عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ

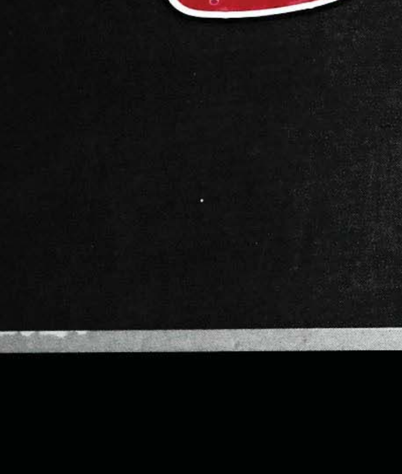
جدید فقہی مباحث

مع تقاریظ علمائے کرام

۱۹

- خاندانی نظام اور خواتین کے حقوق
  (اسلام کا مطلوب خاندانی نظام)
- قیدیوں کے حقوق
  (قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کا عالمی معیار)
- مشترکہ وجداگانہ خاندانی نظام

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا



زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

تاثرات

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

مفتی اعظم پاکستان جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم

شیخ الاسلام جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم

دار الاشاعت

اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ

جدید فقہی مباحث

مع تقاریظ علمائے کرام

جلد 19

خاندانی نظام اور خواتین کے حقوق (ایک تحقیقی جائزہ)
قیدیوں کے حقوق (قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کا عالمی معیار)
مشترکہ وجداگانہ خاندانی نظام (ایک تحقیقی جائزہ)

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی
حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

تاثرات
مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
مفتی اعظم پاکستان جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم
شیخ الاسلام جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم

دارالاشاعت
اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

ہمارے اس ایڈیشن میں 80 میں سے تقریباً 58 مباحث پہلی مرتبہ صرف پاکستان میں طبع ہوئے ہیں۔ ہم اسلامی فقہ اکیڈمی کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے تمام مسودات وکمپوزنگ بذریعہ ای میل مرحمت فرمائے۔ جزاك الله

باہتمام: خلیل اشرف عثمانی

طبع اول: نومبر 2017ء

تعداد: 500

طباعت: عابد پرنٹنگ پریس غریب آباد کراچی

﴿...........ملنے کے پتے...........﴾

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
مکتبہ معارف القرآن جامعہ دارالعلوم کراچی
بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت القلم اردو بازار کراچی
مکتبہ اسلامیہ امین پور بازار۔ فیصل آباد

ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔انارکلی لاہور و اردو بازار کراچی
مسٹر بکس جناح سپر مارکیٹ اسلام آباد
دارالاخلاص صدف پلازہ محلہ جنگی پشاور
مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور
کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی

﴿انگلینڈ میں ملنے کے پتے﴾

AZHAR ACADEMY LTD.
54-68 LITTLE ILFORD LANE
MANOR PARK, LONDON E12 5QA

ISLAMIC BOOKS CENTRE
119-121, HALLI WELL ROAD
BOLTON BL 3NE, U.K.

﴿امریکہ میں ملنے کے پتے﴾

MADRASAH ISLAMIAH BOOK STORE
6665 BINTLIFF, HOUSTON,
TX-77074, U.S.A.

DARUL-ULOOM AL-MADANIA
182 SOBIESKI STREET,
BUFFALO, NY 14212, U.S.A

فہرست مضامین سلسلہ جدید فقہی مباحث

تمت

بسم الله الرحمن الرحيم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

اللہ تبارک وتعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے دارالاشاعت کراچی کو پاکستان میں 1949ء سے تمام موضوعات پر اسلامی کتب کی طباعت اور اشاعت کی سعادت حاصل رہی ہے، یہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل، تمام بزرگوں کی دعاؤں اور اکابر کی خدمات کا ثمرہ ہے، اسی محنت ولگن اور جذبے سے یہ خدمت تیسری نسل یعنی موجودہ ذمہ داران بھی کر رہی ہے اور اب چوتھی نسل کے نمائندے بھی ماشاء اللہ اس کام میں شریک ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کام کو مکمل اخلاص کے ساتھ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے جو کمی کوتاہی اس میں رہ جاتی ہے اس پر معاف فرمائے۔ (آمین)

تمام قارئین جو ماشاء اللہ ذی علم حضرات ہیں ان کے تعاون اور دعاؤں سے ہی یہ کام انجام پا سکا ان سب حضرات سے بھی دونوں جہاں میں کامیابی کی دعا کی درخواست ہے۔

زیر نظر مجموعہ ''سلسلہ جدید فقہی مباحث'' کا موجودہ ایڈیشن جو بڑے سائز کی 26 جلدوں میں طبع ہوئی ہے اس میں تقریباً 70 مختلف مستقل موضوعات پر کتب جو ہندوستان میں قائم ادارہ ''اسلامی فقہ اکیڈمی'' کی طویل کوششوں سے وجود میں آئیں، فقہ اکیڈمی کے سرپرست حضرات مدظلہم کی بصیرت اور کوششوں سے بڑے بڑے نامور اکابر علماء کے مقالے ان جدید فقہی موضوعات پر جمع ہو کر علمی تحقیقات کرنے والوں کے لیے بڑا ازبردست ذخیرہ جمع کر دیا ہے، جسے نامور اکابر ملت نے بڑی خدمت قرار دیا ہے، آئندہ صفحات میں ان بزرگوں کی تقاریظ شامل ہیں۔

ہمارے اس ایڈیشن سے قبل اس کتاب کا تقریباً چوتھائی سے بھی کم حصہ طبع ہوا تھا، جس کا معیار بھی مناسب نہ تھا اور اس کی دستیابی بھی مستقل نہ ہونے کی وجہ سے اہل علم پریشان رہتے تھے، ضرورت تھی کہ نہ صرف معیار بہتر ہو اور مستقل فراہمی بھی رہے۔ ''منتظمین اسلامی فقہ اکیڈمی دہلی انڈیا'' کی خواہش تھی کہ پاکستان میں کوئی ایسا ادارہ ہو جو ان کے مقاصد کو بھی پورا کرتا ہو اور مکمل اشاعت بھی کر سکتا ہو، تاکہ اس علمی ذخیرہ کی پاکستان میں اشاعت کی ذمہ داری اس کے سپرد کی جائے۔

اس مقصد کے لیے تقریباً اب سے سات سال قبل انہوں نے دارالاشاعت کراچی کو تحریری اجازت مرحمت فرمادی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر ہماری طرف سے اس میں تساہل یا کوتاہی کی گئی تو وہ کسی اور ناشر کو خدمات سونپ دیں گے۔ ارادے کے باوجود بعض مصالح اور حکمتوں کے سبب اسلامی فقہ اکیڈمی سے اپنے عذر کو واضح کر دیا گیا اور اس کی اشاعت کا ارادہ ترک کر دیا گیا۔

2015ء میں اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے سابقہ داعیہ کے ایک صاحب علم نے پیغام دیا کہ پاکستان میں اس کتاب کی مکمل اور مستقل اشاعت نہ ہونے کے سبب وہ پھر چاہتے ہیں کہ اس کا کوئی مستقل انتظام ان کے مطلوبہ معیار و مقاصد کے مطابق ہو جائے بہر حال! پھر دوبارہ ایک مفصل تحریری اجازت نامہ ان حضرات نے پاکستان کے لیے ہمیں جاری فرمایا اور تمام مطبوعہ وغیر مطبوعہ کمپیوٹر کمپوزنگ یا جس شکل میں بھی یہ ذخیرہ تھا انہوں نے مذکورہ صاحب علم صاحب کے ذریعے ہمیں فراہم کیا، ان دو سالوں میں طویل محنت واخراجات کر کے اب اسے طبع کرنے کے لیے تیار کر لیا گیا ہے۔ اب پاکستان میں اس ذخیرہ کی اشاعت کے حقوق

قانونی طور پر بھی دارالاشاعت کراچی ہی کے پاس ہیں، تقریباً 22 کتب اس میں سے پہلے شائع ہوئی تھیں، ان کے علاوہ تمام ذخیرہ پہلی مرتبہ طبع ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے، یہ ذخیرہ پہلے انڈیا میں شائع نہیں ہوا تھا۔

ہم نے اپنے اس جدید ایڈیشن میں ترتیب یا جن دیگر خصوصیات سے اسے مزین کیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱...... اسلامی فقہ اکیڈمی کی طرف سے پرانے شائع شدہ نسخوں میں کسی بھی بحث کے نتیجے میں جمع ہونے والے مقالے شائع کر دیے جاتے تھے، بعد میں ان میں یہ اضافہ کیا گیا کافی جگہ اکیڈمی نے ان بحثوں کے نتیجے میں جو فیصلہ کیا اس کا اضافہ اس موجودہ نسخے میں شامل ہے۔

۲...... پورے علمی ذخیرے کو از سر نو بڑے سائز میں کمپوز و سیٹنگ سے آراستہ کیا گیا ہے بعض مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے بات ادھوری رہ گئی ہے تو قدیم نسخوں اور اصل مسودے میں بھی اسی طرح نامکمل ہے۔

۳...... پورے علمی ذخیرے کی نئی ترتیب یا جلد بندی اس طریقہ پر کی گئی ہے کہ ممکنہ طور پر ایک جیسے موضوعات پر مباحث ایک جلد میں آجائیں، پہلے طبع شدہ نسخے میں یہ صورت نہ تھی۔ مثلاً اسلامی بینکنگ کے عنوان سے ایک موضوع چوتھی جلد میں ہے تو اسی عنوان سے دوسرا موضوع ۱۳ نمبر جلد میں ہے، اب یہ کوشش کی گئی ہے کہ ایک جیسے موضوع ایک ہی جلد میں آجائیں۔

۴...... ممکن ہے کہ استفادہ کرنے والے حضرات کو ایسا محسوس ہو کہ کمپوزنگ بہت جلی نہیں ہے اسے ذرا بڑا بھی رکھا جا سکتا تھا لیکن اس سے مجموعہ کے صفحات اور جلدوں میں بہت اضافہ ہو رہا تھا اور اس کی قیمت بھی قارئین پر ایک بوجھ ہوتی۔ مزید یہ کہ گزشتہ طبع شدہ نسخوں کا قلم بھی تقریباً اس جیسا ہی تھا۔

۵...... بحمد للہ! اب "سلسلہ جدید فقہی مباحث" کا سائز بھی دیگر فقہی کتب کی طرز پر ہو گیا، کاغذ، طباعت اور جلد سازی کا معیار بھی بہت نمایاں اور بہتر ہو گیا۔

۶...... اس ذخیرہ کی قیمت بھی بازار میں دستیاب کتب کے مقابلے میں معیار وغیرہ کو دیکھتے ہوئے بہت مناسب رکھی گئی ہے۔

امید ہے کہ اہل علم حضرات، یونیورسٹیاں، لائبریریاں، اس علمی ذخیرے کی پذیرائی کریں گی اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ درخواست اور دعا ہے کہ ہماری اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرمائیں اور دنیا و آخرت دونوں کے لیے نافع بنا دیں (آمین)

والسلام

خلیل اشرف عثمانی

مدیر کتب خانہ دارالاشاعت

اردو بازار کراچی

8/7/2017

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چند تاثرات برائے اسلامی فقہ اکیڈمی ہند

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہ العالی

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

''اسلامک فقہ اکیڈمی ہند'' ایک ایسا ادارہ اور تنظیم ہے جس پر ہندوستانی مسلمانوں...... بالخصوص علماء اور دینی غیرت وفکر رکھنے والے ہندوستانی مسلمانوں کو فخر اور فخر سے زیادہ خدا کا شکر کرنے کا حق حاصل ہے، یہ ایک خالص تعمیری وفکری، علمی اور فقہی تنظیم اور اجتماعیت ہے جس میں ملک کے ممتاز، صحیح العقیدہ وصحیح الفکر اور وسیع العلم علماء اور کارکن شامل ہیں۔

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ العالی

صدر دارالعلوم کراچی پاکستان

''مجھے بے انتہا مسرت بھی اور کسی قدر حسرت بھی، مسرت اس بات کی کہ ہندوستان کے علمائے کرام نے وہ عظیم الشان کام شروع کیا ہے جس کی پورے عالم کو اور اقلیت والے ملکوں کو شدید ضرورت ہے اور حسرت یہ ہے کہ ہم پاکستان میں ہونے کے باوجود منظم اور بڑے پیمانے پر یہ کام شروع نہ کرسکے۔......فقہ اکیڈمی نے بڑا اہل قدم اٹھایا ہے، مدت سے اس کا انتظار تھا۔

تقدیم

شیخ الاسلام جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی

نائب رئیس مجمع الفقہ الاسلامی جدہ

بمناسبت خطبہ صدارت چوتھے فقہی سیمینار منعقدہ ۱۹۹۲ء حیدرآباد (دکن)

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى: اما بعد!

میرے لیے یہ بات بہت بڑے اعزاز اور خوشی و مسرت اور یادگار کی حیثیت رکھتی ہے کہ اللہ جل جلالہ کے فضل و کرم سے مجھے اس عظیم الشان علمی ادارے کے چوتھے فقہی مذاکرہ میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ میں اپنے محترم بزرگ جناب مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم کا اور اس اسلامک فقہ اکیڈمی کے تمام منتظمین کا تہ دل سے شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس محفل میں شرکت کا موقع عنایت فرمایا اور نہ صرف ایک سامع اور شریک کی حیثیت میں بلکہ اس افتتاحی اجلاس کی صدارت کی ذمہ داری بھی مجھ ناچیز کو سونپی۔ اس سے پہلے اگرچہ اکیڈمی کی طرف سے ہر سال مجھے دعوت موصول ہوتی رہی لیکن میں اپنے بعض مشاغل کی وجہ سے حاضر خدمت نہ ہوسکا۔ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم سے میرا غائبانہ تعارف ایک طویل مدت سے ہے، لیکن میں ان کو ایک فقیہ، ایک عالم کی حیثیت سے جانتا تھا، مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ایک مخفی جوہر، مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا بھی ودیعت کر رکھا ہے۔ آج اس محفل میں شرکت کرنے کے بعد ہندوستان کے علماء اور علم وفضل کے پیکر حضرات سے ملاقات کر کے اس بات کا اندازہ ہو رہا ہے کہ انہوں نے اس اکیڈمی کو قائم کر کے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان کے اس کارنامے کو قبول فرمائے اور اس کے اغراض و مقاصد کو اپنی رضا کے مطابق پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس موقع پر اس اکیڈمی کے اغراض و مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اس اکیڈمی کا قیام جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کی تعمیل ہے۔ وہ ارشاد معجم طبرانی میں ایک روایت میں ہے جسے علامہ ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ!

”اذا جاء نا امر ليس فيه أمرو لا نهي فما ذا تأمرنا فيه“

یا رسول اللہ! اگر ہمارے سامنے کوئی ایسا سوال آجائے، ایسا قضیہ سامنے آجائے جس کے بارے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں کوئی صریح حکم موجود نہ ہو تو اس صورت حال میں آپ ہمیں کس بات کا حکم دیتے ہیں، ایسے موقع پر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ حضرت نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”شاوروا الفقهاء العابدين ولا تمضوا فيه براى خاص“

کہ ایسے موقع پر فقہاء عابدین سے مشورہ کرو اور اس میں انفرادی رائے کو نافذ نہ کرو، محض انفرادی فتویٰ کو، محض انفرادی رائے کو لوگوں پر مسلط کرنے کی بجائے فقہاء عابدین سے مشورہ کرو، اور اس مشورہ کے نتیجہ میں جس مقام پر پہنچو اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم سمجھو۔

یہ ہے وہ ارشاد جس کے ذریعہ نبی کریم سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام قیامت تک پیدا ہونے والے تمام نت نئے مسائل کا حل ہمارے لیے تجویز فرمایا اور وہ یہ کہ آخری وقت میں جب کہ اجتہاد مطلق کا تصور تقریباً مفقود ہو گیا ہے، اس دور میں نئے مسائل کو حل کرنے کا راستہ یہ ہے کہ فقہاء عابدین

کو جمع کیا جائے۔ مگر اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو صفتیں بیان فرمائی: ایک یہ کہ جن لوگوں کو جمع کیا جائے وہ تفقہ فی الدین رکھنے والے ہوں، دین کی صحیح سمجھ رکھنے والے ہوں۔ دین کے مزاج و مذاق کو اچھی طرح محفوظ کرنے والے ہوں، اور دوسری قید یہ لگا دی کہ وہ فقہا محض فلسفی قسم کے نہ ہوں، جو نظریاتی طور پر فقیہ ہوں، نظریاتی طور پر اسلام کے احکام کو جانتے ہوں، جو محض علم رکھتے ہوں، لیکن اس علم پر خود عمل پیرا نہ ہوں۔ اس علم کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہ ہوں، اور اس علم کو اپنی زندگی کا منتہائے مقصود نہ بنایا ہو، تو ایسے فقہاء سے مشورہ کرنے کا کوئی حاصل نہیں، اس لیے کہ دین، یہ محض ایک نظریہ اور فلسفہ نہیں کہ ایک شخص محض فلسفہ کے طور پر اس کو اپنا لے، اس کے حکم بیان کر دے اور پھر بھی اس کا ماہر کہلائے، بلکہ یہ ایک عمل ہے۔ ایک پیغام ہے، ایک دعوت ہے۔ جب تک اس پر عمل صحیح طور پر نہیں ہوگا، اس وقت تک دین کی صحیح سمجھ حاصل نہیں ہو سکتی۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ یہ بات فرمایا کرتے تھے:

"کہ اگر میرا علم بمعنی جان لینا کوئی کمال کی بات ہوتی تو شاید ابلیس سے بڑا صاحب کمال اس کائنات میں کوئی نہ ہوتا۔"

اس لیے کہ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے صرف جان لینے کا، علم حاصل کر لینے کا، تو ابلیس کو علم بہت بڑا حاصل تھا، بہت کچھ علم اس کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا، اور عقل کے اعتبار سے بھی آپ دیکھیں تو عقل، خالص عقل، جو وحی کی رہنمائی سے آزاد ہو، اس عقل کے اعتبار سے اس نے جو دلیل پیش کی، سجدہ نہ کرنے کی، کہ اے اللہ! تو نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور مجھ کو آگ سے پیدا کیا، تو میں افضل ہوں، اس لیے کہ آگ افضل ہے مٹی کے مقابلے میں، تو اگر عقل کو وحی کی رہنمائی سے آزاد کر دیا جائے تو خالص عقل کی بنیاد پر اس کی دلیل کا توڑ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس سارے عقل اور اس سارے علم کے باوجود وہ راندۂ درگاہ ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے نکالا گیا، اس لیے کہ وہ علم نرا علم تھا، دانستن کے معنی میں اس پر عمل نہیں تھا۔ اس کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہیں تھا، آپ کو معلوم ہے کہ آج ہمارے اس دور میں جتنے مستشرقین ہیں، اگر آپ ان کی لکھی ہوئی کتابیں دیکھیں تو ان میں اسلامی کتابوں کے ڈھیر ملیں گے۔ اتنی کتابوں کے حوالے ملیں گے کہ بسا اوقات ہمارے عالم دین اتنی کتابوں کا مطالعہ نہیں کرتے ہیں۔ لیکن سارا علم اور ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد اس علم کا اتنا فائدہ نہیں اٹھا سکے کہ ایمان کی دولت حاصل کر لیتے۔ یہودی کے یہودی، عیسائی کے عیسائی رہے۔ تو معلوم ہوا کہ صرف فقہ کا عالم ہو جانا کافی نہیں، اور صرف فقہ کے عالم ہو جانے سے وہ مقام حاصل نہیں ہو جاتا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نئے مسائل کو حل کرنے کے لیے تجویز فرمایا بلکہ قید لگا دی کہ فقہاء کے ساتھ عابدین ہونے چاہیے، عبادت گزار ہونے چاہیے۔ یہ حدیث میں نے اس وجہ سے سنائی کہ آج کثرت سے یہ آواز بلند ہوتا رہتا ہے، مختلف حلقوں کی طرف سے کہ صاحب دین کی تفہیم اور دین کی تعبیر کا حق صرف علماء ہی کو کیوں حاصل ہے۔ ہر مسلمان بہ حیثیت ایک مسلمان وہ دین کی تفہیم و تشریح کیوں نہیں کر سکتا۔ ہر آدمی کھڑا ہو کر بہ آواز بلند کہتا ہے کہ میں قرآن کریم سے احکام شرعیہ کا استنباط کر سکتا ہوں۔ یہ دین کی تفہیم و تعبیر کا سارا حق اٹھا کر علماء کی جھولی میں کیوں ڈال دیا گیا۔ علماء کی اجارہ داری کیوں قائم کر دی گئی۔

تو جواب دیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ یہ تشریح و تعبیر کا حق صرف فقہاء عابدین کو حاصل ہے، صرف فقہاء کو بھی نہیں بلکہ فقہاء عابدین کو، اس کے سوا کوئی قرآن و سنت کے احکام کی صحیح تفسیر و تشریح نہیں کر سکتا۔

یہ عجیب واقعہ ہے کہ دنیا کے ہر علم و فن میں کوئی ذمہ دارانہ بات کہنے کے لیے ساری دنیا میں یہ شرط عائد کی جاتی ہے کہ اس فن کا اس نے علم حاصل کیا ہو، اس کی ڈگری حاصل کی ہو، کوئی شخص آج تک ایسا پیدا نہیں ہوا جو کہتا ہو کہ انگریزی جانتا ہوں، میڈیکل سائنس کی کتابیں مطالعہ کر کے میں علاج کر سکتا ہوں، اگر میڈیکل سائنس کی کتابیں پڑھ کر، محض مطالعہ کر کے ڈکشنریوں کے ذریعہ اس کے ترجمے دیکھ کر آدمی علاج کرنا شروع کر دے تو سوائے قبرستان آباد کرنے کے اور کوئی خدمت انسانیت کی وہ انجام نہیں دے سکتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے دین کے اندر بھی یہ راستہ رکھا ہے کہ جب کتاب بھیجی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ بھیجا تاکہ آپ اس کی تعلیم دیں، اس کی تربیت دیں، اس کے معانی سکھائیں اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے سالہا سال کی محنت کر کے قرآن کریم کی ایک سورۃ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھی۔ اس لیے یہ نعرہ جو لگایا جاتا ہے کہ ہر شخص قرآن و سنت کے بارے میں جو چاہے کہہ سکتا ہے اس کا جواب اس مکمل حدیث کے اندر موجود ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا مجمع الفقہ الاسلامی اسی حدیث کی

تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حدیث پر عمل کرنے کا صحیح نور، اس کی صحیح برکت اور اس کا صحیح فائدہ مجمع کو عطا فرمائے۔

جیسا کہ مجھ سے پہلے کئی حضرات اس پر روشنی ڈال چکے ہیں کہ اس مجمع (اکیڈمی) کے قیام کا اصل مقصد ان نئے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے جو اس امت مسلمہ کو درپیش ہیں اور کوئی شک نہیں کہ علماء کے نقطۂ نظر سے یہ وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے کہ علماء باہم سر جوڑ کر ان مسائل کا حل امت مسلمہ کے سامنے پیش کریں جو آج امت مسلمہ کے لیے چیلنج بنے ہوئے ہیں۔ لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ وقت کا بہت بڑا تقاضہ ہے کہ علماء یہ کام کریں تو مجھے چند وہ جملے بھی یاد آتے ہیں جو بسا اوقات مختلف حلقوں کی طرف سے بار بار اٹھائے جاتے ہیں کہ علماء کو وقت کے تقاضے کے پیچھے چلنا چاہیے۔ علماء کو وقت کے تقاضوں کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنا چاہیے۔ یہ جملہ جس اجمال کے ساتھ بولا جاتا ہے اس کا صحیح مطلب بھی ہوسکتا ہے اور غلط مطلب بھی ہوسکتا ہے وقت کے تقاضہ کا مفہوم بسا اوقات لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ مغرب میں جو ہوا چل کر آوے، مغرب سے جو فکر، جو فلسفہ جو نظریہ، جو طرز عمل ہمارے ملکوں میں درآمد ہوگیا، بجائے اس کے کہ اس کو بدلا جائے، اس کے بجائے اسلام کو بدل کر اس کے مطابق کیا جائے، اسے وقت کا تقاضہ قرار دیا جاتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ سود، ربوا کا چلن ہوا تو لوگوں نے یہ کہنا شروع کردیا کہ صاحب اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمان سود کو جوں کا توں قبول کرلیں...... ایک زمانہ آیا کہ اشتراکیت اور سوشلزم کا ڈنکا بجا، اور انہوں نے دنیا کے اندر اپنے نظریات کو پھیلانا شروع کیا، دنیا کے مختلف ملکوں اور سلطنتوں میں ان کا نظام رائج ہوا۔ اس کا شور شرابہ ہوا تو اس کے نتیجہ میں ایک جماعت نے یہ کہنا شروع کردیا کہ اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ سوشلزم کو، اشتراکیت کو اسلام کے مطابق ڈھال دیا جائے وقت کا تقاضہ یہ ہے۔ غرض جو نئی وبا مغرب سے درآمد ہوا اسلام کو اس کے مطابق بنانے اور اس کو اسلام کے اندر داخل کرنے کے لیے وقت کے تقاضہ کا عنوان استعمال کرلیا جاتا ہے۔

لیکن یہ مجمع الفقہ الاسلامی درحقیقت ایسے وقت کے نام نہاد تقاضوں کے پیچھے نہ ہے اور نہ ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ...... یہاں وقت کے تقاضوں سے مراد یہ ہے کہ بے شمار مسائل آپ کی زندگی کے اندر سے پیش آگئے ہیں کہ ہمیں ان کا صریح حکم کتاب اللہ میں یا سنت رسول اللہ ﷺ میں یا فقہاء کرام کے کلام میں نہیں ملتا، جسے آپ اصلاحی اعتبار سے اجتہاد فی المسائل کہہ سکتے ہیں۔ تو اجتہاد فی المسائل کے ذریعہ ان مسائل کا حل تلاش کیا جائے اور وسعتِ نظر کے ساتھ کیا جائے۔ پورے اسلامی مزاج کے ساتھ کیا جائے، اس کے اندر کسی اجنبی نظریہ اور فلسفہ سے مرعوب ہوکر نہیں، بلکہ حقیقی اسلامی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا حل اسلامی اصولوں کے دائرہ میں رہ کر تلاش کیا جائے اس سے باہر نہ جایا جائے، یہ ہے اس مجمع (اکیڈمی) کا اصل مقصد اور اسی لیے اس میں الحمد للہ مختلف الخیال، مختلف اداروں سے تعلق رکھنے والے موجود ہیں اور پچھلے دنوں جو تحقیقات سامنے آئی ہیں اللہ کے فضل و کرم سے ان میں ان بنیادی اصولوں کا لحاظ نظر آتا ہے۔ امید ہے کہ یہ اکیڈمی ان راستوں پر چلے گی، تو انشاء اللہ اس امت کے لیے بہترین مسائل کا حل پیش کرے گی...... لیکن میں آخر میں اس سلسلہ کے ایک اہم نکتہ کی طرف آپ حضرات کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، بلکہ توجہ دلانا تو بے ادبی کی بات ہوگی۔ سارے حضرات اکابر علماء ہیں۔ محض تذکیر اور تکرار کے طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ چوں کہ ہم ایک ایسے معاشرہ میں جی رہے ہیں جس میں مغرب کا سیاسی اور فکری تسلط قائم ہے۔ سیاسی اور فکری سیاسی اعتبار سے پوری دنیا کے اوپر مغرب مسلط ہے۔ فکری اعتبار سے بھی مغرب کے افکار اور ان کے نظریات و فلسفے مسلط ہیں۔ اور یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" جس کے پاس ہتھیار، جس کے پاس قوت ہو تو لوگوں کو بات بھی اسی کی سمجھ میں آتی ہے اور جلدی سے سینے میں اتر جاتی ہے۔ تو اس واسطے مغرب نے جو افکار ہمارے یہاں پھیلا دیئے اور صدیوں کی محنت کے بعد پھیلائے۔ ہمارے نظام تعلیم کے اندر وہ افکار پھیلا دیئے۔ ان کی موجودگی میں اس بات کا بڑا قوی اندیشہ ہے کہ بعض ایسی چیزوں کو وقت کی ضرورت قرار دیا جائے جو درحقیقت وقت کی ضرورت نہیں ہے۔ محض مغرب کے پروپیگنڈہ نے اسے وقت کی ضرورت قرار دے دیا۔ یہ وقت کی ضرورت ایک ایسا مجمل لفظ ہے جس کے اندر بہت کچھ سما سکتا ہے اس لیے وقت کی ضرورت کے ہتھیار کو استعمال کرتے ہوئے ان کی دو دھاریں اپنے ذہن میں رکھنی ضروری ہے۔ یہ دو دھاریں ہتھیار ہیں، اس سے امت مسلمہ کے مسائل بھی حل ہوسکتے ہیں اور اس سے امت مسلمہ کا کام

بھی تمام ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہم جب وقت کی ضرورت کا لفظ استعمال کریں تو یہ بات ہمارے ذہن میں ہونی چاہیے کہ محض پروپیگنڈہ کے شور وشغب سے مرعوب ہو کر ہم یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ یہ بھی وقت کی ضرورت ہے۔ بلکہ ہم یہ دیکھیں کہ ہمارے اپنے اصول، ہمارے اپنے قواعد کے لحاظ سے یہ ضرورت ہے یا نہیں؟

اسی ضمن میں یہ سوال بہ کثرت اٹھتا ہے کہ کیا ان مسائل کو طے کرتے وقت کسی ایک فقہی مذہب کی پیروی کرنی چاہیے یا مختلف فقہی مذاہب کو سامنے رکھ کر اور اس میں جو ضرورت کے مطابق معلوم ہو اس کو اختیار کر لینا چاہیے۔

میں خاص طور پر آپ حضرات سے باادب عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خاص طور پر اس دور میں معاملات کے شعبہ میں چوں کہ معاملات پیچیدہ ہوتے ہیں، بے شمار مسائل سامنے آگئے ہیں، لہٰذا اگر یہ شخص حنفی مذہب کا پیروکار ہے اور وہ کسی ضرورت کی وجہ سے، عموم بلویٰ کی خاطر، وہ مسائل وقت کو حل کرنے کی خاطر دوسرے کسی امام کے قول کو اختیار کر لے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہ جائز ہے اور نہ صرف جائز ہے بلکہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو باضابطہ یہ وصیت فرمائی تھی کہ اس دور میں جب کہ معاملات پیچیدہ ہو گئے ہیں، اگر آئمہ اربعہ کے دائرہ میں رہتے ہوئے کسی بھی فقہی مذہب میں کوئی گنجائش مل جائے تو اس دور کے لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنی چاہیے۔

لیکن اس میں ادق ترین جو نکتہ ہے جو بسا اوقات افراط وتفریط کا شکار ہو کر فراموش ہو جاتا ہے وہ یہ کہ مختلف مذاہب میں سے علوم بلویٰ کی خاطر کوئی قول اختیار کر لینا اور بات ہے اور اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کی خاطر مذاہب کو گڈمڈ کرنا بالکل جدا شئے ہے یعنی اگر کوئی شخص محض اس بنیاد پر کہ میری خواہش نفسانی میرے مفاد ایک مذہب سے پورے ہو رہے ہیں دوسرے سے پورے نہیں ہو رہے ہیں تو اس بنیاد پر اگر وہ ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر تو اس کی کسی کے نزدیک اجازت نہیں، یہ اتباع ہویٰ ہے۔ یہ خواہشات نفسانی کی اتباع ہے۔ اس کو تشہی کہا گیا ہے، یہ شہوت پرستی ہے، یہ خواہش پرستی ہے، محض اپنے ذاتی فائدہ یا ذاتی سہولت کی خاطر ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیتا ہے اس کی مثال آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

آج جب کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے یہ عام رجحان پیدا ہوا۔ پورے عالم اسلام میں خاص طور پر عرب ممالک ... یہ رجحان بہت پیدا ہوا کہ ان معاملات کو حل کرنے کے لیے مختلف مذاہب سے رہنمائی حاصل کی جائے اور کسی ایک مذہب کی اتباع نہ کی جائے۔ جب یہ ... آگے بڑھی تو اس نے بعض اوقات یہ صورت اختیار کر لی کہ محض ضرورت کی خاطر نہیں، بلکہ محض ذاتی مفاد، ذاتی سہولت کی خاطر "جمع بین المذاہب" اور "تلفیق بین المذاہب" کا راستہ اختیار کر لیا...... اتباعِ ہویٰ کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ فتاویٰ کے اندر لکھتے ہیں:

"اگر کوئی شخص ذاتی خواہش کی خاطر دوسرے مذہب کو اختیار کرتا ہے تو یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں بلکہ حرام ہے۔"

حالانکہ علامہ ابن تیمیہ تقلید کے سخت مخالف ہیں۔ اتباعِ ہویٰ کو وہ بھی حرام قرار دیتے ہیں۔ اس کی چھوٹی سی مثال پیش کرتا ہوں۔

ایک صاحب سے میری ایک بار ملاقات ہوئی میں اور وہ دونوں سفر پر تھے اور دونوں سفر کے عالم میں مقیم تھے۔ ہفتہ دس دن ایک جگہ ٹھہرنا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ "جمع بین الصلوتین" کر رہے ہیں۔ دو نمازوں کو جمع کر رہے ہیں۔ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک جائز ہے، امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک جائز ہے، امام مالکؒ کے نزدیک جائز ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جمع حقیقی جائز نہیں ہے۔ جمع صوری کو جائز کہتے ہیں۔ تو وہ جمع کر رہے تھے، انہوں نے امام شافعیؒ کے قول پر عمل کیا ہوگا۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ ہفتہ بھر مقیم رہے اور جمع بین الصلوتین کرتے رہے، تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے شافعی مسلک کو لے لیا تا کہ دو نمازوں کو جمع کرنے کی گنجائش مل جائے، میں نے عرض کیا کہ شافعی مسلک یہ بھی ہے کہ چار دن سے زیادہ ان کے یہاں قصر نہیں ہو سکتی۔ ان کے نزدیک مدتِ قصر صرف چار دن ہے۔ تو چار دن سے زیادہ مدتِ سفر نہیں ہوتی اور آپ تو ہفتہ بھر سے مقیم ہیں۔ تو کہنے لگے کہ میں نے اس معاملہ میں حنفی مسلک کو لے لیا۔ تو میں نے پوچھا کہ کیا آپ دلائل کے نقطۂ نظر سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ میں حنفیہ کا مسلک زیادہ قوی ہے اور اس معاملہ میں شافعیہ کا مسلک زیادہ قوی ہے۔ کہنے لگے کہ دلیل کے اعتبار سے تو میں نہیں سمجھتا لیکن میں نے دیکھا کہ یہ

میرے لیے زیادہ سوٹ کرتا ہے تو اس واسطے میں نے اس میں حنفی کا مسلک لے لیا اور اس میں شافعی کا مسلک لے لیا..... تو میری گزارش یہ ہے کہ محض ذاتی سہولت اور ذاتی مفاد، ذاتی راحت کے پیش نظر ایک مسئلہ میں ایک قول کو لے لینا اور دوسرے مسئلہ میں دوسرے قول کو لے لینا، یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ یہ طریقہ اختیار کیا گیا تو اس سے دین کا حلیہ بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ اس واسطے کہ ہر مذہب میں جو قول اختیار کیا گیا اس کے کچھ شرائط ہیں اس کے کچھ حدود ہیں۔ آپ نے ان شرائط کو مد نظر نہیں رکھا چھوڑ دیا اور ان شرائط کو مد نظر رکھے بغیر اور اس طرح سے "تلفیق بین المذاهب" کا سلسلہ شروع کر دیا تو اس کا نتیجہ سوائے اتباع ہویٰ کے اور کچھ نہیں ہو سکتا، اس لیے میری گزارش یہ ہے کہ بے شک دوسرے مذاہب خاص طور پر معاملات کے اندر دوسرے مذاہب سے لے لینے کی گنجائش ہے لیکن یہ اس وقت جب کہ واقعی کوئی ضرورت داعی ہو اور واقعتاً اس سے مسلمانوں کے کسی اجتماعی مسئلہ کا حل نکالنا مقصود ہو اور اس کا مقصد اتباع ہویٰ، تشہی اور ذاتی منفعت کو حاصل کرنا نہ ہو، اس صورت میں اس کی گنجائش ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ یہ علماء کا مجمع ہے، ان کے سامنے کہنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن یہ اس لیے میں نے تذکیر اور تکراراً عرض کر دی کہ جب ہم کسی ایک جانب جھکیں تو ایسا نہ ہو کہ دوسری جانب کا خیال ہمارے دل سے اوجھل ہو...... یہ کام بڑا نازک ہے، یہ پل صراط ہے۔ تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ اس میں اس کا خیال رکھنا ہے کہ وقت کی ضروریات پوری ہوں، مسلمانوں کے مسائل حل ہوں اور دوسری طرف اس بات کا لحاظ رکھنا ہے کہ آپ مغرب کے اس جھوٹے پروپیگنڈے سے مرعوب نہ ہوں جو ہر نئی وبا کو وقت کی ضرورت کہہ کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس واسطے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم اس کام کو انجام دیں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس شریعت کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ یہ آنے والے ہر بڑے سے بڑے مسئلہ کا حل رکھتی ہے اور جب یہ تصور آپ کے سامنے رکھتے ہوئے جواب دیں گے تو ان شاء اللہ امت کے مسائل حل ہوں گے ...... جیسا کہ مجھ سے پہلے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی مدظلہم نے فرمایا کہ عالم کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ یہ کہہ دے کہ یہ حرام ہے بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ اگر کسی چیز کو حرام کہا ہے اور لوگوں کو اس کی ضرورت ہے تو اس کا متبادل حلال طریقہ بھی بتائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں جب حضرت یوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر پوچھی گئی کہ بادشاہ نے خواب دیکھا ہے کہ:

"انی اری سبع بقرات سمان یا کلهن سبع عجاف..."

جب یہ پوچھا تو یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر بعد میں بتائی کہ قحط آنے والا ہے لیکن اس قحط سے بچنے کا راستہ پہلے بتا دیا:

"تزرعون سبع سنین دابا... فما حصدتم فذروه فی سنبله..."

تعبیر تو بعد میں بتائی کہ قحط آنے والا ہے اور پہلے قحط سے بچنے کا یہ راستہ بتایا کہ سات سال تک خوب جم کر زراعت کرو، اور خوشہ کے اندر گیہوں کو چھوڑ دو۔ تو بچنے کا طریقہ پہلے بتا دیا اور خواب کی تعبیر بعد میں بتائی..... تو عالم کا کام محض حرام قرار دے کر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ متبادل راستہ بتانا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ اور یہ اکیڈمی درحقیقت اسی لیے قائم کی گئی ہے۔ اس کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ دوسرے علوم وفنون کے ماہرین کی بھی ضرورت ہوگی۔ متبادل طریقوں کے سمجھنے اور اس کے تعین کے لیے وہ طریقے تجویز کیے جاسکیں جو قابل عمل ہیں۔

الحمد للہ! دیکھتا ہوں کہ مجمع الفقہ الاسلامی نے اس اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے دیگر علوم وفنون کے ماہرین سے بھی استفادہ کا سلسلہ جاری کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اپنی رحمت سے اس اکیڈمی کو اپنے مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائے، قدم قدم پر اس کی نصرت ودستگیری فرمائے، اس کے راستے کی دشواریوں کو دور فرمائے اور دین کی صحیح خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

میں اخیر میں ایک بار پھر اس کانفرنس کے منتظمین کا اور تمام حاضرین کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس ناچیز کی گزارشات کو غور وتوجہ کے ساتھ سنا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ
جدید فقہی مباحث

خاندانی نظام اور خواتین کے حقوق

پہلا باب تمہیدی امور
دوسرا باب خاندانی نظام اور خواتین کے حقوق
تیسرا باب اختتامیہ

تحقیقاتِ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی
حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارُالاشاعت
اُردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

B

پیش لفظ

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ انسان کو سماج کی ضرورت ہے، اگر یہ بات درست ہے تو یہ بھی درست ہے کہ سماج میں تعلقات کے مختلف دائرے ہوتے ہیں، انسان کا سب سے قریبی تعلق جس دائرے سے ہوتا ہے، وہ ہے اس کا خاندان، یہ اس کے لئے حفاظت کا حصار بھی ہے اور اس کی تربیت کا پہلا مدرسہ بھی؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے خاندان (قبائل وشعوب) کو اپنا ایک انعام قرار دیا ہے، خاندانی نظام کا استحکام جتنا مفید ہے، اس نظام کا بکھراؤ اسی قدر نقصان دہ ہے، مغربی سماج خاندان کی نعمت سے محروم ہوتا جا رہا ہے اور اب یہی صورت حال مشرق کے دروازہ پر دستک دے رہی ہے، خود مسلمانوں کا معاشرہ بھی اس سے محفوظ نہیں ہے۔

اس پس منظر میں یہ بات ضروری ہوگئی ہے کہ علماء واہل دانش سر جوڑ کر اس صورت حال پر غور کریں اور صحیح طرز عمل کی رہنمائی کریں، موضوع کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اکیڈمی اب تک اس موضوع پر دو سمینار کر چکی ہے، ایک فکری پہلو سے، جو مورخہ......کو المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے اشتراک سے حیدرآباد میں منعقد ہوا، دوسرا فقہی نقطہ نظر سے، اس کے لئے اکیڈمی کے بیسویں سمینار منعقدہ رام پور میں اسی موضوع کو شامل رکھا گیا، مضامین کا پیش نظر مجموعہ حیدرآباد والے سمینار کے مقالات، خطابات اور تاثرات پر مشتمل ہے، جس کو عزیزی......(رفیق شعبہ علمی اکیڈمی) نے مرتب کیا ہے اور بڑی محنت سے ان لوگوں کے خیالات کو بھی لوح قرطاس پر منتقل کیا ہے، جنہوں نے اپنی بات زبانی کہی تھی؛ حالانکہ یہ ایک دشوار کام ہوتا ہے۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائے، اور یہ مجموعہ مسئلہ کی نوعیت کو سمجھنے اور شریعت کے مزاج و مذاق سے آگہی حاصل کرنے میں مدد و معاون ثابت ہو۔

خالد سیف اللہ رحمانی

۲۴ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ / ۱۴ فروری ۲۰۱۲ء

☆☆☆

پہلا باب تمہیدی امور

افتتاحی خطاب

جناب اقبال انجینئر صاحب

ہمارا موضوع دو حصوں میں تقسیم ہے: ''خاندانی نظام'' اور دوسرا ''خواتین کے حقوق''۔ خاندانی نظام کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کے حصہ کی بنیاد ایک نیک اور فعال احساس کی طرح شروع کرنے کا حکم دیا اور سب کو یہ بتلایا کہ تم آدم کی اولاد ہو، تم ایک ہی خاندان کے فرد ہو، تمہارا سلسلہ ایک ہی انسان سے شروع ہوا تھا اور اس کے بعد اس کی ایک زوج بنی اور ان ہی سے ساری دنیا میں مرد اور عورت کو پھیلایا، بحیثیت مجموعی تم ایک ہی خاندان کے فرد ہو، رنگ ونسل کا کوئی بھید بھاؤ نہیں، تمہیں تقسیم نہیں کیا جاسکتا، نہ طبقات میں تمہیں بانٹا جاسکتا ہے، اور یہی بات کہی گئی کہ مرد اور عورت کا یہ اہم رشتہ ہے اور اسی سے سارے رشتے شروع ہوتے ہیں۔ جب اس کی بنیاد صحیح ہو تو سارے رشتے صحیح، اسی سے ماں بنتی ہے، اسی سے باپ بنتا ہے، اسی سے بیٹے بنتے ہیں اور اسی سے پھوپھی بنتی ہے، جتنے رشتے دنیا میں نظر آئیں گے یہ رشتے اسی سے شروع ہوتے ہیں اور یہ رشتے دینا بھی اللہ کی بڑی مہربانی ہے کہ وہ تمہارے درمیان رشتے دیتا ہے کہ تم اپنے حقوق کو پہچانو، یہ خاندانی نظام جس کی بنیاد پر معاشرہ وجود میں آتا ہے اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی ہم پر ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ ''قوا أنفسكم وأهليكم ناراً'' (سورہ تحریم:٦) (اپنے آپ کو اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ)، اس خاندانی نظام کی بنیاد مرد وعورت کا وہ اہم رشتہ ہے جسے زوج کہا جاتا ہے، حق زوجیت یا زوج کے درمیان گمراہی پیدا کرنا، ایک دوسرے کا حصہ سمجھنے کے بجائے ایک دوسرے کے مخالف حصہ دار بن جانا، اس قسم کی تحریک جو مغرب نے چلائی کہ عورت نفس ہے اور مرد ایک نفس دونوں علیحدہ علیحدہ نفس ہیں، دونوں کی علیحدہ علیحدہ پہچان ہے، ایک مرد کو جس قسم کا ماحول دیا جاتا ہے اگر اسی قسم کا ماحول عورت کو دیا جائے تو عورت بھی وہی کارنامے کرسکتی ہے جو مرد کرتا ہے، آزادیٔ نسواں کا نعرہ جو بڑی مشکل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے چند سال پہلے شروع ہوا، ورنہ اس وقت...... چند سال پہلے یورپ کو تو یہ اختیار تھا کہ عورت کے جسم میں کس کی روح ہے؟...... روح جانور کی ہے یا انسان کی، اس پر بحث ہوتی رہی، بڑی مشکل سے، عورت کی آزادی کا نعرہ دیا گیا اور یہ نعرہ مغرب کی طرف سے ہے وہ اس خاندانی نظام کے مخالف ہے جو قرآن مجید میں ہے۔

عورت کو متاثر کرنے کے لیے مسلمانوں کو نشانہ اسی لیے بنایا گیا ہے کہ مسلمانوں میں جو خاندانی نظام ہے ختم ہوجائے تو مسلمانوں کی شریعت کو ختم کرنا بڑا آسان ہے، عورت اگر باہر آجائے اور بے پردہ ہوجائے تو اس کے بعد خاندانی نظام کو ختم کرنا بڑا آسان ہے، اسی لیے عورت کے حقوق پر بھی بات ہوتی ہے کہ عورت کو جو پردہ کرایا جارہا ہے عورت کی جو ذمہ داریاں بتائی جارہی ہیں، اور اس طرح سے بتائی جارہی ہے کہ عورت قیدی ہے اور مغرب کی جو بہنیں ہیں وہ بڑی پریشان ہیں کہ مشرق کی ان بہنوں سے جو پردہ کرتی ہیں، ان کی فکر یہ ہے کہ مشرقی بہنوں کو آزادی دلائی جائے...... یہ تحریک بڑے زوروشور سے چل رہی ہے، ہمیشہ یہی کہا جاتا ہے کہ مسلمان عورتیں مسلسل قید میں ہیں مقید ہیں ان کو آزاد کرانا یہ بڑی ذمہ داری ہے۔ مغرب کے ان لوگوں کی جو اس فکر کو رکھتے ہیں۔ اسی بنیاد پر یہ دو اہم مسئلے ہیں۔ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے آج کے موجودہ دور کے تناظر میں بحث کے لیے رکھے ہیں، اللہ نے چاہا تو کوئی ایسا نتیجہ ضرور نکلے گا جس کی بنیاد پر ہم یہ کہنے کے موقف میں ہوں گے کہ ہم نے یہ پیغام نہ صرف یہاں سے شروع کیا، بلکہ اس کو سارے ہندوستان میں بھی پھیلایا اور ہماری کوشش ہو کہ ساری دنیا میں ہم اس پیغام کو پھیلانے کا باعث بن جائیں۔ پہلے ہم مطمئن ہوجائیں کہ ہمارا جو اسلامی نظام ہے وہ بالکل ہی مکمل ہے، اور خالی یہ کہنا کہ مکمل ہے، بات نہیں بنے گی، ثابت کرنا پڑے گا دلیل کی بنیاد پر، دنیا کے سامنے ثابت کرنا پڑے گا کہ اسلام کا پیغام مکمل ہے۔

☆☆☆

افتتاحی خطاب

جناب رحیم الدین انصاری صاحب[1]

''خاندانی نظام اور خواتین کے حقوق'' کے سلسلہ میں مختصری تحریر آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ دنیا پر اسلام کے بے شمار احسانات ہیں، اس کا ایک عظیم احسان بھائی، بہن اور دور ونزدیک کے ان تمام افراد کے مابین تعلقات قائم ہونا، جو ان سے خون کا رشتہ رکھتے ہیں۔ اور انہی کے ذریعہ اس کا خاندان تشکیل پاتا ہے اور ان ہی کے درمیان اس کی اجتماعی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، خاندان کے باہر کے افراد سے اس کا تعلق ابتدائی مرحلہ میں ہے۔

☆☆☆

[1] معتمد دار العلوم حیدرآباد

افتتاحی خطاب

جناب حافظ پیر شبیر احمد صاحب[1]

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔

خاندانی نظام کی اہمیت اور افادیت پر کسی شخص کی طرف سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لوگوں کے آپس میں مل جل کر رہنے میں دینی فائدہ کے علاوہ دنیاوی فائدے بھی ہیں، ایک مسلمان کے ذمہ صرف اپنی ذات کی اصلاح نہیں۔ بلکہ اپنی اولاد اور گھر والوں کی دینی تربیت بھی اس کے فرائض میں داخل ہے، خاندانی نظام آج سے نہیں چودہ، سوا چودہ سو سال پہلے سے ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک شریعت دی تھی، اگر اس شریعت پر ہم عمل کرلیں تو ہمارے خاندان کے جتنے نظام ہیں وہ صحیح طریقہ پر چل سکتے ہیں، لیکن ہم اس شریعت کو چھوڑ کر اغیار کے راستہ پر اور خود جو اپنے آپ ہم فیصلہ کر لیتے ہیں، اس راستہ پر چلنے سے جو تکالیف اٹھانی پڑ رہی ہیں، آج آپ کے اور ہمارے سامنے ساری چیزیں موجود ہیں۔

آج علماء کرام اور مفتیان عظام جو خدمات انجام دے رہے ہیں اور جو کتابیں لکھ رہے ہیں کہ موجودہ زمانے میں ہمیں کس طرح چلنا چاہئے، قرآن وحدیث سے ہٹ کر نہیں کہہ رہے ہیں، بلکہ اسی قرآن وحدیث کی روشنی میں یہ اپنے کچھ فیصلے آج کل کے ماحول کے حساب سے کر رہے ہیں اس پر ہمیں چلنا چاہئے، آج ہماری یہ حالت ہوگئی کہ دنیا کے اغیار کے جو بھی فیصلے ہمارے سامنے آتے ہیں ہم فوراً اس کو قبول کر لیتے ہیں۔ اور ہمارے اکابرین جو اتنی محنت سے، او رات دن محنت کر کے جو کام کرتے ہیں اس کی طرف ہماری نظریں نہیں ہوتی ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ہمیں ان اکابرین کے تعلق سے پہلے یہ سوچنا چاہئے کہ یہ کتنی خدمات انجام دے رہے ہیں، لیکن حالت کیا ہے؟ میں معافی چاہتے ہوئے یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم صرف کتابیں پڑھ لیتے ہیں، دینی کتاب یا قرآن وحدیث اور اس سے ہم خود فیصلہ کر لیتے ہیں۔

اگر اسی طرح سے ہم یہ فیصلے کرنا شروع کر دیں تو کیا ہم صحیح راستہ پر چل سکتے ہیں؟ ایک دنیاوی مثال میں دینا چاہتا ہوں کہ ایک ڈاکٹر ہے، ایک انجینئر ہے، یا آئی ایس ہے یا کسی عصری تعلیم گاہ میں وہ تعلیم حاصل کرتا ہے، چاہے پانچ سال ہو چاہے دس سال ہو، جب فارغ ہو کر وہ ڈگری لیتا ہے تو کیا فوراً ایک ڈاکٹر کو آپریشن کرنے کی اجازت دی جاتی ہے؟ نہیں، جب تک کہ وہ اپنے سینئر کے پاس جا کر مشق نہ کرے، کسی ماہر کے پاس جا کر مشق نہ کرے، اس وقت تک وہ ماہر نہیں کہلائے گا، اسی طرح علم دین ہے، یا جو بھی ہے ہم تو پڑھ لیتے ہیں جب تک ان اکابرین کی صحبت میں رہ کر ان اکابرین سے اگر فیض حاصل نہیں کریں گے تو ہمیں وہ چیزیں حاصل نہیں ہو سکتیں، اگر خود ہم فیصلہ کرلیں تو وہ الگ بات ہے، ہوسکتا ہے کہ ہم غلط راستے پر چلے جائیں اور اسی طرح خواتین کے حقوق کے تعلق سے۔ میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری بہنیں صرف شریعت نے جو حق ان کو دیا ہے اگر وہ پہچان لیں تو کسی چیز کے بارے میں ان کو بتلانے کی یا ان کو جگانے کی ضرورت نہیں ہے، اسلام نے ان کو نیا حق دیا ہے، اسلام نے ان کو کس طرح اپنے گھر میں رہ کر اور تمام چیزیں کرنے ہے اگر وہ چیزیں کرلیں تو وہ سارے مسائل حل ہو جائیں گے، یہ دنیا میں اغیار کے طریقہ پر چلنے کی وجہ سے جو حالات ہمارے سامنے ہیں اس سے جو نقصانات ہو رہے ہیں، دین کی بدنامی ہو رہی ہے، اس لئے ہمیں سوچنا چاہئے۔

☆☆☆

[1] صدر جمعیۃ علماء آندھرا پردیش۔

١٤٠٨٦٩

افتتاحی خطاب

جناب ملک محتشم صاحب[1]

اہل ایمان کے لئے، مسلمانوں کے لئے، خاندانی نظام اور خواتین کے حقوق، اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کے نتیجہ میں کوئی بہت بڑا مسئلہ یا کوئی بہت بڑی مصیبت نہیں ہے۔ یہ مصیبت اور پریشانی مغربی تہذیب کی وجہ سے ہے، یورپ اور خاص کر مغربی تہذیب نے خاندانی نظام کو تہس نہس اور درہم برہم کردیا ہے، نہ صرف خاندانی نظام، بلکہ عورت اور مرد کے جو تعلقات ہیں، عورت اور مرد کی سماج میں جو حیثیت ہے اس حیثیت کو متعین کرنے میں ناکامی نے پوری دنیا میں خاندانی نظام کو مصیبت اور پریشانی میں ڈھکیل دیا ہے اور اس کا خمیازہ پوری دنیا بھگت رہی ہے۔ ہمارے لیے یہ موضوع اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ ہم ایک داعی امت ہیں اور دنیا کے اقوام کی رہنمائی کرنے والی امت ہیں۔ عورت اور مرد کے تعلقات، عورت اور مرد کی حیثیت، خاندانی نظام، خواتین کے حقوق اس سے واقف کرانا یہ ہماری ذمہ داری ہے، لیکن یہ بات صحیح ہے کہ اس مغربی تہذیب کے اثر نے مسلم خاندانوں پر بھی برے اثرات ڈالے ہیں، اس لیے دوہری ذمہ داری، ایک تو امت مسلمہ، اسلام کے عطا کردہ خاندانی نظام، خواتین کے حقوق پر عمل کرے اور ساری دنیا کے سامنے خاندانی نظام کی اہمیت، خواتین کے حقوق وغیرہ پر لوگوں کو اسلام کی تعلیم پیش کرے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اسلام میں خاندان کی اہمیت کی بہت تاکید کی گئی ہے، یہ معاشرہ کی بنیادی اکائی ہے، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں خاندان کے بارے میں بہت تفصیل سے ذکر ہے، شادی کے بارے میں، شوہر اور بیوی کے حقوق کے بارے میں اور شادی سے قبل اور شادی کے بعد کی زندگی گزارنے کے بارے میں، علیحدگی ہو تو اس کے بارے میں، طلاق اور وراثت کے قانون کے بارے میں، احادیث میں بھی ذکر ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے کہ خاندان کو استحکام ملے، خاندانی نظام موجود رہے اور خاندان کی اکائی محفوظ رہے، ہمیں یہ تعلیمات اس لیے دی گئی ہیں، تاکہ ہم کو دوسروں کی طرف دیکھنے کا موقع نہ ملے، ایک مستحکم خاندان موجود رہے، آپ جانتے ہیں کہ جب مستحکم خاندان ہوگا تو اس میں پرورش پانے والی شخصیت مستحکم شخصیت ہوگی۔ آج جو لوگوں میں بونا پن ہے جو علمی، فکری، جذباتی، سطحی کیفیت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ گھر کے اندر جو جذباتی اور فکری نشوونما ہوتا ہے جو کردار تشکیل پاتا ہے وہ خاندان میں تشکیل نہیں پا رہا ہے، اس لیے بہت ادھوری شخصیات پیدا ہو رہی ہیں، خاندانی نظام کا متاثر ہو جانا انسانیت کے لیے بہت بڑی مصیبت اور بہت بڑا نقصان ہے، اس لیے قرآن اور حدیث میں اس کی زبردست تاکید کی گئی ہے۔

اسلام کے خاندانی نظام کے شارحین نے تین بنیادیں بتائی ہیں۔ پہلی بنیاد الفت ومحبت ہے، مشہور آیت جو ہم عام طور پر اپنے دعوت ناموں میں شادی کے موقع پر لکھتے ہیں: "ومن آیاته أن خلق لكم من أنفسكم أزواجاً لتسكنوا إليها وجعل بينكم مودة ورحمة" اسلامی خاندان یا کسی بھی خاندان کی بنیاد مہر ومحبت ہے، دوسری بنیاد عدل ہے، تیسری بنیاد اجتماعی تکافل ہے، ایک دوسرے کی خبر گیری ہے، ایک دوسرے کی مدد ہے، مالدار لوگ غریب لوگوں کی، طاقتور لوگ کمزور لوگوں کی مدد کرے، تو یہ مہر ومحبت یہ عدل وانصاف اور یہ اجتماعی تکافل، یہ لوگوں کی، آنے والی نسلوں کی تربیت کرتا ہے، اس خاندانی نظام کی ہمیں سخت ضرورت ہے، ہمارا خاندان مستحکم ہو، ہماری بنیاد مستحکم ہو، تب ہمارا مستقبل بھی مستحکم ہوگا۔

جہاں تک خواتین کے حقوق کا تعلق ہے، میں اس میں بھی، یعنی حقوق اور فرائض، حقوق اور ذمہ داریاں یہ سب ملی جلی ہیں، اسلام میں جہاں قانون ہے اسلام میں وہیں اخلاق ہے، جہاں قانونی تعلیمات دی گئی ہیں، وہیں اخلاق بھی سکھائے گئے ہیں، ظاہر ہے جہاں خواتین کو صرف حقوق معلوم ہو جائیں اور ذمہ داریاں اور اخلاق معلوم نہ ہوں، یہ بھی ایک نیا مسئلہ پیدا ہوگا۔ مشرق اور مغرب میں یہی فرق ہے۔ اسلام لاشرقیۃ، لاغربیۃ کا نعرہ دیتا ہے مغرب نے خواتین کو بے حد آزادی دی ہے، اور مشرق نے عورتوں کو قید وبند کی صعوبت دی اور حقوق سے محروم کیا، اسلام یہ کہتا ہے کہ عورت کو آزادی ملے صرف اللہ کی غلامی ہو، کسی فرد کی، کسی شخص کی، کسی سماج کی، کسی رسم ورواج کی غلامی نہ ہو، یہ جو اسلام کا تصور ہے کہ کسی کی غلامی نہیں اللہ کی دی ہوئی ہدایت کی پابند ہو تو آزادی ہی آزادی عورتوں کو ہے، صرف اللہ کی دی ہوئی ہدایت کی پابندی کرنا ہے، تو یہ جو اسلامی نظام ہے اس زمین کے اوپر، انسانوں کے لیے سب سے بڑی رحمت ہے، اس کو چھوڑ دینا ہمارا نقصان ہے اور دنیا اس سے محرومی کے نتیجے میں بڑی مصیبت میں گرفتار ہے تو ہم کو ایک داعی امت کی

---

[1] امیر جماعت اسلامی آندھرا پردیش

حیثیت سے نہ صرف اپنے خاندان کو سنوارنا ہے، بلکہ انسانی زندگی کے گیسو سنوارنا ہماری ذمہ داری ہے، ہم سب مل کر ایک ایسا معاشرہ ایک ایسا ماحول جنم دیں، جس میں عدل ہو، انصاف ہو، مہر و محبت ہو، اجتماعی تکافل ہو۔

☆☆☆

افتتاحی خطاب

جناب حیدر محی الدین غوری صاحب[1]

معاشی سبقت اور مادہ پرستانہ دور میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لیے آدمی جو کوشش کر رہا ہے، اس کے حدود سے تجاوز کر کے خواتین کو بھی اس پیشے میں یا اس میں گھسیٹ لایا ہے دراصل اس کے لیے مرد حضرات ہی ذمہ دار ہیں، ظاہر ہے اس کی وجہ سے خاندانی نظام منتشر ہو رہا ہے، کیونکہ وہ اپنے خاندان کہ جو دینی ذمہ داریاں ہیں اس کو پوری طرح سے انجام دینے میں کوتاہی کرتے ہیں، دراصل میں نے یورپ میں کچھ عرصہ گزارا ہے اور وہاں کے حالات کا تجزیہ کیا ہے کہ واقعی مرد عورت پر بھروسہ نہیں کر سکتے، اور عورت مرد پر یقین نہیں کر سکتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کے نظام میں ٹیکسیس اور انشورنس جیسی چیزوں کا اتنا بوجھ ڈال دیا جاتا ہے کہ اس کی بھرپائی کرنے کے لیے لامحالہ اس نظام کو اپنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ زندگی گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہے، تو اس وجہ سے ڈاکٹری کارروائی اور علاج کے لئے انشورنس کرانا پڑتا ہے، اگر مکان کے سامنے برف گر جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ وہاں پر صاف کیا جائے، اگر کوئی شخص وہاں پر پھسل کر گر گیا تو انشورنس مطالبہ کرے گا، وہاں باز پرس ہوتی ہے کہ آپ وہاں کا انشورنس کیوں نہیں کرائے تو ہر چیز پر انشورنس تو اس صورت میں اللہ کی ذات پر یقین کم اور اسباب پر یقین زیادہ ہو جاتا ہے، ایسے بہت سے حالات ہیں، یہ چیزیں ایسی ہیں کہ معاشی نظام کے بگڑنے میں اس کا بڑا دخل ہے، ہم مادہ پرستانہ دور میں اس سے زیادہ تجاوز نہ کریں کہ اللہ کی ذات پر یقین کم ہو جائے بلکہ ہمیں قرآن کے احکامات کے مطابق زندگی گزارنی چاہئے یہ مکمل ایک دستور حیات ہے، مغربی ممالک اور کئی سرمایہ دارانہ نظام والے ممالک کسی نہ کسی طریقے سے معاشرہ کی خرابی، جو بالکل بگڑی ہوئی ہے، اس کو ہمارے تک پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں، اگر ہم اس کا سد باب کریں اور کسی طریقہ سے ہم اس سے محفوظ رہیں تو اس کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغامات واحکامات سے واقف ہوں۔

☆☆☆

---

[1] قرآن فاؤنڈیشن

کلیدی خطبہ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على رسوله الكريم، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين

صدر عالی قدر، بزرگان محترم، بھائیو اور بہنو! اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے، اسے بہترین تخلیقی ڈھانچہ سے نوازا ہے: {لَقَدْ خَلَقْنَا الإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ} (التین: ۴) اس انسانیت کو شرافت و کرامت سے نوازا ہے: {وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ} (الاسراء: ۷۰)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کی توقیر و تکریم کا اوج کمال یہ ہے کہ اسے فرشتوں سے سجدہ کرایا گیا اور شیطان کو صرف اسی لئے عالم بالا سے اتار پھینکا گیا کہ اس نے انسان کو حقیر سمجھ کر سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور اللہ کے حکم سے سرتابی کی راہ اختیار کی، (البقرۃ: ۳۴، الاعراف: ۱۱، الاسراء: ۶۱، الکہف: ۵۰، طہٰ: ۱۱۶)

اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان پر یہ احسان بھی کیا ہے کہ اس کو قوت تسخیر سے نوازا گیا ہے، وہ سمندر کی تہوں کو ٹٹول رہا ہے، وہ حد نظر سے دور سیاروں پر اپنی کمندیں پھینک رہا ہے، وہ ہوا کے دوش اور سمندر کی متلاطم موجوں کی پشت پر سوار ہو کر ہزاروں میل کا سفر طے کرتا ہے، ہر صبح جب طلوع ہوتی ہے تو کائنات کی چھپی ہوئی حقیقتوں کے انکشافات اور نئے نئے آلات کے اختراع میں انسان کی فتح مندی کا مژدہ سناتی ہے؛ لیکن جہاں اس کی عقل و دانش کی سحر طرازیوں کے آگے کائنات دم بخود ہے، وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ جسمانی اعتبار سے بے حد کمزور، نحیف اور محتاج و ضرورت مند ہے، دنیا میں جتنے جاندار ہیں، وہ بمقابلہ انسان کے نومولود کے جلد اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے ہیں، بعض جانور چند گھنٹوں میں چلنے پھرنے لگتے ہیں اور اپنی غذائی ضرورت خود پوری کر لیتے ہیں، بعض چند دنوں میں اور بعض چند مہینوں میں؛ لیکن انسان کو صرف آنکھ کھولنے میں کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں، مہینوں میں وہ بولنا شروع کرتا ہے اور سالوں میں چلنا پھرنا، بلوغ و شباب کی منزل کو پہونچنے میں اسے پندرہ سولہ سال لگ جاتے ہیں، پھر شعور کی پختگی، جذبات میں اعتدال، فکر میں گہرائی وغیرہ کے لئے بھی سالہا سال مطلوب ہوتے ہیں؛ اس لئے وہ طویل عرصہ تک اپنے والدین کا، بزرگوں اور دوستوں کا، اساتذہ اور مربیوں کا بہتر مشورہ دینے والے اور بہی خواہی کا جذبہ رکھنے والے رہنماؤں کا محتاج ہوتا ہے۔

اسی لئے انسان کو سب سے زیادہ خاندان کی ضرورت پڑتی ہے، اگر ماں باپ کا سایہ اس کے سر سے اٹھ جائے تو وہ ایک خزاں رسیدہ درخت کی طرح اپنے آپ کو بے سایہ اور بے سہارا محسوس کرتا ہے، اگر وہ بھائی بہن سے محروم ہے تب بھی اسے اپنی تنہائی کا احساس ہوتا ہے، اگر کچھ اور بزرگ رشتہ دار ۔ دادا، دادی اور نانا، نانی...... نہ ہوں تو وہ غیر معمولی خلا محسوس کرتا ہے، اگر چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ سے محروم ہو تو اسے لگتا ہے کہ جیسے اس کے اردگرد اپنے خاندان کا حفاظتی حصار موجود نہیں ہے، پھر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد جب تک شریک حیات کا ساتھ حاصل نہ ہو جائے، اس کی زندگی بے سکون اور ناآسودہ ہوتی ہے، اب آگے خود اس کے گھر میں پھول کھلتے ہیں اور وہ صاحب اولاد ہوتا ہے تو اس سے غیر معمولی نفسیاتی مسرت اسے حاصل ہوتی ہے اور بیٹوں اور بیٹیوں کے بغیر اسے اپنی تگ و دو اور جد و جہد بے معنی اور بے مقصد نظر آتی ہے، پھر سسرالی خاندان کے ذریعہ وہ اپنے آپ میں مزید توانائی محسوس کرتا ہے، غرض کہ انسان کی فطرت چاہتی ہے کہ وہ ایک خاندان کا حصہ بن کر رہے۔

خاندان کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ اس کے لئے حفاظتی حصار ہوتا ہے، اگر کوئی شخص اس پر زیادتی کرے تو انسان یہ سمجھ کر اپنا دفاع کرتا ہے کہ اس کی پشت پر اس کا پورا خاندان ہے اور خود زیادتی کرنے والے کو بھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ہمیں تنہا ایک شخص کا نہیں؛ بلکہ پورے خاندان کا مقابلہ کرنا ہوگا؛ اسی لئے شریعت نے قتل کی دیت (خون بہا) قاتل کے قریب ترین رشتہ داروں کے ذمہ رکھی ہے، جس کو ''عاقلہ'' کہا جاتا ہے؛ تاکہ ایک طرف قاتل پر عائد ہونے والی اس بڑی مالی سزا کو رشتہ داروں پر تقسیم کر دیا جائے اور وہ اس کے لئے قابل برداشت ہو سکے، دوسری طرف جو اعزہ و اقارب ہیں، وہ بھی محسوس کریں کہ اپنے خاندان کے ایک فرد کو جرم سے باز رکھنے کے لئے بھی ذمہ دار ہیں، ورنہ جرمانہ میں ہمیں بھی شریک ہونا پڑے گا، اسلام سے پہلے عربوں میں یہ خاندانی نظام ہی تھا، جس کے ذریعہ لوگوں کا تحفظ ہوتا تھا، اور آج بھی قبائلی علاقوں میں یہی نظام لوگوں کی جان و مال کا محافظ ہے۔

خاندان کا دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے کمزوروں، غریبوں، معذوروں، بوڑھوں، یتیموں، بیواؤں اور خواتین کی کفالت کا سامان ہوتا ہے؛ کیوں کہ ہر شخص اپنے خاندان کے مجبور و نادار لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے، والدین پر اولاد کی اور اولاد پر والدین کی، شوہر و بیوی، بھائیوں، بہنوں کی ایک دوسرے پر، اسی طرح خاندان کے نادار اور بے سہارا لوگوں کی خاندان کے مرفہ الحال لوگوں کو ذمہ داری سونپی جاتی ہے، اسلام میں نفقہ، کفالت اور میراث کے پورے قانون کی اساس یہی ہے کہ انسان پر صرف اسی کی ذمہ داری نہیں ہے؛ بلکہ وہ خاندان کا ایک حصہ ہے، وہ ایک کل کا جزو اور ایک عمارت کی اینٹ ہے، اس کے لئے درست نہیں ہے کہ وہ دوسروں سے بالکل بے تعلق ہو جائے۔

خاندان کا تیسرا اہم مقصد خوشی اور مسرت کو دوبالا کرنا اور مصائب و آلام کو تقسیم کرنا اور ہلکا کرنا ہے، کتنی بھی خوشی کی بات ہو جائے، اگر اس خوشی میں ماں باپ کی شرکت نہ ہو تو یہ خوشی ادھوری، ناتمام اور بے کیف معلوم ہوتی ہے، اسی طرح اگر انسان پر کوئی مصیبت آئے، اس کے درد پر آنسو بہانے والی کوئی آنکھ نہ ہو، اس کے غم کو بانٹنے والا کوئی دل نہ ہو اور اس کی تسلی و دلداری کرنے والی کوئی زبان نہ ہو تو رائی برابر مصیبت پہاڑ کی طرح معلوم ہوتی ہے، یہ انسانی فطرت ہے اور انسان کی نفسیات کا لازمی حصہ ہے، خاندان کی شرکت خوشی کو دوبالا اور غم کے احساس کو ہلکا کرتی ہے۔

اسی لئے قرآن مجید نے خاندان کے وجود کو اللہ تعالیٰ کے احسان میں شمار کیا ہے، بنیادی طور پر انسان تین خاندانوں کے درمیان ہوتا ہے، دادیہال، نانیہال اور سسرال، دادیہال اور نانیہال ماں باپ کی طرف سے اور سسرال شوہر و بیوی کی طرف سے، قرآن نے پہلے دونوں خاندان کو ''نسب'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور تیسرے خاندان کو ''صہر'' کے لفظ سے: {وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَّصِهْرًا وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا} (الفرقان: ۵۴) اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خاندانی نظام انسانی سماج کے لئے اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اس میں انسان کا تحفظ ہے، اس میں اس کی کفالت کا انتظام ہے اور اس میں قلبی اور روحانی سکون کا سامان ہے؛ لیکن اسلام کا قانون میراث اور قانون نفقہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ خاندانی نظام میں اتنا پھیلاؤ بھی نہ ہونا چاہئے کہ انسان کے لئے اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہو جائے اور ہر انسان کے اندر خلوت پسندی اور دوسروں کی مداخلت سے تحفظ کا جو جذبہ رکھا گیا ہے وہ بھی مجروح نہ ہونے پائے؛ کیوں کہ اگر خاندان کی وسعت غیر محدود ہو جائے تو انسان گھر میں رہتے ہوئے اپنے آپ کو بازار میں محسوس کرتا ہے اور مزاج کا اختلاف دوریاں پیدا کرنے کا اور ایک دوسرے سے اکتاہٹ کا سبب بن جاتا ہے؛ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ اسلام میں خاندانی نظام کی بڑی اہمیت ہے؛ لیکن اس کے دائرہ کو اس حد تک محدود کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان بے سکونی محسوس نہ کرے۔

خاندانی نظام کی بنیاد شریعت اسلامی میں عدل و احسان پر ہے، عدل یہ ہے کہ جو آپ کے کام آتا ہے اور جتنا کام آتا ہے، آپ بھی اس کے کام آئیں اور اسی قدر آئیں؛ اسی لئے شریعت نے نفقہ کی ذمہ داری، حصۂ میراث کے تناسب سے رکھی ہے، اعزہ و اقارب کا نفقہ ان رشتہ داروں پر واجب ہوتا ہے، جو امکانی طور پر اس کے وارث ہونے کے اہل ہیں اور اتنی ہی مقدار میں واجب ہوگا، جتنا اس کا حق میراث ہوتا ہے...... احسان یہ ہے کہ جو آپ کے کام نہ آئے آپ اس کے کام آئیں، یعنی ایثار اور بے غرضی پر مبنی تعلق، اسی لئے جن لوگوں کا نفقہ کسی شخص پر واجب ہوتا ہے، وہ اس پر قرض نہیں ہوتا؛ بلکہ تبرع ہوتا ہے، یہ سمجھ کر رشتہ داروں کی خدمت کی جاتی ہے کہ ان کے لئے کھونا بھی پانا ہے؛ اس لئے اسلام میں خاندانی نظام کی بنیاد عدل و احسان یا انصاف و ایثار پر ہے۔

حضرات! خاندان کی تشکیل میں خواتین کا کردار بنیادی اہمیت رکھتا ہے، عورت ایک طرف اپنے بچوں کو سمیٹ کر رکھتی ہے اور دوسری طرف اپنے رشتہ داروں اور اپنے شوہر کے رشتہ داروں سے اپنی اولاد کو جوڑتی ہے، ماں کی ممتا اور بیوی کی محبت کا نقش اسی وقت ادا ہو سکتا تھا، جبکہ وہ لطافت کا پیکر اور سراپا لطف و محبت ہو، لطافت کے لئے جسمانی نزاکت بھی ضروری ہے اور لطف و محبت کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اندر جذبات کا عنصر زیادہ ہو اور اس کا دل درد و محبت سے معمور ہو، اس میں شبہ نہیں کہ یہ ایک غیر معمولی خوبی ہے؛ لیکن دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس سے انسان کی قوت فیصلہ متاثر ہوتی ہے اور اس میں ذکاوت حس پیدا ہو جاتی ہے؛ اس لئے اسلام میں خواتین کے حقوق پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے کہ مرد اس کی جسمانی کمزوری کا فائدہ نہ اٹھائے اور اس کے جذبات محبت کا استحصال نہ کرے، رسول اللہ نے اسی لئے عورتوں اور غلاموں کے حقوق پر سب سے زیادہ زور دیا ہے، اگر خواتین کو ان کے حقوق نہ دیئے گئے، انہیں برابر کی شریک حیات کا درجہ نہ دیا گیا، انہیں اپنی ضروریات کے لئے گھر سے باہر نکلنے پر مجبور کیا گیا اور فرائض مادری ادا کرنے میں رکاوٹ پیدا کی گئی تو یقینی طور پر خاندانی نظام بکھر کر رہ جائے گا

حضرات! مغرب میں اس وقت یہی صورت حال ہے، مغرب نے مادی مفادات، زیادہ سے زیادہ افرادی وسائل کے حصول اور تجارتی ترقی کے لئے خواتین کو گھر سے باہر نکالا، انہیں تشہیر تجارت کا ذریعہ بنایا اور انہیں اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اس ذمہ داری کو بھی ادا کریں، جو فطری طور پر ایک عورت ہی ادا کرسکتی ہے اور کسب معاش کی جدو جہد میں بھی مردوں کے ساتھ شریک ہوں، اپنا بوجھ آپ اٹھائیں اور اپنی ضرورتیں آپ پوری کریں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میاں بیوی کے تعلق میں جذباتیت اور وفاداری کم ہوگئی، طلاق کے واقعات بڑھ گئے، بغیر نکاح کے زندگی گذارنے کو بہتر سمجھا جانے لگا، بچے والدین کے لئے بوجھ ہوگئے، شرح پیدائش گھٹتی چلی گئی، زنا کی کثرت اور شناخت سے محروم بچوں کی بہتات ہوگئی، پُرسکون ازدواجی زندگی سے محرومی کی وجہ سے سکون حاصل کرنے کے لئے نشہ خواری زندگی کا حصہ بن گئی، والدین اور اولاد میں بھی محبت، وفاداری اور جذبہ خدمت باقی نہیں رہا اور خاندانی نظام پوری طرح بکھر کررہ گیا، خاندانی نظام کے بکھراؤ سے مغربی سماج کو جو نقصانات پہونچے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

- بوڑھے اور ضعیف لوگوں کے لئے زندگی گذارنا دوبھر ہوگیا، اب ان کے لئے دو ہی راستے رہ گئے، یا تو وہ اپنے گھر میں تنہائی اور بے چارگی کی زندگی گذاریں، انہیں ایک گلاس پانی دینے والا اور ایک نوالہ کھلانے والا بھی میسر نہ ہو، یا وہ سن رسیدہ اور معمر لوگوں کے لئے بنائے گئے ہاسٹل میں رہیں اور ان کے بچے سال میں ایک دفعہ آکر انہیں گلدستہ پیش کردیں اور بس، یہ ایسی زندگی ہے جس میں انسان کو موت زندگی سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔
- دوسرا نقصان عورتوں کا ہوا، عورتوں کی صحت میں فطری طور پر جلد انحطاط پیدا ہوتا ہے، ولادت اور فطری عوارض تیزی سے ان کی صحت کو متأثر کردیتے ہیں اور عمر گذرنے کے ساتھ ساتھ نہ صرف ان کی خوبصورتی کو گھن لگنے لگتا ہے؛ بلکہ ان کی قوت فکر اور قوت عمل بھی تیزی سے متأثر ہونے لگتی ہے، اب جس معاشرہ میں عورت صرف مرد کے لئے ہوس کا سامان ہو، اس میں ایک ایسی عورت کی کیا قیمت ہوسکتی ہے، جس کا حسن و جمال ڈھل چکا ہو؛ اسی لئے مغربی سماج میں عورتیں اپنے آپ کو بہت پریشان محسوس کرتی ہیں اور غالباً اسی سبب سے مغربی ممالک میں خواتین بہ مقابلہ مردوں کے زیادہ اسلام قبول کرنے پر مائل ہیں۔
- تیسرے اس سے بچے متأثر ہوتے ہیں، جب زندگی میں ایک دوسرے سے جوڑ نہ ہو، زندگی کا مقصد صرف عیش و عشرت ہو تو وہاں انسان کے دادِ عیش دینے میں جو چیز بھی رکاوٹ بنتی ہو، وہ بوجھ بن جاتی ہے، بچے اس آزادی میں بھی خلل انداز ہوتے ہیں، وہ ماؤں کے لئے ملازمت میں رکاوٹ بنتے ہیں اور شوہر و بیوی کے درمیان تعلقات میں بے وفائی کی وجہ سے یہ اندیشہ بھی دامن گیر ہوتا ہے کہ اگر ہمارے راستے الگ ہوگئے تو ان بچوں کا بوجھ کون اٹھائے گا؟ اس لئے مغربی سماج اولاد سے راہ فرار اختیار کررہا ہے اور جو بچے پیدا ہوجاتے ہیں، انہیں دیکھ بھال کے لئے پرورش گاہوں کے حوالے کردیا جاتا ہے، باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا انہیں ہفتہ میں ایک دو دن ہی مل پاتی ہے، اس طرح بچوں پر غیر معمولی نفسیاتی اثر پڑتا ہے۔
- اس کا ایک بڑا نقصان اپنی شناخت سے محرومی ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں یہ بات رکھی ہے کہ وہ اپنی پہچان کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کے شہر کی، اس کے گھر کی، اس کے کاروبار کی اور اس کی اپنی پہچان ہو، سب سے زیادہ اس کو جو شناخت عزیز ہوتی ہے، وہ فطری شناخت ہے، یعنی ماں باپ اور خاندان سے اس کی نسبت، وہ اس کو اپنے لئے باعث افتخار سمجھتا ہے، جو لوگ اپنی شناخت سے محروم ہوتے ہیں، انہیں یہ محرومی ستاتی ہے، وہ نفسیاتی مریض ہوجاتے ہیں، یہاں تک کہ مجرمانہ حرکتوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں، خاندانی نظام کے بکھراؤ کی وجہ سے نکاح سے گریز، زنا کی کثرت اور اپنی شناخت سے محروم بچوں کی پیدائش مغربی ملکوں میں ایسے مجرموں کو پیدا کررہی ہیں۔
- انسان کو جو چیز سب سے زیادہ محبوب ہے، وہ ہے دل کا سکون، یہ سکون یا تو انسان کو تعلق مع اللہ سے ہوتا ہے، یا ایک انسان کو دوسرے انسان سے، بچوں کو اپنے ماں باپ کی گود میں جاکر جو سکون ملتا ہے، اس کی کسی بڑی سے بڑی نعمت سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی، نوجوان اولاد بوڑھے ماں باپ کے سر میں تیل لگائے اور پاؤں دبائے، اس سے والدین کو جو خوشی ہوتی ہے اور قلب و روح کو جو تسکین حاصل ہوتی ہے، وہ سونے چاندی کی پلنگ پر سلانے سے بھی حاصل نہیں ہوسکتی، شوہر و بیوی جیسے ایک دوسرے کے سکون کا ذریعہ ہیں، کوئی چیز اس کا متبادل نہیں بن سکتی، بھائی بہن کو ایک دوسرے کی محبت سے جس خوشی کا احساس ہوتا ہے، وہ کسی اور چیز سے نہیں ہوسکتا، جب خاندان بکھرتا ہے تو رشتوں کے آبگینے

ٹوٹ جاتے ہیں، جیسے برقی سے محروم بلب سے روشنی حاصل نہیں کی جاسکتی، اسی طرح ان بے روح رشتوں سے انسان کوسکون کی غذا حاصل نہیں ہو پاتی، یہی وجہ ہے کہ مغرب اور مغرب زدہ معاشرہ میں بے خوابی، ڈپریشن اور خودکشی کے واقعات تیزی سے بڑھتے جارہے ہیں؛ اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خاندانی نظام کا بقا انسان کے لئے بہت بڑی نعمت اور اس کا بکھر جانا بہت بڑی آزمائش ہے۔

حضرات! اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا ہندوستان کا ایک مؤقر ادارہ ہے، جس کے بنیادی مقاصد عصر حاضر میں پیدا ہونے والے شرعی مسائل کو علماء اور ارباب افتاء کی اجتماعی رائے سے حل کرنا، اہم علمی موضوعات پر تحقیق اور ریسرچ کا کام کرانا، دینی مدارس اور عصری دانشگاہوں کے نوجوان طلبہ کی فکری تربیت کرنا، علمی اور تحقیقی موضوعات پر لٹریچر مرتب کرنا، نیز دوسری زبانوں سے اردو میں اور اردو سے دوسری زبانوں میں اہم علمی وفقہی تحقیقات کو منتقل کرنا وغیرہ ہے، چنانچہ اب تک اس کے انیس انٹرنیشنل فقہی سیمینار منعقد ہو چکے ہیں، جن میں ڈیڑھ سو سے زیادہ جدید پیش آمدہ مسائل پر فیصلے کئے گئے، اکیڈمی کی تحقیقات اور مطبوعات سو سے زیادہ ہو چکی ہیں، جن میں ۴۵ جلدوں میں کویت سے شائع ہونے والی ''الموسوعۃ الفقہیۃ'' (فقہی انسائیکلو پیڈیا) اور تقریباً چالیس جلدوں میں فقہی سیمیناروں کے مقالات کا مجموعہ ہے، جو ''جدید فقہی تحقیقات'' کے نام سے شائع ہو رہا ہے اور اکیڈمی کا ایک اہم ترین مقصد عصر حاضر کے اہم فکری، تعلیمی، سماجی اور اقتصادی مسائل پر امت کی رہنمائی اور خواص امت کی فکر سازی بھی ہے، اس مقصد کے لئے سیمینار منعقد کئے جاتے ہیں اور ان میں اصحاب نظر کو اظہار خیال کی دعوت دی جاتی ہے، اس وقت جو سیمینار ہو رہا ہے، یہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

اس سیمینار میں، خاندانی نظام کے استحکام، مشترک اور جداگانہ خاندانی نظام کی خوبیوں اور خامیوں اور خواتین کے حقوق پر گفتگو ہوگی، خواتین کے حقوق سے مراد صرف بیویوں کے حقوق نہیں ہیں، جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے؛ بلکہ عورتوں کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے ان کے حقوق اس میں شامل ہیں، ماں، بیٹی، بیوی، بہن اور دوسری قریبی خاتون رشتہ دار، مطلقہ و بیوہ اور حقوق سے محروم معلقہ عورتیں، سبھوں کو ہمیں اس بحث کے دائرہ میں لانا چاہئے؛ کیوں کہ جیسے بیوی اور بہو کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے، موجودہ معاشرہ میں اس سے کم زیادتی ماں، ساس اور بہنوں کے ساتھ نہیں ہوتی، ان سب کے ساتھ انصاف ہونا چاہئے۔

حضرات! گلوبلائزیشن کی بنیاد پر صرف مغرب کے تجارتی سامان ہی کا مشرقی ملکوں میں ایکسپورٹ نہیں ہو رہا ہے؛ بلکہ مغربی افکار، مغربی تہذیب اور مغرب کا طرز زندگی بھی ہمارے سماج کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے، نوجوان لڑکوں اور خاص کر لڑکیوں میں خاندان سے بے تعلق ہو کر ایسی زندگی گذارنے کا مزاج پیدا ہو رہا ہے کہ جس میں انہیں نہ اپنے بڑوں کی خدمت کرنی پڑے اور نہ ان کا حکم ماننا پڑے، ماں باپ جن کے قدموں کے نیچے جنت رکھی گئی اور جن کو جنت کا دروازہ کہا گیا، وہ اولاد کے لئے بوجھ بنتے جارہے ہیں، خاندان کے بزرگوں کے تجربات پر مبنی مشغلوں کو دخل در معقولات تصور کیا جارہا ہے، رشتۂ نکاح میں وفاداری کے بندھن کمزور ہوتے جارہے ہیں، اولاد سے فرار کا جذبہ پروان چڑھ رہا ہے، خاندان کے مجبور لوگوں کی کفالت اور ان کی خدمت کی ذمہ داری لوگ اپنے آپ پر محسوس نہیں کرتے، غرض کہ ہمارا خاندانی نظام بھی شکست وریخت کے خطرہ سے دوچار ہے، اسی پس منظر میں آج یہ سیمینار منعقد کیا جارہا ہے۔

امید کہ یہ سیمینار ان مسائل کو واضح کرنے، اس سلسلہ میں غور وفکر کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے اور اس اہم موضوع پر لوگوں کی فکر کو بیدار کرنے میں مدد ومعاون ثابت ہوگا، یہ حقیر اکیڈمی اور المعہد العالی الاسلامی کی طرف سے تمام مقالہ نگاروں، اظہار خیال کرنے والوں، بحث میں حصہ لینے والے شرکاء، بھائیوں اور بہنوں کا شکر گذار ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح راہ دکھائے اور صحیح نتائج اخذ کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

وباللہ التوفیق وہو المستعان۔

خالد سیف اللہ رحمانی

(جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا وناظم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

۲۰ / ذوالحجہ ۱۴۳۱ھ م ۲۷ / نومبر ۲۰۱۰ء

تجاویز سمینار

''خاندانی نظام اور خواتین کے حقوق''

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے زیر اہتمام المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے تعاون سے مؤرخہ ۲۰-۲۱ ذو الحجہ ۱۴۳۱ھ مطابق ۲۷-۲۸ نومبر ۲۰۱۰ کو نہرو آڈیٹوریم، مدینہ ایجوکیشنل سنٹر حیدرآباد میں ''خاندانی نظام اور خواتین کے حقوق'' کے موضوع پر دو روزہ سمینار منعقد ہوا، سمینار میں خاندانی نظام کی اہمیت، خاندانی نظام کے بکھراؤ کے نقصانات، مشترک اور جداگانہ خاندانی نظام کے فوائد ونقصانات اور اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر، مسلم خواتین کی موجودہ صورتحال، ان کے مسائل کا حل، اور ان کے حقوق کا تحفظ، جیسے اہم موضوعات پر ملک کے ممتاز علماء اور دانشوروں نے اپنے خیالات پیش کئے، اور سنجیدہ مناقشے ہوئے، سمینار کے مقالات ومباحث کی روشنی میں باتفاق رائے درج ذیل تجاویز منظور کی گئیں:

۱- اسلام خاندانی نظام کی بقا کو بڑی اہمیت دیتا ہے؛ کیوں کہ اس سے خاندان کے مختلف افراد کا تحفظ، کمزور، معذور اور پسماندہ لوگوں کی کفالت اور اخلاقی قدروں کے بچاؤ میں مدد ملتی ہے، خاندانی نظام کا بکھراؤ سماج کے لئے نہایت گمبھیر اور پیچیدہ مسائل کو جنم دیتا ہے، خاص کر خواتین، بوڑھے ماں وباپ، مطلقہ عورتوں اور باپ کی شفقت، نیز ماں کی ممتا سے محروم بچوں کے لئے نہایت تکلیف دہ دشواریوں کا باعث ہے، مغربی تہذیب اس کا تلخ تجربہ کر رہی ہے؛ اس لئے مسلمانوں کو خصوصاً اور تمام ہندوستانیوں کو عموماً خاندانی نظام کو باقی رکھنے اور اس کو بکھراؤ سے بچانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

۲- حالات وضروریات کے اعتبار سے اسلام میں مشترکہ وجداگانہ دونوں طرح کے خاندانی نظام کی گنجائش ہے، اگر جداگانہ خاندانی نظام کی وجہ سے کسی کی حق تلفی نہ ہوتی ہو، خدمت کے محتاج بزرگ افراد خاندان کی ضرورت پوری ہوجاتی ہو تو جداگانہ نظام میں کوئی مضائقہ نہیں ہے؛ البتہ الگ الگ رہنے کے باوجود ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت ضروری ہے، اسی طرح بال بچوں کے ماں باپ سے الگ رہنے میں، مطلقہ وبیوہ بہنوں، یا غیر شادی شدہ یتیم بہنوں یا یتیم بھائیوں کو الگ کردینے میں ان کے حقوق کی ادائیگی دشوار ہو تو وہاں مشترک خاندانی نظام کو اختیار کرنا چاہئے؛ کیوں کہ اصحاب حق کے حقوق کو ادا کرنا شرعاً واجب ہے۔

۳- یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ ہمارے سماج میں دن بدن والدین کی عظمت کا احساس اور ان کی خدمت کا جذبہ مفقود ہوتا جارہا ہے، اور پڑھے لکھے لوگ بھی اس سلسلہ میں احکام شریعت کو نظر انداز کرتے جارہے ہیں، یہ نہایت غیر اخلاقی اور غیر اسلامی طرز فکر ہے، جو خود غرضی اور خدانا ترسی پر مبنی ہے؛ اس لئے سمینار نوجوانوں کو والدین خصوصاً بوڑھے والدین کے حقوق کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ وہ ان کو اپنے لئے خدا کی رحمت سمجھیں نہ کہ بوجھ۔

۴- اسلام میں بیوی کے حقوق کی بڑی اہمیت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوی کے ساتھ اچھے اخلاق اور برتاؤ کو کسی انسان کے بہتر ہونے کا معیار قرار دیا ہے، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستانی سماج میں بہت سی دفعہ بیوی کے ساتھ بڑی زیادتی روا رکھی جاتی ہے، ان کے جذبات اور ضروریات کا خیال نہیں رکھا جاتا، ان کی املاک پر زبردستی قبضہ کرلیا جاتا ہے، جسمانی اذیت پہونچائی جاتی ہے، ذہنی طور پر ٹارچر کیا جاتا ہے، یہ ساری باتیں اسلام، اخلاق اور انسانیت کے خلاف ہیں؛ اس لئے مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے گھر کو جنت نشان بنائیں، جس میں بیویوں اور بہوؤں کے ساتھ بہتر برتاؤ کیا جائے، اور شریعت کی حدود میں ان کی امنگوں اور آرزوؤں کا خیال رکھا جائے۔

۵- نکاح میں جہیز کا مطالبہ یا کسی اور پہلو سے لڑکی والوں کو زیر بار کرنا حرام وگناہ ہے، اور اس کی وجہ سے بڑے بڑے مفاسد پیدا ہوتے ہیں، اس لئے لڑکوں اور ان کے سرپرستوں کو چاہئے کہ اس سماجی لعنت سے اپنے آپ کو بچائیں، نیز اللہ کی شریعت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق تقریب نکاح کو انجام دینے کی کوشش کریں، اسی میں ہر مسلمان کی فلاح وکامیابی ہے۔

۶۔ تاخیر سے نکاح کرنا، نکاح کے لئے خوبصورت لڑکی، صاحب ثروت خاندان اور ملازمت پیشہ لڑکی پر اصرار کرنا اور دوسرے رشتوں کو نا قابل اعتناء سمجھنا ایک خطرناک رجحان اور شریعت کی روح کے مغائر سوچ ہے، اس کی وجہ سے لڑکیوں کی شادی میں غیر معمولی تاخیر ہورہی ہے خودکشی اور بعض دوسرے غیر اخلاقی واقعات بھی پیش آرہے ہیں؛ اس لئے نوجوانوں کو چاہئے کہ رشتوں کے لئے اخلاق اور دینداری کو معیار بنائیں کہ اسی میں ان کی بھلائی مضمر ہے اور اس طرح سماج کو بہت سی برائیوں سے بچایا جاسکتا ہے۔

۷۔ کسی معقول و معتبر سبب کے بغیر طلاق دینا یا عورت کی طرف سے خلع کا مطالبہ درست نہیں ہے اور عند اللہ اس میں سخت پکڑ ہے، میاں بیوی کے درمیان علیحدگی سے خاندان بکھر جاتا ہے، بچے باپ کی شفقت یا ماں کی ممتا سے محروم ہوجاتے ہیں اور ان کی بہتر تربیت نہیں ہو پاتی، اس لئے سبھوں کو مل کر ایسے واقعات کو روکنا چاہئے، شوہر و بیوی کے والدین اور ارکان خاندان کی بھی اس سلسلہ میں بڑی ذمہ داری ہے اور سماج کے بزرگ اور صاحب اثر حضرات کو بھی اس سلسلہ میں اپنا کردار ادا کرنا چاہئے اور شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے ایسے واقعات کو روکنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

۸۔ قرآن مجید میں سوتیلے بچوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "وربائبکم اللاتی فی حجورکم" یعنی (وہ سوتیلی بیٹیاں جو تمہاری پرورش میں ہیں) اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مرد یا عورت کو اپنی سوتیلی اولاد کی اس طرح پرورش کرنی چاہئے جیسی اپنی اولاد کی کی جاتی ہے۔ افسوس کہ ہمارے معاشرہ میں اکثر سوتیلی اولاد کے ساتھ نامناسب اور بعض اوقات انسانیت سوز سلوک کیا جاتا ہے۔ اس لئے مردوں اور خواتین کا فریضہ ہے کہ اگر سوتیلی اولاد کی پرورش ان کے حصہ میں آئے تو وہ ان کے ساتھ محبت کا سلوک کریں اور انہیں اپنی اولاد کا درجہ دیں۔

۹۔ یہ ایک بدبختانہ بات ہے کہ شادی کے بعد بہت سے نوجوان اپنے بھائیوں، بہنوں اور اپنے خاندان سے کٹ جاتے ہیں اور اپنے آپ کو ان سے متعلق ذمہ داریوں سے بے تعلق سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ نکاح پہلے رشتوں کو ختم نہیں کرتا، بلکہ ایک نئے رشتہ کو وجود میں لاتا ہے، اس لئے نوجوان کو حقوق کی ادائیگی میں توازن اور شریعت کی معتدل تعلیمات کے مطابق عمل کرنا چاہئے کہ وہ بیوی کی ضروریات پوری کرنے کے ساتھ۔ساتھ خاندان کے دوسرے لوگوں کی نسبت سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو بھی پوری کریں اور ان کے ساتھ حق تلفی نہ ہونے دیں۔

۱۰۔ سماج کی اصلاح میں اہم اور مؤثر رول مساجد کے ائمہ و خطباء کا ہے، موجودہ حالات میں یہ بات ضروری ہوگئی ہے کہ علماء جمعہ کے بیانات میں بھی اور دوسرے پروگراموں میں بھی سماجی مسائل کو اپنے خطبات کا موضوع بنائیں، اور مسلمانوں میں شعور کو بیدار کریں، اسی طرح مسلمانوں کے زیر انتظام تعلیمی اداروں میں طلبہ و طالبات کو خاندانی زندگی سے متعلق اسلامی تعلیمات اور حقوق و فرائض کے بارے میں آگاہ کیا جائے کہ یہی امت کا مستقبل ہیں۔

۱۱۔ تعلیم جیسے لڑکوں کے لئے مطلوب ہے، اسی طرح لڑکیوں کے لئے بھی اس کا دروازہ کھلا ہوا ہے، اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ رسمی اور رواجی چیزوں میں اپنے پیسے ضائع کرنے کے بجائے بچوں کی تعلیم پر توجہ دیں، اور لڑکیوں کی تعلیم کو بھی لڑکوں کی تعلیم ہی کی طرح اہمیت دیں، کیوں کہ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ ہندوستان میں تعلیم نسواں کے اعتبار سے مسلمان بہت پیچھے ہیں اور ان کی تعلیمی پسماندگی ضرب المثل بن چکی ہے۔

۱۲۔ تعلیم کا اصل مقصود بہتر کردار سازی ہے۔ موجودہ اخلاقی گراوٹ کے ماحول میں اس بات کی شدید ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ بچوں اور بچیوں کی تعلیم کے ساتھ اس بات کا پورا اہتمام کیا جائے کہ وہ اخلاق باختہ ماحول اور اخلاقی بگاڑ سے محفوظ رہیں اور انہیں اسلامی اخلاق اور اقدار و آداب کے اعلیٰ جواہر سے آراستہ کرنے پر توجہ دی جائے۔

۱۳۔ یہ سمینار اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا (دہلی)، المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد، مسلم خواتین کی مقامی تنظیموں اور مختلف موضوعات پر اپنے قیمتی خیالات سے مستفید کرنے والے مقالہ نگاروں کا شکریہ ادا کرتا ہے اور دعاء کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسلام کی تعلیمات پر قائم رکھے، جس میں ہماری دنیا کی بھی بھلائی ہے اور آخرت کی بھی، اور جس کے بغیر ہم قلبی سکون، باہمی محبت اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی و بہی خواہی کی نعمت سے ہمکنار نہیں ہو سکتے۔

☆☆☆

دوسرا باب خاندانی نظام اور خواتین کے حقوق

اسلام کا مطلوب خاندان قرآن وحدیث کی روشنی میں

ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی[1]

خاندان انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ اس کی تخلیق کچھ ایسی ذہنی ونفسیاتی ساخت پر ہوئی ہے کہ اس کی بہترین نشوونما خاندان کے اندر ہی ممکن ہے۔ اسی ماحول میں وہ بولنا سیکھتا ہے، کھانے پینے اور دیگر طبعی ضروریات پوری کرنے کے طریقے سیکھتا ہے۔ عادات واطوار اور اچھے کردار کے درس وہ یہیں لیتا ہے۔ اسی گہوارہ میں اس کی ذہنی اور نفسیاتی تشکیل ہوتی ہے۔ اور اسی سانچہ میں اس کی متوازن شخصیت ڈھلتی ہے۔ انسان کو حقیقی مسرت اور قلبی سکون خاندان کی گھنی چھاؤں میں ہی ملتا ہے۔ پس خاندان کا یہ سانچہ جتنا متوازن، مضبوط، خوبصورت اور بہترین ہوگا، انسانی شخصیت کی تعمیر وتشکیل اسی قدر بہتر ہوگی۔ اور انسان کی انفرادی شخصیت جتنی بہتر ومتوازن ہوگی، سماج اتنا ہی بہتر اور متوازن بنے گا۔

انسان کی تعمیر اور تربیت میں خاندان کے اسی بنیادی کردار کی وجہ سے اسلام نے ایک مضبوط اور مستحکم خاندان کی تیاری پر بہت زور دیا ہے۔ خاندان چونکہ کئی افراد سے مل کر بنتا ہے اور ایک ایسے درخت کی مانند رہتا ہے جس سے شاخ در شاخ نکلتی رہتی ہے، اس لئے اسلام نے خاندان کے اس درخت پر ہمہ جہت توجہ دی ہے۔ اس کی جڑوں کے استحکام سے لے کر تنے کی مضبوطی، شاخوں کے پھیلاؤ اور ان میں حسین تناسب کے ساتھ ہم آہنگی، ہر شاخ کی شادابی وسرسبزی اور درخت کی مسلسل سیرابی کا اس قدر خیال رکھا ہے، اور اس کے لئے حقوق وفرائض اور اصول وآداب مقرر کئے ہیں کہ ان سے زیادہ اہتمام، توازن اور استحکام کی امید نہیں کی جاسکتی ہے۔

سطور ذیل میں خاندان کے ان ہمہ جہت پہلوؤں کی بابت قرآن وحدیث کی ہدایات کا اسلامی خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

نسل انسانی کا تسلسل

خاندان چند انسانوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ ایک خاندان سے دوسرے کئی خاندان نکلتے ہیں۔ اس کائنات میں ہزاروں برسوں سے یہی انسانی ریت چلی آرہی ہے۔ اسلام حکم دیتا ہے کہ انسانی آبادی کا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے، اور نسل انسانی کی بقاء ہی دراصل اس کائنات کی تعمیر کا مقصد ہے۔ چنانچہ اللہ نے بتایا:

هو انشأكم من الارض واستعمركم فيها۔ (اسی نے تمہیں زمین سے بنایا اور تمہیں اس میں آباد کیا۔ (ھود:٦١)

اور فرمایا: "اذ قال ربك للملائكة اني جاعل في الارض خليفة" (اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔ (بقرہ:٣٠)

اور "هو الذي جعلكم خلائف في الارض" (وہی ہے جس نے زمین میں تمہیں قائم مقام بنایا۔ (فاطر:٣٩)

اللہ نے خبر دی ہے کہ: هو الذي خلق من الماء بشرا فجعله نسبا وصهرا۔ (الفرقان:٥٤)

اور "ومن آياته ان خلقكم من تراب ثم اذا انتم بشر تنتشرون" (اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہیں مٹی سے بنایا پھر تم انسان بن کر پھیل رہے ہو۔ (روم:٢٠)

---

[1] شعبہ اسلامیات، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

نکاح کا حکم اور اس کی پائیداری

نکاح خاندان کی پہلی اکائی ہے۔ اسلام نے عام حالات میں نکاح کو ضروری قرار دیا ہے۔ اور بے نکاحی زندگی کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔ چنانچہ قرآن میں کہا گیا: فانکحوا ما طاب لکم من النساء (تو جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان سے نکاح کرلو۔ (نساء: ۳)

نکاح نبیوں کی سنت رہی ہے، پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ نے فرمایا: النکاح من سنتی (نکاح کرنا میرا طریقہ ہے)۔

آپ ﷺ نے فرمایا: یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجاء (اے نوجوان گروہ! تم میں سے جو نکاح کا خرچ اٹھا سکتا ہو وہ شادی کرلے، اس کی وجہ سے نگاہ نیچی رہتی ہے اور شرمگاہ کی خوب حفاظت ہوتی ہے، اور جو اس کی حیثیت نہ رکھتا ہو وہ روزہ سے مدد لے، کہ اس سے شہوانی قوت ٹوٹتی ہے۔ (متفق علیہ)

رسول خدا ﷺ نے خود نکاح فرمائے، اور صحابہ کرام ؓ کو اس کا حکم دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تناکحوا تناسلوا فانی مکاثر بکم الامم (نکاح کرو اور نسل انسانی بڑھاؤ، میری امت تمہارے ذریعہ دوسری امتوں سے زیادہ ہوگی)

ایک صحابی حضرت عکاف بن وداعہ ہلالی ؓ سے فرمایا: ''اے عکاف! کیا تمہاری بیوی ہے؟ انھوں نے کہا: نہیں، پوچھا! کوئی باندی ہے؟ کہا: وہ بھی نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: اور تم صحت مند اور خوشحال ہو؟ کہا: ہاں، الحمد للہ، آپ ﷺ نے فرمایا: تب تم شیطان کے بھائی ہو، یا تو تم نصرانی راہبوں کی طرح کر رہے ہو تو تم ان ہی میں سے ہو، یا پھر تم ہم میں سے ہو تو جیسا ہم کرتے ہیں ویسا کرو، ہمارا طریقہ نکاح کرنا ہے۔ تم میں جو بے نکاح لوگ ہیں وہ سب سے خراب لوگ ہیں اور جو بے نکاح مرتے ہیں وہ سب سے رذیل ہوتے ہیں۔ ہائے عکاف! نکاح کرلو، انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ جس سے میرا نکاح کردیں، میں کرلوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں اللہ کے نام اور اس کی برکت پر تمہارا نکاح کلثوم حمیری کی بیٹی کریمہ سے کرتا ہوں''۔

اس نکاح کے رشتہ کو قرآن نے مضبوط بندھن کا نام دیا ہے، ارشاد ہے: ''واخذن منکم میثاقا غلیظا'' (اور وہ عورتیں تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں۔ (نساء: ۲۱)

پس اس رشتہ کو بہت مستحکم اور بندھن کو مضبوط ہونا چاہئے۔ اس کے لئے قرآن اور حدیث کے اندر کئی احکام دئے گئے اور مختلف مواقع کے لئے ہدایات اور تدابیر بتائی گئی ہیں۔ ان کو اختیار کرنے سے رشتہ نکاح میں پائیداری آتی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ رشتہ کے انتخاب کے لئے ایسی چیز کو معیار بنایا جائے جو مستحکم اور پائیدار ہو۔

عموماً لوگ چار چیزوں کے پیش نظر رشتہ کا انتخاب کرتے ہیں: مال و دولت، حسب و نسب، حسن و جمال اور دینداری و اخلاق۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مال و دولت آنی جانی چیز ہے، آج کا مالدار کل دست نگر ہو جاتا ہے اور آج کا غریب کل ترقیوں کے بام عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ یہ تماشہ دنیا میں روز جاری ہے۔ پس دولت پائیدار معیار نہیں ہے۔ بلکہ اگر اولاد نکمی ہو تو باپ دادا کی دولت برباد ہوتے دیر نہیں لگتی ہے۔ حسب و نسب کو لیجئے، تو یہ جھوٹی شہرت اور جھوٹے غرور کے سوا کچھ نہیں۔ کسی کا نسب کسی کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہونچاتا۔ اگر دوسری خوبیاں نہیں ہیں تو محض نسب اور برادری کوئی ضرورت پوری نہیں کرسکتی ہے۔ اور جھوٹی عزت اللہ کے یہاں کچھ بھی فائدہ نہ دے گی۔ حسن و جمال سب سے زیادہ وقتی شئ ہے۔ ہر گذرتے دن کے ساتھ حسن ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ اور عین اس وقت جب ایک انسان کو دوسرے انسان کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے، یہ حسن جھریوں میں تبدیل ہو چکا ہوتا ہے، اس وقت حسن نہیں کردار و جذبہ کام دیتا ہے۔

آخری شئ دینداری اور اخلاق ہے۔ یہ ایسی معنوی دولت ہے جسے کوئی چرا نہیں سکتا اور نہ چھین سکتا ہے۔ یہ سرمایہ کبھی ضائع نہیں جاتا، یہ خوبی ہر دل کو موہ لیتی اور ہر غم کو ہلکا کردیتی ہے۔ اخلاق و کردار بیمار کے لئے نصف شفاء، غریب کے لئے قناعت، مصیبت میں صبر و تسلی، اور خوشی و پریشانی ہر موقع پر رفیق دیرینہ ہے۔ پس دینداری اور اخلاق ہی پائیدار معیار اور مضبوط بنیاد ہے۔ اگر یہ خوبی موجود ہے تو اس کے ساتھ دوسری خوبیاں سونے پر سہاگہ ہیں۔ اسی لئے رشتہ کے انتخاب کا اصل معیار دینداری کو بنانا چاہئے۔ یہ بات رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمائی ہے۔ حدیث کے الفاظ

ہیں: "تنکح المراۃ لاربع: لمالها، ولحسبها، ولجمالها، ولدينها، فاظفر بذات الدين تربت يداك". (متفق علیہ)

آپ ﷺ نے اس سلسلہ میں ہدایت دی کہ: "اذا خطب اليكم من ترضون دينه وخلقه فزوجوه ان لا تفعلوه تكن فتنة فى الارض وفساد كبير عريض" (جب تمہارے پاس ایسا رشتہ آئے جس کا دین اور اخلاق پسندیدہ ہو تو اس سے رشتہ کردو، اگر ایسا نہیں کروگے تو زمین پر فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائے گا۔ (ترمذی)

اخلاق و دینداری کو معیار بنا کر جب رشتہ کی بات شروع ہوگی تو شرعی طور پر اس بات کی اجازت اور ترغیب ہے کہ ہونے والے شوہر و بیوی ایک دوسرے کو دیکھ لیں، کہ اس سے رشتہ نکاح میں پائیداری کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ ایک صحابی حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اذا خطب احدكم المراۃ فان استطاع ان ينظر الى ما يدعوه الى نكاحها فليفعل" (ابوداؤد) (جب تم میں سے کوئی شخص کسی خاتون کو نکاح کا پیغام دے تو اگر ہو سکے کہ وہ کوئی ایسی چیز دیکھ لے جو اس کے ساتھ نکاح پر آمادہ کرے، تو وہ ایسا کرلے)۔

دوسرے موقع پر آپ ﷺ نے باضابطہ ایک صحابی حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے فرمایا کہ: "جاؤ اس عورت کو دیکھ لو جس سے نکاح کرنے جارہے ہو۔ اس سے رشتہ میں پائیداری کا زیادہ امکان ہے"۔ (ترمذی، کتاب النکاح)

رشتہ میں پائیداری کے لئے دوسرا حکم یہ دیا گیا کہ رشتہ نکاح کے بعد زوجین ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک، محبت اور ایثار کا رویہ رکھیں، ایک دوسرے کا احترام کریں، اور ایسی باتوں سے گریز کریں جن کی وجہ سے باہمی اعتماد کو ٹھیس لگتی ہے، یا تعلقات میں بال پڑتا ہے۔ قرآن نے حکم دیا ہے: "وعاشروهن بالمعروف" (اور ان کے ساتھ اچھی طرح سے زندگی بسر کرو۔ (نساء:۱۹)

قرآن نے مردوں سے کہا کہ اس اللہ کے حکم کا ہمیشہ پاس ولحاظ رکھو جس کے نام پر یہ رشتہ تم نے حلال کیا ہے: "واتقوا الله الذى تساءلون به والارحام" (اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور رشتہ داری کے تعلقات کو بگاڑنے سے بچو۔ (نساء:۱)

رسول اللہ ﷺ نے مردوں کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا: "الا واستوصوا بالنساء خيرا فانما هن عوان عندكم" (دیکھو، عورتوں کے ساتھ اچھے برتاؤ کی نصیحت قبول کرو، وہ تمہارے ہاتھوں میں اسیر ہیں۔ (ترمذی، کتاب الرضاع)

حجۃ الوداع یعنی اپنے آخری حج کے موقع پر بھی، جب امت سے رخصت ہو رہے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: "اتقوا الله فى النساء" (عورتوں کے حق میں اللہ کا خوف رکھو)۔

رشتہ میں پائیداری کے لئے صرف انہی نصیحتوں پر اکتفاء نہیں کیا گیا، بلکہ مرد اور عورت دونوں کے حقوق اور فرائض طے کئے گئے، تاکہ دونوں ان کے پابند رہیں۔ چنانچہ حکم دیا گیا کہ عورت کے تمام تر اخراجات کی ذمہ داری مرد کے کاندھے پر ہے۔ حضرت حکیم بن معاویہؓ کہتے ہیں کہ: "قلت يا رسول الله ما حق زوجة احدنا عليه قال ان تطعمها اذا طعمت وتكسوها اذا اكتسيت ولا تضرب الوجه ولا تقبح ولا تهجر الا فى البيت" (میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! ہماری بیوی کا ہم پر کیا حق ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم کھاؤ تو اسے کھلاؤ، جب پہنو تو اسے پہناؤ، چہرہ پر نہ مارو اور بھلا مت کہو، اور اگر ناراضی میں تنہا چھوڑو تو صرف گھر کے اندر)

اور عورت کی ذمہ داری بتائی گئی کہ: "وہ ہر جائز بات میں شوہر کی اطاعت کرے اور اس کے گھر اور سامانوں کی حفاظت کرے"۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ: "اى النساء خير، قال: التى تسره اذا نظر وتطيعه اذا امر ولا تخالفه فى نفسها ولا مالها بما يكره" (کیسی خاتون سب سے اچھی ہے، فرمایا: وہ کہ شوہر اگر اسے دیکھے تو خوش ہو جائے، کوئی حکم دے تو وہ بجالائے اور اپنی ذات اور مال میں شوہر کی ایسی مخالفت نہ کرے جو اسے ناپسند ہو۔ (نسائی)

بیوی کی نظر میں شوہر کے مقام کی وضاحت کرتے ہوئے آپ ﷺ نے مزید فرمایا: "لو كنت آمر لاحد ان يسجد لاحد لامرت المراۃ ان تسجد لزوجها" (اگر میں کسی کو حکم دیتا کہ وہ کسی کو سجدہ کرے تو بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔ (ترمذی، کتاب النکاح)

ازدواجی رشتہ میں محبت و پائیداری اور باہمی تعلقات کی پختگی کی اہمیت کو نمایاں کرنے کیلئے رسول اللہ ﷺ نے بڑی اہمیت سے بتایا کہ

انسان کی فضیلت اور اخلاق مندی کا معیار یہ ہے کہ وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہو۔ ارشاد فرمایا: "خیر کم خیر کم لاهله وانا خیر کم لاهلی" (تم میں سب سے اچھا انسان وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لئے سب سے اچھا ہو، اور میں اپنے گھر والوں کے لئے تم میں سب سے اچھا ہوں۔ (ترمذی)

اور مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: "اکمل المؤمنین ایمانا احسنهم خلقا وخیارکم خیارکم لنسائهم" (سب سے مکمل ایمان والے وہ لوگ ہیں جو سب سے اچھے اخلاق والے ہیں اور تم میں سب سے اچھے لوگ وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے لئے سب سے اچھے ہیں۔ (ترمذی)

اس رشتہ کی پائیداری میں ذہنی سوچ اور انسانی نفسیات کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس پہلو کا بھی بڑا خیال رکھا، اور ایسی باتوں کی جانب توجہ دلائی جن کا خیال رکھنے سے انسان ذہنی طور پر اس رشتہ میں پائیداری کے لئے آمادہ ہوجاتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "لا یفرك مؤمن مؤمنة ان کره منها خلقا رضی منها آخر" (کوئی مومن کسی مومنہ سے نفرت نہ کرے، اگر وہ عورت کی ایک بات کو ناپسند کرے گا تو دوسری بات کو پسند بھی کرے گا۔ (مسلم)

اور یہی بات قرآن نے یوں کہی ہے: "فان کرهتموهن فعسی ان تکرهوا شیئا ویجعل الله فیه خیرا کثیرا" (اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ممکن ہے کہ تمہیں ایک چیز پسند نہ آئے مگر اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھی ہو۔ (نساء:۱۹)

آپ نے فرمایا: "النساء شقائق الرجال" (عورتیں مردوں کی ہم رتبہ ہیں۔ (ابوداؤد، کتاب الطہارہ)

نیز فرمایا: "الدنیا کلها متاع وخیر متاع الدنیا المراة الصالحة" (دنیا پوری متاع ہے، اور دنیا کی سب سے بہتر متاع صالح خاتون ہے)۔

آپ نے یہ بھی فرمایا: "ما استفاد المؤمن بعد تقوی الله خیرا له من زوجة صالحة ان امرها اطاعته وان نظر الیها سرته وان اقسم علیها ابرته وان غاب عنها نصحته فی نفسها وماله" (مومن کو تقوی الہی کے بعد اچھی بیوی سے بہتر کوئی فائدہ کی چیز نہیں ملی، جو شوہر کی بات مانے، وہ بیوی کو دیکھے تو خوش ہوجائے، اس پر قسم کھالے تو پوری کردے، اور موجود نہ ہو تو اپنی ذات اور شوہر کے مال میں خیر خواہ بنی رہے۔ (ابن ماجہ)

باہمی تعلق ومحبت، ایک دوسرے کا خیال واحترام اور نازک جذبات کی رعایت کی بابت صرف زبانی گفتگو پر اکتفاء نہیں کیا گیا، بلکہ خود رسول اکرم ﷺ نے اس سلسلہ میں اپنی پاکیزہ زندگی کے عمدہ نمونے پیش فرمائے۔ آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہؓ بتاتی ہیں کہ آپ جب گھر میں ہوتے تو ایک عام آدمی کی طرح ہوتے، اور گھر کے کام خود اپنے ہاتھوں سے انجام دے لیا کرتے۔ حدیث کے الفاظ ہیں: "کان رسول الله یخصف نعله ویخیط ثوبه ویعمل فی بیته وکان بشرا من البشر یفلی ثوبه ویحلب شاته ویخدم نفسه" (رسول اللہ ﷺ اپنی چپل ٹھیک کرلیتے، اپنے کپڑے سل لیتے، اور اپنے گھر کا کام کرتے، آپ ﷺ انسانوں میں سے ایک انسان تھے، اپنے کپڑے کی صفائی کرلیتے، اپنی بکری دوہ لیتے، اور اپنا کام خود کرلیتے۔ (ترمذی)

حضرت خدیجہ کبریٰؓ آپ کی پہلی زوجہ تھیں، ان سے محبت اور تعلق کی یاد ان کی وفات کے بعد بھی ہمیشہ تازہ رکھتے۔ ان کی بہن حضرت ہالہ بنت خویلدؓ آتیں تو آپ ﷺ کو اپنی زوجہ یاد آجاتیں اور آپ انھیں احترام سے بٹھاتے اور نوازش فرماتے۔ اپنے گھر میں آپ حضرت خدیجہؓ کی خوبیاں بیان کرتے اور کہتے کہ وہ ایسی تھیں اور ایسی تھیں۔ اپنی زوجہ حضرت عائشہؓ، جن کی عمر کم تھی، ان کی دلجوئی فرمایا کرتے، اور موقع فراہم کرتے کہ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ گڑیوں کا کھیل کھیلیں۔ سیرت نگاران لکھتے ہیں: "کان یسرب الی بنات الانصار یلعبن معها" (آپ خود ہی انصار کی بچیوں کو حضرت عائشہؓ کے پاس بھیج دیتے کہ وہ ان کے ساتھ کھیلیں (زاد المعاد)۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ اگر کوئی چیز پسند کرتیں اور وہ غلط نہ ہوتی تو ضرور ان کی خواہش پوری کرتے۔ چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ عید کے موقع پر کچھ حبشی کھیل دکھانے جمع ہوگئے، آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ کیا ان کا کھیل دیکھنا چاہتی ہیں، انھوں نے فرمایا: ہاں، تو آپ خود کھڑے ہوگئے اور اپنے پیچھے حضرت عائشہؓ کو کھڑا کرلیا کہ آپ کا اوٹ لے کر وہ کھیل دیکھتی رہیں، اور جب تک ان کا جی نہ بھر گیا آپ نہیں ہٹے۔

بیوی کے ساتھ آپ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے اور جس برتن سے حضرت عائشہؓ پانی پیتیں، آپ اس برتن کو لے کر اسی جگہ منہ لگا کر پانی پیتے جہاں پر حضرت عائشہؓ نے منہ لگایا ہوتا۔ حضرت عائشہؓ کوئی ہڈی لے کر چوستیں تو اس ہڈی کو لے کر اسی جگہ منہ لگا کر آپ چوستے۔ یہ بیوی سے غایت درجہ محبت و تعلق اور احترام کی عظیم مثال ہے۔ (زاد المعاد)

ازدواجی زندگی میں پائیداری کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنی رائے زبردستی دوسرے پر نہ تھوپی جائے، اور وقت ضرورت آپس میں مشورہ کیا جائے، اس سے ایک دوسرے کی قدر دلوں میں بڑھتی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بابت بھی عمدہ مثالیں قائم فرمائی ہیں۔ ایک نازک موقع پر آپ نے اپنی زوجہ حضرت ام سلمہؓ سے مشورہ کیا اور ان کے مشورہ پر عمل کیا، جیسا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر پیش آیا۔ ایک مرتبہ ایک سفر میں آپ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ آؤ! دوڑ کا مقابلہ کریں، دونوں میں مقابلہ ہوا، حضرت عائشہؓ آگے نکل گئیں، پھر دوسرے کسی سفر کے موقع پر جب حضرت عائشہؓ کچھ موٹی ہو گئی تھیں، پھر دوڑ کا مقابلہ ہوا، اور اس بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگے نکل گئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عائشہؓ! یہ اس بار کا بدلہ ہے۔ "عن عائشة قالت: انها كانت مع النبي ﷺ في سفر قالت: فسابقته فسبقته على رجلي فلما حملت اللحم سابقته فسبقني قال: هذه بتلك السبقة"۔ (ابوداؤد)

اگر اختلاف ہو جائے

ذہنوں کا فرق و اختلاف زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ ازدواجی زندگی میں بھی ایسے مواقع بسا اوقات آجاتے ہیں، جہاں باہم اختلاف ہو جائے۔ ایسے مواقع کے لئے قرآن و حدیث کی تعلیم ہے کہ پہلے اختلاف کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے لئے نرمی اور افہام و تفہیم سے کام لیا جائے، اگر اس سے مسئلہ ختم نہ ہو تو دونوں طرف کے خاندان کے ایک ایک مخلص اور سنجیدہ بزرگ کو بٹھا کر اختلاف دور کرایا جائے۔ دلوں میں محبت اللہ ڈالتا ہے۔ اگر اخلاص و ہمدردی کے ساتھ کوشش کی جائے گی تو اللہ کی مدد سے امید ہوتی ہے کہ اختلاف و دوری پھر سے یگانگت و قربت میں بدل جائے۔ قرآن کریم میں اس بابت حکم ہے: وان خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من اهله وحكما من اهلها ان يريدا اصلاحا يوفق الله بينهما (اور اگر تمہیں کہیں میاں و بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا خطرہ ہو تو ایک منصف مرد کے خاندان میں سے اور ایک منصف عورت کے خاندان میں سے مقرر کرو، اگر یہ دونوں صلح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان دونوں میں موافقت کر دے گا۔ (نساء: ۳۵)

چھوٹی موٹی باتوں پر ہلکی پھلکی ناراضی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں بھی کبھی پیدا ہو جاتی تھی۔ دیکھئے کس محبت آمیز انداز میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حل کیا۔ اپنی زوجہ حضرت عائشہؓ سے فرماتے ہیں: مجھے معلوم ہو جاتا ہے کب تم مجھ سے خوش ہوتی ہو اور کب مجھ سے ناراض ہو جاتی ہو۔ جب تم مجھ سے خوش ہوتی ہو تو کہتی ہو، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کی قسم، اور جب مجھ سے ناراض ہوتی ہو تو کہتی ہو، ابراہیمؑ کے رب کی قسم۔ اس پیارے انداز نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر محبت بھرا جواب بھی دیکھئے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں: ہاں تب بھی میں صرف آپ کا نام ہی تو چھوڑتی ہوں۔ (متفق علیہ)

اختلاف اور چھوٹی بات کو اس حد تک آگے نہیں بڑھنے دینا چاہئے کہ رائی کا دانہ پربت بن جائے، اور معمولی بات پر اختلاف جھوٹی الزام تراشیوں کا ذریعہ بننے لگے۔ جن باتوں کی وجہ سے اختلاف پنپ رہا ہے، ٹھنڈے دل سے غور کر کے ان پر پابندی لگائی جائے اور مصالحت کی راہ اختیار کی جائے۔ کیونکہ میاں و بیوی میں اتحاد و محبت کی بنیادیں زیادہ ہیں، اختلاف تو وقتی اور عارضی ہے۔ ایک صحابی کا واقعہ ہے، انھوں نے خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آکر شکایت کی کہ میری بیوی میرے ساتھ زبان درازی کرتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر اپنے سے جدا کر دو اور طلاق دے دو۔ انھوں نے عرض کیا: لیکن مجھے تو اس سے محبت ہے اور اس سے میرے بچے بھی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تب اس کی زبان درازی پر صبر کرو، لیکن اس کو ستانے اور مارنے کا حق تمہیں نہیں ہے۔

طلاق ناپسندیدہ فیصلہ

بسا اوقات میاں و بیوی کے درمیان ایسے چھوٹے موٹے اختلاف کے موقع پر سماج کے کچھ بدخواہوں کا رویہ بڑا خراب ہوتا ہے، وہ خواہ رشتہ دار ہوں یا کوئی اور، دونوں کے اختلاف کو ہوا دیتے ہیں، جھوٹی سچی باتیں ملا کر ایک کو دوسرے سے بدظن کرتے ہیں۔ ایسے رویہ کی اسلام نے سخت مذمت کی ہے۔ اور زوجین کو اس قسم کے لوگوں سے ہوشیار اور دور رہنا چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ليس منا من خبب امرأة على زوجها

(وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو کسی عورت کو اس کے شوہر سے ورغلائے۔ (ابوداؤد)۔

اسی طرح حدیث میں اس بات کو بھی سخت ناپسند کیا گیا ہے کہ عورت اپنے شوہر سے بغیر کسی معقول وجہ کے طلاق کا مطالبہ کرے۔ طلاق کوئی ایسی معمولی بات نہیں ہے کہ کسی اہم وجہ کے بغیر اس کا مطالبہ کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایما امراۃ سالت زوجها طلاقا فی غیر ما باس فحرام علیها رائحة الجنة'' (جو کوئی عورت اپنے شوہر سے بلا وجہ طلاق کا مطالبہ کرے گی تو اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔ (ابوداؤد، کتاب الطلاق)

ایسا ممکن ہے کہ کسی خاص شخص کے لئے ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ مصالحت اور افہام وتفہیم کی تمام کوششیں رائیگاں جائیں، اور اختلاف ودوری کی جڑیں اتنی گہری ہو جائیں کہ ان کو دور کرنا ممکن محسوس نہ ہو، اور نوبت یہاں تک آ جائے کہ دونوں ہی اس بات میں اپنی بہتری محسوس کریں کہ وہ رشتہ ازدواج سے علاحدہ ہو جائیں، اور اپنی اپنی زندگی کے لئے علاحدہ راہ عمل طے کریں۔ تو اس موقع پر طلاق دونوں کی ضرورت اور ان کے مسئلہ کا حل بن جاتی ہے۔ اسی موقع کے لئے اسلام نے طلاق کی سہولت رکھی ہے۔ چنانچہ حدیث میں جہاں طلاق کی گنجائش کا ذکر کیا گیا ہے، ان الفاظ میں اس کی حیثیت نمایاں کی گئی ہے کہ: ابغض الحلال الی الله الطلاق (حلال چیزوں میں اللہ کو سب سے ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔ (ابوداؤد)

ایسا موقع جب کسی کی زندگی میں آ ہی جائے تب ان دنوں میں، جب عورت پاکی کے ایام میں ہو، صرف ایک طلاق دے کر علاحدگی کی راہ اختیار کر لی جائے۔ ایک طلاق کے بعد جب عدت گذر جائے گی تو جدائیگی مکمل ہو جائے گی۔ اس موقع پر بھی تین طلاق دینے کا طریقہ کوئی پسندیدہ عمل نہیں ہے۔

غیر جنس کے ساتھ اختلاط کی زہرناکی

ازدواجی زندگی کی پاکیزگی اور پختگی کے لئے ایک بات یہ بھی ضروری ہے کہ ناجائز جنسی تعلقات پر پوری طرح بندش عائد کر دی جائے، کہ یہ ازدواجی زندگی کے باہمی خوشگوار تعلقات کے لئے خطرناک زہر ہے۔ فاشانہ اختلاط، غیر جنس کے ساتھ بے محابا روابط اور بے لگام زندگی نے کتنے مستحکم گھروں کو توڑ دیا ہے۔ اور اس سے اٹھنے والی عداتوں نے کتنی عزتیں پامال اور کتنی زندگیاں برباد کر دی ہیں۔ اسلام نے اس دروازہ کو سختی سے بند کیا ہے، اور اس تک پہنچانے والے تمام راستوں اور چور دروازوں پر بھی زبردست پہرہ بٹھایا ہے۔ زنا سماج کے لئے سخت ناسور ہے۔ اس سے پیدا ہونے والی بیماریاں انسان اور انسانی سماج کو کربناک موت سے دوچار کرتی ہیں، زنا کی شکار خاتون جیتے جی کڑھ کڑھ کر مرتی ہے، اور ہر دن وہ موت کی کربناکیوں سے گذرتی ہے۔ ایسے شنیع عمل کو اسلام نے سختی سے حرام قرار دیا ہے۔ بلکہ اس کے اسباب ومحرکات کو بھی حرام بنایا ہے۔ قرآن نے بلیغ انداز میں بتایا کہ زنا کے قریب بھی نہ جاؤ کہ یہ بہت ہی برا راستہ ہے۔ "ولا تقربوا الزنا انه كان فاحشة وساء سبيلا" (اور زنا کے قریب نہ جاؤ، بے شک وہ بے حیائی ہے اور بری راہ ہے۔ (بنی اسرائیل: ۳۲)

حدیث میں حکم دیا گیا کہ کوئی مرد کسی اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی میں اکٹھا نہ ہو، کیونکہ وہاں تیسرا شیطان ہوتا ہے، جو اس کے دل میں برے خیالات ڈالتا ہے۔ ایسے قبیح فعل سے بچنے کے لئے اسلام نے تاکید کی کہ سماج میں کوئی فرد بے نکاح نہ رہے، اور اپنی جنسی خواہشات کو جائز طریقہ پر پورا کرنے کے مواقع بہ سہولت فراہم رہیں۔ اسی لئے اسلام نے نکاح کو آسان بنایا، تاکہ ہر فرد اپنی اس ضرورت کی بآسانی اور پاکیزہ طریقہ پر تکمیل کر سکے۔ اور اسی لئے اسلام نے جہاں ضرورت ہو وہاں 'عدل واستطاعت کی شرط کے ساتھ' ایک سے زائد (صرف چار کی حد تک) نکاح کی اجازت دی، تاکہ زائد جنسی رغبت اور استطاعت رکھنے والے لوگ بھی ناجائز راہوں پر قدم نہ رکھ سکیں، اور خواتین کو بھی مکمل سماجی اور قانونی تحفظ ملے۔ مخصوص حالتوں میں تعدد ازدواج کی یہ قانونی اجازت اسی لئے ہے کہ نہ پہلی بیوی کا کوئی حق متاثر ہو اور نہ دوسری 'خاتون' اپنی جوانی کھونے اور مرد کی جنسی خواہش پوری کرنے کے بعد بے یارومددگار ہو جائے، بلکہ اس کی بھی تمام قانونی ذمہ داریاں اس مرد کے سر آئیں۔

خاندان کے دیگر افراد

نکاح کے ذریعہ جب خاندان وجود میں آ جاتا ہے تب اس کی شاخیں نکلتی ہیں۔ سب سے محبوب اور خوبصورت شاخ اولاد کی ہوتی ہے۔ گھر کے آنگن میں ایک ننھی کلی پھوٹتی ہے، جس کی رونق اور معصومیت دلوں کو بھالیتی اور غموں کو دور کر دیتی ہے۔ پھر یہ سلسلہ چل پڑتا ہے، معصوم کلیاں پھولوں میں تبدیل ہوتی ہیں۔ اب ان کی بھینی بھینی خوشبو پورے گھر کو معطر کرنے لگتی ہے، اور ان کی معصوم اور دلکش چہچہاہٹ سے پورے گھر کا ماحول پر بہار بن جاتا ہے۔ اس موقع پر بچوں کی پرورش و پرداخت اور تعلیم وتربیت کی ذمہ داریاں آتی ہیں۔ بچے بڑے ہوتے ہیں تو ان کے رشتے بھائیوں اور

بہنوں سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ان پر والدین کے تئیں ذمہ داریاں آتی ہیں۔ نیز دیگر قرابت داروں کے حقوق وفرائض عائد ہوتے ہیں۔ اور ان سب سے مل کر خاندان کا ایک بڑا ڈھانچہ تیار ہو جاتا ہے۔ قرآن اور حدیث میں ان میں سے ہر فرد کے تعلق سے ہدایات اور رہنمائیاں دی گئی ہیں، تا کہ خاندان کی پوری عمارت مکمل موزونیت اور حسن ودلکشی کے ساتھ کھڑی ہو سکے۔ ذیل کے سطور میں اس کی کچھ تفصیل پیش ہے۔

بچوں کی پرورش

بچوں کی بہترین پرورش و پرداخت والدین کی شرعی ذمہ داری ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن وحدیث میں نہ صرف ہدایات دی گئی ہیں بلکہ قانونی حقوق اور ذمہ داریاں طے کردی گئی ہیں۔ چنانچہ بچوں کی رضاعت یعنی دودھ پینے کے اخراجات اور اسی طرح حضانت یعنی پرورش کے تمام انتظامات کے اخراجات بچوں کے والد کی قانونی ذمہ داری بنائی گئی ہے۔ نیز اس کے ساتھ بچوں کی رضاعت اور حضانت انجام دینے والی خاتون، خواہ وہ بچوں کی ماں ہو یا کوئی اور، کے اخراجات کی بھی ذمہ داری متعلقہ مدت تک کے لئے بچوں کے باپ کے اوپر ڈالی گئی ہے۔ یہ ذمہ داری اس صورت میں بھی باقی رہتی ہے، جب کسی وجہ سے میاں وبیوی کے درمیان علاحدگی ہوگئی ہو اور بچے اپنی ماں کے پاس زیر پرورش ہوں۔ ایسی مخصوص صورت میں بچوں کے بالغ ہونے تک اور بچیوں کے بلوغت کے بعد شادی ہونے تک کے اخراجات باپ کے اوپر لازم رہتے ہیں۔ قرآن کریم کے اندر اس بابت اصولی حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے: وعلی المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف (اور باپ پر دودھ پلانے والیوں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق ہے۔ (بقرہ: ۲۳۳)

تعلیم وتربیت

پرورش و پرداخت کے ساتھ اور اس کے بعد بچوں کی بنیادی ضرورت ان کی اچھی تعلیم اور بہترین تربیت ہے۔ اس پہلو پر اسلام نے بے حد توجہ دی ہے۔ یہ بات معروف ہے کہ قرآن کریم نے علم سیکھنے اور تعلیم حاصل کرنے کو انتہائی اہمیت دی ہے، اور علم کی فضیلت کو مختلف انداز سے نمایاں کیا ہے۔ خود نبی کریم ﷺ نے علم کی اشاعت اور تعلیم کے انتظام کے لئے بہت زیادہ تاکید فرمائی، طرح طرح سے اس کی اہمیت بتائی۔ خود پابندی سے لوگوں کو تعلیم دی اور تعلیم کی اشاعت کے انتظامات کئے۔ نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں تعلیم کی اہمیت کا یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ نے اپنی بعثت کا مقصد ہی علم وتعلیم کی اشاعت کو قرار دیا۔ فرمایا: ''انما بعثت معلما''۔ (حدیث نبوی)

چونکہ تعلیم کا آغاز بچپن سے ہوتا ہے، اس لئے تعلیم کی ان تمام اہمیتوں کا مصداق پہلے نمبر پر ہمارے بچے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ بچوں کو بڑے دلچسپ اور مؤثر انداز میں دین واخلاق کی باتیں سکھاتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے فرمایا: اے بچے! کھانے سے پہلے اللہ کا نام لو، دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے قریب سے کھاؤ۔ تعلیم کا ایک لازمی عنصر تربیت ہے، بلکہ تعلیم نام ہی ہے کردار سازی کا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس پہلو پر بہت زیادہ توجہ دی، ہدایات بھی دیں اور عملی نمونے بھی قائم فرمائے۔ آپ نے فرمایا: ''لان يؤدب الرجل ولده خير له من ان يتصدق بصاع''۔ (کوئی شخص اپنی اولاد کو اچھی تربیت دے یہ بہتر ہے اس سے کہ وہ ایک صاع صدقہ کرے۔ (ترمذی)

آپ ﷺ نے فرمایا: ''مانحل والد ولده من نحل افضل من ادب حسن'' (کسی والد نے اپنی اولاد کو حسن ادب سے اچھا تحفہ نہیں دیا۔ (ترمذی)

بچوں سے پیار ومحبت ان کی تربیت کا حصہ ہے۔ آپ اپنے نواسے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ سے جس طرح محبت کرتے تھے، اس کی مثال دیکھئے، روایت میں آتا ہے کہ: ''ان حسنا وحسينا استبقا الى رسول الله ﷺ فضمهما اليه'' (حسن اور حسین دوڑ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے انھیں چمٹا لیا۔ (مسند احمد)

اسی طرح آپ ﷺ کی نواسی حضرت امامہ چھوٹی تھیں، فتح مکہ کے موقع پر وہ آپ کی گود میں کھیلتی تھیں، نماز میں بھی آپ نے انھیں گود سے نہیں اتارا، جب سجدہ میں جاتے تو گود سے رکھ دیتے اور سجدہ سے اٹھتے تو پھر گود میں اٹھا لیتے۔

بیٹی کے لئے خصوصی ہدایات

اسلامی تعلیمات میں بیٹی اور بیٹے کے درمیان مقام اور حیثیت میں کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن دوسرے سماجوں کی طرح عرب کے سماج میں

بھی لوگ بیٹی کو بیٹے سے کم حیثیت دیتے تھے۔ اور بیٹی پر ظلم وزیادتی کے طرح طرح کے طریقے اپنا رکھے تھے۔ شقاوت کی انتہا یہ تھی کہ ایک ہنستی کھیلتی معصوم بچی کو خود باپ اپنے ہاتھوں سے زندہ دفن کر دیا کرتا تھا، اور جب بچی کی پیدائش کی خبر ملتی تو وہ مارے شرم اور غم کے منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ بیٹیوں پر ظلم اور اس کے ساتھ غیر مساویانہ سلوک کی گھناؤنی مثالیں آج کے ترقی یافتہ کہے جانے والے مہذب معاشروں میں بھی بہت زیادہ رائج ہیں، جنین کشی اور رحم مادر میں بچیوں کا قتل' عام ہوتا جارہا ہے۔ لیکن اسلام نے پہلے بھی اور آج بھی اس کو سختی سے روکا ہے، اور اس پر بہت سخت وعیدیں سنائی ہیں، قرآن نے اس سلسلہ میں سخت زبان استعمال کرتے ہوئے کہا ہے: "واذا الموؤدۃ سئلت بأی ذنب قتلت" (اور جب زندہ درگور لڑکی سے پوچھا جائے، کہ کس گناہ پر ماری گئی تھی (تکویر: ۸۔۹)۔ قرآن نے صاف لفظوں میں اس کی ممانعت کرتے ہوئے، اس حرکت کے محرک پر سوالیہ نشان بھی کھڑا کیا کہ: "ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق نحن نرزقھم وایاکم ان قتلھم کان خطئا کبیرا" (اور اپنی اولاد کو تنگدستی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم انھیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی، بے شک ان کا قتل کرنا بڑا گناہ ہے (بنی اسرائیل: ۳۱) اور "قد خسر الذین قتلوا اولادھم سفھا بغیر علم وحرموا ما رزقھم اللہ افتراء علیہ" (یقینا خسارہ میں پڑے وہ لوگ جنھوں نے اپنی اولاد کو جہالت اور نادانی کی بنا پر قتل کیا اور اللہ پر بہتان باندھ کر اس رزق کو حرام کرلیا جو اللہ نے انھیں دیا تھا۔ (انعام: ۱۴۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچیوں کے ساتھ بے حد محبت وشفقت کا برتاؤ فرمایا اور ان کی تعلیم وتربیت اور حسن پرورش پر بڑے بڑے انعامات الٰہی کا اعلان فرمایا، ارشاد ہوا: "من عال جاریتین حتی تبلغا جاء یوم القیامۃ انا وھو ھکذا وضم اصابعہ" (جس شخص نے دو بچیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بالغ ہوگئی تو وہ قیامت کے دن میرے ساتھ اس طرح ہوگا، یہ کہہ کر آپ نے انگلیاں ملا کر اشارہ کیا۔ مسلم)، نیز یہ بھی فرمایا کہ: "من عال ثلاث بنات او مثلھن من الاخوات فادبھن ورحمھن حتی یغنیھن اللہ اوجب اللہ لہ الجنۃ" (جس نے تین بیٹیوں یا ان کے مثل بہنوں کی کفالت کی، ان کی تربیت کی اور شفقت کا برتاؤ کیا، یہاں تک کہ اللہ نے انھیں خود کفیل بنادیا تو اللہ اس شخص کے لئے جنت واجب کردے گا۔ شرح السنۃ)۔ لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح دینے کے خیال کی تردید کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: "من کانت لہ انثی فلم یئدھا ولم یؤثر ولدہ علیھا یعنی الذکور ادخلہ اللہ الجنۃ" (جس شخص کے پاس بچی ہو اور وہ اس کو زندہ نہ مارے اور نہ اپنے لڑکوں یعنی اولاد نرینہ کو اس پر ترجیح دے تو اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا۔ ابوداؤد)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی بیٹیوں کی محبت بھری تربیت فرمائی۔ آپ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ تھیں۔ روایت میں آتا ہے کہ "کانت اذا دخلت علیہ قام الیھا فاخذ بیدھا فقبلھا واجلسھا فی مجلسہ" (جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لاتیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر ان کا استقبال کرتے، ان کا ہاتھ پکڑتے، بوسہ لیتے اور اس جگہ بٹھاتے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود بیٹھا کرتے (ابوداؤد)۔ ایک صحابی حضرت اسامہؓ تھے جو آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ کے بیٹے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں بے حد محبوب رکھتے تھے، ایک مرتبہ فرمایا کہ: ''اگر اسامہ لڑکی ہوتا تو میں اسے زیوروں سے آراستہ کردیتا (حدیث نبوی) بیٹی کی عمدہ تربیت کے بعد اچھے جوڑ میں اس کی شادی کرنا بھی باپ کی شرعی ذمہ داری ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کی شادی حضرت علیؓ سے کی جو ہر اعتبار سے ان کے لئے بہتر تھے۔

اگر سوء اتفاق سے بیٹی بھی مطلقہ یا بیوہ ہو کر گھر واپس آتی ہے تو اس کی ذمہ داریوں کو خوش دلی سے قبول کرنا اور اس کے لئے اخراجات برداشت کرنا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں اس قدر اہمیت کا حامل عمل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو افضل صدقہ قرار دیا، چنانچہ فرمایا: "الا ادلکم علی افضل الصدقۃ ابنتک مردودۃ الیک لیس لھا کاسب غیرک" (کیا میں تم کو افضل صدقہ کے بارے میں نہ بتاؤں؟ تمہاری وہ بیٹی جو اس حال میں لوٹ کر تمہارے پاس آتی ہے کہ تمہارے سوا اس کا کوئی کمانے والا نہیں ہے۔ (ابن ماجہ)

بہن کے لئے شفقت ومحبت

اسلام نے بہن کے لئے عزت کا مقام ومرتبہ رکھا ہے اور حقوق متعین کئے ہیں۔ چنانچہ بھائی کے ترکہ میں بعض خاص حالتوں کے اندر بہن کے لئے بھی حصے مقرر کئے گئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی سگی بہن تو نہ تھیں، لیکن بچپن میں جہاں آپ نے دودھ پیا تھا، وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دودھ شریک بہن تھیں جن کا نام شیماء تھا، ایک غزوہ کے موقع پر جب مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور لوگ گرفتار ہو کر آئے تو ان میں حضرت شیماء بھی تھیں، وہ جب آپ کے پاس آئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بدن مبارک کی چادر اتار کر زمین پر بچھادی اور رضاعی بہن کو اس پر بٹھایا۔ بہن کی عزت اور ان کے جذبات کا احترام کرنے کی ایک دوسری مثال دیکھئے۔ حضرت حمزہؓ آپ کے چچا تھے، غزوہ احد میں دیگر مسلمانوں کے ساتھ حضرت حمزہؓ بھی شہید ہوئے۔

دشمنوں نے ان کی نعش کے ساتھ بڑی زیادتی کی تھی، جسم کے اعضاء کاٹ کاٹ دیئے تھے، ان کی بہن حضرت صفیہؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی تھیں۔ آپ نے حضرت حمزہؓ کے جسم پر چادر ڈلوائی اور تاکید فرمائی کہ حضرت صفیہؓ نعش کو دیکھنے نہ پائیں کہ بھائی کو اس حالت میں دیکھ کر بہن کو شدید رنج ہوگا۔

بھائی کے لئے شفقت ومحبت

بھائی کے لئے شفقت ومحبت تو فطری ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے تو اس رشتہ اخوت کو استحکام کی مثال بتاتے ہوئے بڑی وسعت دے دی ہے، کہا ہے کہ ''تمام مومن تمہارے بھائی ہیں'' انما المؤمنون اخوۃ (حجرات: ۱۰)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رشتہ اخوت کے حقوق کو کئی موقعوں پر نمایاں فرمایا۔ خود انبیاء کرام کی مثال دیتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''سارے انبیاء آپس میں باپ شریک بھائی کی طرح ہیں''۔ مدینہ منورہ ہجرت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مکہ کے مہاجر مسلمانوں اور مدینہ کے انصاری مسلمانوں کے درمیان بھائی بھائی کے رشتہ کا نظام قائم فرمایا، جو تاریخ میں 'مواخات' (بھائی چارہ) کے نام سے مشہور ہے، اور ان دینی بھائیوں نے اپنی اخوت اور بھائی چارہ کی عمدہ مثالیں قائم کردیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "انصر اخاك ظالما او مظلوما" (حدیث نبوی)۔ یعنی ہر مسلمان کا یہ حق بنتا ہے کہ ہر حال میں اس موقع کے مطابق اس کی مدد کی جائے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے چھوٹے چچازاد بھائی حضرت علیؓ کو بچپن سے اپنے زیر تربیت رکھا اور ان سے محبت اور ان پر بھرپور اعتماد کا اظہار فرمایا۔ حضرت علیؓ نے بھی شروع سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دیا، اور اس راہ میں بڑی بڑی قربانیاں پیش فرمائیں۔

گھر کے اندر بڑے بھائی کی ذمہ داری چھوٹے بھائیوں کی پرورش اور تعلیم وتربیت کے تعلق سے اسی طرح ہے جو باپ کی ہوتی ہے۔ بہت سے گھروں میں یہ صورت حال پیدا ہوجاتی ہے کہ یا تو والد نہیں رہے، چھوٹے بھائی بہنوں کے لئے صرف بڑے بھائی ذمہ دار ہیں، یا والد ضعیف و معذور ہوگئے اور بڑے بھائی نے انتظامات سنبھال لئے ہیں، ایسے موقعوں پر چھوٹے بھائیوں کی تربیت وتعلیم اور دیگر ذمہ داریاں شرعی اعتبار سے بڑے بھائی پر عائد ہوتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرما: "حق کبیر الاخوۃ علی صغیرھم حق الوالد علی ولدہ" سب سے بڑے بھائی کا، چھوٹے بھائی پر وہی حق ہے جو والد کا اپنی اولاد پر ہے۔ (بیہقی)

والدین کے ساتھ

والدین یعنی ماں وباپ کا جو مقام ومرتبہ اسلام نے مقرر کیا ہے وہ بہت ہی بلند وبالا اور عظیم ہے۔ وہ ایسی عظمتوں، برکتوں اور تقدس کا حامل ہے کہ دوسرا کوئی رشتہ اس کے برابر نہیں ہے۔ ماں وباپ میں بھی ماں کے مقام اور حق کو بہت زیادہ بڑھایا گیا ہے۔ قرآن کریم نے متعدد جگہوں پر اللہ کی عبادت کے ساتھ دوسرا حکم والدین کے ساتھ حسن سلوک کا دیا ہے: "واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا وبالوالدین احسانا" (اور اللہ کی بندگی کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ کرو اور ماں وباپ کے ساتھ نیکی کرو۔ نساء: ۳۶)۔ والدین کی اس عظمت ومقام کو اس وقت بھی باقی رکھا گیا ہے جب وہ ایمان سے محروم ہوں: "وان جاھداك علی ان تشرك بی ما لیس لك بہ علم فلا تطعھما وصاحبھما فی الدنیا معروفا" (اور اگر تجھ پر اس بات کا زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ اس کو شریک بنائے جس کو تو جانتا بھی نہ ہو تو ان کا کہنا نہ مان اور دنیا میں ان کے ساتھ نیکی سے پیش آ۔ لقمان: ۱۵)۔ حضرت اسماءؓ کہتی ہیں کہ ''میری والدہ مشرکہ تھیں، زمانہ قریش میں میرے پاس آئیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ وہ میرے پاس آئی ہیں، کیا میں ان کے ساتھ صلہ رحمی کروں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں! ان کے ساتھ صلہ رحمی کرو'' قدمت علی امی فی عھد قریش فقلت یا رسول اللہ ﷺ ان امی قدمت علی وھی راغبۃ افاصلھا قال نعم صلیھا (متفق علیہ)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: ''وہ شخص بڑا بدقسمت اور خسارہ میں ہے جس نے اپنے والدین یا ان میں کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور ان کی خدمت کرکے خود کو جنت کا مستحق نہ بنا سکا'' (مسلم)۔ والدین کے ساتھ بدسلوکی اور ان کی نافرمانی پر سخت ترین وعیدیں بیان کی گئی ہیں، اور اس کو عظیم گناہوں میں شمار کیا گیا ہے، جن کی بھیانک سزا سے انسان دنیا میں بھی نہیں بچتا، اور آخرت کی سزا تو دردناک ہے ہی۔ قرآن کریم نے بہ تاکید کہا ہے کہ: ''والدین میں سے کوئی ایک یا دونوں اگر بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کے ساتھ انتہائی نرمی سے پیش آؤ، ان کی کسی بات پر اف بھی نہ کہو، کہ ناپسندیدگی کا اظہار بھی ممنوع ہے''۔ "اما یبلغن عندك الکبر احدھما او کلاھما فلا تقل لھما اف ولا تنھرھما وقل لھما قولا کریما" (اور تیرے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں اف بھی نہ کہو، اور نہ انہیں جھڑکو اور ان سے ادب سے بات کرو (بنی اسرائیل: ۲۳)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ: ''والدین کو برا بھلا کہنا اور ان کو گالی دینا سخت ترین

گناہ ہے''۔"من الکبائر شتم الرجل والدیہ" (متفق علیہ)۔ والدین کی نافرمانی اسلام کی نظر میں حرام ہے۔"ان اللہ حرم علیکم عقوق الامہا ووأد البنات" (متفق علیہ)۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:''کل الذنوب یغفر اللہ منہا ما شاء الا عقوق الوالدین فانہ یعمل لصاحبہ فی الحیاۃ قبل الممات" (تمام گناہ ایسے ہیں کہ اللہ ان میں سے جو چاہے معاف فرمادیتا ہے سوائے والدین کی نافرمانی کے، کہ اللہ اس کی سزا مرنے سے پہلے دنیا میں بھی دلاتا ہے۔(بیہقی)

پھر والدین میں سے ماں اور باپ کے مقام کو علاحدہ علاحدہ بھی واشگاف کیا گیا۔ ماں کے بارے میں کہا گیا کہ''اس کے قدموں کے نیچے جنت ہے''۔ایک روایت میں ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ:''میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہاری ماں، انھوں نے پوچھا: پھر کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہاری ماں، انھوں نے پوچھا: پھر کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہاری ماں۔انھوں نے چوتھی بار پوچھا: اس کے بعد کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بار فرمایا: تمہارے والد'' (متفق علیہ)۔اور باپ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:''اگر والد ناراض ہیں تو اللہ ناراض ہو جاتے ہیں، اور اگر والد خوش ہیں تو اللہ خوش ہو جاتے ہیں۔ رضی الرب فی رضی الوالد وسخط الرب فی سخط الوالد۔ (ترمذی)

قرآن کریم نے ماں کی عظمت ومرتبہ کو نمایاں کرنے کے لئے کئی جگہوں پر تفصیل سے بتایا کہ اس ماں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ جو اپنے بچے کی پیدائش کے موقع پر بے انتہا تکلیف واذیت برداشت کرتی ہے اور پیدائش سے پہلے اور اس کے بعد وہ تکلیف پر تکلیف اٹھاتی ہے۔"ووصینا الانسان بوالدیہ احسانا حملتہ امہ کرہا ووضعتہ کرہا" (اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرنے کی تاکید کی کہ اسے اس کی ماں نے تکلیف سے اٹھائے رکھا اور اسے تکلیف سے جنا (احقاف: ۱۵)۔قرآن نے اللہ کے نبی حضرت عیسی علیہ السلام کی زبان سے کہلوایا کہ:''اللہ نے مجھے اپنی والدہ کا فرمانبردار بنایا'' وبرا بوالدتی (اور اپنی ماں کے ساتھ نیکی کرنے والا) (مریم: ۳۲)۔ایک مرتبہ ایک شخص نے آکر پوچھا کہ:''میرے پاس مال ہے، اور میرے والد کو میرے مال کی ضرورت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تم اور تمہارا مال دونوں تمہارے والد کے لئے ہیں، تمہاری اولاد تمہاری پاکیزہ کمائی ہیں، تو اپنی اولاد کی کمائی میں سے کھاؤ''ان لی مالا وان والدی یحتاج الی مالی. قال: انت و مالک لوالدک. ان اولادکم من اطیب کسبکم. کلوا من کسب اولادکم۔ (ابوداؤد)

ماں وباپ کے ساتھ حسن سلوک اور اچھے برتاؤ کو اسلام نے یہاں تک وسعت دی ہے کہ والد کے گذر جانے کے بعد ان کے دوست احباب کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرنے کا حکم دیا، اور اس کو بہت بڑی نیکی قرار دیا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:"ان من ابر البر صلۃ الرجل اہل ود ابیہ بعد ان یولی" بہت بڑی نیکی یہ ہے کہ انسان اپنے والد کے گذر جانے کے بعد ان کے دوست احباب کے ساتھ صلہ رحمی کرے۔(مسلم)

قرابت داروں کے ساتھ برتاؤ

خاندان کے وسیع ڈھانچہ میں بیوی، بچوں اور والدین و بھائی وبہنوں کے علاوہ ایک اہم حصہ قرابت داروں کا ہوتا ہے۔قرابت داروں میں دور ونزدیک کے تمام رشتہ دار آتے ہیں۔اور جو رشتہ دار جس درجہ قریب ہوں گے، ان کے حقوق اسی درجہ میں انسان پر زیادہ عائد ہوتے ہیں۔قرابت داروں میں کچھ رشتہ دار محرم ہوتے ہیں، جن کے درمیان باہم نکاح کا رشتہ قائم نہیں ہوسکتا۔یہ بہت ہی قربت کے رشتہ دار ہوتے ہیں۔دوسرے قرابت داروہ ہیں جو محرم نہیں ہیں۔ان دونوں قسم کے رشتہ دار قرابت داروں میں آتے ہیں۔دوسری طرح یہ بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ نسبی رشتہ دار اور سسرالی رشتہ دار دونوں درجہ بدرجہ قرابت میں آتے ہیں۔ان سب کے حقوق ہیں، اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور صلہ رحمی سے پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے۔

قرآن کریم نے کئی موقعوں پر رشتہ داروں اور قرابت داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے اور ان کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا ہے، ارشاد ہے:"فآت ذا القربی حقہ" (پھر رشتہ دار کو اس کا حق دے) (روم: ۳۸)۔اور کہا گیا:" واعبدوا اللہ ولاتشرکوا بہ شیئا وبالوالدین احسانا وبذی القربی" (اور اللہ کی بندگی کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ کرو اور ماں وباپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ داروں کے ساتھ بھی) (نساء ۳۶)۔قرابت داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرنے کا حکم دیتے ہوئے کہا گیا: صلہ رحمی کا مطلب بھی واضح کیا گیا کہ جب دوسرے رشتہ کو کاٹ رہے ہوں تب بھی تم ان کے ساتھ جوڑ پیدا کرو لیس الواصل بالمکافی ولکن الواصل الذی اذا قطعت رحمۃ وصلہا (بخاری)۔حدیث میں کہا گیا کہ اگر رشتہ دار محتاج وضرورت

مند ہوں تو اپنی زکاۃ کی رقم سے ان کی اعانت کرو۔ اور رشتہ داروں کو زکاۃ دینے میں دوہرا ثواب رکھا گیا کہ اس سے زکاۃ بھی ادا ہوگی اور صلہ رحمی بھی انجام پائے گی۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں قرآن میں کہا گیا کہ وہ مسلمانوں سے اپنے قرابت داروں کے حق میں محبت طلب کرتے ہیں۔ الا المودة فی القربی۔ بجز رشتہ داری کی محبت کے (شوری: ۲۳)۔ ان قرابت داروں میں بہتوں کو درجہ بدرجہ میراث میں حصہ دار بھی بنایا گیا ہے، چنانچہ اگر اولاد نہ ہو تو بھائی اور بہن کو میراث میں حصہ ملتا ہے۔ وہ بھی نہ ہوں اور والدین بھی نہ ہوں تو دوسرے رشتہ دار مستحق بنتے ہیں۔

پڑوسی کے ساتھ

خاندان کے استحکام اور اس کی خوشگوار زندگی کی بقاء میں پڑوسیوں کا رول بھی کافی حد تک اہمیت کا حامل ہے۔ بسا اوقات احباب وقرابت داروں کے مقابلہ میں پڑوسیوں کا عمل دخل گھر کے اندرونی معاملات میں کافی بڑھا ہوا رہتا ہے۔ اور یوں بھی پڑوسی وہ پہلا کنبہ ہوتا ہے جس سے کسی خاندان کا بیرونی تعلق سب سے پہلے استوار ہوتا ہے۔ اچھے پڑوس کی وجہ سے گھر کا ماحول اچھا رہتا ہے اور بچوں کی عمدہ تربیت ہوتی ہے، غلط اور خراب پڑوس گھر کے ماحول کے ساتھ بچوں کے عادات واطوار اور تربیت پر بھی برا اثر ڈالتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان اپنا دوست بدل سکتا ہے، لیکن پڑوس نہیں۔

اسی اہمیت کی وجہ سے اسلام نے اپنی تعلیمات میں پڑوس کو بہت اہمیت دی ہے، اور قرابت داروں کے مثل پڑوسیوں کے حقوق بھی بیان فرمائے۔ تاکہ پڑوسیوں کے ساتھ اچھے اور خوشگوار تعلقات استوار ہوں، اور دونوں گھرانوں میں اعتماد ومحبت کا ماحول پروان چڑھے۔ قرآن کریم میں جہاں والدین اور قرابت داروں وغیرہ کے حقوق بیان کئے گئے ہیں، ان کے ساتھ کئی جگہوں پر پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور ان کے دکھ درد میں شریک ہونے کی بھی تائید کی گئی ہے: "واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا وبالوالدین احسانا وبذی القربی والیتامی والمساکین والجار ذی القربی والجار الجنب والصاحب بالجنب"۔ (اور اللہ کی بندگی کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور قریبی ہمسایہ اور اجنبی ہمسایہ اور پاس بیٹھنے والے کے ساتھ بھی نیکی کرو (نساء ۳۶)۔ اس آیت کی رو سے پڑوسی کئی قسم کے ہیں، ایک تو وہ مستقل پڑوسی جو گھر سے متصل آباد ہیں، دوسرے وہ بھی پڑوسی ہیں جو کچھ وقت کے لئے ہمارے ساتھ رہتے ہیں، جیسے آفس میں ساتھ کام کرنے والے یا کاروبار اور ملازمت میں ساتھ رہنے والے ہیں۔ تیسرے وہ بھی پڑوسی ہیں جو سفر میں کچھ وقفہ کے لئے ساتھ ہوتے ہیں، وہ بھی اتنے وقت کے لئے پڑوسی ہوتے ہیں۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں ایسے تمام پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پڑوسی کو تکلیف پہنچانے سے منع فرمایا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تاکید فرمائی کہ پڑوسی کے ساتھ رشتہ محبت استوار کرنے کے لئے ان کے گھر میں کھانے پینے کے سامان بھیجا کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواتین کو تاکید فرمائی کہ اگر پڑوسی کے یہاں سے کوئی چھوٹا موٹا سامان آئے تو اسے بھی خوش دلی سے قبول کرو اور حقارت سے واپس نہ کرو، کہ اس سے دل شکنی ہوتی ہے اور تعلقات کشیدہ ہوتے ہیں۔ ایسے شخص کو سخت سزا کا مستوجب قرار دیا گیا جو اپنے پڑوسی کی بیوی پر بری نظر ڈالتا ہو۔ پڑوسی کے آرام وراحت اور اس کے ساتھ حسن تعلق کو اس قدر اہمیت دی گئی کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہوسکتا، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہوسکتا، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہوسکتا، (تین بار فرمایا) صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کون مومن نہیں ہوسکتا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص جس کے شر سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو"۔ پڑوسیوں کے حقوق کی اتنی تاکید ہوا کرتی تھی کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے پڑوسی کے تعلق سے فرشتہ جبریل اس قدر تاکید کرتے تھے کہ مجھے اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں پڑوسی کو میراث میں حصہ دار نہ بنا دیا جائے۔ دیکھئے یہ ہے پڑوسی کی اہمیت کہ خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جس طرح قرابت دار اور قریبی رشتہ دار کسی شخص کی میراث میں حصہ پاتے ہیں، یہی حیثیت پڑوسی کو حاصل ہو جائے گی کہ وہ قریبی رشتہ دار کی طرح میراث میں حصہ پانے کا حقدار ہو جائے گا۔

یہ خاندان کا وہ پورا ڈھانچہ ہے جس کو اسلام نے بہت ہی حسین، مستحکم اور متوازن بنایا ہے، یہ ایسا شجر طوبی ہے جس کی جڑیں بھی پیوست ہیں، جس کے تنے بھی مضبوط ہیں، جس کی شاخیں بھی سرسبز وشاداب ہیں، اور جس کا سایہ ایسا حسین، خوشگوار اور گھنیرا ہے کہ اس کے تلے چلنے والی آرام وراحت، محبت والفت، امن وسکون اور ہمدردی وایثار کی باد بہاری ہر فرد خاندان کے مشام جان کو معطر کر دیتی ہے۔

☆☆☆

اسلام کا مطلوب خاندانی نظام

پروفیسر محسن عثمانی ندوی[1]

اسلام جس مثالی معاشرے کو عام کرنا چاہتا ہے وہ اعلی درجہ کا صالح معاشرہ ہے، اور ہر معاشرہ کی سب سے اہم اکائی خاندانی نظام کی ہوتی ہے، اگر خاندانی نظام صالح اور مصلح اور صحت منداقدار کا آئینہ دار ہے تو ایسے خاندانوں سے مل کر جو معاشرہ تیار ہوگا، وہ صلاح وفلاح کا ضامن ہوگا، صالح اقدار کی چمک سے روشن ہوگا، خاندانی نظام کے لئے اسلام کا معیاری مطلوب کیا ہے؟ اس کو جاننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم خاندانی نظام کے عناصر اربعہ کو سمجھ لیں اور ان میں سے ہر ایک عنصر کے بارے میں اسلام کی جو رہنمائی ہے وہ ذہن میں رکھیں، اس سے ہمیں یہ اندازہ ہو جائے گا کہ اسلام کا مطلوب خاندانی نظام کیا ہے؟، صالح خاندانی نظام کے عناصر اربعہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ خاندانی نظام کی ایک اہم بنیاد شوہر ہے، وہ خاندانی زندگی کا سربراہ ہوتا ہے، جس طرح سے کسی قوم کا کوئی سربراہ ہوتا ہے اور اس سربراہ پر قوم کی ترقی واستحکام کی ذمہ داری ہوتی ہے، اسی طرح سے شوہر بھی خاندان کا سربراہ ہوتا ہے، اور خاندانی زندگی کے استحکام اور خوشگواری کی سب سے زیادہ ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے، شوہر کی اس حیثیت کو قرآن مجید میں ان الفاظ میں واضح کیا ہے: ''الرجال قوامون علی النساء'' (مرد عورتوں پر قوام ہیں)، قوام اس شخص کو کہتے ہیں جو ادارہ کے نظم کو ٹھیک ٹھیک چلائے، درست رکھے، اور ضروریات فراہم کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے، چونکہ اللہ تعالی نے مرد کو اور شوہر کو سربراہ اور نگراں کی حیثیت دی ہے، اس لئے اس کو اس کام کے لئے موزوں صلاحیتوں اور توانائیوں سے بھی نوازا ہے، یورپ نے جب اس حقیقت کو نظر انداز کیا اور مرد کی قوامیت کو ختم کیا اور آزادی نسواں کی تحریک چلائی تو وہاں کا خاندانی نظام درہم برہم ہوگیا، آج یورپ اور امریکہ کے حالات سے جو لوگ واقف ہیں یا وہاں رہ چکے ہیں وہ اس بات کے شاہد ہیں کہ مشرق میں خاندانی نظام میں جو مسرت وآسودگی، اطمینان اور استحکام پایا جاتا ہے وہ وہاں نہیں پایا جاتا، وہاں خاندانی نظام کا شیرازہ بکھر چکا ہے، وہ نہ کوئی سرپرست ہے اور نہ ماتحت، بچے بھی آزاد، والدین بھی آزاد، سکون وآسودگی سے سب محروم، نہ وہاں شوہر کو اپنے گھر کو راحت کدہ اور سکون ومسرت ونشاط کی جگہ بنانے کی فکر ہے، اور نہ بیوی اپنے شوہر کی وفادار اور نہ اس کا خوش دلی سے استقبال کرنے والی، اس گھر کو آراستہ کرنے والی، اور بچوں کی تربیت کرنے والی۔

۲۔ اسلام کے مطلوب خاندانی نظام میں دوسرے اہم عنصر کی حیثیت بیوی کی ہے، وہ گھر کی ملکہ بھی ہے، بچوں کی ماں اور ان کی دینی واخلاقی تربیت کی نگراں بھی ہے، اسی سے گھر کی زینت ہے، اسی سے خاندانی نظام کی رونق ہے، اسی سے خاندانی نظام کی بہار اور نکھار ہے، وہ اگر اللہ تعالی کے دیئے ہوئے احکام کو پورا کرتی ہے تو گھر جنت کا نمونہ ہوتا ہے، بیوی اور عورت کی ذمہ داری کے بارے میں قرآن میں ہے: ''فالصالحات قانتات حافظات للغیب بما حفظ اللہ'' (النساء: ۳۴) (نیک بیویاں شوہروں کی اطاعت گذار اور مردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت ونگرانی میں ان کے حقوق وامانتوں کی حفاظت کرنے والی ہیں)۔

بخاری اور مسلم کی حدیث ہے: (عورت اپنے شوہر کے گھر میں نگراں ہے اور اس سے ان افراد کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی جن پر وہ نگراں رہی ہے)۔

قرآن مجید میں آیا ہے: ''واذکرن ما یتلی فی بیوتکن من آیات اللہ والحکمۃ'' (الاحزاب: ۳۴) (یاد رکھو اللہ کی ان آیات وحکمت کی ان باتوں کو جو تمہارے گھروں میں سنائی جاتی ہیں)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا:

---

[1] صدر شعبہ عربی، EFL یونیورسٹی، حیدرآباد

''بہترین بیوی وہ ہے کہ جب تم اسے دیکھو تو تمہارا جی خوش ہو جائے، جب تم اسے کسی بات کا حکم دو تو وہ خوش دلی سے اطاعت کرے، اور جب تم گھر میں موجود نہ ہو تو وہ تمہارے پیچھے تمہارے مال واسباب اور اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کرے''۔

قرآن کی ان آیات سے اور احادیث سے ایک عورت کی جو بیوی ہو ذمہ داریاں معلوم کی جاسکتی ہیں، ایک صالح اور وفاشعار اور اپنی ذمہ داریوں سے واقف بیوی ہی ایک اچھی ماں بن سکتی ہے اور وہ شفقت ومحبت کے ساتھ بچوں کی تربیت اور پرورش کا کام انجام دے سکتی ہے، ان اولاد کے لئے مثالی ماں بن سکتی ہے، اور گھر روکش فردوس اور دین کا سرچشمہ اور اخلاقی اقدار کا مرکز بن سکتا ہے، ایسے مرد اور ایسی بیوی کی موجودگی سے ایک گھر صرف عشرت کدہ اور راحت وآسائش کا گہوارہ ہی نہیں، بلکہ اسلامی تہذیب کا مرکز بھی ہوگا اور پھر ایسے شوہر و بیوی کی موجودگی اس بات کی ضمانت ہوگی کہ گھر میں جو نسل تربیت پائے گی وہ بھی دین سے واقف، دین پر عامل اور اصلاح وتہذیب کا نمونہ ہوگی۔

۳۔ اسلام کے مطلوب خاندانی نظام کا تیسرا عنصر اولاد ہے، اولاد انسان کی آرزوؤں کا ثمرہ اور انسانی نسل کی بقاء اور تسلسل کی علامت ہے، اگر والدین کی تربیت کے نتیجے میں اولاد صالح اور فرماں بردار ہے تو پھر ان سے ماں وباپ کی آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کا سکون ہوگا، صالح اولاد صدقہ جاریہ کے حکم میں ہیں، ماں باپ کے بڑھاپے کے زمانے میں صالح اولاد ان کی خدمت وآرام کا ذریعہ ہے، ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے پوچھا کہ کیا ماں وباپ کے وفات کے بعد بھی ان کے ساتھ نیک سلوک کی کوشش ہوسکتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ چار طریقوں سے مرنے کے بعد حسن سلوک کیا جاسکتا ہے (۱) والدین کے لئے دعاو استغفار (۲) ان کے معاہدوں اور وصیتوں کو پورا کرنا (۳) ماں باپ کے دوستوں کی خاطر داری (۴) ان لوگوں کے ساتھ صلہ رحمی کرنا جو ماں وباپ کے واسطے سے تمہارے رشتہ دار ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''والدین اپنی اولاد کو جو سب سے بہتر تحفہ دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ اسے دینی تعلیم اور تہذیب سکھائیں''۔

اللہ تعالیٰ نے اولاد کے لئے جو تعلیم دی ہے اور جو ان کی ذمہ داری بتائی ہے وہ یہ ہے کہ (ترجمہ) آپ کے رب نے فیصلہ کرلیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو، مگر صرف اس کی، والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمہارے پاس کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو جائیں تو انہیں اف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو، اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو، اور دعا کیا کرو کہ پروردگار ان پر رحم فرما، جس طرح انہوں نے رحمت وشفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا'' (بنی اسرائیل ر ۲۳۔ ۲۴)

۴۔ اسلام کے مطلوب خاندانی نظام کا چوتھا عنصر والدین ہیں، والدین کے سلسلے میں کچھ اسلامی احکام کا تذکرہ تیسرے عنصر اولاد کے ذکر میں آگیا ہے، والدین کا مقام اتنا اونچا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کی رضا والدین کی رضا میں ہے اور اللہ کی ناراضگی والدین کی ناراضگی میں ہے'' (ترمذی)۔

حضرت ابوامامہؓ کا بیان ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: یا رسول اللہ! والدین کا اولاد پر کیا حق ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: والدین ہی تمہاری جنت ودوزخ ہیں۔ (ابن ماجہ)

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ آدمی ذلیل ہو، پھر ذلیل ہو، پھر ذلیل ہو، لوگوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کون آدمی؟ فرمایا: وہ آدمی جس نے اپنے والدین کو بڑھاپے کی حالت میں پایا، یا دونوں میں سے کسی ایک کو پایا، اور پھر ان کی خدمت کرکے جنت میں داخل نہ ہوا''۔ (مسلم)

ان سب احادیث سے اور قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں وباپ کی حیثیت خاندانی نظام کے فلک میں شمس وقمر کی ہے، اور اولاد کی حیثیت ستاروں کی ہے، اگر اسلام کے معیار مطلوب کے مطابق شوہر اور بیوی اولاد دین پر عامل ہو اور ماں وباپ کی فرماں بردار ہے تو پھر خاندان میں خوار یوسف کی طلعت افروزی بھی ہوگی اور مہتاب چہارم کی جلوہ آرائی بھی ہوگی اور ستاروں کی بزم بھی آراستہ ہوگی، اور پھر نور سے پرامن معاشرہ منور اور عطر بیز ہو جائے گا۔

☆☆☆

ازدواجی زندگی میں خواتین کے مسائل کے حل کے لئے فقہی تدابیر

قاضی عبدالجلیل قاسمی[1]

الحمد لله رب العلمين والعاقبة للمتقين والصلوة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وصحبه أجمعين۔

قرآن پاک میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں بالخصوص شخصی وخاندانی زندگی سے متعلق احکام وقوانین اور اصول وضوابط بیان کئے گئے ہیں۔اس لئے کہ دین اسلام قرآن وسنت نبویؐ کے ذریعہ شخصی اور خاندانی معاملات مثلاً نکاح، طلاق، رضاعت، عدت، مہر، نان ونفقہ، خلع، وراثت، وصیت، تعدد ازدواج، شوہر وبیوی کے حقوق، وغیرہ کے مسائل کے بارے میں تفصیل سے احکام وقوانین پیش کرتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ آزادی نسواں اور مساوات مرد وزن کے پرفریب نعروں کے ساتھ مغرب نے عریانیت اور فحاشی سے لبریز کلچر کو فروغ دیا۔ جو کلچر آج اس کے گلے کی ہڈی بن چکا ہے۔ یورپین کلچر اور عائلی قوانین نے امریکہ اور یورپ کے لئے ایسے سنگین مسائل کھڑے کئے ہیں جن کا حل تلاش کرنے سے امریکہ اور یورپ کے بڑے بڑے اہل فکر اور دانشور عاجز ہیں۔ وہاں کا فیملی سسٹم تباہ ہو رہا ہے، خاندانی نظام کی پسلیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی ہیں۔

ان حالات میں دین حق کے حاملین کی اہم ترین ذمہ داری ہے کہ دنیا کے سامنے اسلام کا نظام رحمت پوری جرأت، دانشمندی اور حکمت کے ساتھ پیش کریں اور یہ حقیقت پوری طرح واضح کریں کہ یورپ کی غیر انسانی تہذیب اور خود ساختہ غیر فطری عائلی قوانین نے دنیا کو تباہی کے جس دہانے پر لا کھڑا کیا ہے اس سے نجات کا واحد راستہ اسلامی تعلیمات اور اسلامی قوانین پر عمل کرنا ہے۔

زیر بحث مقالہ کا عنوان ''ازدواجی زندگی میں خواتین کے مسائل اور فقہی تدابیر'' بڑی تفصیل کا متقاضی ہے۔ آج ازدواجی زندگی میں خواتین کو درپیش مسائل بہت سے ایسے ہیں جو زمانہ کی مصنوعی پیداوار اور دین بیزار لوگوں کی ایجاد ہیں، چنانچہ آج معاشرہ میں خاندانی نظام اور ٹوٹتے ہوئے گھروں کا غیر جانب دارانہ جائزہ لیا جائے تو یہ بات کہنے میں ذرا بھی باک نہیں ہوگا کہ کل تک جب خاتون زینت خانہ تھیں ان کو عزت وتقدس اور عظمت وپاکیزگی حاصل تھی۔ لیکن جب وہ رونق بازار اور شمع محفل بننے لگیں تو پھر تقدس کی جگہ ہولناکی اور عظمت کی جگہ ذلت نے اپنا گھر بسالیا۔ ماضی میں جب تک شوہر کی فرمانبردار اور معاشرہ کے لئے ایک باحجاب اور باکردار خاتون تھیں تو سب کے لئے نمونہ اور آئینہ عمل تھیں، مگر جب فرمانبرداری، ناگواری میں تبدیل ہونے لگی اور حجاب کی جگہ برہنگی نے اپنا قبضہ جمایا تو وہ شوہر کے لئے ناقابل برداشت اور سماج کیلئے متاع کوچہ وبازار بن کر رہ گئیں۔

خاندانی نظام کو انسانی زندگی میں جہاں ایک وقار اور اعتبار حاصل ہے وہیں یہ انسانی سماج کی تعمیر وتشکیل میں ایک اہم بنیادی حیثیت کا حامل بھی ہے۔ اگر اس نظام میں کہیں خلل وفساد آتا ہے تو اس کا مطلب براہ راست ہوتا ہے کہ انسانی سماج میں بگاڑ وفساد آگیا ہے، جس کا سب سے پہلا نشانہ اور شکار آج کے عہد میں زوجین بنتے ہیں۔

مذکورہ مسائل کا حل ہمیں قرآن وسنت اور فقہائے امت کے اقوال میں تلاش کرنا ہے۔ چنانچہ سب سے بڑی خرابی اور بگاڑ کی جو وجہ آج ہمیں نظر آتی ہے وہ ہے ''مصنوعی ضروریات اور اس کی تکمیل کے لئے غیر شرعی وغیر فطری راستے کا انتخاب'' آج نام نہاد ترقی کے نام پر عورتوں کو ''معیار زندگی'' کا ایک سنہرا سا نعرہ دیدیا گیا ہے، جس کی تکمیل کے لئے جہاں وہ شوہر کی اجازت تو دور خود فطری حسن کی ضمانت حجاب وپردہ کو بھی وہ بالائے طاق رکھ دیتی ہیں۔ کام کاج کے لئے ایسے اداروں کا انتخاب ہوتا ہے جہاں کارکنان میں تمام مرد ہوتے ہیں اور حد تو یہ ہے کہ ڈیوٹی کا وقت کبھی دن تو

---

[1] قاضی شریعت، مرکزی دارالقضاء امارت شرعیہ، پھلواری شریف پٹنہ

کبھی رات کو رکھا جاتا ہے، جہاں سے زن وشو کے درمیان جھگڑے کی ابتدا ہوتی ہے۔

مصنوعی ضروریات:

جہاں ضروری لوازمات کے ساتھ صرف شوہر کی کمائی کے ذریعہ سادہ زندگی سے کام چل سکتا ہے وہاں غیر ضروری خرافات کی تکمیل کے لئے عورتوں کا ملازمت سے جڑنا اور پھر انتظام والنصرام کرنا مثلاً جو چیزیں عام بازاروں سے بھی مل سکتی ہیں۔ان کو برانڈیڈ کمپنیوں سے ہی حاصل کرنا، ایک فریج کی جگہ ہر روم میں الگ فریج کا انتظام، ایک ریڈیو کی جگہ مہنگی مہنگی ڈیک اور ساؤنڈ باکس، ایک کمپیوٹر کی جگہ مزید کمپیوٹر و لیپ ٹاپ، چند ضروری لباسوں کی جگہ برانڈیڈ کمپنیوں و فیشن ایبل لباسوں کی بھرمار، گھر میں سادہ کھانا کی جگہ ہوٹل کی پر تکلف ڈشیں الغرض وہ تمام غیر ضروری سامان ولوازمات جو یقیناً اسراف میں داخل ہیں اور محض دوسروں کی دیکھا دیکھی کا نتیجہ ہوتیں ہیں وہ سب مصنوعی ضروریات میں داخل ہیں جس سے قرآن کریم میں سختی سے روکا گیا ہے اور ان کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا ہے۔سورہ بنی اسرائیل میں ہے:۔

إن المبذرين كانوا إخوان الشياطين وكان الشيطان لربه كفوراً (السورة ۱۷،الآية ۲۷)

(فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے)۔

علامہ آلوسیؒ رقم کرتے ہیں:

أى انهم أصدقاهم وأتباعهم فيما ذكر من التبذير والصرف فى المعاصى فإنهم كانوا ينحرون الإبل ويتياسرون عليها ويبذرون أموالهم فى السمعة وسائر مالاخير فيه من المناهى والملاهى (روح المعانی ۹،۹۰)

(مذکورہ فضول خرچی میں یہ فضول خرچ افراد شیطان کے دوست اور اسی کے پیروکار ہیں اور اپنے اموال کو گناہ کے کاموں میں لگاتے ہیں۔کیونکہ ان کا عمل بھی یہ ہے کہ اونٹوں کو ذبح کر کے اس کو جوے کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور ریا کاری میں اپنے مال کو خرچ کرتے ہیں اور ایسی ایسی خرافات ومنہیات میں مال صرف کرتے ہیں جس میں بھلائی کا کوئی گذر نہیں)۔

علامہ قرطبیؒ رقم کرتے ہیں:

وقوله "إخوان" يعنى أنهم فى حكمهم إذ المبذر ساع فى إفساد كالشياطين أو أنهم يفعلون ماتسول لهم أنفسهم أو يقرنون بهم غداً فى النار ... الثالثة من أنفق ماله فى الشهوات زائداً على قدر الحاجات وعرضه بذلك للنفاء فهو مبذر (الجامع لأحكام القرآن للقرطبى:۹-۱۰-۱۶۳)

ظاہری بات ہے جب قرآن کریم نے ان جیسی منمانی ضروریات کو عمل شیطانی سے تعبیر کیا ہے تو اس کے ممنوع ہونے میں کیا شک رہ جاتا ہے لہذا سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان جیسی نامعقول ضروریات کی قباحت کو عیاں کیا جائے اور ان کی فقہی وقانونی حیثیت بھی لوگوں کے سامنے لائی جائے۔چنانچہ علامہ طحطاویؒ رقم کرتے ہیں:

الإسراف :العمل فوق الحاجة الشرعية فى فتاوى الحجر يكره صب الماء فى الوضوء زيادة على العدد والقدر المعهود لماورد فى الخبر شرار أمتى الذين يسرفون فى صب الماء (حاشية الطحطاوى :۸۰)

(فقہاء نے اسراف کا ایک وسیع دائرہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔چنانچہ جب وضو جو عبادت کا ذریعہ ہے اس میں قدر ضرورت اور قدر مسنون سے زائد اسراف ہے تو عام ضرورت کی چیزیں قدر حاجت سے زائد بدرجہ اولی اسراف میں داخل ہوں گی اور وہ ممنوع ٹھہریں گی)۔

ہمارے لئے اہم نمونہ:

گذران زندگی کے واسطے جب حضرت نبی اکرمؐ سے بی بی ہندہؓ نے یہ عرض کیا کہ کیا میں اپنے شوہر ابوسفیانؓ کے جیب سے ضروری اخراجات کے لئے خرچ کرنے کو دراہم لے سکتی ہوں؟ کیونکہ وہ بخیل ہیں کس کر دیتے نہیں! تو آپؐ نے جو کہا تھا اس کو ہم سمجھیں اور نمونہ عمل بنائیں آپؐ نے یہ

نہیں کہا کہ تم بھی کوئی کام کاج کرلو! بلکہ آپؐ نے یہ فرمایا کہ اتنا لے سکتی ہو جو تمہارے اور بچوں کے لئے کافی ہو جائے۔ (بخاری شریف: ۲/ ۸۸)

مذکورہ باتیں اس پر دال ہیں کہ ''مصنوعی ضروریات'' یا ''اسراف'' جہاں یہ محض دوسروں کی دیکھا دیکھی کا نتیجہ اور شیطانی عمل ہے وہیں فقہاء کی نگاہ میں ناپسندیدہ بھی ہے۔ اس لئے اس سے گریز بہر صورت لازم اور ضروری ہے۔

تاہم معیار زندگی بلند کرنے کے واسطے عورتوں کا ملازمت سے جڑنا یہ بھی آج اسلامی معاشرہ میں اہم اور نازک مسئلہ بن گیا ہے اور عورتوں کا بے محابا بلا کسی روک ٹوک واجازت ہر طرح کی ملازمت میں ان کے وجود کو لازم سمجھا جا رہا ہے۔ اگر ہم مصنوعی ضروریات کو نظر انداز کردیں تو عورت کو اپنے ضروری نفقہ کے لئے کمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی پیدائش کے بعد اس کا نفقہ اس کے والد کے ذمہ رہتا ہے۔ بالغہ ہونے کے بعد بھی جب تک اس کی شادی نہ ہو جائے اس کا نفقہ اس کے والد پر واجب ہوگا۔ شادی کے بعد اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہو جاتا ہے۔ اگر شوہر کا انتقال ہو جائے یا وہ طلاق دیدے تو اس کا نفقہ اگر اس کے لڑکے ہوں تو ان پر ہوگا۔ ورنہ والد پر ہوگا، یا اس کے دوسرے رشتہ داروں پر ہوگا جن کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے اگر کوئی ایسا رشتہ دار نہ ہو جو نفقہ دے سکے تو بیت المال پر ہوگا۔

اگر بیت المال کا نظام نہ ہو جیسا کہ آج کل ان ممالک میں ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں یا بیت المال کا نظام تو ہو لیکن وہ محتاج عورتوں کی ضروریات کے پورا کرنے سے قاصر ہو جیسا کہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ میں ہے۔ تو اس وقت عورت اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے آمدنی کا کوئی ذریعہ اختیار کرسکتی ہے۔ اسی میں ملازمت بھی داخل ہے۔

ولی کی اجازت اہم ہے:

قرآن کریم نے سورہ بقرہ آیت ۲۳۳ میں "وإن أردتم أن تسترضعوا أولادكم فلا جناح عليكم إذا سلمتم ما اٰتيتم بالمعروف" کہہ کر عورتوں کو دایہ کا پیشہ اختیار کرنے کا مجاز بنایا ہے، وہیں "وقرن في بيوتكن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولىٰ" (سورۃ الاحزاب) کے اندر گھروں میں رہنے کا پابند بھی کیا ہے۔

چنانچہ علامہ قرطبیؒ نے الجامع لاحکام القرآن میں یہ رقم کیا ہے:۔

''قوله ''إن أردتم أن تسترضعوا'' قلت وعلى هذا يكون في الآية دليل على جواز اتخاذ الظئر إذا اتفق الآباء والأمهات على ذلك''۔ (۳۔۴۔۱۱۴)

کہ یہ آیت دلیل ہے ان لوگوں کے لئے جو عورتوں کو بطور دایہ اجرت پر رکھنا چاہتے ہیں۔ ظاہری بات ہے مفسرین کے ضابطہ "العبرة للعموم" کے مطابق عورتیں دایہ سے بھی ہٹ کر دیگر صنعت وحرفت یا پیشہ وغیرہ باپردہ ہو کر اختیار کرسکتی ہیں۔ اس میں کوئی قباحت نہیں۔

پردہ کی ضرورت:

تاہم جہاں اس کا پیشہ فتنہ گری، بے حیائی یا بدقماشی کا سبب بنے گا وہاں یہ ''وقرن في بيوتكن'' کے تحت ان کو گھر میں ہی بیٹھے رہنا ہوگا کیونکہ اب عزت کو ہی صنعت وحرفت پر ترجیح ملیگی۔ چنانچہ فقہاء نے جو ضابطے مقرر کئے ہیں۔ ان کو اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ عزت وناموس کی حفاظت شریعت میں ہر چیز پر مقدم ہے۔ چنانچہ نماز میں بھی عورتوں کے لئے پردہ اور تستر کو سامنے رکھتے ہوئے گھر میں نماز ادا کرنے کو افضل کہا گیا۔ روایت میں ہے:

عن عبد الله ابن مسعود رضي الله عنه عن النبي ﷺ قال: صلوة المرأة في بيتها أفضل من صلاتها في حجرتها، وصلاتها في مخدعها أفضل من صلاتها في بيتها۔ (أبو داؤد: ۱۔۸۴)

آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ عورتوں کی نماز ان کے اندرونی کمروں میں زیادہ افضل ہے بمقابلہ گھر صحن کے اور اندرونی کمروں کے مقابلہ بالکل اندر کسی کونے میں زیادہ افضل وبہتر ہے۔

علامہ خلیل احمد سہارنپوریؒ اپنی مایہ ناز شرح بذل المجہود میں اس کی حکمت کو تحریر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

لأن مبنی أمرها علی التستر (بذل المجهود: ۱-۳۶۴) کہ اس طرح کی کیفیت کا حکم دینے کی بنیاد پورے طور سے پردہ میں عورتوں کے رہنے کا پابند بنانا ہے۔

تاہم مذکورہ اجازت کے ساتھ ایک اہم شرط ولی یا شوہر کی اجازت بھی ہے جسے آج کل نظرانداز کئے جانے پر بھی طرح طرح کے مسائل جنم لیتے ہیں حالانکہ شریعت میں عورتوں کو کمائی کے عمل سے فارغ کر کے کمائی کے وقت ان کو اذن ولی، یا اذن زوج کا پابند کیا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی عورت کہیں کام کاج کرنے لگے اور شوہر کی اجازت نہ لے تو فقہاء یہ حکم بتاتے ہیں کہ وہ جب تک کام پر رہے گی نفقہ کی مستحق نہ ہوگی اس لئے کہ جتنی دیر بلا اجازت کام میں لگے گی ظاہر ہے کہ وہ اپنے آپ کو سپرد کرنے سے باز رہے گی جس کو فقہاء ''حق احتباس'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ البحر الرائق میں علامہ ابن نجیم مصریؒ رقم کرتے ہیں:

لکن ذکر فی المجتبی: وإذا سلمت نفسها بالنهار دون اللیل أو علی عکسها لا تستحق النفقة لأن التسلیم ناقص، قلت: وبهذا عرف جواب فی واقعة زماننا بأنه إذا تزوج من المحترفات التی تکون عامة النهار فی الکارخانه واللیل مع الزوج لا نفقة لها۔ (البحر الرائق: ۴-۳۰۵)

یعنی جب پیشہ ور خواتین سے شادی کرلی اور وہ دن کا پورا حصہ کارخانہ میں ہی لگاتی ہے صرف رات شوہر کے ساتھ رہتی ہے تو یہ سپردگی ناقص ہے جس کی بنیاد پر اس کو نفقہ نہیں ملے گا۔

مذکورہ بالا باتوں کے علاوہ آج معاشرہ میں زوجین کے مابین تنازع کا ایک اہم سبب عورتوں کے حقوق کی رعایت نہ کرنا بھی ہے چنانچہ عام طور پر شوہر حضرات اپنی بیویوں کو اپنی مملوکہ سمجھ کر قدرت کے باوجود نہ تو ان کے لئے اچھے رہائش کا نظم کرتے ہیں اور نہ ہی اچھے لباس و پوشاک کا انتظام جس کی بنیاد پر عورتیں اپنے حقوق کے تئیں حساس بن کر مسائل کھڑا کر دیتی ہیں۔ جبکہ قرآن میں دوٹوک انداز میں کہا گیا ہے تمہارے اوپر بھی تمہاری بیویوں کے حقوق اسی طرح ہیں جس طرح کے تمہارے حقوق ان پر بھی سورہ بقرہ میں ہے: "ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف" (بقرہ: ۲۲۸)

چنانچہ "وعاشروهن بالمعروف" (النساء: ۱۹) کی تفسیر میں علامہ قرطبیؒ رقم کرتے ہیں:

"واستدل علمائنا بقوله تعالی "وعاشروهن" علی أن المرأة إذا کانت لا یکفیها خادم واحد أن علیه أن یخدمها قدر کفایتها۔ وقال الشافعی وابوحنیفة: لا یلزمه الا خادم واحد۔" (القرطبی: ۵-۶/۶۵) یعنی کہ بیوی کے لئے شوہر خادم کا نظم کرے اگر ایک کافی نہ ہو تو دوسرا بھی رکھے۔ تاہم ابوحنیفہؒ و امام شافعیؒ حضرات ایک ہی کو کافی قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح سے جب ایک سے زائد بیوی ہو تو ہر ایک کے ساتھ حسن معاشرت اختیار کرے، کسی ایک کے سامنے دوسری سے اپنی محبت کا اس طرح اظہار نہ کرے کہ اس کی دل شکنی ہو چنانچہ "ولن تستطیعوا أن تعدلوا بین النساء ولو حرصتم فلا تمیلوا کل المیل" کی تفسیر میں علامہ ابوبکر جصاص رازیؒ احکام القرآن میں نقل کرتے ہیں:

فجعل من حقها علیه ترك اظهار المیل إلی غیرها۔ (أحکام القرآن للجصاص: ۱-۴۵۳)

آگے رقم کرتے ہیں کہ ایک سے زائد کی صورت میں سب کے ساتھ مساویانہ سلوک برتتے حتی کہ شب گزاری میں بھی۔ تاکہ کسی کے دل میں نفرت وحسد کی چنگاری نہ سلگنے پائے اور گھر برباد نہ ہو۔

''وقد دل ذلك علی أن من حقها القسم بینها وبین سائر نسائه۔ (احکام القرآن للجصاص: ۱-۴۵۳)

آخر میں اہم بات آج کے بھاگتے دوڑتے تیز رفتار زندگی کے حوالے سے یہ تحریر کرنا ہے کہ جہاں کمائی کی خاطر انسان ایک مشین بن کر رہ گیا ہے وہیں وہ اعصابی طور پر اتنا کمزور و کھوکھلا ہو چکا ہے کہ اپنی بہت سی ضروریات سے منہ موڑنے پر آمادہ و تیار نظر آتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ صبح سے شام اور پھر رات تک اپنے کاموں میں لگے ہوتے ہیں ان کی بیویوں کے حقوق شاہانہ متاثر ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں عورتیں چڑچڑاپن کا شکار ہو جاتی

ہیں۔ اور کبھی کبھی یہ چڑ چڑا پن بہت ہی باغیانہ وعیاشانہ راہ اختیار کر لیتی ہے۔ اس لئے اس امر پہ بھی قرآن نے پورے طور سے واضح انداز میں حکم دیا ہے کہ ان کی فطری خواہشوں کی تکمیل بھی شوہر حضرات کریں۔ علامہ ابوبکر جصاص رازیؒ تحریر کرتے ہیں:

"ویدل علیه أن علیه وطأها لقوله تعالی (فتذروها کالمعلقة) (النساء:۱۲۹) (أحکام القرآن: ۱/ ۴۵۳) یعنی بیویوں کے حقوق شابانہ لازماً ادا کرے۔

بیوی کے حقوق کی رعایت اس قدر کی گئی ہے کہ کوئی شخص رات دن عبادت میں مصروف رہے دن کو روزے رکھے رات بھر نفل نماز ہی ادا کرتا رہے، جس کی وجہ سے بیوی کے حق کی ادائیگی میں کوتاہی ہو جائے تو اس کو شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ قرار نہیں دیا گیا ہے چنانچہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں ایک عورت آئی اور اس نے اپنے شوہر کے عدم اداء حقوق زوجیت کے متعلق ان الفاظ میں استغاثہ کیا: یا امیر المؤمنین! إن زوجی یصوم النهار ویقوم اللیل وانا اکرہ ان اشکوہ (اے امیر المؤمنین! میرا شوہر دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات بھر خدا کی عبادت کرتا ہے اور میں اپنے شوہر کی شکایت کرنے کو برا سمجھتی ہوں)۔ حضرت عمرؓ نے سن کر فرمایا: نعم الرجل ذلك (تمہارا شوہر بڑا اچھا آدمی ہے)۔ عورت نے یہ سن کر پھر اپنی بات دہرائی، حضرت عمرؓ نے پھر وہی جواب دیا اور کچھ مزید بات نہیں فرمائی۔ حضرت کعب بن سورؓ نے جو حضرت عمرؓ کی خدمت میں بیٹھے تھے کہا: یا امیر المؤمنین! انها تشکو زوجها فی هجرہ فراشها (یہ عورت اپنے شوہر کے عدم اداء حقوق زوجیت کی شکایت کر رہی ہے) تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: کما فهمت اشارتها فاحکم بینهما (جس طرح تم نے اس کے اشارہ کی بات کو سمجھا ہے تم ہی دونوں کے درمیان فیصلہ کرو)۔ حضرت کعبؓ نے اس کے شوہر کو بلوایا، جب وہ آیا تو عورت سے کہا کہ تم کیا کہتی ہے؟ تو اس عورت نے یہ شعر پڑھا۔ جس کا ترجمہ ہے: اے عقلمند قاضی! میرے رفیق جناب (شوہر) کو میرے بستر سے ان کی مسجد نے غافل کر رکھا ہے۔ آپ ان کو ہدایت کیجئے۔ ان کی عبادت نے ان کو میرے ساتھ سونے سے بیزار کر دیا ہے۔ اور وہ ان کو رات دن کسی وقت سونے نہیں دیتی ہے۔ عورتوں کے حق میں ان کو لائق ستائش نہیں سمجھتی ہوں۔ حضرت کعبؓ نے اس کے شوہر سے کہا: تم اس کے جواب میں کیا کہتے ہو؟ تو انہوں نے اپنا جواب شعر ہی میں دیا: مجھ کو عبادت نے اپنی بیوی کے بستر اور اس کی مچھر دانی کے اندر جانے سے روک دیا ہے اور اب میں ایسا آدمی ہوں جس کو ان آیتوں نے جو سورہ نمل اور سبع طوال میں نازل ہوئی ہیں مدہوش کر دیا ہے۔

اس جواب کو سننے کے بعد حضرت کعبؓ نے بھی اپنا فیصلہ دیا۔ اور اس کو حکم دیا کہ مجامعت عورت کا حق ہے تم اس سے چار شب میں ایک شب ضرور ملا کرو۔ اور اپنے حیلوں سے باز آؤ۔ اس فیصلہ کو سن کر حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ یہ فیصلہ تم نے کس بنیاد پر کیا تو حضرت کعبؓ نے جواب دیا: یہ اس لئے کہ اللہ تعالی نے آزاد مرد کے لئے چار بیویوں کو مباح قرار دیا ہے۔ لہذا ہر ایک بیوی کے حق میں ایک دن اور ایک رات ہے اور ہر رات چوتھی رات ہوگی۔ حضرت کعبؓ کے اس جواب کو سن کر حضرت عمرؓ بہت مسرور ہوئے اور ان کو بصرہ کا قاضی بنا دیا۔ واللہ اعلم

☆☆☆

مشترکہ خاندانی نظام......فوائد اور نقصانات

سید احمد ومیض ندوی[1]

خاندان، آغاز اور تاریخی پس منظر

انسان کو دیگر جانداروں سے ممتاز کرنے والی منجملہ خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت اجتماعیت ہے۔ انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ وہ دیگر حیوانات کی طرح اپنے خاندان، معاشرہ اور سماج سے کٹ کر تنہا زندگی نہیں گزار سکتا۔ خلاقِ کائنات نے حضرتِ انسان کی تخلیق ہی کچھ اس انداز سے فرمائی ہے کہ وہ قدم قدم پر اپنے جیسے دوسرے انسانوں کا محتاج ہے۔ غذا، لباس، مکان اور دیگر ضروریات کی تکمیل دوسرے افرادِ انسانی کے بغیر نہیں کرسکتا۔ آپسی تعاون انسانی زندگی کی ایک ایسی ناگزیر ضرورت ہے کہ اس کے بغیر ایک قدم بھی آگے بڑھایا نہیں جاسکتا۔ پھر خونی رشتہ کے اعتبار سے جس سے جتنا گہرا تعلق ہوتا ہے انسان اس کا اتنا ہی زیادہ محتاج ہوتا ہے۔ دنیا میں قدم رکھنے والے کمزور و ناتواں نومولود کو سب سے زیادہ ماں کی احتیاج ہوتی ہے۔ قدم قدم پر ماں اس کے لیے سایۂ رحمت ثابت ہوتی ہے۔ شیر خوار کے لیے ماں کے بغیر چند گھنٹے بھی گراں گزرتے ہیں، ماں کے بعد تعلق اور ضروریات کی تکمیل کے اعتبار سے باپ کا نمبر آتا ہے، باپ اپنی بے پناہ شفقتِ پدری کے سبب بچہ کی ہر ضرورت کی تکمیل کرتا ہے۔ پیدا ہونے والا بے شعور بچہ روزِ اول سے ماں باپ سے مانوس رہتا ہے، اس کے بعد جوں جوں عمر بڑھتی رہتی ہے بھائی بہن اور دیگر خونی رشتہ داروں سے اسے انسیت ہونے لگتی ہے۔ اس طرح بتدریج ایک خاندان تشکیل پاتا ہے۔ افراد سے خاندان وجود میں آتا ہے اور مختلف خاندانوں سے معاشرہ کی صورت گری ہوتی ہے۔ خاندانی نظام کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود انسانی تاریخ قدیم ہے۔ روئے زمین پر جب اولین مرد اور اولین خاتون کی حیثیت سے حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام اتارے گئے تو یہیں سے خاندان کی تشکیل کا آغاز ہوا، بلکہ عالمِ بالا میں حضرت آدم کی تخلیق کے بعد جب ان سے حضرت حوا کو پیدا کیا گیا تو گویا وہیں خاندان کی پہلی خشت رکھی گئی۔ پہلے انسانی جوڑے کے زمین پر اتارے جانے کے بعد جب توالد و تناسل کا سلسلہ چل پڑا تو نسلِ انسانی کا ارتقاء ہونے لگا اور اس طرح شدہ شدہ خاندانی نظام مستحکم ہونے لگا۔ انسان بچپن جوانی بوڑھاپہ، عمر کے ان تینوں مرحلوں میں خاندانی رابطہ کا محتاج ہوتا ہے۔ بچپن میں تو وہ بالکلیہ اہلِ خاندان کی نگہداشت میں ہوتا ہے۔ ماں باپ اور دوسرے قریبی خونی رشتہ دار اس کی پرورش اور ساخت و پرداخت میں بھرپور رول ادا کرتے ہیں۔ عہدِ شباب میں بھی اسے خاندانی رابطہ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن عمر کے اس مرحلہ میں وہ خاندان سے تعاون لینے کے ساتھ خاندان کو تعاون دینے کے موقف میں ہوتا ہے۔ پھر جب وہ بڑھاپہ کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے تو پورے طور پر خاندانی تعاون کا محتاج ہو جاتا ہے۔

خاندان کی اہمیت

خاندان اور خاندان سے وابستگی انسان کی ایک فطری ضرورت ہے اور اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لیے اسلام عائلی زندگی کے تعلق سے بھرپور رہنمائی کرتا ہے، اسلام خاندانی استحکام پر زور دیتا ہے، خاندانی رشتوں کا لحاظ اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک پر قرآن وحدیث میں کافی زور دیا گیا ہے۔ صلہ رحمی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید میں ایک سے زائد مقامات پر توحید کے ساتھ قرابت داری کا لحاظ رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: واعبدوا الله ولا تشرکوا به شیئا وبالوالدین احسانا وبذی القربی والیتامی والمساکین (نساء: ۳۶)۔ اور خدا ہی کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں وباپ، قرابت والوں، یتیموں، محتاجوں، رشتہ داروں، ہمسایوں، اجنبی ہمسایوں، رفقاء پہلو، مسافروں اور جو لوگ تمہارے قبضہ میں ہوں سب کے ساتھ احسان کرو۔ بنی اسرائیل سے اللہ تعالیٰ نے جن اہم باتوں کا عہد لیا

---

[1] استاذ حدیث دار العلوم حیدرآباد

تھا ان میں قرابت داروں کے ساتھ حسنِ سلوک بھی شامل ہے۔ احادیث میں رشتہ داری کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ ''رشتہ'' رحمن سے جڑا ہوا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جس نے تم کو جوڑا اس سے جوڑوں گا اور جس نے تم کو کاٹا اس سے کاٹوں گا (بخاری)۔ صلہ رحمی اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کو رزق میں کشادگی اور عمر میں برکت کا ذریعہ قرار دیا گیا، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جس کو اس کی خوشی ہو کہ اس کے رزق میں کشادگی اور موت کو مؤخر کیا جائے تو اسے چاہیے کہ وہ رشتوں کو جوڑے۔ (بخاری ومسلم)

خاندان کی مختلف قسمیں

قدیم زمانہ سے خاندان کی مختلف شکلیں رائج ہیں، خاندان چھوٹے بھی ہوتے ہیں اور بڑے بھی خاندان کی تین بڑی شکلیں عام ہیں۔

(۱) مختصر خاندان: جسے اصطلاح میں نیوکلیئر خاندان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ خاندان بیوی بچوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بسا اوقات ماں وباپ اور بہت قریبی رشتہ دار بھی اس میں ضم کر لیے جاتے ہیں۔ بعض اہلِ علم خاندان کی اس شکل کو سب سے قدیم شکل تصور کرتے ہیں۔

(۲) توسیعی خاندان: یہ خاندان کی دوسری شکل ہے، جس میں آدمی اپنی ایک یا ایک سے زائد بیویوں اور بچوں کے ساتھ الگ مکان میں رہائش پذیر ہوتا ہے۔ جہاں تک اس کے شادی شدہ بچوں کا تعلق ہے تو بعض اپنا الگ خاندان تشکیل دیتے ہیں اور بعض اس کے ساتھ رہائش اختیار کرتے ہیں۔ یہ سب اگرچہ ایک ہی مکان میں قیام کرتے ہیں لیکن ان میں سے ہر کمانے والا افراد اپنے بیوی بچوں کے مصارف کا خود متحمل ہوتا ہے۔ کھانے پینے کا نظم مشترک ہو تو اپنی آمدنی یا خرچ کے لحاظ سے مجموعی مصارف میں حصہ لیتا ہے۔

(۳) مشترکہ خاندان: یہ خاندان کی قدیم شکل ہے، جس کے لیے جوائنٹ فیملی کی اصطلاح رائج ہے۔ زیر نظر تحریر کا اصل موضوع خاندان کی یہی شکل ہے۔ مشترکہ خاندان اسے کہا جاتا ہے جس میں ایک باپ کی بالخصوص نرینہ اولاد اور ان کے بچے سب مل کر رہتے ہیں اور مشترکہ طور پر خاندان کی معاشی ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں۔ سب کے کھانے پینے اور قیام کا نظم ایک مکان میں ہوتا ہے۔ مشترکہ خاندان کے تعلق سے یہ بات مشہور ہے کہ خاندان کا یہ نظام تاریخ کے زرعی دور میں وجود میں آیا۔ چونکہ زراعت میں جتنے زیادہ افراد شریک ہوں اس کے بہتر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں اس لیے اس دور میں اسے فروغ حاصل ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ انسانی معاشروں کے ابتدائی دور میں خاندان کی یہی شکل رائج تھی۔ مشترکہ خاندان جہاں اپنے اندر بعض خوبیاں رکھتا ہے وہیں اس کی خامیوں کا دائرہ کافی پھیلا ہوا ہے۔ مشترکہ خاندان کے جہاں فوائد ہیں وہیں نقصانات بھی ہیں۔ اور شاید اس کے نقصانات فوائد سے کہیں زائد ہیں۔ اور اگر گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ مشترکہ خاندان کے مقابلہ میں مختصر اور علیحدہ خاندانی نظام مزاجِ شریعت سے زیادہ قریب اور احکام شرعیہ سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ آئندہ سطور میں پیش کی جانے والی تفصیلات سے اس پہلو پر خوب روشنی پڑے گی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مشترکہ خاندان کے فوائد ذکر کئے جائیں پھر اس کے نقصانات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ واضح کیا جائے کہ کس قسم کا خاندانی نظام اقرب الی الکتاب والسنۃ ہے اور کون سا نظام اصول شریعت سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

مشترکہ خاندان کے فوائد

دیہات سے شہروں کی طرف نقل مکانی کے بڑھتے رجحان کے پیش نظر اگرچہ جداگانہ خاندانی نظام کے امکانات میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن اس کے باوجود چونکہ ہندوستان کی ۸۰ فیصد آبادی دیہاتوں میں آباد ہے اور بیشتر دیہاتوں میں اب بھی مشترک خاندانی نظام نہ صرف رائج ہے بلکہ اسے ایک طرح کا تقدس بھی حاصل ہے، اس لیے مشترکہ خاندانی نظام کی افادیت کے پہلو سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پرانے خاندانی بزرگ اپنی اولاد کو تادمِ آخر اس بات کی تاکید کرتے تھے کہ وہ آپس میں مجتمع رہیں اور ان کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے۔ اس پس منظر میں مشترک خاندانی نظام کے افادیت کے پہلوؤں کو اجاگر کرنا نفع سے خالی نہیں، سرسری نظر میں مشترک خاندانی نظام کے درج ذیل فوائد سمجھ میں آتے ہیں۔

خاندان میں اتحاد واجتماعیت

اسلام اجتماعیت اور اتحاد کا پُرزور داعی ہے۔ اسلامی تعلیمات میں اتحاد واجتماعیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ارکانِ اسلام جن پر اسلام کی

عمارت قائم ہے اتحاد کا مظہر ہیں، نماز با جماعت سارے اہلیان محلہ کو مجتمع رکھتی ہے، زکوۃ معاشرہ کے امراء اور فقراء میں ایک دوسرے سے ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتی ہے، رمضان المبارک کے روزوں سے مسلمانوں کی اجتماعیت جھلکتی ہے، حج ملت اسلامیہ کی عالمی وحدت کا مظہر ہے، علاوہ ازیں قرآن وسنت میں بار بار مسلمانوں کو آپس میں متحد رہنے اور آپسی تفرقہ سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ارشاد ہے: واعتصموا بحبل الله جميعا ولاتفرقوا (آل عمران: ۱۰۳)۔ اسلام جس طرح بحیثیت ایک ملت کے تمام مسلمانوں کے اتحاد پر زور دیتا ہے، اسی طرح ایک خاندان کے افراد کو بھی شیر وشکر بن کر رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ اسلام میں خاندانی استحکام کی بڑی اہمیت ہے۔ خاندانی استحکام کے بغیر مستحکم معاشرہ کی تشکیل ممکن نہیں۔ خاندان میں استحکام یا اس کے مختلف افراد کے درمیان اتحاد کے لیے مشترکہ خاندانی نظام جس قدر موزوں ہوسکتا ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں، ایک گھر اور ایک چھت تلے جب سب بود وباش اختیار کریں گے تو لامحالہ اس سے آپس میں جوڑ اور تعلقات میں استحکام پیدا ہوگا۔ خاندانی افراد کا آپسی اتحاد مخالفین کے لیے رعب ودبدبہ کا باعث بنے گا۔ دوسروں کی جانب سے جارحیت کے مظاہرہ کی صورت میں متحدہ مقابلہ آسان ہوگا۔ اگر خاندان تقسیم ہوجائے تو اس کے ساتھ اس کی قوت بکھر جائے گی اور رعب اور دبدبہ کی جگہ محکومی اور مرعوبیت لے گی۔

مالی استحکام:

سارے لڑکوں کے ایک ساتھ رہنے سے کاروبار اور آمدنی کے ذرائع نہ صرف برقرار رہیں گے بلکہ اجتماعی کاروبار کی وجہ سے اس میں مزید اضافہ ہوگا، باپ کا بنا بنایا کاروبار خاندان کی تقسیم کے سبب بکھر جاتا ہے اور تجربہ کار افراد سے محرومی بسا اوقات کاروبار کو مکمل ٹھپ کرکے رکھ دیتی ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام خاندان کے مالی موقف کو مضبوط کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوتا ہے۔ کتنے کاروباری گھرانے خاندان کی تقسیم کے سبب کنگال ہوگئے۔ زراعت پیشہ خاندان کے پس منظر میں مشترکہ خاندان کی اہمیت کو زیادہ بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ زراعت کے لیے جہاں افرادی قوت کی ضرورت ہوتی ہے وہیں زمین وجائیداد کا ارتکاز بھی ضروری ہوتا ہے۔ صنعتی انقلاب کے سبب اگرچہ زندگی کی خوشحالی کا مرکز ثقل بڑی حد تک زراعت سے صنعت کی طرف منتقل ہوچکا ہے، لیکن اس کے باوجود برصغیر کے بیشتر ممالک میں دیہاتی آبادی کا ذریعہ معاش زراعت ہی ہے، کاشت کی زمین جتنی زیادہ ہوگی پیداوار میں اضافہ ہوگا، خاندان در خاندان تقسیم کے سبب جائیداد گھٹتی جائے گی اور تقسیم کے بعد بہت سے لڑکے جائیداد فروخت کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں، اس طرح مجموعی حیثیت سے خاندان کا مالی موقف کمزور سے کمزور تر ہوجائے گا۔

بوڑھے والدین اور خاندان کے کمزور افراد کی نگہداشت

اسلام میں ماں وباپ کی خدمت اور خاندان کے کمزور افراد کے تعاون کی کس قدر اہمیت ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ پھر جب والدین بڑھاپے کی عمر کو پہونچ جائیں تو ان کی خبر گیری اور نگہداشت اولاد کا اولین فریضہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں بارہ مقامات پر ماں وباپ کے ساتھ حسن سلوک کی تائید کی گئی ہے۔ اور اکثر مقامات پر خدا کی عبادت کے ساتھ والدین کی حق شناسی کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: وقضی ربك الا تعبدوا الا اياه وبالوالدين احسانا، اما يبلغن عندك الكبر احدهما اوكلاهما فلا تقل لهما اف ولا تنهرهما وقل لهما قولا كريما (بنی اسرائیل)۔ تمہارے رب نے حکم دیا ہے کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو، اگر دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہونچ جائیں تو انہیں اف تک نہ کہو اور نہ انہیں جھڑک کر جواب دو اور ان سے بات کرو تو ان کا اکرام ملحوظ رکھ کر بات کرو۔

احادیث میں ماں وباپ کے حق کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ وہ اولاد کے لیے جنت ہیں یا جہنم ہیں (ابن ماجہ ابواب الادب، باب برالوالدین)۔ یعنی آدمی ان کی خدمت کرکے جنت کا بھی مستحق ہوسکتا ہے اور اس میں کوتاہی کرکے جہنم کا بھی سزاوار ہوسکتا ہے۔ ایک حدیث میں اس شخص کو انتہائی محروم بتایا گیا جو اپنے والدین کے بڑھاپے کو پائے اور ان کی خدمت کرکے اپنے کو جنت کا مستحق نہ بنالے (مسلم شریف جلد ۲ کتاب البر والصلۃ)۔ ایک روایت میں ماں وباپ کی خوشی کو رب کی خوشی اور ان کی ناراضگی کو رب کی ناراضگی قرار دیا گیا (ترمذی جلد ۲ باب ماجاء من الفضل فی رضا الوالدین)۔ کتاب وسنت کے ان نصوص کی وجہ سے فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے کہ کسی کے والدین اگر محتاج ہوں اور وہ مالدار ہو تو اسے اس کے والدین کے نفقہ کے لیے مجبور کیا جائے گا (المبسوط للسرخسی ۲۲۲/۵)۔ حتی کہ اگر والدین کافر ومشرک ہوں تب بھی اولاد سے ان کے نفقہ کی ذمہ داری ساقط نہیں ہوگی (ہدایہ ۴۲۷/۲)۔ ماں وباپ کی نگہداشت اور ان کی مکمل دیکھ ریکھ مشترکہ خاندان ہی سے ممکن ہے۔ جداگانہ خاندانی نظام میں ہر شخص اپنی بیوی وبچوں کے

مسائل میں ہمہ تن مصروف رہتا ہے۔موجودہ شہری زندگی میں آدمی کے لیے وقت نکال کر بار بار ماں وباپ سے ملاقات کرنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ایک چھت کے نیچے ساری اولاد ہو اور ماں وباپ ساتھ رہتے ہوں تو ان کی نگہداشت اور بروقت خدمت آسان ہوتی ہے۔

اسی طرح خاندان کے یتیم اور مالی اعتبار سے کمزور افراد کا تعاون بھی مشترکہ خاندان کی صورت ہی میں بہتر طریقہ پر ممکن ہے۔جداگانہ خاندان میں کسی کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ دوسروں کی دیکھ ریکھ کرے اور احوال وکوائف سے واقفیت حاصل کرے۔خاندان کے کمزور افراد بے یارومددگار چھوڑ دیئے جائیں تو اس سے خاندان کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

کمسن اولاد کی کفالت

ماں وباپ بڑھاپے اور کمزوری کے سبب روزگار کے قابل نہ رہیں اور ان کی کمسن اولاد ہو تو ایسے میں اگر شادی شدہ اولاد اپنا الگ خاندان بسالے تو ماں وباپ کی کمسن اولاد کی کفالت کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔اس کے برخلاف مشترکہ خاندان کی صورت میں بڑی اولاد اپنے کمسن بھائیوں کی کفالت کا بوجھ اپنے سر لے لیتی ہے۔باپ کی عدم موجودگی میں بھائی اپنی چھوٹی بہنوں اور بھائیوں کی باپ کی طرح پرورش کرتا ہے،ان کی تعلیم اور شادی بیاہ کی ساری ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر لیتا ہے،خاندان کی تقسیم کی صورت میں ہر شخص اپنی بیوی اور بچوں کی ذمہ داریوں میں مصروف ہو جائے گا۔

قناعت وکفایت شعاری

مشترکہ خاندان کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ سارے افراد جب ایک گھرانے سے منسلک ہوں گے تو گھر کی تمام سہولتوں کے مشترک ہونے کے باعث کفایت شعاری اور معاشی بچت ہوگی۔استعمالی اشیاء مشترک ہوں اور کھانا پینا بھی اجتماعی ہو تو اس سے اخراجات میں کافی کمی آئے گی۔اس کے برخلاف جداگانہ خاندان میں ہر شخص کو علیحدہ علیحدہ ساری ضروریات کا انتظام کرنا ہوگا۔

مشترکہ خاندان کے نقصانات

یہ اور اس قسم کے دیگر بعض فوائد مشترکہ خاندان کے ضمن میں ذکر کئے جاتے ہیں،لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے،تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ مشترکہ خاندانی نظام اپنے اندر بہت سی ناہمواریاں اور متعدد پہلوؤں سے معاشرتی زندگی کے لیے نقصان کا باعث ہے۔شرعی نقطۂ نظر سے بھی اس نظام میں بڑی بے اعتدالیاں پائی جاتی ہیں۔نفسیاتی اعتبار سے بھی اس کے ان گنت مفاسد ہیں،اور جنسی ومعاشرتی نقطۂ نظر سے بھی وہ اپنے اندر بے پناہ نقصانات رکھتا ہے۔اس کے ساتھ یہ پہلو بھی توجہ طلب ہے کہ مشترکہ خاندانی نظام کے ہوتے ہوئے بہت سے دینی احکام پر عمل آوری مشکل ہوتی ہے۔

نفسیاتی نقصان

مشترکہ خاندانی نظام میں عموماً بڑے لڑکے کی حکمرانی ہوتی ہے،بڑا لڑکا گویا سرپرست خاندان کا درجہ حاصل کر لیتا ہے،باپ کی جانب سے بڑے لڑکے کو اہمیت دینے والا سلوک دیگر بچوں پر نفسیاتی لحاظ سے منفی اثر ڈالتا ہے۔چنانچہ دیگر بھائی جہاں باپ سے متنفر ہونے لگتے ہیں وہیں ان میں بڑے بھائی کے تعلق سے معاندانہ جذبات پرورش پانے لگتے ہیں۔یہ صورت حال نفسیاتی تربیت کے لحاظ سے انتہائی نقصان دہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسلام میں باپ کو اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ وہ اپنے مختلف بیٹوں کے درمیان مساوات اور برابری کا سلوک کرے،اولاد کے درمیان برابری کے برتاؤ کو اولاد کے حقوق میں شامل کیا گیا ہے۔غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ بڑے لڑکے کی بالادستی کا تصور ہندوانہ طرز معاشرت کا چربہ ہے۔ہندو مذہب کی قدیم کتاب منوسمرتی میں روایتی مشترکہ خاندانی نظام کو استحکام بخشنے کے لیے باپ کے بعد بڑے بیٹے کو پوری جائیداد کا تنہا وارث قرار دیا گیا ہے اور چھوٹے بھائیوں کو ہر طرح سے بڑے بھائی پر منحصر رکھا گیا ہے (دیکھئے منوسمرتی: ادھیائے ۹:۱۰۵ تا ۱۰۸ ترجمہ لالہ سوامی دیال صاحب)۔اسلام سے قبل کے دور جاہلیت میں بھی یہی تصور غالب تھا۔باپ کے انتقال کے بعد بڑا بیٹا بیوی اور چھوٹے لڑکوں کو ترکہ سے محروم کر کے خود تنہاء وارث ہوتا تھا۔حتی کہ وہ مرحوم کی بیوہ کا وارث تک ہو جاتا تھا۔(جامع البیان ۴/۱۴۲)

علاوہ ازیں اس نظامِ خاندان کے نفسیاتی نقصان کا ایک پہلو یہ ہے کہ ایک مکان میں مختلف شادی شدہ لڑکوں کے رہائش پذیر ہونے سے انسان کو نجی زندگی کا تحفظ اور پرائیوسی حاصل نہ ہونے سے وہ بے اطمینانی کی کیفیت سے دوچار ہوجاتا ہے۔ ہر انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ اس کے لیے الگ مکان تمام تر سہولیات کے ساتھ حاصل ہو جہاں وہ آزادی کے ساتھ اپنی بیوی و بچوں کے ساتھ رہ سکے۔ نیز مشترکہ خاندانی نظام عدمِ تسکین کے اعتبار سے بھی نفسیاتی نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ مشترکہ پھیلے ہوئے گھر میں جہاں سارے لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہے جنسی تسکین کے مواقع حاصل نہیں رہتے۔ جب کہ شادی کے بعد ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے جنسی تسکین کے بھرپور مواقع حاصل ہوں۔ شادی کے بعد اپنے اہل خانہ کے ساتھ حدود میں رہتے ہوئے بے تکلف معاشرت شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ نہیں ہے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ کے ساتھ جنابت کا غسل ایک برتن کے پانی سے فرماتے تھے (بخاری جلد ا باب غسل الرجل مع امرأتہ)۔ اس قسم کی روایات سے جہاں معاشرتی خوشگواری ظاہر ہوتی ہے وہیں جنسی تسکین کا نفسیاتی پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے۔ بصورتِ دیگر آدمی کی پاکیزگیٔ قلب و نظر متاثر ہوتی ہے۔

معاشرتی نقصان

معاشرتی پہلو سے مشترکہ خاندان اپنے اندر بڑی ناہمواریاں رکھتا ہے۔ آدمی کو مشترکہ خاندان سے منسلک رہ کر قدم قدم پر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مشترکہ رہائش کے سبب سارے گھر والوں کے لیے ایک ہی قسم کے کھانے کا نظام رائج ہوگا۔ ایک ساتھ کھانے میں آدمی کو اپنی پسند اور اپنی ترجیحات سے دستبردار ہونا پڑتا ہے جو کسی بھی بااختیار انسان کے لیے مصیبت سے کم نہیں۔ پھر یہ کہ گھر سے ملحق دیگر سہولتوں کے مشترکہ ہونے سے ہر جگہ بھیڑ بھاڑ سے دوچار ہونا پڑتا ہے جس سے آدمی کو مستقل بے اطمینانی لاحق رہتی ہے۔ نیز خانگی ذمہ داریوں میں بیوی کے ساتھ شوہر کی شرکت تقریباً ناممکن ہوتی ہے۔ اسلامی عائلی نظام میں اس کی بڑی اہمیت ہے کہ شوہر بیوی کا تعاون کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے کاموں میں اپنی ازواج کا تعاون فرماتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے اندر کے معمولات کے بارے میں دریافت کرنے پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا آپ گھر میں ہوتے تو اس کے کام کاج میں لگے ہوتے، جب نماز کا وقت ہوتا تو مسجد کا رخ کرتے (بخاری جلد ۲ باب خدمۃ الرجل فی اہلہ)۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ کپڑے سیتے، جوتے گانٹھتے اور وہ تمام کام کرتے جو دوسرے مرد اپنے گھروں میں کرتے ہیں (مسند احمد ۶/ ۱۲۱)۔ ظاہر ہے کہ اہلِ خاندان کے ساتھ تعاون کی یہ شکل مشترکہ خاندان میں ممکن نہیں۔

مشترکہ خاندانی نظام کے معاشرتی نقصان کا ایک پہلو یہ ہے کہ افرادِ خاندان کے ساتھ تعلقات میں خرابی پیدا ہوجاتی ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ جن لوگوں کے ساتھ ہمیشہ رہتا ہے ان سے اس کی طبیعت میں ایک طرح کی بیزاری پیدا ہوجاتی ہے۔ انسان کی اسی نفسیاتی کمزوری کے باعث حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دوست واحباب سے وقفہ وقفہ کو ملنے کی تاکید فرمائی، چنانچہ ارشاد ہے: زرغبا تزدد حبا

پھر یہ کہ مشترکہ خاندانی نظام کی مخصوص نوعیت افرادِ خاندان کے درمیان بہت سے رذائل کو جنم دیتی ہے، جھوٹ، چوری اور فریب کے لیے مشترکہ خاندانی نظام کی فضا بڑی سازگار ہوتی ہے۔ کھانے پینے سے لے کر پہننے اوڑھنے، شادی بیاہ اور دیگر ضروریات کی تکمیل میں چوری جھوٹ اور فریب کا سہارا لیا جانے لگتا ہے۔ چونکہ مشترکہ خاندانی نظام میں آدمی دوسرے افرادِ خاندان کو شریک کیے بغیر کوئی چیز نہ تنہا خود کھا سکتا ہے اور نہ اپنے بچوں کو کھلا سکتا ہے، یا تو اس میں اتنی گنجائش ہو کہ جس چیز کے کھانے کو اس کا جی چاہے اس میں وہ سب کو شریک کرے یا پھر گھر کے مختلف افراد اپنے بچوں کے لیے چوری چھپے من پسند چیزوں کا انتظام کریں۔ اس طرح ایک خاندان کے افراد کے درمیان عجیب طرح کی خودغرضی کی فضا قائم ہونے لگتی ہے۔ مشترکہ خاندان کی معاشرتی خرابیوں میں سے ایک خرابی یہ ہے کہ گھر کا سرپرست کمانے والے افراد کے درمیان ان کی کمائی کے اعتبار سے فرقِ مراتب کرتا ہے، کم آمدنی والا سرپرست کی نگاہ میں کمتر اور زیادہ کمانے والا برتر ہوتا ہے، اس طرح ایک خاندان کے افراد میں ناگزیر نابرابری پیدا ہوتی ہے جس کے غلط اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

معاشی نقصان

مشترک خاندان کی افادیت کے ضمن میں عموماً یہ بات کہی جاتی ہے کہ اس سے گھر کے بہت سے کمزور افراد کی پرورش ہوجاتی ہے۔ اور قناعت وکفایت شعاری کا وصف پیدا ہوتا ہے جو کہ خاندان کے معاشی موقف کو مستحکم کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ لیکن اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اس

نظام کے سبب گھر کے بہت سے لوگ ناکارہ اور نااہل بن جاتے ہیں۔ ناگزیر مجبوری کی صورت میں کمزوروں کا اور مجبوروں کا تعاون ایک انسانی جذبہ ہے، لیکن مشترکہ خاندان کے سبب چند کمانے والوں پر انحصار کرکے دوسروں کو بلا وجہ معاشی تگ ودو سے دور رکھا جاتا ہے۔ ہر شخص دنیا میں اپنا رزق لے کر آتا ہے، ایک صحت مند انسان اگر محنت ومشقت کرے تو وہ دوسروں پر بوجھ بننے کے بجائے اپنے پیروں پر کھڑا ہوسکتا ہے۔ خاندان کے جتنے زیادہ افراد روزگار پر لگیں گے اسی قدر مالی وسائل میں اضافہ ہوگا۔ اور یہ چیز خاندان کے معاشی استحکام کا باعث ہوگی۔ اس کے برخلاف مشترکہ خاندان بہت سے افراد کی فرضی کفالت کا ذمہ لے کر انہیں معاشی جدوجہد کے میدان میں اترنے ہی سے باز رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ مشترک خاندان میں کسی شخص کی الگ مالی حیثیت کا تعین نہیں ہوتا، گھر کے تمام وسائل اور تمام سامان ہر ایک کے یکساں دسترس میں ہوتے ہیں جس کے نتیجہ میں ہر شخص انہیں غیر کا مال تصور کرتا اور بے دردی سے استعمال کرتا ہے۔ اگر گھر کے افراد کو خوف خدا سے متصف مانا بھی جائے تب بھی انسان کی نفسیاتی کمزوری ہے کہ وہ اپنے مال کو جس احتیاط سے استعمال کرتا ہے غیر کے مال میں ویسی احتیاط نہیں برتتا۔ اس طرح کھانے پینے کی چیزوں سے لے کر سواری اور گھر کی تمام چیزوں میں بے دردی کا استعمال معمول بن جاتا ہے۔ جداگانہ گھر کی صورت میں جس سواری سے بیس پچیس سال تک کام چلایا جاسکتا ہے مشترکہ خاندان کی بھیڑ بھاڑ میں چند ہی سال میں اس کے پرزے پرزے ہوجاتے ہیں۔ پھیلے ہوئے گھر میں اشیاء کے مشترک استعمال سے جو بچت ہوتی ہے اس کا منفی اثر اشیاء کے جلد ناکارہ ہونے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

مشترکہ خاندانی نظام کے معاشی نقصان کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس نظام میں گھر کے سارے کمانے والوں کا ایک ہی ذمہ دار ہوتا ہے۔ اور ساری پونجی اسی کے قبضہ میں ہوتی ہے، جس کی وجہ سے کمانے والے افراد کی معاشی جدوجہد میں کمی واقع ہوجاتی ہے۔ چونکہ انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ کمانے میں اسی وقت دلچسپی لیتا ہے جب کہ وہ اپنی کمائی کا خود مالک ہو اور اس کی کمائی ذاتی فائدے کے لیے استعمال ہوتی ہوئی نظر آئے۔ اس طرح جب ہر فرد معاشی جدوجہد میں سرد مہری کا شکار ہوگا تو اس کے منفی اثرات مرتب ہوں گے اور خاندان کے تمام افراد کا معاشی موقف کمزور ہوجائے گا۔

دینی نقصان

مشترکہ خاندان کی مخصوص نوعیت دین پر عمل کی راہ میں قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کرتی ہے اور اس نظام خاندان سے مربوط فرد کے لیے دینی تقاضوں کی تکمیل مشکل ہوجاتی ہے۔ مثلاً مشترکہ خاندان کی بھیڑ بھاڑ میں فرض نمازوں کی قضا ہونے اور جماعت چھوٹنے کا خدشہ مستقل لگا رہتا ہے۔ پھیلے ہوئے گھر میں ایک شادی شدہ فرد کے لیے فجر کی نماز با جماعت ادا کرنا دشوار ہوتا ہے۔ چونکہ غسل اور دیگر تمام سہولیات مشترک ہوتی ہیں، خواتین کی نماز تو مزید خطرہ میں ہوتی ہے، دیورانی جٹھانی ساس نندوں کی بھیڑ میں اس کے لیے وقت پر نہانا اور نماز کی تیاری کرنا مشکل ہوتا ہے۔ جداگانہ خاندان میں عورت وقت پر نماز ادا کرسکتی ہے اور مرد کے لیے غسل وغیرہ کا فوری انتظام ممکن ہوتا ہے۔

مشترکہ خاندان کے دینی نقصان کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس نظام رہائش کے ساتھ پردہ کے احکام پر عمل آوری ممکن نہیں، اس لیے کہ شوہر کے رشتہ دار اور ایسے افراد جن سے پردہ ضروری ہے ایک ساتھ رہنے سے ان سے پردہ مشکل ہوجاتا ہے، یا تو بہوؤں کو اپنے کمروں میں مقفل ہونا پڑے گا یا پھر بے پردگی کے ساتھ آمد ورفت کرنی پڑے گی۔ پردہ اسلامی تعلیمات کا اہم حصہ ہے۔ قرآن وحدیث میں اس کی بار بار تاکید آئی ہے۔ پردہ کا اہتمام گھر کی علیحدہ یونٹ میں ہی ممکن ہے۔ شوہر کا بھائی بھتیجا، چچا اور چچیرا بھائی وغیرہ بیوی کے لیے غیر محرم ہیں جن سے پردہ کرنا ضروری ہے۔ مشترک گھر چونکہ سب کی مشترک ملکیت ہوتی ہے اس لیے کسی کو آمد ورفت سے منع بھی نہیں کیا جاسکتا، ایسی صورت میں لامحالہ بے پردگی ہوگی۔

مشترکہ خاندان کے دینی نقصانات کا ایک پہلو مالِ غیر کے استعمال کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ چونکہ مشترک خاندان سے وابستہ مختلف افراد کی کمائی کا معیار الگ الگ ہوتا ہے، کسی کی آمدنی کم ہوتی ہے اور کسی کی زیادہ، لیکن سب کی آمدنی سرپرستِ خاندان کے زیر تصرف ہوتی ہے۔ ایسے میں لامحالہ ایک کی کمائی دوسرے کے زیر استعمال آئے گی۔ اس سے ہٹ کر دیر سویر جب یہ خاندان بکھر جائے گا تو اس وقت کوئی بہت اچھے مالی موقف میں ہوگا اور کوئی نقصان اور خسارہ میں۔ بہت ممکن ہے کہ زیادہ آمدنی والے افراد کو کم سے کم وسائل پر اکتفاء کرنا پڑے اور کم آمدنی والے فرد کو زیادہ مال مل جائے۔ کتاب وسنت میں ناحق غیر کے مال کے استعمال سے سخت منع کیا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: ولا تأکلوا اموالکم بینکم بالباطل (البقرۃ:۱۸۸)۔ آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق نہ کھاؤ۔ حدیث میں وارد ہے: الا لا یحل مال امرء الا بطیب نفس منہ سن لو

کسی آدمی کا مال دوسرے کے لیے حلال نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اسے خوشدلی سے نہ دے۔

جداگانہ خاندان اور شرعی دلائل

قرآن وسنت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی سیرت سے جداگانہ خاندانی نظام کی تائید ہوتی ہے۔ قرآنی آیات سے واضح ہوتا ہے کہ معاشرہ کے ہر شادی شدہ اور ذمہ دار فرد کو اس کے بیوی و بچوں کے لیے علیحدہ مکان ہونا چاہئے۔ پردہ کے تعلق سے وضاحت کرتے ہوئے اشارہ دیا گیا کہ مسلم معاشرہ میں ہر ذمہ دار شخص کو الگ مکان کی سہولت ہونی چاہئے۔ ارشادِ ربانی ہے: یایھا الذین امنوا لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتی تستأنسوا وتسلموا علی اھلھا (نور: ۲۷)۔ اے ایمان والو! اپنے گھروں کے علاوہ دوسروں کے گھروں میں داخل نہ ہو یہاں تک کہ اجازت نہ طلب کرلو اور ان کے مکینوں تک سلام نہ پہونچاؤ۔ قرآن وسنت نے اس کی بھی تائید ہوتی ہے کہ اگر کسی کی ایک سے زائد بیویاں ہوں تو ان سب کا مکان الگ الگ ہونا چاہئے۔ چنانچہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام ازواجِ مطہرات کو الگ مکانوں کی سہولت حاصل تھی۔ قرآن میں ازواجِ مطہرات کو پردہ کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا گیا: وقرن فی بیوتکن (الاحزاب: ۳۳)۔ اپنے گھروں میں ٹک کر رہو۔ آگے اسی سلسلۂ بیان میں علیحدہ مکانوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا: واذکرن ما یتلی فی بیوتکن من آیات اللہ والحکمۃ (الاحزاب: ۳۳)۔

سورۂ احزاب ہی میں دوسرے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف گھروں کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے: یا یھا الذین امنوا لا تدخلوا بیوت النبی الا ان یؤذن لکم (احزاب: ۵۳)۔ اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں داخل نہ ہو سوائے اس کے کہ تم کو اجازت مل جائے، اتنا ہی نہیں بلکہ قرآن مجید میں حجرات کے نام سے ایک مستقل سورۃ نازل کی گئی جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام ازواج کے الگ الگ مکان ہونے کی صراحت ہے۔ تہذیب وشائستگی سے نابلد بدو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر کمرہ کے پیچھے بلند آواز سے پکارا کرتے تھے۔ انہیں اس کا علم نہیں ہوتا تھا کہ آپ ازواجِ مطہرات میں سے کس کے کمرہ میں ہیں۔ ایسے بدوں کو خطاب کر کے فرمایا گیا: ان الذین ینادونک من وراء الحجرات اکثرھم لا یعقلون (الحجرات: ۴)۔ جو لوگ تم کو پکارتے ہیں کمروں کے پیچھے سے ان میں سے اکثر سمجھتے نہیں۔ صحیح بخاری میں امام بخاری نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے مختلف مکانوں کے حوالہ سے مستقل ترجمۃ الباب قائم کیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں باب ماجاء فی بیوت ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم وما نسب من البیوت الیھن۔ شارح بخاری حافظ ابن حجرؒ نے ازواجِ مطہرات کے الگ الگ مکانوں کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے متروکہ اثاثہ کے صدقہ قرار پاجانے سے ازواجِ مطہرات کے نان ونفقہ کی دوسری سہولتوں کے ساتھ ان کی زندگی بھر کے لیے ان مکانوں کا بھی استثناء تھا، لیکن یہ مکانات ازواجِ مطہرات کی ایسی ملکیت نہ تھے جو ان کے بعد ان کے وارثین تک منتقل ہوسکیں۔ چنانچہ ازواجِ مطہرات کے بعد یہ سارے مکانات بھی مسلمانوں کے عمومی فائدے کے مقصد سے مسجدِ نبوی میں ضم کر لئے گئے (فتح الباری ۶/۲۱۱)۔ ازواجِ مطہرات کے علیحدہ مکانوں کی تفصیل کا ثبوت کتبِ سیرت سے بھی ملتا ہے۔ عمر بن انسؓ کہتے ہیں کہ چار مکان اینٹوں کے تھے جن میں کھجور کے تنوں سے تیار کئے گئے کمرے بھی تھے اور پانچ مکان کھجور کے تنوں سے تیار کئے گئے تھے جن پر مٹی کی لپائی کی گئی تھی (طبقات ابن ۱/۵۰۰)۔ آپ کے معمولات سے بھی ازواجِ مطہرات کے الگ مکانوں کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ آپ کا معمول تھا کہ ہر شب اپنی تمام بیویوں کو ان بیوی کے مکان میں اکٹھا فرماتے تھے جن کے ہاں رات گزارنے کی آپ کی باری ہوتی تھی۔ بسا اوقات آپ کا کھانا بھی ان سب کے ساتھ اکٹھا ہوتا تھا، پھر یہ سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتی تھیں (تفسیر ابن ۱/۴۶۶)۔ علیحدہ مکانوں کے ساتھ مالی معاملات بھی سب کے الگ الگ تھے۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم ہر بیوی کے نان ونفقہ کا علیحدہ انتظام فرماتے تھے۔ فتح خیبر کے بعد آپ نے ہر ایک کے لیے ۸۰ وسق کھجور اور ۲۰ وسق جو سالانہ مقرر کردئے تھے (بخاری ابواب الحرث والزراعۃ باب المزارعۃ بالشطر ونحوہ)۔ لیکن ازواج اپنی دینداری کے پیش نظر ضرورت بھر رکھ کر باقی سب بیواؤں اور یتیموں پر صدقہ کردیا کرتی تھیں۔

علیحدہ خاندانی نظام کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ شادی کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے مکان کو الگ کردیا۔ حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تعلق تھا اس سے ہر شخص واقف ہے لیکن اس کے باوجود آپ نے ان کا مکان الگ کردیا۔ حالانکہ حضرت علیؓ آپ ہی کے زیر کفالت تھے، ان سے گھر کا رشتہ تھا۔ رخصتی کے بعد آپ ان کے ہاں گئے اور حضرت علیؓ سے فرمایا: دونک اھلک یہ لو تمہاری بیوی تمہارے پاس ہے، یہ کہہ کر آپ وہاں سے واپس ہوئے اور دونوں اپنے کمروں میں چھپ گئے۔ (حیاۃ الصحابہ ۲/۶۶۸)

بیوی کے لیے حقِ سکنی کے تعلق سے فقہاء نے جو وضاحتیں کی ہیں ان سے بھی جداگانہ خاندان کی تائید ہوتی ہے۔شادی کے بعد بیوی کے تعلق سے جو ذمہ داریاں شوہر پر عائد ہوتی ہیں ان کی وضاحت فقہِ حنفی کی مشہور کتاب کنز الدقائق میں ان الفاظ سے کی گئی ہے: والسکنی فی بیت خال عن اھلہ واھلھا (کنز الدقائق:۱۵۲)۔ اور شوہر پر بیوی کا ایک حق سکنی یعنی مکان ہے جس میں شوہر اور بیوی دونوں کے متعلقین میں سے کوئی نہ ہو۔ ہدایہ میں اس کی مزید وضاحت یوں کی گئی ہے: وعلی الزوج ان یسکنھا فی دار مفردۃ لیس فیھا احد من اھلہ الا ان تختار ذلک لان السکنی من کفایتھا فیجب لھا کالنفقۃ (ہدایہ ۲/۴۲۱)۔اور شوہر پر واجب ہے کہ وہ بیوی کے لیے رہائش فراہم کرے۔ بالکل الگ گھر میں جس میں اس کے متعلقین میں سے کوئی دوسرا نہ ہو۔ الا یہ کہ عورت خود ایسا پسند کرے، اس لیے کہ رہائش اس کا بنیادی حق ہے، تو وہ اس کے لیے واجب ہوگا جیسا کہ نفقہ واجب ہے۔ ان وضاحتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علیحدہ مکان بیوی کا حق ہے، الا یہ کہ شوہر کی مجبوریوں کے پیش نظر بیوی خود مشترک رہائش کے لیے راضی ہو جائے۔

جداگانہ خاندان کی صورت میں جہاں تک بوڑھے والدین کی نگہداشت اور ان کے حقوق کی ادائیگی کا تعلق ہے تو علیحدہ خاندان اور ماں وباپ کے ساتھ حسن سلوک ان دونوں میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ اس لیے کہ جس خدا اور رسول نے والدین کے حقوق کی تاکید کی ہے اسی خدا اور رسول نے بیوی کے لیے الگ مکان کا حق فراہم کیا ہے۔ اگر آدمی میں دینداری اور خوفِ خدا ہو تو وہ علیحدہ مکان میں رہتے ہوئے بھی اپنے ماں وباپ کی مکمل نگہداشت کر سکتا ہے اور خوفِ خدا سے محروم شخص ساتھ رہ کر حق تلفی کر سکتا ہے۔ پھر یہ ضروری نہیں ہے کہ شادی کے وقت سب کے ماں وباپ ستر اسی سال ہی کے ہوں کہ وہ اولاد کی مدد کے بغیر بالکل حرکت نہ کر سکتے ہوں، مناسب عمر میں اگر شادی ہو جائے تو والدین کو زیادہ احتیاج بھی نہ ہوگی۔

جداگانہ خاندان کی صورت میں باپ کی کمسن اولاد کی کفالت کی جہاں تک بات ہے تو اس کا حل اسلام کے نظام نفقات میں ہے۔ اس کے لیے مشترکہ خاندان ناگزیر نہیں ہے۔ اس لیے کہ اسلام کے نظامِ نفقات کی رو سے بعض استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر کسی بھی شخص کی موت کی صورت میں جو لوگ اس کے وارث ہوں گے وہی اس کی کمسن اولاد کی کفالت کے ذمہ دار ہوں گے اور یہ ذمہ داری مردورثاء ہی پر نہیں بلکہ مالداری کی شرط کے ساتھ عورتوں پر بھی عائد ہوگی (المبسوط للسرخسی ۵/۲۲۴)۔ باپ کے انتقال کی صورت میں اگر ماں مالدار ہو تو دوسرے رشتہ داروں کے مقابلہ میں کمسن اولاد کے نفقہ کی ذمہ داری ماں پر ہوگی۔ ماں کی حیثیت نہ ہو تو پھر دادا پر اس کی ذمہ داری ہوگی (حوالہ سابق ۵/۲۲۶)۔ ماں اور دادا نادار ہوں تو بھائی ان کے نفقہ کا ذمہ دار ہوگا (رد المحتار ۲/۹۳۵)۔ پھر یہ ذمہ داری تنہا بھائی ہی پر نہیں ہوگی بلکہ اگر بہنیں صاحب حیثیت ہوں تو بھائی کے ساتھ ان پر بھی ذمہ داری عائد ہوگی۔ ماں دادا بھائی بہنیں سب محتاج ہوں تو تب نظامِ نفقات کی بعض استثنائی شکلوں کے ساتھ نانا، چچا، ماموں، پھوپھی اور خالہ وغیرہ پر کفالت کی ذمہ داری عائد ہوگی۔ (المبسوط للسرخسی ۵/۲۲۷)

خلاصہ کلام

مختصر یہ کہ کتاب وسنت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی سیرت کے ٹھوس دلائل کے علاوہ معاشی، نفسیاتی، تربیتی ومعاشرتی پہلوؤں سے خاندان کا جداگانہ نظام ہی سب سے بہتر اور زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام کی جہاں دلائل شرعیہ سے تائید نہیں ہوتی وہیں اس نظام میں بے شمار ناہمواریاں ہیں۔ اس سے تعلقات میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے، محبتیں متاثر ہوتی ہیں، بہت سے دینی امور پر عمل آوری میں دشواری پیش آتی ہے، قریبی رشتہ داروں کے درمیان حق تلفی کی شکلیں پیدا ہوتی ہیں۔

☆☆☆

منفرد خاندان......فوائد اور مشکلات

ڈاکٹر عبدالمعز نظامی [1]

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جب مرد اول حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو وہ سب کچھ ہونے کے باوجود خود کو تنہا محسوس کرنے لگے، ان کی اس تنہائی کو دور کرنے کے لیے ایک مونس کو خاتون اول حضرت حوا علیہ السلام کی شکل میں پیدا کیا، جیسا کہ فرمایا گیا ھو الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منہا زوجہا لیسکن إلیہا (الاعراف: ۱۷۹)۔ یعنی وہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا فرمایا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا تاکہ وہ اس سے سکون حاصل کر سکے۔ مزید برآں اس جوڑے میں مکمل انسیت اور تسکین کی خاطر اس میں آپسی محبت، ہمدردی اور دلداری جیسی صفات ڈال دیں وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ (الروم: ۲۱)۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے تخلیق عورت کو سکون قلب اور راحت جسم قرار دیا۔ اس راحت وسکون کو قائم ودائم رکھنے کے لیے جن امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے ان کو شریعت نے بیان فرمایا اور جن باتوں سے اجتناب ضروری ہے ان کو واضح کیا۔ چونکہ ایک صالح اور اچھا خاندان ہی ایک اچھے سماج کی اکائی ہوتی ہے، اس لیے ایک اچھے معاشرہ کی تشکیل کے لیے خاندان کا اچھا ہونا ضروری ہے۔ خاندان کی اسی اہمیت کے پیش نظر شریعت نے تفصیلی احکامات دیے ہیں۔

خاندان کو عربی زبان میں (اُسْرَۃٌ) کہا جاتا ہے جو اُسر سے ماخوذ ہے جس کے معنی مضبوط باندھنے اور جوڑنے کے ہیں، نیز محفوظ قلعے کو بھی عربی میں الاسرۃ کہتے ہیں۔ چنانچہ خاندان کو اسی لیے اسرۃ کہا جاتا ہے کہ اس میں آپسی تعلقات خاندان کے افراد کو باہم متحد اور جوڑے رکھتے ہیں، انتشار اور افتراق سے بچاتے ہیں، اور جس کی وجہ سے افراد خاندان کو تحفظ اور قوت حاصل ہوتی ہے (دیکھئے: لسان العرب، مادہ: ا س ر)۔ خاندان کی اس شدید ضرورت اور اس کے منافع کے پیش نظر اسلام نے بنیادی اور اصولی باتیں بڑی صراحت کے ساتھ بتادیں جس میں میں کسی تاویل کی گنجائش ہے اور نہ تشریح کی ضرورت ہے، زوجین کی باہمی ذمہ داریوں اور ایک دوسرے کے حقوق متعین کردیے گئے ہیں جن میں شفقت وہمدردی کرنے اور قانونی حق سے زیادہ دینے پر ابھارا گیا ہے ولا تنسوا الفضل بینکم (البقرۃ: ۲۳۷)۔ دوسری طرف کچھ امور کو معروف پر چھوڑ دیا گیا ہے، یعنی وہ بات جو معاشرہ میں سب کے نزدیک بہتر اور عمدہ سمجھی جاتی ہو اور اسلامی اصول واحکام سے متصادم نہ ہو۔ ان ہی میں خاندانی نظام کا مسئلہ بھی ہے۔ خاندان کی نوعیت کیا ہو؟ کیا سب ایک ہی مشترک خاندان (Extended/Joint Family) میں رہیں یا علاحدہ چھوٹے چھوٹے خاندان (Nuclear Family) کی شکل میں رہیں۔ شریعت میں دونوں طرح کی مثالیں ملتی ہیں۔ اس سلسلے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس چیز کو حالات اور معمول پر موقوف کردیا گیا ہے کہ کن حالات اور کس ماحول میں کون سا طریقہ بہتر متصور ہوتا ہو کہ جس میں خاندان سے مقصود فوائد زیادہ سے زیادہ حاصل ہوں اس طرز خاندان کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔

جامع ترمذی میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میں نے نکاح کیا اور بعد کو رسول اللہ ﷺ سے بتایا، آپ ﷺ نے پوچھا: ”کیا تم نے کنواری لڑکی سے نکاح کیا ہے یا ثیبہ (بیوہ یا مطلقہ) سے؟“ میں نے کہا ثیبہ سے، آپ نے فرمایا: ”تم نے کسی دوشیزہ سے نکاح کیوں نہ کیا کہ تم اس کے ساتھ خوش طبعی کرتے اور وہ تمہارے ساتھ خوش طبعی کرتی؟“ میں نے کہا یا رسول اللہ میرے والد کا انتقال ہوگیا ہے اور وہ سات یا نو لڑکیاں چھوڑ گئے ہیں لہٰذا میں نے ایسی خاتون سے نکاح کیا ہے جو میری ان بہنوں کی دیکھ بھال کر سکے۔ آپ نے یہ سن کر مجھے دعا دی (جامع الترمذی، کتاب النکاح، باب ماجاء فی تزویج الابکار)۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جابرؓ کے اس عمل پر نکیر نہیں فرمائی بلکہ اسے پسند فرمایا۔ قرآن مجید میں سورہ نور آیت ۶۱ میں کہا گیا ہے لیس علیکم جناح ان تأکلوا جمیعاً او اشتاتا یعنی تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم سب مل کر کھاؤ یا الگ الگ۔ اسی طرح سورہ بنی اسرائیل میں جہاں والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا گیا اس کے ضمن میں یہ بھی کہا

---

[1] صدر شعبہ عربی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

گیا واما یبلغن عندك الکبر احدھما او کلاھما فلا تقل لھما اف ولا تنہرھما یعنی والدین میں سے ایک یا دونوں تیرے پاس بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کے سامنے اف تک نہ کرنا اور نہ ہی انہیں جھڑکنا۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ماں و باپ بڑھاپے کی عمر میں اپنی اولاد کے ساتھ مشترکہ خاندان کی شکل میں رہ سکتے ہیں۔ ہندوستان میں مشترکہ خاندان کا نظام اکثر مقامات پر رائج ہے۔

اس کے برخلاف علاحدہ یا منفرد خاندان کی شکل میں رہنے کی مثالیں بھی موجود ہیں، عربوں کے یہاں یہی طرز زیادہ معروف تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خدیجہؓ سے نکاح کرنے کے بعد علاحدہ سکونت اختیار فرمائی۔ حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ سے نکاح کرنے کے بعد علاحدہ مکان میں قیام فرمایا۔ چنانچہ عرب ممالک میں اب بھی اس قسم کے خاندان کا رواج ہے۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ اسلام میں منفرد خاندان کا وہ تصور نہیں ہے جو آج مغرب میں (Nuclear Family) کے نام سے مروج ہے۔ جہاں آدمی کی توجہ کا مرکز پوری طرح اس کی بیوی، بچے اور خود اس کی ذات ہوتی ہے۔ یہ اسلامی تصور نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام نے آدمی پر جہاں ایک طرف اس کے بیوی و بچوں کا حق رکھا ہے تو دوسری طرف ضرورت مند والدین، دیگر رشتہ داروں نیز یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا حق رکھا ہے۔ سورہ نساء کی آیت ۳۶ میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے: واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا وبالوالدین احسانا وبذی القربی والیتامی والمساکین والجار ذی القربی والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبیل وما ملکت ایمانکم یعنی اللہ کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، ماں و باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو، رشتہ داروں کے ساتھ یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ، قرابت دار پڑوسی اور اجنبی پڑوسی، ساتھ رہنے والے، مسافر اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ صلہ رحمی اور حسن سلوک مال کے ذریعہ اور حسن گفتار کے ذریعہ بھی ہوسکتا ہے، اور جسمانی محنت ومشقت کے ذریعہ اپنے عزیز تر وقت صرف کر کے اور اپنے جذبات اور احساسات کو قربان کر کے اور دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھ کر ہوسکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ہمیں اس آیت کی عملی تشریح ملتی ہے۔

چنانچہ منفرد خاندان میں رہتے ہوئے انسان ان تمام اہل حق کا حق ادا کرنے کی کوشش کرے اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرتا رہے جس کی اسلام میں بڑی تاکید آئی ہے۔ ساتھ ہی اہل خانہ اور بچوں کو اس کی تعلیم دے اور اس نہج پر ان کی تربیت کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات اور آل اطہار کی اس طرح تربیت فرمائی تھی کہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھتیں، گھر میں جو کچھ ہوتا حاجت مندوں کو حاجت روائی کے لیے اسے دے دیتیں۔

اب کوئی شخص عمومی مصلحت کے پیش نظر منفرد خاندان کو اختیار کرتا ہو تو اس کے لیے اس کے فوائد اور نقصانات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

منفرد خاندان کے فوائد:

☆ منفرد خاندان میں رہنے کی وجہ سے خاتون خانہ کو روزمرہ کے معمولات میں آزادی حاصل ہوگی۔ ساس سسر، نند وغیرہ کی بے جا مداخلت سے راحت نصیب ہوگی۔

☆ امور خانہ داری میں سسرالی رشتہ داروں کی جانب سے روک ٹوک اور محاسبہ نہ ہوگا۔

☆ بیوی کی خدمت کا محور اس کا شوہر اور بچے ہوں گے، جہاں وہ پوری طرح ان پر توجہ دے سکے گی۔

☆ شوہر کو اپنی ماں اور بہنوں کے ذریعہ بیوی کی روزانہ کی جانے والی شکایات سے نجات حاصل ہوگی، اسی طرح بیوی کے ذریعہ ماں اور بہنوں کی شکایت سے راحت ملے گی، کہ شوہر دن بھر کام کر کے جب گھر پہنچے تو اسے ایک گونہ سکون حاصل ہوگا۔

☆ خاتون خانہ کو اپنے میکے والوں سے زیادہ سے زیادہ ربط پیدا کرنے نیز ملاقاتیں کرنے کا زیادہ موقع فراہم ہوگا۔

☆ منفرد خاندان میں رہنے کی وجہ سے آپس میں روز روز کی تو تو میں میں نہ ہوگی جس سے بہو کو یہ موقع حاصل ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی ساس، سسر، نند وغیرہ سے تعلقات کو استوار رکھے، ان کو اور مضبوط کرے، جس کا طریقہ تحفے تحائف لے جانا، خوشگوار ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھنا اور ساس سسر

کی خدمت کرنا ہے۔ شوہر کے لیے بھی ممکن ہوجاتا ہے کہ وہ والدین کے ساتھ حسن سلوک، بہن بھائیوں کا مناسب خیال رکھ سکے اور ان کے تعلق سے اس کا ذہن غیر مکدرر ہے۔

اس طرز خاندان میں زیادہ (Privacy) اوقات بے تکلفی حاصل ہوگی۔

منفرد خاندان کے مشکلات:

☆ بیوی اور بچے اچھی خاندانی روایات اور طور طریقوں سے محروم ہوجاتے ہیں۔ چونکہ بہت سی باتیں ماحول سے سیکھی جاتی ہیں جس کا منفرد خاندان میں موقع نہیں ملتا۔

☆ بچوں کی مناسب دیکھ بھال نہیں ہوسکتی۔

☆ ایک آدمی پر ساری ذمہ داریاں عائد ہوجاتی ہیں، گھر کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا، بچوں کو اسکول لانے لے جانے کا انتظام کرنا، ان کے دکھ درد کا خیال رکھنا، کوئی ہنگامی صورت حال پیدا ہوجائے اس سے تنہا نمٹنا یا خاتون خانہ کو تکلیف دینا، اس لیے کہ مشترکہ خاندان میں یہ ذمہ داری بہ آسانی تقسیم ہوجاتی ہے۔

☆ مشترکہ خاندان میں فی کس خرچ کم ہوتا ہے جب کہ منفرد خاندان میں خرچ بڑھ جاتا ہے۔ اور آدمی کو زیادہ زیر بار ہونا پڑتا ہے۔

☆ خاتون اگر شدید ضرورت کے پیش نظر ملازمت کرتی ہو اور اس کے چھوٹے بچے ہوں تو ان کی دیکھ بھال میں دقت پیش آتی ہے۔

☆ منفرد خاندان میں رہنے اور بچوں کو مناسب تربیت نہ ملنے کی وجہ سے یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں وہ (centred-self) نہ ہوجائیں جہاں ان کی ذات پوری توجہ کا مرکز نہ ہوجائے۔ اور وہ دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کا ثبوت دیں۔

☆ مشترکہ خاندان میں رہنے سے ایک طرح کا جو خاندانی تحفظ حاصل ہوتا اس سے محرومی ہوسکتی ہے۔

☆ آدمی کو اگر کاروبار یا ملازمت کے سلسلہ میں بیرون شہر یا بیرون ملک جانا ہو تب گھر میں محافظ کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

☆ مشترکہ خاندان میں بچوں کی صحت کے مسائل تجربہ کار خواتین کی موجودگی کی وجہ سے بہ آسانی حل ہوجاتے ہیں جو ممکن ہے منفرد خاندان میں ناتجربہ کاری کی وجہ سے پیچیدہ ہوجائیں۔

☆☆☆

خاندانی نظام پر تمدنی تبدیلیوں کا اثر

ڈاکٹر محمد شہاب الدین سبیلی[1]

خاندانی نظام پر تمدنی تبدیلیوں کے اثرات کا جائزہ لینے سے پہلے تمدن کے مفہوم کو سمجھ لینا بہتر ہوگا، تمدن ایک ایسا جامع لفظ ہے جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ کا احاطہ کرتا ہے، چاہے سیاست ہو یا تعلیم، معیشت ہو یا معاشرت، مذہب ہو یا اخلاق، سائنس ہو یا جدید ٹکنالوجی، سب اس کے دائرہ میں شامل ہیں، تمدن اسی وقت وجود میں آتا ہے جب کوئی سماج ترقی کے مراحل طے کر کے اپنا منفرد مذہبی، سیاسی، قانونی، معاشی اور تعلیمی تشخص قائم کر لے۔

اس لفظ کے وسیع مفہوم کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم موجودہ دور پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں موجودہ تمدن اور سابقہ تمدن میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے اور جب دونوں تمدن میں اتنا فرق ہے تو ظاہر ہے کہ ان کے خاندانی ڈھانچہ میں بھی کافی فرق ہوگا، اس مختصر سی تحریر میں تمام تمدنی تبدیلیوں اور اس کے اثرات کا جائزہ لینا مشکل ہے، اس لئے یہاں صرف چند اہم تمدنی تبدیلیوں کے ذکر پر اکتفا کیا جائے گا۔

ذرائع معیشت میں تبدیلی

تمدنی تبدیلیوں میں سب سے اہم تبدیلی ذرائع معیشت کی تبدیلی ہے، کیونکہ جدید معاشی نظام نے سماجی ڈھانچہ کو یکسر تبدیل کر دیا ہے، اور وہ اس طرح کہ قدیم دور میں معیشت کا زیادہ تر انحصار زراعت پر ہوتا تھا، لوگ اپنی زمینوں کی پیداوار پر انحصار کرتے تھے، ہر خاندان کی مختص زمینیں ہوتی تھیں، جو اس خاندان کا اصل اثاثہ ہوتا تھا اور خاندان کے افراد متحدہ طور پر کوشش کرتے کہ اپنی زمینوں سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کر سکیں، اس مشترکہ معاشی مفاد نے ارکان خاندان کو آپس میں مربوط اور متحد رکھا تھا، صنعتی دور کے آغاز نے معیشت کے نئے ذرائع پیدا کر دیئے، لوگ دور دور کا سفر کرنے لگے، تاکہ جدید معاشی مواقع سے فائدہ اٹھا سکیں، اس رجحان نے خاندانی نظام پر کافی گہرا اثر ڈالا، کیونکہ افراد خاندان نقل مکانی کر کے اتنے فاصلے پر جا بسے کہ جہاں سے ان کے لئے بار بار آنا مشکل ہوگیا، پھر اس جغرافیائی فاصلہ نے لوگوں کے دلوں میں بھی فاصلے پیدا کر دیے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپسی تعلقات میں جو گرم جوشی ہوتی تھی، اس میں کمی آنے لگی۔

جدید معاشی انقلاب سے پہلے صرف مرد حضرات ہی معاشی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے، مگر جدید معیشت نے عورتوں کے لئے بھی ملازمت کے حصول کے دروازے کھول دیئے، اس کشش نے عورتوں کو گھر کی چہار دیواری سے باہر نکلنے پر آمادہ کیا، اب مرد اور عورت دونوں معاش کے حصول میں اس طرح لگ گئے کہ گھر کا نظام درہم برہم ہوگیا، بچے ماں کی محبت اور باپ کی توجہ سے محروم ہونے لگے، بین الاقوامی کمپنیوں اور کال سنٹرس کے رواج نے عورت کو رات کے وقت بھی گھر سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا، اب تک بچے دن میں نہ سہی، رات میں ماں و باپ کو ایک ساتھ دیکھتے تھے، مگر اس نئی تبدیلی نے بچوں سے یہ نعمت بھی چھین لی، اور پھر ماں و باپ کو اس مجرمانہ سلوک کا یہ خمیازہ بھگتنا پڑا کہ ان کی اولاد ان کے ہاتھ سے نکل گئی، ان کے دلوں میں نہ ماں کا تقدس رہا اور نہ باپ کا احترام، اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے مرد و عورت میں ایک نیا رجحان یہ پیدا ہوا کہ یا تو سرے سے اولاد ہی نہ رکھی جائے یا اگر رکھی بھی جائے تو ایک یا دو، اس سے زیادہ نہیں، اس نئے رجحان نے خاندانی نظام کو برباد کر دیا، یوں تو اس کی بربادی کے اثرات سے ساری دنیا متاثر ہوئی، لیکن امریکہ اس میں سب سے زیادہ متاثر ہوا، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۸۲۰ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک ۴۰ ملین سے زیادہ لوگ دوسرے ملکوں سے آ کر امریکہ میں آباد ہوئے، اور امریکیوں نے ان کو اپنے سماج میں ضم کر لیا، کیوں کہ ان تارکین وطن کے بغیر امریکہ کی نفری طاقت بہت کمزور ہو جاتی۔

ترقی یافتہ ملکوں میں ایک تباہ کن یہ رجحان وجود میں آیا کہ بچوں کی تربیت و تعلیم کی ذمہ داریوں کو اٹھانے سے والدین گھبرانے لگے اور نتیجتاً

---

[1] اسسٹنٹ پروفیسر ای، ایف، ایل، یونیورسٹی، حیدرآباد

ترک اولاد کا رجحان غالب ہو گیا، اب حکومتوں کی یہ ذمہ داری ہو گئی کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ انجام دیں، اس غیر انسانی سلوک نے نئی نسل کو اس بات پر اکسایا کہ وہ یا تو تشدد کا راستہ اختیار کر لیں یا پھر گہری مایوسی میں ڈوب کر اپنے وجود کو فنا کر لیں۔

نظام تعلیم میں تبدیلی

اسی طرح نظام تعلیم کی تبدیلی کا بھی خاندانی نظام پر گہرا اثر پڑا، مخلوط تعلیم کے تصور نے نوعمر لڑکے اور لڑکیوں کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ اپنے سرپرستوں کی نظروں سے اوجھل رہ کر مخرب اخلاق سرگرمیوں میں حصہ لیں اور طرح طرح کی بے راہ رویوں میں مبتلا ہو جائیں، بلاشبہ جدید نظام تعلیم کے کئی مثبت پہلو بھی ہیں، جن کا انکار کرنا عقل کے تقاضہ کے خلاف ہے، مگر اس تلخ حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کہ جدید نظام تعلیم نے ہماری نسلوں کے اخلاق پر برے اثرات ڈالے ہیں، خاص طور پر ہماری لڑکیاں اس نظام تعلیم کے اثر سے حیاء، شرم، اعلیٰ کردار اور شریفانہ اخلاق سے محروم ہو گئیں، جو ان کا امتیاز تھا۔

جدید نظام تعلیم کے برے نتائج مغربی ملکوں میں بڑے پیمانہ پر دیکھنے میں آئے، آج مغربی دنیا کے دانشوروں کے سامنے یہ سوال ایک چیلنج بن کر ابھرا ہے کہ کس طرح نئی نسل کے اخلاق و کردار کی حفاظت کی جائے، اگرچہ کہ ہندوستان اور دوسرے ایشیائی ملکوں کی اخلاقی و روحانی صورت حال مغربی ملکوں سے مختلف ہے، مگر یہ کہنا کہ یہ ممالک جدید تعلیم کے زہریلے اثرات سے محفوظ ہیں، یہ سراسر غلط ہے، کیونکہ ہندوستان میں بھی روشن خیالی کے وہم میں پڑ کر کئی لڑکے اور لڑکیاں خاندانی نظام کو فرسودہ نظام سمجھ کر سماج کی بندشوں سے آزاد ہو گئے ہیں، ان کی نظروں میں شادی کا مقدس تصور صرف ایک جنسی رشتہ تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، وہ خاندانی نظام کے فائدوں کو سمجھنے کے بجائے اس عظیم تہذیبی ورثہ اور روایت کی مخالفت کرتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ طلاق کی شرح بہت بڑھ گئی ہے، گھر کا گھر اور خاندان کا خاندان تباہ ہو رہا ہے۔

جدید ذرائع ابلاغ

یہ حقیقت کسی بھی صاحب فہم انسان کی نظر سے اوجھل نہیں ہے کہ جدید ذرائع ابلاغ یا مواصلاتی نظام نے انسانی تمدن کی تعمیر میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے، لیکن اس بات کا انکار کرنا بھی مشکل ہے کہ جدید ذرائع ابلاغ کی سہولتوں نے جہاں انسانی سماج کی ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے وہیں اس سے خاندانی نظام پر برا اثر بھی پڑا ہے، ٹی وی پر چوبیس گھنٹے رقص وسرور، ناچ وگانا اور حیاسوز مناظر پیش کئے جاتے ہیں، جن کے اثر سے نئی نسل کا اخلاق و کردار بگڑ رہا ہے اور ٹی وی پر ایسے سیریلس اور پروگرامس نشر ہونے لگے ہیں کہ خواتین کا پورا وقت ان پروگراموں کی نذر ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ سے ان کے گھر کا نظام خراب ہو جاتا ہے، ان پروگراموں کے وجود میں آنے سے پہلے افراد خاندان فارغ اوقات میں اپنے رشتہ داروں، پڑوسیوں اور دوستوں کے پاس جاتے تھے اور ان کا حال واحوال معلوم کرتے تھے، مگر رنگ برنگ کے چینلس نے لوگوں کو اتنا مشغول کر دیا کہ ان کے پاس اتنا وقت نہیں رہا کہ وہ ایک دوسرے سے ملیں جلیں اور آپسی تعلقات کو مستحکم کریں۔

بلاشبہ انٹرنیٹ کی ایجاد نے خاندانی نظام پر مثبت اثرات ڈالے ہیں، خاص طور پر ایسی ویب سائٹس کا وجود میں آنا جن کا مقصد ہی سماجی تعلقات کو فروغ دینا ہے مثلاً فیس بک، ٹویٹر وغیرہ، جن کی مدد سے سماجی تعلقات نے ایک نئی بلندی حاصل کی ہے، مگر اس حقیقت کو بھی ماننا پڑے گا کہ انٹرنیٹ کے ان فوائد کے باوجود اس کے ظہور نے خاندانی نظام کو بہت کمزور کر دیا ہے، کیوں کہ اسی کے ذریعہ عشق ومحبت کی ہزاروں داستانیں وجود میں آتی ہیں اور اخلاق سوز لٹریچر تیزی سے دنیا کے کونے کونے میں پہنچ گیا ہے، ہر وہ شخص جس کی انٹرنیٹ تک رسائی ہے، اس کے لئے ممکن ہو گیا کہ اپنے کمپیوٹر اور لیپ ٹاپ کے اسکرین پر دنیا کی ساری برائیوں کا گھر بیٹھے نظارہ کر سکے، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ انٹرنیٹ کا غلط استعمال ایک ایسا چیلنج ہے جس کا تدارک بظاہر بہت مشکل ہے۔

جدید سیاسی نظام

جمہوریت کے فائدے سے کسی کو انکار نہیں ہے، کیوں کہ جمہوریت کے بغیر کوئی ملک ترقی نہیں کر سکتا ہے، اسی طرح سیکولرزم بھی ایک حد تک موجودہ دنیا کی اہم ضرورت ہے، کیوں کہ ہر ملک میں مذہبی لسانی اور جغرافیائی اقلیتیں آباد ہیں، اگر سیکولرزم کے اصولوں کو ان ملکوں میں بالائے طاق

رکھ دیا جائے تو اقلیتوں کا جینا مشکل ہو جائے گا، لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سیکولرزم کے پس پردہ لادینیت اور مذہب بیزاری کی جو لہر اٹھی ہے، اس نے انسانی سماج کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔

بہرحال آج عالمی سطح پر یہ بات کہی جارہی ہے کہ مذہب معاشرہ کو مضبوط اور مستحکم بناتا ہے، اور مذہب وتمدن میں کافی گہرا رشتہ ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک سروے رپورٹ جو حال میں چھپی ہے، اس کا ایک حصہ نقل کیا جائے، جس سے مذہب اور خاندان کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے، اس رپورٹ میں یہ عبارت درج ہے:

The end of the twentieth Century appears to be a time when strength for the family as cornerstone of civilization must come from the top down, must be sought on spiritual levels first and then manifested in earthly life. In a recent study, Lauer and Lauer studied, 300 happily married couples who had been married for 15 years or more. One of the most significant variables contributing to a successful marriage is the belief in family and marriage as a long-term commitment to something sacred (lauer & Laur, 1989). In another study, 40 years of research has shown a strong relationship between religion and family happiness. There are indications that this religious quality went deeper than going to church or participanting in religious activities together. It could most appropirately be called a commitment to a spiritual life style. Words are inadequate to communicate this, but what many of these families said was that they had an awareness of God or a higher power that gave them a sense of purpose and gave their family a sense of support and strenght" (Stinnett, 1989).

ان تہذیبی تبدیلیوں نے انسانی سماج کو کئی مشکلات سے دوچار کیا ہے اور صورت حال اتنی سنگین ہوگئی ہے کہ مغربی ملکوں میں خاندانی نظام کو بحال کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ جدید تہذیبی تبدیلیوں کو آنکھ بند کر کے قبول کرنے کے بجائے اس کی معقولیت پر غور کرنا چاہئے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ یہ تبدیلی خاندان پر اچھا اثر ڈالے گی یا برا، ساتھ ہی ساتھ ہم کوشش کریں کہ کسی بھی معاشی، سیاسی، تعلیمی انقلاب سے منفی اثر لینے کے بجائے مثبت اثر لیں، تاکہ خاندانی نظام مستحکم ہو سکے، اگر خاندان مضبوط ہوگا تو سماج بھی مستحکم ہوگا، اور اگر خاندان کمزور ہو جائے گا تو سماج بھی کمزوری کا شکار ہو جائے گا، روم، یونان اور دنیا کے دوسرے تمدن وتہذیب کی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ تہذیبوں کو اسی وقت زوال آتا ہے جب خاندانی نظام کھوکھلا اور بے اثر ہو جاتا ہے، لہٰذا ہم خاندانی نظام کی اہمیت کو سمجھیں اور کسی بھی قیمت پر اس قیمتی دولت کو ضائع نہ ہونے دیں۔

☆☆☆

خاندانی نظام اور خواتین کے حقوق

محمد رحیم الدین انصاری[1]

دنیا پر اسلام کے بے شمار احسانات ہیں، اس کا ایک عظیم احسان یہ ہے کہ اس نے خاندان کا ایک مفصل نظام پیش کیا، مرد وزن کا رشتہ عدل وانصاف کی بنیاد پر استوار کیا، افراد خاندان کے حقوق وواجبات کا ٹھیک ٹھیک تعین کیا، اور ان کے درمیان ہمدردی، محبت اور حسن سلوک کا ماحول پیدا کیا، اس نے خاندان کی تعمیر میں قانون اور اخلاق دونوں سے مدد لی، اور اسے روح وقالب کے اعتبار سے ایک جامع اور مکمل نظام کی شکل عطا کی۔

انسان جب اس دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اس کی ماں سے اس کا اولین رشتہ استوار ہوتا ہے، پھر بہت جلد باپ اس میں شریک ہوجاتا ہے، اس کے بعد بھائی بہن اور دور ونزدیک کے ان تمام افراد سے اس کے تعلقات قائم ہوتے چلے جاتے ہیں، جو اس سے خون کا رشتہ رکھتے ہیں، انہی سے اس کا خاندان تشکیل پاتا ہے، اور انہی کے درمیان اس کی اجتماعی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، خاندان سے باہر کے افراد سے اسکا تعلق اس ابتدائی مرحلہ میں شاذ ونادر ہی ہوتا ہے ان سے ربط وضبط کا سلسلہ بالعموم بعد میں شروع ہوتا ہے۔

انسان اپنے سفر حیات میں مختلف مراحل سے گزرتا ہے، ایک مرحلہ پیدائش اور بچپن کا ہے، جس میں وہ اپنی بقاء اور ضروریات کی تکمیل میں سراسر دوسروں کا محتاج ہوتا ہے، اس مرحلہ میں اس کا خاندان اس کی نگہداشت اور پرورش کرتا ہے، اس کی ضروریات پوری کرتا ہے اور اسے اس قابل بناتا ہے کہ وہ میدان عمل میں اپنا حصہ ادا کرسکے، استطاعت کے ہوتے ہوئے خاندان اس میں کوتاہی کا ارتکاب نہیں کرتا، کبھی اس میں غفلت ضرور ہوجاتی، لیکن قصد وارادہ بالعموم شامل نہیں ہوتا، انسان کی زندگی کا دوسرا مرحلہ عہد شباب کا ہے، اس مرحلے میں وہ خاندان کا ایک ایسا فرد ہوتا ہے جو اس کی مدد کا ضرور تمند بھی ہوتا ہے، اور وہ اس کی مدد بھی کرسکتا ہے، اس مرحلہ میں وہ ان سے جتنا تعاون حاصل کرتا ہے اس سے زیادہ اس کی معاونت کے موقف میں ہوتا ہے، تیسرا مرحلہ پیری اور بڑھاپے کا ہے جو جوانی کے بعد شروع ہوتا ہے، اس میں آدمی ضعف وناتوانی کا شکار ہوجاتا ہے، اس کی قوتیں اور توانائیاں آہستہ آہستہ کمزور پڑنے لگتی ہیں، کبھی یہ مرحلہ اتنا طویل ہوتا ہے کہ آدمی بچپن ہی کی طرح لمبی مدت کے لئے خاندان کی توجہ اور خبر گیری کا دوبارہ محتاج ہوجاتا ہے۔

افراد خاندان کے درمیان چونکہ ہمدردی اور تعاون وتناصر کے جذبات کارفرما ہوتے ہیں، وہ ایک دوسرے کی ضروریات کی تکمیل اور ان کے تقاضوں کو پورا کرنے کی سعی کرتے ہیں اس لئے یہ سب کچھ فطری طور پر بغیر کسی دباؤ کے انجام پاتا ہے، اس طرح خاندان کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کے چاروں طرف اس کے بہی خواہ اور ہمدرد افراد کا ایک حلقہ موجود ہوتا ہے جن کے درمیان وہ خود کو محفوظ ومامون پاتا ہے، اور جو مشکلات میں اس کے کام آتا ہے۔

اسی طرح افراد خاندان کے درمیان ایک دوسرے کی حفاظت وصیانت کا شدید جذبہ بھی پایا جاتا ہے، کسی کی جان، مال اور عزت وناموس پر حملہ ہو تو پورا خاندان اسے اپنے اوپر حملہ تصور کرتا ہے، اور ظالم سے انتقام لینے کو اپنا فرض سمجھتا ہے، خاندان سے انسان کا جذباتی تعلق بھی ہوتا ہے وہ اس سے دلی قربت اور یگانگت محسوس کرتا ہے اور رنج وراحت میں اسے شریک دیکھنا چاہتا ہے، افراد خاندان اس کی خوشیوں کو دوبالا کرتے ہیں، ان کی محبت وہمدردی اس کے درد والم کو کم کرتی ہے، اور اسے سکون فراہم کرتی ہے۔

الغرض خاندان کی ضرورت جس طرح عہد ماضی میں مسلم تھی اسی طرح اس کی ضرورت زمانہ حال میں بھی ہے، اور مستقبل کا انسان بھی اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتا، جب کبھی خاندان کی تعمیر صحیح خطوط پر ہوئی، اس کے مقاصد پورے ہوئے اور مرکز سکون وراحت بنا رہا، اس کے برخلاف جب وہ

---

[1] رکن آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

تخریب کا شکار ہوا تو اس کی افادیت مجروح ہوئی، اور اس کے برکات وثمرات سے دنیا محروم ہوتی چلی گئی، موجودہ دور جن سنگین مسائل سے دو چار ہے ان میں ایک خاندان کی تباہی بھی ہے، آج نظام خاندان کو غلط رسوم ورواج، نامعقول قاعدوں اور مادیت کے غلبہ نے کمزور تر کردیا ہے، جس کے نتیجے میں خاندان ایک بوسیدہ ڈھانچہ بن کر رہ گیا ہے، خاندان میں الفت ومحبت کی جو خوشگوار فضا تھی وہ ختم ہوتی جارہی ہے، اور اس کی جگہ خود غرضی اور مفاد پرستی نے لے لی ہے، خاندانی رشتے اور تعلقات اس طرح متاثر ہورہے ہیں کہ فرد خاندان کے لئے اجنبی بن کر رہ گیا ہے۔

اس تناظر میں آج کل خاندان کے پورے نظام پر اعتراضات کئے جاتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ اس میں عورت کے حقوق محفوظ نہیں ہیں، ایک خیال یہ ہے کہ خاندان بعض معاشی عوامل کے نتیجے میں وجود میں آیا، اب وہ عوامل ہی نہیں رہے، بعض حضرات خاندان کو ماضی کا ایک ایسا ادارہ تصور کرتے ہیں جس کی موجودہ ترقی یافتہ دور میں چنداں ضرورت نہیں رہ گئی ہے، جو لوگ ریاست کے کلیت پسند تصور کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ خاندان کے فوائد ریاست کے ذریعہ حاصل کئے جاسکتے ہیں، آج مغرب میں خاندان بری طرح شکست وریخت سے دو چار ہے، مرد اور عورت آزاد شہوت رانی کے قائل ہیں، وہ نکاح کی بندش اور خاندان کی تعمیر کا بوجھ اٹھانا نہیں چاہتے۔

ان مسموم حالات میں علماء، زعماء اور قائدین ملت کی ذمہ داری دو چند ہوجاتی ہے کہ وہ خاندان کی اہمیت کو اجاگر کریں، اس کے ذریعہ حاصل ہونے والے فوائد کو امت کے سامنے کھول کھول کر بیان کریں تا کہ اس تعلق سے پائی جانے والی بے راہ روی کا سد باب ہو، اور اس کی ضرورت واہمیت کا احساس کر کے افراد دوبارہ مستحکم خاندانی نظام سے مربوط ہوکر زندگی گزاریں، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے اشتراک سے ''خاندانی نظام اور خواتین کے حقوق'' کے عنوان پر سمینار منعقد کرنا بڑی خوش آئند بات ہے، خدا کرے اس کی آواز دور دور تک پہونچے، اور امت کو صحیح رہنمائی ملے، میں اس سلگتے ہوئے موضوع پر سمینار منعقد کرنے والے تمام احباب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں، اور اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں، اور یہ امید رکھتا ہوں کہ کوئی جامع تجویز اور پیغام متفقہ طور پر امت مسلمہ کو پہونچے، آمین ثم آمین۔

☆☆☆

تاخیر سے ہونے والی شادیاں اور نظام خاندان پر اس کے اثرات

ڈاکٹر مسعود علی خاں[1]

حیدرآباد شہر مسلم تہذیب کا گہوارا ہے، یہاں 76.36٪ مسلمان رہتے ہیں، اس شہر کی خواندگی 57٪ ہے، یہ ایک زمانے میں مسلمانوں کے اقتدار کا شہر تھا، آج کے جمہوری دور میں ملک کا ایک حصہ بن گیا ہے۔

حیدرآباد کے مسلم معاشرہ میں سب سے زیادہ دشوار کن مسئلہ والدین کے لئے اپنی لڑکیوں کے لئے موزوں بر کی تلاش کا ہو گیا ہے۔ ان کو اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے شہر کے متعدد ایجنٹوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ مثلاً اخبار میں "ضرورت رشتہ کا اشتہار" انٹرنیٹ، مشاطائیں اور "دو بدو پروگرام"، حیدرآباد کے متوسط طبقے کے خاندان اپنی لڑکیوں اور لڑکوں کے رشتے کے لئے ان ایجنسیوں سے رجوع ہو رہے ہیں، مثال کے طور پر ادارہ پیامات و شادی۔ اس وقت شہر میں مختلف مقامات پر یہ ادارے پیامات شادی مختلف ناموں سے کام کر رہے ہیں، ان اداروں میں لڑکیوں کی رجسٹریشن فیس 500 روپے اور لڑکے کے لئے 1000 روپے ہیں، ہر ادارہ میں تقریباً تین سے چار ہزار لڑکیوں کے رجسٹریشن ہیں اور دو سے تین ہزار لڑکوں کے رجسٹریشن ہیں۔ لڑکیوں کے فوٹو اور بائیوڈاٹا کے ساتھ ایک فائل محفوظ کر لی جاتی ہے اور ان لڑکیوں اور لڑکوں کے فوٹوز کو مع بائیوڈاٹا انٹرنیٹ پر ڈالا جاتا ہے، اور کوئی پیام آجائے تو آپ کو اطلاع دی جاتی ہے، آپ اپنے رجسٹریشن نمبر کے ذریعہ مزید اس پیام کی تحقیق کر کے لڑکے والوں کو اپنے گھر آنے کی اجازت دیتے ہیں۔ یہ ادارہ عام طور پر دو پارٹیاں، یعنی لڑکے اور لڑکی والوں کو ملانے کا کام انجام دیتے ہیں۔ ان میں اکثر ایسے لڑکے اور لڑکیوں کی تصویریں اور بائیوڈاٹا ہوتا ہے جن کو بہت سے خاندانوں نے ریجیکٹ، یعنی رد کر دیا ہوتا ہے، اس میں تفریق ہے، نئے شہر والے، پرانے شہر والے ان اداروں میں کوئی ربط نہیں ہوتا، بہت سے پرانے شہر کے لڑکی کے خاندان لڑکیوں کے لئے اچھے پیامات کی خاطر بنجارہ ہلز، ٹولی چوکی، مہدی پٹنم شفٹ ہو جاتے ہیں، اور کرایہ پر مکان لیتے ہیں، رشتے طے اور شادی ہونے کے بعد پھر پرانے شہر میں اپنے مکانات میں واپس آتے ہیں، کیونکہ نئے شہر والوں میں سب ہی خاندان خوبصورت، تہذیب یافتہ اور متمول گھرانے کی لڑکی چاہتے ہیں، ان اداروں کا کارنامہ یہ ہے کہ مہینہ میں ایک یا دو پیامات بڑی مشکل سے طے کرتے ہیں، اس کے لئے لڑکے سے ۱۰ ہزار روپے بطور کمیشن اور لڑکی سے بھی ۱۰ ہزار روپے بطور کمیشن لیتے ہیں۔ رجسٹریشن کے وقت ہی اس معاہدہ پر دستخط لے لیتے ہیں، اگر پیام طے ہونے کے آثار نظر آتے ہیں تو درمیان میں ہی نصف کمیشن کا مطالبہ ہوتا ہے، شادی ہونے سے قبل اس کمیشن کو ادا کرنا پڑتا ہے، ملازمت سے جو افراد نے وظیفہ لے لیا ہے وہ افراد اکثر اس ادارہ پیامات شادی کے کاروبار میں جڑے ہوئے ہیں، بڑی لچھے دار گفتگو کرتے ہیں، اللہ کریم ہے، اللہ رحیم ہے، انشاء اللہ آپ کے لئے یہ پیام بالکل طے ہو جائے گا، لڑکی والے ماں و باپ کو دلاسہ دیتے ہیں اور ان کو آس میں لگائے رہتے ہیں۔

بعض لڑکی کے والدین اخبار کے اشتہار یعنی "ضرورت رشتہ" کے کالم میں اشتہار دیتے ہیں، اس کی فیس بھی 400 سے 500 روپے ہے، یہ ادارہ جات لڑکے اور لڑکیوں کی فائل، ان کی تعلیمی قابلیت اور علاقہ داری محلے کے لحاظ سے رکھتے ہیں، اس کام کے لئے ایک دو تین نوجوان لڑکیوں کو ملازم رکھ لیتے ہیں، وہ سارا دفتری کام کرتے ہیں، اور ادارہ میں جو ٹیلی فون آتے ہیں ان کے جوابات دیتے ہیں، جس دن چھٹی رہتی ہے یہ کاروبار بڑے عروج پر رہتا ہے، خصوصاً جمعہ اور اتوار کو اگر کوئی لڑکی پسند کرنے جانا ہو تو ایک کار کرایہ پر لے جاتی ہے، لڑکی کے مکان پر ایک ہی وقت میں بلہ

---

[1] مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

بول دیتے ہیں اوران لڑکیوں کو دیکھنے کے لئے خاص طور پر ہونے والے دولہا کی بہنیں دیکھنے آتی ہیں، ایک لڑکی پسند نہ آئے تو دوسری لڑکی، دوسری پسند نہ آئے تو تیسری۔ تیسری پسند نہ آئے تو چوتھی لڑکی، ہر جگہ ایٹ ہوم نوش کر کے رخصتی حاصل کر لیتے ہیں، لڑکیاں پسند کرنا مقصد نہیں رہتا جیسے قربانی کا جانور پسند کرنے نکلتے ہیں۔

جب لڑکے والے کسی بھی لڑکی والے کے گھر پہنچتے ہیں تو ایک ہی بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمیں لڑکی بتائیے کیونکہ اور بھی جگہ لڑکی دیکھنے کے لئے جانا ہے، یعنی لڑکی کا انتخاب بالکل کاروباری انداز میں ہوتا ہے، اور یہ دولہے کی بہن جو لڑکی سے انٹرویو لیتی ہیں، آپ کہاں تک پڑھی ہیں، کون سے اسکول کالج سے پڑھی ہیں، آپ کی ہابی کیا ہے، آپ کو کیا کیا پکوان آتا ہے، موٹر ڈرائیونگ آتی ہے یا نہیں، جو عمر رسیدہ عورتیں ہوتی ہیں وہ لڑکی کا قد ناپتی ہیں اور لڑکی کی چوٹی اٹھا کر دیکھتی ہیں، اس سے لڑکی کی عمر کا پتہ چلتا ہے، یعنی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اپنے گھر کے لئے بہو نہیں، بلکہ کوئی ماڈل کا انتخاب کر رہی ہیں، لڑکی کی مجبوری میں ماں وباپ لڑکی والوں کے اس آس میں غمزدہ رہتے ہیں، لڑکی کا رشتہ طے ہو جائے گا، لڑکی پسند آ جائے گی، لڑکے والے اٹھ کر جاتے ہیں، کہتے ہیں، ہم گھر جا کر ٹیلی فون کریں گے اور ٹیلی فون کی گھنٹی لڑکی کی سوتی قسمت کی طرح کبھی بجتی ہی نہیں، لڑکی کے والدین پھر فکر مند ہو جاتے ہیں، ہر جمعہ اور اتوار کو آیت کریمہ کا درس، قرآن شریف کی مجلس، یا رب کی تسبیح کرواتے ہیں، یہ تسبیح پڑھنے والے بھی 500 سے 1000 روپئے ہدیہ لیتے ہیں، اگر آپ دوپہر کھانا کھلائے تو مناسب ہے کم از کم ایٹ ہوم تو کھلانا ضروری ہے۔

لڑکی کے ماں وباپ بے چین کسی عالم یا مرشد کے پاس رجوع ہوتے ہیں، آخر ہماری لڑکی کے رشتے میں رکاوٹ کیوں آ رہی ہے؟ یہ عالم یا مرشد اول تو تین چار سو روپئے توڑ لیتے ہیں، لڑکی کی تصویر کو دم کر کے دیتے ہیں، لڑکی بہت ہی جھمیلے میں پھنسی ہے، پڑھنے کی بہت ضرورت ہے، اس کی علاحدہ فیس ہوتی ہے، کنگھی پر دم کر کے دیتے ہیں۔

اب دوسرا طریقہ بعض لڑکی کے ماں وباپ اخبار کا اشتہار کا سہارا لے کر ضرورت رشتہ کے کالم میں اشتہار شائع کرتے ہیں، خوبصورت، رنگ بہت ہی گورا، عمر ۲۴ سال، بی ای الکٹرانک، صوم وصلوۃ کی پابند، امور خانہ داری سے مکمل طور پر واقف، لڑکی کے لئے ایک لڑکا ۲۸ سالہ، انجینئر، ڈاکٹر یا غیر ممالک میں ملازمت کرنے والے مہذب خاندان سے تعلق رکھنے والے لڑکی سے رشتہ مطلوب ہے، گھر کا ٹیلی فون نمبر دیا جاتا ہے۔

اتوار کے دن ۸ بجے سے لڑکی والوں کے گھر ٹیلی فون کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو جاتی ہے، آج کے اخبار میں جو لڑکی کے تعلق سے آپ نے اشتہار دیا، آپ لوگ کون سے محلے میں رہتے ہیں، اگر آپ نے کہا کہ یاقوت پورہ، شاہ علی بنڈہ ''ارے اللہ پرانے شہر کے لوگ ہیں'' کہہ کر فون رکھ دیتے ہیں۔

دوسری مرتبہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے، پہلے انکوائری یہ رہتی ہے کہ لڑکی کا رنگ کیسا ہے، بہت ہی گوری، خوبصورت اور کم عمر لڑکی چاہئے کیونکہ ہمارا لڑکا بہت ہی اسمارٹ ''سلمان خان'' اور ''شاہ رخ'' جیسا ہے۔

جیسے ہی آپ کہتے ہیں کہ لڑکی کا رنگ سانولہ ہے تو جھٹ فون رکھ دیتے ہیں، دو تین سال قبل شہر کے ایک اردو اخبار میں ایک اشتہار ضرورت رشتہ کے کالم میں شائع ہوا تھا، جس کی عبارت کچھ اس طرح تھی:

''کالی وسانولی لڑکی کے ماں وباپ ٹیلی فون کرنے کی زحمت نہ کریں''۔

یعنی یہ کس قدر ذلت آمیز اشتہار ہے۔

قرآن کے ۲۹ ویں پارے میں بالکل صاف صراحت آئی ہے کہ ''اے بندو تم اپنے رنگ ونسل پر مت اتراؤ ہم نے اس دنیا میں کسی کو کالا، کسی کو گورا پیدا کیا، لیکن ہمارے پاس اس بندے کی زیادہ قدر وعزت ہے جس کا تقوی اونچا ہے''۔ یعنی اب قرآنی تعلیمات سے بھی انحراف ہے، حیدرآباد کا معاشرہ اتنا مادہ پرست اور اتنا خود غرض ہو گیا ہے، ان کے پاس نہ اللہ کا خوف نہ دین کا کوئی پاس ولحاظ۔

چوتھی گھنٹی بجی انکوائری، کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے، آپ لوگ شیخ ہیں، یا سید ہیں، فاتحہ وغیرہ دیتے ہیں یا نہیں، پیر ومرشد کو مانتے ہیں یا نہیں، درگاہوں پر جاتے ہیں یا نہیں، ہم وہابی اور تبلیغی جماعت کے لوگوں میں رشتہ نہیں کرتے، ہم کو فاتحہ دینے اور عرسوں میں جانے والا خاندان

چاہئے، یہ بدعتی لوگوں سے ہم ذرا دور رہتے ہیں۔

لڑکیوں کے ان بیانات کے مسائل کو حل کرنے کے شہر کے مدبر اور کچھ اصلاح کاروں نے اخبار سیاست کے ذریعہ ایک ''دوبدو پروگرام'' شروع کیا جس کے ذریعہ اتوار کے دن شہر کا کوئی شادی خانہ لے کر وہاں لڑکی والوں اور لڑکے والوں دونوں کو دوبدو کر کے ان سے بات کا موقع فراہم کیا جاتا ہے کہ لڑکی اور لڑکے والے ایک دوسرے کو پسند کر کے رشتہ کرلیں۔ بات آگے بڑھ جائے، یہ پروگرام بہت کامیاب رہا، لیکن کچھ عرصے کے بعد یہ پروگرام بھی مدھم پڑ گیا، یعنی ہر ایک لڑکے کو گوری لڑکی چاہئے وہ کالی سانولی لڑکی سے شادی کر کے اپنے خاندان ونسل کو برباد نہیں کرنا چاہتا، اس لئے خوبصورت سے خوبصورت لڑکیوں کی تلاش میں رہتے ہیں، ان لوگوں کو سمجھنا چاہئے، خوبصورت لڑکیوں کا رشتہ تو انہیں کے خاندان کے لڑکوں سے ہوجاتا ہے، وہ آپ کے انتظار میں کیوں بیٹھیں گی، اور اس لڑکی کا اشتہار اخبار میں کیوں آئے گا، دنیا میں کئی قسم کی نسلیں ہیں، ہم کیونکہ خط استوا کے قریب رہتے ہیں اور ہمارا تعلق دراوڑی نسل سے ہے گوکہ ہم اسلام کے ماننے والے ہیں، اس لئے ہماری نسل کا رنگ وروپ کالا، سانولا رہ گیا ہے، لیکن ہم اس رنگ وروپ سے اتفاق نہیں کرنا چاہتے، ہم اپنی ذاتی پسند تھوپنا چاہتے ہیں۔

لڑکیوں میں رشتے کے تاخیر کی وجہ سے والدین شگر اور بلڈ پریشر کے امراض میں مبتلا ہوجاتے ہیں، لڑکیوں کے رشتے کی فکر میں رات رات بھر نیند نہیں آتی، نیند کی گولیاں کھا کر سونا پڑتا ہے، لڑکیوں کے سر سے چاندی جھانکنے لگتی ہے، اور لڑکیوں کی عمر دیکھ کر نظر آنے لگتی ہے، لڑکیاں زیادہ تعلیم یافتہ ہونے لگی ہیں اور اب مسلم معاشرہ میں تعلیم یافتہ لڑکے ملنا محال ہوگیا ہے۔

ہر جمعے کے خطبے میں امام حضرات مسجدوں میں ان خرافات کی طرف توجہ دلا کر مذمت کرتے ہیں، لیکن ان کے وعظ کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے، اتوار کے دن مختلف محلہ جات میں اصلاح معاشرہ کے جلسے ہوتے ہیں، علماؤں کی لمبی چوڑی تقریریں ہوتی ہیں اور یہی علماء اور مولانا شام کو کسی ولیمہ، شادی کی دعوت میں مدعو رہتے ہیں، نہ کوئی خرافات کے خلاف احتجاج کرتے ہیں، کھانا تناول کر کے خاموشی سے میزبان کا شکریہ ادا کر کے نکل جاتے ہیں، یعنی انہوں نے اپنے وعظ میں ان خرافات کا ذکر کیا، معاشرہ پر کوئی اثر نہیں ہوگا، معاشرہ کے اس دوہرے معیار Double Standard کے مزاج کا علاج کیا ہے؟ لڑکیوں کے رشتہ میں اتنی باریکیاں ہیں اور لین دین کے مطالبات یقیناً اس کے مضر اثرات معاشرے پر مرتب ہو رہے ہیں، بعض اخبارات میں آج کل خبریں آنے لگی ہیں کہ اکثر نچلے طبقے کی مسلم لڑکیاں غیر مسلم لڑکوں سے شادیاں کر رہی ہیں، پس اس کا علاج نہ معاشرہ کے پاس ہے نہ والدین کے پاس، بڑھتی ہوئی تعلیم، بڑھتی ہوئی ترقی، بڑھتی ہوئی مادہ پرستی، بڑھتی ہوئی انا پرستی اس صورت حال کی ذمہ دار ہے، ہر لڑکے کو خوبصورت لڑکی چاہئے، خود وہ اپنا چہرہ آئینہ میں نہیں دیکھتے، کیونکہ لڑکے خلیجی ممالک میں ملازمت کرتے ہیں، وہاں کی گوری چمڑی سے متاثر ہو کر یہاں بھی خوبصورت دلہن کا مطالبہ کرتے ہیں، خوبصورتی نسل پر منحصر ہوتی ہے، خاندان کی وضع قطع کا بڑا دخل ہوتا ہے، اس پر قدرتی ماحول اور غذاؤں کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے، اس لئے ہدایت آتی ہے کہ تم اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کے رشتے اپنے ''کفو'' میں کرنے کی کوشش کرو، اپنی برادری میں اپنے رشتہ کرلو تاکہ مسائل پیدا نہ ہوں۔

کیونکہ معاشرہ کافی وسیع ہو چکا ہے، لڑکے والے لڑکی کی سیرت وتعلیم اور خاندان پر جائیں تو یہ مسائل نہیں ہوں گے۔

اکثر یہ بات مشاہدے میں آتی ہے کہ لڑکے والے اپنے لڑکے کی شادی کے لئے درجنوں لڑکیاں دیکھتے ہیں اور ان کو رد کر دیتے ہیں، یہ ایک عام بات ہوگئی ہے، لڑکی کے رشتہ دار عورتیں کار یا آٹو رکشا میں بھر کر لڑکی کے گھر جا کر کیک، پسٹری، میوہ جات ومشروبات کے اخراجات سے لڑکی والوں کو زیر بار کرتے ہیں، پھر کوئی نہ کوئی نقص نکال کر ناپسند کرتے ہیں، اس عمل سے بے چاری لڑکی پر نفسیاتی طور پر بہت برا اثر پڑتا ہے، اس خرابی کو دور کرنے کے لئے ایک تجویز یہ ہے کہ آئے دن ہمارے کسی دوست یا رشتہ دار کے یہاں کوئی نہ کوئی تقریب ہوتی رہتی ہے، مثلاً چھلہ، چھٹی، بسم اللہ، روزہ رکھائی وغیرہ، لڑکی والوں کو چاہئے کہ اپنے دوست اور رشتہ داروں سے خواہش کر کے گھر کے لڑکے کے خاتون رشتہ داروں کو اس تقریب میں مدعو کرلیں، وہاں دل بھر کر عورتیں لڑکی کا دیدار کریں اور لڑکی بے چاری کو خبر بھی نہ ہوگی۔

اگر کوئی خاندان سیرت اور لڑکی کی تعلیم کو شادی کا معیار بنا رہے ہیں، صرف گوری چمڑی سے ہی شادی کرنا چاہ رہے ہیں اگر شادی کے بعد نااتفاقی ہوجائے تو پھر پچھتاتے ہیں، اپنے فیصلہ پر افسوس کرتے ہیں، اور تقدیر کو دوش دیتے ہیں، اس لئے معاشرہ کو ایک حقیقی انداز اپنانے کی

ضرورت ہے، تاکہ معاشرہ کا یہ سنگین مسئلہ کوئی خطرناک قسم کا بگاڑ معاشرہ میں پیدا نہ کردے۔

پہلے ہی ہمارے معاشرے میں سماجی بیماریاں پیدا ہوگئی ہیں، اگر ایسا ہوگا تو ہم دین کے رہیں گے نہ دنیا کے، اس لئے اس معاشرہ کو حقیقت کی عینک پہننے کی ضرورت ہے، اب مشاہدے میں یہ بات آرہی ہے کہ اخبارات میں ضرورت رشتہ کے ساتھ ساتھ نکاح ثانی کے بھی اشتہارات کی کثرت ہوگئی ہے، یہ ترقی پسند زمانے کی دین ہے، کیونکہ آج کے معاشرہ میں فرد کی شخصیت کی اہمیت بڑھ گئی ہے اور شخصی انا پرستی شخصیتوں پر چھائی ہیں، اور خاندان کے جو اقدار تھے، اس کی تو بھرپور پامالی ہورہی ہے، پہلے زمانے میں تو صرف گھر کے بزرگ اگر کوئی رشتہ طے کردیتے تو اس کو قبول کرلیا جاتا تھا، اس کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھاتا تھا، لیکن آج کے دور میں وہ ساری باتیں قصہ پارینہ ہوگئی ہیں، ہر شخص کو اپنی زندگی کے ساتھی کا انتخاب کی آزادی ہوگئی ہے، اس لئے زمانے کی نئی روشنی نے معاشرہ کی روایاتی روشوں کو جھنجھوڑ کر رکھدیا ہے، اس لئے آپ کے دلائل آج کی بڑھتی ہوئی مادی ترقی میں بالکل کمزور نظر آتے ہیں۔

عمر بھر ہم ایک ہی غلطی کرتے رہے
چہرے پر دھول تھی ہم آئینہ صاف کرتے رہے

خلاصہ:

حیدرآباد کے مسلم معاشرہ میں آج کل سب سے زیادہ دشوار کن مسئلہ والدین کے لئے اپنی لڑکیوں کے لئے موزوں بر کی تلاش کا ہوگیا ہے، اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے شہر کے متعدد ایجنٹوں کا سہارا لے رہے ہیں، مثلاً اخبارات میں ''ضرورت رشتہ کا اشتہار'' ادارہ پیامات شادی میں لڑکی کا رجسٹریشن، مشطائیں وغیرہ ان لڑکیوں کے رشتوں کو طے کرنا مسلم معاشرہ میں نفع بخش کاروبار ہوگیا ہے، ہر لڑکے کو خوبصورت اور گوری رنگت والی لڑکی چاہئے، کالی اور سانولی لڑکی کی میرج مارکیٹ میں تو کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، یعنی میرج مارکیٹ بھی شیئر مارکیٹ ہوگیا ہے، لڑکے کے رشتے میں دیر ماں و باپ کو شکر اور بلڈ پریشر جیسے امراض میں مبتلا کررہی ہے، رات رات بھر نیند نہیں آتی ہے، نیند آنے کے لئے خواب آور گولیوں کا استعمال بڑھ گیا ہے، لڑکی کی بڑھتی ہوئی عمر کی وجہ سے لڑکی کے بالوں میں چاندی نظر آنے لگتی ہے، لڑکے والوں کو اتنا شعور نہیں ہوتا کہ خوبصورت لڑکیوں کا رشتہ تو خاندان میں طے ہوجاتا ہے، وہ کیوں اشتہار کے سہارے سے اپنے رشتے کریں گے، لڑکی کے انتخاب میں اتنی باریکیاں یقیناً ہمارے معاشرے میں بگاڑ پیدا کریں گے، اگر ہم تعلیم یافتہ، اچھی سیرت کی لڑکیوں کو رد کریں گے تو ہمارے معاشرے میں ایک سماجی جھول پیدا ہوگا۔ خوبصورت لڑکی کے انتخاب کی دھن آج کل مادی ترقی کی دین ہے، لڑکیوں کو پسند نہیں کررہے ہیں، بلکہ ماڈل پسند کررہے ہیں۔ آج کے ترقی یافتہ معاشرے میں فرد کی اہمیت بڑھ گئی ہے، اس لئے ہر چیز میں کسی پسند کا آخری فیصلہ پورے خاندان والوں کو قبول کرنا پڑتا ہے، اس لئے وہ اپنی زندگی کا ساتھی اپنی مرضی سے انتخاب کرنا چاہتے ہیں، وہ خاندان کسی فرد کی رائے اور اصلاح کاروں کے مشورے قبول کرنا نہیں چاہتے۔

عمر بھر ہم ایک ہی غلطی کرتے رہے
چہرے پر دھول تھی ہم آئینہ صاف کرتے رہے

☆☆☆

خاندانی نظام کی تشکیل میں ساس اور بہو کا کردار

مولانا محمد مصطفی عبدالقدوس ندوی [1]

مکان کی زینت مکین سے ہوتی ہے، مکان کتنا ہی خوبصورت ہو، اندر اور باہر عصری زیب و زینت سے کتنا ہی آراستہ ہو، اور ہر طرح کی سہولیات فراہم ہوں، لیکن مکین سے خالی ہو، یعنی اس میں کوئی فرد بشر نہ ہو، رہنے والا کوئی انسان نہ ہو، تو اس مکان کی تمام تر خوبصورتی و رعنائی بیکار اور پھیکی ہے اور اگر گھر کا مکین یعنی انسان سے ہرا بھرا ہو تو گھر بڑا اچھا دکھتا ہے، گو ظاہری خوبصورتی سے عاری ہو، اسی طرح گھر میں رہنے والے افراد باہم شیر و شکر ہوں، اور آپس میں محبت کی فضا قائم ہو، تو ایسے گھر کا کیا پوچھنا، وہ تو جنت کا نمونہ ہے، اور اللہ کی شان ایسا ہو کہ آنے والی بہو بھی کسی جنت نما گھر کی پری ہو تو اس گھر کے رونق میں اور بھی اضافہ ہوگا، لیکن خدانخواستہ آنے والی بہو اچھے گھرانے کی نہ ہو، اخلاق و کردار سے عاری ہو، اسلامی آداب زندگی سے ناآشنا ہو، تو جنت نما گھر میں دراڑ پیدا ہوگا، آہستہ آہستہ محبت والفت کی فضا نفرت و انارکی میں بدل جائے گی، اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ گھر جہنم کا نمونہ بن جائے گا جس طرح تالاب میں اگر ایک مچھلی مر کر سڑ جاتی ہے تو اس سے پورے تالاب کی مچھلیاں متاثر ہوتی ہیں، اسی طرح جنت نما پرسکون گھر میں ایک بداخلاق بہو کی قدم رنجاں ہونے کی وجہ سے اس گھر کا ماحول متاثر ہوتا ہے، اس گھر کا چین و سکون جاتا رہتا ہے، اور اس گھر سے خیر و برکت رخت سفر باندھنے لگتی ہے، اسی لئے ماں و باپ کی ذمہ داری ہے کہ اپنی اولاد کی شادی اچھے خاندان میں کریں، جس طرح اچھے داماد کی تلاش ہوتی ہے، اسی طرح اچھی بہو بھی لانے کی کوشش کریں، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”تم میں سے ہر ایک نگراں ہے، اور ہر ایک سے سوال ہوگا، پس امام نگراں ہے، اس سے (اس کی رعیت کے بارے میں) سوال ہوگا، مرد اپنی بیوی و بچوں کا نگراں ہے، اور اس سے سوال ہوگا، عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگراں ہے، اور اس سے سوال ہوگا، غلام اپنے آقا کے مال کا نگراں ہے، اور اس سے سوال ہوگا، پس تم میں سے ہر ایک نگراں ہے، اور ہر ایک سے سوال ہوگا (اس کے ماتحت کے بارے میں) (بخاری، کتاب النکاح، باب قولہ قوا أنفسکم الخ ۷۷۹/۲)۔

پس اگر گھر میں بداخلاق بہو آئی، تو اس کے بارے میں کل قیامت کے دن سب سے پہلے والدین ماخوذ ہوں گے، کیونکہ انہوں نے اپنی ذمہ داری نبھانے میں کوتاہی کی، اس لئے والدین کو چاہئے کہ اپنی استطاعت بھر اچھی بہو کی تلاش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں، اور چونکہ اسباب کے تحت اگلی نسل کی حفاظت بھی اس میں مضمر ہے، ایک مرفوع حدیث میں ارشاد ہے:

تزوجوا في الحجر الصالح، فإن العرق دساس (الکامل للضعفاء لابن عدی)۔ صالح گود میں شادی کرو، کیونکہ رگ دخال ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے:

الناس معادن في الخير والشر لوگ خیر و شر کے کان ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

تخيروا لنطفكم وأنكحوا الأكفاء (ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب الأکفاء: ۱۴۱/۱)۔ اپنے نطفہ کے لئے بہترین عورت کا انتخاب کرو، اور ہمسر لوگوں میں شادی کرو۔

ساس کا کردار:

---

[1] استاذ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

ساس کو چاہئے کہ نئی بہو کو آہستہ آہستہ گھر کے ماحول سے مانوس کرے، گھر کے افراد کے مزاجوں اور ان کی پسند و ناپسند سے اسے آگاہ کرتی جائیں، ساس کو چاہئے کہ بہو کو اپنی بیٹی کا درجہ دے، جس طرح ایک ماں اپنی بیٹی کے لئے کس قدر خیر خواہ ہوتی ہے، جہاں اس کی غلطیوں پر ٹوکتی ہیں، وہیں اس کی لغزشوں سے صرف نظر بھی کرتی ہیں، ایسا نہیں ہوتا ہے کہ اس سے الجھ کر برابر لڑتی رہتی ہوں، اور دل میں کینہ رکھ کر موقع سے اس کی خبر لیتی ہوں، باپ بھائی سے پٹواتی ہوں، بلکہ اکثر باپ بھائی کے سامنے بیٹی کی طرف سے وکالت اور دفاع کرتی ہیں، اسی طرح بہو کے ساتھ بھی معاملہ ہونا چاہئے کہ اس کی لغزشوں سے صرف نظر کیا جائے، اگر ایسی لغزش ہو کہ ساس واقعی میں اس پر تنبیہ اور اصلاح ضروری تصور کرتی ہیں تو اس میں دو باتیں ضرور ملحوظ رکھے:

اول: خیر خواہی اور اصلاح ہی کا جذبہ ہو، نہ کہ عداوت، انتقام، اور دل کی بھڑاس نکالنا مقصود ہو۔

دوم: لب ولہجہ میں نرمی ہو، درشتی وسختی نہ ہو، اور ناک بھوں چڑھا کر بات نہ کریں۔

ساس کو چاہئے کہ بہو کی معمولی غلطی پر گرفت نہ کرے، اور بیٹے کے سامنے رائی کے دانہ کو پہاڑ بنا کر پیش نہ کرے، کیونکہ اس سے دلوں میں بدظنی پیدا ہوتی ہے، اور بے اعتمادی جنم لیتی ہے، جس کا نتیجہ آگے چل کر اچھا ظاہر نہیں ہوتا ہے، اسی وجہ سے جب بہو گھر کا مالکہ بنتی ہے، گھر کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں آتی ہے اور وہ سپید وسیاہ کی مالک بن جاتی ہے تو دیرینہ جلے ہوئے دل کی بھٹی شعلہ بن کر سامنے آتی ہے، اور موقع بہ موقع سارا کسر نکالنا شروع کرتی ہے، اور ستانے لگتی ہے، حالانکہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ ساس ماں کے درجہ میں ہے، اس لئے ساس کو سوچنا چاہئے کہ حالات برابر یکساں نہیں رہتے ہیں، گردش زمانہ حالات کو بدلتا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وتلك الأيام نداولها بين الناس (آل عمران ر ۱۴۰)

یعنی: اور ہم ان ایام کی الٹ پھیر تو لوگوں کے درمیان کرتے ہی رہتے ہیں، اگر آج ساس کا راج ہے، تو کل بہو کا راج آئے گا، لہٰذا اگر ساس آج بہو کو ستائے گی اور برے اخلاق کے ساتھ پیش آئے گی تو کل جاکر بہو بھی اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرسکتی ہے، جیسا کہ صحیح بخاری میں بھی نقل کیا کما تدین تدان (بخاری، کتاب التفسیر ۲ر ۶۴۲) یعنی جیسا کروگے ویسا بھروگے پس کم سے کم اس نظریہ کے تحت بھی ساس کو چاہئے کہ ناحق بہو کو ستانے سے گریز کرے، اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے حقیقی ماں جیسا سلوک کرے، اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آئے تاکہ کل جاکر بہو بھی اس کے ساتھ اچھا معاملہ کرے اور میرے خیال میں ایسی ساس کے ساتھ بہو بداخلاقی کا مظاہرہ نہیں کرے گی، اور احسان شناسی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ایسی ساس کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے، ان کے آرام وراحت کا خیال رکھا جائے، اور ان کی خدمت اپنے لئے سعادت بختی تصور کرے۔

ساس کو چاہئے کہ بہو کو گھر کی نوکرانی سمجھ کر حکم نہ کرے، حاکمانہ انداز اکثر سودمند نہیں ہوتا ہے، اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ والدین اپنی بڑی اولاد کو کسی کام کرنے کا حکم نہ کرے، کیونکہ اگر اولاد نے والدین کا کہا نہیں مانا تو گنہگار ہوگی، اس لئے اولاد کے ساتھ خیر خواہی اور پدرانہ شفقت ومادرانہ محبت کے تقاضے کے خلاف ہے کہ اس طرح کا انداز گفتگو اختیار کیا جائے، بلکہ انداز تکلم ایسا ہو کہ اگر اولاد بات نہ مانے تو گنہگار نہ ہوسکے، جیسے والدین بڑی اولاد (خواہ لڑکی ہو یا لڑکا) کو کام کرنے کے لئے یوں کہیں: بابو، بیٹا، بیٹی، اگر تم سے یہ کام ہوسکتا ہے، تو کردو، اگر تمہارے پاس وقت ہو تو ایسا کرلو، اچھے بچے ایسا کام نہیں کرتے ہیں، اسی طرح ساس کو بھی چاہئے کہ انداز گفتگو ایسا ہی اختیار کرے، جیسے یوں کہے: بیٹی، بیٹا، یہ کام کرلینا چاہئے، یہ کام اتنے بجے تک ہوجائے تو اچھا ہوگا، ناشتہ اتنے بجے تک تیار ہوجائے تو بہتر ہوگا، شریف بیٹی، شریف خاندان کی بیٹی کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ صبح سویرے اٹھتی ہیں، اگر بہو سے چوک ہوجائے یا کوئی سامان ضائع ہوجائے، مثلاً چائے کی پیالی ہاتھ سے چھوٹ کر گرگئی اور ٹوٹ گئی، تو اس وقت ساس اس پر برس نہ پڑے، بلکہ نرمی کے ساتھ کہے، اچھا کوئی بات نہیں، البتہ ایسا کرتی یا اس طرح لے جاتی تو نہیں ٹوٹتی، آئندہ سے اس کا خیال رکھنا۔

ساس کو چاہئے کہ جہاں خود بہو کو نوکرانی سمجھ کر کوئی حکم نہ کرے، وہیں اس بات کا بھی خیال رکھے کہ گھر کا ہر فرد اسے نوکرانی سمجھ کر حکم نہ چلائے، ورنہ جلد ہی گھر کا امن وسکون جاسکتا ہے۔

ساس کو چاہئے کہ پورے گھر کا کام اسی پر نہ ڈالے، دیور، نند، خسر اور خود اپنے کپڑے دھونے کا مکلف نہ بنائے کیونکہ وہ اس گھر میں بہو بن کر آئی ہے، نہ کہ اس گھر کی نوکرانی، اگر وہ اپنی طبیعت سے سب کے کپڑے دھودے تو اچھی بات ہے، ورنہ اس کو جبر نہ کیا جائے، کیونکہ شرعی نقطہ نظر سے

اس پر پورے گھر والوں کا کام (خواہ وہ کپڑے دھونے کا ہو یا کوئی اور کام) اور ان کی خدمت واجب نہیں، ہاں ساس کی خدمت اس پر دیانۃً واجب ہے جبکہ وہ خدمت لینے کی محتاج ہو، اصلاً اس پر شوہر کی خدمت واجب ہے، لیکن بعض مرتبہ ہوتا ایسا ہے جس کی خدمت اس پر واجب ہے، اسی کی خدمت نہیں ہو پاتی ہے، بقیہ اور لوگوں کی خدمت ہوتی رہتی ہے۔

ساس کو چاہئے کہ خود بھی اور گھر کے دوسرے افراد (خاص طور پر بیٹا، دیور اور نند) کو بھی منع کرے کہ بات بات پر بہو کو جہیز میں کمی کا طعنہ نہ دیں، اور اضافہ کا مطالبہ نہ کریں، ورنہ اس میں زیادہ شدت آنے سے بال آخر طلاق یا خودکشی کی نوبت آئے گی، اولاً جہیز، لین دین اور گھوڑے جوڑے کی رقم کا مطالبہ شرعاً حرام ہے، پھر مزید اس میں کمی وبیشی ہو جائے تو اس کی وجہ سے بہو کو دق کرنا، پریشان کرنا، طعنہ دینا اور ستانا ستم بالائے ستم ہے، حالانکہ ایک عام مسلمان بھائی کو ناحق ایذا پہونچانا گناہ کبیرہ اور حرام ہے، اور صحیح بخاری میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ "المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده" (بخاری، کتاب الایمان) یعنی مسلمان تو وہ ہے جس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان بھائی محفوظ رہیں، غور کرنے کا مقام ہے، یہاں بہو غیر نہیں ہے، بلکہ گھر کی ایک اہم حصہ ہے، جس سے اگلی نسل کی بقاء وابستہ ہے، جس سے خاندان کا وجود ہوگا، جب ایک عام مسلمان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی ہدایت ہے تو اہل خاندان، ان میں بھی قریب سے قریب تر رشتہ دار کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکور بالا ارشاد میں اور شدت پیدا ہو جائے گی، بلکہ صحیح بخاری ہی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلہ رحمی اور قطع رحمی یعنی رشتوں کو جوڑنے اور توڑنے کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ رحم یعنی رشتہ کو مخاطب ہو کر فرمایا: میں اس سے تعلق جوڑوں گا جو تم سے تعلق جوڑے، اور میں اس سے تعلق توڑوں گا جو تم سے تعلق توڑے۔ (بخاری، کتاب الادب، باب من وصلک وصلہ اللہ ۲/۸۸۵)

یعنی رشتہ کو توڑنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا، اس کے برخلاف رشتہ کو جوڑنے والے کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رزق میں کشادگی، درازیٔ عمر اور جنت کی خوشخبری سنائی ہے۔ (بخاری، باب فضل صلۃ الرحم، باب من بسط لہ فی الرزق لصلۃ الرحم)

ساس کو چاہئے کہ اگر بہو اور نند یا دیور کے درمیان لڑائی ہو جائے، تو اس لڑائی کو دو بہنوں اور بھائی بہن کے درمیان سمجھے، نہ کہ خود بھی بیٹی کی طرفداری کرے اور فریق بن جائے، جیسا کہ عام طور پر معاشرہ میں ہوتا ہے، جس کے نتیجہ میں گھر میں کشیدگی بڑھتی ہے، بہو اپنے شوہر سے کہتی ہے، اور شوہر اپنی بیوی کی زبوں حالی پر ترس کھا کر آگے قدم بڑھاتا ہے، اس کے بعد ماں و بیٹے میں تکرار ہوتی ہے، اس طرح باتوں بات میں جھگڑا طول کھینچتا ہے، اور بال آخر علیحدگی پر جھگڑا ختم ہوتا ہے، اگر ساس ابتداء ہی میں فریق بننے کے بجائے حکم بنتی، اور گھر کی ملکیت اور ایک ذمہ دار ہونے کے اعتبار سے انصاف سے فیصلہ کرتی، وہ اپنے گھر کی عزت سمجھتی، اور سب کو بٹھا کر معافی تلافی کرا دیتی، تو گھر میں پھوٹ پیدا ہونے اور علیحدگی کی نوبت نہیں آتی، اور معاملہ اتنا آگے نہیں بڑھتا، اس معاملہ میں ساس کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے، گھر کے ماحول کو خوشگوار رکھنے میں ساس کا بڑا رول ہوتا ہے، اس اعتبار سے ساس کو اپنی ذمہ داری کا زیادہ احساس ہونا چاہئے، گھریلو جھگڑے یعنی بہو، نند اور دیور کے آپسی جھگڑے بلکہ مجھے کہنے کی اجازت دیجئے اور ماؤں سے معافی مانگتے ہوئے بولنے کی جرأت کرتا ہوں کہ حقیقی بھائی بھائی اور بہنوں کے درمیان جھگڑے کو دور کرنے میں ایک اہم رول ادا کرسکتی ہیں، اور انہیں آگے بڑھ کر جھگڑے کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے، نہ کہ غیر کی طرح تماشائی بن کر دیکھتے رہنا چاہئے، اے کاش کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہماری مائیں پہلے ہی سے ذہن میں یہ بات بٹھا لیتیں کہ ہمیں جھگڑے کو دور کرنا ہے، نہ کہ جھگڑے کو بڑھانا ہے، اس مقصد کی خاطر نرم گرم رویہ اختیار کرتیں، اور سب کو بیٹھا کر سمجھاتیں، کہ دیکھو جھگڑا اچھی چیز نہیں ہے، اور نہ کبھی اچھی رہی ہے، جھگڑا سے نقصان ہی پہنچتا ہے، فائدہ نہیں ہوتا ہے، ہاں شیطان ضرور خوش ہوتا ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کو دور کرنے کے لئے فرمایا: اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھے۔ (بخاری، کتاب الادب باب الحذر من الغضب، حدیث نمبر ۶۱۱۵)

مشہور بات ہے بلکہ حدیث میں آیا ہے کہ شب قدر کی تعیین جھگڑے کی وجہ سے چھین لی گئی، اس کے برخلاف صلح اور آپس میں سمجھوتہ کر لینا چاہئے، اس میں اللہ نے خیر رکھا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، "والصلح خیر" صلح کرنا خیر ہے۔

بہو کا کردار

یہاں تک ساس کے بارے میں بات رہی کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ایک ساس کا کردار کیا ہونا چاہئے، اب آگے ہماری گفتگو کا محور بہو ہے، کہ ایک بہو جب نئے گھر میں قدم رکھے، نئے ماحول کا سامنا کرے، اس کے سامنے سب نئے چہرے ہوں گے، تو وہ اس گھر میں کس طرح کا کردار پیش کرے گی کہ شوہر سے لے کر گھر کا ہر فرد اس سے خوش رہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خير متاع الدنيا المرأة الصالحة (رواہ النسائی عن عبداللہ بن عمرو بن عاص، کتاب النکاح ۲/۶۰)۔ یعنی دنیا کی سب سے بہتر متاع نیک عورت ہے، پس ایک بہو کو چاہئے کہ جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ویسا اپنے آپ کو کردار سے ثابت کرنے، ایک بزرگ عالم نے سچ کہا: کوئی لڑکی کتنی ہی بڑی ڈگریاں حاصل کر لے اور کتنی ہی زیادہ تعلیم یافتہ ہو، اگر وہ فرمانبردار بیٹی نہ بن سکی، تو اس کی ساری تعلیم اور ڈگریاں بیکار، اگر وہ ماں جیسی ممتا کی حامل اچھی بیوی نہ بن سکی تو اس کی ساری تعلیم اور ڈگریاں بیکار، اگر وہ اچھی بہو نہ بن سکی، تو اس کی ساری تعلیم اور ڈگریاں بیکار، اور اگر وہ صحیح ماں نہ بن سکی، تو اس کی ساری تعلیم اور ڈگریاں بیکار، کیونکہ عورت کی تخلیق ہی دراصل ان ہی کاموں کے لئے ہوئی ہے، اس کی زندگی کا ماحصل یہی چار ہیں، اس کی کامیابی کا راز ان ہی میں پوشیدہ ہے، دنیا اور آخرت کے اعتبار سے بھی اس کی کامیابی اور ناکامی کی کسوٹی یہی ہیں۔

پس ایک بہو کو چاہئے کہ اپنے آپ کو سرد وگرم ماحول کا سامنا کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار کر لے، کیونکہ وہ اب ایک نیا گھر بسانے جارہی ہے اور انسان کے حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ خود اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: تلك الأيام نداولها بين الناس (سورہ آل عمران: ۱۴۰)۔ یعنی: اور ہم ان ایام کی الٹ پھیر تو لوگوں کے درمیان کرتے ہی رہتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ طبیعت سے چڑچڑاپن، الھڑ بازی اور بچکانی حرکتوں کو نکال دے، اور جب بیاہ کر سسرال پہنچ جائے، تو فوری تمام کام کرنا شروع نہ کردے، بلکہ آہستہ آہستہ کام کرنا شروع کرے، گھر کے ماحول سے شناسائی اختیار کرے، ساس، خسر، نند اور گھر میں رہنے والے جتنے لوگ ہیں سب کے مزاج و مذاق کو پہچاننے کی کوشش کرے، ہر ایک کی پسند اور ناپسند معلوم کرنے کی سعی کرے، تاکہ اسی اعتبار سے اپنے آپ کو نئے ماحول میں ڈھال سکے، ساس اور خسر کا احترام ماں و باپ کی طرح کرے، نند کے ساتھ حقیقی بہن جیسا معاملہ کرے، میکہ سے کوئی سامان آئے تو اس کو ساس کے پاس بھیج دے، ساس اس میں سے جتنا دے خوشی سے قبول کر لے، اسی طرح گھر میں کہیں سے کچھ بھی آئے تو خود سے نہ لے، بلکہ ساس جتنا بھی دے خوشی سے قبول کر لے، ہاں البتہ ساس کو بھی چاہئے کہ انصاف سے تقسیم کرے، نند اور بہو کے درمیان کھانے پینے اور دیگر اشیاء کی تقسیم میں برابری کا معاملہ کرے، کیونکہ بہو بھی گھر کی ایک فرد ہے، وہ بھی اپنے باپ کی پیاری اور ماں کی لاڈلی ہے، لہٰذا اس کو غیر نہ سمجھے، بلکہ اپنی بیٹی ہی تصور کرے، جس طرح اپنی بیٹیوں کے درمیان کھانے پینے اور لباس و پوشاک میں برابری کرتی ہے، اسی طرح بہو کو بھی برابر کا حصہ دے، کہنے کو بات چھوٹی ہے، لیکن اسی سے بڑی بات پیدا ہوتی ہے۔

بہو کو چاہئے کہ کسی بھی چیز میں اپنی پسند کو دخل نہ دے، ساس سے گھر کا حساب نہ لے، ساس جو بات کہیں اسے غور سے سنے، بے توجہی نہ برتے، اگر کسی بات کا جواب دینا ہو تو ادب سے جواب دے، اگر ان کو بلانا ہو تو نام لے کر نہ بلائے، بلکہ عزت کے ساتھ ماں کے لفظ سے پکارے، ان کا کہا مانے ان کو ماں کا درجہ دے، ان کی ہر ضرورت پوری کرنے کی کوشش کرے، بلکہ وقت سے پہلے ان کی ضرورت کی چیز تیار رکھے، ان کی خدمت کرنا اپنے لئے سعادت سمجھے، اگر آج بہو اپنی ساس کی خدمت کرے گی، ان کی راحت کا پورا خیال رکھے گی، تو کل جبکہ یہ خود ساس بنے گی تو اس کی بہو اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرے گی، بلکہ اللہ تعالیٰ اسی جیسی خدمت گزار بہو اسے مہیا کردیں گے۔

بہو کو چاہئے کہ نند کے ساتھ محبت سے پیش آئے، بڑی نند کا اکرام کرے، اور اس کو اپنی حقیقی باجی کا درجہ دے، اور چھوٹی نند کے ساتھ پیار سے پیش آئے، اپنی چھوٹی بہن کا درجہ دے، کھانے پینے میں شریک کرے۔

سسرال سے کوئی فرد اس کے میکہ جائے وہ وہاں موجود ہو تو اس کی خاطر میں کسر اٹھا نہ رکھے، کیونکہ یہ اچھے اخلاق کی علامت ہے، اور اس کا دوررس اثر مرتب ہوتا ہے، خود سسرال میں اس کی قدر بڑھے گی اور اس کا نام ہوگا۔

بہو کو چاہئے کہ جب وہ سسرال کے ماحول میں ضم ہو جائے اور گھل مل جائے تو وہ اپنے آپ کو گھر کا ایک حصہ سمجھے، اور سسرال کے گھر کو اپنا گھر

تصور کرے، یہاں کا نقصان، اپنا نقصان، اور یہاں کا فائدہ اپنا فائدہ سمجھے، یہاں کی کوئی چیز ضائع ہوئی تو گویا اپنی چیز ضائع ہوئی، اسی جذبہ کے تحت کام کرے، صبح سویرے اٹھنے کی عادت ڈالے، عام طور پر نئی بہو صبح اٹھ نہیں پاتی، حالانکہ سویرے اٹھنے میں کئی فائدے ہیں، فجر کی نماز قضا نہیں ہوتی، چہرہ کی رونق باقی رہتی ہے، تندرستی دیر تک قائم رہتی ہے، گھر کے کام کاج میں برکت ہوتی ہے، اور ساس کو شکایت کا موقع نہیں ملتا، کام سے ہر گز بے فکر نہ رہے، کیونکہ بعض مرتبہ گھر کے کام کاج اور اس کی سلیقہ مندی سے اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔

بہو کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس کی ذات سے زیادہ اس کا کام سسرال والوں کے نزدیک خاص طور پر ساس کے نزدیک پیارا ہوتا ہے، بہو کو چاہئے کہ اپنا کام خود کرے اور جہاں تک ممکن ہو سکے ساس کے کام میں ضرور ہاتھ بٹائے، ساس کے ساتھ بلاضرورت ہی صحیح ضرور بیٹھے، کیونکہ ایک ساتھ بیٹھنے سے محبت بڑھتی ہے، انس پیدا ہوتا ہے، اور بہت سی غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں۔

بہو کو چاہئے کہ شوہر کو اس کی ماں کے خلاف نہ اکسائے، کیونکہ فی نفسہ یہ عمل برا ہے، اور اگر شوہر نیک، دیندار اور سمجھ دار رہا تو اس کا الٹا اثر پڑے گا، ہوسکتا ہے کہ ماں کی ہمدردی غالب آ جائے۔

ساس اور بہو دونوں کا مشترکہ کردار

ساس اور بہو دونوں کی مشترکہ ذمہ داری ہے کہ دونوں کے بیچ مرد یعنی ساس کے لئے بیٹا ہوگا، اور بہو کے لئے شوہر ہوگا، کا بھرپور خیال رکھے، کیونکہ دونوں ہی اس کی کمائی کھاتی ہیں، بعض اوقات بیٹے بیچارے کا حال کافی قابل ترس ہوتا ہے، اس کا حال ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ کسی کے حلق میں لقمہ اٹک جائے، تو نہ ہی نگلتے بنتا اور نہ ہی اگلتے بنتا، یا اس بیچارہ کا حال آٹا کی چکی کے درمیان گیہوں یا کوئی اور اناج کے جیسا ہے، جو چکی کے دونوں پارٹ کے درمیان پستا چلا جاتا ہے، اس کی زبوں حالی پر کسی کو ترس نہیں آتا ہے، اور نہ ہی اس کے دکھ و تکلیف سننے کے لئے کوئی تیار ہوتا ہے، اس طرح سے ایک طرف ماں اور دوسری طرف بیوی چکی کے دو پارٹ ہیں، جن دونوں پارٹ کے درمیان بیٹا بیچارہ پستا ہے، اگر وہ ماں کی طرف سے کچھ بولے، تو بیوی کی طرف سے جاتا ہے اور بدنام ہوتا ہے، اور اگر بیوی کی طرف سے کچھ بولے، تو ماں کی طرف سے جاتا ہے، اور طعنہ دیا جاتا ہے کہ دوپٹہ کی ہوا لگ گئی، آخر بیچارہ کیا کرے، اس کے لئے بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے کہ کوئی ایسا راستہ اختیار کرے کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی بچے، اس صورت حال میں اگر ساس بہو دونوں اس کا ساتھ نہیں دیں گی، تو دو حال سے خالی نہیں یا تو ماں کی طرف جھکے گا، اور بالآخر طلاق کی نوبت آئے گی، اور اگر بیوی کی طرف جھکے گا، تو ماں کی ناراضگی مول لے گا اور بالآخر وقت سے پہلے ماں و باپ سے الگ ہونا پڑے گا، اور اگر دونوں جانب بیلنس برقرار رکھنا چاہے، تو گیہوں کی طرح چکی میں پستا رہے گا اور اندر اندر گھلتا رہے گا بالآخر اس پر اللہ تعالیٰ ہی رحم کرے، اور اس کی دعا قبول کرے، اور گھر کے حالات سازگار ہو جائیں۔

ساس اور بہو دونوں کو چاہئے کہ غیر سے اپنے گھر کے عیوب بیان نہ کریں، ہمارے معاشرہ کا حال یہ ہے کہ گھر میں جو بھی باہر سے مرد یا عورت آتی ہے، تو دونوں میں جس کو موقع ملتا ہے ایک دوسرے کی غیبت دل کھول کر کرتی ہے، اور اپنی پوری آپ بیتی سنا کر رہتی ہے، سننے والا تھک جائے گا لیکن اس کی داستان ختم نہیں ہوتی، حالانکہ غیبت گناہ کبیرہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یا ایها الذین اٰمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن إثم ولا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضا. أیحب أحدکم أن یأکل لحم أخیه میتا فکرهتموه. واتقوا الله إن الله تواب رحیم. (سورہ حجرات ر ۱۲)

اے ایمان والو! بچتے رہو بہت تہمتیں لگانے سے اس لئے کہ تہمت گناہ ہے، اور بھید نہ ٹٹولو کسی کا اور برا نہ کہو پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو، بھلا خوش لگتا ہے تم میں کسی کو کہ کھائے گوشت اپنے بھائی کا جو مردہ ہو، سو گھن آتا ہے تم کو اس سے، اور ڈرتے رہو اللہ سے بے شک اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے۔ نیز اپنے گھر کی خامی یا حقیقت کا اظہار دوسروں سے کرنے سے دور نہیں ہوتی بلکہ سننے والی پڑوسن عورت بھی ویسی ہی ہوتی ہے، وہ ساس کی بات بہو تک اور بہو کی بات ساس تک پہونچانے کا رول ادا کرتی ہے، وہ ساس کی بات بہو تک اور بہو کی بات ساس تک پہونچانے کا رول ادا کرتی ہے، گویا وہ دونوں کے درمیان جھگڑے کی چنگاری کو شعلہ بنانے کا کام کرتی ہے، ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ دونوں کی باتیں سن کر دونوں کو سمجھادے، اور صلح کرادے، دونوں کی دلخراش باتیں اپنے ہی دل میں رکھ کر بھلادے۔

ساس اور بہو کو چاہئے کہ اگر آپس میں کسی طرح کی ناچاقی پیدا ہو جائے، اور جھگڑا شروع ہو جائے تو پچھلے احسانات کی پوری فہرست بیان کرنی شروع نہ کریں، اس سے جھگڑا اور بڑھتا ہے، احسان جتلانا زخم پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہوتا ہے، حالانکہ احسان جتلانے سے کیا ہوا احسان برباد ہو جاتا ہے، اور اس کی نیکی مٹ جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یا ایہا الذین اٰمنوا لا تبطلوا صدقاتکم بالمن والأذی (سورہ بقرہ / ۲۶۴)۔ اے ایمان والو! اپنے صدقوں کو احسان جتلا کر اور اذیت پہنچا کر باطل نہ کرو۔

ساس اور بہو کو چاہئے کہ آپسی جھگڑے کو باہر نہ جانے دیں، بلکہ آپس ہی میں بیٹھ کر صلح کر لیں، اللہ تعالیٰ نے صلح میں خیر رکھا ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے: والصلح خیر (سورہ نساء / ۱۲۸) یعنی: اور صلح بہر حال بہتر ہے۔

ساس اور بہو کو چاہئے کہ جو کچھ بھی ایک دوسرے پر احسانات کئے ہیں، ہرگز ان احسانات کا ذکر کسی موقع پر نہ کریں، اس لئے آپ نے جو کچھ بھی ایک دوسرے پر احسان کئے، یا خدمت کی، یا دکھ تکلیف میں کام آئیں یہ سب اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کیں، پس خواہ مخواہ زبان کے چٹخارے اور دل کی تسکین کے لئے احسان جتلا کر نیکی ضائع کرنا کوئی عقلمندی کا کام نہیں ہے، اسی طرح ایک دوسرے کے عیب وخامی پر پردہ ڈالنا چاہئے نہ کہ دوسروں کے سامنے بیان کرنا چاہئے ورنہ اپنے گھر کی عزت کو خود اچھالنا۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من ستر مسلما، ستره الله في الدنيا والآخرة (مسلم، کتاب الذکر)۔ باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن والذکر (۲/ ۳۴۵)۔ جو کوئی کسی مسلمان (مرد ہو یا عورت) (کے عیب وخامی کو) چھپائے گا تو اللہ اس (کے عیب وخامی) کو دنیا وآخرت دونوں جہاں میں چھپائے گا۔

جب آپس میں صلح ہو جائے، تو دوبارہ جھگڑے کے موقع پر، یا یوں ہی باتوں بات میں پچھلی غلطی کا ذکر نہ کریں، اس سے دوسرے کو شرمندگی ہوتی ہے، خود کو کوسنے لگتی ہے، اور اس کا اندیشہ ہوتا ہے کہ بجھی ہوئی آگ پھر سلگ نہ جائے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے شوہروں کو خطاب کرتے ہوئے ذکر فرمایا: فإن أطعنکم فلا تبغوا علیہن سبیلا (سورہ نساء: ۳۴)۔ ''پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنے لگیں تو ان کے خلاف بہانے نہ ڈھونڈو۔

☆☆☆

ہندوستان کے مسلم سماج میں خواتین کے بنیادی حقوق

ڈاکٹر مفتی زاہد علی خاں[1]

ہر خاندان تین بنیادی عناصر سے مل کر تشکیل پاتا ہے:

۱۔ زوجین (شوہر و بیوی) ۲۔ والدین ۳۔ اولاد

ان تین عناصر کے ایک دوسرے پر کچھ حقوق ہیں، نیز ہر ایک سے کچھ فرائض متعلق ہیں۔ اگر سادہ لفظوں میں بیان کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان تینوں عناصر کے کچھ حقوق ہیں (جو انہیں دوسروں سے حاصل ہوتے ہیں) اور ہر ایک پر دوسروں کے تئیں کچھ فرائض ہیں (جن کی ادائیگی اس پر ضروری ہے)۔

حقوق و فرائض کی ادائیگی سے پہلے یہ جان لینا از حد ضروری ہے کہ درج بالا تینوں عناصر میں سے ہر ایک کے اپنے مخصوص احساسات، جذبات و امتیازات ہوتے ہیں جن سے ہر ایک دوسرے سے جداگانہ حیثیت کا مالک قرار پاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے خصوصی مسائل اور بعض مشکلات بھی ہوسکتی ہیں، جن کا پاس و لحاظ رکھنا دوسرے فریقوں پر لازم ہے۔ ورنہ حقوق و فرائض اور ان کی ادائیگی میں سخت مشکلات، دقتیں و رکاوٹیں پیش آئیں گی اور ان میں توازن برقرار رکھنا انتہائی مشکل ہوگا، جس سے معاشرتی زندگی میں سخت خلل واقع ہوگا حالانکہ ان کی درستگی و استواری کا ہمیں حکم دیا گیا ہے اور بحیثیت مومن ہم اس کے پابند ہیں۔

معاشرہ کی بنیاد خاندانی نظام کی درستگی پر قائم ہے۔ ایسا خاندانی نظام کہ جس کی ہر اکائی اپنے حقوق سے زیادہ دوسروں کے حقوق، دوسروں کو ذمہ داری کا سبق یاد دلانے سے زیادہ خود پر عائد ہونے والے فرائض کے بارے میں حساس و بیدار ہو، اسی احساس سے ایک متوازن و صحت مند معاشرہ وجود میں آسکتا ہے، جس میں تمام اکائیوں و افراد کے حقوق کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ دورِ حاضر کے خصوصی مسائل کے مسلسل بڑھتے ہوئے دباؤ، زندگی کی تگ و دو اور معیاری طرزِ حیات/طریقۂ زندگی (Standard Life Style) کے پیچھے مجنونانہ دوڑ نے گھریلو زندگی کو شکست و ریخت سے قریب کر خاندانی نظام کو زیر و زبر کے خطرہ سے دوچار کر دیا ہے۔ معاملہ یہاں تک دگرگوں ہوگیا ہے کہ ذرا سی لاپرواہی برتنے پر حالات بے قابو ہو کر معاشرتی انتشار و سماجی بکھراؤ کی شکل میں بھی سامنے آسکتے ہیں۔ جس سے مثالی صالح معاشرہ کی تشکیل کا امکان ہی معدوم ہوتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔

کتاب و سنت کے مقررہ حدود کے اندر صحیح خطوط پر خاندانی نظام کو از سرِ نو استوار کرنے کی شدید ضرورت سے کسی بھی صالح فکر کے حامل فرد کو انکار نہیں ہوسکتا جس کا نتیجہ وہ مثالی معاشرہ ہوسکتا ہے جس کا ہم اسلامی دور کے آغاز میں تاریخی حوالوں سے مشاہدہ کرتے ہیں۔

تمام تاریخی ادوار میں ''پدری نظامِ خاندان'' (Patriarchal System) کو ہی انسانی خاندانوں میں 'مہذب خاندان' کا درجہ حاصل ہوا ہے، اسی کو خواتین اور اکثر قبائلی نظاموں میں بھی قبولِ عام حاصل ہے۔ البتہ بعض وحشی یا نیم وحشی قبائل میں ہم مادری نظامِ خاندان (Matriarchal System/order) بھی پاتے ہیں تاہم حکومتوں کی انارکی کے دور میں دو شہری خواتین ریاستیں ہم یونان میں بھی (City States in Greek) تاریخی حوالوں سے موجود پاتے ہیں جو بہت تھوڑے عرصہ تک ہی رہیں اور ہنگامی طور سے خواتین ریاستوں نے اسکے خاتمہ کا اعلان کر کے اپنے وجود کو دوسری ریاستوں میں ضم کر دیا۔ اگر مرد و عورت دونوں کی فطری صلاحیتوں، قویٰ، وسائل، مسائل اور زندگی کے نشیب و فراز نیز سرد و گرم پر غور کر کے تحلیلی تجزیہ (Analytical Study) کیا جائے تو ہمیں تقسیم کار کا اصول نہایت فطری، سہل اور ہر ایک کے لیے موزوں دکھائی دیتا ہے۔ اگر ہم قولِ الٰہی اور فعلِ الٰہی کو ضم کر کے دیکھیں اور حقائق کا جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ شوہر (مرد) کو خاندان کی سربراہی

[1]

وقوامیت عطا اس لیے کی گئی ہے کہ وہ حالات کے ہر اتار چڑھاؤ میں اپنی بیوی، بچوں اور زیر کفالت لوگوں کا بوجھ اٹھانے کی بہترین صلاحیت رکھتا ہے اور تمام پرُخطر، بھاری اور مشکل کاموں کو ہمہ وقت انجام دینے کے ساتھ اپنے متعلقین کو تحفظ فراہم کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہے، اسی وجہ سے میڈیکل سائنس اسے جسمانی وذہنی طور پر فائق قرار دیتی ہے:

Male is a Superior than Female in Physical and Mental Exercises

(مرد عورت سے فائق ہے جسمانی وذہنی مشقوں/مشقتوں میں) لیکن بعض دوسرے اعتبارات سے عورت کو بھی مرد سے برتر قرار دیا گیا ہے چنانچہ میڈیکل سائنس نامیاتی طور پر عورت کو مرد سے برتر قرار دیتی ہے، مشہور طبی نظریہ ہے:

"Organically Female is a Superior than Male" (عورت نامیاتی طور پر مرد سے فائق ہے)۔

اسی طرح اللہ کے رسولؐ سے ثابت شدہ صحیح حدیث میں ماں کو باپ (عورت کے رشتہ کو مرد کے رشتہ) پر تین گنا فضیلت وشرف عطا فرمایا گیا ہے، پھر اس کے بعد تمام کائنات میں ماں (عورت) کو ہی یہ شرف عطا کیا گیا ہے کہ جنت اس کے قدموں کے نیچے ہے (الجنة تحت أقدام الامهات) یہ مشہور حدیث، حدیث کی تمام متداول کتابوں میں ہے۔

لہٰذا ہم اس حقیقت کا ادراک کرتے ہیں کہ مرد کو باعتبار سرپرست وقوامیت کے عورت پر یک گونہ شرف حاصل ہے، تو عورت کو مرد پر باعتبار ضروریات، حاجیات اور تحسینیات کی کفالت وعصمت کے تحفظ کی گارنٹی سے فضیلت وشرف عطا کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اگر مرد کو خلیفہ رسولؐ ہو کر شرف ملا تو عورت کو (ماں بن کر) جنت اپنے قدموں میں رکھنے کا شرف حاصل ہوا۔

دستورِ ہند (The Constitution of India) کے تیسرے حصہ (Part III) میں بنیادی حقوق (Fundamental Rights) دفعہ نمبر ۱۲ سے ۳۵ تک (Article 12 to 35) تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں، ان میں سے دفعہ ۲۵ تا ۲۸ (Article 25 to 28) مذہبی آزادی کے بنیادی حقوق سے متعلق ہیں اور ان میں سے بھی دفعہ نمبر ۲۵ اور دفعہ نمبر ۲۶ اس آزادی سے متعلق خاص دفعات ہیں، چنانچہ دفعہ نمبر ۲۵ و ۲۶ میں کہا گیا ہے:

Right to Freedom of Relition

Article 25. Freedom of Conscience and free Profession Practice and Propagation of Religion.

(ضمیر کی آزادی اور مقصدِ حیات بنانے، عبادت اور مذہب کی تبلیغ ودعوت کی آزادی)

Article 26. Administration of Property of Religious endowments

(مذہبی اوقاف کی جائیدادوں کا انتظام کرنے کی آزادی)

ان دفعات پر گفتگو سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ یہ آزادی اگرچہ بنیادی حقوق سے متعلق ہے لیکن درج ذیل معاملات میں خلل ڈالنے یا ان سے متصادم ہونے پر دستورِ ہند کی روشنی میں یہ آزادی بنیادی حق کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی:

(الف) امن عامہ (Public order)(a)

(ب) اخلاقی حدود (Morality)(b)

(ج) صحت (Health)(c)

(د) تیسرے حصہ کے دوسرے حقوق (Other provisions of this Part)(d)

اس کے علاوہ یہ بھی پیش نظر رہے کہ دستورِ ہند میں جس طرح پارلیامنٹ کو دستور یا اس کی دفعہ کی تشریح کا حق حاصل ہے، اسی طرح دستور کی تشریح کا حق ہائی کورٹ/ ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ آف انڈیا کو بھی دستور نے دیا ہے، لہٰذا دونوں دفعات کی تشریح کرتے ہوئے درج بالا عدالتوں نے یہ فیصلے کیے ہیں کہ "مذہب کے لازمی حصہ پر مشتمل تعلیمات" اور "غیر لازمی حصہ پر مشتمل تعلیمات" میں فرق کیا جائے گا، گویا "مذہبی لازمی حصہ"

بنیادی حق ہوگا جس کو کسی بھی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا، تاہم کسی بھی عدالت سے اس کو حاصل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی عدالت اسے چھین سکتی ہے۔ البتہ عدالت عالیہ (High Court) اور عدالتِ عظمیٰ (Supreme Court) دونوں اس کا جائزہ لینے کا حق رکھتی ہیں۔

Article 25 (Notes on Article 25 - Religion):
(b) Doctrines of each religion constitute its essential part, but the court is competent to examine them.

اسی طرح دفعہ ۲۶ کے بعد ہے:

As Under article 25, under article 26 also, courts have made a distinction between the essentials of religion and non essentials.

اس سلسلے میں درج ذیل چار عدالتی فیصلوں سے کورٹ کا موقف واضح ہوتا ہے:

(i). Ratilal v. State of Bombay (1954)
(ii) Sarup v. State of Punjab (1959)
(iii) Ramanuja v. State of Tamil Nadu (1972)
(iv) Acharya Avadhut v. Commissioner of Police, Calcutta (1984)

اس تفصیل کے ساتھ یہ جاننا بھی لازمی ہے کہ ہمارے دستور نے تین طرح کے حقوق تسلیم کیے ہیں:

(بنیادی حقوق) Fundamental Rights.1

(دستور حقوق) Constitutional Rights.2

(قانونی حقوق) Legal Rights.3

بنیادی حقوق کے تذکرہ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ ان حقوق کو کسی بھی عدالت میں نہ چیلنج کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی عدالت ان حقوق کو چھین سکتی ہے اور مذہب و اس سے متعلق حقوق اور پرسنل لا (مثلاً مسلم پرسنل لا) اسی حق کے تحت آتے ہیں۔ البتہ یہ واضح کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ''مذہبی لازمی حصہ'' اور ''مذہبی غیر لازمی حصہ'' کی تفریق کرنا کورٹ کے لیے آسان نہیں ہے کیونکہ مذہبی کتابوں کی تشریح کا حق سپریم کورٹ نے اس مخصوص مذہب کے ماہرین کے لیے تسلیم کیا ہے، تاہم کبھی کبھار عدالتیں چھیڑ چھاڑ کرتی رہتی ہیں جیسے کہ شاہ بانو کیس اور اس کے بعد مسلم مطلقہ ایکٹ (The Muslim Women (Protection of Rights on Divorce) Act, 1986) کے سلسلے میں کئی ہائی کورٹ کر چکے ہیں۔

مشہور ماہر قانون پی ایم بخشی (P.M.Bakshi) اپنی کتاب The Constitution of India: میں Nots on Article 25 کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ ایسا کرنا عدالتوں کے لیے بہت مشکل ہے نیز اس کے خلاف وہ ہائی کورٹ و سپریم کورٹ کے ۱۷ رفیصلوں کی لسٹ بھی گناتے ہیں:

(P.M. Bakshi, The Constitution of India, Law Publishing co. Pvt. Ltd. New Delhi, Tenth Edition 2010 Page No. 62-63)

اسلام نے عورت کو بہت سے بنیادی حقوق اور بعض بنیادی حقوق (اساسی طور پر) عطا کیے ہیں، وہ ایسے حقوق ہیں کہ جن کو کوئی بھی نہیں چھین سکتا، حتی کہ اگر وہ خود دست برداری لکھ دے تب بھی اس کا حق برقرار رہے گا۔ جیسے مہر، یہ ہر بیوی کا ایسا بنیادی و اساسی حق ہے کہ اگر یہ طے پا جائے کہ نکاح میں مہر نہیں ہوگا تب بھی مہر کا حق بیوی کے لیے برقرار رہے گا، البتہ بعد میں وہ معاف کر سکتی ہے۔ اسی طرح اگر خلع دینے کے لیے شوہر شرط لگائے کہ چھوٹا بچہ ماں کے بجائے باپ کے پاس یا اور کہیں رہے گا تو خلع تو صحیح ہے مگر شرط باطل قرار پائے گی۔ کیونکہ بچہ کا ماں کے پاس رہنا اس کا اساسی، بنیادی و پیدائشی حق ہے، کوئی بھی شخص اللہ کے دیے ہوئے اس حق کو نہیں چھین سکتا، بالکل اسی طرح یہ ماں کا اساسی، بنیادی حق ہے، جس کو کوئی معاہدہ بھی نہیں چھین سکتا۔ اس کے علاوہ ضرورت وحاجت کے تحت آنے والے سارے حقوق ہر مسلم عورت کے لیے بنیادی حقوق کی طرح ہیں جیسے

نفقہ، سکنی اور کسوۃ، یہ ہر بیوی، بیٹی کا بنیادی حق ہے۔ اگر والدہ اور غیر شادی شدہ بہن کے لیے کوئی اور قریب ترین عزیز نفقہ وغیرہ مہیا کرنے والا نہ ہوتو یہ بھی بیٹے و بھائی پر واجب ہے اور بنیادی حق کی طرح ہے۔ اس کے علاوہ طلاق کے بعد بھی یہ حق رضاعت (دودھ پلانے) اور حضانت (پرورش) کے نام سے بچہ/ بچی کی ماں کو حاصل رہے گا (جب تک کہ وہ شادی نہ کرلے) بیٹی شادی تک ماں کے پاس رہے گی اور بیٹا اکثر فقہاء کے نزدیک ۹ ریا ۱۰ رسال تک ماں کے پاس رہے گا (جب تک کہ بچہ خود غسل کرنے، کپڑے دھونے اور راستوں کو پہچان کر ان میں امتیاز حاصل کرنے کے قابل نہ ہو جائے)۔

اسلام نے ماں کی رضاعت وحضانت کا نفقہ صرف باپ پر ہی (بعد طلاق) نہیں ڈالا ہے بلکہ یہ دادیہال پر ڈال دیا ہے چنانچہ ارشاد باری ہے: وعلی الوارث مثل ذلك (البقرہ: ۲۳۳)، (اور وارث پر بھی اسی طرح نفقہ وغیرہ ہوگا)۔

اسی طرح طلاق وخلع میں بھی عدت کا نفقہ شوہر پر ہے۔ اس کے علاوہ اسلام نے مرض الموت میں طلاق دینے پر عدت کے اندر وراثت (Death Bed Transaction) عطا فرمائی ہے۔

اسلام نے عورت کو ذوی الفروض بنا کر متعین وراثت اور عصبہ بنا کر ذوی الفروض سے بچے ہوئے تمام مال کا حق دار بنایا اس کے بعد بچے ہوئے مال کا بھی ذوی الارحام کی حیثیت سے حق دار بنایا۔ پہلے دونوں حق بنیادی حقوق ہیں۔ اسی طرح متعۃ الطلاق کو اکثر حالتوں میں لازمی قرار دیا۔

اسلام نے عورت کو شوہر کے انتخاب کا حق عطا فرمایا اور منع کردینے پر نکاح کی ولایت کا حق ولی کے لیے باطل قرار دیا۔ اس کی تفصیل احادیث کی کتب نسائی، ترمذی اور ابوداؤد وغیرہ میں حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت خنساءؓ سے مروی روایات میں ہیں۔

یہ تمام حقوق جو بیان کیے گئے ہیں بنیادی حقوق ہیں، مسلم پرسنل لا کے تحت جو بھی حقوق ایک مسلم کو پرسنل لا کی حیثیت سے حاصل ہیں وہ بنیادی حقوق کی طرح ہیں (درج بالا تمام ملاحظات کے ساتھ) پرسنل لا (صرف چار پرسنل لا ہندوستان کے اندر دستور نے تسلیم کیے ہیں: ۱- ہندو پرسنل لا (بدھ، جین اور سکھ کے لیے بھی)، ۲- مسلم پرسنل لا، ۳- عیسائی پرسنل لا، ۴- پارسی پرسنل لا) کے سلسلے میں یہ وضاحت نہایت مفید ہوگی کہ دستور ہند کی بنیادی ساخت/ بنیادی ڈھانچہ (Basic Structure of the Constitution of India) کے علاوہ ''پرسنل لا کے لازمی حصے'' باقی تمام دستور (بنیادی حقوق کے سوا) سے برتر تسلیم کیے جائیں گے۔ کیونکہ اسلام کے ذریعہ عطا کردہ درج بالا بنیادی حقوق کو پرسنل لا کے تحت گارنٹی دی گئی ہے، لہٰذا یہ تمام حقوق مسلم خواتین کو بنیادی حقوق کے طور پر حاصل ہیں، یعنی اسلام اور ہندوستانی دستور مسلم خواتین کو یکساں طور پر بنیادی حقوق دے کر ان کے حقوق کا تحفظ کرتے ہیں۔ جن کو کوئی بھی حکومت یا عدالت مسلم خواتین سے چھین نہیں سکتی۔

☆☆☆

ہندوستان میں مسلم خواتین کی تعلیمی صورت حال

جناب اقبال احمد انجینئر

ہندوستان میں مسلم خواتین کی تعلیمی صورتحال کے موضوع پر بات کرنے سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ اصل 'تعلیم' کس علم کی ہے۔

علم: حواس خمسہ کے ذریعہ کائنات کو جاننے اور اپنے وجود کو سمجھنے کو علم کہتے ہیں۔ تجربات اور مشاہدات کو قلمبند کرنا بھی علم ہے۔ خالق اور مخلوق کے رشتے کو جاننا بھی علم ہے۔ اسی طرح سے ہر ایک کی قوت کو جاننا اور اسے ادا کرنا بھی علم ہے۔ عصری علوم کے نام سے جو بات کی جاتی ہے اس میں علم کو مختلف خانوں میں تقسیم کرتے ہوئے ایک نظام حیات کی تشکیل دی جاتی ہے تاکہ معاشرہ میں وسائل کا صحیح استعمال ہو اور عوام میں ضروریات کی تکمیل کے مواقع فراہم ہو سکیں اس لئے جب کسی ملک کا دستور بنتا ہے تو اس ملک کے شہریوں کے حقوق اور ذمہ داریوں کو بیان کرتے ہوئے اس کے تحفظ کے لئے مقننہ۔ عدلیہ اور عاملہ سے کام لیا جاتا ہے۔ قانون بنتا ہے اور اس پر عمل کرنے کے لئے اقتدار حرکت میں آتا ہے جسے ہم علم انسانی کہتے ہیں اور بعد از مرگ کی زندگی کو جاننے کا علم روحانی ہے جو صرف 'وحی' کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے جو خالق اور مخلوق کے رشتے کو سمجھاتا ہے۔

مقصد تعلیم:

معاشرے کی ترقی کے لئے تعلیم کی ضرورت پر سبھی کا اتفاق ہے۔ مقصد تعلیم بھی یہی ہے کہ علم انسانی ترقی پذیر ہو اور وہ مسلسل ترقی کرتا جا رہا ہے چنانچہ اسے رہنمائی کی ضرورت ہے۔ گھریلو زندگی کے لئے، خاندانی تعلقات کے لئے معاشی معاملات کے لئے، ملکی وبین الاقوامی روابط اور معاملات کے لئے ایک راہ درکار ہے جو محض ایک شخص کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک جماعت، ایک قوم کی حیثیت سے فطرت کے مقاصد کو پورا کرنے میں مدد کر سکے جو در اصل مقصد تعلیم ہے اگر اس میں محاسبہ اور مواخذہ کا خوف بھی شامل ہو تو مقصد تعلیم اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔

ہندوستانی معاشرہ:

ہندوستانی معاشرہ ہمہ زبانی اور ہمہ تہذیبی معاشرہ ہے۔ اس میں ذات پات کا تصور ابھی موجود ہے۔ یہاں کا معاشرہ مذہبی تقدس سے جانا جاتا ہے۔ تعلیم سے اس سماج کی منصفانہ تقسیم اور اقتصادیات میں بہتری ہوتی ہے۔ جہاں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی سے ممالک ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کوشش میں ہیں وہاں جب تک تعلیم کے مواقع نہ ملیں ملک کی آبادی اس دوڑ میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ کسی قوم کی پہچان اس کی آنے والی نسل کے لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیمی قابلیت سے ہی لگائی جا سکتی ہے کہ ان کا طریقہ تعلیم کیا ہے۔ ان کا نصاب کیسا ہے اور انہیں کیا سہولتیں دی جاتی ہیں۔ محکمہ تعلیم ہر زمانے میں سرمایہ خرچ کرنے والا محکمہ رہا جو زیادہ تر حکومتوں کے زیر کنٹرول رہا۔ کیونکہ اس کو ذریعہ معاش بنانے کی کوششوں سے ہمیشہ نقصان ہی ہوتا رہا۔ حکومتیں اپنا قابل لحاظ بجٹ اس کے لئے مختص کرتی رہی ہیں اور محاسبہ کے ذریعہ ان کے اخراجات کی نگرانی بھی کرتی رہی ہیں۔ اب بھی مغرب کے کئی ایسے ممالک ہیں جہاں ابتدائی تعلیم حکومت کے خرچے پر ہوتی ہے اور پروفیشنل کورسس کے لئے مواقع ہیں جن میں سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی ادارے میدان میں ہیں۔

اس اہم بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہندوستان کے دستور سازوں نے اپنے رہنماء اصولوں میں دفعہ ۴۵ کے تحت ریاستوں کو ذمہ دار گردانا تھا کہ اس دستور کے نفاذ کے دس سال میں تمام ریاستیں ۱۴ سال کی عمر کے تمام بچوں کو مفت تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچائیں گی۔ ۱۹۹۳ء میں سپریم کورٹ نے ایک انقلابی فیصلے میں کہا کہ تعلیم کا حق بنیادی حق ہے اور دستور کی دفعہ ۲۱ زندگی کے حق سے یہ ملتا ہے اور ۲۰۰۲ء میں حق تعلیم کو ایک بنیادی حق تسلیم کرتے ہوئے دستور ہند میں ۸۶ ویں ترمیم کر دی گئی اور اب دفعہ 21-A کے تحت ریاست کو کہا گیا ہے کہ (۱۴-۶) سال کے بچوں کے لئے مفت تعلیم دینے کا بندوبست وہ اپنی سہولت کے اعتبار سے کرے اور یہ بھی کہا کہ ریاست چھ سال تک کے بچوں کے لئے تمام سہولتیں بشمول تعلیم ریاستی حکومت فراہم کرے۔

لیکن دستوری ضمانتوں کے باوجود مرکزی اور ریاستی سرکاروں نے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی اور آج تک ملک میں بچوں کی تعلیم مشکل مرحلے سے گزر رہی ہے۔

مسلم خواتین کی تعلیمی صورتحال:

ملکی سطح پر تعلیمی صورتحال کو جاننے کے لئے جو سروے ہوتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ نیشنل سمپل سروے آرگنائزیشن NSSO

۲۔ نیشنل کونسل آف ایجوکیشن ریسرچ ٹریننگ NCERT

۳۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ ایڈمنسٹریشن NIEPA

۴۔ سنٹرل بورڈ آف ایجوکیشن CBSE

۵۔ نیشنل کونسل آف اپلائیڈ اکنامک ریسرچ NCER

مرکزی حکومت نے بھی مسلم صورتحال (معاشی و تعلیمی) جاننے کے لئے سچر کمیٹی بنائی تھی اور اس پر عمل آوری کے لئے جگناتھ مشرا کمیشن رپورٹ بھی حاصل کی گئی۔

مندرجہ بالا سروے اور رپورٹس کے مطابق مسلم طلباء اور طالبات کی شرح خواندگی ملکی سطح پر شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائبس سے بھی کم ہے۔ مسلمانوں کے دو اہم مسائل ہیں۔ ان کا معیار تعلیم گراہوا اور کوئی بھی معیاری اور قابل ذکر ادارہ نہیں ہے نیز معاشی اور سماجی مسائل سے الگ دو چار ہیں۔

چونکہ ہمارا موضوع مسلم خواتین ہے اس لئے انہی کے بارے میں حتی الامکان بات کی جائے گی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی کا نصف حصہ بہار، اتر پردیش اور مغربی بنگال میں بستا ہے۔ تقسیم ہند سے متاثرہ ان ریاستوں میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ہجرت سے مسائل بہت پیدا ہوئے زیادہ تر غربت کی زندگی گزارتے رہے۔ تقسیم ہند کے اثرات سے یہ علاقے فسادات سے متاثر رہے جن میں ان کی معیشت اور بھی تباہ و برباد کردی گئی۔ اس لئے ان علاقوں میں شرح خواندگی بہت کم ملتی ہے۔ ان ریاستوں میں اقلیتی تعلیمی ادارے قائم کرنے کا شعور اب پیدا ہو رہا ہے۔ ریاستی حکومتیں تعلیم اور روزگار میں تحفظات کی باتیں بھی کر رہی ہیں۔

شرح خواندگی ہندوستان کی قومی سطح پر ۶۵ فیصد ہے جبکہ مردوں کی شرح خواندگی ۳۔۷۵ فیصد اور عورتوں کی شرح خواندگی ۷۔۵۳ فیصد ہے یعنی قومی سطح پر مردوں اور عورتوں کی شرح خواندگی میں ۶۔۲۱ فیصد کا فرق ہے اور ایسا ہی فرق شہری اور دیہی شرح خواندگی میں ہے۔

مسلمانوں میں بھی مردوں اور خواتین کی شرح خواندگی میں بھی ۲۱ فیصد کا فرق ہے جب کہ دیہی شرح خواندگی مسلم خواتین کی اور بھی کم ہے۔

۱۹۶۵ سے ۲۰۰۱ء کے شرح خواندگی کا تجزیہ بتاتا ہے کہ قومی سطح پر مسلم خواتین کی شرح خواندگی میں ۱۰۰ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ یعنی ۴۰ فیصد سے ۸۲ فیصد تک پہنچ گئی ہے لیکن اب بھی عورتوں کی قومی سطح ۹۰ فیصد سے ۸ فیصد کم ہے۔ دیہی سطح پر مسلم خواتین کی شرح خواندگی ۲۰ فیصد سے ۷۰ فیصد تک یعنی ۳۵۰ فیصد بڑھی ہے لیکن قومی سطح پر عورتوں کی شرح خواندگی سے (سچر کمیٹی رپورٹ باب تعلیم) ۱۰ فیصد کم ہے۔

میٹریکولیشن میں کامیاب ہونے والی مسلم خواتین کا فیصد شہری سطح پر ۴ فیصد اور (گاؤں) دیہی سطح پر ۵۔۲ فیصد ہے۔ جو قومی سطح ۷ فیصد سے کم ہے۔ NSSO اور NCAER سروے کے مطابق صرف ۲۵ فیصد مسلمان بچے اسکول جاتے ہیں جو انتہائی تشویش کی بات ہے۔ حالیہ چند سالوں میں تعلیمی شعور کی وجہ سے شہر اور دیہات میں بچوں کو اسکول بھیجنے کے شعور میں ضرور اضافہ ہوا ہے لیکن ابھی تک اس کا سروے موجود نہیں ہے لیکن یہ مثبت رجحان ہے۔

اگر میٹریکولیشن کو بنیاد بنا کر مسلم خواتین کی تعلیمی صورتحال کا جائزہ لیا جائے تو ۲۰۰۱ء کے سروے کے مطابق گو کہ ۱۹۵۳ء میں جب کہ مسلم خواتین صرف ۲ فیصد تھیں اب ۲۸ فیصد ہیں لیکن پھر بھی اس شہری سطح پر وہ قومی سطح ۵۸ فیصد سے بہت کم ہیں یعنی ۳۰ فیصد کم ہیں اسی طرح سے دیہی صورت حال جہاں ۱۹۵۳ء میں صفر تھی اب ۱۰ فیصد ہے لیکن قومی سطح ۲۲ فیصد سے کم ہے یعنی ۱۲ فیصد کم۔

مسلم خواتین میں تحتانوی (Primary) سے لے کر ہائر سکنڈری درجے تک پہنچتے پہنچتے ڈراپ آؤٹ بہت ہے۔ ۳۵ فیصد مسلم طالبات تحتانوی درجہ تکمیل کرتی ہیں اور صرف ۱۰ فیصد میٹریکولیشن تک پہنچتی ہیں اور ہائر سکنڈری میں ان کا فیصد گر کر ۳ ہو جاتا ہے۔ جبکہ قومی سطح پر عورتوں کا فیصد ۱۳ ہے۔

گریجویٹ وٹیکنیکل گریجویٹ میں مسلم خواتین کا فیصد معلوم کرنے سے قبل ملکی سطح پر کتنی تعداد مرد اور عورتوں کی ہے اس میں مسلمان کتنے ہیں معلوم کریں۔
۲۰۰۱ء کے سروے کے مطابق اب تک ۳۸ ملین مرد اور عورتیں جو ۲۰ سال یا اس سے زیادہ عمر کی ہی گریجویشن کی ڈگری حاصل کی ہیں اور ۴ ملین ٹیکنیکل ڈپلوما کا سرٹیفکیٹ لیا ہے، جو جملہ آبادی کا ۶ فیصد ہوتا ہے۔ اس تعداد میں مسلمان صرف ۶ ملین ہیں جوان کی آبادی کا ۳.۴ فیصد ہوتا ہے۔ ٹیکنیکل کورسز میں ان کی تعداد صرف ۰.۴ فیصد ہے۔ پوسٹ گریجویٹ اور پی ایچ ڈی میں مسلم طلباء وطالبات کی تعداد ۴ فیصد ہے اور پی۔ ایچ ڈی میں ۵۔ ۴ فیصد ہے۔

مسلم خواتین سائنس، آرٹس، کامرس کے انڈر گریجویٹ کورسز میں مسلم مردوں سے زیادہ ہیں جب کہ انہی کورسز میں پوسٹ گریجویٹ درجہ میں ان کی تعداد مسلم مردوں سے کم ہے۔ میڈیکل اور انجینئرنگ انڈر گریجویٹ کورس میں مسلمان مردوں کی تعداد زیادہ ہے۔

مدرسوں میں مسلمان کا فیصد ۴ ہے۔ جس میں شہر میں مسلم خواتین ۲۔ ۲ فیصد ہیں اور دیہات میں ۸۔ ۱ فیصد ہیں۔

جنوبی ہندوستان۔ آندھرا پردیش، کرناٹک، کیرالا اور تامل ناڈو جہاں مسلم مائناریٹی اسکولس اور کالجیز کا جال پھیلا ہوا ہے وہاں شہری اور دیہاتی فیصد بہت تیزی سے بڑھا ہے اور یہاں شمال، مشرقی اور مغربی ہندوستان کے طلباء وطالبات بھی داخلہ لے رہے ہیں۔ اس طرح سے جنوبی ہندوستان ملکی سطح پر مسلم مرد اور خواتین کی تعلیمی صورت حال میں بہتری لانے میں بہت حد تک کامیاب ہے۔

شہری سطح اور دیہی سطح پر یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مسلم طالبات کی تعداد تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے اور تعلیم میں ان کی دلچسپی اجتماعات میں ان کی زیادہ تعداد میں شرکت سے بھی لگائی جا سکتی ہے۔ تعلیمی معیار بھی ان کا مسلم مردوں سے اچھا ہے کیونکہ جو پروفیشنل ٹسٹ (EAMCET) وغیرہ کے نتائج آتے ہیں ان میں اونچے مقامات پر مسلم خواتین ہی نظر آتی ہیں۔

امسال میڈیکل کالجز میں جو داخلے ہوئے ان میں زیادہ تعداد مسلم طالبات کی رہی اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو یہ بھی امکان ہے کہ میڈیکل میں صرف لڑکیاں ہی منتخب ہوں گی۔ یہ مثبت رجحان ہندوستان کی مسلم خواتین کے تعلیم کے حصول میں پایا جاتا ہے لیکن باوجود اس کے وہ قومی سطح پر فیصد میں ابھی بھی پیچھے ہیں اور معیاری اسکول نہ ہونے سے معیاری کالجز میں داخلوں سے بھی محروم ہیں۔

علم روحانی کی تعلیم بھی مسلم خواتین کے لئے ضروری ہے کیونکہ جو حالات Out Sourisn سے پیدا ہو رہے ہیں وہ انتہائی تشویشناک ہیں۔ یہ احساس جگانے کی ضرورت ہے کہ علم روحانی ہی سب کچھ طے کرتا ہے اور اسی پر دائمی زندگی کا انحصار ہے جبکہ یہ علم انسانی ضروریات زندگی کے حصول میں مددگار ہوتا ہے جو ایک اہم ضرورت بھی ہے۔

تعلیم کے حصول اور اس میں رکاوٹوں کا جائزہ ایک تو موجودہ اعداد وشمار سے مل جاتا ہے دوسرا طریقہ سماجی رجحان سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ ان دو طریقوں کے اشتراک سے نتیجہ پر پہونچنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ تعلیم ایک مسلسل عمل ہے جو تعلیمی ادارے۔ مدرسے یا مکتب چھوڑنے کے بعد بھی جاری رہنا چاہئے مگر عام مشاہدہ یہ ہے کہ روزگار کی تلاش یا روزگار سے لگ جانے کے بعد تعلیم کے حصول و دینی معلومات کے بارے میں بھی جاننے کی سعی نہیں کی جاتی اور یہ اس دور کی جہالت کا سبب بن جاتی ہے۔

تعلیمی معیار کو لے کر بھی الجھن ہے۔ پڑھنا لکھنا جاننا تعلیم ہے۔ اگر ۷ سال کا لڑکا پڑھنا لکھنا جانتا ہے تو کیا اسے تعلیم یافتہ کہا جا سکتا ہے۔ مردم شماری کا معیار تعلیم کے بارے میں یہی رائے ہے۔

معیار تعلیم کم از کم گریجویٹ ہونا چاہئے۔ میٹرک میں کامیابی درمیانی درجہ کی تعلیم، اسی طرح ۱۰ سالہ اسکولنگ بھی لازمی قرار دی جائے جس میں حاضری بھی شرط ہو۔ اسکول کا انتخاب طریقہ تعلیم اور شہری اور دیہاتی ماحول میں حصول تعلیم مدد کرتے ہیں یا پھر رکاوٹ بن جاتے ہیں۔

شرح خواندگی:

مسلمان عورتوں میں شرح خواندگی کا جائزہ لینے کے لئے سچر کمیٹی رپورٹ اور مختلف نیشنل سروے موجود ہیں جن کے اعداد وشمار کو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ (بحوالہ سچر کمیٹی باب تعلیم)۔

ہندوستان کی شرح خواندگی: قومی سطح پر ۶۵ فیصد

مرد ۳۔۷۵ فیصد

عورتیں ۷۔۵۳ فیصد

شہری خواندگی: ۹۔۷۹ فیصد

دیہی خواندگی: ۷۔۵۸ فیصد

مرد اور عورتوں کے درمیان شرح خواندگی کا فرق ۶۔۲۱ فیصد ہے۔

شہری اور دیہی کے درمیان شرح خواندگی کا فرق ۲۔۲۱ فیصد ہے۔

مسلمانوں کی شرح خواندگی قومی سطح پر ۱۔۵۹ فیصد ہے۔ جو ۲۔۶ فیصد کم ہے قومی شرح خواندگی سے۔

شہری علاقوں میں مسلمانوں کی شرح خواندگی ۶۸ فیصد

دیہی علاقوں میں مسلمانوں کی شرح خواندگی ۵۰ فیصد

آندھرا پردیش میں آبادی کے اعتبار سے مسلمانوں کی شرح خواندگی ۶۸ فیصد ہے۔

جس میں مردوں کی شرح خواندگی ۷۷ فیصد

عورتوں کی شرح خواندگی ۵۹ فیصد

یعنی عورتیں مردوں سے ۱۸ فیصد کم خواندہ ہیں۔

جبکہ دوسری ریاستوں میں مسلمان مرد اور عورت کی شرح خواندگی کا فرق ۲۱ فیصد ہے۔ گاؤں میں مسلم عورتوں کی شرح خواندگی بہت کم ہے۔

گو کہ ۲۰۰۵۔۲۰۰۴ء کے 61st Round, NSSO کے سروے کے مطابق شرح خواندگی تمام سماجی گروہ میں بڑھی ہے لیکن عورتوں اور مردوں کے فرق میں زیادہ فرق نہیں آیا۔ مسلم مرد اور عورتوں میں تو یہ فرق اور بڑھا ہے۔

۲۰۰۱ء میں نئے سروے کے مطابق ۱۹۶۵ء کی شرح خواندگی سے مقابلہ کریں تو قومی سطح پر عورتوں اور مسلم عورتوں کا فرق شہری اور دیہی بنیادوں پر یوں ہے۔

شرح خواندگی:

	1965ء	2001ء
شہری: قومی سطح پر عورتیں	80٪	90٪
قومی سطح پر مسلم عورتیں	40٪	82٪
دیہی: قومی سطح پر عورتیں	40٪	80٪
قومی سطح پر مسلم عورتیں	20٪	70٪

(بحوالہ سچر کمیٹی تعلیمی رپورٹ)

ان اعداد و شمار کو لیا جائے تو مسلم عورتوں میں سال ۱۹۶۵ء کے مقابلہ میں شرح خواندگی میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ شہری سطح پر تو وہ دگنی شرح تک پہونچ گئی ہیں اور دیہی سطح پر ان کی شرح خواندگی 3-1/2 گنا ہے یہ اچھا رجحان مسلم عورتیں میں دیکھا گیا ہے۔ چونکہ مسلم آبادی دیہی سطح پر بھی وہاں کے تجارتی اہم مقامات پر رہتی ہیں زیادہ پھیلی نہیں ہوتی اس لئے ضلع کے ہیڈ کوارٹر یا تعلقہ کا ہیڈ کوارٹر ہونے کے سبب تعلیم سے استفادہ کرنے کا رجحان ان میں بہت بڑھ گیا ہے۔ یہ ایک اچھی خبر ہے۔

میٹریکولیشن مکمل کرنے والی مسلم طالبات:

۲۰۰۱ء کی مردشماری کے مطابق وہ مسلم طالبات جنہوں نے ۷ تا ۱۶ سال کی عمروں میں اسکول کے دس سال مکمل کئے اور میٹرک کامیاب بھی کیا ہے ان کا بھی فیصد دیا گیا ہے۔ جو قومی سطح کے اعتبار سے کم ہے۔ یہ بھی بڑی تکلیف دہ بات ہے کہ مسلمان طلباء کی اوسط حاضری ان دس سالوں میں صرف ۳ سال ۴ ماہ ہوتی ہے جو ظاہر ہے کہ تعلیم کے حاصل کرنے میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ تقریباً تمام ریاستوں میں حاضری کا یہی مسئلہ ہے خاص طور پر مغربی بنگال اور اتر پردیش میں تو اور بھی کمزور حاضری ہے جبکہ کیرالا، بہار، جھارکھنڈ، کرناٹک، مہاراشٹرا، آندھرا پردیش اور گجرات میں مسلم طلباء و طالبات کی حاضری شیڈول کاسٹ وشیڈول ٹرائبس کے طلباء و طالبات سے بہتر ہے۔

شہر میں کامیاب ہونے والی مسلم طالبات کا فیصد میٹریکولیشن = 4 فیصد ہے۔

گاؤں میں کامیاب ہونے والی مسلم طالبات کا فیصد = 5.2 فیصد ہے۔

جبکہ اسکول میں شرکت کرنے والی (طالبات۔طلباء) کا فیصد 1999ء میں 40 فیصد تھا اور 2004-2005ء میں 78 فیصد ہے۔

یہ اعداد و شمار NSSO اور NCAER کے مطابق ہیں۔

گوکہ اسکول میں شرکت اور تعداد میں اضافہ ہوا ہے لیکن مسلم طالبات کے کامیابی کے فیصد میں زیادہ اضافہ نہیں ہوا اور نہ ہی ان کا اور دوسرے سماجی گروہ کے فرق میں کوئی کمی آئی ہے۔ جو رجحان اسکول میں شرکت کا اضافہ بتاتا ہے اس میں مسلم طالبات کی شرکت میں بھی اضافہ ہوا لیکن طلباء کے مقابلے میں ان طالبات کے اضافہ کا فیصد سروے میں نہیں بتایا گیا۔ اس لئے بہ حیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلم طالبات کی اسکول میں شرکت کی تعداد میں ضرور اضافہ ہوا ہے اور یہ ایک اچھا رجحان ہے۔

اس سروے میں یہ بھی بتایا گیا کہ صرف ۲۵ فیصد مسلمان بچے (طلبہ و طالبات) اسکول جاتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم میں اضافہ کے لئے ابھی بہت کوششیں کرنی باقی ہے۔

عمروں کے اعتبار سے تقسیم اور جائزہ:

تحتانوی Primary Level تعلیم = ۱۲ سال میں سے کم از کم ۵ سال اسکول کی تعلیم ہو۔

وسطانوی Middle Level تعلیم = ۱۵ سال جس میں کم از کم ۸ سال کی اسکول کی تعلیم ہو

فوقانی میٹریکولیشن تعلیم = ۱۷ سال جس میں کم از کم ۱۰ سال کی اسکول کی تعلیم ہو

انٹرمیڈیٹ ہائرسکنڈری تعلیم = ۱۹ سال جس میں کم از کم ۱۲ کی اسکول کی تعلیم ہو

قومی سطح پر مسلم طالبات کے فیصد کا جائزہ لیں تو ہر سطح پر ان کا فیصد حسب ذیل ہے۔

دوسرے قومی سطح پر فیصد مسلم طالبات کا فیصد

۱۔ تحتانوی Primary Level	=	۴۵ فیصد	۳۵ فیصد
۲۔ وسطانوی Middle Level	=	۳۰ فیصد	۱۸ فیصد
۳۔ فوقانیہ میٹریکولیشن	=	۱۸ فیصد	۱۰ فیصد
۴۔ ہائرسکنڈری	=	۱۳ فیصد	۳ فیصد

(بحوالہ سچر کمیٹی تعلیمی رپورٹ)

اس جدول سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مسلم طالبات جو تحتانوی درجہ پر ۳۵ فیصد اسکول میں شریک ہوتی ہیں وسطانوی یعنی مڈل اسکول کے درجہ تک

آنے تک ۵۰ فیصد ڈراپ آؤٹ ہوجاتی ہیں اور جب وہ میٹرک درجہ تک پہنچتی ہیں تو ان کا فیصد ۱۰ رہ جاتا ہے اور ہائر سکنڈری درجہ تک پہنچتے پہنچتے ان کا فیصد ۳ رہ جاتا ہے۔ اور ان ۳ فیصد میں سے کتنے گریجویٹ، پوسٹ گریجویٹ اور پی ایچ ڈی تک جاسکیں گے ان کا جائزہ بھی لینا پڑے گا۔

اگر میٹریکولیشن کو بنیاد بنا کر تعلیم کا جائزہ لیا جائے اور اس کا تقابل ۱۹۵۳ سے ۲۰۰۱ء تک کیا جائے تو مسلم طالبات کی شرح خواندگی میں ضرور اضافہ ہوا لیکن وہ قومی شرح خواندگی سے اب بھی بہت پیچھے ہیں۔

شرح خواندگی (میٹریکولیشن)	۱۹۵۳	۲۰۰۱	
شہر: قومی سطح پر عورت	۱۸ فیصد	۵۸ فیصد	
مسلم عورت	۲ فیصد	۲۸ فیصد	
دیہات: قومی سطح پر عورت	•	۲۲ فیصد	
مسلم عورت	•	۱۰ فیصد	(حوالہ سابق)

یہ جائزہ صاف بتاتا ہے کہ شہر میں اب بھی مسلم طالبات قومی سطح سے ۳۰ فیصد پیچھے ہیں جب کہ دیہی سطح پر ۱۲ فیصد پیچھے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ۱۹۵۸ء کو اگر بنیاد بنایا جائے تو رجحان تو مسلم طالبات میں شہری سطح پر تعلیم کی طرف رجحان ۱۴ گنا زیادہ ہے جبکہ دوسرے ساجی گروہ میں تین گنا اضافہ ہوا۔ یہ تیزی سے بدلتا ہوا رجحان ان کی سوچ وفکر میں تبدیلی کا پتہ دیتا ہے۔ اسی طرح دیہات میں جہاں کوئی رجحان ہی نہیں تھا اب تیزی سے تبدیلی آرہی ہے۔

ہائر ایجوکیشن Higher Education:

تحتانوی، وسطانوی، فوقانیہ پھر ہائر سکنڈری (انٹرمیڈیٹ) تعلیم کی تکمیل معاشی حالات اور روزگار کے مواقع کے لئے بہت ضروری ہے اگر اس کو معیار بنا کر دیکھا جائے تو مسلم طالبات وطلباء کی صورتحال قومی سطح پر اور بھی کمزور ہوجاتی ہے۔

مسلمانوں کا رجحان ایسا ہے کہ اگر ۱۰۰ بچے اسکول میں شریک ہوں تو صرف ۷۵ تحتانوی درجہ کامیاب کرتے ہیں یعنی ۲۵ طلباء وطالبات ڈراپ آؤٹ ہوجاتے ہیں۔ ان ۷۵ طلباء میں سے صرف ۵۰ فیصد یعنی آدھے مڈل اسکول کامیاب کرتے ہیں یعنی صرف ۱۷ طلباء میٹرک میں پہنچتے ہیں اور ان کی کامیابی کا فیصد طالبات میں صرف ۱۰ لگایا گیا یعنی ۴ طالبات کامیاب ہوتی ہیں اور ہائر سکنڈری پہنچتے پہنچتے اس کا نتیجہ صرف ۳ فیصد رہ جاتا ہے جو گریجویٹ درجہ کے لئے ملتے ہیں اگر اس کا مقابلہ قومی سطح سے کیا جائے تو مسلم طالبات سے ۴ گنا زیادہ طالبات قومی سطح پر ملتے ہیں جن کا معیار تعلیم اور اسکولنگ بہتر ہوتی ہے۔

گریجویٹ درجہ اور پوسٹ گریجویٹ درجہ:

مندرجہ بالا تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت کم تعداد مسلم طالبات کی گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ درجوں کو پہنچتی ہے اگر موجودہ رجحان کا تجزیہ کیا جائے تو قومی سطح پر آبادی کا ۷ فیصد ۲۰ سال یا ان سے زیادہ طلباء کا گریجویٹ درجہ تک جاتا ہے جبکہ مسلم آبادی کا صرف ۴ فیصد ۲۰ سال یا اس سے زیادہ طلباء گریجویٹ درجہ تک پہنچتا ہے۔ اور پوسٹ میٹرک ٹیکنیکل کورسز کے لئے مسلم طلباء کا ایک فیصد سے کم طبقہ ملتا ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے۔

۲۰۰۱ء کے سروے کے مطابق اب تک ۳۸ ملین مرد اور عورتوں نے جو ۲۰ سال یا اس سے زیادہ ہی گریجویشن کی ڈگری حاصل کی ہے اور صرف ۴ ملین نے ٹیکنیکل ڈپلوما یا سرٹیفکیٹ لیا ہے جو جملہ آبادی کا ۶ فیصد ہوتا ہے۔ جبکہ مسلمانوں میں صرف ۴ ملین گریجویٹ ہیں جو ان کی آبادی کا صرف ۴۔۳ فیصد ہیں اور ٹیکنیکل کورسز مکمل کرنے والوں کی تعداد صرف ۴۔۰ فیصد ہے۔

ٹیکنیکل گریجویٹ جہاں قومی سطح پر ہزار میں ۲ گریجویٹ ہوتے ہیں وہاں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے یہ فیصد ۲۰۰۵-۲۰۰۴ NSSO کے سروے میں بڑھا ہے قومی سطح پر اب ہر ہزار میں ۸ گریجویٹ ہوتے ہیں۔

☆ ٹیکنیکل گریجویٹ شہری سطح پر مسلمان مرد ہر ہزار میں ۲ (2.0٪) ہیں جبکہ مسلم عورتوں میں ہر دس ہزار میں (05.0٪) 5 ہیں۔

☆ ڈپلوما ہولڈرس شہری سطح پر مرد ۲ فیصد اور مسلم عورتیں ا فیصد ہیں۔

پوسٹ گریجویٹ اور پی ایچ ڈی:

جہاں انڈر گریجویٹ کورسز میں مسلمان طلباء کا حصہ ۷۔ا فیصد ہے جس میں طالبات کا حصہ بھی شامل ہے اعداد وشمار کے اعتبار سے طالبات کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مگر صحیح فیصد ابھی تک معلوم نہ ہوسکا۔ پوسٹ گریجویٹ کورس میں مسلم طلباء کی تعداد ۴ فیصد ہے۔ اسی طرح پی ایچ ڈی میں مسلم طلباء کی تعداد (جس میں طالبات کے فیصد میں اچھا اضافہ ہوا ہے) ۵۔ ۴ فیصد ہے جو دوسرے سماجی گروہ سے بہتر ہے۔ یہ ایک ایسا رجحان ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان طلباء وطالبات تعلیم کے اونچے مقام پر پہنچنے کے لئے بہت بے تاب ہیں۔

دوسرے کالجوں میں جیسے سائنس، کامرس، میڈیکل کالجیز ہیں۔

گریجویٹ سطح پر عمومی طور پر ہر ۲۵ طالب علم میں سے ایک ہی مسلمان ہوتا ہے۔ یعنی ۴ فیصد

پوسٹ گریجویٹ سطح پر عمومی طور پر ہر ۵۰ طالب علموں میں ایک مسلمان ہوتا ہے۔ یعنی ۲ فیصد۔ سائنس میں بہت کم ہیں۔ اگر تفصیل سے جائزہ لیا جائے تو:

پوسٹ گریجویٹ سطح پر = آرٹس میں ۴ فیصد، کامرس ۸ فیصد، سائنس ۶ فیصد، انجینئرنگ ۴ فیصد

مسلمان طلباء کا فیصد = میڈیسن ۵ فیصد، پروفیسر ۷ فیصد

اس جدول کو مسلمان طلباء اور طالبات میں تقسیم کریں تو عجیب نتائج سامنے آتے ہیں۔

	انڈر گریجویٹ، پوسٹ گریجویٹ مسلم مرد فیصد		انڈر گریجویٹ، پوسٹ گریجویٹ مسلم عورتیں فیصد	
سائنس	۲.۸	۳.۸	۳.۳	۱.۰
آرٹس	۳.۸	۱.۵	۴	۱.۸
کامرس	۳.۳	۲.۴	۳.۷	۰.۵
میڈیکل کالج	۵.۹	۳.۵	۴.۰	۱.۰
پی جی ڈپلوما	۰.۵	–	۲.۵	–
دوسرے انڈر گریجویٹ کورسز	۱.۰	–	۰.۸	–
دوسرے پی جی کورسز	–	۱.۸	۲.۰	–

(بحوالہ سچر کمیٹی رپورٹ باب تعلیم)

مسلم طلباء وطالبات کی تقسیم پر جو حیرت انگیز تبدیلی نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ سائنس، آرٹس، اور کامرس میں مسلم طالبات کا فیصد مسلم طلباء سے زیادہ ہے انڈر گریجویٹس سطح پر جب کہ پوسٹ گریجویٹ سطح پر مسلم طالبات کا فیصد مسلم طلباء سے بہت کم ہے۔

اسی طرح میڈیکل کالجز انڈر گریجویٹ میں مسلم طلباء کی تعداد ۳۳ فیصد مسلم طالبات سے زیادہ ہے جبکہ پوسٹ گریجویٹ سطح پر ۲۰ فیصد تعداد طالبات کی ہے اور ۸۰ فیصد مسلم طلباء کی۔

دوسرے پی جی کورسز میں صرف مسلم طالبات ہی نظر آئیں گے۔ مسلم طلباء کو اس میں دلچسپی نہیں ہے۔

ہندوستان کی یونیورسٹیز:

ہندوستان میں جملہ ۳۰۰ یونیورسٹیز ہیں سماجی گروہ اور جنس کی بنیاد پر تقسیم کے جو اعداد وشمار آتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں (انڈر گریجویٹ سطح پر اور پوسٹ گریجویٹ سطح پر) ان ۳۰۰ یونیورسٹیز میں ۱۲۹ یونیورسٹیز اور ۸۴ کالجز کے اعداد وشمار کے مطابق سماجی مذہبی طلباء اور طالبات کی تقسیم کی گئی۔ ۳۔۱ ملین گریجویٹ (Bachlor degree) اور (5.1) ملین پوسٹ گریجویٹ (Master Degree) کے مطابق یہ تقسیم ہے جبکہ ان یونیورسٹیز اور کالجز میں جملہ 7.11 ملین گریجویٹ اسٹوڈنٹ ہیں اور 3.4 ملین پوسٹ گریجویٹ طلباء ہیں۔ جو اعداد وشمار میں وہ ہی جملہ 8.2 ملین کے جو جملہ تعداد کا 19 فیصد ہوتے ہیں۔ جو مندرجہ بالا بیان کر دیا گیا (۱) ہیں۔

معاشی حیثیت سے مسلم طلباء کی تقسیم:

(امیر وغریب) غربت کے معیار کو جو سالانہ ۲ لاکھ روپیہ یافت سے کم ہے اس کے مطابق تعلیم، غربت کے اس معیار کے طلباء کی تعداد امیر طلباء کی تعداد سے ۲ فیصد کم ہے۔ روزگار۔ لیکن روزگار کے مسئلہ پر غربت کے معیار کے طلباء روزگار سے لگے ہیں ان کا فیصد ۶۔ ۲۵ ہے۔ جب کہ امیر طلباء جو روزگار سے لگے ہیں ان کا فیصد صرف ۷۔۱۶ فیصد ہے۔

مسلم طلباء وطالبات کی تقسیم اسکول (خانگی وسرکاری) اور مدارس اور مکتبہ میں:

عمومی طور پر جو تقسیم کی گئی ہے طلباء وطالبات کے انتخاب کے پیش نظر وہ حسب ذیل ہے۔

مدارس اور مکتب میں = ۴ فیصد

سرکاری اسکولوں میں = ۶۶ فیصد

خانگی اسکولوں میں = ۳۳ فیصد

جبکہ غیر مسلم طلبا وطالبات کی تقسیم = سرکاری اسکولوں = ۱۷ فیصد اور خانگی اسکولوں 19 فیصد ہے۔

مدرسہ جانے والے طلباء کی تقسیم ہندوستان کے معاشرے میں:

NCAER سروے کے مطابق:

۱۔ سارے ہندوستان میں مجموعی طور پر ۳۔ ۴ فیصد جس کا اندازہ حسب ذیل تفصیل سے لگایا جاسکتا ہے۔

مشرقی ہندوستان = ۲۔ ۳ فیصد: شمالی ہندوستان = ۵۔ ۶ فیصد: جنوبی ہندوستان = ۱ فیصد، مغربی ہندوستان = ۳ فیصد۔

۲۔ NCERT سروے کے مطابق

جملہ ہندوستان مجموعی طور پر = ۸۔ ۲ فیصد جس کو مزید تفصیل سے حسب ذیل تقسیم کیا گیا ہے۔

مشرقی ہندوستان = ۴ فیصد، شمالی ہندوستان ۰۔ ۳ فیصد، جنوبی ہندوستان ۸۔ ۰ فیصد، مغربی ہندوستان = ۱ فیصد

۳۔ اگر مسلم مرد اور عورت کو شہر اور دیہات کے اعتبار سے تقسیم کریں تو فیصد یوں ہوتا ہے (۷ تا ۱۹) سال کے طلباء۔

شہری مسلم مرد ۴ فیصد شہر میں مسلمان عورت ۲۲ فیصد

دیہات میں مسلم مرد ۸۔ ۳ فیصد دیہات میں مسلم عورت ۸۔ ۱ فیصد

مادری زبان میں تعلیم دینے کی ضرورت:

بین الاقوامی سطح پر یہ مان لیا گیا ہے کہ بچوں کو جب تک مادری زبان میں تعلیم نہ دی جائے اس وقت تک ان کی تعلیمی قابلیت اور مہارت میں امید افزاء کامیابی نہیں ملتی۔ اس لئے چونکہ مسلمانوں کی مادری زبان (اکثریت) اردو ہے لیکن اردو زبان میں تعلیم دینے کی سہولتیں میسر نہیں ہیں۔ ہندی بیلٹ

میں ہندی اور اردو کے امتزاج سے اردو زبان کو یکسر نظر انداز ہی کر دیا گیا ہے۔ مغربی بنگال میں بنگلہ زبان کی وجہ سے مسلمان اردو کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہیں۔ بہار میں بھی ہندی کا راج ہے لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ فیصد اردو زبان بولنے والوں کا ہے۔ ایک حیرت انگیز انکشاف یہ ہوا ہے کہ کنڑی اور مرہٹی بولنے والے علاقوں میں اردو بولنے والوں یعنی مسلمانوں کا فیصد زیادہ ہے۔ چوتھے نمبر پر آندھرا پردیش ہے۔

اردو میڈیم میں بچوں کو شریک کرانے کا فیصلہ ریاستوں کے اعتبار سے حسب ذیل ہے۔

اتر پردیش = ۲ فیصد، بہار = ۲۵ فیصد، جھارکھنڈ = ۱۸ فیصد، کرناٹک = ۴۰ فیصد

مہاراشٹرا = ۵۵ فیصد، آندھرا پردیش = ۲۰ فیصد

CBSE امتحان کامیاب کرنے کا فیصد

اردو زبان اور غیر اردو زبان میں مسلمان مرد اور عورتوں کا فیصد:

غیر اردو زبان میں			X دسویں		XII بارہویں
	مرد		72%		71.8%
	عورت		71.8%		80%
اردو زبان میں					
	مرد		30%		55%
	عورت		25%		80%

اردو زبان کی ترقی کے لئے اردو میں نصاب کا ملنا اور تعلیم کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ بہت ضروری ہے چونکہ ایسا نہیں ہو پاتا اس لئے اردو زبان سے فارغ طلبا و طالبات مسابقتی امتحانات میں اچھے نمبرات سے کامیاب نہیں ہوتے۔ چونکہ مہاراشٹر اور کرناٹک میں اس کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس لئے وہاں کے نتائج اچھے آتے ہیں اور غیر اردو داں اسکول سے وہ زیادہ نشانات سے کامیاب ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے قیام سے بھی اردو کی ترقی میں مدد مل رہی ہے لیکن ترجمے کی ابتدائی ضرورت سے وہ بھی گزر رہی ہے لیکن امید ہے کہ بہت جلد اس میں بہتری آ سکتی ہے۔ بشرطیکہ خاطر خواہ توجہ دی جائے۔

ٹیچرس کا ملنا دشوار:

اور ایک مشکل اردو میڈیم کی یہ ہے کہ اردو ٹیچرس دستیاب نہیں ہیں دوسرے مائناریٹی گروپ میں ٹیچرس مل جائیں گے لیکن اردو زبان میں ان کی عدم دستیابی سے پرائمری، مڈل، فوقانیہ اور ہائر سکنڈری اسکول میں تعلیم کا معیار گر رہا ہے اور اس پر توجہ کی ضرورت ہے۔

نتیجہ:

انسانی علم جو ضروریات زندگی کے لئے جاننا ضروری ہے جو تجربات اور مشاہدات سے ہو کر گزرتا ہے اور ہر لمحے بدلتا ہے اور تبدیل ہونے والے اسی علم میں اضافہ کے لئے مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ۲۰۰۵ سے ۲۰۱۰ تک کے اعداد و شمار نہیں ملے لیکن جو کچھ اخباروں کے ذریعہ اور مباحثوں اور میڈیا کے دوسرے ذرائع سے معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ مسلم عورتوں میں تعلیم کے حصول کی رغبت میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ اگر دیہات کو بنیاد بنالیں تو دیہاتی عورتوں میں تعلیم کا شعور بڑھا ہے۔ شمالی، مشرقی، مغربی، ہندوستان میں مسلم اسکول اور کالجز ٹیکنیکل اور نان ٹیکنیکل کھل رہے ہیں اور اقلیتی اداروں سے ان کی تعلیمی شرح خواندگی میں اضافہ ہوا ہے۔

جنوبی ہندوستان، آندھرا، کرناٹک، کیرالا، تامل ناڈو، میں مسلم مائناریٹی کالجز اور اسکولس کا ایک جال پھیل گیا ہے اور اس میں شمال مشرقی اور مغربی

ہندوستان کے مسلم طلباء وطالبات داخلہ لے رہے ہیں شہری سطح پر یہ بات بھی خوب محسوس کی گئی ہے کہ مردوں سے زیادہ عورتوں میں تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ہے۔اور جو نتائج سامنے آرہے ہیں اکثر اوقات میں لڑکیوں کا فیصد لڑکوں سے زیادہ ہے۔

امسال میڈیکل کالجوں کے داخلوں کو دیکھا جائے تو آندھرا پردیش میں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے زیادہ ہے دوسرے گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کورسز میں پایا جاتا ہے۔لڑکیوں کی تعلیم میں دلچسپی اور ترقی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ شادی بیاہ کے سلسلے میں جو اجتماعات ہورہے ہیں وہ لڑکیاں زیادہ تعلیم یافتہ مل رہی ہیں جب کہ لڑکوں کی تعلیم ان سے کم ہے ان سے جوڑ بننے میں دشواری پیدا ہورہی ہے اور اس کے نتائج سے بھی تشویش لاحق ہے۔

یہ بھی دیکھا گیا کہ اکثر مسلم مسائل پر جب کوئی مناظرہ یا کلاس رکھے جاتے ہیں ان میں زیادہ تعداد لڑکیوں کی شریک ہوتی ہے اور لڑکوں کی عدم دلچسپی سے ان کی تعلیمی نقص کا الگ احساس ہوتا ہے۔علم انسانی کی اہمیت اور اس کے حصول کے ذرائع اور رکاوٹوں کا ایک جائزہ لیا گیا اور ہندوستان میں مسلم عورتوں کی تعلیمی صورتحال پر روشنی ڈالی گئی۔

علم روحانی:

ہندوستان میں مسلمان عورتوں کی تعلیمی صورتحال کے جائزہ میں دوسرا سب سے اہم موضوع روحانی علم ہے جو حواس خمسہ کے اختیار میں نہیں ہے جو اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے راستہ تیار کرتا ہے اور مواخذہ کے خوف سے اس کی خواہشات پر پابندی لگاتے ہوئے اس کی فضا بناتا ہے علم انسانی کا مقصد بھی انسانی حقوق کا تحفظ اور عدل وانصاف کا قائم کرنا ہی ہوتا ہے لیکن یہی کافی نہیں ہوتا کہ سماج ومعاشرے کو سدھارے اور انسانوں کے درمیان محبت اور اخوت کو پروان چڑھائے۔اگر یہ علم روحانی کو نظر انداز کردیا جائے تو علم انسانی کے نتائج مثبت نہیں نکل سکتے۔ہر ترقی یافتہ قوم ترقی پذیر قوم کا استحصال کرے گی اور اپنے مفادات کے لئے دوسروں کو تہ تیغ بھی کرے گی۔

علم روحانی، کے لئے سب سے پہلے وحی پر ایمان لانا ضروری ہے اور مسلمان عورتوں کے لئے یہ سب سے آسان ہے۔جس کتاب کو نازل کیا گیا اس کے بغیر وہ صحیح راستہ چن نہیں سکتی۔یہ حق ہے کہ انسانوں کو وہ علم حاصل ہی نہیں جس سے وہ خدا کی رہنمائی کے بغیر خود اپنے لئے صحیح راہ حیات متعین کرسکے انسان کو وہ ذرائع اور قوتیں دی گئی ہیں جن سے وہ علم حاصل کرتا ہے۔اور پھر نتائج بھی اخذ کرسکتا ہے لیکن قرآن کے نزدیک حقیقی علم وہ ہے جو نبیوں کے ذریعہ دیا گیا جو اس دنیا کو ایک آزمائش کی مہلت اور آخرت کو دائمی زندگی بتاتا ہے۔

حقیقی علم:

جو کچھ ہے اللہ ہی کا عطا کردہ ہے ان پر تصرف کرنے کے جو کچھ اختیارات بھی انسان کو بخشے گئے ہیں انہیں اللہ کی مرضی کے مطابق استعمال کیا جانا چاہئے اور اختیارات صحیح وغلط استعمال پر انہیں مالک حقیقی کے حضور جواب دہی کرنا ہے۔

علم سے مراد فلسفہ۔سائنس، تاریخ وریاضی وغیرہ کے درسی علوم نہیں ہیں بلکہ صفات الٰہی کا علم ہے۔اسی سے خواندگی اور ناخواندگی کی تقسیم ہوتی ہے۔ جو شخص خدا سے بے خوف ہے وہ علامہ دہر بھی ہو تو اس علم کے لحاظ سے وہ جاہل محض ہے اور جو شخص خدا کی صفات کو جانتا ہے اور اس کی خشیت اپنے دل میں رکھتا ہو وہ علم انسان میں ان پڑھ بھی ہو تو ذی علم ہے۔

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء۔(۲-۳۵-فاطر)

”حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اللہ سے ڈرتے ہیں“۔

یہاں خدا ترسی میں شرط ہے۔قرآن، حدیث، فقہ اور کلام کا علم رکھنے کے باوجود اگر خدا ترسی پیدا نہ ہو تو وہ اس زمرہ میں نہیں آسکتے (مولانا مودودی، تفہیم القرآن)۔

انہ ھو السمیع العلیم: سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے اور ظاہر ہے کہ سب کچھ جاننے والا ہے علم دے سکتا ہے اور کوئی دوسرا یہ حق ادا ہی نہیں کرسکتا۔انسانی سمجھ، خواہش کی تکمیل کے لئے عقل، سائنس، تاریخ، اور تجربات کی تابع ہوتی ہے۔اور ہر زمانے کے لئے اس کے مشاہدات بدلتے رہتے

ہیں اور تبدیل ہونے والا علم بھلا انسانوں کی رہنمائی کیسے کر سکے گا۔

اسلام میں تعلیم کا سب سے اہم مقصد خالق کو پہچاننا اور عقیدہ توحید کے تحت ذات، صفات، اختیارات اور احکامات میں سے کسی کو شامل نہ کرنا۔

علم روحانی صرف اسلام تک ہی نہیں ہے بلکہ یہودیت، عیسائیت کے علاوہ دیگر دوسرے مذاہب جو روح پر یقین رکھتے ہیں۔ ان سب کا عقیدہ بھی ہے۔ ہندو دھرم میں وید (علم روحانی) بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بدھ مت، جین مت اور زرتشت مذاہب کی گہرائی میں جائیں تو یہی ملے گا۔ ہندوستان چونکہ ہمہ مذہبی معاشرہ ہے یہاں انسانی علم کے علاوہ روحانی علم کی تعلیم بھی انسانی مساوات و مفادات کے تحفظ کے لئے ضروری ہے۔

مسلم عورتوں کی موجودہ تعلیمی صورتحال میں اگر چہ کہ بہتری آئی ہے لیکن صرف انسانی علوم کے حصول اور اس پر اعتماد ان کے اخلاقی اور روحانی وجود کے کئی مسائل کھڑا کر دیتے ہیں۔ اسی عقیدے سے ناواقفیت دنیا کی زینت بنانے کے لئے کوشاں ہے۔ (جہاں علم انسانی میں ترقی ہو رہی ہے اگر وہاں علم روحانی کا بھی خیال رکھا جائے تو حقیقی معنوں میں مسلمان عورتوں کی تعلیمی صورتحال تبدیل ہوگی اور وہ دوسری اقوام اور سماجی گروہ کے لئے مثال بن سکتے ہیں)۔

تجاویز:

معاشی صورتحال:

جب تک معیشت میں سدھار نہ ہو اس وقت تک یہ اندازہ کرنا کہ مسلمانوں میں عمومی طور پر اور مسلم عورتوں میں خصوصی طور پر تعلیم عام ہوگی۔ تقسیم ہند کے اثرات کا شمالی ہندوستان میں جہاں غربت ایک مسئلہ رہی ہے اور دوسرے فسادات کا ایک سلسلہ جو چند سالوں سے تھا ہے وہ بھی اس معاشی کمزوری کا ذمہ دار تھا۔ روزگار کے مواقع گو کہ تعلیم سے جڑے ہیں لیکن اگر چہ ہر ریاست میں زکوۃ کا مرکز میں فنڈ جمع ہو اور اسے اچھی طرح تقسیم کرنے کی کوشش ہو تو اس صورتحال سے نمٹا جاسکتا ہے۔ اوقاف کی جائیدادوں پر بھی توجہ دی جاسکتی ہے۔ تاکہ اس سے معاشی حالت میں اضافہ ہو۔

سیاسی استحصال:

ایک عرصہ سے مسلمان ہندوستان میں استحصال کے شکار ہیں۔ بجٹ میں ان کا حصہ بہت کم ہوتا ہے۔ اقتدار کے ہر سطح پر ان کے ساتھ امتیازی سلوک جاری ہے۔ کوئی ایسا لائحہ عمل جو اس سیاسی استحصال سے بچنے کے لئے بنانے کی سخت ضرورت ہے۔ معاشی و تعلیمی تحفظات کی بات تو مرکزی اور ریاستی حکومتیں کر رہی ہیں لیکن وہ زیادہ دلچسپی نہیں بتاتیں۔ محض انتخابی نعروں میں استعمال کرتی ہیں۔ اس کے لئے بھی ضلعی سطح سے ریاستی سطح تک ایک مضبوط پلیٹ فارم چاہئے اور پھر اسے ہر ریاست سے مرکزی پلیٹ فارم کو وجود بخشا جائے جہاں ایک آواز میں بات کرنے کی گنجائش ہو۔

مسلمانوں میں بے حسی:

عام طور پر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ترجیحات میں تعلیم کا درجہ سب سے آخر میں آتا ہے۔ کمزور معیشت کے باوجود رسم ورواج میں قرض لے کر بھی خواہش پوری کی جاتی ہے۔ شادی و بیاہ میں غیر معمولی خرچ عادت بن گئی ہے جبکہ اس گھر میں بچوں کی تعلیم کے لئے خرچ کرنے کی خواہش کم ہے۔ یہ بے حسی و لاپرواہی اپنی نسل کے ساتھ ظلم ہے۔ اس کو دور کرنے کے لئے بھی ہر سطح پر کوشش ہونی چاہئے۔ مسجدیں اس کا بہتر جواب ہو سکتی ہیں۔

بے راہ روی:

تعلیم یافتہ لڑکے اور لڑکیوں میں مغرب زدہ بے راہ روی کو روکنے کی بہت ضرورت ہے۔ Outsoursing کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے قابل تشویش ہے۔ مسلم طالبات کے لئے جو اہم شعبہ جات ہوتے ہیں ان میں روزگار کے مواقع پر مستقل نمائندگی کی ضرورت ہے۔ اور وہ حقیقی مقصد متعین کریں کہ مسلمانوں میں دین کی سمجھ پیدا ہو اور ان کو اس حد تک ہوشیار اور خبردار کر دیا جائے کہ وہ غیر مسلم رویہ والی زندگی سے بچنے لگیں۔

اور کچھ ضروری نہ تھا کہ اہل ایمان سارے کے سارے نکل کھڑے ہوتے۔ مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ غیر (اسلامی) مسلمانہ روش سے پرہیز کرتے۔ (۹/۱۲۲ توبہ)

☆☆☆

ہندوستان میں مسلم خواتین کی اقتصادی حالت

ڈاکٹر اوصاف احمد

ایک عورت ہونا اور وہ بھی ایک ہندوستانی مسلمان عورت ہونا، محرومی اور امتیاز کا دوہرا بوجھ اٹھانا ہے، اول تو عورت ہونے کی حیثیت سے وہ سماج کے ایسے زمرے سے تعلق رکھتی ہے، جو بہت کم مراعات یافتہ ہے، بہت سے اعلانیہ اور غیر اعلانیہ امتیازات کا شکار ہے، ایک ایسے اقلیتی فرقہ سے تعلق رکھنا جس نے محرومیوں ناانصافیوں اور استحصال کے ماحول کو قبول کرلیا ہے گویا زخموں پر نمک چھڑکنے والی بات ہے، ہندوستان میں مسلم عورتوں کی سماجی اور اقتصادی حالت بہت خستہ ہے، ایک طرف اسے سماجی اور تعلیمی پسماندگی کے سبب محرومیوں اور ناانصافیوں کا شکار ہونا پڑتا ہے تو دوسری طرف مفاد پرست طبقہ سیاسی مقاصد کے لئے اس کا استحصال کرتا ہے، مثال کے طور پر سماج میں متعدد روایتی بیانات رائج ہیں، مسلمان عورتیں برقعہ پوش ہوتی ہیں اور بچہ پیدا کرنے کی مشین ہیں، وہ جاہل اور غیر تعلیم یافتہ انسانوں کا ایسا غول ہیں جو کسی مہذب سماج میں رہنے کے لائق نہیں، اس قسم کی باتیں ہمارے ملک میں مسلم خواتین کے بارے میں عام طور پر سنی جاتی ہیں، دراصل ہمارے یہاں نام نہاد مسلم سیکولر نوازوں اور غیر مسلم ترقی پسندوں اور سیکولرزم کے علم برداروں کا یہ فیشن بن گیا ہے، کہ مسلم عورتوں سے اظہار ہمدردی کیا جائے اور انہیں جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی وکالت کی جائے، بہرکیف اس قسم کی باتوں سے صرف نظر کر کے ہمیں حقائق پر توجہ مرکوز کرنی چاہئے۔

مسلم خواتین سے متعلق اعداد و شمار کی عدم دستیابی

سب جانتے ہیں کہ کہنا آسان ہوتا ہے اور کرنا مشکل، ہندوستان میں مسلم خواتین سے متعلق حقائق کو پرکھنا آسان نہیں ہے، اول تو اس بارے میں مختلف خیالات ہیں کہ حقائق کیا ہیں، ہمارے پاس ہندوستان کی مسلم خواتین کے بارے میں مکمل سائنٹفک، مستند اور قابل اعتماد اعداد و شمار قطعی موجود نہیں ہیں، حکومت ہند کی جانب سے قوم کے مختلف زمروں کی بابت سماجی واقتصادی بنیاد پر اعداد و شمار بڑے پیمانہ پر مرتب کئے جاتے ہیں، ہندوستان کا مردم شماری کمیشن اور نیشنل سمپل سروے یہ اعداد و شمار فراہم کرنے کا سب سے اہم وسیلہ ہیں، جہاں تک راقم الحروف کی معلومات کا تعلق ہے آج تک ان میں سے کسی ادارہ نے مسلم خواتین کے بارے میں خصوصی اعداد و شمار مرتب نہیں کئے ہیں، یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ حکومت ہند، سماجی اور مذہبی طبقوں کی بنیاد پر اس نوعیت کے سماجی واقتصادی اعداد و شمار جمع کرنے اور درجہ بندی کرنے کے حق میں نہیں ہے، سچر کمیٹی کو جہاں دیگر متعدد امور میں سبقت کا شرف حاصل ہے وہیں ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس نے پہلی بار سروے کے طور پر ان رپورٹوں کا تجزیہ کیا جو اہم سماجی اور مذہبی تنظیموں نے مرتب کئے تھے، لہذا زیر نظر مقالہ میں جہاں کہیں تحلیلی تجزیہ ہے اور جہاں کہیں اس نوعیت کی رائے زنی کی گئی ہے اس کی بنیاد سچر کمیٹی کی فراہم کردہ معلومات پر ہے۔

تاریخی بنیادیں

ملک میں مسلمان خواتین کی سماجی واقتصادی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ یہ صورت حال بعض مخصوص تاریخی حالت کا نتیجہ ہے۔ ہندوستان میں عورتوں کی جو حالت ہے وہ ماضی کا ورثہ ہے، اور مسلمان خواتین کی حالت کو بھی اس حقیقت سے علاحدہ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا، ہندوستانی مسلمان ایک جاگیردارانہ ماضی کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں، انیسویں صدی کے آخر میں جب سرسید احمد خان نے اپنا تعلیمی مشن شروع کیا تو ان کی رسائی محض مسلمانوں کے اعلی اور مراعات یافتہ طبقہ تک محدود تھی، ان کی تحریک ہندوستان کے لاکھوں مسلمان دستکاروں، کاشتکاروں، کاریگروں اور مزدوروں تک نہیں پہنچ سکی،

یہ خیال درست نہیں ہے کہ سرسید عورتوں کی تعلیم کے مخالف تھے، انہوں نے ایک حکمت عملی کے طور پر لڑکیوں کی تعلیم پر لڑکوں کی تعلیم کو ترجیح دی، وہ سمجھتے تھے کہ اگر مرد تعلیم یافتہ ہو گئے تو مسلم عورتیں بھی زیادہ عرصہ تک تعلیم کے میدان میں پیچھے نہیں رہیں گی، لہذا ان کے نزدیک لڑکیوں کے

مقابلہ میں لڑکوں کی تعلیم کو ترجیح حاصل تھی۔

اگر چہ سرسید کی تعلیمی تحریک ہندوستانی مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ (امیر طبقہ) پر مرکوز تھی، ایم اے او کالج اور دیگر مسلم تعلیمی اداروں کی جدوجہد سے ہندوستانی مسلمانوں کا وہ درمیانی طبقہ وجود میں آیا جو تعلیم اور ہنرمندی سے آراستہ تھا، لیکن ذو شدید صدمات نے اس طبقہ کو برباد کر دیا، اول ملک کی تقسیم اور دیگر بعض ریاست میں زمین داری کا خاتمہ، ملک کے لاکھوں ہنرمند اور تعلیم یافتہ مسلمان ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے اس سے بھی اس طبقہ کی کمر ٹوٹ گئی۔

اتر پردیش میں خاتمہ زمین داری اور تقسیم ملک کے نتیجہ میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات نے مسلمانوں کو شدید جانی و مالی نقصان پہنچایا اور اقتصادی طور پر وہ برباد ہو کر رہ گئے، ان کی جڑیں اکھڑ کر رہ گئیں، اب جو کچھ بچا وہ سیاسی اعتبار سے کمزور، سماجی لحاظ سے پسماندہ، تعلیم کے میدان میں جاہل اور اقتصادی طور پر بے وزن تھے، مسلم خواتین چونکہ سماج کا کمزور حصہ تھیں لہٰذا وہ ہر لحاظ سے نقصان میں رہیں ان پر دوہری مار پڑی، ان مسلمان خواتین کی بحالی و بازآبادکاری کے لئے ایک طور پر سماجی انقلاب کی ضرورت ہے، ملک میں اقتصادی ترقی اور دیگر عوامل کے تحت تبدیلی رونما ہو رہی ہے تاہم اس کی رفتار کافی سست ہے، ذیل میں کچھ تبدیلیوں کی نشاندہی کی جائے گی:

عمرانیاتی رجحانات

عام خیال کے برخلاف مسلمانوں میں آبادی کا انداز بھی ہندوستان کی عام آبادی کے مطابق ہی ہے، یہاں سچر کمیٹی کی رپورٹ کی بنیاد پر آبادی سے متعلق بعض اہم معلومات جو مسلمان خواتین کے بارے میں ہیں، پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ ہندوستان کی مسلم خواتین کی عمر اور صنفی تشکیل کا رجحان وہی ہے جو ملک کی عام آبادی کا ہے (دیکھئے: گوشوارہ ۳۔ ۴، ص۔ ۳۳)۔

۲۔ مسلمان مردوں اور عورتوں کی عمر کا ڈھانچہ کسی اہم فرق کو ظاہر نہیں کرتا، عموماً مسلم خواتین کی عمر کا تناسب بھی مسلم مردوں کی طرح ہی ہے۔
(گوشوارہ ۲، ۳، ص: ۳)

۳۔ ایک متعلقہ گوشوارہ بچوں کا صنفی تناسب (لڑکیوں کا تناسب ایک ہزار میں ۵ سال کی بچیاں لڑکوں کے اسی عمر کے تناسب میں) مسلمانوں کی آبادی میں بچوں کا تناسب نسبتاً زیادہ ہے، لیکن علاقائی فرق اس گوشوارہ میں بھی محسوس کیا جاتا ہے۔

۴۔ ایک دوسرا متعلقہ رجحان مجموعی شرح بارآوری (ٹی ایف آر) کا ہے جس کا اندازہ ان اعداد سے کیا جاتا ہے جو ایک عورت اپنے پیداواری عرصہ میں ان بچوں کی بارآوری کرتی ہے، بعض حلقوں کی طرف سے الزام لگایا جاتا ہے کہ مسلمان عورتوں میں شرح بارآوری غیر مسلم عورتوں سے زیادہ ہے، یہ سچ ہے کہ مسلمان عورتوں میں شرح پیدائش ہندو، سکھ اور عیسائی عورتوں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہے، لیکن یہاں یہ بھی ذکر کرنا مناسب ہے کہ یہ گوشوارہ صرف عمر سے متعلق ہے، بلکہ زیادہ آمدنی اور تعلیم سے وابستہ بھی ہے، کیونکہ مسلم خواتین میں اقتصادی اور تعلیمی پسماندگی زیادہ ہے، اس لئے ان کے یہاں شرح بارآوری بھی زیادہ ہے، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور زیادہ آمدنی والے طبقہ کی مسلم خواتین میں بارآوری نسبتاً کم ہے۔

۵۔ دوسری معلومات جن کو عموماً واضح نہیں کیا جاتا ان کی خاص وجہ...... ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمان عورتوں میں مجموعی شرح پیدائش میں کمی کا رجحان پایا جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ مسلم خواتین میں تناسب پیدائش ہندو عورتوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔

۶۔ مسلمانوں کی آبادی میں اونچی شرح پیدائش کا کوئی تعلق ہجرت کے اعداد و شمار سے نہیں ہے۔

۷۔ اس کی کافی شہادت موجود ہے کہ مسلمانوں میں فیملی پلاننگ اور مانع حمل ادویہ وغیرہ کے استعمال مقبول ہوتے جا رہے ہیں۔

۸۔ بچوں میں نقص تغذیہ اور وزن کی کمی ہندوستان کے محروم طبقات میں عام ہے، اس میں مسلمانوں کی تخصیص نہیں ہے، پھر بھی مسلم بچوں میں نقص تغذیہ اور وزن کی کمی زیادہ پائی جاتی ہے اس کا اہم سبب مسلمانوں کی اقتصادی اور تعلیمی پسماندگی ہے، ملک کے دیگر سماجی طبقات کی طرح یہاں بھی صنفی تفریق تغذیہ اور تعلیم کی فراہمی میں مانع ہوتی ہے۔

علاحدہ اور تنگ آبادیوں میں رہنے کے اثرات

شواہد سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مسلم آبادی عموماً شہر کے مرکزی علاقوں، فصیلی شہروں اور جھگی جھونپڑیوں (سلم) علاقوں میں رہتی ہے، جسے مسلمان کی گندی بستیاں (گھیٹو) کہا جاتا ہے، ان علاقوں میں خصوصاً صحت، صفائی، صاف پانی، نالیوں، اسکولوں اور ٹرانسپورٹ کی سہولیات میسر نہیں ہوتیں، ان عوامل میں جن سے اقتصادی اور تعلیمی معیار کو سمجھا جاتا ہے اور یہ مردوں عورتوں میں مشترک ہیں۔

تعلیمی محرومی

جب کبھی مسلم خواتین کی تعلیمی پسماندگی کا مسئلہ زیر بحث آتا ہے تو ان کی مایوس کن اقتصادی بدحالی کو ان کی تعلیمی پسماندگی سے ہی منسوب کیا جاتا ہے، بعض لوگ غیر ضروری طور پر خوش ہو جاتے ہیں مثال کے طور پر سچر کمیٹی رپورٹ جس نے مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں ہمدردانہ اور مثبت تجزیہ پیش کیا ہے، میں کہا گیا ہے کہ اگرچہ مسلم لڑکیوں کو تعلیمی مواقع کم تر کر دیئے گئے ہیں تب بھی ان لڑکیوں نے تعلیم سے کنارہ کشی اختیار نہیں کی ہے (ص ۱۹)، یہ بات کہنا غیر ضروری طور پر مبالغہ آرائی ہے کہ کسی نظام تعلیم میں آبادی کے ایک حصہ کو تعلیم سے محروم رکھا گیا ہے، جہاں تک ہندوستان کے نظام تعلیم کا تعلق ہے یہ سب کے لئے یکساں طور پر کھلا ہے اس میں آبادی کے کسی حصہ کو حصول تعلیم سے خارج نہیں کیا گیا ہے، جہاں تک مسلم خواتین میں تعلیم کے لئے جوش اور شدید خواہش (ص۔۱۹) کی تحسین کا تعلق ہے یہ بات ظاہر ہے کہ حصول تعلیم کے لئے پر جوش جذبہ ضروری شرط ہے، تاہم یقیناً یہ کافی نہیں ہے، اس کے لئے دیگر اشیا بھی مطلوب ہیں، جیسے اقتصادی صلاحیت، بنیادی ڈھانچہ کی دستیابی اور مناسب حکمت عملی، مسلم خواتین کی تعلیمی پسماندگی کے اسباب میں ان سہولتوں کی عدم دستیابی کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔

ہندوستان کے شہری اور دیہی علاقوں میں مسلم خواتین کی شرح خواندگی کے تجزیہ سے ہندوستان میں مسلم خواتین کی تعلیمی پسماندگی پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے (سچر کمیٹی رپورٹ کے گوشوارہ ۴ ایک اے اور ۴ ایک بی کو دیکھئے)۔

ان گوشواروں میں پیش کردہ اعداد و شمار کی بنیاد پر مندرجہ ذیل مشاہدات ملاحظہ ہوں؛

۱۔ شہری علاقوں میں آبادی کے تمام زمروں کی شرح خواندگی ۸۰ فیصد ہے، شہری علاقوں میں مسلم مردوں کی شرح خواندگی ۷۶ فیصد ہے، جو کہ قومی اوسط سے کچھ ہی کم ہے، جبکہ شہری مسلم خواتین کی شرح خواندگی ۶۳ ہے، دیہی علاقوں میں قومی شرح خواندگی (آبادی کے تمام زمروں میں) ۵۹ فیصد ہے، دیہی علاقوں میں مردوں کی شرح خواندگی ۷۱ فیصد ہے، لیکن دیہی علاقے کے مسلمانوں میں یہ شرح ۶۲ فیصد ہے جبکہ دیہی مسلم خواتین میں یہ شرح ۴۳ فیصد ہے، ظاہر ہے کہ دیہی علاقوں کی مسلم خواتین کو تین طرح سے محرومی کا شکار ہونا پڑ رہا ہے، وہ شہری اور دیہی تضاد کا شکار ہیں، دوسرے یہ کہ ان کا تعلق ایک محروم اقلیتی فرقہ سے ہے، اور اقلیتوں کے خلاف عصبیت کو بھی سہنا پڑا ہے، اپنے ماحول میں بھی ان خواتین کو صنفی تفریق کا شکار ہونا پڑتا ہے ان ہی وجوہات کے سبب دیہی علاقوں میں مسلم خواتین کی شرح خواندگی اس درجہ کم ہے۔

۲۔ شہری علاقوں کے مسلمانوں اور شہری علاقوں کے دیگر زمروں کے مردوں کے درمیان کوئی اہم فرق نظر نہیں آتا، لیکن شہری علاقہ کی مسلم خواتین اور دیگر زمروں کی مسلم خواتین کے درمیان کافی فرق ہے، اسی طرح دیہی زمروں کی تمام خواتین اور دیہی مسلم خواتین کے درمیان بھی کوئی خاص فرق نہیں ہے، لیکن جب شرح خواندگی میں شہری اور دیہی زمروں کا موازنہ مسلم خواتین سے کیا جائے تو اس میں کافی فرق دکھائی دیتا ہے۔

۳۔ علاقائی تصویر کسی حد تک ملی جلی ہے، بعض ریاستیں ایسی ہیں جہاں شہری اور دیہی علاقوں کے تمام زمروں کے مقابلہ میں مسلم خواتین کی شرح خواندگی زیادہ بھی ہے اور کہیں کم بھی ہے، اس کے کئی وجوہات ہو سکتے ہیں، سب سے پہلے ہم شہری علاقوں پر غور کریں، بعض ریاستیں ایسی ہیں جہاں مسلم خواتین میں شرح خواندگی شہری علاقوں کے دیگر تمام زمروں کی خواتین سے زیادہ ہے، یہ ریاستیں ہیں: تامل ناڈو اور چندی گڑھ، دیگر تمام ریاستیں جن میں مغربی بنگال، کیرالہ، اتر پردیش، بہار، آسام، جموں اور کشمیر، جھارکھنڈ، کرناٹک، ہماچل پردیش، دلی، مہاراشٹرا، آندھرا پردیش، گجرات، راجستھان، مدھیہ پردیش، ناگالینڈ، اڑیسہ اور پنجاب شامل ہیں، ان میں دیہی علاقوں کی مسلم خواتین میں بعض رجحانات دیکھے

جاسکتے ہیں، بعض ریاستیں ایسی ہیں جہاں دیہی مسلم خواتین میں شرح خواندگی دیگر تمام زمروں کی خواتین سے زیادہ ہے، مثلاً اڑیسہ، ہماچل پردیش، اور چندی گڑھ، دیگر متعدد ریاستوں میں خواندگی کی شرح عمومی شرح اوسط سے کم تر ہے، ان ریاستوں میں مغربی بنگال، کیرالہ، اتر پردیش، بہار، جموں وکشمیر، جھارکھنڈ، کرناٹک، اتراکھنڈ، دلی، مہاراشٹرا، آندھراپردیش، گجرات، راجستھان اور ہریانہ شامل ہیں۔

۴۔ ہریانہ میں دیہی علاقوں کی مسلم خواتین میں شرح خواندگی ۱۹ فیصد ہے، اتر پردیش میں ۲۲ فیصد، بہار میں ۲۸ فیصد، راجستھان میں ۱۳ فیصد ہے، جو کم تر سطح کو ظاہر کرتا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ قومی سطح پر خواندگی شرح بڑھانے کے لئے کوئی ملک گیر پالیسی مناسب نہیں ہوگی، لہٰذا ضروری ہے کہ علاقائی طور پر متعلقہ ریاستوں کے حالات اور ماحول کو پیش نظر رکھتے ہوئے مناسب پالیسی بہتر دائرۂ عمل کے تحت مرتب کی جائیں۔

اقتصادی محرومی

ہندوستان میں مسلم خواتین کی اقتصادی پسماندگی مسلمانوں کی اقتصادی پسماندگی سے مختلف نہیں ہے، دیہی مسلم خواتین کی اقتصادی حالت زیادہ نازک ہے، جو سماجی اعتبار سے کمزور طبقہ کی ہیں اور متفرق سماجی حالات سے دوچار ہیں، ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ اکثر اعداد وشمار مجموعی نوعیت کے ہیں اور صنفی و مذہبی بنیاد پر ان کی درجہ بندی نہیں کی گئی ہے، لہٰذا ہم بعض مشاہدات پر ہی اکتفا کریں گے جو زیادہ معقول ہوں، اہم بات یہ ہے کہ یہ بیانات مفروضہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے، مندرجہ ذیل اندازوں سے مسلم خواتین کی اقتصادی بدحالی کے محرکات کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

۱۔ منظم کاروباری زمرہ میں مسلم خواتین بے حد کم ہیں، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پیشہ ورانہ زمرے (ڈاکٹر، پروفیسر، سائنسداں، ٹیچرز وغیرہ) میں مسلمان خواتین موجود ہیں لیکن آبادی کے لحاظ سے ان کا تناسب بہت کم ہے۔

۲۔ پالیسی ساز سطح پر مسلم خواتین کی کمی صاف نظر آتی ہے۔

۳۔ اکثر مسلم خواتین غیر منظم زمرے میں ملازمت کرتی ہیں، وہ اپنے گھر کی چہار دیواری میں رہ کر کام کرتی ہیں جن کاموں میں وہ مصروف کار ہیں ان میں سلائی، کڑھائی، چکن، ساڑی، ریڈی میڈ کپڑے وغیرہ شامل ہیں، ان کی کمائی بہت کم ہے، وہ یہ کام اپنے خاندان کی آمدنی میں اضافہ کے لئے کرتی ہیں کیونکہ ان کے گھر والوں کی آمدنی گھریلو اخراجات کے لئے کافی نہیں ہوتی۔

۴۔ انہیں غیر منظم زمرے میں پیش آنے والی تمام تر مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، کیونکہ یہ خواتین تعلیم یافتہ اور منظم نہیں ہوتیں لہٰذا اپنی بات منوانے کی صلاحیت نہیں رکھتیں، ان میں سے بیشتر کو کچا سامان فراہم کیا جاتا ہے اور پھر مصنوع اشیاء مڈل میں (درمیانی کمائی) کے ذریعہ وصول کرلیجاتی ہیں اس طرح یہ درمیانی آدمی کا استحصال کرتے ہیں۔

۵۔ انہیں قرضہ حاصل کرنے اور منظم مارکیٹ کے اداروں تک رسائی حاصل نہیں ہوتی۔

شریعت کے احکام واصول پر عمل نہ کرنے کے سبب محرومی

بعض لبرل غیر مسلموں اور بعض ناواقف مسلمانوں میں یہ غلط خیال پایا جاتا ہے کہ ہندوستان کی مسلم خواتین کی پسماندگی کا سبب شریعت ہے، اس کے برخلاف شریعت نے مسلمان عورتوں کو سماج میں عزت اور وقار کا درجہ عطا کیا ہے، ہندوستان میں مسلم خواتین کی اقتصادی بدحالی کا اہم سبب مالیاتی امور میں شرعی قوانین کا عدم نفاذ ہے، مثال کے طور پر بعض قوانین ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ اسلام میں مرد کو خاندان کے سربراہ کا درجہ حاصل ہے اور وہ اپنے خاندن کی جملہ ضروریات واخراجات پوری کرنے کا پابند ہے، شادی کے بعد شوہر اپنے اہل وعیال کے نان ونفقہ کی ادائیگی کا پابند ہے، شریعت کے تحت یہ امر واجب ہے، پسماندہ طبقات میں اکثر شوہر اپنی اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرتے اور خواتین کو گھر کا خرچہ چلانے کے لئے محنت ومزدوری کا سہارا لینا پڑتا ہے، حالانکہ ایسے کاموں سے بہت کم آمدنی ہوتی ہے

اس وجہ سے اس زمرہ میں اقتصادی بدحالی زیادہ ہوتی ہے۔

۲۔ شریعت کا حکم ہے کہ شادی کے وقت مہر ادا کردیا جائے جو عورت کا حق ہے، مہر کی ادائیگی اتنی ضروری ہے کہ بعض لوگ جنہیں شرعی احکام کا شعور ہے وہ خلوت سے پہلے ہی پورا مہر ادا کردیتے ہیں، لیکن علاقائی ماحول کے باعث بعض مسلم شوہر اس فریضہ کی ادائیگی سے منہ موڑتے ہیں، اور کوشش کرتے ہیں کہ مہر معاف کرالیا جائے اس کے لئے سختی بھی کی جاتی ہے، طلاق اور موت کی دھمکیاں تک دی جاتی ہیں۔

۳۔ شرعی احکام کے مطابق ورثہ کی صحیح تقسیم نہیں کی جاتی، جائداد اور مالی اثاثوں پر خاندان کے مرد ممبران کا قبضہ ہوتا ہے، قرآن مجید کی سورہ ۴ کی آیت ۱۱ میں وراثت کی تقسیم میں صنفی تفریق نہیں کی گئی ہے، بعض اوقات ورثہ کی تقسیم کا تنازعہ طویل مدت تک چلتا ہے ایک مثال سے اسے واضح کیا جاسکتا ہے، فرض کیجئے زید نے اپنی وفات کے وقت ایک بیٹا اور سات بیٹیاں پیچھے چھوڑیں، باپ کی وفات کے بعد اس کا سارا ترکہ بیٹے کے قبضہ میں چلا جاتا ہے، جو قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت کی کھلی خلاف ورزی ہے، اس طرح زید کی بہنیں ورثہ سے محروم کردی جاتی ہیں اگر بیٹا بھی فوت ہوجائے تو یہ سارا ترکہ اس کی اولاد میں تقسیم ہوجاتا ہے، اور زید کی بہنوں کی اولاد اس سے قطعاً محروم ہوجاتی ہیں، اس طرح ایک ہی نسل میں یہ ترکہ مرد کے قبضہ میں چلا جاتا ہے، شریعت کا مقصد انصاف قائم کرنا ہے لیکن شرعی احکام کی خلاف ورزی کے سبب معاشی اور معاشرتی ناانصافی کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

☆☆☆

ہندوستان میں مسلم خواتین کی معاشی صورت حال

جناب ایچ عبدالرقیب، چنئی

Unequal Citizens- A Study of Muslim Women in (غیر مساوی شہری- ہندوستان میں مسلم خواتین پر ایک مطالعہ) غالباً پہلی کتاب ہے جو ہندوستانی مسلم خواتین کی سماجی، معاشی اور سیاسی صورتحال پر جدید علمی انداز میں اور اعداد وشمار کی روشنی میں بحث کرتی ہے۔ یہ کتاب جواہر نہرو لعل یونیورسٹی کے شعبۂ سیاسیات کی پروفیسر زویا حسن اور معروف صحافی ریتو مینن نے مل کر مرتب کی ہے۔ ۲۰۰۰ انہوں نے Org-Marg کے تعاون سے مسلم خواتین کے سروے (Muslim Women's Survey) کے نام سے ملک کی بارہ ریاستوں کے چالیس اضلاع میں دس ہزار خواتین کا تفصیلی سروے کیا تھا۔ ان خواتین میں ۸۰ فیصد مسلم اور ۲۰ فیصد ہندو، ۶۰ فیصد شہری اور ۴۰ فیصد دیہاتی ہیں۔ اس سروے کے ذریعے درج ذیل نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔

"With the possible exception of Scheduled caste women Muslim Women probably comprise of the poorest and the most disadvantaged gorup in the country. The overall negative impact of this on Muslim women can scarcely be overstated, with the majority of them being the poorest of the poor in India"

خواتین کا طبقہ عمومی طور پر ملک میں پس ماندہ اور پچھڑا ہوا ہوتا ہے اور مسلم خواتین کا طبقہ ان میں بھی سب سے زیادہ پس ماندہ اور پچھڑا ہوا ہے اور دلت خواتین کو اگر مستثنیٰ کر دیا جائے تو یہ ملک کا غریب ترین طبقہ شمار ہوگا۔

آزادی کے بعد سے ہندوستانی مسلمانوں میں بڑے پیمانے پر احساس محرومی پایا جاتا ہے۔ سچر کمیٹی کی رپورٹ ہندوستان کے مسلمانوں کی سماجی، اقتصادی اور تعلیمی حالت پر ایک اہم دستاویز ہے۔ اس رپورٹ کی تیاری سے قبل اس مسئلہ پر بیشتر بحث ومباحثہ قیاس آرائیوں کی بنیاد ہی پر ہوتا تھا۔ لیکن اس رپورٹ میں مذہبی اقلیتوں کی سماجی اور اقتصادی حالت کا اعداد وشمار پر مبنی ایک منظم اور باضابطہ تجزیہ پیش کیا گیا ہے، اس رپورٹ کے اختتام میں یہ الفاظ درج ہیں:

''مختلف ریاستوں کے مسلمانوں کے حالات میں قابل لحاظ فرق پایا جاتا ہے اور یہ کہ مسلم فرقہ ترقی کے عملاً تمام مظاہر میں خسارے اور محرومیوں سے دوچار ہے''۔ قومی کمیشن برائے کار اندازی ترقی غیر منظم سیکٹر (National Commission for Enterprises in the Unorganized Sector) کے تحت ممتاز ماہر معاشیات آنجہانی ڈاکٹر ارجن سین گپتا ایک رپورٹ ۲۰۰۹ء میں پیش کی ہے جس میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ملک کی معاشی ترقی کی تیز رفتاری اور ملک میں ایک لاکھ سے زیادہ کروڑ پتیوں (Millionaires) کی موجودگی کے باوجود آبادی کا ۷۷ فیصد حصہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جن کی روزانہ کی آمدنی بیس روپے سے کم ہے۔ تشویشناک بات یہ ہے کہ اس رپورٹ کے مطابق ۸۴ فیصد مسلمان غریب اور مسائل کا شکار ہیں۔

مسلم خواتین کی پسماندگی کی وجہ عام طور پر ان کے مذہب کو قرار دیا جاتا ہے۔ مسلم خواتین کی زندگی کے بہت سارے امور مثلاً آمدنی، روزگار، تعلیم اور تغذیہ وغیرہ سے صرف نظر کر کے صرف نکاح وطلاق کے شرعی ضابطوں اور نان ونفقہ جیسے امور کو صنفی انصاف کی بنیاد بنایا جاتا ہے۔ مسلم خواتین سے متعلق چند منتخب واقعات ومعاملات پر جس طرح حد درجہ توجہ دی جاتی ہے اور انہیں میڈیا میں نہایت جوش وخروش سے بحث کا موضوع بنایا جاتا ہے اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا مذہب ہی مسلم فرقے میں موجودہ صنفی نابرابری کا واحد سبب ہے۔ نتیجتاً سول سوسائٹی اور ریاست مسلم خواتین کی محرومیوں کے اسباب سماجی امتیازات اور غلط ترقیاتی پالیسیوں میں نہیں بلکہ مذہبی اور فرقے کے اندرونی معاملات میں تلاش کرتی ہے۔ اس عام خیال کے برعکس مذکورہ بالا

رپورٹیں اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہیں کہ مسلم خواتین کی پسماندگی کی وجہ مذہب نہیں بلکہ دیگر خارجی عوامل ہیں۔

مسلم خواتین کے معیار زندگی کا انڈکس (Standard of Living Index-SLI) پورے ملک میں یکساں نہیں ہے۔ ملک کے جنوب اور مغرب کے علاقوں میں ان کے بود وباش کا معیار شمال اور مشرق کے علاقوں کی بہ نسبت بہتر ہے۔ غربت کی شرح سب سے زیادہ یوپی اور بہار میں ہے۔ جہاں بالترتیب ۵۵ فیصد اور ۴۰ فیصد خواتین خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہی ہیں۔ اس کے بعد آسام اور مغربی بنگال کا نمبر آتا ہے جہاں بالترتیب ۴۰ فیصد اور ۳۵ فیصد خواتین کے نیچے زندگی گزار رہی ہیں۔ ان اعداد وشمار پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو علاقے ترقیاتی اور پیداواری پہلو سے بہتر ہیں وہاں کی مسلم خواتین کی معاشی حالت بھی نسبتاً بہتر ہے۔ مسلم ویمنس سروے (Muslim Women's Survey) میں مسلم خواتین کے گھروں کی ملکیت، پیداواری وغیر پیداواری اثاثوں اور ان کے پیشوں کی نوعیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس جائزہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مسلم خواتین کی حالت درج فہرست ذاتوں (Scheduled Castes) کی خواتین سے کچھ بہتر ہے لیکن مجموعی طور پر وہ غریب ہی ہیں۔ اس غربت کے تین اہم وجوہات ہیں۔

۱۔ تعلیم کی کمی

مسلم طلبہ میں تعلیم چھوڑنے والوں کی کثرت پریشان کن ہے۔ دیگر بہت سے ہندوستانیوں کی طرح مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا خاص سبب غریبی ہے جس کی وجہ سے بچے ابتدائی درجات کے بعد تعلیم چھوڑنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ یہ بات مسلم بچیوں کے معاملے میں زیادہ نمایاں ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ کارخانوں یا گھروں میں کام کریں اور آمدنی فراہم کریں یا اگر ان کی مائیں کام کرنے والی ہوں تو یہ گھر میں اپنے بھائی بہنوں کی دیکھ بھال کریں۔ مزدوری کرنے والے بچوں کی تعداد دیگر طبقوں کے بالمقابل مسلمانوں میں زیادہ ہے۔ غریب اور ناخواندہ والدین اپنے بچوں کے ٹیوشن کے اخراجات کا بار اٹھانے کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ نہ ہی گھر پر ان کی تعلیم میں وہ ان کی مدد کرسکتے ہیں جو آج کے تعلیمی نظام کا لازمی جزو بن گیا ہے۔ بچوں کو اسکول بھیجنے کی قیمت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ایسا کرنا والدین کے لئے دشوار ہوجاتا ہے اور والدین اس وجہ سے بھی ایسا کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ حالیہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل غریبی اور مالی دشواریاں ہی مسلم لڑکیوں کے جدید سیکولر تعلیم سے محروم رہنے کا سب سے بڑا سبب ہے۔ غربت تعلیم سے دوری کا سبب بھی ہے اور نتیجہ بھی۔ مسلم سماج میں خواتین کی شرح تعلیم مردوں سے بہت کم ہے۔ والدین لڑکیوں کو اسکول سے اس ڈر سے نکال لیتے ہیں کہ پڑھنے لکھنے سے شوہر نہیں مل سکیں گے اور تعلیم زیادہ ہو تو شادی بیاہ کا خرچ بھی زیادہ ہوجاتا ہے۔

۲۔ مسلم خواتین کے روزگار کی نوعیت اور ان میں فنی مہارت کی کمی

روزگار سے فرد اور اس کے کنبے کو قوت خرید فراہم ہوتی ہے جس کی بدولت وہ زندگی گزارنے کے وسائل اور اس کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل، آرام وآسائش اور خالی وقت گزارنے کے لئے اسباب حاصل کرسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ آمدنی میں اضافہ کی صورت میں سرمایہ کاری بھی کی جاسکتی ہے۔ اس کے ذریعے پائیدار اشیائے صرف خریدی جاسکتی ہے۔ سرمایہ کاری آمدنی بڑھانے اور افراد اور معیشت کی نمو کو برقرار رکھنے میں مددگار ہوتی ہے۔ اس طرح مالی حیثیت سے حاصل ہونے والے اقتصادی فوائد بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض غیر اقتصادی فوائد بھی ہیں جو انہیں حاصل ہوتے ہیں۔ یہ خیال کہ کوئی شخص اہم اور قابل قدر سرگرمی میں لگا ہوا ہے اس کی عزت نفس کو بڑھاتا ہے اور اسے خوشحال ہونے کے احساس سے بھی ہم کنار کرتا ہے۔

مسلم خواتین میں وہ بھی ہیں جو کمانے پر مجبور ہیں اور وہ بھی جو کمانے کو معیوب سمجھتی ہیں۔ بہت ساری خواتین اپنے خاندان کی ضروریات کی تکمیل اور آمدنی میں اضافہ کی غرض سے کام کرتی ہیں اور ان کا نہ کمانا ان کی غربت میں اضافہ اور فاقہ کشی کا سبب بن سکتا ہے۔ متوسط درجہ کے گھرانے کی خواتین روزگار سے وابستہ نہیں ہیں اس لئے کہ ان کے یہاں خواتین کے روزگار سے متعلق ہونے کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ البتہ اعلیٰ سطح کی خواتین اس سے مستثنیٰ ہیں۔ مجموعی طور پر ہندوستان میں ۱۵ تا ۶۴ سال کی عمر کی تقریباً ۴۴ فیصد خواتین کام کرتی ہیں۔ مسلم خواتین میں کام کرنے والی خواتین کی تعداد تقریباً ۲۵ فیصد ہے۔ دیہی علاقوں میں مسلم خواتین کی تعداد تقریباً ۲۹ فیصد ہے جو اکثر گھروں میں رہتی ہیں اور زراعت میں بھی بہت کم حصہ لیتی ہیں۔

مسلم خواتین کی بڑی تعداد Self-employed یعنی گھریلو روزگار سے متعلق ہے۔ جبکہ باضابطہ ملازمتوں بالخصوص سرکاری زمرے میں ان کی

حصہ داری بہت کم ہے۔ یہ خواتین سلائی، کڑھائی، کشیدہ کاری، زری کا کام، اگربتی سازی اور بیڑی سازی وغیرہ کرتی ہیں۔ ان پیشوں کے ذریعہ انہیں بہت کم آمدنی ملتی ہے اور وہ اپنی محنت کی اصل قیمت حاصل نہیں پاتیں۔ اس کے علاوہ انہیں دیگر مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے مثلاً کام کے ابتر حالات، ٹوائلٹ اور بچوں کے مراکز کی عدم موجودگی، صحت بیمہ جیسی سماجی تحفظ کی سہولتوں کی عدم موجودگی وغیرہ۔ مسلم خواتین بہتر حالات پر اصرار بھی نہیں کرسکتیں کیونکہ بیشتر کام جو وہ کرتی ہیں ذیلی ٹھیکے داروں کے تحت ہوتا ہے۔ گھر سے باہر نکل کر دوڑ دھوپ کرنے پر عائد پابندیوں (جو اکثر سماجی اور ثقافتی اسباب کا نتیجہ ہیں) کے سبب ان کے روزگار کے مواقع محدود ہوجاتے ہیں اور اچھی اجرت نہیں حاصل کرپاتیں۔ وہ عموماً ذیلی ٹھیکے داروں کے تحت کام کرتی ہیں اور ان کے استحصال کا شکار ہوتی ہیں۔ ان کی بڑھتی ہوئی علیحدگی اور خودگزینی کے سبب گھروں میں رہ کر مسلم خواتین الگ تھلگ ہوجاتی ہیں جس کے نتیجے میں باہر کی دنیا سے ان کے رابطے ٹوٹ جاتے ہیں اور ان کی اجتماعی کوششوں کی صلاحیت کند ہوجاتی ہے۔ تعلیم سے دوری اور تکنیکی مہارتوں میں کمی کی وجہ سے ان کی آمدنی بہت کم ہوتی ہے اور اس طرح غریبی کا سلسلہ بڑھتا ہی رہتا ہے۔ کئی ریاستوں میں گھریلو روزگار بیٹھ چکا ہے جس کے نتیجے میں مسلم خواتین سخت افلاس کی حد تک جا پہنچی ہیں۔ گھریلو روزگار کی صورت میں مسلم خواتین کے روزگار کی اس حالت زار کا ایک سبب روزگار میں کارفرما امتیازات بھی ہیں۔ وہ آزادی کے طور پر قرضوں کی سہولت، ہنرمندی میں اضافہ کے مواقع یا بازاروں تک رسائی حاصل نہیں کرسکتیں۔ غریب مسلم خواتین کو قرضے دینے کے معاملے میں امتیازات برتے جاتے ہیں۔

برسرروزگار مسلم خواتین اور مختلف قسم کے روزگار سے اس کی وابستگی کا تناسب	
روزگار	فیصد
پروفیشنل خواتین (ڈاکٹرس، وکیل، ٹیچرس)	۸
ویکیشنل پیشہ ورانہ کاموں سے متعلق مثلاً ٹیلرس، زری کا کام کرنے والی خواتین وغیرہ	۳۰
چھوٹی موٹی تجارتوں سے متعلق خواتین (مثلاً پھل فروش، ترکاری فروش)	۱۲
بڑے کاروبار سے متعلق خواتین (مثلاً اسکول یا کمپنی چلانا)	۱
چھوٹے کاروبار سے متعلق خواتین (مثلاً پاپڑ، اگربتی وغیرہ کی صنعت)	۳۱
دیگر	۱۸

درج بالا اعداد وشمار سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم خواتین کی بڑی اکثریت ایسے پیشوں سے وابستہ ہے جو افزائش کے پیشے (Wealth Creating Occupation) شمار نہیں ہوتے۔

۳۔ مسلم خواتین کی اکثریت کا ملک کے معاشی اور معاشرتی طور پر پسماندہ علاقوں میں رہنا:

ملک کے شمال علاقے اترپردیش، بہار، مشرقی علاقہ مغربی بنگال اور آسام جہاں مسلمانوں کی بڑی اکثریت رہتی ہے وہ معاشی اور معاشرتی لحاظ سے بھی پورے ملک میں پسماندہ اور پیچھے ہے اور انہی علاقوں میں مسلم خواتین کی اکثریت آباد ہے جس کی وجہ سے بھی غربت اور آمدنی کی کمی ان کے حصہ میں بھی آئی ہے۔ (ملاحظہ ہو۔ مسلم خواتین کی معیار زندگی انڈکس ص ۱)۔

تجاویز

۱۔ مسلمانوں کے روزگار کے حالات میں بہتری لانے کے لئے مہارتوں کے فروغ اور ان زمروں میں قرضوں کی فراہمی پر زیادہ توجہ درکار ہوگی۔ چونکہ مسلمانوں کی کثیر تعداد خودروزگاری سے وابستہ ہے اس لئے مہارتوں کے فروغ اور قرضوں کی فراہمی کا عمل بہت ضروری ہے۔ اسکے علاوہ تکنالوجی اور بازار کی فراہمی سے متعلق پروگراموں کو خاصی اہمیت دینی چاہئے۔

۲۔ مسلمان، بطور خاص خواتین، حکومت کی ترقیاتی اسکیموں سے بالکل محروم رہ جاتی ہیں۔ وہ خط افلاس سے نیچے (BPL) لوگوں سے متعلق جواہر روزگار

یوجنا کے پروگراموں کے تحت مکان بنانے کے لئے قرضے کے حصول اور بیواؤں کی پنشن کے معاملوں میں امتیازات سے دو چار ہوتی ہیں۔ اس لئے حکومت کی اسکیموں اور پروگراموں سے متعلق بڑے پیمانے پر اور مؤثر انداز میں معلومات فراہم کی جائے۔ ایسے مشاورتی مراکز بھی قائم کئے جائیں جہاں لوگ ان کے لئے بنائی گئی اسکیموں سے واقف ہوں اور ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ معلومات کی کمی کے سبب مسلمانوں کے لئے جاری کردہ سرکاری فنڈ بلا استعمال رہ جاتی ہے۔

۳۔ ملت کو اپنے مسائل کے سلسلہ میں خود کفیل بننے کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کی معاشی ترقی کے لئے وقف کے جائیدادوں کا بہتر استعمال ہونا چاہئے۔ زکوٰۃ کے ذریعے حاصل ہونے والی رقوم کا تعلیم، صحت اور ملازمت کے شعبوں میں بھی استعمال کرنا چاہئے۔

۴۔ ۵۸ اضلاع میں جہاں مجموعی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ۲۵ فیصد ہے، خاص توجہ ان چھوٹے کاروباروں کی پیداواریت میں اضافہ پر ہونی چاہئے جہاں مسلم کارکنوں کی بڑی تعداد سرگرم ہے۔ ان کاروباروں کے لئے معمول سے الگ اقدامات کارگر ہو سکتے ہیں۔ جدید انتظامی صلاحیت، تکنیک اور ڈیزائن کی مہارتوں اور پیشہ وارانہ مہارتوں کے مؤثر امتزاج کے لئے کارگر حکمت عملی ترتیب دینے کی غرض سے گہرا مطالعہ درکار ہے۔

بنگلور کے دیہی اور شہری علاقوں میں مایا آرگینک (Maya-Organic) کے ذریعے کئے جانے والے اقدامات ان کوششوں کے لئے ماڈل کا کام دے سکتے ہیں۔ ان اقدامات کا اہم پہلو یہ ہے کہ ان کے تحت پیشہ وارانہ مہارتوں کو فروغ دیا جاتا ہے اور یہ صلاحیت پیدا کی جاتی ہے کہ لوگ تیزی سے بدلتے ہوئے بازار کے مزاج کو سمجھ سکیں اور اسے اپنے موافق بنا سکیں۔ اس قسم کے اقدامات سے نمو پذیر صنعتوں سے وابستہ کارکنوں کو مدد ملے گی۔ اس طرح جمود کی شکار صنعتوں میں لگے ہوئے کارکنوں کے لئے منتقلی کی حکمت عملی مناسب ہوگی۔ کارکنوں میں ایسی نئی مہارتیں پیدا کرنے پر توجہ مرکوز کرنی چاہئے جن کی مانگ بڑھ رہی ہے۔

۵۔ National Minorities Development and Finance Corporation اقلیتوں کی اقتصادی ترقی پر خصوصی توجہ دینے کے لئے قائم کی گئی۔ اس کا بنیادی مقصد، اقلیتوں کے پس ماندہ طبقوں کی بہبود کے لئے اقتصادی اور ترقیاتی سرگرمیوں کو فروغ دینا ہے جس میں مختلف پیشہ وارانہ گروپوں اور خواتین پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔ یہ ادارہ خط افلاس کے قریب زندگی بسر کرنے والی اقلیتوں کو خود روزگاری کے لئے امداد فراہم کرتا ہے۔ یہ ادارہ مائکرو فائنانس بھی فراہم کرتا ہے۔ شہر کے سلمس میں رہنے والی اقلیتی خواتین جو عام بینکوں سے قرض نہیں لے سکتیں، ان کی امداد کرنا بھی اس ادارہ کے پروگراموں میں شامل ہے۔ اس طرح کے اداروں سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

غور وفکر کے لئے چند معروضات:

اسلام نے عورت کو دوسروں پر اپنی کفالت کے لئے بوجھ نہ بننے کے مقصد کے تحت مہر اور وراثت کا حق متعین کردیا تھا، مال سے عورت کی شخصیت کو تقویت ملتی ہے اور اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں خاص طور پر شمالی ہندوستان میں اور دیندار طبقوں میں بھی اسے وراثت کے حق سے محروم رکھا جاتا ہے اس سلسلہ میں ہمیں آواز اٹھانے کی ضرورت ہے جس طرح آج سے چند سال پہلے تک مہر کے تعلق سے بھی ہمارے سماج میں افراط وتفریط پائی جاتی تھی لیکن آج اس کی طرف لوگ متوجہ ہو رہے ہیں۔

نکاح کو غیر ضروری رسوم ورواج سے پاک فضول خرچیوں سے دور ہو کر آسان اور سادہ بنانے کی سخت ضرورت ہے اور ایک مہم چلانے کی بھی۔

اسی طرح عورت کی ملازمت اور پیشہ وارانہ کاموں کے تعلق سے بھی ہمیں صحیح نقطہ نظر کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ مغرب اور جدید نظریات کے حامل طبقہ جو خود مختاری اور Empowerment کا نعرہ لگاتا ہے کہ شادی شدہ عورت کو معاشی طور پر آزاد اور خود کفیل ہونا چاہئے تاکہ وہ آزادانہ طور پر اپنی مرضی اور ارادہ کی مالک ہو جس سے وہ بنیاد ہی منہدم ہو جاتی ہے جس پر خاندان کا پورا نظام قائم ہوتا ہے اس کی سخت ترین طور پر تردید ہونی چاہئے۔

اسی طرح یہ دعوی بھی کیا جارہا ہے کہ ملازمت عورت کے لئے اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ وہ اپنی شخصیت کی دریافت کرسکے اور اسے پروان چڑھا سکے کیونکہ یہ دعوی غلط ہے۔ عورت اپنے گھر میں رہ کر اپنی شخصیت کی دریافت کرسکتی ہے اور اپنا مثبت ومنافع بخش کردار ادا کرسکتی ہے۔

اسی کے ساتھ اس بات کی بھی تردید ہونی چاہئے کہ عورت کا ملازمت کرنا ممنوع ہے صرف ضرورت کے وقت ہی عورت کے لئے ملازمت جائز ہے کیونکہ ضرورت ممنوع چیزوں کو بھی جائز کردیتی ہے۔

پہلے مشترکہ خاندان کے رواج کی وجہ سے بیٹے اور بیٹیاں شادی کے بعد بھی ایک ہی گھر میں اکٹھے رہا کرتے تھے لیکن اب علاحدہ چھوٹے خاندان کا تصور عام ہوگیا ہے لہٰذا اب مرد کو زیادہ آمدنی کی ضرورت ہوئی تاکہ وہ ایک نئے چھوٹے خاندان کو مستحکم کر سکے۔ اس استحکام کی کوشش میں عورت کو اپنے شوہر کا ساتھ دینا چاہئے اسی طرح ایسی صورتحال میں جب عورت مطلقہ یا بیوہ ہوجاتی ہے تو اس کے ولی اس کی اور اسکے بچوں کی کفالت نہیں کرپاتے ہیں لہٰذا وہ زندگی گزارنے کے لئے کہیں ملازمت کرنے پر مجبور ہوجاتی ہیں۔

ابن عابدین نے کہا ہے: باپ کو چاہئے کہ وہ اپنی بیٹی کو ایسی عورت کے حوالہ کرے جو اسے مختلف فنون کڑھائی، سلائی وغیرہ سکھائے تاکہ ضرورت کے وقت خود کما کر اپنی کفالت کر سکے۔

دور نبوی اور خلفاء راشدین کے دور میں سماج میں عورتوں کی حیثیت اور اس کے کاموں کی نوعیت بھی ہمیں نگاہ میں رکھنی چاہئے۔ حضرت خدیجہؓ خود ایک بڑی تاجر تھیں جو مضاربت میں اپنا مال دور دراز مقامات اور بیرونی ممالک میں بھیجا کرتی تھیں۔ اسی طرح مدینہ میں جو مارکٹ "سوق مدینہ" کے نام سے آپ نے قائم فرمایا جس کے بارے میں ارشاد نبوی ہے: الجالب الی سوقنا کالمجاهد فی سبیل الله جو شخص ہمارے اس بازار میں مال لے کر آئے وہ اسی طرح کے اجر کا مستحق ہوگا جس کا جہاد کرنے والا مجاہد مستحق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا مسلمانوں کی آزادی کی ضمانت فراہم کرتا ہے جو مسلمانوں کے بازار کو کامیاب بناتا ہے اور مسلمانوں کی معاشی آزادی کو یقینی بناتا ہے۔ اس میں جہاں مرد تاجر احباب کا نام آتا ہے وہیں خواتین کا ذکر بھی آتا ہے۔ ابن ماجہ کے کتاب التجارۃ میں اسماء بنت مخرمہ، خولہ بنت ثویب، ملیکہ ام صائب ابن الاقراء اور قیلہ النماریہ کے نام آئے ہیں۔ اسی طرح اس مارکیٹ کے محتسبوں میں جہاں مردوں کے نام آئے ہیں وہیں دو خواتین۔ ثمرہ بنت نحیک السعدیہ اور شفا بنت عبد اللہؓ کا ذکر موجود ہے، ثمرہ اپنے پاس ایک درہ بھی رکھتی تھی اور شفا بنت عبد اللہ حضرت عمرؓ کے دور میں بھی مارکٹ کی انسپکٹر میں کی حیثیت سے معروف ہیں۔

حضرت جابر بن عبد اللہؓ کی مطلقہ خالہ باغ میں جاکر کھجوریں جمع کرتی تھیں۔ اسی طرح ایک خاتون ام مبشر انصاریہ کے باغ کا تذکرہ بھی آتا ہے۔ حضرت زینبؓ اپنے ہاتھ سے مختلف چیزیں بنایا کرتی تھیں اسی طرح حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی بیوی بھی اپنے ہاتھ سے چیزیں بنا کر فروخت کرتی تھیں، اسی طرح گھریلو صنعت اور کام کاج کے واقعات بھی ملتے ہیں۔ اسماء بنت مخرمہ یمن سے آئے ہوئے عطر فروخت کرتی تھیں۔

غربت اور اس کا ازالہ

ایشین ایج اور دکن کرونیکل (۱۸ ستمبر ۲۰۰۷) کے شمارے میں ممتاز صحافی سوسن جیت گوہا کا مضمون گھر پر شاہدہ، کام پر شیامولی (Shahida Shyamoli at work,at home) نے کلکتہ کی ان بے شمار عورتوں اور مسلم خواتین کی کسمپرسی، بے چارگی اور لاچاری کا نقشہ کھینچا ہے جو ہندوؤں کے گھروں میں ملازمہ کی حیثیت سے کام کرتی ہیں۔ ملازمت کے لئے وہ اپنے مسلم ہونے کی شناخت یہاں تک کہ نام بدلنے اور اپنے حلیہ کی تبدیلی پر بھی مجبور ہیں۔

اسی طرح چند سال پہلے ممبئی کے شراب خانے اور اس میں ڈانس کلب کے بند کرنے کی قانونی کاروائی کی گئی تو معلوم ہوا کہ سینکڑوں مسلم لڑکیاں (Bar Girls) کی حیثیت سے وہاں کام کررہی تھیں۔ یہ لڑکیاں ممبئی کے مضافات امروت نگر، ممبرا اور ملاوَتی سے تعلق رکھتی تھی۔ تعلیم کی کمی اور گھر پر کوئی کمائی نہ کرنے والوں کی وجوہ سے یہ مسلم لڑکیاں باہر نکلیں اور اس کاروبار میں ملوث ہوئیں۔ حال یہ ہے کہ غربت کی وجہ سے جب یہ کلب بند ہوئے تو یہی لڑکیاں جسم فروشی پر اتر آئیں اور یہاں تک کہ وہ بنکاک، سنگاپور، لندن اور آسٹریلیا تک جانے کے لئے تیار ہوگئیں۔

سچر کمیٹی نے ایک جگہ واضح کیا ہے کہ ملک کے بڑے میٹرو شہروں کی جھونپڑیوں میں زیادہ تر لوگ مسلمان آباد ہیں ایک کمرہ کے مکان میں یہ اپنے پورے خاندان- بیوی، بچے اور رشتہ داروں کے ساتھ رہتے ہیں۔ ٹوائلٹ اور صاف پانی کا کوئی انتظام نہیں اور بنیادی ضروریات سے عاری ان لوگوں کی حالت زار قابل رحم ہے۔ اسی کے ساتھ مردوں کی شراب کی عادت سے بھی غریب مسلم خواتین پریشان ہیں۔

غربت جس کے بارے میں محسن انسانیت نے فرمایا تھا: کاد الفقر ان یکون کفرا۔

فقر و فاقہ عنقریب کفر تک پہنچا دے گا۔ اور اسی لئے آپ نے اللہ تعالیٰ سے خصوصی دعا کی فرمائی تھی:

اللّٰھم انی اعوذبک من الفقر والقلۃ والذلۃ۔ اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں، فقر، رزق کی کمی اور ذلت سے۔

واقعہ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ ہند کی اکثریت کی صورتحال بڑی تشویشناک ہے۔ غریب مسکین مسلمان اور مڈل کلاس کی نچلی سطح LowerMiddle Class کے خاندان غربت اور پسماندگی کا شکار ہیں خاص طور پر خواتین اور نوجوان لڑکیوں کی حالت زار پر فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ غربت، لاچارگی اور ملی جلی بستیوں میں رہنے کی وجہ سے اور تعلیم کی کمی اور ملت اسلامیہ کی ان کی طرف توجہ کی کمی کی وجہ سے وہ عیسائی مشنریوں، قادیانیوں اور زیر زمین گروہوں سے متاثر ہو کر نہ صرف اپنی عصمت وقت بلکہ دین سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔

اس صورتحال پر بڑی سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر کر کے عملی راہیں پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

بعض احباب نے مشورہ دیا ہے کہ ہر مسجد میں ایک NGO قائم کی جائے جس کا کام یہ ہو کہ اس کے اطراف کی آبادی کا سروے کرے اور مستحقین اور ضرورت مندوں کی فہرست تیار کی جائے اور اسی طرح صاحب ثروت وحیثیت مرد وخواتین کی لسٹ بھی اور ہر مسجد میں امداد مستحقین کے لئے ادارہ قائم کرے جو منصوبہ بند طریقوں سے زکوٰۃ اور اعانتیں وصول کر کے باقاعدگی کے ساتھ ایک جامع Data Bank تیار کر کے ایک غریبی دور کرنے کی مہم کا آغاز کرے اور ساتھ ہی ان کی اخلاقی تربیت اور تعلیمی ومالی لحاظ سے اونچا اٹھانے کی کوشش کرے۔

مائکروفینانس

موجودہ دور میں خواتین کی معاشی صورتحال کو بہتر بنانے کے لئے چھوٹے چھوٹے قرضوں کی فراہمی کا ایک نیا تجربہ کیا جارہا ہے اور مائکروفینانس کی یہ تحریک بنگلہ دیش کے ماہر معاشیات ڈاکٹر محمد یونس کے گرامین بینک کے تجربہ اور ان کو نوبل پرائز دیئے جانے کے بعد دنیا بھر میں اور خود ہمارے ملک میں کافی آگے بڑھا ہے۔

مائکروفینانس سوسائٹیاں ان غریبوں کو قرضہ دیتی ہیں جنہیں بینکوں سے قرضہ ضمانت کے نہ ہونے اور وہ قرضوں کی واپسی کے قابل نہیں ہوتے۔

اس کے بجائے انہیں گروپس کی شکل دے کر باہمی امداد کی صورت میں سیلف ہلپ گروپ Self Help Group بنا کر ان کی چھوٹی چھوٹی بچتوں (Seving) بھی جمع کی جاتی ہیں اور قرضوں کا ایک سلسلہ شروع کیا جاتا ہے۔ اس SHG میں خواتین پانچ یا دس کی تعداد میں ایک گروپ کی شکل میں قرضوں کی واپسی کی ذمہ دار قرار پاتی ہیں اور کسی ایک نے کوئی گڑبڑ کی تو پورا گروپ متاثر ہوتا ہے۔

چند سالوں سے ملک بھر میں اور خاص طور پر جنوبی ہندوستان میں مائکروفینانس نے کروڑوں لوگوں تک اپنی خدمات پیش کی ہیں۔

لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے اس سسٹم میں بڑی خرابیاں ہیں جس میں سب سے پہلے قرضوں پر سود کا ہے اور یہ سود بھی بینکوں کے سود سے بھی زیادہ۔ بیس تا پچاس فیصد تک بھی پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ زیادہ تر خواتین کے گروپس کو دیا جاتا ہے جو چھوٹے موٹے کاروبار، دستکاری اور گھریلو صنعتوں میں مشغول ہوتے ہیں اور ان خواتین کے لئے مائکروفینانس تربیتی پروگرامس بھی چلاتے ہیں جس میں کئی اچھی باتوں کے علاوہ چھوٹے خاندان کی ضرورت اور دیگر سیکولر تعلیمات بھی دیتی ہیں۔ اور یہ بھی دیکھا گیا کہ خواتین میں آزادروی اور اپنے خاوند اور خاندان سے بغاوت کے آثار بھی نمودار ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر عبیداللہ صاحب اسلامی مائکروفینانس پر ایک بین الاقوامی ماہر سمجھے جاتے ہیں ان کا خیال ہے کہ مائکروفینانس کی بنیاد نبی کریم کی وہ معروف حدیث ہے جس میں آپ نے صدقہ طلب کرنیوالے صحابی رسول کو اپنے اثاثہ۔ چادر اور برتن۔ کے نیلام کے ذریعہ کلہاڑی خریدنے کی ہدایت کی اور اپنے ہاتھوں سے اس کو دستہ لگایا۔ ان کی رہنمائی فرمائی اور خود کفیل بنایا۔

حالیہ دنوں میں کرناٹک کے کئی ڈسٹرکٹس مثلاً کولار، میسور، رام نگرم وغیرہ میں مسلم محلوں میں اس قسم کے پراجکٹس کو مسلم نوجوانوں اور تنظیموں نے سود کی حرمت اور دیگر غلط اثرات کے رونما ہونے کی وجہ سے اپنے قرضے واپس کرنے سے انکار کردیا اور مائکروفینانس کے کارندوں کو اپنے علاقوں کے اندر داخل ہونے سے روک دیا ہے۔ ان سوسائٹیوں کا کہنا ہے کہ کروڑوں روپیوں کے قرضہ جات کا بقایا ابھی موجود ہے۔

انڈونیشیاء، سوڈان، بنگلہ دیش اور دیگر ممالک میں اسلامی مائکروفائنانس کا آغاز ہو چکا ہے جن میں سود کے بغیر مرابحہ، مضاربہ اور مشارکہ کی بنیاد پر چھوٹے قرضوں کی اسکیم کامیابی کے ساتھ چلائے جارہے ہیں، ہمارے ملک کے قوانین میں بلاسودی قرضہ کی فراہم کی گنجائش کے مواقع نہیں ہیں اور

صرف کوآپریٹیو سوسائٹی ایکٹ میں اس کے لئے راہیں نکالی جاسکتی ہیں۔ اس سلسلہ میں الخیر کوآپریٹیو کریڈٹ سوسائٹی پٹنہ نے چند سالوں سے اس کا کامیاب تجربہ کیا ہے اور اب دہلی میں سہولت مائکرو فائنانس سوسائٹی کے نام سے پورے ملک میں اس کی شاخیں کھولنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔

ہمیں اسلامی مائکرو فینانس کو ملک میں روبعمل لانے کی ضرورت ہے جس سے سود سے اجتناب کے علاوہ پورے خاندان کو پیش نظر رکھ کرنہ کہ صرف خواتین کو فوکس کر کے کام کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

تجارت چاہے بڑی ہو یا چھوٹی اس میں بڑی برکت ہے اس کی طرف بھی خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

افزائش مال کے لئے حکومتی منصوبے ہوں یا انفرادی و اجتماعی۔ چھوٹے یا بڑے کاروبار کے فروغ و ترقی کی بات ہو پورے نظام معیشت و مالیات میں سود کا عنصر ملت اسلامیہ ہند کے لئے ایک بڑی رکاوٹ ثابت ہورہی ہے ہمارے معاشرہ میں دو قسم کے رجحان و عمل پائے جاتے ہیں۔ ایک بڑا طبقہ سود کی شدید حرمت کی وجہ سے تجارت کے میدان سے الگ تھلگ ہو کر زندگی کے معاشی دوڑ اور تکوین ثروت کی دوڑ سے فرار کی راہ اختیار کرتا ہے تا کہ دنیا کا نقصان تو برداشت کرلے لیکن اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے قرآنی حکم سے اپنے آپ کو بچائے اور آخرت کو برباد نہ کرے۔ دوسری طرف کاروباری طبقہ اس حرمت سے بے نیاز ہو کر اس دوڑ میں آگے بڑھ رہا ہے اس میں وہ طبقہ بھی ہے جو دین دار ہے، نماز، روزہ، صدقات و حج کی پابندی بھی کرتا ہے لیکن معاملات دنیا میں وہ مغرب کی پیروی میں قباحت محسوس نہیں کرتا۔

خوش قسمتی سے ۲۰۰۸ کے مالیاتی کساد بازاری Financial Metltdor نے جدید مالیاتی نظام کی ناکامی کو اجاگر کر دیا ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی مالیات و بنکاری کے اس بحران سے متاثر نہ ہونے اور اس کی شرح نمو پندرہ فیصد سے زیادہ ہونے کی وجہ سے الحمد للہ بلاسودی اسلامی مالیات و بنکاری ایک متبادل (alternative) کی حیثیت سے ابھر کر آرہا ہے۔ نہ صرف مسلم ممالک بلکہ جدید صنعتی اور سیکولر حکومتیں مثلاً برطانیہ، فرانس، ہانگ کانگ، جاپان، سنگاپور، اور کنیڈا نے بھی اپنے بنکاری کے قوانین میں ترمیم/تبدیلی کر کے بلاسودی اسلامی مالیات و بنکاری کے لئے راہیں فراہم کر دی ہیں اس سلسلہ میں ہمارے ملک میں بھی اس کی کوششیں جاری ہیں کہ یہاں بھی بلاسودی اسلامی معیشت و مالیات کا آغاز ہوتا کہ اس سے ملک کے تمام شہری مستفید ہوسکیں اور خاص طور پر مسلمان۔ مرد و خواتین اور پسماندہ طبقات اس کے ذریعہ تجارت، صنعت و حرفت اور معاش کی دوڑ میں حصہ لے کر تکوین ثروت اور افزائش مال میں بھرپور حصہ لے سکیں۔

سیاسی عمل اور حکمرانی میں حصہ داری

سچر کمیٹی کی رپورٹ میں یہ بات بڑی وضاحت کے ساتھ کہی گئی اور یہ حقیقت پر مبنی ہے کہ تعلیم و ہنرمندی میں آگے بڑھنا ہو یا مائکرو فینانس اور تجارتی میدان میں پیش رفت کرنی ہو یا کسی بھی معاشی و معاشرتی پروگرام میں موثر کردار ادا کرنا ہو اس میں ایک سبب بطور خاص مقامی سطح پر مسلمانوں کی سیاسی عمل اور حکمرانی کے عمل میں شرکت لازمی ہے اور آج تقریباً تمام اجتماعی معاملات میں مسلمانوں کی ۔ مرد اور خواتین دونوں کی ۔ شرکت بہت کم ہے۔

ان کی جمہوری سرگرمیوں اور فیصلہ سازی کے عمل میں حصہ داری میں اضافہ کرنا بہت ضروری ہے خاص طور پر خواتین کے ریزرویشن جو بہار وغیرہ میں پچاس فیصد اور دوسری ریاستوں میں ایک تہائی کے فیصلہ پر ہمیں سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے جس کے دور رس اثرات مسلم خواتین کے سماجی، معاشی اور معاشرتی حالات پر مرتب ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ ہمارا ناصر و مددگار ہو اور اسی سے ہم صحیح رہنمائی کی توفیق کے طالب ہیں۔

غیر باضابطہ زمرے میں گزر بسر کے معاملات سے متعلق سسٹمز پر مبنی طریق کار

مایا آرگینک کی کوششیں اس تصور پر مبنی ہیں کہ غریبوں کے فروغ سے متعلق موجودہ ماڈل خالصتاً علامتی نوعیت کے ہیں اور عموماً سرمائے اور تربیت تک رسائی جیسے امور پر علاحدگی میں، اور ایک وسیع تر سیاق میں ان کی معنویت پر نگاہ ڈالے بغیر غور کرتے ہیں۔ یہ ماڈل تیز رفتاری سے بازار پر مبنی ہو جانے والی معیشت جس کے تحت تجارتی ساختوں کی تشکیل نو عمل میں آرہی ہے کی پیچیدگی اور غریبوں پر پڑنے والے اس کے اثرات کی فہم سے بھی محروم ہے۔ مایا آرگینک ایک ایسی ایجاد پسندانہ ادارہ جاتی ساخت کی ضرورت محسوس کرتی ہے جو بازار کی حقیقتوں کے پیش نظر صلاحیتوں کو فروغ دینے کے کلیدی

معاملے پر انفرادی اور تنظیمی دونوں سطحوں پر غور کر سکے۔ ان صلاحیتوں میں بازار کے ہر لحہ تبدیلی ہوتے ہوئے منظر نامے میں زندہ رہنے اور لچک دار رویہ اختیار کرنے کے گر سیکھنے کی کوششیں شامل ہوں گی۔ یہ ادارہ جاتی ساخت کام کرنے والے غریبوں کی ایک اجتماعی تشکیل ہے۔ اجتماعیت سازی کی یہ کوشش، اشیاء اور خدمات کی پیداوار کے مقصد کے لئے کام کرنے والے غیر منظم زمرے کے کارکنوں کے گروپوں کی تشکیل کے ذریعے کی جاتی ہے۔

اجتماعیت سازی، صنعت کاری کو کام کرنے والے غریبوں کے فروغ کا ماڈل سمجھنے کی معروف کوتاہیوں کے پیش نظر ضروری ہے۔ 'مایا' زمروں پر مبنی طرز عمل اختیار کرتے ہوئے مخصوص زمروں میں کارکنوں کی اجتماعی ساختیں تشکیل دیتی ہے جو پیداواری اور تجارتی اکائیوں کی طرح کام کرتی ہیں۔ ایسا کرنا ہر تجارتی زمرے کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ تاہم ہر اجتماعی ساخت دیگر اجتماعی ساختوں سے قوت حاصل کرتی ہے جس سے مختلف زمروں کو ایک دوسرے سے سیکھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان اجتماعی ساختوں کو ایک مضبوط تنظیم کی چھتر چھایا بھی فراہم کی جاتی ہے تاکہ وہ بازار کے ساتھ اپنی شرائط پر معاملہ کر سکیں۔ اس عمومی تنظیم اور مایا آرگینک کے ساتھ ان اجتماعی ساختوں کی وابستگی ایک لیبل اور برانڈ بھی تشکیل دیتی ہے۔ یہ برانڈ اب تک کے اس خیال کو تبدیل کر رہا ہے کہ غیر منظم زمرے کی مصنوعات اور خدمات گھٹیا معیار اور گھٹیا قدر و قیمت کی ہوتی ہیں۔ اس کوشش کے تحت پیداواری اجتماعی ساختوں کے ذریعے اعلا معیار کی مصنوعات اور خدمات فراہم کی جاتی ہیں جس سے غیر منظم زمرے کے کارکنوں کا وقار بھی بڑھتا ہے۔

'مایا' ان دنوں بنگلور کے دیہی اور شہری علاقوں میں ملبوسات، لاکھ کے سامان، لکڑی اور دھات کے کام کے زمروں میں غریب کارکنوں کے آزاد اجتماعی کاروباروں کو فروغ دے رہی ہے۔ یہ مارکیٹنگ، مصنوعات کی ڈیزائننگ اور تیاری اور کارکنوں کی صلاحیتوں کو فروغ دینے کے اہم دائروں میں مدد فراہم کرتی ہے۔ ان زمروں میں 'مایا' کھلونوں اور ان سے متعلق سامان، ملبوسات اور لکڑی و دھات کے فرنیچر کے شعبوں میں خود اپنی مصنوعات تیار کر رہی ہے۔ یہ ملبوسات کا کام دوسروں سے کرانے کے معاملے میں باضابطہ زمرے کی صنعتوں کے لئے خدمات بھی فراہم کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ معیار، ڈیزائن اور مصنوعات کی تراشیدگی سے متعلق بازار کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کی تکمیل کے اقدامات بھی کئے جا رہے ہیں۔

تعمیرات کے شعبے میں کارکنوں کو منظم کرنے اور فروغ دینے کے سلسلے میں بھی یہی طریقہ استعمال کرنے کی کوشش لیبرنیٹ کی تشکیل کے ذریعے کی جارہی ہے جس کا مقصد تعمیراتی خدمات کے شعبے میں اجتماعی ساختیں تشکیل دینا ہے۔ لیبرنیٹ کے تحت مختلف کام کرنے والے تعمیراتی کارکنوں کو رجسٹر کر کے بنگلور شہر سے متعلق ایک ڈیٹا بیس تشکیل دیا گیا ہے جسے بلڈر اور ٹھیکیدار حسب ضرورت استعمال کر سکتے ہیں۔ اسکے ذریعے ذیلی ٹھیکیداری کے معاملات طے کرنے، تربیت کا نظام قائم کرنے اور کارکنوں کو سماجی تحفظ کے فوائد فراہم کرنے کی بنیاد فراہم ہوتی ہے۔ اس کے تحت کام کے دوران حفاظت کے بندوبست اور تعمیراتی فرموں کے اشتراک سے کام کے دوران مہارتوں کو فروغ دینے کے معاملات پر غور کیا جاتا ہے۔

اس کوشش کو انجام دینے والے نظام کے دو حصے ہیں۔ ایم او ایس ایس (مایا آرگینک سپورٹ سروسیز) ایم اے وائی اے کی مارکیٹنگ تنظیم ہے جو بازاروں کے ساتھ رابطہ کرتی ہے، آرڈر حاصل کرتی ہے اور برانڈ سازی کی سرگرمیاں انجام دیتی ہے۔ یہ تمام زمروں کو باہم مربوط بھی کرتی ہے۔ سیکٹر ڈیولپمنٹ اکائیاں ہر زمرے میں کارکنوں کی زیر ملکیت اجتماعی ساختیں تشکیل دینے کے لئے ضروری معلومات فراہم کرتی ہیں۔ اس معلومات کا تعلق پیداوار، مہارتوں اور تجارتی صلاحیتوں اور ممبروں کو فلاحی فوائد فراہم کرنے سے ہے۔ 'مایا' کا طریق کار خاصا متنوع ہے جس کے تحت عملی سوجھ بوجھ کے ساتھ اقدامات کئے جاتے ہیں تاکہ اس کوشش کی وسعت اور پہنچ کو فروغ دیتے ہوئے مصنوعات اور خدمات کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا جاتا رہے۔ کوئی بھی موجودہ قانونی نظام اس کوشش کے لئے موزوں نہیں ہے مگر پھر بھی خود امدادی گروپوں کے نظام کی مدد لی جاتی ہے لیکن زیادہ کارگر طریقے سے۔ تجارتی سرگرمیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے وسائل اور زائد رقوم کو اس سیکٹر کو فروغ دینے، نئی اجتماعی ساختیں تشکیل دینے اور ممبروں کو سماجی تحفظ کے فوائد فراہم کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے

(سچر کمیٹی رپورٹ)۔

☆☆☆

خواتین کا استحصال...... مغربی دنیا کے خصوصی حوالے سے

ڈاکٹر سید اسلام الدین مجاہد

خواتین کا استحصال اکیسویں صدی کے اس تہذیب یافتہ اور ترقی یافتہ دور میں ایک معلوم حقیقت بن چکا ہے۔ نت نئے نعروں کے ذریعے دنیا کے تقریباً ہر خطے اور قوم میں عورت کی مظلومیت ایک کھلا راز بن چکی ہے۔ قدیم دور کا یونان ہو کہ مصر، عراق ہو کہ چین یا جدید دور کا یورپ ہو کہ ایشیاء، امریکہ ہو کہ فرانس ہر جگہ عورت کے حقوق پر دست درازی اور ان کی عزت وعفت پر ڈاکے ڈالنے کے بے شمار واقعات تقریباً ہر دن دہرائے جاتے ہیں۔ دور جدید میں جب کہ مغربی دنیا انسانی حقوق کے چمپین کی حیثیت سے اپنے آپ کو دنیا کی دیگر اقوام سے منوانا چاہتی ہے لیکن یہی مغربی تہذیب کے علمبردار جنہوں نے تحریک آزادی نسواں کا نعرہ دے کر دنیا کو یہ فریب دیا کہ وہ عورت کو مرد کی غلامی سے نجات دلا کر اور سوسائٹی میں انہیں باوقار مقام عطا کر کے انہیں اعلیٰ حیثیت دینا چاہتے ہیں۔ لیکن عملاً مغربی دنیا نے عورت کو ذلت اور پستی کی گہرائیوں میں پہنچا دیا۔ اس نے ہر مرحلہ پر عورتوں کے حقوق کا استحصال کیا۔ مغربی تہذیب کے متوالوں نے جدیدیت اور ماڈرنزم (Modernism) بلکہ الٹرا ماڈرنزم (Modernism-Ultra) کے نام پر عورت کو مرد کے ہاتھوں کا کھلونا بنا دیا۔ وہ عورت کے جسمانی حسن کی نمائش سے اپنی تجارت کو چمکانے کے سارے سامان کرتا رہا۔ عورتوں کے مقابلہ حسن کے پردے میں عورت کا جنسی استحصال کرنا اب کوئی غیر معمولی بات نہیں رہی۔ فیشن، جدیدیت اور ترقی کے دلفریب نعروں سے عورت ایسی مسحور اور مرعوب ہوئی کہ وہ اسے اپنی آزادی سمجھتی رہی لیکن یہ نہ سمجھی کہ حقوق نسواں اور مساوات مرد وزن کا نعرہ عورت کے استحصال میں مغرب کا ایک خوشنما ہتھیار رہا۔

دور جاہلیت کے انتہائی تاریک پہلو میں بھی روشنی کی ایک ہلکی سی کرن یہ تھی کہ ظالم بھی سمجھتا تھا کہ وہ ظلم کر رہا ہے اور انصاف پسند لوگ بھی اس ظلم وستم کے خلاف احتجاج کر سکتے تھے اور ظالموں کو جبر وتشدد سے روک سکتے تھے۔ مگر اس وقت مغربی دنیا نے جو ظلم وستم کے مکروہ چہرے پر عدل وانصاف کا غلاف چڑھا دیا ہے اور جبر وتشدد کو آرٹ، فن اور فیشن کی حیثیت دے دی ہے اس سے مظلوم کو بھی اس بات کا احساس نہیں کہ وہ تختۂ مشق ستم بنا ہوا ہے۔ مغربی تہذیب سے متاثر اور مرعوب ہونے والی خواتین کا حال یہ ہے کہ آزادی کے نام پر غلامی کی سنہری زنجیروں میں انہیں جکڑا جا رہا ہے۔ لیکن وہ اس غفلت کا شکار ہیں کہ انہیں آزادی اور مساوات کی نہ ختم ہونے والی لذتیں مل رہی ہیں۔ اس نام نہاد آزادی کو حاصل کرنے کی خواہش میں خواتین پہلے تو اپنی شرم وحیا کو خیر باد کہہ دیتی ہیں۔ اس کے بعد ان کا شیشۂ عصمت بھی چکنا چور ہو جاتا ہے۔ پھر نہ والدین ان کو اپنے گھر میں رکھنا پسند کرتے ہیں اور نہ وہ انہیں سہارا دینے کے لئے تیار ہوتے ہیں جن کے دامنِ فریب میں پھنس کر ان کا دامن عصمت تار تار ہو چکا ہوتا ہے۔

مغربی دنیا اور اس کی تہذیب کے پرستاروں نے عورت کو آزادی، مساوات اور برابری کے حقوق دلانے کے بلند وبانگ دعوے، پُرفریب نعرے اور دلفریب نظریے تو گھڑ لئے اور خواتین کو ورغلانے کے مختلف ہتھکنڈے بھی استعمال کر لیے لیکن کیا اصولاً یا پھر عملاً خواتین کو ان کے جائز حقوق مل پاتے ہیں؟ کیا عورت کے وجود کو اس کی اصل حیثیت کے ساتھ مغرب تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے؟ اور کیا اب تک واقعی اس کی عزت وآبرو، جان ومال اور جسم وروح کی حفاظت کا کسی نے ذمہ لیا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ عورتوں کی آزادی اور حقوق کی بحالی کے نعروں کے بیچ عورت کا استحصال بھی پورے شد ومد کے ساتھ جاری ہے۔ مملکت کے قوانین اور سماجی اصولوں کے ہوتے ہوئے عورت پر ظلم وجبر کا سلسلہ رکا نہیں۔ حقوق نسواں کے لئے یوں تو بہت سارے قوانین مرتب کر لیے گئے مگر معاشرے میں عورت کو اب تک اس کے اصل اور جائز حقوق سے عملی طور پر محروم رکھا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ جیسے ہی عورت معاشی آزادی حاصل کر لیتی ہے اس کی دنیا بدل جاتی ہے، اس کی پوزیشن میں غیر معمولی تبدیلی آجاتی ہے۔ اسے کوئی حقیر اور کمتر نہیں سمجھتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہیں سے اس کا استحصال شروع ہو جاتا ہے۔ عالمی پیمانے پر ہوئی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی عورت کو برابر کے حقوق دینے میں ترقی یافتہ ممالک جیسے یورپ اور امریکہ کافی پیچھے ہیں۔ آج بھی مغرب میں عورت کا وجود، اس کی شخصیت اور اس کی حیثیت، سب کچھ اس پر منحصر ہے کہ وہ کب تک اور کس حد تک مردوں کا دل بہلانے کا سامان کر سکتی ہے۔ اس کے جسم کی نمائش سے ہی اس کی ترقی کو جوڑا جاتا ہے اور آزادی کے نام پر اس کا بدترین

استحصال کیا جاتا ہے اور عورت اندھی، گونگی اور بہری بن کر اس بدترین کھلواڑ کو نہ صرف برداشت کرتی ہے بلکہ مردوں کے شانہ بہ شانہ چلتی ہوئی ان کی پُرزور معاونت بھی کرتی ہے تاکہ دنیا کی نظر میں وہ ''آزاد خیال'' کہلائے۔ لوگ اس کی تعریف کریں اور اس کو ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ Libarated Women کہیں۔ چنانچہ عورت کی خواہی نہ خواہی رضامندی کے نتیجے میں، خواتین کو عریاں کر کے سر بازار لانے کے اور بھی کئی ذرائع موجودہ دور میں ایجاد ہو گئے ہیں۔ یہ ''مظاہرہ حسن''، یہ سینما اور ٹی وی کے پردوں پر ان کے جسم کی نمائش ہی کیا کم تھی کہ اب انفارمیشن ٹکنالوجی کی برق رفتار ترقی نے عورت کی رہی سہی عزت عفت کو بھی داؤ پر لگا دیا ہے۔ فحش میگزینس اور کتابوں میں عورتوں کی عریاں تصویروں کے بعد اب موبائل فون اور انٹرنیٹ کے علاوہ دیگر ذرائع کے استحصال نے عورت کے وقار اور اس کے مقام کو سربازار اور نیلام کر دیا۔ مغربی دنیا نے خواتین کو زیادہ سے زیادہ با اختیار بنانے (Empowerment of Women) کا نعرہ لگا کر بھی انہیں اپنا فریفتہ بنالیا۔ چنانچہ اسے آہستہ آہستہ معاشی، سیاسی، معاشرتی اور سماجی امور میں مرد کے برابر عورت کو لا کھڑا کرنے کی حکمت عملی اختیار کی گئی۔ اور اس تصور کو عام کیا گیا کہ عورت کا وجود ہر شعبہ حیات کی ترقی میں لازم و ملزوم ہے اور یہ پروپگنڈا بھی زور و شور سے کیا گیا کہ عورت کے بغیر زندگی بے کیف اور بے لطف ہے۔ عورت نے مغربی دنیا کی اس نظر التفات کو اسے ترقی کی طرف پیش رفت سمجھا اور ایک قدم کے بعد دوسرا قدم اٹھانے کے لئے بے چین اور مضطرب رہنے لگی۔ وہ اس کے ظاہری حسن پر اپنا دل دے بیٹھی اور اس کے بطن میں چھپی ہوئی خرابیوں کو نہ دیکھ سکی۔ چنانچہ عورت کی اس بے قید آزادی نے مغرب کی پوری زندگی کو ایک ایسے راستے پر ڈال دیا جو تباہی و بربادی کا راستہ ہی کہلایا جا سکتا ہے اور اس کے گھناؤنے اور خطرناک نتائج آج دنیا اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔ اس کے کڑوے کسیلے پھل چکھنے پر بھی مجبور ہے۔ خاندانی نظام کی تباہی، اباحیت کا بڑھتا ہوا طوفان، جنسی بے راہ روی اور مقدس رشتوں کے احترام کا ختم ہو جانا یہ سب دراصل اسی مغربی دنیا کی دین ہیں جس کی ظاہری چمک دمک کو دیکھ کر مشرق کی خواتین اور دختران ملت بھی اس طرف سرپٹ دوڑ رہی ہیں۔ مغرب کی غلاظت کو خوشبو اور گندگی کو چشمہ صافی سمجھ کر اس کی طرف ولولہ وار لپکنا مشرقی تہذیب کی شانِ امتیاز بن چکی ہے، حالانکہ مغربی دنیا نے خود اس کی عورتوں کو رسوائیوں اور تباہیوں سے دوچار کر دیا ہے۔ مغرب کی نیک فطرت خواتین، جنہیں مغربی دنیا نے اپنی شہوانی جذبات کے ہاتھوں کھلونا بنا رکھا ہے۔ اس پر وہ سراپا احتجاج ہیں۔ وہ عزت و وقار اور پاکیزگی کی زندگی کی متلاشی ہیں۔

مغربی دنیا کے خصوصی حوالے سے اگر خواتین کے استحصال پر ایک طائرانہ نظر ہی ڈالی جائے تو یہی تلخ حقیقت سامنے آتی ہے کہ موجودہ دور میں مغربی تہذیب کی گرفت بتدریج ساری دنیا میں مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ مغرب کی تقلید کی دوڑ میں شامل ہو کر دنیا کے مختلف علاقوں کی خواتین بظاہر خوش اور مطمئن نظر آتی ہیں، لیکن ان کا یہ خوشی اور اطمینان کا دور بہت مختصر ہوتا ہے اور پھر انہیں اس بات کا احساس ہونے لگتا ہے کہ ان کی زندگی کی ڈگر سیدھے راستے پر نہیں ہے، لیکن یہ جھوٹا اطمینان اور خوش فہمی جو اگرچہ کہ وقتی اور مختصر تھی اپنے دیرپا اثرات دکھا جاتی ہے جس کا خمیازہ آنے والی نسلوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ خاندان کا بکھر جانا، اولاد میں بغاوت کے جذبات کا امڈ آنا، معاشرے سے خیر خواہی اور ایک دوسرے سے محبت کے جذبات کا عنقا ہو جانا یہ سب اس مغربی تہذیب کو اپنانے کا نتیجہ ہے۔

بیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے دنیا نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اب مغرب میں خاندان کا نظام جو تمدن کا سنگ بنیاد ہے، بری طرح منتشر ہو رہا ہے۔ گھر کی زندگی، جس کے سکون پر انسان کی قوت کارکردگی کی نشو و نما کا انحصار ہے عملاً ختم ہو رہی ہے۔ نکاح کا رشتہ، تار عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہو گیا ہے۔ یہ سارے بھیانک مسائل محض اس لئے پیدا ہوئے کہ عورت کو فطری مشاغل سے نکال کر شمع محفل بنا دیا گیا ہے۔ آج عورت میں ہر وقت ''ہل من مزید'' کی کیفیت پائی جا رہی ہے۔ کیونکہ مغرب نے عورت کے جذبات میں جو آگ لگائی ہے وہ حسن کی بے حجابی پر بجھتی نہیں بلکہ اور زیادہ بھڑکتی ہے اور مزید بے حجابی کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ برہنہ تصویریں، یہ صنفی لٹریچر، یہ عشق و محبت کے افسانے یہ جذبات کو برانگیختہ کرنے والے ناچ اور گانے سب اس آگ کو بھڑکانے کا ذریعہ ہیں جس سے نسل انسانی کی تباہی کے در کھلتے ہیں لیکن مغربی دنیا نے فحاشی اور عریانی کے ان سارے مظاہروں کو ''آرٹ'' کا خوشنما نام دے رکھا ہے۔

مغربی تہذیب کی مرعوبیت اور دہشت زدگی نے دراصل مشرقی عورت کو مایوس، رنجیدہ اور شکست خوردہ کر دیا ہے۔ اس تہذیب پر ایمان بالغیب لانا اور اپنی زندگی میں اس تہذیب کو اپنا روشن خیالی تصور کی جانے لگی۔ مغربی تہذیب پر تنقید کو دقیانوسیت اور کم علمی سے تعبیر کیا جانے لگا۔ آج صورتحال یہ ہے کہ آزادی کے نام پر عورت ہر بندش کو توڑنے اور ہر قانون کی خلاف ورزی کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ اس کے نتیجے میں پورے اجتماعی نظام میں ہر طرف

بغاوت کا جذبہ پروان چڑھتا جارہا ہے۔ مغرب نے عورت کو بطور ایک آلہ کے استعمال کر کے سماج کے اخلاقی اور مذہبی ضابطوں کی دھجیاں اڑادیں۔ آج سر بازار ایک نوجوان لڑکی یہ سوال کرتی ہے کہ نکاح کے بغیر اگر کوئی کسی سے محبت کرے تو کیا بگڑ جاتا ہے؟ اور پھر یہ سوال بھی معاشرے میں گردش کرتا ہے کہ آیا شادی کے بغیر بھی ماں بننے میں کیا قباحت ہے؟ خود مسلمانوں کے بعض ذمہ دار حضرات کے دل ودماغ پر مغرب کا اثر اتنا پڑ چکا ہے کہ وہ کہنے لگتے ہیں کہ اسلامی شریعت جن حالات میں نازل ہوئی تھی وہ حالات بدل چکے ہیں اور بدلے ہوئے حالات میں صدیوں پرانے اصول اور روایات پر اصرار صحیح نہیں ہے۔ ان کے خیال کے مطابق اسلام نے عورت کے بارے میں جو موقف اختیار کیا ہے اس پر قائم رہتے ہوئے موجودہ مسابقت میں وہ شریک نہیں ہوسکتیں اس لئے اسلامی قوانین میں ترمیم کر کے انہیں موجودہ دور سے ہم آہنگ کیا جائے۔ ان حضرات کے نزدیک یہ "اجتہاد" ہے اور بدلے ہوئے حالات میں "اجتہاد" ضروری ہے۔ مسلمانوں کے ہی بعض طبقے بڑی معصومیت سے کہتے ہیں کہ اسلام ایک جدید مذہب ہے۔ اس نے عورت کو دور جدید کے سارے حقوق دیے ہیں لیکن قدامت پرستوں نے قرآن وحدیث کی تعبیر اس طرح کی ہے کہ دور غلامی کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ اس لئے اسلام کی جدید اور ترقی پسندانہ تعبیر کی ضرورت ہے۔ یہ خیالات عام مسلمانوں کے نہیں بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ہیں جو دنیا کی نظر میں دانشور اور اسکالر کہلاتے ہیں۔ مغرب سے مرعوبیت یا اس کی ذہنی غلامی کی یہ ایک دو مثالیں ہیں ایسی بیسیوں باتیں ہم ہر نازک وقت پر مختلف گوشوں سے سنتے آئے ہیں۔

مغرب، جو حقوق نسواں کا سب سے بڑا علمبردار ہے اس نے عورت کا جس بیدردانہ انداز میں استحصال کیا ہے اس حالت زار کا اندازہ چند ناقابل تردید حقائق سے بھی بخوبی ہوجاتا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق امریکہ میں ہر سال اندازاً ۴۰ لاکھ خواتین، خاندان کے مردوں اور دوستوں کے ہاتھوں مار پیٹ کا نشانہ بنتی ہیں۔ اوسطاً سالانہ ۲۵ لاکھ خواتین پر جنسی حملے کئے جاتے ہیں۔ امریکہ کے ۷۵ فیصد شادی شدہ مرد اور عورتیں اپنی شریک حیات سے بے وفائی کرتے ہیں اور دوسروں سے ناجائز تعلقات استوار کرتے ہیں۔ ہم جنس پرستی کی لعنت میں مغربی اقوام کی ایک بہت بڑی تعداد ملوث ہے۔ تصویر کا یہ بھی ایک الم ناک پہلو ہے کہ مغرب اس ذلت اور پستی سے اپنی خواتین کو نکالنے کے بجائے دنیا بھر کی خواتین خصوصاً مشرقی خواتین کو بھی اس حالت میں ڈھکیلنا چاہتا ہے۔ چنانچہ "عالمی تحفظ حقوق نسواں کانفرنسوں" کے ذریعے یہ مطالبات پیش کئے گئے کہ دنیا بھر کی خواتین کو ضبط تولید کی آزادی ملنی چاہئے۔ خواتین کو اسقاط حمل کی آزادی حاصل ہونی چاہئے۔ خواتین کو ہم جنس پرستی اور عورت سے عورت کی شادی کا قانون بنانا چاہئے۔ نکاح کے بغیر بے حجابانہ آزادی، جسمانی تعلقات کی آزادی ملنی چاہئے۔ مغرب اپنے ان جارحانہ اقدامات کے ذریعے دنیا بھر میں اباحیت پسند معاشرہ تشکیل دینا چاہتا ہے۔ عالمی مقابلہ حسن کا سالانہ انعقاد بھی مغربی تہذیب کا ایک ہتھکنڈہ ہے۔

مغرب میں ہونے والے اس استحصال سے سبق لینے کی بجائے مشرقی خواتین بھی مغرب کے ہتھکنڈوں کا شکار ہوتی جارہی ہیں۔ خود ہمارا ملک ہندوستان بھی مشرقی روایات کو پس پشت ڈال کر مغرب کی بھونڈی تقلید میں دوسروں کو پیچھے چھوڑ کر خود تباہی کے گڑھے کی طرف دوڑا جارہا ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں لگاتار کئی سال ہندوستانی دوشیزاؤں کو حسینہ عالم اور حسینہ کائنات کے تاج پہنائے گئے جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ مغرب کی نگاہیں مشرق کی طرف گڑی ہوئی ہیں۔ مغرب کی اس اندھی تقلید کو حرز جاں بنانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے ملک میں بھی خواتین کی حالت میں سدھار ہونے کے بجائے زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ خواتین کے خلاف جرائم کی شرح روز افزوں بڑھتی چلی گئی۔ کہنے کو تو دستوری طور پر عورتوں کے بہت سارے حقوق گنائے گئے لیکن عورت پر مظالم کا ایک نیا باب تقریباً ہر روز اس سرزمین پر کھلتا ہے۔ ایک سروے کے مطابق ہندوستان میں ہر ۵۴ منٹ میں ایک عورت کی عصمت دری ہوتی ہے۔ ہر ۲۶ منٹ پر ایک آبروریزی کا واقعہ ہوتا ہے۔ ہر ۴۲ منٹ پر ایک دلہن جلائی جاتی ہے اور ہر ۳۳ منٹ پر ظلم کا ایک گھناؤنا واقعہ پیش آتا ہے۔ (State of World Population Report 1997-Ref) اس رپورٹ کے مطابق بیویوں کی پٹائی کے واقعات بھی عام ہوتے جارہے ہیں۔ معاشرہ کی بے رحمی دیکھیے کہ معصوم بچوں اور بچیوں کو جنسی کاروبار Child Prostitute کو فروغ دیا جارہا ہے۔

نابالغ بچیاں کوٹھوں (Brothels) میں قید کرلی جاتی ہیں تاکہ ان کے ذریعے جنسی کاروبار زوروں پر چل سکے۔ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالنے کا قدیم رواج آج بھی موجود ہے بلکہ اب تو جدید ترین ٹیکنک الٹرا ساؤنڈ (Ultra Sound) کے ذریعہ رحم مادر میں پل رہی بچی کو پیدائش سے پہلے ہی موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ عورت کو سامانِ تجارت بنانے کا ایک بڑا ذریعہ جسم فروشی Flesh Trade ہے اس کے ذریعہ سے مرد کروڑوں روپیوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ ہندوستانی معاشرے میں بھی عورت کو آزادی کا لالچ دے کر اسے جس ذلت سے دو چار کیا جارہا ہے یہ سب مغربی

تہذیب کو گلے لگانے کا نتیجہ ہے۔ حقوق نسواں کے مراکز اور ناری نکیتن جو ملک میں خواتین کی فلاح و بہبود کے لئے کام کر رہی ہیں عورتوں پر ظلم کے خلاف مظاہرے کر کے عوامی شعور بیدار کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ خواتین کی مختلف تنظیمیں اور انسانی حقوق کے تحفظ سے متعلق ادارے بھی خواتین پر ظلم کے خلاف ایک لگاتار جنگ چھیڑنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اس میں کامیابی اس لئے نہیں مل پا رہی ہے کہ خود خواتین میں اپنے حقوق کے تئیں صحیح شعور پیدا نہیں ہوا ہے۔ وہ استحصال کو آزادی سمجھنے لگی ہیں۔ اس لئے مختلف انداز سے عورتوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ جنسی حملوں سے لے کر زنا کاری، ستی اور جبر کے لئے عورتوں کو مار ڈالنے کی وارداتیں ہر روز اخبارات کی زینت بنتی ہیں۔ روپ کنور کا ستی کیس ہو کہ وما چودھری کو زندہ جلانے کا واقعہ، ایسے موقعوں پر مختلف ذرائع ابلاغ کے توسط سے عورتوں کے مسائل پر بڑے زور و شور سے آوازیں اٹھتی ہیں۔ لیکن بدبختانہ واقعات کے چند دن بعد ہی یہ آوازیں اٹھ کر یا تو پھر دب جاتی ہیں یا پھر سیاسی رنگ اختیار کر لینے کے بعد پروپگنڈا تو خوب ہوتا ہے مگر مسائل کا ازالہ ہوتا نظر نہیں آتا۔

جس طرح ہندوستانی سماج نے مغرب کی اندھی تقلید کو اپنا وطیرہ بنالیا اس سے مسلم معاشرہ بھی مبرا نہیں ہے۔ آج مسلم معاشرے میں خواتین کو جو مقام دیا گیا اس پر ایک سوالیہ نشان لگا ہوا ہے۔ اپنی نادانی کی وجہ سے مسلم خواتین بھی اس مغربی تہذیب کی اسیر ہوتی جا رہی ہیں جسے اہل ملک کی خواتین نے اپنا کر اپنا کوئی وقار باقی نہیں رکھا۔ یہ عجیب المیہ ہے کہ جو برائیاں اور جو خرابیاں ہندوستانی خواتین میں سرایت کر چکی ہیں، مسلم خواتین کی بھی کم و بیش یہی صورتحال ہے۔ دنیا کے رخ پر چلنے کے شوق نے مسلم خواتین سے ان کا وہ زیور حیا چھین لیا جو ان کی شانِ امتیازی تھا۔ دین سے دوری اور تعلیمی بیزاری کی وجہ سے مسلم لڑکیاں اسلام دشمن عناصر کے ہاتھوں لگ جاتی ہیں اور پھر اسلام کے خلاف ان کے بیانات نمایاں انداز میں میڈیا میں اچھالے جاتے ہیں۔

میڈیا کے جھوٹے پروپگنڈے سے متاثر ہو کر ان کا Mind set بدل جاتا ہے۔ اسلام دشمن اور مسلم دشمن طاقتیں مظلوم مسلم عورتوں کی شناخت کر کے ان سے ہمدردی کا ناطہ جوڑتی ہیں اور انہیں مسلمانوں کے مدمقابل کھڑا کر دیتی ہیں۔ ہمیں اس تلخ حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ مسلم معاشرہ بھی اس وقت افراط و تفریط کا شکار ہے۔ عورتوں کے حقوق کے معاملے میں ہمیں حقیقت پسندی سے کام لینا چاہئے ان کو جو حیثیت اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے اسے تسلیم کرنا چاہئے اور ان کے شرعی حقوق اور آزادی پر کوئی قدغن نہیں لگانا چاہئے۔ مسلمان اگر اپنے معاشرے میں خواتین کو ان کا صحیح مقام بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو مغربی دنیا کی ساری ملمع کاری یکلخت ختم ہو سکتی ہے اور دنیا والوں کے سامنے ایک مثالی معاشرہ کا عملاً قیام عمل میں آسکتا ہے۔ عورتوں کے حقوق کے معاملے میں یہی بات سامنے آتی رہی کہ وقتی طور پر عورتوں پر ہونے والے مظالم کی شاخیں کاٹ کر پھینکنے کی کوششیں مختلف سطحوں پر ہوتی رہیں لیکن مظالم کو جڑ سے اکھاڑنے کا کام اس لئے نہیں ہو سکا کہ اس کا کوئی عملی خاکہ ان مصلحین کے سامنے نہ رہا جسے وہ روبہ عمل لا کر خواتین کو مغرب کے استحصال کے چنگل سے نکال سکیں۔

اکیسویں صدی کے اس دور میں جب کہ پوری دنیا خواتین کے استحصال کے خلاف کمربستہ ہوتی نظر آرہی ہے ضرورت ہے کہ عصر حاضر کے تقاضوں کے تحت خواتین کو مغرب کی ذہنی غلامی کے شکنجہ سے آزاد کرانے کے لئے اصل سرمایۂ حیات سے واقف کرایا جائے۔ اسلام ہی وہ آفاقی مذہب ہے جس کی روشنی میں ساری انسانیت اپنے مسائل حیات کا اطمینان بخش حل تلاش کر سکتی ہے۔ جبر و اکراہ کے بغیر وہ اس حیات بخش پیغام سے وابستہ ہو کر ہر قسم کے استحصال سے اپنے آپ کو بچا سکتی ہے۔ اسلام کا تصور مساوات مرد و زن انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہے۔ جب کہ مغرب کا تصورِ مساوات معاشرہ کو عریانی اور فحاشی کی طرف لے جاتا ہے۔ دور جدید کی عورت کی بدنصیبی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات سے ناواقف ہے۔ بدقسمتی سے مسلم خواتین بھی تہذیب جدید کی مصنوعی چمک دمک سے متاثر اور مرعوب ہو کر اسلام کے آب حیات پر مغربی تہذیب کے زہر ہلاہل کو ترجیح دینے لگیں۔ اسلام کی روشن شاہراہ کو چھوڑ کر مغرب کی تاریک پگڈنڈیوں میں ٹھوکریں کھانا اپنے لئے باعث افتخار سمجھنے لگیں۔ دور جدید کی مظلوم انسانیت کی خیر خواہی کا حق ادا کرنا تو کجا خود وہ اپنے نفع و ضرر کا فیصلہ نہ کر سکی۔ مغرب کے بڑھتے ہوئے ظلم کے گرداب سے نکلنے اور انسانی معاشرہ میں اپنے لئے عزت و سربلندی کے حصول کے لئے خواتین کو بہرحال خدائی تعلیمات کی روشنی میں ہی اپنی زندگی کی سمت سفر متعین کرنا ہوگا۔ انسانیت کی معراج اور قوموں کے عروج کے پس پردہ بھی یہی اہم راز رہا کہ خالق کائنات کے عطا کردہ اصولوں پر جو گروہ گامزن رہا اسے کامیابی اور سربلندی ملتی رہی اور جس نے اس صراط مستقیم سے انحراف کیا وہ تباہی کے دلدل میں پھنستا چلا گیا۔ اس لئے یہ کہنا از حد ضروری ہے کہ سوائے اسلام کے کوئی اور مذہب اور دھرم، ازم اور نظریہ، تہذیب و تمدن عورت کو وہ وقار اور

مقام نہیں دے سکا جو اسلام نے چودہ سو سال پہلے عورت کو عطا کیا ہے۔ اسی لئے خواتین کے استحصال کے سد باب کے لئے مغربی دنیا کے ظلم وستم کی داستان کا اختتام ناگزیر ہے اور اسلام کے سائے رحمت میں عورت کو لانا وقت کا اہم تقاضا ہے۔

میں اپنے اس مقالے کو حکیم الامت شاعر مشرق علامہ اقبال کے ان اشعار پر ختم کرتا ہوں۔ علامہ نے مارچ ۱۹۰۷ء میں مغربی تہذیب کے پرخچے اڑاتے ہوئے کہا تھا کہ:

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہاں میخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

پھر اقبال آگے بڑھ کر اہل مغرب کو چیلنج کرتے ہیں کہ:

دیار مغرب کے رہنے والو، خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب رزر کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

مغربی دنیا کے آزادی نسواں کے دلفریب نعرے سے متاثر ہوکر جو خواتین بے قید آزادی کی دلدادہ ہوگئیں ہیں اور مغربی تہذیب کے زلف کی اسیر ہوگئی ہیں انہیں مخاطب کرتے ہوئے علامہ اقبال نے ''آزادی نسواں'' کے عنوان کے تحت خطاب کرتے ہوئے ''ضرب کلیم'' میں کہا کہ:

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے، وہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں، معذور ہیں، مردانِ خرد مند
کیا چیز ہے آرائش وقیمت میں زیادہ
آزادی نسواں کے زمرد کا گلوبند؟

☆☆☆

خواتین کا استحصال...... مغربی دنیا کے خصوصی حوالے سے

سیدہ عقیلہ خاموشی [1]

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو اگر تم ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانی تو یہ تمہیں ایمان سے کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے (آل عمران: ۱۰۰)

اور محسن انسانیت حضرت محمد مصطفی ﷺ نے فرمایا من تشبہ بقوم فھو منہ (جس نے جس قوم کی مشابہت اختیار کی وہ ان ہی میں سے ہوگا)۔

جہاں تک حقوقِ نسواں کا تعلق ہے تاریخ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتی کہ حقوق نسواں کے تعلق سے فکر کرنے والی پہلی شخصیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔

طبقہ نسواں پر ہونے والی ناانصافیوں پر آواز اٹھانے والی پہلی آواز لسان حبیب خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔

حقوق نسواں مرتب کرنے والی پہلی شخصیت آقائے دو جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔

حقوق نسواں کو ادا کرنے کی تحریک کی بنیاد سب سے پہلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔

خواتین کے حقوق کو ادا کرنے، رب کا خوف دلانے والی ہستی کوئی اور نہیں بلکہ خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔

میں زور دے کر کہوں کہ حقوق نسواں کو عمدگی سے ادا کر کے دنیا کے سامنے نمونہ پیش کرنے والی مبارک اور قابل تقلید شخصیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے، چنانچہ فرمایا ''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں اور تم میں بہتر اخلاق والا وہ ہے جو اپنے گھر والوں سے اچھا ہو اور تم سب میں گھر والوں سے اچھا رہنے والا میں ہوں''۔

ان تمام باتوں کو تاریخ نہ صرف جانتی ہے بلکہ مانتی بھی ہے چنانچہ Wicipedia کے تحت Womens Rights کے عنوان کے ایک Page میں "Reforms Under Islam" کے تحت ان امور کا اعتراف کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ 610-661ء کے دوران خواتین کے قانون کی تدوین کرنے، عمل کرنے اور عمل کروانے کی بہترین کوشش ہوئی اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ 622ء میں جو مدینے کا منشور بنا اس میں خواتین کو شادی، طلاق، وراثت کے علاوہ دیگر قانونی حقوق بھی دیئے گئے جبکہ دنیا میں کسی بھی مقام پر کوئی بھی شخص اس بارے میں فکر مند نہیں نظر آتا۔

مغربی ممالک میں عورت کا حال بندھوا مزدور سے بھی بدتر تھا ۱۲ ویں صدی میں English Common Law وجود میں لایا گیا اور مغرب کے زیادہ تر ممالک میں نافذ کیا گیا جس میں قانونی طور پر مرد اور عورت کو برابری کا درجہ حاصل نہ تھا۔ شادی کے وقت عورت کے پاس جتنی بھی جائیداد ہوتی مرد اس کا حقدار ہو جاتا اور وہی اس کا ذمہ دار ہو جاتا۔ عورت کو اپنی کمائی پر اختیار و حق حاصل نہ تھا۔ ان حالات میں مرد اگر لاپرواہ ہو بد دیانت ہو تو عورت کی زندگی کتنی اجیرن بن جاتی اور مرد کے انتقال کر جانے کی صورت میں عورت کس طرح کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ان حالات کو صدیاں بیت گئیں عورت مغرب کے اس غیر منصفانہ اصول کی وجہ سے صدیوں جانوروں کی سی زندگی گزارتی رہتی۔

۱۸ ویں صدی میں فرانس کے انقلاب کے بعد فرانس کے قوانین کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے De Gauges نے کہا کہ فرانس کے قوانین کے تحت دی جانے والی سزائیں تو مرد اور عورت دونوں کے لئے برابر ہیں لیکن ان کے حقوق میں یکسانیت نہیں ہے۔

۱۸۴۰ء میں USA اور UK میں چل رہی تحریکوں کی وجہ سے Married Womens Property Act پاس کیا گیا جو شادی شدہ

[1] نائب صدر تنظیم بنت حرم، رکن مسلم پرسنل لابورڈ، حیدرآباد

خواتین کو اپنی جائیداد اپنے نام رکھنے کا حق دیا۔

۱۹ ویں صدی میں John Stam mil لکھتا ہے کہ ہم سے یہ مسلسل کہا جاتا ہے کہ ہماری تہذیب ہمارے مذہب میں خواتین کے لئے انصاف پر مبنی اصول مہیا کئے گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ بیوی اور بندھوا مزدور کے درمیان کوئی فرق نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک Bounded Labour سے بدتر حال ایک بیوی کا ہے۔

فرانس میں بھی شادی شدہ خواتین پر بہت سی پابندیاں عائد تھیں یہ تو صرف ۱۹۶۵ء کی بات ہے کہ شادی شدہ خواتین کو کچھ حقوق دیئے گئے۔

خواتین کو حق ووٹ کا مطالبہ حاصل کرنے کے لئے جو تحریکیں چلیں جن کو Suffrage بھی کہا جاتا ہے کی وجہ سے ۲۰ ویں صدی میں ۱۹۲۰ء سے ۱۹۸۴ء تک مختلف ممالک میں خواتین کے ووٹ دینے کے حق کو تسلیم کیا گیا۔

۱۹۶۰ء تک بھی کئی مغربی ممالک میں خواتین کو Equal Civil Rights حاصل نہ تھے۔

۱۹۷۰ء میں Equal Rights Amendmemt تحریک چلائی گئی جس کے نتیجہ میں 22 March 1972 نے اس کو پاس کیا جس میں کہا گیا کہ "Equality of Rights shall not be demied an accoint of sex" لیکن ۱۹۸۲ء تک پورے States اس کو نافذ کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔

۱۹۴۸ء میں Universal declaration of Human Rights جاری کیا گیا جس میں کہا گیا کہ Human Rights کا مطلب ہے Gender Equality لیکن ۲۰ ویں صدی میں کئے گئے اعداد وشمار کے مطابق امریکہ میں جملہ ڈاکٹرس کا صرف 5% خواتین ڈاکٹرس تھیں، سال ۲۰۰۵ء میں ۱۱۸۱ خواتین کا قتل ان کے Life Partners نے کئے جس کی یومیہ اوسط تین ہے۔

اور 40, 80,000 شوہروں نے بیویوں کو زدوکوب کیا، 2,32,960 خواتین جنسی ہراسانی کا شکار ہوئیں جس کا اوسط فی یوم ۶۰۰ ہوتا ہے۔

National Organization for Women کا کہنا ہے کہ Domestic Violence سے متاثرہ خواتین کے علاج کے لئے 8. 3 billian Dollar درکار ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۸ ویں صدی میں رونما ہوئے صنعتی انقلاب کی وجہ پر فریب نعروں کے ذریعہ خواتین کو گھر سے نکل کر کم اجرت پر کام کرنے کی کامیاب ترغیب دلائی گئی اور اس طرح خواتین کے استحصال کا سلسلہ زور پکڑتا گیا۔

یہاں تک کہ اپنے Products کو فروخت کرنے کے لئے عورت کو عریاں کر کے اشتہارات کی اجرائی عمل میں لائی گئی۔

اس طرح سرمایہ دارانہ نظام نے اپنے منافع کو بڑھانے عورت کو اس کی صنفی صلاحیتوں سے بری کر دیا۔ جس سے خاندانی نظام بکھر کر رہ گیا ہے۔ نئی نسلیں Family life سے کترا رہی ہیں جس کی وجہ سے آبادی کے تناسب میں گراوٹ آتی جارہی ہے اعداد بتاتے ہیں کہ امریکہ میں روزانہ 7000 شادیاں ہوتی ہیں جن میں سے 3300 بہت ہی جلد ختم ہوجاتی ہیں، اس پس منظر میں امریکی کالم نگار Bean wine Burg اپنی کتاب پہلی عالمی قوم میں لکھتا ہے کہ ''یہ فرض کرنے کی بے شمار وجوہات ہیں کہ آنے والے دور میں مسلمانوں کے اثر ورسوخ میں اضافہ ہوگا جس کا ایک سبب دنیا بھر میں مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ ہے اس بات کو لے کر نہ صرف مغربی ممالک بلکہ اسرائیل بھی پریشان ہے اور اس کا وزیر اعظم شمعون نے کہا کہ اسرائیل کی آبادی جس رفتار سے کم ہورہی ہے اگر یہی حال رہا تو بڑے قومی نقصان کا سامنا ہوگا''۔

مادہ پرستی کی ترقی کے باوجود مغربی اقوام ذہنی کرب واذیت کی زندگی گزار رہے ہیں اس کا ثبوت یہ ہے کہ ماہر نفسیات سے وقت لینے مریض کو ڈیڑھ تا ۲ ماہ کا وقت درکار ہوتا ہے۔ نئی نسلیں Depression کا شکار ہوکر Drugs کے عادی بن گئے ہیں ۲۰ لاکھ نوجوانوں نے اپنے جسموں کو زخمی کر کے سکون حاصل کرنے کی کوشش کی اور ان میں ۹۹٪ خواتین ہیں۔

S candanevia کے ممالک میں سردی سخت ہونے کے باوجود Air Hostess کو ان کی مرضی کے خلاف منی اسکرٹ پہننا پڑتا ہے۔

Germany میں ہر سال 40,000 عورتیں گھریلو تشدد کا شکار ہوتی ہیں یہی استحصال وتشدد ظلم وزیادتی ناانصافی کی وجہ کئی خواتین داخل اسلام ہو کر امان پارہی ہیں جن کا اوسط روزانہ ۱۰۰ کو پار کر رہا ہے۔

ایک امریکی ایکٹرس Sara Booter اپنے داخل اسلام ہونے کے واقعہ کو قلم بند کرتے ہوئے مضمون لکھتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

Why I shed Bikini for Hijab - The New symbol of Liberation because bikini gone libration from saul and Hijab liberation from aye catchess

یہ حقائق ہمارے لئے خصوصاً خواتین کے لئے سامان عبرت بنے اس نظام سے ہماری نفرت اور بڑھے اور ہمارے دین کی عظمت اور بڑھے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ شریعت محمدیؐ کی شکل میں ہم کو پاکیزہ اور کامل نظام حیات عطا کیا۔

شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے مغربی تہذیب کی تباہ کاریوں کا اندازہ لگا کر ہی کہا تھا کہ:

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی کے
نئی تہذیب کے ہیں یہ انڈے گندے

☆☆☆

خاندانی نظام کی بنیادیں

پروفیسر شاہد علی عباسی

آج کا معاشرہ ایک عجیب بحران سے گزر رہا ہے اور معاشرہ کے افراد کو خود نہیں معلوم کہ کہاں جارہے ہیں، باقی ہم سب جانتے ہیں کہ "هو الأول والآخر والظاهر والباطن" اللہ ہی اول ہے اور آخر ہے، لوٹ کر ہم کو اسی کی طرف جانا ہے، چنانچہ قرآن مجید کی آیات میں جو آیت سب سے اخیر میں نازل ہوئی اس کے بارے میں علماء میں اختلاف ہے، لیکن ایک خاصی تعداد اس کی قائل ہے: "واتقوا یوماً ترجعون فیه إلی الله (اس دن سے ڈرو جس دن تم سب اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے) وہی قرآن ہم سے یہ بھی کہتا ہے "إن السمع والبصر والفؤاد کل أولئك كان عنه مسؤولاً" نگاہ، سماعت اور قلب ہر چیز کے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا، آج جس بحران میں ہم بتلا ہیں اس میں اگر ہم دیکھیں تو نظر کا بھی دخل ہے، سماعت اور قلب کا بھی ہے، اور اپنے وسیع تر معنی میں دیکھیں تو بہت دور تک بات جاتی ہے۔ ایک دوڑ لگی ہوئی ہے، اقتدار کی کرسی تک پہنچنے کے لیے زیادہ سے زیادہ شہرت کمانے کے لیے جماعتی حیثیت اپنی بلند سے بلند تر کرنے کے لیے مسابقت جاری ہے کل ان لوگوں کا کیا حشر ہوگا ہم نہیں جانتے، لیکن دین ایک ایسا نام ہوگیا ہے، شریعت ایک ایسا لفظ ہوگیا ہے جس کے نام پر دنیا بٹوری جارہی ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے، مسلمانوں کو اس لعنت سے محفوظ رکھے۔

ہم کو بتایا گیا "کلکم بنو آدم وآدم من طین. أو کما قال علیه الصلوٰة والسلام" تم سب کے سب اولاد آدم ہو اور آدم کی حقیقت مٹی ہے، آدم مٹی سے تخلیق کیے گئے ہیں، ہم بھول جاتے ہیں کہ اسی مٹی سے ہماری تخلیق ہوئی ہے اور اسی مٹی میں ہم کو جانا ہے اور اسی مٹی سے ہم کو دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ اور اس روز جب کوئی ہمارا سفارشی نہیں ہوگا۔ ہماری زبانوں پر مہر لگادی جائے گی، اعضاء کو قوت گویائی دی جائے گی اور اعضاء سے جہنم کی طرف لے جانے والے اعمال نفس کے اکسانے پر سرزد ہوئے ہیں، لہٰذا ہمارے خلاف شہادت دینے کے لیے تیار ہوجائیں گے اور شہادت دیں گے، اللہ ہم سب محفوظ رکھے ہم سب کو "أعاذنا الله منها" میں دراصل چاہتا ہوں کہ پہلے خاندان میں جو بگاڑ آرہے ہیں یا خاندان کی وجہ سے جو معاشرہ میں بگاڑ آرہے ہیں۔ جو دنیا بھر میں بگاڑ پیدا ہوا ہے کسی ایک خاندان کے ٹھیک ہوجانے سے خاندانی نظام ٹھیک نہیں ہوگا، کسی ایک قوم کے معاشرہ میں اور وہاں کے نظام کے ٹھیک ہوجانے سے ساری اقوام درست نہیں ہوتیں۔ بنیادی کردار مسلمانوں کا یہ ہے کہ ہم امت دعوت ہیں اور ہم امت استجابہ بھی ہیں، داعی بھی ہیں اور مدعو بھی، اس معنی میں کہ رسول اکرم ﷺ کا پیام ہم نے اپنے دل کو پہنچایا ہے جس میں کلمہ دل کی گہرائیوں کے ساتھ بالغ ہونے کے بعد کم سے کم ایک بار کہنا، ہر مسلمان کے لیے، ہر شخص کے لیے امام غزالیؒ کے مطابق واجب ہے، واجب العین ہے کہ کلمہ ہمارے دل کے اندر ہے یا دل کے باہر۔ اگر کلمہ ہمارے دل کے اندر ہوتا تو شریعت کی تعظیم وتوقیر ہمیشہ ہمارے پیش نظر ہوتی۔ اگر کلمہ ہمارے دل کے اندر ہوتا تو ہر شئ کے بارے میں ہم قرآن وحدیث کی روشنی میں شریعت کے احکام معلوم کرنے کے لیے علماء سے ربط قائم کرتے۔ اگر کلمہ ہمارے دل کے اندر ہوتا تو بہت سا بگاڑ آج معاشرہ میں دکھائی دے رہا ہے یہ بگاڑ ہو ہی نہیں پاتا۔ اگر کلمہ ہمارے دل کے اندر ہوتا تو ہم کسی پر نہ ظلم کرتے نہ ظلم ہوتا ہوا دیکھتے، اگر کلمہ ہمارے دل کے اندر ہوتا تو ہم مجسم دعوت ہوتے۔ مجسم ایمان ہوتے، اللہ تعالیٰ ہم کو اس کی بھی توفیق عطاء فرمائے کہ کلمہ کے تقاضوں پر عمل کرنے والے بنیں۔ دیکھیے خاندان بنتا ہے شادی کے بعد، ماں باپ اور بچوں کے ساتھ رہنے کے لیے اکائی بنتی ہے، مغربی طرز فکر نے ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے جس میں ہر ایک اکائی اپنی جگہ الگ ہے، لڑکا جیسے ہی بالغ ہوا اس نے اپنے طور پر تعلیم طے کیے، محنت کرنا شروع کیا، کمائی اپنے ہاتھ سے کیا اور پھر اپنا گھر الگ جاکر بسالیا، ماں باپ سے صرف اس کا رسمی تعلق قائم ہے، ابھی الحمد للہ مشرق میں یہ بات نہیں پیدا ہوئی ہے، مشرق میں اب بھی ماں باپ اپنے بچوں کی تعلیم وتدریس کی طرف توجہ کرتے ہیں اور جتنا ان کے بس میں ہوتا ہے، اتنا کرتے ہیں، آج اس کی ضرورت ہے کہ ہم اس پر غور کریں کہ شادیاں کس طرح طے پاتی ہیں اور اس سلسلہ میں اسلام کا کیا حکم ہے، بنیادی زور کس چیز پر دیا گیا ہے، دینداری کو ترجیح دو،

دینداری کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور چیز کی طرف توجہ دلائی ہے اور وہ ہے "هن لباس لكم وأنتم لباس لهن" (سورہ بقرہ: ۱۸۷) کہ تمہاری ازواج وزوجات تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو)۔ لباس کس لیے پہنتے ہیں، لباس تحفظ کے لیے پہنا جاتا ہے، لباس تزئین وتجمل کے لیے پہنا جاتا ہے، لباس جسم کی موزونیت کے اعتبار سے تیار ہوتا ہے، لباس موسموں کے تغیرات سے حفاظت کے لیے پہنتے ہیں، اس کے علاوہ لباس سے اگر جسم میں کسی قسم کی تکلیف ہوتی ہے، جیسے الرجی تو وہ لباس نہیں پہنتے ہیں، اتار دیتے ہیں، مطلب یہ کہ لباس کا آرام دہ ہونا ضروری ہے، آیت کے اس ٹکڑے میں اگر آپ دیکھیں تو موزونیت آپ کو ایک بنیادی شئ ملے گی، اس کے بعد دوسرے احکام اس کے ساتھ ملیں گے۔

ظاہری حسن سے زیادہ ضروری انسان کا کردار اس کی سیرت ہے، بعض امراض میں مرد یا عورتیں مبتلا ہوتے ہیں، ان کو چھپانے کا اہتمام ہوتا ہے، شریعت کسی کا عیب اگر معلوم ہو تو بتا دینا ضروری کہتی ہے۔ لیکن دوست واحباب اہل خاندان خود اس کو چھپانے کا اہتمام کرتے ہیں جو کہ شرعاً معصیت ہے، کسی کو اگر مہلک اور متعدی مرض ہے یا کسی کو برص، جنون یا جذام ہے اسی طرح عورتوں میں ایک مرض ہوتا ہے جسے Infetility اگر اس طرح کی کوئی بات ہے تو پہلے ہی بتادی جائے، تاکہ شادی نہ ہو۔ مرد ساری زندگی بھگتتا رہے یا ایک جوا کھیلے، اسی طرح بعض مے خوار ہوتے ہیں، بعض قمار، جوا کھیلتے ہیں، بعض لوگوں کی طبیعت میں آتش مزاجی ہوتی ہے، ذرا سی بات پر بالکل بھڑک اٹھتے ہیں۔ بعض لوگ زبان دراز ہوتے ہیں، بڑے چھوٹے اور ساتھیوں کا آپس میں ایک دوسرے کا کچھ خیال نہیں کرتے، اسراف وتبذیر بعض لوگوں کی طبیعت میں ہوتی ہے، مرد ہو یا عورت، ہٹ دھرمی ہوتی ہے، ضد ہوتی ہے، بدکلامی ہوتی ہے، زبان پر کوئی جملہ بغیر گالی کے نہیں نکلتا، بعض لوگوں میں خودنمائی ہوتی ہے، بعض لوگوں میں عاشق مزاجی ہوتی ہے، ایک عورت یا ایک خاتون کے پیچھے نہیں بیک وقت مختلف جگہ حسن کے جلوؤں سے اپنی آنکھیں سینکتے ہیں۔ یہ سوچے بغیر کہ یہی آنکھیں جہنم میں پھر کس طرح سینکی جائیں گی، اس کا پہلے سے اندازہ کرلیں، بعضوں کی طبیعت میں آوارگی، تشدد، انتہا پسندی، بیکارگی، شہوانیت، حیوانیت، ایذا پسندی ہوتی ہیں، اب اس طرح کی چیزیں اگر بتادی جائیں تو شادی کیسے ہو؟ یہ ایسے امراض ہیں جن کا علاج ممکن ہے، علماء کی صحبت اختیار کی جائے تو بہت سے امراض خود بخود ختم ہو۔

کسی شخص کو اگر اس طرح کی شکایت ہو تو اس کے لئے ایسی دوائیں تشخیص کی جائیں جس سے مزاج میں اعتدال پیدا ہوگا اور جو اس کی وجہ سے بھٹکتا ہے اس کو سکون میسر ہوگا ان چیزوں کو سامنے رکھا جائے، جیسے موزونیت، دینداری، خوش خلقی، صبر وتحمل، تعلیم وتربیت، محنت پسندی، مزاجی ہم آہنگی یہ بہت ضروری ہیں، مزاجی ہم آہنگی اگر نہ ہو تو پھر زندگی بھر پریشانی رہتی ہے، تھوڑا بہت اختلاف تو ہوتا ہی ہے، اس کے بعد اس اختلاف کو نظر انداز کرنا آدمی کے لیے آسان ہو جاتا ہے، لیکن اگر اختلاف اکثر چیزوں میں ہو، دونوں کے لیے زندگی ایک طرح کی جہنم بن جاتی ہے۔ میں اس صاف گوئی کے لیے معذرت چاہتا ہوں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دو مقامات کے اوپر یہ فرمایا ایک نکاح کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا: "لتسكنوا إليها" اور دوسری جگہ فرمایا: "وجعل منها زوجها ليسكن إليها" سکون، کیسا سکون؟ ایک جسمانی سکون ہوتا ہے، اگر صرف جسمانی سکون مطلوب ہو تو پھر قرآن مجید میں غیر مسافحات، محض شہوت رانی مقصود نہ ہو، تو جسمانی سکون تو حاصل ہوتا ہے، لیکن اس سے زیادہ اہم ذہنی سکون ہے، روحانی سکون ہے، یہ سکون زیادہ اہم ہے، تو ان چیزوں میں ایک سلسلہ کی رعایت کرے۔

☆☆☆

جہیز کی رسم

جناب ڈاکٹر عبدالوحید صاحب

عورتوں کے حقوق کے استحصال کے سلسلہ میں بہت حد تک ہندوستانی سماج ذمہ دار ہے۔ ہندوستانی سماج میں رسم جہیز کافی قدیم ہے، لیکن پورے ہندوستان میں یا اس خطۂ تہذیب میں جس میں پاکستان، بنگلہ دیش بھی شامل ہے وہ سب جگہ یکساں نہیں ہے، ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں اور ایک ہی علاقے میں ایک قوم یا ایک برادری یا ایک طبقے سے دوسری برادری یا طبقے میں اس کی نوعیت، اس کے چلن الگ الگ ہیں بہر کیف اس رسم سے کافی پریشانیاں ہوتی ہیں۔ عورتوں کے حقوق کا استحصال ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ہندوستانی گورنمنٹ نے، آزاد حکومت نے اس کو محسوس کیا اور ۱۹۴۱ء میں ایک ایکٹ پاس کیا۔ جس کے بعد اس کے اندر مزید ترمیم بھی کی گئی، لیکن اس کے باوجود جہیز کا چلن روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے، ظلم وستم کی اتنی کہانیاں ہیں کہ ان کے اعداد وشمار دینے سے کوئی فائدہ نہیں، ہندوستان کے معروف ومشہور ماہر سماجیات پروفیسر ایمن شریواس نے کہا کہ جہیز بیسویں صدی کی ستی ہے، اس سے آپ اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کے ظلم وستم کی داستان کتنی گہری ہے اور اس کی نوعیت کیا ہے، سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی یہ کیا رسم ہے کہ جس کے خلاف قانون بنائے جاتے ہیں، رائے عامہ ہموار کی جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود بھی یہ رکنے کا نام نہیں لیتی ہے اور روز بروز بڑھتی چلی جاتی ہے، علم سماجیات کے لحاظ سے جب بھی کبھی ایسی کوئی رسم ہوتی ہے تو اس کی جڑیں سماج میں بڑی گہری ہوتی ہیں، یعنی سماج کے دوسرے اداروں تک اس کی جڑیں ہوتی ہیں، یا دوسرے اس کو تقویت دیتے ہیں، کسی چیز کے اوپر کون سے سماجی عوامل یا سماجی اسباب ہیں جن کی وجہ سے رسم جہیز اتنی مضبوط ہے کہ جس کو ہم توڑنا چاہ رہے ہیں مگر ٹوٹ نہیں رہی ہے، جس کو ہم روکنا چاہ رہے ہیں مگر رک نہیں رہی ہے اور یہ ہندوستان کی کسی ایک قوم میں نہیں بلکہ پورے خطہ میں اور ہر قوم میں موجود ہے، اس کے بارے میں اپنے کچھ خیالات کا اظہار تین مضمون کے تین حصوں میں کیا ہے (۱) جہیز کی تعریف کیا ہے؟ انگریزی میں اس کو Doury (ڈاوری) کہتے ہیں دوسری چیز یہ ہے کہ اس کے سماجی عوامل ہندوستانی سماج میں کیا ہیں؟ اور تیسرے یہ کہ مسلمانوں میں اس کے چلن کی کیا نوعیت ہے؟ اس مضمون کے اتنے حصے ہیں، اصطلاحیں بہت اہم ہوتی ہیں اور جب تک ہم اصطلاحوں کو نہیں سمجھ پاتے ہیں تب تک ہم اس کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔ تو کبھی ہم اس کے لیے لفظ جہیز بولتے ہیں کبھی دہیز بولتے ہیں، اور بھی بہت سے الفاظ موجود ہیں۔

دنیا کی ہر تہذیب میں یہ بات حقیقت ہے کہ شادی کے وقت تحفے اور تحائف پیش کیے جاتے ہیں اور قبول کیے جاتے ہیں، کوئی بھی ایسی تہذیب یا سماج نہیں ہے کہ جس میں شادی کے وقت تحفے تحائف پیش نہ کیے جاتے ہوں اور قبول نہ کیے جاتے ہوں، میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان تحفے تحائف کو دو بڑی قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے ایک ڈاوری اور دوسرا قیمت عروس یا قیمت ہے، ڈاوری وہ تحفے تحائف ہیں جو لڑکی کے والدین شادی سے پہلے، شادی کے وقت یا شادی کے بعد، لڑکے، اس کے والدین، اس کے عزیز واقارب کو پیش کرتے ہیں، اور اس کے بالکل برعکس برائٹ پرائز ہے، اس میں مہر شامل نہیں ہے اور نہ ہی ڈاوری میں ہے، مہر کی حیثیت خود ہوتی ہے، جب کہ اصولی طور پر جہیز کی بھی حیثیت اور حقیقت ہوتی ہے، لیکن پریکٹیکلی وہ نہیں ہوتا، برائٹ پرائز میں جو تحفے تحائف ہوتے ہیں اس کی آنرشپ، ملکیت وہ لڑکی کے والدین کی ہوتی ہے، تو مہر کے بارے میں بہت سارے لوگ کنفیوز ہوتے ہیں، مہر نہ تو ڈاوری میں آتا ہے، نہ برائٹ پرائز میں آتا ہے، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جہیز ڈاوری ہے جو لفظ عربی کا ہے اور وہی یہاں پر مستعمل ہے، کہیں دہیز (جہیز) ہے کہیں دان دہیز (جہیز) ہے، کیا یہ ڈاوری ہے؟ بالکل نہیں ہے، جہیز کا لفظ ان تحفے تحائف کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو محبت کی خاطر لڑکی کو وداع کرتے وقت اپنی صوابدید کے مطابق پیش کیا جائے، آپ غور کیجئے کہ اگر کوئی بھی تحفہ شادی کے وقت لڑکی کو صرف محبت کے لیے پیش کیا جاتا ہے تو اس کو قیمت عروس کہا جاتا ہے، اس کے لیے ڈاوری کا لفظ نہیں ہے، لفظ ڈاوری تب آتا ہے جب ان تحفے تحائف کو پیش کرنے میں جبر شامل ہو، تو وہ تحفے تحائف جو شادی کے وقت لڑکی کو دیئے جاتے ہیں یا اس کے دولہا کو دیئے جاتے ہیں یا اس کے عزیز واقارب کو دیئے جاتے ہیں تو وہ ڈاوری بنتا ہے، نہیں تو اس سے پہلے وہ قیمت ہے، اب یہ کیا ہے؟

عام طور سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جب چیزوں کی ڈیمانڈ کی جائے تو وہ...... اس کو ہم براہ راست کورشن کہتے ہیں، ڈائریکٹ کورشن، لیکن ایک طریقہ ان ڈائریکٹ کورشن کا ہوتا ہے، ان ڈائریکٹ کورشن ڈاؤری کے لیے استعمال کر رہا ہوں، جہیز کی لڑکے والا ڈیمانڈ نہیں کر رہا ہے، لیکن پھر بھی لڑکی کے والدین کچھ ان کو دیدیتے ہیں جو دیکھے نہیں جاسکتے، کچھ ان ڈائریکٹ کورشن کی وجہ سے بحالت مجموعی وہ جہیز دیتا ہے، وہ ان ڈائریکٹ کورشن کیا ہوتے ہیں وہ ان ڈائریکٹ کورشن اس بات کے ہوتے ہیں کہ اگر میں نے پہلی لڑکی کی شادی میں جہیز نہیں دیا تو دوسری کا پیغام نہیں آئے گا۔ اور اگر میں نے اپنی لڑکی کو بغیر جہیز کے وداع کیا تو سماج میں میری عزت نہیں رہے گی اسی طرح شادی ایک بہت ہی عظیم موقع ہے جہاں سے مجھے اپنی دولت کی اور اپنے منصب کی نمائش کرنا ہے، یعنی کہ ڈیمانڈ لڑکے والے کی طرف سے نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود بھی جو ان ڈائریکٹ کورشنز ہیں وہ موجود ہیں، تو ہم ڈاؤری کی جو تعریف کرتے ہیں وہ یہ نہیں کرتے ہیں کہ شادی سے پہلے، شادی کے وقت، شادی کے بعد وہ تحفے تحائف جو لڑکی کے والدین اس کے عزیز واقارب، اس کے دولہا کو، اس کے والدین کو، یعنی لڑکی کے والدین دینے کے لیے مجبور ہوتے ہیں بلکہ کورشن ان کے اوپر ہوتا ہے اس کو ہم ڈاؤری کہتے ہیں، یہ

تشریح ذہن میں ہونا چاہیے اور کورشن طریقے کے ہوتے ہیں، ڈائریکٹ کورشن، ان ڈائریکٹ کورشن، یعنی کہ جبر، اب ان ڈائریکٹ کورشن مختلف سماج میں ہندوستان کی مختلف قوموں اور مختلف علاقوں میں الگ الگ نوعیت ہوگی، کہیں پر ڈائریکٹ کورشن زیادہ ہوگا، کہیں پر ان ڈائریکٹ کورشن، کہیں پر ان کی نوعیت کم ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن کورشن کسی نہ کسی طرح سے موجود ہے اور اس کا جب ہم تجزیہ کرتے ہیں کہ وہ عوامل کون سے ہیں؟ جن کی وجہ سے اس رسم کی شروعات ہوئی، ان کا فروغ ہوا اور آج بھی روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہے۔ تو سب سے پہلی جو چیز آتی ہے وہ ہندوستان کے سماج کی شادی کا نظام (یعنی ہندوؤں کی شادی کا جو نظام ہے)۔ مجموعی اعتبار سے دو باتیں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں ایک چیز تو یہ ہے لاڈمروں کے مطابق ہندوؤں میں آٹھ طریقے کی شادیوں کو تسلیم کیا گیا، منوسمرتی کے مطابق شادی کا جو نظام اور میرج سسٹم ہے اس کی تین بڑی اہم خصوصیت اس کی رسمیں ہیں اس میں ایک ہے کنیادان، دوسری ہے ور دکھشنا اور تیسری ہے استری دھن یہ اس وواہ کی خاصیتیں ہیں۔ کنیادان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس میں ماں باپ اپنی بیٹی کا دان کرتے ہیں، یعنی میں نے اپنی بیٹی آپ کو گفٹ کردی، جب کوئی چیز آپ نے گفٹ کردی تو اس کا تعلق آپ سے نہیں رہا، اس لیے اس شادی کی وجہ سے لڑکی کا تعلق شادی کے بعد اپنے ماں باپ کے خاندان سے ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتا ہے، اور وہ لڑکے کے، یعنی شوہر کے خاندان سے ہمیشہ کے لیے جڑ جاتی ہے، یہ چیز اسلام میں نہیں ہے۔ جب کنیا گفٹ کی جاتی ہے تو اس کے ساتھ میں ور، یعنی کہ دولہا کو کچھ دکھشنا بھی دی جاتی ہے، یعنی ایک تو لڑکی کو گفٹ دیا، اس کے بعد اس کو کچھ دکھشنا بھی دی جاتی ہے، یعنی کہ اس کو تحفے تحائف دیئے جاتے ہیں اور ساتھ ہی میں لڑکی کو استری دھن دیا جاتا ہے، یعنی لفظ ڈاؤری کے لیے ہندوؤں کے خواص میں آج بھی جو لفظ مستعمل ہے وہ استری دھن ہے، تو یہ تین چیزیں ہیں۔ اسی ور دکھشنا اور استری دھن کی جوت سے اسی کی کوکھ سے ہلکے ہلکے جہیز کی رسم نے ارتقاء پایا، اسی کو آج ڈاؤری کے نام سے جانا جاتا ہے، ور دکھشنا کا انحصار محبت کے اوپر تھا، لیکن آج اس کا انحصار محبت پر نہیں ہے، بلکہ لالچ کے پر ہے اور...... دوسری چیز ہندوؤں کے میرج میں اندرون ذات وواہ۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندو سماج ذاتوں میں بٹا ہوا ہے، ایک ذات دوسری سے اونچی یا نیچی ہوتی ہے، اب اس میں تو کوئی چیز نہیں ہے، لیکن جو سب سے بڑی چیز ہے ذات، اس میں ذاتی کا لفظ صحیح ہے، ذات نہیں، ذاتی کی ایک خاصیت ہندو بینی ہے یعنی اندرون ذاتی بیاہ (وواہ) کرنا، سب سے پہلے آپ اندرون ذاتی وواہ دیکھئے ذاتی میں بھی گوتر ہوتے ہیں، ایک ذاتی گوتروں میں بٹی ہوئی ہے اور گوتر بھی اپنے منصب کے لحاظ سے اونچے یا نیچے ہوتے ہیں، تو سب سے پہلے وہ کہتے ہیں کہ آپ گوتر میں وواہ کیجئے، اپنی ذاتی میں وواہ کیجئے، ہندو ویدی اور اس میں اپنے گوتر کے باہر کیجئے، خاص طور سے شمالی ہندوستان میں، تو اب کیا کوئی وواہ ذاتی کے باہر نہیں ہوسکتا، گوتر کے باہر تو ہونا ہی ہے، ذاتی کے باہر بھی ہوسکتا، اس کا اصول یہ ہے کہ، ہوسکتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ لڑکا اونچی ذاتی کا ہو اور لڑکی نیچی ذاتی کی ہو۔ تب ہوسکتا ہے۔ اس وواہ کو انولوم وواہ، کہا جاتا ہے اگر اس کا الٹا ہے کہ لڑکا نیچی ذات کا ہے لڑکی اونچی ذات کی ہے تو اس وواہ کی اجازت نہیں ہے، یہی اصول اندرون ذاتی جب وواہ ہوتے ہیں تو گوتر کا بھی ہوتا ہے۔ گوتر کا لڑکا اونچی گوتر کی لڑکی سے وواہ نہیں کرسکتا، یا اس کو قانونی طور پر اجازت نہیں ہے، حالانکہ آج کل یہ مسئلہ بڑھا ہوا ہے، لیکن یہ اصول مذہبی اعتبار سے ہے، اور یہ ایک آئیڈیالوجی ہے، یعنی کہ اونچی ذات کا لڑکا، اونچی ذات کی لڑکی، اونچے گوتر کا لڑکا اونچی گوتر کی لڑکی، تب وواہ ہوگا...... میرج ایبل پارٹی، یعنی کہ لڑکا اور لڑکی کی پارٹی حیثیت کی نہیں ہے، بلکہ ان کے بیچ میں ایک غیر مساوی تعلقات ہے، لڑکے کا خاندان ہمیشہ اونچا، سماجی طور پر بھی اونچا ہو، اونچا سمجھا جائے گا اور لڑکی کا خاندان ہمیشہ نیچا، سماجی طور پر بھی نیچا اور نیچ سمجھا جائے گا۔ دوسری چیز یہ ہے کہ اونچی ذاتی اور اونچے گوتر کے لڑکے کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ نیچی ذاتی اور نیچے گوتر کی لڑکی سے شادی کرلے تو اونچے ذاتی اور گوتر کے لڑکوں کی سپلائی ہوتی رہتی

ہے، لیکن لڑکیوں کی سپلائی نہیں ہوتی۔ اونچی ذاتی میں اور اونچے گوتر میں لڑکیوں کی اوور (Over) سپلائی ہوجاتی ہے اور لڑکوں کی انڈر سپلائی ہوجاتی ہے، اب اگر اقتصادی قانون جاری کرتے ہیں تو جب کسی چیز کی کم سپلائی ہوگی تو اس کا معیار بڑھ جاتا ہے، اقتصادیات اور معاشیات کا جب آپ اصول جاری کرتے ہیں کہ کسی چیز کی اگر کم سپلائی ہے تو اس کی قیمت بڑھ جائے گی۔ اور کسی کی زیادہ (Over) سپلائی ہے تو قیمت کم ہوجائے گی۔ تو اونچی ذات کی اور اونچے گوتر میں ہمیشہ سے لڑکیوں کی شادی کی ایک پریشانی ہوئی اور بہت ساری ذاتیوں میں اس پریشانی کا حل انھوں نے لڑکیوں کو زندہ دفن کر کے حل کیا ہے، جو کہ راجپوتوں میں اور دوسری اونچی ذاتیوں میں یہ چیز رہی ہے جیسے آج اسقاط حمل کی شکل میں یہ چیز سامنے آرہی ہے۔

اب دوسری چیز یہ کم ہے کہ تیسرا جو اس کا پہلو ہے وہ ہے رسم جہیز کے اوپر کہ جو لڑکے کی اندرونی سپلائی ہے اونچی ذاتی کے اونچے گوتر کے، سو اس کی ڈیمانڈ جب بڑھتی ہے تو اونچی ذاتی کی آبادی اس کو زیادہ سے زیادہ یعنی ورد کچھنا دیتے ہیں یعنی کہ لڑکی کے ماں باپ زیادہ سے زیادہ پیسے دے کر اونچی ذات کے لڑکے والے کو اپنا سماج میں وقار بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو اس کا اطلاق ڈاوری ہے؟ دوسرا جو سبب ہے جہیز کا وہ ہے لڑکیوں کے غیر منقولہ وراثت میں حصہ نہ دینا۔ ہندو مذہب کے اندر خاص طور سے جو قانون وراثت کا ہے، اس میں لڑکیوں کا ماں وباپ کی غیر منقولہ وراثت میں حصہ نہیں ہے اور اس لیے ڈاوری کے شمول میں جہیز جو استری دھن وہ اپنی بچیوں کو وہ حصہ دیتے ہیں جو ان کا حصہ غیر منقولہ جائداد میں آتا ہے، تو جو حق وراثت ہے، اس سے بھی جہیز کا تعلق ہے، اور یہ بات بہت ہی مشہور ماہر سماجیات اسکالر نے اپنے ریسرچ میں یہاں پر کہی ہے۔

اب تیسری چیز یہ ہے کہ یہ عوامل جب موجود تھے تو ایسا نہیں تھا کہ ہندوستان میں ہر قوم کے اندر جہیز تھا، جہیز کی رسم انیسویں صدی کے آخر تک صرف اعلی ذاتوں میں اور زمیندار طبقوں میں موجود تھی، نچلی ذاتیں، قبائلی یہ تمام کے تمام لوگ برائٹ پرائز جس کو اردو میں قیمت عروس کہیں گے لیکن رفتہ رفتہ جہیز چوں کہ اعلی ذاتوں اور زمیندار طبقے سے اس کا تعلق تھا تو اس کو عزت اور فخر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس لیے جب نچلی قوموں، قبائیلوں اور دوسرے لوگوں میں معاشی ترقی ہوئی، خوشحالی آئی تو سب لوگوں نے اونچی ذات کے زمینداروں کے طور طریقے کو اپنایا اس میں ایک رسم جہیز بھی ہے اور آج بھی ہندوستان کی تمام جگہوں کی رسم بنی ہوئی ہے، یعنی کہ وہ قومیں وہ قبائلی لوگ جو کبھی انیسویں صدی کے آخر تک قیمت عروس پر قائم تھے، آج وہ چیز بدل کر رسم جہیز میں بری طرح سے آگئی ہے۔ اب دوسری چیز یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمان ہندو سماجی نظام اور رواج کے تحت ہیں، سوچنا یہ ہے کہ کیا ہندوستانی مسلمان اس سے الگ ہیں؟ میرا اپنا بحیثیت ایک سماج کے طالب علم ہونے کے نقطۂ نگاہ سے یہ ماننا ہے کہ ہندوستانی مسلمان سماجی معاملات میں ہندوستانی زیادہ ہیں اسلامی کم ہیں۔ ساری چیزیں چاہے وہ ذات برادری ہو یا حق برادرت ہو، وہ تمام کی تمام چیزیں مسلمانوں میں کافی پہلے سے ملتی ہیں، یہ خیال غلط ہے کہ وہ ابھی کی ایجاد ہے۔ آزادی سے پہلے ہریانہ سے لیکر پنجاب تک جتنا مسلم خواتین کے حقوق کا استحصال تھا وہ شاید کہیں اور نہیں ملتا۔ مولانا ممتاز علی کی رائننگ شو، راقم الخیری صاحب کی رائننگ شو تو یہ جتنے بھی دیکھیں گے خاتونوں کی عصمت، تہذیب نسواں، ان میں ان تمام چیزوں کا ذکر موجود ہے اور رسم جہیز بھی اپنے عروج پر تھی اور یہاں کے زمیندار مسلمان رسم جہیز کو جائز قرار دیتے تھے۔ مسلمانوں کے علماء کرام نے کچھ اس پر کام کیا ہے۔ تین کتابیں میری نگاہ سے گزریں، خورشید احمد قاسمی صاحب دیوبند کی کتاب ''جہیز ایک سماجی لعنت'' مولانا عبدالرحمن صاحب کی فتنۂ جہیز'' اور پروفیسر عمر حیات خاں غوری کی کتاب جس میں کہ رسم جہیز اسلامی اور اسلامی نظام معاشرت وغیرہ تمام علماء کرام کا متفقہ فیصلہ ہے جو میں نے تین کتابوں کے ذریعہ سے کہا کہ جو رسم یہاں پر چلتی ہے اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

رسم جہیز کے اسباب سماج کی گہرائیوں میں موجود ہیں اور اب اس میں مزید اضافہ ہوا ہے، مغربی تہذیب مادیت پرستی اور اس کے اثرات سے اس میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے، اس لئے خاندان کے کسی بھی پیشہ میں ہو ایماندار ہو، لڑکی ہو شادی کیجئے، نکاح کیجئے اور وہ برادریوں کی بندش کو توڑ دیجئے، اکوپیشن کی بندش کو توڑ دیجئے، اکوپیشن میں اگر کوئی بڑا حیثیت والا ہے وہ کم حیثیت والے سے شادی کرے، یہ دو چیزیں توڑنے میں ہم کامیاب ہوجاتے ہیں یا اس کی تبلیغ کرتے ہیں تو جہیز کو ہم کنٹرول کر سکتے ہیں (Minimize) کر سکتے ہیں اور ختم بھی کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

تیسرا باب اختتامیہ

تأثرات

مولانا عبید اللہ الاسعدی صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہم لوگ کل یہاں ایک عظیم مقصد لے کر جمع ہوئے تھے، اللہ کا فضل و کرم ہے کل سے لے کر آج تک چند نشستوں میں ہم نے اپنے اس نظام کو مکمل کیا اس میں بہت اچھے مقالات اور افکار پیش کیے گئے، ہم سب کے لیے بڑی اچھی معلومات بھی سامنے آئیں، تجربات و تجاویز بھی اور ظاہر ہے کہ لکھنے والوں نے اپنی معلومات کی بنیاد پر یا ہمارے مقررین نے تاثرات کا اظہار کیا ہے اس مجلس میں اس کے علاوہ جو بھی ان کے سامنے حالات ہیں ان حالات کی روشنی میں۔ انشاء اللہ ابھی تجاویز سامنے آئیں گی، اس قسم کی نشستوں کا مقصد ظاہر ہے کہ جمع کر کے صرف سننا، سنانا نہیں ہوتا۔ دراصل کچھ دل کا درد رکھنا ہوتا ہے، کچھ لوگوں کے دلوں میں جو کچھ ہے اس کو سامنے لانا ہوتا ہے اور مقصود یہ ہوتا ہے کہ آخر ہم، ہمارے سامنے جو حالات ہیں اس میں کیا لائحہ عمل اختیار کریں اور اس کو اپنائیں اور کس طرح سے اپنی زندگی کو اور اپنے حالات کو اچھا بنا سکیں۔ امید یہ ہے کہ یہ سمینار انشاء اللہ اس عتبار سے نتیجہ خیز ہوگا، اس کی تجاویز کو قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا، ہر ایسی مجلس میں ساری چیزوں کو سمیٹا نہیں جاسکتا اور نہ ساری چیزیں سامنے لائی جاسکتی ہیں اور میں ایک مرتبہ پھر اسلامک فقہ اکیڈمی سے تعلق کی نسبت سے آنے والے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں، خاص طور سے جن حضرات کی شرکت اس نشست میں ہوئی اور اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس نشست کو، اس اجلاس کو قبول فرمائے، خیر و برکت کا ذریعہ بنائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العلمین۔

☆☆☆

تأثرات

ڈاکٹر سید عبدالرشید صاحب

دیکھئے مجھے ایک احساس ہوتا ہے کہ یہ خاندانی نظام اس کو نظام کہتے ہیں جو نظام بہت ساری چیزوں سے جڑ کر بنتا ہے اور اسلام بھی ایک نظام ہے جو کئی نظاموں سے مل کر بنا ہے اور ہر نظام کے اندر کئی نظام ہیں۔

أعوذ بالله من الشيطن الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم. يأيها الناس اتقوا ربكم الذي خلقكم من نفس واحدة (سورہ نساء:۱) (اے انسانو! اپنے پالنے والے سے ڈرو، تقویٰ کے معنی، پالنے والے سے کبھی کیئرفلی ہوسکتا ہے، بے نیاز ہوسکتا ہے، یہ اخوت ومحبت جو تمہارے اندر ہے، یہ دو صفت کے حوالہ سے اللہ رب العلمین وہ قوت نافذہ دے رہے ہیں ہمیں کہ جس کی وجہ سے ہر سسٹم کو صحیح طور سے چلا دیں گے، شیطان کا منھ کالا کرنا ہے اور اللہ رب العلمین کے گمان کو سچا کر دکھانا ہے، ہر لمحہ ہم اس امتحان سے گزر رہے ہیں، ہر وقت کام کرنے سے پہلے رونا ہم پر طاری ہو جانا چاہئے، ورنہ ہمارے ہاتھوں سے یہ متبرک کام نہیں ہوسکے گا اور اس کو دوسرے لیں گے، کام کرلیں گے تو معافی کے کم سے کم قابل ہو جائیں۔ اور یاد رکھئے۔ پتہ ہونا الگ ہے علم ہونا الگ ہے، اس کا استحضار الگ ہے، یہ بات ذرا بغور سمجھیں۔

اللہ رب العالمین ہمارے پالنے والے ہیں ہم کو اس کا علم ہے، اللہ ہم کو بنانے والے ہیں، سب کو بنانے والے اس کا علم ہے، لیکن اس کا استحضار نہیں ہے۔ میرے مالک...... ہماری عقل معاش کو عقل نہ بنادے اور پھر اللہ رب العلمین کا علم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے سے ہمیں عطا ہوا ہے، ہم سب کو وہ استحضار عطا ہو کہ ہر لمحہ اللہ رب العلمین سے ہم قریب ہوں اور جانیں: "يا أيها الإنسان إنك كادح إلى ربك كدحاً فملقيه" (اپنے رب کو، تمہارے پالنے والے کو، معاملہ رکھنا اور اپنا ایکشن ری ایکشن اپنے مخلوقات کے ساتھ، خاص طور سے یہ دونوں سسٹم ہیں۔

ہمیں چاہیے کہ ہم اللہ رب العالمین کے دین کو پھیلنے اور پھیلانے کی محنت میں ہر روز کوشش کریں، ہم کو جہنم کی آگ سے بچنا اور بچانا ہے، یہ ہمارا مسئلہ ہے ایسے ہاتھوں سے خاندانی نظام کی پریشانیوں کو دور کیا جائے گا اور صحیح عمل کیا ہوگا اس کی حکمت کیا ہوگی کیوں کہ اللہ رب العزت فرماتے ہیں: "قوا أنفسكم وأهليكم نارا" اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں تم کو پکڑ پکڑ کر کھینچ رہا ہوں تم ادھر ہی جا رہے ہو...... اور اللہ رب العالمین کو تڑپ کر بولنا پڑتا ہے اس وجہ سے اللہ کی تڑپ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تڑپنے والا بنایا، اور وہ ہم کو دیکھ رہے ہیں کہ ہم اور ہمارا خاندان اور نظام کیا کر رہا ہے۔

☆☆☆

تأثرات

مولانا محمد حسام الدین ثانی جعفر صاحب

حقیقت یہ ہے کہ ہم حقیقت کو بھول گئے ہیں، بقول شاعر:

حقیقت روایات میں کھو گئی　　　　یہ امت خرافات میں کھو گئی

ہم کو جہاں جانا تھا جو ہمارا مقام تھا ہم نے چھوڑ دیا اور اس مقام پر آ گئے جہاں غیر لوگ ہم کو راستے بتا رہے ہیں، حالانکہ ہمارے آقاء حضرت محمد مصطفی ﷺ کی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ کہ آپ ﷺ ہمارے لئے ایک نمونہ ہیں، اگر ہم رسول اکرم ﷺ کی زندگی کو دیکھیں تو یہی ہمارے لیے بہت بڑا انعام ہوگا۔ شاعر یہ کہتا ہے ۔

طور پر جاؤ تو ناحق کہ بھٹکنا ہے مجھے　　　　تو افاقہ کرو تنہا کہ جو سودا ہے مجھے

سچ تو یہ ہے کہ تیرے گھر میں کمی کیا ہے مجھے　　　　خبط ہے دردِ سر اعجاز مسیحا ہے مجھے

حسن یوسف دم عیسی ید بیضا داری　　　　آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

وہ کونسی خوبی ہے جو ہمارے آقا میں موجود نہیں۔ آپ چھوٹے سے صاحبزادے ہیں، جھولے میں جھول رہے ہیں اور اس وقت جب دائی حلیمہ کو آپ کے پاس لایا گیا، ابھی آپ نے حضور اکرم ﷺ کو دودھ بھی نہیں پلائی، لیکن جب رسول اکرم ﷺ کے پاس آپ تشریف لے گئیں اور چادر مبارک کو ہٹایا تو آپ مسکرا دیئے، گویا اپنی امت کو آپ نے بتادیا کہ دیکھو یہ میری دایہ ہے، اگر چہ اس نے ابھی دودھ نہیں پلائی ہے، لیکن میں اس کو دیکھ کر مسکرا رہا ہوں۔ اے میری امت! تو بھی اپنی ماؤں کو دیکھ کر مسکرا دینا، اس میں ہم کو ایک بڑا سبق دیا اور یہ بتادیا کہ دیکھو میں دودھ پلانے والی کو دیکھ کر مسکرا رہا ہوں، تم پیدا کرنے والی کو دیکھ کر کے مسکرا نہیں سکتے۔ حضور اکرم ﷺ کی زندگی ہر لحاظ سے ہمارے لئے نمونہ ہے اپنی صاحبزادی کا معاملہ دیکھیے کہ آپ اپنی صاحبزادی کے ساتھ کیسا سلوک فرماتے تھے اور اگر آپ حضور اکرم ﷺ کی سیرت پڑھتے ہیں اور یقینا ہم حضور اکرم ﷺ کے ہر واقعہ کو جو آپ اور ہم ہمیشہ پڑھتے رہتے ہیں، لیکن پڑھنے سے زیادہ پڑھ کر اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہے، شادی سے متعلق یہ کہا جا رہا ہے، جہیز سے متعلق کہا جا رہا ہے، حقیقت یہ ہے کہ لوگ شادی کر رہے ہیں کس واسطے، جہیز کے واسطے، اب یہ بعض نعرہ ہے کہ بھائی لڑکی دے نہ دے، جہیز دے کہ وہی ہمارے لیے کافی ہو جائے گا، مصیبت یہ ہے کہ ہمارے لوگ اب ان کی دعوتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں ان کے اندر اتنی صلاحیت نہیں کہ اپنا ولیمہ کر سکیں، اس لیے بیوی کا پیسہ لے کر ولیمہ کر رہے ہیں، کیا مقام تھا آپ کا، کیا مقام آپ نے بنا لیا۔

بیوی کے پیسہ پر اٹھ رہے ہیں، بیوی کے پیسہ پر بیٹھ رہے ہیں۔ آج ہماری نوعیت یہ ہوگئی ہے کہ ہم اپنا اتنا وقار کھو دیئے ہیں اپنی پوزیشن اتنا گرا لیے ہیں کہ اپنا وقار کسی معاملہ میں نہیں رکھتے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ ہم دیکر شادی کریں، مگر ہم اتنے بھکاری ہو گئے ہیں کہ بھیک مانگے بغیر ہم اپنے گھر کا معاملہ طے ہی نہیں کرتے۔ آج اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم جہیز کی لعنت کو ختم کریں اور آج کل جو بچیاں ہمارے گھروں میں بیٹھی ہوئی ہیں، آج ہم کو معلوم ہے کہ لوگ جہیز اٹھاتے ہیں تو کس درد سے اٹھاتے ہیں، گھر ٹوٹتے ہیں تو کیسے ٹوٹتے ہیں، گھر جمانا تو مشکل ہے، مگر گھر کو توڑنا بہت آسان ہے۔ اور آج ہماری قوم اسی میں بہت آگے ہے، بیٹھے بیٹھے دل ملانے کی کوشش نہیں کرتے ہیں، دل تڑانے کی کوشش ضرور کرتے ہیں، یاد رکھئے سب دل سے تعلق ہے، دل اچھا رہا تو سب اچھے ہیں، دل کالا رہا تو سب کالے ہیں، دل کو اپنے پاس رکھیے۔ جب آپ دل دے چکے ہیں تو یہ شعر ۔

جب آپ دل دے چکے ہیں تو ان سے بدول رہا نہ کرنا
اگر کرم ہو خوشی نہ کرنا اگر ستم ہو گلہ نہ کرنا

☆☆☆

۱۔ تأثرات

ڈاکٹر فخر الدین محمد صاحب

جب تک ہمارا بیسک سماج پیس فُل نہ رہے تو نہ صرف گھر کے اندر امن نہیں رہے گا، بلکہ سماج، ملک اور ساری دنیا میں بدعنوانی کا ایک سلسلہ ہر وقت کے لیے قائم ہوگا، اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات، خصوصاً ہمیں قرآن وحدیث کے ذریعہ جو تعلیمات ملتی ہیں اگر اس پر ہم عمل کریں تو نہ صرف خود اپنی فیملی لائف کو بہتر اور کامیاب یہاں اور آخرت کے لیے بنا سکیں گے، بلکہ اس کی اہمیت سارے عالم کے لیے ضروری ہے، جب تک فیملی نظام درست اور پیس فُل نہ ہو عالمی سطح پر امن قائم رہنا ممکن نہیں ہے، یہ ایک اللہ کی طرف سے نظام بنا ہے اور اس نظام میں اگر ہم کوئی تبدیلی کرتے ہیں تو یقینی طور پر اس میں ناکامی ہوتی ہے۔ جس طرح حال ہی میں سپریم کورٹ نے فیصلہ لینے کی کوشش کی تھی، مگر حقیقت تو یہ ہے کہ یہ آج ہندوستان اور دیگر ملکوں کے سماج میں ایک پریکٹیکل ریالٹی ہے، یہ اس وجہ سے ہے کہ ہم عائلی زندگی اور عائلی اتحاد کو نظر انداز کرتے آئے ہیں اور اس کو ایک ماڈرن، ڈیولپ اور انڈسٹرلائزیشن کا حصہ سمجھتے ہیں، ہم انڈسٹرلائزیشن کو حاصل کرنے میں، فیملی لائف کو اس کی کامیابی سمجھتے ہیں، جب کہ اسلامی تعلیمات اس کے برخلاف ہیں۔

دوسرا عنوان جو ویمن رائٹس کا ہے جو بار بار مختلف مقامات پر تھیوریکل اور پریکٹیکلی یہ ثابت کیا ہے، ویمن ایز ویمن ہم اس کو بھی کریں، اس کی عزت کریں اور اس کے اور شوشل وجود کو بہتر کر کے اس کا رول ماڈل بنائیں، تو اس سے بہتر اس دنیا کے لیے خاص کر اس بدعنوانی کے زمانے میں بھی ہوسکتا ہے۔ ویمن رائٹس کو اسلام نے اس زمانے میں سارے عالم کے سامنے ظاہر کیا، جبکہ بچیوں کو زندہ دفن کیا جاتا تھا، آج بدعنوانیوں کی وجہ سے اسٹیٹس ان تمام کاموں کے لیے مثبت نہیں ہے جو کہ مرد کے لیے اللہ تعالیٰ نے مثبت کیا ہے، اس کے باوجود وہ کمیشن، آرگنائزیشن، لبریشن کے نام پر ویمن کے نام پر رائٹ کے نام پر اس کو سول کرتے رہے اور اس کے جو غلط نتائج ہیں آپ اور ہمارے سامنے بار بار کھلتے آرہے ہیں، آج نہ صرف مسلم سماج بلکہ سارے عالم کو بتانے کی ضرورت ہے کہ اسلام اس کی حقیقت اور اس کی روح کو پہچانئے اور اس پر عمل کرنے کے لیے پورے طور سے پلان کیجئے، جس سے پھر سے ہم ایک کامیاب سوسائٹی کو وجود میں لاسکیں، آج ہم صرف ریسیکیشن کی مہارت حاصل کرنے کی فکر میں ہیں، ریسیکیشن، جو اسپرٹ، جو میسیج، جو ڈائریکٹلی قرآن آپ کو دے رہا ہے، جو آپ کو بار بار چیلنج کرتا ہے وہ ہم مس کر رہے ہیں، کیونکہ لینگوئج سے ہم دور ہیں، مجھے امید ہے کہ آپ کی یہ چھوٹی سی کوشش یقینی طور پر ایک تبدیلی لائے گی۔

آج ہم ڈائگنوسٹک کے بارے میں ہی شیور نہیں ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ شاید ڈائگنوسٹک میں غلطی ہے، شاید ہمیں مرض ہی نہیں ہے، جب تک آپ اپنے مرض کو مرض نہ سمجھیں تو جانچ نہیں کرائیں گے، آج ہم اس کوشش میں لگے ہیں کہ ہم مرض کو پہچانیں، اس کی سمت کو سمجھیں اور وہ سمت کے لحاظ سے جانچ کی تلاش کریں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے پاس قرآن وحدیث کا نسخہ برقرار ہے، مگر اس کو استعمال کرنے کے لیے پہلے اس کو پڑھیں اور پھر حل تلاش کریں۔

☆☆☆

۱۱ تاثرات

جناب کے ایم عارف الدین صاحب

میں محسوس کرتا ہوں کہ مسلمانوں کی معیاری تعلیم سے محرومی، ہم اعلیٰ عہدوں پر پہنچنے نہیں دے رہی ہیں، اگر آپ اعلیٰ عہدوں پر نہیں پہنچیں گے تو حکومت کی مشنری کا حصہ نہیں بنیں گے اور حکومت میں آپ کی کوئی آواز نہیں ہوگی۔ اور ہم اپنے آپ کو خوش فہمی میں رکھے رہیں گے، اب خاندانی نظام کے تعلق سے جہاں تک بات ہے، چند چبھتے ہوئے سوالات ہیں، جو موجودہ زمانہ میں ابھر رہے ہیں جن کے تعلق سے ہمارے علماء دین سنجیدگی سے سوچیں۔ اگر آپ سوچیں گے نہیں تو لوگ راستہ ادھر کرلیں گے اور آپ یہیں بیٹھے رہیں گے۔ آپ سب سے میری درخواست ہے کہ یہ دنیا اس وقت گلوبلائزیشن کی وجہ سے بہت چھوٹی ہوگئی ہے۔ تب سوال یہ ہے کہ میڈیا آنے کے بعد ہر ایک کے جذبات، ہر ایک کے خیالات کا ٹکراؤ، اب ہم اس کا مقابلہ کرنے کے بارے میں سوچتے ہیں تو اس کی تیاری کی ضرورت ہے، وہ کس طرح سے کی جائے، علماء دین بیٹھیں اور سوچیں کہ الیکٹرانک میڈیا کا استعمال مسلمان کس طرح سے کرسکتے ہیں، جیسے ایک ایس ایم ایس بھیجا جاتا ہے، تو مختلف ایسے ایس ایم ایس ہم اپنے بچوں کو بھیجیں جس کے ذریعہ سے وقتاً فوقتاً کچھ اسلامی کردار کی نمائندگی ہو، یا اسلامی باتیں ان کو بتائی جائیں، یا برائی کی طرف سے روکا جائے، اسی طرح سے ایسی بہت ساری چیزیں ہیں جس کے ذریعہ ہم اس کی اصلاح کرسکتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ بچیاں آج کل پندرہ سترہ سال سے ہی ٹی وی کلچر کی طرف راغب ہوتی ہیں، یہ فطرت انسانی ہے، آپ فطرت انسانی کو روک کر پندرہ سال چودہ سال کی بچی کو یا تیرہ سال کی بچی کو پانچ سال کے بچے کی طرح بولیں کہ تم چوبیس گھنٹے اس طرح سے رہو تو وہ رہے گی نہیں بغاوت کرنے پر اتر آئے گی تو بہرحال اس بات کو ہمیں ذہن نشین رکھنا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جہیز وغیرہ تو برائی ہے۔ لیکن شادی بیاہ پر اتنا روپیہ خرچ کیا جارہا ہے، مجھے تو شرم آرہی ہے، اس میں زیادہ تر علماء دین موجود ہیں، اس سے پرہیز لازم ہے کیوں کہ اگر علماء دین، مشائخ، خطیب صاحبان، واعظین، ہمارے پیشوا صاحبان مشترکہ فیصلہ کرلیں کہ ہم اس کا بائیکاٹ کرتے ہیں تو کچھ نہ کچھ فرق آئے گا۔

تیسری بات میری یہ ہے کہ آج کل لڑکیاں لڑکوں کے مقابلہ میں زیادہ پڑھ رہی ہیں، ترقی نہیں کر پارہے ہیں، مسلمان بڑی باصلاحیت قوم ہے، لیکن اس باصلاحیت قوم کو ایک حد تک معلوم نہیں کہ ہمارا راستہ کون سا ہے اور ہم کو کیا کرنا چاہئے اس وجہ سے یہ باصلاحیت قوم بے صلاحیت ہوتی جارہی ہے۔

دوسری جو مصیبت مسلمانوں پر اس وقت میری نظر میں ہے کہ ہمارا دین بدنام ہورہا ہے، میرے جیسے ان پڑھ جاہل قسم کے لوگ یہاں بچ رہے ہیں اور وہ چھوٹے موٹے کاروبار میں، بہت پیسہ کمارہے ہیں تو ان کو ان کی کوئی اہمیت ہی نہیں، اگر وہ جائز ناجائز پیسہ بھی کمالیں تو کسی مولانا مولوی کو پکڑ کر وہ ان کے لیے فتوی لے لیتے ہیں، عمرہ وحج کر کے سمجھتے ہیں کہ میں گیارہ مہینے گمراہ رہا تو رہا ایک مہینہ عمرہ کرلیا، تو اس قسم کے واقعات ہم آپ سب کی نظر میں ہیں، بہرحال علماء دین اور ماڈرن قسم لوگوں کا کوئی اجتماع ہی نہیں ہوتا کہ ان سے پوچھا جائے کہ بھائی ان کا حل کیسے نکالا جائے، آپ مذہب کے بڑے اتھارٹی، مذہبی مسائل نہیں، لیکن اس دنیاداری کو چلانے کے لیے کیا طریقے ہم کو اختیار کرنا چاہئے اور اس پر ہم سب کو مل کر غور کرنا چاہئے کہ دونوں کے درمیان آپسی تعلق وربط کیسے پیدا ہو۔

☆☆☆

۱۰ اثرات

ڈاکٹر اسماء زہرہ صاحبہ

دیوالی کلچر، برتھ ڈے کلچر اور پورے طریقے سے غیر مسلم کلچر ہماری سوسائٹی کو پوری طریقہ سے، کرپٹ کرتے جارہے ہیں تو اس تہذیب کا کس طریقہ سے ہم دفاع کریں، تاکہ اسلامی خاندانی نظام کا تحفظ ہو، اور اس کے ساتھ ساتھ یعنی پوزیٹیو اور کنسپٹ رول کیسے ادا کریں ہم اپنی بیٹیوں کو روک نہیں سکتے کہ آپ یہ مت کریئے وہ مت کریئے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم کو یہ پوچھنا ہے کہ ہماری خواتین اکنامک رول کس طرح ادا کریں، ان میں پروڈکشن نیچر کس طرح ہوں، ان کے لیے ٹریننگ پروگرامس ہوں، لیڈرشپ ڈیولپمنٹ ہو، پرسنالٹی ڈیولپمنٹ ہو اور یہ ساری چیزیں جو باطل ادارے ہیں وہاں، بلکہ ہمارے خود ان ہی اداروں میں اس طرح کی تہذیب اور تمدن ہے، اگر اس طرح کا انداز ہوگا تو اپنے بچوں کو ہم باطل تہذیب سکھادیں گے، اس کے ساتھ اگر صرف ہم قرآن کی کچھ تفسیر پڑھادیں گے اور کہیں گے کہ ہم نے یہ بھی ذمہ داری پوری کردی تو میں سمجھتی ہوں کہ یہ ایک اچھے خاندان کی بنیاد نہیں ہوگی، بلکہ ایک اچھے خاندان کی بنیاد جو کہ ایک عورت سے ہوتی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ ہماری کمیونٹی میں ایک کمپنی پلان ہو اور ایک پورا کا پورا روڈ میپ ہو جس سے وہی سوسائٹی اور خاندان کو تعمیر وتشکیل ہوسکے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں قائم کیا تھا، جو جو چیزیں حلال پروفیشن ہیں ان کو اپنی بچیوں کو بتانا اور جو ناجائز ہیں، جیسے بیوٹی پارلز ہوں یا جو ناجائز چیزیں ہیں اور ان کے برے اثرات کیا کیا ہیں، ان تمام چیزوں سے ہمیں اپنی بچیوں کو واقف کرانا ہوگا، اس کے ساتھ ساتھ اکنامک رول جوان کا ہے اس کو ہم کو ڈیولپ کرنا ہوگا، بچت کی عادت ان کے اندر ڈالنا ہوگا، اس کے ساتھ ساتھ ترقی کرنے کی صلاحیت ان کے اندر پیدا کرنا ہوگا۔

اب ہمارے یہاں جو میرج سسٹم ہے، میں سمجھتی ہوں کہ اس پر ہم مزید اگر اور فوکس کریں اور اسٹڈی کریں اور آج ہماری لڑکیوں کے پڑھنے کے باوجود اور تمام خوبیاں رکھنے کے باوجود ہمارا فیملی سسٹم کرپٹ ہوگیا ہے۔ اتنے زیادہ مطالبات ہو رہے ہیں، اور باطل تہذیب کو اختیار کرنے کی وجہ سے ہمارا فیملی نظام اتنا بگڑ چکا ہے کہ شادی کے بعد بھی جو حقوق الزوجین ہیں، اس میں جتنا حق ہے، اتنا حق نہیں مانگنا، یا پھر حق سے بڑھ کر حق مانگنا، یا پیسے کی بنیاد پر ایک دوسرے پر اپنا اثر اس حد تک ڈالنا کہ کبھی عورت ظالم ہے تو کبھی مرد ظالم ہے دونوں جانب یہ ہو رہا ہے، یہ مختلف ٹاپکس ہیں اس کو ہمیں غور کرنا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ شریعت ہماری پسند ہے، شریعت کو ہم نے پسند کیا ہے، شریعت کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے ہماری بیٹیاں اور بہنوں کو بھی راہ عمل دینا ہے۔ صورت حال آج ہماری ملت کی اجتماعیت کی ہے۔ اور اس کی اصلاح کے لیے سب سے پہلے فیملی سسٹم کو قائم کرنا ہے اور عورت کو اسلامی حق جو شریعت نے اس کو دیا ہے اگر ان دونوں پوائنٹ پر ہم گفتگو کریں تو میں سمجھتی ہوں کہ ضرور یہ مسئلہ حل ہوگا۔ میری گزارش ہے کہ ان عنوانات پر غور کرنے کی ہم کوشش کریں۔

☆☆☆

۱۱۔ اثرات

میمونہ سلطانہ صاحبہ

ہمارے معاشرہ میں، امت محمدیہ میں اخلاقی برائیاں جو پیدا ہو چکی ہیں ان کو کھلے انداز میں ہم کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا ہے، تمام کو آنے کی ضرورت ہے گھر گھر پر ہم کو سر مارنا پڑے گا، گھر گھر کے اندر ہم کو جانا پڑے گا، ان برائیوں کو دور کرنے کے لیے۔ اور جو اخلاقی برائیاں ہمارے معاشرہ میں پیدا ہوگئی ہیں، خاص طور پر ہماری نوجوان لڑکیاں اور لڑکے جو جہالت کے دلدل میں پھنس رہے ہیں، برائیوں کے دلدل میں پھنس رہے ہیں۔ اس کے اسباب کیا ہیں پہلے ہم کو اس پر غور کرنا ہے۔ اس میں سب سے پہلے جو ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمارے معاشرہ میں ایجوکیشن کا معاملہ پیش آرہا ہے، اس کے بعد ہمارے گھروں میں جو ٹی وی سیٹ رکھے گئے ہیں، بچوں اور بچیوں کے ہاتھوں میں سیل فون تھما دیتے ہیں...... انٹرنیٹ اور ہم کو نہیں معلوم کہ ہمارے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں راتوں میں بیٹھ کر انٹرنیٹ کا مس یوز کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جو بہترین عقل سلیم سے نوازا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم لوگ جتنا چاہے اس کے اندر غور کرو اور الحمد للہ آج انسان زمین تو زمین آسمان تک پہنچ چکا ہے۔ مگر جو ترقی انسان نے کی ہے آج وہ ترقی اس کے لیے وبال جان بن چکی ہے، ہماری نوجوان نسل تباہ و برباد ہو رہی ہے، ہم کو اپنے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں پر نظر رکھنا ہے اور اس میں سب سے پہلے بڑی ذمہ داری ماں اور باپ کی ہوتی ہے، ماں باپ کو چاہئے کہ اپنی اولاد کی تربیت میں اپنا تمام وقت لگا دے، خالی پرورش نہیں، پرورش تو جانور بھی اپنے بچوں کی کرتے ہیں، چرند، پرند بھی اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ مگر ان کی تربیت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہم کو خاص طور پر احکامات بھیجے ہیں، یعنی اپنی اولاد کی تربیت پر ہم زور دیں گے، آج ہمارے گھروں کا حال یہ ہے کہ جب ٹی وی کھلتا ہے تو ہمارے گھروں کے حضرات بڑی بڑی داڑھیاں رکھ کر اپنی اولاد کے ساتھ بیوی بچوں کے ساتھ جوان بہو بیٹیوں کے ساتھ بیٹھ کر دیکھتے ہیں، ٹی وی کے اندر جو اخلاقی برائیاں ہیں، غیر اخلاقی حرام رشتے، لڑائی جھگڑے فساد یہ ساری چیزیں ہمارے بچے ٹی وی کی وجہ سے کر رہے ہیں، آپ سب اور ہم کو سب سے پہلے اس کے اوپر کنٹرول کرنا ہے، یہ تمام چیزیں ہمارے فائدے کے لیے ہیں، مگر اس کا صحیح استعمال ہم کو کرنا ہے، اس کے بعد سماجی برائیوں میں پردہ کے نظام کو اور زیادہ اچھا کرنا ہے، خالی تقریروں سے، بڑے بڑے سمینار رکھ لینے سے کوئی فائدہ ہونے والا نہیں ہے، ہر ایک اپنے خاندان میں، اپنے گھر میں جھانک کر دیکھے کہ کس طرح پردہ کا انتظام ہو رہا ہے، ہم تو بڑی بڑی باتیں باہر جا کر کرتے ہیں، مگر ہمارے گھروں میں خود پردہ کا انتظام نہیں ہو رہا ہے، آج نامحرم رشتوں کی تو اتنی ہمارے پاس کھلے عام آزادی ہے کہ ہمارے نوجوان بیٹیوں کو ہمارے بہوؤں کو گھر کے ساس اور سسر یہ اجازت دیتے ہیں کہ گھر میں کوئی نامحرم، خاندان کا اگر آ گیا ہے تو صبح ہوتے ہی چائے بنا کر لاؤ، پیش کرو، بہو کو بولتے ہیں کہ چائے بناؤ اور ڈرائنگ روم میں لا کر پیش کرو یہ ہمارے بعض حضرات کا معاملہ ہوتا ہے، ہم کو اس پر بہت زیادہ سختی سے پابندی کرنا ہے، ہمارے گھر کی جوان بیٹی ہو یا جوان بہو ہو خصوصاً ہمارے اپنے خلیرے، پھپھیرے، ممیرے جتنے بھی ہیں، لڑکیوں کو ان کے سامنے قطعاً نہیں جانا ہے، یہ شوہر کا کام ہے یا بہر حال باپ یا سسر کا کام ہے کہ اپنے گھر کی جوان بہوؤں اور بیٹیوں کو کسی کے سامنے نہ نکالیں۔ آج اس کے علاوہ ہمارے یہاں شادی و بیاہ میں جو رسومات ہوتے ہیں ان رسومات کا سلسلہ کہاں سے شروع ہوتا ہے، جب لڑکی کو دیکھنے جاتے ہیں

لڑکی کو پسند کرتے ہیں، ایک گھر میں چار چار دس دس دفعہ جاتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں اس کے بعد ریجیکٹ کر کے واپس آ جاتے ہیں، اور اگر شادی طے ہو جاتی ہے تو آٹھ دس دن گھر میں مصروفیت ہوتی ہے، مہندی وغیرہ یہ تمام رسومات جو ہمارے اندر آ گئے ہیں، آج بڑی بڑی تقریریں کی جاتی ہیں، مگر ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر اہمیت نہیں دی جاتی۔ بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تمام چیزیں کرنا ہے، اسی لیے ہم کر رہے ہیں، جہیز کا معاملہ تو الگ ہے، اس کے علاوہ جو جو معاملات ہیں، ہمارے شادی خانوں میں پردہ کا انتظام نہیں ہے، جمعہ کی جو رسم ہوتی ہے جمعہ کو جب دولہا، دولہن کو اسٹیج پر بیٹھایا جاتا ہے، اس کے بعد دولہن کے مرد پورے آ جاتے ہیں اور دولہے والوں کے مرد پورے آ جاتے ہیں، نوجوان لڑکے اور لڑکیاں سب جمع ہوتے ہیں اور خاندان کے بڑے اور بزرگ لوگ اس کو دیکھ کر رہ جاتے ہیں اور وہاں پر کوئی انتظام نہیں ہوتا، ہم سب ان معاملات کو ہائی لائٹ کریں۔

آج ہمارے معاشرہ میں ہماری نوجوان بچیاں ملت کی غیر مسلموں سے شادی کر رہی ہیں، گھروں سے بھاگ کر چلی جا رہی ہیں، ناجائز رشتے قائم کر رہی ہیں، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہم پردہ کی پابندی خود نہیں کر رہے ہیں، ہم اپنے بچوں سے بھی پردہ کی پابندی نہیں کرا رہے ہیں، آج گھر گھر کا رونا ہے کہ ہمارے بچے نافرمان نکل رہے ہیں، ہاں کیوں نہ نکلیں، ہم اپنے بچوں کی شادیاں اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے خلاف کر رہے ہیں، اللہ کے حکم کو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو ہم نے پس پشت ڈال دیا ہے اور وہ تمام چیزیں ہم کر رہے ہیں جس سے شریعت ہم کو منع کرتی ہے۔ جب شادی کرتے ہیں تو ہم سے جو بچے پیدا ہوتے ہیں یقیناً نافرمان ہوں گے اور ماں باپ کے بھی نافرمان ہوں گے، اور پھر اللہ تعالیٰ کے بھی نافرمان ہوں گے۔

☆☆☆

تأثرات

سیدہ عاقلہ خاموشی صاحبہ

مسلم سماج کی موجودہ تصویر کی وجہ سے کافی عرصہ سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ ''مسلم خواتین کے حقوق اور خاندانی نظام'' پر کچھ عملی کام ہو۔ اسی طرح آل انڈیا فقہ اکیڈمی کی طرف سے اس عنوان کے تحت دوروزہ سمینار کے انعقاد نے طبقۂ نسواں کے لیے موقع فراہم کیا کہ وہ نہ صرف اپنے حقوق سے آگہی حاصل کریں، بلکہ اپنے شکوک وشبہات کا ازالہ بھی کرسکیں، مسلم طبقہ جو خوشگوار تبدیلی کے دور سے گزر رہا ہے، خواتین میں مذہبی، تعلیمی، سماجی بیداری پیدا ہورہی ہے، وہ قرآن وحدیث اور شریعت کے تحت دیئے گئے اپنے حقوق سے واقف ہوکر ان کو حاصل کرنے کے لیے مضطرب ہیں، لیکن شوہر یا باپ یا بیٹے کی جانب سے ان حقوق کی عدم ادائیگی ایک وبا کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے، ایسے میں خواتین کی مضطرب نگاہیں ملت کے علماء کرام اور مفتیان عظام کی جانب لگی ہوئی ہیں کہ ایک ٹھوس لائحۂ عمل کے ذریعہ خواتین کے حقوق جو کہ راست طور سے مرد کے فرائض بھی کہے جاسکتے ہیں کے تعلق سے بیداری پر کام ہو۔ اور نہ ادا کرنے والوں کو کم از کم سماجی طور پر برا سمجھنے کا رجحان تعلیم یافتہ طبقہ سے نکل کر عام طبقہ میں بھی سرایت کرجائے، اصلاح معاشرہ کی کامیابی، حقوق نسواں کی ادائیگی سے راست طور سے جڑا ہوا ہے اور ایک بات یہ ہے کہ نہ صرف تقریبات کا انعقاد اور ان میں خواتین کا نہ صرف قیمتی لباس، بلکہ بیوٹی پارلر اور فیشن کا فروغ مسلم سماج کے اقتصادی مسائل کے لیے ناسور بن چکے ہیں، جو کہ اقتصادی مسائل راست طور سے تعلیمی اور سماجی ترقی سے بھی جڑے ہوئے ہیں، اقتصادی مسائل جو پیدا ہورہے ہیں نہ صرف تقریبات کی وجہ سے، بلکہ خواتین کے بیجا اسراف کی وجہ سے بھی ہورہے ہیں۔ اس لیے آل انڈیا فقہ اکیڈمی کے اس پلیٹ فارم سے میں امید کرتی ہوں کہ ایسے ٹھوس گائڈ لائن خواتین کے سامنے لائے جائیں کہ وہ تقریبات میں کس طرح سے شرکت کریں؟ اور ایک بات یہاں سے میں کہنا چاہوں گی کہ جس طریقہ سے زمانہ ترقی کررہا ہے اور نہ صرف ٹی وی سے بلکہ موبائل اور انٹرنیٹ اور دوسری ٹیلی کمیونیکیشن کی چیزیں عام ہورہی ہیں اس میں ماں کا کردار بہت زیادہ اہم ہوتا ہے، جس طریقہ سے یہ چیزیں عام ہورہی ہیں ماں کی ذمہ داری بھی زیادہ ہوتی جارہی ہے اور اس پر یہ دیکھنا ہے کہ کس طریقہ سے اس کا ان کی اولاد استعمال کررہی ہیں، اس سے دور رہ کر زندگی گزارنا ناممکن ہے، لیکن ماں کو چاہئے کہ وہ ہر لمحہ ہر فیملی میں اپنی اولاد کے لیے ایک رول ماڈل کا کردار نبھائیں اور ان کے لیے ایک پہرہ دار کی ذمہ داری بھی وہ نبھائیں، نہ صرف یہ، بلکہ یہ دیکھتے ہوئے اور محسوس کرتے ہوئے کافی تکلیف ہوتی ہے کہ ملت کے نوجوانوں میں اور لڑکیوں میں منفی عمل بہت زیادہ ترقی کررہا ہے اس کے لیے بھی ماؤں کو اور ان کے والد کو کام کرنے کی ضرورت ہے، نیگیٹیو ایٹی ٹیوڈ اور پرسنالٹی سے کوئی قوم ترقی کرنے والی نہیں ہے، جب تک ہماری سوچ مثبت نہ بنیں، پوزیٹیو پرسنالٹی اور پوزیٹیو سوچ کی حامل نہ بنے ہمارے اندر بیداری ہرگز پیدا نہیں ہوسکتی اور ہم ترقی کی منزلیں طے نہیں کرسکتے اور ہم اپنا ایک منظم کردار بھی نبھا نہیں سکتے۔

☆☆☆

صدارتی خطاب

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب[1]

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

الحمد لله رب العلمين والصلوٰة والسلام على سيد المرسلين وعلىٰ آله وصحبه أجمعين۔

بزرگان محترم، بھائیو اور بہنو! اللہ تعالیٰ کا بہت شکر و احسان ہے کہ وقت کے اہم موضوع پر اللہ کی توفیق سے ہم لوگ جمع ہوئے ہیں اور اللہ کی کتاب، جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور اس دور کے تقاضوں اور تجربات کو سامنے رکھ کر یہاں راہ عمل متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس وقت اس نشست میں محترم جناب ڈاکٹر عبدالرشید صاحب نے بنیادی بات کہی کیونکہ حقوق کی ادائیگی اور فرائض کی تکمیل دونوں کی بنیاد اصل میں تقوی اور اللہ کے خوف پر ہے، مولانا محمد حسام الدین جعفر صاحب جو صاحبزادے ہیں حضرت مولانا عاقل صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انھوں نے جہیز کی شناعت اور برائی پر توجہ دلائی، ہمارے بہت ہی قابل احترام دوست اور ملت کی ایک بہت ہی مفید اور کارکن شخصیت بالخصوص تعلیم کے میدان میں اور ان کے اس کام کی وجہ سے ہم لوگ ان سے محبت رکھتے ہیں جناب کے ایم عارف الدین صاحب، جنھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے بعض خیالات سے آپ حضرات کو اتفاق نہ ہو، لیکن ایک مزاج ہم لوگوں کو یہ بنانا چاہئے کہ بات چاہے کتنی ہی خلاف مزاج ہو اس کو تحمل کے ساتھ سنیں اور اگر ہمارا نقطۂ نظر مختلف ہے تو اس کو بردباری اور واقعیت کے ساتھ پیش کریں، رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک صاحب آئے نوجوان، کہنے لگے کہ میں زنا چھوڑ نہیں سکتا، اب سوچئے کہ کتنا سخت جملہ ہے اللہ کے پیغمبر کے سامنے ایک نوجوان کہے، آج اگر کسی باپ کے سامنے اس کا بیٹا کہے، کسی استاذ کے سامنے اس کا شاگرد کہے کتنا غصہ آئے گا۔ چہ جائیکہ کہ نبی کے سامنے اس کا امتی، صحابہ کی آنکھیں چڑھ گئیں، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم بالکل نارمل رہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قریب بلایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم جس عمل کا ذکر کرتے ہو، اگر یہی عمل تمہاری ماں کے ساتھ کوئی شخص کرے، کہا میں اس کو برداشت نہیں کرسکتا، بیوی کے ساتھ میں اس کو گوارا نہیں کرسکتا، بیٹی کے ساتھ میں ہرگز برداشت نہیں کرسکتا، بہن کے ساتھ، اس نے کہا قطعی برداشت نہیں کروں گا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سمجھایا کہ تم جب اس حرکت کا ارتکاب کروگے تو سوچو، وہ بھی تو کسی کی ماں، کسی کی بیٹی، کسی کی بیوی، کسی کی بہن ہوگی، اس کے جذبات کیا ہوں گے، تو فوراً بات ان کے سمجھ میں آئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے دعا بھی کی، فوراً انھوں نے توبہ کرلی، بات کتنی گراں خاطر تھی، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی تحمل اور بردباری کے ساتھ سنا، تو ایک مزاج ہم لوگوں میں پیدا ہونا چاہئے، کے ایم عارف الدین صاحب یا ہمارے اور احباب، یہ تو ہمارے صف کے لوگ ہیں، دردمندی میں ایسی باتیں کہتے ہیں، لیکن اگر کوئی غیر مسلم بھی اسی بات کو ہم سے کرے جو بالکل ہمارے مزاج کے خلاف ہو تب بھی

---

[1] جنرل سکریٹری، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

مشتعل ہوئے بغیر ہم برداشت کریں اور ہم واقعیت کے ساتھ اس کا جواب دیں، یہ اصل میں اسلامی طریقہ ہے، یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ اس کی کمی ہمارے اندر پیدا ہوتی جارہی ہے۔ کے ایم عارف الدین صاحب نے کئی اہم باتوں کی طرف توجہ دلائی۔ جہیز ہی نہیں، اسراف بھی بہت بری بیماری ہے، یہ بھی صحیح ہے کہ علماء، اہل دین اور دانشوروں کو واقعی ایسی تقریبات میں شرکت سے گریز کرنا چاہئے جو شریعت کے خلاف ہو اور جو سماج کو فضول خرچی، بگاڑ اور دوسری برائیوں کی طرف لے جاتی ہو۔ ماشاء اللہ انھوں نے اپنے یہاں کی تعلیمی کامیابی کا ذکر کیا، یہ ہم سب لوگوں کے لیے بہت ہی مبارک بات ہے اور ہم لوگ اس کی تحسین کرتے ہیں۔

البتہ ہم یہ ضرور عرض کرنا چاہتے ہیں کہ تفریحات کے بارے میں یہ تصور کہ یہ اسلام میں ہے، ایسا نہیں ہے کہ اسلام ایک ایسا بند مذہب ہے جس میں انسان کے لیے تفریح کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے، خوش طبعی کی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے، ہمارے یہاں جو اگلا سمینار ہورہا ہے اسلامک فقہ اکیڈمی کا رامپور میں، اس کا ایک موضوع تفریحات بھی ہے، تفریحات کے جائز حدود کیا ہیں؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک طریقہ تھا اس کو ہمارے بزرگوں نے لکھا ہے، ایک ہے امالہ اور ایک ہے ازالہ، کسی آدمی کے اندر جو بات ہو آپ چاہیں تو وہ صلاحیت اس کی بالکل ختم ہوجائے یہ ازالہ ہے، یہ عام طور پر ہو نہیں پاتا ہے، انسانی فطرت کو بدلا نہیں جا سکتا، دوسرا طریقہ امالہ ہے یعنی اس کی صلاحیت کو باقی رکھتے ہوئے اس کو نشوونما دیتے ہوئے اس کا رخ آپ موڑ دیں، اچھے کام کی طرف اس کا رخ موڑ دیں، ایک آدمی ہے اس کے اندر بولنے کی اچھی صلاحیت ہے، اس کو آپ اچھا مقرر بنادیں کہ اسلامی اور دعوتی بات کہہ سکے، کسی آدمی کے اندر اچھا لکھنے کی صلاحیت ہے تو بجائے اس کے کہ وہ مخرب اخلاق کہانیاں لکھے اس کو اخلاقی کہانیاں لکھنے کا مزاج اس کے اندر بنادیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے زمانۂ جاہلیت کے جو شعراء تھے ان کا خاص موضوع تھا شراب، حضور نے شاعری کو منع نہیں کیا، بلکہ اس کا رخ موڑ دیا، اب صحابہ کرام نے شاعری کی تو دینی مقاصد کے لیے کی۔ تو میں یہ درخواست کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ جیسے ناچ گانا ہے ظاہر ہے کہ اسلام میں اس کی اجازت نہیں ہے اور اب ایسی چیزوں میں ہمیں بچیوں کو سمجھانا چاہئے کہ جو لوگ لڑکیوں سے رقص کرواتے ہیں وہ دراصل لڑکیوں کا استحصال کرتے ہیں، یہ ان کو عزت دینا نہیں ہے، ان کا استحصال کرنا ہے، ہم دوسروں کا رقص دیکھنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں، لیکن ہماری بیٹی رقص کرے تو ہم اس کو گوارہ نہیں کرسکتے۔ اس لیے اس کو صحیح رخ دیا جائے، مثال کے طور پر گانا ہے اس کے بجائے لڑکیوں کا پروگرام ہو اس میں نظمیں آپ ان سے پڑھوایئے، ان میں نعتیہ مقابلے ان سے کروایئے، آپ جنرل نالج میں مقابلے ان کے رکھ دیجئے، پکوان کا مقابلہ رکھ دیجئے، اچھا سے اچھا کھانا ان سے بنوایئے، جائز حد تک ان کو کہیں لے جایا جائے تفریح کے لیے کسی تاریخی جگہ پر اور ان کو بتایا جائے اس کی ہمیں کوشش کرنی چاہئے۔

خود ہمارے عارف الدین صاحب، ڈاکٹر فخر الدین صاحب اکثر ان لوگوں سے میں کہتا ہوں کہ جو مسلم تعلیمی اداروں سے جڑے ہوئے ہیں کہ آپ جائز، متبادل تفریحات تو کرایئے اور ضرور اس کو کیجئے، تاکہ ایسا نہ ہو کہ لڑکے اور لڑکیاں آپ کے یہاں بوریت محسوس کرنے لگیں، تو یہ پہلو اگر سامنے ہو تو انشاء اللہ سونے پر سہاگہ ہوجائے، ہمارے عارف الدین صاحب نے اجتہاد کی بات بھی کہی، اصل میں اجتہاد کے معنی شریعت کے احکام کو بدلنا نہیں ہے، اجتہاد کا مطلب نئے مسائل کو شریعت کے احکام پر منطبق کرنا ہے، جو بات قرآن وحدیث میں موجود ہے ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں ہم اس کو بدل نہیں سکتے۔ جیسے ہم

ہندوستان کی شہریت کو قبول کرتے ہیں تو ہم اس دستور کے وفادار ہیں ہم اپنے طور پر کوئی اس میں تبدیلی نہیں کر سکتے، اسی طرح ہم نے اللہ تعالیٰ سے اس کے دستور کی وفاداری کا عہد مانگا ہے تو یقیناً جو نئے مسائل پیدا ہوں اس میں اجتہاد کیا جاتا ہے، اسلامک فقہ اکیڈمی تو یہی کام کر رہی ہے، ڈیڑھ سو مسائل اب تک جو بالکل کرنٹ ٹاپکس پر ہیں جو آج کے مسائل ہیں ان کے بارے میں اکیڈمی نے رائے کا اظہار کیا ہے، لیکن اس کے حدود ہیں "تلك حدود الله فلا تعتدوها" (اللہ نے جو حدیں قائم کردی ہیں ہم ان کو پھلانگ نہیں سکتے اور چونکہ میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کا سکریٹری بھی ہوں اور اس میں ایک مسئلہ نفقہ مطلقہ والا ہے، ممکن ہے عارف صاحب ایک حد تک واقف بھی ہوں وہ بڑے ہیں، لیکن مولانا مجاہد الاسلام صاحب کی تو مستقل کتاب ہے نفقۂ مطلقہ پر، جس میں اس موقف کی مخالفت کی گئی ہے کہ رشتۂ نکاح کو ختم کرنے کے بعد بھی پچھلے مرد پر اس کا نفقہ واجب قرار دیا جائے، ایسا نہیں ہے کہ عورت بغیر نفقہ کے رہے گی، اس کے متبادلات موجود ہیں، لیکن جب ایک رشتہ ختم ہو چکا ہے اور نکاح میں نہیں رہی وہ عورت اور پھر اس مرد سے نفقہ دلایا جائے تو اس عورت کی غیرت کے بھی خلاف ہے، اس کے دینی، اس کے اندرونی، نفسیاتی ضرورت کے بھی خلاف ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے اس کو قبول کریں۔ ہمارے پاس تو جو دارالقضاء میں معاملات آتے ہیں، بعض معاملات تو ایسے ہوتے ہیں کہ شوہر نے جو سامان تحفہ کے طور پر دیا تھا شادی کے وقت، میں نے کہا کہ بھائی یہ عورت کا حق ہے اس کو واپس نہیں کرنا چاہئے، لیکن عورت نے واپس کر دیا، کہا اب مجھے ان تحفوں کی ضرورت نہیں، جب رشتۂ نکاح ہی ختم ہو گیا تو میں اس شخص کا کوئی سامان اپنے پاس کیوں رکھوں، تو سوچ کا ایک انداز یہ بھی ہے، بہر حال ہمارے کے ایم عارف الدین صاحب کی بہت سی مفید باتیں تھیں اس میں اور تعلیم کے میدان میں جو ان کی خدمت ہے وہ بہت قابل تحسین ہے۔

جنابہ اسماء زہرہ صاحبہ نے بڑی اہم باتیں بتائی ہیں، مشترکہ خاندان کے بارے میں بھی انھوں نے فرمایا اسلامک فقہ اکیڈمی کا جو اگلا سمینار ہے جو رامپور میں مارچ کے شروع میں انشاء اللہ ہوگا اس میں ایک مستقل موضوع ہے "مشترکہ خاندانی نظام" بہت ہی تفصیل کے ساتھ اس پر مقالے آئے ہیں اور اکیڈمی نے خاص طور سے خواتین کے مسائل کو خصوصی توجہ دی ہے، آج کی اس مجلس میں شرکت کے بعد یہ احساس ہوا کہ وہ فیصلے اکیڈمی کے جو خواتین کے مسائل سے متعلق ہیں، خواتین کی ملازمت پر بھی موجود ہیں، جیسا کہ میں نے ذکر کیا، تو انشاء اللہ اس مجموعے کو ہم لوگ ایک جگہ شائع کریں گے اور آپ بہنوں تک زیادہ سے زیادہ پہنچائیں گے، انشاء اللہ آپ کو اس سے فائدہ بھی ہوگا اور اسلام پر انشاء اللہ آپ کا یقین بنے گا۔

اسی طرح ہماری بہن میمونہ سلطانہ صاحبہ نے پردہ کے سلسلہ میں والدین کی ذمہ داری کے سلسلہ میں انٹرنیٹ کے سلسلہ میں، جناب عاقلہ خاموشی صاحبہ نے حقوق نسواں کے سلسلہ میں، تقریبات میں شرکت کا کیا طریقہ ہونا چاہئے اور بیوٹی پارلرز اور اس کے حدود کیا ہیں، اس پر گفتگو کی، بڑی مفید گفتگو ہوئی، ڈاکٹر فخر الدین محمد صاحب نے موجودہ حالات پر بھی تبصرہ کیا اور تعلیم کی اہمیت کو بھی بتایا، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "العلم نور" (علم روشنی ہے)، ساری تاریکیاں چھٹتی ہیں علم کی وجہ سے، چاہے وہ جہالت کی تاریکی ہو، یا مادیت کی تاریکی، یا بے دینی و بداخلاقی کی تاریکی ہو، واقعی سب سے زیادہ ہم کو اپنے معاشرہ میں تعلیم پر محنت کرنے کی ضرورت ہے، تعلیم اور ایسی تربیت جو انسان کو خدا سے جوڑنے والی ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجلس میں بہت مفید باتیں آئی ہیں اور ان تمام باتوں کو اس نقطۂ نظر سے سمجھنا چاہئے کہ یہ درد دل ہیں آدمی کو جب کوئی تکلیف ہوتی ہے تو وہ تڑپ کرکے ہر

آدمی سے بیان نہیں کرتا ہے، اپنے گھر والوں سے، اپنے دوستوں سے، اپنے رشتہ داروں سے بیان کرتا ہے، اسی نقطۂ نظر سے اس کو سننا چاہئے اور اسی نقطۂ نظر سے اس کو سمجھنا چاہئے، اسی نقطۂ نظر سے جو باتیں قابل عمل ہوں اس پر عمل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ وقت بہت زیادہ ہوگیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ کم سے کم تین بجے تک ہم لوگوں کو یہ نشست ختم کر تجاویز بھی پیش کی جانی ہے۔

لیکن اس پورے موضوع کے بارے میں تین باتیں دو دو تین منٹ میں آپ سے ضرور عرض کرنا چاہوں گا، ایک بات تو یہ ہے کہ آج مغربی دنیا میں جو عورتوں کا استحصال ہے آپ کو معلوم ہوگا کہ انیسویں صدی تک یورپ میں عورتوں کو حق میراث نہیں دیا جاتا تھا، اس کی وجہ سے یورپ میں آزادئ نسواں کی تحریک اٹھی کہ عورتوں کو مردوں سے آزاد کیا جائے، اس تحریک نے دو دھڑ بنادیئے ایک مرد اور ایک عورت۔ لیکن اسلام کا بنیادی تصور اس سے مختلف ہے، نکاح کے شروع میں خطبہ میں جو آیت پڑھی جاتی ہے: "یأیها الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدة وخلق منها زوجها وبث منهما رجالاً کثیراً ونساءً" اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا، یعنی قرآن نے یہ تصور دیا کہ مرد و عورت دو پارٹیاں نہیں ہیں، بلکہ مرد و عورت دو پارٹ ہیں، دو حصے ہیں ایک دوسرے کا پارٹ ہیں، مقابل پارٹی کے بارے میں ایثار کا جذبہ نہیں ہوتا ہے، خودغرضی کا جذبہ ہوتا ہے ہر ایک چاہتا ہے کہ مجھے زیادہ فائدہ ہو۔ ابھی کئی سوالات ہماری بہنوں کے آئے اس سے اس کا اندازہ ہوا۔ اور جب آدمی کسی چیز کو اپنا حصہ سمجھتا ہے تو اس کے بارے میں ایثار کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اتنی بات صحیح ہے کہ آج کل آزادئ نسواں کا بہت سوال اٹھایا جاتا ہے، اسلام نے تو سب کو آزادی دی ہے، مرد بھی آزاد ہیں عورتیں بھی آزاد ہیں، باپ بھی آزاد ہے، بیٹا بھی آزاد ہے، بیٹا اگر بالغ ہو تو باپ اس کی جائدادوں میں تصرف نہیں کرسکتا اور نابالغ ہو تو اس کے مفاد کے خلاف نہیں کرسکتا، لیکن جو بھی آزادی بے قید ہوگی وہ انسانیت کے لیے مفید ہونے کے بجائے نقصان دہ ہوگی، آپکو سڑک پر چلنے کی آزادی ہے، لیکن آپ نے کہا کہ ہم بے قید آزادی رکھتے ہیں، ہم بائیں طرف کے بجائے دائیں طرف سے چلیں گے، تو آپ بتائیے کہ یہ آزادی آپ کے لیے مفید ہوگی یا نقصان دہ ہوگی؟ نقصان دہ ہوجائے گی، ہر شعبۂ زندگی میں آپ دیکھیں آپ اپنے آپ میں آزاد ہیں، لیکن کوئی شخص یہ کہے کہ میں آزاد ہوں، میں خودکشی کرلوں گا، اپنے آپ کو جلا لوں گا، یہ آزادی اس کے حق میں مفید ہوگی یا نقصان دہ ہوگی؟ تو جتنی آزادی ہے اگر آزادی اخلاق کی اور مذہب کی حدود سے، اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے حدود سے آزاد ہوجائے تو وہ انسانیت کے لیے رحمت نہیں ہے، انسانیت کے لیے زحمت ہے، اس لیے ہماری مائیں اور بہنیں بھی اس بات کو یاد رکھیں کہ اسلام نے آپ کو عزت کا مقام، احترام کا مقام، بلندی کا مقام دیا ہے اور آپ کے حقوق مردوں کے حقوق سے بڑھ کر رکھے ہیں، تفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں ہے اور لڑکیوں کو شریعت میں لڑکوں پر ترجیح دی گئی ہے، ماں کو باپ پر، بیٹی کو بیٹے پر، لیکن اس کے باوجود جو حدود و قیود شریعت نے متعین کیے ہیں وہ آپ کے بھی حق میں ہیں اگر آپ اس حد سے باہر نکلنا چاہیں گی تو یہ آزادی آپ کے لیے امرت نہیں ہوگی زہر ہوگی، یہ آپ کے لیے سکون کا سبب نہیں ہوگی، بلکہ بے چینی کا سبب بن جائے گی۔

تیسری بات کہہ کر میں اپنی بات ختم کرتا ہوں قرآن نے تین اصطلاحوں کا استعمال کیا ہے ظلم، عدل اور احسان۔ ظلم کے معنی ہیں اپنے حق سے آگے بڑھ کر دوسرے کا حق لے لینا ظلم ہے۔ ایک عورت سے جہیز کا مطالبہ کیا جائے، ہماری بہن کو حق میراث نہ

دیں یہ ظلم ہے۔ عدل یہ ہے کہ جتنا دوسروں کا حق اس کو دیجئے جتنا اپنا حق ہے خود لیجئے۔ ظلم حرام ہے اور عدل جائز ہے۔

تیسرا درجہ احسان کا ہے احسان کے معنی اپنا حق چھوڑنا اور دوسرے کو اس کے حق سے زیادہ دینا یہ احسان ہے، ہمیشہ یاد رکھیے، خاندان کے استحکام اور تعلقات کی استواری کی بنیاد عدل پر نہیں ہوسکتی احسان پر ہوسکتی ہے، شوہر یہ کہے کہ ہم بیوی کو اس کے حق سے زیادہ دیں گے، بیوی یہ سوچے کہ شوہر کا جتنا حق ہے اس سے زیادہ ادا کریں گے، ماں وباپ اپنے بال بچوں کے لیے ان کے حق سے بڑھ کر کرے، لڑکا بالغ ہوجائے تو نفقہ واجب نہیں ہے لیکن باپ کہے کہ نہیں بیٹا ہمارا ہے ہم نفقہ اس کا ادا کریں گے، یہ احسان ہے اس سے خاندانی نظام کا استحکام ہوتا ہے تو ہمیں اس بات کی کوشش کرنی چاہئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لیے بتایا اور میں نے اس سے پہلے بھی حوالہ دیا کہ آپ نے فرمایا مجھے ۹/ باتوں کا حکم دیا گیا ہے اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ "أنا أصل من... جو میرے ساتھ رشتہ کے معاملہ میں بے رحمی کا ثبوت دے میں اس کے ساتھ رحم دلی کا معاملہ کروں یہی احسان ہے۔

تو میرے بھائیو اور بزرگو! اور خاص طور پر بہنو! آپ سے یہ عرض کرنا ہے کہ خاندانی استحکام موقوف ہے اس بات پر کہ ہم اپنے معاشرہ کی بنیاد ظلم پر تو رکھنا جائز ہی نہیں ہے عدل پر بھی نہیں، احسان پر رکھیں، اس سے تعلقات خوشگوار ہوں گے، اس سے رشتے مضبوط ہوں گے اور اس سے خاندانی نظام کو استحکام حاصل ہوگا، بہرحال بہت ہی خوشی کی بات ہے کہ یہ بہت اچھا پروگرام یہاں ہوا، ہمارے ڈاکٹر فخر الدین صاحب نے کہا کہ خواتین اس میں کم ہیں واقعی کم ہیں، لیکن اس کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہاں جو ہماری بہنیں آئی ہیں وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں، مختلف تنظیموں کی نمائندہ اور مختلف علاقے کی نمائندہ بہنیں ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اس سیمینار کے پیغام کو وہ اپنی دوسری بہنوں تک بھی پہنچائیں گی اور پورے معاشرہ کو اس کا فائدہ پہنچے گا، انشاء اللہ، اب اس کے بعد اکیڈمی کے شعبہ علمی کے رفیق مولانا صفدر ندوی صاحب تجاویز پیش کریں گے تو انشاء اللہ زیروکس کر کے آپ تمام حضرات تک یہ تجاویز پہنچائی جائیں گی اور اس کے بعد اقبال احمد انجینئر صاحب شکریہ ادا کریں گے میں کے ایم عارف الدین صاحب کا بھی خاص طور سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے شہر کے ایک مرکزی مقام پر یہ ہال رکھا ہے اور اس کی وجہ سے دینی ومذہبی پروگرام جو ایک طرح سے نئے اور پرانے شہر کے سنگم کی طرح ہے تو ایسے پروگرام رکھنے کا موقع ملتا ہے اللہ تعالیٰ ان کو جزاء خیر دے اور ان کی جو مفید کوششیں ہیں اللہ ان کو قبول فرمائے۔

تمت

علم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ

جدید فقہی مباحث

قیدیوں کے حقوق

(قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کا عالمی معیار)

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے اٹھارہویں فقہی سمینار منعقدہ مورخہ ۲۸ فروری تا ۲؍مارچ ۲۰۰۹ء کو
مدورائی میں پیش کئے گئے علمی، فقہی اور تحقیقی مقالات و مناقشات کا مجموعہ

تحقیقاتِ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دار الاشاعت
اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

مجلس ادارت

پیش لفظ

دنیا میں اس وقت اگر مظلوم گروہوں کو شمار کیا جائے تو شاید ان میں سب سے پہلا نام قیدیوں کا ہوگا؛ حالاں کہ بین الاقوامی سطح پر قیدیوں کے لئے قوانین اور معاہدات موجود ہیں اور ہمارے ملک میں بھی نہ صرف ایسے قوانین موجود ہیں؛ بلکہ وقتاً فوقتاً معزز عدالتیں بھی اس سلسلہ میں ہدایات جاری کرتی رہی ہیں؛ لیکن ان سب کے باوجود پوری دنیا میں قیدیوں کے ساتھ جو انسانیت سوز مظالم روا رکھے جا رہے ہیں، وہ ان لوگوں کو لرزاں دیتے ہیں جو اپنے سینوں میں دل اور دلوں میں احساس اور انسانیت کی کوئی رمق رکھتے ہیں، امریکہ نے افغانستان اور عراق میں جو کچھ کیا اور گوانتاناموبے نیز ابوغریب جیلوں میں جو وحشیانہ سلوک روا رکھا گیا، اس نے شاید درندوں کو بھی شرمندہ کردیا ہو، خود ہمارے ملک ہندوستان میں ٹاڈا اور پوٹو کے نام پر بے قصور گرفتاریوں اور پولس حوالات نیز جیلوں میں قیدیوں کے ساتھ مظالم کے جو واقعات منظر عام پر آئے ہیں، وہ یقیناً ہر محب وطن ہندوستانی کے لئے شرمندگی کا باعث ہیں۔

اسلام میں مجرموں اور بعض حالات میں زیر تحقیق ملزموں کو قید کئے جانے کا تصور موجود ہے، سیدنا حضرت عمرؓ نے باضابطہ قیدیوں کے لئے جیل بنائی تھی، حضرت علیؓ نے مزید پختہ جیل بنائی؛ کیوں کہ اپنے اہل تعلق سے کٹ کر انسان کا رہنا اس کے لئے سزا بھی ہے اور اپنی اصلاح کے لئے ایک مہلت بھی؛ لیکن اسلام نے قیدیوں کے تمام انسانی حقوق کا پاس ولحاظ رکھا ہے اور ان کے ساتھ تشدد، ظلم وجور، ناانصافی اور اپنی صفائی اور رفع الزام کے حق سے محروم رہنے کی اجازت ہرگز نہیں دی ہے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ تہذیب کے علم برداروں اور امن کے عالمی ٹھیکیداروں نے قانون کی دھجیاں بکھیر رکھی ہیں اور انسانی حقوق کو اس طرح پامال کیا ہے کہ شاید پاگل ہاتھی بھی کسی کو اس طرح نہ روندتا ہو، اور ان سب کے باوجود الٹے اسلام اور مسلمانوں ہی کو ہدف بنایا جا رہا ہے، نیز اسلام کی تصویر ایک شدت پسند اور مسلمانوں کا چہرہ ایک خون خوار کے چہرے کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے، اس پس منظر میں اکیڈمی نے ضرورت محسوس کی کہ قیدیوں کے حقوق کے عالمی مسئلہ پر سمینار منعقد کیا جائے؛ تاکہ ایک طرف اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات کی وضاحت ہو اور دوسری طرف انسانی ضمیر کو بیدار کرنے کے لئے آواز بلند کی جائے۔

چنانچہ اکیڈمی کے اٹھارہویں سمینار کے لئے جو عنوانات منتخب کئے گئے ان میں ایک یہ بھی تھا، خوشی کی بات ہے اس اہم اور پیچیدہ موضوع پر پچاس کے قریب مقالات موصول ہوئے، سمینار میں موضوع کے مختلف پہلوؤں پر طویل بحثیں ہوئیں، جن نکات پر مقالہ نگاروں کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا تھا، ان میں اتفاق رائے تک پہنچنے کی کوشش کی گئی اور بحمد اللہ متفقہ طور پر تجویزیں منظور ہوئیں، یہ تجویزیں اسلام کی منصفانہ تعلیمات کی آئینہ دار بھی ہیں اور اس وقت دنیا میں ترقی یافتہ طاقتیں قیدیوں کے ساتھ جس غیر انسانی سلوک کو روا رکھے ہوئی ہیں ان کے لئے دعوت وتذکیر بھی۔

اس مجموعہ میں علماء اور ارباب افتاء کے مقالات کے علاوہ ماہرین کی تحریریں، طے پانے والی تجاویز اور تبادلۂ خیال کے دوران ہونے والے مناقشات سب شامل ہیں اور اس طرح یہ اپنے موضوع پر دستاویزی حیثیت کا حامل مجموعہ ہے۔ عزیز گرامی مولانا صفدر زبیر ندوی (رفیق شعبہ علمی) نے ماشاء اللہ بہتر طور پر اس مجموعہ کی تصحیح وترتیب کی خدمت انجام دی ہے، فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے قبول عام وتام عطا فرمائے اور مقاصد کے اعتبار سے ثمر آور بنائے۔ وباللہ التوفیق وهو المستعان۔

خالد سیف اللہ رحمانی

(خادم اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا)

۵/محرم الحرام ۱۴۳۱ھ / ۲۳/دسمبر ۲۰۰۹ء

پہلا باب/تمہیدی امور

سوالنامہ

قیدیوں کے حقوق

اسلام کی تمام تعلیمات اور شریعت اسلامی کے تمام احکام کی بنیاد عدل اور احسان پر ہے، اس میں دوستوں اور دشمنوں، اپنوں اور بیگانوں کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا گیا ہے، اور ہر ایک کے لئے انصاف کا ایک ہی پیمانہ مقرر کیا گیا ہے، اس وقت دنیا میں جو طبقات انصاف سے محروم ہیں اور ان کے ساتھ نہایت غیر انسانی سلوک کیا جاتا ہے، ان میں قیدی بھی ہیں، ہمارے ملک میں اور عالمی سطح پر بھی قیدیوں کے ساتھ بدسلوکی کی ایسی روح فرسا خبریں آتی ہیں، جنہیں سن کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، ان حالات میں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ قیدیوں کے حقوق کے سلسلہ میں اسلام کی منصفانہ تعلیمات پیش کی جائیں، چنانچہ اس سلسلہ میں درج ذیل سوالات قابل توجہ ہیں:

۱- کیا کسی ملزم کو اس کے جرم کا ثبوت فراہم ہوئے بغیر قید کیا جاسکتا ہے اور اگر بطور احتیاط کے قید کیا جائے تو کیا اس کے لئے کوئی مدت مقرر کی جاسکتی ہے؟

۲- درج ذیل امور سے متعلق قیدیوں کو کیا حقوق حاصل ہیں؟

الف- مذہبی امور (عبادت کرنا، مذہبی کتابوں کا مطالعہ، دوسرے قیدیوں کے درمیان دعوت دین، اس کی مذہبی تعلیمات کے مطابق اس کے لئے غذا فراہم کرنا، وہ جس مذہب پر عقیدہ رکھتا ہے اس مذہب کی مقدس شخصیتوں اور کتابوں وغیرہ کی بے احترامی سے گریز) —

ب- جسمانی ضروریات (مناسب غذا، صاف پانی، علاج، حفظان صحت کے لئے ورزش وتفریح، بیوی سے تعلق، ایسی تنگ جگہ میں قیدیوں کو رکھنے کا مسئلہ جہاں کھڑا ہونا یا پاؤں پھیلا کر لیٹنا، یا دیوار کے باہر کسی چیز کا دیکھنا ممکن نہیں)

ج- عام سماجی حقوق (اخبارات پڑھنے، ریڈیو سننے، فون پر احباب واقارب سے گفتگو کرنے، دوسرے قیدیوں سے ملاقات، تعلیم اور ہنر سیکھنا وغیرہ)

د- اخلاقی امور (مردوں اور عورتوں کو الگ قید خانے، بالغوں اور نابالغوں کے لئے الگ قید خانے وغیرہ مسائل)

۳- قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے کس حد تک دھمکانے کی اجازت ہے؟ کیا اس مقصد کے لئے درج ذیل سزائیں دی جاسکتی ہیں:

الف- قیدیوں کو بے لباس کر دینا۔

ب- قیدیوں کو مار پیٹ کرنا

ج- انہیں الکٹرک شاٹ لگانا۔

د- قیدیوں پر کتے چھوڑنا

ھ- قیدیوں کو سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈال دینا

و- انہیں مسلسل جگے رہنے پر مجبور کرنا اور اس کے لئے اس کی جائے رہائش میں تیز روشنی یا تیز آواز کا انتظام رکھنا۔

۴- کیا قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑا جاسکتا ہے یا انہیں ہتھکڑی پہنائی جاسکتی ہے، یا انہیں بیڑی ڈالی جاسکتی ہے؟

۵- کیا کسی مجرم کو اس کے خصوصی جرم کے پس منظر میں قید تنہائی دی جاسکتی ہے؟

۶- کیا جیل میں قیدیوں سے جبرًا کام لیا جاسکتا ہے اور اگر کام لیا جائے تو کیا قیدی اس کام کی اجرت کے مستحق ہیں؟

۷- جن قیدیوں کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے اور جن کے بارے میں سزائے قید کا فیصلہ ہو چکا ہے، قید خانوں میں سلوک کے اعتبار سے کیا ان دونوں میں فرق کیا جاسکتا ہے؟

۸- کیا زیر سماعت قیدیوں کو اتنے دنوں تک فیصلے سے پہلے قید میں رکھا جاسکتا ہے جو ان کے اوپر عائد فرد جرم کی اصل سزا ہے۔

۹- اگر ملزم کو قید میں رکھا گیا ہو اور بعد کو عدالت نے اسے بری قرار دیا تو کیا وہ زمانہ قید میں ہونے والی ذہنی اذیت اور مالی ہرجانہ طلب کرسکتا ہے؟

۱۰- قیدی کو اپنے مقدمات کے سلسلہ میں وکیل سے رابطہ اور صفائی پیش کرنے کے کیا حقوق حاصل ہیں؟

۱۱- کیا خواتین قیدیوں کو اپنے ساتھ شیر خوار بچوں کو جیل میں رکھنے کا حق حاصل ہے؟

☆☆☆

اکیڈمی کا فیصلہ

قیدیوں کے حقوق

عصر حاضر میں، بیرون ملک میں قیدیوں کے ساتھ بدسلوکی کے واقعات جس کثرت سے پیش آرہے ہیں، وہ ہر انسان دوست اور انصاف پسند شخص کے لئے لمحۂ فکریہ ہے، اس تناظر میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا یہ سمینار اسلامی واخلاقی نقطۂ نظر کو واضح کرتے ہوئے درج ذیل تجاویز منظور کرتا ہے:

۱)......کوئی شخص جرم کا مرتکب ہو تب بھی اس کے انسان ہونے کی حیثیت باقی رہتی ہے، اسے اس کے جرم کی سزا ضرور ملنی چاہئے؛ لیکن وہ انسانی توقیر واحترام کے حق سے محروم نہیں ہوجاتا۔

۲)......اگر کسی شخص پر جرم کا الزام ہو، تو جب تک وہ پایۂ ثبوت کو پہنچ نہیں جائے، اس کو مجرم قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ اس کے ساتھ مجرموں کا سا سلوک کیا جاسکتا ہے۔

۳)......کسی الزام کی بنیاد پر قید کرنا جائز ہے؛ بشرطیکہ کسی قوی قرینہ سے ہی الزام کی تائید ہورہی ہو، یا ملزم پر شک کئے جانے کی واضح علامتیں موجود ہوں اور ایسی صورت میں قید کی مدت عدالت کی صوابدید پر ہے؛ لیکن یہ مدت اتنی طویل نہ ہونی چاہئے، جو کسی ثابت شدہ جرم پر دی جاتی ہے۔

۴)......قیدیوں کے حقوق:

(الف)......بلاتفریق مذہب جملہ قیدیوں کو اپنے اپنے مذہب کے مطابق عبادت وعمل کی آزادی حاصل ہوگی، نیز اس کی مذہبی تعلیمات کے مطابق اس کے لئے غذا فراہم کی جائے گی اور وہ جس مذہب پر عقیدہ رکھتا ہے، اس مذہب کی مقدس شخصیتوں اور کتابوں وغیرہ کی بے احترامی سے گریز کیا جائے گا۔

(ب)......قیدیوں کو جسمانی ضروریات:- مثلاً: مناسب غذا، صاف پانی اور موسم کے لحاظ سے کپڑے، نیز علاج ومعالجہ کی سہولیات، فراہم کی جائیں گی، ان کو حفظان صحت کے لئے ورزش کی اجازت ہوگی، قیدیوں کو ایسی تنگ جگہ میں رکھنا درست نہیں، جہاں ٹھیک سے کھڑا ہونا یا پاؤں پھیلا کر لیٹنا ممکن نہ ہو یا ہوا اور روشنی کا مناسب نظم نہ ہو۔

(ج)......قیدیوں کو سماجی حقوق:- مثلاً: تعلیم وہنر سیکھنے، عام حالات میں دیگر قیدیوں سے ملاقات کرنے اور عزیز واقارب سے رابطہ کرنے کے حقوق حاصل ہوں گے، جہاں تک ریڈیو اور ٹی وی کا تعلق ہے تو یہ عموماً تفریحی چیزوں کا حصہ ہوتی ہیں؛ لہذا اس کی اجازت دینا ضروری نہیں؛ البتہ اخبارات پڑھنے کی اجازت دینا حکومت کی صوابدید پر ہے۔

(د)......مردوں اور عورتوں کو الگ الگ قید خانوں میں رکھا جائے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ عورتوں کے حصہ کی نگراں افسر بھی خاتون ہی ہو، زنانہ قید خانہ میں اندرونی دیکھ بھال کا کام بھی عورتیں ہی سنبھالیں اور اسی طرح نابالغ اور بالغ قیدیوں کو بھی الگ الگ رکھا جائے۔

۵)......قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے قیدیوں کا نارکو الائسس کرنا، انہیں بے لباس کرنا، الکٹرک شاک لگانا، ان پر کتے چھوڑنا، ان کو برف کی سلوں پر ڈالنا، انہیں مسلسل جگے رہنے پر مجبور کرنا اور اس کے لئے ان کی جائے رہائش میں تیز روشنی کرنا یا تیز آواز سنانا یہ تمام امور ناجائز، غیر اخلاقی اور غیر انسانی ہیں، اسی طرح ایسی سزائیں جن سے کسی عضو کو نقصان پہنچے، یا اس کے تلف ہوجانے کا اندیشہ ہو یا ذہنی ودماغی صحت متاثر ہونے کا خطرہ ہو، بھی حرام ہے۔

۶)......قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑنا، ہتھکڑی پہنانا یا بیڑی ڈالنا شرعاً ناجائز ہے، البتہ اگر قیدی خطرناک اور عادی مجرم ہو، جس کے فرار ہونے کا یا خود کو یا دوسروں کو نقصان پہنچانے کا اندیشہ ہو تو اس کو قابو میں رکھنے کے لئے قانون کی حدود میں مناسب تدبیر اختیار کی جاسکتی ہے۔

۷)......اگر مصلحت متقاضی ہو تو مجرم کو اتنے دنوں کی قید تنہائی دی جاسکتی ہے، جس کی میڈیکل آفیسر اجازت دے، اور یہ اتنی طویل نہ ہو کہ قیدی ذہنی

مریض ہوجائے۔

۸)...... جبری کام لیا جانا اگر سزا کا حصہ ہوتو بطور تعزیر قیدی سے اس کے حسب طاقت جبری کام لیا جاسکتا ہے اور اس صورت میں شرعاً وہ اجرت کا مستحق نہ ہوگا؛ البتہ حکومت اپنے قانون کے تحت اجرت دے تو یہ اس کے لئے حلال ہوگی، بصورت دیگر وہ اجرت کا مستحق ہوگا۔

۹)...... زیر سماعت قیدیوں کو اصولی طور پر بے قصور تصور کیا جائے، ایسے قیدی مجرم نہیں؛ بلکہ ملزم ہوتے ہیں، ان کے ساتھ مجرموں جیسا رویہ ہرگز نہ اختیار کیا جائے؛ لہذا ان سے جبری کام لینا درست نہیں اور دیگر قیدیوں کے مقابلہ میں ان کے ساتھ اچھا سلوک ضروری ہے۔

۱۰)...... زیر سماعت قیدیوں کو سماعت سے پہلے اتنے دنوں تک قید میں رکھنا جوان کے اوپر عائد فرد جرم کی اصل سزا کے برابر ہے، درست نہیں، نیز فیصلے یا تحقیق حال میں تاخیر نہیں ہونی چاہئے کہ دورانِ مقدمہ قید کی مدت سزا کی مدت سے لمبی ہوجائے اور اگر ایسا ہوتو اسے فوراً رہا کردیا جائے۔

۱۱)...... بے قصور قیدی کو زمانہ قید میں ہونے والی ذہنی اذیت کا مالی ہرجانہ دینا واجب ہے۔

۱۲)...... قیدی کو مقدمات کے سلسلہ میں وکیل سے رابطہ کرنے، اپنے عزیز واقارب سے مشورہ کرنے اور اپنی صفائی پیش کرنے کے سارے حقوق حاصل ہوں گے۔

۱۳)...... خواتین قیدیوں کو اپنے ساتھ شیر خوار بچوں کو جیل میں رکھنے کی اجازت ہوگی۔

۱۴)...... اجلاس نے محسوس کیا کہ ملک میں قید خانوں اور قیدیوں کے تعلق سے جو قوانین اور قواعد نافذ ہیں، ان میں اکثر ان امور کا لحاظ رکھا گیا ہے، جو اسلامی نقطۂ نظر سے اوپر بیان کئے گئے ہیں؛ تاہم عملاً ان کو بہت کم نافذ کیا جاتا ہے؛ اس لئے یہ اجلاس مطالبہ کرتا ہے کہ مذکورہ تمام حقوق قیدیوں کو عملی طور پر دیئے جائیں، اجلاس میں اس احساس کا بھی اظہار ہوا کہ عام طور پر کسی ٹھوس شہادت کے بغیر قانون اور سپریم کورٹ کی ہدایات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے شہریوں کو گرفتار کیا جاتا ہے، گذشتہ چند سالوں میں مسلم نوجوانوں کی اس طرح گرفتاری کے متعدد واقعات ہوچکے ہیں، جنہیں گرفتار کرنے کے بعد اذیت پہنچائی جاتی ہے، ٹارچر کیا جاتا ہے، کئی دنوں تک اپنی تحویل میں رکھنے کے بعد پولیس ان کی گرفتاری درج کرتی ہے اور عدالت میں پیش کرتی ہے، پولیس اور نفاذ قانون کے اداروں کے اس رویہ اور حکومت کی چشم پوشی کے نتیجے میں ملک میں اضطراب اور بے چینی کی کیفیت پیدا ہورہی ہے اور ملک کی جمہوریت داغدار ہورہی ہے؛ اس لئے یہ اجلاس مرکزی اور ریاستی حکومتوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ پولیس کو قانون وقواعد اور سپریم کورٹ کی ہدایات کا پابند بنائے، اس کی خلاف ورزی کرنے والے عہدہ داروں کے خلاف عبرتناک کاروائی کرے اور سخت ہدایات جاری کی جائیں کہ قوی اور ٹھوس بنیاد کے بغیر کسی کو گرفتار نہ کیا جائے اور تعذیب اور ٹارچر کا طریقہ بالکل ختم کردیا جائے۔

۱۵)...... اجلاس کا یہ بھی احساس ہے کہ امریکہ اور بعض یورپی ممالک نے دہشت گردی کا بہانہ بنا کر مختلف مقامات پر جو عقوبت خانے بنائے ہیں اور جن میں وحشیانہ طریقہ پر ایذاء پہنچائی جاتی ہے، یہ بین الاقوامی میثاقات اور اصولوں کی کھلی خلاف ورزی اور انسانیت سوز حرکت ہے، جس کا نوٹس اقوام متحدہ اور دیگر عالمی اداروں اور حقوق انسانی وشہری آزادیوں کی بین الاقوامی انجمنوں کو لینا چاہئے، ہم ان سب سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ان عقوبت خانوں اور ان میں روا رکھے جانے والے مظالم کے خلاف آواز بلند کریں، عالمی ادارے ان ممالک کے خلاف تہدیدات عائد کریں اور انہیں بین الاقوامی قوانین پر عمل کرنے کے لئے مجبور کریں۔

۱۶)...... سمینار اس صورت حال پر گہری تشویش ظاہر کرتا ہے کہ ملک کے بعض علاقوں میں بار کونسلیں اور وکلاء ان لوگوں کا مقدمہ لینے سے انکار کررہے ہیں، جن کے خلاف دہشت گردی کا الزام لگایا جاتا ہے؛ حالاں کہ قانونی دفاع ہر شخص کا حق ہے اور یہ ایک مسلمہ عالمی قانون ہے کہ ملزم کو مجرم کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، نہ ملک کا قانون اس کی اجازت دیتا ہے اور نہ یہ اخلاقی وانسانی تقاضوں کے مطابق ہے، وکلاء اور یہ ادارے انصاف قائم کرنے کے لئے ہیں، ان کا ایسی غیر منصفانہ حرکتوں کا مرتکب ہونا نہایت افسوسناک ہے؛ اس لئے سمینار وکلاء برادری اور بار کونسلوں سے بھی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایسے غیر قانونی رویہ سے گریز کریں اور حکومت سے بھی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس کا سدباب کرے۔

☆☆☆

تلخیص مقالات:

قیدیوں کے حقوق

مولانا صفدر زبیر ندوی

اسلامک فقہ اکیڈمی کے اٹھارہویں فقہی سمینار کے موضوعات میں ایک موضوع ''قیدیوں کے حقوق'' کو بھی بحث کے لئے رکھا گیا ہے، یہ موضوع موجودہ حالات کے تئیں اہم بھی ہے اور قابل مباحثہ بھی، اس سلسلے میں پورے ہندوستان سے علماء و ماہرین کے تقریباً تیس مقالات اور تحریریں آئی ہیں، جن کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے:

بعض حضرات نے لفظ ''حق'' اور لفظ ''قید'' پر بھی طویل بحثیں کی ہیں، اور قیدیوں کے ساتھ (خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں) نرمی کا برتاؤ اور حسن سلوک اور ان کے ساتھ عدل و انصاف کرنے کو اسلام کی ایک خصوصی صفت کے طور پر پیش کیا ہے، مثلاً قرآن میں ہے:

''ولا یجرمنکم شنآن قوم علی أن لا تعدلوا، اعدلوا هو أقرب للتقوی'' (سورۂ مائدہ: ۸) (مقالہ: مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی)۔

اسی طرح قرآن کی یہ آیت بھی ہے:

''ویطعمون الطعام علی حبه مسکینا و یتیما و أسیرا'' (سورۂ انسان: ۸) (مقالہ: مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مفتی اقبال احمد قاسمی)۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید فرمائی ہے، چنانچہ جب حضرت ثمامہ بن اثال قید کرکے آپ کے پاس لائے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''أحسنوا إساره'' (آداب الحرب فی الاسلام للشیخ محمد الخضر الحسین/۲۸) (مقالہ: مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے صحابہ سے فرمایا: ''استوصوا بالأساری خیرا'' (طبرانی کبیر) اس حدیث کے ضمن میں ابن کثیر نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ان قیدیوں میں مصعب بن عمیر کے بھائی ابوعزیز بن عمیر بھی تھے، وہ خود کہتے ہیں کہ میں جن کے پاس تھا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کا اس درجہ خیال رکھتے تھے کہ وہ لوگ تو خود کھجور پر اکتفا کر لیتے اور مجھے خاص طور سے روٹی کھلاتے، مجھے شرم آتی اور روٹی ان کو لوٹا دیتا، لیکن وہ دوبارہ مجھے دے دیتے اور کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم فرمایا ہے (السیرۃ النبویہ لابن کثیر ۲/۴۵۸، مجمع الزوائد ۶/۸۶) (مقالہ: مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، شاہ محمد تفضل علی جلال آبادی)۔

اسی طرح فقہاء کے یہاں بھی قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید آئی ہے، چنانچہ امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں:

''الأسیر من أسری المشرکین لا بد أن یطعم ویحسن إلیه حتی یحکم فیه...''، اسی طرح حضرت علیؓ نے فرمایا: ''یحبس عنهم شره وینفق علیه من بیت مالهم'' (کتاب الخراج/۱۵۰، ۱۴۹) (مقالہ: مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

حبس کی تعریف

''الحبس لغة: الإمساك وهو ضد التخلية''۔

''أما فی الشرع فهو تعویق الشخص ومنعه من التصرف بنفسه سواء کان فی البیت أو فی مسجد، أو کان یتوکل الخصم أو وکیله، وملازمته له'' (القضاء و نظامه/ص۵۵۰) (مقالہ: مولانا عبد الرشید قاسمی، مفتی اقبال احمد قاسمی)

قرآن کی آیت: ''إنما جزاء الذین یحاربون الله ورسوله ویسعون فی الأرض فسادا أن یقتلوا أو یصلبوا أو

تقطع أيديهم وأرجلهم من خلاف أو ينفوا من الأرض'' (سورۂ مائدہ:۳۳) کے تحت یہ صراحت موجود ہے: ''فإن المراد بالنفي الحبس، هذا على رأى الأحناف، فإن المراد بالنفي من الأرض عندهم الحبس والسجن، لأن الشخص المحبوس يفارق بيته وأهله...'' (القضاء ونظامه/ص۵۵۱) (مقالہ: مولانا عبدالرشید قاسمی)۔

''وقال مالك أيضا والكوفيون: نفيهم سجنهم فينفي من سعة الدنيا إلى ضيقها فصار كأنه إذا سجن فقد نفي من الأرض إلا من موضع استقرار'' (الجامع لأحكام القرآن للقرطبی ۶/۱۵۳) (مقالہ: مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا راشد حسین ندوی)۔

''وقال الحنفية وجماعة من الشافعية والحنابلة وابن العربي من المالكية: إن المراد به الحبس لأن النفي من جميع الأرض محال، وإلى بلد آخر فيه إيذاء وهو ليس نفيا من الأرض بل من بعضها، والله تعالى يقول: ''من الأرض'' فلم يبق إلا الحبس، لأن المحبوس في حقيقته بمنزلة المخرج من الدنيا'' (الموسوعة الفقهيه ۱۶/۲۸۶)

(مقالہ: مفتی محمد جعفر ملی رحمانی)۔

مولانا اقبال احمد ٹنکاروی نے قید کو عقوبت کی ایک قسم قرار دیا ہے، اور عقوبات کی تین قسمیں حدود، قصاص اور تعزیر کو بیان کرتے ہوئے قید کو اسی تعزیر سے جوڑا ہے، اور بدائع کے حوالے سے قید کا اصطلاحی معنی یہ ذکر کیا ہے:

''هو منع الشخص من الخروج إلى أشغاله و مهماته الدينية والاجتماعية'' (بدائع الصنائع ۷/۱۷۴)۔

اور نفس کی قید کی مشروعیت پر آیات قرآنی: ۱-''فشدوا الوثاق...''، ۲-''وخذوهم واحصروهم...'' اور ۳-''أو ينفوا من الأرض'' سے استدلال کیا ہے۔ اسی طرح اس حدیث: ''إذا أمسك الرجل الرجل وقتله الآخر فيقتل الذى قتل ويُحبس الذى أمسك'' (دارقطنی، نیل الاوطار)، اور واقعہ ابولبابہ اور واقعہ ثمامہ بن اثال سے استدلال کیا ہے۔

پھر موصوف نے بدائع کے حوالے سے اور مولانا رحمت اللہ ندوی نے معین الحکام کے حوالے سے حبس کی دو قسمیں حبس التعزیر اور حبس الاستیثاق سے کی ہے، اور پھر اس کے بعد حبس الاستیثاق کی تین قسمیں کی ہیں: حبس التہمۃ، حبس الاحتراز اور حبس تنفیذ العقوبۃ- حبس التہمت کی مثال میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ جو دو قیدی تھے ان کو پیش کیا ہے۔ حبس الاحتراز کی مثال میں خود حضرت یوسف علیہ السلام کی قید کو پیش کیا ہے، اور حبس تنفیذ العقوبۃ کے سلسلہ میں قبیلہ بنو قریظہ کے غداروں کو روکے رکھے جانے کی مثال پیش کی ہے۔

۱- ثبوت جرم کے بغیر کسی کو قید کرنا اور اس کے قید کئے جانے کی مدت

سوال:.....کیا کسی ملزم کو اس کے جرم کا ثبوت فراہم ہوئے بغیر قید کیا جاسکتا ہے، اور اگر بطور احتیاط کے قید کیا جائے تو کیا اس کے لئے کوئی مدت مقرر کی جاسکتی ہے؟

الف:-اکثر مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ ملزم کو جرم کا ثبوت فراہم ہوئے بغیر تحقیق کی غرض سے بطور احتیاط قید میں رکھا جاسکتا ہے۔

(مقالہ: مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا اقبال احمد ٹنکاروی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی اقبال احمد قاسمی، مفتی شبیر علی گجراتی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا لطیف الرحمن فلاحی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا رحمت اللہ ندوی، شاہ محمد تفضل علی جلال آبادی، مولوی محمد مغفور باندوی)۔

ان حضرات کے دلائل ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

قرآن

۱-''تحبسونهما من بعد الصلاة'' (سورۂ مائدہ:۱۰۶)۔

۲-''حتى إذا أثخنتموهم فشدوا الوثاق'' (سورۂ محمد:۴)۔

۳-''إنما جزاء الذين يحاربون الله ورسوله...أو ينفوا من الأرض'' (سورۂ مائدہ:۳۳)۔

۴- "واللاتی یأتین الفاحشة من نسائکم فاستشهدوا علیهن أربعة منکم فإن شهدوا فأمسکوهن فی البیوت" (سورۂ نساء: ۱۵)۔

۵- "وخذوهم واحصروهم" (سورۂ توبہ: ۵)۔

حدیث

۱ "إن النبی صلی الله علیه وسلم حبس رجلا فی تهمة ثم خلّی عنه" (ترمذی، کتاب الدیات، رقم: ۱۴۱۷. نسائی، رقم: ۴۸۶۲، ابوداؤد، کتاب الاقضیة، رقم: ۳۶۳۰)۔

۲- لمعات میں ہے: "فیه أن حبس المدعی علیه مشروع قبل أن تقام البینة" (تحفة الأحوذی ۴/۵۵۶)۔

۳- "عن أزهر بن عبدالله الحرازی أن قوما من الکلاعیین سرق لهم متاع فاتهموا أناسا من الحاکة فأتوا النعمان بن بشیر صاحب النبی ﷺ فحبسهم أیاما ثم خلّی سبیلهم فأتوا النعمان فقالوا خلّیت سبیلهم بغیر ضرب ولا امتحان فقال النعمان ماشئتم إن شئتم أن أضربهم فإن خرج متاعکم فذاك وإلا أخذت من ظهورکم مثل ما أخذت من ظهورهم فقالوا هذا حکمك فقال هذا حکم الله و حکم رسوله ﷺ" (ابوداؤد: کتاب الحدود ۴/۱۳۵)۔

۴- "إذا أمسك الرجل الرجل وقتله الآخر فیقتل الذی قتل، ویحبس الذی أمسك" (بیہقی. دارقطنی)۔

۵- "روی أن النبی صلی الله علیه وسلم حبس أحد رجلین من غفار اُتهما بسرقة بعیرین، وقال للآخر: اذهب فالتمس فذهب وعاد بهما" (مصنف عبدالرزاق)۔

۶- "عن أبی هریرة أن النبی صلی الله علیه وسلم حبس فی تهمة یوما ولیلة استظهارًا واحتیاطًا" (الأحکام السلطانیة للقاضی أبی یعلی/۲۴۲)۔

فقہ

۱- "ویسوغ ضرب هذا النوع من المتهمین، کما أمر النبی صلی الله علیه وسلم الزبیر بتعذیب المتهم الذی غیب ماله حتی أقر به... أشهب بن عبد العزیز قاضی مصر فإنه قال: یمتحن بالحبس والضرب، ویضرب بالسوط مجردًا" (الطرق الحکمیة فی السیاسة الشرعیه/ص ۱۱۳)۔

۲- "وإذا ثبت الحق للمدعی أمره بدفع ما علیه فإن أبی حبسه فی الثمن والقرض والمهر المعجل وما التزمه بالکفالة لأنه جزاء الظلم" (البحر الرائق ۶/۴۷۶) (مقالہ: مولانا افتخار احمد مفتاحی)۔

۳- "الذی علیه جمهور الفقهاء فی المتهم بسرقة ونحوها أن ینظر... وأما أن یکون مجهول الحال فیحبس حتی یکشف أمره، قیل شهرًا، وقیل باجتهاد ولی الأمر" (ردالمحتار ۳/۲۱۴)۔

۴- "بخلاف الحبس فإن الحبس للتهمة مشروع" (بدائع الصنائع ۵/۵۱۸)۔

۵- "فإذا لم یوجد الخصومة لم تقبل شهدتهم ولکن یحبس السارق، لأن اخبارهم أورث تهمة، ویجوز الحبس بالتهمة" (بدائع ۶/۳۱)۔

۶- "من یتهم بالقتل والسرقة وضرب الناس یحبس ویخلد فی السجن إلی أن تظهر التوبة" (فتاوی قاضیخان ۳/۳۸، هندیه ۲/۱۶۹)۔

۷- "قال جماعة من الفقهاء لمشروعیة الحبس بدلیل أن النبی ﷺ حبس رجلا فی تهمة ثم خلی عنه، وهذا هو الحبس

الاحتیاطی" (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۵۵۹۴/۷)۔

مفتی محمد جعفر ملی صاحب اور مولانا ابرار حسن ایوبی ندوی ملزم کے سلسلہ میں تفصیل بیان کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ متہم دو حال سے خالی نہیں ہوتا، یا تو وہ معروف الحال ہوگا یا مجہول الحال۔ پھر معروف الحال دو حال سے خالی نہیں، یا تو معروف بالبر والصلاح والتقوی ہوگا یا معروف بالفسق والفجور ہوگا۔ تو جس شخص کا صلاح وتقوی معلوم ہو ایسے شخص کو محض تہمت کی بنا پر گرفتار کرنا جائز نہیں۔

"روی أبو یوسف أن رسول اللہ ﷺ لا یأخذ الناس بالقرف (التہمة)" (کتاب الخراج /ص ۲۲۳، التحذیر من الأخذ بالتہمة)

اور جس کا فسق وفجور معلوم ہو اسے گرفتار کرنا جائز ہی نہیں بلکہ اولی ہے۔ لیکن جس شخص کا صلاح وتقوی یا فسق وفجور معلوم ومشہور نہ ہو اسے انکشاف حال تک قید میں رکھنا درست ہے (الموسوعة الفقہیہ ۱۶/ ۲۹۳، مجموعہ فتاوی ابن تیمیہ ۳۵/ ۳۹۰)۔

اور مولانا محمد شاہجہاں ندوی کہتے ہیں کہ قید کے لئے شرط یہ ہے کہ کسی قوی قرینہ سے الزام کی تائید ہو رہی ہو، یا ملزم پر شک کئے جانے کی واضح علامتیں ہوں، یا ملزم بدکرداری کے ساتھ معروف ہو (ردالمحتار ۶/ ۱۲۶، الاحکام السلطانیہ للماوردی/ ۲۲۰)۔

اور اگر ملزم کے خلاف کوئی صحیح قرینہ نہ ہو تو ایسے ملزم کو قید کرنا جائز نہیں ہے۔

مفتی محمد مقصود رامپوری، مولانا راشد حسین ندوی کا کہنا ہے کہ ملزم کو جرم ثابت ہوئے بغیر قید کرنا درست نہیں ہے مگر یہ کہ مجرم کے بھاگ جانے یا غائب ہو جانے کا خطرہ ہو تو اس کو قید کرنا جائز ہے، مگر اس سے کام نہ لیا جائے۔

مولانا خورشید انور اعظمی اور مولانا راشد حسین ندوی کے بقول قید کرنے کا حکم اسی صورت میں ہے جبکہ یہ الزام ایسا ہو کہ اس سے حد کا ثبوت ہوتا ہو تو ملزم کو بلا تحقیق قید کرنا درست نہیں ہوگا (مقالہ: مولوی محمد مغفور باندوی)۔

"لم یشرع الحبس بتہمة ما یوجب التعزیر حتی لو ادعی رجل علی آخر شتیمة فاحشة أو أنہ ضربہ وأقام شہودا لا یحبس قبل أن یسأل عن الشہود ویحبس فی الحدود" (فتح القدیر ۵/۱۱۷) (مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی)۔

"وتحبس المتہمین تعزیرا لہم جائز بخلاف ما إذا شہدوا بالدین لا یحبس المشہور علیہ بہ قبل ظہور عدالة الشہود، لأن أقصی العقوبات بعد ثبوت العدالة والقضاء بموجب الشہدة الحبس فلا یجوز أن یفعلہ قبل ثبوت الحق بخلاف ما ہنا، فإن بعد الثبوت عقوبتہ أغلظ" (فتح القدیر ۵/۸) (مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی)۔

لیکن مولانا راشد حسین ندوی اس کا اضافہ کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو الزام کی بنیاد پر قید کرنا جائز ہے ان کا بھی شرعی طور سے متہم ہونا شرط ہے، اور شرعاً تہمت اسی وقت معتبر مانی جائے گی جب ایک عادل یا دو مستور اس کے خلاف گواہی دیں، یا وہ شر وفساد میں مشہور ہو اور قاضی کو اس کا علم ہو۔

"ذکروا فی کتاب الکفالة أن التہمة تثبت بشہدة مستورین أو واحد عدل. فظاہرہ أنہ لو شہد عند الحاکم واحد مستور وفاسق بفساد شخص لیس للحاکم حبسہ، بخلاف ما إذا کان عدلا أو مستورین فان لہ حبسہ. بحر. قلت: ومثلہ مالو کان المتہم مشہور بالفساد فیکفی فیہ علم القاضی" (شامی ۲/۲۰۶، البحر الرائق ۵/۴۲)

(مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی، شاہ محمد تفضل علی)۔

مولانا نعیم اختر قاسمی نے ہدایہ کے حوالہ سے کہا کہ اگر تہمت کا تعلق حدود وقصاص سے ہو تو ایک عادل یا دو مستور شخص کی گواہی پر اسے قید میں رکھا جا سکتا ہے۔ اور یہ قید بطور احتیاط ہے۔

حافظ ابن قیم کے حوالہ سے شامی میں ہے:

"ولو حلفنا کل واحد منہم وأطلقناہ مع العلم باشتہارہ بالفساد فی الأرض وکثرة سرقاتہ وقلنا لا نأخذ إلا بشاہدی عدل کان مخالفا للسیاسة الشرعیة" (ردالمحتار ۳/۱۸۸ باب التعزیر) (مقالہ: مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

لیکن قید بطور تعزیر میں مکمل جرم ثابت ہونے اور دو گواہوں کی گواہی کے بعد ہی قید کیا جا سکتا ہے، اس سے پہلے نہیں۔

''بخلاف الحبس فی باب الأموال لأنه أقصی عقوبة فلا یثبت إلا بحجة کاملة'' (ہدایہ ۲/۱۱۵)۔

بعض حضرات مثلاً مفتی محبوب علی وجیہی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد ذکاء اللہ شبلی اور مفتی سید باقر ارشد قاسمی کا کہنا ہے کہ کسی ملزم کو ثبوت جرم کے بغیر قید کرنا درست نہیں ہے۔

لیکن اگر مجرم کے بھاگ جانے یا غائب ہوجانے کا خطرہ ہوتو اس کو قید کرنا جائز ہے (مقالہ: مفتی محبوب علی وجیہی)۔

اور ایسے ملزم کو قید میں رکھا جاسکتا ہے جو مختلف جرائم میں مشہور ہو (مقالہ: مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی)۔

اگر الزام زیادہ سنگین ہوتو ایسے ملزم کو اس کے گھر یا محلے میں نظر بند کیا جاسکتا ہے (مقالہ: مولانا محمد ذکاء اللہ شبلی)۔

مفتی سید باقر ارشد قاسمی کے بقول ثبوت کی فراہمی تک ملزم کو نگرانی میں رکھا جاسکتا ہے، اور اس کے لئے موصوف یہ رائے دیتے ہیں کہ الگ سے تفتیش خانے بنائے جائیں جہاں پر جبر وتشدد اور وحشت کا ماحول نہ ہو اور وہ جیل خانوں اور قید خانوں کی طرح بھی نہ ہوں، اس جگہ پر ملزم سے صرف پوچھ تاچھ کی جاسکے اور اس کو روک کر رکھا جائے تاکہ فرار نہ ہوسکے۔

مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی فرماتے ہیں کہ واضح علامات اور یقینی بنیادوں پر ہی مجرم کو قید کیا جانا چاہئے۔

"ثم بدا لهم من بعد ما رأوا الآيات ليسجننه"

سید قطب کہتے ہیں: ''علی أن الإسلام لا یشدد فی العقوبة هذا التشدید إلا بعد تحقیق الضمانات الوقائیة المانعة من وقوع الفعل ومن توقیع العقوبة إلا فی الحالات الثابتة التی لا شبهة فیها'' (فی ظلال القرآن ۱۸/۲۲۸۹)۔

اور اس لئے بھی کہ بغیر قطعی دلائل کے قید کرنا اس پر ایک طرح کا ظلم ہے۔ ''روی عن النبی علیه السلام أنه قال من بلغ حداً فی غیر حد فهو من المعتدین'' (البیهقی: کتاب الحدود، کتاب الآثار لمحمد بن الحسن)۔

ب- قید کی مدت کے سلسلہ میں بعض مقالہ نگار حضرات کا کہنا ہے کہ ملزم کے قید کی مدت ولی الامر یا حاکم یا عدالت کی صوابدید پر ہے۔

(مقالہ: مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، قاضی محمد ہارون مینگل، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی شیر علی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا راشد حسین ندوی، شاہ محمد تفضل علی جلال آبادی، مولانا اقبال احمد نکاروی، مولانا ابرار حسن ایوبی ندوی)۔

ان حضرات کے مستدلات میں سے چند دلائل ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

۱- ''قال الزیلعی: ولیس فی التعزیر شئ مقدر وإنما هو مفوض إلی رأی الإمام علی ما تقتضی جنایتهم فإن العقوبة فیه تختلف باختلاف الجنایة'' (شامی ۶/۱۰۶) (مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی)۔

۲- ''وللإمام أن یجتهد فی تعزیر المفسد ویفعل ما رأی من العقوبة'' (مرقاة المفاتیح ۴/۹۲) (مقالہ مولانا خورشید انور اعظمی)۔

۳- ''من یتهم بالقتل والسرقة وضرب الناس یحبس ویخلد فی السجن إلی أن یظهر التوبة'' (الفتاوی الخانیه ۳/۲۸۰) (مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی، شاہ محمد تفضل علی)۔

۴- ''وتقدیر مدة الحبس راجع إلی الحاکم کما لا یخفی'' (البحر الرائق ۵/۴۳) (مقالہ: مولانا نعیم اختر قاسمی، مولوی محمد مغفور باندوی)۔

۵- ''کذلك والی الحرب ووالی الحکم یفعل کل منهما ما اقتضته ولایته الشرعیة مع رعایة العدل والتقید بالشریعة'' (الطرق الحکمیة فی السیاسة الشرعیة/۱۱۵، مجموع فتاوی ابن تیمیه ۳۵/۴۰۲) (مقالہ: قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا ابرار حسن ایوبی ندوی)۔

جن حضرات نے مدت حبس کا دارومدار ملزم کی ذات کو مانا ہے، ان کے نزدیک مجہول الحال ملزم کو علی اختلاف فقہاء زیادہ سے زیادہ ایک ماہ تک قید میں رکھا جاسکتا ہے، اور جو ملزم معروف بالفجور ہوتو جب تک اس کے معاملہ کی تحقیق وتفتیش نہ ہوجائے اسے قید میں رکھا جاسکتا ہے، خواہ موت تک ہی اسے قید میں کیوں نہ رکھنا پڑے (مقالہ: مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا ابرار حسن ایوبی ندوی وغیرہ)۔

ان حضرات نے الموسوعۃ الفقہیہ (۱۶/۲۹۵)،تبصرۃ الحکام (۲/۱۴۷)، المغنی لابن قدامہ (۹/۳۲۸)وغیرہ کی عبارات کو اپنا مستدل بنایا ہے۔

''وقال بعض الفقهاء: إن أكثر مدة يحبس فيها المتهم المجهول الحال يوم واحد، وحددها قوم بيومين وثلاثة، وأجاز آخرون بلوغها شهرًا- أما المتهم المعروف بالفجور والفساد فأكثر مدة حبسه ماتقتضيه ظهور حاله والكشف عنه ولو حبس حتى الموت وهذا هو الظاهر من مذاهب فقهاء الأمصار من الحنفية'' (الموسوعة الفقهية ۱۶/۲۹۵)۔

اکثر مقالہ نگار حضرات نے اس میں تفصیل کی ہے اور کہا ہے کہ اس سلسلہ میں اقل مدت کی کوئی حد نہیں ہے، اور اکثر مدت حاکم کے اجتہاد پر مبنی ہے، بعض فقہاء کے یہاں ایک دن، بعض کے نزدیک دو دن یا تین دن اور بعض کے نزدیک ایک مہینہ ہے (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۲۹۴-۲۹۵) (مقالہ: مفتی محمد جعفر ملی رحمانی)۔

مولانا راشد حسین ندوی اور مفتی اقبال احمد قاسمی، مولانا عبد الرشید قاسمی کہتے ہیں کہ مدت قید کا دارومدار ملزم کی ذات، الزام کی نوعیت اور دوسرے خارجی عوامل سے بھی ہے، یہاں تک کہ عمر قید کی بھی سزا دی جاسکتی ہے۔

دلائل

۱-''بأن ادعى عليه رجل ذنبا أو دينا فحبسه ليعلم صدق الدعوى بالبينة، ثم لما لم يقيم البينة خلى عنه اى تركه عن الحبس بأن أخرجه منه والمعنى خلى سبيله عنه'' (مرقاة المفاتيح ۷/۲۱۸) (مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی)۔

۲-''وإما أن يكون مجهول الحال فيحبس حتى يكشف أمره، قيل شهرا وقيل باجتهاد ولى الأمر'' (ردالمحتار ۳/۲۱۴) (مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی، مفتی اقبال احمد قاسمی، مولانا عبد الرشید قاسمی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۳-''ومن يتهم بالقتل والسرقة وضرب الناس أحبسه وأخلده فى السجن حتى يتوب (قوله حتى يتوب) المراد حتى تظهر امارات توبته إذ لا وقوف لنا على حقيقتها، ولا يقدر بستة أشهر إذ قد تحصل التوبة قبلها وقد لا تظهر بعدها، كذا حققه الطرسوسى وأقره ابن الشحنة'' (شامى ۳/۲۰۶، منحة الخالق ۵/۴۲)

(مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی، مفتی اقبال احمد قاسمی، شاہ محمد تفضل علی، مولانا عبد الرشید قاسمی)۔

۴-''وتختلف مدة الحبس فى التعزير باختلاف أسبابه وموجباته ولذا فلا يمكن تقديره قال ابن فرحون فى تبصرة الحكام فحبس التعزير راجع إلى اجتهاد الحاكم يقدر ما يرى أنه ينزجر به'' (القضاء ونظامه /۵۵۶)

(مقالہ: مفتی اقبال احمد قاسمی، مولانا عبد الرشید قاسمی)۔

۵-''وإذا مضى على حبسه شهرا أو شهران أو ثلاثة ولم ينكشف حاله فى اليسار و الإعسار خلى سبيله لأن هذا الحبس كان لاستبراء حاله وإبداء عذره، و الثلاثة الأشهر مدة صالحة لاشتهار الحال وإبداء العذر'' (بدائع الصنائع ۷/۲۸۰) (مقالہ: مولانا لطیف الرحمن فلاحی)۔

۶-''وفى لفظ البيهقى: أن النبى صلى الله عليه وسلم حبس رجلا فى تهمة ساعة من النهار'' (القضاء ونظامه/ص ۵۵۱ بحوالہ ترمذی و ابوداؤد) (مقالہ: مولانا عبد الرشید قاسمی)۔

۷-''واختلفوا فى مقدار الحبس فى التهمة، هل هو مقدر أو مرجعه إلى اجتهاد الإمام؟ على قولين ذكرهما القاضى أبويعلى والقاضى الماوردى وغيرهما، وقيل هو مقدر بشهر وهو قول أبى عبدالله الزبيرى، وقيل هو غير مقدر وهو اختيار الماوردى'' (مجموع فتاوى ابن تيميه ۳۵/۳۹۸) (مقالہ: مولانا ابرار حسن ایوبی ندوی)۔

۸-''عن أبى هريرة أن النبى صلى الله عليه وسلم حبس فى تهمة يوما وليلة استظهارًا واحتياطًا'' (الأحكام السلطانية للقاضى ابى يعلى/۲۶۲) (مقالہ: مولانا اشتیاق احمد اعظمی)۔

۹-''وأما قدر مدة الحبس فيختلف باختلاف أسبابه وموجباته فحبس التعزير راجع إلى اجتهاد الحاكم بقدر ما يرى

أنه ينزجر به. وقال أبوعبدالله الزبيري من الشافعية يتقدر بشهر للاستبراء والكشف وستة أشهر للتأديب والتقويم'' (تبصرة الحکام ۲/۲۴۰) (مولوی محمد مغفور باندوی)۔

مفتی سید باقر ارشد قاسمی کا کہنا ہے کہ کوئی خاص مدت کی تخصیص نہیں کی جاسکتی، ثبوت فراہم ہونے تک اس کو روک رکھا جائے اور جلد از جلد ثبوت حاصل کر کے ملزم کا فیصلہ کر دیا جائے۔

مولانا رحمت اللہ ندوی وغیرہ نے مدت حبس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، وہ کہتے ہیں کہ اقل مدت بعض شافعیہ کے یہاں جمعہ کی نماز کے لئے جانے سے روک دینا ہے، اور یہ مقصد بذات خود محبوس کو تصرف سے روک دینے سے بھی پورا ہو جاتا ہے، اکثر مدت کے بارے میں جمہور فقہاء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اکثر مدت حبس کی حد متعین نہیں ہے، بلکہ اس کا اختیار قاضی کو ہے، کہ وہ مجرم کے حسب حال طے کرے۔

''والصحيح أن التقدير مفوض إلى رأى القاضي لاختلاف أحوال الأشخاص فيه'' (فتح القدیر ۶/۲۷۹)۔

اور شافعیہ کے یہاں ایک قول کے مطابق چھ ماہ، دوسرے قول کے مطابق ایک سال، اور تیسرے قول میں اکثر مدت کی کوئی تحدید و تعیین نہیں ہے۔ (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/۲۸۹)۔

اسی طرح موصوف نے حبس دوام کے جواز پر حضرت عثمان غنیؓ کا ضابی بن حارث کو موت تک قید کرنے اور حضرت علیؓ کے اس فیصلے کو کہ جو شخص کسی کو پکڑے تاکہ دوسرا اسے قتل کر دے تو پکڑنے والے کو موت تک قید کر دیا جائے، کو استدلال کے طور پر پیش کیا ہے (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/۲۸۹، الاحکام السلطانیہ/۲۲۰)۔

۲- مذہبی امور، جسمانی ضروریات، عام سماجی حقوق اور اخلاقی امور سے متعلق قیدیوں کے حقوق

الف- مذہبی امور:

سوال:...... مذہبی امور (عبادت کرنا، مذہبی کتابوں کا مطالعہ، دوسرے قیدیوں کے درمیان دعوت دین، اس کی مذہبی تعلیمات کے مطابق اس کے لئے غذا فراہم کرنا، وہ جس مذہب پر عقیدہ رکھتا ہے اس مذہب کی مقدس شخصیتوں اور کتابوں وغیرہ کی بے احترامی سے گریز)۔

تقریباً تمام ہی مقالہ نگاروں کا کہنا ہے کہ قیدیوں کو ان کے مذہبی امور میں مکمل آزادی حاصل ہوگی، عبادت، مذہبی کتابوں کا مطالعہ، دوسرے قیدیوں کے درمیان دعوت دین، مذہب کے مطابق غذا فراہم کرنا، یہ سب چیزیں اس میں شامل ہیں، اسی طرح قیدی کے مذہب کی مقدس شخصیات اور کتابوں وغیرہ کی بے احترامی سے گریز کیا جائے گا (مقالہ: مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا محمد اشرف عباس قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مفتی محمد مقصود رامپوری، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا محمد ذکاء اللہ شبلی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی شیر علی گجراتی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، قاضی محمد ہارون مینگل، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا ابرار حسن ایوبی ندوی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا اقبال احمد ٹنکاروی، شاہ محمد تفضل علی، مولانا لطیف الرحمن فلاحی، مفتی اقبال احمد قاسمی، مولانا راشد حسین ندوی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مفتی انور علی اعظمی، مولوی محمد مغفور باندوی)۔

ان حضرات کے دلائل درج ذیل ہیں:

قرآن

۱-''ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدوا بغير علم'' (سورۂ انعام: ۱۸۰)

(مقالہ: مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا محمد اشرف عباس قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا ابرار حسن ندوی، مولانا اقبال احمد ٹنکاروی، مولانا راشد حسین ندوی)۔

۲-''لا إكراه في الدين'' (سورۂ بقرہ: ۲۵۶) (مقالہ: مولانا ابوبکر قاسمی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی)۔

۳-حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل میں قیدیوں کو دعوت دین دی تھی۔

(مقالہ: مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا محمد اشرف عباس قاسمی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا ظفر الاسلام صدیقی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا اقبال احمد ٹنکاروی، مفتی اقبال احمد قاسمی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی)۔

حدیث

۱- تورات کے سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لا نصدق ولا نکذب'' (...) (مقالہ: مولانا رحمت اللہ ندوی)۔

فقہ

۱-''لا یمنع من التصرفات الشرعیۃ'' (بدائع الصنائع ۱۸۰/۶) (مقالہ: مولانا افتخار احمد مفتاحی)۔

۲-''ینبغی تمکین المحبوس من الوضوء والصلاۃ ولا تجوز معاقبته باثلمنع منهما'' (الموسوعۃ الفقھیہ ۱۶/۳۲۷، شامی ۵/۳۷۸) (مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا اقبال احمد ٹنکاروی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی)۔

۳-''لا تدعنّ فی سجونکم أحدا من المسلمین فی وثاق لا یستطیع أن یصلی قائما ولا تبیتن فی قید إلا رجلا مطلوبا بدم'' (کتاب الخراج/۱۶۲) (مقالہ: مولانا اقبال احمد ٹنکاروی)۔

۴-''کان یسمع سجناء فی السجون الإسلامیۃ بإدخال الکتب والأقلام والأوراق للقراءۃ والکتابۃ''
(احکام السجن/۳۸۳ بحوالہ البدایہ لابن کثیر ۱۴۰/۱۴) (مقالہ: مولانا اقبال احمد ٹنکاروی)۔

بعض حضرات نے کچھ امور کا استثناء کیا ہے، چنانچہ:

☆ مولانا رحمت اللہ ندوی کہتے ہیں کہ مذہبی تعلیمات کے مطابق غذا فراہم کرنا اس کے حقوق میں نہیں، بلکہ صاف ستھری غذا قید خانہ کا ذمہ دار اپنی سہولت کے اعتبار سے مہیا کرے گا۔

☆ مولانا اختر امام عادل قاسمی کا کہنا ہے کہ دوسرے قیدیوں کے درمیان دعوت دین کا کام حاکم کی صوابدید پر موقوف ہونا چاہئے، اس لئے کہ دعوت اس کی بنیادی یا مذہبی ضرورت میں شامل نہیں ہے۔

☆ مولانا خورشید انور اعظمی کے نزدیک یہ حقوق اس وقت دیے جائیں گے جبکہ یہ حقوق مقصد حبس سے متعارض نہ ہوں، مثلاً کسی کو عبادت کے لئے بار بار قید سے نکالنا پڑے تو اس کی اجازت نہیں ہے۔

''ولا یخرج لجمعۃ ولا جماعۃ ولا لحج فرض فغیرہ أولی ولا لحضور جنازۃ ولو کان بکفیل'' (درمختار ۸/۵۶)۔

(ب) جسمانی ضروریات

سوال:...... جسمانی ضروریات (مناسب غذا، صاف پانی، علاج، حفظان صحت کے لئے ورزش وتفریح، بیوی سے تعلق، ایسی تنگ جگہ میں قیدیوں کو رکھنے کا مسئلہ جہاں کھڑا ہونا یا پاؤں پھیلا کر لیٹنا، یا دیوار کے باہر کسی چیز کا دیکھنا ممکن نہیں)۔

تقریباً تمام ہی مقالہ نگار اس پر متفق ہیں کہ قیدی کے لئے مناسب غذا، صاف پانی، اور موسم کے حساب سے کپڑے اور علاج ومعالجہ کی سہولت فراہم کی جائے گی، اور بیوی سے ملنے کی اجازت دی جائے گی، اور اگر قیدی عورت ہو تو شوہر سے ملنے کی اجازت ہوگی۔

دلائل درج ذیل ہیں:

۱-"ویطعمون الطعام علی حبه مسکینا ویتیما وأسیرا" (سورۂ انسان: ۸)۔

۲-آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ احزاب میں قید کئے گئے لوگوں کے بارے میں جبکہ گرمی بہت تھی فرمایا: ''أحسنوا إسارهم وقیلوهم واسقوهم. وقال: لا تجمعوا علیهم حرّ هذا الیوم وحر السلاح واسقوهم وقیّلوهم'' (بدائع ۷/۱۲۰)

۳-''ولا یمنع الطبیب والخادم من الدخول علیه لمعالجته وخدمته'' (فتح القدیر ۵/۴۷۱)۔

۴-''ولا یمنع من الجماع إن احتاج إلیه فتدخل امرأته أو جاریته علیه إن کان فیه موضع سترۃ''۔

(البحرالرائق ۶/ ۲۸۳، مجمع الانہر ۳/ ۲۲۸، ہندیہ ۳/ ۴۱۸، معین الحکام/ ۱۹۸)۔

۵-''ومنع المساجين مما يحتاجون إليه من الغذاء والكساء والصحة جور يعاقب الله عليه كما دل عليه حديث الهرة'' (القضاء ونظامه/۵۵۸)۔

بعض حضرات نے شرط کے ساتھ ہی بعض امور کی اجازت دی ہے، مثلاً:

☆ مولانا راشد حسین ندوی، مولانا ابرار حسن ایوبی ندوی کہتے ہیں کہ اگر اس بات کا اندیشہ ہے کہ ورزش نہ کرنے پر صحت بگڑ جائے گی تو بقدر ضرورت ورزش کی اجازت دی جاسکتی ہے، صرف تفریحاً ورزش کی اجازت نہیں ہوگی۔

☆ مولانا خورشید احمد اعظمی کا کہنا ہے کہ حفظان صحت کے لئے ورزش اور تفریح حاکم کی صوابدید پر منحصر ہے۔

☆ مولانا خورشید انور اعظمی کہتے ہیں کہ ورزش وتفریح کا موقع دیا جائے گا، بشرطیکہ قید خانے کے نظام میں کوئی خلل واقع نہ ہو اور مصلحت قید کے خلاف بھی نہ ہو۔

☆ مولانا محمد اشرف عباس قاسمی کا کہنا ہے کہ حفظان صحت کے لئے ورزش وتفریح قیدیوں کا کوئی حق واجب نہیں، قیدیوں کے جرائم کی نوعیت کے اعتبار سے اس کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

☆ مولانا لطیف الرحمن فلاحی لکھتے ہیں کہ ورزش اور تفریح اور بیوی سے تعلق کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

☆ مولانا عبد الرشید قاسمی کہتے ہیں کہ بیوی سے تعلق اور عام سماجی امور میں مجرم اور جرم کی حیثیت سے مشروط آزادی ہونی چاہئے ورنہ قید کا مقصد ہی فوت ہوجائے گا۔

☆ مولانا محمد شاہجہاں ندوی کہتے ہیں کہ حکومت پر لازم ہے کہ قید خانہ میں مناسب جگہ کی تعمیر کرائے، جہاں قیدیوں کو چار ماہ میں ایک بار پردہ پوش طریقہ سے اپنی جنسی خواہش پوری کرنے کا موقع دیا جائے۔

☆ مولانا ابوسفیان مفتاحی کے بقول قیدیوں کو بیوی سے تعلق کی اجازت نہ دی جائے۔

اسی طرح قیدیوں کو کسی ایسی تنگ جگہ میں رکھنا جہاں اس کے لئے ٹھیک سے کھڑا ہونا یا بیٹھنا یا پاؤں پھیلا کر لیٹنا ممکن نہ ہو شرعاً جائز نہیں، کیونکہ یہ اس کے بنیادی حقوق کے منافی ہے۔ (مقالہ: شاہ محمد تفضل علی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا ظفر الاسلام صدیقی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا محمد اشرف عباس قاسمی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا اقبال احمد ٹنکاروی، مولوی محمد مغفور باندوی)۔

''لا يجوز الحبس في مكان يمنع فيه المحبوس الطعام والشراب، أو في مكان حار أو تحت الشمس أو في مكان بارد، أو في بيت تسد نوافذه وفيه دخان أو يمنع من الملابس في البرد فإن مات المحبوس فالدية على الحابس'' (الموسوعة الفقهيه ۱۶/۳۲۰، فتح القدير ۷/۲۶۰)۔

☆ لیکن مولانا ابرار حسن ایوبی ندوی کا کہنا ہے کہ ایسی سزائیں مخصوص حالت میں اور محدود مدت کے لئے دینے کی اجازت تو دی جاسکتی ہے لیکن اس طرح سزا دینا کہ اعضاء تلف ہوجائیں بالکل جائز نہیں۔

☆ مولانا خورشید احمد اعظمی اور مولانا راشد حسین ندوی قیدی کے متعنت ہونے کی شرط لگاتے ہیں۔

☆ مولانا سلطان احمد اصلاحی کے بقول قیدیوں کو تکلیف دہ تنگ جگہ میں رکھنے کی گنجائش اقبال جرم کی مخصوص ضرورت سے ہی ہوسکتی ہے۔

(ج) عام سماجی حقوق

سوال:..... عام سماجی حقوق (اخبارات پڑھنے، ریڈیو سننے، فون پر احباب واقارب سے گفتگو کرنے، دوسرے قیدیوں سے ملاقات، تعلیم اور ہنر سیکھنا وغیرہ)۔

اکثر مقالہ نگار حضرات کا اس پر اتفاق ہے کہ قیدیوں کو عام سماجی حقوق مثلاً اخبارات پڑھنے، ریڈیو سننے، فون پر گفتگو کرنے، نیز دوسرے قیدیوں سے ملاقات، تعلیم اور ہنر سیکھنے کے حقوق حاصل ہوں گے (مقالہ: مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا

محمد ذکاء اللہ شبلی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مفتی شیر علی گجراتی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، قاضی محمد ہارون مینگل، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مفتی انور علی اعظمی)۔

دلیل کے طور پر درج ذیل عبارتیں ذکر کی گئی ہیں:

۱- ''استوصوا بالأساری خیرا'' (المعجم الکبیر للطبرانی، رقم الحدیث: ۹۷۷) (مقالہ: مفتی محمد جعفر ملی رحمانی)۔

۲- غزوہ بدر کے قیدیوں سے بچوں کو تعلیم دلوانا اور کتابت سکھلانا خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہے (مقالہ: مولانا ابوبکر قاسمی)۔

۳-''لا یمنع من الاکتساب ولا یمنع المسجون من دخول أهله وجیرانه علیه ولکن لا یمکنون أن یمکثوا ثمة طویلا'' (مبسوط ۲۰/۹۰، بدائع ۶/۱۸۱، فتاوی عالمگیری ۳/۴۱۸) (مقالہ: مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا اقبال احمد ٹنکاروی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

اس کے برعکس بعض حضرات نے ان امور کو مختلف شرطوں کے ساتھ مشروط کیا ہے، ان کی آراء ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

☆ مولانا اختر امام عادل قاسمی اور مفتی جمیل احمد نذیری کہتے ہیں کہ قیدیوں کو عام سماجی امور کی اجازت تو ہوگی، لیکن اگر کسی وجہ سے حاکم وقت بعض قیدیوں کے لئے اس کو خلاف مصلحت سمجھے تو اس پر پابندی عائد کر سکتا ہے۔

☆ مولانا اقبال احمد ٹنکاروی اور شاہ محمد تفضل علی کے بقول حاکم وقت کے لئے اگر مصلحت کے خلاف نہ ہو تو قیدیوں کو فون، ریڈیو، اخبار وغیرہ مہیا کر سکتے ہیں (احکام السجن / ۴۹۷)۔

☆ مولانا راشد حسین ندوی اور مولانا خورشید انور اعظمی لکھتے ہیں کہ قیدی کی دلداری اور استیناس کے لئے کسی کے داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے، اسی طرح دل بہلانے کے لئے فون کرنے کی بھی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔

''ولایمکن أحد أن یدخل علیه للاستئناس إلا أقاربه وجیرانه لاحتیاجه للمشاورة، ولایمکثون عنده طویلا'' (شامی ۴/۳۴۹، هندیه ۳/۴۱۸)۔

اسی طرح اخبارات پڑھنا، ریڈیو سننا وغیرہ کا تعلق تفریحی مشاغل سے ہے اور ان سے استیناس حاصل ہوتا ہے اس لئے اس کی بھی اجازت نہیں ہوگی۔

☆ مولانا خورشید انور اعظمی مزید یہ کہتے ہیں کہ تعلیم یا کسی ہنر کے سیکھنے کی بھی بظاہر اجازت نہیں ہونی چاہئے اس وجہ سے کہ اس میں مشغول ہو جانے کے بعد قیدی کے لئے جو کیفیت مطلوب ہے وہ مفقود ہو جائے گی۔

☆ مولانا سلطان احمد اصلاحی کا کہنا ہے کہ مذکورہ تمام چیزوں کی اجازت ہو سکتی ہے، لیکن فون سے احباب واقارب سے گفتگو کی اجازت مطلق نہیں دی جا سکتی ہے۔

☆ مولانا خورشید احمد اعظمی کا کہنا ہے کہ یہ امور مجرم کی نوعیت اور قاضی کی صوابدید پر موقوف ہے۔

☆ مولانا محمد شاہجہاں ندوی کے نزدیک مخصوص حالات میں عام سماجی حقوق سے قیدیوں کو محروم کیا جا سکتا ہے۔ ''ینبغی أن یحبس فی موضع خشن لا یتبسط له فی فراش ولا وطاء، ولا أحد یدخل علیه لیستأنس لیضجر قلبه بذلك'' (المبسوط ۲۰/۱۰)۔

☆ مولانا عبدالرشید قاسمی کے مطابق اس میں مجرم اور جرم کی حیثیت سے مشروط آزادی ہونی چاہئے ورنہ قید کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

☆ مولانا لطیف الرحمن فلاحی اور مولوی محمد مغفور باندوی کہتے ہیں کہ قیدیوں کو عام سماجی حقوق کی مراعات نہیں دی جائے گی۔

☆ مولانا محمد اشرف عباس قاسمی کہتے ہیں کہ اگر قید کا مقصد محض نظر بند کرنا اور عام لوگوں سے دور رکھنا ہے تو ایسے قیدیوں کو اخبارات اور ریڈیو کی اجازت ہوگی، اور اگر قید کا مقصد کسی حق کی وصولی کے لئے اس پر دباؤ بنانا ہے تو اسے ایسی سہولیات فراہم نہ کی جائیں،

''لأنه لیضجر قلبه فیسارع للقضاء'' (فتح القدیر ۷/۲۶۰)۔

☆ مولانا ابرار حسن ندوی کا کہنا ہے کہ اخبارات پڑھنے اور ریڈیو سننے سے روکا جائے گا، اس لئے کہ یہ امور حوائج ضروریہ میں سے نہیں ہیں۔

(د) اخلاقی امور

سوال:......اخلاقی امور (مردوں اور عورتوں کو الگ قید خانے، بالغوں اور نابالغوں کے لئے الگ قید خانے وغیرہ کے مسائل)۔

تقریباً تمام ہی مقالہ نگاروں کی یہ رائے ہے کہ مرد قیدیوں اور عورت قیدیوں کو الگ الگ قید خانوں میں رکھا جائے، اسی طرح نابالغ اور بالغ قیدیوں کو بھی الگ الگ رکھا جائے، اور بعض مقالہ نگاروں نے خنثیٰ مشکل کو بھی علاحدہ قید خانے میں رکھے جانے کا ذکر کیا ہے۔

ان حضرات نے بطور دلیل یہ عبارتیں ذکر کی ہیں:

۱- بنو قریظہ کے قیدیوں کے سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو معمول رہا اسے زرقانی (۲/۱۳۶) نے اس طرح بیان کیا ہے:

''أنه حبس رجال بني قريظة في ناحية وجعل نساءهم وذريتهم في ناحية أخرى''۔

۲-''وينبغي أن يكون للنساء محبس علاحدة تحرزا عن الفتنة، وعن أبي حنيفة أن المرأة تحبس في محبس النساء ولكن يحفظها الرجال'' (فتاوى ہندیہ ۳/۴۱۴)۔

۳-''ويجعل للنساء سجن على حدة نفيا لوقوع الفتنة'' (البحر الرائق ۶/۲۷۳، شامی ۵/۳۷۹، الدر المختار ۸/۵۸)۔

۴-''نص الفقهاء على أن يكون للنساء محبس على حدة إجماعا ولا يكون معهن رجل لوجوب سترهن وتحرزا من الفتنة، والأولى أن تقوم النساء على سجن مثيلاتهن فإن تعذر ذلك جاز استعمال الرجل المعروف بالصلاح على محبسهن ليحفظهن وهو المروي عن أبي حنيفة، وإذا لم يكن هناك سجن معد للنساء حبست المرأة عند أمينة خالية عن الرجال أو ذات رجل أمين كزوج أو أب أو ابن معروف بالخير والصلاح'' (الموسوعة الفقهيه ۱۶/۳۱۷، فتاوى هنديه ۳/۴۸۶)۔

۵-''تدل أكثر النصوص على أن يكون حبس الحدث في بيت أبيه أو وليه على أنه يجوز حبسه في السجن إلا إذا خشي عليه ما يفسده فيتوجب حبسه عند أبيه لا في السجن'' (الموسوعة الفقهيه ۱۶/۳۱۸)۔

بعض حضرات نے کچھ چیزوں کا اضافہ کیا ہے، مثلاً:

☆ مفتی انور علی اعظمی اور مولانا اشتیاق احمد اعظمی کہتے ہیں کہ زیر حراست بچوں کو الگ رکھنا چاہئے اور حتی الامکان فوری طور پر عدالتی کارروائی کے لئے پیش کیا جانا چاہئے، اسی طرح خواتین کو بھی الگ رکھا جائے اور ان کے لئے خواتین ملازمین کا بندوبست کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

☆ مولانا اختر امام عادل قاسمی اور مولانا رحمت اللہ ندوی کا کہنا ہے کہ مردوں اور عورتوں کو نہ صرف یہ کہ الگ الگ رکھا جائے بلکہ عورتوں کے حصے کا نگراں افسر بھی کسی عورت کو ہونا چاہئے، اگر اس قسم کی عورت میسر نہ ہو تب صلاح وتقویٰ میں معروف شخص کا انتخاب ہونا چاہئے (المبسوط ۲۰/۹۰، فتاوی ہندیہ ۳/۴۱۴، جواہر الاکلیل للآبی ۲/۹۳، الموسوعہ الفقہیہ ۱۶/۳۱۷)۔

☆ جبکہ مولانا ابرار حسن ایوبی ندوی کا کہنا ہے کہ اندرونی دیکھ بھال کا کام عورتیں سنبھالیں اور باہر سے حفاظت کی ذمہ داری اہل تقویٰ مردوں کی ہو۔

اور بچوں کے بارے میں موصوف کا کہنا ہے کہ فقہاء بچوں کو اصلاً قید کرنے کے قائل نہیں ہیں، اور جو حضرات قائل ہیں ان کا کہنا ہے کہ حبس کی سزا تادیبا ہوگی معاقبۃً نہیں۔

''ولا يحبس الصبي إلا بطريق التاديب لئلا يتجاسر إلى مثله إذا باشر شيئا من أسباب التعدي قصدًا فلو خطأ فلا'' (رد المحتار ۸/۱۲۳، ہندیہ ۳/۴۱۳)۔

☆ لیکن مولانا راشد حسین ندوی کہتے ہیں کہ اس عبارت سے خاص مقاصد کے تحت بچوں کی گرفتاری کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

اس کی تفصیل کرتے ہوئے شاہ محمد تفضل علی لکھتے ہیں کہ نابالغ اگر کوئی ایسا جرم کرے جو عام حالات میں موجب تعزیر ہوتا ہے تو اگر بچے کی عمر ۱۰ سال سے

کم ہے تو اس پر تعزیر عقوبت جاری نہیں کی جائے گی، البتہ وہ تعزیر تادیب کا مستحق ہوگا۔

''إلا الصبی العاقل فإنه یعزر تأدیبا لا عقوبة، لأنه من أهل التأدیب، ألا ترى إلى ما روی عنه صلى الله علیه وسلم أنه قال: ''مروا صبیانکم بالصلاة إذا بلغوا سبعا، واضربوهم علیها إذا بلغوا عشرا''، وذلك بطریق التأدیب والتهذیب لا بطریق العقوبة'' (بدائع الصنائع ۶۴/۷)۔

۳- سچی بات اگلوانے کے لئے قیدیوں کو دھمکانا

سوال: قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے کس حد تک دھمکانے کی اجازت ہے؟ کیا اس مقصد کے لئے درج ذیل سزائیں دی جاسکتی ہیں:

الف-قیدیوں کو بے لباس کر دینا۔ ب-قیدیوں کو مار پیٹ کرنا۔ ج- انہیں الکٹرک شاک لگانا۔

د-قیدیوں پر کتے چھوڑنا۔ ھ- قیدیوں کو سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈال دینا۔

و- انہیں مسلسل جگے رہنے پر مجبور کرنا اور اس کے لئے ان کی جائے رہائش میں تیز روشنی یا تیز آواز کا انتظام رکھنا۔

تقریباً تمام ہی مقالہ نگار اس بات سے متفق ہیں کہ قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے قیدیوں کو بے لباس کر دینا، انہیں الکٹرک شاک لگانا، ان پر کتے چھوڑنا، ان کو برف کی سلوں پر ڈالنا، انہیں مسلسل جگے رہنے پر مجبور کرنا، اور ان کی جائے رہائش میں تیز روشنی کرنا یا تیز آواز بجانا، یہ تمام امور ناجائز ہیں اور حقوق انسانی منشور کے خلاف ہے۔ اور ایسی سزائیں جن سے کسی عضو کو نقصان پہنچنے یا اس کے تلف ہونے کا اندیشہ ہو تو حرام ہیں۔

اس سلسلہ میں ان حضرات نے درج ذیل دلیلیں دی ہیں:

۱-''إن رسول الله صلى الله علیه وسلم قال: فإنه لا یعذب بالنار إلا رب النار'' (ابوداؤد، کتاب الجهاد، باب فی کراهیة حرق العدو بالنار) (مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی وغیرہ)۔

۲-''لا ینبغی للقاضی أن یضرب محبوسا فی دینه ولا فی غیره ولا یصفد ولا یقید ولا یغل ولا یمد ولا یجرد ولا یقیمه فی الشمس'' (فتاوی ہندیہ ۴۱۴/۳، البحر الرائق ۲۷۶/۶) (مقالہ: مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مولوی محمد مغفور باندوی)۔

۳-''التمثیل بالجسم، وضرب الوجه ونحوه، والتعذیب بالنار ونحوها، التجویع والتحریض للبرد ونحوه، والتجرید من الملابس وأمور أخرى تحرم المعاقبة بها'' (الموسوعة الفقهیه ۳۲۶/۱۶، بدائع الصنائع ۱۲۰/۷)

(مقالہ: مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

۴-''ولیس للطالب أن یقیم الملزوم فی الشمس أو على الثلج أو فی موضع یضرّبه''

(معین الحکام/۱۹۹) (مقالہ: مولانا رحمت اللہ ندوی، مولوی محمد مغفور باندوی)۔

۵-''لا یغلّ ولا یجرّد'' (رد المحتار ۳۵۰/۴) (مقالہ: مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا راشد حسین ندوی، شاہ محمد تفضل علی)۔

۶-''تحرم المعاقبة بالتجرید من الثیاب لما فی ذلك من کشف العورة'' (الاحکام السلطانیة/۲۳۹)

(مقالہ: مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی)۔

۷-''ولا یجوز خنق المحبوس وعصره وغطه فی الماء... لا یجوز الحبس فی مکان یمنع فیه المحبوس الطعام والشراب، أو فی مکان حار أو تحت الشمس أو فی مکان بارد، أو فی بیت تسدّ نوافذه وفیه دخان أو یمنع من الملابس فی البرد''

(الموسوعۃ الفقہیہ ۳۲۷/۱۶) (مقالہ: مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، شاہ محمد تفضل علی)۔

بعض حضرات نے بعض سزاؤں کی اجازت دی ہے، جیسا کہ:

☆ مولانا اشتیاق احمد اعظمی اور مفتی انور علی اعظمی لکھتے ہیں کہ تعزیزاً اتنی پٹائی ہوسکتی ہے جو حد سے کم ہو اور وہ طرفین کے نزدیک ۳۹ کوڑے اور امام ابویوسف کے نزدیک ۷۵ کوڑے ہیں۔

''ویری أبو حنیفة ومحمد أن الحد الأعلی فی التعزیر تسعة وثلاثون سوطا، بینما یری أبو یوسف أنه خمسة وسبعون سوطًا'' (التشریع الجنائی الاسلامی ۶۹۰/۲)۔

☆ مولانا رحمت اللہ ندوی اور مولانا محمد اشرف عباس قاسمی کے نزدیک سچی بات اگلوانے کے لئے قیدی کو مارنے پیٹنے کا جواز ہے، اور اس پر انہوں نے کئی دلیلیں نقل کی ہیں:

۱- جنگ بدر کے لئے جاتے ہوئے جب صحابہ کرام قریش کے اونٹوں کے پاس سے گزرے تو وہاں ایک لڑکے کو پکڑ لیا اور اس سے ابوسفیان کے بارے میں پوچھا، جب اس لڑکے نے لاعلمی ظاہر کی اور بتانے سے انکار کیا تو صحابہ نے اسے مارا...... (عون المعبود، جلد ۷، کتاب الجہاد)۔

۲- ''لیّ الواجد یحلّ عرضه وعقوبته'' سے بھی قیدی کو سخت بات کہنے اور اس کو سزا دینے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

۳- ملزم کو دھمکی دینے کا جواز حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کی حدیث میں مذکور واقعہ سے معلوم ہوتا ہے۔

☆ مولانا محمد ذکاء اللہ شبلی کہتے ہیں کہ سچی بات معلوم کرنے کے لئے مناسب تدبیر اختیار کرنے کی اجازت ہوگی۔

☆ مولانا افتخار احمد مفتاحی کا کہنا ہے کہ معمولی الکٹرک شاک لگائی جاسکتی ہے، اس سے غالباً جسم کی مشینریوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

☆ مفتی محمد مقصود رامپوری اور مولانا ابوسفیان مفتاحی کا کہنا ہے کہ سچی بات حاصل کرنے کے لئے ان کی مار پیٹ کرنا صحیح ہے بشرطیکہ ہلاکت کا اندیشہ نہ ہو، قاضی ہارون مینگل نے اس میں ''یضرب بالسوط مجردا'' کی صراحت کی ہے۔

☆ مولانا راشد حسین ندوی اور مولانا ابرار حسن ایوبی ندوی کہتے ہیں کہ اگر کوئی خطرناک مجرم ہو اور اس کے پاس کوئی راز ہو اور برہنگی کے بغیر اس راز کو معلوم کرنا ممکن نہ ہو تو بدرجہ مجبوری اس کی بقدر ضرورت اجازت ہوگی، اور بطور دلیل یہ حدیث پیش کی ہے:

''سمعت علیا یقول: بعثنی رسول الله صلی الله علیه وسلم أنا والزبیر والمقداد فقال: انطلقوا... فاذا نحن بالظعینة، فقلنا: هلمی الکتاب، قالت: ما عندی من کتاب، فقلت: لتخرجن الکتاب أو لنلقین الثیاب'' (بخاری کتاب المغازی، ابوداؤد؛ کتاب الجهاد)۔

☆ مولانا نعیم اختر قاسمی اور شاہ محمد تفضل علی کا کہنا ہے کہ جرم کی سنگینی اور مجرم کی خصوصی نوعیت کو دیکھتے ہوئے یہ مسئلہ حاکم اور ذمہ دار کی صوابدید پر منحصر ہونا چاہئے۔

☆ مولانا خورشید انور اعظمی کہتے ہیں کہ اگر ملزم ایسا ہے کہ اپنے الزام کے تعلق سے مشہور و معروف ہے یا دوسرے مضبوط قرائن اس الزام کی تصدیق کرتے ہوں تو مارنے کی اجازت ہوگی۔

☆ مولانا محمد شاہجہاں ندوی نے معمولی درجہ میں مار پیٹ کی اجازت دی ہے، اور استدلال اس حدیث سے کیا ہے جس میں منقول ہے کہ سعیہ نے حیی بن اخطب کے سونے اور زیورات کے ذخیرہ کو غزوہ خیبر کے موقع سے چھپالیا، اور آپ ﷺ کے دریافت کرنے پر جواب دیا:

''أذهبته النفقات والحروب'' اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''العهد قریب والمال أکثر من ذلک''، اور پھر آپ ﷺ نے سعیہ کو حضرت زبیر کے حوالہ کیا، انہوں نے اسے ہلکی ضرب لگائی تو اس نے سچی بات اگل دی اور مال کی جگہ بتادی (ابوداؤد؛ کتاب الامارۃ، حدیث نمبر: ۳۰۰۶، جامع الاصول ۶۴۲/۲)۔

قاضی ہارون مینگل نے کہا کہ اگر الیکٹرک شاک لگانے کی تکلیف ضرب سوط سے زیادہ نہ ہو تو گنجائش ہے۔

۴- قیدیوں کو زنجیر، بیڑی یا ہتھکڑی لگانا:

سوال:...... کیا قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑا جاسکتا ہے یا انہیں ہتھکڑی پہنائی جاسکتی ہے، یا انہیں بیڑی ڈالی جاسکتی ہے؟

بعض مقالہ نگار حضرات کے نزدیک قیدی کے اگر بھاگنے کا اندیشہ ہو تبھی بیڑی یا ہتھکڑی ڈالا جاسکتا ہے بصورت دیگر زنجیروں میں جکڑنا یا ہتھکڑی اور بیڑی ڈالنا ناجائز ہے (مقالہ: مفتی اقبال احمد قاسمی، مولانا ابرار حسن ایوبی ندوی، شاہ محمد تفضل علی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، قاضی محمد ہارون مینگل، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا اقبال احمد ٹنکاروی، مفتی محمد جعفر علی رحمانی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولوی محمد مغفور باندوی)۔

دلائل

۱-''عجب اللّٰہ تعالی من قوم یدخلون الجنة فی السلاسل'' (بخاری، حدیث نمبر: ۳۰۱۰)

(مقالہ: مولانا ابرار حسن ایوبی ندوی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا رحمت اللہ ندوی)۔

۲-''ولا یغل إلا إذا خاف فراره فیقید'' (شامی ۶/۵۸، مجمع الأنهر ۳/۲۲۴)

(مقالہ: مفتی اقبال احمد قاسمی، مولانا ابرار حسن ایوبی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولوی محمد مغفور باندوی)۔

۳-''ولایقید ولایغل ولایجرد ولا جر ولایقام بین یدی صاحب الحق إبانة وفی المنتقی إذا خاف فراره قیده، کذا فی البزازیة، و فیها إذا خیف أنه یفر من السجن یحول إلی سجن اللصوص...'' (البحر الرائق ۶/۲۸۳، ہندیہ ۳/۴۱۴)

(مقالہ: شاہ محمد تفضل علی، مولانا راشد حسین ندوی، مفتی محمد جعفر علی رحمانی)۔

بعض حضرات نے حسب ضرورت جرم اور مجرم کی نوعیت کے اعتبار سے اس کی اجازت دی ہے۔ (مقالہ: مفتی انور علی اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا لطیف الرحمن فلاحی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا محمد ذکاء اللہ شبلی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی)۔

دلائل

۱-''حتی إذا أثخنتموهم فشدوا الوثاق'' (سورۂ محمد: ۴)

(مقالہ: مفتی انور علی اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا اقبال احمد ٹنکاروی، مفتی محمد جعفر علی رحمانی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی)۔

۲-حضرت سودہؓ سے روایت ہے: ''فرجعت إلی بیتی ورسول اللّٰہ ﷺ فیه. وإذا أبویزید سهیل بن عمرو فی ناحیة الحجرة مجموعة یداه إلی عنقه بحبل'' (ابوداؤد ۳/۵۶) (مقالہ: مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا راشد حسین ندوی)۔

۳-''عن أبی هریرة قال بعث النبی ﷺ خیلا قبل حمامة فجاء ت برجل من بنی حنیفة یقال له ثمامة بن أثال فربطوه بساریة من سواری المسجد'' (مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۴۳، احکام القرآن للمفتی محمد شفیع ۴/۲۱۱)

(مقالہ: مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا راشد حسین ندوی)۔

۴-''وللآسر أن یشد وثاقه إن خاف انفلاته أو لم یأمن شره کما یجوز عصب عینیه أثناء نقله لمنعه من الهرب'' (الموسوعة الفقهیه ۴/۱۹۷) (مقالہ: مولانا اشتیاق احمد اعظمی)۔

بعض حضرات نے ایسا کرنے کو مطلق جائز قرار دیا ہے، اور وہی دلیلیں دی ہیں جو اوپر گذر چکیں (مقالہ: مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا محمد اشرف عباس قاسمی، مفتی محمد مقصود رامپوری)۔

۵-قیدیوں کو قید تنہائی کی سزا دینا

سوال:.....کیا کسی مجرم کو اس کے خصوصی جرم کے پس منظر میں قید تنہائی دی جاسکتی ہے؟

تقریباً تمام ہی مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ خصوصی جرم کے پس منظر میں بعض قیدیوں کو قید تنہائی کی سزا دیئے جانے کی گنجائش ہے۔

دلائل

۱-''وعلى الثلاثة الذين خلفوا حتى إذا ضاقت عليهم الأرض بما رحبت وضاقت عليهم أنفسهم وظنوا أن لا ملجأ من الله إلا إليه ثم تاب عليهم ليتوبوا إن الله هو التواب الرحيم''(سورۂ توبہ:۱۱۸)(مقالہ: مفتی اقبال احمد قاسمی)۔

۲-''ويجوز للحاكم عزل السجين وحبسه منفردا في غرفة يقفل عليه بابها إن كان في ذلك مصلحة''(فتاوى ابن تيميه ۱۵/۳۱۰، المغنى ۸/۱۲۴، الموسوعة الفقهيه ۱۶/۳۱۹)(مقالہ: مولانا اختر امام عادل قاسمی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا رحمت اللہ ندوی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا خورشید انور اعظمی، شاہ محمد تفضل علی)۔

۳-''يطين عليه الباب ويترك له ثقبة يلقى له الخبز والماء، وقيل: الرأي فيه للقاضي''(ردالمحتار ۸/۵۴، البحر الرائق ۶/۴۷۶)(مقالہ: مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی اقبال احمد قاسمی، شاہ محمد تفضل علی)۔

☆ البتہ قید تنہائی کی صورت میں اس کے دیگر مذہبی، سماجی اور جسمانی حقوق دیے جانے چاہئیں (مقالہ: مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مفتی انور علی اعظمی)۔

☆ لیکن مفتی سید باقر ارشد قاسمی کا خیال ہے کہ قید تنہائی کی اجازت نہ ہونی چاہئے، کیونکہ اس سے قیدی کی صحت متاثر ہوتی ہے۔

۶- قیدیوں سے جبراً کام لینا اور اس کے کام کی اجرت

سوال:...... کیا جیل میں قیدیوں سے جبراً کام لیا جاسکتا ہے اور اگر کام لیا جائے تو کیا قیدی اس کام کی اجرت کے مستحق ہیں؟

☆ اس سلسلہ میں مقالہ نگاروں کی رائیں مختلف ہیں، لیکن اکثر حضرات اس طرف گئے ہیں کہ قیدیوں سے جبراً کام لیا جاسکتا ہے بشرطیکہ کام ان کی طاقت سے باہر نہ ہو، اور یہ سزا کے طور پر ہوگا اس لئے وہ اجرت کے بھی مستحق نہیں ہوں گے (مقالہ: مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا لطیف الرحمن فلاحی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد اشرف عباس قاسمی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مفتی جمیل احمد نذیری وغیرہ)۔

۱-''واختلفوا في منعه من الكسب والأصح المنع''(البحر الرائق ۶/۴۷۶)۔

۲-''وفي شرح أدب القضاء عن السرخسي أنه الصحيح من المذهب، لأن الحبس مشروع ليضجر ومتى تمكن من الاكتساب لا يضجر فيكون السجن له بمنزلة الحانوت''(شامی ۸/۵۷)۔

۳- سوال (۷۴۹) جیل خانہ میں دری وغیرہ اور اکثر چیزیں قیدیوں سے تیار کرائی جاتی ہیں جس کی اجرت و معاوضہ کچھ نہیں مقرر ہے بلکہ سزائے جرم میں یہ امر مفہوم ہوتا ہے، اس صورت میں جیل خانہ کی بنی ہوئی جانماز یا کمبل وغیرہ پر نماز درست ہوگی یا نہیں؟

الجواب: استیلاء سے سرکار مالک ہوجاتی ہے، لہذا اس کا خریدنا اور برتنا سب جائز ہے (امداد الفتاوی ۱/ ۹۲)۔

☆ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اگر قیدی کو کام پر مجبور کیا جائے تو اجرت کا مستحق ہوگا (مقالہ: ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا اقبال احمد ٹنکاروی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا ابرار حسن ایوبی ندوی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولوی محمد مغفور باندوی)۔

۱-حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے:''كان ناس من الأسرى يوم بدر لم يكن لهم فداء فجعل رسول الله ﷺ فداءهم أن يعلموا أولاد الأنصار الكتابة''(مسند احمد بن حنبل، حديث نمبر: ۲۲۱۶)(مقالہ: مولانا ابرار حسن ایوبی ندوی)۔

۲-''وعن الثاني يوجره لقضاء دينه (قوله عن الثاني) عبارة النهر ولا يوجر خلافا لما عن الثاني''(شامی ۴/۲۵۰)
(مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی)۔

☆ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ کسی بھی قیدی سے جبراً کام نہیں لیا جاسکتا (مقالہ: مولانا محمد ذکاء اللہ شبلی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا ابوبکر قاسمی، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا

خورشید انور اعظمی وغیرہ)۔

''ولا يقيد ولا يقام ولا يؤاجر، لأن هذه عقوبات زائدة ماورد الشرع بها. لا يقام يعني لا يؤمر بالقيام بين يدى صاحب المال إهانة له فإن ذلك مع عقوبة، ولا يؤاجر من غير اختياره، لأن ذلك نوع حجر عليه، ولا يجوز ذلك فى ماله، فلأن لا يجوز فى نفسه بطريق الأولى'' (المبسوط ۲۰/۹۸)۔

☆ مفتی محمد مقصود رامپوری کا کہنا ہے کہ اگر ایسے قیدی سے کام لیا گیا جس کا جرم ثابت نہ ہوا اور عدالت نے اسے بری کر دیا تو پھر وہ قیدی اجرت کا مستحق ہوگا۔

☆ مولانا رحمت اللہ ندوی کہتے ہیں کہ اس کی اجرت بشرطیکہ کام بطور سزا نہ ہو، قید خانہ کے قانون اور عرف ورواج پر موقوف ہوگی۔

☆ جبکہ مولانا سلطان احمد اصلاحی کے بقول بہتر ہوگا کہ اس کو کام کے معاوضہ سے بالکل محروم نہ رکھا جائے۔

☆ اسی طرح مولانا محمد اشرف عباس قاسمی اور مفتی اقبال احمد قاسمی کہتے ہیں کہ حکومت کو چاہئے کہ اس پر کچھ اجرت مقرر کردے، جس سے قیدیوں کو کسی حد تک راحت حاصل ہو۔

☆ اور مولانا عبدالرشید قاسمی اور شاہ محمد تفضل علی کے نزدیک قاضی یا حاکم کی صوابدید پر قیدیوں سے کام لینا اور اس کی اجرت موقوف ہوگا۔

۷-ملزم قیدی اور مجرم قیدی کے درمیان امتیاز برتنا

سوال:......جن قیدیوں کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے اور جن کے بارے میں سزائے قید کا فیصلہ ہو چکا ہے، قید خانوں میں سلوک کے اعتبار سے کیا ان دونوں میں فرق کیا جا سکتا ہے؟

تقریباً تمام مقالہ نگاروں کا کہنا ہے کہ زیر سماعت قیدیوں اور جن کا فیصلہ ہو چکا ہے ان قیدیوں کے درمیان قید خانوں میں سلوک کے اعتبار سے فرق کیا جائے گا (مقالہ: مفتی انور علی اعظمی، مفتی جمیل احمد نذیری، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا محمد ذکاء اللہ شبلی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مفتی محمد مقصود رامپوری، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا ابرار حسن ندوی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، شاہ محمد تفضل علی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولوی محمد مغفور باندوی)۔

دلائل

۱-''والمعمول به فى القديم تميز حبس الوالى الذى يضم أهل الريبة والفساد(الموقوفين) عن حبس القاضى الذى يضم المحكومين ويختلف سجن الوالى عن سجن القاضى'' (الموسوعة الفقهيه ۱۶/۳۱۸) (مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی، شاہ محمد تفضل علی)۔

۲-''عن عائشة رضى الله عنها قالت: أمرنا رسول الله ﷺ أن ننزل الناس منازلهم'' (مسلم ۱/۴) (مقالہ: مفتی محمد جعفر ملی رحمانی)۔

۳-''كتب عمر بن عبد العزيز إلى أمراء الأجناد: وانظروا من فى السجون ممن قام عليه الحق فلا تحبسه حتى تقيمه عليه، ومن أشكل أمره فاكتب إليّ فيه، واستوثق من أهل الدعارات، فإن الحبس لهم نكال، ولا تعد فى العقوبة...وإذا حبست قوما فى دين فلا تجمع بينهم وبين أهل الدعارات فى بيت واحد ولا حبس واحد'' (الطبقات الكبرى لابن سعد ۵/۳۵۶) (مقالہ: شاہ محمد تفضل علی)۔

لیکن اس کے برعکس بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ:

☆ زیر سماعت قیدیوں کو بے قصور تصور کیا جائے، ایسے قیدی مجرم نہیں بلکہ ملزم ہوتے ہیں، لہذا ان سے کام بھی نہ لیا جائے اور ان کے ساتھ برا سلوک بھی نہ کیا جائے (مفتی انور علی اعظمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا عبدالرشید قاسمی)۔

''وإن الأصل فى المتهم البراءة حتى تثبت إدانته'' (الفقه الاسلامى وادلته ۷/۶۴۵۳)۔

☆ مفتی اقبال احمد قاسمی کے نزدیک زیر سماعت قیدیوں کو جن کو محض الزام یا اتہام اور شبہ کی بنا پر قید کر لیا گیا ہو اگر ان کا ریکارڈ پہلے سے داغدار نہیں ہے تو ان کو قید میں رکھنا ہی شرعاً درست نہیں ہے۔

☆ مولانا ابوبکر قاسمی کا کہنا ہے کہ جیل خانہ میں ہر قسم کے قیدیوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے گا۔

☆ مولانا راشد حسین ندوی کے نزدیک دونوں قسم کے قیدیوں کے ساتھ سلوک میں کوئی فرق نہیں رکھا جائے گا، البتہ صرف چور، جاسوس اور اس جیسے متہمین پر کچھ ایسی مزید سختیاں جائز ہیں جو ثبوت جرم کے بعد باقی نہیں رکھی جائیں گی۔

۸- اصل سزا سے زائد دنوں تک فیصلے سے پہلے قید میں رکھنا

سوال: کیا زیر سماعت قیدیوں کو اتنے دنوں تک فیصلے سے پہلے قید میں رکھا جا سکتا ہے جو ان کے اوپر عائد فرد جرم کی اصل سزا ہے؟

☆ اکثر حضرات اس پر متفق ہیں کہ زیر سماعت قیدیوں کو فیصلے سے پہلے اتنے دنوں تک قید میں رکھنا جو ان کے اوپر عائد فرد جرم کی اصل سزا کے برابر ہے درست نہیں ہے (مقالہ: مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، شاہ محمد تفضل علی، مفتی اقبال احمد قاسمی، مفتی محمد مقصود رامپوری، قاضی محمد ہارون مینگل، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مفتی محمد اشرف عباس قاسمی، مولوی محمد مغفور باندوی)۔

☆ اکثر فقہاء کے نزدیک فیصلہ سے قبل متہم کے قید کی مدت حاکم یا قاضی کی صوابدید پر منحصر ہے (مقالہ: مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

☆ فیصلہ میں یا تحقیق حال میں تاخیر نہیں ہونی چاہئے بلکہ جلد از جلد معاملہ کو نپٹانے کی کوشش ہونی چاہئے (مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

اجمالی دلائل

۱- ''فيحبس حتى يكشف أمره، وقيل شهرا'' (رد المحتار ۱۰۸/۶) (مقالہ: مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مفتی اقبال احمد قاسمی)۔

۲- ''لا حد لأقل مدة الحبس أما أكثره فيرجع فيه إلى اجتهاد الحاكم حتى ينكشف حال المتهم وقد نسب ابن تيمية هذا القول إلى مالك وأصحابه وأحمد ومحققي أصحابه و أصحاب أبي حنيفة ونص المالكية لا يطال و قال بعض الفقهاء... يوم واحد و حددها بيومين وثلاثة وأجاز آخرون بلوغها شهرا'' (الموسوعة الفقهيه ۲۹۴/۱۶)

(مقالہ: مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی)۔

۳- ''والثالث أن للأمير أن يعجل حبس المتهوم للكشف والاستبراء، واختلف في مدة حبسه لذلك، فذكر عبدالله الزبيري من أصحاب الشافعي أن حبسه للاستبراء والكشف مقدر بشهر واحد لا يتجاوزه، وقال غيره: بل ليس بمقدر وهو موقوف على رأى الإمام واجتهاده وهذا أشبه، وليس للقضاة أن يحبسوا أحدا إلا بحق وجب'' (الأحكام السلطانية/۲۲۰) (مقالہ: مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی انور علی اعظمی)۔

۴- ''مر ولا تك جميعا بالنظر في أمر أهل الحبوس في كل أيام فمن كان عليه أدب، أدّب و أطلق. ومن لم يكن له قضية خلّي عنه'' (كتاب الخراج لأبي يوسف/۱۵۷) (مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

☆ بعض مقالہ نگاروں کا کہنا ہے کہ زیر سماعت قیدیوں کو فیصلے سے پہلے ان پر عائد فرد جرم کی سزا کے برابر یا اس سے زائد دنوں تک قید میں رکھا جا سکتا ہے (مقالہ: مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا محمد ذکاء اللہ شبلی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

جبکہ مفتی محمد جعفر ملی رحمانی اور مولانا ابرار حسن ندوی متہم ملزم کے معروف بالفسق والفجور یا مجہول الحال ہونے کی قید لگاتے ہیں۔

دلائل

۱-''ویحبس الدعارون الذین ہم مخوفون علی المسلمینض، وأهل الفساد، حتی تعرف منهم التوبة...''
(الفتاوی الهندیہ ۳/ ۴۱۴) (مقالہ: مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۲-''أما المتهم المعروف بالفجور والفساد فأكثر مدة حبسه بحسب ما يقتضيه ظهور حاله والكشف عنه ولو حبس حتی الموت وهذا هو الظاهر فی مذاهب فقهاء الأمصار من الحنفية والمالكية والشافعية والحنابلة''۔
(الموسوعة الفقہیہ ۱۶/ ۲۹۵) (مقالہ: مفتی محمد جعفر ملی رحمانی)۔

۳-''ثم الحاكم قد يكون مشغولا عن تعجيل الفصل وقد يكون عنده حكومات سابقة فيبقى المطلوب محبوسا معوقا من حين يطلب إلى حين يفصل بينه وبين خصمه وهذا حبس بدون التهمة ففی التهمة أولی''۔
(مجموع فتاوی ابن تیمیہ ۳۵/ ۳۹۸) (مقالہ: مولانا ابرار حسن ایوبی ندوی)۔

۹-قید میں ہونے والی ذہنی یا جسمانی اذیت پر مالی ہرجانہ کا مطالبہ

سوال: اگر ملزم کو قید میں رکھا گیا ہو اور بعد کو عدالت نے اسے بری قرار دیا تو کیا وہ زمانہ قید میں ہونے والی ذہنی اذیت اور مالی ہرجانہ طلب کرسکتا ہے؟

زمانہ قید میں ہونے والی ذہنی اذیت پر مالی ہرجانہ طلب کرنے کے سلسلہ میں دونوں رائیں پائی جاتی ہیں۔ اکثر مقالہ نگار حضرات کے نزدیک اگر عدالت نے ملزم کو بری کردیا تو وہ زمانہ قید میں ہونے والی ذہنی اور جسمانی اذیت پر مالی ہرجانہ کا مطالبہ کرسکتا ہے۔(مقالہ: مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد ذکاء اللہ شبلی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، قاضی محمد ہارون مینگل، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا اقبال احمد ٹنکاروی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا ابرار حسن ندوی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مفتی اقبال احمد قاسمی، مولوی محمد مغفور باندوی)۔

دلائل

۱-"وإن عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به" (سورۂ نحل: ۱۲۶) (مقالہ: مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا ابرار حسن ندوی)۔

۲-"فلا عدوان إلا على الظالمين" (سورۂ بقرہ: ۱۹۳) (مقالہ: مولانا ابوبکر قاسمی)۔

۳-"فمن اعتدى عليكم فاعتدوا عليه بمثل ما اعتدى عليكم" (سورۂ بقرہ: ۱۹۴) (مقالہ: مولانا ابرار حسن ندوی)۔

۴-"وجزاء سيئة سيئة مثلها" (سورۂ شوری: ۴۰) (مقالہ (مولانا ابرار حسن ندوی)۔

۵-''لا ضرر ولا ضرار'' (ابن ماجہ/ ۲۳۴۰) (مقالہ: مولانا ابرار حسن ندوی)۔

۶-''وجوب تعويض المضرور عن ضرره على حساب من سبب هذا الضرر'' (موسوعۃ الفقہ الاسلامی المعاصر ۳/ ۳۴۸)۔
(مقالہ: مولانا ابرار حسن ندوی)۔

۷- حضرت علیؓ نے شہادت کی بنیاد پر ایک شخص پر قطع ید کی سزا نافذ کردی، تھوڑی دیر بعد وہ دونوں گواہ ایک دوسرے شخص کو پکڑ لائے اور کہا چور اصل یہ ہے پہلے غلطی ہوگئی۔ حضرت علیؓ بہت ناراض ہوئے اور ان دونوں گواہوں سے اس پہلے شخص کو دیت دلوائی (موسوعۃ الفقہ الاسلامی المعاصر ۳/ ۳۴۹)
(مقالہ: مولانا ابرار حسن ندوی، مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی)۔

۸-''وإن جنى على حر جناية نقص بها جمال أو منفعة ولا إرش لها مقدر ذكرنا أنه يجب فيهما حكومة''
(المجموع للنووی ۲۰/ ۵۴۸) (مقالہ: مولانا عبدالرشید قاسمی، مفتی اقبال احمد قاسمی)۔

بعض حضرات نے کچھ شرطوں کے ساتھ ہرجانہ کے مطالبہ کی بات کہی ہے، چنانچہ:

☆ مولانا رحمت اللہ ندوی کہتے ہیں کہ اگر وہ مجہول الحال اور فاجر و فاسق نہ ہو تو ہرجانہ کا مطالبہ کرسکتا ہے۔

☆ مفتی جمیل احمد نذیری کا کہنا ہے کہ زیر سماعت قیدی یعنی ملزم کے ساتھ اگر مجرموں جیسا برتاؤ کیا گیا یا اسے بلا کسی معقول عذر کے لمبی مدت تک رکھا گیا تو ہرجانہ طلب کرسکتا ہے۔

☆ مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی اور مولانا راشد حسین ندوی کہتے ہیں کہ مدعی سے مالی ہرجانہ کا مطالبہ کیا جائے گا۔

☆ مولانا ظفر عالم ندوی اور مولانا اختر امام عادل قاسمی کے بقول اگر قیدی کو سزا کے مقررہ حدود سے بڑھ کر اور غیر انسانی سزا دی گئی تو مالی ہرجانہ کے مطالبہ کا حق ہوگا۔

☆ شاہ محمد تفضل علی کا کہنا ہے کہ دعویٰ کی پیروی یا اس کی جوابدہی میں مدعا علیہ کا جو مال خرچ ہوا اس کا مدعی سے مطالبہ کرسکتا ہے۔

مولانا محمود الحسن گنگوہی سوال نمبر ۸۰۱۵ کے جواب میں لکھتے ہیں: غلط دعویٰ کی جوابدہی میں جس قدر خرچ ہو وہ سب وصول کرنا درست ہے، جسمانی و روحانی اذیت اور بے آبروئی کا کوئی مالی ضمان نہیں (فتاویٰ محمودیہ ۱۶/ ۴۶۰)۔

☆ مولانا نعیم اختر قاسمی کے نزدیک ذہنی اذیت کا ہرجانہ طلب نہیں کرسکتا، البتہ مالی ہرجانہ کا مطالبہ درست ہے۔

☆ مولانا خورشید انور اعظمی کہتے ہیں کہ یہ قید تعزیراً ہے اس لئے اسے ہرجانہ کے مطالبہ کا حق نہیں ہوگا، اور تقریباً یہی رائے مولانا سلطان احمد اصلاحی، مفتی محمد مقصود رامپوری، مولانا محمد اشرف عباس قاسمی اور مولانا خورشید احمد اعظمی کی ہے۔

☆ مفتی محمد جعفر ملی رحمانی کا کہنا ہے کہ ذہنی اذیت کا تعلق عین سے نہیں ہے اس لئے مالی ہرجانہ طلب کرنا صحیح نہیں۔

۱۰- قیدی کو وکیل سے رابطہ کرنے اور اپنی صفائی پیش کرنے کا حق

سوال: قیدی کو اپنے مقدمات کے سلسلہ میں وکیل سے رابطہ اور صفائی پیش کرنے کے کیا حقوق حاصل ہیں؟

تمام مقالہ نگاروں کا اس پر اتفاق ہے کہ قیدی کو مقدمات کے سلسلہ میں وکیل سے رابطہ کرنے اور اپنے عزیز و اقارب سے مشورہ کرنے اور اپنی صفائی پیش کرنے کے سارے حقوق حاصل ہوں گے۔

دلائل

۱- "وأخي هارون هو أفصح مني لسانا فأرسله معي ردءا يصدقني إني أخاف أن يكذبون" (سورۂ قصص/ ۳۴) (مقالہ: مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی)۔

۲- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا: "إذا تقاضى إليك رجلان فلا تقض للأول حتى تسمع كلام الآخر" (ترمذی ۱/ ۲۴۸) (مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی)۔

۳- "ولا يمكن أحد أن يدخل عليه للاستئناس إلا أقاربه وجيرانه لاحتياجه للمشاورة" (درمختار ۵/۳۷۷)
(مقالہ: مولانا اختر امام عادل قاسمی، شاہ محمد تفضل علی، مولانا راشد حسین ندوی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۴- "لو يعطى الناس بدعواهم لادعى ناس دماء رجال وأموالهم ولكن البينة على المدعي عليه" (مشکوۃ ۲/۳۲۶)
(مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی)۔

۵- "وتجوز الوكالة بالخصومة في سائر الحقوق لما قدمنا الحاجة، إذ ليس كل أحد يهتدي إلى وجوه الخصومات، وقد صح أن عليا رضي الله عنه وكّل فيها عقيلا رضی اللہ عنہ وبعد ما أسن وكّل عبد الله بن جعفر" (المغنی ۵/۲۷۰، الهدایه ۳/۱۳۶)
(مقالہ: مولانا محمد اشرف عباس قاسمی، مولانا ابرار حسن ایوبی ندوی)۔

۶- "وذكر الموفق وغيره إجماع الأمة على جواز الوكالة في الجملة والحاجة داعية إليها، إذ لا يمكن كل أحد فعل ما يحتاج إليه بنفسه" (الملخص الفقهي للشيخ فوزان ۲/۶۳) (مقالہ: مولانا محمد اشرف عباس قاسمی)۔

۷- "إذا وكل عنه من يقوم مقامه في الخصومة بأن يدعي عنه دعوى صحيحة أو يجيب عن دعوى فإن ذلك جائز"

(الفقه على المذاهب الأربعة ۳/۱۷۷) (مقالہ: مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی)۔

۸-''الوكالة في الشرع إقامة الشخص غيره مقام نفسه مطلقا أو مقيدا'' (القضاء ونظامه/۳۶۱)

(مقالہ: مفتی اقبال احمد قاسمی، مولانا عبدالرشید قاسمی)۔

۹-''أما الوكالة بالخصومة كالمحاماة اليوم فتجوز في حقوق الناس لما روى عن على رضى الله عنه ولأن الحاجة تدعو إلى التوكيل فيها، إذ قد لا يحسن المرء الدفاع عن حقوقه أو يكره أن يتولى الخصومة بنفسه'' (الفقه الإسلامي وأدلته ۴۰۷۷/۵) (مقالہ: مولانا ابرار حسن ندوی)۔

۱۰-''إذا علم القاضي بأن الموكل عاجز عن البيان في الخصومة بنفسه يقبل منه التوكيل كذا في فتاوى قاضي خان'' (فتاوی ہندیہ ۳/۲۷۶) (مقالہ: مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی انور علی اعظمی)۔

بعض حضرات کی اس کے ساتھ اضافی رائے یہ ہے کہ:

☆ مقدمات کے سلسلہ میں اگر ضرورت ہوئی تو اسے قید خانہ سے نکلنے کی اجازت دی جائے گی (مقالہ: مولانا اختر امام عادل قاسمی وغیرہ)۔

☆ اس کے برخلاف مولانا خورشید احمد اعظمی کہتے ہیں کہ اس کے لئے اسے قید سے نکالا نہیں جائے گا۔

☆ جو قیدی وکیل کے اخراجات نہ برداشت کر سکے اس کے لئے قانونی نمائندگی کا بندوبست ریاست/حکومت پر لازم ہونا چاہئے۔

(مقالہ: مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی)۔

☆ مولوی محمد مغفور باندوی کا کہنا ہے کہ اصول تو یہ ہے کہ ملزم اپنی صفائی خود ہی پیش کرے، لیکن اگر ملزم کے بار بار باہر آنے میں دشواری ہو یا خود اپنی صفائی پیش کرنے سے عاجز ہو تو ایسی صورت میں وکیل بنانا جائز ہوگا۔

☆ ''إذا ادعى عليك محبوس حقًا يخرجه القاضي بسماع الدعوى عليه والإجابة عنها ثم يرد إلى الحبس ولا يؤكل عنه أحدا في الخصومة عند غير المالكية، فإن تعذر على المحبوس الخروج جاز له استحسانا توكيل من يجيب عنه''

(الموسوعة الفقهيه ۶/۲۲۶)۔

۱۱-خواتین قیدیوں کا اپنے ساتھ شیر خوار بچوں کو رکھنا

سوال: کیا خواتین قیدیوں کو اپنے ساتھ شیر خوار بچوں کو جیل میں رکھنے کا حق حاصل ہے؟

تقریباً تمام ہی مقالہ نگاروں کی رائے ہے کہ خواتین قیدیوں کو اپنے ساتھ شیر خوار بچوں کو جیل میں رکھنے کی اجازت دی جائے گی۔

دلائل

۱-"والوالدات يرضعن أولادهن حولين كاملين" (سورۂ بقرہ: ۲۳۳) (مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی)۔

۲-''عن علي أنه فرق بين جارية وولدها فنهاه النبي ﷺ عن ذلك ورد البيع'' (ابوداؤد مع شرحه بذل المجهود ۴/۲۵)

(مقالہ: مفتی انور علی اعظمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا راشد حسین ندوی، مولوی محمد مغفور باندوی)۔

۳-''وكان ﷺ يمنع التفريق في السبي بين الوالدة وولدها ويقول: من فرق بين والدة وولدها فرق الله بينه وبين أحبته يوم القيامة، وكان يؤتى بالسبي فيعطي أهل البيت جميعا كراهية أن يفرق بينهم'' (زاد المعاد ۳/۱۱۴، المغني ۱۰/۳۶۸، بدائع الصنائع ۵/۲۲۸) (مقالہ: مولانا ابرار حسن ندوی، مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، شاہ محمد تفضل علی)۔

۴-''ويحرم التفريق بين الأم والولد حتى يميز وفي قول حتى يبلغ'' (الدر المنضود شرح سنن ابی داؤد ۴/۲۲۵)

(مقالہ: مولانا ابرار حسن ایوبی ندوی)۔

۵-''من فرق بين والدة وولدها فرق الله بينه وبين أحبته يوم القيامة'' (ترمذی ۲۴۱/۱) (مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، مفتی اقبال احمد قاسمی، مولانا عبد الرشید قاسمی)۔

۶-''لا توله والدة عن ولدها'' (رواه البيهقي، نصب الرایہ ۲۶۶/۳) (مقالہ: مولانا اختر امام عادل قاسمی، شاہ محمد تفضل علی)۔

۷-''نهى رسول الله ﷺ أن يفرق بين الأم وولدها فقيل: يا رسول الله! إلى متى؟ قال: حتى يبلغ الغلام وتحيض الجارية'' (دار قطنی ۶۷/۳) (مولانا اختر امام عادل قاسمی، شاہ محمد تفضل علی جلال آبادی)۔

بعض حضرات نے درج ذیل شرطوں کا بھی ذکر کیا ہے:

☆ مولانا ابو سفیان مفتاحی کہتے ہیں کہ اگر بچے کے لئے رہنے کی کوئی جگہ نہ ہو تو چار سال کی عمر تک وہ اپنی ماں کے ساتھ جیل میں رہ سکتا ہے۔

☆ مولانا محمد شاہجہاں ندوی اور مولانا اقبال احمد ٹنکاروی کے نزدیک اگر بچہ ماں کے علاوہ کسی اور کا دودھ نہ لے یا اس کا باپ کسی دودھ پلانے والی کو اجرت پر رکھنے کے قابل نہ ہو تو بچہ کو ساتھ میں رکھنے کا حق ہوگا۔

☆ مولانا افتخار احمد مفتاحی کے بقول جب تک بچہ خود سے خورد ونوش اور دیگر انسانی ضروریات پر قادر نہ ہو جائے وہ اپنی ماں کے ساتھ جیل میں رہے گا۔

☆ مفتی اقبال احمد قاسمی وغیرہ لکھتے ہیں کہ اگر امرأۃ غامدیہ کے واقعہ سے استئناسا بچہ کے سمجھدار ہونے تک قید ہی کو ملتوی کر دیا جائے تو بہتر ہوگا۔

☆ مولانا خورشید احمد اعظمی کے نزدیک وہ بچہ کو اس کے باپ کی اجازت کے بعد ہی رکھ سکتی ہے، اور اگر باپ اس بچہ کی رضاعت اور غذا کا نظم کر لیتا ہے تو نہ رکھنا ہی زیادہ بہتر ہے۔

☆ ''إذا أرادت المطلقة أن تخرج بولدها من المصر فليس لها ذلك لما فيه من الإضرار بالأب'' (ہدایہ ۲/ ث ۴۱۶)۔
بچہ کو جیل میں رکھنے پر بھی یہ ضرر سامنے آتا ہے اس لئے اجازت نہیں ہونی چاہئے۔

☆☆☆

عرض مسئلہ

قیدیوں کے حقوق

(سوال نمبر ۱، ۲)

مولانا سید اسرار الحق سبیلی [۱]

راقم الحروف کو سوالنامہ ''قیدیوں کے حقوق'' کے سوال نمبر ۱، ۲ سے متعلق عرض مسئلہ کے لئے اکیس مقالات اکیڈمی کی طرف سے موصول ہوئے۔

۱- کیا کسی ملزم کو اس کے جرم کا ثبوت فراہم ہوئے بغیر قید کیا جاسکتا ہے اور اگر بطور احتیاط کے قید کیا جائے تو کیا اس کے لئے کوئی مدت مقرر کی جاسکتی ہے؟

بیشتر مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ ملزم کو اس کا جرم ثابت ہوئے بغیر قید کیا جاسکتا ہے، ان کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:

مفتی محبوب علی وجیہی، مفتی لطیف الرحمن فلاحی، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مفتی اقبال احمد قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا عبد الرشید قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی۔

جبکہ مولانا راشد حسین ندوی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی اور مولانا محمد مغفور باندوی کی رائے ہے کہ صرف حدود و قصاص کے ملزم کو قید کرنا درست ہوگا، ان حضرات کے نزدیک ملزم ہونے کے لئے شرط ہے کہ اس کے خلاف دو مستور الحال یا ایک عادل شخص کی گواہی موجود ہو۔

مولانا اقبال دار العلوم ماٹلی والا کی رائے ہے کہ قرائن کی موجودگی میں قید کرنا درست ہوگا، یا ملزم عادی مجرم ہو، لیکن نیک شخص کو بغیر بینہ کے قید نہیں کیا جاسکتا، جبکہ مولانا ابرار حسن ایوبی ندوی کا خیال ہے کہ دینداری اور تقویٰ میں مشہور شخص کو قید نہیں کیا جاسکتا، مجہول الحال اور فسق و فجور میں مشہور شخص کو قرائن کی بنیاد پر قید کیا جاسکتا ہے، مولانا ابوسفیان مفتاحی بھی صرف جرائم میں مشہور شخص کو قید کرنے کے قائل ہیں۔

اس کے برخلاف مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی اور ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی کا خیال ہے کہ بلاثبوت کے قید کرنا جائز نہیں ہے، مفتی سید باقر ارشد قاسمی کا خیال ہے کہ ثبوت کی فراہمی تک ملزم کو تفتیش خانہ میں رکھا جاسکتا ہے، انہوں نے جبر و تشدد سے پاک تفتیش خانے بنوانے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

ان حضرات کا استدلال یہ ہے کہ بغیر ثبوت کے قید کرنا ظلم ہے، اور ظلم کی حرمت کے بارے میں حدیث قدسی ہے:

''یا عبادی! إنی حرمت الظلم علی نفسی، وجعلته بینکم محرما فلا تظالموا'' (مسلم)

اور مشہور حدیث ہے: ''لو رجمت أحدا بغیر بینة لرجمت هذه'' (بخاری)، اس سلسلہ میں انہوں نے فقہاء کی یہ عبارتیں بھی پیش کی ہیں:

۱-''ولهذا لم یشرع فی التعزیر بالتهمة قبل ثبوته کما شرع فی الحد، لأنه من التعزیر'' (ہدایہ ۲/۵۱۶)۔

۲-''والشرع لایرخص فی معاقبة أصحاب التهم قبل إلمامهم بالسیئات'' (غیاث الأمم: ۲۲۹)۔

جن حضرات نے مطلق قید کرنے کو درست قرار دیا ہے، ان کا استدلال ترمذی اور ابوداؤد کی حدیث سے ہے:

''عن بهز بن حکیم عن أبیه عن جده أن النبی ﷺ حبس رجلا فی تهمة ثم خلی عنه'' (ترمذی ۱/۲۶۱، ابوداؤد ۲/۵۱۱)۔

---

[۱] لکچرار جونیئر گورنمنٹ کالج میدک اے پی۔

اور سیدنا علیؓ کا عمل ہے: ''وعن علی أنه حبس متهمين حتى أقروا'' (ابوداؤد ۲/۲۲۱)۔

ان کے علاوہ ان حضرات کا استدلال فقہاء کی ان عبارتوں سے بھی ہے:

۱-''فإذا لم يوجد الخصومة لم تقبل شهدتهم، ولكن يحبس السارق، لأن إخبارهم أورث تهمة، ويجوز الحبس بالتهمة'' (بدائع الصنائع ۶/۳۱)۔

۲-''وأما أن يكون مجهول الحال فيحبس حتى يكشف أمره'' (ردالمحتار ۳/۲۱۴)۔

۳-''من يتهم بالقتل والسرقة وضرب الناس يحبس ويخلد فى السجن إلى أن تظهر التوبة'' (فتاوى قاضى خان على الهنديه ۳/۴۸۰)۔

۴-اور حافظ ابن قیم کا بیان ہے: ''ولو حلفنا كل واحد منهم وأطلقناه مع العلم باشتهاره بالفساد فى الأرض وكثرة سرقاته، وقلنا: لا ناخذ إلا بشاهدى عدل كان مخالفا للسياسة الشرعية'' (ردالمحتار ۳/۱۸۸)۔

جن حضرات نے حدود وقصاص کے علاوہ تعزیری معاملات میں قید کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے، ان کا استدلال فقہاء کی ان عبارتوں سے ہے:

۱-''لم يشرع الحبس بتهمة ما يوجب التعزير، حتى لوادعى رجل على آخر شتيمة فاحشة أو أنه ضربه وأقام شهود إلا يحبس قبل أن يسأل عن الشهود و يحبس فى الحدود'' (فتح القدير ۵/۱۱۷)۔

۲-''بخلاف الديون حيث لا يحبس فيها قبل ظهور العدالة'' (هدايه ۵/۸)۔

۳-''بخلاف ما إذا شهدوا بالدين لا يحبس المشهود عليه به قبل ظهور عدالة الشهود، لأن أقصى العقوبات بعد ثبوت العدالة والقضاء بموجب الشهدة الحبس فلا يجوز أن يفعله قبل ثبوت الحق، بخلاف ماهنا، فإن بعد الثبوت عقوبته أغلظ'' (فتح القدير ۵/۸)۔

اس طرح یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ملزم کا جرم ثابت ہونے سے پہلے تہمت یا شک کی بنیاد پر قید کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے، اور یہی مصلحت کا تقاضہ ہے، لیکن صرف حدود وقصاص کے مقدمہ میں قید کرنے کی گنجائش ہوگی، تعزیری اور دیوانی مقدمات میں قید کرنے کی گنجائش نہیں ہوگی، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ غفار کے ایک شخص کو دو اونٹوں کی چوری کی تہمت میں قید کیا تھا، (جیسا کہ مولانا محمد مغفور باندوی نے اپنے مقالہ میں صراحت کی ہے) نیز تعزیری اور دیوانی مقدمات میں عموماً قید کی سزا دی جاتی ہے، لہذا جرم ثابت ہونے سے پہلے سزا دینا عدالت کے اصول کے خلاف ہے۔

اس سوال کا دوسرا جزء یہ ہے کہ ''اگر بطور احتیاط کے قید کیا جائے تو کیا اس کے لئے مدت مقرر کی جاسکتی ہے؟''۔

اس کے جواب میں اکثر مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ قید کی کوئی مدت مقرر نہیں ہے، جرم کی تحقیق ہونے تک قید کیا جاسکتا ہے، اور یہ قاضی اور حاکم کی صوابدید پر موقوف ہے، البتہ مفتی انور علی اعظمی، مولانا عبدالرشید قاسمی اور مفتی اقبال احمد قاسمی نے قید کی مدت ایک ماہ بیان کی ہے، جیسا کہ علامہ شامی نے کتاب السرقہ میں لکھا ہے: ''فيحبس حتى يكشف أمره وقيل شهرا'' (ردالمحتار ۶/۱۴۷)۔

اور علامہ ماوردی نے ''الاحکام السلطانیہ'' میں بیان کیا ہے: ''واختلف فى مدة حبسه بذلك، فذكر عبد الله الزبيرى من أصحاب الشافعى أن حبسه للأسراء والكشف مقدر بشهر واحد لا يتجاوزه، فقال غيره: بل ليس مقدر وهو موقوف على رأى الإمام واجتهاده، وهذا أشبه'' (الأحكام السلطانيه/۲۲۰)۔

مولانا اقبال (دارالعلوم ماٹلی والا) نے لکھا ہے کہ ابن فرحون نے تبصرہ میں صراحت کی ہے کہ ایک سال سے کم حبس قصیر ہے، اور ایک سال سے زیادہ مدت حبس طویل ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ قید کی مدت زیادہ لمبی نہیں ہونی چاہئے، قید کی مدت ایک یا چند ماہ مقرر کی جاسکتی ہے، تفتیش کے نام پر سالوں قید میں رکھنا اصول

انصاف کے خلاف ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے: ''درج ذیل امور سے متعلق قیدیوں کو کیا حقوق حاصل ہیں؟

الف- مذہبی امور (عبادت کرنا، مذہبی کتابوں کا مطالعہ، دوسرے قیدیوں کے درمیان دعوت دین، اس کی مذہبی تعلیمات کے مطابق اس کے لئے غذا فراہم کرنا، وہ جس مذہب پر عقیدہ رکھتا ہے اس مذہب کی مقدس شخصیتوں اور کتابوں وغیرہ کی بے احترامی سے گریز)۔

اس بارے میں تمام مقالہ نگاروں کی متفقہ رائے ہے کہ قیدیوں کو مذکورہ حقوق حاصل ہوں گے، اس بارے میں انہوں نے مندرجہ ذیل نصوص سے استدلال کیا ہے:

مفتی سید باقر ارشد قاسمی نے مذہبی آزادی پر آیت شریفہ: ''لا إکراہ فی الدین'' (سورۂ بقرہ) سے استدلال کیا ہے، دوسرے قیدیوں کے درمیان دعوت دین پیش کرنے کے سلسلہ میں مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا اقبال، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی اور مفتی محمد جعفر ملی رحمانی نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے جیل خانہ میں دعوت دین پیش کرنے کے قرآنی واقعہ سے استدلال کیا ہے:

"یاصاحبی السجن ء أرباب متفرقون خیر أم اللہ الواحد القھار" (سورۂ یوسف: ۳۹-۴۰)۔

اسی طرح مذہب کی مقدس شخصیتوں اور کتابوں کی بے احترامی سے گریز کے سلسلہ میں مولانا راشد حسین ندوی، مولانا ابرار حسن ایوبی ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی اور مولانا خورشید انور اعظمی نے قرآنی آیت: "ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم" (الانعام) پیش کی ہے۔

مولانا ابرار حسن ندوی اور مولانا اقبال نے قیدیوں کی مذہبی آزادی کے بارے میں سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کا گورنروں کے نام ایک خط سے استدلال کیا ہے:

''لا تدعن فی سجونکم أحدا من المسلمین فی وثاق لا یستطیع أن یصلی قائما ولا أحدا فی قید، إلا رجلا مطلوبا بدم وأجروا علیھم من الصدقة مایصلحھم فی طعامھم وأدمھم'' (موسوعة الفقه الاسلامی المعاصر للشیخ عبد الحلیم عویس ۲/۲۴۰)۔

مولانا اقبال نے اس بارے میں شامی کی یہ عبارت پیش کی ہے:

''ویجب تمکین السجین من الماء للوضوء ونحوہ، ویحرم منعه من ذلك'' (ردالمحتار ۵/۳۷۸)

نیز انہوں نے مذہبی کتابوں کے مطالعہ کے بارے میں یہ عبارت پیش کی ہے:

''کان یسمح للسجناء فی السجون الإسلامیة بإدخال الکتب والأقلام والأوراق للقراءة والکتابة کما فعل ھارون مع أبی العتاھیة'' (احکام السجن: ۳۸۳ بحوالہ البدایہ لابن کثیر ۱۴/۱۴۰)۔

حصہ ب کا سوال ہے: ''جسمانی ضروریات (مناسب غذا، صاف پانی، علاج، حفظان صحت کے لئے ورزش وتفریح، بیوی سے تعلق، ایسی تنگ جگہ میں قیدیوں کو رکھنے کا مسئلہ جہاں کھڑا ہونا یا پاؤں پھیلا کر لیٹنا، یا دیوار کے باہر کسی چیز کا دیکھنا ممکن نہیں)''۔

قیدیوں کے لئے مناسب غذا کی فراہمی کے سلسلہ میں مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا راشد حسین ندوی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی اور مولانا اقبال نے آیت: "ویطعمون الطعام علی حبه مسکینا ویتیما وأسیرا" (الدھر) پیش کی ہے، جبکہ مولانا ابرار حسن ایوبی ندوی نے سورۂ یوسف کی آیت: "لا یاتیکما طعام ترزقانه" سے بھی استدلال کیا ہے، مولانا عبدالرشید قاسمی نے بخاری کی مشہور حدیث پیش کی ہے:

''عذبت امرأة فی ھرة حبستھا حتی ماتت جوعا فدخلت منھا النار'' (بخاری)۔

اسی طرح مفتی سید باقر ارشد قاسمی اور مفتی جعفر ملی رحمانی نے معجم کبیر کی روایت پیش کی ہے:

''عن أبی عزیز بن عمیر أخ مصعب بن عمیر قال: کنت فی الأساری یوم بدر فقال رسول اللہ ﷺ: ''استوصوا بالأساری خیرا'' وکنت فی نفر من الأنصار، وکانوا إذا قدموا غداءھم وعشاءھم أکلوا التمر وأطعمونی الخبز بوصیة رسول اللہ ﷺ إیاھم''۔

مولانا خورشید انور اعظمی نے اس بارے میں سیدنا علیؓ کا فرمان پیش کیا ہے جو انہوں نے اپنے قاتل ابن ملجم کے بارے میں فرمایا تھا:

''أطعموه وأسقوه وأحسنوا أساره'' (کنز العمال ۱۹۷/ ۱۳)۔

علاج کے بارے میں مولانا اقبال نے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا فرمان ذکر کیا ہے:

''انظروا من فی السجون وتعهدوا المرضی'' (ابن سعد ۵/۳۵۶)

اور فتح القدیر کی یہ عبارتیں بھی پیش کی ہیں: ''ولا یمنع الطبیب والخادم من الدخول علیه لمعالجته وخدمته... وأنه یخرج من سجنه للعلاج والمداواة لصیانته'' (فتح القدیر ۵/۴۷۱)۔

حفظان صحت اور ورزش وتفریح کے سلسلہ میں مفتی محمد جعفر ملی رحمانی نے سنن کبری اور مسلم کی احادیث پیش کی ہیں:

''وکل شئ یلهو به الرجل باطل إلا رمی الرجل بقوسه وتادیبه فرسه وملاعبته امراته، فإنهن من الحق، ومن ترك الرمی بعد ما علمه فقد کفر الذی علمه'' (السنن الکبری للبیهقی ۱۰/۳۶۹)۔

''المؤمن القوی خیر وأحب إلی الله من المومن الضعیف'' (مسلم ۸/۲۶۰)۔

بیوی سے تعلق کے بارے میں مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا ابرار حسن ایوبی ندوی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا شاہجہاں ندوی اور مولانا محمد مغفور باندوی نے بحر، مجمع الانہر، ہندیہ، شامی، فتح القدیر اور موسوعہ کی فقہی عبارتیں پیش کی ہیں:

''ولا یمنع من الجماع إن احتاج إلیه فتدخل امراته أو جاریته علیه إن کان فیه موضع سترة'' (البحر الرائق ۶/۴۷۶)، جبکہ مولانا لطیف الرحمن فلاحی نے ورزش، تفریح اور بیوی سے تعلق کی اجازت نہیں دی ہے۔

تمام مقالہ نگاروں کا اتفاق ہے کہ قیدی کو ایسی تنگ جگہ میں رکھنا جائز نہیں ہے جہاں کھڑا ہونا یا پاؤں پھیلا کر لیٹنا یا دیوار کے باہر کسی چیز کا دیکھنا ممکن نہ ہو، اس سلسلہ میں مولانا اقبال نے ''احکام السجن'' سے بحوالہ ابن حبیرہ الوزیر نقل کیا ہے: ''لا أعرف أنه یجوز أحد من المسلمین جمع الکثیر فی حبس یضیق عنهم غیر متمکنین من الوضوء والصلاة'' (الافصاح ۱/۳۹۲)۔

اور مولانا خورشید احمد اعظمی نے عالمگیری کی یہ عبارت پیش کی ہے:

''ولا یجوز الحبس فی مکان یمنع فیه المحبوس الطعام والشراب أو فی مکان حار أو تحت الشمس. أو فی مکان بارد، أوفی بیت تسد نوافذه وفیه دخان'' (فتاوی عالمگیری ۳/۴۱۴)۔

اس سلسلہ میں مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی اور مولانا مغفور باندوی نے وضاحت کی ہے کہ حبس شرعی تنگ جگہ میں قید کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ شخصی تصرف سے روکنے کا نام ہے۔

''الحبس الشرعی لیس هو السجن فی مکان ضیق، وإنما هو تعویق الشئ ومنعه من التصرف بنفسه'' (فتاوی ابن تیمیه ۳۵/۳۹۸)۔

البتہ مولانا خورشید انور اعظمی اور مولانا خورشید احمد اعظمی کا خیال ہے کہ سرکش قیدی کو بطور تعزیر تنگ وتاریک جگہ میں رکھنے کی اتنی دیر گنجائش ہوگی کہ اس کے جسم میں کوئی نقص پیدا نہ ہو، اس بارے میں انہوں نے بحر کی یہ عبارت پیش کی ہے:

''وإذا جلس المحبوس فی السجن متعنتا لایوفی المال قال الأرسانیدی یطین الباب ویترك له ثقبة یلقی منها الماء والخبز'' (البحر الرائق ۶/۲۸۳)۔

سوال ج-''عام سماجی حقوق (اخبارات پڑھنے، ریڈیو سننے، فون پر احباب واقارب سے گفتگو کرنے، دوسرے قیدیوں سے ملاقات، تعلیم اور ہنر وغیرہ سیکھنا)''۔

بیشتر مقالہ نگاروں کا خیال ہے کہ قیدیوں کو مذکورہ حقوق حاصل ہوں گے، مفتی اقبال احمد قاسمی نے سورۂ یوسف کی آیت: یوسف أیها الصدیق أفتنافی

سبع بقرات..." پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن کے بیان کردہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے قید کے واقعہ سے کافی حد تک قیدیوں کے حقوق کا خلاصہ واضح ہوجاتا ہے، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی نے اس بارے میں معجم کبیر کی روایت "استوصوا بالأساری خیرا" پیش کی ہے، ان کے علاوہ مولانا اقبال، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا افتخار احمد مفتاحی اور مفتی محمد جعفر ملی رحمانی نے فقہاء کی یہ عبارتیں پیش کی ہیں:

۱- "ولا یمنع المسجون من دخول أهله وجیرانه" (هندیه ۲/۴۱۸، بدائع ۱۸۱/۶)۔

۲- "لا یمنع المحبوس من السلام علی أصدقاءه والحدیث معهم إلا من یخشی أن یعلمه الحیلة فیمنع" (المبسوط للسرخسی ۲۰/۹۰)

۳- "وإن رأی الحاکم مصلحة فی اطلاع المحبوس علی أنواع الکتب والصحف الهادفة بالأنباء المهمة والأخبار المفیدة وتزویده بالثقافة، فله أن یفعل ذلك، ومثل هذا تمکینه من الإستماع إلی مذباع" (احکام السجن: ۴۹۷)۔

اس کے برخلاف مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا لطیف الرحمن فلاحی، مولانا ابوسفیان مفتاحی اور مولانا محمد مغفور باندوی کے نزدیک قیدیوں کو مذکورہ حقوق حاصل نہیں ہوں گے، ان حضرات کا خیال ہے کہ قید کا مقصد یہ ہے کہ قیدی کے دل میں بے چینی اور گھٹن محسوس ہو اور ہر لمحہ اسے قید ہونے کا احساس ستائے، اخبار، ریڈیو اور ٹیلی فون جیسی تفریحی چیزوں سے قید کا مقصد فوت ہوجائے گا، چنانچہ انہوں نے بحر، ہندیہ، درمختار اور معین الحکام وغیرہ کی عبارتیں پیش کی ہیں:

"صفة الحبس أن یکون فی موضع لیس فیه فراش ولا وطأ ولا یمکن أحد یدخل علیه للاستیناس إلا أقاربه وجیرانه ولا یمکثون" (البحر الرائق ۶/۲۸۳)۔

یہی رائے مولانا راشد حسین ندوی کی ہے، مگر انہوں نے ہنر اور تعلیم کی اجازت دی ہے، جبکہ مولانا خورشید احمد اعظمی کی رائے ہے کہ اگر جرم ہلکا ہو اور مجرم اشراف میں سے ہو تو مذکورہ چیزوں کے استعمال کی اجازت ہوگی، اور اگر مجرم فاسق وفاجر ہو اور جرم کا عادی ہو تو ان چیزوں کے استعمال کی اجازت نہیں ہوگی، مولانا شاہجہاں ندوی کا خیال ہے کہ مخصوص حالات میں عام سماجی حقوق سے محروم کیا جاسکتا ہے۔

اس کے بارے میں عرض ہے کہ قید کا اصل مقصد انسان کی آزادی کو ختم کرنا ہے، قید میں ساری سہولیات مہیا کرنے کے باوجود قید خانہ سے باہر آزادی کی زندگی کا مزہ حاصل نہیں ہوسکتا، اور قید ہونے کی اذیت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے، اس لئے ریڈیو، اخبارات اور ٹیلی فون کے استعمال سے قید کا مقصد فوت نہیں ہوتا، جس طرح علم اور ہنر سے روکنا مناسب نہیں، اسی طرح ریڈیو اور اخبارات علم کے حصول کا ذریعہ ہیں۔

سوال: د- "اخلاقی امور (مردوں اور عورتوں کے الگ قید خانے، بالغوں اور نابالغوں کے لئے الگ قید خانے وغیرہ کے مسائل)"۔

اس سوال کے جواب میں تمام مقالہ نگاروں کی رائے متفق ہے کہ مردوں، عورتوں اور نابالغ بچوں کو علاحدہ علاحدہ قید خانوں میں رکھنا ضروری ہے، کیونکہ سب کو مخلوط طور پر رکھنا شرعی واخلاقی اعتبار سے بہت نقصان دہ ہے اور بہت سے فتنے پھیلنے کا باعث ہے۔

اس بارے میں مولانا اقبال (دار العلوم ماٹلی والا) نے زرقانی کے حوالہ سے آپ ﷺ کا عمل بیان کیا ہے:

"أنه حبس رجال بنی قریظة فی ناحیة وجعل نساء هم وذریتهم فی ناحیة أخری"۔

مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا محمد مغفور باندوی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا اقبال، مولانا عبد الرشید قاسمی اور ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی نے اس بارے میں درمختار، بحر، ہندیہ اور مبسوط وغیرہ سے یہ عبارت پیش کی ہے:

"ویجعل للنساء سجن علیحدة نفیا للفتنة" (الدر المختار ۸/۵۸)۔

جب کہ مولانا محمد شاہجہاں ندوی نے نابالغ اور بالغ اور مخنث کے لئے علاحدہ قید خانہ کی بابت بغیر متن کے حاشیة الدسوقی (۳/۲۸۰) اور حاشیة الصغیر علی کفایت الطالب کا صرف حوالہ نقل کیا ہے۔

عرض مسئلہ

قیدیوں کے حقوق

(سوال نمبر ۳ تا ۱۱)

ڈاکٹر مفتی محمد فہیم اختر ندوی[1]

محترم شرکائے سیمینار!

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے اٹھارہویں سیمینار منعقدہ مدورائی مؤرخہ ۲۸ فروری تا ۲ مارچ ۲۰۰۹ء میں غور وخوض کے لئے دیگر موضوعات کے ساتھ ایک موضوع قیدیوں کے حقوق بھی مقرر کیا گیا۔ اس موضوع پر اکیڈمی کا سوالنامہ کل گیارہ سوالات پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ابتدائی دو سوالات کو چھوڑ کر سوال نمبر ۳ تا سوال نمبر ۱۱ جملہ نو سوالات سے متعلق عرض مسئلہ تیار کرنے کی ذمہ داری راقم سطور کے سپرد کی گئی۔ سطور ذیل میں عرض مسئلہ پیش خدمت ہے۔

قیدیوں کے حقوق کے موضوع پر اکیڈمی کی جانب سے بھیجے گئے علمائے کرام کے مقالات کی کل تعداد ۲۱ ہے۔ ان میں سے بیشتر مقالات قدرے تفصیلی ہیں، جبکہ بعض حضرات نے اختصار کے ساتھ متعلقہ سوالات کے جوابات سپرد قلم فرمائے ہیں۔ ذیل کی سطور میں ہر سوال سے متعلق مقالہ نگار علمائے کرام کی آراء اور ان کے استدلال کی تفصیل پیش کی جارہی ہے۔ جہاں ضرورت محسوس ہوئی وہاں ترجیحی پہلو پر بھی روشنی ڈالی گئی۔

سوال نمبر ۳:...... ''قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے کس حد تک دھمکانے کی اجازت ہے؟ کیا اس مقصد کے لئے درج ذیل سزائیں دی جاسکتی ہیں؟

الف۔ قیدیوں کو بے لباس کر دینا۔ ب۔ قیدیوں کو مار پیٹ کرنا۔ ج۔ انہیں الکٹرک شاک لگانا۔

د۔ قیدیوں پر کتے چھوڑنا۔ ھ۔ قیدیوں کو سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈال دینا۔

و۔ انہیں مسلسل جگے رہنے پر مجبور کرنا اور اس کے لئے اس کی جائے رہائش میں تیز روشنی یا تیز آواز کا انتظام رکھنا۔

اس سوال کے (الف تا واؤ) چھ شق ہیں۔ بیشتر مقالہ نگاروں نے تمام شقوں کے جوابات ایک ساتھ دئے ہیں۔ جب کہ بعض اصحاب نے ہر ہر شق پر علاحدہ علاحدہ گفتگو کی ہے۔ راقم مناسب محسوس کرتا ہے کہ ہر شق کے تعلق سے مقالہ نگاروں کی آراء اور ان کے دلائل علاحدہ علاحدہ ذکر کئے جائیں۔

الف۔ قیدیوں کو بے لباس کرنا

شق الف میں دریافت کیا گیا ہے کہ کیا قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے انھیں بے لباس کردینے کی اجازت ہے؟

سوال کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ ابھی قیدی کے اوپر کسی جرم کا ثبوت نہیں ہوا ہے۔ گویا زیر بحث مسئلہ میں قیدی ابھی صرف کسی شک یا الزام کے تحت زیر حراست ہے۔ اور اثبات جرم کے مقصد سے اس سے تفتیش کی جارہی ہے۔ اور تفتیش کے دوران اس پر دباؤ بنانے کے لئے اس کو بے لباس کیا جارہا ہے۔

اس جزئیہ کے جواب میں تمام مقالہ نگاروں کا متفقہ جواب ہے کہ بے لباس کرنے کا عمل نہ صرف غیر شرعی اور ناجائز وحرام ہے، بلکہ یہ انتہائی درجہ

---

[1] شعبہ اسلامیات، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔

حیاء سوز، غیر اخلاقی اور غیر انسانی عمل ہے۔ یہ انسان کی تذلیل اور توہین ہے۔ اور قیدی انسان بھی کرامت انسانی کا اسی طرح حقدار ہے جس طرح کوئی دوسرا عام انسان۔ اور یہ قیدی یہاں تو مجرم بھی نہیں صرف کسی شک کے تحت زیر حراست ہے۔ لہذا شریعت اسلامیہ ایسے غیر انسانی عمل کی قطعاً اجازت نہیں دے سکتی ہے۔ کسی کو بے لباس کرنا اس کے ستر کے حصوں کو کھولنا ہے۔ اور اسلام میں ستر کے حصوں کو نہ تو کھولنا جائز ہے اور نہ ان کی طرف دیکھنے کی اجازت ہے۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی نے اپنے مقالہ میں لکھا ہے کہ شریعت اسلامیہ تو ان لوگوں کو بھی بے لباس کرنے کی اجازت نہیں دیتی جن پر حدود اور قصاص نافذ کئے جا رہے ہوں، تو صرف تفتیش کی خاطر اس عمل کی کیسے گنجائش ہو سکتی ہے۔ انھوں نے علامہ ماوردی کا اقتباس نقل کیا ہے:

تحرم المعاقبة بالتجريد من الثياب لما في ذلك من كشف العورة (الاحكام السلطانية ۲۳۹)۔

مفتی انور علی اعظمی نے جنگ جمل کے موقع پر حضرت علیؓ کا فرمایا ہوا قول نقل کیا ہے:

''لا يقتل أسير ولا يكشف ستر ولا يؤخذ مال، وهو القدوة في هذا الباب'' (ہدایہ ۲/۵۸۹)۔

مفتی باقر ارشد قاسمی نے صحیح بخاری کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ بدر کے قیدیوں میں سے حضرت عباس کو کپڑے کی ضرورت تھی تو انھیں قمیص فراہم کی گئی۔

اس رائے سے عمومی حالت میں اتفاق کرتے ہوئے تین مقالہ نگار مولانا ابرار حسن ایوبی ندوی، مولانا نعیم اختر قاسمی اور مولانا راشد حسین ندوی نے رائے دی ہے کہ قیدیوں سے راز اگلوانے کے مقصد کی خاطر البتہ ان کو بے لباس کرنے کی دھمکی دی جا سکتی ہے۔ مولانا راشد حسین نے یہ اضافہ کیا ہے کہ اگر خطرناک مجرم سے برہنگی کے بغیر راز سے پردہ اٹھانا ممکن نہ ہو تو بدرجہ مجبوری اور بقدر ضرورت اس کی اجازت ہوگی۔ ان حضرات نے اس پر استدلال حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کے واقعہ سے کیا ہے کہ انھوں نے فتح مکہ کی مہم کا راز ایک عورت کے ذریعہ مکہ بھیجنا چاہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی ہدایت پر حضرات علی، مقداد بن اسود اور زبیر بن العوام اسکے تعاقب میں گئے اور خط طلب کرتے ہوئے دھمکی دی کہ: ''لتخرجن الكتاب أو لنلقين الثياب (بخاری کتاب المغازی)۔ اس عورت کو جب احساس ہوگیا کہ بصورت دیگر وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا کر ہی دم لیں گے، ''فلما رأت الجد منه'' (سیرت ابن ھشام) تو اس نے اپنے بالوں کی چوٹی سے خط نکال کر دے دیا۔

لیکن راقم سطور کے نزدیک ان تینوں حضرات کا یہ استدلال زیر بحث مسئلہ میں مفید مطلب نہیں ہے۔ اور اس واقعہ سے تفتیش کے دوران ملزم کو بے لباس کرنے کی اجازت ثابت نہیں ہوتی ہے۔ کیونکہ اس واقعہ میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو اس بات کی اطلاع دی تھی کہ وہ عورت اپنے ساتھ خط لے جا رہی ہے۔ عورت کے پاس خط کی موجودگی یقینی تھی، اور وہ خط کا انکار کر رہی تھی، تو اس کے پاس سے خط نکالنے کی ایک ہی صورت تھی کہ اس کی جسمانی تلاشی لے کر خط برآمد کیا جائے۔ لہذا صحابہ کرام نے اسے جسمانی تلاشی کی دھمکی دی۔ اور اگر وہ پھر بھی انکار کرتی رہتی تو یقیناً دھمکی پر عمل کرتے ہوئے خط برآمد کیا جاتا۔ زیر بحث مسئلہ میں زیر حراست قیدی کی تلاشی یا اس کے جسم سے کسی چیز کی برآمدگی مطلوب نہیں ہوتی ہے۔ اگر ایسا کوئی موقع ہوتا تو ممکن ہے بے لباسی کی گنجائش بدرجہ مجبوری نکل آتی۔ یہاں تو ایک بے گناہ شخص کو بے لباس کرنے کے پیچھے مقصد یہ ہے کہ اس کو ذہنی اور نفسیاتی طور پر اس طرح توڑ دیا جائے اور اس کی ایسی تذلیل کی جائے کہ وہ جرم کا اقرار کر لے، یا زیادہ صحیح لفظوں میں تفتیش کار کی ہر بات تسلیم کر لے۔ اسلام ایسی تذلیل اور بے گناہ پر ایسی زیادتی کی اجازت نہیں دیتا۔

ب- قیدیوں کو مار پیٹ کرنا

سوال کے شق (ب) میں پوچھا گیا ہے کہ کیا اس غرض کے لئے قیدیوں کی مار پیٹ کی جا سکتی ہے؟

اس سوال کے جواب میں اکثر مقالہ نگاروں کی رائے ہے کہ حدود شرع میں رہتے ہوئے معمولی مار پیٹ کی جا سکتی ہے۔ یعنی مار پیٹ ایسی نہ ہو جس کا اثر جسم کے اندر تک پہنچ جائے یا جس سے کوئی عضو تلف ہو جائے۔ مفتی انور علی نے قید لگائی ہے کہ یہ مار پیٹ حد شرعی کے درجہ سے کم یعنی ۳۹ کوڑے تک ہو۔ قاضی ہارون مینگل نے کہا ہے کہ یضرب بالسوط مجردا۔ مولانا لطیف الدین فلاحی نے یہ لکھا ہے کہ قیدی اگر عورت ہے اور وہ حاملہ یا نفاس کی حالت میں ہے تو اس حالت میں اس کے ساتھ مار پیٹ نہیں کی جائیگی، بلکہ اس کے وضع حمل اور نفاس سے پاکی کا انتظار کیا جائے گا۔

مار پیٹ کے جواز پر استدلال متعدد حضرات نے غزوہ بدر کے اس واقعہ سے کیا ہے کہ قریش کے دو آدمی بعض صحابہ کے ہاتھ لگے۔ انھوں نے ان دونوں کو پکڑ کر ابوسفیان کے بارے میں پوچھا۔ جب ان دونوں نے لاعلمی دکھائی تو صحابہ نے ان کی پٹائی کی تو وہ کہنے لگے، ہاں ہم جانتے ہیں۔ جب پٹائی بند ہوئی تو پھر لاعلمی ظاہر کرنے لگے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے، فارغ ہو کر آپ نے فرمایا:

''إذا صدقاکم ضربتموهما وإذا کذباکم ترکتموهما والله إنهما لقریش'' (مسلم ۲/۱۰۲، سیرت ابن ہشام ۱/۶۱۶)۔

مولانا ابرار حسن ایوبی نے لکھا ہے کہ امام ابوداؤد نے اس واقعہ پر ترجمۃ الباب قائم کیا ہے ''باب الأسیر ینال منه ویضرب''، اس سے بھی اس کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ مولانا شاہ جہاں ندوی اور مولانا عبدالرشید قاسمی نے مار پیٹ کے جواز میں غزوہ خیبر کے اس واقعہ سے استدلال کیا ہے کہ جب حیی بن اخطب کے سونے اور زیورات کے ذخیرہ کو اس کے چچا نے چھپالیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دریافت کرنے پر جواب دیا کہ ''أذهبته النفقات والحروب'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حضرت زبیر بن عوام کے حوالہ کیا اور فرمایا: ''دونك هذا فمسه الزبیر بشيء من العذاب فدلهم علی المال'' (شامی ۶/۱۴۷)۔

ج-قیدیوں کو الکٹرک شاک لگانا

سوال کے اس شق کے جواب میں تمام مقالہ نگاران متفق ہیں کہ زیر حراست قیدیوں کو تفتیش کی غرض سے الکٹرک شاک لگانا جائز نہیں ہے۔ البتہ صرف دو مقالہ نگاروں نے یہ فرض کرتے ہوئے الکٹرک شاک کی اجازت دی ہے کہ اس کی تکلیف 'ضرب شوط' (کوڑے مارنے) سے کم ہے، یا یہ کہ الکٹرک شاک جسم کی مشنریوں پر اثر نہیں کرتا۔ چنانچہ قاضی ہارون مینگل نے لکھا ہے کہ شاک کی تکلیف ضرب سوط سے کم ہو تو گنجائش ہے، ورنہ اس کی شرعا اجازت نہیں ہے۔ اور مولانا افتخار احمد نے لکھا ہے کہ معمولی الکٹرک شاک لگائی جاسکتی ہے کیونکہ اس سے غالبا جسم کی مشنریوں پر اثر نہیں پڑتا۔

راقم سطور عرض کرتا ہے کہ یہاں ان دونوں حضرات کی اجازت نہ صرف مشروط ہے بلکہ اس تصور پر مبنی ہے کہ الکٹرک شاک کی تکلیف معمولی اور کوڑے کی تکلیف سے بھی کم ہے۔ لیکن حقیقت حال اس تصور کا ساتھ نہیں دیتی۔ واقعہ یہ ہے کہ الکٹرک شاک جو ٹارچر کا ایک مروجہ اور بھیانک طریقہ ہے، نہ صرف شدید اذیت ناک ہے، بلکہ بعض حالات میں جسم کے اعضائے رئیسہ اور اعصابی نظام کے لئے شدید خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں جسم کے خلیات متاثر ہوتے ہیں اور سر و چہرہ پر شاک لگانے سے دماغی خلیات کو نقصان پہنچتا ہے۔ دراصل الکٹرک شاک سے پہنچنے والے نقصان میں قیدی کی جسمانی صحت کے ساتھ الکٹرک شاک کے وولٹیج اور اس کے دورانیے کا دخل ہوتا ہے۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ بھی ہے کہ جہاں قیدیوں کے ساتھ ناقابل تصور حد تک انسانیت سوز ظلم روا رکھا جاتا ہو، وہاں یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ الکٹرک شاک لگانے والا اس کو معمولی کوڑے سے بھی کم تکلیف پہنچانا چاہتا ہے۔

مولانا راشد حسین ندوی نے لکھا ہے کہ آگ سے صرف جلن ہوتی ہے، نیز آگ سے صرف وہی حصہ متاثر ہوتا ہے جسے جلایا جائے، لیکن بجلی سے جلن کے ساتھ جسم کو جھٹکا بھی لگتا ہے، اس سے پورا جسم متاثر ہوتا ہے اور موت تک کا خطرہ رہتا ہے۔

الکٹرک شاک کے عدم جواز پر مقالہ نگاروں نے تعذیب بالنار کی ممانعت والی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ چنانچہ مولانا باقر ارشد قاسمی نے لکھا ہے کہ الکٹرک شاک بھی جلانے کے زمرے میں آتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ کسی کو جلا کر مارا جائے۔ مولانا شاہ جہاں ندوی اور مولانا ابرار ایوبی ندوی نے ہندیہ کی عبارت: ولا ینبغي للقاضي أن یضرب محبوسا.... ولا یقیمه في الشمس (۳/۴۱۴) نقل کر کے لکھا ہے کہ جب دھوپ میں رکھنے کی اجازت نہیں ہے تو الکٹرک شاک لگانا تو اس سے بڑھ کر اذیت ناک ہے۔

د-قیدیوں پر کتے چھوڑنا

تفتیش کی غرض سے قیدیوں پر کتے چھوڑنا تمام مقالہ نگاروں کی متفقہ رائے میں وحشیانہ اور غیر انسانی حرکت ہے، اور اس کی وجہ سے قیدی کو شدید ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچ سکتی ہے۔ لہذا اس کی قطعا اجازت نہیں ہوسکتی ہے۔ مولانا شاہ جہاں ندوی نے لکھا ہے کہ امام مالک سے پوچھا گیا کہ قیدی کو تیل اور گبریلے (بھونرے کی مانند پردار کالا کیڑا جو گوبر میں ہوتا ہے) کے ذریعہ سزا دی جاسکتی ہے؟ تو آپ نے جواب دیا: حلال نہیں، سزا یا تو کوڑا ہے

یا قید ہے (اسنی المطالب ۹/۴)۔ مولانا راشد حسین ندوی اس کے عدم جواز پر استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کتے چھوڑنے سے قیدی کو زخم آسکتے ہیں نیز اس عمل سے مثلہ ہوجانے کا قوی امکان ہے اور قیدی کو ایسی ضرب کی جس سے ہڈی ظاہر ہوجائے اور مثلہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

ھ-سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈال دینا

اس شق کی حرمت پر بھی سارے مقالہ نگار متفق ہیں، کیونکہ یہ عمل بھی غیر انسانی اور سخت اذیت ناک ہے۔ مولانا لطیف الدین فلاحی نے اس ضمن میں بدائع کی یہ عبارت نقل کی ہے:

''إن لا يكون في إقامة الجلدات خوف الهلاك، لأن هذا الحد شرع زجرا لا مهلكا، فلا يجوز الإقامة في الحر الشديد والبرد الشديد لما في الإقامة فيهما خوف الهلاك'' (۹۵/۷)۔

اور مولانا راشد ندوی نے ہندیہ کی عبارت نقل کی ہے:

''ليس للطالب أن يقيم في الشمس أو على الثلج أو في موضع يضر به'' (ہندیہ ۳/۴۱۶)

مولانا باقر ارشد قاسمی نے لکھا ہے کہ یہ جان کی ہلاکت کی کوشش ہے اور بے رحمی کی انتہاء ہے۔

و-مسلسل جگے رہنے پر مجبور کرنا

قیدیوں کو مسلسل جگے رہنے پر مجبور کرنے کے لئے ان کی جائے رہائش میں تیز روشنی یا تیز آواز کا انتظام رکھنا، تین حضرات علماء کرام کے سوا تمام مقالہ نگاروں کے نزدیک غیر انسانی، اذیت ناک اور تباہ کن ہے، اس لئے یہ عمل بھی ناجائز اور حرام ہے۔ صرف قاضی ہارون مینگل، مولانا راشد ندوی اور مولانا ابرار حسن ایوبی ندوی نے اسکی مشروط اجازت دی ہے۔ قاضی مینگل کہتے ہیں کہ اس میں ناقابل برداشت ایذاء کی کوئی شکل بظاہر نہیں نظر آتی، اس لئے اس کی گنجائش ہے، وہ آگے لکھتے ہیں: بشرطیکہ مزید کوئی ناقابل برداشت سزا اس میں شامل نہ ہو۔ مولانا ایوبی کہتے ہیں کہ اسے عارضی اور وقتی سزا کے طور پر استعمال کرسکتے ہیں۔ اور مولانا راشد حسین ندوی کا خیال ہے کہ بظاہر محدود مدت کے لئے اس کی اجازت ہوگی۔ آگے دونوں حضرات لکھتے ہیں کہ اگر اس سزاء سے اعضاء شل ہوجائیں یا نفسیاتی یا جسمانی مرض میں مبتلا ہوجانے کا خطرہ ہو تو اس کا شمار بھی ممنوع طریقوں میں ہوگا۔

مؤخر الذکر دونوں حضرات نے جزوی جواز پر استدلال چند واقعات سے کیا ہے۔ ایک یہ کہ حضرت سودہؓ کی روایت میں ہے کہ ابویزید سہیل بن عمرو کا ہاتھ ان کی گردن میں ملا کر باندھ دیا گیا تھا۔ تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر وہ سونہیں سکے ہوں گے۔ اسی طرح ثمامہ بن اثال کو تین دنوں تک مسجد نبوی کے ستون سے باندھ کر رکھا گیا تھا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح بندھے رہنے پر انھیں آسانی سے نیند نہیں آئی ہوگی۔ نیز غزوہ بدر کے قیدیوں کو جس طرح جکڑا گیا اس سے حضرت عباسؓ کی کراہ کی آواز آتی رہی، تو بظاہر انھیں بھی نیند نہیں آئی ہوگی۔

راقم سطور عرض کرتا ہے کہ یہاں دو باتیں قابل غور ہیں: اول یہ کہ ان تینوں حضرات کی آراء پر غور کرنے واضح ہوتا ہے کہ زیر بحث مسئلہ میں مسلسل جگائے رہنے کے ذریعہ جس نوع کی اذیت کو سوال کے اندر پیش نظر رکھا گیا ہے، اور جس کی حرمت پر بقیہ تمام مقالہ نگار متفق ہیں، اس صورت کے عدم جواز سے ان تینوں حضرات کو بھی اختلاف نہیں ہے۔ اسی لئے ان تینوں حضرات نے نہ صرف جواز کے ساتھ یہ شرط لگائی ہے کہ مزید کوئی ناقابل برداشت سزا اس میں شامل نہ ہو، اور اسے عارضی اور وقتی طور پر استعمال کیا جائے، بلکہ ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی کی ہے کہ اگر اس سے اعضاء کے شل ہونے اور جسمانی یا نفسیاتی مرض میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو تو یہ ممنوع ہوگا۔ دوسرے یہ کہ ان حضرات نے اوپر اپنے استدلال میں جن واقعات کا حوالہ دیا ہے، ان میں سے کسی واقعہ میں قیدی کو سونے سے محروم کرنے اور مسلسل جگائے رکھنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ انھیں عام حالات کے تحت صرف باندھ کر رکھا گیا تھا۔ یہ بات تو قابل فہم ہوسکتی ہے کہ باندھنے کی وجہ سے انھیں آسانی سے نیند نہیں آئی ہو۔ لیکن یہاں زیر بحث مسئلہ میں قیدی کو نیند سے محروم کرنا ہی مقصود ہے۔ اور اس کی ترکیب کے طور پر ایسا طریقہ اپنایا جارہا ہے جو ذہنی ونفسیاتی اور جسمانی طور پر تباہ کردینے والا ہے۔ نیند تو انسان کی ایسی ہی ضرورت اور مجبوری ہے جیسی کھانا پینا اور جیسی رفع حاجت کرنا۔ اگر قیدی کو کھانے پینے اور رفع حاجت سے مسلسل روکے رکھا جائے تو اس کی کیا صورت حال بنے گی؟ مسلسل نیند سے محروم کرنے پر انسان کے اعضاء شل ہوجائیں گے۔ اسی طرح اس کی جائے رہائش میں تیز

روشنی اور تیز آواز کا انتظام اس کی صحت اور قوت سماعت ہی کو متاثر نہیں کرے گا، بلکہ اس کو دماغی طور پر مفلوج بنا کر رکھ دے گا۔

سوال نمبر ۴

کیا قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑا جا سکتا ہے، یا انھیں ہتھکڑی پہنائی جا سکتی ہے، یا انھیں بیڑی ڈالی جا سکتی ہے؟

اس سوال کے جواب میں تمام مقالہ نگار حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ قیدیوں اور مجرمین کے حالات پر منحصر ہے۔ چنانچہ عام حالات میں قیدیوں کو ہتھکڑی اور بیڑی وغیرہ پہنانا درست نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بے ضرورت ظلم وزیادتی ہے۔ ہاں البتہ اگر مجرم خطرناک ہو اور اس سے نقصان پہنچنے کا یا قید خانہ سے اس کے فرار ہونے کا اندیشہ ہو، یا عدالت لیجاتے وقت راستہ سے فرار ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسے مخصوص حالات میں ہتھکڑی لگائی جا سکتی ہے۔ مولانا جعفر ملی نے المبسوط کی عبارت نقل کی ہے: ''ولا يقيد ولا يقام ولا يؤاجر. لأن هذه عقوبات زائدة ما ورد الشرع بها'' (باب الحبس فی الدین)۔

بوقت ضرورت ہتھکڑی لگانے کے جواز پر متعدد حضرات نے استدلال کیا ہے۔ مولانا ظفر الاسلام صدیقی لکھتے ہیں: غزوہ بنی قینقاع میں حضرت منذر بن جذامہ کو تمام قیدیوں کو ہتھکڑی لگانے کا کام سونپا گیا تھا۔ اسی طرح ثمامہ بن اثال کو مسجد کے ستون سے باندھا گیا تھا۔ خود قرآن کریم میں قیدیوں کو باندھنے کا ذکر ہے: "حتى إذا أثخنتموهم فشدوا الوثاق" (سورہ محمد)۔ مولانا خورشید احمد اعظمی نے ابوداؤد شریف کے حوالہ سے حضرت سودہ کی حدیث نقل کی ہے:

''فرجعت إلى بيتي ورسول الله ﷺ فيه وإذا أبو يزيد سهيل بن عمرو في ناحية الحجرة مجموعة يداه إلى عنقه بحبل'' (۳/۵۶)۔

مولانا ابرار ایوبی نے لکھا ہے کہ بخاری میں ترجمۃ الباب ہے: باب الاسارى في السلاسل۔ اور ابوداؤد میں ہے: باب في الاسير يوثق۔ مولانا جعفر ملی نے مصنف عبدالرزاق سے حدیث نقل کی ہے:

''لما أسر العباس في الأسارى يوم بدر سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم أنينه وهو في الوثاق'' (كتاب المغازى)۔

سوال نمبر ۵

کیا کسی مجرم کو اس کے خصوصی جرم کے پس منظر میں قید تنہائی دی جا سکتی ہے؟

اس سوال کے تحت مولانا باقر ارشد قاسمی نے لکھا ہے کہ قید تنہائی کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ اس سے قیدی کی صحت متاثر ہوتی ہے، اور یہ شریعت کو گوارہ نہیں۔ ان کے علاوہ تمام مقالہ نگار حضرات اس رائے سے متفق ہیں کہ اگر مصلحت متقاضی ہو تو مجرم کو قید تنہائی دی جا سکتی ہے۔ مولانا خورشید انور نے موسوعہ کی یہ عبارت نقل کی ہے:

''يجوز للحاكم عزل السجين وحبسه منفردا في غرفة يقفل عليها بابها إن كان في ذلك مصلحة'' (۱۶/۹۱۳)۔

مولانا خورشید احمد نے یہ عبارت نقل کی ہے:

''يطين الباب ويترك له ثقبة يلقى منها الماء والخبز، وقال القاضي: الرأى فيه إلى القاضي'' (البحر الرائق ۶/۲۰۶)

مولانا اقبال احمد نے لکھا ہے کہ غزوہ تبوک کے موقع پر پیچھے رہ جانے والے (مخلفین) صحابہ کے ساتھ جو معاملہ کیا گیا وہ قید تنہائی جیسا معاملہ تھا۔

سوال نمبر ۶

کیا جیل میں قیدیوں سے جبرا کام لیا جا سکتا ہے اور اگر کام لیا جائے تو کیا قیدی اس کام کی اجرت کے مستحق ہیں؟

اس سوال کی دو شقیں ہیں:

شق اول یہ ہے کہ جبری کام لینا کیسا ہے؟ اور شق دوم میں یہ دریافت کیا گیا ہے کہ اگر کام لیا جائے تو وہ اجرت کا مستحق ہوگا یا نہیں؟

ان دونوں شقوں کے تعلق سے شرکائے سیمنار کی رائیں مختلف ہیں:

☆ ایک رائے یہ ہے کہ جیل میں قیدی سے جبری کام لینا درست نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی بامقصد کام لیا جاتا ہے تو وہ اجرت کا مستحق ہوگا۔ یہ رائے مولانا ظفر الاسلام، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا افتخار احمد، مولانا راشد ندوی، مولانا مغفور باندوی، مولانا عبد التواب اور قاضی ہارون مینگل صاحبان کی ہے۔ ان حضرات کا استدلال یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کی راجح رائے یہ ہے کہ جیل میں قیدی کو کام کی اجازت نہیں ہوگی، ورنہ قید خانہ دوکان بن جائیگا۔ مولانا راشد ندوی نے شامی کا یہ جزئیہ بھی اپنی تائید میں نقل کیا ہے: "وعن الثاني يوجر لقضاء دينه" (۴/۳۵۰)۔

☆ مولانا اشتیاق اعظمی، مفتی محبوب علی اور مفتی انور علی نے یہ صراحت کی ہے کہ زیر سماعت قیدیوں سے کام نہیں لیا جائے گا، اور اگر کام لیا گیا تو اجرت دی جائے گی۔

☆ دوسری رائے یہ ہے کہ جبری کام لینے کی اجازت نہ ہوگی اور اسے اجرت کا استحقاق بھی نہیں ہوگا۔ یہ رائے مولانا جعفر ملی اور مولانا خورشید احمد کی ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ عقد کے لئے طرفین کی رضامندی ضروری ہوتی ہے، جبری کام میں طرفین کی رضامندی مفقود ہے۔ تو اس سے جبری عقد اجارہ لازم آئے گا، جو درست نہیں ہے۔

☆ تیسری رائے یہ ہے کہ اگر کام لینے میں مصلحت ہو تو قیدی کی صحت کا خیال رکھتے ہوئے کام لیا جاسکتا ہے، اور اسے اجرت ملے گی۔ یہ مولانا ابرار حسن ایوبی، مولانا اقبال ٹنکاوی اور مولانا ابوسفیان مفتاحی کی رائے ہے۔

☆ چوتھی رائے یہ ہے کہ جبری کام لیا جانا سزا کا حصہ ہے، اس لئے بطور تعزیر جبری کام لینا درست ہے، یہ رائے مولانا عبد الرشید قاسمی، مولانا اقبال قاسمی، مولانا لطیف الرحمن فلاحی، مفتی محبوب علی، مولانا شاہ جہاں ندوی، مولانا نعیم اختر، مفتی انور علی اور مولانا باقر ارشد قاسمی کی ہے۔ اس رائے کے قائلین میں سے مولانا نعیم اختر اور مفتی انور علی کے نزدیک اسے اس کام کی اجرت ملے گی اور دیگر حضرات کے نزدیک قاضی کی صوابدید کے مطابق یا تو اجرت نہیں ملے گی یا کم ملے گی۔

راقم سطور عرض کرتا ہے کہ جبری کام لیا جانا اور قیدی کو اپنی مرضی سے کام کی اجازت ملنا دو مختلف باتیں ہیں۔ امام ابوحنیفہ کی جو راجح رائے اوپر نقل کی گئی، اس کا تعلق قیدی کو اپنی مرضی سے کام کرنے کی اجازت سے ہے، اسی لئے اس عبارت میں آگے کہا گیا کہ پھر تو قید خانہ اس کے لئے دوکان بن جائے گا۔ اور قید کا مقصد یعنی زجر و توبیخ فوت ہوجائے گا۔ لیکن زیر بحث سوال اس بات سے متعلق ہے کہ کیا قیدی سے بالجبر کام لیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

اس سلسلہ میں راقم یہ عرض کرتا ہے کہ قید خانہ کے اندر لئے جانے والے کام کی نوعیت دو ہے: اول یہ کہ روزمرہ کی ضروریات مثلاً صفائی، کھانا پکانا اور اس جیسے کام لئے جائیں۔ دوسری نوعیت یہ ہے کہ کوئی ہنر، قابلیت، تعلم جیسے کام میں اس مقصد سے لگایا جائے کہ قیدیوں کی اس طرح اصلاح بھی ہو، اور دوران قید وہ ایسی اضافی قابلیت اور ہنرمندی وغیرہ سیکھ لیں، جو آئندہ جیل سے باہر نکلنے کے بعد اچھی زندگی گذارنے میں ان کے لئے معاون بن سکیں۔ اس دوسری نوعیت کے کاموں پر موجودہ دور میں خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔ اور اسی نوعیت کے کاموں کے تعلق سے اجرت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ پہلی نوعیت کا کام ایک نوع کی مشقت ہے، اور یہ ذمہ داری صرف قید بامشقت کی صورت میں جبری دی جاسکتی ہے۔ جن حضرات مقالہ نگار نے جبری کام لئے جانے کی اجازت دی ہے اور اجرت کے استحقاق سے منع کیا ہے، ان کے نزدیک اس سے مراد اسی پہلی نوعیت کا کام محسوس ہوتا ہے۔ دوسری نوعیت کا کام یعنی ہنر وغیرہ کی تعلیم اور اس سے متعلق کاموں میں مصروفیت قیدی کے لئے مفید اور بامقصد ہے، اور اس کی بالکل اجازت ہونی چاہئے، نیز انھیں اپنے ان کاموں پر اجرت بھی ملنی چاہئے۔ اکثر مقالہ نگار حضرات نے اسی نوع کے کاموں پر اجرت کے استحقاق کی رائے دی ہے۔

سوال نمبر ۷:...... جن قیدیوں کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے اور جن کے بارے میں سزائے قید کا فیصلہ ہوچکا ہے، قید خانوں میں سلوک کے اعتبار سے کیا ان دونوں میں فرق کیا جاسکتا ہے؟

اس مسئلہ پر مقالہ نگاران متفق ہیں کہ زیر سماعت قیدی چونکہ ابھی مجرم نہیں ہے، تحقیق حال کے بعد وہ بے قصور بھی ثابت ہوجاتا ہے، اس لئے

اس کے ساتھ وہ سلوک روانہیں رکھا جائے گا جو ایسے قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے جن کا جرم ثابت ہو چکا ہے اور بطور سزا جیل میں ہیں۔ پس زیر حراست قیدی کو مجرم کے ساتھ نہیں رکھا جائے گا، اور ان کی حراست کی کیفیت بھی ہلکی ہوگی۔

اس رائے پر استدلال کرتے ہوئے مولانا عبد الرشید قاسمی اور مولانا اقبال قاسمی نے شیخ وہبہ زحیلی کی یہ عبارت نقل کی ہے:

إن الاصل في المتهم البرائة حتى تثبت ادانته'' (الفقه الاسلامی ۶۴۵۳/۷)۔

مولانا خورشید انور نے موسوعہ کی عبارت نقل کی ہے: ''والمعمول به في القديم تميز حبس الوالي الذي يضم أهل الريبة والفساد (الموقوفين) عن حبس القاضي الذي يضم المحكومين، ويختلف سجن الوالي عن سجن القاضي'' (۱۶/۳۱۸)۔

صرف مولانا راشد ندوی کی رائے ہے کہ دونوں قسم کے قیدیوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوگا۔ دراصل انھون نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ چونکہ قید صرف حدود وقصاص کے متہم کو ہی کچھ شرطوں کے ساتھ کیا جا سکتا ہے اور جلد ہی ان کے معاملہ کا فیصلہ کیا جائے گا۔ فیصلہ ہونے کے بعد ان کی سزائیں دوسری ہوں گی۔ لہذا جو لوگ قید میں ہیں، ان کی سزا قید نہیں ہے، یا تو وہ عدم ثبوت کی بنا پر بری ہوں گے، یا ثبوت کے بعد سزا کے مستحق۔ لہذا ان کو دوران قید نہ تو سہولت دی جا سکتی ہے کہ جرم کا الزام سنگین ہے اور نہ ہی ان کے ساتھ بدسلوکی کی جا سکتی ہے کہ وہ شرعی سزا پر اضافہ ہوگا۔ پس ان دونوں حالتوں میں ان کے ساتھ سلوک دوران قید یکساں رہے گا۔

سوال نمبر ۸: ...... کیا زیر سماعت قیدیوں کو اتنے دنوں تک فیصلے سے پہلے قید میں رکھا جا سکتا ہے جو ان کے اوپر عائد فرد جرم کی اصل سزا ہے۔

اس سوال کے جواب میں متعدد مقالہ نگاروں نے کہا ہے کہ حراست کی مدت ہرگز اتنی نہ ہونی چاہئے جو جرم کی سزا ہے (مفتی انور علی، مولانا اشتیاق احمد، مولانا ہارون مینگل، مولانا خورشید احمد، مولانا عبد الرشید قاسمی)۔ بعض حضرات نے اسے ظلم وزیادتی اور ناجائز بتایا ہے، کیونکہ ضمانت پر رہائی کا راستہ موجود ہے (مولانا اقبال قاسمی، مولانا مغفور باندوی)۔ کچھ مقالہ نگاروں نے اس صورت کو نادر یا اسلامی ریاست میں ناقابل وقوع قرار دے کر بات ختم کردی ہے (مولانا راشد ندوی، مولانا نعیم اختر)۔ کئی مقالہ نگاروں نے اس سوال کا واضح جواب نہیں دیا ہے۔

مولانا ظفر الاسلام صدیقی کا کہنا ہے کہ دوران مقدمہ کی مدت سزا کی مدت سے لمبی ہو جائے تو اسے فوراً رہا کر دینا چاہئے۔ اور مولانا باقر ارشد قاسمی کی رائے ہے کہ ایسی صورت میں اگر جرم ثابت ہوا تو بری ہو جائے گا، ورنہ ہرجانہ لے گا۔

مولانا ابرار ایوبی، مولانا اقبال ٹنکاوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا خورشید انور، مولانا جعفر ملی اور مولانا شاہ جہاں ندوی کے نزدیک خاص صورتوں میں اور متہم مجہول الحال کو کشف حال تک قید میں رکھنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے، اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ خواہ مخواہ تاخیر درست نہیں ہے۔

سوال نمبر ۹: ...... اگر ملزم کو قید میں رکھا گیا ہو اور بعد کو عدالت نے اسے بری قرار دیا تو کیا وہ زمانہ قید میں ہونے والی ذہنی اذیت اور مالی ہرجانہ طلب کر سکتا ہے؟

اس بابت مقالہ نگاروں کی دو علاحدہ علاحدہ رائیں ہیں: ایک رائے یہ ہے کہ یہ قید تعزیری ہے، لہذا اسے مالی ہرجانہ کے مطالبہ کا حق نہیں ہے۔ یہ بات مولانا خورشید انور، مولانا خورشید احمد اور مفتی محبوب علی نے کہی ہے۔ مولانا نعیم اختر، مولانا راشد ندوی اور مولانا مغفور باندوی نے کہا ہے کہ صرف ذہنی اذیت کا ہرجانہ درست نہیں ہے۔ البتہ اگر قید میں کوئی جسمانی نقصان پہنچا ہے تو اس کا معاوضہ طلب کیا جا سکتا ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ ایسی صورت میں وہ مالی ہرجانہ طلب کر سکتا ہے۔ کیونکہ بسا اوقات باصلاحیت نوجوانوں کو صرف شک کی بنیاد پر اٹھالیا جاتا ہے، یا دشمنی کی خاطر نقصان پہنچانے کے لئے جھوٹے مقدمات میں پھنسا دیا جاتا ہے، اور اس میں عمر کا قیمتی مرحلہ اور تعلیم وغیرہ ضائع ہو جاتی ہے۔ یہ رائے مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا اقبال قاسمی، مولانا باقر ارشد، مولانا ظفر الاسلام، مولانا شاہ جہاں ندوی، مولانا ابرار ایوبی، مولانا عبد التواب، مفتی انور علی، مولانا اشتیاق احمد اور مولانا عبد الرشید قاسمی صاحبان کی ہے۔ راقم سطور بھی اسی رائے کو راجح سمجھتا ہے، کیونکہ ایسی صورت میں نہ

صرف اس کو ذہنی اذیت پہنچتی ہے، بلکہ زبردست مالی نقصان بھی ہوتا ہے، عزت اور نیک نامی پر دھبہ لگ جاتا ہے، سماج میں اس کو کئی پہلو سے شدید نقصان لاحق ہو جاتا ہے۔ لہذا اس کو اس ہمہ جہتی نقصان کا پورا معاوضہ اور ہرجانہ ملنا چاہئے۔ اس ہرجانہ اور معاوضہ سے اس کے نقصان کی کچھ حد تک تلافی ہو سکے گی، اور سماج میں اس پر لگ جانے والے داغ کی کسی حد تک صفائی بھی ہو سکے گی۔

دوسری رائے کے قائلین کا استدلال درج ذیل ہے:

☆ منافع کا ضمان عند الاحناف گو کہ نہیں ہوتا، لیکن یہاں فساد زمانہ کو دیکھتے ہوئے اور ظلم کے سد باب کے لئے تلف منفعت کا ضمان دلانا عین مصلحت ہے۔ (مولانا اقبال قاسمی، مولانا شاہ جہاں ندوی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا ظفر الاسلام اعظمی)

☆ حضرت علیؓ کا واقعہ کہ دو لوگوں کی گواہی پر حضرت علیؓ نے چور کا ہاتھ کٹوا دیا۔ بعد میں دونوں گواہان نے کہا کہ مجرم کی شناخت میں غلطی ہوگئی۔ چور دوسرا شخص ہے، تو حضرت علیؓ سخت ناراض ہوئے، دونوں گواہوں کی شہادت کو باطل قرار دیا، اور متاثرہ شخص کو ان دونوں گواہان سے دیت دلوائی (مولانا ابرار ایوبی۔ موسوعۃ الفقہ الاسلامی المعاصر ۳/ ۲۴۹)۔

سوال نمبر ۱۰

قیدی کو اپنے مقدمات کے سلسلہ میں وکیل سے رابطہ اور صفائی پیش کرنے کے کیا حقوق حاصل ہیں؟

اس سوال کے جواب میں تمام مقالہ نگاران متفق ہیں کہ قیدی کو وکیلوں تک رسائی، اور صفائی پیش کرنے کے تمام حقوق حاصل ہوں گے۔ کیونکہ عام طور پر لوگ عدالت میں صفائی پیش کرنے کے طور طریقوں سے واقف نہیں ہوتے۔ نیز انھیں اپنے اوپر عائد الزام کے تعلق سے صلاح و مشورہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

☆ مولانا خورشید انور نے اس پر استدلال کرتے ہوئے یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا:

"إذا تقاضى إليك رجلان فلا تقض للأول حتى تسمع كلام الآخر" (ترمذی ۱/ ۲۴۸)۔

☆ مولانا اشتیاق احمد نے فتاوی عالمگیری کی عبارت نقل کی ہے:

"إذا علم القاضي بأن الموكل عاجز عن البيان في الخصومة يقبل منه التوكيل. كذا في فتاوى قاضي خان" (۳/ ۲۷۶)

سوال نمبر ۱۱

کیا خواتین قیدیوں کو اپنے ساتھ شیر خوار بچوں کو جیل میں رکھنے کا حق حاصل ہے؟

بیشتر مقالہ نگاروں کی رائے ہے کہ بچہ کو ماں سے علاحدہ نہیں کیا جائے گا۔ اور ماں کو اجازت ہوگی کہ وہ شیر خوار بچہ کو اپنے ساتھ رکھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ماں کو اور اس کے شیر خوار بچہ سے جدا جدا کرنے سے منع فرمایا ہے۔ مولانا اقبال قاسمی نے لکھا ہے کہ بچہ مدت رضاعت تک ماں کے پاس رہے گا۔ مولانا افتخار احمد کے نزدیک اس وقت تک رہے گا، جب تک وہ خورد و نوش پر قادر نہ ہو جائے۔ مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا اشتیاق احمد، مولانا عبدالرشید اور مفتی انور علی کے نزدیک چار سال تک رہے گا۔

مولانا خورشید احمد اعظمی اور مولانا ابا قرار شد قاسمی کی رائے ہے کہ اگر بچہ ماں کے دودھ کے بغیر رہ سکتا ہے، یا باپ رضاعت وغذا کا نظم کر لیتا ہے تو بچہ کو جیل میں ماں کے پاس رکھنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ کیونکہ جیل کا ماحول بچہ کے لئے مفید نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ بچہ کے مفاد کی وجہ سے مطلقہ کو شہر سے باہر بچہ کو لے جانے کی اجازت نہیں دی جاتی ہے۔

دوسرا باب / تعارف مسئلہ

قیدیوں کے حقوق - ایک تعارف

جناب عبدالرحیم قریشی[1]

کسی مجرم یا ملزم کو قید میں رکھنے کے دو اہم مقاصد ہیں: ایک یہ کہ معاشرے کی جرائم سے حفاظت کی جائے اور دوسرے یہ کہ مجرم کو قید سے چھوٹنے کے بعد قانون کا احترام و پابندی کرنے والا شہری بنایا جائے، پہلے مقصد کا تعلق زمانہ حال سے اور دوسرے مقصد کا تعلق مستقبل سے ہے۔ ان مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ معاشرے کو جرائم سے پاک اور محفوظ رکھنے کیلئے جہاں مجرمین کو ایک مدت کیلئے معاشرے سے الگ تھلگ کر دیا جائے وہیں سنگین جرائم کی صورت میں مجرمین کو ایسی سزا دی جائے جس سے دوسرے عبرت حاصل کر سکیں۔

دوسرے مقصد یعنی قید کے دوران اس بات کی کوشش کہ قید خانے سے نکلنے کے بعد مجرم اب ایک بہتر اور اچھا شہری بنے یہ ضروری سمجھا گیا کہ قیدیوں کی جسمانی قوت اور صحت کو برقرار رکھا جائے اور کوشش کی جائے کہ دوران قید جسمانی قوت باقی رہے اور صحت متاثر نہ ہو۔ اسی طرح یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ قیدی کی اخلاقی حالت کو سدھارا جائے اُس میں اچھے اور برے کام میں امتیاز کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے اور برے کام سے اور جرائم سے نفرت کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ قید کے سلسلہ میں اس کو بھی ضروری تصور کیا گیا کہ قیدیوں کی زمرہ بندی کی جائے تاکہ عادی مجرموں اور بری طینت کے قیدیوں کی صحبت سے ان کو بچایا جائے کہ عادی مجرم اور سنگین جرم کرنے والے دوسرے قیدیوں پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ مستقبل کی بہتری کیلئے قید خانے میں تعلیم و تربیت اور خصوصاً پیشہ وارانہ تربیت کے انتظام کو ضروری سمجھا گیا تاکہ یہ قیدی سزا کاٹ کر چھوٹنے کے بعد اپنے پیر پر کھڑے ہونے کے قابل بن سکیں۔

قیدیوں سے برتاؤ کے بارے میں اقل ترین معیاری رولس (قواعد) اقوام متحدہ کی پہلی کانگریس نے منظور کیئے جو جنیوا میں ۱۹۵۵ء میں منعقد ہوئی تھی۔ ان قواعد کے توثیق یونیسکو نے ۱۹۵۷ء اور بعد ازاں ۱۹۷۷ء میں کی۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت نے ۱۸۹۴ء میں قید خانون کا قانون یعنی The Prision Act مدون کیا۔ اسکے بعد ۱۹۰۰ء میں ایک اور قانون The Prisioner Act بنایا گیا ان قوانین کے تحت ریاستی (صوبائی) حکومتوں کو تفصیلی رولس مرتب کرنے کا اختیار دیا گیا۔ زیر نظر مضمون میں آندھرا پردیش کی ریاست میں نافذ The Andhra Pradesh Prision Rules) دی آندھرا پردیش پریزن رولس (کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ دیگر ریاستوں میں اُمید ہے کہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ایسے ہی قواعد بنائے گئے ہوں گے۔

قیدیوں کی زمرہ بندی

اقوام متحدہ کے مرتبہ اقل ترین معیاری رولس کے تحت جہاں یہ بنیادی اُصول بیان کیا گیا کہ ان رولس کے اطلاق میں مکمل غیر جانبداری برتی جائے اور نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب، سیاسی یا دیگر نظریات، قومیت اور کسی سماجی طبقے سے تعلق، جائیداد، پیدائش وغیرہ کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہ برتا جائے وہیں اس بات کی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ جنس، عمر مجرمانہ سرگرمیوں کے ریکارڈ، قید کئے جانے کی قانونی وجہ اور برتاؤ کی دیگر ضرورتوں کے پیش نظر زمرہ بندی کی جائے (رول نمبر ۸) چنانچہ ہمارے ملک میں بھی قید قانونوں کے قواعد کے تحت تفصیلی زمرہ بندی موجود ہے، جو درج ذیل ہے:

۱) خاتون قیدیوں کو مرد قیدیوں سے اس طرح الگ رکھا جائے کہ مرد قیدی ان کو نہ دیکھ سکے اور ان سے بات چیت نہ کر سکے۔

[1] اسسٹنٹ جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ۔

۲) مرد قیدیوں میں (۲۱) سال سے کم عمر کے قیدیوں کو اس سے بڑی عمر کے قیدیوں سے الگ کیا جائے اور علحدہ رکھا جائے۔

۳) (۲۱) سال سے کم عمر کے قیدیوں میں سے ان کو الگ کیا جائے جو ابھی بالغ نہیں ہوئے اور ان کا علحدہ انتظام کیا جائے۔

۴) سزا یافتہ مجرموں کو زیر سماعت قیدیوں (Undertrial) یعنی غیر سزا یافتہ قیدیوں سے الگ کیا جائے اور علحدہ رکھا جائے۔

۵) سیول قیدیوں کو فوجداری قیدیوں سے الگ رکھا جائے (سیول قیدی سے مراد وہ ہیں جنھیں رقمی جرمانہ ادا نہ کرنے کیوجہہ سے قید کی سزا دی گئی یا کسی کے قرض کے نہ ادا کرنے پر قرض دینے والے نے اس پر مقدمہ کر کے قید کی سزا دلوائی یا وہ جو لگان یا کسی ٹیکس کی نہ دہندگی کیوجہہ سے قید میں رکھے گئے۔) (دفعہ ۷ دی پرنیرن ایکٹ) اس زمرہ بندی کے علاوہ بھی ایک اور نوعیت کی زمرہ بندی ہے

۱) وہ قیدی جنھیں قید سادہ کی سزا سنائی گئی۔

۲) وہ قیدی جنھیں مشقت کی سزا سنائی گئی۔

۳) وہ قیدی جنھیں مدت العمر کی قید کی سزا سنائی گئی۔

۴) وہ قیدی جنھیں سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔

طبقہ واری تقسیم

علاوہ ازیں قیدیوں کے تین طبقات قرار دیئے گئے ہیں ان طبقا کی تقسیم کیلئے دیگر باتوں کے علاوہ معیار زندگی اور سماجی مرتبے کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ برطانیہ میں سماجی اونچ نیچ کا طبقہ واری نظام (Fuedal System) نافذ تھا اور ہندوستان میں بھی تقریباً تمام ہی فرقوں میں کسی نہ کسی نوعیت کی طبقہ واری تقسیم تھی اور طبقہ واری اونچ نیچ کا تصور موجود تھا۔ اس طبقہ واری تقسیم کے تحت کلاس اے قیدیوں کو کافی سہولتیں حاصل ہیں۔ اور وہ قیدی جو عادی مجرم نہ ہوں اور جو سماجی رتبے تعلیم اور طرز زندگی کی وجہہ سے اعلیٰ معیار کی زندگی گذارتے رہے ہوں اور جو کسی ایسے جرم میں ملوث نہ ہوں جو ظالمانہ ہوں جس میں اخلاقی گراوٹ ہو جو عورتوں اور بچوں کے خلاف کیا گیا ہو یا جو دھماکہ اشیاء اور آتشی اسلحہ کے جرم سے متعلق ہو۔ ایسے مجرمین اے کلاس برتاؤ کے مستحق ہوں گے۔ بی کلاس کیلئے بھی تقریباً شرائط یہی ہیں۔ البتہ ایک عادی مجرم بھی بی کلاس کا قیدی قرار دیا جاسکتا ہے۔

مختلف زمروں کے قیدیوں سے برتاؤ اور انکے حقوق کا جائزہ لینے سے پہلے اے بی اور سی کلاس قیدیوں کے ساتھ سلوک کا جائزہ لیں گے۔ اے کلاس قیدی کو اس بات کی اجازت ہوگی کہ وہ پھل اور میوہ خرید سکیں یا منگوا سکیں اور اسی طرح تغذیہ بخش اشیاء جیسے بسکٹ، کوکو اور اوالٹین خرید یں یا منگو اسکیں انکو اس بات کی بھی اجازت ہوگی کہ محنت اور کام کے اوقات سے ہٹ کر اوقات میں اپنے ملبوسات پہن سکیں اور سونے کیلئے اپنا بستر منگوا سکیں۔ اے کلاس قیدی کو ہر ہفتہ ایک خط لکھنے یا وصول کرنے کی اجازت ہوگی اور پندرہ دن میں ایک مرتبہ قریبی رشتہ داروں اور دوستوں سے ملاقات کی اجازت ہوگی۔ اگر اے کلاس قیدی کو قید با مشقت کی سزا سنائی گئی ہو تو اسکے کردار، سابقہ طرز زندگی، صلاحیت اور صحت کے تمام معاملات پر غور کرتے ہوئے اسی نوعیت کی محنت کا کام لیا جائے گا۔ اے کلاس قیدی کو پکوان اور کھانے پینے کیلئے برتن منگوانے کی اجازت ہوگی۔ شیو بنانے کیلئے ریزر یا استرہ رکھنے کی اجازت ہوگی اور صابن سر کے بالوں کیلئے تیل، مالش کا تیل، ٹوتھ پیسٹ یا ٹوتھ پاوڈر اور برش استعمال کرنے کی اجازت ہوگی لیکن یہ چیزیں اسکو اپنے پیسوں سے حاصل کرنا ہوگا۔ اے کلاس قیدی کو دیئے جانے والے فرنیچر میں ایک چارپائی ایک میز ایک کرسی ایک کموڈ، ہاتھ منہ دھونے کیلئے بیسن اور ایک برتن، پانی کیلئے جگ، پڑھنے کی کتابوں کیلئے بک شیلف اور رات میں پڑھنے کیلئے لیمپ یا الکٹرک بلب دیا جائے گا۔ اپنے آرام کیلئے کسی اور فرنیچر کی ضرورت ہوگی تو وہ اپنے خرچے پر منگوا سکتا ہے۔ کوشش یہ ہوگی کہ اے کلاس کے ہر قیدی کو ایک الگ کوٹھری ملے۔

بی کلاس کے قیدیوں کو تقریباً وہی سہولتیں حاصل ہوں گی جو اے کلاس کے قیدیوں کو حاصل ہیں البتہ بی کلاس کے ہر قیدی کو الگ کوٹھری نہیں دی جائے گی بلکہ یہ وارڈ میں رکھے جائیں گے۔ اور وارڈ میں ہر ایک کیلئے میز کی بجائے ایک بڑا میز ہوگا جسکے اطراف کرسیاں یا بنچیس قیدیوں کیلئے ہوں گے۔ بی کلاس کے قیدیوں کو اپنے گھر سے پکوان اور کھانے کے برتن منگانے کی سہولت حاصل نہ ہوگی۔ اے کلاس کی کوٹھریاں قید خانے کے وارڈ اور کمروں کو بند کیئے جانے کے وقت کے بعد بھی مزید ایک گھنٹے تک کھلی رہیں گی جبکہ بی کلاس کے وارڈ عام وقت کے ساتھ ہی بند کیئے جائیں

گے۔اے کلاس کے ہر قیدی کو ایک آئینہ دیا جائے گا جبکہ بی کلاس کے وارڈس میں ایک یا دو آئینے لگائے جائیں گے۔اے کلاس اور بی کلاس دونوں طبقات کے قیدیوں کو اپنے صرفے پر مچھر دان منگوانے کی اجازت ہوگی۔

اے اور بی کلاس کی خاتون قیدیوں کو کانچ کی چوڑیاں پہننے کی اجازت ہوگی اور شادی شدہ ہندو خاتون قیدی منگل سوتر پہنی رہ سکیں گی۔

اے اور بی کلاس کے ان قیدیوں کو جنھیں اپنی ہی کوٹھری یا اپنے ہی وارڈ میں کام دیا جائے گا ان کو میڈیکل آفیسر کی سفارش پر ایک گھنٹہ کھلی ہوا میں چہل قدمی اور ایکسرسائز کی اجازت ہوگی۔

اے اور بی کلاس کے قیدیوں کو اپنے خرچے سے روزنامہ اخبارات ورسائل اور کتابیں منگانے کی اجازت ہوگی۔

سی کلاس کے قیدی کو ان تمام سہولتوں سے جو اے کلاس اور بی کلاس کے قیدیوں کو فراہم کی جاتی ہیں استفادہ کا کوئی حق نہ ہوگا۔

مذہبی عقائد اور اخلاقی ضابطہ کا احترام

اقوام متحدہ کے مرتبہ اقل ترین معیاری رولس میں ایک بنیادی اصول یہ بتایا گیا ہے کہ قیدیوں کے مذہبی عقائد اور اخلاقی ضوابط کا احترام کیا جائے گا۔یہی بات ہمارے ملک کے قواعد میں بھی ملتی ہے کہ ہندوؤں کو سر پر شینڈھی رکھنے کی اجازت ہوگی لیکن اسکی گولائی ساڑھے سات سنٹی میٹر سے زائد اور لانبائی پندرہ سنٹی میٹر سے زائد نہ ہوسکے گی۔تمام قیدیوں کی مونچھیں اور داڑھیاں کتر کے باریک کی جائیں گی لیکن مسلمانوں کو ۵ ' ۲ سنٹی میٹر تک لانبی داڑھی رکھنے کی اجازت ہوگی۔سکھوں کے بالوں کو نہ کاٹا جائے گا نہ چھوٹا کیا جائے گا البتہ میڈیکل آفیسر کسی میڈیکل وجہ سے ایسا چاہے تو بال چھوٹے کئے جاسکتے ہیں اور کاٹے جاسکتے ہیں (رول نمبر ۲۵۶ (۲))۔

صبح قیدیوں کو نیند سے بیدار کرنے کیلئے پربھات پھیری کا انتظام ہوگا یہ پربھات پھیری تین تا پانچ قیدیوں پر مشتمل ہوگی جو ایسے بھجن گاتے ہوئے پھریں گے جو غیر مذہبی اور غیر فرقہ وارانہ نوعیت کے ہوں گے (رول نمبر ۲۵۹ (بی))۔

رول (۲۸۶)(۱) میں کہا گیا ہے کہ قیدیوں کے مذہبی اور ذات پات پر مبنی احساسات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی ایسی مداخلت کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔اسی رول کی شق نمبر (۲) میں کہا گیا ہے کہ کسی مذہبی یا ذات واری تقریب یا رسم کیلئے قیدیوں کا اجتماع کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہوگی شق نمبر (۳) میں ان مواقع کا ذکر کیا گیا ہے جب کہ قیدیوں کو برت یا روزہ رکھنے کی اجازت ہوگی۔مسلمانوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ماہ رمضان کے (۳۰) دن محرم کی (۱۰) تاریخ کو (۱۵) شعبان کو اور (۹) ذی الحجہ کو روزے رکھ سکیں گے۔شق نمبر (۴) میں مذہبی یا خیراتی اداروں اور افراد کی جانب سے جیل خانے کے سپرنٹنڈنٹ سے اجازت لے کر میڈیکل آفیسر کے معائنہ کے بعد تہوار' عید اور دیگر تقریبات کے موقعوں پر پھل اور مٹھائیاں قیدیوں میں تقسیم کرنے کی سہولت فراہم کی گئی ہے۔رول (۲۹۳) میں کہا گیا ہے کہ کسی امام' پجاری یا پادری کو کسی قیدی تک پہنچنے کی کوئی اجازت نہیں ہوگی۔البتہ یہ اپنے عقیدے اور اپنے مسلک کے اس قیدی سے مل سکیں گے جسکو موت کی سزا سنائی گئی ہو۔ایک ہی مذہب کے ہونے کے باوجود اگر فرقہ الگ ہو تو یہ اجازت حاصل نہیں ہوگی تا آنکہ قیدی اپنی مرضی سے ایسے مذہبی پیشوا سے ملنے کی خواہش ظاہر کرے۔

جہاں مذہبی پیشوا کی قیدیوں سے ملاقات ممنوع ہے ؤ ہیں رول (۲۹۲) کے تحت اخلاقی نوعیت کے لیکچرس کی اجازت حاصل ہے اس شرط پر کہ اخلاقی تعلیم کے لبادے میں مذہب بدلنے کی نیت سے کسی مذہبی عقیدے کا پرچار نہ کیا جائے۔ایسے لیکچر دینے والوں کا انتخاب پولیس کمشنر یا ڈسٹرکٹ کلکٹر کے مشورے سے قید خانوں کا انسپکٹر جنرل کرے گا۔جیل کے سپرنٹنڈنٹ کی یہ کوشش ہوگی کہ معروف اداروں کے ٹیچرس اور لیکچررس کو جیل کی چھٹیوں اور اتوار کے دن قیدیوں کے استفادہ کیلئے غیر سیاسی موضوعات پر لیکچر دینے کی دعوت دے۔کسی ٹیچر یا لیکچرر کو ایسے لیکچر کیلئے جیل کے سپرنٹنڈنٹ سے لیکچر کا موضوع بتا کر قبل از قبل باضابطہ اجازت حاصل کرنی ہوگی جیل سپرنٹنڈنٹ کی جانب سے مدعو کئے گئے ٹیچرس اور لیکچررس کو قاعدے کے مطابق شرح پر سواری الاونس دیا جائے گا۔

رول (۳۰۴) کے ذریعے کسی قیدی کے مذہب تبدیل کرنے یا عقیدہ تبدیل کرنے کی کوشش کی ممانعت ہے اسی طرح دوسروں کے مذہبی جذبات اور عقیدے کو عمداً ٹھیس پہنچانے کی ممانعت بھی کی گئی اور قیدیوں کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ ذات پات یا مذہبی احساسات کی بنیاد پر کوئی مطالبہ

یا ایجی ٹیشن نہ کریں۔

قیدیوں کی تعلیم وتربیت کے سلسلے میں رول (۲۹۴) میں یہ کہا گیا ہے کہ ایسے سزا یافتہ قیدیوں کیلئے جو دلچسپی رکھتے ہوں تعلیمی سہولتیں فراہم کی جائیں گی رول (۲۹۵) کے تحت ہر سنٹرل جیل اور ڈسٹرکٹ جیل میں ابتدائی تعلیم کا اسکول رہے گا۔ جس میں مطلوبہ لیاقت رکھنے والے ٹیچرس کام کریں گے اور اس میں اسکول کی تمام سہولتیں دستیاب ہوں گی۔ (۲۹۶) کے تحت یہ بتایا گیا ہے کہ ابتدائی (Elementry) درجات کی تعلیم کے آگے زیر سماعت (غیر سزا یافتہ) قیدیوں کیلئے علٰحدہ کلاس منعقد ہوگی۔ اور جو قیدی ابتدائی درجات سے آگے پڑھنا چاہیں انہیں ضروری کتابیں اور دیگر سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ اسی دفعہ میں یہ بھی کہا گیا کہ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر اور اسکے اسٹنٹ قید خانے کے اسکول کا معائنہ کیا کریں گے اور تعلیم میں دلچسپی رکھنے والوں کی ضرورتوں کا جائزہ لے کر قید خانے کے حکام کو مشورہ دیں گے۔ علاوہ ازیں کسی فن یا ہنر کی تربیت کا بھی انتظام ہوگا اور اس پیشہ وارانہ تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کو جیل کے حکام پیش نظر رکھیں گے۔

حفظان صحت وطبی امداد

اقوام متحدہ کے مرتبہ معیاری اقل ترین رولس میں اس بات کو ضروری قرار دیا گیا کہ صفائی کا خاص خیال رکھا جائے اور حوائج فطریہ سے فراغت کیلئے جو انتظام ہو وہ صاف ستھرا اور عمدہ ہو۔ غسل اور نہانے کی سہولتیں فراہم کی جائیں اور قید خانے کے تمام حصوں کو ہر وقت صاف ستھرا رکھا جائے۔ (رولس ۱۲، ۱۳ اور ۱۴) قیدیوں کی صحت کے تعلق سے قواعد میں اس پر زور دیا گیا ہے کہ صحت اور صفائی کے نقطہ نظر سے مناسب مقدار میں پانی کا انتظام کیا جائے اور حوائج ضروریہ کے ٹائلیٹ اور اسکی چیزیں صاف ستھری ہوں نیز سر اور داڑھی کے بالوں کو اچھی حالت میں رکھنے کی سہولت فراہم کی جائے۔ اور جو شیو کرتے ہیں انکو اسکی سہولت فراہم کی جائے۔ (رولس نمبر ۱۵، ۱۶)۔

طبی خدمات کے تعلق سے قاعدہ بتایا گیا ہے کہ ہر قید خانے میں کم از کم مطلوبہ لیاقت رکھنے والا میڈیکل آفیسر ہونا چاہئے جو نفسیاتی امراض کے بارے میں بھی جانتا ہو۔ بیمار قیدیوں کو قید خانے کے دواخانے میں یا سیول دواخانوں میں منتقل کیا جائے دانتوں کے ڈاکٹر کی خدمات بھی دستیاب رہیں۔ جن قید خانوں میں خاتون قیدیوں کیلئے انتظام ہو وہاں قبل زچگی اور بعد زچگی علاج ونگہداشت کا معقول انتظام ہو۔ کوشش ہو کہ بچے کی پیدائش قید خانے کی بجائے اس کے باہر کسی ہسپتال میں ہو۔ اور اگر بچے کی پیدائش قید خانے میں ہو جائے تو اس کا ذکر پیدائش کے صداقت نامے (برتھ سرٹیفکیٹ) میں نہ کیا جائے۔ قید خانے میں تربیت یافتہ نرسنگ اسٹاف شیر خوار بچوں کی دیکھ بھال اور نگہداشت کیلئے رکھا جائے (رولس ۲۲، ۲۳)۔

میڈیکل آفیسر کے بارے میں ان رولس میں یہ کہا گیا ہے کہ کسی قیدی کے قید خانے میں داخلے کے ساتھ ہی میڈیکل آفیسر اس کا طبی معائنہ کرے گا اور اسکے بعد جب ضرورت محسوس ہو طبی معائنہ کیا جائے گا۔ ایسے قیدیوں کو جن میں متعدی امراض کا شبہ پایا جائے ان کو دیگر قیدیوں سے علٰحدہ کیا جائے گا۔ ہر قیدی سے محنت وکام لینے کی صلاحیت کا تعین میڈیکل آفیسر کرے گا۔ میڈیکل آفیسر قیدیوں کی جسمانی اور دماغی صحت کا خیال رکھے گا اور تمام بیمار قیدیوں کا روز معائنہ کرے گا۔ کسی قیدی کی جسمانی یا دماغی صحت مسلسل قید یا قید کی کسی حالت کیوجہ سے متاثر ہونے کی صورت میں ایسے قیدی کے بارے میں قید خانے کے انتظامی عہدہ دار کو اطلاع دے گا (رولس نمبر ۲۴، ۲۵)۔

میڈیکل آفیسر کی یہ بھی ذمہ داری ہوگی کہ وہ باقاعدگی کے ساتھ قیدیوں کو دی جانے والی غذا کی مقدار وکیفیت، قید خانے میں صفائی اور حفظان صحت کا انتظام ہوا روشنی، گرمی وار ٹائلیٹس کے انتظام، قیدیوں کے کپڑوں اور بستر کی موزونیت، قیدیوں کیلئے فزیکل ایکسر سائیز اور اسپورٹس کے انتظام کا معائنہ کرے اور ان امور کے تعلق سے قید خانے کے انتظامی عہدہ دار کو مشورہ دے۔ یہ انتظامی عہدہ دار اس مشورے پر فوری عمل کرے گا اور قدم اٹھائے گا اور اگر ایسا قدم اٹھانا اسکے اختیارات میں نہ ہو تو فوری میڈیکل آفیسر کے مشورے کے ساتھ اپنی رپورٹ اعلیٰ عہدہ دار کو روانہ کرے گا۔

حفظان صحت اور طبی خدمات کے تعلق سے اقوام متحدہ کے مرتبہ ان اصولوں کو ملک کے قانون اور قواعد میں پیش نظر رکھا گیا ہے اور ہر قید خانے میں صفائی ستھرائی کے انتظام کے ساتھ میڈیکل آفیسر کا تقرر کیا جاتا ہے۔

ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کا استعمال

اقوام متحدہ کے مرتبہ معیاری اقل ترین رولس کے رول نمبر ۳۳ میں یہ کہا گیا ہے کہ بطور سزا کسی قیدی کو ہتھکڑیوں بیڑیوں اور زنجیروں میں جکڑا نہیں جائے گا اور قیدی کی نقل وحرکت کو روکنے کیلئے زنجیروں اور آہنی اشیاء کا استعمال نہیں کیا جائے گا۔ لیکن جیل سے باہر کسی قیدی کو منتقل کرنے کے دوران یا میڈیکل آفیسر کے ڈائرکشن پر جو طبی وجوہات سے دیا گیا ہو یا کسی قیدی کو خود اپنے آپکو زخمی کر لینے یا دوسرے کو زخمی کرنے یا کسی شئے کو نقصان پہنچانے سے روکنے کیلئے ہتھکڑی بیڑی یا زنجیر کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔

آندھرا پردیش پر یزن رولس میں کہا گیا ہے کہ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کا استعمال کسی قیدی پر سزا کے طور پر نہیں کیا جائے گا۔ البتہ تحفظ کے نقطہ نظر سے ہتھکڑی لگائی جاسکتی ہے اور بیڑیاں پہنائی جاسکتی ہیں (رول نمبر ۳۱۱)۔

دی پر یزن ایکٹ ۱۸۹۴ء کی دفعہ ۵۶ کے تحت قید خانے کے سپر نٹنڈنٹ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اگر وہ کسی قیدی کی حالت یا اسکے کردار یا اسکی سلامتی کے نقطہ نظر سے ضروری سمجھے تو ہتھکڑی بیڑی یا زنجیر اس قیدی کو پہنانے کا حکم دے سکتا ہے۔ اسی قانون کی دفعہ (۵۷) میں بتایا گیا ہے کہ جن قیدیوں کو تاعمر قید کی سزا دی جائے قید خانے میں داخلے کے بعد ان کو پہلے تین مہینے بیڑیاں پہنا کر رکھا جاسکتا ہے اور سپر نٹنڈنٹ قید خانوں کے انسپکٹر جنرل سے توثیق حاصل کر کے تین مہینے کے بعد بھی بیڑیاں پہنائے رکھنے کا حکم دے سکتا ہے۔ دیگر قیدیوں کے بارے میں دفعہ ۵۸ میں کہا گیا ہے کہ فوری ضرورت کے حالات کے سوا کسی قیدی کو لوہے یا کسی میکانیکل آلہ میں جکڑا نہیں جائے گا۔ آندھرا پردیش پر یزن رولس کے تحت رول نمبر (۵۴۶) میں کہا گیا ہے کہ کسی قیدی کو بیڑی نہیں پہنائی جائے گی بجز ایسی صورت کہ جبکہ یہ قیدی نظم وضبط توڑنے والا تشدد پر آمادہ ہو یا خطرناک بن گیا ہو۔ قید خانے کے سپر نٹنڈنٹ کو اس بات کا اختیار ہوگا کہ کھلی جیل میں رکھے گئے تمام یا کسی قیدی کو بیڑیاں پہنانے کے ہدایت دے کہ ایسی جیلیں دیواروں کے حصار میں نہیں ہوتیں۔ دفعہ (۵۴۸) کے تحت کسی قیدی کو ہتھکڑی پہنائی جاسکتی ہے اگر قید خانے کے سپر نٹنڈنٹ کے رائے میں ایسا کرنا خود قیدی کی حفاظت یا کسی اور وجہ سے ضروری ہو۔ اسی رول کے تحت یہ بھی اجازت دی گئی ہے کہ تشدد پر آمادہ اور خطرناک خاتون قیدی کو بھی ہتھکڑی پہنائی جاسکتی ہے۔ اگر خاتون قیدی کے بارے میں یہ اندیشہ ہو کہ وہ خود کو زخمی کر لے گی تو ایسی صورت میں بھی اسکو ہتھکڑی پہنائی جاسکتی ہے لیکن تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ہتھکڑی کھولنا ضروری ہے تا کہ بازو اور ہاتھ کو آرام ملے۔ ان صورتوں کے علاوہ کسی اور صورت میں کسی خاتون قیدی کو ہتھکڑی نہیں پہنائی جاسکتی۔ رول (۵۴۹) کے تحت کسی خاتون کے علاوہ کسی بچہ قیدی، سیول قیدی یا ایسے قیدی کو بیڑیاں نہیں پہنائی جاسکتی جسکی عمر یا جسمانی کمزوری یا شدید بیماری کی بناء پر میڈیکل آفیسر نے یہ رائے دی ہو کہ اسکو بیڑیاں پہنانا مناسب نہیں ہے۔ رول (۵۵۰) میں بتایا گیا ہے کہ درج ذیل قیدیوں کو بیڑیاں نہیں پہنائی جائیں گی۔

الف) ایسا قیدی جسکی مدت قید چھ مہینے سے کم رہ گئی ہو۔

ب) ایسا قیدی جو اپنی قید کی معیاد کا تین چوتھائی حصہ کاٹ چکا ہو۔

ج) ایسا قیدی جو کسی تعزیری جرم میں ماخوذ ہو لیکن عدالت نے ابھی اسکو سزا نہ سنائی ہو۔

د) وہ قیدی جس کو سزائے موت سنائی گئی ہو۔

اگر جیل خانے کا سپر نٹنڈنٹ ان میں سے کسی قیدی کو بیڑیاں پہنانا ضروری سمجھے تو اسکو تحریر میں ان وجوہات کا ذکر کرنا پڑے گا جن کی بناء پر وہ انکو بیڑیاں پہنانا ضروری سمجھتا ہے۔

دی پر یزن ایکٹ کی دفعہ (۴۶) کی رو سے سول قیدی کو ہتھکڑیاں بیڑیاں پہنانے سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

مختلف زمروں کے قیدیوں کے حقوق

الف) سیول قیدی

دی پر یزن ایکٹ ۱۸۹۴ء کی دفعہ (۳۱) کے تحت ایک سیول قیدی کو چند شرائط کے تحت اپنی غذا اپنے کپڑے اپنا بستر اور دیگر ضروریات کی

اپنی چیزیں حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ دفعہ (۳۳) کے تحت کہا گیا ہے کہ اگر سیول قیدی اپنے طور پر یہ چیزیں حاصل نہ کر سکے تو قید خانے کا سپرنٹنڈنٹ اسکو کپڑے اور بستر فراہم کرے گا۔ دفعہ (۳۴) کے تحت ایک سیول قیدی سپرنٹنڈنٹ کی اجازت سے کام یا محنت کر سکتا ہے اور اس کام کی پوری اجرت پا سکتا ہے۔ دفعہ (۴۰) کے تحت سیول قیدی کو ملاقاتیوں سے ملنے کی اجازت دی جا سکے گی۔

آندھرا پردیش پریزنس رولس کے تحت کسی سیول قیدی کو اگر اسکی مرضی نہ ہو تو کام یا محنت کرنے پر نہیں لگایا جا سکتا۔ اور سیول قیدی کو سیول قید خانے میں یا قید خانے کے علٰحدہ حصے میں جو سول قیدیوں کیلئے مختص ہو رکھا جائے گا مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر سول قیدی کو ایک کمرہ یا ایک کوٹھری دی جائے۔ جو سول قیدی قرض کی نادہندگی کی وجہ سے قید میں بھیجا گیا ہو اسکو یہ حق ہوگا کہ اپنے خلاف عدالت کی ڈگری حاصل کرنے والے شخص کو کپڑے اور بستر فراہم کرنے کیلئے کہے۔ بہ صورت دیگر جیل خانے کا سپرنٹنڈنٹ جو کپڑے فراہم کرے گا وہ ایک سوتی جوڑے ایک چٹائی یا ایک سوتی کارپیٹ اور ایک چادر پر مشتمل ہوگا۔ سرما کے مہینوں میں ایک اونی بلانکیٹ یا ایک کمبل دی جائے گی (رولس ۷۰۴ تا ۷۰۷)

رول (۷۱۰) کے تحت ایک سیول قیدی جیل کے باہر سے صرف پکوان کا راشن منگا سکتا ہے۔ پکا ہوا کھانا نہیں منگا سکتا۔ رول (۷۱۷) میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرض کی نادہندگی کی بناء پر قید کی سزا پانے والے کو قید خانے میں اس وقت تک داخل نہیں کیا جائے گا جب تک کہ اسکی غذا کے ماہانہ اخراجات اسکے کھلانے پلانے کے انتظام کا خرچ اسکو لانے لیجانے کے اخراجات جمع نہ کروا دیئے جائیں۔ اور وقفہ وار ادائیگی کی صورت میں اگر وقت پر اس قیدی کے اخراجات کی ادائیگی نہ ہو تو جیسے ہی پچھلی ادائیگی کی معیاد پوری ہوگی اسکو رہا کر دیا جائے گا۔

ب) زیر سماعت (غیر سزا یافتہ) قیدی

اقوام متحدہ کے مرتبہ معیاری اقل ترین رولس میں رول (۸۴) میں کہا گیا ہے کہ ان قیدیوں کو جب تک کہ انکے خلاف عدالت کا فیصلہ نہیں ہوتا اور انھیں مجرم نہیں قرار دیا جاتا بے قصور تصور کیا جائے گا۔ اقوام متحدہ کے ان رولس میں رول ۸۴ تا رول ۹۳ میں انکے مختلف حقوق بیان کئے گئے ہیں اور ایسے حقوق ان قیدیوں کو ملک کے قانون اور ملک میں رائج رولس کے تحت حاصل ہیں۔

دی پریزن ایکٹ ۱۸۹۴ء کی دفعہ (۲۷) میں کہا گیا ہے کہ ان قیدیوں کو سزا یافتہ قیدیوں اور سیول قیدیوں سے الگ اور دور رکھا جائے گا۔ دفعہ (۳۱) کے تحت ان کو اپنی غذا، اپنے کپڑے، اپنا بستر اور دیگر ضرورتوں کی اپنی چیزیں حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی اجازت ہوگی۔ اگر یہ چیزیں وہ اپنے طور پر حاصل نہ کرنا چاہیں تو قید خانے کا سپرنٹنڈنٹ انکو کپڑے اور بستر فراہم کرے گا جس طرح کے ایسی صورت میں سیول قیدیوں کو فراہم کیا جاتا ہے۔ دفعہ (۴۰) کے تحت انھیں بھی ملاقاتیوں سے ملنے کی اجازت ہوگی۔

آندھرا پردیش پریزن رولس کے تحت غیر سزا یافتہ قیدیوں کو دو طبقوں میں تقسیم کیا جائے گا اسپشیل (خاص) اور آرڈیزی (عام)) اسپشل کلاس ان پر مشتمل ہوگی جو اپنے سماجی رتبے، تعلیم اور اپنی زندگی کی عادتوں کے لحاظ سے اعلٰی معیار کی زندگی گذارنے کے عادی ہوں۔ اس تعلق سے قید میں بھیجنے والی عدالت اپنی سفارش ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو لکھے گی اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی توثیق کے بعد کسی غیر سزا یافتہ قیدی کو اسپشیل کلاس کی سہولتیں ملیں گی۔ (رول ۷۳۰)

اگر زیر سماعت قیدی کی معافی یافتہ گواہ (Approver) بننے کی درخواست کو عدالت منظوری دیدے تو اسکو تمام اوقات دوسروں سے علٰحدہ رکھا جائے گا اور جس کیس میں ماخوذ ہے اس کیس سے متعلق دیگر قیدیوں سے ملنے، بات کرنے ربط قائم کرنے سے روک دیا جائے گا (رول ۷۳۱)۔

ایسے کسی قیدی کو کام یا محنت پر نہیں لگایا جائے گا۔ (رول نمبر ۷۳۲)

ایسے قیدی باہر سے پکوان کی اشیاء منگا سکیں گے۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کر سکتے ہوں تو قید خانے سے انکو کھانا فراہم کیا جائے گا۔ اسپشیل کلاس کے قیدی کو اے کلاس کے معیار کا اور آرڈنیری کلاس کے قیدی کو سی کلاس کے معیار کا کھانا دیا جائے گا۔ (رول ۷۳۳)

ان قیدیوں کو اپنے سر کے بال منڈھوانے یا چھوٹے کرانے یا چہرے کی ایسی شیو بنانے یا اپنے حلیہ کو اس طرح تبدیل کرنے کی اجازت نہ ہوگی جس سے انکی شناخت مشکل ہو جائے (رول ۷۳۵)

جہاں تک ممکن ہو سکے ایسے ہر قیدی کو ایک کوٹھڑی فراہم کی جائے گی۔ قید خانے کے اس حصے کا صحن کئی حصوں میں تقسیم کیا جائے گا جو اس سے پہلے جیل میں آ چکے ہیں ان کا حصہ الگ ہوگا۔ بلوغت کی عمر میں داخل ہونے والوں کا حصہ بالغوں سے الگ ہوگا۔ اسپشل کلاس کا حصہ آرڈنیری کلاس سے الگ ہوگا۔

ج) قید سادہ کی سزا پانے والے قیدی

دی پریزن ایکٹ ۱۸۹۴ء کی دفعہ (۳۶) میں بتایا گیا ہے کہ ایسے قیدی کو بھی قید خانے کا سپرنٹنڈنٹ کام یا محنت پر لگائے گا مگر اس کام یا محنت سے غفلت کی بناء پر اس کو سزا نہیں دی جائے گی البتہ اسکی غذا کی مقدار اور کیفیت میں تبدیلی کی جاسکے گا۔

دی آندھرا پردیش پریزن رولس کے تحت اگر سپرنٹنڈنٹ ایسے قیدی کو کسی کام یا محنت پر لگائے اور وہ قیدی اطمینان بخش انداز میں کام انجام دے تو اسکی بنیاد پر معیاد قید میں کمی کی جاسکے گی (رول ۷۵۴)

ایسے قیدی کو خود اپنے وارڈ کی صفائی کرنی ہوگی اپنے کپڑوں کو دھونا ہوگا اپنے کپڑوں اور بستر کو صاف ستھرا رکھنا ہوگا اور ہر روز اپنے بستر کو تہہ کرنے کے بعد اگر موسم اجازت دے تو دھوپ میں رکھنا ہوگا اور انہیں خود کا اور دوسرے قیدیوں کا کھانا پکانے پر لگایا جا سکے گا۔ البتہ دوسرں کے گھٹیا کام کرنے اور نیچے درجے کا کام کرنے پر انہیں مجبور نہیں کیا جائے گا (رول ۷۵۵)۔

ان کو ہر روز صبح ایک گھنٹے تک چہل قدمی یا ایکسرسائیز کرنی ہوگی اور میڈیکل آفیسر کے مشورے کی صورت میں شام میں ایکسرسائیز یا چہل قدمی کرنا ہوگا (رول ۷۵۶)۔

ان کو اپنے خود کے کپڑے پہننے کی اجازت ہوگی۔ اگر یہ کپڑے ناکافی ہوں تو قید خانوں کے کپڑوں سے اسکی تلافی کی جائے گی۔ اگر ایسا قیدی فوجی ہو تو کسی صورت فوجی یونیفارم پہننے کی اجازت نہیں ہوگی (رول ۷۵۷)۔

د) قید تنہائی کی سزا پانے والے قیدی:

دی پریزن ایکٹ کی دفعہ (۲۹) میں کہا گیا کہ ایسے قیدی کی کوٹھڑی میں رابطے کے وسائل فراہم کئے جائیں اور دن میں کم سے کم ایک مرتبہ میڈیکل آفیسر یا اسٹنٹ سرجن اس کا معائنہ کرے دی آندھرا پردیش پریزن رولس کے رول نمبر (۷۶۰) میں بتایا گیا ہے کہ کسی سال میں (۸۱) دن قید تنہائی سے بڑھ کر قید تنہائی کی سزا نہیں دی جاسکتی۔ رول (۷۶۳) میں کہا گیا ہے کہ کسی قیدی کو قید تنہائی میں اسی وقت رکھا جائے جبکہ میڈیکل آفیسر یہ تصدیق کرے کہ یہ قیدی قید تنہائی کو برداشت کرنے کے قابل ہے۔ رول (۷۶۶) کے تحت میڈیکل آفیسر کے مشورے پر صحت کی برقراری کی کے نقطہ نظر سے ایسے قیدی کو کھلی ہوا میں ایکسرسائیز کرنے کی اجازت ہوگی، رول (۷۶۷) میں کہا گیا ہے کہ ایسے قیدی کا بستر دن کے اوقات میں اس کی کوٹھڑی سے باہر نکال کر دھوپ میں رکھا جائے گا۔ اور رول (۷۶۸) کے تحت اس کوٹھڑی کو اچھی طرح صاف ستھرا رکھنا ضروری ہے۔ رول (۷۶۹) کے تحت سپرنٹنڈنٹ، جیلر، میڈیکل آفیسر اور اسٹنٹ سرجن کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے کہ وہ روزانہ ہر ایسے قیدی سے ملیں اور معائنہ کریں۔

ھ) عمر قید کی سزا پانے والے قیدی

رول (۷۷۱) کی رو سے ایسے قیدیوں کے لئے بڑے قید خانوں میں جنھیں سنٹرل پریزن قرار دیا گیا ہو علحدہ رکھنے کا انتظام کیا جائے گا۔ اور ان کو کسی کام یا محنت میں لگانے کے سلسلہ میں اس بات کو بھی پیش نظر رکھا جائے گا کہ یہ کئی ہنر حاصل کر سکیں۔ خاندان کے معاملات میں دلچسپی لینے کی ہمت افزائی کی جائے گی اور اس غرض کیلئے افراد خاندان سے ملاقات اور ان کو خط لکھنے اور ان کے خطوط وصول کرنے کے زیادہ مواقع فراہم کئے جائیں گے۔

و) موت کی سزا پانے والے قیدی:

دی آندھرا دیش پریزن رولس میں کہا گیا ہے کہ ایسے قیدی کو کالی کوٹھری (CondDemned Cell) میں رکھا جائے گا اور حکومت سے خصوصی منظوری حاصل کیئے بغیر انکو قید خانے کے دواخانے میں بھی منتقل نہیں کیا جائے گا۔ کسی کو کوٹھڑی تک جانے اور رابطہ پیدا کرنے کی اجازت نہیں،

دی جائے گی۔ یہ اجازت صرف سپرنٹنڈنٹ، جیلر، میڈیکل آفیسر اور جیل کے ان ملازمین کو حاصل ہوگی جنھیں اس قیدی کی دیکھ ریکھ کیلئے مقرر کیا گیا ہو۔ رات میں اس کوٹھری میں روشنی رہے گی اور ایک وارڈر کوٹھری پر نظر رکھے گا۔ اگر میڈیکل آفیسر ضروری قرار دے تو اس قیدی کو سخت نگرانی میں ہر دن کھلی ہوا میں ایکسرسائز کرنے کی اجازت دی جائے گی۔ ایسی سزا پانیوالی خاتون قیدی کو ہتھکڑی اور بیڑی نہیں پہنائی جائے گی۔ بجز اسکے کہ سپرنٹنڈنٹ کی رائے میں اس خاتون قیدی کے بارے میں خود کو شدید طور پر زخمی کر لینے کا اندیشہ ہو۔ سزائے موت کی تعمیل کے وقت قیدی کے مرد رشتہ داروں میں سے کسی ایک کو اور معزز حضرات میں سے زیادہ سے زیادہ (۱۲) اصحاب کو بلایا جاسکتا ہے۔ اس موقع پر حاضر رہنے کی کوئی درخواست کرنے تو سپرنٹنڈنٹ اس درخواست کو نامنظور کرسکتا ہے۔

اس قیدی کے تعلق سے قواعد کی ترتیب میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ موت کی سزا ٹل جائے۔ چنانچہ سزا کے خلاف اپیل کرنے کی تمام سہولتیں فراہم کرنے کی ذمہ داری سپرنٹنڈنٹ کی قرار دی گئی ہے اور اسی طرح تمام عدالتی چارہ کار کی تکمیل کے بعد بھی موت کی سزا برقرار رہے تو حکومت کو رحم کی درخواست روانہ کرنے کا کام سپرنٹنڈنٹ کی ذمہ داری بتائی گئی ہے۔ اور سزا کی تعمیل اسی وقت ہو سکے گی جبکہ تحریری طور پر حکومت کا فیصلہ سپرنٹنڈنٹ کو پہنچے۔ ٹیلیفون یا ٹیلیگراف سے اطلاع پر سزائے موت نہیں دی جاسکے گی۔

ز) خاتون قیدی:

دی پریزن ایکٹ ۱۸۹۴ء کے تحت خاتون قیدیوں کیلئے بالکل علحدہ انتظام کا ذکر آچکا ہے۔ اور یہ بات بھی آچکی ہے کہ خاتون قیدیوں کو ہتھکڑی یا بیڑی نہیں پہنائی جائے گی۔

دی آندھرا پردیش پریزن رولس کے تحت خاتون قیدیوں میں مزید تقسیم ہوگی۔ عادی مجرمین کو علحدہ کیا جائے گا۔ کم عمر اور بلوغت کی عمر میں داخل ہونے والیوں کو علحدہ کیا جائے گا اور اسی طرح عصمت فروشی کرنے والیوں اور فحاشی کیلئے عورتوں اور لڑکیوں کو فراہم کرنے والیوں کو دوسروں سے بالکل الگ کیا جائے گا۔ (رول ۸۱۷)

کسی خاتون قیدی کو کسی عذر کے تحت اپنے وارڈ یا کوٹھری کو چھوڑنے کی اجازت نہیں ہوگی اور انھیں اپنے حصے سے باہر نہیں نکالا جائے گا بجز اسکے کہ اس خاتون قیدی کو رہا کیا جارہا ہو یا حاضری کیلئے عدالت کو لیجایا جارہا ہو یا کسی خاص وجہ سے جبکہ یہ حکم سپرنٹنڈنٹ دے۔ جب بھی کسی خاتون قیدی کو زنانہ حصے سے باہر لے جایا جائے گا تو اسسٹنٹ میاٹرن (Asst Matron) یا خاتون وارڈر اسکی واپسی تک یا اسکے جیل چھوڑنے تک اسکے ساتھ رہے گی (رول ۸۱۸)۔

کسی بالغ مرد کو زنانہ وارڈ میں داخل ہونے کی اجازت نہ ہوگی۔ بجز اسکے کہ کوئی عائد کردہ ڈیوٹی کو انجام دینے کیلئے داخل ہونا پڑے۔ (رول ۸۱۹)

خاتون قیدی کو زنانہ حصے کی صفائی ستھرائی کے کام پر لگایا جاسکے گا۔ اور اس زنانہ حصے میں کسی صورت کوئی مرد صفائی کرنے والا داخل نہ ہوسکے گا۔ (رول ۸۲۴)

خاتون قیدی کی رہائی سے قبل ہی اسکے رشتہ داروں کو اطلاع نامہ بھیجا جائے گا تاکہ وہ رہائی کے وقت قید خانے پر حاضر رہیں۔ اگر رہائی کے وقت کوئی فرد خاندان یا دوست نہ آئے تو سپرنٹنڈنٹ خاتون وارڈر کی نگرانی میں اسکو اپنے گھر روانہ کرسکتا ہے۔ (رول ۸۲۶)

ایک خاتون قیدی کے ساتھ اس کا بچہ اگر کسی رشتہ دار کی نگرانی میں نہ دیا جاسکے تو (۵) پانچ سال کی عمر ہونے تک وہ اپنی ماں کے ساتھ رہ سکتا ہے۔ اسی طرح قید کے دوران پیدا ہونے والا بچہ پانچ سال کی عمر تک اپنی ماں کے ساتھ رہ سکتا ہے۔ (رول ۸۲۸)

شادی شدہ ہندو خاتون قیدی کو چوڑیاں پہننے پیشانی پر کم کم لگانے، گلے میں منگل سوتر پہننے اور ناک میں نتھ رکھنے کی اجازت ہوگی۔

ح) بلوغت کی عمر میں پہنچنے والے قیدی:

یہ زمرہ ان قیدیوں کیلئے ہے جن کی عمر (۱۶) سال سے زیادہ اور (۲۱) سال سے کم ہو۔ ان کے تعلق سے قید خانے کے حکام کی یہ ذمہ داری

قراردی گئی ہے کہ وہ ان کی اصلاح کرنے اور جرم کی طرف انکے رجحان کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں اور اس کے لئے وہ تمام طریقے اختیار کریں جنکی قانون کے تحت ان کو اجازت ہے۔

جنگی قیدیوں کے حقوق

جنگ اور لڑائی کے دوران پکڑے گئے دشمن کے لوگوں کے تعلق سے چاہے وہ سپاہی ہوں کہ غیر سپاہی ان کو گرفتار کرنے والی حکومت یا اسکی فوج کا رویہ اس ملک کے تمدن کے مطابق رہا ہے۔ اکثر صورتوں میں ان کو قتل کردیا جاتا تھا تاکہ یہ پھر کبھی مقابلے میں نہ آسکیں۔ یا پھر ان سے معاشی فائدہ اٹھانے کے خاطر ان کو غلام بنالیا جاتا اور جانوروں کی طرح ان سے کام لیا جاتا۔ اکثر صورتوں میں عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے گریز کیا جاتا۔ تاریخ میں ایسے واقعات بھی ہیں کہ جنگ عورت یا عورتوں کیلئے چھیڑی گئیں۔ شہر روم کے بانیوں نے (Sabine) کی عورتوں سے اپنی جنسی ہوس مٹانے کیلئے جنگ کی اور ان کو قیدی بنایا۔ (Troy) کی ہیلن کیلئے جنگ کی داستان یوروپ کے کلاسیکی ادب کا حصہ ہے۔ جنگی قیدیوں کے بارے میں اسلام نے دنیا کو ایک نئی راہ دکھائی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا غزوۂ بدر کے قیدیوں کے ساتھ سلوک انسانی تاریخ میں ایک ہم سنگ میل اور ایک نئے باب کا آغاز ہے۔ اسلام میں جنگی قیدیوں کو غلام ضرور بنایا گیا لیکن اسلام میں غلامی اس غلامی سے بالکل مختلف ہے جس کا رواج یوروپ اور امریکہ میں رہا ہے۔ اس پر بہت کچھ کہا جاسکتا اور لکھا جاسکتا ہے لیکن صرف اس بات پر اکتفا کرتا ہوں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا دور حکومت غلاموں کے خاندان سے شروع ہوا اور مصر میں غلاموں کی حکومت (ممالیک مصر) عالم عرب کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے جسمیں کہ ایک حکمران ملک الظاہر بے برس نے جو خود غلام تھا تاتاریوں کے لشکر جرار کو عین جالوت کے مقام پر ایسی شکست دی کہ اسکے بعد تاتاریوں کو کسی مسلم ملک پر حملہ کی جرأت نہ ہوسکی۔

جنگی قیدیوں کے بارے میں قانون کی تاریخ انیسویں صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے۔ ۱۷۹۳ء سے لے کر ۱۸۱۵ء تک نپولین کے فاتحانہ عزائم نے سارے یوروپ کو جنگ میں مبتلا کردیا۔ اسی دوران برطانیہ اور امریکہ کے درمیان جنگ چھڑی جبکہ امریکہ نے برطانیہ کے تسلط سے علحدہ ہونے کا اعلان کیا۔ ان جنگوں کی تباہ کاریوں نے یہ خیال پیدا کیا کہ جنگوں کو بھی کسی نہ کسی قانون اور قاعدے کا پابند کرنا چاہئے کہ بے ضرورت اور غیر ضروری طور پر انسانی ہلاکت اور تباہ کاری نہ ہو۔ اور جنگ کے نقصانات کم سے کم ہوں۔ اس تعلق سے ۱۸۵۶ء میں یوروپی ممالک نے پیرس اعلامیہ کو منظور کیا۔ اگست ۱۸۶۴ء میں جنیوا میں بطور خاص میدان جنگ میں زخمی ہونے والے سپاہیوں کے مسائل پر غور کیا گیا۔ ۱۸۹۹ء میں ہیگ میں کانفرنس منعقد ہوئی۔ ۱۹۰۴ء میں ایسے پانی کے جہازوں کو جو ہسپتال کے طور پر سمندر میں گشت کررہے ہوں نشانہ نہ بنانے پر اتفاق ہوا۔ ۱۹۰۷ء میں ہیگ میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔

۱۸۹۹ء میں جو امن کانفرنس ہیگ میں منعقد ہوئی اس میں ایک میثاق (The Hague Convention) منظور کیا گیا جو چار اہم دفعات اور تین اعلانات پر مشتمل تھا۔ ان دفعات اور اعلانات کا اہم مقصد یہ تھا کہ یوروپی اقوام کے درمیان نزاعات کے پُرامن تصفیہ ہو۔ بحری جنگ کو قواعد کا پابند بنایا جائے اور ہوا میں سے دھما کو اشیاء زمین پر گرانے یا بیلون کے ذریعہ دھما کو اشیاء کے ذریعہ کسی عمارت یا آبادی کو نشانہ بنانے پر پابندی لگائی جائے۔ اس کونشن میں جنگی قیدیوں سے متعلق کوئی خاص بات نہیں کی گئی تھی۔ اس سے پہلے ۱۸۶۴ء میں جنیوا کونشن میں اس پر اتفاق ہوا تھا کہ دشمن کے زخمی، بیمار سپاہیوں اور غیر سپاہیوں کا علاج کیا جائے گا۔ اور نگہداشت کی جائے گی۔ ہلاک ہونے والے دشمنوں کی نعشیں جمع کی جائیں گی اور دوران جنگ میڈیکل گاڑیوں پر حملہ نہیں کیا جائے گا اور میڈیکل آلات کو تباہ نہیں کیا جائے گا۔

۱۹۰۷ء میں ہیگ میں ایک اور کانفرنس منعقد ہوئی جس میں (۱۲) دفعات پر مشتمل دستاویز منظور کی گئی۔ اس دستاویز میں بھی کوئی قابل ذکر دفعہ جنگی قیدیوں کے بارے میں نہیں ہے۔ اس میں بحری جنگ کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور دفعات بحری جہازوں اور خصوصاً جہازوں کی حفاظت کے نقطہ نظر سے مرتب کی گئی ہیں۔

۱۹۲۸ء میں ایک اور کانفرنس جنیوا میں منعقد ہوئی جس میں جنگ میں دم گھٹا دینے والی گیاس اور بکٹریا کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کی ممانعت کی گئی۔ ۱۹۲۹ء میں جنگی قیدیوں کے بارے میں ایک میثاق مرتب کیا گیا۔ جو جنگی قیدیوں کے حقوق کے بارے میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں مزید ترمیم کے بعد جنیوا ہی میں ۱۹۴۹ء کو ایک اور میثاق مرتب کیا گیا جو جنگی قیدیوں کے بارے میں جنیوا کونشن کے نام

سے جانا جاتا ہے۔ یہ ایک طویل دستاویز ہے جو (۱۴۳) آرٹیکل پر مشتمل ہے۔ اس دستاویز کو اقوام متحدہ کے تقریباً تمام ہی ممالک نے تسلیم کرلیا ہے۔ اسکے باوجود حقیقت یہ ہے کہ اس دستاویز کے نکات پر عمل بہت کم ہوتا ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے اپنی سرزمین سے باہر کیوبا کے علاقے گوانتاناموبے میں جو کیمپ بنا رکھا ہے اور اس کیمپ میں افغانستان پر حملہ کے بعد یہاں مختلف افغانیوں پاکستانیوں برطانوی مسلمانوں اور دیگر کو قید رکھ کر ٹارچر کیا گیا اور انکے ساتھ ایسا طرز عمل اختیار کیا گیا جو جنیوا کونشن کے بالکل خلاف ہے اس کی بڑی دردناک داستانیں میڈیا میں آچکی ہیں۔ اور تہذیب و تمدن کے ہر اصول سے گری ہوئی صدر بش کی حکومت کے اس طرز عمل سے خود امریکی عوام میں اتنی ناراضگی پیدا ہوئی کہ نئے منتخبہ صدر مسٹر بارک اوباما کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ وہ صدارت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد فوری طور پر اس عقوبت خانے کو بند کردیں گے۔ نائن الیون کے واقعہ کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر نے یہ اعلان کیا تھا کہ دہشت گردوں نے دنیا کے سب سے زیادہ متمدن ملک کو نشانہ بنایا ہے لیکن وہ خود اور ان کی حکومت کتنی متمدن ہے اس کا اندازہ عراق میں امریکہ نے جو کچھ ابوغریب قید خانے میں کیا اس سے ہوتا ہے کہ ان سے زیادہ غیر متمدن اور وحشی آج کے دور میں کوئی اور نہیں۔ اس قید خانے کی انچارج خاتون جنرل اور اس قید خانے میں متعین خاتون امریکی سپاہی نے جو کچھ کیا اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا یہ نام نہاد متمدن ترین ملک اور اسکی فوج انسانی شرم وحیا سے بھی عاری ہے۔ جنیوا کونشن (۱۹۴۹ء) کے کچھ اہم خدوخال یہاں پیش کئیے جاتے ہیں۔

اس دستاویز کے آرٹیکل (۴) میں جنگی قیدی کی تعریف بیان کی گئی ہے جسمیں کئی زمرے ہیں اور یہ تعریف بڑی طویل ہے۔ آرٹیکل نمبر (۳) میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ تمام اشخاص جن کا تعلق فوج ہی سے کیوں نہ ہو لڑائی میں جنھوں نے عملی حصہ نہ لیا ہو یا جنھوں نے ہتھیار ڈال دیئے ہوں یا وہ جو زخموں یا بیماری کیوجہ سے لڑائی میں حصہ لینے کے قابل نہ ہوں ان کے ساتھ نسل، رنگ، مذہب، جنس وغیرہ کے امتیازات کو برتے بغیر بہر صورت انسانیت نوازی کا سلوک کیا جائے گا۔ اور اس غرض کیلئے درجہ ذیل امور کو اس دستاویز میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

الف)...... ایسے شخص کی شخصیت یا اس کی زندگی کے خلاف تشدد بطور خاص قتل، جسمانی اعضاء کی قطع و برید اور ٹارچر۔

ب)...... یرغمال بنانا

ج)...... اہانت آمیز اور گھٹیا رویے کے ذریعہ عزت نفس کو مجروح کرنا وغیرہ

زخمی اور بیمار جنگی قیدیوں کو جمع کر کے نگہداشت اور علاج کیلئے غیر جانبدار ادارے جیسے انٹرنیشنل ریڈ کراس کے حوالے کیا جائے گا۔

اس کونشن کے آرٹیکل (۱۴) میں کہا گیا ہے کہ جنگی قیدیوں کے ساتھ ہر وقت انسانیت نواز سلوک کیا جانا چاہئے ایسا سلوک قطعاً نہ کیا جائے جس سے کسی جنگی قیدی کی صحت کو خطرہ لاحق ہو۔ کسی جنگی قیدی کے اعضاء کو کاٹا یا بگاڑا نہیں جائے گا اور نہ اس پر کسی قسم کا میڈیکل یا سائنسی تجربہ کیا جائے گا۔

تشدد دھمکیوں اور اہانت آمیز حرکات سے جنگی قیدیوں کو بچایا جائے گا اور جنگی قیدیوں کے خلاف کوئی انتقامی کاروائی نہیں کی جائے گی۔ (آرٹیکل۔ ۱۳)

قید میں کوئی جسمانی ٹارچر نہیں کیا جائے گا اور ذہنی اذیت نہیں پہنچائی جائے گی۔ اور اگر کوئی جنگی قیدی پوچھ تاچھ کے دوران کوئی جواب دینے سے انکار کرے تو اس کو دھمکی دی جائے گی نہ اس کی اہانت کی جائے گی نہ اس کے ساتھ کوئی ناگوار سلوک کیا جائے گا۔ ایسے جنگی قیدیوں کو جو اپنی جسمانی اور ذہنی حالت کی وجہ سے اپنی شناخت وغیرہ بتانے کے قابل نہ ہوں ان کو میڈیکل سروس کے حوالے کیا جائے گا ان کی شناخت کو معلوم کرنے کیلئے دوسرے طریقے اختیار کئے جائیں گے۔ جنگی قیدیوں سے پوچھ تاچھ اور تفتیش اس زبان میں کی جائے گی جسکو وہ سمجھ سکتے ہوں۔ (آرٹیکل۔ ۱۷)

میدان جنگ سے جنگی قیدیوں کی منتقل انسانی رویے کے ساتھ عمل میں لائی جائے گی اور جس طرح اپنی فوج کو ایک مقام سے دوسرے مقام کو منتقل کیا جاتا ہے ویسا ہی عمل جنگی قیدیوں کے ساتھ روا رکھا جائے گا۔ اس عمل کے دوران جنگی قیدیوں کے کھانے اور پینے کیلئے پانی کا مناسب انتظام ہوگا اور ضروری کپڑے فراہم کرنے کے ساتھ ان کی طبی نگہداشت بھی ہوگی۔ (آرٹیکل۔ ۲۰)

جنگی قیدیوں کے کیمپ کے اوپر P.W. یا P.G. اس طرح لکھا جائے گا کہ اوپر سے بھی آسانی سے دکھائی دے۔ لیکن یہ حروف جنگی قیدیوں کے کیمپ کے سوا کہیں اور استعمال نہیں کیئے جائیں گے۔ جنگی قیدیوں کے کیمپ پر مخالف ملک یا کوئی اور ملک بم نہیں گرائے گا۔ اس دستاویز میں

آرٹیکل ۲۵ سے آرٹیکل ۲۸ تک جنگی قیدیوں کیلئے رہائش غذا اور لباس سے متعلق دفعات ہیں۔ دفعہ ۲۹ سے دفعہ ۳۲ ان کی صحت کی برقراری اور ان کی میڈیکل نگہداشت سے متعلق ہے۔ دفعہ ۳۴ سے دفعہ ۳۸ تک کی دفعات میں ان قیدیوں کے مذہبی عقائد میں عدم مداخلت اور انکو مذہبی عبادتوں کی اجازت اور عبادتوں کے سلسلہ میں مذہبی پیشوا کے تقرر کی بات کہی گئی ہے۔ دفعہ ۴۹ سے لے کر دفعہ ۵۷ تک جنگی قیدیوں سے کس نوعیت کا کام لیا جا سکتا ہے اس کا تذکرہ ہے اور اس بات کا بھی ذکر ہے کہ جنگی قیدی اپنی فوج میں جس رتبے کا حامل رہا ہے اس کو پیش نظر رکھا جائے۔ اس دستاویز کے آرٹیکل (۶۹) میں کہا گیا ہے کہ جنگی قیدیوں کو گرفتار کرنے کے ساتھ ہی یہ ملک کسی دوسرے ملک کے ذریعہ گرفتار شدہ قیدیوں کے ملک کو یہ اطلاع پہنچائے گا۔ آرٹیکل (۷۱) میں جنگی قیدی کو اپنا خط یا کارڈ روانہ کرنے اور وصول کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اس بارے میں تفصیل کئی دفعات میں بیان کی گئی ہے۔

جنیوا کنونشن کی دستاویز جنگی قیدیوں کے بارے میں اس بات پر زور دیتی ہے کہ جنگی قیدیوں سے انسانیت نوازی کا سلوک کیا جائے اور یہ دستاویز ان کو نقصان پہنچانے، ان کی اہانت کرنے اور ٹارچر کرنے سے چاہے یہ ٹارچر جسمانی ہو یا ذہنی منع کرتی ہے۔

ضمیر کے قیدی / سیاسی قیدی (PRISONER OF CONSCIENCE)

ضمیر کے قیدی کو عرف عام میں سیاسی قیدی کہا جاتا ہے۔ یہ اصلاح ایمینسٹی انٹرنیشنل کی ایجاد ہے اور اس کی تعریف کا دائرہ بہت وسیع تھا نسل، مذہب، رنگ، زبان، جنس وغیرہ کے اختلاف کی بنیاد پر کسی کی نقل وحرکت پر پابندی لگائی جانے یا اس کو گھر میں نظر بند یا قید خانے میں قید کر دیا جائے تو اس کو ضمیر کا قیدی قرار دیا جاتا تھا مگر اب یہ اصطلاح ان اشخاص کے لئے استعمال کی جاتی ہے جنھیں سیاسی یا مذہبی نظریہ اور خیالات کی وجہ سے نظر بند یا قید کیا جاتا ہے اس میں یہ شرط بھی ہے کہ اس شخص نے اپنے نظریہ یا خیال سے اتفاق کرنے والوں کو تشدد پر ابھارا نہ ہو۔ عام طور پر ایسے شخص کو سیاسی قیدی کہا جاتا ہے۔

ان قیدیوں کے تعلق سے عالمی، ملکی یا ریاستی (صوبائی) سطح پر کوئی قانون موجود نہیں ہے۔ عالمی ادارہ ایمینسٹی انٹرنیشنل ایسے قیدیوں کے بارے میں متعلقہ حکومتوں سے نمائندگی کرنے کے علاوہ عالمی رائے عامہ کو بنانے کی کوشش کرتی ہے۔

دنیا کے بعض لیڈر بھی سیاسی قیدی رہے ہیں۔ زندہ شخصیتوں میں نیلسن منڈیلا کا نام لیا جا سکتا ہے جنھیں نسلی امتیاز کی پالیسی کی مخالفت کی وجہ سے جنوبی افریقہ کی سفید فام حکومت نے ایک طویل عرصہ تک (۱۹۶۲ء-۹۹ء) قید میں رکھا۔ موجودہ شخصیتوں میں کیوبا کی عظیم شخصیت فیڈل کاسترو کا نام بھی آتا ہے۔ جنھیں ان کے کمیونسٹ نظریات کی وجہ سے اس وقت کی حکومت نے قید میں رکھا تھا۔

ہمارے ملک سے تعلق رکھنے والی مشہور عالمی شخصیت مہاتما گاندھی بھی نسل امتیاز کے خلاف خیالات کے اظہار کے لئے جنوبی افریقہ میں اور ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ کرنے کے لئے ہندوستان میں انگریزی حکومتوں کے حکم پر قید کئے گئے۔

سیاسی قیدیوں کی ایک قسم وہ ہے جنھیں ایسے قوانین کے تحت جن میں بغیر مقدمہ چلائے نظر بند یا قید کرنے کا اختیار حکومت کو دیا گیا ہو قید یا نظر بند کیا جاتا ہے ہمارے ملک میں بھی ایسے قوانین رائج رہے ہیں۔ احتیاطی نظر بندی کے قانون (PREVENTIVE DETENTION ACT) کے تحت کئی شہریوں کو ڈیفنس آف انڈیا رولس کے تحت بہت بڑی تعداد میں سیاسی لیڈر اور سماجی کارکن قید کئے گئے جن میں بڑا تناسب مسلمانوں کا تھا۔ ایمرجنسی کے دوران غیر کانگریس سیاسی قائدین کو جیلوں میں بند کیا گیا۔ ایمرجنسی میں بہت سے دستوری حقوق معطل ہو جاتے ہیں۔ عام حالات میں ایسے کسی قانون میں یہ گنجائش رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ ایسے قیدی کو اس کی قید کی وجوہات تحریری طور پر فراہم کی جائیں گیں۔ ان کے خلاف وہ اس کمیٹی سے نمائندگی کر سکتا ہے جو اس طرح کی قید اور نظر بندیوں پر نظر ثانی کے لئے تشکیل دی جاتی ہے اور اس کمیٹی میں عدلیہ کی نمائندگی بھی ہوتی ہے۔ اگر یہ کمیٹی یہ رائے دے کہ وجوہات 'قید و نظر بندی کے لئے کافی نہیں ہیں تو حکومت کو ایسے قیدی کو رہا کرنا پڑتا ہے

دیگر سیاسی قیدیوں کے لئے کوئی قانونی چارہ کار اس میں نہیں رہتا کہ عام طور پر ان کو کسی جرم میں ماخوذ بتا کر قید کیا جاتا ہے اور ان کی رہائی کا دارومدار اس فوجداری کیس کے فیصلہ پر ہوتا ہے جس میں کافی وقت لگتا اور دیر ہو سکتی ہے۔ ☆☆☆

قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کا عالمی معیار

جناب سالار محمد خان[1]

اس مضمون میں قیدیوں کے ساتھ برتاؤ سے متعلق عالمی برادری کے تسلیم شدہ معیارات پر عام فہم زبان میں ایک عمومی نظر ڈالی گئی ہے اور عمومیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی خاص حق یا اصول کو بیان کرنے والے دستاویزات اور معاہدات کا الگ سے حوالہ دینے سے گریز کیا گیا ہے۔

عالمی قانونی ضابطے کے مطابق قیدیوں کے ساتھ حسن معاملہ کا بنیادی ہدف یہ ہے کہ وہ معاشرے میں از سر نو شریفانہ زندگی گزارنے کے اہل ہو جائیں، چنانچہ حراست یا قید و بند کی کارروائی کا اس طرح منظم و معقول ہونا لازمی ہے جس سے کہ جتنا جلد ہو سکے قیدیوں کو معاشرے میں معمول کی زندگی گزارنے کے لئے بلا خوف و تردد آزاد کیا جا سکے۔

بہت سے ملکوں میں قیدیوں کا از دحام ایک گمبھیر مسئلہ ہے، ریاستیں قیدیوں کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے میں خود کو بے بس محسوس کرتی ہیں، مطلب یہ ہے کہ قیدیوں کے بنیادی حقوق انسانی کے تحفظ کی نہ تو ضمانت دی جاتی ہے اور نہ ہی معاشرے میں انھیں ضم کر کے ان کو ایک ذمہ دار شہری بنانے کا مقصد پوری طرح حاصل ہو پاتا ہے۔ زیر سماعت قیدیوں کا مسئلہ بھی کافی اہمیت کا حامل ہے، قانون کی نگاہ میں وہ معصوم ہوتے ہیں۔ بہت سے ملکوں میں قیدیوں کی اکثریت اسی زمرے سے تعلق رکھتی ہے، بسا اوقات ان کا تناسب ۷۰-۸۰ فیصد تک پہنچ جاتا ہے۔

اسی بنا پر یہ سوچ پروان چڑھ رہی ہے کہ قید خانہ ایک مہنگا نظام ہے اور آخری تدبیر کے طور پر ہی اسے استعمال کرنا چاہئے جبکہ عدالت کے سامنے یہ واضح ہو جائے کہ غیر حراستی سزا مناسب نہیں ہوگی۔

دسمبر ۱۹۹۰ء میں جنرل اسمبلی نے اقوام متحدہ کے معیاری ادنیٰ قوانین برائے غیر حراستی اقدامات (ٹوکیو قوانین) کو منظوری دے دی جسے اس سلسلے میں ایک اہم پیش رفت تصور کیا جا رہا ہے، ان قوانین سے اقتصادی کارروائی، خدمت خلق، معافی، سزا ملتوی کرنے اور کام وغیرہ کے مقصد سے عارضی یا مشروط رہائی وغیرہ کی صورت میں رہنمائی حاصل ہوتی ہے، غیر حراستی اقدامات کو اپنانے کی اصل وجہ انسانی حقوق، مجرم کی باز آبادکاری، معاشرے کا تحفظ اور جرم کے شکار افراد کے مفادات ہیں۔

قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے عالمی رہنما اصول عموماً معاہدوں کی شکل میں موجود ہیں، خالص قانون کی زبان میں ایسے معاہدے جن کی توثیق یا منظوری حکومتوں نے دے دی ہو، نیز عالمی روایتی قوانین کی حیثیت بھی لازمی آئین کی ہوتی ہے، اقوام متحدہ کا دستور العمل (Charter) قانوناً ایک لازمی معاہدہ ہے جس کے فریق تمام رکن ممالک ہیں۔

دیگر کچھ اہم معاہدے حسب ذیل ہیں:

۱- عالمی معاہدہ برائے اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق۔
۲- عالمی معاہدہ برائے شہری اور سیاسی حقوق۔
۳- معاہدہ برائے حقوق اطفال۔
۴- ٹارچر اور دیگر بے رحم، غیر انسانی یا ذلت آمیز سلوک و سزا کے خلاف معاہدہ۔
۵- نسلی امتیاز و تفریق کی تمام قسموں کے خاتمے کے لئے عالمی معاہدہ۔

---

[1] ایڈوکیٹ ہائی کورٹ دہلی۔

۶- خواتین کے خلاف امتیاز وتفریق کی تمام شکلوں کے خاتمے کے لئے معاہدہ۔

۷-نسل کشی کے جرائم کا ارتکاب کرنے والے افراد واقوام کو سزا دلوانے اور اس کی روک تھام کے لئے کیا گیا معاہدہ۔

اس کے علاوہ ایک زمانے تک اگر ریاستیں احساس ذمہ داری کے ساتھ کسی مخصوص طریقہ کار کو اپناتی ہیں تو اسے بھی عالمی آئین کے ایک اصول کے طور پر تسلیم کرلیا جاتا ہے اور اس پر عمل آوری حکومتوں کے لئے لازم بن جاتی ہے خواہ اسے کسی مخصوص معاہدے میں لکھا گیا ہو یا نہ لکھا گیا ہو، اسے ہی روایتی عالمی قانون کہتے ہیں۔

دیگر بہت سے قانونی دستاویزات ایسے بھی ہیں جو خصوصاً ان ملازمین کے فرائض وواجبات کی نشاندہی کرتے ہیں جن کو آزادی سے محروم کر دیئے گئے لوگوں پر ذمہ دار بنایا گیا ہے، ان میں قانون نافذ کرنے والے افسروں کے لئے ضابطۂ اخلاق (۱۹۷۹)، ڈاکٹروں اور طب سے جڑے دیگر افراد بالخصوص فزیشین کی ذمہ داریوں سے متعلق اصول وقواعد، ٹارچر اور دیگر بے رحم، غیر انسانی یا ذلت آمیز سلوک وسزا سے قیدیوں اور نظر بند افراد کی حفاظت (۱۹۸۲) طاقت وہتھیار کے استعمال کے لئے بنیادی اصول وضوابط (۱۹۹۰)، ان رہنما اصولوں پر اقوام متحدہ کے توسط سے عالمی برادری کا اتفاق ہو چکا ہے۔

علاقائی حقوق انسانی کے بہت سے دستاویزوں کو ان عالمی معیاروں کے ضمیمے کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ یورپ میں ان کی مثالیں یہ ہیں؛ حقوق انسانی اور بنیادی آزادی کے تحفظ کی خاطر کیا گیا معاہدہ (۱۹۵۳)، ٹارچر اور غیر انسانی یا ذلت آمیز سلوک وسزا کی روک تھام کے لئے یورپی معاہدہ (۱۹۸۹)، یورپین آئین قید خانہ (۱۹۸۷)، امریکن معاہدہ برائے حقوق انسانی پر عمل درآمد ۱۹۹۸ میں شروع ہوا جبکہ افریقی دستور العمل برائے انسانی حقوق پر عمل کا آغاز ۱۹۸۶ میں ہوا، کسی بھی علاقے کی عدلیہ کو ایک مفید مرجع کی حیثیت حاصل ہے، جس کے ذریعہ یہ پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ الگ الگ ریاستیں عالمی معیاروں کو کس حد تک نافذ کرتی ہیں، امریکہ میں بین امریکی عدالت برائے انسانی حقوق اس کردار کو ادا کرتی ہے جبکہ یورپ میں اس طرح کی ضرورتیں یورپین عدالت برائے انسانی حقوق پورا کرتی ہے۔

ایذا رسانی مخالف معاہدہ کے تحت اقوام متحدہ ایک اختیاری پروٹوکول کو منظوری دینے کی راہ پر گامزن ہے، اس سے ماہرین کی ایک جماعت کے ذریعہ مقامات حراست کے مسلسل معائنہ کا ایک نظام قائم ہو سکے گا، اس کے ساتھ ساتھ جانچ پڑتال کرنے والی آزاد وملکی جماعتوں کی رہنمائی میں ان جگہوں کے اطمینان بخش ومتواتر جائزے کا بھی نظم ہو سکے گا۔

حکومتی نظام میں قید خانوں کا مقام

مجرموں کو قید کرنا عدالت کی تعزیری کارروائی کا ایک حصہ ہے، عالمی قانون میں مسلمہ اصول ہے کہ قیدیوں کو شہری اقتدار کی طرف سے متعین کردہ ججوں کے فیصلے پر جیل بھیجا جانا چاہئے، یہ بھی لازم ہے کہ قید خانے کا نظام شہری حکومت کے کنٹرول میں ہو، فوجوں کا اس پر کوئی تسلط نہ ہو۔

مسلح افواج کے کسی رکن کو اس کی ملازمت کے دوران قید خانے کی انتظامیہ کا سربراہ بنائے جانے کی صورت میں حکومت پر اس امر کو یقینی بنانا واجب ہے کہ وہ شخص ایک عام شہری کی حیثیت سے نہ کہ فوج کے ایک رکن کے طور پر اپنے فرائض انجام دے گا۔

مزید برآں قید خانے کی انتظامیہ اور پولس میں واضح دوری ہونی چاہئے۔ پولس پر عموماً جرائم کی چھان بین اور مجرموں کو پکڑنے کی ذمہ دار ہوتی ہے، جب کسی شخص کو نظر بند یا قید کرلیا جائے تو جتنا جلد ہو سکے اسے عدالت کے عہدیداروں کے سامنے پیش کیا جانا چاہئے، پھر اسے قید خانے میں ڈال کر یا نظر بند رکھ کر مزید تفتیش کی جائے۔

کسی انسان کو آزادی جیسی عظیم نعمت سے محروم رکھنا ہی ایک سخت سزا ہے، قید فی نفسہ بہت سے حقوق سے بے انتہا محرومی کا نام ہے، چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ واضح اور متعین حالات ہی میں صرف عدالت کے بااختیار افراد کو قید وبند کی سزا دینے کا مجاز ہونا چاہئے جبکہ دوسرا کوئی معقول متبادل نہ ہو۔

قیدی انسان ہی تو ہیں! انکی عزت نفس اور آدمیت کو ملحوظ رکھا جانا چاہئے

جمہوری معاشرے میں قانون سماج کے بنیادی اقدار و بہتر روایات کو تحفظ فراہم کرتا ہے اور استحکام بخشتا ہے۔ ان میں سب سے اہم انسانوں کی فطری عزت نفس کا احترام ہے چاہے ان کا معاشرتی وانفرادی رتبہ کچھ بھی ہو۔

انسانیت کے اس احترام کی ایک بڑی آزمائش معاشرے کے ان معیارات میں پنہاں ہے جن کو وہ ایسے لوگوں کے لئے جنہوں نے تعزیری قانون کی خلاف ورزی کی ہے یا جن پر قانون شکنی کا الزام لگایا گیا ہے اختیار کرتے ہیں۔

تمام انسانوں کو قابل احترام سمجھنے کے اس اصول کو چاہے ان کا جرم بہت ہی سنگین کیوں نہ ہو مشہور و معروف سابق قیدی اور جنوبی افریقہ کے سابق صدر نیلسن منڈیلا نے بڑے ہی اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے:

''لوگ کہتے ہیں کہ کسی قوم کے قید خانے میں زندگی گزارے بغیر کوئی بھی انسان اس قوم کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا، کسی بھی قوم کی اخلاقیات کا اندازہ اس بات سے نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ اپنے ممتاز ترین شہریوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتی ہے بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ معاشرے کے ادنی سے ادنی طبقہ کے ساتھ اس کا طرز عمل کیسا ہے؟''

عالمی معیار کے مطابق جن لوگوں کو قید یا نظر بند کیا جاتا ہے، ایسا نہیں کہ وہ انسان باقی نہیں رہتے خواہ ان کا جرم بہت ہی سنگین کیوں نہ ہو جس کا ان پر الزام لگایا گیا ہے یا جس کا انکو مرتکب پایا گیا ہے، نظر بند یا مقید اشخاص کو بطور انسان ان کے تمام حقوق حاصل رہتے ہیں، سوائے ان حقوق کے جن کو انہوں نے آزادی سے محروم ہونے کے مخصوص نتیجے کی صورت میں کھودیا ہے۔ ان کے ساتھ وحشیانہ برتاؤ صرف اس لئے نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے کوئی جرم کیا ہے یا ان پر مجرم ہونے کا الزام لگایا گیا ہے، قیدیوں کے ساتھ برا سلوک ہمیشہ ہی قانوناً ممنوع رہا ہے۔

لہذا ظاہر ہے کہ تعذیب وتشدد اور دانستہ طور پر بے رحم غیر انسانی یا ذلت آمیز رویہ پر بندش ہونی چاہئے۔ اس ممانعت کا صرف یہی مطلب نہیں کہ براہ راست جسمانی و ذہنی ظلم وستم نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس میں ہر وہ چیز شامل ہے جس کا سرا کسی نہ کسی صورت میں قیدیوں کے حقوق سے ملتا ہے۔ تعذیب وایذا رسانی کی ممانعت ان جگہوں کے لئے کافی اہم ہے جہاں تفتیش وتحقیق کی خاطر ملزموں کو رکھا جاتا ہے کیونکہ فوجداری مقدمات کو نمٹانے کی خاطر معلومات حاصل کرنے کے مقصد سے ان کو ٹارچر کا نشانہ بنایا جاسکتا ہے، چونکہ قیدیوں کو بند رکھا جاتا ہے اور عوام کی نگاہوں سے وہ دور رہتے ہیں، ان کے حقوق کی پامالی کا امکان یقیناً بہت بڑھ جاتا ہے۔

قید خانہ میں داخل کئے جانے کی کاروائی

عالمی قانون کا ماننا ہے کہ حق حیات، برے برتاؤ اور ٹارچر سے نجات کے لیے تحفظ کے ایک مخصوص متعین فریم ورک کا ہونا ضروری ہے۔ قید خانے یا حراست کے دیگر مقامات پر کسی کو پہلی بار لانے کے وقت جیل کے ملازمین کی ذمہ داریوں اور قید کئے جانے والے افراد کے حقوق کو دنیا کے بہت سے قانونی دستاویزوں میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے تاکہ غیر عدالتی قتل، خودکشی، وحشیانہ برتاؤ اور ٹارچر وغیرہ کو روکا جاسکے، وہ زیر حراست، قبل سماعت اور سزا کے منتظر ہوں یا یہ کہ ان کو سزا مل چکی ہو۔ قیدیوں کی مخصوص جماعتوں مثلاً وہ افراد جن کا جرم اب تک ثابت نہ ہوسکا ہو، کمسنوں، نوجوانوں اور خواتین کے لئے بہت سے اضافی اصول وضوابط ہیں۔

قانون کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ تمام قیدی اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ انہیں سرکار کی طرف سے قید و بند کے لیے منظور شدہ مقامات پر ہی رکھا جائے۔ نظر بند افراد اور قیدی تشدد کا شکار ہوجاتے ہیں خصوصاً اس وقت جب وہ پہلی بار قید خانے میں یا مقام حراست پر آتے ہیں۔ قیدیوں کی عزت و وقار کا خیال رکھتے ہوئے ملازمین قید خانے میں داخلہ کی کارروائی کو کس طرح انجام دیں، اس تعلق سے بہت سے ملکوں نے شاندار روایتیں قائم کی ہیں جو حسب ذیل ہیں:

۱- قید خانے میں لائے جانے والے ہر فرد کی حراست کے متعلق درست حکم نامے کی جانچ کرنا۔

۲- مقام حراست اور ممکن ہو تو مرکزی مقام دضونوں پر تمام نظر بندوں کا ایک تازہ ترین رجسٹر رکھنا جس میں قیدیوں کی آمد کی تاریخ، وقت اور ان

کے ذمہ داروں کی پوری تفصیلات ہو اور جہاں تک عدالتی شخصیتوں، دیگر بااختیار عہدیداروں اور حصول اطلاعات میں واقعی دلچسپی رکھنے والوں کی رسائی ہو۔

۳- قیدیوں کی شناخت کے لئے پوری تفصیلات رکھنا تاکہ یقین کے ساتھ بتایا جاسکے کہ ان کی حراست قانون کے دائرے میں ہے۔ یہ حقوق انسانی کی پامالی مثلاً غائب ہو جانا، ٹارچر، وحشیانہ برتاؤ اور غیر عدالتی قتل سے بچاؤ کے لئے بھی ضروری ہے۔

۴- رجسٹر مجلد ہو، اندراجات کی نمبرنگ کی جائے یعنی ہر وہ طریقہ اپنایا جائے جس سے کہ اس میں مذکور کسی ڈاٹا کو ختم نہ کیا جاسکے یا غیر متعلق ڈاٹا کا اس میں اندراج نہ ہو سکے۔

۵- جب کسی قیدی کا جرم ثابت نہ ہوا ہو، ایسی صورت میں حراست کے لئے لکھا ہوا قانونی منظوری ضروری ہے جس میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہو کہ وہ آدمی کس دن عدالت کے سامنے پیش ہوگا۔

۶- جتنا جلد ہو سکے تمام قیدیوں کو یہ موقع فراہم کرنا کہ وہ اپنے قانونی نمائندوں اور اہل خانہ کو اپنا اتہ پتہ بتا سکیں۔

۷- غیر ملکی قیدیوں خصوصاً جب انہیں ساعت سے قبل حراست میں لیا گیا ہو، ان کو ہر وہ سہولتیں فراہم کیا جانا چاہئے جس سے کہ وہ اپنے ملک کے نمائندوں سے رابطہ قائم کر سکیں اور مل سکیں۔ پناہ گزین قیدیوں کو بین الحکومتی اداروں کے بااختیار افراد سے ملنے اور رابطہ قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔

۸- قید خانے میں آنے کے فوراً بعد ماہر ڈاکٹر سے قیدیوں کا چیک اپ۔

۹- اس امر کا انتظام کرنا کہ تمام قیدی قید خانے کے اصول وضوابط سے واقف ہو جائیں اور اگر ممکن ہو سکے تو ایک ایک کر کے سب کو دستور العمل کا ایک نسخہ دے دیا جائے۔

۱۰- جو قیدی علاقائی زبان نہیں بول سکتے، جو ان پڑھ یا معذور ہیں ان کی آگاہی کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈھنا چاہئے۔

۱۱- قیدیوں کو ان کے حقوق کے متعلق معلومات فراہم کرنا تاکہ وہ اپنے حقوق کا دعویٰ کر سکیں اور ظلم وجبر کی صورت میں شکایت کر سکیں۔

ضروریات زندگی

حکومت کے لیے ضروری ہے کہ وہ قیدیوں کے انسانی وقار کا لحاظ رکھے، اپنے واجبات کی ادائیگی کے لئے حکومت کو بہت سی مادی سہولیات فراہم کرنا چاہئے۔ ان مادی ضرورتوں میں مناسب رہائش، حفظان صحت کے اصول کے مطابق ماحول کا صحت بخش ہونا، لباس، بستر، غذا، مشروبات اور ورزش شامل ہے۔ عالمی اصول وضوابط کی ہدایات کے مطابق جیل بھیجے جانے والے افراد پر ایک ہی سزا نافذ کی جاتی ہے اور وہ ہے آزادی سے محرومی، قیدیوں کو قید خانہ کے ملازمین اور دوسرے قیدیوں کی طرف سے بھی جسمانی وجذباتی ایذا رسانی، طبعی حالات یا بے توجہی کے سبب سخت بیماری یا موت سے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔

عالمی قانون زندگی کے لئے باوقار اور انسانی حالات پیدا کرنے سے انحراف کی اجازت اس بنیاد پر نہیں دیتا کہ اس ملک کی عوام کا معیار زندگی کافی گرا ہوا ہے۔ قیدیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے میں ناکامی کی صورت میں کسی حکومت کو ایسے بہانے بنانے کی ہرگز اجازت نہیں دی جاسکتی۔

اس کا سبب واضح ہے کہ جس طرح ریاست کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی کو اس کی آزادی سے محروم کر سکتی ہے وجہ جو بھی ہو، اسی طرح اس پر الزام ہے کہ وہ اس انسان کے ساتھ حسن سلوک کو یقینی بنائے۔

ریاست کی ایک بہت ہی اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ تمام قیدیوں کو معقول غذا اور صاف پانی مہیا کرائے تاکہ وہ بھوک اور قلت خوراک سے پیدا ہونے والی بیماریوں کا شکار نہ ہوں۔

ہر قیدی کو کم از کم کتنی زمین فراہم کی جائے اس سلسلے میں عالمی قانونی دستاویزات خاموش ہیں۔ حالیہ برسوں میں ٹارچر، غیر انسانی اور ذلت

آمیز برتاؤ یا سزا کی روک تھام کے لئے یورپین کمیٹی کی کونسل اس کو انجام دینے کے لئے کمربستہ ہے۔

سبھی قیدیوں کی رہائش کے لئے جگہ متعین کرتے وقت اس بات کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ چوبیس گھنٹے میں کتنا وقت وہ اس میں گذارے گا۔ چھوٹی سی جگہ کم نقصان دہ ہے، اگر اسے صرف سونے کے لئے استعمال کیا جائے اور دن میں قیدی باہر کھلی فضا میں دوسرے کاموں میں مصروف ہو۔

قیدیوں کا ازدحام ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، بہت سے ملکوں میں ازدحام کی حالت یہ ہے کہ قیدیوں کو جگہ یا بستر شیئر کرکے باری باری سونا پڑتا ہے، یہ بندوبست قابل قبول نہیں ہوسکتا، تمام قیدیوں کے لئے صاف ستھرا بستر اور سونے کی جگہ الگ ہونا چاہئے۔

ازدحام کا قیدیوں کی صحت پر بھی کافی برا اثر پڑتا ہے، مثلاً خطرناک متعدی بیماری جیسے ٹی بی وغیرہ میں مبتلا افراد ایسی تنگ تاریک جگہوں پر ہوسکتے ہیں جہاں ہوا اور روشنی کا انتظام مناسب نہ ہو جس کے سبب ان کے ساتھی قیدیوں کو بیماری لگنے کا شدید خطرہ ہوسکتا ہے۔

عالمی معیار کے مطابق ریاستوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ قیدیوں کی صحت وتندرستی اور موسم کا خیال کرتے ہوئے گرم وسرد اور صاف ستھرا کپڑا مہیا کرائے اور ایسی پوشاک فراہم کرنے سے پرہیز کرے جس سے ان کی بے عزتی ورسوائی ہوتی ہو۔ صفائی ستھرائی کے سارے وسائل قیدیوں کو مہیا ہونے چاہئیں۔

بہت سے ملکوں میں قیدیوں کو قید خانے کی طرف سے دیا گیا یونیفارم پہننا ہوتا ہے، قید خانے کی طرف سے اس یونیفارم کی فراہمی کو سیکورٹی اور مساوات کی بنیادوں پر جائز ٹھہرایا جاتا ہے، تاہم یہ مسلمہ اصول ہے کہ اس یونیفارم کو تعزیری نظام کا ایک جز نہیں ہونا چاہئے اور نہ ہی قیدیوں کو ذلیل ورسوا کرنے کے لئے اسے اپنانا چاہئے۔

پابندی کے ساتھ غسل کرنے کی ساری سہولتوں کا مہیا ہونا بھی ضروری ہے، بندوبست ایسا نہ ہو کہ اس سے قیدیوں کی ذلت ورسوائی ہوتی ہو مثلاً سب کے سامنے اسے غسل کرنے پر مجبور کرنا۔ صفائی ستھرائی اور قضائے حاجت کے انتظامات ایسے ہوں جن سے ان قیدیوں کی عزت وقار پر کوئی حرف نہ آئے۔

خواتین قیدیوں کے تعلق سے ان کی مخصوص ضرورتوں اور نسائی شرم وحیا کو سامنے رکھ کر صفائی ستھرائی کا بندوبست ہونا چاہئے۔

قیدیوں کو روزانہ کھلی ہوا میں رہنے کے لئے مناسب وقت، چہل قدمی اور ورزش کرنے کا موقع ملنا چاہئے، ورزش کرنے کا حق ہر قسم کے قیدی کو حاصل ہونا چاہئے۔

مذہب

عالمی معیار آزادی مذہب کے حق کو تسلیم کرتا ہے، اس کے تمام اہل مذاہب کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت ہونی چاہئے، عالمی قانون کا اصرار ہے کہ تمام مذہبی نمائندوں کو قیدیوں کی مذہبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے قید خانے میں آنے کی اجازت ملنی چاہئے، یہ واضح ہے کہ آزادی سے محرومی کا یہ مطلب نہیں کہ قیدیوں کو اپنے مذہبی امور کی انجام دہی سے روکا جائے۔ یہ منظور کیا گیا ہے کہ قید خانوں کے عہدہ داروں کے لیے اس امر کو یقینی بنانا ضروری ہے کہ قیدیوں کو عبادت کرنے، مذہبی کتابوں کو پڑھنے اور اپنے مذہب کے مطابق کپڑا پہننے کا موقع ملے، ان کو مذہبی اجتماع کرنے اور مذہبی نمائندوں سے اجتماعی وانفرادی مقصد کے لیے ملنے کی اجازت ہونی چاہئے۔

عالمی معیار کے مطابق یہ مذہبی سہولتیں دنیا کے مشہور ومعروف مذاہب کے ماننے والے کے لیے ہی نہیں بلکہ سبھی چھوٹے بڑے مذاہب کے ماننے والے کے لئے ہیں، قید خانہ میں کسی مخصوص مذہب کی طرفداری نہیں ہونی چاہئے اور نہ ہی مذہبی امور کی انجام دہی کے لئے کسی قیدی کو مجبور کیا جانا چاہئے۔

قیدی اور طبی سہولیات

قیدیوں کو جسمانی وذہنی دونوں طرح کی صحت وتندرستی کا بنیادی حق حاصل ہے، وہ کم ازکم ان معیاری طبی سہولیات کے حقدار ہیں جو عوام الناس کو مہیا کرائی گئی ہیں، ان تمام بنیادی انسانی حقوق کے ساتھ ساتھ قیدی اپنی حالت وحیثیت کی بنا پر اضافی تحفظات کے مستحق ہوتے ہیں، جب ریاست لوگوں کو ان کی آزادی سے محروم کرتی ہے، ایسی صورت میں انفرادی طور پر ضروری علاج ومعالجہ اور باوقار انسانی حراست کے حالات پیدا

کر کے ان کی صحت وتندرسی کی دیکھ بھال اس پر لازم ہو جاتی ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ قیدی جس حالت میں قید خانہ آئے تھے ان کی حالت اس سے بدتر نہیں ہونی چاہئے، ریاست کی یہ پوری ذمہ داری بنتی ہے کہ جن لوگوں کی آزادی سلب کرنے کا اسے اختیار حاصل ہے ان کی صحت کی حفاظت کرے اور صحت خراب ہو جانے کی صورت میں اسے بحال کرے۔

جو قیدی منشیات کے عادی، ذہنی بیماری یا پہلے سے موجود بیماریوں کے شکار ہیں وہ خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔

قیام گاہ کے طبعی حالات، غذا اور حفظان صحت کے اصولوں کی پابندی اور صفائی ستھرائی کے انتظامات ایسے ہونے چاہئیں کہ بیماری نہ پھیل سکے اور بیماروں کی صحت یابی میں معاون کردار ادا کر سکے۔

بہت سے ملکوں میں قیدیوں کی ایک بڑی تعداد ٹی بی، ہیپی ٹائٹس بی اور ایچ آئی وی ایڈز جیسی متعدی امراض میں مبتلا ہیں، قید خانہ کی انتظامیہ کا فرض منصبی ہے کہ وہ ایسی بیماریوں کو پھیلنے نہ دیں۔

کچھ عدالتی نظاموں میں طویل المیعاد یا غیر متعینہ مدت کی سزائیں قیدیوں میں عمر سے متعلق بہت سے امراض میں اضافہ کا سبب بن رہی ہیں، ریاست پر واجب ہے کہ وہ ایسے قیدیوں کو مناسب طبی سہولیات فراہم کرائے، بہت سے ممالک عوام الناس کو اعلی معیار کی طبی سہولیات فراہم کرنے سے قاصر ہوتے ہیں، ان حالات میں بھی قیدی حتی الامکان بہتر سے بہتر طبی سہولیات کے مستحق قرار دئے گئے ہیں۔

قیدیوں کا انفرادی علاج ومعالجہ

ملک کے عام طبی روایات کے مطابق ہی قیدیوں سے ان کی صحت کے بارے میں پوچھ تاچھ ہونی چاہئے، طبی معاملات میں قیدی پرائیویسی کا حق رکھتے ہیں، ڈاکٹروں کے ساتھ ان کی ملاقات برائے علاج کا بھرو سے مند ہونا ضروری ہے۔

حق اعتماد کا یہ بھی تقاضا ہے کہ قیدی ڈاکٹروں تک بلا واسطہ پہنچ سکیں۔ قیدیوں کا میڈیکل ریکارڈ میڈیکل آفیسر کے کنٹرول میں ہونا چاہئے اور قیدیوں کی پیشگی تحریری تصدیق کے بغیر ان کے ریکارڈ کو ظاہر نہیں کرنا چاہئے، تشخیص امراض اور ڈاکٹروں کے ذریعہ چیک اپ کے نتیجہ میں قیدیوں کا علاج ومعالجہ قیدیوں کے مفاد میں ہونا چاہیے، اس سلسلے میں لیا جانے والا فیصلہ قید خانہ کی انتظامیہ کی سہولت اور اضافی خرچ پر مبنی نہیں ہونا چاہئے، عالمی معیار کے مطابق پاگل قیدیوں کو عمومی قید خانے میں نہیں ڈالنا چاہئے بلکہ جتنی جلد ہو سکے انہیں ذہنی ونفسیاتی اداروں میں منتقل کر دینا چاہئے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ دوسری نفسیاتی امراض میں مبتلا قیدیوں کا علاج میڈیکل مینجمنٹ کے تحت نفسیاتی امراض کے لیے خاص کردہ اداروں میں ہونا چاہئے، اگر مناسب ہو تو قید خانے کی طرف سے مہیا میڈیکل سروسز کے ذریعہ ان کا علاج کرایا جائے یا ان کی علاج کی نگرانی کی جائے۔

بہت سے ملکوں میں جان لیوا بیماریوں میں مبتلا قیدیوں کو وقت سے پہلے ہی چھوڑ دیا جاتا ہے، قید خانوں میں HIV/AIDS پھیلنے کے تعلق سے ۱۹۹۳ کو جنیوا میں تسلیم کئے گئے WHO کے قرارداد کے مطابق جو قیدی ایڈز میں پوری طرح سے جکڑ چکے ہیں، جتنا جلد ہو سکے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ان کو آزاد کر دینا چاہیے تا کہ وقار وآزادی کے ساتھ اپنے اہل خانہ کی معیت میں وہ موت کا سامنا کر سکیں۔

سیکورٹی اور سماجی مفادات کا توازن

عالمی قانونی دستاویزوں میں قیدیوں کو معاشرے میں باوقار زندگی گزارنے کا اہل بنانے کے مختلف پروگراموں اور سیکورٹی کے درمیان اعتدال وتوازن پر کافی زور دیا گیا ہے۔ قانونی کاغذات جسمانی بندھنوں جیسے ہتھکڑی، زنجیر، فولاد اور جکڑ بند لباسوں پر پابندی کے قائل ہیں، البتہ استثنائی صورتوں میں ان کا استعمال کیا جا سکتا ہے، قیدیوں کو فرار ہونے سے روکنے کے وسائل کا استعمال لازما اور رسما نہیں ہونا چاہئے۔

بہر صورت انفرادی طور پر ہر ایک قیدی کی طرف سے رسک کی جانچ پڑتال کے بعد ہی ان کا استعمال ہونا چاہئے۔ خطرناک قیدیوں کو قابو میں رکھنے کے لئے آخری تدبیر کے طور پر ان بندھنوں کا استعمال ہونا چاہئے، جیسے ہی اس انسان کا پرتشدد رویہ ختم ہو جائے ان بندھنوں کو فوری طور پر ہٹا دینا چاہئے، صرف استثنائی صورتوں ہی میں قیدیوں کو اپنے آپ کو نقصان پہونچانے سے بچانے کے لئے بندھنوں کا استعمال ہونا چاہئے، معقول حالت میں سیکورٹی کی بنیاد پر خواہ وہ کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو باہری دنیا سے تعلق ورابطہ رکھنے سے قیدیوں کو محروم نہیں رکھا جا سکتا۔

نظم وضبط کو برقرار رکھنے کے طریقے اور سزائیں

بہت سے قیدی، بہت خطرناک ہو سکتے ہیں، اور اپنے قیدی ساتھیوں اور قیدخانہ کے ملازمین پر حملہ بھی کر سکتے ہیں، ایسی بھی نوبت آسکتی ہے کہ قیدیوں کی ایک جماعت مناسب و برحق اصولوں کو ماننے سے انکار کردیں یا قیدخانہ کی انتظامیہ کی غلط کاریوں کے خلاف علم بغاوت بلند کردیں۔ عالمی قانون کا ماننا ہے کہ ایسی حالت سے نمٹنے کے لئے بالکل واضح اور متعین طریقہ کار ہونا چاہئے، یہ طریقے عالمی آئینی دستاویزوں کو سامنے رکھ کر بنائے جانے چاہئیں۔

اس حقیقت کو تسلیم کرنا بہت اہم ہے کہ قانون کی حکومت قیدخانہ کے دروازہ پر ختم نہیں ہوجاتی، مثلاً جس شخص پر قیدخانہ میں حملہ کیا جاتا ہے وہ قانون فوجداری کے تحفظ کا اسی طرح حقدار ہے جیسے کسی پر عوامی جگہ پر حملہ کیا جاتا ہے، قیدخانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بند ادارے ہیں جن میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو ان کی رضامندی کے بغیر بہت سی پابندیوں کے ساتھ رکھا جاتا ہے، یہ ناگزیر ہے کہ بعض اوقات قیدی قیدخانہ کے اصول وضوابط اور قانون کی خلاف ورزی کئی اعتبار سے کریں، ایسی حالت سے نمٹنے کے لئے بالکل واضح اور متعین طریقے ہونے چاہئیں، کسی بھی قیدخانہ میں جب کسی سنگین جرم کا ارتکاب کیا جائے یا اس طرح کے کسی حادثہ کا امکان ہو تو ایسی صورت میں سول سوسائٹی میں رائج نظام کو بروئے کار لایا جانا چاہئے، ایسے معاملات جن میں باہر کے عہدیداران شامل ہوں، انہیں ایسے معیار اپنانا چاہئے گویا وہ اس سے پہلے قیدی تھا ہی نہیں۔

نظم وضبط کے طریقوں کا مبنی بر عدل ہونا

نظم وضبط کے طریقوں کو فطری قانون عدل وانصاف کا احترام کرنا چاہئے، تمام قیدیوں کو پہلے سے ہی معلوم ہونا چاہئے کہ قیدخانہ کے اصول وضوابط اور قوانین کیا ہیں؟ دوسرے الفاظ میں قیدیوں کے پاس کتاب الاحکام کا ایک نسخہ ہونا چاہئے جس میں اصول توڑنے کی صورت میں دی جانے والی سزا اور واجبات وممنوعات کی پوری فہرست ہونی چاہئے، ہمیشہ ہی سزائیں توڑے گئے اصول کے تناسب میں مبنی بر انصاف ہوں، ان اصولوں کو ایک قانونی دستاویز کی حیثیت دی جانی چاہئے۔

جس قیدی پر بھی اصولوں کی خلاف ورزی کا الزام لگایا جائے، اسے اپنے اوپر لگائے گئے الزام اور الزام لگانے والوں کے بارے میں پہلے ہی سے معلوم ہونا چاہئے، بلاتاخیر متعلقہ ذمہ دار کو اس الزام کی سماعت کرنی چاہئے، قیدیوں کو بھی اپنا دفاع کرنے کے لئے مطلوبہ مدت کی مہلت دی جانی چاہئے، سماعت کے وقت وہ موجود ہو اور جیل کے عہدیداروں کی طرف سے پیش کردہ گواہوں سے سوال کرکے اسے اپنا دفاع کرنے کی اجازت ہونی چاہئے، اس معاملے کی سنوائی لائق وفائق عہدیداروں کے سامنے ہونی چاہئے، اگر قیدی پر لگایا گیا الزام ثابت ہوجائے تو اسے اعلیٰ عہدیدار سے اپیل کرنے کا حق ملنا چاہئے۔

فریاد وشکایت

قیدخانہ کے اصولوں میں یہ گنجائش ہونی چاہئے کہ قیدی خصوصی درخواست کرسکیں اور اپنی شکایتیں درج کراسکیں، شکایت کرنے اور درخواست دینے کے طریقے قیدیوں کو سمجھا دینا چاہئے، شکایت کرنے کی سہولیات بھی فراہم ہونے چاہئے۔

ان تمام باتوں کا لب لباب یہ ہے کہ قیدی اپنے مسائل قیدخانہ کے ان ملازمین کے سامنے جو ان کے سب سے قریبی نگراں ہیں رکھ سکیں، اگر اس سطح پر معاملہ نہ سلجھ پائے تو قیدخانہ کے اقتدار اعلیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور اگر اب بھی معاملہ نہ سلجھے تو قیدیوں کو قیدخانہ سے باہر اعلیٰ عہدیداروں تک رسائی کا حق ملنا چاہئے۔

قیدخانہ کے عہدیدار اس بات کو یقینی بنائیں کہ شکایت کرنے والے قیدیوں سے انتقام نہ لیا جائے، اس کے علاوہ ان کے اہل خانہ یا نمائندہ کو ان کی طرف سے پیروی کرنے کی اجازت ملنی چاہئے۔ نظم وضبط قائم کرنے کے اصول ایسے نہ ہوں کہ قیدیوں کو شکایت کرنا دشوار ہوجائے، قیدخانہ کے ملازمین کے خلاف الزام تراشی کی صورت میں جب الزام بے بنیاد ثابت ہوجائے ان کو سزا نہ دی جائے۔

درخواست شکایت پر عمل درآمد فوری طور پر ہونا چاہئے، اگر ممکن ہو جوابی کارروائی کے لئے وقت متعین ہوجائے۔ تاہم اور بہ ... شکایتوں کو فوری طور پر اس طرح نمٹایا جائے کہ قیدیوں کا اعتماد برقرار رہے۔

اسی طرح مجرمانہ برتاؤ خواہ وہ قید خانہ کے ملازمین کی طرف سے کیا گیا ہو یا کسی دوسرے قیدی کی طرف سے، اسے فوراً اسول سوسائٹی کی ایجنسی کے سپرد کردینا چاہئے جو تعزیری جرائم کی تحقیق واستغاثہ کی ذمہ دار ہے۔ اسے تعزیری تحقیقات کے زمرے میں رکھا جائے یا اسے قید خانہ کے عہدیداروں کو منتقل کردیا جائے، اس کا فیصلہ وہ ایجنسی کرے گی۔

باہری دنیا سے رابطہ: ملاقات، خطوط اور ٹیلیفون سے گفتگو

اپنے اہل خانہ سے رابطہ قائم کرنے کا حق قیدیوں کا ایک اہم حق ہے، یہ حق نہ صرف قیدیوں کو حاصل ہے بلکہ ان کے گھر والوں کو بھی یہ حق حاصل ہے جو قید خانہ میں نہیں ہیں، اپنے ماں باپ، بھائی بہن، بیٹا بیٹی سے رابطہ قائم کرنے کا حق جس طرح قیدی کو ہے اسی طرح ان لوگوں کو اس سے رابطہ قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔

اس حق سے کماحقہ استفادہ کے لئے ضروری ہے کہ مقام حراست قیدی کے وطن کے علاقے ہی میں ہو۔ اس سبب سے یہ اور بھی اہم ہے کہ بہت سے قیدی کافی غریب ہوتے ہیں اور ان کے خاندان کے افراد لمبی مسافت کے سفری اخراجات کو برداشت نہیں کرسکتے۔

اپنے اہل خانہ اور دوستوں سے رابطہ قائم کرنے کا حق ہر طرح کے قیدی کو حاصل ہے چاہے وہ سزا یافتہ ہوں یا زیر سماعت، ملاقات کرنا خصوصاً اپنے قریبی رشتہ داروں سے انسان کا ایک بنیادی حق ہے، اسے رعایت کا نام نہیں دے سکتے۔

پھر بھی پرائیوٹ طور پر ہر وقت خاندان والوں کو قیدی سے ملنے کی اجازت دینا ممکن نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ قید خانہ کے بڑے کمروں میں ملاقات کا بندوبست کیا جاتا ہے، اس سلسلے میں اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ ملاقات براہ راست ہو، درمیان میں کوئی طبعی رکاوٹ نہ ہو۔ بنچ یا میز پر ملاقات ہوسکتی ہے، قیدیوں کو اپنے ملنے والوں کو چھونے کی اجازت ہونی چاہئے الا یہ کہ اس کی ممانعت کی کوئی معقول وجہ ہو، بعض ملکوں میں ملاقات کی مدت ۱۵ منٹ ہوتی ہے اور قیدیوں اور ملنے والوں کے درمیان آہنی دیوار ہوتی ہے، عالمی معیار کے مطابق یہ درست نہیں ہے۔

قیدیوں سے ملاقات کرنے والے لوگوں کے ذریعہ غیر قانونی اشیاء بشمول ڈرگ اور ہتھیار کے اسمگلنگ کو روکنے کے لئے سیکورٹی کا معقول انتظام ہونا چاہئے، اس مقصد کے لئے قیدی اور ملنے والوں کی تلاشی ملاقات سے پہلے اور اس کے بعد ایک اہم احتیاطی اقدام ہے، تاہم ملنے والوں اور قیدیوں کے جذبات واحساسات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

اقبال جرم کرانے کے مقصد سے قبل مقدمہ قیدیوں کے لئے ملاقاتوں پر پابندی لگانے کے لئے قید خانہ کے عہدیداروں کو چھان بین کرنے والی پولس اور استغاثہ کے ذمہ داروں کی درخواست کو منظور نہیں کرنا چاہئے۔

فیملی وزٹ کے علاوہ رابطے کی دوسری شکلیں بھی اہم ہیں، حتی الامکان آزادانہ طور پر خط بھیجنے اور پانے کا حق قیدیوں کو ملنا چاہئے، اور اگر ہوسکے تو فون کرنے اور فون ریسیو کرنے کا بھی موقع ملنا چاہئے۔

پوری دنیا میں اس بات کی ضرورت کا احساس بڑھتا جارہا ہے کہ ایک ایسا نظام ہونا چاہئے جس کے تحت قیدی اپنے اہل خانہ کے ساتھ ایک قلیل عرصہ کے لئے رہ سکیں، کچھ عدالتی نظاموں میں فیملی وزٹ یا طویل المیعاد وزٹ کا تجربہ اپنایا جارہا ہے، وسط ایشیا اور مشرقی یورپ کے بہت سے قید خانوں میں ان کے حدود کے اندر بہت سے چھوٹے چھوٹے اپارٹمنٹ ہیں جن میں بہتر گھنٹوں تک اہل خانہ کے ساتھ رہنے کی اجازت ہوتی ہے، مستحق قیدیوں کو ایک سال میں چار بار اس طرح کی ملاقاتوں کی اجازت دی جاسکتی ہے، عموماً بیک وقت تین یا چار ملاقاتیں ہوتی ہیں، میاں بیوی یا پارٹنر، باپ دادا یا بچوں کے ساتھ ملاقات ہوسکتی ہے۔ کناڈا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے چند قید خانوں کے نظام میں یہ سہولتیں مہیا ہیں۔

اس طرح کی فیملی ملاقاتیں جنسی ملاقاتوں سے مختلف ہیں، کچھ عدالتی نظاموں مثلاً ڈنمارک، سویڈن، نیدرلینڈ اور اسپین وغیرہ میں قیدیوں کو ایک فرد سے ملاقات کرنے کی اجازت ہوتی ہے، عموماً شریک حیات یا طویل المیعاد پارٹنر سے وہ تین گھنٹوں کے لئے خلوت کے ساتھ ایک چھوٹی سی جگہ میں جہاں ایک بستر اور صفائی ستھرائی کی دوسری سہولتیں ہوتی ہیں مل سکتے ہیں۔

لاطینی امریکہ کے بہت سے قید خانوں میں مرد قیدیوں کے لئے سنیچر و اتوار کے دن فیملی وزٹ کی اجازت ہوتی ہے، کچھ جگہوں پر خواتین قیدیوں کو

بھی اس کی اجازت دی گئی ہے، اس طرح کی ملاقاتوں کے دوران کچھ حد تک خلوت وتنہائی کی فضا قائم کرنے کے لئے کمبل و چادر لٹکا دیئے جاتے ہیں۔

راجستھان اور ہندوستان کی کچھ دوسری ریاستوں میں کھلے جیلوں پر کام شروع ہوگیا ہے جہاں طویل المیعاد قیدی جو اپنی سزا کا ایک حصہ کاٹ چکے ہیں اور یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ان سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوسکتا ان کو ان قید خانوں میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ انفرادی رہائش گاہوں میں رہ سکتے ہیں، ایسے قیدی آس پڑوس کے کھیتوں میں کام کرتے ہیں یا دیگر مفید کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔

بہت سے نظامہائے عدالت میں ایسے انتظامات کئے گئے ہیں جس سے کہ قیدی ویڈیو کانفرنسنگ کے ذریعہ اپنے گھر والوں سے بات کر سکیں، بہت سے اسباب کی بنا پر ایسا ہوسکتا ہے کہ کچھ قیدیوں سے ملاقات کرنے والا کوئی نہ ہو، ایسی صورت میں لوکل کمیونیٹی کے رضا کاروں کا ایک نظام ہونا چاہئے تا کہ وہ باہر کی دنیا سے رابطے کو برقرار رکھ سکیں۔

حالیہ برسوں تک قیدیوں کے نام آنے والے اور ان کی طرف سے جانے والے خطوط کی جانچ پڑتال کرنے کا نظام تھا، اب اس میں کمی ہوتی جارہی ہے، اکثر صورتوں میں سرسری اور نمونے کے طور پر پڑھ لینے کو کافی سمجھا جاتا ہے پھر بھی ممنوعہ چیزوں کے لئے آنے والے خطوں کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے، اس کی ایک مناسب صورت یہ نکالی گئی ہے کہ قیدیوں کی موجودگی میں ان کے نام آنے والے خطوط کو کھولا جاتا ہے۔ قید خانے کے ملازمین لفافے کو کھولتے ہیں، اگر کوئی ممنوعہ چیز نہیں ملتی ہے تو خط کو قیدی کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ بہت سے جیلوں میں فون پر بات کرنا اور آنے والی کالوں کا جواب دینا ممکن ہے۔ چونکہ یہ رابطہ براہ راست ہوتا ہے، کچھ قید خانوں میں تمام کالوں کو ریکارڈ کیا جاتا ہے اور ایک مخصوص مدت تک ٹیپ ریکارڈ کو رکھنے کا نظم کیا جاتا ہے۔ صرف انھی قیدیوں کی کالوں کو سنسر کرنے کی پابندی کی جاتی ہے جو سنگین مسائل کھڑا کر سکتے ہیں۔

کچھ قید خانوں کے نظام میں ای میل کی بھی اجازت ہے، جیسے نئی دلی کے تہاڑ جیل میں غیر ملکیوں کے لئے اس کی اجازت ہے۔

وکیلوں اور قیدیوں کی فلاح و بہبود میں دلچسپی رکھنے والے افراد تک رسائی کا حق بھی کافی اہمیت کا حامل ہے، جن قیدیوں کے خلاف سماعت کا آغاز نہیں ہوا ہے ان کے لئے تو یہ اور اہم ہے، وہ قیدی بھی اسی زمرے میں آتے ہیں جن کا جرم ثابت ہو چکا ہو لیکن عدالتی کارروائی ابھی جاری ہو۔ اس حق سے استفادہ کا موقع معمول کے مطابق ملنا چاہئے۔

ٹیلی ویژن، ریڈیو اور مطالعہ کے لئے سہولیات کی فراہمی

قیدیوں کی اصلاح وفلاح اور معاشرے میں شریفانہ زندگی گزارنے کا اہل بنانے کے وسیع مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے عالمی معیاروں نے یہ طے کر دیا ہے کہ پوری دنیا سے ان کے ربط و تعلق کے مواقع کو ختم نہیں کرنا چاہئے۔ لہذا اپنے خویش واقارب سے رابطہ میں رہنے کے علاوہ قیدیوں کی رسائی اخبارات ورسائل، ٹیلی ویژن اور ریڈیو وغیرہ تک ہونی چاہئے تا کہ وہ باہر کی دنیا کے تازہ ترین واقعات وحادثات سے باخبر رہ سکیں۔ سنسر کی اجازت استثنائی صورتوں میں دی جاسکتی ہے۔

زیر سماعت قیدیوں اور غیر سزا یافتہ دیگر قیدیوں کا مسئلہ

بہت سے ملکوں میں قیدیوں کی ایک بڑی تعداد اور بعض اوقات ان کی اکثریت ایسی ہوتی ہے جن کے خلاف سزا کا حکم اب تک نہیں دیا گیا ہے، ان کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایسے قیدی ہیں جن پر عائد کئے گئے الزامات کی چھان بین ہورہی ہے یا وہ زیر سماعت، زیر مقدمہ یا عدالتی کارروائی کے آخری فیصلے کے منتظر ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم اصول یہ ہے کہ زیر مقدمہ قیدیوں کو دوران سماعت بےقصور تصور کیا جائے اس لئے کہ بہت سے معاملے میں چھان بین کے بعد وہ معصوم قرار پاتے ہیں، ایسا بھی ہوتا ہے کہ مجرم پائے جانے کی صورت میں قبل مقدمہ حراست کی مدت ان کو دی گئی سزا کی مدت سے زیادہ ہوتی ہے۔

تمام قبل مقدمہ قیدیوں کو باصلاحیت قانونی نمائندوں کی خدمات حاصل کرنے حق ملنا چاہئے۔ پہلی بار جو لوگ قید خانہ آتے ہیں وہ اپنی حالت اور دوسری بہت سی چیزوں کے تعلق سے اکثر الجھن اور غیر یقینی صورتحال کا شکار ہوجاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہیں آزاد قانونی صلاح ومشورہ کا مستحق سمجھا جاتا ہے، جو وکیلوں کے اخراجات برداشت کر سکتے ہیں ان کو ان تک رسائی ملنی چاہئے اور جو ایسا نہیں کر سکتے ان کے لئے قانونی نمائندگی کا

بندوبست کیا جانا چاہئے۔

قیدیوں اور ان کے قانونی نمائندوں کے درمیان اتصال وارابطے میں قید خانے کے عہدیداروں کے ذریعہ مداخلت نہیں ہونی چاہئے، کسی قیدی اور اس کے وکیل کے درمیان مراسلت کو سنسر کرنا بھی نامناسب ہے، اس شبہ کی اگر معقول وجہ ہو کہ فراہم کردہ سہولیات کا غلط استعمال ہو رہا ہے تو قیدیوں کی موجودگی میں آنے والے خطوط کو کھول کر دیکھا جاسکتا ہے کہ ان میں ممنوع چیزیں تو نہیں ہیں، اس طرح قیدیوں کی طرف سے باہر جانے والے خطوط کو مہر لگانے سے پہلے چیک کیا جاسکتا ہے، کسی بھی حال میں خطوط کے مضامین قید خانہ کے عہدیداروں کو پڑھنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، قیدیوں اور ان کے نمائندوں کے درمیان ہونے والی گفتگو وغیرہ کو قید خانہ کے عہدیداروں کے ذریعہ خفیہ طور پر نہیں سنا جانا چاہئے، اپنے وکیلوں کے ساتھ قیدیوں کی ملاقات اتنی دور سے دیکھا جاسکتا ہے جہاں سے ان کی باتیں سنائی نہ دے سکے۔

زیر سماعت قیدی

قبل مقدمہ قیدیوں کو ایسے قیام گاہوں پر نہیں رکھا جانا چاہئے جہاں ایسے مجرموں کو رکھا گیا ہے جن کی سزا کا حکم صادر کیا جاچکا ہو، ان کی حراست کی کیفیت سزا یافتہ قیدیوں کی حراست کی کیفیت سے کمتر نہیں ہونا چاہئے، قبل سماعت قیدیوں کے لئے انفرادی اصول وضوابط ہونے چاہئے، ان کے لئے کام لازمی نہ ہو البتہ اپنی خوشی سے کام کرنے کا موقع انہیں ملنا چاہئے۔

غیر سزا یافتہ دیگر قیدی

بہت سے ملکوں میں لوگوں کو انتظامی اسباب کی بنا پر یا شہری قوانین کی خلاف ورزی کے الزام کے تحت حراست میں رکھا جاتا ہے، ان لوگوں کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ ہونا چاہئے جیسا برتاؤ ان قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے جن پر الزام ثابت نہ ہوا ہو۔

کمسن اور نوعمر قیدی

اس سلسلے میں قانون بالکل واضح ہے کہ بچہ کسے تصور کیا جائے، اتفاق برائے حقوق اطفال کے آرٹیکل نمبر ا کی نگاہ میں اٹھارہ سال سے کم عمر کا ہر انسان بچہ ہے البتہ اس سے پہلے ہی پختگی حاصل کر لینے کی صورت میں پختگی سے جڑے قوانین کا انہیں مکلف بنایا جاسکتا ہے، آزادی سے محروم کردیئے گئے کم سنوں کے تحفظ کے لئے اقوام متحدہ کے ذریعہ بنائے گئے قوانین کے قانون نمبر گیارہ کے مطابق اٹھارہ سال سے کم عمر کا ہر انسان کمسن کے زمرے میں شامل ہے۔

عالمی معیار کی ہدایات کی رو سے بچے ان تمام انسانی حقوق کی ضمانت کے حقدار ہیں جو بالغوں کو حاصل ہیں، اس کے علاوہ درج ذیل اصول وضوابط بطور خاص کمسن بچوں اور نوجوانوں کے لئے بنائے گئے ہیں:

۱- حراست میں لئے گئے بچوں کے ساتھ اس طرح پیش آنا چاہئے کہ ان کے احساس وقار وعزت کو فروغ ملے، سماج ومعاشرے میں وہ ضم ہوسکیں اور ان کے مفادات وضروریات کا بھرپور لحاظ ہوسکے۔

۲- آزاد کر کے اصلاح وتوبہ کا موقع دیئے بغیر بچوں کو جسمانی، موت اور عمر قید کی سزا نہیں ملنی چاہئے۔

۳- زیر حراست بچوں کو بالغ قیدیوں سے الگ رکھنا چاہئے اور حتی الامکان فوری طور پر انہیں عدالتی کارروائی کے لئے پیش کیا جانا چاہئے۔

۴- زیر حراست بچوں کو اپنے اہل خانہ سے ملنے اور ان سے مراسلت کا موقع فراہم کرنے کے لئے خصوصی جدوجہد ہونی چاہئے۔

۵- زیر حراست بچوں کے تخلیہ کا خیال رکھا جائے اور اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ ان کے سبھی ریکارڈ بھروسے مند ہوں اور انہیں محفوظ رکھا جائے۔

۶- لازمی اسکولی عمر کے بچوں کو تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت دی جانی چاہئے۔

۷- جن اداروں میں بچوں کو رکھا گیا ہے وہاں ہتھیار نہ لایا جائے۔

۸- نظم وضبط سے متعلق اصول وضوابط ایسے ہوں جن سے بچوں کے اندر عدل وانصاف، عزت نفس اور حقوق انسانی کے جذبے کو فروغ ملے اور ان

سے ان کی عزت ووقار کے احترام میں کوئی فرق نہ آئے۔

۹- والدین کو کمسن بچوں کی موت، قید خانے سے ان کی خلاصی، منتقلی اور داخلے کی اطلاع ملنی چاہئے۔

خواتین قیدی

پوری دنیا میں کسی بھی نظام قید خانہ میں خواتین قیدیوں کا تناسب دو سے آٹھ فیصد کے درمیان ہے۔ جسمانی وجنسی زیادتیوں سے خواتین قیدیوں کو محفوظ رکھنے کی شدید ضرورت ہوتی ہے کیونکہ وہ بند ماحول میں رہتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ خواتین ملازمین کے ذریعہ ان کی نگرانی کی وکالت کی گئی ہے۔ ملازمین کے مرد ہونے کی شکل میں اقتدار اعلی کے عہدہ پر کسی خاتون کا فائز ہونا لازم ہے اور مردوں کے ساتھ خواتین کا ہونا بھی ضروری ہے۔

دوران قید استحصال وتشدد اور امتیاز وتفریق کی تمام شکلوں سے تحفظ کو یقینی بنانا قید خانہ کی انتظامیہ پر لازم ہے۔ قید خانہ میں موجود حاملہ خواتین اور دودھ پلانے والی ماؤں کی کیفیت کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے لئے خصوصی رعایتوں کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ اگر ممکن ہو سکے تو بچے کی پیدائش باہر کسی ہاسپیٹل میں ہو۔

عالمی معیاروں کا اصرار ہے کہ خواتین قیدیوں کی تلاشی لیتے وقت خصوصی احتیاط وحسن سلوک کا مظاہرہ کیا جائے، خواتین قیدیوں کی ذاتی و اندرونی تلاشی کی صورت میں مرد ملازمین کی شرکت کا کوئی جواز ہی نہیں۔

خواتین قیدیوں کے تعلق سے نوزائیدہ اور شیر خوار بچوں کا مسئلہ بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔ بہت سے ملکوں میں ماؤں کو قید خانے میں اپنے نوزائیدہ بچوں کو رکھنے کی اجازت ہے، شیر خوار بچوں کو ان کی ماؤں سے جدا کرنے کی مناسب عمر کیا ہے، یہ متعین کرنا بڑا مشکل ہے۔ کچھ قید خانوں کی انتظامیہ ماؤں کو اپنے بچوں کو ۹ یا اٹھارہ مہینوں کی عمر تک اپنے ساتھ رکھنے کی اجازت دیتی ہے، اگر بچے کے لئے رہنے کی کوئی اور جگہ نہ ہو تو چار سال کی عمر تک وہ اپنی ماں کے ساتھ رہ سکتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ روس کا تعزیری قانون ان ماؤں کے لئے جن کی سزاؤں کی مدت پانچ سال یا اس سے کم ہے، ان کے سب سے چھوٹے بچے کی عمر آٹھ سال ہونے تک سزا ملتوی کئے جانے کی اجازت دیتا ہے، مدت پوری ہونے کے بعد ایک بار پھر سزا پر نظر ثانی کی جاتی ہے تاکہ یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ اس خاتون کو جیل بھیجا جائے یا نہیں، اس فیصلہ کا ایک اہم پیمانہ یہ ہوتا ہے کہ اس مدت میں اس خاتون نے کوئی دوسرا جرم کیا ہے یا نہیں۔

عمر قید یا طویل المیعاد سزا یافتہ قیدی

عمر قید یا دوسری طویل المیعاد سزائیں پائے ہوئے قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کے متعلق اگرچہ عالمی معاہدوں اور حقوق انسانی کے دستاویزوں میں متعینہ طور پر بہت کچھ نہیں کہا گیا ہے، اس کے باوجود اس میں کوئی دورائے نہیں کہ وہ بھی ان سبھی رعایتوں اور حقوق کے مجاز ہیں جو عام قیدیوں کو حاصل ہیں۔ طویل المیعاد قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کی ضابطہ بندی کی خاطر ''عمر قید کے تعلق سے اقوام متحدہ کی سفارشات'' ایک بنیادی عالمی دستاویز ہے، ان سفارشات کے موافق ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ ''معاشرتی تعامل اور اتصال وروابطے کے مواقع'' نیز ''اجرت کے ساتھ کام کرنے، مطالعہ، مذہبی وثقافتی امور کی بجا آوری، کھیل کود اور خالی اوقات کے دوسرے مشاغل کے مواقع'' ان تمام قیدیوں کو فراہم کرے جو عمر قید کی سزا پا چکے ہیں۔ ان سفارشات سے یہ بھی نتیجہ نکالنا بالکل بجا ہے کہ دوسرے تمام طویل المعیاد قیدی بھی ان سہولیات کے مستحق ہیں۔

اسی طرح طویل المیعاد قیدیوں کے متعلق یورپین کاؤنسل کی رپورٹ سفارش کرتی ہے کہ ''نفع بخش کاموں کے مواقع'' دیئے جائیں، اس رپورٹ کا یہ بھی کہنا ہے کہ ایسے قیدیوں کے ساتھ اس طرح برتاؤ کیا جائے کہ وہ سدھر جائیں اور باہر کی دنیا میں شریفانہ زندگی گذارنے کے لئے ان کو آزاد کرنے کا امکان بڑھ جائے۔

سزائے موت یافتہ قیدی

حقوق انسانی کا عالمی معیار حکومتوں کو اس بات کا پابند بناتا ہے کہ وہ سزائے موت پائے ہوئے قیدیوں کو وہ ساری سہولتیں مہیا کرائے جو عام

قیدیوں کو حاصل ہیں، یہ بھی ضروری ہے کہ طعام وقیام، حفظان صحت کے وصول، ورزش، طبی سہولیات اور دوسرے قیدیوں سے تعلق رکھنے جیسے معاملات میں انہیں کمتر تصور نہ کیا جائے، ان قیدیوں کی قیدخانے کے اندر حرکت پر غیر ضروری بندش نہیں ہونی چاہئے اور ان کے ساتھ برابرتاؤ صرف اس لئے نہیں ہونا چاہئے کہ وہ سزائے موت والے قیدی ہیں۔ ایسے قیدیوں کو کام، تعلیم اور دوسری ثقافتی سرگرمیوں کی سہولیات تک رسائی کے بغیر الگ تھلگ جگہوں پر مسلسل رکھنے کی کوئی بھی دلیل عالمی حقوق انسانی کی نگاہ میں غیر منطقی ہے۔ ان کو جو سزا دی گئی ہے صرف اس کی بنیاد پر کسی اضافی سزا کی اجازت نہیں دی جاسکتی، بلکہ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ قیدخانہ کی انتظامیہ ان ذہنی ونفسیاتی کرب واضطراب کو جسے عموماً "Death row phenomenon" (موت کا انتظار کررہے لوگوں کی ذہنی کیفیات کا مظہر) کہتے ہیں، کم کرنے کی کوئی سبیل نکالے، ایسے قیدیوں کو اپنے ان وکیلوں سے رابطہ قائم کرنے کا پورا موقع ملنا چاہئے جو سزا کے خلاف اپیل کی پیروی کررہے ہیں۔

کام اور فنی تربیت

عالمی قانون کے مطابق جبری یا لازمی محنت ممنوع ہے، تاہم یہ بھی ملحوظ رہے کہ قیدیوں کے سارے کام خود بخود اس زمرے میں نہیں آجاتے، سزا یافتہ قیدیوں کو کام کا مکلف بنایا جاسکتا ہے بشرطیکہ درج ذیل تحفظات فراہم کئے جائیں۔

☆ کام بامقصد ہو

☆ کام سے ایسی فنی صلاحیتیں پیدا ہوتی ہوں جو قید سے چھٹکارے کے بعد مفید ثابت ہو

☆ قیدیوں کو کام کی اجرت ملنی چاہئے

☆ کام کی کیفیت عمومی ورک کلچر بالخصوص صحت وتندرسی اور تحفظات کے معیاروں کے مطابق ہونی چاہئے۔

☆ کام کے اوقات حد سے متجاوز نہ ہوں اور دوسری سرگرمیوں کے لئے بھی وقت بچے۔

قبل کارروائی قیدیوں کو کام کا پابند اگرچہ نہیں بنایا جاسکتا، تاہم ان کے لئے بھی کام کے مواقع فراہم ہونے چاہئے اور جہاں تک ممکن ہو سکے اس میں شرکت کے لئے ان کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے۔

مختلف طبقات کی ضروریات کا لحاظ

قانون کا عالمی معیار تمام ملکی فریقوں کا یہ فریضہ قرار دیتا ہے کہ وہ زبان، جنسی رجحانات، مذہب وثقافت، سماجی حیثیت، ذات برادری یا وطنیت پر مبنی اقلیتی فرقوں کا خصوصی لحاظ کرے، قیدخانہ کی انتظامیہ کے لئے اس امر کو یقینی بنانا بھی ضروری ہے کہ قیدیوں یا ملازمین میں سے کوئی بھی فرد اقلیتوں کے خلاف امتیازی برتاؤ کا رجحان پیدا نہ کرسکے۔

معاشرے میں قیدیوں کا انضمام

عالمی معیاروں کا اس امر پر اصرار ہے کہ قیدخانوں کو ایسی جگہ کے طور پر استعمال کرنا چاہئے جو قیدیوں کو قیدخانے سے خلاصی کے بعد معاشرے میں واپس آکر معمول کی زندگی گذارنے کا اہل بنانے میں معاون ہو۔ یہ قول مشہور ہے کہ سدھرا ہوا قیدی وہ نہیں جو قیدخانہ میں رہنے کے طور طریق کو اچھی طرح سیکھ لے بلکہ وہ قیدی صحیح معنوں میں سدھرا ہوا ہے جو آزادی کے بعد قیدخانہ سے باہر کی دنیا میں کامیابی کے ساتھ زندگی گذارنے کا اہل ہوجائے۔ جہاں تک ہوسکے قید وبند سے آزاد ہونے والے افراد کو معاشرے کا ذمہ دار شہری بنانے کے لئے ہر طرح کے وسائل وذرائع کو بروئے کار لانا چاہئے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ قیدی جس حالت وکیفیت کے ساتھ قیدخانہ میں داخل ہو وہاں سے نکلنے کے وقت ان کی حالت وکیفیت اس سے بدتر نہیں ہونی چاہئے۔

☆☆☆

عالمی قانون کے تحت قیدیوں کے حقوق - ایک جائزہ

جناب عبدالرحیم بیجاپور[1]

تعارف

قیدیوں کے حقوق سے بحث کرنے والے حقوق انسانی کے دستاویزات دو قسم کے ہیں؛ ان میں سے ایک کی پابندی لازمی ہے جبکہ دوسرے کی پابندی ضروری نہیں ہے۔ قید خانوں اور قیدیوں سے متعلق عمومی احکام وقوانین بہت سے عالمی بنیادی حقوق انسانی کے دستاویزات میں موجود ہیں۔ مثلاً عالمی معاہدہ برائے شہری وسیاسی حقوق (ICCPR) میں مذکور ہے: ''وہ تمام افراد جن کو اپنی آزادی سے محروم کردیا گیا ہے، ان کے ساتھ انسان کی فطری و پیدائشی عزت واحترام کا خیال رکھتے ہوئے انسانی سلوک کیا جانا چاہئے'' ٹارچر اور دوسرے بے رحم غیر انسانی اور ذلت آمیز برتاؤ یا سزا کے خلاف اقوام متحدہ کا معاہدہ، ٹارچر اور غیر انسانی یا ذلت آمیز برتاؤ یا سزا کی روک تھام کے لئے یورپین معاہدہ ٹارچر اور سخت جسمانی سزاؤں کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔ تیسرا جنیوا معاہدہ ۱۹۴۹ء (جنگی قیدیوں سے متعلق) اولین معاہدہ ہے جو قیدیوں کی ایک مخصوص قسم کے حقوق سے بحث کرتا ہے۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ کوئی ایسا عالمی معاہدہ نہیں ہے جو صرف یا پوری تفصیل کے ساتھ قیدیوں کے حقوق یا ان کے ساتھ برتاؤ سے بحث کرتا ہو۔ قیدیوں کے ساتھ برتاؤ اور قید خانوں کی انتظامیہ کے متعلق اہم دستاویزات معاہدوں کی شکل میں نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ عالمی قانون کے تحت ان کی پابندی لازمی نہیں ہے، تاہم یہ مختلف رہنما اصول وقوانین قیدیوں اور قید خانوں کے تعلق سے ایک بہت ہی مؤثر اور مفصل عالمی رہنمائی کا ماخذ فراہم کرتے ہیں۔

قانون نافذ کرنے والے افسران اور قیدیوں کے حقوق سے متعلق چند اہم ترین غیر لازمی عالمی اور علاقائی دستاویزات درج ذیل ہیں:

- ☆ قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے لئے اقوام متحدہ کا علی الاقل معیاری قوانین ۱۹۷۷ء
- ☆ کسی بھی طرح کی تحویل یا قید میں رکھے گئے افراد کے تحفظ کی خاطر مجموعہ اصول
- ☆ قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے بنیادی اصول ۱۹۹۰
- ☆ نابالغ کی خطا کاریوں کی روک تھام کے لئے اقوام متحدہ کے رہنما اصول (ریاض رہنما اصول)
- ☆ نوعمر بچوں کو انصاف دلانے کے لئے اقوام متحدہ کا علی الاقل معیاری قوانین (بیجنگ قوانین)
- ☆ قانون نافذ کرنے والے افسران کے لئے ضابطہ اخلاق

اس مضمون کا مقصد حقوق انسانی پر مشتمل لازمی اور غیر لازمی دونوں طرح کے دستاویزات میں مذکور عالمی قانون کے تحت قیدیوں کے حقوق پر ایک مختصر جائزہ ہے۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، بہت سے غیر لازمی دستاویزات ایسے ہیں جن کا تذکرہ جگہ کی قلت کی بنا پر اس مضمون میں نہیں کیا گیا ہے۔ ان میں سے کچھ کا تذکرہ ضروری ہے جو درج ذیل ہے:

اپنی آزادی سے محروم کردئے گئے اطفال کی حفاظت کے لئے اقوام متحدہ کے اصول ۱۹۹۰ء، غیر حراستی اقدامات کے لئے اقوام متحدہ کے علی الاقل معیاری قوانین (ٹوکیو قوانین) ۱۹۹۰ء قانون نافذ کرنے والے افسران کے ذریعہ طاقت کے استعمال کے لئے بنیادی اصول وضوابط، ٹارچر اور دوسرے بے رحم غیر انسانی یا ذلت آمیز سلوک وسزا سے نظر بند افراد یا قیدیوں کو محفوظ رکھنے کے مقصد سے میدان صحت کے اشخاص کے رول کے متعلق طبی اخلاقیات کے اصول وضوابط ۱۹۸۲ء۔

---

[1] ایم فل، پی، ایچ، ڈی (جے این یو) ایل ایل ایم، ایسکس (Essex) برطانیہ۔ پروفیسر، سماجی سیاسیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

جنیوا کے تیسرے معاہدے ۱۹۴۹ء کے تحت جنگی قیدیوں کے ساتھ برتاؤ

جنگی قیدی ریاست کے قیدی تصور کئے جاتے ہیں اور ریاست کو ہی انہیں نظر بند یا قید کرنے کا اختیار حاصل ہے، اس فرد وجماعت کو نہیں جنہوں نے انہیں گرفتار کیا ہے، قید کرنے کا اختیار جسے حاصل ہے، وہی عالمی قانون کے مطابق ان کے ساتھ حسن سلوک کا ذمہ دار ہے۔ قوانین جنگ کے متعلق جنیوا معاہدہ جنگی قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے تعلق سے بنیادی احکام مہیا کرتا ہے۔ جنگی قیدیوں کے ساتھ غیر انسانی یا ذلت آمیز سلوک نہیں ہونا چاہئے، رنگ و نسل، جنس و جنسیت، مذہبی عقیدہ، سیاسی نظریہ یا اسی طرح دوسرے عوامل کے بہانے ان کے درمیان فرق وامتیاز کرنا روا نہیں، ان کے خلاف انتقامی کارروائیاں ممنوع ہیں، ان کی حفاظت ہمہ وقت ضروری ہے، خصوصا تشدد، ڈرانے دھمکانے، تذلیل وتحقیر اور عوامی تجسس جیسے معاملات سے ان کو بچانا بھی ناگزیر ہے، جنگی قیدیوں کا عوام کے سامنے مظاہرہ بھی جائز نہیں۔

ان کو قید میں رکھنے والی بااختیار ریاست کی ذمہ داری ہے کہ ان کے لئے مناسب انداز میں سبھی ضروریات مفت فراہم کرے، جنیوا معاہدۂ سوم جنگی قیدیوں کے قید کی کیفیت ونوعیت، ان کی محنت، حالت قید میں مالی وسائل، باہری دنیا اور وہ افسران جن کے ماتحت وہ ہیں ان کے ساتھ تعلقات اور قید کے خاتمہ کے متعلق مفصل قانونی بیانات پر مشتمل ہے۔

مسلح جنگ چھڑنے کے وقت اس میں شریک دونوں پارٹیوں کو اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر کسی غیر جانبدار ریاست کو تحفظ کا اختیار دے دینا چاہئے، Protecting Power کا نظام اس امر کو یقینی بنانے کے لئے قائم کیا گیا ہے کہ مسلح تصادم میں شریک پارٹیاں جنیوا دستور کی تعمیل کرسکیں۔ Protecting Power کا بنیادی کام جنگی قیدیوں سے ملنا اور بغیر گواہی کے ان سے سوالات پوچھنا ہے، جنگی قیدیوں سے ملنے کی خاطر Protecting Power کے نمائندوں پر زمان ومکان کی کوئی بندش نہیں ہونی چاہئے، اس تعلق سے ناگزیر فوجی عوامل کی بنا پر صرف عارضی اور استثنائی شکل میں Detainig Power کو کسی طرح کی پابندی لگانے کی اجازت ہے۔ جنگی قیدیوں کے خلاف عدالتی کارروائی شروع کرنے کی صورت میں Detainin Power (جسے قید کرنے کا اختیار حاصل ہے) کی ذمہ داری ہے کہ وہ مقدمہ کے آغاز سے کم از کم تین ہفتہ قبل ہی Protecting Power کو اس کی اطلاع دے۔ Protecting Power (جسے قیدیوں کے تحفظ ومفاد کے لئے کام کرنے کا اختیار سونپا گیا ہے (عموما اس پارٹی کے شہریوں جو دشمن کے کنٹرول میں ہیں، کے مفادات کی نگرانی کرتا ہے جس نے اس کو متعین کیا ہے۔ Protecting Power تنازع کے تصفیہ میں بھی حصہ لے سکتا ہے۔

اس نظام کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ Protecting Power کی تعیین کے سلسلہ میں مسلح تصادم میں شریک پارٹیوں کی باہمی رضامندی ضروری ہے، نتیجۃ اس نظام سے بہت کم فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں فالک لینڈ جنگ کی مثال دی جاسکتی ہے جس کے دوران سوئٹزرلینڈ نے برطانیہ کی طرف سے اور برازیل نے ارجنٹینا کی طرف سے Protecting Power کا رول ادا کیا تھا۔ (کوریا، ویتنام یا ایران وعراق جنگ میں کسی Protecting Power کی تعیین نہیں ہو پائی تھی)

تصادم میں شریک پارٹیاں اگر Protecting Power پر رضامند نہ ہوسکے، اس صورت میں ریڈ کراس کی عالمی کمیٹی (ICRC) یا کوئی بھی انسان دوست تنظیم Protecting Power کا رول ادا کرنے کے لئے آگے بڑھ سکتی ہے یا انسانی بنیادوں پر ایسے کام سرانجام دے سکتی ہے جو Protecting Power کی ذمہ داری ہوتی ہے، بہرحال پہلا مرحلہ درخواست اور دوسرا مرحلہ Detaninig Power کی رضامندی ہے۔

ICRC کو ایک اہم مقام حاصل ہے، Protecting Power کی تعیین ہو یا نہ ہو، Detaninig Power کی رضامندی کے ساتھ جنگی قیدیوں کے تحفظ اور فلاح وبہبود کی خاطر ICRC کو کام کرنے کی اجازت حاصل ہے۔

جنیوا معاہدۂ سوم کے احکام وقوانین کی تعمیل اس پر دستخط کرنے والی ریاستوں پر اگرچہ لازم ہے، اس کی خلاف ورزی بہت زیادہ ہوئی ہے۔ اس معاہدہ شکنی کی ایک تازہ مثال عراقی قیدیوں کے ساتھ خصوصا ابوغریب جیل میں امریکہ کی قیادت میں اتحادی فوجیوں کا ذلت آمیز سلوک ہے۔ بہت سی عالمی حقوق انسانی کی تنظیموں اور ICRC کی طرف سے شکایتوں کے نتیجے میں ۱۹/ جنوری ۲۰۰۴ء کو عراق میں تعینات امریکہ کے سینئر کمانڈر جنرل رکارڈو سالیز نے امریکہ کے سنٹرل کمانڈ سے اس معاملہ میں تحقیقات کرانے کی درخواست کی، میجر جنرل انٹونیو ایم ٹگو با کو تحقیقات کے لئے متعین کیا گیا جنہوں نے ۲۶/ فروری ۲۰۰۴ء کو

اپنی رپورٹ مکمل کرلی، اس رپورٹ کے مطابق: "یہ بات سچ ہے کہ منظم اور غیر قانونی طور پر ابوغریب جیل میں قیدیوں کے ساتھ حیاسوز، صریح ظلم وستم اور خباثت پر مبنی مجرمانہ برتاؤ کیا گیا" ان زیادتیوں میں بشمول دیگر اشیاء کے جسمانی ظلم وستم، مرد وعورت قیدیوں کو ننگا کر کے ان کی فوٹو گرافی اور ویڈیو گرافی، فوٹو گرافی کے لئے واضح مختلف جنسی بیٹھوں سے قیدیوں کو پوز دینے کے لئے مجبور کرنا، ان کے کپڑے اتروا کر لگاتار گھنٹوں عریاں رکھنا، مرد ایم پی گارڈ کا عورت قیدی کے ساتھ صحبت کرنا، فوجی کتوں کے ذریعہ ڈرانا دھمکانا شامل ہے۔ جب سی بی ایس (CBS) نے "Minutes 1160" بتاریخ ۲۸/ اپریل ۲۰۰۴ء امریکہ کے فوجیوں کے ذریعہ عراقی قیدیوں پر ظلم وستم کی واضح تصویریں دکھائیں، اس کے بعد ہی اس کی رپورٹ شائع ہوسکی۔

گوننتاموبے میں ان قیدیوں کے ساتھ جو افغانستان میں "Operation Enduring Freedom" کے دوران پکڑے گئے تھے ان کے ساتھ تیسرے جنیوا معاہدہ کے مطابق برتاؤ کرنے سے اگرچہ امریکہ حکومت نے انکار کیا ہے پھر بھی اس نے عالمی رفاہ عام کے قانون خصوصاً تیسرے اور چوتھے جنیوا معاہدے (جنگ کے زمانہ میں شہری قیدیوں کے تحفظ سے متعلق) کی موزونیت کو کبھی چیلنج نہیں کیا ہے۔ عراقی شہریوں کو گرفتار کرنے، ان کو گوننتاموبے میں قید کر کے ان کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کی صورت میں رفاہ عام اور عدالتی چارہ جوئی کے قوانین کی بنیادی شرطوں کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ عراقی قیدیوں کے تعلق سے تیسرے معاہدے کی اہم ترین قانونی شقوں کی خلاف ورزی کی گئی ہے جن کی رو سے جنگی قیدیوں کے ساتھ بہر صورت انسانی سلوک کرنا لازمی ہے، محفوظ قیدیوں کے ساتھ جسمانی یا اخلاقی زیادتی کرنا خصوصاً ان سے یا کسی فرد ثالث سے معلومات حاصل کرنے کی غرض سے ممنوع ہے (آرٹیکل ۳۱) اسی طرح قتل، جسمانی سزا یا ظلم و بربریت پر مبنی کوئی بھی عمل خواہ وہ شہریوں یا فوجیوں کے ذریعہ ہو ناجائز ہے (آرٹیکل ۳۲)۔ ابوغریب جیل میں شہری بھی تھے۔ جنیوا کے چوتھے معاہدہ کے مطابق جنگی قیدیوں اور شہریوں کے درمیان امتیاز لازمی ہے اور یہ کہ شہریوں کے ساتھ ان کے وقار کا لحاظ کرتے ہوئے انسانی برتاؤ کیا جائے۔ (آرٹیکل ۵، ۲۷، ۳۱ اور ۳۲)

کیوبا اور گوننتاموبے (جہاں کے سبھی قیدی طالبان اور القائدہ سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کو امریکہ غیر قانونی جنگ جو کہتا ہے (میں قائم امریکہ کے فوجی بیس میں بھی قیدیوں کے انسانی حقوق کو اسی طرح پامال کیا گیا ہے۔ ۲۰۰۲ء کے اوائل میں چند تنظیمیں (Centre for Constitutional Rights, The Human Rights Clinic at Columbia Law School, and the Centre for Justice and International Law) نے انٹر امریکن کمیشن برائے انسانی حقوق سے درخواست کی کہ بشمول دیگر اشیاء کے امریکہ نے the American Declaration on the Rights and Duties of Man کی خلاف ورزی کی ہے کیونکہ وہ جنیوا کے تیسرے معاہدے میں مذکور ضروری اقدامات کی تعمیل میں ناکام رہی ہے اور اس نے عدالت تک رسائی کے بغیر لوگوں کو طویل المیعاد قید وحراست میں رکھے ہوئے ہے۔ امریکی حکومت انٹر امریکن کمیشن کی اس درخواست کی ان دیکھی کررہی ہے "بااختیار ٹریبونل کے ذریعہ قیدیوں کو اس کی قانونی حیثیت دلانے کے لئے فوری طور پر ضروری کارروائی کی جائے"۔ ۲۰۰۲ء سے ۲۰۰۵ء کے دوران امریکی حکومت اور درخواست دہندگان نے کمیشن کو بہت سے بریف پیش کئے اور اس کے سامنے زبانی ساعتوں میں شرکت کی۔ اس مدت میں کمیشن نے اپنے مارچ ۲۰۰۲ء کے پیغام کو دہراتے ہوئے کئی فیصلے جاری کئے ہیں۔ کمیشن کا یہ بھی ماننا ہے کہ اس دوران جو پیش رفت ہوئی ہے بشمول امریکی سپریم کورٹ کے فیصلے، شعبہ دفاع کی پالیسی میں تبدیلیوں کے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کمیشن کے ابتدائی فیصلے میں مذکور امریکی ذمہ داریوں پر جزئی طور پر عمل درآمد ہوا ہے۔ کچھ مبصرین کی نظر میں اس پیش رفت کا سہرا کمیشن اور دوسری بھی بااختیار عالمی تنظیموں کے سر جاتا ہے۔

کمیشن کے ساتھ تبادلہ خیال کے دوان امریکی حکومت نے ہمیشہ ہی یہ دلیل دی ہے کہ رفاہ عام کے عالمی قانون کی حیثیت مختلف ہے، قانون برائے انسانی حقوق کا اطلاق اس پر نہیں ہوسکتا۔ امریکہ کا یہ بھی کہنا تھا کہ کمیشن کو آئی اے ایچ ایل کی تشریح وتوضیح اور اسے لاگو کرنے کا قانونی اختیار حاصل نہیں ہے۔

یہاں پر گوننتاموبے میں مقید افراد کے تعلق سے انسانی حقوق کمیشن کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ ۲۰۰۶ء میں ICCPR کے تحت امریکی رپورٹ (UN doc. A/61/40(vol.1) کے مطالعہ کے نتیجے میں کمیشن کے چار اختتامی مشاہدات من وعن نقل کئے جاتے ہیں:

۱۲......ممبر ریاست کو فوراً خفیہ حراستی کارروائی کو ختم کرنا چاہئے اور سبھی خفیہ قید خانے بند کردینا چاہئے، مسلح جنگ کے نتیجے میں مقید افراد تک ریڈ کراس کی عالمی کمیٹی کی مکمل رسائی ہونی چاہئے۔ حکومت کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ قیدیوں کو مقام قید لحاظ کئے بغیر پوری طرح قانونی تحفظ فراہم کرے۔

۱۴...... رکن ریاست کو چاہئے کہ وہ گونتنا موبے، افغانستان، عراق اور دوسری غیر ملکی سبھی جگہوں پر قائم مقامات حراست میں مشکوک اموت، ٹارچر، یا بے رحم غیر انسانی یا ذلت آمیز سلوک وسزا کے متعلق الزامات کی فوری اور غیر جانبدارانہ تحقیقات کرائے جن کے ذمہ دار اس کے اسٹاف ہیں (بشمول کمانڈر اور عارضی ملازمین کے)، ریاست اس امر کو یقینی بنائے کہ ملزم اشخاص پر مقدمہ چلائے جائے، ان کے جرائم کی سنگینی کے اعتبار سے ان کو سزا دی جائے۔ اسے ایسے تمام اقدامات کرنے چاہئے جس سے ان جرائم کے ارتکاب پر قابو پایا جا سکے۔

۱۸...... معاہدہ کے آرٹیکل ۹ اور پیراگراف ۴ کے مطابق رکن ریاست کے لیے اس امر کو یقینی بنانا ضروری ہے کہ گونتنا موبے میں زیر حراست افراد کورٹ کے سامنے عدالتی چارہ جوئی کے حقدار ہیں جو بلا تاخیر یہ فیصلہ کرے گی کہ ان کی حراست قانونی ہے یا ان کو چھوڑنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں حق بجانب کارروائی، انتظامیہ اور فوج سے آزاد جائزہ لینے والی عدالتوں، نظر بند افراد کے من پسند مشیروں، شہادتوں اور کارروائیوں تک رسائی کی ضمانت دی جانی چاہئے۔

۳۳...... کمیٹی اپنی اس سفارش پر پھر زور دے رہی ہے کہ مرد افسران کو خواتین کے کوارٹر میں جانے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے یا کم از کم ان کے ساتھ خواتین افسران بھی ہوں۔ کمیٹی اس بات کی بھی سفارش کرتی ہے کہ ولادت کے وقت نظر بند خواتین کے ہاتھوں میں ہتھکڑی نہیں ہونی چاہئے۔

ICCPR اور قیدی

قیدیوں کے متعلق ICCRP کی بہت سی شقیں کافی واضح ہیں۔ آرٹیکل ۱۰ کے پیراگراف تین کے مطابق یہ ضروری ہے کہ نظام قید خانہ "ایسا ہو کہ قیدیوں کے ساتھ معاملات کا بنیادی مقصد جو ان کی اصلاح اور معاشرے میں ان کو از سر نو زندگی گذارنے کا اہل بنانا ہے حاصل ہو سکے۔ قیدیوں کی اصلاح و فلاح پر معاہدے کے اصرار کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے سزا یافتہ اور ریمانڈ پر لئے ہوئے قیدیوں کے درمیان فرق ملحوظ رکھنے کی شرط لگائی گئی ہے۔ ریمانڈ قیدیوں کے ساتھ غیر سزا یافتہ افراد کی طرح مناسب سلوک کرنا چاہئے اور کم سن قیدیوں کو بالغوں سے الگ رکھنا چاہئے۔ آرٹیکل نمبر سات واضح انداز میں ٹارچر اور بے رحم غیر انسانی یا ذلت آمیز برتاؤ کو ممنوع قرار دیتا ہے اور آرٹیکل ۱۰ کے پیراگراف ایک کے مطابق " آزادی سے محروم کئے گئے سبھی افراد کے ساتھ انسانی سلوک ہونا چاہئے کیونکہ بہر حال انہیں بنی نوع انسان کا ایک فرد ہونے کے ناتے احترام انسانیت کا فطری حق حاصل ہے"۔

ICCPR میں مفصل تعریفات نہیں ملتیں اور نہ ہی یہ اشارہ ملتا کہ ان واضح اصولوں کے مدنظر قیدیوں کے ساتھ سلوک کے معیار کیا ہیں؟ مثلاً ٹارچر کے امتناع میں ٹارچر کی تعریف یا اس کی ماہیت کی بابت کوئی رہنمائی نہیں ملتی، اسی طرح "بے رحم غیر انسانی یا ذلت آمیز" کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ آرٹیکل ۱۰(۱) کا قطعی مفہوم کہ قیدیوں کے ساتھ انسانی سلوک ہونا چاہئے اور ان کی فطری عزت ووقار کا احترام کیا جائے غیر واضح ہے، اگر چہ HRC نے وضاحت کی ہے کہ یہ شرط رکن ریاستوں پر ایک مثبت فرائض عائد کرتی ہے جس کا منطقی نتیجہ ٹارچر یا دوسرے بے رحم غیر انسانی سلوک وسزا کی ممانعت ہے جس کا تذکرہ معاہدے کے آرٹیکل سات میں کیا گیا ہے، اسی طرح اپنی آزادی سے محروم کر دیے گئے افراد کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں کیا جا سکتا ہے، جو آرٹیکل سات کے مخالف ہو اور نہ ہی انہیں آزادی سے محرومی کے سبب پریشانیوں کے علاوہ دوسری سختیوں اور بندشوں کا شکار نہیں بنانا چاہیے، جس طرح آزاد انسانوں کو عزت نفس کا حق حاصل ہے انہیں بھی ملنا چاہیے۔ آزادی سے محروم کردیئے گئے افراد اس معاہدے میں مذکور تمام حقوق کے مستحق ہیں، سوائے ان بندشوں کے جن سے بچنا کسی بند ماحول میں مشکل ہے۔

ICCR کے آرٹیکل سات اور اس میں متعین تصورات اور انہیں کس طرح قیدیوں پر لاگو کیا جائے کی رہنمائی بہت سے عالمی قانونی ماخذ سے مل سکتی ہے

بہت سے مواقع پر HRC نے پایا ہے کہ قید خانہ کی حالت مجموعی اعتبار سے نامناسب اور سخت ہے جو آرٹیکل ۷ کی خلاف ورزی ہے، ایک معاملہ میں HRC نے پایا کہ ایک قیدی کو کافی تنگ و تاریک سیل (۲۰/ سکوائر میٹر میں تقریباً ۵ ۳/قیدی) میں رکھا گیا تھا، اس نے فطری روشنی نہیں دیکھی تھی یہ سراسر حقوق انسانی کی خلاف ورزی ہے، پھر اسے اس سے بھی زیادہ تنگ و تاریک جگہ منتقل کر دیا گیا جہاں اس سے سخت محنت کا کام لیا جاتا، معمولی خوراک دی جاتی، اور مسلسل اس سے پوچھ گچھ کی جاتی، اس کے ساتھ زیادتی کی جاتی اور سخت سزا دی جاتی، ایک دوسرے معاملے میں آرٹیکل میں ۷ کی خلاف ورزی سامنے آئی جس میں قیدی کو سخت اور اکثر ذلت آمیز حالت و کیفیت، نامناسب طبی سہولیات اور لگاتار قید تنہائی کا سامنا کرنا پڑتا تھا، اسے قید خانہ کے سب سے سرد حصے میں رکھا گیا تھا (قید خانہ خود سرد علاقے میں تھا) جس کے سبب اس کے گھٹیا کرمرض ناقابل برداشت ہو جاتا اور وہ ورزش کے لئے اپنی کوٹھری سے قلیل وقفہ کے لئے بھی

باہر آنے سے معذور تھا۔

بہت سے معاملات میں HRC کے مطابق آرٹیکل دس کی خلاف ورزی ہوئی ہے جن میں قیدیوں کو اذیت ناک اور ذلت آمیز حالت میں رکھا گیا تھا، ان تمام معاملات کا عمومی نکتہ یہ ہے کہ ان حالات وکیفیات کا قیدیوں پر منفی اثر ہوتا ہے، یوروگوائے کے قیدیوں کے متعلق بہت سے فیصلوں میں HRC نے آرٹیکل دس کی خلاف ورزی پائی ہے جن میں قیدیوں کو گارڈ کی طرف سے مسلسل ستایا جاتا، لگاتار قید تنہائی کے ساتھ متواتر ان کا مشاہدہ کیا جاتا، اس میں نامناسب اشیاء خوردنی کی فراہمی اور ناکافی ورزش اور بند ماحول شامل ہے۔

بہت سے معاملات میں آرٹیکل دس اور سات کے مابین ہم آہنگی نہیں ہوسکی جس کا حق قیدیوں کو حاصل ہے، ٹارچر کے متعلق روئیداد مرتب کرنے والے اقوام متحدہ کے مخصوص نمائندے نے تبصرہ کیا ہے کہ ICCRP کی خلاف ورزی نتیجۃً آرٹیکل ۱۰(۱) کی خلاف ورزی ہے البتہ اس کے برعکس ہمیشہ سچ نہیں ہوتا۔ اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ آرٹیکل سات ایک متعین معیار فراہم کرتا ہے اگرچہ بہت ممکن ہے کہ دونوں کے درمیان ایک موہوم حد فاصل موجود ہو۔ مرتب نے اشارہ کیا ہے کہ بسا اوقات مبہم فرق کے بہت سے معقول اسباب ہوسکتے ہیں پھر بھی HRC کے لئے اس صورت حال کے تعلق سے منطقی طور پر مدلل تجزیہ فراہم کرنا باقی ہے۔

یورپین انسانی حقوق کے دستاویزات میں اس کے مساوی تصورات کی طرف اشارہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ The European Commission on Human Rights کی رائے میں '' غیر انسانی برتاؤ ''وہ ہے جو دانستہ طور پر ذہنی یا جسمانی اذیت ومصیبت کا سبب بنے، جس کو مخصوص حالت میں جائز نہیں کہا جاسکتا'، کمیشن کا یہ بھی ماننا ہے کہ اگر سزا'' ذلت آمیز ''ہے تو ECHR کے آرٹیکل ۳ کے مقاصد کے لئے ذلت ورسوائی کا اس حد تک پہونچنا ضروری ہے جو جرائم کے ارتکاب کے لئے دی گئی سزاؤں کے نتیجہ میں ذلت ورسوائی سے الگ تھلگ ہو۔ اس اصول کے مطابق قید خانہ کی جانچ پڑتال موجودہ ان تمام حالات وخلفیات پر منحصر ہے جن کے تحت قیدیوں کو قید کیا گیا ہے۔ اس آرٹیکل کی خلاف ورزی اس وقت مانا جائے گا جب بدسلوکی میں ایک خاص سطح تک سختی پائی جائے۔ چنانچہ سکورٹی، اصول پسندی اور تحفظ کے مقصد سے انتظامی طور پر قیدیوں کو ایک دوسرے الگ رکھنا آرٹیکل ۳ کی خلاف ورزی نہیں ہے۔ اس دلیل کے سبب کمیشن کا ماننا ہے کہ تنہا قید کی بظاہر کچھ سخت مثالیں آرٹیکل ۳ کے خلاف نہیں ہیں۔ قیدیوں کے حقوق پر لکھے گئے اہم انگریزی مقالوں کے مصنفین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ فیصلے اس امر کے متقاضی ہیں کہ '' سکورٹی کی متخیلہ شرطوں اور انسان کے بنیادی حقوق میں توازن قائم کرتے وقت اکثر وبیشتر فیصلہ پہلی پارٹی کے حق میں ہوگا'۔

اس کے برخلاف قید خانہ کے ماحول کی بابت European Committe on Torture کا نظریہ زیادہ جامع اور مفصل ہے، ماحول کے مجموعی اثرات کے حوالے سے غیر انسانی اور ذلت آمیز کی وہ تعین کرتی ہے۔ برطانیہ میں اپنی پہلی آمد کے موقع پر کمیٹی نے انگریزوں کے بہت سے قید خانوں کی نوعیت وکیفیت کی کثیر جہتی اور مفصل چھان بین کی۔ بہت سے قید خانوں میں بھیڑ کے مجموعی اثرات، طہارت خانے (قیدی قضائے حاجت کے بعد اپنے فضلہ کو بالٹیوں میں ڈالتے تھے جنہیں متعینہ مدت کے بعد ہی ہٹایا جاتا تھا) کی کمی اور بدسلوکی کی بہت سی دوسری مثالوں کے تئیں کمیٹی نے اپنی گہری فکرمندی کا اظہار کیا۔ کمیٹی نے اس طرح کے حالات کو غیر انسانی اور ذلت آمیز کے زمرے میں رکھا ہے۔

اختیاری پروٹوکول کے تحت شکایتیں

ICCPR میں مذکور حقوق کے مقابلے اختیاری پروٹوکول کی کی توثیق اس میدان میں ہوری ہی پیش رفت کے تعلق سے کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس لئے کہ یہ لوگوں کو بشمول قیدیوں کے ICCPR کی مبینہ عہد شکنی کے خلاف United Nations Human Rights Committee سے شکایت کرنے کا اختیار عطا کرتا ہے۔ HRC سے کی گئی شکایتوں کو دور کرنے کے طور طریقوں پر کئی اعتبار سے تنقید کی گئی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ HRC سے کی گئی شکایت کو قبول کرنے کے سخت احکام اختیاری پروٹوکول کے تحت شروع کی گئی کارروائیوں کو آخر کار غیر یقینی بنادیتا ہے۔ قبولیت کا سب سے اہم اصول یہ شرط ہے کہ HRC کے سامنے شکایت اسی وقت درج کی جاسکتی ہے جب کہ شکایت کنندہ نے موجودہ اپنی تمام ملکی تدبیریں اختیار کرچکا ہو۔ اس طرح کی شرط جو عموماً انسانی حقوق کے معاہدوں کا ایک جز ہے شکایت کنندہ کی یہ ذمہ داری قرار دیتا ہے کہ وہ اس بات کا ثبوت پیش کرے کہ اس نے'' علاقائی قانون میں موجود سبھی تدبیریں جو اصولی طور پر نقصانات کی تلافی کے لئے مؤثر اور کارگر وسیلہ ہے'' سے استفادہ کی پوری کوشش کرچکا ہے۔ HRC نے اس معیار کو اس لئے

اختیار کیا ہے تاکہ وہ پتہ کر سکے کہ اختیاری پروٹوکول کے لئے شکایت کنندہ نے سبھی علاقائی تدبیریں اختیار کر چکا ہے۔ آیا کسی مخصوص تدبیر کو اختیار کیا جاسکتا ہے قبل اس کے کہ انھیں حقائق پر مبنی شکایت HRC قبول کرے، بہت حد تک اس مسئلے میں تدبیر کی خصوصیت پر منحصر ہے۔ تاہم یہ شرط کہ تدبیر ''موثر اور مناسب'' ہو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس کے اندر ایسی خصوصیت کا ہونا لازمی ہے جس سے شکایت کنندہ کے مسئلہ کا حل کارگر طریقے سے نکل سکے۔

شکایت کے طور طریقے پر دوسری تنقید یہ کی جاتی ہے کہ HRC کا زیادہ تر کام اضافی طور پر مبہم ہے۔ کمیٹی کے قوانین میں حالیہ ترمیمات نے اس کے طریقے کے بہت سے مشکل پہلوؤں کو بدل دیا ہے۔ مثال کے طور پر اب کمیٹی کے فیصلے منظر عام پر آتے ہیں۔ درخواست دہندہ پر اب یہ پابندی نہیں رہی کہ وہ عرضی پیش کرنے کی حقیقت کو منظر عام پر نہ لائے۔ تاہم عمل تحکیم کے چند پہلو واضح نہیں ہیں اور کمیٹی زبانی سماعت نہیں کر سکتی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ HRC کی کارروائیوں کی پبلسٹی اضافی طور پر کم ہوتی ہے اور عدالتی سماعتوں کی بہ نسبت اس کی عوامی تنقید و تفتیش کم ہو پاتی ہے۔ پھر بھی اس میں شبہ کی گنجائش بہت کم ہی ہے کہ HRC کے بہت سے فیصلوں پر سفارتی، سیاسی اور دانشورانہ نگاہ ڈالی گئی ہے اور یہ کہ حکومت عالمی برادری کے دباؤ میں HRC کے فیصلے کو نافذ کرتی ہے۔ لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ HRC کے فیصلوں کو ماننا اقوام متحدہ کے رکن ریاستوں کے لئے لازمی نہیں ہے اور انہیں جبراً نافذ نہیں کیا جاسکتا۔

قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے لئے اقوام متحدہ کا علی الاقل معیاری قانون

قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے متعلق مشہور ترین عالمی دستاویز UNSMR ہے۔ UNSMR کو بنیادی طور پر ایسے معیار کی فراہمی کے لئے تیار کیا گیا تھا جس کو انفرادی طور پر سبھی ملکوں کے قومی قانون فوجداری میں شامل کیا جاسکے، ایسی تبدیلیوں کے ساتھ جو ان ملکوں کی سماجی اور قانونی حالات کے متقاضی ہیں، یہ دستاویز بہت حد تک تمام پہلوؤں پر حاوی ہے، اس میں ۹۵ / اصولوں سے بحث کی گئی ہے۔ UNSMR دیوانی اور فوجداری قیدیوں کی سبھی قسموں بشمول ریمانڈ اور مخصوص قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کا کم از کم معیار تجویز کرتا ہے۔ اور شرط لگاتا ہے کہ قیدیوں کو قانون میں فراہم کردہ حقوق کے بارے میں مطلع کیا جائے، ان قوانین میں بنیادی ضروریات، مناسب اور صحت بخش غذا، صاف پینے کا پانی اور موزوں کپڑے کی شرطیں داخل ہیں۔

UNSMR کے مطابق یہ بھی لازمی ہے کہ قید خانوں میں مناسب طریقے پر افسران صحت رکھے جائیں جن کی ذمہ داریوں میں طہارت خانہ، غذا کی تیاری، حرارت و روشنی کے تعلق سے حفظان صحت کے اصول و معیار کی رپورٹنگ اور چھان بین شامل ہے۔ UNSMR سماجی و ثقافتی معلومات و اطلاعات تک قیدیوں کی رسائی کو برقرار رکھنے کی بابت بھی رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ ان قوانین کی ہدایت ہے کہ قیدیوں کو افراد خاندان اور نیک نام دوستوں سے مراسلت کرنے اور ملنے کی اجازت دی جانی چاہئے، قیدیوں کی رسائی ان لائبریریوں تک ہونی چاہئے جن میں تعلیمی و تفریحی مواد کا کافی ذخیرہ موجود ہو، ریڈیو اور اخبارات جیسے وسائل کے ذریعہ وہ باہری دنیا کی اہم خبروں سے وہ آگاہ رہیں، مذہب اور مذہبی سہولیات کے تعلق سے کچھ حد تک مفصل قوانین کے تحت قیدی مذہبی امور انجام دے سکتے ہیں، وہ مذہبی کتابیں رکھ سکتے ہیں اور اپنے مذہب کے باصلاحیت نمائندوں سے ملاقات بھی کر سکتے ہیں اور ملاقات سے انکار بھی کر سکتے ہیں، یہ بات قابل ذکر ہے کہ مذہب سے متعلق بہت سے قانونی بیانات مثلاً مذہبی کتابوں کی ملکیت یا مذہبی نمائندے کی تقرری وغیرہ غیر مشروط نہیں ہے، ہاں قید خانہ کے افسران کی اجازت سے قیدی ان قوانین کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں، قید خانہ کے افسران کے لئے قانون کے معیاروں پر اترنا اسی وقت ضروری ہے جبکہ ایسا کرنا ممکن ہو۔ UNSMR کی بہت سی شقیں قیدیوں کو اصولوں کا پابند بنانے سے متعلق ہے، یہ قوانین تمام بے رحم غیر انسانی اور ذلت آمیز سلوک کو ممنوع قرار دیتے ہیں، اور زیادہ مخصوص شقیں واضح طور پر بدسلوکی کی بہت ساری قسموں جیسے جسمانی سزا، قید تنہائی اور آلات بندش کو بطور سزا استعمال کرنے کی مختلف شکلوں کو ممنوع قرار دیتی ہیں۔ البتہ UNSMR قلت خوراک یا تبدیل شدہ غذا کو بطور سزا استعمال کرنے سے نہیں روکتا، غذائی پابندیاں عائد کی جاسکتی ہیں بشرطیکہ قید خانہ کا ڈاکٹر تصدیق کردے کہ قیدی اس سزا کو برداشت کر سکتا ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ UNSMR میں خواتین قیدیوں سے متعلق چار احکام موجود ہیں۔ خواتین قیدیوں کو مرد قیدیوں سے الگ رکھا جائے، ان کی نگرانی اور تلاشی صرف خواتین افسران یا اسٹاف کے ذریعہ کی جائے، حاملہ خواتین اور دودھ پلانے والی مائیں جو قید میں ہیں انہیں مخصوص سہولیات فراہم کی جائیں، اگر ممکن ہو سکے تو انہیں ولادت کے لئے باہر کسی ہاسپیٹل میں لے جانا چاہئے۔

قید خانوں کو محفوظ مقام بنانے کے لئے UNSMR کے بہت سے قوانین ہیں جو درج ذیل ہیں:

☆ ہتھکڑی وغیرہ کا استعمال منتقلی کے دوران فرار کے خلاف احتیاطی تدبیر کے طور پر ہونا چاہئے جس کی مدت ضرورت سے زیادہ نہ ہو، اس شرط کے ساتھ کہ

عدالت یا انتظامیہ کے عہدیدار کے سامنے پیش ہوتے ہی یا طبی اسباب کے مدنظر اسے ہٹا دیا جائے۔

☆ قیدخانوں کا ماحول ان سبھی لوگوں کے لئے جو یہاں رہتے اور کام کرتے ہیں محفوظ ہونا چاہئے، دوسرے لفظوں میں قیدیوں، ملازمین اور ملاقاتیوں کے لئے ان کا محفوظ ہونا ضروری ہے۔

☆ قیدخانہ کے کسی فرد کو اپنے جسمانی تحفظ کے تئیں کوئی اندیشہ نہ ہو۔

☆ زنجیروں اور فولاد کا استعمال بطور بندش کے نہیں ہونا چاہئے۔

☆ نظم ونسق کے قواعد اور اصول وضوابط پر سختی سے عمل کرایا جائے تاکہ مرتب سماجی زندگی جینے کا داعیہ ان کے اندر پیدا ہو اور سکورٹی کے انتظامات میں کمی نہ ہو البتہ ضرورت سے زیادہ پابندیاں عائد نہ کی جائیں۔

☆ اصول شکنی سے متعلق خطاؤں اور سزاؤں کی تعیین قانون یا مطبوعہ ہدایات کے مطابق ہونی چاہئے۔

☆ مبینہ جرم کی اطلاع اور اس کے مناسب دفاع کے لئے موقع فراہم کئے بغیر کسی قیدی کو سزا نہیں ملنی چاہئے۔

☆ تمام بے رحم غیر انسانی سزائیں بالکل ممنوع ہیں جن میں جسمانی سزا اور تاریک کوٹھریوں میں قیدیوں کو رکھنا شامل ہے۔

☆ بالکل تاریک وتنگ جگہ میں قید یا قلت خوراک کی سزا کبھی نہیں دینی چاہئے الا یہ کہ صحت کے عہدیدار اس بات کی تصدیق کردے کہ طبی طور پر قیدی اسے برداشت کرسکتا ہے۔

☆ سزا کے طور پر آلات بندش کا استعمال نہیں ہونا چاہئے۔

☆ جو قیدی اصول شکنی کے لئے تادیبی کارروائی کا سامنا کررہے ہیں انہیں اعلی عہدیداروں تک اپنی بات پہونچانے کا موقع ملنا چاہئے۔

اسی طرح بہتر طریقے سے قیدخانوں کے استعمال کے متعلق بہت سے احکام ہیں جو درج ذیل ہیں:

☆ قیدخانہ کے اصول وضوابط کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ قیدی جیل سے چھٹنے کے بعد بااصول زندگی گزارنے کے اہل ہوجائیں اور اپنی مدد آپ کرسکیں۔

☆ جہاں تک ممکن ہوسکے ان تمام سزا یافتہ قیدیوں سے کام لینا چاہئے جو طبی اعتبار سے تندرست ہیں۔ اس کام کی نوعیت ایسی ہو جو ان کے اندر مخصوص صلاحیت پیدا کرے تاکہ وہ سزا کاٹنے کے بعد سماج میں باعزت طریقے سے اپنی روزی روٹی کما سکیں۔

☆ فنی تربیت کا بندوبست خصوصا نوجوان قیدیوں کے لئے ہونا چاہئے۔

☆ قیدیوں کو اپنے کام کا معاوضہ دیا جائے۔

☆ قیدیوں کو اس بات کی اجازت ہونی چاہئے کہ وہ اپنی کمائی میں سے خود پر صرف کریں، اپنے اہل خانہ کو دیں اور کچھ بچت کریں۔

☆ تعلیم اور ثقافتی سرگرمیوں کے مواقع قیدیوں کو ملنے چاہئے جس سے ان کی حوصلہ افزائی ہو، اس میں کتب خانہ تک ان کی رسائی بھی شامل ہے۔

☆ ان پڑھ اور نوجوان قیدیوں کے لئے تعلیم لازمی ہونا چاہئے، قیدخانہ کے ذمہ داروں کو چاہئے کہ وہ اسے اپنی اولین ترجیحات میں شامل کریں۔

☆ قیدیوں کو کسی بھی مذہب کے باصلاحیت نمائندوں سے رابطہ قائم کرنے کا اختیار ملنا چاہئے۔

☆ قیدیوں کی سزا کے آغاز ہی سے قید سے فراغت کے بعد ان کی زندگی کے متعلق غور وغوض ہونا چاہئے اور سماج میں باعزت زندگی گزارنے کا اہل ہونے کی کوششوں میں اس کو تعاون ملنا چاہئے۔

☆ قیدیوں کے اندر باعزت معاشرتی زندگی گزارنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے مقصد سے سرگرم ایجنسیوں اور سروسوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ اس امر کو یقینی بنائیں کہ قیدی سزا کاٹنے کے بعد کے زمانے میں اپنی زندگی گزارنے کے لئے موجود وسائل وذرائع کا استعمال کرسکیں۔

چونکہ UNSMR کوئی عالمی معاہدہ نہیں ہے، اس لئے اس کی حیثیت قانونی نہیں ہے۔ قانون اول میں درج ہے: UNSMR'' کا منشا صرف یہ

ہے کہ قیدیوں کے ساتھ برتاؤ اور اس ادارے کے انتظام وانصرام کے تئیں جو رواج وقانون عموماً مسلم ہیں ان کی نشاندہی کرے“

اقوام متحدہ میں شامل رکن ریاستوں کے ذریعہ ان قوانین کے نفاذ کے موضوع پر لکھی گئیں پہلے کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت ہی کم ریاستوں نے ان قوانین کے اہم حصوں کو نافذ کیا ہے، بہت سی ریاستیں رپورٹ پیش کرنے میں ناکام ثابت ہوئی ہیں یا انہوں نے کافی تاخیر سے رپوٹیں پیش کی ہیں۔ ۱۹۹۴ء میں اقوام متحدہ کی اقتصادی اور سماجی کونسل نے قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے علی الاقل معیاری قوانین کے نفاذ کے موثر طریقے کو اختیار کیا، جس نے واضح کیا کہ قید وحراست میں مبتلا سبھی افراد کے تحفظ کی خاطر جو ریاستیں قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے علی الاقل معیاری قوانین کے معیار پر نہیں اترتیں انہیں ان قوانین کو اختیار کرنا چاہئے، ۱۹۶۷ء اور ۱۹۹۴ء کے درمیان UNSMR کے نفاذ کے متعلق اقوام متحدہ نے کئی سروے کرائے۔ ۱۹۹۸ء تک مجموعی طور پر ۹۹ ریاستوں نے UNSMR کی حیثیت کی بابت سوالوں کے جوابات دیے۔ ان جوابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جوابات فراہم کرنے والے تقریباً سبھی ملکوں نے ان قوانین کو اپنے قومی آئین میں شامل کیا ہے۔ تاہم ان ملکوں کی طرف سے فراہم کردہ معلومات کی توثیق کا کوئی وسیلہ موجود نہیں۔ کسی تجزیہ نگار کا قول ہی ”ان سروے کے جوابات دینے میں ریاستیں اپنے مفادات کو سامنے رکھتی ہیں، کہا جاتا ہے کہ ان قوانین نے وہاں رائج آئین پر اثر ڈالا ہے جبکہ ان اثرات کی شناخت مشکل ہوتی ہے۔“

یہ کہا گیا ہے کہ علی الاقل معیاری قوانین میں درج رفاہ عام کے اصول عالمی اعلانیہ برائے انسانی حقوق کا ایک جز ہے۔ اس رائے کو ان بہت سارے قوانین سے تقویت ملتی ہے جنہوں نے اہم عالمی معاہدوں کے قوانین برائے رفاہ عام کو اختیار کرلیا ہے۔ مثلاً UNSMR کا قانون ششم رنگ ونسل، مذہب وملت، جنس وجنسیت یا سیاسی وغیر سیاسی نظریئے، جائداد یا کسی اور حیثیت کی بنیادوں پر قیدیوں کے ساتھ امتیازانہ سلوک ورویہ کو حرام قرار دیتا ہے۔ اس تجزیئے سے اندازہ ہوتا ہے کہ UNSMR کا مقصد دوسرے عالمی دستاویزوں میں موجود بنیادی اصولوں کو وسعت دینا ہے نہ کہ اس کی تکرار اور قید خانہ کی انتظامیہ اور قیدیوں کے حالات کے مسائل پر ماہرانہ رہنمائی فراہم کرنا ہے۔

اقوام متحدہ کی کمیٹی برائے انسانی حقوق نے عالمی برادری کو یاددہانی کرائی ہے کہ UNSMR اور اس جیسے دوسرے دستاویزات ICCPR کی طرح دوسرے دستاویزات کے مواد کی تعیین میں کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ کمیٹی نے اشارہ کیا ہے کہ ICCPR کے آرٹیکل ۱۰(۱) (جس کی ہدایت کے مطابق آزادی سے محروم کردیئے گئے سبھی افراد کے ساتھ ان کے فطری وقار کو ملحوظ رکھتے ہوئے انسانی سلوک کیا جانا لازمی ہے) میں موجود مزید عمومی فریضہ کی ادائیگی کی بابت کمیٹی کو رپورٹ پیش کرتے وقت رکن ممالک کو ”اپنی رپورٹ میں یہ ضرور بتانا چاہئے کہ قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے تعلق سے اقوام متحدہ کا معیار کس حد تک قابل عمل ہے:

قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے لئے علی الاقل معیاری قوانین حراست وقید میں رکھے گئے سبھی افراد کے تحفظ کے لئے مجموعہ اصول اور دوسرے عالمی دستاویزات۔ اس تبصرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ Human Rights Committee کا ماننا ہے کہ UNSMR کی تعمیل ICCPR کی طرف سے عائد کردہ فریضہ کو صرف جزئی طور پر ادا کرتا ہے۔

علاقائی سطح پر قیدیوں اور قید خانوں کے متعلق اصلاحی وتحقیقاتی پروگراموں کے لئے UNSMR حوالے کی خاطر کافی اہم ہے۔

کسی بھی طرح کے قید وحراست میں رکھے گئے سبھی اشخاص کے لئے اقوام متحدہ کا مجموعہ قوانین (مجموعہ قوانین)

کسی بھی طرح کی حراست وقید میں رکھے گئے سبھی افراد کے لئے مجموعہ اصول کو اقوام متحدہ کے جنرل اسمبلی نے ۱۹۹۸ء میں منظور کیا ہے۔ اس مجموعہ اصول کو جو ۳۹ اصولوں پر مشتمل ہے جنرل اسمبلی کے ایک قرارداد سے ملحق ایک عمومی مجموعہ اصول کی حیثیت حاصل ہے؛ چنانچہ اسے کسی معاہدے یا اتفاق کی حیثیت حاصل نہیں ہے اور نہ ہی عالمی قانون میں اس کی پابندی لازمی ہے۔ لیکن جنرل اسمبلی کے ایک قرارداد کے نتیجہ میں جس کے اندر یہ بیان موجود ہے کہ ان اصولوں کو عام کرنے اور انہیں محترم بنانے کی غرض سے سبھی رکن ممالک کو ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے مجموعہ اصول کی منظوری کو ایک عالمی خصوصیت عنایت کرتا ہے۔

مجموعہ اصول تمام مقید افراد کے بنیادی حقوق انسانی کے تحفظ کی اہمیت کی تصدیق کرتا ہے۔ تعارفی بیان کی وضاحت ہے کہ مجموعہ اصول کا دائرۂ عمل کسی بھی طرح کی حراست وقید میں رکھے گئے سبھی افراد کی حفاظت تک وسیع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے زیادہ تر اصولوں کی عمومی اصطلاحات کی ذریعہ پوری وضاحت کی گئی ہے (برخلاف UNSMR کے مخصوص ومتعین احکام کے) تاکہ اس کا اطلاق حراست کی موجودہ مختلف شکلوں جیسے کم سنوں، نفسیاتی بنیادوں پر

محفوظ حراست، گرفتاری، ریمانڈ کی حراست، مقدمے کے بعد قید تعزیراتی جرم کے ثبوت پر سزا کی توثیق وغیرہ پر اطلاق کیا جاسکتا ہے۔

بہت سے اصول جرم کی پاداش میں سزا یافتہ قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے تعلق سے کافی اہمیت کے حامل ہیں، مثلاً قیدیوں کو ان کے حقوق کے متعلق اطلاعات فراہم کیا جانا چاہئے اور ایسے وسائل تک ان کی رسائی ہونی چاہئے جن کے ذریعہ وہ اپنے حقوق کی لڑائی لڑسکیں۔ قید خانہ کے ذمہ داروں کو چاہئے کہ وہ قیدیوں کی درخواست کہ انہیں حتی الامکان ان کے گھر کے قریب رکھا جائے، اس پر عمل درآمد کی پوری کوشش کریں، اور قیدیوں کو مسلسل اپنے خویش واقارب اور قانونی مشیر کاروں سے رابطے کی اجازت ہونی چاہئے۔ خویش واقارب کے ساتھ قیدیوں کے رابطہ پر قانونی بندشیں لگائی جاسکتی ہیں مگر قانونی نمائندوں سے ان کے رابطہ پر بے حد اہم استثنائی صورتوں میں ہی پابندی عائد کی جاسکتی ہے۔ قید خانہ کے اصول وضوابط کیا ہیں، اصول شکنی کی صورت میں کیا سزائیں اور جرمانے عائد کئے جاسکتے ہیں ان سب کی وضاحت قانون کے ذریعہ ہونی چاہئے اور مناسب اشاعت بھی ہونی چاہئے۔ قیدیوں کو اصول پسندی کی کارروائیوں میں اپنا موقف واضح کرنے اور اور اصول شکنی کا مرتکب پائے جانے کی صورت میں اس فیصلے پر نظر ثانی کرانے کا موقع ملنا چاہئے۔

قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے لئے بنیادی اصول وضوابط

۱۴/ دسمبر ۱۹۹۰ء کو جنرل اسمبلی نے قیدیوں ک ساتھ برتاؤ کے لئے بنیادی اصول کو منظوری دی۔ مجموعی طور پر گیارہ اصولوں پر مشتمل یہ دستاویز ایسے حقوق وتحفظات کی ایک مفصل فہرست فراہم کرتا ہے جن کے قیدی مستحق ہیں۔ اس میں درج ذیل اصول ہیں:

☆ چونکہ سبھی قیدی انسان ہوتے ہیں احترام آدمیت کا انہیں حق حاصل ہے۔ ان کے ساتھ انسانی سلوک ہونا چاہئے۔

☆ رنگ ونسل، جنس وجنسیت، زبان ومذہب، سیاسی یا کسی اور نظریئے، جائداد یا کسی بھی دوسری حیثیت کی بنیادوں پر قیدیوں کے ساتھ فرق وامتیاز نہیں کیا جانا چاہئے۔

☆ قیدیوں کے مذہب اور ان کی جماعتوں کی تہذیبی روایات کا احترام مطلوب ہے۔

☆ قیدیوں کی حراست اور معاشرے کو جرائم سے محفوظ رکھنے کے تعلق سے قید خانہ کی ذمہ داری کی ادائیگی اس طرح ہو کہ معاشرے کے تمام افراد کی فلاح وبہبود اور ترقی کے تئیں ریاست کے تمام تر مقاصد وواجبات پورے ہوسکیں۔

☆ اسیری کی ناگزیر ولازمی پابندیوں کو چھوڑ کر) International Bill of Human Rights اس بل میں Universal Declaration of Human Rights International Covenant on Economic, Social and Cultural Rights/ICECR ، ICCPR اور اس کے اختیاری پروٹوکول) نیز اقوام متحدہ کے دوسرے معاہدوں میں مذکور حقوق انسانی اور دوسرے تمام حقوق وآزادی کے مستحق ہیں۔

☆ انسان کی صلاحیتوں کو ابھارنے کے مقصد سے تعلیمی وثقافتی سرگرمیوں میں شرکت کا حق سبھی قیدیوں کو حاصل ہے۔

☆ قید تنہائی بطور سزا کو ممنوع یا اس کے استعمال کو کم کرنے کی تمام تر کوششیں ہونی چاہئے اور ان کی ہمت افزائی بھی ہو۔ ایسے ماحول پیدا کئے جائیں جن میں قیدی بامعنی ملازمت کے لئے تیار ہوسکیں تاکہ وہ اپنے اور اپنے افراد خاندان کے لئے باعزت طریقے سے روزی روٹی کا بندوبست کرسکیں۔

☆ قیدی قانونی حیثیت سے قطع نظر ملک میں فراہم سبھی طبی سہولیات سے مستفید ہونے کا استحقاق رکھتے ہیں۔

☆ برادری اور سماجی اداروں کی شرکت وتعاون کے ساتھ اور جرائم کے شکار لوگوں کے مفادات کو نگاہ میں رکھ کر سابق قیدیوں کو معاشرے میں بحال کرنے کے مقصد سے بہتر سے بہتر ماحول پیدا کرنا چاہئے اور۔

☆ مذکورہ بالا سبھی اصولوں کی پابندی غیر جانبدارانہ طریقے سے ہو۔

بچوں کی غلط کاریوں کی روک تھام کے لئے اقوام متحدہ کی ہدایات ۱۹۹۰ء (ریاض اصول) Juvenile Justice کی انتظامیہ کے لئے اقوام متحدہ کے علی الاقل معیاری قوانین ۱۹۸۵ء (بے جنگ قوانین)

۱۴/ دسمبر ۱۹۹۵ء کو جنرل اسمبلی نے نابالغ قیدیوں کے متعلق ایک اہم دستاویز (جو ریاض اصول سے مشہور ہے) کو منظوری دی، بنیادی اصولوں کے مقابلے یہ دستاویز زیادہ مفصل ہے جس میں ۶۶/ اصول مذکور ہیں، اسی طرح بیجنگ قوانین ۳۰/ اصولوں پر مشتمل ہیں، یہ دونوں دستاویزات درج ذیل قوانین و ہدایات کی وضاحت کرتے ہیں جن کا اطلاق نابالغوں پر ہونا چاہئے۔

☆ مقید بچوں کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے جس سے ان کی عزت نفس میں اضافہ ہو، وہ معاشرے میں باوقار زندگی گذار سکیں، ان کے مفادات و ضروریات کا پورا خیال رہے۔

☆ امکان نجات کے بغیر بچوں کو سزائے موت، عمر قید یا کسی طرح کی جسمانی سزا نہیں ملنی چاہئے۔

☆ مقید بچوں کو بالغ قیدیوں سے الگ رکھا جائے۔

☆ ملزم بچوں کو بڑوں سے الگ رکھا جائے اور حتی الامکان جلد از جلد انہیں عدالتی کارروائی کے لئے پیش کیا جائے۔

☆ نابالغ قیدیوں کو اپنے اہل خانہ سے مراسلت کرنے اور ملنے کی اجازت کی خاطر خصوصی طور پر کوشش ہونی چاہئے۔

☆ مقید بچوں کی پرائیوسی کا احترام ہونا چاہئے اور ان کا محفوظ و مکمل ریکارڈ رکھا جانا چاہئے۔

☆ لازمی اسکول عمر کے بچوں کو تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت کا حق حاصل ہے۔

☆ جن اداروں میں نابالغ بچے ہوں وہاں ہتھیار نہیں لے جانا چاہئے۔

☆ اصول پسندی کی کارروائیاں ایسی ہوں جن سے بچوں کی عزت نفس میں کوئی فرق نہ آئے اور ان کے اندر احساس انصاف اور حقوق انسانی کا احترام پیدا ہو

☆ نابالغوں کی موت، زخمی ہونے، بیماری، چھٹکارا، منتقلی اور داخلے کی اطلاع ان کے والدین کو دی جانی چاہئے۔

قانون نافذ کرنے والے افسران کے لئے ضابطہ اخلاق

۱۷/ دسمبر ۱۹۷۹ء میں جنرل اسمبلی نے قانون نافذ کرنے والے افسران کے لئے ضابطہ اخلاق کو منظوری دی، ضابطہ اخلاق نے "Law Enforcement" کی اصطلاح کی تعریف یہ کی ہے: اس میں قانون کے وہ سبھی افسران شامل ہیں جو پولس کے اختیارات خصوصاً گرفتاری اور تحویل کے اختیارات استعمال کرتے ہیں، فوجی عہدیداران خواہ وہ یونیفارم میں ہوں یا نہ ہوں اور ریاست کے سکورٹی فورسیز جو پولس کے اختیارات استعمال کرتے ہیں وہ بھی اس میں شامل ہیں، ضابطہ اخلاق کی شرط کے مطابق افسران کا فرض منصبی ہے کہ وہ حقوق انسانی کا احترام کریں، اپنی ذمہ داریوں کے نبھانے کے لئے شدید ضرورت کے وقت ہی طاقت کا استعمال کریں، خفیہ رکھنے والی چیزوں کو خفیہ رکھیں الا یہ کہ فرض کی ادائیگی اور انصاف کی ضرورتوں کی خاطر اسے افشا کرنا پڑے، انہیں چاہئے کہ وہ ٹارچر یا کسی اور بے رحم غیر انسانی برتاؤ میں ملوث ہوں اور نہ ہی اسے برداشت کریں۔ اسی طرح اعلی عہدیداروں کے فرمان، استثنائی حالات جیسے حالت جنگ، قومی سلامتی کو خطرہ، اندرونی سیاسی اتھل پتھل یا کسی بھی پبلک ایمرجنسی کو ٹارچر کے لئے بہانہ نہ بنائیں۔ ان کی تحویل میں جو افراد رکھے گئے ہیں ان کی صحت کی مکمل حفاظت کریں، خصوصاً ضرورت کے وقت طبی سہولیات فراہم کریں، انہیں کوئی نامناسب حرکت نہیں کرنی چاہئے، ضابطہ اخلاق کا آرٹیکل ۸ ان کو پابند کرتا ہے کہ وہ قانون و ضابطے کا احترام کریں، جہاں تک ہو سکے وہ ان اصولوں کی خلاف ورزی کو روکیں اور اس کی مخالفت کریں۔ اس میں یہ مذکور ہے کہ جو کوئی یہ مانتا ہے کہ اس ضابطے کی خلاف ورزی ہو رہی ہے یا ہو سکتی ہے اس کی اطلاع اپنے سینئر عہدیداروں کو کرنی چاہئے اور ضرورت پڑے تو ان محکموں اور ذمہ داروں کو بھی بتانا چاہئے جن کو نظر ثانی یا تدبیر کا اختیار حاصل ہے۔

خلاصہ: آگے کی راہ

قید خانوں اور قیدیوں سے متعلق سب سے اہم اور مفصل دستاویزات معاہدے نہیں ہیں لیکن UNSMR، اقوام متحدہ کا مجموعہ قوانین، BPT، بیجنگ رولس ریاض ہدایات اور قانون نافذ کرنے والے افسران کے لئے ضابطہ اخلاق جیسے دستاویزات غیر لازمی ہونے کے باوجود رہنما اصول و ہدایت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قیدیوں کی حیثیت اور ان کے ساتھ برتاؤ کے متعلق اگرچہ ان دستاویزات میں اعلانات موجود ہیں تاہم انہیں معاہدوں کا رتبہ و اثر میسر نہیں۔ ان

اصول وقوانین اور ہدایات نے قیدیوں کے حقوق سے متعلق ملکی قانون کی تدوین میں ریاستوں کا تعاون کیا ہے۔ The Human Rights Committee اور The Committee against Torture ((Under UN Convention against Torture انسانی برتاؤ کئے جانے کی بابت قیدیوں کا حق، آزادی اور سکورٹی کا حق (آرٹیکل ۹) اور ٹارچر اور غیر انسانی سلوک سے آزادی کے تعلق سے ICCPR کے جو قانونی بیانات ہیں ان کے مفہوم ومتن کی تعیین ووضاحت کے لئے ان دستاویزات کا استعمال کرسکتی ہیں۔ ICCPR، Convention against Torture اور کچھ حد تک جنیوا کنونشن کے تحت قیدیوں کے حقوق کا تحفظ اور بہتر طریقے سے کیا جاسکتا ہے۔ پہلے والے دستاویزات میں عالمی انسانی حقوق کی تعمیل کے تعلق سے رپورٹنگ کے طور طریقے، انفرادی درخواست کا نظام اور دوسرے بین ریاستی شکایت میکانزم جیسے نفاذ وپیش رفت کے ضروری وسائل کا تذکرہ موجود ہے لیکن بدقسمتی سے دوسرے دستاویز (جنیوا دستور) میں ایسا کوئی میکانزم نہیں ہے۔ یہ بات ذہن نشیں رہے کہ گذشتہ تین دہائیوں میں انفرادی ابلاغ کے موضوع پر انسانی حقوق کمیٹی کی فقہیات کا ایک بڑا حصہ منظر عام پر آچکا ہے۔

جیسا کہ سبھی جانتے ہیں، CAT اور ICCPR کے رکن ممالک میں بہت ہی کم ایسے ہیں جو انسانی حقوق کے اصولوں کی پابندی کرتے ہیں ان میں بہت تو ایسے ہیں جہاں کے شہریوں کے حقوق انسانی کو پامال کیا جاتا ہے جن میں مقید افراد شامل ہیں۔ چونکہ ٹارچر توہین انسانیت پر مبنی ہے کسی ریاست کے لئے کسی بھی فرد کو ٹارچر کرنے کی اجازت نہیں۔ کچھ ریاستوں نے ICCPR قوانین سے حق استثناء (تحفظات) کا استعمال کیا ہے۔ مثلاً ہندوستان حکومت نے آرٹیکل ۹ کے پیراگراف پانچ سے اپنے کو مستثنی کرلیا ہے جس کے مطابق "غیر قانونی گرفتاری وحراست کے شکار افراد معاوضے کا لازمی حق رکھتے ہیں"۔ علاوہ ازیں ہندوستان کی حکومت نے انسداد دہشت گردی کے لئے پوٹا (Prevention of Terrorist Act)، ٹاڈا (Terrorist and Disruptive Activiteis Act) جیسے بہت سے قوانین بنائے جس کے تحت بہت سے لوگوں کے حقوق انسانی کی خلاف ورزی کی گئی۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں پنجاب کے مسئلہ میں پولس کی زیادتیوں، جعلی انکاونٹر، مشتبہ دہشت گردوں کی خفیہ اسیری جیسے بہت سے الزامات حکومت ہند پر عائد کئے گئے تھے۔ اب تک اس غیر قانونی عمل میں ملوث افراد کے خلاف مقدمہ چلایا گیا اور نہ ہی ان کو سزا دی گئی۔

قیدیوں کی حالت سدھارنے کے مقصد سے کچھ عمومی تجاویز پیش کئے جارہے ہیں:

زیادہ سے زیادہ ریاستوں کو ICCPR اور انفرادی طور پر درخواست دینے کے لئے اس کے اختیاری پرٹوکول اسی طرح Convention agains Torture اور انفرادی طور پر درخواست دینے کے لئے اس کے اختیاری پرٹوکول پر دستخط کرنے کے لئے نہ صرف آمادہ کیا جائے بلکہ قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے متعلق اقوام متحدہ کے غیر لازمی دستاویزات کے طرز پر ملکی آئین کی تدوین پر آمادہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ مقید افراد کے حقوق کے متعلق بہت سے غیر لازمی دستاویزات کے قوانین، IHL اور International Bill of Human Rights کے متعلق لوگوں کو واقف کرانے کی شدید ضرورت ہے۔

References and Bibliography / webliography

Amnesty International, A Guide to the United Nations Body of Principles for the Protection of all Persons under Any Form of Detention or Imprisoment (AI Index IOR/52/04/08)

Birgdom, Astrid and Perlin, Michael L. " 'Tolling for the Luckless, the Abandoned and Forsaken': Community Safety, Therapeutic Jurisprudence and International Human Rights Law as Applied to Prisoners and Detainees", Legal and Criminological Psychology, Vol. 13, 2008

Kumar, Ram Narayan, " The Matter of Mass Cremations in Punjab: A Window into the State of Impuntiy in India", in Abdulrahim P. Vijapur (ed.), Implementing Human Rights in the Third World - Esssays on Human Rights, Dalits and Minorities (New Delhi: Manak Publications, 2008)

McGoldrick, Dominic, The Human Rights Committee: Its Role in the Development of the ICPR (Oxford: Clarendorn Press, 1991)

Morgan, Roy, and Evans, Michael, Protecting Prisoners -The Standards of the European Committee for the Prevention of Torture in Context (1999)

Rodley, Nigel, The Treatment of Prisoners Under International Law, 2nd ed, (Oxford: Clarendon Press, 1999)

Steiner, Henry J., Alson, Philip, Goodman, Ryan, International Human Rights in Context - Law, Politics, Morals, Third Edition (Oxford: Oxford University Press, 2008)

Stocker, Daniel, "World Implementation of the Unted Nations Standard Minimum Rules for the Treatment of Prisoners", Journal of International Law and Economics, Vol. 10, 1975

Togabu Report (www.npr.org/iraq/2004_abuse_pdf)

Toaman, Jiri, "Quasi-Legal Standards and Guidelines for Protecting Human Rights", in Hurst Hannum (ed.), Guide to International Human Rights Practice, 4rd edn. (New York: Transnational Publications, 2004)

Treves, Tullio, "The UN Body of Principles for the Protection of Detained or Imprisoned Persons", American Journal of Interntional Law, Vol. 84, 1990

A Compilation of Intenational Human United Nations, Human Rights and Prisons - Rights Instruments concerning the Administration of Justice (New York / Geneva: United Nations, 2005)

A Pocketbbook of International Human Rights Unted Nations, Human Rights and Prisons - Standards for Prison Officials (New York and Geneva: United Nations, 2005)

Studies in Human Rights (New Vijapur, Abdulrahman P., The United Nations of Fiffy - delhi: South Asian Publishers, 1996)

Vijapur, Abdulrahman P., and k. Savitri, "The International Covenants on Human Rights: An Overview", India Quaterly, Vol. 62, No. 2, April-June 2006, pp. 1-37

(7,217 words)

17 December 2008

☆☆☆

مسلمانوں کی کثیر تعداد جیلوں میں - سچر کے اعداد و شمار

محترمہ سیما چشتی [1]

جسٹس راجندر سچر کمیٹی نے ریاستوں سے جو اعداد و شمار حاصل کئے ہیں ان سے ہندوستان میں مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے تعلیم اور ملازمت کے مقابلے میں جہاں مسلمانوں کی موجودگی انتہائی کم ہے یہ بڑی تلخ متضاد پوزیشن ہے کہ جیلوں میں ان کی موجودگی ان کی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ ہے بلکہ بعض ریاستوں میں جیل سے باہر مسلمانوں کی آبادی کا فیصد کافی کم ہے جبکہ جیل خانوں میں ان کی تعداد ان کی آبادی کے تناسب سے بہت زیادہ ہے۔

پھر یہ اہم اعداد و شمار جنہیں پہلی بار انگریزی روزنامہ انڈین ایکسپریس نے ۲۹ اکتوبر کی اشاعت میں پیش کیا ہے سچر کمیٹی کی اس فائنل رپورٹ میں شامل نہیں کئے گئے ہیں جو آئندہ ہفتہ پارلیمنٹ میں پیش کی جائے گی۔

ان اعداد و شمار کا حذف کیا جانا حیرت انگیز ہے جن میں مسلمان قیدیوں کی اتنی کثیر تعداد بتائی گئی ہے اس کے سنگین سیاسی و سماجی اثرات ہو سکتے ہیں اس سے مسلمان قومی زندگی میں اور بھی الگ تھلگ پڑ سکتے ہیں، جمود اور عصبیت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

جب جسٹس سچر سے ان اعداد و شمار کو حذف کرنے کے بارے میں پوچھا گیا تو ان کا کہنا تھا کہ کیونکہ رپورٹ وزیر اعظم کو پیش کی جا چکی ہے اور عنقریب پارلیمنٹ کے روبرو پیش کی جائے گی لہذا اس کے کسی پہلو پر تبصرہ کرنا میرے لئے مناسب نہیں ہوگا۔

حذف کردہ اعداد شمار بتاتے ہیں کہ مسلم قیدیوں کی تعداد کے تناسب کی بابت مہاراشٹرا، گجرات اور کیرالہ میں صورت حال سب سے زیادہ غیر متناسب ہے۔

مہاراشٹرا میں مسلم قیدیوں کا فیصد ریاست کی مجموعی آبادی میں ان کے تناسب سے کہیں زیادہ ہے۔ ریاست میں مسلمان آبادی کا تناسب ۱۰٫۶ فیصد ہے جبکہ مسلمان قیدیوں کا فیصد قیدیوں کی مجموعی تعداد کا ۳۲٫۴ ہے۔

جہاں تک ایسے قیدیوں کی تعداد کی بات ہے جو ایک سال سے کم عرصہ سے قید ہیں تو مہاراشٹرا کے تمام ایسے قیدیوں میں مسلمانوں کا تناسب ۴۰٫۶ فیصد ہے۔

گجرات میں مسلمان ریاست کی آبادی کا محض ۹٫۶ فیصد ہیں جبکہ مسلمان قیدیوں کا تناسب قیدیوں کی مجموعی تعداد کا چوتھائی (۲۵ فیصد) ہے۔ جموں کشمیر کے بعد آسام ملک کی دوسری ریاست ہے جہاں مسلم آبادی کا تناسب سب سے زیادہ ہے یعنی ۳۰٫۹ فیصد جبکہ مسلم قیدیوں کا فیصد ۲۸٫۱ فیصد ہے۔

کرناٹک میں دیگر ریاستوں کے مقابلے مسلمانوں کو ملازمت کے زیادہ مواقع میسر ہیں لیکن وہاں بھی ایسا ہی رجحان پایا جاتا ہے۔ ریاست کی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ۱۲٫۲۳ فیصد ہے جبکہ مسلمان قیدیوں کا فیصد ۱۷٫۵ ہے۔

دہلی میں مسلمان آبادی کا ۱۱٫۷ فیصد ہیں لیکن ایسے قیدیوں کی تعداد جو ایک سال سے کم عرصہ سے جیل میں ہیں مسلمانوں کا تناسب ۲۹٫۱ فیصد ہے۔

جناب وجاہت حبیب اللہ چیف انفارمیشن کمشنر کا خیال ہے کہ ان اعداد و شمار کو رپورٹ میں شامل کیا جانا چاہئے تھا۔ اسے حذف کرنے کے بارے میں ان کے اپنے دلائل اور وجوہ ہو سکتے ہیں لیکن مسلمانوں کی حالت اور ملک میں جن مسائل سے وہ دوچار ہیں اسے مجموعی تناظر میں سمجھنے اور دیکھنے کے لئے یہ اعداد و شمار رپورٹ میں شامل کئے جانے چاہئے۔

ان اعداد و شمار سے مرتب ہونے والے اثرات پر متعدد ماہرین نے سوالات اٹھائے ہیں۔ بی ایس ایف کے سابق سربراہ پرکاش سنگھ جن کی پی آئی ایل پر سپریم کورٹ نے پولس میں اصلاحات کا حکم جاری کیا، کا کہنا ہے کہ ان اعداد و شمار سے پولس کا تعصب ظاہر نہیں ہوتا۔ دیگر ماہرین اسے مسلمانوں کے افلاس سے جوڑتے ہیں قومی سطح پر ۲۸ فیصد کے مقابلہ میں مسلمانوں میں غربت ۴۴ فیصد ہے۔ روزگار کے مواقع اور قانونی امداد نہ ملنا بھی اس کا سبب ہے۔ ۲۵ / نومبر ۲۰۰۶ء۔

---

[1] سینئر صحافی بی بی سی۔

جیل خانہ میں مسلمانوں کو تناسب سے زیادہ نمائندگی

جناب سالار محمد خان[1]

تعلیم اور روزگار کے میدانوں میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب کے اعتبار سے بہت ہی کم حصہ ملتا ہے اگر جیلوں کو دیکھا جائے تو یہ بہت بڑا تضاد نظر آئے گا کہ وہاں مسلمان اپنی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ موجود ہیں بلکہ بعض ریاستوں میں تو صورت حال یہ ہے کہ جیلوں کے اندر مسلمانوں کو ان کی آبادی کے فیصد سے بھی زیادہ نمائندگی حاصل ہے جبکہ جیل سے باہر آبادی میں ان کا فیصد کافی کم ہے (یعنی مسلمان آزاد کم ہیں قیدی زیادہ ہیں)۔

یہ صورت حال ان معلومات پر مبنی ہے جو جسٹس راجندر سچر کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں پیش کی ہے سچر کمیٹی وزیر اعظم نے مقرر کی تھی تاکہ ملک میں مسلمانوں کی جو حالت ہے اس کا قومی سطح پر جائزہ لیا جائے۔ کمیٹی کے اس انکشاف کے بڑے دوررس سماجی اور سیاسی اثرات ہو سکتے ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ قید و بند میں مبتلا مسلمانوں کی اس کثیر تعداد کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان قومی زندگی میں اور بھی الگ تھلگ پڑ جائیں گے۔ تعصب اور بدگمانیاں اور بھی زیادہ گہری جڑ پکڑیں گی۔

اگرچہ اس کی تفصیل دستیاب نہیں ہے کہ مسلمان قیدیوں کی اتنی بڑی تعداد کس جرم میں قید خانوں میں پڑی ہے تاہم ذرائع کا کہنا ہے کہ سروے کے تحت ان قیدیوں کی مجموعی تعداد ۱۰۲۶۵۲ ہے، اور ان میں سے اکثریت دہشت گردی کے جرم میں ماخوذ نہیں ہے۔

ایک درجن ایسی ریاستوں سے جہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب کافی اہم ہے، کہا گیا تھا کہ وہ اپنے وہاں مسلمان قیدیوں کی تعداد، وہ قیدی جن پر جرم ثابت ہو چکا ہے اور وہ قیدی جن کے مقدمات زیر سماعت ہیں، ان سب کے بارے میں اعداد و شمار فراہم کریں۔ مغربی بنگال، اتر پردیش، بہار اور آندھرا پردیش نے کمیٹی کو مطلوبہ اعداد و شمار فراہم نہیں کئے۔ اس طرح زیر بحث اعداد و شمار صرف آٹھ ریاستوں سے متعلق ہیں۔

اتفاق سے مغربی بنگال، اتر پردیش، بہار وہ ریاستیں ہیں (جیسا کہ انگریزی روزنامہ انڈین ایکسپریس نے اس ہفتہ کی اشاعت میں بتایا ہے) جہاں سرکاری ملازمتوں بشمول ریاست کے سرحدی زمرہ کے انڈرٹیکنگ (ریاستی نگرانی میں چلنے والے ادارے) میں مسلمانوں کی نمائندگی انتہائی حد تک کم ہے یہی صورت حال نچلی سطح کی عدلیہ میں بھی ہے۔

سنڈے ایکسپریس نے جو اعداد و شمار فراہم کئے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ مہاراشٹرا، گجرات اور کیرالہ میں مسلمان قیدیوں کی تعداد سب سے زیادہ غیر متناسب ہے۔

۱- مہاراشٹرا میں تمام زمروں کے تحت (ملاحظہ ہو چارٹ) مسلمان قیدیوں کا فیصد ریاست میں ان کی آبادی کے تناسب سے بہت زیادہ ہے، ریاست میں مسلم آبادی ۶ء۱۰ فیصد ہے جبکہ مسلمان قیدیوں کا فیصد تناسب ۴ء۳۲ فیصد ہے۔

ایسے قیدیوں کا تناسب جو ایک سال سے کم عرصہ سے قید ہیں، اس میں مہاراشٹرا کے تمام قیدیوں میں مسلمانوں کا فیصد ۶ء۴۰ فیصد ہے۔

۲- گجرات کی مجموعی آبادی میں مسلمانوں کا فیصد صرف ۹-۶ ہے جبکہ قیدیوں کی مجموعی تعداد میں ایک چوتھائی مسلمان ہیں۔

۳- ملک میں آسام ایسی دوسری ریاست ہے جہاں جموں کشمیر کے بعد مسلمانوں کا تناسب آبادی سب سے زیادہ ہے۔ آسام میں مسلمانوں کی

[1] ایڈووکیٹ ہائی کورٹ، دہلی۔

آبادی کا تناسب ۹ء۳۰ فیصد ہے جبکہ مسلمان قیدیوں کا تناسب ۱ء۲۸ ہے۔

۴۔ کرناٹک میں بھی جہاں دیگر ریاستوں کے مقابلے میں مسلمانوں کو ملازمت کے بہتر مواقع دستیاب ہیں وہاں بھی اسی قسم کا رجحان پایا جاتا ہے۔

یہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۲۳ء۱۲ فیصد ہے جبکہ مسلمان قیدیوں کا تناسب ۵ء۱۷ فیصد ہے۔

بارڈر سیکورٹی فورسز (بی ایس ایف) کے سابق ڈائریکٹر جنرل پرکاش سنگھ جن کی مفاد عامہ کی عرضداشت (بی آئی ایل) پر سپریم کورٹ نے پولس میں اصلاحات کا حکم جاری کیا۔ کہا کہ میں ان اعداد وشمار پر بحث ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ پولس پر غیر منصفانہ شک وشبہ کیا جاتا ہے۔ دہشت گردانہ حملوں یا فرقہ وارانہ فسادات کی صورت میں اگر پولس تشدد کرنے والوں کی دارو گیر کرتی ہے اور پکڑے جانے والوں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو تو اب محض سیکولرزم کے نام پر یہ توقع نہیں کر سکتے کہ پولس انہیں ان کی آبادی کے تناسب سے ہی گرفتار کرے گی۔

دیگر ماہرین کی رائے ہے کہ افلاس اس رجحان کا خاص سبب ہے سچر کمیٹی کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق قومی پیمانے پر افلاس کی سطح ۲۸ فیصد ہے جبکہ اس کے مقابلہ میں شہری علاقوں میں مسلمانوں کے درمیان یہ تناسب ۴۴ فیصد تک پہنچ گیا ہے۔

جناب وجاہت حبیب اللہ جو سابق سینئر سرکاری افسر جو اس وقت چیف انفارمیشن کمشنر کے عہدہ پر فائز ہیں، ان کا کہنا ہے کہ مسلمان قیدیوں کی تعداد کی کثرت اس حقیقت کی عکاس ہے کہ مسلمان عام طور پر زیادہ غریب ہیں اور پولس انہیں بے دریغ اٹھا لے جاتی ہے، اور وہ استحقاق وتحفظ کی کمی کے سبب بآسانی پولس کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف تعصب بھی پایا جاتا ہے اور غربت وافلاس کے سبب اس کی شدت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

سابق ممبر پارلیمنٹ اور مسلم مجلس مشاورت کے صدر سید شہاب الدین کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں اور امریکہ میں افریقی امریکیوں کے درمیان ایک قسم کی یکسانیت ہے۔

سنیما اور میڈیا جیسے ضمنی شعبوں میں مسلمانوں کو بہتر نمائندگی حاصل ہے اسی طرح غنڈہ گردی میں بھی وہ آگے ہیں چونکہ عام ملازمتوں اور روزگار میں انہیں مواقع دستیاب نہیں ہوتے۔

پھر آخر وہ کیا کریں؟ لہذا وہ پولس اسٹیشنوں (تھانوں) میں بکثرت لے جائے جاتے ہیں، اور پھر ایسے کاموں میں الجھ جاتے ہیں جن میں انہیں الجھنا نہیں چاہئے یہ وہی صورت حال ہے جو امریکہ میں افریقی نسل کے امریکیوں کے ساتھ پیش آتی ہے۔ ملک کی ابادی میں ان کا جس قدر تناسب ہے اس سے کہیں زیادہ تناسب میں ان کی تعداد جیلوں میں بند ہے۔ جب روزگار کے پورے مواقع میسر نہ ہوں تو پھر جرم ہی روزگار بن جاتا ہے۔

سید شہاب الدین کا یہ بھی کہنا ہے کہ مسلمان قیدیوں کی کثرت تعداد کا ایک سبب پولس میں ان کے خلاف تعصب اور انہیں قانونی امداد نہ ملنا بھی ہے یہ کلیہ کہ مسلمان دہشت گرد ہوتے ہیں پولس میں مسلم مخالف ذہن کی پیداوار ہے اگر کوئی مسلمان ملزم ہے تو وہ ایک کے بجائے دس مسلمانوں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں وہ ہمیشہ اس وقت گرفتاریاں کرتے ہیں جبکہ اس اقدام کی ضرورت نہیں ہوتی چنانچہ وہ ان کے خلاف الزامات ثابت نہیں کرپاتے (۱۲۹ کتوبر ۲۰۰۶ء)۔

☆☆☆

تیسرا باب / تفصیلی مقالات

کسی اور گھر میں باندھ دینے یا بند کردینے کا حکم دیا جاتا تھا، لیکن حضرت علیؓ کے دور میں اس کا باقاعدہ مکمل نظم ہوا اور آج تک رائج ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: البحر الرائق ۶/ ۲۸۳، الدر المختار مع رد المحتار ۴/ ۳۴۸ تا ۳۵۶، فتح القدیر ۶/ ۳۷۵، ابوداؤد: کتاب الجہاد مختلف ابواب)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلام میں قید کرنا ثابت ہے، لہذا لازما جیل اور اس کی متعلقہ چیزیں بھی ثابت ہوجائیں گی، قید کرنے کا ثبوت کتاب وسنت سے بھی ہے اور اجماع سے بھی ہے۔

جہاں تک کتاب اللہ کا تعلق ہے تو قید کا استدلال اس آیت کریمہ سے کیا جاتا ہے:

"إنما جزاء الذين يحاربون الله (الى) أو ينفوا من الأرض" (سورۃ المائدہ: ۳۳)۔

چنانچہ احناف اور مالکیہ نے "ینفوا" سے قید کرنا مراد لیا ہے، امام ابوبکر جصاص فرماتے ہیں:

"واختلف فی النفی فقال أصحابنا هو حبسه حيث يرى الإمام وروى مثله عن إبراهيم" (احکام القرآن للجصاص ۲/۴۱۲)

علامہ قرطبی فرماتے ہیں:

"وقال مالك أيضا والكوفيون نفيهم سجنهم فينفى من سعة الدنيا إلى ضيقها" (الجامع لاحکام القرآن ۶/۱۵۲)۔

جہاں تک احادیث کا تعلق ہے تو بے شمار لوگوں کے قید کرنے کا ذکر ملتا ہے، مثلاً: ثمامہ ابن اثال (مسلم، جہاد، باب ربط الاسیر وحبسہ، ابوداؤد جہاد، باب فی الاسیر یوثق) اور سہیل ابن عمرو (ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی الاسیر) وغیرہ کے قید کا ذکر ہے اسی طرح ایک شخص کو تہمت میں قید کرنے کا ذکر ہے۔ (نسائی، کتاب قطع السارق، باب امتحان السارق)۔

اجماع کے متعلق الموسوعۃ الفقہیہ میں ہے:

"أما الإجماع فقد أجمع الصحابة رضی الله عنهم ومن بعدهم على المعاقبة بالحبس" (مادہ تعزیر ۱۶/۲۶۸)۔

۱- ثبوت جرم سے پہلے قید کرنے کا مسئلہ

جس طرح نصاب شہادت کے بغیر کسی پر حدود وقصاص کا نفاذ نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح بظاہر کسی کو قید کرنے کا بھی حق نہ ہونا چاہئے تھا، اس لئے کہ قید کرنا بھی ایک سزا ہے اور انسان اپنی اصل کے اعتبار سے بری ہے جب تک کہ جرم کا ثبوت پیش نہ کردیا جائے، لیکن اس مسئلہ کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ اگر ایک شخص کے خلاف بینہ اور شرعی ثبوت موجود نہیں ہے، لیکن قرائن اور صورت حال اس کے مجرم ہونے کی گواہی دے رہے ہیں، تو اگر اسے آزاد چھوڑ دیا جائے تو فرار ہوجانے کا امکان ہے، اس لئے اہون البلیتین یہی ہے کہ اس کو قید کردیا جائے، پھر جتنی جلد ممکن ہو اس کا معاملہ نپٹایا جائے، پھر اگر وہ بے گناہ ثابت ہوجائے تو اسے بری کردیا جائے، اگر مجرم ثابت ہوجائے تو جرم کی بلا تاخیر سزا دی جائے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تہمت اور الزام کی بنیاد پر قید کرنے کا حکم دیا اور فقہاء نے بھی اس کی اجازت دی ہے، چند نصوص ملاحظہ ہوں:

۱- "عن بهز بن حكيم عن أبيه عن جده أن النبی ﷺ حبس رجلا فی تهمة ثم خلى عنه" (ابوداؤد، اقضیہ، باب فی الحبس فی الدین وغیرہ، ترمذی، دیات، باب ماجاء فی الحبس بالتهمة، نسائی، کتاب قطع السارق، باب امتحان السارق بالضرب والحبس)۔

۲-''عن ابن العز فی کتاب: ''التنبیه علی مشکلات الهدایة'' حیث قال: الذی علیه جمهور الفقهاء فی المتهم بسرقة ونحوها أن ینظر (إلی أن قال) وأما أن یکون مجهول الحال فیحبس حتی یکشف أمره قیل شهرا. وقیل باجتهاد ولی الأمر'' (ردالمحتار ۴/ ۲۱۴)۔

۳-''بخلاف الحبس فإن کان الحبس للتهمة مشروع'' (بدائع ۱۸۶/۵)۔

۴-''فإذا لم یوجد الخصومة لم تقبل شهادتهم ولکن یحبس السارق. لأن اخبارهم أورث تهمة، ویجوز الحبس بالتهمة'' (بدائع ۲۱۶/۶)۔

۵-''من یتهم بالقتل والسرقة وضرب الناس یحبس وبخلاف السجن إلی أن تظهر التوبة'' (فتاوی قاضیخان علی هامش الهندیه ۲/ ۴۸۰، هندیه ۲/ ۱۶۹)۔

لیکن اتہام کی بنیاد پر صرف حدود وقصاص ہی میں قید کرنا جائز ہے، جہاں تک دیون کی بنیاد پر یا ان جرائم کے الزام کی بنیاد پر قید کرنے کا تعلق ہے جن میں قید کی حیثیت مستقل سزا کی ہوتی ہے ان میں ثبوت کے بغیر قید کرنا جائز نہیں ہے، ہدایہ میں ہے:

''بخلاف الدیون حیث لایحبس فیها قبل ظهور العدالة'' (ہدایہ مع الفتح ۸/۵)۔

جن لوگوں کو الزام کی بنیاد پر قید کرنا جائز ہے، ان کا بھی شرعی طور سے متہم ہونا شرط ہے، شرعاً تہمت اسی وقت معتبر مانی جائے گی، جب ایک عدل یا دو مستور اس کے خلاف گواہی دیں، یا وہ ہسٹری شیٹر ہو اور قاضی کو اس کا علم ہو، علامہ شامی فرماتے ہیں:

''ذکروا فی کتاب الکفالة أن التهمة تثبت بشهادة مستورین أو واحد عدل فظاهره أنه لو شهد عند الحاکم واحد مستور وفاسق بفساد شخص لیس للحاکم حبسه، بخلاف ما إذا کان عدلا أو مستورین فإن له حبسه بحر قلت: ومثله ما لو کان المتهم مشهور بالفساد فیکفی فیه علم القاضی'' (شامی ۲۰۶/۳)۔

ملزم کی مدت قید

مذکورہ بالا دلائل سے یہ ثابت ہو گیا کہ ملزم کو قید کرنا شرعاً جائز ہے، رہا یہ سوال کہ اس کی مدت قید کیا ہوگی تو اس کا دارومدار ملزم کی ذات، الزام کی نوعیت اور دوسرے خارجی عوامل سے متعلق ہے، جس کا خلاصہ صاحب مرقاۃ کے الفاظ میں یہ ہے:

'بأن ادعی علیه رجل ذنبا أو دینا فحبسه لیعلم صدق الدعوی بالبینة، ثم لما لم یقم البینة خلی عنه أی ترکه عن الحبس بأن أخرجه منه والمعنی خلی سبیله عنه'' (مرقاۃ المفاتیح، کتاب الامارۃ والقضاء، باب الاقضیہ ۲۱۸/۷)۔

سید سابق اس کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''ولا یحل حبس أحد بدون حق، ومتی حبس بحق، یجب المسارعة بالنظر فی أمره، فإن کان مذنبا أخذ بذنبه، وإن کان بریئًا أطلق سراحه'' (فقه السنة ۲۲۱/۳)۔

ان تفصیلات کی تاکید خود حدیث شریف کے الفاظ ''ثم خلی عنه'' سے ہو رہی ہے، لہذا کہا جا سکتا ہے کہ متہم کی مدت قید حاکم کی صوابدید پر ہوگی، اگر حاکم سمجھتا ہے کہ ثبوت وشواہد دستیاب ہونے کا امکان ہے تو اس میں تاخیر کر سکتا ہے لیکن اسے چاہئے کہ ممکنہ عجلت سے کام لے، اس کے متعلق علامہ شامی صراحت سے فرماتے ہیں:

''قیل شهرًا وقیل باجتهاد ولی الأمر'' (ردالمحتار ۲۱۴/۳)۔

البتہ بعض چیزوں میں متہم کی مدت حبس کی تحدید کی گئی ہے:

الف- اگر قذف کا اتہام ہے تو قاضی کے جس اجلاس میں مرافعہ کیا گیا ہے اسی اجلاس میں قاضی کے مجلس قضاء برخواست کرنے تک قید کا حکم دیا جائے گا، لیکن یہاں حبس کا مطلب اس کو روک لینا ہے نہ کہ جیل میں بند کرنا (دیکھئے: بدائع الصنائع ۵/ ۵۱۷)۔

ب- اگر اتہام کسی حد یا قصاص کا ہے اور اتہام موکد بالبینہ ہو چکا ہے تو ملزم کو تعدیل شہود تک قید کر دیا جائے گا، پھر اگر گواہ کھرے اتریں تو متعلقہ سزا دی جائے گی ورنہ ملزم کو بری کر دیا جائے گا:

''ویحبس فی الحدود والقصاص إذا قامت البینة حتی یسأل عن الشهود الخ'' (ہندیہ ۴۱۴/۳)۔

ج- بعض عبارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ متہم کو عمر قید کی سزا بھی دی جاسکتی ہے، اگر چہ ان عبارات میں یہ تاویل بھی کی جاسکتی ہے کہ یہاں متہم سے مراد وہ ہے جس پر جرم ثابت ہو چکا ہے:

''ومن یتهم بالقتل والسرقة وضرب الناس أحبسه وأخلده فی السجن حتی یتوب (قوله حتی یتوب) المراد حتی تظهر أمارات توبته إذ لا وقوف لنا علی حقیقتها، ولا یقدر بستة أشهر إذ قد تحصل التوبة قبلها وقد لا تظهر بعدها کذا حققه الطرسوسی وأقره ابن الشحنة'' (شامی ۲۰۶/۳)۔

بہر حال خلاصہ یہی ہے کہ الزام کی بنیاد پر قید کرنا شرعاً جائز ہے، شریعت نے اس قید کی کوئی تحدید نہیں کی ہے، پوری طرح ولی امر کے اوپر چھوڑ دیا گیا ہے۔

اس بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ ولی امر اگر سمجھتا ہے کہ معاملہ کو اگر قاضیوں اور ججوں کی صواب دید پر چھوڑ دیا گیا تو ناانصافی کا خطرہ ہے اور بدعنوانیوں اور رشوت کا بازار گرم ہونے کا اندیشہ ہے تو وہ مختلف الزامات کے لئے الگ الگ مدت قید کی تحدید کے احکام جاری کرسکتا ہے۔

۲- الف: قیدیوں کو عبادات کی اجازت

مکلف مسلمان پر تمام عبادات مخصوص شرائط کے ساتھ واجب ہیں، حج، جمعہ اور اس طرح کی ایسی عبادات جن کے لئے باہر نکلنا واجب ہوتا ہے ان کو چھوڑ کر بقیہ عبادات کا قیدی بھی مکلف ہوتا ہے اور شرعی خطاب اس کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہے، لہذا اگر کسی اسلامی ملک کی جیل ہے تو بلاشبہ جس طرح قیدی کی جسمانی ضروریات کو پورا کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے، اسی طرح اس کی روحانی تقاضوں کا پورا کرنا بھی ریاست کی ذمہ داری ہوگی اور اگر کوئی ریاست اس پر روک لگائے تو ظالم کہلائے گی، اسی لئے کتب فقہیہ میں جمعہ وعیدین اور جن چیزوں کے لئے باہر نکلنا پڑتا ہے ان پر پابندی کا ذکر موجود ہے، لیکن جن عبادات کے لئے باہر نکلنے کی ضرورت نہیں پڑتی ان پر پابندی کا کہیں بھی ذکر نہیں ملتا (دیکھئے: فتح القدیر ۶/ ۳۷۵، البحر الرائق ۶/ ۲۸۳، الدر المختار وشرح رد المحتار ۴/ ۳۴۸-۳۵۶)۔

جہاں تک غیر مسلم قیدیوں کا تعلق ہے تو شعائر کے علاوہ بقیہ عبادات پر ان کے اوپر بھی کوئی پابندی نہیں ہوگی ''لأن أمرنا أن نترکهم وما یدینون''، اس کے لئے اس عبارت میں واضح دلیل ہے:

''وقال القدوری فی النصرانیة تحت مسلم: لا تنصب فی بیته صلیبًا، وتصلی فی بیته حیث شاءت کذا فی المحیط'' (ہندیہ ۳۵۶/۵)

ظاہر ہے کہ جب ایک مسلمان کے گھر میں رہ کر عبادت کی اجازت ہے تو جیل میں موجود قیدی کو تو بدرجہ اولی اجازت ہوگی۔

پھر اسلامی حکومت میں موجود غیر مسلم خواہ جیل میں ہوں یا جیل سے باہر ہوں ظاہر بات ہے کہ وہ پوری طرح ہمارے اختیار میں ہیں، تو جس طرح جیل سے باہر ان سے عدم تعرض کا حکم ہے اسی طرح جیل میں بھی یہی حکم ہوگا (دیکھئے: ہدایہ مع الفتح ۲۸۸/۴)۔

مذہبی کتابوں کا مطالعہ

جہاں تک مذہبی کتابوں کے مطالعہ کا تعلق ہے تو فارغ اوقات میں مسلمان قیدی اگر مذہبی کتابیں پڑھتا ہے تو اس کے اخلاق پر اچھا اثر پڑے گا، اس لئے نہ صرف یہ کہ اس پر پابندی لگانے کی کوئی وجہ نہیں ہے، بلکہ میرے خیال سے حکومت کو حکمت و دانائی کے ساتھ خاص ترتیب سے کتابوں کے مطالعہ کی ترغیب دینی چاہئے تاکہ قیدیوں کی اخلاقی حالت میں سدھار آئے۔

ذمی بھی اگر اپنے طور پر اپنی مذہبی کتابیں پڑھتے ہیں تو ان پر پابندی لگانے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اوپر گزر چکا ہے کہ ان کو اپنی عبادات کی اجازت ہوگی، تو مذہبی کتب کا مطالعہ تو اس سے اہون چیز ہے لہذا اس کی اجازت بدرجہ اولی ہونا چاہئے۔

دعوت دین

اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ عوام کی دینی حالات کی نگرانی رکھے اور ہر طریقہ سے ان کو احکام اسلام کا پابند بنانے کی کوشش کرے، اسی کوشش میں یہ بھی شامل ہے کہ ان کے درمیان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو انجام دینے کے لئے باقاعدہ لوگوں کو مقرر کرے، آنحضرت ﷺ برابر اس کا خیال رکھتے تھے اور دوسروں کو بھی اس پر ابھارتے تھے۔

ریاست کی ذمہ داریوں میں سے غیر مسلموں میں دعوت پیش کرنا بھی ہے، اس لئے کہ: "کنتم خیر أمة... الآیة" اور "ولتکن منکم. الآیة جیسی آیات میں اگر چہ تخاطب کل امت مسلمہ سے ہے، لیکن اس کے اولین مخاطب اولیاء امر ہیں، پھر دوسرے عوام کی طرح قیدی بھی بلاشبہ ان تمام امور میں دوسرے باشندوں ہی کی طرح ہیں، لہذا ان چیزوں میں ان کے لئے نظم کرنا بھی ضروری ہوگا اور یہ ضرورت اگر قیدیوں کے ذریعہ پوری ہوسکتی ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہوگا، بشرطیکہ قیدی اس کے اہل ہوں، ورنہ اہل نہ ہوں تو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچے گا، لہذا ہر کس و ناکس کو دعوت پیش کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

فراہمی غذا

تمام قیدیوں کو غذا فراہم کرنا ضروری ہے، پھر غذا ایسی ہونی چاہئے جسے قیدی استعمال بھی کر سکے ورنہ دینے سے کوئی فائدہ ہی نہ ہوگا، اگر کسی قیدی کو ایسی غذا دی گئی جسے مذہبی ممانعت کے سبب وہ استعمال نہیں کر سکتا، یا اس کے استعمال پر کوئی دوسری رکاوٹ ہو تو اسے دینا نہ دینا برابر ہے، مندرجہ ذیل دلائل سے غذا کی فراہمی کا وجوب ثابت ہوتا ہے اور اقتضاءً یہ بھی اشارہ مل رہا ہے کہ اس کے استعمال پر کسی بھی اعتبار سے کوئی رکاوٹ نہ ہونی چاہئے:

۱- ''عن ابن عمر رضی الله عنه أن النبی ﷺ قال: عذبت امرأة فی هرة سجنتها حتی ماتت، فدخلت منها النار، لا هی أطعمتها وسقتها إذ حبستها، ولا هی ترکتها تأکل من خشاش الأرض'' (بخاری و مسلم، کتاب الحیات، باب تحریم قتل الهرة)

اس سے معلوم ہوا کہ اگر انسان کو قید کیا اور اس کے کھانے پینے کا نظم نہیں کیا تو بدرجہ اولی اس میں گناہ ہوگا۔

اسی طرح اگر قیدی کو کوئی ایسی چیز دی جسے وہ استعمال ہی نہیں کر سکتا تو دینا بلا فائدہ ہوگا، نیز اگر ایسی چیز دی جسے وہ بہ مشکل تمام ہی استعمال کر سکتا ہے تو اس میں بھی کراہت ہوگی۔

۲- سید سابق فقہ السنۃ میں لکھتے ہیں: ''وإن یعطی کل واحد کفایته من الطعام والباس، ومنع المساکین مما یحتاجون إلیه من الغذاء والکساء والمسکن الصحی جور یعاقب الله علیه'' (فقه السنة ۲/۴۴۲)۔

۳- شامی نیز دوسری کتب معتبرہ میں متعنت قیدی کے بارے میں بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ویترك له ثقبة یلقی له الخبز والماء'' (شامی ۴/۳۵۰)۔

جب اس قید تنہائی میں کھانے پینے کا خیال رکھنے کا حکم ہے تو دوسرے قیدیوں کے ساتھ بدرجہ اولی یہ حکم ہوگا۔

مقدس شخصیات اور کتابوں کا احترام

اس پر ممانعت تو قرآن پاک کی اس آیت کریمہ ہی سے ظاہر ہوتی ہے:

"ولا تسبوا الذین یدعون من دون الله فیسبوا الله عدوًا بغیر علم۔ اللہ کو بے ادبی سے بدون سمجھے۔

علامہ عثمانی فرماتے ہیں: کسی مذہب کے اصول و فروع کی معقول طریقہ سے غلطیاں ظاہر کرنا یا اس کی کمزوری اور رکاکت پر تحقیقی الزامی طریقوں سے متنبہ کرنا جداگانہ چیز ہے، لیکن کسی قوم کے پیشواؤں اور معبودوں کی نسبت بغرض تحقیر و توہین دلخراش الفاظ نکالنا قرآن نے کسی وقت بھی جائز نہیں رکھا۔

ب- جسمانی ضروریات

غذا کی فراہمی کی بحث ہم اوپر کر چکے ہیں، اس بحث سے صاف ظاہر ہے کہ قیدیوں کو ایسی غذا کا فراہم کرنا ضروری ہے جو اس کی جان بچانے کے لئے کافی

ہو، پانی کا مسئلہ اس سے بھی بڑھ کر ہے اس لئے اس کا نظم کرنا بدرجہ اولی واجب ہوگا، اس کی دلیل میں حدیث ہرۃ گزر چکی ہے، مزید وضاحت اس آیت کریمہ سے ہورہی ہے، جو خاص قیدی ہی سے متعلق ہے، ارشاد ہے:

"ویطعمون الطعام علی حبه مسکینًا ویتیمًا وأسیرًا" (سورۃ الدھر: ۸)۔

(اور کھلاتے ہیں کھانا اس کی محبت پر محتاج کو اور یتیم کو اور قیدی کو)۔

یہاں قیدی سے مشرک قیدی مراد لیا گیا ہے لہذا بقول مفسرین مسلم قیدی بدرجہ اولی اس سلوک کا مستحق ہوگا۔

(دیکھئے: الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۱۹/ ۱۲۹، وکذا فی احکام القرآن للجصاص ۳/ ۴۷۱)۔

حفظان صحت کے لئے ورزش

اگر اس بات کا اندیشہ ہے کہ ورزش نہ کرنے پر صحت بگڑ جائے گی تو بقدر ضرورت ورزش کی اجازت دی جاسکتی ہے، بقیہ صرف تفریحًا ورزش کی اجازت نہیں ہوگی، اس لئے کہ اس کو لایا ہی سزا کے طور پر گیا ہے، اگر پوری تفریح اور آزادی رہے تو مقصد فوت ہوجائے گا۔

"وینبغی أن یحبس فی موضع خشن لا یبسط له فراش ولا وطاء ولا أحد یدخل علیه لیستأنس لیضجر قلبه" (ہندیہ ۳/ ۴۱۹)

البتہ چونکہ قید میں رہتے ہوئے علاج ومعالجہ کا حق اسے حاصل ہے:

"لا یخرج لمعالجة (قوله لمعالجة) أی لمداوة مرضه لإمکان ذلك فی السجن" (شامی ۴/ ۳۴۹)۔

لہذا اسے اتنی ورزش کی اجازت ہوگی جتنی صحت کے لئے ضروری سمجھی جائے۔

بیوی سے تعلق

اگر خلوت کی جگہ جیل میں میسر ہوسکتی ہو تو بیوی کے ساتھ خلوت اختیار کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے، لیکن اگر تنہائی کی جگہ میسر نہ ہو تو جماع کی اجازت نہیں ہوگی، بقیہ ملنے، بات چیت کرنے اور صلاح ومشورہ کرنے کی اجازت حاصل رہے گی۔

۱- "وإذا احتاج للجماع دخلت علیه زوجته أو أمته إن کان فیه موضع سترة" (شامی ۴/ ۳۴۹)۔

۲- "وفی الفتاوی العتابیة وإن لم یجد مکانًا خالیا لا یجامع" (ہندیہ ۳/ ۴۱۸)۔

تنگ جگہ میں قید کرنا

یہ تو صحیح ہے کہ قید خانہ ایسا آرام دہ نہ ہونا چاہئے کہ لگے کہ وہ مہمان خانہ یا تفریح گھر میں عیش کرنے آیا ہے، اس سے متعلق عبارت اوپر گزر چکی ہے کہ قید خانہ کا فرش آرام دہ نہ بنایا جائے کھردرا ہو، لیکن ایسی تنگ جگہ قید کرنا شرعًا جائز نہیں ہوگا جہاں وہ کھڑا نہ ہوسکے، پیر نہ پھیلا سکے، اس لئے کہ اس میں اس کو ضرر ہوگا اور ضرر والی جگہ میں جب دائن مدیون کو نہیں رکھ سکتا تو بھلا حکومت کو اس کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے؟ ہندیہ میں ہے:

"ولیس للطالب أن یقیم فی الشمس أو علی الثلج أو فی موضع یضر به کذا فی الخلاصة" (ہندیہ ۳/ ۴۱۶)۔

جہاں تک ایسی جگہ قید کرنے کی اجازت کا تعلق ہے جہاں سے باہر دکھائی نہ دیتا ہو تو اس کی خاص حالات میں اجازت ہوسکتی ہے، مثلًا قیدی متعنت ہو یا اس سے کوئی خطرناک حرکت کا خطرہ ہو:

"وإذا حبس المحبوس فی السجن متعنتا لا یوفی المال قال الإمام الأرسانیدی: یطین الباب ویترك له ثقبة یلقی منه الماء والخبز. وقال القاضی: الرأی فیه إلی القاضی" (البحر الرائق ۶/ ۲۸۳، شامی ۴/ ۳۵۰)۔

ج- سماجی حقوق

قیدیوں کے پاس ان کے عزیز واقارب اور پڑوسیوں کے آنے کی اجازت ہے تا کہ وہ ان سے صلاح ومشورہ کرسکیں، اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ عزیز

واقارب نیز وکلاء سے فون پر بھی صلاح ومشورہ کی اجازت ہوگی۔

لیکن قیدی کی دلداری اور استئناس کے لئے کسی کے بھی داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ دل بہلانے کے لئے فون کرنے کی بھی اجازت نہیں ہونی چاہئے، اس بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ قیدیوں کو موبائل وغیرہ رکھنے کی اجازت نہیں ہوگی، البتہ اگر حاکم مناسب سمجھتا ہے تو ان کے لئے ٹیلی فون بوتھ کا نظم کرسکتا ہے، لیکن اس امر کو یقینی بنانا چاہئے کہ صرف اپنے عزیز واقارب پڑوسی اور وکلاء ہی سے بقدر ضرورت رابطہ کرسکیں، اور مقصد صرف صلاح ومشورہ ہو، تفریحاً رابطہ کرنے کی اجازت نہ ہونا چاہئے۔ (شامی ۴/ ۳۴۹، ہندیہ ۳/ ۴۱۸)۔

جہاں تک اخبارات پڑھنے، ریڈیو سننے یا اس طرح کی دوسری چیزوں سے استفادہ کا تعلق ہے تو ظاہر بات ہے کہ ان کا تعلق تفریحی مشاغل سے ہے اور ان سے استئناس حاصل ہوگا جس کی اجازت نہیں ہے، اوپر گزر چکا ہے کہ قید خانہ میں ایسا سلوک ہونا چاہئے جس سے وہ زچ ہو "لیضجر قلبہ" اور ان امور کی اجازت اس کے زچ ہونے سے مانع ہوگی۔

یہ تفصیل چور اچکوں یا ان کے ہم معنی قیدیوں کے لئے ہے، بقیہ اگر کسی تعلیم یافتہ اور مہذب شخص کو کسی مصلحت کے تحت قید کرنا حکومت ضروری سمجھے تو اس کو بظاہر اس طرح کی چیزیں مہیا کرانے کی اجازت ہونی چاہئے۔

جہاں تک دوسرے قیدیوں سے ملنے جلنے کی اجازت کا تعلق ہے تو اس کی ممانعت کہیں نظر نہیں آئی، اس لئے اس کی اجازت ہوگی۔

(دیکھئے: البحر الرائق ۶/ ۲۸۳، شامی ۴/ ۲۴۸-۵۶، ۳، فتح القدیر ۶/ ۳۷۵)۔

جہاں تک ہنر سیکھنے اور تعلیم حاصل کرنے کا تعلق ہے تو اس کی اجازت ہونی چاہئے، اس لئے کہ جیل خانہ میں رہتے ہوئے کاروبار کرنے کی اجازت کے بارے میں دو روایتیں ہیں: ایک روایت اجازت کی ہے اور صحیح روایت ممانعت کی ہے، اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے علامہ شامی فرماتے ہیں:

"لأن الحبس مشروع لیضجر، ومتی تمکن من الاکتساب لا یضجر. فیکون السجن له بمنزلة الحانوت" (شامی ۴/ ۳۴۹)

ہنر یا تعلیم حاصل کرنے میں اگرچہ اکتساب ہی سے مشابہت معلوم ہوتی ہے، لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے، کمائی کی اجازت دینا قید کے مقصد کے خلاف ہے کہ جس طرح وہ باہر آزادی سے اپنے کام میں مشغول تھا یہاں بھی مشغول ہے، ہنر یا تعلیم کے حصول میں یہ بات نہیں ہے، بلکہ یہ قید کرنے کے مقصد کے خلاف ہونے کے بجائے اس کے مقاصد کے لئے مفید ومعاون ہے، اس لئے کہ رذائل اور برے کاموں میں ملوث ہونے کا بڑا سبب جہالت اور بیکاری ہوتی ہے، اگر کوئی ہنر جان لے یا علم حاصل کرے تو امید ہے کہ بداخلاقیوں سے بچ جائے گا اور یہ بات واضح ہے کہ قید کا مقصد دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ تادیب بھی ہے۔

نیز حصول علم کے جواز کے لئے وہ تمام دلائل بھی پیش کئے جاسکتے ہیں جو جیل سے باہر حصول علم کی تاکید اور فضیلت کے لئے پیش کئے جاتے ہیں، اس لئے کہ وہ دلائل عام ہیں اور جیسا کہ عرض کیا گیا جیل ان کے حصول سے مانع نہیں ہے۔

د- اخلاقی امور

عورتوں اور مردوں کو الگ الگ رکھنا

عورتوں کے لئے الگ جیل کا انتظام کرنا ضروری ہے ورنہ اس میں بہت سی اخلاقی خرابیاں جنم لیں گی، جن کی وضاحت بھی ضروری ہے:

"ویجعل للنساء سجن علی حدة نفیا لوقوع الفتنة" (البحر الرائق ۶/ ۲۸۳)۔

"وعن أبی یوسف رحمه الله أن المرأة تحبس فی محبس النساء ولکن یحفظها الرجل" (ہندیہ ۳/ ۴۱۴، کذا فی الشامی ۴/ ۳۴۹، فتح القدیر ۶/ ۳۷۵)۔

جہاں تک نابالغوں کا تعلق ہے تو تادیباً ان کو بھی قید کرنے کی اجازت ہے:

"ولا یحبس الصبی إلا بطریق التأدیب لئلا یتجاسر إلی مثله إذا باشر شیئًا من أسباب التعدی قصدا فلو خطأً فلا.

کذا فی کفالة المبسوط. وفی المحیط: للقاضی حبس الصبی التاجر تادیبًا لا عقوبة لئلا یماطل حقوق العباد. فإن الصبی یؤدب لینزجر عن الأفعال الذمیمة'' (شامی ۴/ ۳۸۵)۔

ان عبارات سے خاص مقاصد کے تحت بچوں کی گرفتاری کا جواز معلوم ہوتا ہے اور انہیں سے یہ اشارہ بھی مل رہا ہے کہ ان کی جیل علاحدہ ہونی چاہئے، اس لئے کہ ان کی قید کا مقصد تادیب ہے، بڑوں کی قید کا مقصد سزا ہے اور بچوں کی کما حقہ تادیب اسی وقت ہو سکے گی جب ان کی جیل الگ رکھی جائے،

اس کے ساتھ ساتھ دونوں کو اکٹھا رکھنے میں وہ اخلاقی خطرے بھی ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

۳: قیدی کو سزا دینا

الف: بے لباسی کی سزا

قیدیوں کو بے لباس کرنے کی اجازت نہیں ہے: ''ولا یجرد''۔

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ ایک غیر انسانی اور وحشیانہ عمل ہے جس سے عزت نفس مجروح ہوتی ہے، اور اسلام میں اس طرح کی چیزوں کی اجازت نہیں ہو سکتی۔

البتہ اگر کوئی خطرناک مجرم ہو مثلاً حکومت کے خلاف جاسوسی جیسی چیزوں میں پکڑا گیا ہو، اس کے پاس یقینی طور پر راز ہوں، لیکن برہنگی کے بغیر ان رازوں سے پردہ اٹھانا ممکن نہ ہو تو بدرجہ مجبوری اس کی بقدر ضرورت اجازت ہوگی، اس کے لئے اشارہ اس واقعہ سے ملتا ہے:

''سمعت علیا یقول: بعثنی رسول الله ﷺ أنا والزبیر والمقداد فقال: انطلقوا (إلی) فإذا نحن بالظعینة. فقلنا هلمی الکتاب: قالت: ماعندی من کتاب، فقلت: لتخرجن الکتاب أو لنلقین الثیاب'' الحدیث (بخاری مغازی، باب غزوہ الفتح ومابعث حاطب بن ابی بلتعه الٰہ اهل مکة، ابوداؤد، جهاد، باب فی حکم الجاسوس اذا کان مسلما)۔

قیدیوں کو مارنا پیٹنا:

مار پیٹ جیسی چیزوں میں قیدیوں کی دو قسمیں ہیں:

۱- ایک وہ جس کو دَین جیسے کسی مالی حق کی بنیاد پر قید کیا گیا ہو اور وہ ادائیگی کے لئے مال ہونے سے منکر ہو۔

اس طرح کے قیدیوں کو اعتراف کرانے کے لئے مارنے کی اجازت نہیں ہے:

(۱) ولا یضرب المدیون'' (البحر الرائق ۶/ ۲۸۳، فتح القدیر ۶/ ۳۷۵)۔

(۲) لا ینبغی للقاضی أن یضرب محبوسا فی دین أو فی غیرہ (هندیه ۳/ ۴۱۴)۔

۲- دوسرا قیدی وہ ہے جسے چوری ڈکیتی جیسی کسی خطرناک علت کے سبب ماخوذ کیا گیا ہو اور وہ الزام سے انکار کر رہا ہو۔

اگر قیدی پر اس طرح کے رذائل کا اتہام ہے تو اگر قاضی مناسب سمجھتا ہے تو اس کے ضرب کا حکم دے سکتا ہے:

۱-''فجعلوا یسألونه أین أبوسفیان؟ فیقول: والله مالی بشئ من أمرہ علم، ولکن هذه قریش قد جاء ت، فیهم أبوجهل وعتبة وشیبة ابناربیعة، وأمیة بن خلف، فإذا قال لهم ذلك ضربوہ فیقول: دعونی دعونی أخبرکم الحدیث'' (ابوداؤد، جهاد، باب فی الاسیرینالی منه ویضرب ویقرر)۔

یہ واقعہ آنحضرت ﷺ کی موجودگی میں ہوا، لہٰذا یہ حدیث مرفوع کے حکم میں ہے۔

۲-''والسارق لایفتی بعقوبته لأنه جور تجنیس وعزاہ القهستانی للواقعات معللا بأنه خلاف الشرع ومثله فی السراجیة... ثم نقل عن الزیلعی فی آخر باب قطع الطریق جواز ذلك سیاسة، ... ای جواز ضرب المتهم حیث قال نقلا عن الزیلعی ومنها ای ومن السیاسة ماحکی عن الفقیه أبی بکر الأعمش أن المدعی علیه إذا أنکر فللإمام أن

يعمل فيه بأكبر رأيه. فإن غلب على ظنه أنه سارق وإن المسروق عنده عاقبه ويجوز ذلك . . . (رد المحتار ۳/ ۲۱۴)۔

لیکن اس عقوبت کے لئے متہم ہونا شرط ہے اور شرعاً متہم (جیسا کہ گزر چکا ہے) اس کو کہتے ہیں جس پر دو مستور یا ایک عادل گواہ کے ذریعہ الزام لگایا جائے، یا جو جرائم کے سلسلہ میں شہرت رکھتا ہو اور قاضی کو اس کا علم ہو تو صرف قاضی کا باخبر ہونا اس کے لئے کافی ہوتا ہے: (شامی ۳/ ۲۰۶)۔

کیا اکراہ کے ساتھ کیا ہوا اقرار معتبر ہوگا

اس پر یہ سوال قائم ہوتا ہے کہ اگر اس طرح سزا دینے سے ملزم اقرار کرے تو کیا اس کا اقرار معتبر ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بعض مشائخ کے نزدیک ضمان لازم ہونے کے حق میں معتبر ہوگا، قطع ید کے حق میں معتبر نہیں ہوگا، جب کہ اکثر کے نزدیک اس کا بالکل ہی اعتبار نہیں ہوگا:

''وفي إكراه البزازية: من المشائخ من أفتى بصحة إقرارها بها مكرها (قوله بصحة إقرارها بها مكرها) أي في حق الضمان لا في حق القطع'' (شامی ۳/ ۲۱۴)۔

''فإقرارها بها مكرها باطل'' (ایضا/ ۲۱۳)۔

ضرب کے حد

یہ ضرب اور عقوبت بھی مطلقاً جائز نہیں ہے کہ ہڈی پسلی ایک کردی جائے جیسا کہ آج کل رواج ہے، بلکہ اجازت صرف اتنی ضرب کی ہے جس سے ہڈی ظاہر نہ ہو:

''وعن الحسن يحل ضربه حتى يقر مالم يظهر العظم'' (الدر المختار علی هامش رد المختار ۳/۲۱۴) اگرچہ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ امام حسن بن زیاد درحقیقت یہاں ایک دوسری بات فرماتے ہیں، لیکن بہرحال مفہوم کی تردید انہوں نے بھی نہیں کی ہے۔

ج- الیکٹرک شاٹ لگانا

الیکٹرک شاٹ لگانے سے جسم اس طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح آگ سے جلانے سے متاثر ہوتا ہے اور آگ سے تکلیف دینے کی اجازت شریعت نے نہیں دی ہے تو بجلی سے بدرجہ اولی اجازت نہیں ہوگی، اس لئے کہ آگ سے صرف جلن ہوتی ہے اور بجلی سے جلن کے ساتھ ساتھ جسم کو جھٹکا بھی لگتا ہے، آگ سے تو صرف وہی حصہ متاثر ہوگا جسے تپایا اور جلایا جائے، لیکن بجلی سے پورا جسم متاثر ہوتا ہے اور موت کا بھی خطرہ رہتا ہے، آگ سے جلانے کی ممانعت سے متعلق چند نصوص ملاحظہ ہوں:

۱-''عن محمد بن حمزة الأسلمي عن أبيه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أمره على سرية. قال فخرجت فيها. وقال: إن وجدتم فلانا فأحرقوه بالنار. فوليت. فناداني فرجعت إليه فقال: إن وجدتم فلانا فاقتلوه. ولا تحرقوه. فإنه لا يعذب بالنار إلا رب النار'' (ابو داؤد، جهاد، باب في كراهية حرق العبد بالنار. نیز دیکھئے: شامی ۳/ ۲۲۵)۔

۲-''ولا ينبغي للقاضي أن يضرب محبوسا (الى) ولا يقيمه في الشمس'' (هندیہ ۳/ ۴۱۴)۔

جب دھوپ میں رکھنے کی اجازت نہیں ہے تو الیکٹرک شاٹ لگانا تو اس سے بڑھ کر اذیت ناک چیز ہے۔

د- کتے چھوڑنا

اوپر گزرا کہ قیدیوں پر جب قابو مل جائے تو ان کا مثلہ کرنا جائز نہیں ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ قیدیوں پر کتے چھوڑنے کی اجازت نہیں ہوگی، اس لئے کہ اس عمل سے مثلہ ہوجانے کا قوی امکان ہے، پھر کتے چھوڑنے سے گہرے زخم آسکتے ہیں جس سے ہڈی ظاہر ہوجائے گی اور اوپر گزر چکا ہے کہ اس طرح کی ضرب کی اجازت نہیں ہے، اس کے علاوہ اس انداز سے سزا دینا انسانی شرف کے خلاف ہے، اس طرح کے وحشیانہ عمل کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ھ- برف کی سل پر ڈالنا

یہ بھی ناجائز ہے، اس کا اشارہ مندرجہ ذیل عبارت سے ملتا ہے:

''ليس للطالب أن يقيم في الشمس أو على الثلج أو في موضع يضر به'' (ہندیہ ۳/۴۱۶)۔

و- جگے رہنے پر مجبور کرنا

اوپر عبارتیں آچکی ہیں کہ چوراچکوں، حکومت کے خلاف جاسوسی کرنے والوں اور ان جیسے دوسرے ملزموں سے جرم کا اعتراف کرانے کے لئے ان پر ضرب لگانا اور سختی کرنا جائز ہے، اسی طرح شروع میں حدیث گزر چکی ہے:

''وإذا أبو يزيد سهيل بن عمرو في ناحية الحجرة مجموعة يداه إلى عنقه بحبل'' (ابو داؤد، كتاب الجهاد، باب في الاسير يوثق)۔

اسی طرح حدیث کی کتابوں میں یا ثمامہ ابن اثال کے تین دن تک مسجد کے ستون میں بندھے رہنے کا واقعہ مذکور ہے (مصدر مذکور و مسلم جہاد باب ربط الاسیر وحبسہ)۔

لہذا جگے رہنے پر مجبور کرنا تو اس سے ہلکے درجہ کی چیز ہے اور جس انداز سے باندھنے کا ذکر ہے اس انداز سے باندھنے پر بھی آسانی سے تو نیند نہیں آئے گی، اس لئے اعتراف کرانے کے لئے بظاہر محدود مدت کے لئے اس طرح کی سزا دینے کی اجازت ہوگی۔

لیکن اگر نفسیاتی یا جسمانی مرض میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو تو اس کا شمار بھی ممنوعہ طریقوں میں ہوگا۔

۴- قیدیوں کو زنجیر وغیرہ میں جکڑنا

مدیون اور اس جیسے قیدیوں کو باندھنے یا بیڑی اور ہتھکڑی وغیرہ لگانے کی اجازت نہیں ہے:

''لا ينبغي للقاضي أن يضرب محبوسا في دين أو في غيره ولا يصفد ولا يقيد ولا يغل ولا يمد... الخ''
(ہندیہ ۳/۴۱۴، کذا فی البحر ۶/۲۸۳، شامی ۴/۳۴۸-۳۵۶، فتح القدیر ۶/۳۷۵)۔

البتہ خطرناک قیدیوں، جاسوسوں اور ان جیسے قیدیوں کو جیل خانہ میں بند کرنے سے پہلے فرار کے خوف سے ہتھکڑی وغیرہ لگانے کی اجازت ہے، اس کی اجازت مندرجہ ذیل نصوص سے ظاہر ہے:

۱- اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

حتى إذا أثخنتموهم فشدوا الوثاق فإما منًّا بعد وإما فداء حتى تضع الحرب أوزارها'' (سورۂ محمد: ۴)۔

۲- ثمامہ بن اثال کو مسجد کے ستون میں باندھنے کا قصہ (مسلم، جہاد، باب ربط الاسیر وحبسہ، ابوداؤد، جہاد، باب فی الاسیر یوثق)۔

صاحب بذل فرماتے ہیں: ''أي قوم كفار يؤخذون أن أسارى قهرًا في السلاسل والقيود فيدخلون في دار الإسلام ثم يرزقهم الله تعالى الإيمان فيدخلون به الجنة'' (أبوداؤد مع بذل المجهود، جهاد، باب في الاسير يوثق)۔

۳- ''وإذا أبو يزيد سهيل بن عمرو في ناحية المسجد مجموعة يداه إلى عنقه بحبل'' (ابوداؤد باب مذکور)۔

حربی قیدیوں اور جاسوسوں کو باندھنے کی اجازت بدر اور دوسرے غزوات میں قیدیوں کے باندھنے کی روایات سے بھی واضح ہو رہی ہے۔
(دیکھئے: مشکوۃ، باب حکم الاسراء)۔

۵- قید تنہائی کا حکم

کسی خاص سبب سے اگر حاکم مناسب سمجھتا ہے تو قید تنہائی دے سکتا ہے:

''وإذا جلس المحبوس في القيد متعنتًا لا يوفي المال، قال الإمام الأرسانيدي. يطين الباب ويترك به ثقبة يلقى

منه الماء والخبز'' (بحر ۶/ ۲۸۳، شامی ۴/ ۳۵۰)

۶-جبراً کام لینا

قیدی سے جبراً کام لینا جائز نہیں ہے:

''ولا یضرب المدیون (إلی) ولا یؤاجر'' (بحر ۶/ ۲۸۳، فتح القدیر ۶/ ۳۷۵، شامی ۴/ ۳۵۰)۔

اگر اس کو کام پر مجبور کیا جائے تو اجرت دینا ضروری ہوگا، اس کا اشارہ اس عبارت سے ملتا ہے:

''وعن الثانی یؤجره لقضاء دینه (قوله وعن الثانی) عبارة النهر ولا یؤجر خلافا لما عن الثانی'' (شامی ۴/ ۳۵۰)۔

ظاہر بات ہے اگر اجرت اس کے حوالہ نہ کرنی ہوتی تو قضاء دین کی بات کیوں کی جاتی۔

۷-ملزم اور مجرم میں فرق

اوپر گزر چکا ہے کہ بغیر حق کے کسی کو قید نہیں کیا جاسکتا، قید مجرم یا ملزم یعنی متہم کو کیا جاسکتا ہے، اتہام کے لئے ایک عدل یا دو مستور گواہوں کی گواہی ضروری ہے، پھر مزید شرط یہ بھی ہے کہ اتہام بھی حدود وقصاص جیسی چیز کا ہونا چاہئے، دین جیسی کسی ایسی چیز کے اتہام سے قید نہیں کیا جاسکتا جس کی سزا ہی قید ہو، چنانچہ تعزیر کی بحث میں علامہ کاسانی فرماتے ہیں: ''إلا أنه لایحبس لتعدیل الشهود (إلی) وأما عدم الحبس، فلأن الحبس یصلح تعزیرًا فی نفسه، فلا یکون مشروعًا قبل تعدیل الشهود بخلاف الحدود... الخ'' (بدائع ۵/ ۵۲۶)۔

اوپر یہ بھی گزر چکا ہے کہ چوری کے اتہام میں ماخوذ کو بعض اوقات سزا دینے کا اختیار رہتا ہے، حکومت کے باغی اور جاسوسوں کے بارے میں پختہ یقین ہو کہ وہ راز چھپا رہے ہیں تو بدرجہ اولی ان کی عقوبت کی اجازت ہوگی، اس لئے کہ کسی ایک شخص کے مالی نقصان کے لئے جب ضرب وعذاب کی اجازت ہے تو جن رازوں کے افشاء ہوجانے سے مفاد عام وابستہ ہو، یا جن سے حکومت اسلامیہ پر زلزلہ آجانے کا خوف ہو ان کے سلسلہ میں بدرجہ اولی سزا کی اجازت ہونی چاہئے، بقیہ دوسرے ملزموں کو مارنے پیٹنے اور دوسری عقوبتوں میں مبتلا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

اس طرح کے چند استثنائی ملزمین کو چھوڑ دیں (کہ ان میں ملزمین کو کچھ عقوبتیں دی جاسکتی ہیں مجرمین کو نہیں دی جاسکتی ہیں) تو بقیہ دوسرے ملزمین اور مجرمین کے درمیان کوئی فرق نظر نہیں آتا، نہ عبارات فقہیہ میں اس طرح کی کوئی تفریق نظر آتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ احکام دین یا کسی تعزیر میں قید کئے گئے افراد کے بیان کئے گئے ہیں، الزام کے تحت صرف حدود وقصاص کے متہم کو قید کیا جاتا ہے اور حدود وقصاص کی اصل سزائیں دوسری ہیں جنہیں ممکنہ عجلت کے ساتھ ثبوت کے بعد نافذ کرنے کا حکم ہے، تو اگر اس ملزم کے ساتھ کچھ بدسلوکی کی گئی تو یہ مقررہ سزا پر ایک اضافہ ہوگا جس کی شرعاً اجازت ہے۔

نیز اس کو کچھ سہولت بھی اس لئے نہیں دے سکتے ہیں کہ وہ سنگین جرم کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے اور الزام بھی محض الزام نہیں بلکہ ایک حد تک ثابت ہے، لہذا اس کو کچھ سہولت دینا بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ دونوں کے ساتھ سلوک میں کوئی فرق نہیں رکھا جائے گا، صرف چور جاسوس اور اس جیسے متہمین پر کچھ ایسی مزید سختیاں جائز ہیں جو ثبوت جرم کے بعد باقی نہیں رکھی جائیں گی۔

۸-ملزم کو اصل سزا کے بقدر قید رکھنا

اسلامی شریعت کے نفاذ کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کا سوال پیدا ہی نہیں ہوگا، اس لئے کہ ملزم کو صرف حدود وقصاص جیسے جرائم کے الزام میں قید کیا جاسکتا ہے اور ان کی اصل سزا قید کے بجائے کچھ اور ہے، پھر ملزم کی مدت قید کی تعیین اگرچہ نہیں کی گئی ہے اور اس کو امام کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے، لیکن قرائن سے صاف ظاہر ہے کہ جلد سے جلد معاملہ کو نپٹانے کا حکم ہے، پھر یہ مدت تبدیل شہود جیسی چیزوں کے لئے ہوتی ہے جس میں بہت دیر لگنے کا امکان نہیں، لہذا ایک اسلامی ریاست میں اس سوال کے پیدا ہونے کا امکان نہ ہونا چاہئے۔

۹- بریت ثابت ہونے پر مالی ہرجانہ کا مطالبہ

اگر قید کے درمیان اقبال جرم کرانے کے لئے اس کو زدوکوب کیا گیا اور اس سے بچنے کے لئے ملزم فرار ہوکر چھت پر چڑھ گیا اور گرکر مر گیا بعد میں اس کی بریت ظاہر ہوئی یا مار پیٹ سے اس کو کوئی جسمانی نقصان لاحق ہو گیا تو اس کو حق ہے کہ الزام لگانے والے سے دیت یا ہرجانہ طلب کرے، ملزم کے فوت ہونے کی صورت میں یہ حق اس کے اولیاء کو ہوگا۔

اسی طرح اگر اس پر حاکم نے کوئی ضمان لازم کیا تو بریت ثابت ہونے پر مدعی سے اس کا مطالبہ کرسکتا ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: شامی ۳/۲۱۵)۔

لیکن اگر اس طرح کی کوئی بات نہیں ہوئی تو اس کو قید کے سبب پہنچنے والی ذہنی اذیت کے لئے ہرجانہ طلب کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، اس لئے کہ اس کو جو جسمانی یا مالی نقصان پہنچا ہے بریت کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بغیر کسی حق کے تھا، لہذا اس کا معاوضہ طلب کرنے کی اجازت دی گئی، لیکن قید کرنے کا عمل ظاہر ہے شرعی اتہام کے بغیر نہیں ہوسکتا اور شرعی اتہام کے بعد اس کو قید کرنا ایک حق شرعی کے سبب ہے، لہذا اس کا معاوضہ نہیں طلب کرسکتا۔

۱۰- قیدی کو وکیل سے صلاح لینے کا حق

اپنے اوپر عائد الزام کو رفع کرنے کے لئے ملزم کو اپنے وکیل صفائی سے صلاح ومشورہ کا حق حاصل ہوگا، اس کی دلیل یہ ہے کہ تمام معتبرات میں اپنے عزیز واقارب سے صلاح ومشورہ کی اجازت دی گئی ہے، ظاہر ہے کہ پہلے زمانہ میں جو قانونی امداد عزیز واقارب اور پڑوسیوں سے مل سکتی تھی آج کے دور میں اپنے وکیل سے صلاح ومشورہ کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی، لہذا اس پر قیاس کرکے کہا جاسکتا ہے کہ ملزم کو وکیل صفائی سے صلاح ومشورہ کا حق حاصل ہوگا:

''ولا یمکن أحد أن یدخل علیه للاستئناس إلا أقاربه وجیرانه للمشاورة ولا یمکثون عنده طویلا (قوله ولا یمکثون عنده طویلا) --- بل بقدر ما یحصل به المقصود من المشاورة'' (شامی ۴/۳۴۹م ہندیہ ۳/۴۱۸)۔

اس عبارت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وکیل صفائی کو قیدی سے ملاقات کرنے اور بقدر ضرورت بات چیت کرنے اور مقدمہ کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی اجازت ہوگی۔

۱۱- شیر خوار بچوں کا اپنی ماں کے ساتھ رہنا

اصل یہی ہے کہ بچوں کو ان کی مائیں دودھ پلائیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"والوالدات یرضعن أولادهن حولین کاملین" (سورۃ البقرۃ:۲۳۳)۔

(اور بچے والی عورتیں دودھ پلائیں اپنے بچوں کو دو برس پورے)۔

اس حکم پر دلالت کرنے والی نصوص کا تقاضہ یہ ہے کہ ماؤں کو شیر خوار بچوں کو ساتھ رکھنے کی اجازت دی جائے، خاص طور سے جب کوئی بچہ کا خیال رکھنے والا نہ ہو۔

اس کا اشارہ اس حکم سے بھی نکل رہا ہے کہ زوجین کے درمیان طلاق کی صورت میں خاص عمر تک بچوں کی نگہداشت کا حق ماں کو ہوتا ہے۔

نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے بھی اس حکم کا استئناس کیا جاسکتا ہے:

''عن علی رضی الله عنه أنه فرق بین جاریة وولدها، فنهاه النبی صلی الله علیه وسلم ورد البیع''

(ابو داؤد، جہاد، باب فی التفریق بین السبی)۔

قیدیوں کے حقوق-شرعی حل

مولانا ظفر عالم ندوی[1]

قید کے لغوی و اصلاحی معنی

لغوی معنی:......حبس یہ عربی کا لفظ ہے، جسے اردو زبان میں قید کہتے ہیں، حبس کے معنی ہیں روکنا، منع کرنا۔ حبس کا اطلاق گویا قید خانہ پر ہوتا ہے، حبس کی جمع حبوس (بضم الحاء) جس کو حبس اور قید کیا جائے اسے عرب محبوس اور حبیس کہتے ہیں اور قیدی عورت کو حبسۃ کہتے ہیں، جس کی طرف سے قید کیا جائے اسے حابس کہتے ہیں (القاموس المحیط، المصباح المنیر مادہ: حَبس)۔

اصطلاحی معنی:......شرعی اصطلاح میں کسی شخص کو بذات خود تصرف، اپنی مصروفیات اور دیگر دینی وسماجی خدمات کے لئے نکلنے سے روک دینا "حبس" کہلاتا ہے (تبصرۃ الحکام لابن فرحون ۲/۵۰)۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے "حبس شرعی" کی وضاحت فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ شرعی اعتبار سے کسی تنگ جگہ میں قید کرنے کا نام حبس نہیں ہے بلکہ کسی کو تصرف سے روک دینے کا نام حبس ہے خواہ کسی مکان میں روک رکھا گیا ہو یا مسجد میں، موصوف فرماتے ہیں:

"فإن الحبس الشرعيث ليس هو الحبس في مكان ضيق وإنما هو تعويق الشخص ومنه من التصرف بنفسه سواء كان في بيت أو مسجد أو بتوكيل نفس الخصم أو وكيل الخصم عليه" (فتاوی ابن تیمیہ ۳۵/۳۹۸)۔

امام ابن تیمیہؒ کی وضاحت سے معلوم ہوا کہ حبس شرعی کے لئے کسی تیار شدہ عمارت کا ہونا ضروری نہیں، بلکہ گھر یا مسجد میں روک دینا بھی حبس کہلائے گا۔

حبس (قید) کی مشروعیت

فقہاء نے حبس کی مشروعیت کو کتاب وسنت اور عہد نبوی وعہد صحابہ میں ہونے والے واقعات کی بنیاد پر ثابت کیا ہے، علامہ ابن فرحونؒ نے تبصرۃ الحکام (۲/۲۱۶) اور علامہ علاء الدین طرابلسیؒ نے معین الحکام (ص ۱۹۹) میں اس پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے، ان حضرات کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ مجرمین کو قید کرنا اسلام میں جائز ہے، اور یہ جواز قرآنی آیات، نبوی ارشادات اور صحابہ کے واقعات سے ثابت ہے۔ البتہ بعض علماء نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو قید نہیں کیا، لیکن جمہور فقہاء نے یہ ثابت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قید کیا ہے البتہ عہد نبوی اور عہد ابوبکر میں باقاعدہ قید خانہ نہیں تھا۔ قید خانہ کا وجود حضرت عمرؓ کے عہد میں ہوا۔ ذیل میں ہم جمہور فقہاء کے دلائل مختصراً درج کررہے ہیں، تاکہ قید کے جواز پر اسلام کا نظریہ مدلل طور پر واضح ہو جائے۔

۱- "واللاتي يأتين الفاحشة من نسائكم فاستشهدوا عليهن أربعةً منكم فإن شهدوا فأمسكوهن في البيوت حتى يتوفاهن الموت أو يجعل الله لهن سبيلا" (سورہ نساء: ۱۵)۔

(اور تمہاری بیوی میں سے جو عورتیں بے حیائی کا کام کریں تو تم لوگ ان عورتوں پر چار آدمی اپنوں میں سے گواہ بنالو پھر اگر گواہی دے دیں تو تم ان کو گھروں کے اندر مقید رکھو یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ کردے یا اللہ تعالی ان کے لئے کوئی اور راہ تجویز فرمادیں)۔

امام رازیؒ نے اس آیت کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ آیت اگرچہ زنا کی سزا کے سلسلے میں حبس کا حکم منسوخ ہے، لیکن زنا کے علاوہ کے بارے میں یہ حکم آج بھی موجود اور مشروع ہے (احکام القرآن للجصاص ۲/۲۱۶)۔ امام سرخسیؒ نے بھی مبسوط میں حبس کی مشروعیت پر اس آیت سے استدلال کیا ہے (المبسوط للسرخسی ۲۰/۸۸)۔ ان کے علاوہ ابن العربی نے بھی اس سے استدلال کیا ہے (احکام القرآن لابن العربی ۱/۳۵۷)۔

---

[1] دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

۲- "أو ينفوا من الأرض" (المائدۃ: ۳۳)۔ (یا دور کر دیئے جائیں اس جگہ سے)

علامہ حصکفی نے اور علامہ ابن ہمام نے اس آیت سے حبس کی مشروعیت پر استدلال کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ نفی اور جلاوطنی بھی حبس کی ایک شکل ہے (فتح القدیر ۵/ ۴۷۱)۔ احناف کے علاوہ شوافع کی ایک جماعت، حنابلہ اور مالکیہ میں ابن العربیؒ نے بھی اس آیت میں نفی سے حبس ہی مراد لیا ہے۔

ان حضرات نے بہت ہی لطیف بات کہی ہے کہ پوری سرزمین سے جلاوطنی تو ممکن ہی نہیں ہے، اس لئے یہاں حبس ہی مراد ہے (الموسوعۃ الفقہیہ / ۲۸۴)۔

۳- "تحبسونهما من بعد الصلاة فيقسمان بالله" (مائدۃ: ۱۰۶)۔ (تو کھڑا کرو ان دونوں کو بعد نماز کے وہ دونوں قسم کھاویں اللہ کی)۔

ابن العربی نے أحکام القرآن میں صراحت کی ہے کہ اس آیت میں حبس سے قید مراد ہے۔ یعنی جس شخص پر کسی کا حق واجب ہے، اسے روک کر رکھنے کا حق ہے، تا آنکہ وہ حق ادا کرے، اس میں اشارہ حبس ہی کی طرف ہے (احکام القرآن لابن العربی ۲/ ۷۱۶)۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے کوفہ میں اپنے عہد امارت میں اس پر عمل کیا ہے، اس لئے یہ آیت منسوخ نہیں، بلکہ حبس کے بارے میں مشروع ہے (تفسیر خازن ۲/ ۷۱، الطرق الحکمیۃ/ ص ۱۸۶)

۴- "وخذوهم واحصروهم" (سورہ توبہ: ۵)۔ (اور پکڑو اور گھیرو ان کو)

حبس کی مشروعیت پر جمہور فقہاء نے اس آیت سے بھی استدلال کیا ہے۔ علامہ کاسانیؒ نے بدائع الصنائع میں، ابن قدامہؒ نے المغنی میں اس آیت کو بھی مستدل بنایا ہے (بدائع الصنائع ۷/ ۱۱۹، المغنی ۸/ ۲۷۲)۔

۵- "حتى إذا أثخنتموهم فشدوا الوثاق" (سورہ محمد: ۴)۔ (یہاں تک کہ جب خوب قتل کر چکو ان کو تو مضبوط باندھ لو قید)۔

محققین علماء نے اس آیت کو محکم قرار دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اس میں قیدیوں کو قید کرنے کا حکم ہے (الموسوعۃ الفقہیۃ/ ۲۸۵)۔

مذکورہ آیات کے علاوہ فقہاء نے درج ذیل احادیث سے بھی استدلال کیا ہے:

۱- ابن ماجہ میں عمرو بن الشرید سے روایت ہے: "لي الواجد يحل عرضه وعقوبته" (ابن ماجہ ۲/ ۸۱۱ مطبوعہ حلبی)۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس روایت کو حسن قرار دیا ہے۔ اس روایت میں "حل عرضه" سے مراد سخت سست کہنا، اور "عقوبة" سے مراد حبس ہے۔

ابن حجرؒ نے بہت سے فقہاء بالخصوص سفیان ثوری، عبداللہ ابن مبارک وغیرہ کا یہی قول نقل کیا ہے (فتح الباری ۵/ ۶۲)۔

۲- دارقطنی اور بیہقی نے حضرت عبداللہ بن عمر کے واسطہ سے روایت نقل کی ہے:

"روى عن النبي ﷺ أنه قال: إذا أمسك الرجل الرجل وقتله الآخر فيقتل الذي قتل ويحبس الذي أمسك"
(دارقطنی ۳/ ۱۴۰، بیہقی ۸/ ۵۰)۔

(اس روایت سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی کسی کو پکڑ کر رکھے اور دوسرا قتل کر دے تو قاتل کو قصاصاً قتل کیا جائے گا اور پکڑنے والے کو قید کیا جائے گا)۔

۳- امام ابوداؤدؒ اور امام ترمذی نے معاویہ بن حیدہ القشیری کی روایت نقل کی ہے:

"أن النبي صلى الله عليه وسلم حبس رجلا في تهمة" (ابوداؤد ۴/ ۴۷، ترمذی ۴/ ۲۸)۔
(نبی کریم ﷺ نے بربنائے تہمت ایک شخص کو قید کیا)۔

۴- مصنف عبدالرزاق میں عراک بن مالک کی مرسل روایت ہے:

"روى أن النبي صلى الله عليه وسلم حبس أحد رجلين من غفار اتهما بسرقة بعيرين وقال للآخر: اذهب فالتمس فذهب وعاد بهما" (مصنف عبدالرزاق ۱۰/ ۲۱۶، ۲۱۷)۔

۵- مصنف عبدالرزاق میں حضرت علیؓ کا ایک فیصلہ بھی مذکور ہے کہ ایک شخص نے ایک آدمی کو پکڑ رکھا اور دوسرے نے قتل کیا، تو حضرت علیؓ نے قاتل کو قتل کرنے کا حکم دیا اور پکڑنے والے کو قید کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ شخص قید کیا گیا اور قید ہی میں اس کی وفات ہوئی (مصنف عبدالرزاق ۹/ ۴۸۰)۔

مذکورہ آیات اور روایات کی بنا پر تمام صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین کا قید کی مشروعیت پر اتفاق رہا ہے۔

اسلامی شریعت ایک فطری، عقلی اور منطقی شریعت ہے، اس لئے عقل وخرد کا تقاضا ہے کہ جس پر زیادتی اور جرم کا الزام ہو اس کو قید کیا جائے، تا آنکہ عدالت میں اس کا جرم ثابت ہو جائے یا وہ عدالت سے بری ہو جائے۔ اور جرم جس درجہ کا سزا ہو اسی درجہ کی دی جائے، مثلاً اگر قتل کا جرم ہوا اور قتل عمد ثابت ہو جائے تو اسے بھی قصاصاً قتل کیا جائے گا، اور اگر جرم حد کے درجہ کا ہو تو اس پر حد جاری کی جائے گی، اور تعزیر کے درجہ کا جرم ہو تو تعزیر کی جائے گی۔

قید خانہ اور اس کی ایجاد

حبس کا جو اصطلاحی مفہوم بیان کیا گیا، عہد نبوی اور عہد ابوبکر صدیقؓ میں حبس وقید کا یہی مفہوم تھا۔ ان دونوں ادوار میں جس کو قید کیا جاتا وہ ''اسیر'' کہلاتا تھا۔ موجودہ قید خانہ کا تصور ان دونوں ادوار میں نہیں پایا جاتا ہے، بلکہ جب حضرت عمرؓ کا دور آیا اور اسلامی سلطنت میں توسیع ہوئی اور رعایا کی تعداد بڑھ گئی اور ہر طرف پھیل گئی تو انہوں نے ملکی اور سماجی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے مکہ میں ایک مکان خریدا اور اسے قید خانہ بنایا۔ امام ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاوی میں حبس شرعی کی تعریف کرنے کے بعد لکھا ہے:

''لم يكن على عهد النبي صلى الله عليه وسلم وأبي بكر رضي الله عنه حبسًا معدًا لسجن الناس، ولكن لما انتشرت الرعية في زمن عمر بن الخطاب ابتاع بمكة دارًا وجعلها سجنًا وحبس فيها'' (مجموعہ فتاوی ابن تیمیہ ۳۵/ ۳۹۸)۔

قید خانہ اور اس کی مشروعیت

اگر کوئی متعین جگہ میں قید خانہ بنایا جائے اور اس کے لئے مستقل عمارت اور چہار دیواری ہو تو کیا شریعت اسلامی میں اس کی اجازت ہے یا نہیں؟

اس بارے میں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ حضرت عمرؓ نے ملکی اور معاشرتی ضرورت ومصلحت کی بنا پر ایک مکان خرید کر قید خانہ بنایا تھا۔ ظاہر بات یہ ہے کہ اس مشروعیت کے لئے کافی ہے۔ اسی لئے جمہور فقہاء نے کسی الگ اور مستقل جگہ کو قید خانہ بنانے کی اجازت دی ہے۔ اور اسے مصالح مرسلہ میں شمار کیا ہے۔ گویا حاکم وقت ملکی اور سماجی مصلحت کی بنا پر قید خانہ بنا سکتا ہے، حضرت عمرؓ کے بعد حضرت علیؓ نے کوفہ میں قید خانہ مقرر کیا ہے اور مجرم کو وہاں قید کیا ہے۔ علامہ علاء الدین طرابلسی کی وضاحت کے مطابق حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے بھی یہ عمل کیا ہے (معین الحکام للطرابلسی/ ۱۹۷)۔ علامہ ابن فرحون نے صراحت کی ہے:

''وقد أفرد الحكام المسلمون أبنية خاصة للحبس وعدوا ذلك من المصالح المرسلة'' (تبصرة الحكام لابن فرحون ۲/ ۱۵۰)

مسلم حکمرانوں نے قید خانہ کے لئے مستقل علیحدہ عمارتیں بنائی ہیں، ان حضرات نے اس عمل کو مصالح مرسلہ میں شمار کیا ہے۔

التشریع الجنائی الاسلامی میں بھی اس کی مشروعیت پر مکمل گفتگو موجود ہے (التشریع الجنائی الاسلامی ۱/ ۶۹۴)۔

قید خانہ کی نوعیت

قید خانہ کس نوعیت اور صفت کا ہو اس بارے میں اسلامی شریعت کا تصور بہت متوازن ہے، نہ اس طرح کہ وہ ایک آرام گاہ بن جائے، جیسا کہ موجودہ دور میں اہل اقتدار اور امراء کے لئے قید خانہ ہوتے ہیں جہاں ہر طرح کی سہولیات مہیا ہوتی ہیں، بسا اوقات نجی گھروں سے بھی زیادہ سہولتیں پائی جاتی ہیں، اور نہ ہی ایسی تنگ وتاریک، وحشتناک اور اذیتوں سے پر ہو کہ قیدی بنیادی انسانی حقوق سے بھی محروم ہو، بلکہ اسلام نے قیدیوں کو بنیادی ضرورتوں کا مستحق قرار دیا ہے، اسی طرح بشری تقاضوں کی تکمیل اور مذہبی امور بجالانے کی آزادی دی ہے، علامہ ابن نجیمؒ نے ''صفۃ الحبس'' کے بارے میں لکھا ہے:

''صفة الحبس أن يكون في موضع ليس في فراش ولا وطاء ولا يمكن أحد أن يدخل عليه للاستيناس إلا أقاربه وجيرانه ولا يمكثون ولا يخرجون لجمعة ولا جماعة ولا لحج فرض ولا بحضور جنازة ولو بكفيل. وفي الخلاصة: يخرج لجنازة الوالدين والأجداد والجدات والأولاد وفي غيرهم لا يخرج وعليه الفتوى'' (البحر الرائق ۶/ ۲۱۳)۔

(قید خانہ ایسی جگہ ہو جہاں اوڑھنا اور بچھونا نہ ہو اور سوائے قریبی رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے وہاں کوئی داخل نہ ہو سکے کہ وہ اس سے مانوس ہو سکے۔ اقارب اور پڑوسی وہاں قیام نہیں کر سکتے، قیدی جمعہ، جماعت اور حج فرض کے لئے نہیں نکل سکتا اور نہ نماز جنازہ میں شریک ہو سکے گا خواہ کفیل

کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو، خلاصۃ الفتاوی میں ہے کہ کفیل کے ساتھ والدین، دادا اور دادیوں اور اولادوں کے جنازہ میں جا سکتا ہے، ان کے علاوہ میں نہیں، اور اسی پر فتوی ہے)۔

''الموسوعۃ الفقہیہ'' میں ایک جگہ یہ صراحت ہے کہ قیدیوں کو صرف تنہا نہیں رکھا جائے گا بلکہ اجتماعی طور پر بھی رکھا جائے گا، لیکن اتنی بڑی جماعت اور بھیڑ نہیں ہونی چاہئے کہ لوگ سخت تنگی میں پڑ جائیں اور وضو بھی نہ کر سکیں، اور نہ نماز ادا کر سکیں بلکہ اتنی گنجائش اور کشائش ہو کہ کوئی کسی کا ستر نہ دیکھ سکے۔ اسی طرح قیدیوں کو گرمی کی اذیت بھی نہ دی جائے۔

''إن الأصل في الحبس كونه جماعيًا وقالوا: لا يجوز عند أحد من المسلمين أن يجمع الجمع الكثير في موضع يضيق ثعنهم غير المتمكنين من الوضوء والصلاة وقد يرى بعضهم عورة بعض ويوذون في الحر والصيف'' (الموسوعة الفقهيه ۱۶/ ۳۱۹)۔

فقہاء کی مذکورہ تفصیلات وتصریحات سے اتنی بات واضح ہوجاتی ہے کہ قید خانہ بہت تنگ وتاریک نہ ہو اور نہ ہی اتنی بڑی تعداد ہو کہ وہ اپنی ضروریات بھی پوری نہ کر سکیں اور عبادات تک ادا نہ کر سکیں، بلکہ انسانی بنیادی حقوق اور مذہبی امور کی ادائیگی کے مواقع مل سکیں۔

حبس (قید) کی قسمیں

فقہاء نے حبس کی ابتدائی دو قسمیں کی ہیں:

(۱) حبس بغرض سزا (۲) حبس بغرض طلب ثبوت

پہلے یہاں ہم پہلی قسم کو بیان کریں گے اور ان کی مدتوں اور لوازم کو ذکر کریں گے، پھر دوسری قسم پر روشنی ڈالیں گے۔

۱- حبس بغرض سزا ان افعال وجرائم میں ہے جن میں حدود مشروع نہیں ہیں، خواہ ان کا تعلق حقوق اللہ سے ہو یا حقوق العباد سے۔ ان میں دونوں برابر ہیں۔ جن جرائم اور افعال میں شریعت نے حدود مقرر نہیں کئے ہیں ان میں حاکم کی صوابدید پر تعزیر مقرر ہوگی۔ اگر غور کیا جائے تو حبس دراصل تعزیر ہی کی ایک قسم ہے۔

علامہ قرافی مالکیؒ اور علامہ عزالدین بن عبدالسلام شافعیؒ نے تقریباً آٹھ اسباب ذکر کئے ہیں جن میں حبس مشروع ہے۔ علامہ ابن فرحونؒ نے بھی تقریباً آٹھ اور صاحب تبصرۃ الحکام نے قریب قریب دس بنیادیں ذکر کی ہیں (الفروق للقرافی ۴/ ۷۹، حاشیۃ الرملی علی أسنی المطالب ۴/ ۳۰۶، تبصرۃ الحکام ۲/ ۲۱۶، معین الحکام / ص ۱۹۹، ۲۰۰)۔

ان میں پانچ وہ ہیں جن میں حبس بطور تعزیر ہوا کرے گا، مثلاً حق کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنے والے کو تا ادائیگی حق قید کرنا، جنایت کرنے والوں کو معاصی سے روکنے کے لئے قید کرنا، ایسے حق واجبی میں تصرف سے روکنے کے لئے قید کرنا جس میں دوسرے کی نیابت ممکن نہیں، جیسے کسی دو بہنوں سے نکاح کر لیا تھا پھر وہ اسلام لے آیا تو اسے اس وقت تک قید میں رکھا جائے گا جب تک کہ وہ ایک بہن کو زوجیت سے جدا نہ کردے اور کسی ایک کو اختیار نہ کرلے، اگر کوئی شخص مجہول شئی کا اقرار کرے پھر اس کی ادائیگی سے گریز کرے تو تعین کے لئے اسے قید کرنا، اسی طرح اگر کوئی ایسے حقوق اللہ کی ادائیگی سے گریز کرے جن میں نیابت نہیں ہوتی جیسے نماز اور روزے کی ادائیگی سے گریز کرے تو اس کے لئے قید کرنا (حوالہ سابق)۔

ان کے علاوہ حدود کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی بعض امور میں تعزیراً قید بھی کیا جائے گا، جیسے غیر شادی شدہ زانی کو ایک سو کوڑے مارنے کے ساتھ ساتھ سیاست ملکی اور معاشرہ کی استواری کے لئے بطور تعزیر ایک سال قید میں رکھنا (الدر المختار ورد المحتار ۴/ ۱۴)۔

فقہاء نے ان کے علاوہ اور بھی مجرمین کے لئے قصاص کے ساتھ حبس اور کفارہ کے ساتھ حبس کی سزا مقرر کی ہے، طوالت کی وجہ سے ہم ان کا ذکر یہاں حذف کر رہے ہیں، آگے ہم مستقل عنوان کے تحت حبس کے اسباب پر انشاء اللہ روشنی ڈالیں گے۔

قید کی مدت

حبس جب بغرض سزا ہو تو اس کی مدت کیا ہونی چاہئے یہ ایک اہم باب ہے۔ فقہاء نے مجرم کے جرائم کے اعتبار سے سزاؤں کی مدت مقرر کی ہے، ایک ادنی مدت ہے اور ایک اعلی مدت ہے۔

اقل (کم سے کم) مدت قید

فقہاء شوافع کے یہاں قید کی کم سے کم مدت کی صراحت ملتی ہے، بعض فقہاء شوافع نے اقل مدت قید نماز جمعہ سے روک دینا بیان کیا ہے اور دیگر فقہاء شوافع نے قید کی کم سے کم مدت ایک دن بیان کیا ہے (تبصرۃ الحکام ۲/۳۲۹)۔

اکثر مدت کی قید

فقہاء حنفیہ، حنابلہ اور مالکیہ نے بغرض سزا قید کی اکثر مدت متعین نہیں کی ہے، بلکہ ان حضرات نے قاضی کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔ یعنی قاضی کو اختیار ہوگا کہ مجرم کے جرائم اور حالات کے مطابق ان کی سزا کی مدت مقرر کرے، کیوں کہ قید کرنا تعزیر ہی کا ایک جز ہے اور جس قدر مدت قید کرنا متصور ہو قاضی اتنی مدت تک قید میں رکھنے کا حکم صادر کرسکتا ہے۔ بلکہ قاضی کو یہ بھی حق ہوگا کہ عادی مجرم اور بھیانک جرائم کے مرتکب کو حبس دوام کی سزا مقرر کرے۔

''والصحیح أن التقدیر مفوض إلی رأی القاضی لاختلاف أحوال الأشخاص فیه'' (فتح القدیر ۶/ ۳۷۹)۔

اکثر مدت قید کے سلسلہ میں احناف، مالکیہ اور حنابلہ کی رائے تو متفق علیہ ہے، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، لیکن فقہاء شوافع کی آراء مختلف ہیں:

۱- علامہ زبیری شافعیؒ کا قول اکثر مدت چھ ماہ کا ہے۔

۲- لیکن شوافع کا مشہور قول ایک سال کا ہے۔

۳- تیسرا قول یہ ہے کہ اکثر مدت قید کی کوئی تحدید نہیں ہے، امام الحرمین اسی کے قائل ہیں۔

بعض فقہاء شوافع نے جمہور کے مسلک پر عمل کی اجازت دی ہے۔ اس طرح اگر اقوال کا جائزہ لیا جائے تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اسلامی شریعت میں قید کی اکثر مدت کی کوئی تحدید نہیں ہے، بلکہ یہ قاضی اور حاکم کی صوابدید پر مبنی ہے کہ قاضی مجرم کے حسب حال مدت مقرر کرے۔

طویل المیعاد اور قلیل المیعاد حبس کے درمیان فرق

فقہاء نے طویل المیعاد حبس اور قلیل المیعاد حبس کے درمیان بھی فرق بیان کیا ہے، اگر ایک سال سے کم قید کی سزا ہو تو اس کو قلیل المیعاد حبس کہتے ہیں، اور اگر ایک سال سے زائد مدت کی قید ہو تو اس کو طویل المیعاد حبس کہتے ہیں (تبصرۃ الحکام لابن فرحون ۲/ ۱۴۸)۔

اگر معمولی قسم کا جرم ہو مثلاً پڑوسی کو گالی دے دی تو تین دن قید کی سزا دی جائے گی، علامہ ماوردیؒ نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص پورے رمضان روزہ ترک کردے تو اسے بھی تین دن کے لئے قید کیا جائے گا (الاحکام السلطانیہ للماوردی/ص ۲۳)۔ لیکن اگر جرم بڑا ہو اور مجرم اس کا عادی ہو تو فقہاء نے ایسے مجرمین کی سزا حبس طویل رکھی ہے، مثلاً اگر کوئی شادی شدہ زانی ہو اور بار بار اس طرح کا جرم کررہا ہے تو اسے حد زنا یعنی ایک سو کوڑے کے علاوہ ایک سال کے لئے قید میں رکھا جائے گا تاکہ مجرم اپنے اس مجرمانہ عمل سے آئندہ باز رہے اور اس دوران اصلاح بھی ہوجائے (حاشیہ ابن عابدین ۴/ ۶۷)۔

اسی طرح اگر کوئی کسی کو اس طرح زخمی کردے کہ قصاص تو جاری نہ کیا جاسکے، لیکن اس پر حبس طویل کی سزا جاری کی جائے گی۔

مدت حبس مبہم

فقہاء نے مدت حبس کو مبہم رکھنے کو بھی درست قرار دیا ہے اور یہ صراحت کی ہے کہ محبوس کو مدت حبس بتانا ضروری نہیں ہے، بسا اوقات توبہ واصلاح تک حبس کی مدت مبہم رکھی جاسکتی ہے، جیسے شراب پینے، سود لینے دینے، دشمن کے لئے جاسوسی کرنے والے مسلمان کو توبہ واصلاح کی مدت تک قید میں رکھا جاسکتا ہے۔

حبس دوام

ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی مجرم کو حبس دوام کی سزا یعنی تاحیات قید میں رکھا جاسکتا ہے یا نہیں؟ فقہاء نے اس بارے میں بھی بحث کی ہے اور یہ صراحت کی ہے کہ قاضی کو اختیار ہوگا کہ سنگین جرائم کے مرتکب جو بار بار ان جرائم کا ارتکاب کرتا رہتا ہو اس کو حبس دوام یعنی تاحیات قید خانہ میں رہنے کی سزا دے، اس طرح کی سزا کے واقعات دور صحابہ میں بھی ملتے ہیں، امام ابو یوسفؒ نے ضابئ بن حارث التیمی کا واقعہ لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اسے شرارتی چور ہونے کی وجہ سے مستقل طور پر جیل میں مقید کردیا اور وہیں اس کی وفات ہوئی (الخراج لابی یوسف/ ۱۶۳)۔

اسی طرح ایک واقعہ حضرت علیؓ کے دور کا ہے کہ حضرت علیؓ نے ایک مقتول کو پکڑے رکھنے کی وجہ سے حبس دوام کی سزا دی اور اس کی بھی قید خانہ ہی میں وفات ہوئی۔

علامہ ماوردیؒ نے لکھا ہے کہ عادی مجرم کو حبس دوام کی سزا دی جاسکتی ہے (الاحکام السلطانیہ/ص ۲۲۰)۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے آیت قرآنی: "فاقتلوا المشركين حيث وجدتموهم وخذوهم واحصروهم واقعدوا لهم كل مرصد" (سورہ توبہ:۵) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کلمہ اسلام پڑھ کر نماز ادا نہ کرے یا زکوۃ نہ دے تو مسلمان اس کا راستہ روک سکتے ہیں، امام احمدؒ، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ تارک صلاۃ اگر توبہ نہ کرے تو اسے قتل کردے (امام احمد کے نزدیک ردۃً اور امام مالکؒ وشافعیؒ کے نزدیک حداً و تعزیراً)۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اسے خوب زدوکوب کرے اور قید میں رکھے حتی کہ وہ مرجائے یا توبہ کرلے (تفسیر عثمانی سورہ توبہ، آیت:۵)۔ علامہ عثمانیؒ نے یہاں امام ابو حنیفہ کا مسلک نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک تارک صلاۃ کو تاحیات یا تا توبہ قید میں بند رکھا جاسکتا ہے۔ امام ابن تیمیہ نے مجموعہ فتاوی ابن تیمیہ میں متہم شخص کے بارے میں بھی حضرت عمر بن عبدالعزیز اور بعض مالکیہ کی رائے نقل کی ہے کہ اسے حبس دوام کی سزا دی جائے گی، ایسا بدعتی جو اپنی بدعت سے توبہ نہ کرے اس کے بارے میں بھی امام احمدؒ کی رائے یہی ہے کہ اسے بھی حبس دوام کی سزا دی جائے گی۔

''ولكن حبس المتهم عندهم أبلغ من حبس المجهول، ولذلك اختلفوا هل يحبس حتى يموت؟ فقال عمر بن عبدالعزيز وجماعة من أصحاب مالك كمطرف وابن الماجشون و غيرهما أنه يحبس حتى يموت، وهكذا روى عن الامام أحمد فيمن لم ينته عن بدعته أنه يحبس حتى يموت'' (مجموعہ فتاوی ابن تیمیہ ۳۵/ ۴۰۱)۔

اگر کوئی قوم لوط کی طرح گھناؤنی حرکت اور عمل کرے تو اسے بھی حبس دوام کی سزا دی جاسکتی ہے (حاشیہ ابن عابدین ۴/ ۲۷)۔

اگر کوئی تیسری بار چوری کرے یعنی دونوں ہاتھ کٹ جانے کے بعد تیسری بار چوری کرے تو اسے بھی حبس دوام کی سزا دی جائے گی، اسی طرح شراب نوشی کے مستقل عادی، سرکش اور دوسروں کو کثرت سے ایذاء پہونچانے والے کو بھی حبس دوام کی سزا دی جائے گی (السیاستہ الشرعیہ/ ۱۰۴)۔

فقہاء کے مذکورہ اقوال اور تصریحات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام میں سنگین اور عادی مجرمین کی سزا حبس دوام یعنی تاحیات قید ہے۔

قید کی سزا ختم ہونے کے اسباب

اگر کسی مجرم کی سزا قید مقرر ہوجائے خواہ ابھی اس کا نفاذ ہوا ہو یا نہیں درج ذیل اسباب کی وجہ سے قید کی سزا ساقط ہوجائے گی۔

۱- موت: اگر جرم کرنے والا قیدی مرجائے تو اس کی سزا ختم ہوجائے گی چونکہ سزا کا محل ہی نہیں رہا تو اب سزا بھی نہیں ہوگی۔

۲- جنون: جمہور فقہاء کی رائے یہی ہے کہ جرم سرزد ہونے کے بعد اگر مجرم پر عارضی جنون طاری ہو تو اس کی وجہ سے قید کی سزا کا نفاذ روک دیا جائے گا، اس لئے کہ مجنون شرعی احکام کا مکلف نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی سزا و تادیب کا اہل ہوتا ہے۔ چونکہ اس میں شعور وادراک نہیں ہوتا ہے اس لئے سزا کے مقصود کو وہ سمجھ نہیں سکتا اور جب اسے سزا ہی کی خبر نہ ہو تو اسے سزا دینا بے معنی ہوجائے گا (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۲۹۰)۔

البتہ حنابلہ کے یہاں مجنون کی سزا موقوف نہیں ہوگی، ان حضرات کا خیال یہ ہے کہ تعزیر کا مقصد تادیب اور زجر ہے، اگر جنون کی وجہ سے تادیب کا پہلو ختم کردیا جائے تو زجر کا پہلو ختم کرنا مناسب نہیں ہے، تاکہ دوسروں کے لئے یہ ایک سبق ہو کہ یہ جرم اس قدر قابل مواخذہ ہے کہ جنون کے بعد بھی اس میں بخشا نہیں جاتا۔ حنفیہ میں ابو بکر اسکافی بھی یہی خیال ہے، لیکن جمہور احناف جمہور علماء کے ساتھ ہیں (حوالہ سابق)۔

۳-عفو (معافی)

کسی انسان کے حق کی خاطر اگر کسی کو قید کیا جائے اگر وہ معاف کردے تو معافی ہو جائے گی اور قید کی سزا ختم کردی جائے گی، فقہاء نے اس کی مثال یہ دی ہے کہ اگر کسی شخص کو قرض خواہ کے مطالبہ پر قرض کی وصولیابی کے لئے مقید کیا جائے پھر اگر وہ خود معاف کردے تو قید کی سزا ختم کردی جائے گی (فتح القدیر ۵/ ۴۷۱)۔

۴-سفارش

جمہور فقہاء کے رائے یہ ہے کہ اگر مجرم کو سزائے قید سنائی جائے اور یہ مجرم ایسا ہو کہ اس نے کسی کو اذیت نہ دی ہو تو اس میں سفارش کرنا جائز ہے خواہ سزا کا نفاذ ہو گیا یا نہ ہوا ہو، لیکن حاکم اور قاضی کو حق ہوگا کہ وہ سفارش کو رد کردے اگر رد کرنے میں مصلحت ہو، حضرت عمرؓ کے دور میں جب معن بن زائدہ کو جھوٹ بولنے کی وجہ سے قید کیا گیا اور ان کے حق میں سفارش کی گئی تو حضرت عمرؓ نے بربنا مصلحت اس سفارش کو رد کردیا (المغنی ۸/ ۳۲۵)۔

اگرچہ امام زرکشی کو مجرم کے حق میں سفارش اور اس کے قبول کئے جانے پر اشکال ہے، تاہم فقہاء کا یہی فیصلہ ہے کہ اگر مجرم صاحب اذیت نہ ہو تو اس کے حق میں سفارش کرنا جائز ہے۔ البتہ حاکم کو حق حاصل ہے کہ سفارش قبول کرے یا نہ کرے (المنثور للزرکشی ۲/ ۲۴۸، ۲۴۹)۔

۵-توبہ

اگر مجرم اپنے جرم سے توبہ کرلے تو قید کی سزا ختم ہو سکتی ہے، لیکن توبہ کی کوئی خاص متعین مدت نہیں ہے، یہ محض قرائن سے معلوم کی جائے گی۔ بعض توبہ تو ظاہر سے بھی معلوم ہو جائے گی، مثلاً اگر کسی کو دوسرے کے حق کی وجہ سے قید کیا جائے اور وہ اس کا حق بعد قید لوٹا دے تو اسے توبہ تصور کیا جائے گا اور قید کی سزا ختم کر دی جائے گی، اسی طرح اگر ترک نماز کی وجہ سے قید کیا جائے اور تارک نماز پابندی سے نماز پڑھنے لگے اور اس پر اس کے آثار بھی ظاہر ہو رہے ہوں تو اس بنیاد پر قید کی سزا ختم کی جاسکتی ہے۔ تاہم حاکم کو اس کی شناخت کا حق ہوگا اور اپنی صوابدید سے سزا کو ساقط کرے گا (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۲۹۱)۔

حبس بغرض طلب ثبوت

حبس سے متعلق مذکورہ تفصیلات برائے سزا و عقوبت تھی۔ لیکن اگر حبس محض تفتیش و تحقیق کے لئے کیا جائے تو کیا شرع اسلامی میں اس کی اجازت ہے یا نہیں؟

اس بارے میں فقہاء کی تصریحات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق اور طلب ثبوت کی خاطر بھی کسی کو قید کیا جاسکتا ہے۔ فقہاء نے بیان کیا ہے کہ تہمت والزام، اور کسی دوسری سزا کی خاطر بھی قید کیا جاسکتا ہے (حوالہ سابق)۔

قیدیوں کو سزا دینا

اسلام میں قیدیوں کی اصلاح اور اس کی تادیب کی خاطر ایسی سزا دینا درست ہے جن میں بے جا تکلیف، اہانت، اعضاء کا نقصان اور غیر انسانی سلوک نہ ہو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ ایذاء، اہانت، اتلاف اعضاء اور غیر انسانی برتاؤ سے پاک ہے (موسوعہ فقہیہ ۱۶/ ۳۲۶، ۳۲۷)۔ ذیل میں ہم ان سزاؤں کا تذکرہ کرتے ہیں جو قیدیوں کو دینا اسلام میں جائز نہیں ہے:

ناک، کان اور دیگر اعضائے جسمانی کو کاٹنا

قیدیوں کے ناک، کان کاٹنا، ہونٹ کا کچلنا، انگلیاں کھینچنا، ہڈیاں توڑنا جائز نہیں ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے جو قید خانے تیار کروائے اور ان میں قیدیوں کو رکھا تو انہوں نے اس طرح کی کوئی سزا نہیں دی، کیوں کہ قیدیوں کی تادیب اور اصلاح تو کی جائے گی لیکن ان کے اعضاء ناکارہ نہیں کئے جائیں گے، مولانا مودودی کی الجہاد فی الاسلام (ص ۲۵۰) میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ بدر کے قیدیوں میں ایک شخص سہل بن عمرو بڑا چرب زبان تھا، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا، جب وہ قید کرکے لایا گیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا کہ اس کے دانت توڑ دئے جائیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمادیا۔ امام مسلمؒ نے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کے افسروں کو حکم فرمایا تھا کہ ان کا مثلہ نہ کیا جائے "لاتمثلو" (مسلم ۲/ ۸۲)۔

امام نوویؒ نے روایت کے اس حصہ کا حکم بیان کیا ہے کہ قیدیوں کا مثلہ کرنا مکروہ ہے، وفیہ کراهیة المثلة (شرح نووی علی مسلم ۲/ ۸۲)۔

چہرے اور گردن وغیرہ پر مارنا

قاضی اور حاکم کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ قیدیوں کے چہرے، گردن اور حلق کی جگہوں پر مارے، کیوں کہ ان مقامات پر مارنے سے اہانت ہوتی ہے اور جان کا خطرہ بھی، ایسی تادیب جس میں اہانت ہو، یا جان کا خطرہ ہو اسلام میں جائز نہیں، اسی طرح قیدیوں کی گردنوں میں زنجیر ڈالنا، یا مارتے وقت زمین پر لٹا دینا جائز نہیں۔ فتاوی ہندیہ میں صراحت ہے: ''لا ینبغی للقاضی أن یضرب محبوسًا فی دین ولا غیرہ ولا یصفد ولا یقید ولا یغل ولا یمد ولا یجرد ولا یقیمہ فی الشمس'' (فتاوی ہندیہ ۳/ ۴۱۴)۔

آگ میں جلانے کی سزا دینا

قیدیوں کے پورے جسم یا اس کے کسی حصہ کو تکلیف پہونچانے اور اذیت دینے کے ارادہ سے جلانا جائز نہیں، بلکہ فقہاء نے اسے حرام لکھا ہے، ہاں اگر قیدی نے کسی کو جلایا ہو تو قصاصًا بدلہ کے طور پر جلانا اکثر فقہاء کے نزدیک جائز ہے، اسی طرح قیدی کا گلا دبانا، اس کو بھینچنا اور پانی میں ڈبونا جائز نہیں۔

آگ کی سزا کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع سے منع فرمایا اور سخت ناراضگی ظاہر فرمائی، حدیث میں آتا ہے: ''لا تعذبوا بعذاب اللہ'' جس چیز سے اللہ عذاب دیتا ہے اس چیز سے عذاب نہ دو، دوسری روایت ہے: ''إن النار لا یعذب بہا إلا اللہ'' (فتح الباری ۶/ ۱۸۰)۔ بلاشبہ آگ کا عذاب اللہ ہی دے سکتا ہے، البتہ اگر قیدی نے کسی مسلمان کو جلایا ہو تو بدلہ اور قصاص میں اس کو بھی جلایا جاسکتا ہے، جیسا کہ عکل وعرینہ والی روایت میں اس کی نظیر موجود ہے (فتح الباری ۶/ ۱۸۵)۔

بھوک یا ٹھنڈک یا گرمی کی سزا دینا

اسلام میں قیدی کو بھوکا رہنے پر مجبور کرنا اور کھانے پینے کے لئے نہ دینا جائز نہیں، چونکہ کھانا پینا ہر انسان بلکہ تمام جانداروں کی بنیادی ضرورت ہے، اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے: ''ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینًا ویتیمًا وأسیرًا'' (سورۂ دہر: ۸) (اور کھلاتے ہیں کھانا اس کی محبت پر محتاج کو اور یتیم کو اور قیدی کو)۔ تفسیر منیر میں ایک قیدی کا واقعہ منقول ہے کہ بنو عامر کے ایک آدمی کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے گرفتار کرلیا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس سے گزرے تو قیدی نے آپ کو پکارا اور عرض کیا کہ ''میں بھوکا ہوں آپ مجھے کھانا کھلائیے''، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: ''نعم ہذہ حاجتک'' (جی ہاں! یہ تمہاری ضرورت ہے اس کو پوری کی جائے گی) (التفسیر المنیر ۲۶/ ۹۲، ۹۱)۔ مولانا مودودی نے لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کے ساتھ بہتر سلوک کا برتاؤ کیا، اور صحابہ کرام کو حکم دیا کہ ان کے ساتھ فیاضی کا برتاؤ کریں، اس حکم کی تعمیل میں صحابہ نے اس طرح کیا کہ ان کو اپنے سے اچھا کھانا کھلایا اور اپنے سے زیادہ آرام دیا، بعض صحابہ خود کھجوریں کھاتے تھے اور قیدیوں کو روٹی سالن کھلاتے تھے (الجہاد فی الاسلام ص/ ۲۵۰، ۲۴۹)۔

مسلم شریف کی روایت ہے: ''کفی بالمرأ إثما أن یحبس عن من یملک قوتہ'' (مسلم)۔ (آدمی کے گنہگار ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں کی خوراک روک لے)۔ غرض کہ اسلام میں قیدیوں یا ماتحتوں کو کھانا یا پانی سے محروم کردینا سخت گناہ ہے، اسی طرح قیدیوں کو گرم یا سرد جگہ میں رکھنا یا دھوپ کے نیچے کردینا یا ایسے کمرہ میں بند کردینا جس میں دھواں بھرا ہو یا سردی کے بچاؤ والے کپڑوں کے استعمال سے روک دینا، یا لباس اتار دینا جائز نہیں (فتاوی ہندیہ ۳/ ۴۱۴)۔

تیز روشنی کی سزا دینا

قیدی کو ایسے کمرہ میں بند کردینا جس میں تیز روشنی ہو یا کمرہ میں بند کرکے روشنی تیز کردینا تاکہ مسلسل تیز روشنی میں رہنے کی وجہ سے نیند جاتی رہے اور دماغ صحیح طور پر کام نہ کرے اور جو چاہے ان سے اگلوائے، اسلام میں ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ جس طرح دھوپ میں رکھنا جائز نہیں اسی طرح بجلی کی تیز روشنی میں بھی رکھنا جائز نہیں ہے۔

برف کی سل پر لٹانا

قیدیوں کو جس طرح گرم پتھر اور زمین پر نہیں لٹایا جاسکتا ہے، اسی طرح برف کی سل پر بھی لٹانا اور اذیت دینا جائز نہیں ہے، علامہ علاء الدین طرابلسی لکھتے ہیں: ''لیس للطالب أن یقیم الملزوم فی الشمس أو علی الثلج أو فی موضع یضر بہ'' (معین الحکام ص/ ۱۹۹)۔

ننگا کرنا

قیدیوں کے کپڑے اتار کر اسے ننگا کر دینا حرام ہے، کیوں کہ اس سے بے ستری ہوگی جو شرعاً حرام ہے، اسلام نے قیدی یا غیر قیدی کسی کو بھی بے پردہ کرنے کی اجازت نہیں دی ہے، اس قسم کی سزا انسان کو حیوان سے ملا دیتی ہے، اس لئے یہ کسی درجہ میں جائز نہیں ہے، اسلام میں پردہ کی اس قدر اہمیت ہے کہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک صحابی کی ران کھلی ہوئی تھی تو آپ ﷺ نے چھپانے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: ''کیا تمہیں پتا نہیں کہ ران ستر میں ہے''۔ قیدی کو تو برہنہ کرنا درکنار اگر کپڑے نہ ہوں تو ان کو کپڑے فراہم کئے جائیں گے، سیرت کی کتابوں میں اسی طرح احادیث میں بھی یہ واقعہ آتا ہے کہ بدر کے قیدیوں میں حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس بھی تھے، ان کو لباس کی ضرورت تھی، آپ ﷺ نے ان کو لباس مہیا کیا، یہاں تک کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول کا کرتا جو حضرت عباس کے بدن میں فٹ ہو رہا تھا آپ ﷺ نے اس سے لے کر حضرت عباس کو عنایت کیا اور خود اپنا کرتا عبداللہ بن ابی بن سلول کو دے دیا، تاکہ کسی منافق کا احسان نہ رہے، امام بخاریؒ نے اس واقعہ کو ''باب الکسوۃ للأساری'' میں ذکر کیا ہے، اور اس بات کے لانے کا مقصد یہ ہے کہ قیدی اگر ننگے ہوں تو ان کو ستر پوشی کے لئے لباس دیا جائے گا، چنانچہ آپ ﷺ نے لباس دیا ہے:

''فکساه النبي صلی اللہ علیه وسلم إیاہ، فلذلك نزع قمیصه الذی ألبسه'' (البخاری ۲/ ۸۲)۔

وضو، نماز اور دیگر عبادات سے روکنا

مسلمان قیدیوں کو عبادات کے مواقع فراہم کئے جائیں گے، وضو، نماز اور دیگر عبادات مثلاً تلاوت قرآن وغیرہ سے روکنا اسلام میں جائز نہیں ہے، ایسی جگہ جہاں یہ سہولیات نہ ہوں کسی کو قید کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح مذہبی کتابوں کے مطالعہ سے روکنا بھی جائز نہیں ہے۔

دعوت دین سے قیدی کو روکنا

قیدیوں کو دعوت دین سے بھی نہیں روکا جائے گا، یوسف علیہ السلام نے قید میں دین کی دعوت دی تھی، اس لئے اس سنت سے کبھی بھی مسلمان قیدی کو روکنا جائز نہیں ہے۔

اگر قیدی غیر مسلم ہوں تو ان کو بھی ان کی مقدس کتابوں کے مطالعہ اور ان کی اہم شخصیات کی سوانح کے مطالعہ سے نہیں روکا جائے گا، بلکہ ان کی بے حرمتی سے گریز کیا جائے گا۔ اس میں ایک بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ اگر ہم غیر مسلم قیدیوں اور ان کی مذہبی کتابوں اور ان کے قابل احترام شخصیات کے متعلق رواداری نہیں کریں گے تو وہ بھی ہمارے قیدیوں کے ساتھ رواداری نہیں کریں گے، قرآن میں اس کی واضح ہدایت موجود ہے:

''لا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم'' (سورہ انعام/ ۱۰۸)

(اور تم لوگ برا نہ کہو ان کو جن کی یہ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا، پس وہ برا کہنے لگیں گے اللہ کو بدون سمجھے)۔

البتہ غیر مسلم قیدیوں کے لئے ان کی مذہبی کتابیں فراہم کرنا مسلم حکمرانوں اور قید کے افسران کے لئے ضروری نہیں بلکہ یہ ان کی ذمہ داری ہی نہیں ہے۔

قیدی کو گالی گلوج کرنا

قیدیوں کو گالی گلوج کرنا بھی جائز نہیں ہے، نہ لعن وطعن کرنا اور نہ ماں باپ کو گالی دینا جائز ہے، البتہ اے ظالم! اے ستمگر! وغیرہ جیسے الفاظ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۳۲۸)۔

ڈاڑھی نوچنا، سر پر گرم تیل ڈالنا جیسی سزا دینا

قیدی کی اذیت دینے کے لئے دھوپ میں کھڑا کرنا، ان کے سر پر گرم تیل ڈالنا، ان کی داڑھی نوچنا یا مونڈنا، اس پر کتے، سانپ، بچھو جیسے جانور چھوڑنا وغیرہ حرام ہے، اسلام نے اس کی قطعاً اجازت نہیں دی ہے۔

اسی طرح الکٹرک شاٹ لگانا یا جسم کے کسی حصہ کو گرم لوہے یا بجلی سے داغنا حرام ہے، کیوں کہ اس سے اعضاء ناکارہ ہو جائیں گے جس سے اسلام نے سخت منع کیا ہے۔

سیدنا امام مالکؒ سے گرم تیل اور گبریلے کپڑے سے قیدی کو سزا دینے کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا: ''لا یحل هذا، إنما هو السوط أو السجن'' (یہ جائز نہیں، بلکہ سزا کوڑے یا قید خانہ ہے)۔

سچ اگلوانے کے لئے قیدیوں کو مار پیٹ کرنا

یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر قیدی سنگین جرائم کے ارتکاب یا الزام میں مقید ہوں اور وہ سچ چھپا رہے ہوں تو اسے سچ اگلوانے کے لئے مار پیٹ کرنا اور ان کو دھمکی دینا درست ہے یا نہیں؟

اس سلسلہ میں غزوہ بدر کے قصہ میں ایک واقعہ ملتا ہے جس کو امام ابوداؤدؒ نے ''باب فی الأسیر ینال منه ویضرب ویقرر'' (ابوداؤد ۲/ ۳۶۴) کے تحت نقل کیا ہے کہ صحابہ کرام جنگ بدر کے لئے جا رہے تھے اور قریش کے اونٹوں کے پاس سے گزر رہے تھے، وہاں ایک کالا کلوٹا غلام جن کا نام اسلم تھا ملا، اسے پکڑ کر ابوسفیان کے بارے میں دریافت کیا: ''أین أبوسفیان؟'' مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے ''مالي بشيئ من علمه''۔ اس پر صحابہ نے اسے مارا پیٹا، جب مارتے وہ کہتا: مجھے چھوڑ دو میں بتاتا ہوں، جب چھوڑ دیتے تو پھر یہی کہتا: مجھے ان کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ صحابہ کرام اسے پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز ادا فرما رہے تھے، اور ان کی بات سن رہے تھے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا: یہ سچ کہتا ہے تو تم اسے مارتے ہو، اور جب جھوٹ بولتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو۔ ''إنکم لتضربونه إذا صدقکم وتدعونه إذا کذبکم''۔ ابوداؤد کے شارح صاحب عون المعبود نے امام خطابی کے واسطہ سے لکھا ہے کہ اس حدیث میں کافر قیدی کو سچ اگلوانے کے لئے مارنے کا جواز معلوم ہوتا ہے اگر مارنے میں فائدہ ہو۔

''وفي الحدیث دلیل علی جواز ضرب الأسیر الکافر إذا کان في ضربه طائل'' (عون المعبود ۲۴۶/، کتاب الجهاد)

فقہاء نے مذکورہ مقصد کی خاطر مارنے کی اجازت دی ہے، امام ابن تیمیہؒ نے اس بارے میں فقہاء کے تین اقوال نقل کئے ہیں جن میں ایک قول یہ ہے کہ قاضی اور والی مار سکتا ہے، امام ابن تیمیہؒ نے قاضی مصر اشہب کا قول نقل کیا ہے:

''یمتحن بالسجن والأدب ویضرب بالسوط مجردًا'' یعنی سچ معلوم کرنے کے لئے قید کیا جا سکتا ہے، تادیب بھی ہو سکتی ہے، اسے کپڑے اتار کر کوڑے بھی لگائے جا سکتے ہیں۔ غرض یہ کہ سچ اگلوانے کے لئے سزا تو دی جا سکتی ہے، لیکن انسانیت سوز سزاؤں کی اجازت شرعاً نہیں ہوگی۔

قید بسبب تہمت

اگر کسی کے خلاف حقوق العباد میں سے کسی حق کا دعوی کیا گیا، لیکن شرعی دلائل اور شواہد فراہم نہ ہو پا رہے ہوں، تو مدعا علیہ کو معاملہ واضح ہونے تک قید کیا جا سکتا ہے۔ یہ قید دراصل اظہار حال کے لئے ہوتا ہے تاکہ جو چیز پوشیدہ اور غیر واضح ہو وہ واضح ہو جائے، اس دوران حق اللہ یا حق العبد کی خاطر قید کیا جانا حبس بہ سبب تہمت کہلاتا ہے۔

شرع اسلامی میں اس کا جواز واضح طور پر ملتا ہے، فقہاء نے عام طور پر درج ذیل آیت اور روایت سے استدلال کیا ہے۔

آیت یہ ہے: ''تحبسونهما من بعد الصلاۃ'' (مائدہ /۱۰۶) (تم کھڑا کر وان دونوں کو بعد نماز کے)۔

امام ترمذی اور امام ابوداؤد نے یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غفار کے ایک شخص کو دو اونٹ کی چوری کے الزام میں قید کیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملہ کی تحقیق کے بعد اسے رہا کر دیا (ترمذی ۴/ ۲۸، ابوداؤد ۴/ ۴۸)۔ امام ترمذی نے اس روایت کو حسن قرار دیا ہے۔

مذکورہ آیت اور روایت کی وجہ سے فقہاء نے تہمت اور الزام کی بنا پر کسی کو صورت حال واضح ہونے تک قید کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔

جمہور فقہاء کی یہی رائے ہے کہ نظام حکومت کو درست رکھنے اور اسلامی معاشرہ کی استواری کے لئے برائے تفتیش قید کرنا درست ہے، لیکن یہ اس صورت حال میں جب کہ قوی قرائن یا شبہات کے آثار موجود ہوں یا ملزم بدنام زمانہ ہو تو ایسی صورت میں اسے قید کیا جا سکتا ہے (حاشیہ ابن عابدین ۴/ ۷۶، ۸۸، الاحکام السلطانیہ للماوردی/ص ۲۱۹)۔ جیسے ابن ابی الحقیق کا واقعہ ہے کہ خیبر کے موقع سے اس نے کچھ خزانہ چھپا لیا اور اس نے یہ دعوی کیا کہ یہ خزانے اخراجات میں ختم ہو گئے ہیں، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے یہ فرماتے ہوئے قید کیا کہ اتنی کم مدت میں اتنے زیادہ مال کیسے خرچ ہو سکتے ہیں: ''العهد قریب والمال أکثر'' (جامع الأصول لابن الأثیر ۲/ ۶۴۲)۔ یہاں اس کے جھوٹ کا قرینہ موجود تھا اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قید کرنے کا حکم فرمایا، اور حضرت زبیر سے

فرمایا کہ اس پر سختی کرو تا آنکہ خزانہ ظاہر ہو جائے۔ اس طرح کے واقعات دور صحابہ اور دور تابعین میں بھی پیش آئے ہیں، اور ان حضرات نے قید کیا ہے۔

فقہاء نے یہ بھی تفصیل بیان کی ہے کہ اگر کسی پر الزام ہو، لیکن اس کے حالات سے معلوم ہو کہ یہ الزام درست نہیں ہے، الزام پر کوئی معقول قرینہ بھی نہ ہو تو پھر ملزم کو برائے تفتیش و تحقیق قید کرنا جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر ملزم ایسا شخص ہو کہ اس کا حال واضح نہ ہو، یعنی اس کا تقوی یا فسق و فجور کسی کو معلوم نہ ہو تو جمہور فقہاء کے مطابق اس مستور الحال شخص کو بھی قید کیا جائے گا (القوانین الفقہیہ/۲۱۹)۔

قاضی شریح، امام ابو یوسفؒ اور امام الحرمینؒ کی رائے یہ ہے کہ متہم و ملزم کے خلاف جب تک مکمل ثبوت و شواہد نہ ہوں اس وقت تک انہیں قید نہیں کیا جا سکتا ہے۔

قاضی شریح کے پاس ایک واقعہ آیا کہ مال دار شخص کا دوران سفر انتقال ہو گیا، قافلہ کے ایک شخص پر ان کی مال و سرمایہ لینے کا الزام تھا تو قاضی موصوف نے قسم لے کر ان کو چھوڑ دیا، قید نہیں کیا (تبصرۃ الحکام ۱/۴۰۷، المغنی ۹/۳۲۸)۔

اس طرح کے واقعات اور فیصلے امام ابو یوسفؒ اور امام الحرمین کے یہاں بھی ملتے ہیں (المحلی لابن حزم ۱۳۱/۱۱، ۱۳۲)۔

قید بسبب تہمت کا حق کس کو ہے؟

ایک اہم سوال یہاں ہوتا ہے کہ تہمت اور الزام کی بنیاد پر اگر کسی کو قید کیا جائے تو قید کرنے کا حق کس کو حاصل ہے؟ قاضی کو یا والی اور حکمراں کو یا دونوں کو؟ اس بارے میں دو اقوال ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ یہ حق صرف والی کو ہوگا، قاضی کو نہیں ہے، امام زبیری شافعی، علامہ ماوردیؒ اور علامہ قرافیؒ وغیرہ کی رائے یہی ہے۔ ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ یہ کارروائی ملکی اور شرعی سیاست کی بنا پر ہوگی اور یہ حق صرف والی کو ہوا کرتا ہے نہ کہ قاضی کو (السلطانیہ الاحکام ص ۲۱۹)۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ حق والی اور قاضی دونوں کو حاصل ہوگا، اس قول کے قائلین امام مالک، امام احمد اور فقہاء حنفیہ ہیں۔ ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ عمومی ولایت دونوں کو حاصل ہے، البتہ بعض حالات اور مخصوص مواقع میں ولایت کبھی قاضی کو حاصل ہوگی اور کبھی والی کو۔ شرع میں اس کی کوئی تحدید نہیں ہے (تبصرۃ الحکام ۲/۱۴۱، ۱۴۳)۔

قید بسبب تہمت کی مدت

یہاں دوسرا سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر الزام کی بنا پر کسی کو قید کیا جائے تو قید کی مدت کیا ہوگی؟

اس بارے میں بھی فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ مجموعہ فتاوی ابن تیمیہ میں مذکور ہے کہ اس بارے میں دو اقوال پائے جاتے ہیں، ایک قول یہ ہے کہ اس کی مدت متعین ہے اور وہ ایک مہینہ ہے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ مدت متعین نہیں ہے۔ یہ قاضی اور امام کی صوابدید پر موقوف ہے، پہلا قول ابو عبداللہ الزبیری کا ہے، اور دوسرا قول ماوردی کا ہے۔

"واختلفوا في مقدار الحبس في التهمة: هل هو مقدر؟ أم مرجعه إلى اجتهاد الإمام؟ قيل: مقدر بشهر. وهو قول أبي عبد الله الزبيري، وقيل: هو غير مقدر وهو اختيار الماوردي" (مجموعہ فتاوی ابن تیمیہ ۳۵/ ۳۹۹)۔

لیکن اگر تمام فقہاء کی آراء کا تتبع کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اقل مدت کی کوئی تحدید نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ اکثر مدت کیا ہے؟ تو اس سلسلہ میں جمہور فقہاء کی یہی رائے ہے کہ یہ حاکم کے اجتہاد اور صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ مجرم کے حالات کے مطابق قید کی مدت متعین کر سکتے ہیں۔

اگر مجرم ایسا ہو کہ اس کا حال معلوم نہ ہو تو اس کے قید کی مدت ایک دن بھی ہو سکتی ہے اور دو تین دن بھی، اور بعض فقہاء کے نزدیک ایک مہینہ بھی، لیکن اگر مجرم فسق و فجور اور بد معاشی میں مشہور یعنی بدنام زمانہ ہو تو اس کی اکثر مدت قید اس کے ظہور حال تک رہے گی گو کہ قید ہی میں اس کی وفات ہو جائے، جمہور فقہاء اسی کے قائل ہیں (معین الحکام/ص ۲۰۰، ۲۳۹)۔ البتہ امام زبیری الشافعیؒ کی رائے ہے کہ بدنام زمانہ ملزم کو بھی زیادہ سے زیادہ ایک مہینہ تک مقید رکھا جا سکتا ہے جیسا کہ اوپر امام ابن تیمیہؒ کی صراحت بیان کی گئی ہے۔

قید بغرض تحفظ

اگر کسی سے نقصان کا عام لوگوں کو اندیشہ ہو تو مفاد عامہ کے تحت اسے قید کیا جائے گا، فقہاء نے اس قسم کے حبس میں اس شخص کا ذکر کیا ہے جس کی آنکھ سے کسی دوسرے کو نقصان ہو، دوسرے کو تکلیف دہ چیز سے بچانے کے لئے عائن (صاحب نظر) کو قید کیا جائے گا (حاشیۃ ابن عابدین ۴/۳۶۴)۔

قید بغرض نفاذ سزا

اگر کسی شخص کو قاضی کی طرف سے سزا سنائی گئی، لیکن کسی عارض کی بنا پر اسے فی الوقت سزا نہیں دی جاسکتی، مثلاً مجرم مریض ہو، یا حاملہ ہو، یا مرضعہ ہو، بچے کو دودھ پلاتی ہو، ان کی سزا اس وقت مؤخر کردی جائے گی، لیکن اگر یہ اندیشہ ہو کہ مجرم فرار ہوسکتا ہے تو ایسی صورت میں اسے قید میں رکھا جاسکتا ہے تاکہ ان اعذار کے ختم ہونے پر ان کو قاضی کی طرف سے سنائی گئی سزا ان پر نافذ کی جاسکے (أسنی المطالب ۴/۱۲۳)۔

عورتوں کو قید کرنا

جن وجوہات واسباب کی بنا پر قید کی سزا دی جاتی ہے وہ اگر عورتوں میں پائی جائیں تو عورتوں کو بھی سزا دی جائے گی، البتہ قیدی عورتوں کے ساتھ سلوک اور برتاؤ میں مردوں کے مقابلہ میں قدرے فرق ہوا کرے گا۔

عورتوں کے لئے علیحدہ قید خانہ

قید میں عورتوں کو مردوں سے علیحدہ رکھنا ضروری ہے تاکہ ان کی عزت وعصمت محفوظ رہ سکے۔ اسلام کے عمومی قانون میں بھی عورتوں کی عصمت وعزت کی غیر معمولی حفاظت کا انتظام ہے حتی کہ اگر دوران جنگ دشمنوں کی عورتوں سے سابقہ پڑ جائے تب بھی کسی مسلمان سپاہی کو ان سے دست درازی کا حق نہیں ہوگا، شیخ وھبہ الزحیلیؒ نے اس بارے میں بڑی تفصیل کے ساتھ فقہاء کے اقوال اور مباحث نقل کئے ہیں (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۷/۵۵۵۲-۵۷۰۵)۔ غیر مسلم قیدی عورتوں اور بچوں کو جس طرح قتل نہیں کیا جائے گا اسی طرح ان کی عصمت وعزت کی بھی حفاظت کی جائے گی، اس لئے اسلام میں یہ ہدایات موجود ہیں کہ عورتوں کے لئے علیحدہ قید خانے ہوں، مولانا مودودیؒ نے قیدیوں کے حقوق پر "الجہاد فی الاسلام" میں بڑی تفصیلی بحث کی ہے وہاں دیکھی جاسکتی ہے۔

فقہاء نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ عورتوں کی نگرانی اور حفاظت کے لئے عورتیں ہی رکھی جائیں گی، البتہ اگر اس کے لئے کوئی عورت نہ مل سکے تو مجبوری کی حالت میں مرد رکھے جاسکتے ہیں، لیکن مردوں کے لئے یہ شرط ہے کہ صالح اور صاحب تقوی ہونا ضروری ہے۔ اگر عورتوں کے لئے باقاعدہ علیحدہ قید خانہ نہ ہو تو عورت قیدی کسی امانت دار عورت کے پاس رکھی جائے گی جہاں کوئی مرد نہ ہو، اور اگر مرد ہو تو یہ ضروری ہے کہ اس میں عورت کے امانت دار شوہر یا لڑکے ہوں اور وہ تقوی وصلاح میں معروف ہوں (موسوعہ فقہیہ ۱۶/۳۱۷)۔

بچوں کو قید کرنا

عام طور پر فقہاء کی رائے یہی ہے کہ بچے چونکہ مکلف شرع نہیں ہوتے اس لئے ان کو قید نہیں کیا جائے گا، البتہ دوسروں کے مال ضائع کرنے کے بارے میں ان کی تادیب کی جائے گی، بعض احناف بھی اسی کے قائل ہیں، امام سرخسیؒ نے اسی کو راجح قرار دیا ہے (المبسوط ۲۰/۹۱)۔

لیکن احناف میں دیگر لوگوں کا مسلک یہ ہے کہ بچوں کو بھی قید کیا جائے گا، البتہ یہ قید برائے سزا نہیں، بلکہ بغرض تادیب ہوگی (حاشیہ ابن عابدین ۴/۲۵۷)

اگر بچوں سے سنگین جرائم سرزد ہوں جیسا کہ ہمارے اس دور میں ایسے واقعات کبھی کبھی دیکھنے میں آتے ہیں، اس بارے میں فقہاء یہی کہتے ہیں کہ بچوں کو قید نہیں کیا جائے گا کیوں کہ یہ مکلف شرع نہیں ہیں، لیکن احناف کے یہاں بچے بھی سنگین جرائم پر قید کئے جائیں گے البتہ یہ قید سزا کے طور پر نہیں بلکہ برائے تادیب ہوگی (معین الحکام/ص ۱۷۴)۔ فتاوی ہندیہ میں ہے:

"أما الصبي الحر فبعض المشائخ مالوا إلى الحبس وبعضهم قالوا: إذا كان له وصي يحبس تأديبًا" (فتاوی ہندیہ ۲/۴۱۵)

تاہم فقہاء نے یہ بھی شرط لگادی ہے کہ اگر قید میں رکھنے سے فتنہ وفساد کا اندیشہ ہو تو بچے قید خانہ میں نہیں رکھے جائیں گے، بلکہ اپنے والدین کے یہاں قید کرکے رکھے جائیں گے۔

معاملات اور جرائم کے قیدی میں فرق

فقہاء نے معاملات جیسے دیون وغیرہ کے قیدی اور جرائم جیسے چوری اور ظلم وزیادتی کرنے والے قیدی کے درمیان فرق کیا ہے اور دونوں کو علیحدہ رکھنے کی تاکید بیان کی ہے۔ دونوں کو ایک ساتھ رکھنے میں بڑے مفاسد کے امکانات ہیں (فتاوی ہندیہ ۴/ ۴۱۴)۔ کیونکہ قرض اور عقود وغیرہ میں شرفاء بھی مبتلا ہو سکتے ہیں، ان سے یہ کوتاہیاں ہو سکتی ہیں، اگر ان لوگوں کو چوری اور ڈاکہ زنی کرنے والے یا قتل وغارت گری کرنے والوں کے ساتھ رکھ دیا جائے تو قید کے اندر ان پر مزید زیادتیوں کا امکان ہے، اس لئے دونوں قسم کے مجرموں کو علیحدہ علیحدہ رکھنا ضروری ہے۔ اسی لئے فقہاء نے یہ صراحت کی ہے کہ قیدیوں کی درجہ بندی کی جائے۔ غالباً فقہاء کے ان خیالات سے استفادہ کرتے ہوئے موجودہ ہندوستانی قوانین میں بھی قیدیوں کی درجہ بندی کی گئی ہے۔

قیدیوں کے حقوق

اسلامی نقطہ نظر سے کسی مجرم یا ملزم کو قید میں رکھنے کے دو اہم مقاصد ہوتے ہیں، ایک یہ کہ انسانی معاشرے کی جرائم سے حفاظت کی جائے اور دوسرے یہ کہ مجرم کو قید سے نکلنے کے بعد ایک بہتر انسان کی حیثیت سے شرعی اور اخلاقی زندگی گزارنے والا فرد بنایا جائے، اس دوسرے مقصد کے اعتبار سے قید کے دوران اس کو یہ موقع ملنا چاہئے کہ اس کی جسمانی صحت وصلاحیت باقی اور برقرار رہے، اسی طرح اخلاقی حالات بہتر بنانے کے لئے مذہبی امور کی ادائیگی اور مذہبی معلومات کی فراہمی وغیرہ حاصل ہوں، اس بنیادی نقطہ نظر کے پیش نظر قیدیوں کو درج ذیل حقوق حاصل ہوں گے:

۱- جسمانی ضرورت اور تقاضے کی تکمیل

جسمانی صحت وصلاحیت باقی رہنا ان کے بنیادی حقوق میں ہیں، اس کے لئے قیدیوں کو مناسب غذا، صاف پانی، علاج ومعالجہ اور ورزش وتفریح کا حق ہو، فقہاء نے قیدیوں کے حق میں مذکورہ امور کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ "صنوان القضاء وعنوان الافتاء" میں یہ صراحت موجود ہے کہ قیدی کو قید خانہ میں صفائی ستھرائی کا حق رہے گا:

"قال محمد: المحبوس يتنور في السجن ولايخرج إلى الحمام، لأنه ليس في التنوير إبطال حق المدعي، وفيه إزالة التفث عنه" (صنوان القضاء وعنوان الافتاء: قاضي عماد الدين الخطيب الاشفورقاني. تحقيق: قاضي مجاہد الاسلام قاسمی ۱/ ۲۲۳)

۲- جنسی ضروریات کی تکمیل

قیدیوں کے لئے جس طرح کھانے پینے کی سہولیات فراہم کی جائیں گی، اسی طرح قاضی کی اجازت سے اگر قید خانہ میں تنہائی کی جگہ ہو تو اپنی بیوی سے خواہشات پوری کرنے کی بھی اجازت ہوگی۔ قاضی اشفورقانیؒ نے لکھا ہے کہ اگر قیدی کو مباشرت کی ضرورت ہو تو اس کو اپنی بیوی سے ملاقات کا موقع اس طرح دیا جائے گا کہ کسی کو خبر نہ ہو۔

"ولو احتاج إلى المباشرة لابأس بأن تدخل زوجته وجاريته في السجن فيطؤها بحيث لايطلع عليه أحد. لأن قضاء شهوة الفرج من أصول الحوائج فلا يمنع عنه كالأكل والشرب" (حوالہ سابق)۔

علامہ موصوف نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ قیدیوں کو شادی کرنے کا بھی حق حاصل ہوگا۔ اس لئے کہ اگر ان کو نکاح اور تعلق ازدواج سے روک دیا جائے تو یہ مزید زجر ہو جائے گا جو ظلم کے دائرہ میں آجائے گا۔

"ولا يمنع من التزوج؛ لأنه إذا تزوج ومنع عن الوطء ويزاد ضجره" (صنوان القضاء ۱/ ۲۲۳)۔

۳- مذہبی امور کی ادائیگی کے حقوق

قیدیوں کو مذہبی امور کی ادائیگی کا موقع دیا جائے گا بلکہ اس کی طرف اسے آمادہ کیا جائے گا، تاکہ ایک بہتر انسان بنے، اور ان کی اصلاح کے لئے عبادات کی ادائیگی، قرآن کی تلاوت، مذہبی کتابوں کا مطالعہ، دوسرے قیدیوں کے درمیان دعوت دین ہر مکلف انسان کا فریضہ ہے، جن کی ادائیگی کا ان کو موقع ملنا چاہئے۔

عام سماجی حقوق

انسانی سماج اوران کے حالات سے واقفیت کے لئے اخبارات پڑھنے، ریڈیو سننے اور فون پر بات کرنے اور قید کے اندر رہتے ہوئے ثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لینے جیسے امور قاضی اور حاکم کی اجازت پر موقوف ہیں، اگران چیزوں میں شرکت قید کے مصالح کو فوت نہ کرتی ہو تو اس کی اجازت دی جائے گی۔

اسی طرح قید میں گھر کے لوگوں سے ملنے اور پڑوسیوں سے ملاقات کا حق حاصل ہوگا، قید میں رہتے ہوئے ان کو خرید وفروخت کرنے اور مالی تصرفات کا بھی حق حاصل ہوگا، ان چیزوں سے ان کو نہیں روکا جائے گا۔

''ولا يمنع من دخول الزوار عليه من أهله وجيرانه ولايمنع من البيع والشراء لما فيها من سرعة قضاء الدين'' (حوالہ سابق)

۵-اخلاقی امور کے حقوق

قیدیوں کو اخلاق سے آراستہ ہونے اور دوسرے قیدیوں کے ظلم وزیادتی اور بداخلاقیوں سے محفوظ رہنے کا بھی حق حاصل ہوگا، اس کے لئے قیدیوں کی زمرہ بندی کی جائیگی، مردوں کو ایک زمرہ اور قید خانہ میں رکھا جائے گا اور عورتوں کے لئے الگ قید خانے ہوں گے، اسی طرح بالغ ونابالغ قیدیوں کے الگ الگ زمرے ہوں گے، عادی اور سنگین جرائم کے مجرموں سے غیر عادی اور معمولی قسم کے جرم میں گرفتار لوگوں کو الگ رکھا جائے گا تا کہ ان کو عادی مجرموں اور بری طینت کے قیدیوں کی صحبت سے بچایا جاسکے۔

۶-علاج ومعالجہ کے حقوق

اگر قیدی بیمار ہوجائے اور قید خانہ میں علاج ممکن ہو تو وہیں رہتے ہوئے ان کے علاج ومعالجہ کا انتظام کیا جائے گا، اگر علاج نہ ہو اور اس کی وجہ سے قیدی ہلاک ہوجائے تو اسلام میں یہ جائز نہیں ہے۔

اگر قید خانہ میں علاج ممکن نہ ہو تو اسے علاج کے لئے باہر نکالے جانے کی اجازت ہوگی۔ حنفیہ کا مفتی بہ قول یہ ہے کہ کفیل کے ساتھ ان کو ہر علاج کے لئے نکالا جائے گا، بغیر کفیل کے نہیں نکالا جائے گا۔

مسلم حکمرانوں نے ہر دور میں مریضوں کی صحت اور ان کے علاج ومعالجہ کے احکام جاری کئے ہیں، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے حکام کو قیدیوں کی اچھی نگہداشت اور ان کے علاج ومعالجہ پر توجہ دینے کا حکم جاری فرمایا تھا، اسی طرح بعد کے ادوار میں بھی اس کا رواج رہا ہے (موسوعہ فقہیہ ۱۶/۳۲۰)۔

۷-قیدی عورتوں اور ان کے شیر خوار بچوں کے حقوق

قیدی عورتوں کو اپنے شیر خوار بچوں کے ساتھ قید میں رہنے کا حق حاصل ہوگا، بچوں کو ماں سے جدا نہیں کیا جائے گا۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے:

''أنه فرق بين جارية وولدها فنهاه النبي ﷺ عن ذلك ورد البيع'' (ابوداؤد مع عون المعبود ۷/۲۵۹)۔

اس روایت سے فقہاء نے استدلال کیا ہے کہ جب خرید وفروخت میں ماں اور اس کے بچوں میں تفریق نہیں کر سکتے ہیں تو قید خانہ میں بھی تفریق نہیں کی جائے گی۔ ظاہر بات ہے دونوں کو جدا کرنے میں ماں کو مزید اذیت دینے کے ساتھ ساتھ بچہ کو بھی اذیت دینے بلکہ ہلاکت میں ڈالنے کی کارروائی ہوگی جو شرع اسلامی میں درست نہیں ہے۔

مذکورہ حقوق کے علاوہ قیدیوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو کسی انسان کو بحیثیت انسان کے حاصل ہوتے ہیں، مثلاً محنت کرنے، کمائی کرنے، بیوی بچوں کے اخراجات کی فراہمی کے لئے قید خانہ کے اندر رہتے ہوئے محنت ومزدوری کرنے کا موقع دیا جائے گا، اس طرح کی اور دیگر ضروریات وسہولیات بھی فراہم کی جائیں گی۔

قیدیوں کے حقوق سے متعلق سوال نامہ کے جوابات

قید اور اس سے متعلق مذکورہ تفصیلات کی روشنی میں قیدیوں کے حقوق سے متعلق سوال نامہ کے جوابات ترتیب وار تحریر کئے جارہے ہیں:

۱- ملزم کو جرم کا ثبوت فراہم ہوئے بغیر بھی حاکم وقاضی کی اجازت سے قید کیا جا سکتا ہے، اور قید کی مدت قاضی کی صوابدید پر ہے، قاضی جتنی مدت تک ضرورت محسوس کریں اسے قید میں رکھ سکتے ہیں، لیکن اس صورت میں حبس دوام کی سزا نہیں دی جا سکتی ہے۔ بعض فقہاء نے ایک مہینہ کی تحدید کی ہے۔

۲- الف- قیدیوں کو عبادت کرنے، مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرنے، دوسرے قیدیوں کے درمیان دعوت دین کا فریضہ انجام دینے، اور مذہبی تعلیمات وعقائد کے مطابق غذا استعمال کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اور قیدیوں کی مقدس شخصیتوں اور کتابوں کی بے حرمتی سے گریز کیا جائے گا۔

ب- جسمانی ضروریات مثلاً مناسب غذا، صاف پانی، ورزش وتفریح، بیوی سے تعلق کے مواقع فراہم کئے جائیں گے، لیکن ایسی تنگ جگہ میں قیدیوں کو رکھنا جہاں ان کے لئے کھڑا ہونا، پاؤں پھیلا کر لیٹنا یا دیوار کے باہر کسی چیز کا دیکھنا ممکن نہ ہو جائز نہیں ہے۔

ج- عام سماجی حقوق مثلاً اخبارات پڑھنے، ریڈیو سننے، فون پر احباب واقارب سے گفتگو کرنے، دوسرے قیدیوں سے ملاقات کرنے، تعلیم اور ہنر وغیرہ سیکھنے کے مواقع قیدیوں کے لئے فراہم کرنا درست ہے۔

د- اخلاقی امور مثلاً مردوں اور عورتوں کے لئے الگ الگ قید خانے، بالغوں اور غیر بالغوں لئے الگ الگ قید خانے ہونا شرعاً ضروری ہیں۔

۳- قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے دھمکانا اور مار پیٹ کرنا جائز ہے، لیکن قیدیوں کو بے لباس کر دینا، الکٹرک شاٹ لگانا، قیدیوں پر کتے چھوڑنا، ان کو سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈال دینا شرعاً درست نہیں ہے۔ اسی طرح ان کو مسلسل جگے رہنے پر مجبور کرنا اور ان کی رہائش گاہ میں تیز روشنی اور تیز آواز کا انتظام رکھنا جائز نہیں ہے۔

۴- قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑنا، بیڑی ڈالنا اور ہتھکڑی پہنانا درست ہے۔ گو کہ بعض فقہاء حنفیہ نے ناجائز لکھا ہے۔

۵- اگر جرم سنگین ہو تو قید تنہائی بھی دی جا سکتی ہے۔

۶- زیر سماعت قیدی اور سزا یافتہ قیدیوں کے درمیان سلوک میں فرق کرنا درست ہے۔

۷- قاضی کی صوابدید سے اصل سزا کی مدت کے بقدر فیصلہ سے پہلے قید میں رکھا جا سکتا ہے۔

۸- سزا کے جو حدود مقرر ہیں اگر اسی کے اندر رہ کر سزا دی گئی اور قید خانہ میں رکھا گیا تو عدالت سے بری ہونے کے بعد مالی حرجانہ طلب کرنے کا حق نہیں ہوگا، لیکن اگر مقررہ حدود سے بڑھ کر سزا دی گئی اور غیر انسانی سزائیں دی گئیں تو بری ہونے کے بعد مالی حرجانہ طلب کرنے کا حق ہوگا۔

۹- قیدی اس سلسلہ میں وکیل صفائی سے مدد لے سکتا ہے۔

۱۰- خواتین قیدیوں کو اپنے ساتھ شیر خوار بچوں کو جیل میں رکھنے کا حق حاصل ہوگا۔

☆☆☆

قیدیوں کے حقوق اسلامی تناظر میں

ڈاکٹر مفتی محمد فہیم اختر ندوی[1]

موجودہ دور جہاں کئی اعتبار سے ترقی یافتہ اور وسائل وٹکنالوجی کے انقلاب کا زمانہ کہلاتا ہے، وہیں یہ اخلاق واقدار کے زوال اور مادیت ونفع پرستی کے غلبہ کی وجہ سے انسانی حقوق کی شدید پامالی کا بھی زمانہ محسوس ہوتا ہے، چنانچہ آج سماج میں کئی ایسے طبقات ہیں جو شدید ناانصافی، محرومی اور ظلم وبربریت کے شکار ہیں اور گو کہ ان کے حقوق کے تحفظ اور ان کی بہبودی کے لئے کوششیں کی جارہی ہیں اور حقوق کی پامالی اور ظلم کو روکنے کے لئے سفارشات اور دستاویزات تیار کی گئی ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ مسائل ومشکلات کی سنگینی کی رفتار بہت تیز ہے اور مقدار فزوں تر، سماج کے ایسے ہی محروم ومظلوم طبقات میں ایک طبقہ وہ ہے جو پس زنداں قیدیوں کی صورت میں زندگی گذار رہا ہے، قیدیوں کے مسائل میں سزایافتہ مجرمین کے ساتھ سلوک اور ان کے حقوق کا مسئلہ جہاں تشویشناک ہے، وہیں زیر حراست لوگوں کے ساتھ معاملہ انتہائی بدترین صورت اختیار کرتا جارہا ہے، مختلف ناموں اور وجوہات کے تحت لوگوں کو حراست میں اس طرح لے لیا جاتا ہے کہ بسااوقات ان کے اہل خانہ کو اطلاع بھی نہیں ہوپاتی، پھر تفتیش کے نام پر ان کو ایسی اذیتیں دی جاتی ہیں کہ بڑے بڑے جرائم کی سزا بھی ان کے سامنے ہیچ ہے اور بسااوقات اذیت رسانی کے ساتھ انتہائی ذلیل قسم کی شرمناک بدسلوکی اور جنسی کھلواڑ بھی روا رکھا جاتا ہے اور یہ تماشے مہینوں اور برسوں چلتے ہیں، اس دوران ان کے پورے خاندان کو کرب واذیت اور نقصان کے ناقابل برداشت حالات میں جینے پر مجبور کردیا جاتا ہے، پھر بے شمار واقعات میں یہ تفتیش بے نتیجہ ثابت ہوتی ہے اور زیر حراست قیدیوں کو جرم کے بغیر سنگین مجرموں سے بدتر زندگی گذارنے کے بعد رہا کردیا جاتا ہے۔

یہ وہ صورت حال ہے جو حالات پر نظر رکھنے والا کوئی بھی شخص آئے دن سنتا اور پڑھتا ہے، ان حالات میں حقوق انسانی کے تحفظ کے لئے آواز اٹھانے والوں کی تنظیمیں وجود میں آئی ہیں، ان تنظیموں کے کارکنان جیل خانوں اور تفتیشی مراکز کے دورے کرتے ہیں، متاثرین سے ملتے ہیں اور حقائق پر مبنی رپورٹس سامنے لاتے ہیں، بین الاقوامی سطح کی ایسی متعدد تنظیموں نے حکومتوں کے سامنے تجاویز پیش کی ہیں، جن میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ قیدیوں کے ساتھ بہتر انسانی سلوک روا رکھا جائے، ان کی اصلاح اور تربیت پر توجہ دی جائے، ان کے مذہبی حقوق کا خیال رکھا جائے، مناسب غذا و پانی اور حفظان صحت کے انتظامات کئے جائیں، انھیں اچھا شہری بنانے کے لئے عام سماجی حقوق کا لحاظ رکھا جائے، نیز ان کو بہتر قانونی امداد سے استفادہ کے مواقع دئے جائیں، حقوق انسانی کی تنظیموں کے سامنے سب سے زیادہ تشویشناک مسئلہ ان قیدیوں کا ہے، جو صرف شک وشبہ کی بنیاد پر حراست میں لئے گئے ہیں، ان کی تحقیقات میں یہ بات روشنی میں آئی ہے کہ ایسے لوگوں کو تفتیش کے نام پر سخت ترین سزاؤں کا نشانہ بنایا جاتا ہے، ان کے خلاف کیس شروع کرنے سے پہلے طویل طویل عرصہ تک انھیں حراست میں رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے، ایسے میں وہ اپنے اوپر لگائے جارہے الزامات کا دفاع بھی نہیں کرپاتے ہیں، پھر انھیں اس عرصہ میں جیلوں کے علاوہ گمنام مقامات پر رکھ کر ٹارچر کیا جاتا ہے، ایسے واقعات بھی روشنی میں آئے ہیں کہ انھیں شدید جنسی تشدد اور بدسلوکی سے دوچار کیا جاتا ہے، یہ صورت حال کسی بھی مہذب سماج کے لئے اچھی نہیں سمجھی جاسکتی ہے اور اس سے سماج کے اندر امن وامان کے فروغ اور انصاف کے استحکام میں مدد نہیں مل پاتی ہے۔

اسلام کے اولین دور میں قیدی

قیدیوں کا مسئلہ کوئی نیا نہیں ہے، تاریخ میں قیدیوں کے حقوق کے حوالہ سے باتیں آتی رہی ہیں، پہلے زیادہ تر جنگی قیدی ہوا کرتے تھے، اب

[1] اسسٹنٹ پروفیسر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔

مختلف قسم کے جرائم اور دہشت گردی کے حوالہ سے قید اور حراست کی صورتیں پیش آتی ہیں، اسلام کی تاریخ کے اولین دور میں بھی قیدیوں کا وجود تھا اور ان کے لئے جیلیں بھی بنائے گئے، اسلام کے حوالہ سے قیدیوں کے ساتھ سلوک کی سب سے پہلی مثال مشرکین مکہ کے ساتھ مسلمانوں کے پہلے غزوہ میں اس وقت سامنے آئی، جب بدر کی لڑائی میں دشمنوں کے ستر قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے، انھیں مدینہ منورہ لے جایا گیا، اس وقت جیل نہیں تھے، وہاں انھیں باندھ کر رکھا گیا، لیکن بندھن کی رسی کی تکلیف سے قیدی کے کراہنے کی آواز سنائی دی، تو اسے ڈھیلا کر دیا گیا، اس وقت مسلمان معاشی اعتبار سے انتہائی تنگی کے عالم میں تھے اور تینوں وقت کے کھانے بھی انھیں بآسانی میسر نہ تھے، ایسی صورت میں ان قیدیوں کے کھانے پینے کا انتظام مختلف گھروں کے سپرد کر دیا گیا اور وہ اس طرح انجام پایا کہ گھر کے لوگوں نے خود معمولی کھایا، لیکن انھیں اچھا کھانا فراہم کیا، جن قیدیوں کے جسم پر کپڑے نہیں رہ گئے تھے، ان کے لئے کپڑوں کا انتظام کیا گیا اور جو قیدی تعلیم یافتہ تھے، انھیں تعلیم اور تدریس کے مہذب اور باوقار کام میں مصروف کیا گیا اس کے بدلہ میں یہ اعزاز دیا گیا کہ انھیں قید سے رہائی عطا کر دی گئی، یہ قیدیوں کے ساتھ سلوک کا اولین اسلامی نمونہ تھا، نمونے اور بھی قائم ہوتے رہے اور ان کی روشنی میں علماء اور اہل دانش نے قیدیوں کے حقوق اور ان کے ساتھ سلوک کے اصول وضوابط طے کئے۔

قیدیوں سے متعلق اسلامی اصول

قیدیوں کے ساتھ اس حسن سلوک کی بنیاد قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ کی ہدایات تھیں، قرآن نے قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور انھیں کھانا کھلانے کو اللہ کی رضا کا باعث اور مومن بندوں کی صفات قرار دیا: "ویطعمون الطعام علی حبه مسکینا و یتیما و أسیرا" (سورہ دھر: ۸) (اور وہ مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا اس کی محبت کے باوجود کھلاتے ہیں)۔ ثمامہ بن اثال مسجد نبوی میں قید میں رکھے گئے تھے، رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں صحابہ کرام سے فرمایا: ''اجمعو ما عندکم من طعام فابعثوا به إلی ثمامة بن أثال'' (جو کچھ تمہارے پاس کھانے کا سامان ہے، اسے جمع کر کے ثمامہ بن اثال کے کھانے کا انتظام کرو) (فتح الباری ۸/۸۸) اسی طرح آپ ﷺ نے قیدیوں کے حقوق کے بارے میں ہدایت دیتے ہوئے فرمایا: استوصوا بالأساری خیرا (قیدیوں کے ساتھ خیر کا معاملہ کرو) (معجم کبیر للطبرانی، حدیث نمبر ۹۷۷)۔

قیدیوں کا مسئلہ بنیادی طور پر عدل وانصاف اور امن وامان کے ساتھ جڑا ہوا ہے، عدل کے تعلق سے اسلام کا موقف بہت واضح ہے کہ وہ اپنے، بیگانے، دوست و دشمن اور عزیز واقارب سب کے ساتھ عدل اور انصاف کا ایک ہی پیمانہ استعمال کرنے کی تاکید کرتا ہے، قرآن کی آیت کا دوٹوک اعلان ہے:

"ولا یجرمنکم شنآن قوم علی أن لا تعدلوا اعدلوا هو أقرب للتقوی"

(کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو عدل کرو کہ یہ خداترسی کے زیادہ قریب ہے) (سورہ مائدہ: ۸)

اور "یأیها الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط" (اے ایمان والو! انصاف کے ساتھ کھڑے ہونے والے بنو) (سورہ نساء: ۱۳۵)

اسلام کے نزدیک جس طرح کسی مجرم کو سزا نہ دینا بے انصافی ہے، اسی طرح کسی بے گناہ کو ظلم وزیادتی کا نشانہ بنانا بھی بے انصافی ہے، اور وہ ان دونوں قسم کی صورتوں میں حد سے معمولی تجاوز کو بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، جہاں تک امن وامان کا تعلق ہے، اسلام سماج کے ہر فرد کو اس سے بہرہ ور کرنے کی تاکید کرتا ہے، اور امن وامان کے قیام اور اس کے استحکام کو ریاست کی بنیادی ذمہ داری قرار دیتا ہے، اس سلسلہ میں اس کا اصول ہے کہ ہر انسان بنیادی طور پر بری الذمہ ہے، جب تک کہ اس پر کوئی جرم ثابت نہ ہو جائے، ''إن الأصل في المتهم البرائة حتی تثبت إدانته''، اس کا یہ بھی موقف ہے کہ بار ثبوت مدعی پر ہے، لہذا جس پر کوئی الزام لگایا گیا، اس کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اپنی بے گناہی ثابت کرے، بلکہ یہ الزام لگانے والے کی ذمہ داری بنتی ہے کہ اپنے دعوی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے اس کو مجرم ثابت کرے، ''البینة علی المدعی'' (مشکوۃ المصابیح، کتاب الامارۃ والقضا)۔

امن اور جرم کے تعلق سے اسلام کا تصور یہ ہے کہ مجرم بھی انسان ہے اور جرم کی سنگینی پر بعض معاملات میں سزا سنگین ضرور ہوگی، تاکہ اس سے انسانیت کو عبرت حاصل ہو اور سماج کو اس قسم کے سنگین جرائم سے محفوظ رہنے کے زیادہ امکانات حاصل ہوسکیں، لیکن بہر صورت مجرم انسان محض ارتکاب جرم کی وجہ سے اپنے مقام انسانیت سے نیچے نہیں گر جاتا ہے، لہذا سزا کے نفاذ سے پہلے یا نفاذ سزا کے دوران اس کی تذلیل اور توہین نہیں کی

جاسکتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں ایک سنگین سزا کے نفاذ کے دوران ایک جلیل القدر صحابی نے جب مجرم کے تئیں کسی قدر نفرت کا اظہار کیا، تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو سخت ناپسند کیا اور فرمایا کہ اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اس کی توبہ کو مدینہ کے ستر لوگوں پر تقسیم کردیا جائے تو ان سب کے گناہ معاف ہوجائیں (مشکوۃ المصابیح، کتاب الحدود)۔

اسی طرح مجرم کو اس کے بنیادی انسانی حقوق سے محروم نہیں کیا جاسکتا، نیز اس کو سزا کی مقررہ حد سے ذرا بھی زیادہ سزا نہیں دی جاسکتی ہے، قرآن کی صاف ہدایت ہے: "وإن عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به" (اور اگر تم سزا دو تو اسی کے مثل سزا دو جتنی تم کو سزا دی گئی) (سورہ نحل ۱۲۶)۔

یہ تو مجرم کے تعلق سے اسلام کا موقف ہے، اگر کسی شخص کو ارتکاب جرم کے تحت نہیں بلکہ صرف شک وشبہ کی بنیاد پر گرفت میں لیا گیا ہے، یا احتیاطی حراست میں رکھا گیا ہے، تو اس مرحلہ پر اس کو کوئی سزا نہیں دی جاسکتی ہے۔ تفتیش کی اجازت ضرور ہوگی اور اگر شبہات زیادہ قوی اور واقعات وقرائن ارتکاب جرم کے حق میں ہوں تو کسی حد تک سختی بھی تفتیش میں اپنائی جاسکتی ہے، لیکن تفتیش میں ایسے طریقے نہیں اپنائے جاسکتے ہیں جو سزا کے زمرہ میں آتے ہیں اور نہ ہی تفتیش کے نام پر اتنی مدت زیر حراست رکھا جاسکتا ہے، جو خود اپنے آپ میں سزا بن جائے، تفتیش میں بے جا سختی اور دباؤ بنانے کے لئے جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی تکلیف کے حربے اپنانے کی بھی اجازت نہیں ہوسکتی، نیز اسلام کی نظر میں اکراہ اور سختی کے تحت کیا گیا اقرار قانونی حیثیت نہیں رکھتا اور اس کی بنیاد پر مقدمہ نہیں چلایا جاسکتا ہے۔

قیدی خواہ ثبوت جرم کے بعد قید خانہ میں ہو، یا تفتیش کے تحت زیر حراست ہو، دونوں صورتوں میں اسلام اسے بنیادی انسانی حقوق سے بہرہ ور رکھنے کی وکالت کرتا ہے اور دونوں قسم کے قید میں فرق کی تاکید کرتا ہے، کیونکہ پہلا شخص قید خانہ میں بطور سزا کے ہے، جب کہ دوسرا انسان ابھی مجرم ثابت نہیں ہوسکا ہے اور یہ قید اس کی سزا کے بطور نہیں بلکہ ارتکاب جرم کی تحقیق اور تفتیش کے لئے ہے، اس دوسری نوع کی حراست میں اسلام اس بات کا فرق روا رکھنا چاہتا ہے کہ جس شخص کو کسی شک کی بنا پر حراست میں لیا گیا ہے، وہ سماج میں کیا حیثیت رکھتا ہے؟ مثال کے طور پر اگر وہ جرائم پیشہ گروہ کا مشہور فرد ہے، جرم کا اس کا پرانا ریکارڈ ہے، یا بدنام زمانہ ہے تو اس کے ساتھ رویہ علاحدہ ہوگا اور اگر وہ سماج کے اندر اپنی نیک نامی کے لئے مشہور ہے، سماج کی بہتری کے لئے کام کرنے کا اس کا ریکارڈ ہے اور وہ صاف وشفاف شخصیت کا مالک ہے تو اس کے ساتھ معاملہ علاحدہ ہوگا اور اگر اس شخص کی صورت حال واضح نہیں ہے، تو اس کے تئیں تحقیق وتفتیش میں نسبتاً زیادہ وقت لگ سکتا ہے۔

جرم اور مجرم کے حوالہ سے اسلام کے مقاصد کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے، کیونکہ سزا اور سلوک کی تعیین اور اس کی تفصیلات ان مقاصد کے دائرہ میں ہی طے ہوتی ہے، یہ بات تو واقعاتی ہے کہ سماج میں کچھ لوگ کبھی کسی غلطی کے تحت اور کبھی اپنی بدمزاجی کی وجہ سے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں، ایسے موقع پر اسلام مجرم اور سماج دونوں کو ایک ساتھ اپنے سامنے رکھتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ سماج میں امن وامان قائم ہو، جرم کے نقصانات اور غلط اثرات سے سماج کو تحفظ ملے، مجرم کو اپنی غلطی اور گناہ کا احساس اور شرمندگی ہو اور وہ اپنے گناہوں سے پاک ہوسکے، مجرم کی اصلاح اور تربیت ہو کہ وہ دوبارہ غلطیوں سے محفوظ رہنے کی کوشش کرے، مجرم کی سزا بھی بعض صورتوں میں سماج کے دوسرے افراد کے لئے عبرت کا سامان ہو اور جس طرح سماج کے ہر فرد کو ظلم سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جائے، اسی طرح مجرم کو بھی سزا کے سوا کسی بھی دوسرے ظلم سے محفوظ رکھا جائے، یہ سزا اور مجرم کے حوالہ سے اسلام کے مقاصد ہیں، چنانچہ اسلام کی تمام سزاؤں پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوجاتا ہے کہ اسلام سزا کے نفاذ کو زیادہ کرنے کے بجائے سزا کے واقعات کو کم سے کم (Minimize) کرنے پر زور دیتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عدالتوں کو یہ ہدایت دی ہے کہ عدالت غلطی سے کسی کو بری کردے، یہ اس سے بہتر ہے کہ کسی کو سزا دینے میں عدالت سے غلطی ہوجائے اور یہ اعلان بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: شبہات کی بنیاد پر سزاؤں کو ساقط کردو (مشکوۃ المصابیح، کتاب الحدود)۔

اسلامی سزائیں دراصل دو قسم کی ہیں: ایک تو وہ سزائیں جن کی تعیین کردی گئی ہے۔ ایسی سزائیں عبرتناک اور سخت ہیں، لیکن صرف چند ہیں اور ان کے نفاذ سے پہلے ان کے ثبوت کی شرطیں سزاؤں سے زیادہ سخت ہیں، جن کی وجہ سے عملاً ایسی سزاؤں کے امکانات کم ہوجاتے ہیں، البتہ ان کی سنگینی مجرموں کے حوصلے ضرور پست کردیتی ہے اور یہی ان سزاؤں بلکہ کسی بھی سزا کا اصل مقصد ہوتا ہے، ایسی سزائیں حدود اور قصاص کہلاتی ہیں، دوسری قسم کی سزائیں تعزیر کہلاتی ہیں، یہ بہت بڑا باب ہے اور اس کے ضمن میں ہی روزمرہ پیدا ہونے والے عام قسم کے جرم کے لئے، یا پھر نئی نئی

صورت حال میں مجرموں کے لئے قید اور سزا کی تعیین حسب ضرورت کی جاتی ہے، ایسی سزائیں حاکم وقت اپنی صوابدید سے طے کرتا ہے، فقہاء نے ان سزاؤں کی بابت اجتہادات کئے اور ان کی تفصیلات متعین کیں، یہ سزائیں مختلف ادوار میں علاحدہ ہوسکتی ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ اس باب سے تعلق رکھنے والے جرموں کے لئے قانون بندی کردی جائے یا حسب مصلحت اس میں تبدیلی کی جاتی رہے۔

جہاں تک قید اور حبس کا تعلق ہے، یہ بطور سزا بھی ہوسکتا ہے اور سزا سے پہلے بھی، بطور سزا قید ثبوت وشہادت کے تمام مراحل سے گذرنے کے بعد جرم کے نتیجہ کے طور پر سامنے آئے گا، لیکن سزا سے پہلے قید کی چند صورتیں ہوسکتی ہیں: شک وشبہ اور تہمت کی بنیاد پر قید۔ احتیاطی حراست وقید اور نفاذ سزا کے انتظار میں قید خانہ میں رکھا جانا، سزا سے پہلے قید کی یہ تینوں صورتیں ممکن ہوسکتی ہیں، البتہ یہ قید بطور سزا قید سے پوری طرح مختلف ہے۔

اسلامک فقہ اکیڈمی کے سوالات

ملک کی معروف فقہی اکیڈمی 'اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا' دہلی نے اپنے اٹھارہویں سمینار (منعقدہ مدورائی، مارچ ۲۰۰۸ء) میں غور وخوض کے لئے قیدیوں کے حقوق کے حوالہ سے جن نکات اور سوالات کو اٹھایا ہے، وہ بنیادی طور پر دو قسم کے ہیں: چند سوالات اس بات سے متعلق ہیں کہ جن لوگوں پر جرم ثابت ہوچکا ہے اور بطور سزا وہ جیل خانہ کے اندر ہیں، ایسے مجرمین کو جیل خانہ میں کس قسم کے حقوق حاصل ہوں گے؟ یعنی زندگی کی انفرادی ضروریات، روحانی اور مذہبی تقاضے اور سماجی ربط واطلاعات کے حوالہ سے اس کو کیا اختیارات حاصل رہنے چاہئیں؟ اور دوسرے یہ کہ جیل خانہ کے اندر جبکہ وہ قید کی زندگی گذار رہا ہے، کیا کچھ ایسے حالات ہوسکتے ہیں کہ اس پر مزید پابندیاں اور سختیاں عائد کی جائیں؟ یہ سوالات مجرموں کے تعلق سے اٹھائے گئے ہیں، دوسری قسم کے سوالات وہ ہیں جن کا تعلق مجرموں سے نہیں، بلکہ ان لوگوں سے ہے جن کو سزا سے قبل حراست میں رکھا گیا ہے، اور یہ حراست بھی کسی احتیاطی تدبیر کے طور پر نہیں، نہ ہی سزا کے نفاذ کے انتظار میں ہے، بلکہ حراست صرف شک وشبہ کی بنیاد پر ہے اور قید میں رکھ کر اس سے کچھ خاص معاملات اور واقعات کے بارے میں تفتیش کرنا اور سچائی تک پہنچنا مطلوب ہے اور اس مقصد کی خاطر نہ صرف اسے حراست اور قید میں رکھا گیا ہے، بلکہ اسے تشدد کا نشانہ بھی بنایا جاتا ہے۔

ذیل کی سطور میں ان دونوں قسم کے سوالات کا جائزہ اسلامی شریعت کے اصولوں اور ہدایات کی روشنی میں لینے کی کوشش کی جارہی ہے پہلے دوسری قسم کے سوالات لیتے ہیں، یعنی ملزموں کے ساتھ معاملات۔

ثبوت جرم سے پہلے قید

ثبوت جرم سے پہلے کسی شخص کو قید کرنا خالصتاً انتظامی معاملہ ہے، اس میں ایک بات تو یہ طے ہے کہ یہ قید بطور سزا نہیں ہے، لہذا اس میں سزا والی کوئی بات یا مجرموں جیسا کوئی معاملہ قطعاً نہیں ہوسکتا، ہاں یہ بات ممکن ہے کہ ثبوت جرم سے پہلے کسی شخص کو کسی خاص بنیاد پر قید میں رکھا جائے، مثال کے طور پر کسی شخص کی موجودگی سماج کو نقصان پہنچا رہی ہے، تو اس کو احتیاطی قید میں رکھا جائے گا، اسی طرح اگر کسی پر کسی جرم کی بابت شبہ اور قوی درجہ میں تہمت ہے تو اس کو تفتیش کی خاطر قید میں رکھا جائے گا اور تفتیش کی جائے گی، اس قسم کی قید کی مثال عہد نبوی میں بھی ملتی ہے، سنن ابوداؤد میں ہے کہ حضرت غالب بن عبداللہ کو بنو ملوح پر حملہ کے لئے بھیجا گیا تو وہاں انھوں نے حارث بن برصاء کو قید کرلیا، انھوں نے کہا کہ میں تو مسلمان ہونے آیا ہوں، حضرت غالبؓ نے کہا: إن کنت مسلما فلا یضرک رباطنا یوما ولیلۃ وإن تکن غیر ذلک نستوثق منک (اگر تم مسلمان ہوئے تو ایک دن رات ہمارا روکے رکھنا تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا اور اگر تم مسلمان نہ ہوئے تو ہم تم سے عہد لیں گے) (ابوداؤد ۳/۶۷)، اسی طرح حضرت علیؓ نے شبہ اور الزام کے تحت کچھ لوگوں کو گرفتار کیا اور ان سے تفتیش کی، تو انھوں نے اپنے جرم کا اقرار کرلیا۔ (وعن علی أنہ حبس متھمین حتی أقروا)۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شبہ کی بنیاد پر ایک شخص کو قید میں رکھا، پھر جرم ثابت نہیں ہوا تو اسے رہا کردیا۔ ''عن بھز بن حکیم عن أبیہ عن جدہ أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم حبس رجلا فی تھمۃ ثم خلی عنہ'' (ترمذی، کتاب الدیات)۔

صاحب موسوعہ فقہیہ نے علامہ شامی کے حوالہ سے لکھا ہے: وذهب جمهور الفقهاء إلى مشروعية التهمة واعتبروا من السياسة العادلة إذا تأيدت التهمة بقرينة قوية أو ظهرت أمارات الريبة على المتهم أو عرف بالفجور'' (الموسوعہ الفقہیہ ۱۶/۳۱۲)

لیکن ایسے قید کی بابت فقہاء کرام نے یہ وضاحت فرمائی ہے کہ شک اور قوی تہمت کی بنیاد پر قید ایسے جرم کے معاملہ میں نہیں کیا جائے گا، جس کی انتہائی سزا ہی قید ہے، جیسے دیون اور مالی معاملات کہ ان میں سزا کی آخری صورت قید ہی ہے، لہذا ان معاملات میں محض شک وشبہ کی بنیاد پر قید نہیں کیا جائے گا، البتہ جس قسم کے جرم کی سزا قید سے زیادہ سخت ہے، جیسے حدود اور قصاص کے معاملات، کہ ان میں سزائیں قید کے سوا ہوتی ہیں اور وہ قید سے بہت زیادہ سخت ہوتی ہیں، ان میں قوی شک وشبہ کی بنا پر قید کیا جاسکتا ہے، علامہ ابن الہمام فتح القدیر میں لکھتے ہیں:

''بخلاف ما إذا شهدوا بالدين لا يحبس المشهود عليه به قبل ظهور عدالة الشهود. لأن أقصى العقوبات بعد ثبوت العدالة و القضاء بموجب الشهادة الحبس فلا يجوز أن يفعله قبل ثبوت الحق بخلاف ما هنا. فإن بعد الثبوت عقوبته أغلظ'' (فتح القدير ۵/۸)۔

علامہ بابرتی نے اس کی توجیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ''وفي باب الأموال والتعزير لا يحبس بالتهمة لأنه الأقصى فيهما عقوبة الحبس فلو حبس بالتهمة فيهما لكان إقامة العقوبة الأعلى بمقابلة الذنب الأدنى'' (عناية ۵/۲۳۵-۲۳۶)۔

اس سوال کا دوسرا حصہ اس بات سے متعلق ہے کہ اگر احتیاطی قید یا شک وشبہ کی بنیاد پر کسی کو قید کیا جاتا ہے، تو کیا ایسے قید کے لئے کوئی مدت مقرر کی جاسکتی ہے؟ دراصل یہ مسئلہ بھی خالص انتظام ومصلحت سے متعلق ہے اور اس کا فیصلہ شخص، معاملہ کی نوعیت اور حالات کے لحاظ سے مختلف ہوسکتا ہے، اسی لئے فقہاء کرام نے ایسے مسائل میں گوکہ بعض مواقع پر مدت کی تعیین کی ہے، لیکن آخر میں ایسے امور کو حاکم وقت کی صوابدید پر چھوڑا ہے کہ حاکم وقت اور قاضی اپنے اجتہاد سے فیصلہ کرے گا'' والصحيح أنه مفوض إلى رأي القاضي'' (معین الحکام ۱۹۸)۔

چونکہ ایسے قید کا مقصد حقیقت کی تحقیق اور جرم کی تفتیش ہے، اس لئے اس میں ثبوت وشواہد کی فراہمی وغیرہ میں مختلف مسائل کے اندر مختلف مدت لگ سکتی ہے، لیکن بہر صورت اس میں ممکنہ عجلت سے کام لیا جائے گا، تاکہ اگر وہ مجرم ہے تو اس کی سزا متعین ہو اور اگر وہ مجرم نہیں ہے تو قید سے اسے فوری رہائی دی جائے، یہ بات تو قطعا درست نہیں ہوسکتی کہ صرف تفتیش کے نام پر قید میں رکھ کر ٹال مٹول اور ڈھیلے پن سے کام لیا جائے اور جس مدت میں اس کی تفتیش ہوسکتی ہے، اس کی جگہ اتنی طویل مدت تک جیل میں چھوڑ دیا جائے، جو خود اپنے آپ میں سزا بن جائے۔

اس سوالنامہ کے سوال نمبر ۷ اور ۸ بھی اسی قسم کے ملزم سے متعلق ہیں، سوال نمبر ۸ میں دریافت کیا گیا ہے کہ کیا زیر ساعت قیدیوں کو اتنے دنوں تک فیصلے سے پہلے قید میں رکھا جاسکتا ہے جو ان کے اوپر عائد فرد جرم کی اصل سزا ہے؟

اوپر یہ بات ابھی گذر چکی ہے کہ تفتیش کی غرض سے کسی شخص کو اتنی مدت قید میں نہیں رکھا جاسکتا ہے جو مدت اپنے آپ میں سزا بن جائے، کیونکہ تفتیش کے بعد وہ بے گناہ بھی ثابت ہوسکتا ہے، ایسی صورت میں وہ جرم بے گناہی کی سزا پانے والا ہوگا، اور عدالت کے ذریعہ ظلم سہنے والا مظلوم، جو عدالت کے مقصد ہی کے خلاف ہے، اس مسئلہ کو فقہاء کرام کی عبارتوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو سوال غیر متعلق سا ہوجاتا ہے، کیونکہ یہ بات ابھی فقہی عبارتوں کے حوالہ سے گذری ہے کہ شک اور تہمت کی بنیاد پر حبس اور قید صرف ان ہی جرائم میں درست ہے جن میں سزا کی نوعیت قید نہیں بلکہ اس سے سخت کچھ اور ہے، جیسے حدود اور قصاص کے جرائم، رہے وہ جرائم جن میں قید ہی سزا ہوتی ہے، ان میں شک اور تہمت کی بنیاد پر قید نہیں کیا جائے گا تو پھر یہ سوال کہ کسی قیدی کو فیصلے سے پہلے اتنی مدت تک قید میں رکھنا جو ان پر عائد فرد جرم کی اصل سزا ہو، فقہی عبارتوں کی روشنی میں اس لئے باقی نہیں رہتا کہ جس فرد جرم کی اصل سزا قید ہے، اس میں فیصلے سے پہلے قید کی اجازت ہی نہیں ہے۔

لیکن اس سوال کو اگر موجودہ حالات اور عالمی سطح پر جاری رویے کی روشنی میں دیکھا جائے تو سوال نہ صرف متعلق بلکہ ضروری بن جاتا ہے، آج یہ حقیقت ہے کہ بعض اوقات شک وشبہ اور تفتیش کے نام پر اتنی ہی نہیں بلکہ اس سے زائد مدت تک بھی جیل خانہ میں رہنے پر مجبور کردیا جاتا ہے جو مدت اس جرم کے ثابت ہونے کے بعد سزا کے لئے فوجداری قانون کے اندر مقرر کی گئی ہے، ایسی صورت میں تفتیش مکمل ہونے کے بعد یا تو وہ بے گناہ ثابت ہوگا اور قید میں قیام بے گناہی کی سزا قرار پائے گی، یا پھر فرد جرم ثابت ہوگا اور عدالت سے اس کے حق میں قید کی سزا کا فیصلہ ہوگا، اس وقت عملی حقیقت یہ ہوگی کہ وہ سزا کی مقررہ مدت پہلے ہی جیل میں گذار چکا ہوگا، ان دو ممکنہ صورتوں میں سے دوسری صورت میں مسئلہ کا یہ حل تو موجود ہے کہ سزا کی مدت پوری ہوجانے کی بنیاد پر اسے فوری رہائی دے دی جائے، لیکن پہلی صورت میں وہ حبس بے جا کا شکار اور جرم بے گناہی کی سزا

پانے والا ہوگا، جو تقاضائے انصاف کے خلاف ہوگا، اس صورت کی سنگینی اس وقت مزید بڑھ جائے گی جب یہ گرفتاری کمزور شبہات کی بنیاد پر ہو، یا اس گرفتاری میں بھی مجرمانہ سازش، جانبداری یا کسی ذاتی نوعیت کے انتقام کا دخل ہو۔

پس ایسی صورت حال میں شریعت اسلامیہ کے منصفانہ مزاج کا تقاضا ہے کہ تفتیش کے نام پر گرفتاری میں بعجلت ممکنہ تفتیشی عمل کو مکمل کرایا جائے، اس کے لئے ایسا میکانزم بنایا جائے کہ تحقیق وتفتیش ایک خاص مدت میں لازماً مکمل ہو اور اس کے بعد ملزم کے ساتھ قانونی پوزیشن طے ہو جائے، ایسی بے جا تاخیر سے بچنے کے لئے ہی موجودہ قانونی نظام میں مختلف جرائم کے لئے تفتیش اور چارج شیٹ داخل کرنے کی مدت مقرر کردی گئی ہے، نیز جن جرائم میں اس بات کا امکان ہے کہ تفتیش میں طویل مدت لگ سکتی ہے، ان میں عدالت مطمئن ہونے کے بعد ملزم کو ضمانت پر رہائی دے دیتی ہے، یہ قانونی گنجائشیں اور سہولیات شریعت اسلامیہ کے منصفانہ مزاج سے ہم آہنگی رکھتی ہیں۔

سوال نمبر ۷ میں دریافت کیا گیا ہے کہ جن قیدیوں کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے اور جن کے بارے میں سزائے قید کا فیصلہ ہو چکا ہے، قید خانوں میں سلوک کے اعتبار سے کیا ان دونوں میں فرق کیا جاسکتا ہے؟

اس میں تو کسی شبہ کی قطعاً گنجائش نہیں ہے کہ زیر سماعت مقدمہ کے قیدی ابھی عدالت کی نظر میں مجرم نہیں ہیں، پھر کیسے ان کے ساتھ مجرموں جیسا برتاؤ روا ہو سکتا ہے؟ ابھی تو قید کی نوعیت صرف حراست اور تفتیش میں حصول تعاون کی ہے اور اسلام کا واضح اصول ہے کہ ہر انسان اپنی ذات میں بری اور بے گناہ ہے، جب تک کہ اس پر ثبوت وشواہد کی بنیاد پر جرم ثابت نہ ہو جائے، اگر ثبوت جرم سے پہلے ہی کسی کے ساتھ مجرموں جیسا برتاؤ درست ہو جائے تو پھر عدالت کا عمل بے مقصد ہو جاتا ہے اور انصاف کی روح مجروح ہوتی ہے، پس یہ طریقہ کہ مجرم اور ملزم کو ایک ہی جگہ رکھا جائے اور دونوں کے لئے جیل خانہ کے اندر ایک ہی نظام العمل ہو، انصاف وعدل سے میل نہیں کھاتا ہے اور اسلامی شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی ہے۔

حبس بے جا کا ہرجانہ

اسی سے متعلق سوال نمبر ۹ ہے، جس میں پوچھا گیا ہے کہ اگر ملزم کو قید میں رکھا گیا ہو اور بعد کو عدالت نے اسے بری قرار دیا تو کیا وہ زمانہ قید میں ہونے والی ذہنی اذیت اور مالی ہرجانہ طلب کرسکتا ہے؟

اس کا جواب اثبات میں ہے، بالخصوص اس وقت جب تفتیش وتحقیق کے لئے جیل میں رکھی گئی مدت طویل ہو، کیونکہ اس مدت میں وہ لازماً ذہنی اور نفسیاتی اذیت اور نقصان سے گذرتا ہے، پہلے تو اس کی شخصیت پر ایک ایسے جرم کا داغ لگتا ہے جس کا اس نے ارتکاب نہیں کیا ہے اور اس طرح اس کی شخصیت مجروح ہوتی ہے، پھر جیل میں بھیجا جانا اس کی بہت بڑی بدنامی کا سبب بنتا ہے اور بہت دور تک اس کی بدنامی پھیل جاتی ہے، جس کی تلافی بعد کی باعزت رہائی نہیں کرسکتی ہے، تیسرے یہ کہ جتنی مدت وہ جیل خانہ کے اندر بے جا حبس میں گذارتا ہے، اس میں وہ اپنی ملازمت اور کاروبار سے محروم رہ کر شدید مالی نقصان سے دوچار ہوتا ہے، عموماً قید ہو جانے کے بعد ملازمت برخواست کردی جاتی ہے، اس دوران نہ صرف وہ خود کمائی سے محروم رہتا ہے، بلکہ جن لوگوں کی کفالت اس کے ذمہ ہوتی ہے، وہ افراد خاندان بھی کفالت سے محروم ہو کر مالی تنگی اور پریشانی سے دوچار ہوتے ہیں، چوتھے یہ کہ حراست کے دوران خود ملزم اور اس کے اہل خاندان کو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے اور مقدمہ لڑنے کے لئے مالی اخراجات اور طرح طرح کے تگ ودو کرنے پڑتے ہیں، ان سب پر کافی اخراجات آتے ہیں، جو بلاوجہ ملزم کو کرنے پڑتے ہیں، اسی طرح دوران قید جیل خانہ کے کھانے پینے کے نظام کا پابند رہنے کی وجہ سے اس کی صحت متاثر ہوتی ہے اور بسا اوقات وہ اندرونی اور خاموش امراض کا شکار ہو جاتا ہے اور ان سب کے علاوہ زندگی کا جو قیمتی عرصہ جیل خانہ میں بے گناہی کی صورت میں کاٹنا پڑتا ہے، اس کی تلافی صرف بری ہونے کے فیصلہ سے نہیں ہو جاتی ہے اور ان سب پر مستزاد یہ کہ اس کے کیریئر اور کردار کے ساتھ جرم کا الزام اور جیل میں قید کے واقعات وابستہ ہو جاتے ہیں اور وہ اس کی زندگی کا حصہ ہو جاتے ہیں، اس ناکردہ گناہ کی سزا اسے کیوں ملے گی؟ پس ان سارے مالی، ذہنی، نفسیاتی، جسمانی، اوقاتی، عرفی اور خاندانی نقصانات کی کسی حد تک تلافی کے لئے ہرجانہ اور مالی معاوضہ کا مطالبہ نہ صرف منصفانہ ہے بلکہ ضروری بھی، تاکہ پہنچنے والے نقصانات کی کچھ تو بھرپائی ہو سکے۔

تفتیش میں ناروا سلوک

ملزم کے حوالہ سے اٹھائے گئے سوالات میں ایک انتہائی اہم سوال نمبر ۳ ہے، اس سوال میں بنیادی طور پر یہ بات پوچھی گئی ہے کہ قیدیوں سے

سچی بات اگلوانے کے لئے اسے ڈرانے دھمکانے اور اس پر سختی وتشدد کرنے کی کہاں تک اجازت ہے؟ سوال کے الفاظ ہیں:

قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے کس حد تک دھمکانے کی اجازت ہے؟ کیا اس مقصد کے لئے درج ذیل سزائیں دی جاسکتی ہیں:

الف۔قیدیوں کو بے لباس کردینا۔ ب۔ قیدیوں کو مارپیٹ کرنا۔

ج۔ انہیں الکٹرک شاک لگانا د۔قیدیوں پر کتے چھوڑنا۔ ھ۔ قیدیوں کو سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈال دینا۔

و۔انہیں مسلسل جگے رہنے پر مجبور کرنا اور اس کے لئے اس کی جائے رہائش میں تیز روشنی یا تیز آواز کا انتظام رکھنا۔

اتنی بات تو واضح ہے کہ یہ قید کسی مجرم کا نہیں بلکہ صرف شبہ کی بنیاد پر مبینہ الزام کے تحت ہے اور اس کا مقصد ملزم سے تفتیش کرکے سچائی تک پہنچنے کی کوشش کرنا ہے، تو ایسے قید کی بابت یہ سوال سرے سے اٹھتا ہی نہیں کہ اسے کس قسم کی اور کہاں تک سزا دی جاسکتی ہے، سزا تو مجرم کے لئے ہوتی ہے اور کسی ملزم کو مجرم ثابت کرنے ہی کے لئے عدالت کا نظام اور ثبوت وشواہد کے مطالبات ہوتے ہیں، لہذا یہ بات کیسے پوچھی جاسکتی ہے کہ ایسا قیدی جو ابھی مجرم نہیں ہے، بلکہ صرف تفتیش کی غرض سے زیر حراست ہے، اس سے سچی بات اگلوانے کے لئے کس قسم کی سزا اسے دی جاسکتی ہے؟

البتہ یہ سوال ضرور اٹھتا ہے کہ الزام کے تحت زیر حراست شخص سے سچی بات اگلوانے کے لئے اس پر کس حد تک دباؤ بنایا جاسکتا ہے؟ کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ ایسے افراد جو معروف بالفسق والفجور رہوں یا جو مجہول الحال ہوں، وہ جلدی حقیقت کا اظہار نہیں کرتے، ہاں جو لوگ سماج میں اپنے صلاح و تقوی میں معروف ہوں، یا آج کی زبان میں جن کا کردار بڑا صاف ستھرا اور اچھے ریکارڈ کا حامل ہو، ان پر اگر کسی موقع پر شک وشبہ ہوتا ہے تو ان سے یہی توقع کی جاتی ہے کہ وہ حقیقت کی تفتیش میں صاف گوئی کے ساتھ تعاون کریں گے، اس لئے ان پر کسی قسم کے دباؤ بنانے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی، لیکن اول الذکر دونوں قسم کے لوگوں کا معاملہ قدرے مختلف ہوگا، ان پر دباؤ بنایا جاسکتا ہے اور اس میں ایسی تدبیریں اختیار کی جاسکتی ہیں جو سزا کے دائرہ میں نہ آتی ہوں۔

اس تعلق سے سوال کے ضمن میں جو شقیں درج کی گئی ہیں، کہ انھیں تفتیش میں اپنایا جاسکتا ہے یا نہیں؟ دراصل موجودہ دور میں جہاں انسانی قدریں شدت سے پامال ہورہی ہیں اور انصاف کے اصولوں کی دھجیاں بکھررہی ہیں، شبہات کی بنیاد پر بالکل بے گناہ افراد کو گرفتار کرکے تفتیش کے نام پر ان کے ساتھ ایسی حیاسوز، انسانیت سوز، درندہ صفت اور بربریت آمیز طریقے اپنائے جارہے ہیں، کہ ان کے مقابلہ میں بڑی بڑی سزائیں ہیچ ہیں، ان حالات کے پیش نظر سوال کے اندر اٹھائے گئے شق سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ سوالات نہیں بلکہ پیش آئے واقعات کا عکس ہیں، کیونکہ ''الف'' تا ''واؤ'' میں بیان کردہ طریقوں میں شق ''ب'' کو چھوڑ کر بقیہ پانچوں شقیں انتہائی درجہ شرمناک، اذیت رساں اور گھٹیا طریقے ہیں، کسی انسان کو بے لباس کرنا اسلامی شریعت میں سزا کے اندر بھی درست نہیں ہے، یہ انسانیت کی تذلیل ہے، جس سے عزت نفس مجروح ہوتی ہے، لباس انسان کا جوہر اور اللہ کا عطیہ ہے اور ستر کو چھپانا انسان پر فرض کیا گیا ہے، یہ انسان اور جانور کے درمیان فرق ہے انسان کو بے لباس کرنا اسے انسانوں کی صف سے نکال کر جانوروں میں شامل کرنا ہے اس کی اجازت کیسے ہوسکتی ہے؟ ایسے ہی انسان پر کتے چھوڑنا نہایت وحشیانہ عمل اور درندہ ذہنی کا عکاس ہے اور اسلامی شریعت انسان کو وحشی بننے کی اجازت نہیں دیتا، اس میں اس کا بھی امکان ہے کہ خوفناک کتے قیدی کو جسمانی نقصان پہنچادیں، یا قیدی کے قلب ودماغ پر کتے کے خوف کا کوئی خطرناک اثر مرتب ہوجائے۔اسی طرح الکٹرک شاک لگانا ایک سخت خطرناک اور انسانی اعضاء بلکہ اس کی جان سے کھلواڑ کرنے والا طریقہ ہے، بجلی کے شاک جسم کے اعصابی نظام کو متاثر کرتے ہیں اور بسا اوقات اس کے دماغی خلیات کو شدید نقصان پہنچاتے ہیں، بجلی کے شاک میں اس بات کا بھی امکان ہے کہ بجلی کے وولٹیج یا اس کے وقفہ کے فرق کی وجہ سے یا قیدی کی کمزور جسمانی صحت کی وجہ سے شاک اس کے لئے جان لیوا بن جائے، یا اس کے جسم کے کسی اہم عضو کو ناکارہ بنادے، ایسے نقصان دہ اور خطرات والی اذیت ایک ایسے شخص کے لئے کیسے روا ہوسکتی ہے، جو مجرم بھی نہیں بلکہ صرف زیر تفتیش ہے، اسلام تو ایسی اذیت رسانی کی اجازت مجرم کے لئے بھی نہیں دیتا اور آگ کے ذریعہ سزا اسلام میں یوں بھی ممنوع ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت کرتے ہوئے فرمایا: وإنہ لایعذب بالنار إلا رب النار (آگ سے سزا صرف آگ کا رب ہی دیتا ہے) (ابوداؤد)۔قیدی کو سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر رکھنے کی اجازت اس اسلام میں کیسے ہوسکتی ہے جس نے مجرم کو دھوپ میں کھڑا کرکے سزا سے زائد تکلیف پہنچانے سے منع کیا ہے، سردی کے موقع پر برف کی سل پر ڈالنا سخت اذیت پہنچانا ہے،

ایسی اذیت مجرم کے لئے بھی روا نہیں ہے، چہ جائیکہ ملزم کے لئے درست ہو، آخری شق یعنی قیدی کو مسلسل جگے رہنے پر مجبور کرنے کے لئے اس کی جائے رہائش میں تیز روشنی یا تیز آواز کا انتظام رکھنا، بھی ملزم کو شدید ذہنی کوفت اور نفسیاتی تکلیف میں مبتلا کرنا ہے، نیند انسان کی ایسی ہی ضرورت ہے جیسی غذا و پانی اور جیسی قضائے حاجت، اگر نیند انسان کی پوری نہ ہو اور مسلسل بے خواب رہے تو وہ جسمانی طور پر شل ہو جائے گا، اس کا دماغ ٹھیک سے کام نہیں کرے گا اور عدم توازن کا شکار ہو کر مریض ہو جائے گا، ایسی غیر انسانی تکلیف اور اذیت رسانی کو اسلام قطعاً تسلیم نہیں کرتا ہے۔

پس شق ''ب'' یعنی مار پیٹ کو چھوڑ کر تمام شقیں انتہا درجہ ظالمانہ، وحشیانہ، حیا سوز اور غیر انسانی ہیں جن کی اسلام کی تعلیمات میں کوئی جگہ نہیں ہے، اسلام اصولی طور پر قیدی کو انسانی عزت و وقار کے مقام سے محروم نہیں سمجھتا ہے، وہ اپنے تمام انسانی حقوق کا اسی طرح مستحق رہتا ہے، جس طرح کوئی بھی دوسرا انسان، مجرم کے لئے صرف وہی سزا ہے جو اس کے جرم کے لئے متعین ہے اور اس سزا کے نفاذ میں بھی اس کی تذلیل و توہین روا نہیں ہوگی، نہ اس کے تئیں حقارت آمیز طریقہ اپنایا جائے گا، کیونکہ سزا کا نفاذ اس کی تطہیر اور پاکی کا سبب ہے اور دوسروں کے لئے سامان عبرت۔ اس میں اس کی تحقیر کا دخل نہیں ہے، ورنہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم زنا کی سخت ترین سزا کے نفاذ کے موقع پر مجرم کے توبہ کی تعریف اور اس سے حقارت کا اظہار کرنے والے کی نکیر نہ فرماتے اور اسلام کا یہ رویہ تو مجرم کے تئیں ہے، یہاں تو زیر بحث مسئلہ ملزم سے تعلق رکھتا ہے، ایسے ملزم کو اس قسم کی سزائیں دینا اسلام کی نظر میں کسی بھی طرح درست نہیں ہوسکتا، ملزم پر جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے وہ بے گناہ ہے اور بے گناہ کو کوئی سزا نہیں دی جاسکتی ہے۔

جہاں تک شق ''ب'' کا تعلق ہے، جس میں پوچھا گیا ہے کہ کیا ایسے ملزم کو سچی بات اگلوانے کی غرض سے مارا پیٹا جاسکتا ہے؟ تو بعض شرطوں کے ساتھ اس شق کی گنجائش ہے، ایسی مار پیٹ جو خود سزا نہ بن جائے، یا جو سخت اذیت رساں نہ ہو، ملزم پر دباؤ بنانے کے لئے کی جاسکتی ہے، حضرت حسن بن زیاد سے مروی ہے کہ: یحل ضربہ حتی یقر ما لم یظھر العظم (اتنی پٹائی درست ہے تاکہ وہ اقرار کرلے، جس سے ہڈی نہ ظاہر ہو)

(درمختار ۳/ ۲۱۴)۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کا واقعہ ہے کہ غزوہ خیبر کے موقع پر حیی بن اخطب کے سونے اور زیورات کو اس کے چچا نے چھپالیا،۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا تو اس نے جھوٹا جواب دیا کہ جنگوں اور دوسرے اخراجات میں وہ خرچ ہو گئے ہیں، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر بن عوامؓ سے فرمایا کہ اس سے باز پرس کرو، روایت کے الفاظ ہیں کہ: فمسہ الزبیر بشئ من العذاب (یعنی حضرت زبیر نے اس کی تھوڑی پٹائی کی) (شامی ۶/ ۱۴۷)، تو اس نے مال کی جگہ بتادی، ان روایات میں دیکھا جاسکتا ہے کہ حقیقت کی دریافت کے لئے معمولی پٹائی اور سختی کی گئی، لیکن اتنی نہیں جو سزا کی شکل اختیار کرلے یا جس کی وجہ سے قیدی کو جسمانی نقصان پہنچ جائے۔

جیل خانہ میں قیدیوں کے حقوق

یہ سوالات ملزم کے تعلق سے تھے، اب ان سوالات پر گفتگو کی جاتی ہے جو قیدیوں کے حقوق سے متعلق ہیں، اس سلسلہ میں سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ درج ذیل امور سے متعلق قیدیوں کو کیا حقوق حاصل ہیں؟

الف۔ مذہبی امور (عبادت کرنا، مذہبی کتابوں کا مطالعہ، دوسرے قیدیوں کے درمیان دعوت دین، اس کی مذہبی تعلیمات کے مطابق اس کے لئے غذا فراہم کرنا، وہ جس مذہب پر عقیدہ رکھتا ہے اس مذہب کی مقدس شخصیتوں اور کتابوں وغیرہ کی بے احترامی سے گریز)۔

ب۔ جسمانی ضروریات (مناسب غذا، صاف پانی، علاج، حفظان صحت کے لئے ورزش و تفریح، بیوی سے تعلق، ایسی تنگ جگہ قیدیوں کو رکھنے کا مسئلہ جہاں کھڑا ہونا یا پاؤں پھیلا کر لیٹنا، یا دیوار کے باہر کسی چیز کا دیکھنا ممکن نہیں)۔

ج۔ عام سماجی حقوق (اخبارات پڑھنے، ریڈیو سننے، فون پر احباب و اقارب سے گفتگو کرنے، دوسرے قیدیوں سے ملاقات، تعلیم اور ہنر سیکھنا وغیرہ)۔

د۔ اخلاقی امور (مردوں اور عورتوں کے الگ قید خانے، بالغوں اور نابالغوں کے لئے الگ قید خانے وغیرہ)۔

قیدیوں کے جن حقوق کے بارے میں اوپر سوال کے اندر نشاندہی کی گئی ہے، بڑی حد تک ان تمام حقوق کی ادائیگی کی اسلام وکالت کرتا ہے اور آج عام طور ان بنیادی حقوق کے تعلق سے بھی زیادتی اور پامالی پائی جارہی ہے، اس لئے انسانی حقوق کے لئے سرگرم تنظیمیں ان امور کی فراہمی پر

زور دے رہی ہیں، اس سوال کے شق ''الف''، یعنی مذہبی امور کا جہاں تک تعلق ہے، اس ضمن میں اٹھائی گئی تمام چیزیں قیدی کا نہ صرف حق ہیں بلکہ ان کی اچھی تربیت اور اصلاح کے لئے بھی یہ مفید ہیں، اس لئے مذہبی آزادی قیدی کا لازمی حق ہے، وہ اپنے مذہب کے مطابق عبادت کریں، مذہبی کتابوں کا مطالعہ کریں، دوسرے قیدیوں کے درمیان پرامن طریقہ پر اپنے مذہب کی اچھائیوں کی اشاعت کریں، قرآن کریم نے اس سلسلہ میں حضرت یوسف کا پورا قصہ بیان کر کے اس پر عمل کی ترغیب دی ہے، انھوں نے جیل خانہ میں اپنے ساتھی قیدیوں کو دین کی باتیں بتائی تھیں اور اس کے لئے حکیمانہ اسلوب اور ہمدردانہ طریقہ اپناتے ہوئے قیدی ساتھیوں کی رہنمائی اور ذہن سازی فرمائی تھی، اسی طرح قیدی کے مذہب کی مقدس شخصیتوں اور ان کی مذہبی کتابوں کی بے احترامی نہیں ہونی چاہئے، قرآن نے عام حالات میں دوسرے مذاہب اور عقیدہ والوں کو برا کہنے سے منع کیا ہے (سورہ انعام ۱۰۹)۔ امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے تمام گورنروں کو فرمان بھیجا تھا کہ قیدیوں کو ایسا کھانا اور سالن وغیرہ فراہم کیا جائے جس سے ان کی صحت ٹھیک رہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہوگا کہ قیدی کو کھانے کی اشیاء فراہم کرنے میں اس کی مذہبی تعلیمات کا خیال رکھا جائے اور ایسی چیزیں کھانے میں نہ دی جائیں جو وہ اپنے مذہب کے مطابق نہیں کھا سکتا ہے، مذہبی امور کے تعلق سے اصولی بات یہ پیش نظر رہنی چاہئے کہ مذہبی پابندی قید کا حصہ نہیں ہے اور نہ ہی یہ چیزیں قید کے مقصد کے لئے مفید ہیں، بلکہ مذہبی آزادی ہی سے قیدیوں کی صحیح اصلاح ہوتی ہے، لہذا اس بات کا باضابطہ اہتمام ہونا چاہئے کہ قیدیوں کو مذہبی تربیت فراہم کی جائے اور انھیں مذہبی کتابوں کے مطالعہ اور مذہبی تعلیمات پر عمل کے مواقع میسر ہوں۔

شق ''ب''، جو جسمانی ضروریات سے متعلق ہے، وہ انسان کا بنیادی حق ہیں اور قیدی جیل کے اندر بھی اپنے انسانی حقوق سے محروم نہیں ہوتا ہے، چنانچہ اسے مناسب غذا اور صاف پانی ملنا چاہئے، حفظان صحت کے لئے ورزش و تفریح اب موجودہ امراض کی کثرت اور ذہنی دباؤ کے دور میں انسانی ضرورت بن گئی ہے، اس لئے قیدیوں کی جسمانی صحت کی رعایت کے ساتھ ورزش اور ہوا خوری کا موقع فراہم کیا جانا ضروری ہے، قیدی کو ایسی تنگ جگہ رکھنا جہاں کھڑا ہونا، یا پاؤں پھیلا کر لیٹنا یا دیوار کے باہر کسی چیز کا دیکھنا ممکن نہ ہو، قیدی کی سزا پر ایسا اضافہ ہے جو نہ صرف اس کو جسمانی اور نفسیاتی طور پر بیمار کر دینے والا ہے، بلکہ اس کے حقوق کی پامالی ہے، علامہ طرابلسی لکھتے ہیں: اعلم أن الحبس الشرعي ليس هو في مكان ضيق (معین الحکام ۱۹۶)۔ جہاں تک بیوی سے تعلق کی اجازت کا مسئلہ ہے، طویل مدتی قیدیوں کے لئے اسلام اس کی اجازت دیتا ہے، موجودہ نظام میں بھی قیدیوں کو ایسے مواقع فراہم کرنے کی وکالت کی گئی ہے، دراصل شادی شدہ شخص کے لئے بیوی سے تعلق بھی ایک بنیادی اور صحت مند ضرورت ہے، بالخصوص ایسے قیدی جن کے رویے بہتر ہوں، انھیں پردہ کے انتظام کے ساتھ کچھ گھنٹے جیل خانہ کے اندر ہی اپنی بیوی کے ساتھ تنہائی میں گذارنے کی اجازت دی جانی چاہئے، علامہ شامی نے لکھا ہے:

''وإذا احتاج للجماع دخلت عليه زوجته أو أمته إن كان فيه موضع ستر'' (۴/۳۴۹)۔

عام سماجی حقوق کے ذیل میں جو باتیں دریافت کی گئی ہیں، ان میں تعلیم اور ہنر سیکھنے کا انتظام ایک بہتر اقدام ہے، اس سے قیدیوں کے طور طریقے اور ذہنی رویہ میں بہتری آئے گی اور وہ آئندہ اچھی زندگی گذارنے میں مدد حاصل کر سکیں گے، دوسرے قیدیوں سے ملاقات قید کے نظام کے تحت ہونی چاہئے، البتہ اس میں اس بات کا خیال رکھا جانا مناسب ہوگا کہ برے اور خراب کردار کے عادی مجرموں کے ساتھ اگر معمولی غلطیاں کرنے والے قیدیوں کو اٹھنے بیٹھنے کا موقع دیا جائے گا تو وہ مزید بگاڑ کا شکار ہوں گے اور جیل کے اندر جرم کے خطرناک طریقے سیکھیں گے، جس کے بعد وہ زیادہ خطرناک مجرم بن جائیں گے، یہ قید کے مقصد کے منافی اور سماج کے لئے انتہائی نقصان دہ ہوگا اور یہ بات ان دنوں عام طور پر دیکھی جاتی ہے کہ خطرناک اور خونخوار مجرموں کی صحبت میں رہ کر بعض سیدھے سادے قیدی اتنے خطرناک بن جاتے ہیں جتنے شاید وہ باہر رہ کر نہ بنتے، فون پر احباب و اقارب سے گفتگو کی اجازت مقررہ وقفہ سے ہونی چاہئے، موجودہ نظام میں اعزہ سے ملاقات اور گفتگو کی اجازت مقررہ اصولوں کے مطابق دی جاتی ہے، جو بہتر ہے، جہاں تک اخبارات پڑھنے اور ریڈیو سننے کی بات ہے، تو اس میں موجودہ نظام کے اندر قیدیوں کے درمیان فرق رکھا جاتا ہے، جرائم کے لحاظ سے قیدیوں کی درجہ بندی کرتے ہوئے بعض قیدیوں کو اس کی اجازت ملتی ہے اور یہی طریقہ درست محسوس ہوتا ہے۔

اس سوال کی آخری شق اخلاقی امور سے متعلق ہیں، یعنی مردوں اور عورتوں کے لئے الگ قید خانے، اسی طرح بالغوں اور نابالغوں کے لئے الگ قید خانے رکھے جائیں، تو اسلام ان کی تو ہر حال میں تائید و تاکید کرتا ہے، عورتوں کے قید خانہ کا نظام دیکھنے والے بھی خواتین افسران ہی ہونے

چاہئے اور صفائی ستھرائی وغیرہ بھی عورتوں کے ذریعہ ہی کرانا چاہئے، تاکہ بداخلاقی کو راہ نہ ملے، موجودہ جیل نظام کے اندر بڑی حد تک ان باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے، جہاں ان امور میں کوتاہی برتی گئی ہے، اس کے بدترین نتائج سامنے آئے ہیں اور وہاں عام طور عورتوں کی عزت وعصمت مجروح اور تاتار ہوئی ہے، چھوٹے بچوں کے قید خانہ بھی آج کے زمانہ میں الگ ہی رکھے جاتے ہیں اور یہ ضروری بھی ہے۔

جیل میں سختی

قیدیوں سے متعلق سوال نمبر ۴ میں پوچھا گیا ہے کہ کیا قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑا جاسکتا ہے یا انہیں ہتھکڑی پہنائی جاسکتی ہے یا انہیں بیڑی ڈالی جاسکتی ہے؟ اس سلسلہ میں اصولی بات یہ ہے کہ عام حالات میں یہ غیر ضروری ہے، جہاں بعض مخصوص قیدیوں کی حفاظت کا مسئلہ درپیش ہو، یا جب خطرناک مجرموں کو کہیں لے جایا جارہا ہو، ایسے مواقع پر انہیں پابہ زنجیر کیا جاسکتا ہے، یا ہتھکڑی لگائی جاسکتی ہے، یہ بڑی حد تک انتظامی مسئلہ ہے۔

سوال نمبر ۵ یہ ہے کہ کیا کسی مجرم کو اس کے خصوصی جرم کے پس منظر میں قید تنہائی دی جاسکتی ہے؟ اس سوال کا جواب بھی اثبات میں ہے، کیونکہ یہ اجازت صرف بعض مجرموں کے لئے اس کے جرم کے خصوصی پس منظر میں ہے اور ایسی صورت حال پیش آسکتی ہے، جس میں اس کو تنہا رکھا جانا ضروری ہو۔

سوال نمبر ۶ یہ ہے کہ کیا قیدیوں سے جیل میں جبراً کام لیا جاسکتا ہے اور اگر کام لیا جائے تو کیا قیدی اس کام کی اجرت کے مستحق ہیں؟ اس سلسلہ میں دو قسم کے قید میں فرق کیا جانا چاہئے، اگر کسی قیدی کو اس کے خصوصی جرم کی وجہ سے قید بامشقت دی گئی ہے، تو اس میں اس کی صحت کا لحاظ کیا جانا تو ضروری ہے، البتہ اس سے سزا کے بطور جبری کام لیا جائے گا اور یہ کام اجرت کے بغیر ہوگی، کیونکہ یہ کام اور عمل نہیں بلکہ سزا کا حصہ ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ جیل خانہ کے اندر قیدیوں کی تربیت اور ان کو ہنر وغیرہ سکھانے کے لئے یا ان کے اوقات کو اچھے اور مفید کاموں میں استعمال کرنے کے لئے انھیں صنعت سازی وغیرہ قسم کے کاموں میں مشغول کیا جاتا ہے، تو یہ ایک نوع کا جبری کام ہے، لیکن یہ بطور سزا نہیں ہے، یہ ان کی تربیت کے لئے ہے، ایسے کاموں کے نتائج کو جیل انتظامیہ استعمال میں لاسکتا ہے یا بازار میں فروخت کرسکتا ہے، پس قیدیوں کو ان کے ان کاموں کی اجرت ملنی چاہئے اور موجودہ جیل نظام کے تحت یہی رائج بھی ہے۔

سوال نمبر ۱۰ یہ ہے کہ کیا قیدی کو اپنے مقدمات کے سلسلہ میں وکیل سے رابطہ اور صفائی پیش کرنے کے حقوق حاصل ہیں؟ اس کے جواب میں اسلام اور موجودہ نظام عدالت دونوں ایک آواز ہیں کہ یہ ہر قیدی کا حق ہے اور اسے اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کی صفائی پیش کرنے اور اس سلسلہ میں اپنے وکیل سے رابطہ کرنے کے پورے حقوق حاصل ہیں، اس کے بغیر تو منصفانہ فیصلہ ہی ممکن نہیں ہے، کیونکہ کوئی بھی کسی شخص پر الزام لگادے تو جب تک دوسرے فریق کی بات نہ سنی جائے، کیونکر حقیقت معلوم ہوسکتی ہے اور آج کے موجودہ عدالتی نظام میں الزامات کی صفائی پیشہ ور وکیل کے ذریعہ ہی بڑی حد تک ممکن ہوتی ہے، اس لئے یہ حق ہر حال میں ہر قیدی کو حاصل ہوگا۔

جیل میں ماں کے ساتھ بچہ

آخری سوال عورتوں کے اس حق سے متعلق ہے کہ کیا وہ اپنے ساتھ جیل خانہ کے اندر اپنے شیر خوار بچوں کو رکھ سکتی ہیں؟ دراصل یہ سوال کافی حد تک متعلقہ مسئلہ اور مصلحت پر مبنی ہے، ایک طرف جہاں ماں کے پاس رہنا خود بچہ کا حق ہے اور ماں کو بھی اپنے بچہ کو دودھ پلانے اور پالنے کا حق ہر حال میں ملنا چاہئے، وہیں دوسری جانب اس سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ایک بچہ اپنے گرد وپیش کے ماحول سے سیکھتا ہے، جیل خانہ کا ماحول بہر حال بچہ کے لئے گھر کے مقابلہ بہتر نہیں ہوسکتا، اس لئے اس میں یہ دیکھا جانا چاہئے کہ بچہ و ماں کا حق اور بچہ کا مفاد دونوں ممکنہ حد تک ملحوظ رہیں، چنانچہ ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ جہاں بچہ کی تربیت اور پرورش کا جیل کے باہر خود بچہ کے قریبی اعزہ کے ذریعہ انتظام ممکن ہو وہاں بچہ کو موقع موقع سے ماں سے ملاقات کی اجازت کے ساتھ باہر ہی پرورش کا انتظام کیا جائے اور جہاں ایسی صورت ممکن نہ ہو وہاں ماں کو حق ہونا چاہئے کہ وہ جیل کے اندر اپنے ساتھ بچہ کو اس وقت تک رکھے، جب تک بچہ خود سے اپنی ضروریات پوری کرنے کے قابل نہ ہوجائے۔

☆☆☆

قیدیوں کے حقوق اسلامی نقطہ نظر

مولانا نورالحق رحمانی[1]

اسلام کا الہی، آفاقی اور روحانی نظام ایک ایسے پاکیزہ اور صالح انسانی معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے جس میں ہر طرف امن وسکون کا دور دورہ ہو، سلامتی اور شانتی ہو، اور ایسے مفسد اور شر پسند عناصر جو ماحول کو گندہ اور اس کے امن وسلامتی کو غارت کرنے اور لوگوں کی جان ومال اور عزت وآبرو پر دست درازی کرنے والے ہوں ان کے لئے عبرت ناک سزائیں تجویز کرتا ہے تاکہ جرائم اور مفاسد کا خاتمہ ہو جائے اور ملک اور سماج کا امن وسکون درہم برہم نہ ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر اسلام کے ان سنہرے اصولوں اور عدل وانصاف پر مبنی تعلیمات کو پیش نظر رکھا جائے تو انصاف سے محروم طبقات کو انصاف مل سکتا ہے اور ظلم وزیادتی کا خاتمہ ہو سکتا ہے، اسلام کی یہ مقدس تعلیمات انسانیت کے لئے مشعل راہ ہیں۔ اور مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ دنیا والوں کو ان سے روشناس کرائیں، تاکہ اسلام کے سلسلے میں ان کی غلط فہمی دور ہو اور وہ ان پاکیزہ تعلیمات سے روشنی اور رہنمائی حاصل کریں، اس مختصر سی تمہید کے بعد سوال نامہ میں درج سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

۱- تہمت کی بنیاد پر قید کرنا اور قید میں رکھنے کی مدت

۱- کیا کسی ملزم کو جرم کا ثبوت فراہم ہوئے بغیر قید کیا جاسکتا ہے اور اگر بطور احتیاط کے قید کیا جائے تو کیا اس کے لئے کوئی مدت مقرر کی جاسکتی ہے؟

تہمت کی بنیاد پر متہم کو قید کیا جاسکتا ہے، بشرطے کہ اسے متہم قرار دئے جانے پر کوئی قوی قرینہ موجود ہو یا ایسی علامات پائی جارہی ہوں جن سے شک وشبہ کو تقویت ملتی ہو یا متہم فسق وفجور اور جرائم میں مشہور ومعروف ہو، محض وہم کی بنیاد پر کسی کو قید نہیں کیا جاسکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک شخص کو تہمت کی بنیاد پر قید کرنا ثابت ہے، اسی طرح تبصرة الحکام/۲۱۰ میں یہ روایت بھی نقل کی گئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ کے ایسے دو آدمیوں کو جن پر دو اونٹ کی چوری کا الزام تھا، ان میں سے ایک کو گرفتار کرلیا اور دوسرے سے فرمایا جاؤ اور دونوں اونٹوں کو تلاش کر کے لاؤ، چنانچہ وہ گیا اور انہیں لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہو گیا، اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے تہمت کی بنیاد پر دو آدمیوں کو قید کیا حتی کہ انہوں نے اپنے جرم کا اقرار کرلیا۔

''إن النبي صلى الله عليه وسلم حبس رجلا في تهمة'' (سنن ابی داؤد)۔ ''إن النبي ﷺ حبس أحد الغفارين بتهمة بعيرين ثم أطلقه، وروى عن علي رضي الله عنه أنه حبس متهمين حتى أقروا'' (تبصرة الحكام/ ۲۱۰)۔

عقل وقیاس کی رو سے بھی یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے کی اگر کوئی شخص کسی کو اپنے کسی حق کے سلسلے میں متہم قرار دے۔ یا کسی جرم میں اس کے ملوث ہونے کی علامت موجود ہو تو معاملات کی تحقیق کے لئے اسے وقتی طور پر نظر بند کیا جائے، تاکہ اگر تحقیق وتفتیش کے بعد اس پر کوئی حق ثابت ہو یا کسی جرم میں اس کا ملوث ہونا ثابت ہو جائے تو صاحب حق کو اس سے حق دلایا جائے اور اس پر شرعی سزا کا نفاذ ہو سکے۔ اسی بنا پر صحابہ وتابعین، خلفائے راشدین اور جمہور فقہاء کا تہمت کی بنیاد پر حبس کے جواز اور مشروعیت پر اتفاق ہے، ہر زمانہ میں حکام اور مسلم قضاۃ کا اس پر عمل رہا ہے اور کسی نے اس پر نکیر نہیں کی ہے۔ لیکن محض وگمان کی بنیاد پر کسی کو قید کرنا درست نہیں، علامہ شامی لکھتے ہیں:

''ذهب جمهور الفقهاء إلى مشروعية الحبس بالتهمة واعتبروا من السياسة العادلة إذا تأيدت التهمة بقرينة قوية أو ظهرت أمارات الريبة على المتهم أو عرف بالفجور'' (حاشية ردالمحتار، الموسوعة الفقهيه، ج۱۶، ماده: حبس)۔

---

[1] استاذ المعهد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء (امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ۔

(جمہور فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ تہمت مشروع ہے اور اسے انہوں نے سیاست عادلہ میں سے شمار کیا ہے، جب کہ اس کی تائید کسی قوی قرینہ سے ہو رہی ہو یا متہم پر شک کی علامتیں ظاہر ہوں یا وہ فسق و فجور کے ساتھ مشہور ہو۔

اور جہاں تک کسی تہمت کی بنیاد پر متہم شخص کو قید کرنے کی مدت کا مسئلہ ہے تو راجح قول کی بنیاد پر اس کی کوئی تعیین نہیں کی جاسکتی، بلکہ یہ قاضی اور حاکم کی صوابدید پر موقوف ہوگا کہ وہ حالات کے تقاضے کو سامنے رکھ کر جو مدت چاہے مقرر کرے۔

"وأما قدر مدة الحبس فيختلف باختلاف أسبابه وموجباته، فحبس التعزير راجع إلى اجتهاد الحاكم بقدر مايرى أنه ينزجر به وفي (مختصر الأحكام السلطانية) والحبس في التعزير قد يكون يوما ومنهم من يحبس اكثر بلا تقدير وقال ابوعبدالله الزبيري من اشافعية يتقدر بشهر للاستبراء والكشف وبستة أشهر للتاديب والتقويم... ومقتضى مذهبنا أنه موكول إلى اجتهاد الحاكم... وحبس المتهمون بالسرقة والجنايات بقدر ما يكشف عن حالهم وبقدر ما نسب اليهم من الجراءة والشر واستحلال مالايجوز" (تبصرة الحكام: ۲/ ۲۴۰، ۲۴۱)۔

(بہر حال قید کی مدت کی مقدار اس کے اسباب و محرکات کے اختلاف سے مختلف ہوگی، قید تعزیر کی مدت کا فیصلہ حاکم کی اجتہاد پر موقوف ہوگا، وہ اس کی تنبیہ اور عبرت کے لئے جونسی مدت مناسب سمجھے اس کا فیصلہ کرے، اور "مختصر الاحکام السلطانیہ" میں ہے کہ حبس بر بنائے تعزیر کبھی ایک دن ہوگا، اور کچھ حضرات کسی تعیین و تحدید کے بغیر قید کا فیصلہ کرتے ہیں، اور ابوعبداللہ زبیری شافعی فرماتے ہیں کہ حالات کی تحقیق اور چھان بین کے لئے ایک ماہ کی مدت مقرر کی جائے گی، اور اصلاح و تعزیر کے لئے چھ ماہ کی مدت...... اور ہمارے مذہب کا تقاضہ یہ ہے کہ اسے حاکم کی رائے پر چھوڑا جائے گا...... اور جن لوگوں پر چوری اور زیادتیوں کا الزام ہو انہیں اتنی مدت کے لئے قید کیا جائیگا جس سے ان کی حالت کا صحیح اندازہ ہو جائے اور ان کی طرف جو ظلم اور شر اور ناجائز چیزوں کو حلال کرنے کا الزام ہو اس کے اعتبار سے)۔

۲- درج ذیل امور سے متعلق قیدیوں کو کیا حقوق حاصل ہیں؟

الف: مذہبی امور- اپنے مذہب اور عقیدہ کے مطابق عبادت ادا کرنے، مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرنے، دوسرے قیدیوں کے درمیان دین کی دعوت دینے، اصلاحی باتیں کرنے کی آزادی حاصل ہوگی، البتہ قید کی مدت تک حج کے لئے جانے، عیدین اور جمعہ کی نماز کے لئے جانے، کسی مریض کی عیادت یا نماز جنازہ میں شرکت کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ اسی طرح اس کی مذہبی تعلیمات کے مطابق غذا فراہم کیا جائے گا، جو چیزیں اس کے مذہب کی رو سے حرام ہیں ان کے کھانے پر اسے مجبور نہیں کیا جائے گا، وہ جس مذہب پر عقیدہ رکھتا ہے اس مذہب کی مقدس شخصیتوں اور کتابوں کے ساتھ گستاخی و بے احترامی سے گریز کیا جائے گا۔

ب- چونکہ قید کا مقصد محض تادیب اور تنبیہ ہے اس لئے کوئی جسمانی یا نفسیاتی سزا دینا، یا اس کی تذلیل و توہین کرنا درست نہ ہوگا، لہذا اسے مناسب غذا اور صاف پانی مہیا کیا جائے گا، دن کے اوقات میں روشنی، ہوا اور دھوپ سے کچھ دیر اسے استفادہ کا موقع دیا جائے گا، اندرون قید خانہ تھوڑی دیر چہل قدمی کی بھی اجازت ہوگی، تا کہ اس کی صحت باقی رہے اور ہلاکت سے دوچار نہ ہو، بیمار ہو جانے کی صورت میں ضروری حد تک علاج و معالجہ کی سہولت بھی مہیا کی جائے گی۔ ایسی تنگ جگہ میں نہیں رکھا جائے گا جہاں نہ کھڑا ہو سکے، نہ پاؤں پھیلا کر لیٹ سکے، یا دیوار کے باہر کسی چیز کو نہ دیکھ سکے، جسمانی ضروریات میں یہ سب چیزیں داخل ہیں، کیوں کہ اگر جسمانی ضروریات کی تکمیل نہ ہو تو اس کے بیمار ہو جانے اور ہلاک ہونے کا خطرہ ہے، اور قید کا مقصد بیماری سے دوچار کرنا یا ہلاک کرنا نہیں ہے۔

بیوی سے تعلق اور جنسی خواہش کی تکمیل کے سلسلے میں فقہاء کا اختلاف ہے، اور اس سلسلے میں ان سے تین اقوال مروی ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ قید خانہ میں اگر خلوت کی ایسی جگہ ہے جہاں وہ لوگوں کی نظروں سے چھپ کر اپنی بیوی سے جماع کر سکتا ہے تو اس صورت میں اسے اس کی اجازت دی جائے گی، یہ حنفیہ کے نزدیک ظاہر روایت ہے، حنابلہ کا مذہب بھی یہی ہے اور بعض شوافع بھی اسی کے قائل ہیں۔ اس قول کی دلیل یہ ہے کہ جسمانی ضرورتوں میں جس طرح غذا، پانی اور لباس ہے اسی طرح جنسی خواہش کی تکمیل بھی ہے، لہذا محدود دائرے میں شہوت بطن کی جس طرح تسکین کی جاتی ہے اسی طرح شہوت فرج کی تسکین بھی اس کا جسمانی حق ہے۔ اس لئے ایسی جگہ اگر مہیا ہو تو اسے اس سے استفادہ کا موقع دیا جائے گا۔

”وقال محمد: المحبوس ينور في السجن... ولو احتاج إلى الجماع لابأس بأن تدخل زوجته أو جاريته في السجن فيطأها حيث لا يطلع عليه أحد“ (الفتاوی الهندیه ۲/ ۴۱۸)۔

(امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ قیدی کو جیل میں روشنی فراہم کی جائے گی...... اور اگر اسے جماع کی ضرورت ہوتو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اس کی بیوی یا باندی جیل میں داخل ہو اور وہ ایسی جگہ اس سے وطی کرے جہاں کوئی نہ دیکھے)۔

دوسرا قول جمہور فقہاء کا ہے (یعنی مالکیہ کا اور بعض شوافع اور بعض احناف کا ہے) وہ یہ ہے کہ جیل میں قیدی کے لئے اس کی گنجائش فراہم نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی بیوی سے ہم بستر ہو، اس لئے کہ قید کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قید کی سزا اس کے لئے باعث عبرت بنے، اس کی تعزیر اور تادیب ہوتا کہ آئندہ وہ اس جرم سے باز رہے، اور اگر جیل میں اس کے لئے اس طرح کی لذت وراحت کا سامان فراہم کیا جائے تو قید کی سزا بے معنی ہوکر رہ جائے گی، اور یہ اس کے لئے زجر وتوبیخ کا سبب نہیں بن سکتی۔ غذا اور لباس و پوشاک حوائج اصلیہ میں داخل ہے جب کہ جماع کھانے پینے کی طرح حوائج اصلیہ میں داخل نہیں ہے، اس کے بغیر بھی انسان زندہ رہ سکتا ہے لہذا اسے بیوی سے صحبت کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ البتہ مالکیہ آگے یہ فرماتے ہیں کہ مرد اگر بیوی کے کسی حق کی بنیاد پر قید ہوتو اسے اپنی بیوی سے صحبت کرنے سے نہیں روکا جائے گا، بشرطیکہ قید خانہ میں خلوت کی ایسی جگہ موجود ہو جہاں لوگوں کی نظر نہ پڑے، بیوی کے کسی حق کی بنا پر قید ہوتو شوہر کا حق وطی ساقط نہ ہوگا۔

تیسرا قول یہ ہے کہ وطی قیدی کے جائز حقوق میں سے ایک حق ہے لہذا اسے اس سے نہیں روکا جائے گا، الا یہ کہ مصلحت کا تقاضہ یہی ہو اور قاضی محسوس کرے کہ اس کی تادیب وتنبیہ کے لئے اسے اس حق سے باز رکھنا ضروری ہے تو پھر وہ اسے اس سے روک سکتا ہے جیسا کہ اگر مصلحت متقاضی ہو کہ اسے اپنے دوست واحباب اور متعلقین سے بات چیت کرنے سے روکا جائے تو وہ ایسا کرسکتا ہے، اسی طرح بربنائے مصلحت وہ جیل کے دروازے کو بند کرسکتا ہے۔ یہ تیسرا قول بعض شوافع کا ہے۔

یہ تینوں اقوال چاروں فقہی مذاہب کی مستند ومتداول فقہی کتابوں میں موجود ہیں، اور ان تینوں اقوال میں کسی ایک کا انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ لہذا اگر قیدی کا جرم شدید درجے اور سنگین نوعیت کا ہوتو اس کی تعزیر وتادیب اور زجر وتوبیخ کے لئے اسے اس حق سے محروم رکھا جائے گا، اور اگر جرم اس درجے کا نہ ہوتو اس کے لئے اس کی گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔ اسی طرح حبس کی مدت کی کمی بیشی کو بھی بنیاد بنایا جاسکتا ہے، کہ جو شخص ماہ دو ماہ یا چند ماہ کے لئے قید ہو اس کے لئے اس کی حاجت نہیں ہے، اسے اس کی قدرت دی جائے کہ چند ماہ اس سے صبر کرنا اور باز رہنا کوئی مشکل چیز نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کو عمر قید کی سزا ہو یا طویل عرصہ کے لئے قید میں ہوتو اس کے لئے وقتاً فوقتاً اس کی گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔ بہر حال زیادہ بہتر یہی ہے کہ اسے قاضی اور حاکم کی صوابدید پر موقوف رکھا جائے جس طرح قید سے متعلق بعض دیگر مسائل کو قاضی کی رائے پر چھوڑا گیا ہے۔

ج- عام سماجی حقوق: اس عنوان کے تحت سوال نامہ میں جن حقوق کا تذکرہ کیا گیا ہے یعنی اخبارات پڑھنا، ریڈیو سننا، فون پر احباب واقارب سے گفتگو کرنا وغیرہ تو اگر ان امور کی اجازت دی جائے تو پھر قید کی سزا بے معنی ہوکر رہ جائے گی اور اس سے زجر وتنبیہ اور تعزیر وتادیب کا فائدہ حاصل نہ ہوگا اور جیل گھر کی طرح ہو جائے گا اس لئے ان امور کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ البتہ جیل کے اندر جو دوسرے قیدی ہیں ان سے وقتاً فوقتاً ملاقات، تبادلہ خیال اور مفید اور اصلاحی باتیں کرنے کی اجازت ہونی چاہئے تاکہ قیدیوں کے ذہن سے جرائم کا رجحان ختم ہو اور وہ اصلاح حال پر آمادہ ہوں۔ اسی طرح ان کی اصلاح اور تعلیم وتربیت کا مناسب نظم کیا جاسکتا ہے خواہ اس مقصد کے لئے باہر سے افراد لائے جائیں یا قیدیوں ہی میں اگر کچھ ایسے لوگ ہوں جو اس خدمت کو بہتر طور پر انجام دے سکتے ہوں تو انہیں بھی اس کی خدمت پر مامور کیا جاسکتا ہے، اسی طرح مناسب ہنر اور صنعت وحرفت کی بھی ٹریننگ دی جاسکتی ہے کیوں کہ جرائم کا ایک بڑا محرک جہالت، ناخواندگی اور بے روزگاری ہے۔ لہذا اس کے ازالہ کے لئے مناسب تدبیر اختیار کی جاسکتی ہے۔ بہر حال اگر جیل کی طرف سے جاہل اور ناخواندہ افراد کی تعلیم وتربیت اور اصلاح کا کوئی نظم ہو یا نہیں کوئی مناسب ہنر سکھا دیا جائے تاکہ وہ چوری، ڈاکہ زنی اور اس طرح کے دیگر جرائم سے باز آکر حلال کمائی کے لئے کوئی ہنر اختیار کرلیں تو اس کی بھی گنجائش ہے اور یہ وقت کا صحیح استعمال ہے۔

د- اخلاقی امور یعنی مردوں کے لئے الگ اور عورتوں کے لئے الگ اور بالغوں کے لئے الگ اور نابالغوں کے لئے الگ قید خانے کا نظم ہو یا ایک ہی قید خانے کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کردیا جائے تو یہ مناسب ہی نہیں ضروری ہے تاکہ مردوں اور عورتوں، بالغوں اور نابالغوں کے اختلاط سے فحاشی، بے حیائی اور

اخلاقی مفاسد رونما نہ ہوں، بلکہ فقہاء نے تو یہاں تک صراحت کی ہے کہ اگر خنثیٰ مشکل کو قید کیا جائے تو اسے نہ مردوں کے ساتھ رکھا جائے نہ عورتوں کے ساتھ بلکہ دونوں سے علیحدہ رکھا جائے (الموسوعة الفقهيه ۳۱۷/۱۶، بحواله حاشية الدسوقي ۲۸۰/۳، حاشية الصعيدي على كفاية الطالب ۲۰۱/۲)۔

۳- قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے کس حد تک دھمکانے کی اجازت ہے؟ اور اس کے ذیل میں جن پانچ امور کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے کوئی بھی سزا ازروئے شرع جائز نہیں ہے، مثلاً قیدیوں کو بے لباس کرنا حرام ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مرد مرد کی عورت کو (یعنی قابل ستر حصہ کو) اور عورت عورت کے قابل ستر حصہ کو نہ دیکھے: ''لا ينظر الرجل إلى عورة الرجل ولا المرأة إلى عورة المرأة'' (روائع البیان جلد دوم)،

لہٰذا کسی شخص کو دوسروں کے سامنے ننگا کرنا حرام ہے، کسی کے قابل ستر حصے کو دیکھنا جائز نہیں۔ اسی طرح قیدیوں کو مار پیٹ کرنے کی بھی اجازت نہیں، کیوں کہ قید کرنے کا مقصد محض تادیب وتنبیہ ہے، لہٰذا اس کے ساتھ کسی قسم کی غیر انسانی حرکت اور اس کی تذلیل وتوہین جائز نہیں۔

''وفي كفالة الأصل: لا يضرب المديون ولا يغل ولا يقيد إلا أن يخاف فراره كذا في المنتقى (معين الحكام ۱/ ۱۹۷)

ولا يخوف ولا يجرد ولا يقام بين يدي صاحب الحق اهانة ولا يؤاجر'' (حوالہ سابق)۔

(اور المبسوط کے باب الکفالہ میں ہے کہ مدیون کو نہ مارا جائے گا نہ اس کے گلے میں طوق پہنایا جائے نہ بیڑی اور ہتھکڑی ڈالی جائے گی الا یہ کہ اس کے بھاگنے کا اندیشہ ہو، ''المنتقی'' میں ایسا ہی ہے۔ نہ ڈرایا جائے گا نہ برہنہ کیا جائے گا اور نہ صاحب حق کے سامنے توہین وتذلیل کے طور پر کھڑا کیا جائے گا، نہ اجرت پر کام کرایا جائے گا)۔

جب مدیون کو صاحب دین کے سامنے کھڑا نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں اس کی توہین وتحقیر ہے تو پھر اسے الکٹرک شاٹ لگانا، یا ان پر کتے، درندوں اور سانپ بچھو کو چھوڑنا یا انہیں سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈال دینا کیوں کر روا ہوسکتا ہے، فقہی کتابوں میں ایسی سزاؤں کی ممانعت صراحتاً آئی ہے:

''تحرم المعاقبة بالإقامة في الشمس أو صب الزيت على الرؤوس أو حلق اللحية وكذا إغراء الحيوان كالسبع والعقرب بالمحبوس ليؤذيه'' (الموسوعة الفقهيه ۱۶/۳۲۸، ماده: فقره: حبس ۱۳۶)۔

(دھوپ میں کھڑا رکھ کر یا سروں پر تیل ڈال کر یا ڈاڑھی مونڈ کر سزا نہیں دی جائے گی، اسی طرح قیدی کو اذیت پہنچانے کے لئے جانوروں، درندوں اور بچھو کو اس پر نہیں چھوڑا جائے گا)۔

و- قیدیوں کو مسلسل جگے رہنے پر مجبور کرنا اور اس کے لئے ان کی جائے رہائش میں تیز روشنی یا تیز آواز کا انتظام رکھنا بھی جائز نہ ہوگا۔ اس لئے کہ یہ بے جا اذیت رسانی اور غیر انسانی اور غیر اخلاقی حرکت ہے جس طرح کھانا پینا انسان کی بنیادی جسمانی ضرورت ہے اسی طرح سونا بھی اسی نوعیت کی اہم ضرورت ہے، اگر مسلسل جگے رہنے پر مجبور کیا جائے تو صحت خراب ہونے، بیمار پڑ جانے اور جنون میں مبتلا ہوجانے کا قوی اندیشہ اور غالب گمان ہے، اور یہ قید کے مقصد سے کسی طرح ہم آہنگ نہیں بلکہ بے فائدہ ستانا ہے جس کی اسلام کسی قیمت پر اجازت نہیں دیتا۔

۴- کیا قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑا جاسکتا ہے، یا انہیں ہتھکڑی پہنائی جاسکتی ہے، یا انہیں بیڑی ڈالی جاسکتی ہے؟

گرفتار کئے جانے کے وقت محفوظ طریقے پر جیل تک پہنچانے کے لئے صرف اس حد تک ہاتھوں میں ہتھکڑی یا پیروں میں بیڑی ڈالی جاسکتی کہ وہ بھاگ نہ سکے اور جب جیل خانہ میں ڈال دیا گیا اور بھاگنے کا خطرہ نہ رہا ہو تو اب ہتھکڑی اور بیڑی کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ آج کل جیل کا نظام ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی قیدی چھوٹ کر بھاگ سکے۔ بہرحال بھاگنے ہی کے خطرے سے ہتھکڑی یا بیڑی کے استعمال کا اجازت ہے، توہین وتذلیل کے لئے زنجیروں میں جکڑنے کی اجازت نہیں، فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے:

''ولا يغل إلا إذا خاف فراره فيقيد أو يحول إلى سجن اللصوص'' (حاشية الطحطاوي ۲/ ۱۸۷)۔

(اور اسے زنجیر سے جکڑا نہیں جائے گا مگر جب کہ اس کے بھاگنے کا اندیشہ ہو، اس صورت میں جکڑا جائے گا یا چوروں کے قید خانہ میں منتقل کردیا جائے گا)۔

''ولا يضرب المحبوس لأجل الدين إلا إذا امتنع من الانفاق على قريبه فيضرب ولا يغل إلا إذا خيف أنه يفر فيقيد'' (مجمع الأنهر ۲/ ۱۶۰)۔

(اور دین کی وجہ سے جو شخص قید کیا گیا ہے اسے مارا نہیں جائے گا، مگر جب وہ اپنے رشتہ دار پر خرچ کرنے سے باز رہے اس صورت میں اسے مارا جائے گا، اور جکڑا نہیں جائے گا مگر اس وقت جب کہ اس کے بھاگنے کا خطرہ ہو)۔

۵- کیا کسی مجرم کو اس کے خصوصی جرم کے پس منظر میں قید تنہائی دی جاسکتی ہے؟

جرم کی نوعیت اگر ایسی ہو کہ قید تنہائی کی سزا اس مجرم کے لئے اس جرم سے باز رکھنے کا موثر ذریعہ ہوسکتی ہے تو زجر و تنبیہ اور تادیبی کارروائی کے طور پر یہ سزا دی جاسکتی ہے۔

''ویحبس فی موضع وحش'' (معین الحکام/۱۹۷) (اور وحشت و تنہائی کی جگہ میں اسے قید کیا جائے گا)۔

''ولا یمکن أحد أن یدخل علیه للاستیناس'' (حاشیة الطحطاوی ۴/۱۸۶)۔

(اور کسی کو اس کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ اسے مانوس کرنے کے لئے اس کے پاس آئے)۔

۶- کیا جیل میں قیدیوں سے جبراً کام لیا جاسکتا ہے اور اگر کام لیا جائے تو کیا قیدی اس کام کی اجرت کے مستحق ہیں؟

جیل میں قیدیوں سے جبراً کام نہیں لیا جاسکتا۔ ہاں اگر دین کے سلسلے میں اسے گرفتار کیا گیا ہو تو بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ رقم کی فراہمی اور دین کی ادائیگی کے لئے اجرت پر لگایا جاسکتا ہے، اور اگر اس مقصد کے لئے کام میں لگایا جائے تو ظاہر ہے کہ وہ اس کی اجرت کا مستحق ہوگا۔

''ولا یؤاجروعن الثانی یؤجرہ لقضاء دینه'' (حاشیة الطحطاوی ۴/۱۸۶)۔

(اور قیدی کو اجرت پر کام کرنے کا موقع نہیں دیا جائے گا، اور امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ دین کی ادائیگی کے لئے اسے کام پر لگایا جائے گا)۔

جیل میں قیدیوں کو مشغول رکھنے اور انہیں کام پر لگانے کے سلسلے میں فقہاء کرام کے تین اقوال ہیں:

پہلا قول جو شافعیہ اور حنابلہ کا ہے اس کی رو سے قیدی کو قید خانہ میں کام کرنے سے نہیں روکا جائے گا، بلکہ اسے اس کی سہولت فراہم کی جائے گی، اس لئے کہ اس پر اپنے متعلقین کا نفقہ واجب ہے، اس آمدنی سے ان کی کفالت ہوگی، اسی طرح اگر دوسروں کے حقوق اور دیون اس پر ہیں تو ان کی ادائیگی کی بھی سبیل نکلے گی۔

دوسرا قول جو حنفیہ اور بعض دیگر فقہاء کا ہے اس کی رو سے قیدی کو جیل میں کام کرنے کا موقع نہیں دیا جائے گا، اس لئے کہ قید کا مقصد تنبیہ اور تعزیر ہے، اور اگر وہ قید میں کام میں مشغول ہو اور آمدنی کے ذرائع اختیار کرنے کی آزادی ہو تو قید سے فائدہ حاصل نہ ہوگا اور قید خانہ بمنزلہ گھر اور دوکان کے ہو جائے گا۔ ''فتاوی عالمگیری'' میں اس سلسلے میں مشائخ کا اختلاف نقل کیا گیا ہے۔ بعض حضرات کی طرف اباحت کا قول منسوب ہے اور بعض کی طرف ممانعت کا، لیکن راجح اور صحیح قول یہی نقل کیا گیا ہے کہ اس سے روکا جائے گا لیکن پھر آخر میں فتاوی کبری کے حوالہ سے قاضی فخر الدین حنفی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آج کے دور میں فتوی اس پر ہے کہ قیدی کو کمانے سے نہیں روکا جائے گا۔

''وهل یترك لیکتسب فی السجن؟ اختلف المشایخ رحمهم الله تعالی فیه. قال بعضهم: لایمنع من الاکتساب فی السجن. وقال بعضهم: یمنع عن ذلك وهو الأصح. وإلیه أشار الخصاف رحمه الله تعالی وفی الکبری وقال القاضی فخر الدین: الفتوی الیوم علی أنه لا یمنع من الاکتساب (الفتاوی الهندیه ۳/۴۱۸)۔

(اور کیا جیل میں قیدی کو کمانے کا موقع نہیں دیا جائے گا؟ اس معاملہ میں مشائخ کا اختلاف ہے، بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ قید میں کمانے سے روکا نہیں جائے گا اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے روکا جائے گا اور یہی زیادہ صحیح ہے اور خصاف نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے، اور فتاوی کبری میں ہے کہ قاضی فخر الدین فرماتے ہیں کہ آج فتوی یہ دیا جائے گا کہ قیدی کو کمانے سے روکا نہیں جائے)۔

اور تیسرا قول اس سلسلے میں یہ ہے کہ اس کا فیصلہ حاکم اور قاضی کی رائے اور اجتہاد پر موقوف ہوگا، وہ اگر مصلحت دیکھے اور مناسب سمجھے تو اجازت دے گا ورنہ نہیں۔

جہاں تک ان تینوں اقوال میں ترجیح کا مسئلہ ہے تو اصل یہ ہے کہ شرعی نصوص میں اس سلسلے میں اثباتا یا نفیا کوئی صراحت منقول نہیں ہے۔ اس لئے یہ سراسر اجتہادی مسئلہ ہے، فقہاء کرام نے اپنے اپنے زمانے میں حالات کے لحاظ اور مصلحت کے اعتبار سے جو مناسب سمجھا اس کے مطابق فتوی دیا۔ فقہاء احناف کی طرف جو ممانعت کا قول منسوب ہے وہ اجماعی اور اتفاقی نہیں ہے بلکہ بہت سے مشائخ جواز کی طرف مائل ہیں، اور قاضی فخر الدین کے قول کی رو سے آج کے دور کی رو سے یہی فتوی دیا جائے گا کہ قیدی کو اس سے نہیں روکا جائے، اس طرح جواز کا قول جمہور کا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں جو تیسرا قول ہے کہ اس کا فیصلہ قاضی اور حاکم کے سپرد ہوگا، یہی لائق ترجیح ہے کہ حالات اور مصلحت کی رو سے اور مجرم کے جرم کی نوعیت کو سامنے رکھ کر قاضی فیصلہ کرے کہ اس کے لئے کیا مناسب ہے۔

۷- جن قیدیوں کے بارے میں سزائے قید کا فیصلہ ہو چکا ہے ان کا جرم ثابت ہے، اور عدالت کے فیصلے کی رو سے وہ سزا بھگت رہے ہیں، اور جن قیدیوں کا مقدمہ زیر سماعت ہے ان کا جرم یقینی نہیں اور نہ ان کا قابل سزا ہونا یقینی ہے، اس لئے دونوں کی حیثیت الگ الگ ہے، عین ممکن ہے کہ آئندہ عدالت اسے بری قرار دے اور جو الزام اور تہمت اس پر عائد کی گئی تھی وہ ثابت نہ ہوسکے اس لئے دونوں کے ساتھ یکساں سلوک نہیں کیا جاسکتا۔ قید میں بھی جرائم کے لحاظ سے سزا مختلف ہوتی ہے، سنگین اور خطرناک جرائم کی سزا سنگین ہوتی ہے اور جو جرائم اس سے کم درجے کے ہیں ان کی سزا اس سے کم تر درجے کی ہوتی ہے۔ لہذا جو شخص زیر حراست ہے اور جس کا مقدمہ زیر سماعت ہے اسے صرف نظر بند کر کے رکھا جائے۔ مجرمین جیسی سزا اسے نہیں دی جائیگی، یہی عدل وانصاف کا تقاضا ہے۔

۸- کیا زیر سماعت قیدیوں کو اتنے دنوں تک فیصلے سے پہلے قید میں رکھا جاسکتا ہے جو ان کے اوپر عائد فرد جرم کی اصل سزا ہے؟

نہیں، یہ بات عدل وانصاف کے تقاضوں سے کسی طرح ہم آہنگ نہیں۔

۹- اگر ملزم کو قید میں رکھا گیا اور بعد کو عدالت نے اسے بری قرار دیا تو کیا وہ زمانۂ قید میں ہونے والی ذہنی اذیت اور مالی ہرجانہ طلب کر سکتا ہے؟

یہ ایسا مسئلہ ہے جس کا جواب نہ بالکلیہ اثبات میں دیا جاسکتا ہے نہ بالکلیہ نفی میں۔ جہاں تک تہمت کی بنیاد پر کسی کو قید کرنے کا مسئلہ ہے تو یہی قطعی طور پر ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور خلفائے راشدین اور ان کے بعد خلفاء وامراء نے اپنے اپنے زمانہ میں تہمت کی بنیاد پر قید کیا ہے۔ اور جرم ثابت نہ ہونے کی صورت میں انہیں آزاد کر دیا۔ لیکن اس کی وجہ سے انہوں نے بری ہونے والے ملزم کو کوئی مالی تاوان ادا نہیں کیا، لہذا اصولی طور پر قید بر بنائے تہمت کا ہرجانہ اور مالی تاوان اور زمانۂ قید میں ہونے والی ذہنی اذیت کا معاوضہ اور ہرجانہ طلب کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ اور اس لئے بھی کہ تہمت کی بنیاد پر قید کیا جانا محض وہم یا معمولی شبہ کی بنیاد پر نہیں ہوتا، بلکہ کسی قوی قرینہ کی بنیاد پر ہوتا ہے یا اس کے فسق وفجور میں معروف ومشہور ہونے کی بنیاد پر ہوتا ہے یعنی شک وشبہ کی کوئی ٹھوس بنیاد اور علامت ہوتی ہے۔

لیکن اس مسئلہ کو دوسرا افسوس ناک پہلو یہ بھی ہے کہ آج کی دنیا میں کسی بھی مذہب وملت اور جماعت سے عداوت، نفرت اور تعصب کی بنیاد پر اس کے افراد کو اٹھا کر قید کر لیا جاتا ہے اور ایک عرصہ طویل تک انہیں حراست میں رکھا جاتا ہے۔ بلکہ بعض دفعہ بلاوجہ سخت تکلیفیں پہنچائی جاتی ہیں، اگر اس نوعیت کا مقدمہ ہو تو ایسے مظلومین کو عدالت کی طرف سے بری قرار دیئے جانے کے بعد اپنی ناحق قید کی سزا بھگتنے۔ اور ذہنی وجسمانی اذیت سہنے کے ہرجانہ کے مطالبہ کا حق ہونا چاہئے۔ اور یہ اس لئے بھی کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں تہمت کی بنیاد پر جن افراد کو قید کیا گیا اس کی مدت نہایت مختصر تھی یعنی ایک دو دن، اور آج کے زمانے میں مہینوں اور سالوں قید میں رکھا جاتا ہے، جبکہ بعض فقہاء نے محض تہمت کی بنیاد پر کسی کو قید کرنے کی مدت زیادہ سے زیادہ ایک دن، دو دن، تین دن قرار دی ہے۔ اور اس سلسلے میں حد سے حد جو آخری قول ملتا ہے وہ ایک ماہ سے زیادہ کا نہیں ہے۔ چنانچہ "الموسوعة الفقهية" میں شامی، تبصرة الحكام اور المغنی وغیرہ کے حوالہ سے لکھا گیا ہے:

"لاحد لأقل مدة الحبس، أما أكثره فيرجع فيه إلى اجتهاد الحاكم حتى ينكشف حال المتهم.... وقال بعض الفقهاء: إن أكثر مدة يحبس فيها المتهم المجهول الحال يوم واحد، وحددها قوم بيومين وثلاثة. وأجاز آخرون بلوغها شهرا" (الموسوعة الفقهيه ۱۶/ ۲۹۴)۔

(قید کی کم سے کم مدت کی کوئی حد نہیں ہے، اور زیادہ سے زیادہ مدت کے سلسلے میں حاکم کے اجتہاد کی طرف رجوع کیا جائے گا یہاں تک کہ متہم کی حالت کا

انکشاف ہوجائے ۔۔۔۔ بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ جن متہم کی حالت مجہول ہو اسے زیادہ سے زیادہ ایک دن کے لئے قید کیا جاسکتا ہے اور کچھ حضرات نے دو دن اور تین دن سے اس کی تحدید کی ہے جب کہ دوسرے حضرات نے اس مدت کے ایک ماہ تک پہنچنے کو جائز قرار دیا ہے)۔

۱۰- قیدی کا اپنے مقدمات کے سلسلے میں وکیل سے رابطہ قائم کرنا

زندگی کے مختلف معاملات اور مقدمات میں آدمی کو اپنا وکیل بنانے کا حق شرعاً حاصل ہے، جس کام کو آدمی خود کرسکتا ہے اسے انجام دینے کے لئے وہ کسی کو اپنا وکیل بھی بنا سکتا ہے، چنانچہ نکاح میں، خرید و فروخت میں، عدالتی مقدمات میں آدمی اپنا وکیل بناتا ہے۔ یہ حق جس طرح عام لوگوں کو حاصل ہے اسی طرح قیدی کو بھی حاصل ہے۔ لہذا قیدی جس طرح اپنے کسی مقدمہ میں عدالت کی طلب پر حاضر ہوکر بیان دے سکتا ہے۔ اپنی صفائی پیش کرسکتا ہے اسی طرح وہ اس مقصد کے لئے کسی کو اپنا وکیل بھی بنا سکتا ہے۔ قید ہونے کی وجہ سے اس کا یہ شرعی حق ساقط نہیں ہوسکتا۔

''فإن تعذر علی المحبوس الخروج جاز له استحسانا توکیل من یجیب عنه'' (الموسوعة الفقهیه ۱۶/ ۲۲۶)۔

۱۱- خواتین قیدیوں کا اپنے ساتھ شیر خوار بچوں کو جیل میں رکھنا

کوئی خاتون اگر کسی جرم میں ماخوذ ہو اور عدالت کی طرف سے اس کے حق میں قید کا فیصلہ ہو اور اس کے ساتھ کوئی شیر خوار بچہ ہو تو اسے اپنے ساتھ شیر خوار بچہ کو رکھنے کا حق حاصل ہوگا۔ بچے کو ماں سے جدا نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ شفقت و محبت اور خیر خواہی میں کوئی عورت ماں کا بدل نہیں ہوسکتی اور نہ ماں کی طرح اس کی پرورش کا حق ادا کرسکتی ہے۔ اسی بنا پر کسی شخص کی ملکیت میں کوئی باندی ہو اور اس کے ساتھ بچہ بھی ہو تو کسی ایک کو فروخت کرکے ماں اور بچے کے درمیان تفریق کرنے کا اختیار اسے حاصل نہیں ہوگا۔ سنن ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اپنی ایک باندی کے ساتھ اسی نوعیت کا تصرف کیا تھا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سے منع فرمایا اور ان کی بیع کو رد فرما دیا۔

''عن علی. أنه فرق بین جاریة وولدها فنهاه النبی صلی الله علیه وسلم عن ذلك ورد البیع''

(سنن ابی داؤد، کتاب الجهاد، باب فی التفریق بین السبی: ۲/ ۱۴۴، ۱۴۵۔

اس لئے وہ خاتون اگر اس کی پرورش پرداخت کا کوئی معقول متبادل نظم کرسکتی ہو تو ٹھیک ورنہ اسے اس پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ کیوں کہ اس نازک مرحلہ میں اگر اس کی پرورش کے سلسلہ میں کوتاہی ہو تو بچہ ضائع ہوسکتا ہے اور حق حضانت میں ماں باپ اور بچہ تینوں کا حق متعلق ہوتا ہے۔ اسی بنا پر فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اگر کوئی ماں بچے کو دودھ پلانے سے انکار کردے تو اسے اس پر مجبور نہیں کیا جائے گا، لیکن اگر کوئی دوسری عورت بچے کو دودھ پلانے والی نہ ہو یا بچہ کسی اور عورت کا دودھ قبول نہ کرے تو ماں کو دودھ پلانے پر مجبور کیا جائے گا۔ یا اگر باپ یا اس بچہ کے پاس مال نہ ہو جس سے دودھ پلانے والی عورت کی اجرت ادا کی جاسکے تو بھی اسے دودھ پلانا ہوگا۔ (الدر المختار علی هاحش رد المحتار ۵/ ۲۰۷، کتاب الطلاق، باب الحضانة)۔

خلاصہ کلام یہ کہ دودھ پلانا خود ماں کا حق بھی ہے اور بچہ کا حق بھی ہے اس لئے وہ اپنا حق ساقط کرنے پر راضی بھی ہوجائے لیکن بچے کی پرورش اور شیر خوارگی کا کوئی متبادل نظم نہ ہوسکے تو عورت از روئے شرع اسے اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور ہے، اس سے اس کا اور بچہ کا یہ حق چھینا نہیں جاسکتا۔ واللہ اعلم بالصواب

☆☆☆

اسلامی شریعت میں قیدیوں کے حقوق

مولانا ابدر احمد مجیبی [1]

جواب:۱-الف-شریعت اسلامی میں کسی شخص کو اس کے جرم کے ثبوت فراہم کئے بغیر محض تہمت کی بنیاد پر قید کرنے کی اجازت ہے۔البتہ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس سلسلے میں قوی قرینہ موجود ہو اور اس کے مجرم ہونے کی کوئی علامت نظر آرہی ہو یا وہ فجور میں معروف ہو۔تہمت محض شک سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس کا ثبوت اس طرح ہوتا ہے کہ دو مستور شخصوں نے یا ایک عادل شخص نے اس کے خلاف گواہی دی ہو۔اسی طرح اگر متہم شخص اس کے جرائم میں مشہور ہے تو اس کے بارے میں قاضی کا علم کافی ہوگا۔قاضی تہمت کی بنیاد پر اس کی تعزیر کر سکتا ہے،اس کو قید کر سکتا ہے۔

''ذكروا فى كتاب الكفالة أن التهمة تثبت بشهادة مستورين أو واحد عدل فظاهره أنه لو شهد عند الحاكم واحد مستور وفاسق بفساد شخص ليس للحاكم حبسه بخلاف ما إذا كان عدلًا أو مستورين فإن له حبسه بحر قلت ومثله ما لو كان المتهم مشهورًا بالفساد فيكفى فيه علم القاضى'' (ردالمحتار ۲/۲۰۶)۔

تہمت کی بنیاد پر قید کے جواز کی دلیل یہ ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو تہمت کی وجہ سے قید میں ڈالا تھا۔ابوداؤد اور ترمذی میں بہز بن حکیم بن معاویہ کے دادا معاویہؓ سے مروی ہے:

''حدثنا إبراهيم بن موسى الرازى أخبرنا عبد الرزاق عن معمر عن بهز بن حكيم عن أبيه عن جده أن النبى صلى الله عليه وسلم حبس رجلًا فى تهمة'' (أبو داؤد، كتاب الأقضية، باب فى الحبس فى الدين وغيره)۔

''حدثنا على بن سعيد الكندى حدثنا ابن المبارك عن معمر عن بهز بن حكيم عن أبيه عن جده أن النبى صلى الله عليه وسلم حبس رجلا فى تهمة ثم خلى عنه'' (ترمذى، كتاب الديات، باب ماجاء فى الحبس بالتهمة)۔

کن جرائم میں تہمت کی بنیاد پر قید کی سزا دی جا سکتی ہے اس میں کچھ تفصیل ہے۔اگر کسی شخص پر چوری،قتل یا کسی ایسے جرم کا الزام ہو جس کا تعلق حدود اور قصاص سے ہے تو ایسے شخص کو محض تہمت کی بنیاد پر قید کرنا درست ہے۔کیوں کہ جرم ثابت ہو جانے پر اس کی سزا اس سے بڑے جرم یعنی حد یا قصاص کی ہوگی۔اس لئے قید کی سزا بغیر ثبوت کے بھی تہمت کی وجہ سے دی جا سکتی ہے۔لیکن اگر کسی شخص پر ایسے جرائم کا الزام ہے جس میں زیادہ سے زیادہ سزا قید ہے جیسے مالیات وغیرہ کے جرائم تو اس کو محض تہمت کی بنیاد پر بغیر ثبوت فراہم کئے ہوئے قید کرنا درست نہیں ہے۔کیوں کہ یہ الزام اگر ثابت ہو جائے تو بھی اس کو سزا زیادہ سے زیادہ قید کی سزا ہوگی اور بغیر ثبوت کے محض تہمت کی وجہ سے قید کریں تو دونوں میں کیا فرق باقی رہے گا،ثبوت کے بعد بھی وہی قید اور بغیر ثبوت کے بھی وہی قید تو ثبوت کا فائدہ کیا ہوگا۔

صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں:

''ولهذا لم يشرع فى التعزير بالتهمة قبل ثبوته كما شرع فى الحد لأنه من التعزير'' (بداية كتاب الحدود، فصل فى التعزير)۔

علامہ زیلعی فرماتے ہیں:

''ولهذا لايحبس بالتهمة فى التعزير لكونه أقصى عقوبة فيه فيلزم التسوية بينها وبين التحقيق'' (تبيين

[1] امارت شرعیہ،پھلواری شریف،پٹنہ۔

الحقائق ۲/۲۳۹، نیز دیکھئے: فتح القدیر: ۵/۱۱۷، عنایہ ۵/۱۱۷)۔

ب- تہمت کی بنیاد پر کسی شخص کو قید کیا جائے تو اس قید کی مدت کیا ہوگی؟

تہمت کی بنیاد پر قید کرنا تعزیر ہے۔ حبس بالتعزیر کی مدت کے سلسلے میں صحیح قول یہ ہے کہ اس مدت کی تعیین حاکم اور قاضی کی صوابدید پر موقوف ہوگی۔ قاضی اس شخص کی حالت کے اعتبار سے اس کے مناسب قید کی سزا دے سکتا ہے۔

''وتقدير مدة الحبس راجع إلى الحاكم كذا في البحر الرائق'' (ہندیہ ۲/۱۶۸)۔

صاحب معین الحکام علامہ طرابلسی بھی فرماتے ہیں کہ یہ قاضی کے صواب دید پر منحصر ہے۔

''والصحيح أنه يفوض إلى رأى القاضي'' (معين الحكام/۱۹۸)۔

لیکن فقہاء کی یہ صراحت اس شخص کے بارے میں ہے جس کو حدود وقصاص سے کم درجے کے کسی جرم کے ثبوت ملنے پر قید کیا گیا ہو۔ حدود یا قصاص میں ملوث ہونے کی تہمت کی بنیاد پر جس کو قید کیا جائے اس کی قید اس کی بے گناہی کے ثابت ہوجانے یعنی گواہوں کے ذریعہ اس کے جرم میں ملوث ہونے کے ثبوت نہ ملنے تک یا قاضی کو اس کی بے گناہی کے ظن غالب ہوجانے تک ہونی چاہئے۔

علامہ شامی فرماتے ہیں:

''ومن يتهم بالقتل والسرقة يحبس ويخلد في السجن إلى أن يظهر التوبة'' (ردالمحتار ۲/۱۹۹)۔

جواب:۲-الف- دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو ان کے مذہبی امور کی انجام دہی کی اجازت دینے میں اسلام سے زیادہ وسیع النظر مذہب کوئی بھی نہیں ہے۔ اسلام نے بلاد مفتوحہ کے شہریوں کو جو اسلام نہیں لائے ہیں مکمل مذہبی آزادی عطا کی ہے۔ اسی لئے اسلام نے مفتوحہ ممالک میں وہاں کے باشندوں کو ان کے مذہبی رسوم کی ادائیگی سے نہیں روکا ہے۔ ان کے قدیم عبادت خانوں کو منہدم کرنے سے منع کیا ہے۔ ہاں بعض مصلحتوں کی وجہ سے جدید عبادت خانوں کی تعمیر کی اجازت نہیں دی ہے۔

اس لئے جس طرح دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو پوری مذہبی آزادی اسلامی ممالک میں حاصل ہوگی اسی طرح اسلامی ممالک میں دیگر مذاہب کے قیدیوں کو بھی ان کے تمام مذہبی حقوق حاصل ہوں گے۔ قید خانے کے اندر وہ اپنے مذہب کے مطابق تمام عبادتیں کر سکتے ہیں۔ اپنی مذہبی کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ قید خانے میں اس مذہب کی دینی شخصیات اور اس کی دینی کتابوں کی اہانت اور بے حرمتی نہیں کی جائے گی۔ اپنے مذہب کی اشاعت اور تبلیغ کے سلسلے میں بھی ان کو ایک دائرے کے اندر آزادی حاصل ہوگی۔

ب- انسانی حاجت سے متعلق جو چیزیں ہیں وہ قیدیوں کو فراہم کی جائیں گی۔ قید خانے کے اندر مناسب غذا اور صاف پانی کا انتظام قیدیوں کے لئے کیا جائے گا۔ بیمار ہونے کی صورت میں اس مرض کے علاج کا نظم ہوگا اور قیدیوں کی جسمانی صحت کی حفاظت کا خیال رکھا جائے گا۔ قید خانے میں ہی ان کے علاج کا انتظام کیا جائے گا۔ مرض زیادہ ہونے پر باہر لے جاکر بھی علاج کرایا جائے گا۔

''ولأسير من أسرى المشركين لابد أن يطعم ويحسن إليه حتى يحكم فيه'' (كتاب الخراج لأبي يوسف/۱۳۹)۔

''ولم تزل الخلفاء يا أمير المؤمنين! تجرى على أهل السجون ما يقوتهم في طعامهم وأدمهم وكسوتهم الشتاء والصيف وأول من فعل ذلك على بن أبي طالب كرم الله وجهه بالعراق ثم فعله معاوية بالشام ثم فعل ذلك الخلفاء من بعده'' (كتاب الخراج لأبي يوسف/ ۱۴۹،۱۵۰)۔

''ولو مرض مرضًا أضناه ولم يجد من يخدمه يخرج بكفيل وإلا لا. به يفتي ولا يخرج لمعالجة وكسب''۔

''قوله لمعالجة أي لمداواة مرضه لامكان ذلك في السجن'' (ردالمحتار ۴/۳۴۹، نیز دیکھئے: تبیین الحقائق ۵/۹۶)۔

بیوی اور بچوں سے ملاقات کی ان کو اجازت ملے گی۔ بیوی سے ہمبستری کی اجازت کے سلسلے میں فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ اگر شوہر کو اس کی ضرورت ہو اور قید

خانے میں کوئی ایسی جگہ موجود ہو جہاں لوگوں کی نگاہوں میں آئے بغیر وہ اپنی خواہش پوری کرسکتا ہو تو اس کی بیوی کو قید خانے میں اس جگہ جانے کی اجازت دے دی جائے گی تا کہ اس کی خواہش کی تکمیل ہو سکے۔ اگر ایسی جگہ میسر نہ ہو تو اس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

''لو احتاج إلى الجماع فدخل عليه امرأته أو جاريته حتى جامعها لكن فى موضع لايطلع أحد فإن لم يجد مكانًا خاليًا لا يجامع'' (معین الحکام/ ۱۹۸)۔

''لو احتاج إلى الجماع لابأس بأن تدخل زوجته أو جاريته فى السجن فيطؤها حيث لا يطلع عليه أحد وفى الفتاوى الهندية وإن لم يجد مكانًا خاليًا لا يجامع'' (ہندیہ ۳/ ۴۱۸، نیز دیکھئے: رد المحتار ۴/۳۴۹)۔

قیدیوں کو ایسی تنگ جگہوں میں نہیں رکھا جائے گا جہاں ان کو کھڑے ہونے میں یا پاؤں پھیلا کر لیٹنے میں بھی دشواری ہو۔ امام ابو یوسف حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ایک حکم نامہ نقل کرتے ہیں:

''لا تدعنّ فى سجونكم أحدًا من المسلمين فى وثاق لا يستطيع أن يصلى قائمًا ولا تبيتنّ فى قيد إلا رجلا مطلوبًا بدم وجروا عليهم من الصدقة ما يصلحهم فى طعامهم وأدمهم، والسلام'' (کتاب الخراج لابی یوسف/ ۱۵۰)۔

''اعلم أن الحبس الشرعى ليس هو فى مكان ضيق'' (معین الحکام/۱۹۶)۔

ج- قیدیوں کو ایسے عام سماجی حقوق حاصل نہ ہوں گے جن سے ان کے قید کئے جانے کا مقصد ہی فوت ہو جائے۔ اس لئے کہ قید خانہ کا مقصد یہ ہے کہ قیدی کو پریشانی ہو، اس کے دل میں بے قراری ہو اور اس کو کچھ تکلیف ہو۔

''ولا يبسط له فرش ولا غطاء ولا يدخل عليه أحد ليستأنس'' (معین الحکام ۱۹۶)۔

''ثم صفه الحبس أن يكون فى موضع ليس فيه فراش ولا وطاؤ لا يخلى أحد يدخل عليه ليستأنس به'' (تبیین الحقائق ۵/۹۵) ''وصفته أن يكون بموضع ليس به فراش ولا وطاء لينضجر'' (الدر المختار مع رد المحتار ۴/۳۴۹، نیز دیکھئے: ہندیہ ۳/۴۱۹)۔

اس لئے قید کے مقصد کے پیش نظر نہیں ایسی غیر ضروری چیزوں کی اجازت نہیں ہوگی جس سے ان کی پریشانی دور ہو اور دلی تسکین حاصل ہو۔ لہذا قید خانے میں ریڈیو سننے، اخبار پڑھنے، ٹیلی فون سے اپنے احباب سے باتیں کرنے اور اس طرح کی دوسری چیزوں کی اجازت نہیں ہوگی۔

د- اخلاقی امور کے خیال سے اور فتنوں سے بچنے کے لئے مردوں اور عورتوں کے لئے اسی طرح نابالغوں کے لئے قید خانے میں علیحدہ علیحدہ حصے بنائے جائیں گے۔

''فرع فى البحر عن المحيط ويجعل للنساء سجن على حدة نفيًا للفتنة'' (الدر المختار مع الرد ۴/۳۵۰)۔

''وينبغى أن يكون للنساء محبس على حدة تحرزًا عن الفتنة وعن أبى حنيفة رحمه الله أن المرأة تحبس فى محبس النساء ولكن يحفظها الرجل'' (ہندیہ ۳/ ۴۱۴)۔

جواب:۳- قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے ایسے طریقے استعمال کئے جاسکتے ہیں جو ان کی کچھ ذہنی پریشانی کا سبب ہوں۔ لیکن ذہنی یا جسمانی طور سے ان کو شدید اذیت پہنچانا درست نہیں ہے۔

اس لئے فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ قیدیوں کو کپڑوں سے عریاں کردینا، قید میں کوڑے لگانا، شدید دھوپ میں کھڑا رکھنا، برف پر کھڑا رکھنا جائز نہیں ہے۔ اسی سے سمجھ لینا چاہئے کہ قیدیوں کو شدید مار پیٹ کرنا، الیکٹرک شاٹ لگانا، ان پر کتے چھوڑنا یا ٹارچر وغیرہ کرنا ایسی کوئی بھی شکل ہو تو شریعت میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

''ولا يجرد من ثيابه فى الحبس'' (رد المحتار ۴/۳۵۰)۔

''لا ینبغی للقاضی أن یضرب محبوسًا فی دین ولا غیرہ ولا یصفد ولا یقید ولا یغل ولا یمد ولا یجرد ولا یقیمہ فی الشمس'' (ہندیہ ۳/۴۱۴)۔

اگر مجرم کی طرف سے فرار کی شرارت پائی جارہی ہے کہ وہ بار بار قید خانے سے فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے تو ایسی صورت میں اس پر سختی کی جاسکتی ہے اور اس کو کچھ کوڑے لگائے جاسکتے ہیں۔ لیکن قیدیوں سے جرم کے اقرار کرانے کے لئے اور ان کی زبان سے سچا بیان سامنے لانے کے لئے ان کو کسی طرح کی شدید ذہنی اور جسمانی تکلیف دینا جائز نہ ہوگا۔

''وإن کان ہذا المحبوس لا یزال یہرب من السجن یؤدبہ القاضی بأسواط کذا فی الملتقط'' (ہندیۃ ۴/۴۱۶)۔

''ولا یضرب المحبوس إلا فی ثلاثۃ إذا امتنع عن کفارۃ الظہار والإنفاق علی قریبہ والقسم بین نسائہ'' (الدر المختار ۴/۳۵۰)۔

جواب:۴- اگر قیدیوں کے فرار ہونے کا اندیشہ نہیں ہے تو ان کو ہتھکڑی یا بیڑی وغیرہ پہنانا یا ان کو زنجیر سے جکڑ دینا درست نہیں ہے۔ اگر کسی قیدی کے فرار ہونے کا قاضی کو اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں اس کو ہتھکڑی یا بیڑی وغیرہ پہنائی جاسکتی ہے یا قید خانے کے دوسرے سخت حفاظت والے حصے میں اس کو منتقل کر دیا جائے گا۔

''ولا یغل ولا یقید إلا أن یخاف فرارہ'' (معین الحکام/۱۹۷)۔

''ولا یغل إلا إذا خاف فرارہ فیقید أو یحول لسجن اللصوص'' (الدر المختار ۴/ ۳۵۰)۔

''وإذا خاف القاضی علی المحبوس فی السجن أن یفر من حبسہ حولہ إلی حبس اللصوص'' (ہندیہ ۳/۴۱۴)۔

جواب:۵- فقہاء کرام کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قیدیوں کے جرائم کے اعتبار سے ان کو قید خانے کے علیحدہ علیحدہ حصوں میں رکھا جائے گا۔ چنانچہ اہل فجور یعنی اخلاقی جرائم میں مبتلا قیدیوں کے رہنے کا انتظام الگ ہوگا۔ چوری وغیرہ جیسے جرائم میں ملوث قیدیوں کے لئے علیحدہ نظم ہوگا۔ قتل کے جرائم کے ملزم قیدیوں کو الگ رکھا جائے گا۔ اس لئے اگر کسی شخص کو کسی خاص جرم کی وجہ سے قید تنہائی میں رکھنے کی ضرورت ہو تو اس کو قید تنہائی میں رکھا جاسکتا ہے۔

''ویحبس فی موضع وحش'' (معین الحکام/۱۹۷)۔

''ویجوز للحاکم عزل السجین وحبسہ منفردًا فی غرفۃ یقفل علیہ بابہا إن کان فی ذلک مصلحۃ'' (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۳۱۹)۔

جواب:۶- قید خانے میں قیدی پر محنت ومشقت کے کام کرنے کی ذمہ داری نہیں ہوگی اور نہ ایسا کام ان پر لازم ہوگا۔ اس لئے قید خانے میں قیدیوں سے جبرًا محنت ومشقت کا کام نہیں لیا جاسکتا۔ البتہ اپنی مرضی سے قیدی کوئی محنت کا کام کریں یا ان سے جبرًا ایسا کام لیا جائے تو ایسی صورت میں وہ اجرت کے مستحق ہوں گے۔

''ولا یواجر'' (معین الحکام/ ۱۹۷)۔

''اعلم أن الحبس الشرعی لیس ہو الحبس فی مکان ضیق وإنما ہو تعویق الشخص ومنعہ من التصرف بنفسہ حیث شاء'' (معین الحکام/۱۹۶)۔

''ولا یؤاجر وعن الثانی یؤجر لقضاء دینہ'' (الدر المختار ۸/۵۸)۔

جواب:۷- سوال نمبر ۵ کے جواب میں اس کی وضاحت آچکی ہے کہ جرائم کے اعتبار سے قیدیوں کے لئے قید خانے میں الگ الگ حصے ہوں گے جہاں جرائم کے اعتبار سے ان کو رکھا جائے گا۔ اس لئے قیدیوں کے ساتھ جو سلوک ہوگا وہ ان کے جرائم کے اعتبار سے ہوگا۔ لہذا وہ لوگ جن کے مقدمات ابھی زیر سماعت ہیں ان کے ساتھ ان قیدیوں والا سلوک نہیں کیا جانا چاہئے جن کی سزائے قید کا فیصلہ ہو چکا ہے۔

''صنف الفقهاء سجون الجرائم إلى ثلاثة أصناف أهل الفجور (المفاسد الخلقية) وأهل التلصص (السرقات ونحوها) وأهل الجنايات (الاعتداء على الأبدان)، وجعل أبو يوسف القاضي هذا التقسيم عنوان فصل أفرده في كتابه'' (الموسوعة الفقهيه۱۶/۳۱۹)۔

جواب:۸- جن افراد پر کسی جرم کا ابھی صرف الزام ہے۔جرم ثابت نہیں ہوا ہے۔مقدمہ کی ساعت ہورہی ہے ان کو مقدمہ کی ساعت تک تو قید کرنے کی اجازت ہے۔لیکن زیر ساعت ملزم قیدیوں کو قید میں اتنے دنوں تک رکھنا جو اس جرم کی اصل سزا ہے جائز نہیں ہے، اور یہ حاکم کی جانب سے اس پر ظلم تصور کیا جائے گا۔

''ونقل عن القاضي لامش أنه كان يحبسها في وقت قضائه لمصلحة رأى في ذلك وهو صيانتها عن الفجور'' (معین الحکام/۱۹۷)۔

جواب:۹- ملزم کو قید میں رکھا گیا لیکن بعد میں جرم ثابت نہ ہونے کی وجہ سے اس کو بری کردیا گیا تو اس کو جو ذہنی اذیت اور مالی نقصان ہوا اس نقصان کی تلافی حکومت پر ہوگی یا نہیں؟ اگر وہ اس کا مالی ہرجانہ طلب کرنا چاہے تو درست ہے یا نہیں؟

چونکہ شریعت نے کسی شخص کو تہمت کی وجہ سے قید کرنے کی اجازت دی ہے جیسا کہ احادیث میں اس کی صراحت موجود ہے جس کے حوالے اوپر آچکے ہیں۔اور قید کے زمانے میں کسب معاش یعنی تجارت وغیرہ کی اجازت نہیں ملتی ہے جس سے اس کو مالی نقصان بھی ہوتا ہے۔لیکن صرف قید ہونے کی وجہ سے وہ اس مدت کے مالی ہرجانہ کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔کیونکہ شریعت نے تہمت کی وجہ سے قید کرنے کی اجازت دی ہے اس لئے وہ اس مدت کی ذہنی اذیت اور مالی نقصان کی تلافی کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔

البتہ شریعت نے قیدیوں کو زیادہ جسمانی تکلیف پہنچانے کی گنجائش نہیں دی ہے۔اس لئے اگر مدت قید کے دوران ان کو جسمانی تکلیف دی گئی ہو اور ان پر جرم ثابت نہیں ہوسکا ہو تو وہ جسمانی تکلیف کا معاوضہ طلب کرسکتے ہیں۔

جواب:۱۰- اگر کسی شخص پر کوئی الزام عائد کیا جائے تو اس کی صفائی اسی پر لازم ہوتی ہے۔البتہ اس کو اس سلسلے میں دوسرے لوگوں سے مشورہ کرنے کا حق حاصل ہوگا۔اس لئے اصلاً اس کو اپنا مقدمہ خود سے لڑنا ہوگا۔لیکن اگر ملزم کو مقدمہ کے لئے قید خانے سے باہر نکلنے میں دشواری ہو اور یا خود وہ اپنی صفائی پیش کرنے سے عاجز ہو تو ایسی صورت میں اس کو وکیل بنانا جائز ہوگا اور اس قیدی کو جو حقوق حاصل ہیں وہ تمام حقوق اس کے وکیل کو بھی حاصل ہوں گے۔

''وإن كان الموكل محبوسًا في سجن هذا القاضي الذي وقعت الخصومة عنده لا يقبل منه التوكيل وإن كان محبوسًا في سجن الوالي وهو لا يمكنه الخروج للخصومة يقبل منه التوكيل هكذا في الظهيرية--- وإذا علم القاضي أن المؤكل عاجز عن البيان في الخصومة بنفسه يقبل منه التوكيل هكذا في فتاوى قاضي خان'' (ہندیہ ۳/۶۱۵)۔

جواب:۱۱-فقہاء کرام تحریر کرتے ہیں کہ عورت کو مردوں سے علیحدہ ایسی جگہ قید کیا جائے گا جہاں فتنہ کا کوئی اندیشہ نہ ہو، اور اس کی بھی فقہاء نے اجازت دی ہے کہ عورت کو اس کے شوہر کے ساتھ قید کیا جائے۔اس سے اس مسئلہ کا جواب بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ جب کسی ایسی عورت کو قید کی سزا دی جائے جس کے شیر خوار بچہ کو ماں کی ضرورت ہے اور قریبی رشتہ داروں میں سے اس بچے کی پرورش کرنے والا کوئی دوسرا نہ ہو تو ماں کے ساتھ اس کے بچے کو قید میں رکھا جاسکتا ہے تاکہ وہ معصوم بچہ ماں کی حضانت و پرورش سے محروم نہ رہے۔یوں بھی چھوٹے بچے کے بہت سے معاملات ایسے ہوتے ہیں جن کو ماں ہی پورا کرسکتی ہے۔اس لئے ماں کے قید ہونے کی صورت میں اس کے ساتھ اس کے بچے کو رکھنے میں بظاہر کوئی حرج نظر نہیں آتا ہے۔

''فرع في البحر عن المحيط ويجعل للنساء سجن على حدة نفيًا للفتنة'' (الدر المختار مع الرد ۴/ ۳۵۰، نیز دیکھئے: ہندیہ ۳/۴۱۸)

قیدیوں کے حقوق-شریعت کی نظر میں

مولانا رحمت اللہ ندوی [1]

تمہید

اسلام کے لازوال محاسن اور شریعت اسلامیہ کی بے مثال خوبیوں میں ایک نمایاں خوبی اور امتیازی وصف عدل وانصاف اور حسن سلوک ہے، اس کے جملہ احکام کی بنیاد اسی عدل واحسان پر ہے اور اس کی اولین تعلیمات میں بغیر کسی نقص وزیادتی اور افراط وتفریط کے ہر صاحب حق کو اس کا حق دینا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو نقش دوام بخشتے ہوئے کئی حقوق کی ادائیگی کا شمار کراتے ہوئے آخر میں بڑی تاکید کے ساتھ فرمایا ہے:

''فأعطوا کل ذی حق حقه'' (پس ہر مستحق کو اس کا حق عطا کرو)۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''سیرۃ النبی'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان پر دوسرے انسانوں بلکہ حیوانوں اور بے جان چیزوں تک کے کچھ فرائض عائد ہیں اور یہ ان کے حقوق ہیں، جنہیں ہر انسان کو اپنی استطاعت کے بقدر ادا کرنا ضروری ہے'' (سیرۃ النبی/ ۲۰۳)۔

آگے مزید لکھتے ہیں: ''اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں انسانی حقوق کی بالترتیب کوئی تفصیل نہیں ہے، انسان اور حیوان کے درمیان بھی کوئی خط فاصل نہیں کیا گیا ہے'' (ایضاص ۲۱۰)۔

یوں تو حقوق بہت سارے ہیں اور ان کی ایک طویل فہرست ہے مثلاً: اللہ کے حقوق، نبی کے حقوق، والدین کے حقوق، اولاد کے حقوق، اعزہ واقارب کے حقوق، زوجین کے حقوق، سلاطین اور رعایا کے حقوق، پڑوسیوں کے حقوق، عام مسلمانوں کے حقوق، اور غیر مسلموں کے حقوق وغیرہ (تفصیل کے لئے شیخ محمد صالح عثیمین کا کتابچہ ''حقوق دعت الیها الفطرة وقررها الشریعة'' دیکھیں)، لیکن اس وقت چونکہ زیر بحث موضوع ''قیدیوں کے حقوق'' ہے، اس لئے بحث وگفتگو کا محور صرف یہی ہوگا۔ اصل بحث میں داخل ہونے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حقوق کی وضاحت کردی جائے۔

حق کی تعریف اور تقسیم

عربی زبان میں حق مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے اور سب کا خلاصہ ثبوت اور وجوب سے کیا جاسکتا ہے، مثلاً:

"لقد حق القول علی أکثرهم فهم لا یؤمنون" (یس:۷) أی ثبت ووجب۔

"لیحق الحق ویبطل الباطل" (انفال:۸) أی یثبت ویظهر۔

جب کہ لغت میں کلمہ حق کا اطلاق مقررحصہ، ظلم کے مقابل عدل اور یقین وغیرہ کے لئے بھی ہوتا ہے، جیسے:

"والذین فی أموالهم حق معلوم" (معارج: ۲۴) اور "والله یقضی بالحق" (غافر: ۲۰) وغیرہ۔

اصطلاح میں حق دو معانی کے لئے آتا ہے:

۱- الحکم المطلق للواقع (پیش آنے والے واقعہ کا مطلق حکم)۔

---

[1] دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

اس کے تحت اقوال، عقائد، ادیان اور مذاہب سب آ گئے، کیوں کہ حق کے مقابل میں باطل ہے۔

۲- واجب ثابت: اس کی دو قسمیں ہیں، حق اللہ، حق العباد۔

فقہاء نے حق کی مختلف تعریفات کی ہیں، مثلاً: "الحق هو الحكم الثابت شرعًا" (حق شرعاً حکم ثابت کو کہتے ہیں) یا "الحق: هو مصلحة مستحقة شرعًا" (حق شرعاً وہ مفاد کہلاتا ہے جس کا استحقاق ہو)۔

لیکن سب سے بہترین اور جامع تعریف استاد مصطفی زرقاءؒ نے اپنی کتاب "المدخل الى نظرية الالتزام فى الفقه" میں کی ہے، جسے مشہور فقیہ ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے "تعریف جید" کہہ کر سراہا ہے، وہ یہ ہے: "الحق: هو اختصاص يقرر به الشرع سلطةً أو تكليفًا"

(حق: وہ اختصاص ہے جسے شریعت اپنی بالادستی سے متعین کرے یا اس کا مکلف بنائے)۔

حق سے فقہاء کی مراد

حق کے لئے فقہاء کے اطلاقات مختلف اور متعدد ہیں اگر چہ عام طور پر ان کے یہاں حق سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جس کا آدمی مستحق ہوتا ہے، لیکن مندرجہ ذیل چیزوں کے لئے بھی حق کا اطلاق ہوتا ہے:

(۱) حقوق مالیہ وغیر مالیہ۔ (۲) وہ لوازمات جو حکم کے علاوہ عقد پر مرتب ہوتے ہیں اور تنفیذ سے تعلق رکھتے ہیں۔ (۳) وہ تنخواہیں جو قضاۃ اور فقہاء وغیرہم کو بیت المال سے دی جاتی ہیں۔ (۴) عقار کے مرافق مثلاً: حق الطریق، حق المسیل، حق الشرب۔ (۵) حقوق مجردہ، وہ مباحات ہیں جیسے: حق ملک یا بائع اور مشتری کے لئے حق خیار اور شوہر کے لئے حق طلاق۔

حقوق کی قسمیں

حقوق کی تین قسمیں ہیں: (۱) حق اللہ (۲) حق انسان (۳) حق مشترک۔

حق اللہ سے مراد وہ ہے جس سے اللہ کا تقرب، اس کی تعظیم، اس کے دین کے شعائر کو قائم کرنا یا لوگوں میں سے بغیر کسی کو خاص کئے دنیا کے لئے نفع عام کی جستجو اور اس کی اہمیت اور نفع کی عمومیت کے پیش نظر اسے اللہ کی طرف منسوب کرنا مقصود ہو۔

حق انسان: وہ حق ہے جس سے مقصود فرد کی مصلحت و مفاد کا تحفظ ہو خواہ وہ حق عام ہو جیسے صحت، اولاد اور مال کا تحفظ، امن کی بحالی، جرم کا قلع قمع، زیادتی پر ردعمل، حکومت کے مرافق عامہ سے لطف اندوزی۔

یا وہ حق خاص ہو، جیسے ملکیت میں مالک کے حق کی رعایت، ثمن میں بائع اور مبیع میں مشتری کے حق کی رعایت، کسی ضائع شدہ مال کے بدلہ کا حق، مال مغصوب کی واپسی کا حق، نفقہ میں زوج پر زوجہ کا حق، اپنے بچہ کی حضانت میں ماں کا حق، اولاد کی نگہبانی میں باپ کا حق وغیرہ۔

حق مشترک: جس میں دونوں حق جمع ہو جائیں (حق اللہ بھی اور حق عبد بھی) لیکن ان میں سے کوئی ایک غالب ہو۔ اول کی مثال مطلقہ کی عدت ہے کہ اس میں نسب کو اختلاط سے بچانا حق اللہ ہے اور اپنی اولاد کے نسب کی نگہداشت حق شخص ہے، لیکن حق اللہ غالب ہے کیوں کہ صیانت انساب میں معاشرہ کا عام فائدہ ہے۔

ثانی کی مثال: ولی مقتول کے لئے حق قصاص ہے، اس میں حق اللہ قتل کے گھناؤنے جرم سے معاشرہ کی تطہیر ہے، اور حق شخص اس کے غیظ و غضب کی تسکین اور قاتل کے قتل سے اس کا تطییب خاطر ہے، لیکن حق شخص غالب ہے، کیوں کہ فرمان خداوندی "و كتبنا عليهم فيها أن النفس بالنفس" کے تحت قصاص کی بنیاد مماثلت پر ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الموسوعۃ الفقہیہ جلد ۱۸، حق کی بحث، الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۴/ ۲۸۳۸)۔

قید کا مفہوم اور اس کی مشروعیت

حبس کے لغوی معنی ہیں: منع کرنا، روکنا۔

اور اصطلاح میں کسی شخص کو بذات خود تصرف اور اپنے کام کاج کرنے اور دینی و سماجی مصروفیات کے لئے نکلنے سے روک دینا اور پابندی عائد کر دینا حبس

کہلاتا ہے۔

حبس کے لئے کوئی تیار شدہ مخصوص عمارت بنانا ضروری نہیں، بلکہ درخت سے باندھ دینا اور گھر یا مسجد میں روک لینا بھی حبس ہے، البتہ مسلم حکمرانوں نے حبس وقید کے لئے مصالح مرسلہ کے تحت مخصوص عمارتیں بھی بنوائی ہیں۔

حبس کے مفہوم میں سجن (قید خانہ، جیل) بھی آتا ہے اور اسی معنی میں اعتقال (گرفتاری) بھی ہے۔ اور حبس سے ملتے جلتے یہ الفاظ بھی ہیں:

حجر: (مالی، قولی اور عملی تصرف سے روکنا، نہ کہ اس شخص کو محبوس کرنا)۔

حصر: (افعال حج میں آگے بڑھنے سے روک دینا، خواہ یہ دشمن کی طرف سے ہو یا حبس اور مرض کی وجہ سے ہو)۔

وقف: (جمہور فقہاء کے نزدیک عین کو اللہ کی ملکیت کے حکم پر روکنا اور منفعت کو کسی بھی نیک کام کے لئے صدقہ کردینا)۔

نفی: (جلاوطنی، ملک بدر کرنا)۔

حبس کی مشروعیت

نصوص اور وقائع کی وجہ سے فقہاء کا حبس وقید کی مشروعیت پر اتفاق ہے، اگرچہ بعض حضرات سے یہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو قید نہیں کیا ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ قید تو کیا گیا لیکن قید خانہ نہیں بنایا گیا (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: معین الحکام/۱۹۶)۔

مجوزین کے دلائل

حبس کے مجوزین کا استدلال مندرجہ ذیل آیات، احادیث اور صحابہ کرام کے تعامل سے ہے۔

آیات

۱- واللاتی یأتین الفاحشة من نسائکم فاستشهدوا علیهن أربعة منکم فإن شهدوا فأمسکوهن فی البیوت (نساء: ۱۵)۔

یادر ہے اس آیت کے منسوخ ہونے نہ ہونے میں علماء کے کچھ اقوال ہیں۔

۲- أو ینفوا من الأرض۔

۳- تحبسونهما من بعد الصلاة فیقسمان بالله (مائدہ: ۱۰۶)۔

۴- وخذوهم واحصروهم (توبہ: ۵)۔

۵- حتی إذا أثخنتموهم فشدوا الوثاق (محمد: ۴)۔

محققین کے یہاں یہ آیت محکم ہے، منسوخ نہیں، اور اس میں قیدی کو قید کرنے کا حکم ہے، اور وہ درحقیقت محبوس اور مسجون ہے۔

احادیث

۱- إذا أمسك الرجل الرجل، وقتله الآخر، فیقتل الذی قتل، ویحبس الذی أمسك (بیہقی، دارقطنی بروایت عبداللہ بن عمرؓ)۔

اسی وجہ سے حضرت علیؓ نے اس طرح کے ایک واقعہ میں قاتل کو قتل کرنے اور پکڑنے والے کو تاحیات قید کرنے کا حکم دیا۔

۲- روی أن النبی صلی الله علیه وسلم حبس رجلا فی تهمة (ابوداؤد، ترمذی)۔

عبدالرزاق اور نسائی نے اپنے مصنف میں روایت کیا ہے: ''أن رسول ﷺ سجن فی المدینة فی تهمة دم''۔

۳- ''روی أن النبی ﷺ حبس أحد رجلین من غفار أتهما بسرقة بعیرین، وقال للآخر: اذهب فالتمس، فذهب وعاد بهما'' (مصنف عبدالرزاق)

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غفار کے دو آدمیوں میں سے ایک کو قید کیا جن پر دو اونٹوں کی چوری کا الزام تھا، اور دوسرے سے فرمایا: جاؤ، تلاش کرو، چنانچہ وہ گیا اور تلاش کر کے لایا)۔

اجماع:

صحابہ اور تابعین کا قید کی مشروعیت پر اجماع اور اتفاق ہے، کیوں کہ خلفاء راشدین اور ان کے بعد ابن زبیر اور دیگر خلفاء وقضاۃ نے تمام جگہوں اور زمانوں میں قید و بند کیا ہے اور اس پر کسی نے نکیر نہیں کی ہے۔

عقلی دلیل:

متہم اور ملزم کی حقیقت کا انکشاف کرنے، اور جرائم کے عادی مشہور و معروف پیشہ ور مجرمین پر زجر و توبیخ کرنے کے لئے اور عزتوں کو پامال کرنے، اور زمین میں فساد برپا کرنے کی وجہ سے عقلاً قید کی ضرورت سمجھ میں آتی ہے جبکہ جرم حد اور قصاص کا موجب نہ ہو۔

حبس کے مقاصد اور اس کی قسمیں

فقہاء کرام کے کلام سے حبس کے درمیان دو مقاصد سمجھ میں آتے ہیں:

(۱) حبس بغرض عقوبت و سزا۔ (۲) اور حبس بغرض استیثاق وطلب ثبوت۔

حبس بغرض عقوبت ان افعال و جرائم میں ہے جن میں حدود مشروع نہیں ہیں جیسے حق کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنے والے کو قید کرنا تاکہ ادائیگی کردے، جنایت کے مرتکب کو معاصی سے باز رکھنے کے لئے زجراً قید کرنا۔ واجب تصرف سے رکنے والے کو قید کرنا جس میں نیابت نہیں ہوسکتی مثلاً اس شخص کو قید کرنا جس نے اپنی زوجیت میں دو بہنوں کو رکھا پھر اسلام لے آیا، حتی کہ ان میں سے کسی ایک کو رکھے۔ اس عقوبت میں حق اللہ اور حق آدمی برابر ہے، دراصل یہ حبس تعزیر کی ایک فرع ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶ / ۲۸۶)۔

حبس کی شریعت میں دو قسمیں ہیں:

(۱) محدود (متعین میعاد)۔ (۲) غیر محدود (غیر متعین میعاد)۔

محدود مدت تک حبس کی سزا، شریعت تعزیر عادی جرائم پر دیتی ہے اور عادی مجرموں کو اس کے ذریعہ سزا دیتی ہے۔

فقہاء دیگر سزاؤں پر کوڑا مارنے کی سزا کو ترجیح دیتے ہیں جب کہ جرائم خطرناک اور بھیانک ہوں اور مجرمین خطرناک ہوں یا ایسے ہوں کہ کوڑے کے علاوہ ان کو اور کوئی سزا باز رکھنے والی نہ ہو۔

اس نوع کے قید کی مدت کم سے کم ایک یوم ہے اور حد اعلی غیر متفق علیہ ہے۔ بعض فقہاء کا خیال ہے کہ چھ ماہ سے زیادہ نہ ہو، اور بعض کی رائے ہے کہ مکمل ایک سال تک نہ پہنچے (بلکہ اس سے کم رہے)، اور بعض دیگر حضرات حد اعلی کا معاملہ قاضی اور حاکم پر چھوڑ دیتے ہیں۔

مدت حبس کو متعین کرنے والے شافعیہ ہیں اس شرط کے ساتھ کہ مکمل ایک سال تک نہ پہنچے اسلئے کہ وہ حد زنا میں تغریب پر قیاس کرتے ہیں اور تغریب ایک سال سے زیادہ نہیں ہوتا، لہذا ضروری ہے کہ حبس ایک سال سے کم رہے تاکہ غیر حد میں حد کی سزا نہ ہو جائے (ملاحظہ ہو: التشریع الجنائی الاسلامی ۱ / ۶۹۴)۔

حبس کی مدت:

مجرم اور اس کے جرم کی حالت کے اعتبار سے حبس بغرض تعزیر کی ایک ادنی مدت ہے اور ایک اعلی۔

اقل مدت:

بعض شوافع کے یہاں اقل مدت حبس نماز جمعہ کے لئے جانے سے روک دینا ہے، دیگر حضرات کہتے ہیں: اقل مدت ایک یوم ہے اور یہ مقصد بذات خود محبوس کو تصرف سے روک دینے سے بھی پورا ہوجاتا ہے تاکہ وہ اپنی حرکت سے رک جائے، اس لئے کہ بعض لوگ ایک یوم کی قید سے متاثر اور مغموم ہوجاتے ہیں۔

اکثر مدت

جمہور فقہاء (حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ) نے حبس بغرض تعزیر کے لئے کوئی اعلی حد متعین نہیں فرمائی ہے، بلکہ انہوں نے اس کا اختیار قاضی کو تفویض کردیا ہے کہ وہ مجرم کے حسب حال جو مناسب سمجھے کرے، کیوں کہ تعزیر- جس کی ایک قسم حبس ہے- کا مدار اختیار قاضی پر ہے- علامہ ابن ہمام دو یا تین ماہ اور ایک یا چار تا چھ ماہ کا اختلاف نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

''والصحيح أن التقدير مفوض إلى رأي القاضي لاختلاف أحوال الأشخاص فيه'' (فتح القدير ۶/۳۷۹)

(اشخاص کے اختلاف احوال کی وجہ سے مدت کی تعیین قاضی کی رائے پر موقوف ہے یہی صحیح ہے)

شافعیہ کے اس سلسلے میں تین اقوال ہیں:

(۱) اکثر مدت حبس چھ ماہ ہے، یہ قول زبیر کا ہے۔

(۲) ایک سال اکثر مدت ہے، یہ مذہب کا مشہور قول ہے کیوں کہ جلاوطنی کی حد بھی ایک سال ہے، اور یہ قول اس سے مشابہ ہے۔

(۳) اکثر مدت حبس کی کوئی تحدید و تعیین نہیں ہے، یہ قول امام الحرمین کا ہے، گویا انہوں نے جمہور کی موافقت کی ہے۔ اور بعض شافعیہ نے جمہور کے مذہب پر عمل کی اجازت دی ہے (ملاحظہ ہو: الموسوعة الفقهیہ ۱۶/ ۲۸۹)۔

حبس طویل اور قصیر کا فرق:

فقہاء نے حبس طویل اور قصیر میں اس طرح تمیز کی ہے کہ اگر ایک سال سے کم ہو تو وہ حبس قصیر ہے اور جو ایک سال یا اس سے زیادہ ہو وہ طویل ہے۔

حبس دوام:

قاضی کے لئے بڑے جرائم پیشہ اور وہ لوگ جو بار بار جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں انہیں ہمیشہ قید میں رکھنا جائز ہے۔ حبس دوام کی مشروعیت میں فقہاء نے چند واقعات اور نصوص سے اس کا جواز ثابت کیا ہے جیسے حضرت عثمانؓ کا ضابئ بن حارث (نامور بدمعاش چور) کو قید کرنا حتی کہ اس کی موت جیل خانہ میں ہوئی۔ یا حضرت علی کا یہ فیصلہ کہ جو شخص کسی کو پکڑے تاکہ دوسرا اسے قتل کردے تو پکڑنے والے کو موت تک قید کردیا جائے گا (ملاحظہ ہو: الموسوعة الفقهیہ ۱۶/ ۲۸۹)۔

شیخ ماوردی مؤلف ''الأحکام السلطانیہ'' لکھتے ہیں:

''عادی مجرم کو قید دوام کی سزا دی جاسکتی ہے اور اس کی مدت موت ہے (الأحکام السلطانیہ/ ۲۲۰)۔ البتہ موت تک متہم کے حبس میں اختلاف ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور اصحاب مالک کی ایک جماعت جیسے مطرف اور ابن ماجشون وغیرہما کہتے ہیں کہ حبس الی الموت جائز ہے، اسی طرح امام احمد اس شخص کے بارے میں اسی رائے کے حامل ہیں جو اپنی بدعت سے باز نہ آئے، تارک صلاۃ کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں: '' يحبس حتى يموت أو يتوب'' (قید رکھا جائے گا حتی کہ مرجائے یا توبہ کرلے) (تفسیر عثمانی: سورہ توبہ، آیت نمبر ۵ کا فائدہ)۔

جب کہ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ حبس الی الموت کی سزا نہیں دی جاسکتی ہے (مجموع فتاوی ابن تیمیہ ۳۵/ ۴۰۱)۔

مدت قید کو مبہم رکھنا:

فقہاء نے مدت حبس کو مبہم رکھنے اور اس سے محبوس کو مطلع نہ کرنے اور اس کی مدت کو توبہ وصلاح پر ختم کرنے کی اجازت دی ہے، جیسے شراب پینے والے مسلمان کو توبہ تک قید کرنا، دشمنوں کی جاسوسی کرنے والا مسلمان، مخنث اور سودی لین دین کرنے والے اور باغیوں کو اس وقت تک حبس میں رکھنا جب تک یہ توبہ نہ کرلیں وغیرہ۔

قید تنہائی

ہم پہلے ذکر کرآئے ہیں کہ قید و بند کا دارومدار قاضی اور حاکم کی صواب دید اور رائے پر ہے، وہ مناسب سمجھے تو قید کرے ورنہ بصورت دیگر کوئی دوسری سزا

دے، بلکہ اگر ظن غالب یہ ہو کہ قید کرنے سے یہ قیدی بگڑ جائے گا اور اس کی تادیب نہ ہو پائے گی تو ایسی صورت میں قید کرنا جائز نہیں ہے بلکہ کوئی دوسری سزا دینا واجب نہیں ہے۔

اسی طرح اگر قاضی کی رائے کسی مجرم کو تنہا قید کرنے کی ہو تو ایسا کرنا جائز ہے، کسی مجرم کو اس کے خصوصی جرم پر قید تنہائی کی سزا دی جاسکتی ہے:

''ویجوز للحاکم عزل السجین وحبسه منفردًا فی غرفة یقفل علیه بابها، إن کان فی ذلك مصلحة''
(الموسوعة الفقهيه ۳۱۹/۱۶)۔

(حاکم کے لئے قیدی کو عام قید خانہ سے الگ کر کے تنہا کسی کمرہ میں قید کر کے اس کا دروازہ مقفل کرنا جائز ہے، اگر اس میں کوئی مصلحت ہو)۔

قیدیوں کے ساتھ سلوک:

امام وقت کو قیدیوں کے بارے میں چار چیزوں کے درمیان اختیار ہے، کہ ضرورت، مصلحت یا وقت کے تقاضہ کے مطابق ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرلے، وہ چار امور یہ ہیں:

(۱) قتل، (۲) استرقاق، (۳) منّ (بلا معاوضہ چھوڑنا)، (۴) فدیہ (معاوضہ کے ساتھ رہا کرنا خواہ وہ فدیہ بشکل مال ہو یا قیدیوں کا تبادلہ ہو)۔

جواز قتل:

قیدی کو قتل کرنے کے جواز کی دلیل میں امام ابوبکر الجصاص تحریر فرماتے ہیں:

''اتفق فقهاء الأمصار علی جواز قتل الأسیر، لا نعلم بینهم خلافًا فیه، وقد تواترت الأخبار عن النبی صلی الله علیه وسلم فی قتله الأسیر... (احکام القرآن للجصاص ۹۱۲/۲، هذا الحبیب محمد ﷺ ۲۲۹)۔

(قیدی کے جواز قتل پر فقہاء کا اتفاق ہے، اس سلسلہ میں ان کے درمیان کسی اختلاف کا ہمیں علم نہیں، اور قیدی کے قتل کے بارے میں نبی کریم ﷺ سے واقعات متواتر ہیں)۔

لیکن اگر قیدی مسلمان ہو جاتا ہے تو بالاتفاق قتل نہیں کیا جائے گا (فتح الباری ۱۸۴/۶)۔

بدر کے دن قید کرنے کے بعد عقبہ بن ابی معیط، اور نضر بن حارث کا قتل، احد کے موقع پر ابوعزہ شاعر کی گرفتاری کے بعد قتل، بنوقریظہ کا حضرت سعد بن معاذؓ کے فیصلہ پر آمادہ ہو جانے کے بعد ان کا قتل، فتح خیبر کے بعد ابن ابی الحقیق کی خیانت اور کتمان ظاہر ہونے پر قتل، فتح مکہ کے موقع پر ہلال بن اخطل، مقیس بن صبابہ، عبداللہ بن سعد بن ابی سرح اور دیگر لوگوں کے قتل کا حکم اور ان کے سلسلہ میں یہ ارشاد گرامی ''اقتلوهم وإن وجدتموهم متعلقین بأستار الکعبة'' (التفسیر المنیر ۹۰/۲۶، احکام القرآن للجصاص ۳۹۱/۳، فتح الباری ۱۹۹/۶، باب قتل الأسیر، عون المعبود: کتاب العباد، باب قتل الأسیر ۲۴۲/۷)، (ان کو اگر کعبہ کے پردے سے چمٹا ہوا پاؤ تب بھی قتل کردو)۔ یہ تمام واقعات جواز قتل کی دلیلیں ہیں۔

غلام بنانے کا جواز:

جنگ کے بعد دیگر قوموں کی طرح قیدیوں کو غلام بنانے کا جواز مندرجہ ذیل دلائل سے ہے:

۱- رسول اللہ ﷺ نے بعض ہوازن اور بنی مصطلق اور عرب کے کچھ قبائل کو غلام بنایا ہے۔

۲- حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے بنی ناجیہ (قریش کا ایک قبیلہ) کو قید کیا، اور صحابہ نے ملک ایران وروم کو فتح کیا اور انہیں قیدی بنایا۔

۳- حضرت ابن عباسؓ آیت کریمہ "ما کان لنبی أن یکون له أسری" کے بارے میں فرماتے ہیں: یہ بدر کے دن کی بات ہے جب کہ اس وقت مسلمان تھوڑے تھے، جب وہ کثرت میں آگئے اور ان کی حکومت مضبوط اور اقتدار مستحکم ہو گیا تو اللہ تعالی نے اس کے بعد قیدیوں کے سلسلہ میں یہ آیت "فإما منا بعد وإما فداءً" نازل فرمائی، اور نبی اور مومنین کو قیدیوں کے سلسلہ میں اختیار دیا کہ چاہیں تو وہ انہیں قتل کریں یا غلام بنائیں، اور چاہیں تو فدیہ لے کر چھوڑ دیں، امام وقت جنگی مصلحت کے پیش نظر جو طریقہ مناسب سمجھے اختیار کرلے (التفسیر المنیر، جلد ۲۶، مزید

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: الجہاد فی الاسلام / ۲۵۰ کا حاشیہ تفسیر انوار القرآن: ۴ / ۱۲۵ تا ۱۲۷)۔

منّ (احسان) کا جواز

قیدیوں کے ساتھ احسان اور گرفتاری کے بعد بلا معاوضہ رہائی کے دلائل حسب ذیل ہیں:

۱- حضرت ثمامہ بن اثال ؓ کی مشہور داستان جو امام بخاریؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کے حوالہ سے روایت کی ہے۔
(ملاحظہ ہو: فتح الباری ۶ / ۱۸۳، عون المعبود ۷ / ۲۴۳-۲۴۴)۔

۲- بنی عقیل کے ایک آدمی کو ثقیف کے یہاں دو صحابیوں کی گرفتاری کے بعد رہائی کے بدلہ میں آزاد کرنا ملاحظہ ہو: (التفسیر المنیر الجہاد فی الاسلام / ۲۵۴)۔

۳- روی أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فدی رجلین من المسلمین برجل من المشرکین۔ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ دو مسلمانوں کے بدلہ میں مشرکین کے ایک آدمی کو رہا کیا)۔

معلوم ہونا چاہئے کہ قیدیوں سے تبادلہ کرنا بالاتفاق احناف کے نزدیک جائز ہے۔

علامہ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں:

''اگر مسلمان کے پاس مشرکین کے قیدی ہوتے اور مشرکین کے پاس مسلمانوں کے قیدی ہوتے اور اپنے اپنے قیدیوں کے چھڑانے پر اتفاق ہو جاتا تو اس کا بندوبست کر لیا جاتا'' (فتح الباری ۶ / ۱۰۱)۔

ائمہ اربعہ اس پر متفق ہیں کہ اگر دشمن مسلمان اسیروں سے اپنے اسیروں کا تبادلہ کرنے پر راضی ہو تو تبادلہ کر لینا چاہئے (فتح القدیر ۴ / ۳۰۶)۔

خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تبادلہ اساری کا ثبوت ملتا ہے۔

۴- حضرت سعد بن معاذؓ کے فیصلہ پر بنو قریظہ کا رضامند ہونے کے بعد ان کا قتل اور زبیر بن باطا پر احسان۔

۵- فتح مکہ کے موقع پر چند مخصوص مجرمین کے قتل کا حکم اور اہل مکہ پر احسان اور ان کے اموال کو غنیمت نہیں بنانا۔

الغرض جمہور نے مسلمانوں کو قیدیوں کے ساتھ منّ، فداء بغیر المال اور فداء بالمال کی اجازت دی ہے، آیت کریمہ فإما منا بعد وإما فداء کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیران بدر سے مال کا فدیہ لیا (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: تفسیر انوار القرآن ۴ / ۱۲۵-۱۲۷)

قاضی سلیمان منصور پوریؒ اپنی کتاب ''رحمۃ للعالمین'' میں ''اسیران جنگ'' کے عنوان کے تحت پورا جائزہ پیش کرتے ہوئے اسیروں کے ساتھ اسلام کا سلوک اور قیدیوں کے ساتھ پیغمبر کا طریق عمل پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''اسلام سے پیشتر دنیا میں جتنی قومیں اور سلطنتیں تھیں، وہ اسیران جنگ کے ساتھ ایسے وحشیانہ سلوک کرتی تھیں جسے سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق عمل قیدیوں کے ساتھ صرف دو ہی طرح کا تھا:

(الف)...... فدیہ لے کر آزاد کرنا، (ب)...... بلا کسی فدیہ کے آزاد کرنا۔

الغرض جنگ بدر کے ۷۲ / قیدیوں میں سے ۷۰ / کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جرمانہ لے کر آزاد فرمایا تھا، ان قیدیوں کو مہمان کی طرح رکھا گیا تھا، بہت سے قیدیوں کے بیانات موجود ہیں جنہوں نے اقرار کیا ہے کہ اہل مدینہ بچوں سے بڑھ کر ان کی آسائش کا اہتمام کرتے تھے، صرف دو قیدی (عقبہ بن ابی معیط ونضر بن حارث) قتل کرائے گئے تھے، یہ سزا ان کے سابقہ جرائم کا نتیجہ تھی، جس نے انہیں واجب القتل ٹھہرا دیا تھا، جنگ بدر کے بعد غزوۂ بنو المصطلق میں سو سے زیادہ زن ومرد قید ہوئے تھے، وہ سب بلا کسی معاوضہ کے آزاد کردئے گئے تھے۔

حدیبیہ کے میدان میں کوہ تنعیم کے ۸۰ / حملہ آور قید ہوئے تھے، ان کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا کسی شرط و بلا کسی جرمانہ کے آزاد فرمادیا تھا۔

جنگ حنین میں چھ ہزار زن ومرد کو بلا کسی شرط وجرمانہ کے آزاد فرمادیا تھا، بعض اسیروں کی آزادی کا معاوضہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے اسیر کنندگان کو ادا کیا تھا، اور پھر اکثر اسیروں کو خلعت وانعام دے کر رخصت فرمایا تھا۔

ان جملہ نظائر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جملہ دشمنوں پر قابو اور غلبہ پالینے کے بعد کس قدر الطاف فرمایا کرتے تھے، کتب احادیث میں ایک واقعہ قیدیوں سے قیدیوں کے تبادلہ کا بھی ملتا ہے" (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: رحمۃ للعالمین ۱/ ۱۴۶-۱۴۸، زاد المعاد ۱/ ۱۶۶)۔

حراست میں رکھنے کا حکم

قیدی کو حراست میں رکھنے کا جواز حضرت جندب بن مکیث کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے جس میں یہ مذکور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دستہ حضرت عبداللہ بن غالب لیثی کی سرکردگی میں کدید مقام پر بھیجا اور بنی ملکدح پر حملہ کرنے کا حکم دیا، اس دستہ میں میں بھی تھا، جب ہم وہاں پہنچے تو حارث بن برصا لیثی ملے، ہم نے انہیں پکڑ لیا، انھوں نے کہا کہ ہم اسلام لانے کے ارادے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جارہے ہیں، ہم نے کہا: اگر تم مسلمان ہو تو ایک دن اور ایک رات ہمارا تمہیں باندھے رہنا نقصان دہ نہ ہوگا، اور اگر تم اس کے خلاف نکلے تو ہم تمہیں مضبوط باندھیں گے اور سخت گرفت میں لیں گے (عون المعبود ۷/ ۲۴۲، ۲۴۳)۔

عورتوں کو حراست میں رکھنا

جنگ میں جو عورتیں اسلامی فوج کے قبضہ میں آئیں ان کے بارے میں اسلامی قانون کا خلاصہ یہ ہے:

جب تک حکومت یہ فیصلہ نہ کرلے کہ آیا ان کو فدیہ لے کر چھوڑنا ہے یا انہیں تبادلہ میں دینا ہے یا لونڈیاں بنا کر فوج میں تقسیم کردینا ہے اس وقت تک وہ حراست میں رہیں گی، اس دوران میں کوئی سپاہی اگر ان میں سے کسی عورت کے ساتھ شہوانی تعلق قائم کرے تو یہ زنا ہے، جس کی وہی سزا اسے دی جائے گی جو اسلام میں زنا کے لئے مقرر ہے (الجہاد فی الاسلام ۲۵۴، حاشیہ ۱)۔

قیدی عورتوں کے احکام

معلوم ہونا چاہئے کہ اسیر اور سبی میں فرق ہے، اسیر کفار کے وہ جنگجو آدمی کہلاتے ہیں جنہیں مسلمان زندہ گرفتار کرنے میں کامیاب ہوجائیں، اور سبی قید شدہ عورتیں اور بچے کہلاتے ہیں۔

گرفتاری کے بعد عورتوں اور بچوں کا قتل بالاتفاق جائز نہیں ہے، خواہ ان کا تعلق اہل کتاب سے ہو یا وہ غیر اہل کتاب ہوں مثلاً دہریہ اور بت پرست قوم سے تعلق رکھتے ہوں، اگر عورتیں اور بچے جنگ میں اپنی قوم کے ساتھ رائے یا فعل سے شریک ہوتے ہیں تو دوران جنگ ان کا قتل جائز ہے اور جمہور ائمہ کے یہاں گرفتاری کے بعد بھی جائز ہے، کیوں کہ قتل اعداء کی علت مقاتلہ (مقابلہ آرائی) پائی جارہی ہے، البتہ گرفتاری کے بعد قتل میں حنفیہ کا اختلاف ہے چنانچہ وہ عورت، بچے اور (ضعیف العقل بیوقوف کے قتل کی اجازت نہیں دیتے، اس لئے کہ قید کے بعد قتل عقوبت کے طور پر ہے اور یہ اس کے اہل نہیں، دوران جنگ ان کا قتل دفع شر کے لئے مباح ہے اور قید کے بعد شر معدوم ہوگیا (ملاحظہ ہو: الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۸/ ۹۱۰)

کفار کے یہاں کسی مسلمان مرد یا عورت قیدی کے بدلہ کافر عورت کو رہا کرنا جائز ہے (فتح الباری ۶/ ۱۸۴)۔

عورتوں کے لئے علاحدہ قید خانہ

عورت کی عصمت ہر حال میں واجب الاحترام ہے اور عورت کو اپنے ناموس کی حفاظت کا پورا حق حاصل ہے، اسلام نے عورتوں کی عصمت کی حفاظت کے لئے بہت مفصل ہدایات دی ہیں اور ہر ممکن طور پر ان کی حفاظت کا تاکیدی حکم دیا ہے حتی کہ جنگ کے اندر دشمنوں کی عورتوں سے بھی اگر سابقہ پیش آجائے تو کسی مسلمان سپاہی کے لئے جائز نہیں کہ وہ ان پر ہاتھ ڈالے، بدکاری ہر حال میں حرام ہے خواہ وہ کسی قوم کی عورت سے کی جائے اور عورت اپنی عصمت کی حفاظت کا حق رکھتی ہے خواہ وہ کسی قوم کی ہو (ملاحظہ ہو: حقوق انسانی کا اسلامی منشور/ ۴۷)۔

اسی وجہ سے عورتوں کا قید خانہ مردوں سے الگ رکھا جائے گا، مولف "البحر الرائق" محیط کے حوالہ سے لکھتے ہیں: ويجعل للنساء سجن على حدة نفيًا لوقوع الفتنة (البحر الرائق ۶/ ۲۸۳) (عورتوں کے لئے فتنہ کے وقوع کی نفی کرتے ہوئے علاحدہ جیل بنایا جائے گا)۔

فقہاء نے بالاتفاق یہ صراحت فرمائی ہے کہ عورتوں کے لئے علاحدہ قید خانہ ہو، ان کے ساتھ مرد نہ ہوں، کیوں کہ ان کے لئے پردہ ہے اور فتنہ سے احتراز

ضروری ہے، اور یہ اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب کہ ان کا جیل خانہ الگ ہو۔

بہتر تو یہی ہے کہ ان کا افسر اور نگراں انھی جیسی عورتیں ہوں، لیکن اگر دشواری کی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہو تو بصورت دیگر عورتوں کے قید خانہ کی نگرانی کی خدمت پر کسی ایسے آدمی کو مامور کیا جاسکتا ہے جو صلاح وتقوی میں معروف اور معمر ہو تا کہ وہ محفوظ رہ سکیں، یہی امام ابوحنیفہؒ سے مروی ہے۔

اگر عورتوں کے لئے الگ سے قید خانہ تیار نہ ہو تو عورت کو کسی امانت دار عورت کے پاس جہاں مرد نہ ہوں قید کیا جائے گا، یا ایسی عورت کے پاس قید کیا جائے گا جہاں امانت دار آدمی ہو جیسے شوہر یا باپ یا بیٹا جو خیر وصلاح میں معروف ہو (ملاحظہ ہو: الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۳۱۷)۔

موقوفین اور محکومین کا قید خانہ

اسی طرح موقوفین (مشکوک اور متہم لوگ) اور محکومین (جن پر بینہ قائم ہونے کے بعد قاضی کے فیصلہ سے وجوب حق ہو چکا ہو) کا قید خانہ علاحدہ ہوگا۔ معاملات کے قضایا میں حبس، جرائم میں حبس سے الگ ہوگا، کیوں کہ فقہاء نے محبوس فی المعاملات جیسے دین، اور محبوس فی الجرائم جیسے چوری اور ابدان پر اعتداء کے مابین فرق کیا ہے۔

خنثی مشکل

اسی طرح خنثی مشکل کو نہ مردوں کے ساتھ رکھا جائے گا اور نہ عورتوں کے ساتھ بلکہ اسے تنہا قید کیا جائے گا یا کسی محرم کے پاس مقید رکھا جائے گا، اس لئے کہ اسے نہ مردوں کے ساتھ قید کرنا مناسب ہے اور نہ عورتوں کے ساتھ۔

عقوبات (سزائیں)

قید کی عقوبت میں شریعت کا موقف

دیگر عقوبات کی طرح حبس (قید) میں بھی یہ شرط ہے کہ ایسی سزا دی جائے جو مجرم کی اصلاح وتادیب کرنے والی ہو، اگر یہ ظن غالب ہو کہ قید مجرم کی اصلاح اور تادیب کے لئے مناسب نہیں، اس سے وہ اپنی حرکتوں سے ہرگز باز نہ آئے گا بلکہ اور بگڑ جائے گا تو ایسی صورت میں کوئی دوسری سزا دینا واجب ہے۔

قید کی عقوبت میں شریعت کا موقف وضعی قوانین سے بڑا واضح اور مختلف ہے، وضعی قوانین میں قید ہی اول یا بنیادی سزا ہے، جو تقریباً تمام جرائم میں دی جاتی ہے، خواہ جرم سنگین ہو یا ہلکا اور معمولی ہو، جب کہ شریعت اسلامی میں یہ ثانوی درجہ کی سزا ہے، اس لئے معمولی جرائم میں یہ سزا نہیں دی جاتی بلکہ قاضی کو اختیار ہے، وہ مناسب سمجھے تو دے ورنہ ترک کردے، لیکن یہ سزا اسی وقت دے گا جب کہ اس کے مفید ہونے کا ظن غالب ہو۔ وضعی اور شرعی قوانین میں اسی فرق کا نتیجہ ہے کہ ان ممالک میں قیدیوں کی تعداد بڑی حد تک کم ہے جہاں اسلامی شریعت کی تطبیق ہے، اور ان ممالک میں قیدیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جہاں وضعی قوانین کا رواج ہے (ملاحظہ ہو: التشریع الجنائی الاسلامی ۱/ ۶۹۴، ۶۹۵)۔

ناجائز سزائیں

یاد رہے کہ سزا تادیب، اصلاح ودرستگی اور بقاو قیام کے لئے مشروع ہے نہ کہ اہانت اور ہلاکت اور آدمیت کے مفہوم کی حقارت کے لئے، اسی وجہ سے فقہاء نے قرآن وحدیث کی روشنی میں یہ صراحت کی ہے کہ قیدی یا غیر قیدی کو مندرجہ ذیل سزائیں نہیں دی جاسکتی ہیں، یہ سزائیں دینا حرام ہے:

الف- مثلہ کرنا

مثلہ کرنا یعنی ناک یا کان یا ہونٹ یا انگلیاں کاٹنا یا کسی بھی عضو کی اہانت اور نقصان کی غرض سے قطع وبرید کرنا اور ہڈی توڑنا، یا ایسی سزائیں دینا جو کسی صحابی سے ثابت نہ ہوں، جائز نہیں، کیوں کہ ضرورت تادیب کی ہے اور تادیب کسی عضو کو تلف کردینے سے نہیں ہوسکتی۔ بدر کے قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمرو بڑا فصیح اللسان تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف زہریلی تقریر کرتا تھا جب اس کے دانت توڑنے کی بات کہی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار فرمایا (پورا واقعہ الجہاد فی الاسلام (صفحہ ۲۵۰) پر ملاحظہ کیا جائے)۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کا مثلہ کرنے سے منع کرتے ہوئے امراء سرایا (فوجوں کے سپہ سالاروں) کو یہ ہدایت دی ہے: "لا تمثلوا" (مسلم)۔

ب- جسم کے نازک حصوں پر مارنا

حاکم کے لئے ایسی تادیب بھی جائز نہیں جس میں اہانت اور عضو کو خطرہ ہو، جیسے چہرہ یا جسم کے دیگر نازک مقامات پر مارنا، یا قیدیوں کے گردنوں میں زنجیر ڈالنا، یا مارتے وقت قیدی کو زمین پر دراز کرنا اور لٹا دینا، خواہ یہ ضرب حدًا ہو یا تعزیرًا۔ احادیث میں عورتوں اور غلاموں کے چہروں پر مارنے سے بطور خاص ممانعت فرمائی گئی ہے، اور اعضاء انسانی میں چہرہ تو مشرف ہے پھر اس پر مارنا کیسے جائز ہوسکتا ہے؟

ج- آگ وغیرہ کی سزا

جسم یا اس کے کسی حصہ کو جلانا، تکلیف اور اذیت پہنچانے کے مقصد سے حرام ہے، الا یہ کہ سزا میں مماثلت ہو تو بیشتر فقہاء کے یہاں جائز ہے۔ اسی طرح قیدی کا گلا گھونٹنا، نچوڑنا اور پانی میں ڈبونا حرام ہے۔

حدیث ''لا تعذبوا بعذاب اللہ'' اور ''إن النار لا یعذب بھا إلا اللہ'' (فتح الباری ۶ / ۱۸۰) کی وجہ سے قیدی کو آگ میں جلانے کی سزا دینا جائز نہیں، ہاں قتل کئے جانے کا جواز ہے، البتہ اگر مشرک نے کسی مسلمان کو جلایا ہے تو قصاص میں اسی طرح کی سزا دی جاسکتی ہے جیسا کہ عُکل وعُرینہ والی مشہور حدیث سے معلوم ہوتا ہے (ایضا / ۱۸۵)۔

د- بھوک یا ٹھنڈا اور گرم وغیرہ کی سزا

قیدی کو ایسی جگہ قید کرنا جائز نہیں جہاں اسے کھانے پینے سے روک دیا جائے، کیونکہ بھوک کی سزا غیر اخلاقی کے ساتھ غیر انسانی بھی ہے، اور کھانا پینا یہ ہر انسان بلکہ حیوان کی بنیادی ضرورت ہے، قرآن میں قیدیوں کو کھانا کھلانے کے تعلق سے آیا ہے: "ویطعمون الطعام علی حبه مسکینًا ویتیمًا وأسیرًا" (الدھر: ۹)۔

حضرت عمران بن حصینؓ کی ایک طویل حدیث میں ایک قیدی کا واقعہ آیا کہ بنی عامر کے ایک آدمی کو صحابہ کرام نے گرفتار کرلیا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس سے گزرے تو اس نے گرفتاری کی وجہ پوچھی، آپ اس کا جواب دیکر آگے بڑھے تو قیدی نے آپ کو پکارا، جب آپ آئے تو اس نے کہا: میں بھوکا ہوں، مجھے کھانا کھلایئے، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں یہ تمہاری ضرورت ہے اسے پوری کی جائے گی (اس حدیث کے لئے دیکھئے التفسیر المنیر ۲۶ / ۹۱-۹۲)

اسی طرح مسلم شریف کی حدیث میں اس عورت کا واقعہ جس نے ایک بلی کو باندھ کر بھوکا پیاسا رکھا تو عذاب کی مستحق ٹھہری۔ اور متفق علیہ حدیث میں اس آدمی کا واقعہ جس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلا دیا تو اس کی مغفرت ہوگئی اور وہ جنت کا مستحق ہوگیا۔

خود صحابہ کرام کا قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک اور اچھا برتاؤ اس بات کی دلیل ہے کہ قیدی کو بھوکا پیاسا نہیں رکھا جاسکتا۔ مولف ''الجہاد فی الاسلام'' اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم سبایا اور قیدیوں کے بارے میں ہمیشہ حسن سلوک کی نصیحت فرماتے تھے، جنگ بدر میں جب وہ لوگ پکڑے ہوئے آئے جنہوں نے ۱۳ / برس تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور مسلمانوں کو تکلیفیں دے کر جلاوطنی پر مجبور کیا تھا تو آپ نے صحابہ کو تاکید فرمائی کہ ان کے ساتھ فیاضی کا برتاؤ کریں، اس حکم کی تعمیل صحابہ نے اس طرح کی کہ ان کو اپنے سے اچھا کھانا کھلایا اور اپنے سے زیادہ آرام دیا، بعض صحابہؓ خود کھجوریں کھاتے تھے اور قیدیوں کو روٹی سالن کھلاتے تھے (الجہاد فی الاسلام / ۲۴۹-۲۵۰)۔

مسلم شریف کی روایت میں ہے:

''کفی بالمرء إثما أن یحبس عمن یملک قوته'' (آدمی کے گنہگار ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں کی خوراک روک لے)۔

اسی طرح قیدی کو کسی گرم جگہ یا دھوپ میں یا کسی سرد جگہ یا کسی گھر میں روشن دان اور کھڑکیاں بند کرکے یا اس میں دھواں کرکے یا سردی میں لباس اتار کر سزا دینا بھی جائز نہیں۔

''ولیس للطالب أن یقیم الملزوم فی الشمس أو علی الثلج أو فی موضع یضر به'' (معین الحکام / ۱۹۹)۔

(طالب کو یہ حق نہیں کہ ملزوم کو دھوپ یا برف یا کسی مضرت رساں جگہ میں ٹھہرائے)۔

یہی حکم قیدی کی جائے رہائش میں تیز روشنی یا تیز آواز کا انتظام کرنے یا اسے مسلسل جگنے پر مجبور کرنے کا ہے۔

اگر ان صورتوں میں قیدی مرجاتا ہے تو قید کرنے والے پر دیت ہوگی، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قصاص ہوگا (ملاحظہ ہو: الموسوعۃ الفقہیہ جلد ۱۶)۔

ھ- ننگا کرنا

لباس سے عاری اور برہنہ کرنے کی سزا دینا حرام ہے، کیوں کہ ستر عورت فرض ہے اور کشف حرام ہے، ایک صحابی کی ران کھلی ہوئی تھی تو آپ ﷺ نے چھپانے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: کیا تمہیں پتہ نہیں کہ ران ستر میں داخل ہے۔ ایک عورت کو مرگی کا دورہ پڑا کرتا تھا، جب اس نے حضور ﷺ سے دعا کی درخواست کی تو آپ ﷺ نے صبر کی تلقین کی اور جنت کا وعدہ کیا، لیکن جب اس نے یہ کہا کہ میں اس حالت میں بے پردہ ہوجاتی ہوں، دعا کردیجئے کہ میں بے پردہ نہ ہوا کروں تو آپ ﷺ نے دعا فرمائی۔

ستر عورت شریعت سے قطع نظر، ایک فطری ضرورت اور انسان کا طبعی تقاضا ہے، اسی لئے حضرت آدم علیہ السلام سے جب جنت کا لباس چھینا گیا تو انہیں ستر عورت کی فوراً فکر ہوئی اور درخت کے پتوں سے اپنا جسم ڈھانپنے لگے۔

قیدی کے پاس اگر ستر عورت کے لئے لباس اور ضرورت کے کپڑے نہ ہوں تو فراہم کئے جائیں گے نہ کہ اس کے جسم کا لباس اتارا جائے گا۔

اسیران بدر میں حضور اکرم ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ بھی تھے، انہیں لباس کی ضرورت تھی، آپ ﷺ نے مہیا کیا حتی کہ عبداللہ بن ابی (رئیس المنافقین) کا کرتا جو ان کے جسم پر فٹ آتا تھا اسے لیکر پہنایا اور خود اپنا کرتا عبداللہ کو دے دیا تاکہ کسی منافق کا احسان نہ رہے (ملاحظہ ہو: فتح الباری ۶/۱۷۴، باب الکسوۃ للاساری)۔

"قیدیوں کے پاس کپڑے نہ رہے تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے پاس سے ان کو کپڑے پہنائے حالانکہ وہ وقت مسلمانوں پر بے انتہا تنگی کا تھا" (الجہاد فی الاسلام/۲۵۰)۔

و- مذہبی امور سے روکنا

قیدی کو وضو اور نماز کی سہولت دینا مناسب ہے، اور ان دونوں سے ممانعت کی سزا دینا جائز نہیں، اور نہ ایسی جگہ قید رکھنا جائز ہے جہاں یہ سہولت میسر نہ ہو (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/۳۱۹)۔

اسی طرح دیگر مذہبی امور مثلاً عبادت کرنا، مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرنا، قیدیوں کے درمیان حضرت یوسفؑ کی سنت کے مطابق دعوت دین اور قیدی کا جس مذہب پر عقیدہ ہو اس کی مقدس شخصیتوں اور کتابوں وغیرہ کی بے احترامی سے گریز وغیرہ کا حکم ہے،

"ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدوًا بغير علم" اور تورات کے بارے میں حضور ﷺ کے ارشاد گرامی "لا تصدق ولا تكذب" کی وجہ سے۔ البتہ مذہبی تعلیمات کے مطابق غذا فراہم کرنا ناچیز راقم السطور کے نزدیک ضروری نہیں، لیکن ناپاک اور مضر غذا دینا جائز نہیں ہے، اگر قیدی کے مذہب میں کوئی غذا حرام ہے تو اسے بھی نہیں دیا جائے گا۔

ز- سب وشتم

امام وقت اور حاکم وغیرہ کے لئے قیدی کو لعن طعن کرنا اور فحش گالی دینا یا ماں باپ وغیرہ کی گالی سے نوازنا اور اس کے ذریعہ تادیب کرنا جائز نہیں، لیکن اے ظالم! اے ستمگر! وغیرہ مہذب گالی کے ذریعہ تادیب جائز ہے۔

دیگر ناجائز سزائیں

قیدی کو اذیت دینے کے لئے دھوپ میں کھڑا کرنا، اس کے سر پر گرم تیل ڈالنا، اس کی داڑھی نوچنا یا مونڈنا، اس پر جانور چھوڑنا مثلاً درندہ، بچھو، سانپ اور کتا وغیرہ، الکٹرک شاٹ لگانا یا جسم کے کسی حصہ کو داغنا حرام ہے، کیوں کہ اس میں اہانت ہے تادیب نہیں، اور قید کا بنیادی مقصد تادیب ہے نہ کہ اہانت، پھر اس میں

عضو کے تلف یا ناکارہ اور معطل ہونے کا قوی اندیشہ ہے، اور یہ موجب دیت اور بعض کے نزدیک موجب قصاص ہے، حضرت امام مالکؒ سے گرم تیل اور گبریلے کیڑے کے ذریعہ قیدی کو سزا دینے کی بابت پوچھا گیا تو فرمایا: یہ جائز نہیں، بلکہ کوڑا یا قید خانہ ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: از الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۳۲۸)۔

حضرت ہشامؓ بن حکیم بن حزام کا ملک شام میں کچھ نبطی لوگوں کے پاس سے گزر ہوا جو دھوپ میں کھڑے کئے گئے تھے اور ان کے سروں پر گرم تیل ڈالے گئے تھے، حضرت ہشام کے پوچھنے پر انہیں بتایا گیا کہ یہ سزا ان کو خراج ادا نہ کرنے پر دی جارہی ہے تو یہ حدیث ''إن اللہ یعذب الذین معذبون الناس في الدنیا'' سنائی، جب قاصد نے یہ حدیث اپنے امیر کو سنائی تو اس نے انہیں آزاد اور رہا کرنے کا حکم دیا (مسلم، ابوداؤد، نسائی)

انہی ہشام سے روایت ہے: ''أن النبی ﷺ مرّ علیہ حمار قد وسم في وجهه. فقال: لعن اللہ من وسمه'' (رواہ مسلم)۔

(نبی کریم ﷺ کے پاس سے ایک گدھا گزارا گیا جس کا چہرہ داغ دیا گیا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے اسے داغا ہے اس پر اللہ کی لعنت ہو)۔

قیدی کے علاج ومعالجہ کا حکم

اگر قیدی قید خانہ میں بیمار ہو جائے اور علاج وہاں ممکن ہو تو اسے باہر نہیں نکالا جائیگا، اور نہ اس کے علاج ومعالجہ اور خدمت کے لئے ڈاکٹر اور خادم کو اس کے پاس جانے سے روکا جائے گا کیوں کہ روکنے کی صورت میں اس کی ہلاکت کا اندیشہ ہے جو جائز نہیں۔

اگر قید خانہ میں علاج ممکن نہ ہو اور نگہداشت ٹھیک سے نہ ہوسکتی ہو تو قید خانہ سے نکالا جائے یا نہ نکالا جائے؟ اس سلسلہ میں فقہاء کے کئی اقوال ہیں:

۱- جان کی حفاظت کے لئے علاج ومعالجہ کی غرض سے قید خانہ سے نکالا جائے گا، یہ بعض حنفیہ مثلاً خصاف، ابن ہمام کا قول اور شافعیہ ومالکیہ کا ظاہر کلام ہے۔

۲- بغیر کفیل کے نہیں نکالا جائے گا، حنفیہ کے یہاں مفتی بہ قول یہی ہے۔

۳- قید خانہ میں ہی علاج کیا جائے گا باہر نہیں نکالا جائے گا، قید خانہ میں یا باہر ہلاکت برابر ہے، یہی امام ابو یوسف سے مروی ہے۔

البحر الرائق میں ہے: ''... لا یخرج للمعالجة لامکانها في السجن'' (البحر الرائق ۲۸۳۱۶)

(قید خانہ میں علاج ممکن ہے اس لئے باہر نہیں نکالا جائے گا)۔

زمانہ قدیم ہی سے مسلمانوں نے قید خانوں میں مریضوں کی نگہداشت کا خیال رکھا ہے، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے تو اپنے گورنروں کو قید خانوں پر نظر رکھنے اور مریضوں کی نگہداشت کرنے کی ہدایت جاری کی تھی۔

خلیفہ مقتدر کے زمانہ میں ہر دن بعض اطباء قید خانہ میں مریضوں کے پاس جانے، ان کو دوائیاں اور مشروبات پہنچانے، ان کی نگرانی کرنے اور بیماریوں کو دور کرنے کے لئے مخصوص ومتعین تھے (ملاحظہ ہو: الموسوعۃ الفقہیہ ۶/ ۳۱۹-۳۲۰)۔

جنسی ضرورت

قیدی کو اپنی بیوی سے مجامعت پر قابو دینے کے سلسلہ میں فقہاء کے تین اقوال ہیں:

۱- اگر قید خانہ میں خلوت وتنہائی کی کوئی جگہ ہو تو قیدی کو اپنی بیوی سے وطی کرنے سے نہیں روکا جائے گا، یہ حنابلہ کا مذہب ہے، اکثر حنفیہ کا ظاہر مذہب اور بعض شافعیہ کا بھی یہی مذہب ہے، ان کا استدلال اس سے ہے کہ جب پیٹ کی خواہش پوری کرنا ممنوع نہیں تو اس شہوت کا بھی یہی حکم ہوگا۔

۲- جنسی تعلق قائم کرنے سے روکا جائے گا، کیوں کہ قید کا مقصد تنگی اور بے چینی پیدا کرنا ہے نہ کہ لذت اندوزی اور عیش کوشی کا موقع فراہم کرنا، یہ مالکیہ کا مذہب اور بعض حنفیہ اور شوافع کا قول ہے، امام ابو حنیفہؒ سے بھی یہی مروی ہے کہ جماع سے منع کیا جائے گا (ملاحظہ ہو: معین الحکام/ ۱۹۸)۔

۳- قیدی کا اپنی بیوی سے وطی اس کے مشروع حقوق میں سے ہے لہذا منع نہیں کیا جائے گا الا یہ کہ قاضی روکنے میں مصلحت سمجھتا ہو، تو محروم کر دیا جائے گا، جس طرح دوستوں کے ساتھ گفتگو سے منع کر دینا، قید خانہ کے دروازہ پر قفل وغیرہ لگانا قاضی کی رائے پر موقوف ہے، یہ بعض شافعیہ کا قول ہے۔

البحر الرائق میں ہے: ''ولا یمنع من الجماع إن احتاج إلیه فتدخل امرأته أو جاریته علیه إن کان فیه موضع

سترة'' (البحر الرائق ۶/۲۸۳)۔

(جماع سے نہیں روکا جائے گا، اگر اس کو اس کی ضرورت ہو تو اس کی بیوی یا اس کی باندی اس کے پاس جائے گی اگر وہاں پردہ کی جگہ ہو)۔

کفایہ مع فتح القدیر میں ہے: ''ولو احتاج إلى الجماع دخلت عليه زوجته أو جاريته فيطؤهما حيث لا يطلع عليه أحد لأنه غير ممنوع عن قضاء شهوة البطن فكذا شهوة الفرج. وقيل: الوطء ليس من أصول الحوائج فيجوز أن يمنع بخلاف الطعام'' (كفاية مع فتح القدير ۶/۲۷۶)۔

(اگر اسے جماع کی ضرورت ہو تو اس کی بیوی یا اس کی باندی اس کے پاس جائے گی تو وہ ان سے ایسی جگہ تعلق قائم کرے گا جہاں کوئی واقف نہ ہو پائے، اس لئے کہ پیٹ کی خواہش ممنوع نہیں ہے تو یہی شرمگاہ کی شہوت کا بھی حکم ہوگا، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وطی چونکہ حوائج اصلیہ میں سے نہیں ہے لہذا منع کرنا جائز ہے برخلاف کھانا کے)۔

قیدی سے کام لینا اور اس کی اجرت

اسلام نے کام پر قدرت کے باوجود سوال کرنے اور مانگنے کو حرام قرار دیا ہے، اس لئے کہ اسلام دوسروں کے حساب اور کام کاج اور کدوکاوش پر طفیلی بن کر زندگی گزارنے کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔

علماء نفس نے ثابت کیا ہے کہ ہر انسان کے پاس محدود طاقت ہے اسی کے دائرہ میں رہ کر وہ اپنے کاموں کو بحسن وخوبی انجام دے سکتا ہے جن کا وہ مکلف ہے، اگر مسلسل کام اور لگاتار کوشش کرے گا تو تھک جائے گا، طاقت فنا ہو جائے گی، اعصاب جواب دے دیں گے، تفکیر کا زمام اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا، اور وہ غلطیاں بہت کرنے لگے گا۔

اسی طرح وہ اگر اپنی صلاحیتوں اور طاقتوں سے کام نہ لے تو وہ منجمد اور بے کار ہو جائیں گی، شیخ محمد الغزالیؒ لکھتے ہیں:

''زندگی کوئی منجمد مادہ نہیں ہے، خوش حالی اور رونق ایسی اضافی چیزیں ہیں جن سے زندگی اپنے سفر میں مستغنی نہیں ہو سکتی، جس طرح اونٹ مہارت رکھنے والے حدی خواں کے نغمہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا'' (حقوق الانسان/۲۵۷)۔

قیدی سے کام لیا جائے یا نہ لیا جائے؟ البحر الرائق میں ہے: ''واختلفوا في منعه من الكسب والأصح المنع. كذا في الخلاصة'' (البحر الرائق ۶/۲۸۳) (قیدی کو کام سے روکنے میں فقہاء کا اختلاف ہے، صحیح یہ ہے کہ روک دیا جائے، خلاصۃ الفتاوی میں یہی مذکور ہے)۔

''معین الحکام'' میں ہے: ''هل يمنع من الكسب؟ اختلف الشيوخ فيه. والأصح أنه يمنع'' (معین الحکام ۱۹۸۱)

(مشائخ کا اس میں اختلاف ہے کہ کسب سے روکا جائے یا نہیں؟ صحیح یہی ہے کہ روکا جائے گا)۔ اگر قیدی کو کام کرنے کی اجازت اور کسب کی آزادی دی جاتی ہے تو وہ قید خانہ کو اپنی دوکان سمجھے گا اور قید کا مقصد فوت ہو جائے گا، اور اگر اس سے کام نہ لیا جائے تو وہ بے کار اور معطل پڑا رہے گا۔

قیدی کو قید خانہ میں کام میں مشغول رکھنے کے بارے میں فقہاء کے تین اقوال ہیں:

۱- کام سے نہیں روکا جائے گا بلکہ اس کا موقع دیا جائے گا، بسبب نفقہ واجبہ اور ادائے دین وغیرہ، یہ شافعیہ اور حنابلہ وغیرہم کا قول ہے اور بعض حنفیہ کا فتوی بھی اسی پر ہے۔

۲- کام سے روکا جائے گا، تا کہ وہ قید کو معمولی نہ سمجھے اور اس کا دل تشویش اور پریشانی میں رہے، ورنہ قید خانہ اس کے لئے دوکان کی طرح ہو جائے گا، یہی حنفی مذہب کا معتمد قول ہے، اور دیگر فقہاء کا بھی یہی قول ہے۔

۳- حاکم کے اجتہاد اور اس کی رائے پر معاملہ چھوڑ دیا جائے گا۔ یہی مرتضی نے کہا ہے۔ یہ رائے عام وخاص مصلحت کے پیش نظر زیادہ فٹ اور مناسب ہے (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۳۲۰)۔

اگر قیدی سے کام لیا جائے تو اس کا خیال ضرور رہے کہ قیدی کے معیار کے مطابق کام ہو اور حد سے زیادہ کام نہ لیا جائے کہ وہ تھکن سے چور چور ہو جائے یا

اس کی صحت متاثر ہوجائے، اور وہ کام تذلیل وتوہین کے ارادہ سے بھی نہ لیا جائے۔

قیدی کے کام پر اجرت دی جائے یا نہیں؟ اس کی کوئی وضاحت ناچیز کی نظر سے کہیں نہیں گزری، ضابطہ کے اعتبار سے ملنی چاہئے، کیوں کہ وہ اجیر ہے اور اجیر اجرت کا مستحق ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ وہ اسیر بھی ہے جو وہاں نوکری کرنے نہیں آیا ہے بلکہ سزا کاٹنے کے لئے آیا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ حاکم کی رائے اور قید خانہ کے اصول وضوابط اور قیدی کے حالات اور زمانہ کے دستور اور ماحول پر چھوڑ دیا جائے۔

سچی بات اگلوانے کے لئے مار پیٹ اور دھمکی

سچی بات اگلوانے اور اقرار کرانے کے لئے قیدی کو مارنے پیٹنے کا جواز ہے۔ ایک طویل حدیث میں حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ جنگ بدر کے لئے جاتے ہوئے صحابہ کرامؓ قریش کے اونٹوں کے پاس سے گزرے، وہاں ایک کالا کلوٹا غلام ملا، اسے پکڑ کر ابوسفیان کے بارے میں پوچھا، جب اس نے لاعلمی ظاہر کی اور بتانے سے انکار کیا تو صحابہ نے اسے مارا، جب مارتے تو کہتا مجھے چھوڑ دو بتا رہا ہوں، جب چھوڑ دیتے تو پھر لاعلمی ظاہر کرنے لگتا۔ صحابہ کرام اسے پکڑ کر حضور کے پاس لائے، آپؐ اس وقت نماز پڑھ رہے تھے اور ان کی باتیں سن رہے تھے، جب آپؐ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: جب یہ سچ کہتا ہے تو تم اسے مارتے ہو اور جب جھوٹ بولتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو (عون المعبود، جلد ۷، کتاب الجہاد، باب فی الأسیر ینال منہ ویضرب)۔

اس حدیث سے کافر قیدی کو اقرار کرانے کے لئے مارنے کا جواز معلوم ہوتا ہے بشرطیکہ اسے مارنے میں کوئی فائدہ ہو۔ حدیث: ''لی الواجد یحل عرضہ وعقوبتہ'' سے بھی قیدی کو سخت بات کہنا اور سزا دینا جائز معلوم ہوتا ہے (الموسوعۃ الفقہیہ ۶/ ۲۸۵)۔

ملزم اور متہم کو دھمکی دینے کا جواز حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کی حدیث میں مذکور واقعہ سے معلوم ہوتا ہے

(ملاحظہ ہو: فتح الباری ۶/ ۱۷۳، باب الجاسوس ۷/ ۶۴۹، باب غزوۃ الفتح ۸/ ۸۰۷، باب لاتتخذوا عدوی)۔

''قاضی شریح تہمت اور بناء شک کا اعتبار کرتے تھے، کچھ لوگوں کے خلاف الزام لگایا گیا، قاضی شریح نے انہیں دھمکانا شروع کیا، ان لوگوں نے کہا کہ محض تہمت اور شک کی صورت میں بھی گرفت فرماتے ہیں؟ قاضی شریح نے جواب دیا:

''إذا ذهب كبد الجزور فمن يسأل عنه إلا الجاذر''

(اگر مذبوح بکرے کی کلیجی غائب ہوجائے تو قصاب کے علاوہ کس سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا) (اسلامی عدالت/ ۴۱)۔

اگر کسی واجب کے ترک پر ضرب ہے تو مقدار متعین نہیں ہے، بلکہ ایک دن مارا جائیگا، اگر وہ اس واجب کو کرلے تو ٹھیک ہے ورنہ دوسرے دن بھی مارا جائے گا۔ علامہ ابن تیمیہ امتحان بالضرب کے سلسلہ میں تین اقوال لکھتے ہیں:

۱- قاضی اور والی مارے گا، اشہب قاضی مصر کہتے ہیں: ''يمتحن بالسجن والأدب. ويضرب بالسوط مجردًا'' (قید وبند اور تادیب کے ذریعہ آزمائش کی جائے گی، اور ننگا کرکے کوڑے سے مارا جائے گا)۔

۲- مارا نہیں جائے گا بلکہ قید کیا جائے گا۔

۳- صرف والی مارے گا، قاضی نہیں۔

حبس اور ضرب کی حالت میں اگر اقرار کرے تو اس اقرار کو قبول کرنے نہ کرنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے کہا: اگر صدق ظاہر ہو تو ماخوذ ہوگا۔ اور بعض کہتے ہیں: ضرب کے بعد آخری اقرار ضروری ہے، اگر اقرار سے رجوع کرلے تو ماخوذ نہ ہوگا (مجموع فتاوی ابن تیمیہ ۳۵/ ۴۰۰-۴۰۱)۔

زنجیروں وغیرہ میں جکڑنا

قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑنے، انہیں ہتھکڑی پہنانے اور انہیں بیڑی ڈالنے کا جواز ہے، حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے:

''عجب الله من قوم يدخلون الجنة في السلاسل'' (فتح الباری ۶/ ۱۷۵، عون المعبود ۲۲۲/۷)۔

اس حدیث کے مفاہیم ومطالب سے قطع نظر اس سے قید اور پابند زنجیر کئے جانے کا جواز معلوم ہوتا ہے، لیکن ظاہر ہے ہر مجرم کے لئے اور ہر طرح کے جرم

میں اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے، جس طرح سزائے قید ہر جرم میں مجرم کو نہیں دی جاسکتی ہے۔

قید بسبب تہمت

قید بسبب تہمت کی مشروعیت پر استدلال آیت کریمہ "تحبسونھما من بعد الصلاۃ" سے کیا گیا ہے، اور اس حدیث سے جس میں مذکور ہے کہ حضور ﷺ نے ایک غفاری شخص کو دو اونٹ کی چوری کی تہمت میں قید کیا پھر چھوڑ دیا، ابوداؤد اور ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ تہمت کی وجہ سے آپ ﷺ نے ایک آدمی کو قید کیا۔ حبس بسبب تہمت کا جواز اور مشروعیت جمہور فقہاء کے نزدیک ہے اور انہوں نے اسے سیاست عادلہ میں شمار کیا ہے، بشرطیکہ تہمت کی تائید کسی قوی قرینہ سے ہو جائے یا متہم پر شک کی علامات ظاہر ہو جائیں یا وہ فجور میں معروف ہو (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۲۹۲)۔

متہم کی قسمیں

علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاوی میں متہم کی تین قسمیں لکھی ہیں:

۱- نیک آدمی ہوگا، اور اس پر جو تہمت لگائی گئی ہے اس کا اہل نہ ہوگا۔

۲- تہمت کا مستحق اور فاجر لوگوں میں ہوگا۔

۳- مجہول الحال ہوگا، اور حاکم کو اس کی حالت کا علم نہ ہوگا۔

اگر نیک ہے تو بالاتفاق اسے سزا دینا جائز نہیں، متہم کو سزا دینے میں اختلاف ہے، اگر کسی عادل شخص کے ہاتھ میں مال مسروق موجود ہو اور وہ کہتا ہو کہ میں نے اسے بازار سے خریدا ہے، مجھے بیچنے والے کا علم نہیں، تو اس پر بالاتفاق سزا نہیں ہے۔

دوسری قسم کے متہم کو بالاتفاق قید کیا جائے گا، اور اگر متہم مجہول الحال ہو تو انکشاف حال کے لئے عام علماء اسلام کے نزدیک اسے قید کیا جائے گا، اور اکثر ائمہ کے یہاں صراحت ہے کہ اسے قاضی اور والی قید کرے گا۔ استدلال حضرت بہز بن حکیم کی روایت "أن النبی ﷺ حبس فی تھمۃ" (ابوداؤد) اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت "أن النبی ﷺ حبس فی تھمۃ یومًا ولیلۃً" سے ہے، اور ائمہ کے درمیان یہ متفق علیہ اصول ہے کہ جب مدعی، مدعا علیہ کے حاضر کئے جانے کا مطالبہ کرے جس کا حاضر کیا جانا ضروری ہو تو حاکم پر فیصلہ کی مجلس میں اسے حاضر کرنا واجب ہے تاکہ وہ ان دونوں کے درمیان فیصلہ کر سکے۔ اس صورت میں مطلوب محبوس ہے اور جس وقت طلب کیا گیا ہے اس وقت سے لے کر فیصلہ تک روک دیا گیا ہے، اور یہ حبس کسی تہمت کے بغیر ہے تو تہمت میں حبس بدرجہ اولی ہوگا (مجموع فتاوی ابن تیمیہ ۳۵/ ۳۹۶)۔

البتہ تہمت میں مقدار حبس کے اندر اختلاف ہے کہ اس کی کوئی حد متعین ہے یا اس کا مدار امام کے اجتہاد پر ہے، ابو عبداللہ زبیری کا کہنا ہے کہ ایک ماہ ہے جب کہ ماوردی کا اختیار کردہ قول ہے کہ غیر متعین ہے (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: الاحکام السلطانیہ/ ۲۲۰)۔

متہم کو ضرب اور دھمکی

متہم کو ترک واجب یا فعل حرام پر مارنے کی اصل صحیح میں مذکور حدیث ہے جو حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے، اس میں بیان ہوا ہے کہ حضور ﷺ نے اہل خیبر سے سونے چاندی پر مصالحت کی، حیی بن اخطب کے چچا زید بن سعید سے پوچھا کہ حیی بن اخطب کا خزانہ کہاں ہے؟ جب وہ بتانے سے کترایا تو آپ نے حضرت زبیرؓ کو اسے پکڑنے کا حکم دیا، حضرت زبیرؓ نے پکڑ کر کچھ سزا دی تب جا کر اصل بات ظاہر کی۔

دھمکی دینے کا جواز اس حدیث میں ہے جس میں حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کا ایک عورت کے ذریعہ حضور کے کچھ راز لکھ کر اہل مکہ کے پاس بھیجنے کا واقعہ ہے، اور یہ مذکور ہے کہ چند صحابہ کرامؓ نے اس عورت کو حضور کی نشاندہی کے مطابق پکڑ لیا، خط مانگنے پر جب اس نے انکار کیا تو انہوں نے ننگا کرنے کی دھمکی دی تب جا کر اس نے خط دیا (ملاحظہ ہو: فتح الباری ۶/ ۱۷۳)۔

حضرت قاضی شریح کا تہمت کی بنا پر متہم کو دھمکانے کا واقعہ پیچھے گزر چکا ہے (ملاحظہ ہو: اسلامی عدالت ۴۱)۔

قیدی خواتین اور ان کے شیر خوار بچے

قیدی خواتین کے شیر خوار بچوں کو ان کے ساتھ رکھا جائے گا، ماؤں کو انہیں اپنے ساتھ رکھنے کا حق حاصل ہے، دونوں کے درمیان تفریق جائز نہیں۔ ابوداؤد شریف کی ایک حدیث جو ''باب فی التفریق بین السبی'' کے تحت آئی ہے اس سے تفریق کی ممانعت معلوم ہوتی ہے، وہ حدیث یہ ہے:

عن میمون بن ابی شبیب عن علی أنه فرق بین جاریة وولدها فنهاه النبی ﷺ عن ذلك ورد البیع (عون المعبود ۷/۲۵۹)۔

(حضرت علیؓ نے ایک باندی اور اس کے بچے کے درمیان (بیع میں) تفریق کردی، حضور ﷺ نے انہیں اس سے منع کیا اور بیع رد کردی)۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ خطابی فرماتے ہیں:

اہل علم کا چھوٹے بچے اور اس کی ماں کے مابین تفریق کے عدم جواز میں کوئی اختلاف نہیں ہے، ہاں! اختلاف صغیر اور کبیر کی تعریف میں ہے کہ کبیر کے ساتھ تفریق ہوسکتی ہے اور صغیر کے ساتھ نہیں۔

امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا کہنا ہے، صغیر کبیر کی حد بلوغ ہے۔ امام شافعی کہتے ہیں سات یا آٹھ سال سے کم ہو تو صغیر ہے اور جب اس عمر کو پہنچ جائے تو کبیر ہے، امام اوزاعی کہتے ہیں: جب بچہ اپنی ماں سے مستغنی ہوجائے تو صغیر سے نکل گیا، کبیر ہوگیا۔

امام مالکؒ کہتے ہیں: جب باشعور ہوجائے تو کبیر ہے۔ اور امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ کسی بھی صورت میں دونوں کے درمیان تفریق نہیں ہوسکتی اگرچہ لڑکا بڑا اور بالغ ہوجائے۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دو بھائیوں کے درمیان تفریق جائز نہیں جب کہ ان میں ایک چھوٹا اور دوسرا بڑا ہو، اگر دونوں چھوٹے ہوں تو جائز ہے۔

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: عون المعبود ۷/۲۵۹-۲۶۰)۔

خلاصہ بحث

اس مختصر سے مقالہ میں متعین موضوع پر ناچیز راقم السطور جس نتیجہ اور رائے تک پہنچا ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

☆ اسلامی عقوبات میں وضعی قوانین کی طرح قید اول اور آخر سزا نہیں ہے بلکہ بعض مجرمین کو بعض جرائم میں قید کی سزا بھی دی جاسکتی ہے۔

☆ قید کی سزا دینے میں یہ خیال رہے کہ اگر یہ سزا مجرم کو جرم سے باز رکھنے میں مفید اور مناسب ہو تو قید کیا جائے گا ورنہ اسکے علاوہ کوئی دوسری سزا دی جائے گی۔

☆ قیدی کو ایسی سزائیں نہیں دی جاسکتی ہیں جن میں اس کی اصلاح وتادیب کا سامان نہ ہو بلکہ وہ وحشیانہ ہو اور اس کی صرف ذلت ورسوائی، تذلیل وتوہین، اور جسم یا اس کے کسی عضو کا نقصان ہو۔

۱- کسی ملزم کو اس کے جرم کا ثبوت فراہم ہوئے بغیر بطور احتیاط کم از کم ایک دن اور ایک رات قید کیا جاسکتا ہے، اس سے زیادہ حاکم کی صوابدید پر ہے۔

۲- قیدیوں کو مندرجہ ذیل حقوق حاصل ہوں گے:

الف- مذہبی امور، عبادت، مذہبی کتابوں کا مطالعہ، دوسرے قیدیوں کے درمیان دعوت دین، وہ جس مذہب پر عقیدہ رکھتا ہے اس مذہب کی مقدس شخصیتوں اور کتابوں وغیرہ کی بے احترامی سے گریز کیا جائے گا: البتہ مذہبی تعلیمات کے مطابق غذا فراہم کرنا اس کے حقوق میں نہیں، بلکہ صاف ستھری غذا قید خانہ کا ذمہ دار اپنی سہولت کے اعتبار سے مہیا کرے گا۔

ب- جسمانی ضروریات: مناسب غذا، صاف پانی، علاج، حفظان صحت کے لئے قید خانہ کے اندر رہتے ہوئے ورزش وتفریح کا حق حاصل ہوگا، اگر قید خانہ میں خلوت کی جگہ ہو تو بیوی سے تعلق قائم کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ لیکن از راہ مصلحت حاکم منع بھی کرسکتا ہے۔ کسی تنگ وتاریک جگہ میں قید کرنا جہاں کھڑا ہونا یا پاؤں پھیلا کر لیٹنا یا دیوار کے باہر کسی چیز کا دیکھنا ممکن نہ ہو، جائز نہیں۔

ج- عام سماجی حقوق: اخبارات پڑھنے، ریڈیو سننے اور فون پر گفتگو کی اجازت حاکم اور ذمہ دار کی رائے اور مصلحت پر موقوف ہے، البتہ اعزہ واقارب سے قید خانہ میں ملنے کا حق دیا جائے گا، لیکن زیادہ دیر تک یہ لوگ نہیں ٹھہریں گے۔ دوسرے قیدیوں سے ملاقات اگر خلاف مصلحت نہ ہو تو اجازت ہوگی، ورنہ

پابندی لگادی جائے گی، تعلیم اور ہنر سیکھنے کا مدار افسر اور حاکم کی رائے پر ہے۔

د- اخلاقی امور: مردوں اور عورتوں کے قید خانے الگ ہوں گے، اور اسی طرح بالغوں اور نابالغوں کو بھی علاحدہ رکھا جائے گا۔

۳- قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے دھمکی کی اجازت ہے لیکن اس کی کوئی حد متعین نہیں ہے، البتہ ظلم وزیادتی سے گریز کیا جائے گا، اس مقصد سے مارا بھی جاسکتا ہے۔ مندرجہ ذیل سزائیں نہیں دی جاسکتی ہیں، ناجائز ہیں۔

(الف)...... قیدیوں کو بے لباس اور ننگا کرنا۔ (ب)...... الکٹرک شاٹ لگانا۔ (ج)...... جانور، مثلاً درندہ، کتا یا سانپ اور بچھو وغیرہ چھوڑنا۔ (د)...... سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈال دینا وغیرہ۔ (ھ)...... انہیں مسلسل جگے رہنے پر مجبور کرنا اور اس کے لئے جائے رہائش پر تیز روشنی یا تیز آواز کا انتظام کرنا۔

۴- قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑا جاسکتا ہے۔ انہیں ہتھکڑی پہنائی اور بیڑی ڈالی جاسکتی ہے۔ بشرطیکہ اتنا نہ کسا جائے جو اذیت ناک ہو یا اس سے جسم پر گہرے نشانات پڑجائیں یا کھال کٹ جائے اور ہڈی ٹوٹ جائے۔

۵- کسی مجرم کو اس کے خصوصی جرم کے پس منظر میں قید تنہائی دی جاسکتی ہے۔

۶- جیل میں قیدی سے اس کے معیار کے اعتبار سے کام لیا جاسکتا ہے، یا بطور سزا کوئی کام اسے دیا جاسکتا ہے، اس کی اجرت بشرطیکہ کام بطور سزا نہ ہو، قید خانہ کے قانون، اور عرف ورواج پر موقوف ہوگی، کام لینے میں اس کا خیال رہے کہ حد سے زیادہ اس پر بار نہ ڈالا جائے، اگر قیدی لکھنا پڑھنا جانتا ہے تو اس سے تعلیم دینے کا کام بھی لیا جاسکتا ہے۔

۷- جن قیدیوں کا مقدمہ زیر سماعت ہے اور جن کے بارے میں سزائے قید کا فیصلہ ہو چکا ہے، ان دونوں کے قید خانے علاحدہ ہوں گے، اور سلوک کے اعتبار سے دونوں میں فرق کیا جائے گا۔

۸- زیر سماعت قیدیوں کو فیصلے سے پہلے اتنے دنوں تک قید میں نہیں رکھا جاسکتا ہے جو ان کے اوپر عائد فرد جرم کی اصل سزا ہے۔

۹- اگر ملزم کو قید کیا گیا ہو اور بعد کی عدالت نے اسے بری قرار دیا تو وہ زمانہ قید میں ہونے والی ذہنی اذیت اور مالی ہرجانہ کا مطالبہ اسی صورت میں کرسکتا ہے جب کہ وہ مجہول الحال نہ ہو، لیکن اگر وہ فاجر اور بد ہے تو مطالبہ نہیں کرسکتا، کیوں کہ اچھوں کی صحبت اختیار کرنا، بروں کی صحبت سے گریز کرنا اور اپنے آپ کو تہمت سے بچانا واجب ہے۔

۱۰- قیدی کو اپنے مقدمات میں وکیل سے رابطہ، اہل تعلق سے مشورہ، اور گواہان پیش کرنے اور صفائی دینے کا حق حاصل ہوگا۔

۱۱- خواتین قیدیوں کو اپنے ساتھ شیر خوار بچوں کو جیل میں رکھنے کا حق حاصل ہوگا، ماں اور بچے میں تفریق جائز نہیں۔

ھٰذا ما عندی، واللّٰہ أعلم بالصواب۔

......☆......

قیدیوں کے حقوق اور ان کے مسائل

مولانا شاہ محمد تفضل علی جلال آبادی[1]

الحمدللہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی الہ واصحابہ اجمعین۔ امابعد!

اصل سوالات کے جوابات سے پہلے قید اور سزائے قید کے متعلق چند بنیادی باتیں بطور تمہید عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(الف) اسلامی نظام قانون میں سزاؤں میں سے بلاشبہ سزائے قید کا تصور بھی ہے جو بنیادی طور پر تعزیری سزاؤں میں سے ہے اور بطور تعزیر شرعاً جائز بھی ہے۔

لیکن چونکہ اسلام میں تعزیری سزاؤں کے نفاذ کا مقصد مجرموں کی اصلاح وتربیت ہے اور اصلاح وتربیت میں ''قید'' کی بجائے دوسری تعزیری سزائیں زیادہ مؤثر ہیں، اس لئے سزاؤں میں ''قید'' کو ثانوی حیثیت حاصل ہے یعنی اسلام میں اصل یہ ہے کہ مجرم کو دوسری تعزیری سزائیں دی جائیں، لیکن اگر کہیں ضرورت ہو اور حاکم کی رائے میں کسی خاص مجرم کے لئے اس کے حالات کے پیش نظر قید زیادہ اصلح ہو تو اس صورت میں حاکم مجرم پر قید کی سزا نافذ کرسکتا ہے مثلاً کسی پر کوئی حق ہے، اور وہ استطاعت کے باوجود اس حق کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرتا ہے، تو صاحب حق کے مطالبہ پر حاکم اس کو جیل میں ڈال سکتا ہے، تاکہ وہ حق کی ادائیگی کرے۔

اسی طرح اگر کوئی مجرم اتنا خطرناک ہے کہ قید کے علاوہ دیگر سزاؤں سے نہ اس کی اصلاح متوقع ہے، اور نہ اس کے شر سے لوگ محفوظ ہوسکتے ہیں، تو اس صورت میں اس مجرم کو حاکم قید میں ڈال سکتا ہے، ورنہ عام حالات میں حاکم کوئی نقد سزا دیکر مجرم کو فارغ کردے، اور کسی کو حتی الامکان جیل میں نہ ڈالا جائے، تاکہ مجرم کے قید کے باعث اس کا خاندان کم سے کم متاثر ہو اور ایک شخص کی سزا کی وجہ سے کئی بے گناہ لوگوں کو سزا نہ ملے، کیونکہ قید کے نتیجے میں لازمی طور پر قیدی کے زیر کفالت افراد متاثر ہوجاتے ہیں، اس کا کاروبار بند ہوجاتا ہے، زمینیں بنجر ہوجاتی ہیں، بیوی کی آبرو خطرہ میں پڑجاتی ہے۔ بچے اخلاقی طور پر بگڑ جاتے ہیں، وغیرہ، نیز جیل خانہ میں قیدیوں کے زیادہ ہونے کی وجہ سے قیدیوں کو ایک دوسرے سے جرائم کے ارتکاب میں تجربہ حاصل کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور بجائے اصلاح کے (جو سزا کا مقصد ہے) اس کے فساد میں اور اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

قال فی الهداية:

''قال (وإن رأى الامام أن يضم الى الضرب فى التعزير الحبس فعل) لأنه صلح تعزيرا وقد ورد الشرع به فى الجملة حتى جاز أن يكتفى به فجاز أن يضم اليه، ولهذا لم يشرع فى التعزير بالتهمة قبل ثبوته كما شرع فى الحد لأنه من التعزير. (هداية مع فتح القدير، ج۵/ ص ۱۱۷، وفی حاشية ابن عابدين۔ (ج/ ص ئ ء)۔

''قوله: (إذا احتيج لزيادة تأديب) وذلك بأن يرى أن أكثر الضرب فى التعزير وهو تسعة وثلاثون لايترجربها، أو هو فى شك من انزجاره بها يضم إليه الحبس. لأن الحبس صلح تعزيرا بانفراده، حتى لورأى أن لايضربه ويحبسه أياما عقوبة فعل. (وفى التشريع الجنائى ج ۱ ص ۹۵ء)۔

''أمافى الشريعة الاسلامية فعقوبة الحبس ليست إلا عقوبة ثانوية لايعاقب بها إلا على الجرائم البسيطة وهى عقوبة اختيارية للقاضى'' (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو عبارات نمبر ۱ تا ۵)

---

[1] دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی۔

(ب) اسلام کی رو سے سزائے قید کی اصل حقیقت یہ ہے کہ مجرم کی آزادی اور حریت پر قدغن لگا کر اسے ایسی جگہ رہنے کا پابند کر دینا، جہاں کوئی آرام دہ فرش یا بستر کا انتظام نہ ہو، اور خاص حالت وضرورت کے سوا وہاں سے باہر نکلنے پر پابندی ہو۔ البتہ سزائے قید چونکہ تعزیری سزا ہے، اور تعزیری سزا میں قاضی جرم کی نوعیت، مجرم کے ظروف واحوال، مقدمہ کے خصوصی حالات، زمان اور مکان وغیرہ کو پیش نظر رکھ کر کمی وزیادتی کا صوابدیدی اختیار رکھتا ہے، اس لئے مجرم کی اصلاح وتربیت، اور اس کی سرکوبی وتنبیہ کی غرض سے یا کسی متہم ومشکوک فرد سے سچ بات اگلوانے کی غرض سے اگر قاضی ضرورت محسوس کرے تو اعتدال کا پہلو مدنظر رکھتے ہوئے (تعزیر۔ عقوبت میں بغرض تکمیل سزا اور تعزیر تادیب میں بغرض ادب) بعض صورتوں میں (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے) ''قید'' کے ساتھ ساتھ قیدی کو قدرے جسمانی سزا بھی دے سکتا ہے، نیز اصلاح وتنبیہ کی غرض سے سزا کا کوئی دوسرا مناسب طریقہ بھی اپنا سکتا ہے جو مجرم کی دل شکنی اور زجر وتنبیہ پر مشتمل ہو اور مجرم کی اصلاح میں یا متہم ومشکوک فرد سے سچ بات اگلوانے میں معاون ہو، کیونکہ تعزیرات کا مقصد یہی ہے کہ مجرم کی اصلاح ہو اور وہ ارتکاب جرم سے تائب ہو جائے، یا متہم وملزم حقیقتِ حال کو ظاہر کر دے، یہ مقاصد سزائے قید کی تمام انواع واقسام میں مطلوب ہیں، چاہے وہ محدود مدت کی سزا ہو یا غیر محدود مدت کی سزا ہو۔

لیکن یہ بات ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے کہ قیدیوں کو ان کے جرائم کے اعتبار سے سزا کی تعیین اور سزا کے نفاذ دونوں میں اعتدال کا پہلو سامنے رکھا جائے یعنی قانونی طور پر مقررہ سزا دینے میں حد سے تجاوز نہ کیا جائے جس کی وجہ سے قیدی کو غیر معمولی ضرور لاحق ہو، اور نہ کوئی ایسی سزا دی جائے جو حد شرعی کو پہنچ جائے۔ (مزید تفصیل تیسرے سوال کے جواب میں ملاحظہ ہو: فی الدر المختار ج ۵/ص ۳۷۷)۔

''(صفة أن يكون بموضع ليس به فراش ولا وطاء) ليضجر فيوفي. ومفاده أنه لوجئ له به منع منه (ولا يمكن أحد أن يدخل عليه للاستئناس إلا أقاربه وجيرانه) لاحتياجه للمشاورة (الى قوله)... (ولا يقام بين يدى صاحب الحق إهانة)'' (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: البحر الرائق: ج ۵ ص ۲)۔

(ج) قرآن وحدیث کی تعلیمات سے ادنیٰ آگاہی رکھنے والے حضرات پر بھی یہ بات ہرگز مخفی نہیں کہ اسلام کا منشور حقوق صرف انسانوں کے حقوق تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ منشور حیوانات اور بے جان چیزوں کے حقوق کے تحفظ پر بھی مشتمل ہے، اور یہ کہ اسلام کا منشور حقوق اور ان حقوق وفرائض کی ادائیگی میں عدل وانصاف کے ترازو کو مضبوطی سے تھامے رکھنے کا تاکیدی حکم صرف اپنوں کے حقوق کی ادائیگی تک ہی محدود نہیں بلکہ اس معاملہ میں اپنوں اور بیگانوں، دوستوں اور دشمنوں کے درمیان کوئی فرق وامتیازی سلوک کو نہ صرف روا نہیں رکھا گیا، بلکہ بلا امتیاز دوست ودشمن، مسلم وغیر مسلم سب کے حقوق کا تحفظ اور حقوق وفرائض کی ادائیگی میں سب کے ساتھ عدل وانصاف کو برقرار رکھنے کا حکم اس منشور کا لازمی حصہ ہے۔

چنانچہ حقوق اور حقوق کی ادائیگی میں عدل وانصاف کو برقرار رکھنے کے متعلق قرآنی آیات اور احادیث رسول کا مطالعہ کرنے والا خود مشاہدہ کر سکتا ہے کہ اللہ رب العالمین نے حقوق انسان کا جو منشور قرآن کریم میں دیا اور جس کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وقتاً فوقتاً اپنے ارشاداتِ گرامی میں فرمائی، نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ''حجۃ الوداع'' کے موقع پر اپنے مشہور خطبہ میں حقوق کی جو فہرست جاری فرمائی، ان کے الفاظ اس قدر عالمگیر ہیں کہ ان کا ہر ہر لفظ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اے اسلام کے پیروکارو! تم پر بلا امتیاز تمام اہل حقوق کے جملہ حقوق کی ادائیگی واجب ہے، نیز حقوق وفرائض کی ادائیگی میں بھی بلا امتیاز دوست ودشمن عدل وانصاف کا پہلو مدِ نظر رکھنا لازم ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کریم میں حقوق کی ادائیگی اور فیصلہ کرتے وقت عدل وانصاف کو برقرار رکھنے کا تاکیدی حکم اللہ تعالیٰ ان الفاظ میں دیتے ہیں:

"إن الله يأمركم أن تؤدوا الأمٰنٰتِ إلى أهلها وإذا حكمتم بين الناس أن تحكموا بالعدل"

ترجمہ: ...... بیشک تم کو اللہ تعالیٰ اس بات کا حکم دیتے ہیں کہ اہل حقوق کو ان کے حقوق (جو تمہارے ذمہ ہیں) پہنچا دیا کرو اور (تم کو) یہ (بھی حکم دیتے ہیں) کہ جب (محکوم) لوگوں کا فیصلہ کرنے لگو تو فیصلہ کرو انصاف سے''

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''الامانات'' کے اندر حقوق اللہ سمیت تمام مخلوقات کے جن جن حقوق کی

ادائیگی انسان پر واجب ہے وہ سب آ گئے، اور اللہ تعالیٰ ان کی ادائیگی کا انہیں حکم دیتے ہیں، سو جو کوئی اس دنیا میں ان حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کریگا، آخرت میں اس کا مؤاخذہ ہوگا...... (فی تفسیر ابن کثیر۔ (ج ۲/ص ۳۳۸)

''وهذا يعم جميع الأمانات الواجبة على الإنسان، من حقوق الله، عزوجل، على عباده... ومن حقوق العباد بعضهم على بعض... فأمر الله، عزوجل، بأدائها، فمن لم يفعل ذلك فى الدنيا أخذ منه ذلك يوم القيامة. كما ثبت فى الحديث الصحيح أن رسول الله ﷺ قال: لتؤدن الحقوق إلى أهلها، حتى يقتص للشاة الجماء من القرناء''

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ العزیز اپنی شہرۂ آفاق تفسیر ''معارف القرآن'' میں آیت "وإذا حكمتم بين الناس أن تحكموا بالعدل" کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''اس جملہ میں حق تعالیٰ نے "بين الناس" فرمایا "بين المسلمين" یا بين المؤمنين نہیں فرمایا، اس میں اشارہ فرمایا کہ مقدمات کے فیصلوں میں سب انسان مساوی ہیں، مسلم ہوں یا غیر مسلم، اور دوست ہوں یا دشمن، اپنے ہم وطن، ہم رنگ، ہم زبان ہوں یا غیر، فیصلہ کرنے والوں کا فرض ہے کہ ان سب تعلقات سے الگ ہو کر جو بھی حق وانصاف کا تقاضا ہو وہ فیصلہ کریں'' (معارف القرآن: ج ۲ ص ۸)۔

نیز قرآن کریم اپنے پیروکاروں کو یہ تاکیدی حکم بھی دیتا ہے کہ عدل وانصاف کے معاملہ میں اپنے نفس اور والدین اور عزیزوں کی بھی پروانہ کرو (كونوا قوامين بالقسط شهداء لله ولو على أنفسكم أو الوالدين والأقربين) یعنی عدل وانصاف پر قائم رہو، چاہے وہ عدل وانصاف کا حکم خود تمہاری ذات، یا تمہارے والدین، اور عزیزوں اور دوستوں کے خلاف پڑے۔ سورۂ مائدہ آیت نمبر ۸ میں مزید تاکید ان الفاظ میں مذکور ہے (كونوا قوامين بالقسط شهداء لله ولا يجرمنكم شنآن قوم على ألا تعدلوا اعدلوا) یعنی کسی قوم کی عداوت ودشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل وانصاف کے خلاف کرنے لگو، ہر معاملہ میں ضرور عدل کیا کرو۔

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ العزیز ''معارف القرآن'' میں آیت "كونوا قوامين لله شهداء بالقسط ولا يجرمنكم شنآن قوم على ألا تعدلوا اعدلوا" کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''خلاصہ یہ ہے کہ سورہ نساء اور مائدہ کی دونوں آیتوں میں دو چیزوں کی طرف ہدایت ہے ایک یہ کہ خواہ معاملہ دوستوں سے ہو یا دشمنوں سے عدل وانصاف کے حکم پر قائم رہو۔ نہ کسی تعلق کی رعایت سے اس میں کمزوری آنی چاہئے اور نہ کسی دشمنی وعداوت سے، دوسری ہدایت ان دونوں آیتوں میں ایک بھی ہے کہ سچی شہادت اور حق بات کے بیان کرنے سے پہلو تہی نہ کی جائے، تاکہ فیصلہ کرنے والوں کو صحیح فیصلہ کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔''

الغرض حقوق انسانی کی اسلامی منشور نہ صرف ہر طبقوں اور ہر اقوام کے حقوق کا محافظ ہے کہ اس میں اگر ایک طرف بادشاہوں اور حکمران طبقوں کے حقوق پر مشتمل نکات موجود ہیں، طاقتور اور فاتح قوموں کے حقوق اسمیں متعین ہیں، شریف اور آزاد شہریوں کے حقوق اس میں مذکور ہیں، تو دوسری طرف اس میں رعایا اور محکوم طبقوں کے حقوق بھی واضح طور پر متعین ہیں، کمزوروں اور مفتوح اقوام کے حقوق پر مشتمل نکات بھی اس منشور کا لازمی حصہ ہیں، مجرموں اور قیدیوں کے حقوق کو بھی اس منشور میں واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، بلکہ اس منشور حقوق کے نکات کی وسعت اور خوبیاں ایسی بے نظیر ہیں کہ دنیا انکی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے، مثلاً مجرموں اور قیدیوں کے حقوق ہی کو لے لیجئے کہ حقوق انسانی کا اسلامی منشور مجرموں کو سزا دینے میں بھی اعتدال کو مدنظر رکھنے اور عدل وانصاف کے اصولوں پر کاربند رہنے کا اپنے پیروکاروں کو پابند بناتا ہے، اور قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کرتا ہے، حتیٰ کہ اسلام اپنے پیروکاروں کو اس دشمن قیدی سے بھی حسن سلوک کی تاکید کرتا ہے جو میدان جنگ میں مسلمانوں کی جان کا درپے تھا، لیکن گرفتار ہو کر مسلمانوں کے قید میں آ گیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''تم قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک اور خیر خواہی کا معاملہ کرو''

(إن رسول الله حين أقبل بالأسارى فرقهم بين أصحابه وقال استوصوا بالأسارى خير)

کیا موجودہ مہذب دنیا جو حقوق انسانی اور انسان کے بنیادی حقوق کے علمبردار ہونے کا دعویٰ کرتی ہے، ایسی نظیر پیش کرسکتی ہے؟

قال فی الأحکام فی حقوق الانسان: ص ۵۹۹ ''لقد أوصی الإسلام بالأسری خیراوأوصی رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم بأسری بدرحتی کان المسلم یقدم أفضل طعامہ وشرابہ للأسیر تنفیذا لموصیة رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم حیث قال: استوصوا بالأساری خیرا (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوں عبارات نمبر ۱۲ تا ۱۵)۔

(۱) جیسا کہ تمہیدی باتوں میں تفصیل کے ساتھ عرض کیا جاچکا ہے کہ سزائے قید بنیادی طور پر تعزیری سزاؤں میں سے ہے، لہٰذا اصل تو یہی ہے کہ بطور سزا کسی شخص کو قید کرنے کیلئے صرف اس قدر بات کافی نہیں کہ اس پر ارتکاب جرم کا محض الزام ہے، بلکہ کسی کو بطور سزا قید کرنے کیلئے شرعا ضروری ہے کہ شرعی ثبوت کے ذریعہ ارتکاب جرم کا الزام اس پر ثابت ہو، لیکن چونکہ شریعت نے قاضی کو یہ اختیار بھی دیا ہے کہ مصلحت عامہ کے خاطر اگر قاضی کسی شخص کو قید کرنے میں مصلحت سمجھے تو جرم کا ثبوت فراہم ہوئے بغیر بھی قید کرسکتا ہے، مثلاً تفتیش کی غرض سے اگر کسی کو قید کرنا قاضی کی نظر میں مناسب ہو یا وہ لوگ جو کسی جرم کے ارتکاب میں متہم یا مشہور ہوں، لیکن انکے خلاف جرم ثابت نہ ہوسکا ہو یا ایسے عادی مجرم جن پر سزائے حد ناکافی ثبوت کی وجہ سے ثابت نہ ہو، یا جو لوگ شر وفساد برپا کرنے کے سلسلہ میں معروف ہوں، مگر واردات میں شامل رہتے ہوئے قابو نہ پایا گیا ہو تو شریعت کی رو سے قاضی ایسے لوگوں کو بطور تعزیر یا تادیب قید میں ڈال سکتا ہے، اور اس وقت تک قید میں رکھ سکتا ہے کہ جب تک ان سے توبہ کا اظہار یا انکے طرز عمل میں توبہ واصلاح کی علامات ونشانیاں ظاہر نہ ہوجائیں یا مقصد حاصل نہ ہوجائے۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر بطور احتیاط یا کسی اور مصلحت کے خاطر قاضی کسی کو قید کرنا مناسب یا ضروری سمجھے تو جرم کا ثبوت فراہم ہوئے بغیر بھی قید کرسکتا ہے، اس صورت میں کسی خاص مدت کا پابند کئے بغیر حصول مقصد تک اسے قید میں رکھے، کسی خاص مدت کی تعیین پہلے سے نہ کرے کیونکہ اشخاص کے ظروف اور حالات کے فرق سے ظہور توبہ کی مدت کم وزیادہ ہوسکتی ہے، اس لئے مدت کی تعیین غیر مفید اور غیر مؤثر ہے، کیونکہ پہلے سے جج کو یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ مجرم کی اصلاح میں یا مقصد کے حصول میں کس قدر مدت درکار ہوگی، اس لئے پہلے سے مدت متعین کردینے کی صورت میں ہوسکتا ہے کہ وہ مدت کافی نہ ہو اور مجرم بدون اصلاح جیل سے باہر آجائے، اور کبھی یہ بھی ہوسکتا ہے اسکی اصلاح ہوچکی ہو لیکن وہ صرف متعین مدت پوری کرنے کے خاطر جیل میں پڑا رہے، اور یہ دونوں صورتیں عدل کے خلاف ہیں (فی سنن الترمذی: تحت باب ما جاء فی الحبس فی التھمة)۔

''حدثنا ابراھیم بن موسی الرازی أخبرنا عبدالرزاق عن معمر عن بھز بن حکیم عن أبیہ عن جدہ أن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم حبس رجلا فی تھمة ثم خلی عنہ'' (رقم الحدیث ۱۴۱۷ وفی تحفة الأحوذی ج۴/ ص ۵۲)۔

''قولہ: (حبس رجلا فی تھمة) أی فی أداء شھادة بأن کذب فیھا أو ادعی علیہ رجل ذنبا أو دینا فحبسہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لیعلم صدق الدعوی بالبینة ثم لما لم یقم البینة خلی عنہ (ثم خلی عنہ) أی ترکہ عن الحبس بأن أخرجہ منہ والمعنی خلی سبیلہ عنہ یدل علی أن الحبس من أحکام الشرع. کذا فی المرقاة وقال فی اللمعات: فیہ أن حبس المدعی علیہ مشروع قبل أن تقام البنة انتھی.'' (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: وفی حاشیة رد المحتار ج۳/ ص ۶۶. وفی منحة الخالق: ج۵/ ص ۲۲۱. وفی التشریع الجنائی: ج۱ ص ۲۹۷. وفی البحر الرائق شرح کنز الدقائق: ج۵/ ص ۴۲)۔

(۲) تمہیدی باتوں میں یہ تفصیل آچکی ہے کہ اسلام کی رو سے سزائے قید کی اصل حقیقت صرف اس قدر ہے کہ ملزم یا مجرم کی آزادی اور حریت پر قدغن لگا کر اسے مقررہ جگہ پر رہنے کا پابند کردینا اور خاص حالت وضرورت کے سوا وہاں سے باہر نکلنے پر پابندی ہونا، لہٰذا حق آزادی پر قدغن کے سوا قیدیوں کو باقی تمام بنیادی حقوق حاصل ہوں گے جو حوائج اصلیہ اور زندگی کی بنیادی ضروریات میں سے ہیں اور قید خانہ میں بہم پہنچانا ممکن ہے مثلاً، انہیں مناسب خوراک، موسم کے مطابق لباس، جیل کی صفائی اور روشنی وغیرہ مہیا کی جائیں، نماز باجماعت کی ادائیگی سمیت دیگر فرائض وواجبات اور سنن مؤکدہ جو جیل خانہ میں رہ کر ادا کی جاسکتی ہے ان کی ادائیگی کے واسطے انہیں سہولت دی جائے، غسل و طہارت کے واسطے جیل خانہ کے اندر مناسب سہولت دی جائے، ان کے واسطے اسلامی اور اخلاقی تعلیم کا بندوبست کیا جائے ان کے رشتہ داروں کو ان سے ملاقات کا موقع فراہم کیا جائے ایک ہی جگہ اتنے قیدی نہ رکھے جائیں جس کی وجہ سے قیدیوں کے بنیادی حقوق پامال ہو،

جو فرائض وواجبات جیل میں رہ کر ادا کرنا ممکن نہ ہوں انکی ادائیگی کیلئے خاص حالت وضرورت کے علاوہ باہر جانے کا حق انہیں حاصل نہ ہوگا مثلاً فرض حج کی ادائیگی کیلئے انہیں جانے کی اجازت نہ ہوگی، نماز عید یا نماز جمعہ کیلئے بھی باہر جانے کی اجازت نہ ہوگی۔ (فی الطبقات الکبری لابن سعد ج۵ /ص ۳۵۶)۔

''أخبرنا محمد بن عمر قال: حدثنا موسى بن عبيدة قال:كتب عمر بن عبدالعزيز أن ينظر فى أمر السجون ويستوثق من أهل الذعارات، وكتب لهم برزق الصيف والشتاء. قال موسى: فرأيتهم يرزقون عندنا شهرا بشهر ويكسبون كسوة فى الشتاء وكسوة فى الصيف. (وفى فقه السنة ج ۳/ ص ۳۶۶)۔

''وينبغي أن يكون الحبس واسعا. وأن ينفق على من فى السجن من بيت المال وأن يعطى كل واحد كفايته من الطعام واللباس. ومنع المساجين مما يحتاجون اليه من الغذاء والكساء والمسكن الصحيح جور يعاقب الله عليه. فعن ابن عمر رضى الله عنه أن النبى صلى الله عليه وسلم قال: ''عذبت امرأة فى هرة سجنتهاحتى ماتت فدخلت فيها النار. لاهى أطعمتها وسقتها، إذحبستها، ولاهى تركتهاتأكل من خشاش الارض'' (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: وفى الموسوعة الفقهية الكويتية: ـ ۲۲، ج۲۲/ ص۱۳۲وفى المحيط الربانى: ج۱۳ ص ۱۹ كتاب القضاء فى الفصل الحبس، وفى العناية شرح الهداية ج ۱۰/۲۴۳، وفى بدائع الصنائع فى ترتيب الشرائع ج۶/ص ۶۱۴)۔

(الف)......اوپر ذکر کردہ تفصیل کے مطابق قیدیوں کو یہ تمام حقوق حاصل ہونگے، یعنی انہیں عبادت کرنے، مذہبی کتابیں پڑھنے اور دوسرے کو دین کی دعوت دینے کا حق ہوگا، قیدی کو اسکی مذہبی تعلیمات کے مطابق غذا فراہم کی جائیگی، نیز وہ جس مذہب پر عقیدہ رکھتا ہے اس مذہب کی مقدس شخصیتوں، کتابوں اور شعائر کی بے حرمتی سے گریز کرنا لازم ہوگا، اسلام اپنے پیروکاروں کو اس بارے میں یہاں تک تاکید کرتا ہے کہ دین کی تبلیغ یا مناظرہ کی ضرورت کے وقت جب کسی حقیقت کو اجاگر کرنا ہو تو اس وقت بھی تبلیغ کے جوش میں کوئی ایسا رویہ اختیار نہ کریں جس سے غیر مسلموں کے پیشواؤں اور شعائر کے سب وشتم تک نوبت پہنچ جائے، کیوں کہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا ہے (وفى التحرير والتنوير ج ۸/ ص ۷۵)۔

''وربما استطاع المبطل بوقاحته وفحشه مالايستطيعه المحقّ، فيلوح للنّاس أنّه تغلّب على المحقّ.على آن سبّ آلهتهم لمّا كان يحمى غيظهم ويزيد تصلّبهم قدعاد منافيًا لمراد الله من الدّعوة. فقد قال لرسوله عليه الصّلاة والسّلام ''وجادلهم بالّتى هى أحسن'' وقال لموسى وهارون عليهما السّلام ''فقولا له قولا ليّنًا''. فصار السب عائقًا من المقصود من البعثة. فتمحّض هذا السبّ للمفسدة ولم يكن مشوبًا بمصلحة.

مقام المجادلة ولكنّ السبّ أن نباشرهم فى غيرمقام المناظرة بذلك. ونظير هذا ماقاله علماؤنا فيما يصدر من أهل الذّمة من سبّ الله تعالى أو سبّ النّبئ بأنهم إن صدر منهم ماهو من أصول كفرهم فلايعد سبًّا وإن تجاوزوا ذلك عدّ سبًّا،ويعبّر عنها الفقهاء بقولهم: ''ما به كفر وغير مابه كفر'' (وفى الموسوعة الفقهية الكويتية ج۱۷/ ص ۲۵۲۵)

(ب) جیل میں رہکر جو جسمانی ضروریات پوری ہوسکتی ہیں ان تمام حقوق کا بھی قیدی حقدار ہیں لہٰذا انہیں حفظان صحت کے مطابق مناسب غذا، لباس، پینے کے واسطے صاف پانی اور بیمار ہونے کی صورت میں علاج ومعالجہ کی سہولت مہیا کی جائیگی یعنی بیمار ہونے کی صورت میں جیل ہی میں ان کا علاج ومعالجہ کیا جائے اور اگر کسی قیدی کو ایسا مرض لاحق ہو کہ جیل میں اس کا علاج نہ ہوسکے اور جیل سے باہر جانا ناگزیر ہو تو ایسی صورت میں قیدی کو پولیس کی تحویل میں بقدر ضرورت جیل سے باہر لے جایا جائیگا، نیز حفظان صحت کیلئے ضروری ورزش بطور علاج ہوتی ہے کیونکہ مریض کی صحت کیلئے یہ دواؤں سے زیادہ مؤثر ہے، شادی شدہ قیدی کو وقتاً فوقتاً میاں بیوی کے فرائض انجام دینے کا مناسب موقع فراہم کیا جائے گا۔ قیدیوں کو کسی ایسی تنگ جگہ میں رکھنا جہاں آدمی کیلئے کھڑا ہونا، پاؤں پھیلا کر لیٹنا ممکن نہ ہو شرعاً جائز نہیں ہے کیونکہ یہ اسکے بنیادی حقوق کے منافی ہے (وفى البحرالرائق شرح كنز الدقائق ج/ص ۲۸۳)۔

''وإن مرض مرضا أضناه فان وجد من يخدمه لايخرج، وإلا أخرج بكفيل وإلا لا يطلقه وحضرة الخصم ليست شرطا ولايخرج للمعالجة لإمكانها فى السجن ولا يمنع من الجماع إن إحتاج اليه فتدخل امرأته أو جاريته عليه إن كان فيه موضع سترة، واختلفوا فى منعه من الكسب، والأصح المنع كذا فى الخلاصة'' (وفى الموسوعة الفقهية الكويتية ج۱۶/ص ۲۷۳)۔

(ج) اسلامی تعلیمات کی رو سے سزا کا بنیادی مقصد تہذیب ہے، تعذیب کا درجہ ثانوی ہے، اسلئے ازروئے شریعت قیدیوں کے حقوق میں یہ بھی داخل ہے کہ ان کے واسطے تعلیم وتربیت کا انتظام کیا جائے، انہیں کوئی مفید اور جائز ہنر سکھایا جائے، تعلیم وتربیت کی غرض سے قیدیوں کو آپس میں ایک دوسرے سے ملاقات کی اجازت دی جائے، تاکہ ان کی اصلاح بھی ہو اور ان کے اوقات ضائع ہونے سے بھی بچ جائیں۔ نیز انہیں اپنے خاندان والوں اور رشتہ داروں سے باخبر رہنے کیلئے ڈاک اور تار وغیرہ کی سہولت بھی فراہم کی جانی چاہئے۔ لیکن اخبارات پڑھنے، ریڈیو سننے یا احباب واقارب سے بات کرنے کے لئے ٹیلی فون کی سہولت فراہم کرنا بنیادی ضروریات میں داخل نہیں اس لئے شرعاً انتظامیہ یا حاکم ان چیزوں کی فراہمی کا پابند نہ ہوگا، تاہم اگر حاکم مناسب سمجھے تو شرعاً اس میں کوئی ممانعت بھی نہیں، مگر چونکہ یہ بنیادی حقوق میں سے نہیں اور حاکم پر انکا مہیا کرنا لازم بھی نہیں اس لئے اسمیں حاکم کو یہ اختیار بھی ہے کہ اگر مصلحتِ عامہ یا کسی اور انتظامی ضرورت کے خاطر ان امور پر مکمل پابندی عائد کردے تو ایسا بھی کرسکتا ہے، خصوصاً سیاسی قیدیوں کو چونکہ ملکی اور بین الاقوامی حالات سے واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے انکے واسطے مذکور باتوں کی سہولت مناسب ہے۔

(د) مردوں اور عورتوں کو علیحدہ علیحدہ قید خانوں میں رکھا جائیگا یا کم از کم قید خانہ میں خواتین قیدیوں کے رہنے سہنے کا اسطرح علیحدہ انتظام کیا جائے کہ کسی مرحلہ میں بھی مرد قیدیوں سے یا جیل خانہ کے مرد محافظین وعملہ سے اختلاط یا بے پردگی کی نوبت نہ آئے۔ فی الدر المختار۔ (ج۵/ص ۳۷۹)

''ويجعل للنساء سجن على حدة نفيا للفتنة'' (وفى البحر الرائق: ج۶/ ص۳۷۹، وفى المحيط، ويجعل للنساء سجن على حدة نفيا لوقوع الفتنة، (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے وفى المبسوط للسرخسى: ج۲۰/ ص۹۰، وفى الموسوعة الفقهية الكويتية ج۱۶/ص ۵۷۷۵)۔

نیز بالغ اور نابالغوں کو بھی الگ الگ رکھا جائے گا۔ لیکن نابالغوں کو قید کرنے یا انکو سزا دینے کے بارے میں یہ اصولی بات بھی مدنظر رہے کہ شریعت کی رو سے نابالغ پر قصاص اور حدود کی سزائیں بالکل جاری نہیں ہوں گی، اور تعزیری سزاؤں میں جن میں ''قید'' بھی شامل ہے، یہ تفصیل ہے کہ نابالغ اگر کوئی ایسا جرم کرے جو عام حالات میں موجب تعزیر ہوتا ہے، تو دیکھا جائیگا کہ اس کی عمر کیا ہے؟ اگر اسکی عمر ۱۰ سال سے کم ہے تو اس صورت میں اس پر تعزیر عقوبت بھی جاری نہیں کی جائے گی، البتہ وہ تعزیر تادیب کا مستحق ہوگا۔ نیز نابالغ ''مالی ضمانات'' سے بھی مستثنی نہیں، خواہ اس کی عمر کچھ بھی ہو چنانچہ اگر نابالغ نے کسی بھی قسم کا قتل کیا خواہ قتل عمد ہو، یا کسی اور قسم کا قتل ہو اس پر دیت واجب ہوگی، مگر اس کی ادائیگی شرعی قاعدہ کے مطابق اس کی ''عاقلہ'' پر لازم ہوگی۔ اور اگر اس نے کسی کا مال ضائع کردیا، تو اسکے مال سے اس ضمان (تاوان) کی ادائیگی لازم ہوگی، اور اگر اس کی ملکیت میں فی الحال مال نہیں، تو اس کی ملکیت میں مال آنے کا انتظار کیا جائیگا (فی بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۷/ص ۶۳)۔

''وأما شرط وجوبه فالعقل فقط، فيعزر كل عاقل ارتكب جناية ليس لها حد مقدر، سواء كان حراأو عبدا، ذكرا أوأنثى، مسلماأو كافرا، بالغا أوصبيا، بعدأن يكون عاقلا، لأن هؤلاء من أهل العقوبة، إلاالصبى العاقل فإنه يعزر تأديبا لاعقوبة، لأنه من أهل التأديب، ألا ترى إلى ماروى عنه عليه الصلاة والسلام أنه قال: ''مروا صبيانكم بالصلاة، إذا بلغوا سبعا واضربوهم عليها، إذابلغواعشرا'' وذلك بطريق التأديب والتهذيب لابطريق العقوبة، لأنها تستدعى الجناية، وفعل الصبى لايوصف بكونه جناية، بخلاف المجنون والصبى الذى لايعقل، لأنهما ليسا من أهل العقوبة ولامن أهل التأديب.

(۳) متہم یا ملزم سے سچی بات اگلوانے کیلئے یا مشکوک فرد سے اصل حقیقت ظاہر کرانے کے لئے، رانے دھمکانے یا اسے زدوکوب کرنے میں شرعاً کچھ تفصیل ہے جس میں قاضی الزام کی نوعیت اور متہم کے اوصاف وشخصیت کو دیکھ کر فیصلہ کریگا۔ بعض صورتوں میں ضرب وتہدید ناجائز اور ظلم

ہے جبکہ بعض صورتوں میں کچھ شرائط کے ساتھ جائز ہے (وفی حاشیۃ ابن عابدین: ۴ ص: ۸۷)۔

"مطلب فی جواز ضرب السارق حتی یقر قال فی البحروسئل الحسن بن زیاد أیحل ضرب السارق حتی یقرقال مالم یقطع اللحم لایتبین العظم ولم یزد علی هذا اه کلام البحر وهو ضرب مثل أی مالولم یعاقب لاتظهر السرقة ففی عبارة الشارح سقط من الکاتب أومن قلمه بدلیل أنه فی شرحه علی الملتقی ذکر عبارة الحسن علی وجهها فلم یکن ماهنا تصرفا منه بسوء فهمه إذلم نعهدهذا الشارح الفاضل وصل فی البلادة إلی مازعمه من هومولع بالاعتراض علیه فافهم" (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: وفی المبسوط للسرخسی ج: ۹ ص: ۱۸۵)۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ دعویٰ خواہ حدِ محض کا ہو یا حق محض کا یا ایسے فعل کا جو دونوں پر مشتمل ہے، اس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) دعویٰ تہمت۔ (۲) دعویٰ غیر تہمت۔

اس سلسلہ میں فقہاء کرام رحمہم اللہ نے متہم کے تین درجات بیان فرمائے ہیں۔

پہلا درجہ یہ ہے کہ متہم کی اچھی شہرت اور نیک نامی مشہور و معروف ہو، وہ ایسے صالحین اور ذی وقار لوگوں میں سے ہو، جن سے اس نوعیت کا جرم صادر ہونا ظاہر حال کے اعتبار سے مشکل ہو جو دعویٰ میں مذکور ہے، اس درجہ کا حکم یہ ہے کہ قاضی ایسے لوگوں کو کوئی سزا نہیں دیگا بلکہ انہیں بری اور بے گناہ تصور کریگا، البتہ اگر قاضی مصلحت و مناسب محسوس کرے تو بوقت ضرورت متہم سے اس کی برائت پر حلفیہ بیان لے سکتا ہے، اگر وہ حلف اٹھا کر اپنی برائت کا اظہار کرلے اور مدعی بھی اسکے خلاف ارتکاب جرم کا شرعی ثبوت پیش نہ کر سکے تو قاضی متہم کو بری کردیگا، حدیث میں ہے کہ امام سے عفو میں خطا ہو جانا بہتر ہے سزا دینے میں خطا ہونے سے۔ پھر مدعی اور الزام لگانے والے کو مناسب سزا دے تاکہ آئندہ کسی بے گناہ کی عزت پر حملہ کی روک تھام ہو سکے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ متہم مجہول الحال ہو، نہ اسکی نیک نامی معلوم ہو اور نہ ہی برے اقدار کا مالک ہونا معلوم ہو تو اس صورت میں قاضی اصل حقیقت معلوم ہونے تک متہم کو قید میں رکھ سکتا ہے، نیز اگر قرائن و شواہد سے متہم سے ارتکاب جرم کا گمان غالب ہو، لیکن متہم انکار کر رہا ہو تو قاضی ڈرا دھمکا کر بلکہ حدِ اعتدال میں رہتے ہوئے کسی قدر جسمانی سزا دیکر بھی دعویٰ کی سچائی اور حقیقت معلوم کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے کیونکہ سیاسۃً قاضی کو شرعاً یہ اختیار ہے، لیکن حدِ اعتدال میں رہنا لازم ہے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ متہم فسق و فجور میں معروف ہو، اسکی بری شہرت زبان زدِ خلق ہو مثلاً چوری کرنا قتل و غارت گری کرنا، دہشت پھیلانا، چور ڈاکو وغیرہ کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا وغیرہ۔

ایسے ملزموں سے سچ اگلوانے یا اصل حقیقت معلوم کرنے کے لئے انہیں ڈرانے دھمکانے اور جسمانی تکلیف دینے یا مار پیٹ کرنے کا شرعاً قاضی کو اختیار ہے۔ لیکن اسکے واسطے درج ذیل امور کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

(ا) جسمانی تکلیف دینے یا مار پیٹ کرنے کا اختیار صرف حاکم یا قاضی ہی کو ہے، کسی اور کو نہیں (ب) سزا میں حدِ اعتدال اور شرعی حدود کو ملحوظ رکھنا لازم ہے، اس لئے ڈرانے دھمکانے کی غرض سے بھی فحش سب و شتم یا ماں بہن کی گالیاں دینا ناجائز ہے، البتہ جو سب و شتم ڈانٹ ڈپٹ کے طور پر ہوتی ہے اسکی اجازت ہے، مثلاً اے ظالم، اے بدتمیز وغیرہ۔

(ج) جسمانی سزا میں حدِ اعتدال یہ ہے کہ ظروف و احوال، جرم کی نوعیت اور مجرم کے حالات کو پیش نظر رکھ کر سزا دی جائے، نیز سزا اس قدر سخت نہ ہو کہ مجرم کی جان یا اس کا کوئی عضو تلف ہو جائے، لہذا کسی کو ایسی سزا دینا جس سے وہ خصی ہو جائے یا اسکے جنسی قوی ناکارہ ہو جائے یا اسکی بصارت چلی جائے اور وہ اندھا یا نابینا ہو جائے، یا اسکے ایک یا دونوں کانوں کی سماعت چلی جائے اور وہ بہرا ہو جائے، اس کا کوئی بھی عضو یا جوڑ ناکارہ ہو جائے، جسم کے کسی حصے کی ہڈی ٹوٹ جائے وغیرہ یہ سب امور ناجائز ہیں، اسی لئے چہرہ اور اندامہائے نہانی پر مارنا منع ہے نیز کسی ایسے نازک مقام پر مارنا بھی منع ہے جس سے آدمی کے ہلاک ہونے کا خطرہ ہے کیونکہ تعزیری سزا مجرم کی اصلاح کے لئے ہوتی ہے نہ کہ

اسے ہلاک کرنے یا اسکے کسی عضو کو تلف کرنے کے لئے۔

(د) سزا اس طرح نہ ہو جو انسانیت کی تذلیل وتوہین پر مشتمل ہو یا شرف انسانیت کے خلاف ہو۔

(ہ) سزا ایسی نہ ہو جو حیا سوز ہو یا کسی معصیت پر مبنی ہو۔

(و) سزا ایسی نہ ہو جس سے آدمی مثلہ ہو جائے اور اسکی شکل وصورت بگڑ جائے وغیرہ۔

لہٰذا کسی قیدی (خواہ مجرم یا ملزم) کا ناک کان کاٹ دینا، اس کی داڑھی مونڈ دینا، اس پر درندہ جانور چھوڑ دینا یا اسے سانپ بچھو سے کٹوانا وغیرہ یہ سب ناجائز ہیں (حاشیہ ابن عابدین ج:۸۷)۔

''قوله عن ابن العزأى فى كتابه التنبيه على مشكلات الهداية حيث قال الذى عليه جمهور الفقهاء فى المتهم بسرقة ونحوهاأن ينظر فإما أن يكون معروفا بالبرلم تجز مطالبته ولا عقوبته وهل يحلف قولان ومنهم من قال يعزر متهمه وإماأن يكون مجهول الحال فيحبس حتى يكشف أمره قيل شهراوقيل باجتهاد ولى الأمروإن كان معروفا بالفجور فقالت طائفة يضربه الوالى أو القاضى وقالت طائفة يضربه الوالى دون القاضى ومنهم من قال لايضربه وقد ثبت فى الصحيح أن النبى أمر الزبير بن العوام أن يمس بعض المعاهدين بالعذاب لما كتم اخباره بالمال الذى كان قد عاهدهم عليه وقال له أين كنز حيى بن أخطب فقال يا محمد أنفذته النفقات والحروب فقال المال كثير والمسألة أقرب وقال للزبير دونك هذا فمسه الزبير لشئ من العذاب فدلهم على المال وهوالذى يسع الناس وعليه العمل... الخ وتمامه فى المنح قوله ثم نقل أى المصنف وقوله جواز ذلك أى جواز ضرب المتهم حيث قال نقلا عن الزيلعى ومنها أى ومن السياسة ماحكى عن الفقيه أبى بكر الأعمش أن المدعى عليه إذا أنكر فلاإمام أن يعمل فيه بأكبر رأيه فإن غلب على ظنه أنه سارق وأن المسروق عنده عاقبه ويجوز ذلك كما لو رآه الإمام مع الفساق فى مجلس الشرب وكما لورآه يمشى مع السراق وبغلبة الظن أجازوا قتل النفس كما إذا دخل عليه رجل شاهرا سيفه وغلب علىَ ظنه أنه يقتله اه قوله لغلبة الفساد تمام عبارة النهر وكيف يؤتى للسارق ليلا بالبينة بل ولافى النهاراه يعنى لايتوقف تعزير المتهم وقدمنا هنالك عن ابن القيم حكاية الإجماع على ذلك وقد سمعت آنفا تصريح الزيلعى بأن هذا من السياسة وبه يعلم أن للقاضى فعل السياسة'' (مجموع فتاوى ابن تيمية ج۹/ ص ۲۸۰)۔

اس تفصیل کے بعد سوال نمبر تین کے شق وار جوابات ملاحظہ ہوں۔

(الف) قیدی خواہ متہم ہو یا مجرم، مرد ہو یا عورت اسے بالکل ننگا کر کے بے لباس کر دینا یا ستر عورت کی حد تک جو لباس شرعاً ضروری ہے وہ اس سے اتروالینا جائز نہیں، کیونکہ یہ حیا سوز اور معصیت پر مبنی ہے، ہاں سزا قائم کرتے وقت جو زائد کپڑے درد وتکلیف پہنچنے میں رکاوٹ بنتے ہوں انکو اتروانا جائز ہے مثلاً شال، کوٹ، سوئٹر یا ایسا جبہ جس میں روئی وغیرہ بھری ہوئی ہو۔

(فى حاشية ردالمختار ج ۵/ ص ۲۷۹، قوله: (ولايجرد أى من ثيابه فى الحبس. الموسوعة الفقهية الكويتية ج ۱/ ص ۵۴۸۳)۔

تحرم المعاقبة بالتّجريد من الثياب لمافى ذلك من كشف العورة.''

(ب)...... مار پیٹ یا جسمانی سزا کے بارے میں تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

(ج)...... الیکٹرک شاٹ لگانا ناجائز ہے، کیونکہ اس میں ہلاکت اور تلفِ عضو کا خطرہ ہے۔ تفصیل اوپر ملاحظہ ہو۔

(د)...... قیدیوں پر کتے چھوڑنا بھی ناجائز ہے کیونکہ کسی پر کتے چھوڑنے میں نہ صرف مثلہ ہونے اور تلفِ عضو کا خطرہ ہے، بلکہ یہ شرفِ انسانیت کے بھی خلاف ہے۔

(ہ)...... قیدیوں کو برف کی سلوں پر ڈالدینا ناجائز ہے، کیونکہ اسمیں ہلاکت یا تلفِ عضو کا خطرہ ہے جبکہ سخت ٹھنڈک کے وقت برف کی سلوں میں کسی

کوڑا لگانا تو ظلم بالائے ظلم ہے اس لئے یہ اور سخت ناجائز ہے۔

(و)...... یہ امور بھی ناجائز ہیں کیونکہ یہ بنیادی حقوق اور ضروریاتِ زندگی سے محروم کرنا ہے جسکی شریعت اجازت نہیں دیتی ہے (الموسوعة الفقهية الكويتية ج ا /ص ۵۷۸۳)۔

’’ولايجوز خنق المحبوس وعصره وغطّه فى الماء. (التّجويع والتعريض للبرد ونحوه): لايجوز الحبس فى مكان يمنع فيه المحبوس الطّعام والشّراب، أو فى مكان حارّ أو تحت الشّمس أو فى مكان بارد. أو فى بيت تسد نوافذه وفيه دخان أو يمنع من الملابس فى البرد.‘‘

قیدیوں ڈکو زنجیروں میں جکڑنا، ان کے گلے میں طوق ڈالنا درست نہیں، البتہ اگر کسی قیدی کے بھاگنے کا خوف ہو تو پھر اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی یا اس کے پاؤں میں بقدرِ ضرورت بیڑی ڈالی جاسکتی ہے اور سخت پہرے والے قید خانہ میں منتقل کیا جاسکتا ہے (وفی رد المختار ج ۵ /ص ۳۷۹)۔

’’(قوله: وإن فر) أى من الحبس. (قوله: فى العنت يذكر) أى إذا كان متعنتا لايؤدى المال. وقيل يطين عليه الباب ويترك له ثقبه يلقى له الخبز والماء وقيل: الرأى فيه للقاضى وهو ما يذكره قريبا عن البزازية. (قوله: ولا يغل) أى لا يوضع له الغل بالضم وهو طرق من حديد يوضع فى العنق جمعه أغلال كقفل وأقفال مصباح، وأما القيد فمايوضع فى الرجل.‘‘ (قوله: ولايجرد أى من ثيابه فى الحبس. (تفصیل کے لئے دیکھئے: وفی الفتاوى الهندية ج ۳/ ص ۴۱۲)۔

(۵) فقہاء کرامؒ کے کلام سے ظاہر ہے کہ عام حالات میں کسی کو قیدِ تنہائی کی سزا نہ دی جائے کیونکہ انسان معاشرتی مخلوق ہے، لیکن کسی جرم کی نوعیت یا قیدی کی خاص حالت اگر متقاضی ہو اور قاضی قیدِ تنہائی کو مصلحت سمجھے تو شرعاً اسکی بھی اجازت ہوگی (فی الموسوعة الفقهية الكويتية ج ا /ص ۵۷۷۷)۔

ويجوز للحاكم عزل السجين وحبسه منفردا فى غرفة يقفل عليه بابها إن كان فى ذلك مصلحة.

(۶) جیل میں ملزم اور مجرم سے جبری مشقت لینے، جبراً اس سے کام لینے یا اسے کسی قابل مشقت ضابطہ اور نظام کا پابند بنانے کے بارے میں اسلامی قانون جرم و سزا کا تقاضا یہ ہے کہ اگر قاضی کسی قیدی کو سزائے قید کے ساتھ ساتھ بطور سزا یا تادیب کسی مشقت یا کام کا پابند کرنے میں مصلحت سمجھے یعنی تادیب و تعذیب میں یا قیدی کے اصلاح میں اسے معاون سمجھے تو شرعاً دو شرطوں کے ساتھ قیدیوں سے جبری مشقت یا مشقت کی غرض سے کوئی کام لینے کی اجازت ہوگی۔

(۱) کام اور مشقت ایسی ہونی چاہئے کہ خود مجرم کی شخصیت اور اس کے جرم کی نوعیت کے مطابق اور مناسب ہو۔

(۲) مشقت اور کام کا مقصد قیدی کی حوصلہ شکنی اور سزا کو زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانا ہو، کمائی کا ذریعہ بنانا یا تحکم محض مقصد نہ ہو، اور نہ حکام یا جیل کا عملہ اپنا ذاتی کام لیں۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرالعزیز فرماتے ہیں:

’’قیدیوں سے بیگار اور مشقت کا کام لینا ان کی مصلحت یعنی تادیب و تعذیب کیلئے یا ان کی اصلاح کے لئے درست ہے اور کمائی کیلئے یا صرف تحکم کیلئے درست نہیں، جیسے بعض اہل عملہ جیلر کی ملاقات کے دباؤ سے اپنی بیگاریں لیتے ہیں یا خود جیلر اپنا کام لیتے ہیں‘‘۔

(مجالس الحکمۃ ص ۱۰۷، فی البحر الرائق شرح کنز الدقائق ج ۷/ص ۲۸۳)۔

’’واختلفوا فى منعه من الكسب، والأصح المنع كذا فى الخلاصة ولا يضرب المديون ولا يقيد ولا يغل ولا يجرد ولا يؤاجر ولا يقام بين يدى صاحب الحق إهانة‘‘ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: وفى حاشية ردالمحتار ج۵/ ص ۳۷۸). وفى الموسوعة الفقهية الكويتية ج ۱۶/ ص ۵۷۷۹)۔

خیال رہے کہ اس غرض سے بھی قیدیوں سے کام لینا درست نہیں کہ اسکے کھانے پینے کا معاوضہ ہو، کیونکہ جب تک ایک مجرم قید میں ہے، اس کے تمام اخراجات بیت المال سے ادا ہوں گے اسے خوراک اور لباس دیا جائے گا۔ اور ان کے علاوہ تمام ضروریات فراہم کی جائیں گی جو اس کے

زندہ رہنے کے لئے ضروری ہوں (فی الطبقات الکبری لابن سعد ج ۵/ ۳۵۶)۔

کتب عمر بن عبد العزيز أن ينظر في أمر السجون ويستوثق من أهل الذعارات، وكتب لهم برزق الصيف والشتاء! قال موسى: فرأيتهم يرزقون عندنا شهرا بشهر ويكسون كسوة في الشتاء وكسوة في الصيف!''

(۷) جن قیدیوں کا ابھی جرم ثابت نہیں ہوا ہے بلکہ ان کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے، اور جن کا جرم ثابت ہوجانے کی وجہ سے ان کے بارے میں سزائے قید کا فیصلہ ہو چکا ہے، قید خانوں میں سلوک کے اعتبار سے دونوں میں فرق ہونا چاہئے، بلکہ عام جرائم کے مرتکب قیدیوں کو عادی اور سنگین جرائم قیدیوں سے الگ رکھنا چاہئے، تاکہ وہ ان کے اثرات سے محفوظ رہیں، نیز دونوں میں سلوک کے اعتبار سے بھی فرق کرنا چاہئے، اس کے علاوہ سیاسی قیدیوں کو بھی عام قیدیوں سے الگ رکھنا چاہئے اور ان کے ساتھ سلوک میں بھی فرق مراتب کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔

''أخبرنا محمد بن عمر قال: حدثني يحيى بن سعيد مولى المهرى قال: كتب عمر بن عبدالعزيز الى أمراء الأجناد: وانظروا من في السجون ممن قام عليه الحق فلاتحبسه حتى تقيمه عليه، ومن أشكل أمره فاكتب إلي فيه، واستوثق من أهل الذعارات فإن الحبس لهم نكال، ولاتعد في العقوبة، ويعاهد مريضهم ممن لاأحدله ولامال، وإذا حبست قوما في دين فلاتجمع بينهم وبين أهل الذعارات في بيت واحد ولاحبس واحد، واجعل للنساء حبسا على حدة، وانظر من تجعل على حبسك ممن تثق به ومن لايرتشي فإن من ارتشى صنع ماأمر به.'' (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: وفی الموسوعة الفقهية ۱۵- ۲۲۳ ج ۲/ ۱۲۴)۔

(۸) قرآنی حکم: "کونوا قوامین بالقسط" کے وسیع تر مفہوم میں جہاں یہ بات شامل ہے کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے، ظالم کو ظلم سے روکا جائے، مظلوم کی حمایت کی جائے، ظالم کو ظلم سے روکنے اور مظلوم کا حق دلوانے میں ہر شخص ہر ممکن کوشش کرے۔ وہاں اسکے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت اور انصاف فراہم کرنا ہے، جب دو فریق کا کوئی مقدمہ انکے سامنے پیش ہوتو وہ فریقین کو جلد از جلد انصاف فراہم کرنے میں اپنی پوری کوشش صرف کریں۔ اس لئے حکام اور قاضی جو انصاف فراہم کرنے، مقدمہ کی تحقیق وتفتیش کرنے اور فیصلہ صادر کرنے کے ذمہ دار ہیں، ان کی ذمہ داری ہے کہ خدا اور آخرت کو سامنے رکھ کر خلق خدا کے خادم بنیں، لوگوں کو جلد از جلد ہر ممکن آسانی کے ساتھ انصاف فراہم کریں، اور ہر ایسی بات سے گریز کریں جو عدل وانصاف کی فراہمی میں رکاوٹ بنے اور بے گناہ لوگوں کو بلا وجہ جیل کی قید وبند میں رہنا پڑے یا انصاف ملنے میں تاخیر کا سبب بنے، بلکہ قرآن وحدیث کی رو سے حکام اور قاضیوں کی شرعی واخلاقی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ قانون کو خدمت خلق اور اصلاح عالم کا ذریعہ بنائیں، اپنی غفلت یا چند ٹکوں کی خاطر لوگوں کی پریشانیوں میں اضافہ اور مظلوم کو دفتر گردی اور عدالتوں کے چکر میں پھنسا کر ظلم پر ظلم کا سبب نہ بنائیں۔ نیز معاملہ کی تحقیق وتفتیش اور اس بات کی تعیین میں کہ آیا الزام درست ہے یا نہیں، مدعی علیہ پر لگائے گئے الزام کے ثبوت کیلئے مدعی کے پیش کردہ شواہد شرعی نقطہ نگاہ سے کافی ہیں یا نہیں وغیرہ ضروری امور میں جس قدر وقت کی ضرورت ہے، اس سے زائد مدت تک بلا ضرورت کسی ملزم کو قید میں نہ رکھیں کیونکہ زیر سماعت قیدیوں کے مقدمات کو بلا وجہ طول دینا اور مقدمات کی سماعت میں بلا ضرورت تاخیر کرکے ملزموں کو لمبی لمبی مدت تک جیل کے سلاخوں کے پیچھے بند رکھنا نہ صرف منشا اسلام سے مطابقت نہیں رکھتا ہے بلکہ یہ سراسر عدل وانصاف کے تقاضے کے بھی خلاف ہے۔

(۹) جب ایک شخص دوسرے شخص پر جھوٹا دعویٰ کرکے اسے پھنسادے یا اسکو جیل بھجوادے، اور حاکم پر ثابت ہوجائے کہ مدعی نے مدعی علیہ پر جھوٹا دعویٰ کیا تو چونکہ اس دعویٰ سے مدعی نے مدعا مدعا علیہ کو ایذا پہنچایا جو شرعاً معصیت ہے اور اسکی کوئی سزا شریعت میں مقدر نہیں اس لئے مدعا تعزیری سزا کا مستحق ہوگا اور قاضی اسکو تعزیری سزا دیگا سزائے قید بھی دے سکتا ہے، لیکن اس دعویٰ سے اس نے مدعی علیہ کو جو ذہنی اذیت پہنچائی یا قید کی وجہ سے اسے جو ذہنی یا جسمانی اذیت ہوئی اسکا کوئی مالی ضمان لینا یا بطور تعزیر اس سے کوئی مال لینا جائز نہیں، ہاں جھوٹے دعویٰ کے سبب ذہنی وجسمانی ایذا کے علاوہ دعویٰ کی پیروئی اور غلط دعویٰ کی جوابدہی میں مدعا علیہ کا جو مال خرچ ہوا وہ سب وصول کرسکتا ہے۔

فتاویٰ محمودیہ جلد صفحہ...... باب الدعویٰ میں ہے:

سوال (۸۰۱۵) زید نے عمر پر فوجداری کا دعویٰ کر کے بلا قصور پھنسا دیا اور ہائیکورٹ تک عمر بری رہا، مگر پیروی میں اس کے اخراجات کثیر ہوئے اور بدنامی و زیر باری و بے آبروئی اور اپنے کاروبار کا نقصان عظیم ہوا ابتدائی عدالت سے ہائی کورٹ تک مقدمہ چلا اور زید آگے بڑھتا رہا، عمر ہر عدالت سے بری ہوتا گیا۔ چونکہ عمر نہایت درجہ زیر بار اور بے آبرو ہوا اور مالی نقصان اٹھایا اور روحانی وجسمانی اذیت پائی تو اگر عمر اپنی ہتک عزت وروحانی وجسمانی اذیت اور نقصانات کا دعویٰ کسی رقم کا جو مناسب حال ہو دائر کرے تو شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟ اگر دعویٰ کر سکتا ہے تو کس قدر رقم تک دعویٰ کر سکتا ہے جو عند اللہ گناہ گار نہ ہو۔ فقط۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

غلط دعویٰ کی جوابدہی میں جس قدر خرچ ہو، وہ سب وصول کرنا درست ہے۔ جسمانی وروحانی اذیت اور بے آبروئی کا کوئی مالی ضمان نہیں۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ العبد محمود گنگوہی۔

امداد الفتاویٰ جلد سوم صفحہ ۱۲۳ سوال نمبر ۱۵ میں خرچہ عدالت وصول کرنے کے متعلق جواب دیتے ہوئے حضرت حکیم الامت تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز لکھتے ہیں:

الجواب: جب کسی کو اپنے حق کی حفاظت کیلئے بمجبوری نالش کرنا پڑے اور فریق مخالف کی طرف سے بالکل مخاصمانہ کارروائیوں کی وجہ سے بہت مصارف برداشت کرنا پڑے تو اس صورت میں خرچہ کا روپیہ بہت سے علماء کے نزدیک (ومنہم مولانا رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ) جائز ہے یا اگر کسی حساب میں منہا ہو سکے تو ان علماء کے نزدیک یہ بھی جائز ہوگا......'' ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ (حوادث اول وثانی ص ۲۰، وفی الموسوعة الفقهية الكويتية ج ۱/ص ۵۷۷۲)۔

(۱۰) قیدی کو اپنے مقدمات کے سلسلہ میں مشورہ اور تعاون کی غرض سے، کسی وکیل سے یا اپنے عزیز واقارب سے بقدر ضرورت ملاقات یا رابطہ کرنے کا شرعاً حق ہے، نیز اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا بھی شرعاً پورا پورا حق ہے لہٰذا قیدیوں کے لواحقین کو یا ان کے وکلاء کو بوقت ضرورت ان سے بقدر ضرورت ملاقات سے روکنے کی شرعاً اجازت نہیں، نیز قیدی کے وکلاء، لواحقین اور دیگر عام مسلمانوں کو قیدی کے چھڑوانے میں قانونی چارہ جوئی سے بھی نہ روکا جائے۔

فی الدر المختار: (ج ۵/ ص ۳۷۷) ''ولايمكن أحد أن يدخل عليه للاستئناس إلا أقاربه وجيرانه) لاحتياجه للمشاورة (ولايمكثون عنده طويلا) وفی المحيط البرهانی: ج ۱۲ ص ۵۰ کتاب القضاء فی الفصل الحبس والملازمة ''ولايمنع المسجون من دخول أهله وجيرانه عليه، لأنه يحتاج إلى دخولهم عليه لتشاورهم الخ''

(۱۱) جی ہاں! شریعت مقدسہ کی رو سے خواتین قیدیوں کو جیل میں اپنے ساتھ شیر خوار بچوں کو رکھنے کا پورا پورا حق ہے، بلکہ شریعت کی رو سے دونوں میں جدائی کر دینا منع اور ناجائز ہے (بدائع الصنائع ج: ۵ ص ۲۲۸)۔

''والأصل فيه ماروی عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه قال لا توله والدة عن ولدها والتفرق بينهما توليه فكان منهيا وروى أن النبى عليه الصلاة والسلام رأى امرأة والهة فى السبى فسأل عن شأنها فقيل قد بيع ولدها فأمر بالرد وقال عليه الصلاة والسلام من فرق بين والدة وولدها فرق الله بينه وبين أحبته يوم القيامة وهذا خرج مخرج الوعيد وروى أنه قال عليه الصلاة والسلام لايجتمع عليهم السبى والتفريق حتى يبلغ الغلام وتحيض الجارية ونهى عن التفريق فى الصغر'' (وفی الموسوعة الفقهيه ۲۲۔ ۳۰ ج ۲/ ص ۴۹)۔

☆☆☆

اسلام میں قیدیوں کے حقوق

مولانا خورشید انور اعظمی [1]

اسلام ایک صالح اور صاف ستھرا معاشرہ کو پسند کرتا ہے، جس میں امن وسکون کی فضا عام ہو اور ظلم وستم، فتنہ وفساد اور ہر طرح کے جرائم کا کامل سد باب ہو، تاکہ تمام افراد انسانی پورے اطمینان کے ساتھ زندگی کے ایام بسر کر سکیں، اسی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی تاکید فرمائی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو غلط کام کا ارتکاب کرتا ہوا دیکھے تو اپنی استطاعت کے بقدر اس کی روک تھام کی سعی کرے، ارشاد نبوی ہے:

''من رأى منكم منكرًا فليغيره بيده فإن لم يستطع فبلسانه فإن لم يستطع فبقلبه وذلك أضعف الإيمان'' (رواہ مسلم بحوالہ مشکوۃ ۲/۴۳۶)۔

(جو شخص تم میں سے کسی خلاف شرع امر کو دیکھے تو اس کو چاہئے کہ اپنے ہاتھ سے اسے تبدیل کردے اگر ایسا نہ کر سکے تو اپنی زبان سے اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو اپنے دل سے، یہ ایمان کا سب سے کمتر درجہ ہے)۔

روک تھام کی یہ کارروائی ایک نوع کی تعزیر ہے، جس کا ہر مسلمان کو حق ہے، لیکن یہ تعزیر بس اسی وقت تک ہے جب تک کوئی شخص ارتکاب معصیت میں مبتلا ہو اور اگر معصیت کا ارتکاب کر چکا ہو تو ایسی صورت میں تعزیر کا حق صرف حاکم وامیر کو ہوتا ہے۔ درمختار میں ہے:

''ويقيمه كل مسلم حال مباشرة المعصية وأما بعده فليس ذلك لغير الحاكم'' (درمختار ۶/۱۱۱)۔

(معصیت کے ارتکاب کے وقت تک ہر مسلمان تعزیر کر سکتا ہے، لیکن اس کے بعد اختیار صرف حاکم کو ہوتا ہے)۔

شریعت اسلامیہ نے انسداد جرائم کے حوالہ سے بہت ہی مؤثر نظام بنایا ہے، بعض جرائم کی سزائیں مقرر کردی ہیں اور حاکم وامیر کو بعد از ثبوت بلا کم وکاست نافذ کرنے کا سختی سے حکم ہے جبکہ بعض جرائم کے سلسلہ میں حاکم وامیر کو اختیار دیا گیا ہے کہ جرم اور مجرم کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی صوابدید سے مناسب سزا تجویز کریں، اس میں زجر وتوبیخ، زدوکوب اور قید وبند کی صعوبتوں میں مبتلا کر کے مجرم کو کیفر کردار تک پہنچایا جا سکتا ہے، تاکہ جرائم پیشہ افراد اپنی غلط کاریوں سے اور دوسرے لوگ اس طرح کے عزائم سے باز رہیں، اسلام میں قیدیوں کے بارے میں بھی بھرپور رہنمائی موجود ہے جو ہدیہ ناظرین ہے۔

۱- ثبوت جرم کے بغیر قید کرنا

(الف) اگر حاکم وقت کسی کو محض شبہات وقرائن کی بنیاد پر گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیتا ہے تو یہ از روئے شرع درست ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم سے اس کا ثبوت ملتا ہے، بہز بن حکیم کے دادا معاویہ القشیری سے روایت ہے:

''إن النبي ﷺ حبس رجلا في تهمة ثم خلى عنه'' (جامع ترمذی ۱/ ۲۶۱)۔

(نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو ایک الزام میں قید کیا پھر اسے رہا کر دیا)۔

صاحب تحفۃ الاحوذی مولانا عبدالرحمن صاحب مبارک پوری نے حدیث بالا کی شرح کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

---

[1] جامعہ مظہر العلوم بنارس۔

''قال في اللمعات: فيه أن حبس المدعى عليه مشروع قبل أن تقام البينة'' (تحفۃ الاحوذی ۴/ ۵۶۳)۔
(لمعات التنقیح میں ہے: اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ مدعا علیہ (ملزم) کو ثبوت پیش کئے جانے سے پہلے قید کرنا شرعا درست ہے)۔

لیکن یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ یہ الزام ایسا ہوا کہ اس سے حد کا ثبوت ہوتا ہو اور اگر اس سے تعزیر کا ثبوت ہوتا ہو تو ملزم کو بلا تحقیق قید کرنا درست نہیں ہوگا، فتح القدیر میں ہے:

''لم يشرع الحبس تهمة مايوجب التعزير حتى لو أدى رجل على آخر شتيمة فاحشة أو أنه ضربه وأقام شهودا لايحبس قبل أن يسأل عن الشهود ويحبس فى الحدود'' (فتح القدیر ۵/ ۱۱۷)۔
(موجب تعزیر الزام میں قید کرنا شرعاً درست نہیں ہے یہاں تک کہ اگر کسی نے دوسرے کے خلاف دعوی کیا کہ اس نے فحش گالی دی ہے یا اس کو مارا ہے اور گواہ پیش کردیا تو گواہوں کے بارے میں چھان بین سے پہلے اس کو قید نہیں کیا جائے گا اور حدود میں قید کیا جائے گا)۔

البتہ موجب تعزیر الزام کی صورت میں ملزم کا کسی کو کفیل بنادیا جائے گا اور گواہوں کی تحقیق کے بعد اس کے بارے میں سزا تجویز کی جائے گی، شامی میں ہے:

''فإنه يكفل ولا يحبس إلا بعد تزكيتهم فحينئذ يضرب أو يحبس'' (شامی ۷/ ۸۷۷)۔
(اس کا کسی کو کفیل بنادیا جائے گا اور گواہوں کے سچ ثابت ہونے کے بعد ہی اسے قید کیا جائے گا، پھر اسے مارا جائے گا یا قید رکھا جائے گا)۔

(ب) اور اگر ملزم کو بطور احتیاط قید کیا جائے تو اس کی مدت مقرر نہیں ہوگی بلکہ امیر وحاکم اپنے طور پر مسئلہ کی صورت حال کے پیش نظر مدت طے کریں گے، اس وجہ سے کہ تمام تعزیری معاملات امیر وحاکم کے حوالے کردیئے گئے ہیں۔ شامی میں ہے:

''قال الزيلعي: وليس فى التعزير شيئ مقدر وإنما هو مفوض إلى رأى الإمام على ما تقتضي جنايتهم فإن العقوبة فيه تختلف باختلاف الجناية'' (شامی ۶/ ۱۰۶)۔
(زیلعی نے کہا: تعزیر میں کوئی سزا مقرر نہیں ہے بلکہ وہ جرم کے مطابق امام کی صوابدید پر ہے، اس وجہ سے کہ اس میں جرم کے بدلنے سے اس کی سزا بھی بدل جایا کرتی ہے)۔

علامہ ابوالحسن ماوردی نے بھی اس سلسلہ میں اختلاف نقل کرنے کے بعد اسی رائے کو ترجیح دی ہے، لکھتے ہیں:

''امیر کو اختیار ہے کہ متہم کو تفتیش اور استبراء کے لئے فوراً حوالات کردے، اس کی مدت میں اختلاف ہے، عبداللہ زبیری شافعی کہتے ہیں کہ ایک ماہ سے زیادہ حوالات کرنے کا اختیار نہیں اور دوسرے علماء کہتے ہیں کہ مدت معین نہیں، امام کی رائے اور اجتہاد پر موقوف ہے، یہ رائے زیادہ مناسب ہے (الاحکام السلطانیہ مترجم/ ۳۴۵)۔

مرقاۃ المفاتیح میں ہے:

''وللإمام أن يجتهد فى تعزير المفسد ويفعل ما رأى من العقوبة'' (مرقاۃ المفاتیح ۴/ ۹۲)۔
(امام کو اختیار ہے کہ مفسد کی تعزیر میں اجتہاد کرے اور جو سزا مناسب سمجھے دے)۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کے بارے میں امام وقت محسوس کرتا ہے کہ اسے لمبی مدت تک محبوس رکھا جائے تو وہ ایسا کرسکتا ہے، جیسا کہ قتل، چوری اور لوگوں کے مارنے کے الزام میں ماخوذ شخص کو حبس دوام کی سزا دی جاسکتی ہے یہاں تک کہ وہ توبہ کرے، فتاوی خانیہ میں ہے:

''من يتهم بالقتل والسرقة وضرب الناس يحبس ويخلد فى السجن إلى أن يظهر التوبة'' (الفتاوی الخانیہ علی ہامش الرد ۴/ ۴۸۰)۔

(جس شخص پر قتل، چوری اور لوگوں کو مارنے کا الزام ہوا سے قید کیا جائے گا اور تا حیات قید میں رکھا جائے گا حتی کہ توبہ کر لے)۔

۲-قیدیوں کے حقوق

شریعت میں کسی ملزم یا مجرم کے گرفتار کئے جانے کا مقصد اس کی اصلاح اور مجرمانہ سرگرمیوں سے باز رکھنا ہوتا ہے نہ کہ محض اذیت دہی اور انتقامی کارروائی، اسی وجہ سے قید خانے میں بھی اس کو بہت سے بنیادی حقوق حاصل رہتے ہیں، البتہ امیر و حاکم حسب مصلحت اس سلسلہ میں کمی بیشی کے مجاز ہوتے ہیں۔

(الف) قید خانے میں ایسے مذہبی امور جن کی ادائیگی ملزم یا مجرم پر فرض ہے، اس کی اجازت ہوگی، چنانچہ انہیں نماز وغیرہ سے نہیں روکا جائے گا، الموسوعۃ الفقہیہ میں ہے:

''ینبغی تمکین المحبوس من الوضوء والصلاۃ ولا تجوز معاقبته بالمنع منها'' (الموسوعہ الفقہیہ ۱۶/ ۳۲۴)۔

(قیدی کو وضو و نماز کا موقع دیا جانا چاہئے، اس کو ان چیزوں سے روک کر سزا دینا جائز نہیں ہے)۔

علامہ ابوالحسن ماوردی نے احکام سلطانیہ میں بحالت سولی بھی وضو و نماز کی اجازت دی ہے، تحریر فرماتے ہیں:

''تعزیر میں زندہ سولی پر چڑھانا بھی جائز ہے، رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو پہاڑ ابوناب پر سولی دی تھی، سولی پر چڑھانے کے بعد کھانا پینا پہنچانا اور نماز کے لئے وضو ممنوع نہیں، اشارے سے نماز پڑھے'' (الاحکام السلطانیہ مترجم/ ۳۷۵)۔

اگر کوئی قیدی مذہبی کتابوں کے مطالعہ کا ذوق رکھتا ہے، تو امیر و حاکم دیکھ لیں کہ اگر اس سے اس کی ذہنی و فکری اصلاح ہوتی ہے تو اس کی اجازت دے دی جائے گی، اس وجہ سے کہ قید کرنے کا مقصد اصلاح ہے، جو مطالعہ سے ہو رہا ہے، اسی طرح دین کی دعوت دینے والے قیدی کو بھی اس بات کی اجازت ہوگی کہ اپنے دوسرے قیدی بھائیوں تک دین کی باتیں پہنچائیں، اس سے قید خانہ کا ماحول صحیح اور دینی ہوگا اور مجرمانہ ذہنیت کا قلع قمع ہوگا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے قید خانہ میں دعوت کا فریضہ انجام دیتے ہوئے کہا: یا صاحبی السجن أأرباب متفرقون خیر أم اللہ الواحد القہار (یوسف/ ۳۹)، جس سے بحالت قید دینی دعوت کا ثبوت ملتا ہے، نیز قید خانہ میں تمام قیدیوں کے مذہبی جذبات کا لحاظ بھی ضروری ہے، ان کی مقدس شخصیات اور محترم کتابوں کی بے احترامی سے ہر ممکن احتراز کرنا چاہئے، قرآن کریم میں معبودان باطل کو بھی برا بھلا کہنے سے منع کیا گیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

"ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم" (الانعام/ ۱۰۸)۔

(اور دشنام مت دو ان کو جن کی یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں، کیوں کہ پھر وہ براہ جہل حد سے گزر کر اللہ تعالی کی شان میں گستاخی کریں گے)۔

اسی طرح قیدیوں کے کھانے میں بھی اس کا لحاظ ضروری ہے کہ کوئی ایسی چیز نہ دی جائے جو ان کے مذہب کے اعتبار سے ممنوع ہو، اس لئے کہ قرآن کریم میں اہل اسلام کی یہ خصوصیت ذکر کی گئی ہے کہ:

"ویطعمون الطعام علی حبه مسکینًا ویتیمًا وأسیرًا" (الدھر)۔

(وہ لوگ (محض) خدا کی محبت سے غریب اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں)۔

ظاہر ہے کہ اعانت کا یہ مستحسن عمل بایں طور ہوگا کہ قیدیوں کو ایسا کھانا فراہم کیا جائے جس میں ان کے لئے مذہبی اعتبار سے کوئی قباحت نہ ہو، البتہ ایسا کھانا جو شرعاً حرام ہے، اس کے فراہم کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

(ب) اسلام نے قیدیوں کی جسمانی ضروریات کا لحاظ کیا ہے، چنانچہ ان کے خورد و نوش کا مناسب انتظام حکومت کے فرائض میں سے ہے، جب

حضرت علیؓ کو ابن ملجم نے مارا تو آپ نے فرمایا:

''أطعموه واسقوه وأحسنوا أساره فإن عشت فأنا ولي دمي أعفو إن شئت وإن شئت استقدمت وإن مت فقتلتموه فلا تمثلوا'' (کنز العمال ۱۹۷/۱۳)۔

(اسے کھلاؤ پلاؤ اور اچھی طرح قید رکھو، اگر میں زندہ رہا تو میں اپنے خون کا مالک ہوں، اگر چاہوں گا تو معاف کردوں گا اور اگر چاہوں گا تو عدالت میں اس کی پیشی کراؤں گا، اور اگر مرگیا تو اس کو قتل کردینا، مگر مثلہ نہ بنانا)۔

امام ابو یوسفؒ نے ''کتاب الخراج'' میں عام قیدیوں کو کھانا کھلانے کے سلسلہ میں بہت ہی واضح طور پر تحریر فرمایا ہے:

''والأسير من أسرى المشركين لابد أن يطعم ويحسن إليه حتى يحكم فيه فكيف برجل مسلم قد أخطأ أو أذنب يترك يموت جوعا'' (کتاب الخراج/ ۱۴۹)۔

(جب مشرک قیدی کو کھانا کھلانا، اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا ضروری ہے یہاں تک کہ اس کا حکم دیا جاتا ہے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک خطا کار یا گناہ گار مسلمان کو بھوک سے مرتا ہوا چھوڑ دیا جائے)۔

اگر قیدی بیمار ہوجائے تو اس کے علاج کا بھی نظم کیا جائے، قید خانہ میں اگر اس کے علاج کی صورت ہوجاتی ہے تو باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البحر الرائق میں ہے:

''ولا يخرج للمعالجة لإمكانها في السجن'' (البحر الرائق ۶/ ۲۸۳)۔

(علاج کے لئے باہر نہ نکالا جائے اس وجہ سے کہ وہ قید خانہ میں بھی ہوسکتا ہے)۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اگر قید خانہ میں علاج ممکن نہ ہو تو قیدی کو باہر لے جانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، حفظان صحت کے لئے ورزش اور تفریح ایک ضروری امر ہے، اگر قیدی کو اس کی طبی ضرورت ہے تو اس کا بھی موقع دیا جائے گا، بشرطیکہ قید خانہ کے نظام میں کوئی خلل واقع نہ ہو اور مصلحت قید کے خلاف بھی نہ ہو۔

اگر قیدی کو اپنی بیوی سے ملاقات کی خواہش ہو تو اس کا بھی موقع فراہم کیا جائے گا حتی کہ اگر کوئی پردہ کی جگہ ہو تو اس سے مباشرت کی بھی اجازت ہوگی۔ البحر الرائق میں ہے:

''ولا يمنع من الجماع إن احتاج إليه فتدخل امرأته أوجاريته عليه إن كان فيه موضع سترة'' (البحر الرائق ۶/ ۲۸۳)۔

(قیدی کو اگر ضرورت ہو تو جماع سے نہیں روکا جائے گا، چنانچہ اس کی بیوی یا باندی بشرطیکہ وہاں پردہ کی جگہ ہو اس کے پاس جائے گی)۔

قید خانہ کوئی آرام کی جگہ نہیں ہے کہ وہاں جملہ سہولیات مہیا ہوں، بلکہ وہ ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں بستر ہوتا ہے نہ گدا، اور نہ آرام وسکون کی کوئی اور چیز، ایسے میں یہ مسئلہ قاضی کی صوابدید پر ہوگا کہ کس قیدی کو کس طرح کی سہولت فراہم کی جائے، چنانچہ کوئی قیدی اگر شرارت پر آمادہ ہے تو تنگ کوٹھری میں بھی ڈالا جاسکتا ہے، البحر الرائق میں ہے:

''وإذا حبس المحبوس في السجن متعنتا لا يوفي المال قال الأرسانيدي: يطين الباب ويترك له ثقبة يلقى منها الماء والخبز وقال القاضي الرأى فيه إلى القاضي'' (البحر الرائق ۶/ ۲۸۳)۔

(اگر کوئی قیدی ڈھٹائی کے ساتھ قید خانے میں بیٹھا ہوا ہے، اور مال کی ادائیگی نہیں کررہا ہے تو ارسانیدی نے کہا کہ اس کا دروازہ مٹی سے بند کر دیا جائے گا اور اس کے لئے ایک سوراخ چھوڑ دیا جائے گا جس سے کھانا پانی دیا جائے گا، قاضی نے کہا: اس میں قاضی کی رائے کا اعتبار ہوگا)۔

(ج) فقہاء کرام نے قید خانہ کی صفت یہ بتائی ہے کہ وہ ناہموار جگہ ہو، اس میں بستر ہو نہ گدا اور قریبی لوگوں کے علاوہ کسی کو وہاں جانے نہ دیا

جائے، جو جائے تو دیر تک ٹھہرنے کی اجازت نہ ہوتا کہ اسے گھٹن کا احساس ہو۔ البحرالرائق میں ہے:

''صفة الحبس أن يكون في موضع ليس فيه فراش ولا وطاء ولا يمكن أحد يدخل عليه للاستيناس إلا أقاربه وجيرانه ولا يمكثون'' (البحرالرائق ۶/ ۲۸۳)۔

(قید کی صفت یہ ہے کہ وہ ایسی جگہ میں ہو جہاں بستر ہو نہ گدا اور اس کے قریبی لوگوں اور پڑوسیوں کے علاوہ کسی کو اس کے پاس انسیت کے لئے جانے نہ دیا جائے اور نہ یہ لوگ وہاں ٹھہریں)۔

مذکور تصریح سے واضح ہوتا ہے کہ قیدی کو ایسی صورت حال سے دو چار ہونا چاہئے جس میں وہ گھٹن محسوس کرے اور ہر لمحہ اسے اپنے قید ہونے کا احساس ستائے، لہذا اس کے لئے کسی ایسی چیز کی اجازت نہیں ہوگی جس میں اس کے لئے انس کا سامان ہو، اس پس منظر میں اخبارات اور ریڈیو کی اجازت قطعاً نہیں ہوگی، اس وجہ سے کہ ان چیزوں سے طبیعت بہلتی ہے اور اکتاہٹ کا احساس کم ہوتا ہے، فون کی اس حد تک تو اجازت ہوسکتی ہے کہ اس کے توسط سے اپنے مسئلہ میں مشورہ لے، لیکن اس کی عام اجازت مصالح قید کے خلاف ہوگی، باقی رہی تعلیم یا کسی ہنر کے سیکھنے کی بات تو اس کی بھی بظاہر اجازت نہیں ہونی چاہئے، اس وجہ سے کہ اس میں بھی مشغول ہوجانے کے بعد قید و بند کا احساس کم ہوگا اور قیدی کے لئے جو کیفیت مطلوب ہے مفقود ہوجائے گی، یہی وجہ ہے کہ صحیح قول کے مطابق قیدی کو کمائی کرنے سے منع کیا گیا ہے، ورنہ تو وہ قید کیا ہوئی اچھی خاصی دکان ہوگئی۔

(د) اگر عورت قید کی جائے تو اس کا قید خانہ علیحدہ ہوگا، عالمگیری میں ہے:

''وينبغي أن يكون للنساء محبس على حدة تحرزا عن الفتنة، وعن أبي حنيفة أن المرأة تحبس في محبس النساء ولكن يحفظها الرجل'' (عالمگیری ۳/ ۴۱۴)۔

(اور مناسب ہے کہ فتنہ سے بچنے کے لئے عورتوں کے لئے علیحدہ قید خانہ ہو اور امام ابوحنیفہؒ سے مروی ہے کہ عورت، عورتوں کے قید خانہ میں قید کی جائے گی، لیکن اس کی پہرے داری مرد کرے گا)۔

اگر نابالغ بچہ کسی مسئلہ میں بطور تادیب قید کیا جائے تو اس کا قید خانہ بالغ لوگوں سے علیحدہ ہوگا، بالخصوص اس صورت میں جب کہ اس کے بگڑنے کا اندیشہ ہو، اس وجہ سے کہ گندے عناصر کے درمیان کچھ دن گزارنے سے غیر شعوری طور پر اس کی ذہنیت بھی فاسد ہوگی۔ الموسوعۃ الفقہیہ میں ہے:

''تدل أكثر النصوص على أن يكون حبس الحدث في بيت أبيه أو وليه على أنه يجوز حبسه في السجن إلا إذا خشي عليه ما يفسده فيتوجب حبسه عند أبيه لا في السجن'' (الموسوعة الفقهيه ۱۶/۳۱۸)۔

(اکثر نصوص سے پتہ چلتا ہے کہ نوعمر کو اس کے والد یا ولی کے گھر میں قید کیا جائے گا، اس کے ساتھ اس کو قید خانہ میں قید کرنا بھی جائز ہے، الا یہ کہ اس بات کا اندیشہ ہو کہ وہ بگڑ جائے گا تو قید خانہ کے بجائے اس کے والد کے پاس قید کرنا واجب ہوگا)۔

۳- قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کا مسئلہ

اگر کوئی آدمی کسی الزام میں گرفتار کر کے لایا جائے، اور اس سلسلہ میں اس کے خلاف کوئی بینہ بھی نہ ہو تو اس سے مار پیٹ اور قید و بند کی دھمکی کے ذریعہ اقبال جرم کرانا درست نہیں ہوگا اور اس حالت کا اقرار باطل قرار دیا جائے گا۔ علامہ سرخسی نے مبسوط میں لکھا ہے:

''ولو أن قاضيا أكره رجلا بتهديد ضرب أو حبس أو قيد حتى يقر بحد أو قصاص كان الإقرار باطلا'' (مبسوط ۲۴/ ۷۰)

(اگر قاضی نے کسی آدمی کو حد یا قصاص کے اقرار کے لئے مارنے، قید کرنے یا پاؤں میں بیڑی ڈالنے کی دھمکی کے ذریعہ مجبور کیا تو وہ اقرار باطل ہوگا)۔

حتی کہ اگر قاضی نے اسی اقرار کی بنیاد پر سزا دے دی تو وہ اس کا ذمہ دار ہوگا اور اس کے نقصان کا ضامن ہوگا۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے: المبسوط ۲۴/۷۱)۔

مذکورہ تصریح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قیدی سے سچی بات اگلوانے کے لئے اس کو بے لباس کرنا، الکٹرک شاک لگانا، اس پر کتے چھوڑنا، اس کو سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈالنا اور مسلسل جگے رہنے پر مجبور کرنا، یا اس کی رہائش میں تیز روشنی کرنا درست نہیں ہوگا، اس حالت میں اگر قیدی اعتراف جرم کرتا ہے تو باطل ہوگا، البتہ اگر ملزم ایسا ہے کہ اپنے الزام کے تعلق سے مشہور و معروف ہے یا دوسرے مضبوط قرائن اس الزام کی تصدیق کرتے ہوں تو مارنے کی اجازت ہوگی، جیسا کہ حسن بن زیاد سے ایک امیر وقت نے دریافت کیا کہ کیا چور کو اقرار کے لئے مارا جاسکتا ہے تو آپ نے فرمایا: "مالم یقطع اللحم أو یبین العظم" یعنی جب تک گوشت نہ کاٹا جائے تو کیا ہڈی ظاہر ہوسکتی ہے، پھر آپ کو اپنی بات پر ندامت ہوئی اور خود امیر کی مجلس میں پہنچے کہ اس سے منع کردیں، مگر دیکھا کہ اس کی پٹائی ہوچکی ہے اور وہ اقرار کرکے مال بھی حاضر کرچکا ہے، جب آپ نے امیر کے سامنے مال دیکھا تو کہا: "مار أیت ظلمًا أشبه بالحق من هذا" یعنی میں نے کوئی ظلم اس سے زیادہ حق کے ہم مثل نہیں دیکھا (مبسوط ۲۴/۷۰)۔

معلوم ہوا کہ عادی اور ڈھیٹ چوروں کو مارنے کی ضرورت پڑتی ہے، اسی وجہ سے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کا بھی خیال یہی ہے کہ آج علماء نے اس کی اجازت دی ہے (بذل المجہود ۱۷/۳۲۸)

اور فساد زمانہ کے پیش نظر اسی پر اعتماد ہے (شامی ۶/۱۴۷)،

نیز اہل مدینہ کا بھی یہی قول ہے (مبسوط ۲۴/۷۱)۔

۴-قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑنے کا مسئلہ

صحابہ کرامؓ نے یمامہ کے سردار ثمامہ بن اثال کو مسجد کے ایک کھمبہ میں باندھا تھا جس سے قیدی کو باندھنے اور محبوس کرنے کا جواز فراہم ہوتا ہے (شرح صحیح مسلم ۱۲/۳۰۸)۔ اسی طرح شامی میں ہے کہ سفہاء، بدکار اور فسادیوں کو بیڑی ڈالنا درست ہے:

"وصح القید فی السفهاء والدعار وأهل الفساد (شامی ۶/۱۱۶)۔

(سفہاء، بدکار اور فسادی لوگوں کے پاؤں میں بیڑی ڈالنا درست ہے)۔

البتہ مدیون کو نہ مارا جائے گا، نہ بیڑی ڈالی جائے گی، نہ ہتھکڑی پہنائی جائے گی، نہ اسے ننگا کیا جائے گا، نہ اس سے مزدوری لی جائے گی اور نہ اس کو صاحب حق کے سامنے بطور اہانت کھڑا کیا جائے گا، جیسا کہ البحر الرائق میں ہے:

"لا یضرب المدیون ولا یقید ولا یغل ولا یجرد ولا یواجر ولا یقام بین یدی صاحب الحق إهانة" (البحر الرائق ۶/ ۲۸۳)۔

۵-قید تنہائی کی اجازت

اگر کوئی قیدی ایسا ہے کہ اس کو علیحدہ کسی جگہ محبوس کردیا جائے، تو حسب مصلحت اس کی اجازت ہوگی اور حاکم وقت کے لئے اس کو قید تنہائی میں قید کرنا درست ہوگا۔ الموسوعۃ الفقہیہ میں ہے:

یجوز للحاکم عزل السجین وحبسه منفردا فی غرفة یقفل علیها بابها إن کان فی ذلك مصلحة (الموسوعه الفقهیه ۱۶/۳۱۹)

(حاکم کے لئے حسب مصلحت قیدی کو الگ

قیدی کی اہلیت تصرف قید ہونے سے باطل نہیں ہوا کرتی بلکہ اپنے مال میں تصرف بیع وشراء کا مجاز ہوتا ہے۔ الموسوعہ الفقہیہ میں ہے:

"فإن أکره بالحبس علی البیع أو الشراء أو التأجیر فله الفسخ بعد زوال الإکراه لانعدام الرضا" (الموسوعة الفقهیه ۱۶/۳۲۲)

(اگر قید کر کے بیع وشراء اور تاجیر پر مجبور کیا گیا تو اکراہ کے ختم ہونے کے بعد اس کو عدم رضامندی کے سبب فسخ کرنے کی اجازت ہوگی)۔

لہذا قیدی سے جبراً کام لینا درست نہیں ہوگا، جیسا کہ المبسوط میں ہے:

''ولا یؤاجر من غیر اختیارہ لأن ذلك نوع حجر علیه ولا یجوز ذلك فی مالہ فلأن لایجوز فی نفسه بطریق الأولی'' (المبسوط ۲/۹۰)۔

(قیدی کی رضامندی کے بغیر اس سے مزدوری کا کام نہیں لیا جائے گا، اس وجہ سے کہ ایک طرح سے اس کے تصرف سے روکنا ہے، اور یہ اس کے مال میں جائز نہیں ہے تو اس کی ذات میں بدرجہ اولی جائز نہیں ہوگا)۔

لیکن قیدی سے جبراً کام لیا گیا ہے تو وہ اس کی اجرت کا مستحق ہے، اس وجہ سے کہ یہ اپنی جانب سے منفعت پیش کر رہا ہے جس کا تقاضا ہے کہ اس کو اس کا عوض ملے، اس وجہ سے کہ بحالت اکراہ بھی عقود نافذ ہوجایا کرتے ہیں۔

۷-زیر سماعت مقدمہ

ایسے مقدمات جو ابھی زیر سماعت ہیں اور ایسے مقدمات جن کا فیصلہ ہو چکا ہے، دونوں قیدیوں کے بارے میں فرق ہوگا۔ الموسوعۃ الفقہیہ میں ہے:

''والمعمول به فی القدیم تمیز حبس الوالی الذی یضم أهل الریبة والفساد (الموقوفین) عن حبس القاضی الذی یضم المحکومین ویختلف سجن الوالی عن سجن القاضی'' (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/۳۱۸)۔

(زمانہ قدیم میں یہ معمول رہا ہے کہ والی کی قید جس میں مشکوک اور فسادی لوگ (روکے ہوئے) ہوتے ہیں، قاضی کی قید سے الگ رہیں جس میں وہ قیدی ہوتے ہیں جن کے بارے میں فیصلہ کیا جا چکا ہے اور والی کا قید خانہ قاضی کے قید خانہ سے مختلف ہوتا ہے۔

۸-زیر سماعت قیدیوں کو روکنے کی مدت کا مسئلہ

زیر سماعت قیدیوں کو تعزیراً روکا جاتا ہے اور یہ قاضی کی صوابدید پر ہوتا ہے، اس لئے اگر ان کی مدت حراست اصل سزا سے بڑھ جائے تو اس کی اجازت ہوگی، کیوں کہ دونوں قید کی نوعیت میں فرق ہے، پھر تعزیرات کے باب میں قاضی کو اختیار ہوتا ہے کہ ملزم یا مجرم کے حالات کے مطابق فیصلہ کرے، البتہ والی کو چاہئے کہ قیدیوں کے مسائل جلد از جلد حل کرے، امام ابو یوسفؒ نے ہارون رشید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''مر ولا تلك جمیعا بالنظر فی أمر أهل الحبوس فی کل یوم فمن کان علیه أدب أدب وأطلق ومن لم یکن له قضیة خلی عنه'' (کتاب الخراج/۱۵۷)۔

(اپنے تمام والیوں کو حکم دیں کہ وہ قیدیوں کے معاملات کا روزانہ جائزہ لیا کریں، پھر جن کو سزا دینی ہے سزا دے کر چھوڑ دیں، اور جن کا کوئی مسئلہ نہیں ہے انہیں رہا کر دیں)۔

۹-بری ہونے کے بعد زمانہ قید کی ذہنی اذیت کا ہرجانہ

اگر کوئی شخص کسی الزام میں ماخوذ ہوا اور اسے قید خانہ میں ڈال دیا گیا، پھر مقدمہ کی سماعت کے بعد عدالت نے اسے بری کر دیا تو ایسی صورت میں اسے زمانہ قید کی اذیتوں، پریشانیوں کے مالی ہرجانہ کے مطالبہ کا حق حاصل نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ قید تعزیراً ہے، جس کی شریعت نے اجازت دی ہے۔

۱۰-قیدی کے لئے وکیل صفائی کا مسئلہ

اسلام نے قیدی کو اپنی صفائی پیش کرنے کا حق دیا ہے، چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا:

''إذا تقاضى إليك رجلان فلا تقض للأول حتى تسمع كلام الآخر'' (ترمذی ۱/۲۴۸)۔

(جب آپ کے پاس دو آدمی اپنا مقدمہ لے کر آئیں تو پہلے کے حق میں فیصلہ نہ کردیں یہاں تک کہ دوسرے کی بات بھی سن لیں)۔

اسی طرح دوسری حدیث میں ہے:

''لو يعطى الناس بدعواهم لادعى الناس دماء رجال وأموالهم ولكن البينة على المدعى عليه'' (مشکوۃ ۲/۳۲۶)۔

(اگر لوگوں کو محض ان کے دعوی کے مطابق دے دیا جائے تو بہت سے لوگ دوسروں کی جان و مال بذریعہ دعوی لینے لگیں گے، لیکن مدعا علیہ پر یمین ہے)۔

اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ قیدی کو اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا پورا حق ہے اور وہ اس سلسلہ میں اپنے وکیل سے رابطہ کر کے عدالت میں اپنی صفائی پیش کرسکتا ہے۔

۱۱- خواتین قیدی کا اپنے ساتھ شیر خوار بچے کو رکھنا

ماں کو اپنے بیٹے سے جذباتی لگاؤ ہوتا ہے، وہ نہیں چاہتی کہ اس کا لخت جگر ایک لمحہ کے لئے بھی اس کی نگاہ سے اوجھل ہو، شریعت اسلامیہ نے اس جذبہ کا لحاظ کیا ہے، چنانچہ زوجین میں علیحدگی کی صورت میں حضانت کا حق اسی کو حاصل ہے۔ ہدایہ میں ہے:

''وإذا وقعت الفرقة بين الزوجين فالأم أحق بالولد'' (ہدایہ ۲/۴۱۴)۔

(جب زوجین میں علیحدگی ہوجائے تو ماں بیٹے کی زیادہ حق دار ہے)۔

اسی طرح اگر شوہر مدت رضاعت کے دوران دودھ چھڑانے پر مجبور کرے تو اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ درمختار میں ہے:

''وليس له ذلك يعني الإجبار بنوعيه مع زوجته الحرة ولو قبلهما لأن حق التربية لها'' (دُرمختار ۲/۳۹۰)۔

(شوہر کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اپنی آزاد عورت کو دودھ پلانے اور اس کے چھڑانے پر مجبور کرے خواہ دو سال سے پہلے ہی، اس وجہ سے کہ تربیت کا حق ماں کو حاصل ہے)۔

نیز اگر شوہر اپنے بیٹے کو دودھ پلانے کے لئے کسی مرضعہ کا انتظام کرتا ہے تو وہ ماں کے پاس آکر بچہ کو دودھ پلائے گی، درمختار میں ہے:

''ويستأجر الأب من ترضعه عندها لأن الحضانة لها والنفقة عليه'' (درمختار ۵/۳۴۷)۔

(باپ کسی عورت کو اجرت پر طے کردے کہ وہ بچہ کو اس کی ماں کے پاس دودھ پلائے، اس وجہ سے کہ حضانت ماں کا حق ہے اور نفقہ شوہر کے ذمہ)۔

مذکورہ بالا تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ شیر خوار بچہ کو قیدی ماں کے ساتھ قید خانہ میں رکھنا درست ہے اور یہی بچہ کے حق میں ماں کی محبت وشفقت کا تقاضا بھی ہے۔

......☆......

قیدیوں سے متعلق مسائل اور حل

مولانا محمد اقبال ٹنکاروی [1]

قید عقوبت ہی کی ایک قسم ہے لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عقوبۃ کی تعریف، اس کی غرض، اس کی قسمیں بیان کردی جائیں تاکہ سزاؤں کے سلسلہ میں اسلامی نقطہ نظر ابھر کر سامنے آجائے۔

عقوبۃ کی تعریف

علامہ ماوردی بحوالہ (احکام السجن / ۲۱۹) الحدود والتعزیر سے کی ہے، جب کہ قاموس الفقہ میں بحوالہ معین الحکام اس طرح تعریف کی گئی ہے:

''العقوبة جزاء شرعي على فعل محرم أو ترك واجب أو سنة أو فعل مكروه'' (۴/۴۰۸)۔

ان عقوبات کی غرض کیا ہے؟ تو ملکی قوانین میں عقوبات اس لئے ہوتی ہے کہ امن عامہ کا قیام اور حقوق انسانی کا تحفظ ہو، بیشک اسلام میں سزاؤں کا ایک مقصد یہ بھی ہے، لیکن اس کے ساتھ کچھ اور بھی مقاصد ہیں جن کا تعلق تصور آخرت ورضائے رب کے ساتھ ہے، لہذا اہم مختصراً ان مقاصد کو بھی ذکر کرتے ہیں:

۱- قیام امن جس کی طرف "ولکم فی القصاص حیاۃ" سے اشارہ کیا گیا ہے۔

۲- مجرمین کی حوصلہ شکنی اور عامۃ الناس کو عبرت حاصل ہو جس کی طرف "ویشھد عذابھما ... الخ" سے اشارہ ہوا۔

۳- تقاضۂ عدل کی تکمیل تاکہ مظلوم کا دل جذبۂ انتقام وکینہ وغیرہ سے پاک ہوجائے، اور افراد قانون اپنے ہاتھ میں نہ لیں۔

۴- مجرم کی پاکی وتطہیر وغیرہ (ملخصاً از قاموس الفقہ ۳/۹۰-۹۲)۔

چوں کہ اسلامی سزائیں تصور آخرت، احساس عبدیت اور توبہ کی رغبت وغیرہ کو شامل ہیں جو کہ انسانیت کا جوہر ہے، لہذا اسلامی سزاؤں میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ سزا کا کوئی پہلو انتقام یا تحقیر سے متصف نہ ہو، لہذا علامہ الماوردی الاحکام میں تحریر فرماتے ہیں:

اتصافها (العقوبة) بالتقويم والإصلاح (ص/ ۲۳۶)۔

''فقد تضافرت النصوص على منعها من المعانى السيئة كالتعذيب والتحقير والقسوة وفررت فيها الأهداف السامية والغايات الكريمة'' (احكام السجن/ ۲۲)

یہی وجہ ہے کہ معمولی گناہ پر سخت سزا یا سخت گناہ پر معمولی سزا نہیں رکھی گئی، اسی طرح شبہات کا فائدہ دے کر تنفیذ حدود کو لازم نہیں کردیا۔

انہی خصوصیات کی بنا پر عقوبات کی اسلام نے تین قسمیں کرکے ہر ایک کے احکام بھی الگ بیان کئے ہیں تاکہ تخفیف وتشدید علی قدر الحاجۃ ملحوظ رہے، وہ قسمیں حدود، قصاص، تعزیر ہیں، ہمارا مسئلہ قید، اسی تعزیر کی ایک قسم ہے، لہذا اہم تعزیر کے سلسلہ میں قدرے عرض کرنے کے بعد مسئلہ مبحوث عنہا قید کی تفاصیل کا آغاز کریں گے۔

تعزیر کا اصطلاحی معنی

---

[1]

علامہ کاسانی نے اس طرح بیان کیا ہے:

''عقوبة غير مقدرة تجب حقًا لله تعالى أو لآدمي في كل معصية لا حد فيها ولا كفارة'' (بدائع ۶۳/۷)

، اور اسی وجہ سے شریعت نے تعزیر میں کوئی مقدار وغیرہ مقرر کرنے کے بجائے قاضی اور امام کی طرف تفویض کردی ہے، البتہ کن چیزوں میں تعزیر کی جائے گی اس کو فقہاء کرام نے مفصلاً ذکر کیا ہے، ایک ضابطہ یہ بیان کردیا ہے:

''سبب العقوبة في التعزير الإضرار بالمجتمع وإيذاء الناس في أنفسهم وأموالهم وحقوقهم (احکام السجن/ ۲۷)

درمختار میں ہے: ''فكل من ارتكب منكرا أو أذى غيره بغير حق بقول أو فعل أو إشارة يستحق التعزير (درمختار ۶۶/۴)

جس طرح تعزیر مشروع ہے اسی طرح تعزیر کی الگ الگ انواع بھی فقہاء نے بیان کی ہیں کہ کون سے گناہ میں کیسی سزا دی جائے جس کی اجماع فہرست مذاہب اربعہ کی روشنی میں احکام السجن کے حوالہ سے درج کرتا ہوں: (۱) قتل (۲) جلد (۳) نفی (۴) صلب (۵) ہجر (۶) توبیخ وتہدید (۷) الاعلام (۸) عہدہ سے ہٹا دینا (۹) بعض حقوق سے حرمان (۱۰) مجرم کی شہرت وتشہیر (۱۱) غرامہ، (احکام السجن ملخصا/ ص ۳۰ سے ۳۵)۔

قید کا اصطلاحی معنی

اس کا معنی کسی شخص کو اپنے دینی اور معاشرتی کام سے روک دینے کے ہیں، قید کا اصطلاحی معنی بدائع میں یوں ہے:

''هو منع الشخص من الخروج إلى أشغاله ومهماته الدينية والاجتماعية (بدائع ۱۷۴/۷)۔

یہی وجہ ہے کہ درخت کے ساتھ باندھنے اور مسجد میں باندھنے پر بھی قید کا اطلاق ہوا ہے۔

قید کی شرعی حیثیت

قید کا ثبوت قرآن اور حدیث سے ہے، نفس قید کی مشروعیت پر یہ آیتیں ہیں: "فشدوا الوثاق...-وخذوهم واحصروهم...-أو ينفوا من الأرض

دارقطنی میں ہے: ''إذا أمسك الرجل الرجل وقتله الآخر فيقتل الذي قتل ويحبس الذي أمسك (دارقطني، نيل الاوطار)

اسی طرح واقعہ ابولبابہ اور واقعہ ثمامہ بن اثال وغیرہ سے استدلال کیا گیا ہے۔ نفس قید کی مشروعیت کے بعد فقہاء نے قید کی دو قسمیں بیان کی ہیں:

(۱) حبس التعزیر۔ (۲) حبس الاستیثاق (بدائع ۶۵/۷)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح قید بغرض سزا وتعزیر مشروع ہے اسی طرح قید بطور احتیاط بغرض اقرار جرم وغیرہ جائز ہے۔

حبس کی قسمیں

یہاں پر یہ جان لینا خالی از فائدہ نہیں کہ حبس بقصد الاستیثاق کو تین قسموں پر منقسم کیا گیا ہے: (۱) حبس التہمۃ (۲) حبس الاحتراز (۳) حبس تنفیذ العقوبۃ۔

حبس التہمۃ:

حبس التہمۃ کی مشروعیت پر سیدنا یوسفؑ کے دو ساتھی جو جیل میں تھے اس سے بھی استدلال کیا گیا ہے، اسی طرح آپ ﷺ نے ایک آدمی کو تہمت کی بنیاد پر قید کیا تھا (فتح القدیر ۴۷۱/۵)۔ ہمارے فقہاء نے متہم کے سلسلہ میں تفصیل کی کہ اگر اس شخص پر پہلے کوئی تہمت نہیں آئی اور فی الحال بھی کوئی قرینہ تو یہ نہیں ہے تو اس کو قید کرنا جائز نہیں اور اگر وہ شخص مجہول الحال ہو تو اس کی حالت منکشف ہونے تک اس کو قید کیا جاسکتا ہے اور اگر وہ معروف بالفجور ہو تو اس کو بدرجہ اولی گرفتار کرسکتے ہیں، حبس بالتہمۃ کی مدت قید کے سلسلہ میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں، مگر مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حد بندی نہ کی جائے بلکہ حاکم کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے (شامی ۸۸/۴، ابن فرحون ۱۵۵/۲)۔

حبس احتراز:

دوسرے نمبر پر حبس احترازی ہے جس کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے:

''التحفظ لمصلحة العامة على من يتوقع حدوث ضرر بتركه ولا يستلزم منه وجود التهمة'' (احکام السجن/۱۰۸)

ان کا حکم یہ ہے کہ ان کو محبوس بالتہمت کے مقابلہ میں زیادہ رعایت دی جائے گی اور خطرہ اٹھ جانے کے بعد ان کو چھوڑ دیا جائے گا، حبس احترازی پر سیدنا یوسفؑ کے واقعہ سے استدلال کیا جاسکتا ہے (تفسیر خازن ۳/۴۵)، اسی طرح سنن ابوداؤد کی ایک روایت سے بھی جس میں غالب بن عبد اللہؓ کو بنوملوح پر حملہ کے لئے بھیجا گیا تھا پھر ان کی ملاقات حارث بن برصاء سے ہوئی تو انہوں نے ان کو قید کردیا، حارث نے کہا: میں تو مسلمان بننے آیا ہوں، تو حضرت غالبؓ نے کہا:

''إن كنت مسلمًا فلا يفرك رباطنا يومًا وليلة وإن تكن غير ذلك نستوثق منك'' (سنن ابوداؤد ۲/۷۶)۔

حبس تنفیذ عقوبۃ

تیسرے نمبر پر حبس تنفیذ عقوبۃ ہے (یعنی مقررہ سزا کے نفوذ کے انتظار میں قید کیا جائے)، اس صورت کے جواز میں آپ ﷺ کا قبیلہ بنوقریظہ کے غداروں کو روک رکھنا پھر ان کے قتل کا حکم دینا اس واقعہ سے استدلال کیا جاتا ہے (کتاب الخراج/۲۱۸) اس انتظار کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں، مثلاً عورت ہو اور حاملہ ہو، یا اولیاء قصاص میں سے کوئی غائب ہو، یا مجرم نشہ کی حالات میں ہو وغیرہ۔

یہ کلام تو قید بقصد الاستیثاق کی تفصیل میں تھا، اب تھوڑی تفصیل قید بقصد التعزیر کے تحت پیش خدمت ہے۔

حبس بالتعزیر کی مشروعیت

حبس بالتعزیر کی مشروعیت پر حضرت ابولبابہ کا واقعہ، اسی طرح ان عورتوں کو محبوس رکھنا جو فاحشہ (زنا) کا ارتکاب کریں وغیرہ سے استدلال کیا جاتا ہے، لیکن یہ قسم حبس بالتعزیر نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں دوسری سزاؤں کے مقابلہ میں قلیل الاستعمال رہی ہیں، البتہ سیدنا فاروقؓ وعثمانؓ وعلیؓ کے زمانہ میں یہ برابر استعمال ہوتی رہی۔

حبس بالتعزیر کا موجب کیا ہے تو فقہاء کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ حبس بطور تعزیر کے ان جرائم وافعال میں مشروع ہے جن میں حد نہ ہو، چاہے اس جرم کا تعلق حق اللہ سے ہو یا حق العباد سے ہو۔

حبس بالتعزیر کی اقل مدت ایک دن ہے (درمختار للحصکفی ۵/۳۸۴)۔ اکثر مدت کی کوئی حد نہیں بلکہ حاکم کی صوابدید پر محمول ہے (درمختار ۵/۳۸۹)۔

البتہ فقہاء کے کلام میں حبس قصیر وحبس طویل کا ذکر ملتا ہے، جیسا کہ ابن فرحون نے تبصرہ میں تصریح کی ہے، ایک سال سے کم حبس قصیر ہے اور ایک سال سے زیادہ مدت حبس طویل ہے، فقہاء نے اس بات کی بھی صراحت کی ہے کہ چھوٹے چھوٹے جرائم میں حبس قصیر ہوگا جیسا کہ پڑوسی کو ستانے والے کو تین دن قید کیا جائے گا (ونشریسی ۲/۴۰۲)۔

اسی طرح بڑے گناہ والے یا عادی مجرم کو حبس طویل کی سزا دی جائے گی (ابن فرحون ۲/۱۴۲، ابن عابدین ۴/۴۷)، ان تصریحات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اگر حاکم حبس کی تحدید کردے کہ فلاں جرم میں اتنی مدت کی قید ہوگی تو یہ جائز ہے، ایک مسئلہ یہاں یہ بھی ہے کہ کیا حبس مؤبد جائز ہے کہ نہیں تو کتاب وسنت وکلام فقہاء سے اس کے جواز کا پتہ چلتا ہے جیسا کہ آیت کریمہ: "حتى يتوفاهن الموت... الخ" اور حدیث: ''إن رسول الله ﷺ قتل ثلثة مشركين صبرًا'' سے مصرح ہے (اخرجه ابوداؤد في مراسيله)، نیز کاہلی کی بنا پر نماز ترک کرنے والا، عمل لوطی کا مرتکب وغیرہ کی سزا فقہاء نے حبس دائمی ذکر کی ہے (شامی ۴/۲۷)۔

اسی طرح قید تنہائی جائز ہے جیسا کہ سیدنا عمرؓ نے حطیئہ شاعر کو کنویں میں بند کردیا (ابن فرحون ۲/۲۱۷)، نیز فقہ کی کتابوں میں مدیون متعنت کو تنہا قید کرنے کا ذکر ہے (ابن عابدین ۵/۳۷۷)، اسی طرح مخنث کو تنہا قید کرنے کا ذکر ہے (فتاوی ابن تیمیہ ۱۵/۳۱۰)، لیکن یہ یاد رہے کہ شریعت مطہرہ میں خاص خاص اسباب اور مصالح کے پیش نظر ہی قید تنہائی روا ہے جیسا کہ مظاہر حق اور دین حق سے سرکشی کرنا، دوسروں کو ہمیشہ سب وشتم کرتے رہنا، اخلاق کی تخریب کاری، فساد فی الارض وغیرہ، لہذا اگر یہ اندیشہ ہو کہ قید تنہائی کے سبب مجرم کی اصلاح نہیں ہوگی اور وہ عبرت حاصل نہیں کرے گا تو اس صورت میں قید تنہائی مناسب نہ ہوگی، الغرض حاکم وقت جو مصلحت سمجھے وہ کرے، یاد رہے کہ یہ قید تنہائی ہمیشہ کے لئے نہ دے بلکہ اتنی ہی مدت کافی ہے جس میں عبرت کی توقع ہو جیسا کہ بعض ممالک عربیہ میں قید تنہائی کی مدت ۱۵ دن یا اس سے کم تھی جیسا کہ تونس، کویت، مصر (احکام السجن)۔

یہ پوری بحث صرف قید کے متعلق ہے، اب ہم سوالات کا جائزہ اس تفصیل کی روشنی میں لیں گے:

۱- بغیر کسی ثبوت جرم کے کسی کو بقصد الاحتراز قید کر سکتے ہیں اور اس کی مدت کی کوئی تعیین نہیں، حاکم کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے، البتہ اس کے ساتھ مجرم قیدی جیسا برتاؤ نہیں کیا جائے گا۔

۲- کسی مجرم کو خصوصی جرم کی بنا پر قید تنہائی میں رکھا جا سکتا ہے۔

۳- مجرم قیدی اور ملزم قیدی کے درمیان فرق کیا جائے گا اور ملزم کو زیادہ رعایت دی جائے گی۔

۴- تہمت کی بنا پر قید کرنا درست ہے جیسا کہ تفصیلاً گزر چکا ہے۔

۲-(الف): مذہبی امور:

۱- قیدی کو عبادت کی اجازت ہوگی بلکہ سجون اسلامیہ میں توکوتوال کو پابند بنایا جائے گا کہ وہ دھیان رکھے کہ مسلمان قیدی نماز کا اہتمام کرتے ہیں یا نہیں؟ احکام السجن میں معالم القربۃ لابن الاخوۃ (ص/ ۱۸۴) کے حوالہ سے ہے:

''نصوا على أن من وظائف المحتسب مراقبة السجناء في أداء فرائضهم'' (احكام السجن /۳۸۷)۔

شامی (۵/ ۳۷۸) میں ہے:'' ويجب تمكين السجن من الماء للوضوء ونحوه ويحرم منعه من ذلك''۔

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے گورنروں کو خط میں لکھا تھا: ''لا تدعنّ في سجونكم أحدًا من المسلمين في وثاق لا يستطيع أن يصلي دائمًا ولا يبيتنّ في قيد إلا رجلًا مطلوبًا بدم'' (كتاب الخراج/ ص ۱۶۲)۔

۲- دعوت دین کے سلسلہ میں سیدنا یوسفؑ کی دعوت بہترین مثال ہے، اسی طرح مرتد کو تین دن تک جو تذکیر کرنے کی روایات ہیں وہ بھی حق دعوت وضرورت دعوت پر دال ہیں۔

۳- مطالعہ کتب وغیرہ کی بھی آزادی ہوگی، احکام السجن/ ۳۸۳ پر بحوالہ بدایہ لابن کثیر (۱۴/ ۱۴۰) ہے:''كان يسمح للسجناء في السجون الإسلامية بإدخال الكتب والأقلام والأوراق للقراءة والكتابة كما فعل هارون مع أبي العتاهيه''

۴- مذہبی شخصیات وکتب کا احترام تو ویسے بھی آیت کریمہ ''ولا تسبوا الذين الخ'' سے مصرح ہے جس میں قید وآزادی کی کوئی حد نہیں ہے۔

(ب) جسمانی ضروریات

۱- مناسب غذا و پانی اور کپڑے فراہم کرنا حکومت کی اپنی ذمہ داری ہوگی، نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو ثمامۃ بن اثال کی جب کہ وہ قیدی تھے دیکھ بھال کرنے کا حکم دیا تھا، یہ حکم کتنا فکر انگیز ہے۔

''أجمعوا ما عندكم من طعام فابعثوا به إلى ثمامة بن أثال (فتح الباري ۸/ ۸۸)

یہود بنو قریظہ جب غزوہ احزاب میں قید ہوئے اور گرمی بہت تھی تو آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کو ان کے متعلق حکم دیا:

''لا تجمعوا عليهم حرّ هذا اليوم وحر السلاح واسقوهم وقيّلوهم (بدائع ۷/ ۱۲۰)

،امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج (ص ۱۶۱) میں نقل کیا ہے:

وكتب عمر بن عبد العزيز إلى عماله أن أجروا على السجناء ما يصلحهم في طعامهم وإدامهم. وكتب أبو يوسف كتابًا إلى خليفة هارون الرشيد يوصيه بإطعام السجناء وتغذيتهم ونصح أن يختص لهم مبالغ من المال (الخراج: ۱۶۲)

یہ ساری وضاحتیں اسی آیت کریمہ "ويطعمون الطعام على حبه مسكينًا ويتيمًا وأسيرًا" کی رہین منت ہیں، کپڑوں کے سلسلہ میں امام بخاریؒ نے باب ہی قائم کر دیا: باب الکسوۃ للأساری۔ سیدنا علیؓ قیدیوں کو سال میں دو مرتبہ گرمی اور ٹھنڈی میں کپڑا دیتے تھے (الخراج/ص ۱۶۱)۔

۲- صحت وراحت کا جہاں تک مسئلہ ہے تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہ فرمان کافی ہے: ''انظروهن في السجون وتعهدوا المرضى'' (ابن سعد ۵/۳۵۶)، فقہاء کرام نے بھی اس مسئلہ کو بیان کیا ہے: ''إذا مرض المحبوس في سجنه وأمكن علاجه فيه فلا يخرج لحصول المقصود'' (شامی ۵/۳۷۸)، ''ولا يمنع الطبيب والخادم من الدخول عليه لمعالجته وخدمته'' (فتح القدیر ۵/۴۷۱)، یہ تو اس وقت ہے جب اس کا علاج قید خانہ میں ممکن ہو، اور اگر ممکن نہ ہو تو ''أنه يخرج من سجنه للعلاج والمداواة لصيانة نفسه'' (فتح القدیر ۵/۴۷۱)، بلکہ فقہاء نے تو نظافت وطہارت کے مسائل بھی بیان کئے ہیں کہ نظافت کا اثر صحت پر ہوتا ہے۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں:

''ينبغي تمكين السجين من إزالة شعره في الحبس'' (ہندیہ ۳/۴۱۸)۔

۳- بیوی سے تعلق رکھنے کے سلسلہ میں فقہاء کے درمیان مختلف آراء پائی جاتی ہیں، کچھ لوگوں کی رائے یہ ہے کہ قید ایک زجر ہے اور وطی ایک لذت ہے لہذا وطی کی اجازت دینے سے معنیٰ زجر حاصل نہیں ہوگا، جب کہ دوسری رائے یہ ہے کہ جب مصلحت کے خلاف نہ ہو اور میاں بیوی کے لئے رات گزارنے کی قید خانہ میں موزوں جگہ ہو تو قیدی کو وطی کی اجازت دی جائے گی کہ یہ بھی شہوت فرج ہے جس طرح شہوت بطن ہوتی ہے (فتح ۵/۴۷۱، ہندیہ ۳/۴۱۸)، بلکہ بعض احناف نے بیوی کو شوہر کے ساتھ رکھنے کو مستحب لکھا ہے جب کہ بیوی کو فساد و بے راہ روی کا اندیشہ ہو (شامی ۵/۳۷۷، بزازیہ ۵/۲۳۵)۔

۴- تنگ جگہ میں قید کرنے کو ہمارے فقہاء نے روا نہیں رکھا ہے۔ احکام السجن میں بحوالہ الافصاح لابن ہبیرہ ہے: ''لا أعرف أنه يجوز لأحد من المسلمين جمع الكثير في حبس يضيق عنهم غير متمكنين من الوضوء والصلوة (احکام السجن ۱/۳۹)۔

(ج) عام سماجی حقوق

۱- تعلیم وہنر: تعلیم اور ہنر کی اہمیت اسلام میں جس قدر تھی اسی قدر ضروری تھا کہ وہ اس تعلیم کو عام کرے، لہذا اسلام نے قیدیوں کی تعلیم کو نہ صرف جائز رکھا بلکہ مستحسن نظروں سے دیکھا، ایسے ہی ہنر کو بھی، اس سلسلہ میں سیدنا یوسفؑ کی تعلیم وتبلیغ مثالاً پہلے پیش کی جاچکی ہے۔ بدر کے قیدیوں کا واقعہ بھی عمدہ مثال ہے۔

۲- ملاقات: قیدی کے دوست واحباب اس سے ملاقات کر سکتے ہیں، مبسوط سرخسی (۲۰/۹۰) میں ہے:

'لا يمنع المحبوس من السلام على أصدقائه والحديث معهم إلا من يخشى أن يعلمه الحيلة فيمنع'۔

اسی طرح گھر والوں اور پڑوسیوں کو بھی ملاقات سے نہیں روکا جائے گا البتہ دیر تک بیٹھے رہنے سے روکا جائے گا:

''ولا يمنع المحبوس من دخوله أهله وجيرانه للسلام عليه ويمنعون من طول المكث عنده'' (مبسوط ۲۰/۹۰)۔

۳- اسی طرح ان کو خط وپیغام کی اجازت ہوگی جس طرح ان کو روبرو گفتگو کی اجازت ہے، ہاں اگر یہ مصلحت کے خلاف ہو تو روک دیا جائے گا۔

علامہ ابن کثیر نے (البدایہ ۱۴/۴۸) میں فقیہ ومحدث مرد مجاہد علامہ ابن تیمیہؒ کے متعلق بیان کرتے ہیں:

''ولما حبس ابن تيمية استمر في سجنه يستفتي ويقصده الناس ويزورونه''۔

۴- اسی طرح حاکم وقت کے نزدیک اگر مصلحت کے خلاف نہیں ہو تو ان کو فون، ریڈیو، اخبار وغیرہ مہیا کر سکتے ہیں، احکام السجن (ص/۴۹۷) میں ہے:

''وإن رأى الحاكم مصلحة في اطلاع المحبوس على أنواع الكتب والصحف الهادفة لتعريفه بالأنباء المهمة والأخبار المفيدة وتزويده بالثقافة فله أن يفعل ذلك ومثل هذا تمكينه من الاستماع إلى مذياع''۔

اخلاقی امور

یعنی مرد وعورت بالغ ونابالغ کو قید خانہ میں علیحدہ رکھنا: یہ خصوصیات اسلام میں سے ہے کہ جہاں جرم پر روک لگاتا ہے وہیں اس جرم کے اسباب سے بھی دور رہنے کا حکم دیتا ہے: ''ولا تقربوا الزنا'' اس پر شاہد عدل ہے، سد ذرائع میں سے ایک ممانعت خلوۃ الرجال مع النساء بھی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دین

فطرت نے اس خلوۃ قبیحہ کا خیال قید کی حالت میں بھی رکھا، بنو قریظہ کے قیدیوں کے سلسلہ میں نبی کریم ﷺ کا یہ معمول زرقانی (۲/۱۳۶) نے بیان کیا ہے، آپ ﷺ نے مرد و عورت دونوں کو الگ الگ رکھا ہے:

''أنه حبس رجال بني قريظة في ناحية وجعل نسائهم وذريتهم في ناحية أخرى''۔

علامہ سرخسی مبسوط (۲۰/۹۰) میں تحریر فرماتے ہیں:

''أنه ينبغي أن يكون للنساء محبس على حدة ولا يكون معهن رجال تحرزا من الفتنة''

لہذا مردوں کا قید خانہ الگ ہوگا اور عورتوں کا الگ۔

۲- جہاں تک بالغ و نابالغ کی بات ہے تو اولاً نابالغ تو عقوبہ کا اہل ہی نہیں، البتہ اس کو بطور تادیب کچھ سزا دینا چاہے تو دے سکتے ہیں، علامہ طرابلسی (ص ۱۷۴) پر تحریر فرماتے ہیں: ''وقال آخرون بجواز حبس الحدث الفاجر على وجه التأديب لا العقوبة''. لہذا اگر نابالغ کو تادیبًا قید کرلیا جائے تو اسے کہاں رکھا جائے، اگر اس کو بڑوں کے پاس رکھیں تو کئی مفاسد ہیں، لہذا نابالغ کو اس کے ولی کے پاس ہی قید رکھا جائے گا جیسا کہ علامہ شامی نے مرتدہ صغیرہ کا حکم بیان کیا ہے: إن المرتدة الصغيرة ونحوها تحبس عند وليها حتى تتوب'' (در ۴/۲۵۳)۔ علامہ ونشریسی (۸/۲۵۸) پر فرماتے ہیں: ''إذا خشي عليه ما يفسده توجب حبسه عند أبيه لا في السجن''۔ لہذا مناسب یہ ہے کہ نابالغ کو اس کے ولی کے پاس ہی قید کیا جائے، لیکن اگر اس صورت میں تادیب نہ ہو تو حکومت وقت ان کا الگ قید خانہ بنائے جیسا کہ حکومت تونس اور حکومت کویت نے کیا ہے۔

قیدی کی تادیب

اس بات پر تو سب متفق ہیں کہ قیدی کی تادیب جائز ہے، کن باتوں پر تادیب کر سکتے ہیں اس کو بھی فقہاء نے بیان کیا ہے مثلاً:

(۱) جو جرم کا عادی ہو یا لوگوں کے درمیان خوف و ہراس پھیلاتا ہو (ابن فرحون ۲/۱۶۲)

(۲) حق چھپاتا ہو یا مجرم کا پتہ نہ دیتا ہو (السیاسۃ/۱۹)

(۳) مالدار قرض دار جب قرض ادا نہ کرے (در ۵/۳۷۹)

(۴) بنو ہاشم کو گالیاں دے یا علماء یا اسلاف کو برا بھلا کہے (ابن فرحون ۲/۳۰۷) وغیرہ وغیرہ۔

فقہاء نے اس بحث کو اٹھایا ہے کہ تادیب کی کیا صورت ہوگی، اس کو اجمالاً ذکر کر دیتا ہوں:

(۱) زجر و توبیخ و دھمکانا (۲) حلق رأس (ابن فرحون ۲/۳۰۴)، (۳) ضرب کے ذریعہ، پھر فقہاء نے ضرب میں کافی تفصیل کی ہے۔ (۴) بیڑیاں ڈالنا "فشدوا الوثاق" سے اس پر استدلال ہے، اسی طرح آپ ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص کو بیڑیاں ڈالی گئی تھیں (مسلم ۳/۱۲۶۲)۔

بیڑیاں کب ڈالی جائیں گی اس کی مختصر وضاحت یہ ہے:

(الف) قیدی مطلوب بالدم ہو (دسوقی ۴/۳۵۷) (ب) مفسد شریر ہو (ھدایہ ۴/۷۷)، (ج) بھاگ جانے کا اندیشہ ہو (ونشریسی ۲/۳۱۷)۔

(د) یا یہ کہ بیڑیاں اس کے لئے باعث عبرت ہو (شامی ۴/۶۶)،

(۵) تادیب کی ایک صورت قیدی کو کچھ چیزوں سے محروم کر دینا ہے جیسے: (الف) لوگوں سے ملاقات و بات چیت سے محروم کردے (ھندیہ ۳/۳۱۹)، (ب) اسباب راحت سے محروم کردے (شامی ۵/۳۷۷)، (ج) بعض عبادات سے محروم کردے جیسے جمعہ و جماعت (شامی ۵/۳۷۵)۔ (د) غذا کم کردے، (و) کام سے روک دے (شامی ۵/۳۷۵)، وغیرہ وغیرہ۔ تادیب کی ایک صورت قید تنہائی گزر چکی ہے۔

جہاں فقہاء نے تادیب کی مختلف صورتوں کو ذکر کیا ہے وہیں پر ان صورتوں کا بھی ذکر کیا ہے جن سے تادیب ناجائز ہے جیسے:

(۱) مثلہ کرنا، یا بدن کے کسی عضو کو معطل یا اکھاڑ پھینکنا (ابن قدامہ ۸/۳۳)، (۲) چہرے پر مارنا، گردن میں طوق ڈالنا، جسم کے نازک حصوں پر مارنا

(در دیر ۴/ ۵۴ ۳، شامی ۵/۷۹ ۳)، (۳) قیدی کے جسم کو الکٹرک شاک دینا، داغنا، لا تعذبوا بعذاب اللّٰہ کے پیش نظر، (۴) قیدی کو بھوکا رکھنا یا اسے نہایت گرم جگہ یا نہایت ٹھنڈی جگہ رکھنا (ماوردی الاحکام/۲۳۹، کتاب الخراج/ص ۱۱۸)، (۵) کپڑوں سے برہنہ کرنا (ماوردی/ص ۲۳۹)، (۶) نماز وضو سے روکنا حوالہ گزر چکا ہے، (۷) قیدی کو گالیاں دینا یا اس کے ماں باپ کو برا بھلا کہنا (ماوردی/۲۲۶) (۸) داڑھی کا مونڈنا (ابن فرحون ۲ / ۳۱۲)، (۹) کتے وغیرہ چھوڑنا (کتاب الخراج/۱۱۸)، (۱۰) ناخن کھینچ لینا، سونے نہ دینا وغیرہ، یہ سب صورتیں حرام ہیں۔

قیدیوں سے کام لینا

قیدیوں سے کام لئے جانے کے سلسلہ میں فقہاء کی رائے دونوں طرف ہے، جواز وعدم جواز (شامی ۵/۷۸ ۳)، جن لوگوں کی نظر زجر وردع کی طرف ہے انہوں نے منع کر دیا اور جن لوگوں نے اصلاح وتقویم وتہذیب اور ادا نفقہ وغیرہ کی طرف نظر کی، انہوں نے اجازت دی، مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ قیدی سے مناسب کام (کھیتی، باغبانی اور کوئی ہنر) انسانی دائرہ میں رہتے ہوئے اجرت مستحقہ کے ساتھ لیا جائے، جس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جب قیدی سزا کاٹ کر باہر جائے گا تو ایک ہنر اس کے پاس ہوگا، دوسرا یہ کہ اگر وہ بیکار بیٹھا رہے گا تو کاہلی اور خیالات فاسدہ کا شکار ہوگا، مگر یہ بات یاد رہے کہ اس سے وہی کام لئے جائیں جس کی وہ طاقت رکھے اور اس کو اس کی پوری پوری مزدوری دی جائے، اس سلسلہ میں مزدور کے لئے وارد احادیث مبارکہ پر نظر رکھنی چاہئے، قیدی کی تشغیل کے سلسلہ میں اساری بدر سے استدلال کیا جا سکتا ہے، جن کو تعلیم کے کام میں لگایا تھا، اوپر گزر چکا ہے کہ اجرت مستحقہ کے ساتھ جس کا مطلب یہی ہے کہ قیدی کو اجرت دی جائے گی۔

حق ازالہ حیثیت عرفی

شریعت مطہرہ نے حبس بالتہمۃ کی اجازت تو دی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ سست رفتار عدالتی نظام کی وجہ سے ایک ملزم کو سالہا سال تک قید میں رکھا جائے اور گرفتاری کے موقع پر بھی جی بھر کے اخبار کی سرخیاں بنا کر اسے بدنام کیا جائے اور اسے یوں سماج کی نگاہ میں بے وقعت بنا کر رکھ دیا جائے، پھر جب بے قصور ثابت ہو جائے تو وہ پیسے پیسے کا محتاج اور عزت کا بھکاری ہو جائے، فقہاء نے ایک مسئلہ بیان کیا ہے کہ جب شاہدوں کی شہادت سے کسی پر حد یا قصاص نافذ کر دی جائے پھر شاہد اپنی شہادت سے رجوع کرے تو ان گواہوں پر دیت آئے گی (موصلی فی الاختیار ۴/۸۱)، اسی طرح اگر دوران تعزیر مجرم کا کوئی عضو تلف ہو جائے تو شافعیہ کا مسلک یہ ہے کہ حاکم ضامن ہوگا (ماوردی/۲۳۸)، لہذا اس زمانہ میں بڑھتی ہوئی بے جا گرفتاریوں کو روکنے کے لئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر بغیر قرینہ کے گرفتار کیا یا مجہول الحال شخص کو کشف حال کے لئے زائد از مدت قید میں رکھا یا بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے لمبی قید میں ڈال دیا، جیسے پوٹا وغیرہ، پھر یہ گرفتار شدہ شخص بے گناہ ثابت ہوا تو وہ الضرر یزال کے تحت حکومت سے مالی، ذہنی وعرفی ہونے والے نقصان کا ہرجانہ طلب کر سکتا ہے۔

حق وکالت: ہر انسان بری الذمہ پیدا ہوا ہے، اصل یہی ہے کہ اس پر کوئی چیز ثابت نہ ہو، لہذا جب کسی پر کوئی جرم ثابت کیا جائے اور وہ منکر ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اصل کے مطابق بات کر رہا ہے، لیکن ہر منکر سچا نہیں ہوتا، اسی طرح ہر ملزم مجرم بھی نہیں ہوتا لیکن کبھی ملزم (متہم) قانون والوں اور طاقت کے سامنے اپنی بات کو ٹھیک سے نہیں رکھ سکتا یا اس کی آواز دبا دی جاتی ہے، اس وقت حق دفاع اگر کوئی استعمال کرنا چاہے اور کسی کو اپنا وکیل بنائے تو بیشک یہ اپنا حق استعمال کر رہا ہے، اس لئے اس کی اجازت میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

قیدی خواتین کے ساتھ شیر خوار بچے

اس سلسلہ میں کوئی صریح جزئیہ تو نظر سے نہیں گزرا، البتہ حضانت پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو ماں کے فاسقہ یا مسافرۃ بسفر انقطاع وغیرہ ہونے پر ماں کا حق حضانت ساقط ہو جاتا ہے (شامی ۳/۵۶۰) اور حکمت اس میں بچہ کی نگہداشت وصحیح تربیت ہے، لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بچہ کی تربیت کے پیش نظر اگر بچہ کے لئے دودھ کا انتظام ہو جاتا ہے اور بچہ دوسرے کے پاس رہ سکتا ہے تو بچہ کو ماں کے ساتھ جیل میں نہ رکھا جائے بلکہ باپ دادا یا جو کوئی ولی ہو اس کو دودھ وتربیت کا ذمہ دار بنایا جائے، اس لئے کہ قید خانہ میں عامۃً مجرمین ہوتے ہیں اور ماحول کا اثر بچہ پر پڑتا ہے، اس لئے یہی مناسب ہے کہ بچہ ماں کے پاس نہ رہے اور اگر بچہ ماں کے سوا کسی کا دودھ نہیں پیتا یا ماں کے علاوہ کسی کے پاس نہیں رہتا تو پھر ماں کے پاس ہی رہنے دیا جائے۔

لیکن اگر امراۃ غامدیہ کے واقعہ سے استئناساً بچہ کے سمجھدار ہونے تک قید ہی کی ملتوی کر دیا جائے تو بہتر ہوگا۔

قیدیوں کے مسائل شرعی نقطہ نظر سے

مولانا اختر امام عادل القاسمی [1]

اسلام نے اپنی تمام تعلیمات میں قیدیوں کے ساتھ عام انسانی احترام میں کوئی کمی نہیں کی، اسلامی نقطہ نظر سے ہر انسان ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوا ہے اس لئے اس کو اپنے حقوق کے معاملے میں پوری آزادی ملنی چاہئے۔ البتہ انسان کبھی ایسی سرگرمیوں میں ملوث ہوجاتا ہے، جو عام انسانی اجتماع کے لئے ضرررساں ثابت ہوتی ہیں، ایسے موقع پر عام انسانی مفادات کے تحفظ کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ اس شخص کی سرگرمیوں کو محدود کیا جائے یا اس پر مکمل بندش عائد کردی جائے، اسی کے لئے قید کی ضرورت پڑتی ہے، حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں کوئی باقاعدہ قید خانہ یا جیل کا انتظام نہیں تھا۔ اور نہ کبھی ضابطہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کے لئے سزا تجویز فرمائی (اقضية رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم لابن فرح/۱۱، تبصرة الحكام لابن فرحون ۲/ ۲۱۶، الموسوعة الفقهيه ۱۶/ ۲۸۴)۔

صرف تحقیق حال کے لئے بعض ملزمین کو وقتی طور پر قید کا حکم فرمایا، مثلاً:

ایک مرتبہ قبیلہ بنو غفار کے دو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پیش کئے گئے، ان پر دو اونٹوں کی چوری کا الزام تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کو روک لیا اور دوسرے کو اونٹ تلاش کرنے کا حکم دیا، بالآخر وہ دوسرا شخص دونوں اونٹ لے کر دربار نبوت میں واپس ہوا اور پھر دونوں کی رہائی عمل میں آئی۔

(مصنف عبدالرزاق ۱۰/ ۲۱۶-۲۱۷)۔

قید کا نظام

عہد فاروقی سے اس کا آغاز ہوا اور ضرورت کے تحت قید خانہ کا نظام رائج کیا گیا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حکم پر مکہ کے گورنر نافع بن عبد الحارث نے اس غرض سے چار ہزار درہم میں صفوان بن امیہ کا مکان خریدا، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں باقاعدہ قید خانہ قائم کیا۔

(المبسوط ۲۰/ ۸۹، الطرق الحكميه/ ۱۰۳، الموسوعة الفقهيه ۱۶/ ۳۱۶)۔

نیز حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے مکہ مکرمہ میں اپنے اپنے عہد حکومت میں قید خانہ قائم فرمایا۔

(تفسیر خازن ۲/ ۱۷، زاد المعاد ۲/ ۴۷، الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۲۸۶)۔

پھر بعد کے ادوار میں تمام ہی مسلم حکمرانوں نے اس نظام کو باقی رکھا، اور اسلامی قاضیوں نے مختلف جرائم میں قید کی سزا تجویز فرمائی۔ لیکن یہ سب محض وقتی اور ناگزیر ضرورت کے تحت گوارا کیا گیا، اسی لئے قید کے کسی مرحلے پر بھی انسانی احترام کو نظر انداز نہیں کیا گیا، اسلام نے قیدیوں کے ساتھ مراعات اور حسن سلوک کی تعلیم دی، اور ہر حال میں اس پہلو پر دھیان مذکور رکھا ہے کہ وہ بھی تمہاری طرح انسان ہیں، ان کے پاس بھی ضروریات اور تقاضے ہیں اور وہ بھی جذبہ واحساس رکھتے ہیں، اور کل وہ بھی تمہاری طرح آزاد تھے، حالات زمانہ نے ان کو اس حال تک پہونچادیا ہے، اس لئے ان کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کرو۔

قیدیوں کے لئے اسلامی ہدایات

غزوہ بدر میں فتح کے بعد جنگی قیدی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کئے گئے تو زبان نبوت سے جو جملہ صادر ہوا وہ قیدیوں اور کمزور طبقہ کے لئے نبوت کا سب سے بڑا عطیہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"يأيها الناس إن الله قد أمكنكم وإنما هم إخوانكم بالأمس" (مجمع الزوائد ۸۷/۶)۔

---

[1] جامع ربانی منورواشریف۔

(اے لوگو! اللہ نے آج تم کو ان پر قدرت دی ہے اور کل یہ تمہارے بھائی تھے)۔

قرآن کریم میں قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا ابرار اور مقربین کی صفت قرار دیا گیا:

"ویطعمون الطعام علی حبه مسکینًا ویتیمًا وأسیرًا" (سورہ دہر: ۸)۔

(اور یہ لوگ پوری محبت وخلوص کے ساتھ مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت فرمائی:

''استوصوا بالأساری خیرا'' (طبرانی بحوالہ سیرۃ المصطفی ۱/ ۵۷۹ مولانا ادریس کاندھلوی) (قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت قبول کرو)۔

غلام جیسے کمزور طبقہ کے بارے میں فرمایا: '' فأطعمه مما تأکلون واکسوه مما تکسون '' (احمد، ابوداؤد، مشکوۃ/ ۲۹۲)۔

(جو خود کھاتے ہو ان کو کھلاؤ اور جو خود پہنتے ہو ان کو پہناؤ)۔

ان کی عزت نفس کا بھی پورا لحاظ رکھا، اور ارشاد فرمایا: ''لا تقل عبدی ولا أمتی ولکن قل فتائی وفتاتی'' (مجمع الزوائد ۶/ ۸۷)۔

(غلام اور باندی کہہ کر ان کو مت پکارو بلکہ اے میرے بچے اور اے میری بچی کہہ کر آواز دو)۔

انہی تعلیمات کا اثر تھا کہ عہد اول میں جن مسلمانوں کے پاس قیدی تھے وہ اول کھانا قیدیوں کو کھلاتے اور بعد میں خود کھاتے اور اگر کھانا نہ بچتا تو خود کھجور پر اکتفا کر لیتے۔

حضرت مصعب بن عمیر کے حقیقی بھائی ابوعزیر بن عمیر بھی ایک بار قید ہو کر آئے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں انصار کے جس گھر میں تھا ان کا یہ حال تھا کہ صبح وشام جو تھوڑی بہت روٹی بنتی وہ مجھ کو کھلا دیتے اور خود کھجور کھاتے، میں شرماتا اور ہر چند اصرار کرتا کہ روٹی آپ لوگ کھائیں لیکن نہ مانتے اور یہ کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم فرمایا ہے (مجمع الزوائد ۶/ ۸۶)۔

ملزم کو قید کرنے کا مسئلہ

محض الزام کی بنا پر کسی پر سزا نافذ نہیں کی جاسکتی، البتہ کبھی ایسی صورت پیش آسکتی ہے جس میں الزام کی تنقیح اور ثبوت کی فراہمی میں تھوڑا وقت لگ سکتا ہے، اس درمیانی مدت میں ملزم کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ اور اگرچہ کہ وہ ابھی مجرم نہیں ہے، لیکن تنقیح دعوی تک کیا اس کو ''قید'' میں رکھا جاسکتا ہے؟ اس باب میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔

۱- قاضی شریح، امام ابو یوسف، اور امام الحرمین کی رائے میں مکمل ثبوت کے بغیر محض الزام کی بنا پر کسی کو قید نہیں کیا جاسکتا، قاضی شریح نے ایک مالی معاملہ میں ماخوذ ملزم کو ثبوت نہ ملنے کی صورت میں محض قسم لے کر بری کر دیا تھا (تبصرۃ الحکام ۱/ ۴۰۷)۔

امام ابو یوسف اس طرح کی صورت میں زیادہ سے زیادہ کسی معتبر ضمانت دار کا مطالبہ کرتے ہیں، ضمانت مل جانے کی صورت میں ملزم کو اپنے گھر جانے کی اجازت ہے (کتاب الخراج/ ۱۹۰، ۱۹۱)۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ حضرت عمر بن الخطاب کا نقل کیا جاتا ہے کہ ان کے پاس ایک ملزم گرفتار کر کے لایا گیا، اور ثبوت فراہم نہ ہو سکا تو آپ نے اس کو چھوڑ دیا (المحلی لابن حزم ۱۱/ ۱۳۱، مصنف عبدالرزاق ۲۱۷/۱۰)۔

۲- بعض فقہاء حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ جن مقدمات میں ثبوت جرم کے بعد قید ہی کی سزا مقرر ہے، مثلاً مالی معاملات، ان میں مکمل ثبوت کی فراہمی کے بغیر ملزم کو قید میں رکھنا درست نہیں ہے۔

سحنون وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ جن مقدمات کی سزا قید نہیں مثلاً حدود وقصاص کے معاملات، ان میں عدالتی کارروائی مکمل ہونے تک ملزم کو قید میں رکھا جاسکتا ہے (حاشیۃ القلیوبی ۴/ ۳۰۶، در مختار مع رد المحتار ۴/ ۳۰، ۷/ ۲۹۹، العنایۃ للبابرتی ۵/ ۳۰۱، المغنی لابن قدامہ ۹/ ۳۲۸)۔

۳- جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اگر ملزم کوئی معروف اور نیک شخص ہو، اور اس کی ذاتی زندگی غیر مشتبہ اور صاف ستھری سمجھی جاتی ہو، تو ایسے شخص کو بلا

ثبوت قید کرنا یا سزا دینا درست نہیں، البتہ مستور الحال شخص کو تحقیق حال تک قید کرنا درست ہے، یا ملزم کوئی مشتبہ شخص ہو اور اس طرح کے الزامات اس پر لگتے رہے ہوں تو اس کو بھی قید کرنا درست بلکہ نسبتاً بہتر ہے (حاشیہ ابن عابدین ۴/۸۸، حاشیۃ الدسوقی ۳/۲۷۹، الاحکام السلطانیۃ للماوردی/۲۱۹، المغنی لابن قدامہ ۹/۳۲۸، بحوالہ الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/۲۹۲)۔

قید کی مدت

اکثر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ مشتبہ ملزم کے لئے قید کی کوئی مدت مقرر نہیں ہے، یہ حاکم کی صوابدید اور متعلقہ حالات پر موقوف ہے، جتنے دنوں میں صورت حال منقح ہو جائے، اتنے دنوں تک قید میں رکھنے کی گنجائش ہے، علامہ ابن تیمیہ نے اس قول کو امام مالک، امام احمد اور محققین حنفیہ کی طرف منسوب کیا ہے۔

(فتاوی ابن تیمیہ ۳۵/۳۹۷، حاشیہ ابن عابدین ۴/۸۸)۔

جب کہ مالکیہ کی یہ تصریح بھی ملتی ہے کہ مستور الحال کو لمبے عرصہ تک قید میں نہیں رکھا جا سکتا، لمبے عرصہ کا اطلاق ان کے نزدیک ایک سال سے زائد پر ہوتا ہے (تبصرۃ الحکام ۱/۲۶۶، بحوالہ الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/۲۹۴)۔

بعض فقہاء کا خیال ہے کہ مستور الحال ملزم کو ایک دن سے زیادہ قید نہیں کیا جا سکتا، کچھ لوگوں نے دو تین دن مقرر کیا ہے، اور بعض نے اس کو وسعت دے کر ایک ماہ تک کی اجازت دی ہے (حاشیہ ابن عابدین ۴/۸۸، تبصرۃ الحکام ۲/۱۴۸، المغنی لابن قدامہ ۹/۳۲۸)۔

مگر حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کا ظاہر مذہب وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ مدت کی کوئی تحدید نہیں کی جا سکتی، متعلقہ حالات اور حاکم کی رائے پر منحصر ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیز کی بھی یہی رائے نقل کی جاتی ہے (الاحکام السلطانیہ للماوردی/۲۲۰)۔

ایسے لوگ جن پر کسی قسم کا الزام تو نہ ہو، مگر ان سے مفاد عامہ کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو، ایسے لوگوں کو بھی نظر بند یا قید کرنے کی فقہاء نے اجازت دی ہے، فقہاء نے اس کی مثال میں ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کی نظر لگتی ہو (حاشیہ ابن عابدین ۶/۳۶۴، حاشیۃ القلیوبی ۴/۱۶۲، فتح الباری ۱۰/۲۰۵)۔

اسی طرح ایسے مجرمین جن کا جرم ثابت ہو چکا ہو، اور عدالت نے ان کو قابل سزا قرار دیا ہو، مگر بیماری یا کسی اور سبب سے متعلقہ سزا ان پر جاری نہ کی جا سکتی ہو تو سبب کے خاتمہ تک ان کو قید میں رکھنے کی اجازت ہے، بشرطیکہ مجرم ایسا ہو جس کے فرار کا اندیشہ ہو، بصورت دیگر اس کو آزاد رکھ کر سبب کے خاتمہ کا انتظار کیا جائے گا (درمختار مع رد المحتار ۴/۱۶، المدونہ ۵/۲۰۶)۔

۲-قیدیوں کے حقوق

جن ملزمین پر جرم ثابت ہو جائے اور عدالت ان کے لئے سزائے قید کا فیصلہ سنا دے، ان کو سزا کے طور پر قید خانہ میں رکھا جائے گا، مگر عام حالات میں ان کو عام انسانی حقوق سے محروم نہیں کیا جائے گا، اور ان کی بنیادی ضروریات کا پورا لحاظ رکھا جائے گا، فقہاء اسلام نے پوری تفصیل کے ساتھ ان امور پر روشنی ڈالی ہے، مثلاً:

الف-مذہبی امور

قیدیوں کو ان کے مذہبی امور میں مکمل آزادی حاصل ہوگی، وہ اپنے مذہب کے مطابق عبادت وغیرہ انجام دے سکیں گے، ان کے مذہب کے مطابق ان کو غذا فراہم کی جائے گی۔ فقہاء نے صراحت کی ہے کہ مسلم قیدیوں کو وضو اور نماز وغیرہ سے روکنا درست نہیں ہے۔

(درمختار مع رد المحتار ۵/۳۷۸، ۳۷۹، حاشیۃ القلیوبی ۴/۲۰۵)۔

اگر جمعہ اور عیدین کا انتظام قید خانہ میں ہو، اور شرائط جمعہ بھی موجود ہوں تو قیدیوں کو قید خانہ ہی میں جمعہ وعیدین کی اجازت ہوگی، حنفیہ کے کلام سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ قیدیوں کے لئے جمعہ کی اجازت ہے، اور اگر جمعہ کا انتظام نہ ہو تو قیدی تنہا تنہا ظہر ادا کریں گے (ہدایہ ۱/۶۳، المبسوط ۲/۳۶)۔

بعض حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ قید خانہ میں جمعہ وعیدین کا انتظام نہ ہونے کی صورت میں قیدیوں کو باہر نکلنے کی اجازت ہوگی، شافعیہ میں بغویؒ، اور بویطی اور حنفیہ میں سرخسی کی بھی یہی رائے معلوم ہوتی ہے (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/۳۲۱، بحوالہ غایۃ المفتی الکرمی ۱/۲۰۶، روضۃ الطالبین ۴/۴۰)۔

مگر مذاہب اربعہ کے جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ جمعہ وعیدین کے لئے قیدیوں کو باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے، البتہ اگر بعض قیدیوں کے لئے حاکم اس میں مضائقہ نہ سمجھے تو حرج نہیں (اولسموعة الفقهية ۱۶/ ۳۲۱، بحوالہ حاشیہ ابن عابدین ۵/ ۳۷۷، المبسوط ۲۰/ ۹۰، المغنی ۲/ ۳۳۹ وغیرہ)۔

ظاہر ہے کہ اس عموم میں ان کی مذہبی کتابوں کا احترام بھی شامل ہے، اس لئے کہ قید کا مقصد تادیب واصلاح ہے، توہین آمیز یا اشتعال انگیز سلوک کی ہرگز اجازت نہیں ہوگی، اس لئے کہ اس سے ردعمل کی نفسیات جنم لیتی ہیں، اور اصلاح کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔

رہا دوسرے قیدیوں کے درمیان دعوت دین کا کام تو یہ حاکم کی صوابدید پر موقوف ہونا چاہئے، اس لئے کہ دعوت اس کی بنیادی یا مذہبی ضروریات میں شامل نہیں ہے، نیز دعوتی کام کبھی قیدیوں میں گروپ بندی بھی پیدا کرسکتی ہے، اور داعی قیدی اس طرح قوت بھی حاصل کرسکتا ہے، اس لئے اس کی اجازت حاکم کی رائے پر منحصر ہوگی، داعی قیدی کے شخصی حالات اگر مثبت محسوس ہوں تو حاکم اس کو دعوتی کام کی اجازت دے سکتا ہے ورنہ نہیں۔

ب- جسمانی ضروریات

قیدیوں کی جسمانی ضروریات اور بنیادی راحت وآرام کا لحاظ رکھنا بھی لازم ہے، مثلاً مناسب غذا اور پینے کا صاف ستھرا پانی فراہم کیا جائے گا، حفظان صحت کے لئے اگر ورزش وتفریح کی ضرورت ہو تو اس کی اجازت ہوگی، ایسی تنگ جگہوں میں قیدیوں کو رکھنا درست نہیں ہے جہاں ہوا اور روشنی کا گذر نہ ہو، یا جہاں کھڑا ہونا یا پاؤں پھیلا کر لیٹنا ممکن نہ ہو، جہاں گھٹن کا احساس ہو، یا ایسی جگہ پر رکھنا جہاں دھواں بھرا ہوا ہو، یا سخت گرم یا سخت ٹھنڈے مکان میں جہاں زندگی دشوار ہو، یا کھلے آسمان کے نیچے جہاں گرمی یا سردی سے جسم بیمار پڑ جائے، ایسی جگہوں پر قیدیوں کو رکھنے کی اجازت نہیں ہے، فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اگر کسی قیدی کو ایسے تنگ مقامات پر رکھا گیا، یا غذا اور پانی کا معقول انتظام نہیں کیا گیا، اور وہ مر گیا تو اس کی دیت اس شخص کے ذمہ لازم ہے جس کی لاپرواہی سے قیدی کا یہ انجام ہوا ہے۔ بلکہ بعض فقہاء نے تو قصاص کو واجب کیا ہے۔

(الاحکام السلطانیہ للماوردی/ ۲۳۹، حاشیہ ابن عابدین ۲/ ۴۲۱، فتاوی ہندیہ ۳/ ۴۱۴، الموسوعة الفقهية ۱۶/ ۳۲۷)۔

طبی سہولیات

طبی سہولیات بھی قیدیوں کو فراہم کی جائے گی، اور اگر جیل میں یہ سہولتیں میسر نہ ہوں تو شافعیہ اور مالکیہ ان کو جیل سے باہر لے جانے کی اجازت دیتے ہیں، البتہ مفتی بہ قول میں حنفیہ یہ قید لگاتے ہیں کہ بیمار قیدیوں کو باہر لے جانے کے لئے معتبر ضمانت شرط ہے۔ مسلم خلفاء اور حکمرانوں کا تعامل اس باب میں شروع سے یہی رہا ہے کہ قیدیوں کی جسمانی صحت اور طبی سہولیات کی طرف پوری توجہ دی گئی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے باقاعدہ ایک فرمان کے ذریعہ مملکت کے تمام افسروں کو اس کی طرف خصوصی طور پر توجہ دلائی تھی، خلیفہ مقتدر کے زمانہ میں ڈاکٹروں کی خصوصی خدمات بیمار قیدیوں کے لئے حاصل کی گئی تھیں۔ اور دوا علاج کا پورا انتظام بنایا گیا تھا، یہ ڈاکٹر ہر روز قید خانہ پہنچ کر قیدیوں کا معائنہ کرتے اور علاج تجویز کرتے تھے (حاشیة ابن عابدین ۵/ ۳۷۸، فتاوی ہندیہ ۴/ ۴۱۸، شرح ادب القاضی للخصاف ۲/ ۳۷۵، حاشیة القلیوبی ۲/ ۲۹۲، طبقات ابن سعد ۵/ ۳۵۶، الموسوعة الفقهية ۱۶/ ۳۲۱)۔

بیوی سے تعلق کے سلسلے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں:

۱- ایک رائے جس کو اکثر حنفیہ نے اختیار کیا ہے، اور حنابلہ کا مذہب بھی یہی ہے کہ قیدی کو بیوی سے ملنے کی اجازت دی جائے گی بشرطیکہ تنہائی کی ایسی جگہ وہاں میسر ہو، اس لئے کہ پیٹ کی طرح شرم گاہ کی بھوک بھی ایک ضرورت ہے، اس لئے اس ضرورت سے اس کو روکا نہیں جائے گا۔

(المغنی ۷/ ۳۴، ۳۵، ہدایہ ۳/ ۲۳۱، فتح القدیر ۵/ ۴۷۱، فتاوی ہندیہ ۳/ ۴۱۸)۔

۲- دوسری رائے جس کو مالکیہ کا مذہب کہا گیا ہے، بیوی سے تنہائی میں ملنے کی اجازت نہیں ہوگی، اس لئے کہ جنسی تعلق کھانے کی طرح حوائج اصلیہ میں شامل نہیں ہے، نیز اس طرح کی لذتوں سے روکنے سے قیدی کی دل شکنی ہوگی، اور وہ اپنے اصلاح حال کی طرف زیادہ تیزی کے ساتھ توجہ دے گا۔

(الشرح الکبیر للدردیر ۳/ ۲۸۱، تبصرة الحکام ۲/ ۲۰۵، الموسوعة الفقهية ۱۶/ ۳۲۴)۔

۳- اور بعض شوافع کی رائے ہے کہ یہ بھی حاکم کی صوابدید پر موقوف ہے، اگر وہ مصلحت سمجھے تو اجازت دے دے ورنہ نہیں۔

(حاشیة القلیوبی ۲/ ۲۹۲، الموسوعة الفقهية ۱۶/ ۳۲۴)۔

ج - سماجی حقوق

قیدیوں کو عام حالات میں اخبارات پڑھنے، ریڈیو سننے، تعلیم وہنر سیکھنے، احباب واقارب سے رابطہ رکھنے اور دوسرے قیدیوں سے ملنے کی اجازت ہوگی، البتہ اگر کسی وجہ سے حاکم وقت بعض قیدیوں کے لئے اس کو خلاف مصلحت سمجھے تو اس پر پابندی عائد کرسکتا ہے، بعض شوافع سے اس کی صراحت نقل کی گئی ہے۔ (دیکھئے: حاشیۃ القلیوبی ۲/ ۳۹۲، اسنی المطالب مع حاشیۃ الرملی ۲/ ۱۸۸، الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۳۲۴)۔

اسی طرح حاکم کو اس کی اجازت ہے کہ کسی خاص مجرم کو اس کے جرم کے پس منظر میں قید تنہائی کی سزا دے، جہاں کسی سے ملنے کی اس کو اجازت نہ ہو، فقہاء نے اس کی بھی صراحت کی ہے (المبسوط ۲۰/ ۹۰، فتاوی ابن تیمیہ ۱۵/ ۳۱۰، المغنی ۸/ ۱۲۴، الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۳۱۹)۔

د- اخلاقی امور

فقہاء نے جرائم کے لحاظ سے الگ الگ قید خانہ یا قید خانہ میں الگ الگ حصے بنانے کی تجویز دی ہے۔

امام ابو یوسفؒ نے اپنی کتاب "الخراج" میں باقاعدہ ایک باب اس عنوان پر قائم کیا ہے اور مجرمین کو بنیادی طور پر تین حصوں میں منقسم کیا ہے:

۱- اہل فجور: یعنی جن گناہوں کا تعلق اخلاقی مفاسد سے ہو۔

۲- اہل تلصص: یعنی چوری وغیرہ کے قبیل کی چیزیں۔ ۳- اہل جنایات: یعنی ظلم وزیادتی کے ذیل کی چیزیں۔

اس طرح کی کچھ اور تقسیمات بعض دیگر فقہاء کے یہاں بھی ملتی ہیں، ان تقسیمات کا مقصد یہ ہے کہ قیدیوں میں جرائم پھیلنے سے روکا جائے، اس لئے کہ جرائم کا رجحان بڑی تیزی کے ساتھ پھیلتا ہے، اور ایک طرح کا مجرم دوسری طرح کے مجرم سے بہت جلد متاثر ہونے لگتا ہے، لیکن اگر ہر قسم کے مجرمین الگ الگ ہوں، تو دوسرے جرائم سے ان کے محفوظ رہنے کا زیادہ امکان ہے (کتاب الخراج/ ۱۶۱، ابن عابدین ۵/ ۳۷۰، الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۳۱۹)۔

اسی طرح اخلاقی مفاسد سے بچنے کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ مردوں اور عورتوں کو الگ الگ رکھا جائے، تمام فقہاء کا اس پر اتفاق ہے، بلکہ عورتوں کے حصے کا نگراں افسر بھی کسی عورت ہی کو ہونا چاہئے، اگر اس قسم کی عورت میسر نہ ہو تو صلاح وتقوی میں معروف شخص کا انتخاب ہونا چاہئے۔

(المبسوط ۲۰/ ۹۰، فتاوی ہندیہ ۵/ ۴۱۴، جواہر الاکلیل للآبی ۲/ ۹۳، الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۳۱۷)۔

کبھی بالغوں کے ساتھ نابالغ لڑکے بھی بعض جرائم میں شریک ہوجاتے ہیں، ایسے نابالغ لڑکوں کو قید میں ڈالا جاسکتا ہے یا نہیں؟

مالکیہ اور شافعیہ کا مسلک یہ ہے کہ صرف تادیبی کارروائی کی جائے گی، قید میں نہیں ڈالا جائے گا خواہ مالی معاملہ ہو یا غیر مالی، لیکن فقہاء حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ مالی اور غیر مالی دونوں قسم کے جرائم میں نابالغ لڑکوں کو محض تادیب وتنبیہ کے لئے (نہ کہ سزا کے طور پر) قید میں ڈالنے کی اجازت ہے، تاکہ عام لوگ ان کے ضرر سے محفوظ رہیں، اور ان بچوں کی تنبیہ بھی ہو، البتہ ایسی صورت میں فقہاء نے لازم قرار دیا ہے کہ ان کو بالغوں سے الگ ایسی جگہ پر رکھا جائے جہاں ان کا کوئی مناسب رہنما اور مربی موجود ہو، تاکہ وہ بالغوں سے شر کے ممکن طور پر محفوظ رہ سکیں۔

(در مختار ۴/ ۲۵۳، فتاوی ابن تیمیہ ۳۴/ ۱۷۹، حاشیۃ الدسوقی ۳/ ۲۸۰، معین الحکام/ ۱۸۷، الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۳۱۷، ۳۱۸)۔

۳- طریقہ احتساب

یہ ایک حقیقت ہے کہ ثبوت جرم کے لئے اگر شواہد موجود نہ ہوں، تو مجرم آسانی کے ساتھ اپنے جرم کا اقرار نہیں کرتا، اس لئے تھوڑی سختی کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی ایک مثال عہد نبوت میں ابن ابی الحقیق کا واقعہ ہے، جس نے ایک خزانہ غائب کردیا تھا، اور اس کا اقرار نہیں کررہا تھا، نبی کریم ﷺ کے حکم پر حضرت زبیر بن العوام نے جب اس کے ساتھ سختی کی تو اس نے اس کا اقرار کیا (رواہ البخاری، فتح الباری ۵/ ۳۲۸)۔

اسی روایت کی بنا پر فقہاء نے مجرموں کے ساتھ فی الجملہ سختی کی اجازت دی ہے، اور اگرچہ کہ جبر واکراہ کی حالت میں اقرار معتبر نہیں ہے، مگر متاخرین حنفیہ نے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر اس کی افادیت تسلیم کی ہے، اور اس حالت کے اقرار کو کسی نہ کسی درجہ میں درست قرار دیا ہے، چوری کی بحث کے ذیل میں حصکفی لکھتے ہیں: "فیقطع إذا أقر (۶/ ۱۰۸، ۱۰۹)۔

مگر یہ سختی اس حد تک جائز ہے جب تک کہ وحشیانہ حد تک نہ پہنچے، اس لئے فقہاء نے مجرموں کے ساتھ تادیبی معاملہ کو محدود کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''إنما هو السوط أو السجن'' (کتاب الخراج لابی یوسف/۱۳۵)۔ (مجرم کے لئے کوڑا ہے یا قید، اس کے علاوہ کچھ نہیں)۔

اس لئے ایسی کسی بھی کارروائی کی اجازت نہیں دی جاسکتی جو انسانی حدود کو پار کر جائے اور جس سے مجرم کو شدید جسمانی نقصان پہونچے، فقہاء نے تو قید خانہ میں سزا کے طور پر بھی وحشیانہ حرکتوں سے منع کیا ہے، چہ جائے کہ احتساب کے مرحلے میں، جب کہ ابھی سزا کا فیصلہ آنا باقی ہو۔ لہذا سزا کے طور پر ہو یا اعتراف جرم کے لئے درج ذیل کارروائیوں کی اجازت نہیں ہے:

☆ قیدیوں کو دھوپ میں کھڑا کرنا، ان کے سر پر تیل ڈالنا، ڈاڑھی مونڈھنا، کتے، بچھو یا اور کوئی درندہ جانور چھوڑنا (کتاب الخراج/۱۳۵، المغنی ۷/۶۴۱، تبصرۃ الحکام ۲/۱۴۷، الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/۳۲۸)، اس لئے کہ یہ خلاف شرع بھی ہے اور جسمانی نقصان کا باعث ہے۔

☆ قیدیوں کو بے لباس کرنا، اس لئے کہ ستر عورت ضروری ہے (حاشیہ ابن عابدین ۴/۱۳، الاحکام السلطانیہ للماوردی/۲۳۹)۔

☆ بھوکا پیاسا رکھنا، جسم کے کسی حصہ کو آگ سے جلانا، یا الکٹرک شاٹ لگانا۔

☆ پانی میں غوطے دینا۔ (السیاسۃ الشرعیہ لابن تیمیہ/۱۵۲، فتح الباری ۶/۱۵۰)۔

☆ سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈال دینا۔

☆ مسلسل جاگتے رہنے پر مجبور کرنا اور اس کے لئے اس کی جائے رہائش میں تیز روشنی یا تیز آواز کا انتظام کرنا، چہرے پر مارنا، گردن میں ناقابل برداشت بوجھ ڈال دینا، زمین پر لٹا کر مارنا، وغیرہ (فتاوی ہندیہ ۳/۴۱۴، الاحکام السلطانیہ للماوردی/۲۳۹)۔

قیدی کے خاندان کو گالی دینا یا سب وشتم کرنا (بدائع الصنائع ۷/۶۴)۔

ناک، کان یا جسم کا کوئی حصہ کاٹنا یا توڑنا، یہ مثلہ ہے اور سخت ممنوع ہے، وغیرہ (بدائع الصنائع ۷/۱۲۰)۔

☆ اور ہر وہ کام جو خلاف شرع ہو یا جس سے جسم کو کلی یا جزوی نقصان پہنچے۔

۴- قیدی کو بیڑی ڈالنا

قیدیوں کو فرار سے بچنے کے لئے زنجیروں میں جکڑا جاسکتا ہے، ان کو ہتھکڑی بھی پہنائی جاسکتی ہے، بیڑی بھی ڈالی جاسکتی ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ کے سامنے ایک ملزم کو ہتھکڑی لگا کر لایا گیا (مصنف عبدالرزاق ۱۰/۲۱۷)۔ نیز حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایک ملزم کے بارے میں فرمایا (جس پر چوری کا الزام تھا اور وہ کہتا تھا کہ میں نے اسے خریدا ہے): ''فاشدده في السجن وثاقا ولا تحله حتى يأتيه أمر الله'' (اس کو قید خانہ میں مضبوط باندھ دو اور معاملہ کی تحقیق تک نہ کھولو) (المحلی لابن حزم ۱۱/۱۳۱)۔

لیکن ایسا وقتی طور پر کرنے کی اجازت ہوگی، ان چیزوں کو تسلسل کے ساتھ باقی رکھنا درست نہیں، اس لئے کہ ان حالتوں میں بنیادی ضروریات بھی پوری کرنی دشوار ہو جاتی ہے، فقہاء نے قیدیوں کو قضائے حاجت سے روکنے کی اجازت نہیں دی ہے، اسی طرح ایسی تنگ جگہ میں رکھنے کی اجازت بھی نہیں دی ہے جہاں ایک دوسرے سے بے پردگی ہو، یا وضو اور نماز جیسی ضروریات پوری نہ کی جاسکتی ہوں (الشرح الکبیر للدردیر ۳/۲۸۲، در المختار مع الحاشیہ ۵/۳۷۹،۳۷۸)۔

۵- قید تنہائی

حاکم کی اگر رائے ہو تو کسی مجرم کو اس کے خصوصی جرم کے پس منظر میں قید تنہائی دی جاسکتی ہے، الموسوعۃ الفقہیہ میں مبسوط سرخسی، ابن عابدین، فتاوی ہندیہ، حاشیۃ دسوقی، حاشیہ قلیوبی اور دیگر بہت سی کتابوں کے حوالے سے لکھا ہے۔

''ويجوز للحاكم عزل السجين وحبسه منفردا في غرفة يقفل عليه بابها، ان كان في ذلك مصلحة''

(الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/۳۱۹)

۶- قیدیوں سے جبری کام لینا

الف- فقہاء شافعیہ وحنابلہ نے قیدیوں کو اجرت پر کام کرنے کی اجازت دی ہے تا کہ وہ اپنے گھریلو اخراجات یا قرض وغیرہ کی ادائیگی کا انتظام کرسکیں۔

(الموسوعة الفقهيه ۱۶/ ۳۲۱، بحواله آسنى المطالب مع حاشية الرملى ۲/ ۱۸۸، المغنى ۴/ ۴۹۵، هنديه ۳/ ۴۱۸)۔

ب- لیکن حنفیہ کا مسلک معتمد اور دیگر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ قیدیوں کو باجرت کام کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی، ورنہ قید خانہ کی ساری معنویت ہی ختم ہوجائے گی۔ قید خانہ اس کے لئے دوکان یا کارخانہ کی طرح بن جائے گا، اور قید کا مقصد فوت ہوجائے گا (ابن عابدین ۵/ ۲۷۸، فتاوی ہندیہ ۳/ ۴۱۸)۔

ج- تیسری رائے جس کو کویت کے لجنۃ الفقہاء نے اختیار کیا ہے کہ یہ حاکم کی صوابدید پر موقوف ہے (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۳۲۲)۔

دوسری اور تیسری رائے کا مقتضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ حاکم کی اگر رائے ہو تو سزا یافتہ قیدیوں سے بلا اجرت جبری کام لیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ کام ان کی طاقت سے باہر نہ ہو، اور ان کی صلاحیت اور ذوق سے ہم آہنگ ہو، البتہ جن قیدیوں کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے ان کا معاملہ اس سے مستثنیٰ رکھنا چاہئے۔

۷- ملزم اور مجرم کا فرق

جن قیدیوں کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے، اور جن کے بارے میں سزائے قید کا فیصلہ ہو چکا ہے، قید خانوں میں سلوک کے اعتبار سے ان میں فرق کرنا ضروری ہے، یہی عدل کا تقاضا ہے، ورنہ سزا یافتہ اور غیر سزا یافتہ کا فرق باقی نہ رہے گا، اسی لئے بہت سے فقہاء نے دونوں قسم کے قیدیوں کے لئے الگ الگ قید خانہ یا قید خانہ میں حصہ مقرر کرنے کی ہدایت کی ہے، قرافی، ماوردی، زبیری اور حنابلہ کے ایک طبقہ کی رائے یہ ہے کہ زیر سماعت ملزمین کو قید کرنے کا اختیار صرف حاکم کو ہے، عدالت کو نہیں، عدالت صرف انہی ملزمین کو قید کرسکتی ہے جن کے لئے سزائے قید کا فیصلہ ہو چکا ہو، پہلی قسم کے قید خانہ کو "سجن الوالی" اور دوسری قسم کے قید خانہ کو "سجن القاضی" کہا جاتا تھا، اگرچہ کہ بعد میں دونوں قسم کے اختیار عدالت ہی کو دے دیئے گئے، اور اب عدالت دونوں قسم کے ملزمین کو قید کرنے کی مجاز ہوگی، لیکن فقہاء کی رائے کے مطابق کم از کم دونوں کے لئے قیام اور سلوک میں امتیاز کرنا ضروری ہے، تا کہ ظلم وزیادتی کا اندیشہ باقی نہ رہے

(الموسوعة الفقهيه ۱۶/ ۳۱۹-۳۱۸، حاشية ابن عابدين ۵/ ۴۹۹-۳۷۸، تبصرة الحكام ۱/ ۳۰۴، لسان الحكام / ۲۵۱، الاحكام السلطانيه للماوردی / ۲۱۹)۔

ملزم کے قید کی مدت

زیر سماعت قیدیوں کو فیصلہ سے قبل اتنے دنوں تک قید میں رکھنا جو ان کے اوپر عائد فرد جرم کی اصل سزا ہے، درست نہیں، بعض فقہاء حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ ایسے مقدمات میں جن کی آخری سزا ہی قید ہوسکتی ہو، ملزم کو قید کرنے کی اجازت نہیں دیتے، اس لئے کہ فیصلہ سے قبل سزا کا کوئی جواز نہیں ہے، لیکن جو فقہاء (اور اکثر فقہاء کی یہی رائے ہے) قید کی اجازت دیتے ہیں بشرطیکہ ملزم مجہول الحال ہو اور صلاح وتقوی میں معروف نہ ہو، ان میں زیادہ تر فقہاء نے فیصلہ سے قبل قید کی مدت کو حاکم کی رائے پر چھوڑ دیا ہے، مگر کچھ نے اس کی مدت ایک ماہ (ردالمحتار ۶/ ۱۰۸)، کچھ نے ایک دن، بعض نے دو یا تین دن، اور مالکیہ نے ایک سال سے کم مقرر کی ہے (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۲۹۴-۲۹۵)۔

دراصل یہ مدت عدالتی کارروائی کو چاق وچوبند کرنے کے لئے ہے، کسی عدالت کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اپنی غفلت وناکامی کا بدلہ بے قصور ملزموں سے لے، اور اپنی سست رفتار کارروائی کی بنا پر ملزموں کو برسوں جیل میں بے یارومددگار چھوڑ دے، جب کہ اس کا امکان بھی موجود ہے کہ ملزم نتیجتاً بے قصور ثابت ہو۔

۹- ملزم اگر بری ثابت ہو

اگر زیر سماعت ملزم کو قید میں رکھا گیا، اور بعد میں عدالت نے اسے بری کردیا، تو وہ زمانۂ قید میں ہونے والی ذہنی اذیت اور مالی نقصان کا ہرجانہ طلب کرنے کا مجاز نہیں ہے، بشرطیکہ قید کی مدت معروف اصولوں کے مطابق ہو، اور اس دوران اس کے ساتھ کوئی ناروا سلوک بھی نہ کیا گیا ہو، اس لئے کہ جس حد تک قید کی فقہاء نے اجازت دی ہے، وہ ان نقصانات کو مدنظر رکھتے ہوئے دی ہے، اور اسی لئے ملزم کے حالات کے لحاظ سے زمانۂ قید میں کمی بیشی روا رکھی گئی ہے۔

۱۰- قیدی کو رابطہ کی اجازت

قیدی کو اپنے مقدمات کے سلسلے میں وکیل سے رابطہ اور صفائی پیش کرنے کا مکمل حق حاصل ہے، اس لئے کہ حراست کا مقصد تحقیق حال ہے، اگر قیدی کو اپنے معاملہ میں رابطہ اور بیان صفائی کا اختیار نہ دیا جائے تو حقیقت حال کیسے واضح ہوسکتی ہے؟ بلکہ اگر قیدی پر کچھ دوسرے اور مقدمات ہوں تو ان کے لئے بھی بطور خود یا بذریعہ وکیل عدالتی کارروائی کے لئے اس کو نکلنے کی اجازت دی جائے گی، صرف اتنی دیر کہ زیر بحث مقدمہ کی اس سے متعلق کارروائی مکمل ہوجائے

(در مختار مع رد المحتار ۵/۳۷۸، ۴۹۹، لسان الحکام للابن الشحنہ ۲۵۱/۱، تبصرۃ الحکام ۳۰۴/۱، المغنی ۲۰۷/۹، الموسوعۃ الفقہیہ ۳۲۶/۱۶)۔

۱۱- قیدی خواتین کے شیر خوار بچے

خواتین قیدیوں کو اپنے ساتھ ایسے شیر خوار بچوں کو جو ماں کے بغیر نہ رہ سکتے ہوں، جیل میں رکھنے کی اجازت ہوگی، یہی شرعی اصولوں کا تقاضا ہے، اس لئے کہ ماں کے جرم کی وجہ سے بچوں کو ماں کی ممتا سے محروم رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے، علاوہ ازیں بچوں کی علاحدگی خود قیدی خواتین کے لئے بھی مسلسل ذہنی اذیت کا باعث ہوگی، اس سلسلے میں بعض احادیث وآثار سے کافی روشنی ملتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (جنگ میں پکڑی جانے والی خواتین کے بارے میں جن کو باندی بنالیا گیا ہو، اور ان کے ساتھ چھوٹا بچہ ہو) ارشاد فرمایا:

''لاتوله والدة عن ولدها'' (رواہ البیہقی، نصب الرایۃ ۲۶۶/۳)۔ (ماں کو اپنے بچے سے الگ نہیں کیا جائے گا۔

ایک روایت میں ارشاد گرامی اس طرح نقل کیا گیا ہے:

''من فرق بين والدة وولدها فرق الله بينه وبين أحبته يوم القيامة'' (بیہقی ۱۲۶/۹، دارقطنی ۶۷/۳)۔

(جو شخص ماں کو اس کے بچے سے الگ کرے گا، قیامت کے دن اللہ تعالی اس کو اپنے دوستوں سے الگ کردے گا)۔

حضرت عبادۃ بن الصامت روایت کرتے ہیں: ''نهى رسول الله ﷺ أن يفرق بين الأم وولدها فقيل يارسول الله! إلى متى؟ قال: حتى يبلغ الغلام وتحيض الجارية'' (سنن دارقطنی ۶۷/۳)۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کو اس کے بچہ سے الگ کرنے سے منع فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا: یارسول اللہ! کب تک؟ ارشاد فرمایا: جب تک لڑکا بالغ نہ ہوجائے اور لڑکی کو حیض نہ آجائے)۔

حضرت عمران بن حصین کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''ملعون من فرق بين والدة وولدها'' (حاکم ۵۵/۲، دارقطنی ۶۷/۳)۔ (وہ شخص ملعون ہے جو ماں کو اپنے بچہ سے الگ کردے)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ روایت کرتے ہیں:

''وهب لي رسول الله ﷺ غلامين أخوين فبعت أحدهما فقال رسول الله ﷺ: يا علي ما فعل غلامك؟ فأخبرته فقال: رده لرده'' (ابو داؤد، حدیث: ۲۶۹۶، ترمذی، حدیث نمبر: ۱۲۸۴، حاکم ۵۵/۲، دارقطنی ۶۶/۳)۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دو غلام عطا فرمائے جو دونوں بھائی تھے، میں نے ان میں سے ایک کو فروخت کردیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن غلاموں کے بارے میں دریافت فرمایا، تو میں نے بیچنے کے بارے میں بتادیا تو آپ نے فرمایا: واپس کرو واپس کرو)۔

ان احادیث کا مقتضا یہ ہے کہ قیدی خواتین کو ان کے شیر خوار بچوں سے الگ نہ کیا جائے۔

☆☆☆

قیدیوں کے حقوق - شرعی نقطہ نظر

مولانا عبدالرشید قاسمی[1]

حبس اور قید

حبس کی تعریف

''لغت میں حبس امساک کو کہتے ہیں اور تخلیہ کی ضد ہے اور حبس جگہ کا نام ہے''۔...... ''حبس شریعت میں کسی کو باز رکھنا اس کے ذاتی تصرف سے چاہے گھر میں یا مسجد میں یا جہاں خصم یا اس کا وکیل بھروسہ کرے اور اس کے ساتھ ساتھ رہے'' (القضاء ونظامہ/ ۵۵۰)۔

قید کرنے کا حکم قرآن وحدیث سے ثابت ہے اور اس سلسلے میں درج ذیل دلائل کو فقہاء نے اپنا مستدل بنایا ہے۔

"إنما جزاء الذين يحاربون الله ورسوله ويسعون في الأرض فسادًا أن يقتلوا أو يصلبوا أو تقطع أيديهم وأرجلهم من خلاف أو ينفوا من الأرض" (آیت مائدہ: ۳۳)

(جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلانے میں لگے رہتے ہیں ان کی سزا بس یہی ہے کہ وہ قتل کئے جائیں یا سولی دے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پیر مخالف جانب سے کاٹے جائیں)۔

اس آیت میں "أو ينفوا" سے حبس ہی مراد ہے خصوصًا احناف کے نزدیک، القضاء ونظامہ میں اس کی صراحت اس طرح موجود ہے:

''استدلال آیت میں أو ینفوا من الأرض سے ہے، نفی سے مراد حبس ہے، یہ احناف کی رائے ہے، چنانچہ احناف کے نزدیک نفی من الارض سے مراد حبس اور قید خانہ ہے، کیونکہ محبوس شخص اپنے اہل خانہ سے جدا رہتا ہے، اور غیر احناف کے نزدیک اس سے مراد کسی ایسی جگہ جلاوطن کرنا ہے جہاں اس نے گناہ نہیں کیا ہے، لیکن آیت میں موجود الارض ظاہری عموم کا تقاضہ کرتا ہے لہذا حبس اور سجن کے علاوہ کسی دوسرے معنی کا تصور نہیں کیا جاسکتا''

(القضاء ونظامہ/ ۵۵۱)۔

بلا ثبوت جرم قید یا قید احتیاطی

ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

''فقہاء کی ایک جماعت محض شبہ کی بنیاد پر قید کی مشروعیت کی قائل ہے اور دلیل یہ حدیث ہے کہ ایک مرتبہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے ایک متہم مشتبہ آدمی کو قید کیا اور پھر چھوڑ دیا۔ گویا یہ احتیاطی طور پر قید کرنا تھا۔ نیز آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ مالدار آدمی کا حق ادا کرنے سے ٹال مٹول کرنا اس کی شکایت اور سزا کو حلال کر دیتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک جیل خانہ بنوایا تھا، بعد میں حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کی اتباع کی، احناف نے اس مسئلہ میں "أو ينفوا من الأرض" سے استدلال کیا ہے اور کہا کہ النفی سے مراد الحبس ہے'' (الفقہ الاسلامی ۷/ ۵۵۹۲)۔

عبدالرحمن ابراہیم اپنی کتاب ''القضاء ونظامہ'' میں ترمذی اور ابوداؤد کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

''ترمذی وغیرہ نے بہز بن حکیم سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم علیہ السلام نے ایک آدمی کو کسی تہمت کی بنیاد پر قید کیا اور پھر اسے چھوڑ دیا۔ اور بیہقی میں یہ اضافہ ہے: تہمت کی بنیاد پر ایک آدمی کو دن کے ایک حصے تک قید رکھا۔

---

[1] مدرسہ جامع العلوم، پٹکاپور، کانپور۔

(القضاء ونظامہ/۵۵۱ بحوالہ ترمذی ۲/۴۳۵، ابوداؤد ۲/۲۸۲)۔

اس حدیث سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ شک کی بنیاد پر قید کر سکتے ہیں وہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ مدت بس چند گھنٹوں کی ہونی چاہئے نہ یہ کہ زندگی کا ایک حصہ صرف تفتیش کے نام پر سلاخوں کے پیچھے گزر جائے، حدیث شریف سے صرف اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ قید احتیاطی بس چند گھنٹوں کے لئے ہو لیکن معاملہ کی سنگینی کے اعتبار سے یہ مدت گھٹ بڑھ بھی سکتی ہے۔ جیسا کہ شامی میں کتاب السرقہ کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے: "فيحبس حتى يكشف أمره قيل شهرا" (شامی ۶/ ۱۴۷)۔ یعنی چور کو شبہ کی بنیاد پر قید کیا جائے گا، اور بعض فقہاء کی رائے ہے کہ یہ مدت ایک ماہ ہوگی۔ اور یہ فیصلہ مفوض إلى القاضي ہونا چاہئے، کیوں کہ جرائم کی نوعیت الگ الگ ہوتی ہے، بعض جرم چھوٹے ہوتے ہیں اور بعض بڑے، ظاہر ہے کہ اگر الزام چوری کی بنیاد پر قید کیا گیا ہے تو الزام قتل کا جرم چوری سے بڑھا ہوا ہے، وعلى هذا القياس، لہٰذا جرم کی شدت اور خفت کے اعتبار سے حبس کی مدت میں کمی زیادتی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ مقروض اگر مطل الغنی کا مصداق ہے تو اس کے حق میں کوئی رعایت نہیں ہے جب تک حق ادا نہ کر دے قید میں رکھا جائے گا، جب کہ اگر مقروض تنگ دست ہے تو خود قرآن مہلت دینے کو واجب قرار دیتا ہے: "وإن كان ذو عسرة فنظرة إلى ميسرة وأن تصدقوا خير لكم إن كنتم تعلمون" (البقرہ: ۲۸۰)، لہٰذا جرم اور مجرم، الزام اور ملزم کے فرق سے حبس کی مدت میں بھی فرق ہوگا جیسے کہ تعزیر میں اسباب تعزیر کے اعتبار سے قید کی مدت گھٹتی بڑھتی ہے، عبدالرحمن ابراہیم لکھتے ہیں:

"تعزیر میں اسباب تعزیر اور اس کے موجب کے اعتبار سے حبس کی مدت میں کمی وزیادتی ہوگی، لہٰذا اس کا متعین اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے۔ ابن فرحون تبصرۃ الحکام میں فرماتے ہیں: تعزیراً قید کرنے کا مرجع اجتہاد حاکم ہے، جتنی مدت وہ مجرم کی اصلاح کے لئے مناسب سمجھے اتنے دنوں تک قید رکھے گا۔ حتی کہ اگر کسی شخص کی اذیتوں سے لوگ پریشان ہوں تو حاکم اسے تعزیراً موت تک قید کر سکتا ہے جب کہ اسے شرارتوں سے باز رکھنے کے لئے اس کے علاوہ کوئی اور سبیل نہ ہو" (القضاء ونظامہ/۵۵۶)۔

صاحب درمختار اور صاحب شامی صاف طور پر فرماتے ہیں کہ احتیاطاً قید کرنا درست ہے، چنانچہ صاحب درمختار فرماتے ہیں:

"وعزر كل مرتكب منكر" (یعنی ہر برائی کرنے والے کو سزا دی جائے گی) (شامی ۶/ ۱۱۳)۔

اس پر علامہ شامی نے ایک عنوان قائم فرمایا: التعزير قد يكون بدون معصية" (تعزیر کبھی بغیر کسی جرم کے بھی ہوتی ہے)۔

اور صاحب درمختار پر ایک اعتراض کیا ہے کہ علامہ حصکفی کی عبارت "وعزر کل مرتکب منکر" سے معلوم ہوتا ہے کہ تعزیر صرف جرم کے ساتھ خاص ہے حالاں کہ تعزیر کبھی بلا جرم بھی ہوتی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

" وظاهره أن المراد حصر أسباب التعزير فيما ذكر مع أنه قد يكون بدون معصية كتعزير الصبي والمتهم كما سيأتي" (در مختار مع الشامی، کتاب التعزیر ۶/ ۱۱۳ طبع زکریا)۔

قاضی تہمت کی بنیاد پر تعزیر کر سکتا ہے، اور تعزیر بالقید بھی ہوتی ہے، معلوم ہوا کہ تہمت کی بنیاد پر احتیاطاً قید کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح کتاب الکفالہ میں فرماتے ہیں:

"لأن الحبس للتهمة مشروع وكذا تعزير المتهم" (درمختار مع الشامی ۷/ ۵۷۷)۔

(تہمت کی وجہ سے قید کرنا مشروع ہے جیسا کہ متہم کو تعزیر کرنا مشروع ہے)۔

بہر حال مذکورہ فقہی دلائل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بتقاضائے احوال احتیاطاً قید کیا جا سکتا ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ کتنی مدت کے لئے احتیاطاً قید کیا جا سکتا ہے تو بعض فقہاء نے اس کی مدت ایک ماہ بھی بتائی ہے جیسا کہ شامی کے اس جزئیہ سے معلوم ہوتا ہے:

" فيحبس حتى يكشف أمره وقيل شهرا" (شامی، کتاب السرقہ ۶/ ۱۴۷)۔

۲- قیدیوں کے حقوق

قیدیوں کے سلسلے میں یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ ان کے حقوق پامال نہ ہونے پائیں، اور ان کے حقوق مشروعہ کی از حد رعایت کی جائے،

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو جہنمی فرمایا جس نے ایک بلی کو بھوکا پیاسا باندھ رکھا تھا (القضاء ونظامہ/ ۵۵۸)۔

جب جانور کے حق میں یہ وعید ہے تو انسانوں کے بارے میں خود اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے، مجرم کو جرم کی سزا دی جانی چاہئے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے دشمنی نکالی جائے۔ ڈاکٹر عبد الرحمن ''فقہ السنۃ'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ومنع المساجين مما يحتاجون إليه من الغذاء والكساء والصحى جور يعاقب الله عليه كما دل عليه الحديث'' (القضاء ونظامه/ ۵۵۸)۔

(قیدیوں کو ان چیزوں سے روکنا جن کی انہیں ضرورت ہے جیسے غذا، کپڑے، صحت تو یہ ایسا ظلم ہے جس کی سزا اللہ تعالی ضرور دیں گے جیسے کہ (بلی والی) حدیث اس پر دلالت کرتی ہے)۔

اسی طرح عبد الرحمن الجزیری فرماتے ہیں: ''ويطعم في أيام الحبس ويسقى'' (كتاب الفقه على المذاهب الأربعه ۵/ ۳۴۴)۔

(زمانہ قید میں اسے کھانا بھی دیا جائے گا اور پانی بھی)۔

لہذا جرم خواہ کتنا ہی سنگین ہو اور اس کی سزا عمر قید یا موت کیوں نہ ہو تاہم قیدیوں کے انسانی حقوق برقرار رہیں گے۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے: الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۷/ ۸،۵۳۱۷/ ۶۲۰۸)۔

کسی انسان کو آزادی جیسی عظیم نعمت سے محروم رکھنا ہی ایک سخت سزا ہے، قید فی نفسہ بہت سے حقوق سے بے انتہا محرومی کا نام ہے۔ حبس اور ضرب بظاہر حقوق انسانی کے خلاف ہیں لیکن نصوص کی وجہ سے ان کی اجازت ہے، اس کے علاوہ جو بھی حقوق انسانی ہیں وہ برقرار رہیں گے۔ خواہ وہ مذہبی حقوق ہوں جیسے عبادت کرنا، مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرنا، ان کے مذہبی تعلیمات کے مطابق ان کے لئے غذا فراہم کرنا، وہ جس مذہب پر عقیدہ رکھتے ہیں اس مذہب کی مقدس شخصیتوں اور کتابوں وغیرہ کی بے احترامی سے گریز یا جسمانی حقوق ہوں جیسے مناسب غذا، صاف پانی، علاج، حفظان صحت کا خیال، ایسی تنگ جگہ میں قیدیوں کو نہ رکھنا جہاں کھڑا ہونا یا پاؤں پھیلا کر لیٹنا یا دیوار کے باہر کسی چیز کو دیکھنا ممکن نہ ہو۔ یا سماجی حقوق ہوں جیسے اخبارات پڑھنے، ریڈیو سننے، فون پر احباب واقارب سے گفتگو کرنے، دوسرے قیدیوں سے ملاقات، تعلیم اور ہنر سیکھنا وغیرہ یا اخلاقی حقوق ہوں جیسے مردوں اور عورتوں کے لئے الگ الگ قید خانہ، بالغوں اور نابالغوں کے لئے الگ الگ قید خانہ وغیرہ۔ صاحب درمختار فرماتے ہیں:

''ويجعل للنساء سجن عليحدة نفيًا للفتنة'' (درمختار على الشامى ۸/ ۵۸)۔

(فتنے کے خوف سے عورتوں کے لئے علیحدہ قید خانہ ہوگا)۔

حاصل یہ ہے کہ ایک ہے قیدیوں کی سزا اور ایک ہے ان کو انسانی حقوق سے محروم رکھنا تو سزا خواہ کتنی ہی سخت ہو لیکن انہیں انسانی حقوق سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ پھر ان حقوق میں مذہبی، جسمانی اور اخلاقی حقوق تو پورے کے پورے حاصل ہوں گے البتہ سماجی حقوق مثلاً بیوی سے تعلق، اخبارات پڑھنا، ریڈیو سننا، باہری دنیا کی اطلاعات یا دوستوں سے ملاقات، فون پر احباب سے بات، دوسرے قیدیوں یا اپنے اعزاء سے ملاقات وغیرہ اس میں مجرم اور جرم کی حیثیت سے مشروط آزادی ہونی چاہئے ورنہ قید کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

۳- قیدیوں سے سچ اگلوانے کے لئے سزا کی حدود

مخصوص سزاؤں کے علاوہ جو سزائیں ہیں خواہ وہ قاضی اور حاکم کی طرف سے ہوں یا حکومتوں کی طرف سے اور پھر یہ مکث طویل ہو یا قلیل، اور یہ سزائیں جرم ثابت ہونے کے بعد دی جائیں یا محض اتہام کی بنیاد پر یا صرف سچ بات اگلوانے کے لئے، یہ سب تعزیر کے ضمن میں آتی ہیں، اس لئے ہم نے اپنی بحث کی بنیاد اسی تعزیر پر رکھی ہے۔

تعزیر کی تعریف

علامہ شامی فرماتے ہیں:

''هو لغة التأديب مطلقًا وشرعًا تأديب دون حد، أكثره تسعة وثلاثون سوطًا وأقله ثلاثة'' (شامی ۶/ ۱۰۳)۔

(تعزیر لغت میں مطلق تادیب کے معنی میں آتا ہے، اور شرعاً حد سے کم تادیب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ تعزیر کی اکثر مقدار انتالیس کوڑے اور کم مقدار تین کوڑے ہیں)۔

افراد کے اعتبار سے تعزیر کا حکم

''إنه يختلف باختلاف الناس، فتعزير ذوي الهيآت أخف من تعزير عامة الناس مع أنهم يستوون في الحدود مع الناس، لافرق بين عربي وقرشي، فالكل أمام الحدود سواء'' (كتاب الفقه على المذاهب الاربعة ۵/ ۳۲۱)۔

(تعزیر لوگوں کے احوال کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے، چنانچہ خواص کی تعزیر عوام کے مقابلہ میں اَخف ہوگی باوجود یکہ حدود میں سارے لوگ برابر ہوتے ہیں، اس میں عربی یا قریشی کا کوئی فرق نہیں ہوتا بلکہ سارے ہی لوگ حدود میں برابر ہوتے ہیں)۔

صاحب رد المحتار اس طرح فرماتے ہیں:

۱- اشراف الاشراف اور ان سے مراد علماء اور سادات ہیں ان حضرات کی تعزیر فقط ان کو آگاہ کردینا ہے، مثلاً قاضی ان سے کہے کہ بھئی ہم کو آپ کی طرف سے شکایات ملی ہیں کہ آپ ایسا کر رہے ہیں (یہ مناسب نہیں ہے) چنانچہ وہ اتنی ہی تنبیہ سے باز آجائیں گے۔

۲- اشراف اور اس سے مراد گاؤں کا مکھیا، پردھان، تاجر اور دولت مند ہیں، ان کی تعزیر ان کو آگاہ کرنا، قاضی کی عدالت تک کھینچنا اور ان پر مقدمہ چلانا ہے۔

۳- متوسط طبقے کے لوگ اور ان سے مراد بازاری لوگ ہیں ان کی تعزیر پر عدالت تک کھینچنا اور قید کرنا ہے۔

۴- اور خسیس لوگوں کی تعزیر، پچھلی تعزیرات کے ساتھ ساتھ پٹائی بھی کرنا ہے (شامی ۶/ ۱۰۴، باب التعزیر)۔

شریعت میں تعزیر کا حکم

جو سزائیں شریعت میں منصوص نہیں ہیں وہ سب تعزیر کے ضمن میں آتی ہیں، پہلے یہ کام مفوض الی الحاکم والقاضی ہوتا تھا لیکن اب یہ کام حکومتیں کرتی ہیں۔ حاکم اور قاضی جرم اور افراد کو پیش نظر رکھتے ہوئے سزائیں دیتا تھا لیکن اب قانون عامہ کے ذریعہ ہی عدل و مساوات کو باقی رکھا جاسکتا ہے، شریعت میں تعزیر کا کوئی لگا بندھا ضابطہ نہیں ہے تاہم اس باب میں کافی وسعت ہے اور ادنی سزا سے لے کر قتل تک کی گنجائش ہے۔ چنانچہ عبد الرحمن الجزیری ''باب التعزیر واسع'' کے تحت فرماتے ہیں:

''وبالجملة فإن التعزير باب واسع يمكن للحاكم أن يقضي به على كل الجرائم التي لم يقع الشارع لها حدا أوكفارة، على أن يضع العقوبة المناسبة لكل بيئة ولكل جريمة من سجن أو ضرب أو نفي أوتوبيخ أو غير ذلك لقد أجاز الإسلام التعزير بكل أنواعه للحاكم فقط'' (كتاب الفقه على المذاهب الاربعة ۵/ ۳۲۵)۔

(حاصل یہ کہ تعزیر کا باب بہت وسیع ہے جس میں حاکم کو اختیار ہے کہ وہ تمام جرائم میں جن میں شرعاً حد یا کفارہ نہیں ہے گردوپیش کے حالات کے اعتبار سے مناسب سزا تجویز کرے خواہ یہ سزا قید ہو، ضرب ہو، جلاوطنی ہو، ملامت کرنا ہو یا اس کے علاوہ، اسلام نے تعزیر کی اجازت اس کی جملہ انواع کے ساتھ صرف حاکم کو دی ہے)۔

صاحب بدائع لکھتے ہیں:

''إن التعزير فقد يكون بالحبس وقد يكون برفع الصوت وقد يكون بضرب الأسواط'' (بدائع ۵/ ۵۲۵)

(تعزیر کبھی قید کر کے ہوتی ہے، کبھی بلند آواز سے ڈانٹ کر اور کبھی کوڑے مار کر)۔

حصکفی اس طرح لکھتے ہیں:

"والتعزير ليس فيه تقدير بل هو مفوض إلى رأي القاضي لأن المقصود منه الزجر وأحوال الناس فيه مختلف ويكون التعزير بالقتل" (در مختار مع الشامی ۶/۱۰۶)۔

(تعزیر کا کوئی متعین ضابطہ نہیں ہے بلکہ یہ مفوض الی رأی القاضی ہے، کیوں کہ مقصود اس سے تنبیہ ہے اور لوگ مختلف الاحوال ہوتے ہیں، تعزیر بسا اوقات قتل کے ذریعہ بھی ہوتی ہے)۔

مذکورہ فقہی عبارتوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ تعزیر کا باب بہت وسیع ہے، اور ان جنایتوں میں جن میں سزائیں مخصوص نہیں ہیں وہاں تعزیر ہی پر عمل ہوتا ہے۔ پھر جس طرح جرم ثابت ہونے کے بعد تعزیر کا عمل جاری ہوتا ہے بسا اوقات صرف اتہام کی بنیاد پر بھی اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بھلا ایک شخص جس پر سنگین الزامات ہوں وہ بلا سختی کیسے کسی بات کا اقرار کرے گا لیکن مشکل یہاں یہ ہے کہ شبہ کی بنیاد پر سچ بات اگلوانے کے لئے آخر کس حد تک تعزیر اختیار کی جائے اور اس کا پیمانہ کیا ہو۔ یہ مشکل اس وقت مزید پیچیدہ ہو جاتی ہے جب فقہ کا یہ جزئیہ سامنے آتا ہے: "ولا یصح إقرارہ... مکرھا" (درمختار ۴/۴۴۸) کہ زبردستی اقرار کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں ہے، لہذا اگر ایسا شخص سختی کی بنیاد پر کچھ اقرار کر بھی لیتا ہے تو یہ کیسے فیصلہ ہوگا کہ وہ واقعتاً سچ بول رہا ہے یا صرف مار کے خوف سے اقرار کر رہا ہے۔ اور پھر اس پر کوئی حکم کیسے لگایا جا سکتا ہے، بہر حال اب ہم شرعی نقطہ نظر سے اس کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر اس روشنی میں اپنی رائے ذکر کریں گے۔

اس سلسلے میں علامہ حصکفی رحمہ اللہ نے کتاب السرقۃ میں ایک واقعہ اور ایک حدیث ذکر کی ہے:

"ونقل عن التجنيس عن عصام أنه سئل عن سارق ينكر؟ فقال: عليه اليمين فقال الأمين: سارق ويمين؟ هاتوا بالسوط فاضربوه عشرة حتى أقر فأتى بالسرقة فقال: سبحان الله ما رأيت جورًا أشبه بالعدل من هذا" (درمختار مع الشامی ۶/۱۳۶)۔

(تجنیس میں یہ واقعہ منقول ہے کہ (حبان بن جبلہ نے جو بلخ کے امیر تھے شامی) عصام بن یوسف سے سوال کیا کہ ایسا چور جو چوری سے انکار کر رہا ہے اس کا کیا حکم ہے؟ تو عصام نے فرمایا کہ اس پر قسم ہے، اس پر امین نے کہا کہ چور اور قسم (یعنی چور کو بھلا قسم کی کیا پرواہ)، ذرا کوڑا لاؤ اور ابھی دس کوڑے نہیں مار پائے تھے کہ اس نے اقرار کر لیا اور مال مسروقہ لے آیا، تو عصام نے کہا: سبحان اللہ میں نے ایسا ظلم نہیں دیکھا جو عدل کے مشابہ ہو جیسا کہ اس واقعہ میں مشاہدہ کیا)۔

یہ واقعہ ذکر کرنے کے بعد پھر حدیث ذکر کی، فرماتے ہیں:

"عن ابن العز الحنفي صح أنه عليه الإسلام أمر الزبير بن العوام بتعذيب بعض المعاهدين حين كتم كنز حي بن أخطب ففعل فدلّهم على المال قال: وهو الذي يسع الناس، وعليه العمل" (درمختار مع الشامی ۶/۱۳۶)۔

(ابن العز نے اپنی کتاب "التنبیہ علی مشکلات الہدایہ" میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر بن عوام کو بعض معاہدین کے بارے میں جنہوں نے حیی بن اخطب کے خزانے چھپا لئے تھے سزا دینے کا حکم فرمایا۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا، چنانچہ ان لوگوں نے مال کا پتہ بتا دیا۔ اور اس کی لوگوں کو گنجائش ہے، اور اسی پر عمل ہے)۔

مذکورہ بالا دلائل سے یہ معلوم ہوا کہ سچ اگلوانے کے لئے تعزیر کی جا سکتی ہے لیکن حدود میں رہ کر، کیوں کہ جب اصل مجرم کو ثبوت جرم کے بعد ایسی سزائیں نہیں دی جا سکتیں جو حقوق انسانیت کے خلاف ہو تو تفتیش کے نام پر کیسے اجازت ہو سکتی ہے۔

وہبہ زحیلی ایک جگہ لکھتے ہیں: "ولا يمنع من أكل ووضوء، ويصلي بالإيماء ولا يعيد وحرم تعزير بحلق اللحية وقطع طرف وجرح" (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/۵۶۰۰)۔

(کھانے پینے سے اور وضو سے نہیں روکا جائے گا۔ اور اگر نماز ارکان کی مکمل ادائیگی کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا تو اشارے سے پڑھے گا اور اس نماز کا اعادہ نہیں ہے، تعزیراً داڑھی کاٹنا، یا کسی عضو کو کاٹنا، یا زخمی کرنا حرام ہے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ سچ اگلوانے کے لئے کوئی ایسی سزا نہیں دی جاسکتی جس سے اس کا عضو متاثر ہو، اور ظاہر ہے کہ جب جرم ثابت ہوجانے کے بعد اس طرح کی سزا ممنوع ہے تو محض شبہ کی بنیاد پر سچ اگلوانے کے لئے ایسی سزائیں کیسے جائز ہوسکتی ہیں۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ایک جگہ لکھتے ہیں:

''پولس غنڈے یا اس طرح کے دوسرے عناصر کے جبر واکراہ کے تحت اگر کسی بات کا اقرار کرالیا جائے تو ازروئے شرع اس اقرار کا کوئی اعتبار نہیں، نہ اس پر کوئی شرعی حکم مرتب ہوسکتا ہے اور نہ قاضی اس کو بنیاد بنا کر فیصلہ کرسکتا ہے

''ولا یصح إقرارہ بطلاق وعتاق مکرھا'' (جدید فقہی مسائل ۱/ ۴۴۹، بحوالہ درمختار ۴/ ۴۴۸، کتاب الاقرار)۔

لہذا سخت بات اگلوانے کے نام پر انہیں ٹارچر کرنا، قیدیوں کو بے لباس کرنا، انہیں الکٹرک شاٹ لگانا، قیدیوں پر کتے چھوڑنا، ٹھنڈک عذاب دینا، انہیں برف کی سلوں پر ڈال دینا، مسلسل جگے رہنے پر مجبور کرنا، آنکھوں میں تیز روشنی یا کانوں میں تیز آواز کا انتظام رکھنا، پانی میں ڈبکیاں دینا، ان کے بچوں کو ان کے سامنے ٹارچر کرنا، ان کی مذہبی کتابوں کی بے حرمتی کرنا وغیرہ اس طرح تمام امور حرام قرار پائیں گے، کیوں کہ یہ سزائیں تو انہیں بھی نہیں دی جاسکتیں جن کے قتل کا فیصلہ ہوچکا ہے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ پھر آخر سچ اگلوانے کے لئے کیا تدبیر کی جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس نوعیت کی سزائیں اسلام میں مشروع ہیں اس قسم کی تادیب کی جاسکتی ہے جیسے کوڑے مارنا وغیرہ۔ چنانچہ جب حضور علیہ السلام نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تو انہوں نے چور کو صرف کوڑے مارے۔

خلاصہ یہ کہ تحقیق وتفتیش کے نام پر قیدیوں کو ننگا کرنا، کتے چھوڑنا، برف پر ڈالنا، الکٹرک شاٹ لگانا، تیز روشنی میں انہیں رہنے پر مجبور کرنا، اس طرح کی سزائیں کسی بھی قیمت پر کسی بھی قیدی کو خواہ وہ کتنا ہی بڑا مجرم ہو، شریعت اسلامیہ کی روشنی میں نہیں دی جاسکتی۔

۴- قیدی کو ہتھکڑی پہنانا اور بیڑی ڈالنا

حصکفی فرماتے ہیں: ''ولا یغل إلا إذا خاف فرارہ فیقید'' (درمختار مع الشامی ۸/ ۵۸)۔

(گلے میں طوق نہیں ڈالا جائے گا الا یہ کہ بھاگنے کا خوف ہو تو اسے قید کردیا جائے گا)۔

اور کتاب الحظر والاباحۃ میں اس طرح لکھتے ہیں: ''وکرہ جعل الغل طوق لہ (آیۃ فی عنق العبد یعلم بإباقہ) وفی زماننا لا بأس بہ لغلبۃ الإباق'' (درمختار مع الشامی ۹/ ۵۶۶ کتاب الحظر)۔

(غلام کے گردن میں طوق (جس میں اس کے فرار ہونے کی علامت ہو، اور جو غلام آبق ہونے کی خبر دے) مکروہ ہے، لیکن ہمارے زمانے میں غلاموں کے فرار ہونے کی کثرت کی وجہ سے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے)۔

ڈاکٹر وھبہ زحیلی اس طرح لکھتے ہیں:

''ولا بأس تسوید وجہہ ونداء علیہ بذنبہ ویطاف بہ مع ضربہ ویجوز صلبہ'' (الفقہ اسلامی وادلتہ ۷/ ۵۶۰۰)۔

(مجرم کے چہرے پر کالک پوتنا، اس کے جرم کا اعلان کرنا، پٹائی کے ساتھ ساتھ علاقہ میں گھمانا حتی کہ سولی دینا، ان امور میں کوئی حرج نہیں ہے)۔

اس میں مقصد مجرم کی اصلاح ہے نہ کہ سزا، برائے سزا، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی نے جھوٹ کی سزا زبان کاٹنا نہیں فرمائی اور نہ زنا کی سزا زانی کو خصی کرنا، لہذا جس طرح اصلاح ممکن ہو وہی شکل اپنائی جائے گی۔

زحیلی صاحب ایک جگہ اس طرح فرماتے ہیں:

''بندوں کو جرائم سے دور رکھنے کے لئے (اور دوسروں کو ان کے شر سے بچانے کے لئے) اللہ تعالی نے سخت سے سخت سزائیں ضرور رکھی ہیں اس کے باوجود مجرم جتنی سزا کا مستحق ہے اتنی سزا نہیں دی گئی، یہی وجہ ہے کہ جھوٹ کی سزا شرعا زبان کاٹنا یا قتل کرنا نہیں۔ اور نہ زنا کی سزا زانی کو خصی

کرنا، نہ چوری کی سزا چور کو ختم کرنا ہے، بلکہ اللہ تعالی نے جنایتوں کی سزائیں ایسی رکھی ہیں جو اس کی ذات وصفات (حکمت، رحمت، لطف واحسان) کے مطابق ہوں اور ساتھ ہی یہ ملحوظ ہے کہ ظالم ظلم وعدوان سے باز آجائے۔ اور ہر انسان فقط اتنے پر قناعت کرے جو اس کے خالق و مالک نے اسے عطا کیا ہے، کسی دوسرے کے حق کو سلب کرنے کی طمع نہ کرے'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷ / ۵۳۱۲)۔

شرعی سزائیں سخت ضرور ہیں لیکن اس لئے کہ انسانی قدریں محفوظ رہیں، اور احترام انسانیت باقی رہے، یہی وجہ ہے کہ ثبوت جرم کے بعد سزا دیتے وقت بھی بہت ساری ان چیزوں سے روکا گیا، جو احترام انسانیت کے منافی ہوں (تفصیل کے لئے دیکھئے: الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷ / ۵۳۱۰ تا ۵۳۱۸)۔

مذکورہ بالا فقہی عبارتوں سے دو چیزیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ مجرم کو سزا دی جاسکتی ہے اور سزا زبانی تنبیہ سے لے کر قتل اور سولی تک (علی حسب رای الامام والقاضی) ہے۔ دوسری چیز یہ کہ کوئی ایسی سزا نہیں دی جائے گی جو حقوق انسانی یا احترام انسانیت کے خلاف ہو اور ''ولقد کرمنا بنی آدم'' سے متصادم ہو۔ اس آیت کی روشنی میں فقہاء اسلام نے احترام آدمیت کی رعایت میں کافی توجہ دی ہے اور اس کے اصول مرتب فرمائے ہیں۔ ایک مقام پر زحیلی صاحب لکھتے ہیں:

''إنه لا غل ولا تجريد ولا تصفيد ولا تمثيل في الإسلام، وإن للسجين الحق على الدولة في الغذاء والكساء والمأوى الملائم، ومنع التعذيب الوحشي وغيرذلك من أصول الحفاظ على الكرامة الإنسانية'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/ ۵۳۲۵)۔

(اسلام میں نہ طوق ڈالنا ہے نہ بے لباس کرنا، نہ ہتھکڑی پہنانا نہ سخت سزا دینا (مثلہ کرنا) ہے۔ اور قیدیوں کے لئے غذا، کپڑے، مناسب رہائش، وحشیانہ سزاؤوں سے روک اور احترام انسانیت کی حفاظت کے اصول سے متعلق حکومتوں پر حق ہے کہ وہ قیدیوں کے ان تمام حقوق کا تحفظ کریں)۔

لہذا عام حالات میں قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑنا، ہتھکڑی پہنانا یا انہیں بیڑی ڈالنا، جائز نہ ہوگا، البتہ استثنائی صورتوں میں ان کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً گرفتار کرتے وقت یا پیشی پر لے جاتے وقت بھاگ جانے کے خوف سے۔ قید خانوں میں جہاں بھاگنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا وہاں بلا وجہ ایسا سلوک کرنا اسلامی آئین اور انسانیت کے خلاف ہے۔ اور ظلم وبربریت کا وہ سلوک جو امریکہ نے افغانستان اور عراق کے مظلوم قیدیوں کے ساتھ ابوغریب اور دوسرے ظلم خانوں میں کیا وہ اسلام تو کیا خود ان ظالم حکومتوں کے اپنے قوانین کے خلاف ہے۔ ان وحشیانہ اور قاہرانہ سزاؤوں کی جو ان مظلومین پر برپا کی گئیں، اسلام کے عادلانہ اور منصفانہ سزاؤوں کے ساتھ کیا نسبت ہوسکتی ہے۔

۵- قید تنہائی

علامہ حصکفی کتاب القضاء میں فرماتے ہیں:

''ولايمكن أحد أن يدخل عليه للاستئناس إلا أقاربه وجيرانه لاحتياجه للمشاورة ولا يمكثون عنده طويلا... وفي الشامية ولا يمكثون طويلا أي بحيث يحصل له الاستئناس بهم بل بقدر مايحصل به المقصود من المشاورة'' (درمختار مع الشامی ۸/ ۵۵)۔

(سوائے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے کسی کو یہ اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ انسیت دینے کے لئے قیدی کے پاس جائے۔ اور رشتہ دار اور پڑوسیوں کا جانا بھی صرف اس غرض سے ہوگا کہ قیدی ان سے اپنے معاملہ کے بارے میں مشورہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ بھی زیادہ دیر تک نہیں ٹھہریں گے)۔

لیکن بیوی سے جماع کے تعلق سے فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔

علامہ شامی نہر کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

''وفي النهر إذا احتاج للجماع دخلت عليه زوجته أوأمته إن كان فيه موضع سترة... وقيل يمنع من ذلك لأن الوطء ليس من الحوائج الأصلية'' (شامی ۸/ ۵۶)۔

(اگر اسے جماع کا تقاضا ہے تو اس کی بیوی یا باندی اس کے پاس جائے گی بشرطیکہ خلوت کا نظم ہو...... جب کہ بعض فقہاء کہتے ہیں: چوں کہ

جماع ضروریات اصلیہ میں سے نہیں ہے اس لئے اس کو اس کی اجازت نہ ہوگی)۔

قید تنہائی سے متعلق درمختار اور شامی میں یہ جزئیہ موجود ہے لیکن مدت کا ذکر نہیں ہے جس سے اندازہ لگایا جاسکے کہ آخر کتنی مدت تک اسے قید تنہائی دی جائے، تاہم انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی اپنی رائے کے مطابق عمل کرے گا۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

''قیل یطین علیه الباب ویترك له ثقبة یلقی له الخبز والماء وقیل الرأی فیه للقاضی'' (شامی ۵۸/۸)۔

(قید خانہ کا دروازہ مٹی کے ذریعہ لیپ کردیا جائے گا۔ اور ایک سوراخ کے ذریعہ اسے کھانا پانی دیا جائے گا، اور بعض فقہاء نے فرمایا ہے کہ اس بارے میں قاضی اپنی صواب دید پر عمل کرے گا)۔

اسی جزئیہ سے دونوں چیزیں واضح ہوگئیں، ایک یہ کہ قیدی کو قید تنہائی بھی دی جاسکتی ہے، دوسرے یہ کہ مدت قاضی کے سپرد ہے جیسا کہ خود قید تنہائی کا فیصلہ بھی قاضی کے سپرد ہے کہ وہ مجرم اور جرم کے اعتبار سے اس کا فیصلہ کرے۔

۶- قیدیوں سے کام لینے کے حدود اور اجرت کے استحقاق کی وضاحت

ہم نے اپنے وضاحتی نوٹ میں یہ واضح کیا ہے کہ منصوص سزاؤں کے علاوہ تعزیرات کے جملہ اختیارات ''مفوض الی رای الحاکم والقاضی'' ہیں، اور اب یہ کام حکومتوں کے سپرد ہے۔ وہ پہلے ضابطہ بتاتی ہیں اور ان ہی ضابطوں کے مطابق کیس لڑا جاتا ہے اور پھر رہائی یا سزا دی جاتی ہے (حکومتوں کے اپنے وعدے یہی ہوتے ہیں حقیقت کچھ بھی ہو)۔

اس لئے اگر انہوں نے کسی جرم کی سزا قید بامشقت رکھی ہے تو قیدی سے جبراً کام بھی لیا جائے گا لیکن جہاں تک شرعی تعزیر کا تعلق ہے تو یہ بات عرض کی گئی کہ قاضی یا حاکم کو جسمانی ضرب وتادیب کا اختیار ہے (اگرچہ یہ منصب اب حکومتوں کے سپرد ہوچکا ہے) تو جس طرح جسمانی ضرب وتادیب کرتے ہیں اسی پر قیاس کرتے ہوئے عمل مشقت جس کو ہم جبراً کام لینا کہہ سکتے ہیں اس کا اختیار بھی ہونا چاہئے بشرطیکہ اس تعزیر عملی میں اس کی صحت واستعداد کا لحاظ رکھا جائے، نیز کام کے اوقات بھی محدود ہوں مثلاً آٹھ گھنٹہ، یا دس گھنٹہ عرف عام اور اس کی جسمانی صحت کے اعتبار سے، اور یہ کام اس کے حقوق یا احترام انسانیت کے منافی نہ ہوں اور عبث نہ ہوں، پھر اگر تعزیر یہی ٹھہرے کہ اسے اجرت نہ دی جائے تو ایسی صورت میں وہ اجرت کا مستحق نہ ہوگا کیوں کہ یہی قید مع العمل اس کی سزا اور تعزیر ہے اور سزا میں اجرت نہیں ملتی، اس سے یہ چیز بھی سمجھ میں آگئی کہ اگر کام کی نصف اجرت یا اس سے کم وبیش دی جائے تو یہ بھی درست ہونا چاہئے کیوں کہ جس طرح بلا اجرت عمل سزا اور تعزیر ہے اسی طرح کم اجرت پر عمل بھی سزا اور تعزیر ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اگر قیدی سے کام کرانا تعزیر اور سزا کا جز ہے تو ایسی شکل میں اس سے کام لینا اور اجرت نہ دینا یا کم دینا سب درست ہونا چاہئے۔

پھر جس طرح کام لینا تعزیراً اور سزاءً ہوتا ہے، بسا اوقات قیدی کو کام سے روکنا تعزیراً اور سزاءً ہوتا ہے۔ چنانچہ صاحب ردالمحتار علامہ شامیؒ ''ولا یکتسب فیہ'' کے تحت فرماتے ہیں:

''ولا یکتسب فیه، وقد صرح فی البحر وغیره بأن الأصح المنع... لأن الحبس مشروع لیضجر. ومتی تمکن من الاکتساب لایضجر. فیکون السجن له بمنزلة الحانوت'' (شامی ۵۷/۸ کتاب القضاء)۔

(قید خانہ میں قیدی کو کمانے کی اجازت نہ ہوگی، بحر وغیرہ میں اس کی صراحت ہے کہ یہی قول صحیح ہے، کیوں کہ قید تو اس لئے مشروع ہے تاکہ اسے تنبیہ ہو، لیکن جب کمائی کرے گا تو تنبیہ کیسے ہوگی، قید خانہ تو اس کے لئے بدرجہ دوکان ہوجائے گا)۔

شامی کے جزئیہ ''ولا تکتسب فیہ'' میں یہ صراحت ہے کہ قیدی کو کمائی کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ اور اگر وہ خود چاہے تو اس کی تمنا پوری نہ کی جائے گی لیکن شامی میں مذکور یہ جزئیہ کتاب القضاء کا ہے، اور سیاق وسباق سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مطل الغنی (مالدار ٹال مٹول کرنے والے

مقروض) سے متعلق ہے۔ وہ طویل المیعاد قیدی جن کی زندگی کا ایک لمبا عرصہ جیل میں گزرتا ہے یا وہ تاعمر سزا یافتہ ہوتے ہیں ایسے قیدیوں کے لئے کام کی گنجائش معلوم ہوتی ہے تا کہ ان کا بھلا ہو اور حکومت کا بھی، لہذا قیدی اگر از خود کام کرنا چاہیں تو انہیں اس کی مشروط اجازت ہونی چاہئے بلکہ ان سے کام لیا جانا ہی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ جبراً کام لے سکتے ہیں یا نہیں اور اجرت کے ساتھ یا بلا اجرت تو اس سلسلے میں تعزیر میں کافی گنجائش ہے اس لئے صحت و استعداد کے مطابق جبراً بھی کام لیا جاسکتا ہے جب کہ اس کو تعزیر کا جزئیہ بنا دیا جائے، اور اجرت کے استحقاق اور عدم استحقاق میں بھی یہی اصول ہوگا۔

حاصل یہ کہ قیدی سے بشرط صحت و استعداد و اوقات کام لیا جاسکتا ہے اور یہ کام اجرت اور بلا اجرت دونوں طرح درست ہے، جیسی قاضی کی رائے ٹھہرے۔ تاہم اس کے بیوی بچوں کے حقوق مالیہ اس پر عائد ہونے کی وجہ سے اگر اجرت دے دی جائے خواہ کم ہی سہی تو یہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۷- مجرم اور ملزم کے ساتھ سلوک میں فرق

ظاہر ہے جن قیدیوں کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے وہ بری ہو سکتے ہیں اور مشہور ضابطہ ہے کہ جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے متہم کو بری سمجھا جاتا ہے لہذا اس کے ساتھ مجرموں جیسا سلوک جائز نہ ہوگا۔

ڈاکٹر وھبہ زحیلی لکھتے ہیں: ''وإن الأصل في المتهم البراءة حتى تثبت إدانته'' (الفقه الاسلامي و أدلته ۶/ ۴۶۵۳)۔
(جب تک جرم ثابت نہ ہو متہم کو بری سمجھا جائے گا)۔

تو وہ شخص جو متہم ہو اور وہ کسی بھی وقت بری ہو سکتا ہو بھلا اس شخص کے مساوی کیسے ہو سکتا ہے جس پر فرد جرم عائد ہو چکا ہے اور اس کی سزا کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سزا یافتہ قیدی کو قید کے ساتھ ساتھ ضرب بھی ہوتی ہے۔

لہذا سزا یافتہ قیدی اور زیر سماعت قیدی کے مابین قید خانہ کے سلوک میں فرق کیا جاسکتا ہے۔

۸- زیر سماعت قیدیوں کو اتنے دنوں قید نہیں رکھا جاسکتا جو ثبوت جرم کے بعد اصل سزا ہو

زیر سماعت قیدی پر جب تک فرد جرم عائد نہیں ہوتا وہ متہم ہے، اور متہم کو بعض مخصوص حالات کے پیش نظر گرفتار اور قید کرنے کی گنجائش ہے لیکن زمانہ قید اتنا ہرگز نہ ہونا چاہئے جو جرم کی اصل سزا ہے۔ یہ چیز عقل اور نقل کے سراسر خلاف ہے کہ قیدیوں کی ساعت کو اتنا ست بنا یا جائے کہ وہ بذات خود ایک سزا ہو۔ ظلم کی اس سے بدترین کوئی مثال نہیں ہو سکتی کہ ملزم بے چارہ کو قانونی پیچیدگیوں میں ڈال کر اس کی زندگی کا ایک قیمتی حصہ برباد کر دیا جائے۔ پھر یہ کہ کتنے دنوں تک ان کو حراست میں رکھا جائے تو اس بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، البتہ بعض فقہاء نے چور کو شبہ کی بنیاد پر ایک ماہ قید کرنے کو کہا ہے، اسی پر قیاس کرتے ہوئے جرم کی سنگینی کے اعتبار سے یہ مدت کم زیادہ ہو سکتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کئی سال اسی کارروائی میں گزار دئے جائیں۔ علامہ شامی نے کتاب السرقة میں فقہاء کی ایک ماہ والی رائے اس طرح ذکر کی ہے: ''ويحبس حتى يكشف أمره وقيل شهراً'' (چور کو احتیاطاً قید کیا جائے گا اور بعض فقہاء نے کہا کہ یہ مدت ایک ماہ ہوگی)۔

۹- برأت کے بعد مالی ہرجانہ

''عن بهز بن حكيم عن أبيه عن جده أن النبي ﷺ حبس رجلا في تهمة ثم خلى عنه. وفي لفظ البيهقي حبس رجلا في تهمة ساعة من نهار'' (القضاء ونظامیہ / ۵۵۱ بحوالہ ترمذی)۔

(بہز بن حکیم سے انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک شخص کو شبہ کی بنیاد پر گرفتار کیا، پھر اسے چھوڑ دیا۔ اور بیہقی میں یہ اضافہ ہے کہ کچھ دیر کے لئے قید رکھا)۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شبہ کی بنیاد پر کچھ وقت کے لئے حراست میں لیا جاسکتا ہے لیکن یہ مدت بہت زیادہ نہ ہونا چاہیے۔ دوسری طرف احناف کا مشہور ضابطہ ہے کہ ''المنافع لا تضمن'' اس اعتبار سے ایسے شخص کے لئے مالی ہرجانہ نہ ہونا چاہئے کیوں کہ حراست کی وجہ سے اس کی

جسمانی منفعت فوت ہوئی ہے اگر آزاد ہوتا تو کچھ کام کر کے چند پیسے کما سکتا تھا لیکن اس حراست اور قید کی وجہ سے گویا اس کی اس منفعت کو غصب کیا گیا، اور عند الاحناف منافع کا ضمان نہیں ہوتا لہٰذا کسی قسم کا کوئی ہرجانہ نہ ہونا چاہئے۔

لیکن ظلم کے دروازہ کو بند کرنے کے لئے جیسے بہت سی جگہوں میں منافع کو قابل ضمان مان لیا گیا ہے یہاں بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لئے تلف منفعت کی وجہ سے ہرجانہ ملنا چاہئے۔ اور اسی پر ذہنی اذیت کو بھی قیاس کر سکتے ہیں کہ ذہنی اذیت سے بھی چوں کہ ایک آدمی کی صلاحیت متاثر ہوتی ہے لہٰذا اس پر بھی اسے ہرجانہ ملنا چاہئے۔

امام نووی نے کتاب الجنایات میں ایک جزئیہ تحریر فرمایا ہے:

''وإن جنى على حر جناية نقص به جمال أو منفعة ولا ارش لها مقدر ذكرنا أنه يجب فيهما حكومة''

(کتاب السجموع للنووی ۲۰/۵۴۸)۔

(اگر کسی نے کسی آزاد آدمی پر کوئی جنایت کی جس کی وجہ سے اس کے جمال یا منفعت کو نقصان پہنچا اور یہ جنایت ایسی ہو کہ اس کے لئے کوئی متعینہ مقدار دیت کی نہ ہو تو ایسی صورت میں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا حکومت (یعنی قاضی، حاکم یا دو عادل مرد جو تاوان اور ضمان طے کریں) واجب ہے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ نقص جمال یا فوت منفعت کی وجہ سے ہرجانہ واجب ہوگا، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قید کی وجہ سے اس کی صلاحیت متاثر ہوئی جو معنوی جمال ہے اور جسمانی منفعت بھی فوت ہوئی لہٰذا مذکورہ صورت میں ہرجانہ واجب ہونا چاہئے، نیز اگر ہرجانہ لازم کر دیا جائے تو اس طرح قیدیوں کو چھٹکارا بھی جلدی ملے گا ورنہ زیادہ مدت تک قید میں رکھا جائے گا۔ یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ شوافع وغیرہ کے یہاں اس کی پہلے سے ہی گنجائش ہے کیوں کہ ان کے وہاں منافع کا ضمان واجب ہوتا ہے۔

۱۰- قیدی کو مقدمات سے متعلق اپنے وکیل سے رابطے کے حقوق

وکالت کے لغوی معنی حفاظت کے آتے ہیں اس اعتبار سے وکیل حفیظ ہوتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"حسبنا اللہ ونعم الوکیل" (اللہ تعالیٰ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین محافظ (حفاظت کرنے والا) ہے) (القضاء ونظامہ/۴۶۱)۔

اور تفویض وتسلیم کے معنی بھی آتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: "علی اللہ توکلنا" (ہم نے اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ اور سپرد کر دیا)۔

''والوكالة فى الشرع إقامة الشخص غيره مقام نفسه مطلقًا أو مقيدًا'' (القضاء ونظامه/۴۶۱)۔

(وکالت شرع میں اپنی جگہ پر دوسرے کو اپنا قائم مقام بنانا ہے اور یہ نیابت مطلقاً بھی ہو سکتی اور مقید بھی)۔

حضرت جابر بن عبد اللہ سے مروی ہے: ''فرماتے ہیں کہ جب میں نے خیبر جانے کا ارادہ کیا تو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، سلام کیا اور عرض کیا کہ میرا خیبر جانے کا ارادہ ہے، آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ جب میرا وکیل تمہارے پاس آئے تو تم اس سے پندرہ وسق لے لینا، اور اگر وہ تم سے کوئی نشانی طلب کرے تو اپنا ہاتھ اپنی ہنسلی پر رکھ لینا'' (القضاء ونظامہ/ ۴۶۲)۔

ایک قیدی عدالت کے سامنے اپنی برأت کے دلائل تبھی دے سکتا ہے جب وہ قانون اور اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح ادا کرنا جانتا ہو، ورنہ جرم سے بری ہونے کے باوجود بسا اوقات وہ نجات سے محروم رہتا ہے اور صاحب حق ہونے کے باوجود حق حاصل نہیں کر پاتا، چنانچہ ایسے ہی حالات کی طرف حدیث میں صراحت موجود ہے، حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے:

''حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہاری ہی طرح انسان ہوں، اور تم میرے پاس مقدمے لاتے ہو، ایسا ہو سکتا ہے کہ تم میں سے بعض اپنے دلائل کو اچھی طرح ثابت کر لے جائے اور میں اسی کے مطابق اس کے لئے کسی چیز کا فیصلہ کر دوں جو درحقیقت اس کے بھائی کا حق تھا لہٰذا وہ اسے ہرگز نہ لے کیوں کہ یہ جہنم کا ٹکڑا ہے جو میں اسے دے رہا ہوں'' (القضاء ونظامہ/ ۶۴، بحوالہ بخاری ۹/ ۸۶، مسلم، ۳/ ۱۳۳۷)۔

اس سے معلوم ہوا کہ بسا اوقات آدمی حق پر ہوتے ہوئے اپنی بات صحیح انداز میں نہیں کہہ پاتا خصوصاً آج کل کی عدالتوں میں کہ عام آدمی نہ

اس زبان سے واقف ہے اور نہ ہی قانون سے، لہذا قیدی کو اپنے مقدمات کے سلسلے میں وکیل سے رابطہ اور صفائی پیش کرنے کا پورا حق حاصل ہونا چاہئے۔

۱۱- قیدی ماں کا اپنے دودھ پیتے بچے کو ساتھ رکھنے کا حق

اس مسئلہ کا تعلق بچے کی حفاظت اور تربیت سے ہے، یہ اس کا بنیادی حق ہے، اور اسی لئے میاں بیوی کی جدائی کے بعد بھی ماں کو حق تربیت باقی رہتا ہے۔ فقہاء کرام نے صراحت کی ہے کہ بچے کی وجہ سے ماں کی سزا میں تاخیر کی جائے گی، اور اگر وہ حمل سے ہے تو کوڑے وغیرہ مارنے میں وضع حمل کا انتظار کیا جائے گا، چنانچہ حضرت غامدیہؓ کے واقعہ میں حضور اکرم ﷺ نے پہلے ان کو واپس کر دیا، پھر دوبارہ بعد ولادت بچے کو لے کر آئیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ابھی بچہ دودھ پیتا ہے جب روٹی کھانے لگے تب آنا، پھر وہ تیسری مرتبہ اس حال میں تشریف لائیں کہ بچے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا چنانچہ پھر آپ نے سزا کا حکم دیا۔

معلوم ہوا کہ بچے کے حق کی وجہ سے ماں کی سزا میں تاخیر کی جاسکتی ہے، نیز بچے کے حقوق کی رعایت بہر حال ضروری ہے۔ رضاعت حضانت اور پرورش یہ بچے کے حقوق ہیں اور ان حقوق کی ادائیگی ماں سے بہتر دوسرا کوئی نہیں کرسکتا، لہذا قیدی ماں کو بھی بچے کی پرورش کا حق ملے گا، الا یہ کہ قید خانہ میں بچے کی تربیت کا صحیح نظم نہ ہو اور بچے کے اقرباء میں ایسے افراد موجود ہوں جو بچے کی اچھی طرح تربیت کرسکیں۔

لیکن امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس ''باب کراھیۃ التفریق بین السبی'' کے تحت ایک حدیث ذکر فرمائی ہے جو اس سلسلے میں بالکل صریح ہے، فرماتے ہیں:

''عن أبي أيوب قال سمعت رسول الله ﷺ يقول: من فرق بين والدة وولدها فرق الله بينه وبين أحبته يوم القيمة''

(حضرت ابوایوب رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے کہتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص ماں اور اس کے بچے کے درمیان جدائی پیدا کرے گا اللہ تعالی اس کے اور اس کے احباب ورشتہ داروں کے درمیان قیامت میں تفریق پیدا کرے گا)۔

'' والعمل على هذا عند أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم وغيرهم كرهوا التفريق بين السبي بين الوالدة وولدها وبين الولد والوالد وبين الإخوة'' (ترمذی شریف ۲/ ۲۸۵)۔

(اور اسی پر صحابہ وغیر ہم کا عمل ہے، یہ حضرات قیدیوں کے درمیان ماں اور اس کے بچے، باپ اور اس کے بچے اور بھائیوں کے درمیان تفریق کو مکروہ سمجھتے ہیں)۔

ترمذی کے محشی مولانا احمد علی صاحب حاشیہ میں احناف کا مذہب ذکر فرماتے ہیں:

''احناف کے نزدیک بچے (صغیر) اور اس کے ذی رحم ومحرم کے درمیان تفریق مکروہ ہے، صغیر کے قید سے کبیر نکل گیا، اور کبیر امام شافعی کے نزدیک سات یا آٹھ سال کی عمر کا ہے اور ہمارے نزدیک جب وہ بالغ ہو جائے''۔

اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ تو بالغ ہونے کے بعد بھی تفریق کے قائل نہیں ہیں۔

''قال أحمد لايفرق بين الوالدة وولدها وإن كبر واحتلم'' (حاشیہ ترمذی شریف ۲/ ۲۸۵)۔

(امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ بچے اور اس کی ماں کے درمیان تفریق نہیں کی جائے گی چاہے بچہ بڑا اور بالغ کیوں نہ ہو جائے)۔

ان عبارتوں کے عموم سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بچہ اور اس کی ماں بلکہ ذی رحم محرم یعنی قریبی رشتہ داروں کے درمیان تفریق کرنا جائز نہیں ہے۔ رہا یہ شبہ کہ بچہ بھی قید میں رہے گا، اس کو کس جرم کی سزا ملے گی تو عرض ہے کہ بچہ جب تک ہے خصوصا دودھ پینے کے زمانے میں اسے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کہاں ہے، محل میں، یا جھونپڑے میں، جیل میں، یا جیل سے باہر۔

اب رہا یہ مسئلہ کے کتنے دنوں تک مائیں اپنے بچوں کو بحالت قید اپنے ساتھ رکھ سکتی ہیں تو یہ مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے، عام حالات میں تو فقہ کا مشہور مسئلہ ہے کہ اگر بچہ ہے تو سات سال تک اور اگر بچی ہے تو بالغ ہونے تک ماں کی تربیت میں رہے گی، اس کے بعد باپ اسے واپس لے سکتا ہے لیکن

قیدی ماں کے حق تربیت کے بارے میں کوئی حتمی مدت کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، تاہم فقہاء کی رائے پر قیاس کرتے ہوئے یہ مناسب ہوگا کہ مدت رضاعت تک ماں بچے کو اپنے ساتھ رکھ سکتی ہے، اس کے بعد اگر بچے کے لئے رہنے کی کوئی اور جگہ نہ ہو تو چار سال تک ماں کے پاس رہے، چار سال کے بعد چوں کہ بچے کی تعلیمی زندگی شروع ہوجاتی ہے اور خود اس کے اندر تھوڑا بہت شعور پیدا ہوجاتا ہے تو اب اسے ماں کے ساتھ قید خانہ میں نہ رکھا جائے کہ کہیں احساس کمتری کا شکار ہو بلکہ باہر تعلیم و تربیت کا نظم کیا جائے۔

خلاصہ بحث

شرعی سزاؤں اور ''قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کا عالمی معیار'' میں فرق فقط اس قدر ہے کہ شرعی سزائیں بظاہر اگر چہ سخت لگتی ہیں لیکن ان کے اندر حقوق انسانیت کے تحفظ اور ایک قیدی کے ساتھ ایسے معاملات کئے جاتے ہیں جہاں ظالم اور مظلوم دونوں کی رعایت ہو جب کہ عالمی قوانین برائے قیدی بظاہر دیکھنے میں بڑے خوش نما اور ملائم معلوم ہوتے ہیں لیکن انسانیت اور حقوق انسانیت کا خون کیا گیا ہے۔ کہیں ظالم دندناتا پھرتا ہے تو کہیں مظلوم ہی سلاخوں کے پیچھے ہوتا ہے، آخر میں عدل و انصاف سے محرومی ہی ہاتھ لگتی ہے، اس کے بعد سوالات کے نہایت مختصر جوابات درج ذیل ہیں:

۱- بتقاضائے احوال احتیاطاً قید کیا جاسکتا ہے، اور اس کی مدت مفوض الی الحاکم یا قاضی ہوگی۔

۲- قیدیوں کو حق آزادی کے سوا جملہ حقوق انسانیت حاصل ہوں گے۔ جرم کی سنگینی کی بنیاد پر اسے قتل تو کیا جاسکتا ہے لیکن حقوق انسانیت سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

۳- تحقیق و تفتیش کے نام پر اس کے ساتھ غیر انسانی سلوک کرنا شرعاً جائز نہ ہوگا۔

۴- بعض مخصوص حالات میں مخصوص وقت کے لئے قیدیوں کو زنجیر یا ہتھکڑی لگائی جاسکتی ہے مثلاً گرفتاری کے وقت یا پیشی وغیرہ کے وقت، نہ کہ قید خانہ میں جہاں وہ کہیں بھاگ ہی نہیں سکتا، یعنی یہ سلوک سزا کا جز نہیں بلکہ بھاگنے کے خوف سے ہوگا۔

۵- مخصوص حالات میں کچھ وقت کے لئے قید تنہائی دی جاسکتی ہے۔ اس کا فیصلہ قاضی یا حاکم کرے گا۔

۶- بشرط صحت و استعداد کام لیا جاسکتا ہے، با اجرت بھی، کم اجرت اور بلا اجرت بھی، لیکن یہ بلا اجرت اسی وقت جب کہ یہ کام سزا کا جز ہو۔ لیکن بیوی بچوں کے مالی حقوق کی رعایت سے کچھ اجرت دے دینا بہتر ہوگا۔

۷- قید خانہ میں سزا یافتہ قیدی اور زیر سماعت قیدی کے سلوک میں فرق کیا جاسکتا ہے۔

۸- زیر سماعت قیدیوں کو اتنے دنوں تک فیصلہ سے پہلے قید میں رکھنا جو ان کے اوپر عائد فرد جرم کی اصل سزا ہے جائز نہیں۔ یہ سراسر ظلم ہے۔

۹- ہرجانہ طلب کرسکتا ہے بشرطیکہ قید معتد بہ مدت سے زیادہ ہو یعنی ثبوت الزام کے لئے قید کی جتنی مدت درکار ہے یہ قید اس سے زیادہ ہو۔

۱۰- قیدی کو اپنے مقدمات کے سلسلے میں وکیل سے رابطہ اور صفائی پیش کرنے کے پورے حقوق حاصل ہوں گے۔

۱۱- خواتین قیدیوں کو اپنے ساتھ شیر خوار بچوں کو جیل میں رکھنے کا حق حاصل ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆

اسلامی شریعت میں قیدیوں کے حقوق

مولانا خورشید احمد اعظمی[1]

اللہ تعالی نے انسان کو اپنی عظیم نعمتوں سے نوازا ہے۔ اسے مخلوقات میں شرف وعزت والا بنایا، عقل وعلم کی دولت عطا فرمائی، اپنے احکام کا مکلف بنایا، ان کے درمیان اپنے انبیاء اور رسول بھیجے، اور اخلاق حسنہ سے سنوارا، اور آزادی کی زندگی سے سرفراز فرمایا، مگر بھی انسان کبھی اپنے مقام اور حیثیت سے نیچے اتر کر اپنی شرافت کو بالائے طاق رکھ کر کچھ ایسی حرکت کر بیٹھتا ہے کہ اسے قید وبند صعوبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔ اور کبھی ظالم ومتکبر حکمرانوں کے ذریعہ شریف انسان کو بھی اس مصیبت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

قید وحبس نظام زندگانی کے لوازمات میں سے ہے۔ جس میں عام طور پر معاشرہ میں فساد اور بگاڑ پیدا کرنے والے مجرموں کو بغرض اصلاح رکھا جاتا ہے۔ اور یہ ان کے جرم کی سزا بھی ہوتی ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان کے ساتھ کسی بھی طرح کے ناز یبا اور انسانیت سوز معاملات روا رکھے جائیں۔

مجرموں کی نوعیت اور جرم کے ثابت ہونے یا اس کے شک کے دائرے میں ہونے کے لحاظ سے اس کے ساتھ معاملہ اور سزا میں فرق بھی ہوسکتا ہے۔

۱- کسی ملزم کو ثبوت جرم سے پہلے قید کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ بھی علی الاطلاق نہیں ہے کہ کوئی بھی آدمی کسی بھی شخص پر الزام رکھ دے، اور اسے قید میں ڈال دیا جائے، بلکہ کسی کے ملزم ہونے کے لئے شرط ہے کہ اس کے خلاف دو مستور الحال یا ایک عادل شخص کی شہادت اور گواہی ہے:

''إن التهمة تثبت بشهادة مستورين أو واحد عدل، فظاهره أنه لو شهد عند الحاكم واحد مستور أو فاسق بفساد شخص ليس للحاكم حبسه'' (شامی ۲/۱۲۶)

(اگر حاکم کے پاس ایک مستور الحال یا کوئی فاسق آدمی کسی کے فساد کی گواہی دے، تو حاکم کے لئے اس کو قید کرنا جائز نہیں)۔

''لأن خبرالواحد حجة فی الدیانات والمعاملات فتثبت شهادة العدل التهمة، وإن لم تثبت أصل الحق'' (البحر الرائق ٦/ ٣٦٠)

(کیونکہ دیانات اور معاملات میں خبر واحد حجت ہے)۔ لہذا ایک عادل شخص کی گواہی تہمت کو ثابت کردیگی اگرچہ اصل حق کے لئے ثبت نہ ہو۔ اور جب کسی پر تہمت اور الزام ثابت ہوجائے گا تو اس کو قید کیا جاسکتا ہے:

''والحبس بتهمة الفساد مشروع لأنه عليه الصلاة والسلام حبس رجلا بتهمة'' (البحر الرائق ٦/ ٣٦١)۔

اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے ذکر کیا ہے: ''أن النبی ﷺ حبس رجلا فی تهمة ثم خلى عنه'' (۴/ ۲۸، رقم: ۱۴۱۷)۔

سنن ابوداؤد میں مذکور ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ کچھ لوگوں کا سامان چوری ہوگیا تھا۔ انہوں نے کچھ لوگوں کو متہم گردانا اور صحابی رسول نعمان بن بشیرؓ کے پاس ان کی شکایت کی، نعمان بن بشیر نے ان متہم لوگوں کو کچھ دن قید میں رکھا پھر چھوڑ دیا، تو وہ لوگ دوبارہ آئے کہ آپ نے بغیر مار پیٹ کے انہیں چھوڑ دیا تو نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے کہا کہ آخر تم لوگ کیا چاہتے ہو، کہو تو میں ان کو پیٹتا ہوں، اگر تمہارا سامان ان کے پاس نکل گیا تو ٹھیک، ورنہ میں تمہاری بھی ویسی ہی پٹائی کرونگا، ان لوگوں نے کہا کہ یہ آپ کا فیصلہ ہے؟ تو نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ ہے۔ امام ابوداؤد رحمہ اللہ اس حدیث کے ذکر کے بعد کہتے ہیں کہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے اپنے اس قول سے انہیں خوف زدہ اور تنبیہ کیا کہ پٹائی اعتراف کے بعد ضروری ہے پہلے

[1] محلہ رگھوناتھ پورہ، مئو۔

نہیں۔ (۴/۵/۱۳۵ کتاب الحدود)، اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اعتراف اور ثبوت جرم سے پہلے قید میں ڈالا جا سکتا ہے۔ اس حدیث کے تحت حضرت گنگوہی کا یہ ارشاد منقول ہے:

''إلا أن العلماء جوزوا فی أیامنا هذه الامتحان بالضرب وبما شاء من التهدید. لما رأوا من تفویت الحقوق وإتلافها لولا ذلك وكان فیما مضى من الزمان یكتفی بالیسیر من التهدید فی اعتراف السارق''۔

(الدر المنضود ۶/۳۲۵ بحوالہ بذل المجہود)

(مگر علماء نے ہمارے اس زمانہ میں پٹائی اور کسی بھی دھمکی کے ذریعہ تفتیش کو جائز قرار دیا ہے۔ اس سبب سے کہ انہوں نے اس کے بغیر حقوق فوت ہو جانے کو محسوس کیا، اور گزشتہ زمانہ میں چور کے اعتراف میں معمولی دھمکی بھی کافی ہوتی تھی)۔

مگر ظاہر ہے کہ ملزم اگر شریف لوگوں میں سے ہے، اس الزام سے پہلے اس کا کوئی خراب ریکارڈ موجود نہیں ہے تو اس سے تفتیش کرنے میں وہ رویہ نہیں اختیار کیا جائے گا جو کسی فاسق وفاجر اور عادی مجرم سے تفتیش میں اپنایا جائے گا۔ علامہ شامی رحمہ اللہ نے بڑی مناسب بات نقل کی ہے:

''الذی علیه جمهور الفقهاء فی المتهم بسرقة ونحوها أن ینظر فإما أن یكون معروفا بالبر لم تجز مطالبته ولا عقوبته، وهل یحلف؟ قولان، ومنهك من قال: یعزر متهمه وإما أن یكون مجهول الحال فیحبس حتى یكشف أمره، قیل شهرا وقیل باجتهاد ولی الأمر، وإن كان معروفا بالفجور فقالت طائفة یضربه الوالی أو القاضی... الخ (شامی ۶/۱۴۷)۔

(چوری یا اس کے مثل معاملہ میں متہم شخص کے بارے میں جمہور فقہاء اس قول پر ہیں کہ دیکھا جائے گا، یا تو وہ شخص نیکی اور صلاح میں معروف ہوگا تو اس سے مطالبہ یا اس کی سزا جائز نہیں ہوگی، اور کیا اس سے قسم لی جائے گی اس بارے میں دو قول ہیں۔ اور علماء میں سے بعض نے یہ کہا کہ اس کے متہم کی تعزیر کی جائے گی، اور یا تو وہ متہم شخص مجہول الحال ہوگا تو اس کو قید میں رکھا جائے گا، یہاں تک کہ اس کا معاملہ واضح ہو جائے گا۔ قید کی مدت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ایک مہینہ، اور ایک قول یہ ہے کہ ولی الامر کے اجتہاد اور صوابدید پر ہے۔ اور اگر وہ متہم شخص فسق وفجور میں معروف ہوگا تو ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ قاضی یا حاکم اس کی پٹائی کرے گا)۔

لہٰذا ملزم کو ثبوت فراہم ہونے سے پہلے محض تفتیش وتحقیق کے لئے بھی قید کرنا جائز ہے، بلکہ اگر ملزم مشتہر بالفساد ہو تو اس کی پٹائی بھی درست ہے، قید کی مدت ولی الامر کی صوابدید پر ہے۔

۲- (الف) مذہبی امور: مذہب انسان کا فطری اور بنیادی حق ہے، اس لئے قید میں بھی اس کو عبادت، مذہبی کتب کا مطالعہ، اس کے مذہب کے مطابق اس لئے غذا کی فراہمی، اس کے حقوق ہیں جو دیئے جائیں گے جب کہ یہ حقوق مقصد حبس سے متعارض نہ ہوں، مثلاً کسی عبادت کے لئے قید سے بار بار نکالنا پڑے یا زیادہ مدت کے لئے نکالنا پڑے تو اس کی اجازت نہیں ہے:

''ولا یخرج لجمعة ولا جماعة ولا لحج فرض فغیره أولى ولا لحضور جنازة ولو كان بكفیل'' (در المحتار ۸/۵۶)

(اور نہیں نکالا جائے گا جمعہ کے لئے اور نہ جماعت کے لئے اور نہ حج فرض کے لئے لہٰذا غیر فرض میں بدرجہ اولی، اور نہ کسی جنازہ کے لئے اگرچہ کوئی کفیل ہو)۔

اس لئے کہ جمعہ کا بدل ظہر موجود ہے۔ اور جماعت فرض نہیں ہے۔ جنازہ کی نماز فرض کفایہ ہے، اور قید میں ہونے کی وجہ سے حج بھی فرض نہیں عدم استطاعت کے سبب۔

نیز کسی مذہبی شخصیت یا مذہبی کتاب کی بے حرمتی بھی نہیں کی جائے گی، خاص طور سے صاحب مذہب قیدی کے سامنے، قرآن کریم میں ہے:

"ولا تسبّوا الذین یدعون من دون الله فیسبّوا الله عدوًا بغیر علم. كذلك زینا لكل أمة عملهم ثم إلى ربهم مرجعهم فینبئهم بما كانوا یعملون" (انعام/۱۰۸)۔

ہر شخص کو اپنے مذہب، مذہبی شخصیات، مذہبی کتابوں سے جذباتی لگاؤ ہوتا ہے، اس کے سامنے اس کی بے حرمتی اس کو ردعمل پر مجبور کر سکتی ہے، اور

اس کا نتیجہ برعکس پر ہوسکتا ہے۔

جیل کے اندر قیدی کو دین کی دعوت کا بھی جواز ہونا چاہئے، قرآن کریم میں حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے قیدی ساتھیوں کو تعلیم وتبلیغ کرنا منقول ہے۔ اور پھر اس کے نتائج مثبت اور مفید ہی ہونے کی امید ہے۔

ب- جسمانی ضروریات: مجرم کو قید میں بطور سزا، اور زجر وتوبیخ کے لئے رکھا جاتا ہے۔ اس لئے اس کو وہاں اسی انداز سے رکھا جائے گا کہ یہ مقصد حاصل ہو۔ اور جو اس کی بنیادی جسمانی ضروریات ہیں وہ بھی بقدر ضرورت پوری کی جائیں گی، اسے کھانا اور صاف پانی دیا جائے گا، مگر اس حساب سے کہ جیل اس کی عیش گاہ نہ بن جائے۔

حفظان صحت کے لئے ورزش اور تفریح بھی حاکم کی صوابدید پر منحصر ہے۔ بیمار پڑ جائے تو جیل کے اندر ہی اس کے علاج کا نظم کیا جائے گا۔

''ولا یخرج للمعالجة لإمكانه فی السجن'' (البحر الرائق ۶/ ۲۷۶)۔

بیوی سے تعلق کا تقاضا ہے تو اس کا نظم کرنا بھی قیدی کے حقوق میں سے ہے۔

ولا یمنع من الجماع إن احتاج إلیه فتدخل امرأته أوجاریته علیه إن كان فیه موضع سترة (البحر الرائق ۶/ ۲۷۶) (اگر جیل میں پردہ کی جگہ ہو، اور قیدی کو جماع کی حاجت ہو تو اس کی بیوی یا باندی کو اس تک پہنچایا جائے گا)۔

اور اگر جیل میں اس کا نظم نہ ہو تو قیدی کو اس کے لئے نکالنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

نیز قیدی اگر متعنت ہو تو اس کے حالات کے اعتبار سے اسے اکیلے کمرہ میں، تنگ وتاریک جگہ میں بھی رکھا جاسکتا ہے۔ ایسی جگہ جہاں وہ ہاتھ پاؤں نہ پھیلا سکے، یا کھڑا نہ ہوسکے، اس میں تعزیر کے طور پر اتنی دیر کے لئے ہی رکھا جانا چاہئے کہ جس سے اس کے جسم میں کوئی نقص نہ پیدا ہو۔ متعنت قیدی کے بارے میں منقول ہے: ''یطین الباب ویترك له ثقبة یلقی منها الماء والخبز'' (البحر الرائق ۶/ ۲۷۶) دروازے پر مٹی چڑھا کر لیپ دیا جائے گا۔ اور ایک سوراخ چھوڑا جائے گا، جس سے کھانا پانی اندر پہنچایا جاسکے)۔

ج- سماجی حقوق: اخبارات پڑھنا، ریڈیو سننا

یہ امور مجرم کی نوعیت اور قاضی کی صوابدید پر موقوف ہے۔ اگر جرم ہلکا ہے، مجرم اشراف میں سے ہے تو اجازت دی جاسکتی ہے، اور اگر مجرم فاسق اور فاجر ہے، جرم کا عادی ہے تو اسے اجازت نہیں دی جاسکتی۔ کیوں کہ یہ امور اس کے بنیادی حقوق میں سے نہیں ہیں اور نہ اس کی ضروریات میں سے ہیں۔

فون پر احباب واقارب سے گفتگو، دوسرے قیدیوں سے ملاقات وغیرہ امور بھی قاضی کی صوابدید پر منحصر ہے، جیل میں رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اسے اپنے جرم کا احساس ہو، زجر وتوبیخ ہو۔ اس لئے موبائل فون رکھنے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ اقارب واحباب اور پڑوسیوں سے گفتگو فون کے ذریعہ کرائی جاسکتی ہے کیوں کہ اقارب وجیران قیدی سے مل سکتے ہیں۔ ''وصفة الحبس أن یكون فی موضع لیس فیه فراش ولا وطاء ولا یمكن أحد یدخل علیه للاستیناس إلا أقاربه وجیرانه ولا یمكثون'' (البحر الرائق ۶/ ۱۷۵) (اور قید کی صفت یہ ہے کہ ایسی جگہ میں ہو جہاں فرش اور نرم بستر نہ ہو، اور اس کی دلجوئی کے لئے وہاں کوئی نہ جاسکے، مگر اس کے رشتہ دار اور پڑوسی اور وہ لوگ بھی دیر تک نہیں رکیں گے)۔

دوسرے قیدیوں سے ملاقات بھی محدود وقت میں کرائی جاسکتی ہے۔ نیز تعلیم اور ہنر سیکھنے کی اجازت ہونی چاہئے، کیوں کہ یہ اس کی اصلاح اور سدھار کا سبب بن سکتی ہیں۔

د- اخلاقی امور

مردوں اور عورتوں نیز بالغ ونابالغ قیدیوں کے لئے الگ الگ قیدخانے کا نظم کیا جائے گا تا کہ کوئی نیا فتنہ اور نیا مسئلہ نہ پیش آجائے، ''وفی المحیط: ویجعل للنساء سجن علی حدة نفیا لوقوع الفتنة'' (البحر الرائق ۶/ ۲۷۶) (وقوع فتنہ کو روکنے کے لئے عورتوں کو لئے الگ قیدخانہ بنایا جائے گا)۔ اور اس فتنہ کا اندیشہ بالغ ونابالغ کے اجماع میں بھی ہے، اس لئے نابالغ (بچوں) کی الگ جیل بنائی جائے گی۔

۳- قیدی پر جرم ثابت نہیں ہوا، مگر اس پر الزام ہے جس کی تحقیق کے لئے اسے قید میں ڈالا گیا ہے۔ تو اولین صورت تو یہ ہے کہ گواہوں کے ذریعہ اس کا جرم ثابت کیا جائے، لیکن موقع پر گواہ نہیں ہیں۔ اور ملزم کے خلاف کوئی سابقہ ریکارڈ بھی نہیں ہے۔ اور اس کے مجرم ہونے کا قرینہ بھی نہیں ہے تو اس پر زیادہ سختی نہیں کی جائے گی، اور اگر ملزم عادی مجرم ہے یا اس کے مجرم ہونے کے قرائن موجود ہیں تو اس سے سچی بات اگلوانے کے لئے اس پر سختی کی جائے گی، اور اس کی پٹائی بھی کی جائے گی، جیسا کہ بحر کے حوالہ سے علامہ شامی نے نقل کیا ہے:

''وسئل الحسن بن زیاد: أیحل ضرب السارق حتی یقر؟ قال: مالم یقطع اللحم لایتبین العظم، ولم یزد علی هذا!''

(حسن بن زیاد سے پوچھا گیا کہ چور سے اگلوانے کے لئے اس کو مارنا جائز ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ جب تک گوشت نہیں کاٹا جائے گا، ہڈی ظاہر نہیں ہوگی۔ ''وهو ضرب مثل أي ما لولم یعاقب لا تظهر السرقة'' (۶/ ۱۴۶) یعنی یہ ایک ضرب مثل ہے جس کا استعمال یہاں پر اس معنی میں ہے کہ جب تک سزا نہیں دی جائے گی، چوری کھلے گی نہیں۔

لہذا ملزم سے اقرار کروانے کے لئے امام کو قید کرنے اور سختی کرنے کا حق حاصل ہے جسے وہ اپنے حساب سے کرے گا۔ اگر ملزم کے بارے میں قرائن موجود ہیں تو کوئی بھی مناسب طریقہ اختیار کرسکتا ہے۔ ''ومن السیاسة ما حکی عن الفقیه أبي بکر الأعمش أن المدعی علیه إذا أنکر فللإمام أن یعمل فیه بأکبر رأیه'' (شامی ۶/ ۱۴۷) مگر اس کو بے لباس نہیں کیا جائے گا۔ ''ولا یجرد أي من ثیابه في الحبس (شامی ۸/ ۵۸)

اور الکٹرک شاٹ کی بھی اجازت نہیں ہونی چاہئے، کیوں کہ یہ تعذیب بالنار کی قسم سے ہے جس سے حدیث میں منع کیا گیا ہے۔

اسی طرح قیدیوں پر کتے چھوڑنا، ان کو سخت ٹھنڈک میں برف کی سل پر ڈال دینا، یا سخت دھوپ میں کھڑا کردینا، یا ان کی جائے رہائش میں تیز روشنی یا تیز آواز کا نظم کرنا جس سے اس کی آنکھ یا کان کے متاثر ہونے کا خدشہ ہو وغیرہ امور سے ممانعت وارد ہے۔

''لا یجوز الحبس في مکان یمنع فیه المحبوس الطعام والشراب، أو في مکان حار أو تحت الشمس أو في مکان بارد أو في بیت تسدّ نوافذه، وفیه دخان أو یمنع من الملابس في البرد، فإن مات المحبوس فالدیة علی الحابس وقیل القود'' (فتاوی عالمگیری ۳/ ۴۱۴)۔

(ایسی جگہ قید کرنا جس میں قیدی کھانا پانی سے محروم رہے جائز نہیں ہے، اور نہ گرم جگہ میں یا دھوپ میں یا ٹھنڈی جگہ میں یا ایسے گھر میں جس میں دھواں ہوں اور کھڑکیاں بند ہوں، اور نہیں جائز ہے سردی میں اس کو کپڑے سے محروم کرنا، اور اگر قیدی مرجائے تو قید کرنے والوں پر دیت ہوگی، اور قصاص کا بھی قول ہے)۔

لہذا امام اور حاکم ایسی کوئی بھی مناسب سزا دے گا جو اس کی ہلاکت یا اس کے کسی عضو کے ضیاع اور تلف ہونے کا سبب نہ ہو۔

۴- حسب ضرورت قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑا جاسکتا ہے، انہیں ہتھکڑی پہنائی جاسکتی ہے اور انہیں بیڑی ڈالی جاسکتی ہے۔ حضرت ثمامہ بن اثالؓ جب گرفتار ہوئے تھے تو انہیں کھمبے سے باندھا گیا تھا۔ قرآن کریم میں بھی ہے: ''فشدوا الوثاق أي إذا أسر تموهم'' (الجامع لأحکام القرآن للقرطبی ۱۶/ ۲۲۶) سنن ابو داؤد (۳/ ۵۶) میں ثمامہ بن اثالؓ کے علاوہ، حارث بن البرصاء اللیثی کے باندھے جانے کا بھی واقعہ ہے، نیز حضرت سودہؓ کی ایک حدیث بھی مذکور ہے:

''فرجعت إلی بیتي ورسول الله صلی اللہ علیہ وسلم فیه وإذا أبو یزید سهیل بن عمرو في ناحیة الحجرة مجموعة یداه إلی عنقه بحبل'' (۳/ ۵۶، ۵۷)۔

لہذا مجرم اور جرم کی نوعیت کے لحاظ سے باندھنا، بیڑی ڈالنا وغیرہ جائز ہے۔

۵- مجرم کو اس کے خصوصی جرم کے پس منظر میں یا متعنت اور سرکش ہونے کی صورت میں قید تنہائی دی جاسکتی ہے، بزازیہ کے حوالہ سے ہے:

''وفیها: إذا خیف أنه یفر من السجن یحوّل إلی سجن اللصوص وإذا حبس المحبوس في السجن متعنتًا لا یوفي المال. قال الإمام الأرسانیدي: یطین الباب ویترك له ثقبة یلقي منها الماء والخبز وقال القاضي: الرأي فیه إلی القاضي''

(البحر الرائق ۶/ ۴۷۶)۔

۶- کسی مجرم کو قید میں ڈالنے کا مقصد اس کی تنکیل وتوبیخ ہے تا کہ وہ گھٹن اور تنگی محسوس کرے، اور اس حد تک پریشان ہو جائے کہ اپنے جرم پر نادم ہو، اور آئندہ کسی جرم کی ہمت وجرأت نہ ہو، اس لئے تعزیراً اس سے کوئی کام لیا جائے تو اس کی اجرت دینا ضروری نہیں ہے۔ لیکن اجرت پر اس سے کام لینا اسے کسب کا موقع دینے کے مرادف ہے، اس لئے اجرت پر کام نہیں لیا جائے گا۔ قیدی کو جیل میں کسب واکتساب کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ ''واختلفوا فی منعه من الكسب والأصح المنع'' (البحر الرائق ۶/ ۴۷۶) (اور قیدی کو کمانے سے روکنے میں علماء نے اختلاف کیا ہے، اور صحیح اس کو کسب سے روکنا ہی ہے)۔ ''وفی شرح أدب القضاء عن السرخسی انه الصحيح من المذهب. لأن الحبس مشروع ليضجر. ومتى تمكن من الاكتساب لا يضجر. فيكون السجن له بمنزلة الحانوت'' (شامی ۸/ ۱۰۰) (اور ادب القضاء کی شرح میں سرخسی سے منقول ہے کہ یہی قول یعنی اس کو کمائی سے روکنا ہی صحیح مذہب ہے، اس لئے کہ قیدی کی مشروعیت اس لئے ہے تا کہ وہ پریشان ہو۔ اور جب کمانے کا موقع دیا جائے گا تو اسے گھٹن نہیں ہوگی، اور جیل اس کے لئے بمنزلہ دوکان ہو جائے گی)۔

لہذا قیدی سے اجرت پر کام نہیں لیا جائے گا، اور تعزیراً کام لیا گیا تو اجرت دینا ضروری نہیں ہے۔

۷- جن قیدیوں کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے۔ اور جن کے بارے میں سزائے قید کا فیصلہ ہو چکا ہے، قید خانوں میں سلوک کے اعتبار سے دونوں میں فرق کیا جاسکتا ہے، اور یہ حاکم اور قاضی کی صوابدید پر ہے کہ کس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔

۸- زیر سماعت ملزموں کو قید میں رکھنا تحقیق حال کے لئے ہے۔ ملزم کے اوپر جرم کا دعوی ہے، اگر واقعۃً وہ مجرم ہے اور جرم کا ثبوت مل جاتا ہے تو اس کی طرف سے قصور پایا گیا کہ اس نے اپنے جرم کے اعتراف میں تاخیر کی، اور قاضی یا ولی الامر کو یہ استحقاق ہے کہ تحقیق حال کے لئے ملزم کو قید میں رکھے، اور مدت حبس بھی اس کی صوابدید پر ہے، ثبوت فراہم کرنے میں وقت بھی لگ سکتا ہے، اس لئے یہ مدت الگ ہے، اور ثبوت جرم کے بعد سزا کی مدت اور ہے، البتہ ولی الامر کو اپنی طرف سے اتنی تاخیر نہیں کرنی چاہئے کہ اس کی یہ مدت حبس طویل ہو جائے، نیز جرم کی نوعیت کے اعتبار سے وہ تحقیق حال کی مدت کو کم سے کم بھی رکھ سکتا ہے۔

ہمارے زمانہ میں جو تحقیق وتفتیش کی مدت سالہا سال تک بڑھ جاتی ہے وہ یقیناً غیر مناسب ہے، جب کہ آج کل ذرائع اور اسباب اس حد تک مہیا اور فراہم ہیں کہ کسی جرم کی تحقیق ایام اور مہینے میں مکمل ہو سکتی ہے۔ اس لئے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ سماعت وتحقیق حال کی مدت کو اس حد تک طویل نہ کیا جائے کہ اس پر عائد جرم کی مدت قید سے طویل ہو جائے، کیوں کہ اس کی سزا کی مدت معمولی ہونے کا مطلب ہے کہ جرم بھی معمولی ہے۔ اس صورت میں اس کی تحقیق زیادہ وقت نہیں لے گی۔

۹- ملزم کو تحقیق حال کے لئے قید میں رکھنا جائز ہے۔ اس لئے اگر اس پر جرم ثابت نہ ہو پائے اور کچھ دنوں کی قید کے بعد وہ بری کر دیا جائے تو وہ کسی ہرجانہ کے طلب کرنے کا مستحق نہیں ہوگا۔

۱۰- قیدی کو اپنے مقدمات کے سلسلہ میں وکیل سے رابطہ اور صفائی پیش کرنے کا حق ہے، مگر اس کے لئے اسے قید سے نکالا نہیں جائے گا، بلکہ اس کے وکیل کو اس سے جیل میں ملاقات کی اجازت ہوگی جیسا کہ اس کے اقارب وجیران کو اجازت ہے۔

۱۱- قیدی خاتون اپنے ساتھ شیر خوار بچے کو اس کے باپ کی اجازت سے رکھ سکتی ہے۔ لیکن اس کی رضاعت اور غذا کا نظم باپ کر لیتا ہے تو نہ رکھنا ہی زیادہ مناسب اور بہتر ہے۔ اگر چہ ماں کو حق حضانت حاصل ہے ہدایہ کا ایک جزئیہ ہے: ''وإذا أرادت المطلقة أن تخرج بولدها من المصر فليس لها ذلك لما فيه من الإضرار بالأب'' (ہدایہ ۲/ ۴۱۶) (اور مطلقہ عورت اپنے بچہ کو شہر سے باہر لے جانا چاہئے تو اس کو اجازت نہیں ہوگی کیوں کہ اس میں باپ کو ضرر پہنچانا ہے)۔ بچہ کو جیل میں رکھنے پر بھی یہ ضرر سامنے آتا ہے اس لئے اجازت نہیں ہونی چاہئے۔

قیدیوں کے حقوق - اسلامی تناظر میں

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی [1]

۱- اسلامی قانون کسی ایسے شخص کو سزا نہیں دیتا جس نے کسی جرم کے بارے میں صرف سوچا ہو یا اس کے ارتکاب کے لئے منصوبہ بنایا ہو الا یہ کہ مجرم ارادہ جرم اور جرم کے منصوبہ پر عملی جامہ پہنانے کے لئے کوئی کارروائی بھی کرے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''إن الله تجاوز عن أمتي ما حدثت به أنفسها ما لم تعمل أو تتكلم''۔

واضح علامات اور یقینی بنیادوں پر ہی مجرم کو قید کیا جانا چاہئے، "ثم بدا لهم من بعد ما رأوا الآيات ليسجننه" آیت مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عزیز مصر نے یوسف کی براءت کی علامات دیکھنے کے بعد ہی اپنی خفت کو مٹانے اور حقیقت پر پردہ ڈالنے کی غرض سے انہیں قید میں ڈالا تھا۔ (دیکھئے: أحکام القرآن للقرطبی ۹/۱۸۶، ۱۹۹۴)۔

معلوم ہوا کہ جو بات کسی کے خلاف کہی جارہی ہے، وہ ٹھوس بنیادوں پر ہو تبھی لائق سماعت ہوگی، اس کی تائید درج ذیل عبارت سے بھی ہورہی ہے۔

صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

''ولهذا لم يشرع في التعزير بالتهمة قبل ثبوته كما شرع في الحد لأنه من التعزير'' (هدايه ۲/۵۱۶)۔

بڑی مشہور حدیث ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں بغیر کسی بینہ کے کسی کو رجم کرتا تو اس عورت کو ضرور رجم کردیتا۔

فقال عبد الله بن شداد: هي التي قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لو كنت راجمًا امرأة عن غير بينة'' (اعلاء السنن ۱۵/۱۰۴، رواه البخاري)، وفي رواية أخرى لو رجمت أحدًا بغير بينة لرجمت هذه. قال ابن حجر العسقلاني: ولكن لم يثبت عليها ذلك ببينة ولا اعتراف''۔

سید قطب کا بھی یہی کہنا ہے کہ قطعی ثبوتوں کے بعد ہی کسی کو حوالہ زنداں کیا جائے:

''على ثأن الإسلام لا يشدد في العقوبة هذا التشديد إلا بعد تحقيق الضمانات الوقائية المانعة من وقوع الفعل ومن توقيع العقوبة إلا في الحالات الثابتة التي لا شبهة فيها'' (في ظلال القرآن لسيد قطب ۱۸/۲۴۸۹)۔

چونکہ بدون قطعی دلائل کے قید کرنا اس پر ایک طرح کا ظلم ہے۔

''روي عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: من بلغ حدًا في غير حد فهو من المعتدين'' أخرجه البيهقي في السنن كتاب الحدود عن خالد بن الوليد عن النعمان بن بشير وقال في التنقيح ورواه ابن ناجية في فوائده ورواه محمد بن الحسن في كتاب الآثار مرسلاً'' (احكام القرآن ۴/۵۰)۔

اگر احتیاطاً قید کرنے کی نوبت آجائے تو یہ سزائے قید تعزیری ہوگی اور علامہ ماوردی کے قول کے مطابق وہ ایک دن ہے، احقر کی رائے یہ ہے کہ اس مسئلہ کی تعیین شرعی قاضی کی صوابدید پر محول کیا جائے، یا یہ کہ علامہ ماوردی کے مطابق ہی عمل کیا جائے، لیکن اس دوران کسی یقینی نقطہ پر پہنچنے کی

[1] پرنسپل وشیخ الحدیث دار العلوم مئو۔

بھرپور کوشش کی جائے (اس کی تفصیلات موسوعہ فقہیہ ۱۲ / ۲۶۹ پر دیکھی جاسکتی ہیں)۔

۲- الف- نصوص قرآنیہ واحادیث نبویہ کے تحت ہر مکلف پر عبادت فرض ہے چاہے وہ آزاد ہو یا مقید، مذہب کی دعوت دینا، مذہبی کتابوں کا مطالعہ نیز مقدس شخصیتوں سے ملاقات قیدی کی بنیادی اور شرعی ضروریات ہیں جن پر روک لگائی نہیں جاسکتی، عہد صحابہ وتابعین وبعد کے ادوار میں قیدی کو یہ تمام سہولیات میسر تھیں۔

۱۹۴۶ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے حقوق انسانی کے تحت کچھ قوانین وضع کئے تھے جس کو ۱۰ / دسمبر ۱۹۴۸ء میں آخری شکل دی گئی اس کے دفعہ ۱۸ میں کہا گیا ہے کہ ہر انسان کو آزادی فکر، آزادی ضمیر وآزادی مذہب کا پورا حق ہے، اس حق میں مذہب، یا عقیدہ کی تبدیلی، پبلک یا نجی طور پر تنہا یا دوسروں کے ساتھ مل کر عقیدہ کی تبلیغ، عمل، عبادت اور مذہبی رسمیں پوری کرنے کی آزادی شامل ہے۔

محترم سالار محمد خان ایڈوکیٹ لکھتے ہیں: ''عالمی معیار آزادی مذہب کو تسلیم کرتا ہے، اس کے تمام اہل مذاہب کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت ہونی چاہئے، عالمی قانون کا اصرار ہے کہ تمام مذہبی نمائندوں کو قیدیوں کی مذہبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے قید خانہ میں آنے کی اجازت ملنی چاہئے۔...... یہ بھی منظور کیا گیا ہے کہ قید خانہ کے عہدداروں کے لئے اس امر کو یقینی بنانا ضروری ہے کہ قیدیوں کو عبادت کرنے، مذہبی کتابوں کو پڑھنے اور اپنے مذہب کے مطابق کپڑا پہننے کا موقع ملے، ان کو مذہبی اجتماع کرنے اور مذہبی نمائندوں سے اجتماعی وانفرادی مقصد کے لئے ملنے کی اجازت ہونی چاہئے''۔ نیز کوئی بھی دھرم ومذہب کسی بھی مذہب کی کتابوں کی بے احترامی کی اجازت نہیں دیتا، قیدیوں کے درمیان دعوت دین کی واضح مثال قرآن عزیز کی اس آیت میں موجود ہے: "یا صاحبی السجن ءأرباب متفرقون خیر أم الله الواحد القهار". اسی طرح جیل میں جانے کے بعد شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ نے جو تبلیغی ودعوتی خدمات انجام دیں جن کا مفصل تذکرہ الکواکب الدریہ/۱۸۱ پر اور حضرت مجدد الف ثانی سرہندی کی قلعۂ گوالیار میں دعوتی سرگرمی کا تذکرہ (Preching of Islam p. 412) اور انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس ((۸/۷۴۸ پر دیکھا جاسکتا ہے۔

۲- ب- سالار محمد خان ایڈوکیٹ لکھتے ہیں: ''حکومت کے لئے ضروری ہے کہ وہ قیدیوں کے انسانی وقار کا لحاظ رکھے، اپنے واجبات کی ادائیگی کے لئے حکومت کو بہت سی مادی سہولیات فراہم کرنا چاہئے، ان مادی ضرورتوں میں مناسب رہائش، حفظان صحت کے اصول کے مطابق ماحول کا صحت بخش ہونا، لباس، بستر، غذا، مشروبات اور ورزش شامل ہے''۔

شریعت اسلامیہ بیوی سے تعلق کی بھی قیدی کو اجازت دیتی ہے:

''ولا یمنع من الجماع إن احتاج إليه فتدخل امرأته أو جاريته عليه إن كان فيه موضع سترة'' (البحر الرائق ۶/۲۸۳)، ''لأن اقتضاء شهوة الفرج كاقتضاء شهوة البطن'' (تبیین الحقائق ۴/۱۸۲، الموسوعہ الفقہیہ ۱۶/۲۲۳)

اکثر احناف کی یہی رائے ہے۔

ایسی تنگ جگہوں میں قیدیوں کے رکھنے کی شریعت اسلامیہ اجازت نہیں دیتی جہاں کھڑا ہونا یا پاؤں پھیلا کر لیٹنا یا دیوار کے باہر کسی چیز کا دیکھنا ممکن نہ ہو، نیز اس پر حبس وقید کی تعریف بالکل چسپاں نہیں ہوتی، یہ قید کے ساتھ ساتھ ایک اور سزا ہے جبکہ عالمی اصول وضوابط کے مطابق جیل بھیجے جانے والے پر ایک ہی سزا نافذ کی جاتی ہے اور وہ ہے آزادی سے محرومی، اس بات کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ چوبیس گھنٹے میں کتنا وقت وہ اس میں گذارے گا، چھوٹی سی جگہ کم نقصان دہ ہے اگر اسے صرف سونے کے لئے استعمال کیا جائے اور دن میں قیدی باہر کھلی فضا میں دوسرے کاموں میں مصروف ہو۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ لکھتے ہیں: ''فإن الحبس الشرعي ليس هو السجن في مكان ضيق وإنما هو تعويق الشئ ومنعه من التصرف بنفسه'' (فتاوی ابن تیمیہ ۳۵/۳۹۸)۔

علامہ ابن قیم جوزیؒ لکھتے ہیں کہ اسلامی قانون میں حبس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ کسی کو تنگ جگہ میں بند کر دیا جائے بلکہ مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کی

حرکت خود اختیاری پر پابندی لگادی جائے (بحوالہ الطرق الحکمیہ/۱۰۱-۱۰۲)۔

۲- ج- صالح پمفلٹ، ڈائجسٹ وجرائد اور غیر مخرب اخلاق اخبارات کے پڑھنے کی اجازت قیدی کو حاصل ہونی چاہئے، ساتھ ہی صالح پروگرام اور عمدہ خبروں کے سننے کی بھی اجازت، ویڈیو کانفرنسگ کے ذریعہ احباب واقارب سے گفتگو کرنے نیز ان سے ملاقات کا بھی موقع دیا جانا چاہئے،

''ولا يمكن أحد يدخل عليه للاستئناس إلا أقاربه وجيرانه ولا يمكثون'' (البحر الرائق ۶/۲۸۳)۔

بعض قیدیوں کو بعض سے ملاقات کی اجازت بھی دینی چاہئے مگر وہ قیدی جو انتہائی شاطر اور خونخوار ہوں، اس لئے کہ ان سے ملاقات کی اجازت پر ممکن ہے کچھ دیگر جرائم سیکھ لے، قیدی کو بہتر تعلیم اور ٹیکنیکل کی اجازت ملنی چاہئے، تاکہ یہ ہنر اور علم خلاصی کے بعد اس کے کام آئے۔

۲- و- فقہاء نے عورتوں اور مردوں، بالغوں اور نابالغوں کے لئے الگ الگ قید خانوں کی تجویز پیش کی ہے:

''نص الفقهاء على أن يكون النساء محبس على حدة إجماعًا ولا يكون معهن رجل لوجوب سترهن وتحرزًا من الفتنة وثالأولى أن تقوم النساء على سجن مثيلاتهن فإن تعذر ذلك جاز استعمال الرجل المعروف بالصلاح على محبسهن ليحفظهن وهو المروي عن أبي حنيفة وإذا لم يكن هناك سجن معد للنساء حبست المرأة عند أمينة خالية عن الرجال أو ذات رجل أمين كزوج أو أب أو ابن معروف بالخير والصلاح'' (الموسوعة الفقهيه ۱۶/۳۲۱، فتاوی ہندیہ ۳/۴۱۶)۔ نیز عبارت مذکور سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر الگ الگ قید خانہ کا انتظام نہ ہو سکے اور اس بابت دشواری ہو تو قید خانہ کا نگراں صالح و دیندار ہونا چاہئے جو ان کی عصمت و آبرو کا محافظ ہو۔

۳- الف- اولاً اکراہ کے سلسلہ میں مفسرین اور فقہاء کے اقوال پیش ہیں:

''وإنما حلف خوفًا من ضربه وقتله وأخذ ماله فإن كان إنما تبرع باليمين غلبة خوف ورجاء النجاة من ظلم فقد دخل في الإكراه ولا شئ عليه'' (تفسیر القرطبی ۱۸۷/۱۰)۔

(ایک شخص مار یا قتل اور اخذ مال کے خوف سے اور اپنی ذات سے ازالہ ظلم کی غرض سے قسم کھالیتا ہے تو وہ حانث نہ ہوگا اور اس پر کفارہ یمین نہ ہوگا)۔

عبارت مذکورہ سے ضرب، قتل اور مال کے چھین لینے کا خوف اکراہ میں داخل ہے۔

شریعت اسلامیہ نے ان لوگوں پر جن پر حدود وقصاص نافذ کئے گئے ہیں ان کو بھی بے لباس کرنے کی اجازت نہیں دی ہے (دیکھئے: القرطبی ۱۰/۱۹۰، ہدایہ ۲/۴۹۰)۔

یہی حکم تعزیر میں بھی

''ويجوز في نكال التعزير أن يجرد من ثيابه الأخدر ما يستر عورته... ولا يجوز أن تحلق لحيته واختلف في تسويد وجوههم فجوزه الأكثرون ومنع منه الأقلون'' (الاحکام السلطانیہ/۲۳۹)۔

(تعزیری سزا میں بالکل ننگا کرنا جائز نہیں، ہاں اتنے کپڑے اتارنا جائز ہے جس سے بے لباس نہ ہوتا ہو...... نیز حلق لحیہ بھی جائز نہیں، چہرہ کو سیاہ کرنے سے متعلق اکثر حضرات نے جائز کہا ہے، کچھ لوگوں نے ناجائز کہا ہے)۔

''قال مالك من أنه ينزع عن الزاني عند الجلد ثيابه إلا الإزار فإنه لا ينزع لستر عورته به وعن الشافعي وأحمد أنه يترك عليه قميص أو قميصان وروى عبد الرزاق بسنده عن علي كرم الله وجهه أنه أتي برجل في حد فضربه وعليه كساء قسطلاني''۔

ابھی ابھی معلوم ہو چکا کہ ائمہ اربعہ ودیگر فقہاء کرام کے نزدیک قطعاً بے لباس کرنا جائز نہیں کسی کے یہاں ازار تو کسی کے یہاں ایک یا دو کرتا، خود مصنف عبدالرزاق میں اثر صحابی موجود ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس حال میں حد لگائی کہ مجرم کے جسم پر ایک قسطلانی چادر موجود تھی۔

علامہ ماوردی مالکی تحریر فرماتے ہیں:

''تحرم المعاقبة بالتجريد من الثياب لما في ذلك من كشف العورة'' (الاحکام السلطانیہ ۲۳۹)۔

۳- ب-بعض ائمہ کے نزدیک قیدیوں کو مارنے کی اجازت تو ہے مگر حدود شرع میں رہ کر اور ضرب بھی انہیں مقامات پر جہاں حکم شرعی ہے۔

لیکن اکثر احناف وشوافع قیدی کو ضرب کی اجازت بالکل نہیں دیتے، مالکیہ میں اصبغ کا بھی یہی قول ہے۔

''والقول الثاني لا يضرب بل يحبس كما تقدم وهذا قول أصبغ من أصحاب مالك وقول كثير من الحنفية والشافعية وغيرهم'' (فتاوی لابن تیمیہ ۳۵/۴۰۱)۔

۳- ج-ويحرم التأديب بإحراق الجسم أو بعضه بقصد الإيلام والتوجيع إلا المماثلة في العقوبة ولا يجوز خنق المحبوس وعصره وغسطه في الماء'' (الموسوعة الفقهیہ ۱۶/۲۲۷)۔

''وليس للدائن أن يحبسه في الشمس أو على الثلج أو في مكان يتضرر به'' (البحر الرائق ۶/۲۸۸، فتاوی عالمگیری ۳/۲۸۸)، ''تحرم المعاقبة بالإقامة في الشمس أو صب الزيت على الرؤوس'' (عالمگیری ۵/۳۶۱)

مذکورہ عبارتوں سے الکٹرک شاک کی ممانعت ثابت ہو رہی ہے۔

۳- د-اور پر شق (ب) کی تفصیلات میں معلوم ہو چکا ہے کہ کہاں کہاں حد لگائی جاسکتی ہے اور اس سلسلہ میں کس احتیاط کا علم اب ہے کوئی جو بتلائے کہ قیدیوں کے جب بیڑیاں ہتھکڑیاں لگی ہوں اور ان پر خونخوار کتوں کو چھوڑا جائے تو ان کے اعضائے رئیسہ وغیر رئیسہ سالم اور محفوظ رہیں گے؟ ایسے لوگوں سے قصاص لیا جاسکتا ہے اور اسے تادیبی سزا بھی دے سکتے ہیں، تبصرۃ الحکام میں مالکیہ کا مسلک درج ہے کہ جو شخص عمداً کسی کو زخمی کرے گا اس سے قصاص لیا جائے گا اور اس کے ساتھ اسے تادیبی سزا بھی دی جائے گی (التعزیر فی الشریعۃ الاسلامیہ ۱/ ۷۴)۔

یہ ممکن ہے کہ ان کتوں کو چھوڑنے کی بنا پر قیدی کی موت ہو جائے، حضرات صاحبین کے یہاں قتل عمد آلہ کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی ہو سکتا ہے، مثلاً کسی کو ڈبو دینے، گلا گھونٹنے، کسی کو اونچی جگہ سے گرا دینے وغیرہ سے بھی، احقر اس طریقہ کار کو بھی اگر کتے کے چھوڑنے پر قیدی مر جاتا ہے تو قتل عمد شمار کرتا ہے اور اس سے قصاص لیا جائے گا۔

''لا تجوز المعاقبة بجدع أنف أو أذن أو اصطلام شفة وقطع أنامل وكسر عظم ولم يعهد شيء من ذلك عن أحد الصحابة ولأن الواجب التأديب وهو لا يكون بالإتلاف وقد نهى النبي ﷺ بالأسرى فقال في وصية لأمراء السرايا لا تمثلوا'' (الموسوعة الفقهیہ ۱۶/۲۲۶،۲۲۷)۔

اگر تعزیری سزا کے وقت کسی کو کوئی اور ضرر پہنچ جائے جو اصل سزا سے زائد ہو تو اس پر ضمان واجب ہے، حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ کسی مقدمہ میں ایک عورت کو دھمکایا تو اس نے خوف کے مارے اپنے پیٹ کو سکیڑ لیا اور اس طرح اس کا حمل گر گیا، اس پر حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے مشورہ لیا اور بچہ کی دیت ادا کی۔

مسلسل جگے رہنے پر مجبور کرنے کے لئے تیز روشنی یا تیز آواز کا انتظام رکھنا بالفاظ دیگر صحت کے متاثر ہونے کو یقینی طور پر دعوت دینا ہے اور مسلسل بے خوابی سے طرح طرح کے امراض پیدا ہو سکتے ہیں جو مفضی الی الموت ہو سکتے ہیں، اس لئے اس کی بھی اجازت قطعاً دینی نہیں چاہئے۔

۳- ہ-'' لا يجوز الحبس في مكان يمنع فيه المحبوس الطعام والشراب أو في مكان حار أو تحت الشمس أو في مكان بارد أو في بيت تسد نوافذه وفيه دخان أو يمنع من الملابس في البرد فإن مات المحبوس فالدية على

الحابس وقيل القود'' (الموسوعة الفقهيه١٦/)۔

(ایسی جگہ قید کرنا جائز نہیں جہاں قیدی کو کھانا یا پانی نہ مل پائے یا وہ جگہ گرم یا مسلسل دھوپ یا ٹھنڈ رہتی ہو، یا کسی ایسے گھر میں جس میں دھواں ہو اور اس کے روشن دان وغیرہ بند کردیئے گئے ہوں یا ٹھنڈ کے موسم میں اسے گرم کپڑوں کے استعمال پر روک لگادی گئی، اگر اس صورت میں وہ مرگیا تو قید کرنے والے سے دیت یا قصاص لیا جائے گا)۔

۴- غزوہ بنی قینقاع میں حضرت منذر بن حذامہ کو تمام گرفتار شدہ قیدیوں کو ہتھکڑیاں لگانے کا کام سونپا گیا تھا (عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت/ ۲۴۳)، ثمامہ بن اثال کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کے ستون میں سے ایک ستون میں بندھوایا تھا (احکام القرآن: مفتی محمد شفیع ۲۱۱/۴)۔

قرآن کہتا ہے: "حتی إذا أثخنتموهم فشدوا الوثاق" (سورہ محمد)۔

المعجم الوسیط میں ہے: ''الوثاق لمايشد به كالحبل وغيره''۔

زنجیروں میں جکڑے جانے، ہتھکڑی پہنائے جانے یا بیڑی ڈالے جانے کا معاملہ قیدیوں اور مجرمین کے حالات پر منحصر ہے، بعض قیدی انتہائی جری ہوتے ہیں اور بار بار ارتکاب جرم کرتے ہیں تو قاضی انہیں حبس دوام کردیتا ہے۔

''فيجوز للقاضی استدامة حبس من تكررت جرائمه وأصحاب الجرائم الخطيرة'' (الموسوعة الفقهيه١٦/٢٨٨)۔

اس لئے حالات کے اعتبار سے کبھی تو کسی ایک کی ضرورت پڑتی ہے اور کبھی تینوں کی اور کبھی تو کسی کی ضرورت نہیں پڑتی، مثلاً جرم بطور عادت نہ ہو بلکہ غفلت اور سہو سے ہوگیا ہو اور حاکم یہ سمجھتا ہو کہ ابتدائی وعظ ونصیحت ہی اس کے لئے کافی ہے تو پھر اسے قید کرنے کی ضرورت نہیں۔

(التعزیر فی الشریعۃ الاسلامیہ ۲۱۹/۲)۔

۵- کیا کسی مجرم کو اس کے خصوصی جرم کے پس منظر میں قید تنہائی دی جاسکتی ہے، (الموسوعۃ الفقہیہ ۳۱۹/۱۶) میں درج ذیل عبارت موجود ہے جس سے جواز کا ثبوت ہوتا ہے:

''ويجوز للحاكم عزل السجين وحبسه متفردًا فی غرفة يقفل عليه بابها إن كان فی ذلك مصلحة''۔

اگر قاضی مصلحت سمجھتا ہو تو قیدی کو الگ قید کرسکتا ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں ''کال کوٹھری'' سے تعبیر کرتے ہیں، چونکہ بعض قیدی دوسرے قیدی سے مل کر دیگر جرائم سیکھ سکتے ہیں، اس لئے بھی ایسے قیدیوں کو جن پر جیل کے ذمہ دار مطمئن نہ ہوں قید تنہائی دی جاسکتی ہے۔

۶- اس سلسلہ میں فقہاء کے تین اقوال ہیں، لیکن بندہ کے نزدیک راجح وہی ہے جو امام ابوحنیفہ ودیگر فقہاء امت کا معتمد مسلک ہے۔

القول الثانی يمنع المحبوس من العمل فی حبسه ولا يمكن منه لئلا يهون عليه الحبس وليضجر قلبه فينزجر وإلا صار الحبس له بمنزلة الحانوت وهذا هو المعتمد فی مذهب أبی حنيفة وبه قال غيرهم من الفقهاء'' (الموسوعة الفقهيه١٦/٣٢١،٣٢٢)۔

ڈاکٹر عبدالعزیز عامر کی درج ذیل تحریر سے کام لئے جانے کا جواز تو ہے مگر سیاق کلام بتلاتا ہے کہ وہ اجرت نہ دیئے جانے کے حق میں ہیں۔

اس سلسلہ میں التعزیر فی الشریعۃ الاسلامیۃ (۱۳۹/۲) کی ایک تحریر پیش ہے، ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں: ''جہاں تک میں سمجھتا ہوں اسلامی قانون میں کوئی ایسی بات نہیں جو اس کے خلاف ہو بلکہ مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ مجرم سے مشقت لی جائے تا کہ سزائے قید اپنا اثر دکھائے، البتہ یہ سزا اور مشقت ایسی ہونی چاہئے کہ خود مجرم کی شخصیت اور اس کے جرم کی نوعیت کے مطابق اور مناسب ہو''۔ لیکن اس سلسلہ میں سالار محمد خان ایڈوکیٹ لکھتے ہیں: ''عالمی قانون کے مطابق جبری یا لازمی محنت ممنوع ہے تاہم یہ بھی ملحوظ رہے کہ سارے کام خود بخود اس زمرہ میں نہیں آجاتے، آگے سالار صاحب کچھ شرطوں کے ساتھ جواز کا قول نقل کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''سزا یافتہ قیدیوں کو کام کا مکلف بنایا جاسکتا ہے بشرطیکہ درج ذیل تحفظات فراہم کئے جائیں:

(۱) کام بامقصد ہو، (۲) کام سے ایسی فنی صلاحیتیں پیدا ہوں جو قید سے چھٹکارے کے بعد مفید ثابت ہو، (۳) قیدیوں کو کام کی اجرت ملنی چاہئے، (۴) کام کی کیفیت عمومی ورک کلچر، بالخصوص صحت وتندرستی وتحفظات کے معیاروں کے مطابق ہونی چاہئے، (۵) کام کے اوقات حد سے متجاوز نہ ہوں اور دوسری سرگرمیوں کے لئے بھی وقت بچے''۔

احقر کی رائے ہے کہ قیدی کو اجرت ملنی چاہئے۔

۷- فتاویٰ ابن تیمیہ (۳۵/۴۰۱) میں ہے: ''لکن حبس المتهم عندهم أبلغ من حبس المجهول'' اس سے قیدیوں کے مختلف احوال کے باعث مختلف حبس کا ثبوت ملتا ہے، لیکن محترم سالار محمد خان ایڈوکیٹ زیر سماعت قیدیوں اور جن کی بابت سزائے قید کا فیصلہ ہو چکا ہے دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کئے جانے کے حق میں ہیں، لکھتے ہیں: حقوق انسانی کا عالمی معیار حکومتوں کو اس بات کا پابند بناتا ہے کہ وہ سزائے موت پاتے ہوئے قیدیوں کو وہ ساری سہولتیں مہیا کرائے جو عام قیدیوں کو حاصل ہیں، آگے لکھتے ہیں: دوسرے قیدیوں سے تعلق رکھنے جیسے معاملات میں انہیں کمتر تصور نہ کیا جائے اور ان کے ساتھ برابرتاؤ صرف اس لئے نہیں ہونا چاہئے کہ وہ سزائے موت والے قیدی ہیں۔

احقر بھی اسی حق میں ہے کہ انہیں بھی وہی حقوق ملنے چاہئیں جو ایک قیدی کو مذہبی، جسمانی، سماجی اور اخلاقی ملا کرتے ہیں۔

۸- جس کا مقدمہ زیر سماعت ہے وہ قیدی کس طرح کا ہے متہم ہے یا متہم نہیں ہے، پہلی صورت میں ائمہ کرام وفقہاء کا اس بابت اختلاف ہے کہ آیا اسے حجۃ کاملہ اور بینہ تامہ سے پہلے قید کیا جاسکتا ہے یا نہیں، بعض حنفیہ وشافعیہ وحنابلہ، قاضی شریح وابو یوسف وامام الحرمین کے نزدیک جائز نہیں (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۲۹۳)۔

جمہور فقہاء جواز کے قائل ہیں: ''وذهب جمهور الفقهاء إلى مشروعية حبس التهمة'' (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۲۹۲)۔

مجھے سمجھ میں آتا ہے کہ جمہور فقہاء نے جواز کا قول اس صورت میں کیا ہے جب کہ اس کے اتہام پر قرینہ قویہ موجود ہو، لیکن اگر موجود نہ ہو تو جواز کی کوئی صورت نہیں، اس لئے بالاتفاق ایسے شخص کو قید نہیں کیا جاسکتا: ''فإذا لم يكن من أهل تلك التهمة ولم تكن قرينة صالحة على التامة فلا يجوز حبسه ولا عقوبته اتفاقا'' (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۲۹۳) متہم مجہول الحال کے قید سے متعلق ائمہ کے اختلافات ہیں، کسی نے ایک دن، دو دن، تین دن، تو کسی نے ایک ماہ، لیکن محققین حنابلہ واصحاب ابی حنیفہ نے اسے قاضی اور حاکم کے اوپر محول کیا ہے کہ ایسے متہم کے حالات پر آگاہی کتنے دنوں میں ہوسکتی ہے۔

اب عرض یہ ہے کہ جب کسی شخص کو قرینہ قویہ یا بار بار ارتکاب جرم کے باعث قید کرلیا جائے تو جہاں تک جلد ممکن ہو سماعت کی کارروائی شروع کردینی چاہئے اور قیدی کو مطلع کردینا چاہئے کہ کس دن وہ عدالت کے سامنے پیش ہوگا، لیکن اگر دوران مقدمہ اتنی مدت تک مجرم قید رہا جو ثبوت سزا کے بعد کی مدت ہے تو احقر کی رائے یہ ہے کہ اسے فوراً ہی رہا کردینا چاہئے گو کہ تعزیری سزا میں لوگوں نے دوہری سزا کا بھی قول کیا ہے، مگر بندہ فی زمانہ اسے کچھ اعذار کے باعث مناسب نہیں سمجھتا الا یہ کہ مجرم انتہائی شاطر اور خونخوار ہو۔

۹- اگر ملزم کو قید میں رکھا گیا اور بعد کو عدالت نے اسے بری قرار دے دیا تو کیا وہ زمانہ قید میں ہونے والی ذہنی اذیت اور مالی ہرجانہ طلب کرسکتا ہے؟

ہاں مدعی سے مالی ہرجانہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے، دوران مقدمہ کے اخراجات مدعی سے وصول کئے جاتے ہیں نیز مدعی پر ہتک عزت کا دعویٰ بھی کیا جاسکتا ہے، المدونۃ الکبریٰ (۱۶/ ۲۲)، الجوہرۃ النیرۃ (۲/ ۲۳۵) پر تحریر ہے کہ اگر کسی نے کسی کو ابن الکافرۃ، یا ابن الفاسقۃ، یا ابن الفاجرۃ، یا ابن الخبیثۃ کہا تو اسے تعزیری سزا دی جائے گی، اس پر تعزیری سزا اسی لئے ہے کہ یہ اس کی ہتک عزت کے باعث ہیں، ٹھیک اسی طرح مدعی پر ہتک عزت کا دعویٰ اور مقدمہ کے دوران مالی ہرجانہ کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔

قاسم بن عبدالرحمن کی روایت کے مطابق حضرت علیؓ کے سامنے دو گواہوں نے ایک شخص کے خلاف چوری کی شہادت دی اور آپ نے اس کا

ہاتھ کاٹ دیا، اس کے بعد گواہوں نے اپنی شہادت سے رجوع کرلیا، اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا: ''اگر مجھے یہ معلوم ہوجاتا کہ تم دونوں نے جان بوجھ کر جھوٹی گواہی دی ہے تو میں تمہارے ہاتھ کاٹ دیتا لیکن چونکہ عمداً جھوٹی گواہی دینے کا کوئی ثبوت نہ تھا اس لئے آپ نے حکم دیا کہ وہ ہاتھ کی دیت ادا کریں، امام مالک، امام شافعی، امام احمد کا یہی خیال ہے، فی زمانہ شہادت وگواہی ایک پیشہ بنتا جارہا ہے اور اس بابت جو دیدہ دلیری بڑھتی جارہی ہے اس سے سبھی واقف ہیں، اس لئے بندہ کی رائے یہ ہے کہ ائمہ ثلاثہ ہی کے قول پر عمل احوط ہو۔

۱۰- چونکہ ہر شخص اپنے اوپر عائد کردہ جرم (خواہ وہ یقین کی بنیاد پر ہو یا شک کی بنیاد پر) کا دفاع زبان کی ہم آہنگی نہ ہونے، ناخواندگی یا علاقائی زبان کے نہ جاننے، کامل طور پر افہام وتفہیم کی صلاحیت خلقی طور پر موجود نہ ہونے، ہکلا پن گونگے اور بہرے ہونے، یا جسم پر کوئی ایسا عیب ہونے کی وجہ سے جس کی موجودگی میں تمام لوگوں کے سامنے آنا باعث خفت ہو، کامل طور پر نہیں کرسکتا، اس لئے اسے ماہر اور تجربہ کار وکیلوں کی خدمات لینے کی گنجائش ملنی چاہئے، قرآن عزیز کی اس آیت جس میں حضرت ہارونؑ کو حضرت موسیؑ نے اپنا نائب اور ترجمان بنانے کی درخواست کی تھی: "وأخي هارون هو أفصح مني لسانا فأرسله معي ردأً يصدقني إني أخاف أن يكذبون" کو استدلال میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

مشہور مفسر ابوحیان اندلسی تحریر فرماتے ہیں:

''وإنما المعنى أنه لزيادة فصاحته يبالغ في التبيان وفي الإجابة عن الشبهات وفي جداله عن الكفار''

(تفسیر البحر المحیط ۷/۱۱۸، نیز دیکھئے: قرطبی ۱۳/۱۹۰، روح المعانی ۲۰/۷۷، تفسیر ابی السعود ۱۳۷)۔

حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی تحریر بھی اسی کی موید ہے کہ قیدی کو یہ حق ملنا چاہئے، قاضی کسی شخص کو بحیثیت وکیل یا پیروی کار دار القضاء میں آنے سے اور پیش ہونے سے روک سکتا ہے جس کے بارے میں قاضی محسوس کرے کہ اس شخص کا دار القضاء میں آنا دار القضا کے وقار اور اس کے اعتماد کو مجروح کرسکتا ہے (اسلامی عدالت ۱/۴۱۷)۔

۱۱- شریعت اسلامیہ نے ماں اور اس کے بیٹے کے درمیان تفریق کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے، بندہ اولاً دو روایتیں پیش کر رہا ہے:

''عن أبي أيوب سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول من فرق بين الوالدة وولدها فرق الله بينه وبين أحبته يوم القيامة'' رواه الترمذي وحسنه والحاكم والدارقطني وقال حاكم صحيح الاسناد'' (بحوالہ الترغیب والترھیب للحافظ ابن حجر العسقلانی/۲۲۷). قال النبي صلى الله عليه وسلم لا توله والدة عن ولدها''۔

علامہ ماوردی مالکی لکھتے ہیں: ''ولا يفرق فيمن استرقفن بين والدة وولدها'' (الاحکام السلطانیہ/۱۳۴)۔

علامہ حصکفی رقمطراز ہیں: ''تربية الولد (تثبت للأم) النسبية (ولو) كتابية (أو) بعد الفرقة'' (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ۲/۶۳۳)۔

عبارت بالا سے معلوم ہوا کہ ماں کو ہی حق حضانت حاصل ہے خواہ شوہر اپنی زوجیت سے اسے الگ کردے۔

حضرت عاصم بن عمرؓ کے مقدمہ میں حضرت عمرؓ کی مطلقہ ام عاصم کے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے اور انہیں حضرت عاصم کی پرورش کا زیادہ حقدار بتلاتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا تھا: ماں کا تھوک بچے کے حق میں تمہارے شہد سے زیادہ بہتر ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی تحریر فرماتے ہیں: ''من فرق بين والدة وولدها يأثم''. ''وقال مالك لا يفرق بين الأم وولدها خاصة وقال الشافعي لا يفرق بين صغير وبين أبويه. وری الدارقطني عن طليق بن عمران عن أبي هريرة عن أبي موسى قال لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم من فرق بين الوالدة وولدها الخ'' (تفسیر مظہری ۲۲۶/۲۲۷)۔

قیدیوں کے حقوق سے متعلق مسائل

مولانا نذیر احمد کشمیری

یہ ایک تلخ عالم آشکارہ حقیقت ہے کہ آج کے انسانی معاشرہ میں جو طبقہ انتہائی مظلوم ہے اور جس کے ظلم کو ظلم بھی نہیں سمجھا جاتا ہے وہ طبقہ جیلوں میں محبوس افراد کا ہے۔

اس طبقہ کے وہ افراد جن کا کوئی جرم بھی نہیں ہوتا اور جن کو صرف شک کی بنیاد پر محبوس کر کے ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں اور جن کی آہ وفغاں کو کوئی سننے والا بھی نہیں ان پر ایسے روح فرسا مظالم کئے جاتے ہیں کہ جن کے سامنے قبائلی سماج کے مظالم بھی ہیچ ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مجرم افراد پر جرم ثابت ہونے سے پہلے ہی ظلم کرنے والے ان سے بڑے درجہ کے مجرم بن جاتے ہیں، اس لئے کہ وہ ان محبوس ہونے والے مجرموں کو ان کے جرم کی قانونی سزا سے کہیں زیادہ خوفناک جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

جیلوں میں محبوس افراد کے احوال مدہشہ کو جاننے کے بعد یہ کہنا یقینا بے جا ہے کہ ان قید ہونے والے مجرموں سے کہیں زیادہ بڑے درجہ کے مجرم وہ افراد ہوتے ہیں جن کے پنجۂ استبداد میں یہ مجرم پھنس جائیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محبوس ہونے والے افراد انسان نہیں ہیں، بلکہ جانور ہیں۔

حق یہ ہے کہ پورے عالم میں جانوروں کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کہیں نہیں ہوتا جس کو درندگی اور بہیمیت سے تعبیر کرنا بھی اس کی اصل حیثیت کو یقینا کم کرنا ہے، ان مظالم میں ہر ہر نوع کے مظالم شامل ہیں۔

قید ہونے والے افراد پر مذہبی مظالم بھی ہوتے ہیں، ان کو ان کے دینی فرائض انجام دینے سے نہایت توہین وتحقیر بلکہ تعذیب وتشدد کے ساتھ روکا جاتا ہے، ان کے مقدس صحیفوں کی توہین کی جاتی ہے حتی کہ قرآن کریم کے مقدس صحیفوں کو نالیوں اور نجاستوں کی جگہ پھینکا جاتا ہے، مسلمان قیدی کو اللہ جل شانہ، ذات رسالت صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن کریم، ایمانیات اور دینی شعائر کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔

عین نمازوں کے دوران ان پر نجاستیں پھینکی جاتی ہیں مسلمان کی داڑھی کو توہین وتذلیل کے ساتھ نوچنا، اذان کی آواز سنائی دے تو فورا یہ کہنا یہ تمہارے جھوٹے خدا (نعوذ باللہ) کی آواز ہے اس کی طرف تھوکو، اس کا مذاق اڑاؤ، غرض مذہبی ودینی اعتبار سے تعذیب کے جو جو طریقے ممکن ہو سکتے ہیں ان کو بے دھڑک اپنانا ایک عمومی معمول ہے۔

جسمانی تشدد میں مارنا بھی ضرب شدید کے ساتھ، الٹا لٹکانا، بجلی کے جھٹکے دینا، جسم پر رولر (جو کئی کوئنٹل وزنی ہوتا ہے) چلانا، پانی میں ڈبکیاں دینا، بالوں سے پکڑ کر گھسیٹنا، سخت ترین سردی میں ننگا رکھنا، برف کی سلوں پر لٹانا، حتی کہ بالوں اور عضو تناسل کو رسی سے باندھنا اور پھر اس رسی کو لٹکانا تا کہ وہ شدید ترین اذیت کا شکار ہو جائے، سر مونڈ کر پھر اس پر تیزاب ڈالنا، تیز ترین روشنی کے بلب کے سامنے کھڑا کرنا، ایسے سیپ میں منہ کرنا کہ اگر حرکت بھی کریں تو دائیں بائیں بجلی کے کرنٹ لگ جائے اور ایسے سیل میں کئی کئی دن تک بند رکھنا جن میں بیٹھنا تو کجا حرکت کرنا بھی ممکن نہ ہو۔

ناخن اکھاڑ دینا، پھر ان پر نمک یا مرچیں ڈالنا، زخمی جسم پر نمک پھینکنا، پیچھے کے راستہ سے مرچوں والا پانی بھرنا، کئی کئی ہفتوں تک جاگنے پر مجبور کرنا غرض کہ جسمانی مظالم کے ایسے ایسے نت نئے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں جس کو سوچنا بھی ممکن نہیں ہے اور اسی وجہ سے ان عقوبت خانوں میں کتنے ہی افراد موت کے منہ میں پہنچ جاتے ہیں، بلکہ ان مظالم کے بنا پر کتنے ہی محبوس خودکشی کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں اور کتنے ہی ان میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور کتنے بار بار کی کوششوں کے باوجود بھی اپنی یہ تمنا پوری نہیں کر پاتے اور اس عذاب مسلسل میں مبتلا رہتے ہیں، کتنے ہی ان سخت تر مظالم کی بنا پر از خود بار بار یہ التماس کرتے ہیں

کہ ہم کو مار دو ہم لکھ کر دیں گے کہ ہم خود طبعی موت مر گئے، یا ہم کو خودکشی کرنے کا ہی موقع دو، مگر ایسا نہیں کرنے دیا جاتا۔

قیدیوں پر مظالم کی ایک قسم ذہنی ونفسیاتی ٹارچر ہے، چونکہ یہ بھی ظلم وتشدد کی ایک عجیب قسم ہے اسی لئے یہ بھی آزمایا جاتا ہے چنانچہ قیدیوں کو مادرزاد ننگا کرنا، ایک دوسرے کے عضو تناسل کو منہ میں لینے، چوسنے، چاٹنے پر مجبور کرنا، ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کرنے پر مجبور کرنا اور پھر ان کی فلمیں بنانا، فحش گالیاں دینا، ماں، بہن، بیٹی کے متعلق ناقابل برداشت فحش اور غلیظ باتیں کہنا، حتی کہ ماں، بہن اور بیٹی کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنے کے متعلق تمسخر آمیز انداز میں سخت تکلیف دہ باتیں کہنا، غرض کہ طرح طرح سے نفسیاتی وذہنی طور پر اذیت پہنچائی جاتی ہے اور خصوصاً اگر جسمانی تشدد سے قیدی کے مرجانے کا خطرہ محسوس ہونے لگے تو پھر نفسیاتی تعذیب کا رویہ اپنایا جاتا ہے۔

قیدیوں کو کھانے پینے اور سونے جاگنے کے اعتبار سے بھی طرح طرح تختہ مشق بنانا بھی ایک عام بات ہے۔

مضر صحت اشیاء کھلانا، ریت اور مٹی آمیز آٹے، دال اور چاول کھلانا، سڑی ہوئی سبزیاں اور پتھر کے ساتھ پیسا ہوا نمک کھلانا، گندا پانی پلانا، نامرد بنانے والی دوائیاں کھانے میں شامل کرنا، سڑا ہوا اور خراب پانی پلانا، پیشاب پاخانہ کو روکے رکھنے پر مجبور کرنا، پینے کے لئے پیشاب ملا ہوا پانی دینا، مسالوں میں دھنیا کے ساتھ لید، مرچوں کے ساتھ اینٹ پیس کر ملانا اور پھر اہی سالن میں ملانا، غرض یہ بھی مظالم کی ایک منفرد نوع ہے۔

پھر قیدیوں کو غلط بیان دینے پر مجبور کرنا مثلاً اگر کوئی حقوق اللہ سے وابستہ فرد جیل کا معائنہ کرنے پہنچ جائے یا وکلاء کا کوئی وفد قیدیوں سے ملنے پہنچ جائے اور اس طرح قیدیوں کی حالت زار عوام تک پہنچنے کا خدشہ ہو تو پھر قیدیوں کو ایسے بیانات دینے کے لئے مجبور کرنا جس سے محبوس کرنے والے کسی ظلم کے اتہام سے اپنے آپ کو بچائیں اور اگر وہ بیان دینے پر تیار نہ ہوں تو اس پر مزید ظلم کرنا اور پھر خود بیان لکھ کر اس پر بلا چوں وچرا دستخط کرنے پر مجبور کرنا۔

قیدیوں کو بغیر کسی دفعہ کے لگائے صرف ٹارچر کرتے رہنا اور یا پھر تشدد کر کے ناکردہ جرموں کو قبول کروا کر ان پر وہ دفعات لگوانا جن کا اطلاق ان پر نہ ہو سکتا ہو اور اس طرح ان کو ان جرائم کی سزاؤں کا شکار بنانا جن کا انہوں نے ارتکاب ہی نہ کیا ہو، قیدیوں کو صرف تفتیش کے عنوان سے اتنے عرصہ تک جیلوں میں بند رکھنا کہ اگر ان پر قانونی سزا کا اطلاق بھی ہو جائے تو بھی اتنی طویل سزا ان کے وہ مستحق نہ ہوں۔

علاج ومعالجہ کی سہولت سے پوری طرح محروم رکھنا یا پھر تسلی بخش علاج سے محروم کرنا، قیدیوں کو نامعلوم مقام پر بند رکھنا اور ان کے متعلق کو ان سے بے خبر رکھنا، قیدیوں کو اپنے متعلقین سے رابطہ قائم کرنے سے محروم رکھنا اور اس سے آگے بڑھ کر قید کر کے غائب ہی کر دینا بھی آج کی دنیا میں پایا جاتا ہے۔

غرض کہ جسمانی یا مذہبی، نفسیاتی، اخلاقی اور سماجی مظالم کی تقریباً ہر ہر قسم ہے جو محبوس افراد کو کہیں نہ کہیں جھیلنی پڑتی ہے، اس سلسلہ میں جو اقوام اور ادارے حقوق انسانی کا سب سے زیادہ ڈھونڈرہ پیٹتے ہیں اور جو حقوق انسانی کے تحفظ کا سب سے زیادہ نعرے لگاتے ہیں وہی ان حقوق انسانی کی سنگین پامالیوں کے یقینی طور پر مرتکب ہیں، چنانچہ بوسنیا، عراق، افغانستان اور خود یورپین ممالک میں جو صورت حال ہے وہ عالم آشکارہ ہے، بگرام، ابوغریب، گوانتے ناما اور دوسرے لاتعداد ونامعلوم عقوبت خانوں کا حال اب کوئی ڈھکا چھپا معاملہ نہیں ہے۔

غرض کہ آج کے جیل خانہ بدترین عقوبت خانے ہیں جو قوموں کا اصلاً چہرہ سامنے لاتے ہیں۔

اس بدترین صورت حال کے متعلق اسلام کی تعلیمات کیا ہیں اور ان تعلیمات کی روشنی میں جیلوں سے متعلق احکام اور محبوس ہونے والے افراد کے کیا کیا حقوق ہیں۔ یہ ان سطور میں زیر بحث ہے۔

اسلام دین عدل ہے۔ وہ انسان کی جان، مال، عزت، دین اور عزت نفس کا محافظ ہے۔ وہ صاف حکم دیتا ہے جس قوم یا جس فرد کے ساتھ تمہاری دشمنی ہے اس کے ساتھ بھی حق وانصاف کا معاملہ کرو۔ "ولا یجرمنکم شنآن قوم علی أن لا تعدلوا. اعدلوا" (المائدہ) تم کو کسی قوم سے عداوت اس پر نہ آمادہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو۔ بلکہ انصاف کرو۔ "ولا یجرمنکم شنآن قوم أن صدوکم عن المسجد الحرام أن تعتدوا" (المائدہ) تم کو کسی قوم کی ضد وعداوت اس پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم مسجد حرام سے روکو۔ اور ظلم وزیادتی کرو۔ "ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (المائدہ) اور گناہ وزیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون نہ کرو۔

اسلامی شریعت میں جہاں عدل کا حکم ہے۔ اور مختلف انداز سے اسلوب بدل بدل کر اس پر کاربند رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ وہیں رحم حسن سلوک

اور انسانیت نوازی کے متعلق بھی نہایت قیمتی تعلیمات ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ چنانچہ غزوۂ بدر میں جب سخت ترین دشمنانِ اسلام گرفتار کر کے مدینہ لائے گئے تو ملاحظہ ہو ان کے متعلق کیا ارشاد فرمایا گیا۔ اور پھر مسلمانوں نے اس تعلیم نبوی کی بنا پر ان اسیرانِ جنگ کے ساتھ جو دراصل مستحق قتل تھے کیا سلوک کیا۔ بدر کے قیدی جب لائے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صحابہ کے درمیان تقسیم فرمایا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ''استوصوا بالأساری خیرا'' ان قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور ہر طرح کے خیر کی وصیت قبول کرو (طبرانی، مجمع الزوائد)۔

اس وصیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ صحابہ میں سے جن کے پاس جو قیدی تھا، وہ اول اس قیدی کو کھانا کھلاتے اور بعد میں خود کھاتے تھے۔ اور اگر کھانا نہ بچتا تھا تو خود صرف کھجور کھاتے تھے۔ چنانچہ حضرت مصعب بن عمیر کے بھائی عزیز بن عمر کا بیان ہے کہ وہ جس انصاری کے گھر میں تھے ان کا حال یہ تھا کہ وہ روٹی جو بہت کم ہوتی تھی مجھے کھلا دیا کرتے تھے اور خود کھجوروں پر قناعت کرتے تھے۔ میں شرمندہ ہو کر انکار کرتا کہ روٹی خود کھاؤں لیکن وہ جواب میں کہتے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے (مجمع الزوائد طبرانی)۔

قیدیوں میں سہیل بن عمرو بھی تھا جو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ہجو اور مخالفانہ تقریریں کرتا تھا۔ اور اسی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے درخواست کی کہ اس کے دو نیچے کے دانت توڑ دیئے جائیں تاکہ وہ آئندہ بے تکلف اس طرح تقریر نہ کر سکے۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اگر میں اس کا ایک عضو بھی بگاڑ دوں گا تو اگرچہ میں نبی ہوں لیکن اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ میں میرے اعضاء بگاڑ دے گا (تاریخ طبری)۔

بدر میں جو لوگ گرفتار ہو کر قیدی بنائے گئے وہ جنگی قیدی تھے۔ مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانوں کے دشمن اور شمع اسلام کو بجھا دینے کے درپے تھے۔ مکہ میں ان کے مظالم عالم آشکارہ تھے۔ اس لئے وہ یقیناً سخت ترین سزاؤں اور اذیتوں نہیں بلکہ موت کے مستحق تھے۔ مگر ان کو دورانِ قید کسی طرح کے ظلم و زیادتی کا شکار نہیں بنایا گیا۔ اور پھر اخیر میں طویل مشورہ کے بعد ایک بہت معمولی فدیہ (چار ہزار درہم) مقرر کیا گیا۔ اور جو لوگ فدیہ ادا نہ کر سکیں ان پر مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کی ذمہ داری ڈال دی گئی اور یہی ان کی آزادی کی شرط مقرر رہی۔ اور جو یہ بھی نہ کر پائیں ان کو بلا کسی عوض و سرزنش کے آزاد کر دیا گیا۔ چنانچہ عمرو بن عبداللہ نام کے شخص کو فدیہ ادا کرنے کی قدرت نہ تھی۔ اس لئے بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کیا، مفلوک الحال ہوں عیال بار ہوں۔ اس لئے مجھ پر احسان فرمایئے آپ نے یہ سن کر بلا کوئی فدیہ لئے رہا کر دیا اور صرف یہ فرمایا کہ آئندہ کبھی ہمارے کسی دشمن کا ساتھ دے کر ہمارے مقابلہ کے لئے نہ آنا۔ اسی طرح مطلب بن حنطب اور صیفی ابن ابی زمانہ بھی کوئی فدیہ لئے بغیر رہا کر دیئے گئے (سیرت مصطفی)۔

قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ جب بدر سے کفار قریش کو باندھ کر مدینہ لایا گیا تو اتفاق سے حضرت عباس (جو عم رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے) کی رسی میں زیادہ سخت گانٹھ لگائی گئی تھی جس کے بنا پر حضرت عباس بے اختیار آہیں بھرتے تھے اور کراہتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بے قرار ہو گئے اور اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آرام نہ فرمایا جب تک حضرت عباس کی رسی ڈھیلی نہ کر دی گئی۔ تمام قیدیوں کے لئے کپڑوں کا انتظام کیا گیا۔ چنانچہ حضرت عباس جو طویل القامت تھے ان کو عبداللہ بن ابی کا کرتا پہنایا گیا جو خود طویل القامت تھا (سیرت النبی از شبلی)۔

غرض کہ اساری بدر کے ساتھ کیا جانے والا سلوک قیدیوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے رویہ کے لئے ایک بہترین نمونہ عمل ہے۔ حضرت ثمامہ بن اثال کو پکڑ کر لایا گیا جو یمن سے مکہ جا رہے تھے پھر مدینہ منورہ میں ان کو مسجد نبوی میں ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور حضرات صحابہ نے ان کو نہ کوئی جسمانی اذیت پہنچائی نہ بھوکا پیاسا رکھا نہ ان کو کسی ذہنی یا نفسیاتی ٹارچر کا شکار بنایا صرف اتنا ہوا کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ثمامہ سے پوچھا کہ کیا ارادہ ہے (کیا اسلام قبول کرنے کے متعلق کوئی خیال آرہا ہے یا نہیں) دیکھیے کوئی جبر و اکراہ بھی نہیں ہو رہا ہے مگر اس نے جواب میں صاف انکار کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ اگر آپ میرے قتل کا فرمان جاری کرتے ہیں تو یہ ایک مستحق قتل کا ہی قتل ہوگا اور اگر آپ مجھ پر احسان کریں گے تو میں شکر گزار رہوں گا اور اگر آپ کوئی مالی فدیہ چاہتے ہیں تو وہ بتائیں میں پیش کر دوں گا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہ دیا اور دوسرے تیسرے دن بھی سوال جواب ہوتا رہا۔ اس دوران ان پر کوئی تشدد کوئی تعذیب و تذلیل ہرگز نہیں ہوئی۔ اسے خود اپنے متعلق ہرگز یہ یقین نہ تھا کہ میں زندہ چھوٹ سکوں گا۔ اور اگر رحم کی بھیک مل گئی اور مجھے چھوڑ دیا گیا تو بھی نہ جانے کتنا مالی تاوان دینا ہوگا۔ لیکن قیدیوں کے ساتھ کئے جانے والے احسان و ظلم کی پوری تاریخ کے لئے یہ واقعہ ایک مینارۂ نور ہے کہ تیسرے دن اس کا جواب سن کر حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''أطلقوا ثمامة'' ثمامہ کو چھوڑ دو۔ چنانچہ ثمامہ چھوٹ گئے۔ قریب کے باغ میں جا کر غسل کیا اور واپس حاضر ہو کر نعرۂ شہادت پڑھا اور مسلمان ہو گئے۔ اور پھر بولے اس روئے زمین پر سب سے زیادہ مبغوض چہرہ میری نظر میں آپ

کا تھا مگر اب سب سے محبوب چہرہ آپ کا ہے۔ اس روئے زمین میں میری نظر میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت دین آپ کا تھا مگر آج کے بعد سب سے پسندیدہ دین یہی ہے آج تک روئے زمین پر سب سے مبغوض شہر میری نظر میں آپ کا شہر تھا۔ مگر آج کے بعد میرے لئے احب البلاد (سب سے پیارا شہر) یہی ہے۔

یہ پورا واقعہ سیرت واحادیث کی کتابوں میں موجود ہے اس سے قیدیوں کے ساتھ کئے جانے والے سلوک کے متعلق پورا اصول اور اس کی بنیاد پر تمام جزئیات کا بیان واضح ہے۔ حسب ضرورت کمی زیادتی ہوسکتی ہے۔

اگر مجرم کے متعلق قرائن پائے جارہے ہوں اور وہ پھر بھی اعتراف نہ کرے تو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کی اجازت ہے حتی کہ معمولی مار پیٹ بھی کر سکتے ہیں۔ تا کہ مجرم اپنے جرم کا اعتراف کرے۔ لیکن اس مار پیٹ کی حدیں مقرر ہیں کہ اس کو ضرب شدید نہ ہو اس کے اعضاء کا توڑ پھوڑ نہ ہو اور اس کو معذور بنانے کی حد تک یہ عقوبت نہ ہو اس معمولی مار پیٹ کے دوران اگر مجرم نے اعتراف کرلیا تو کیا وہ اعتراف معتبر ہوگا۔ اس سلسلہ میں فقہاء نے تصریح کی ہے کہ وہ اقرار جو صرف مار پیٹ کی بنا پر کیا گیا ہو وہ معتبر نہ ہوگا۔ اسی لئے اگر وہ مار پیٹ کے بعد بھی اقرار کرتا ہے تو یہ وہ اقرار ہے جو مجرم کو مجرم ثابت کرنے کے لئے درکار ہے۔ لیکن اگر اس نے انکار کیا تو مجرم مجرم ثابت نہ ہوگا۔ مجرم کو اثبات جرم تک گرفتار کئے رکھنا درست ہے لیکن اس کی مدت کیا ہوگی۔ اس سلسلہ میں اکثر فقہاء تو امام (حکومت) کی صوابدید کے مطابق کسی بھی ضرورت کے بقدر مناسب مدت تک قید رکھنے کی اجازت دیتے ہیں جبکہ امام شافعی ایک ماہ تک محبوس رکھنے کا حق دیتے ہیں۔ محبوس ہونے والے افراد پر کس کس قسم کی پابندیاں ہوں گی اس سلسلہ میں فقہاء اسلام نے نہایت معتدل اور مبنی بر عدل احکام بیان کئے ہیں کہ جن میں نہ تو محبوس فرد پر بے جا ظلم ہوگا۔ اور نہ ہی اس کے جرم کے باوجود اسے غیر موثر سزا کی بنا پر اسے عادی مجرم بننے کا موقع دیا جائے گا۔

چنانچہ علامہ کاسانی نے لکھا ہے۔

محبوس شخص کو قید خانہ سے باہر نکلنے کی اجازت نہ ہوگی۔ وہ اپنے امور واشغال کے انجام دہی کے لئے بھی باہر نکلنے کا مجاز نہ ہوگا، اسی لئے اسے جمعہ وجماعت میں شرکت کی بھی اجازت نہ ہوگی، نہ ہی وہ جنازہ میں شرکت کر سکے گا، نہ وہ اپنے متعلقین اور اقارب کے پاس بغرض ملاقات جا سکے گا، اسے تمام ان دنیوی ودینی مشاغل سے روک دیا جائے گا جو قید کرنے کے مقصد کے خلاف ہوں، ہاں اس کے اہل وعیال کو اس سے ملاقات کرنے کا حق ہوگا۔ لیکن قید خانہ میں ہی، ظاہر ہے کہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ اپنی نماز، روزہ اور انفرادی عبادت کے لئے آزاد ہوگا۔

امام سرخسی نے لکھا ہے کہ اسے ایسی جگہ قید کیا جائے جو سخت ہو اسے نرم بستر بھی فراہم نہ کیا جائے، اس کے پاس خوش طبعی کے لئے کسی کو آنے جانے کی بھی اجازت نہ ہوگی، امام سرخسی نے یہ بھی لکھا ہے کہ عورتوں کا قید خانہ مردوں سے الگ رکھا جائے گا۔

صاحب مبسوط نے یہ بھی لکھا ہے کہ جو شخص لوگوں کو خوف زدہ کر کے لوگوں کا مال اچک لینے کا کام کرے اسے حبس دوام کی سزا دی جاسکتی ہے تا آنکہ وہ اس فعل بد سے توبہ کرے، قید کرنے کی اجازت کے سلسلہ میں خود حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ثبوت موجود ہے۔ اگر چہ یہ بات طے ہے کہ عہد رسالت میں کوئی مستقل قید خانہ نہیں تھا، چنانچہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو کہی گئی غلط تہمت کی بنا پر قید کیا (ترمذی)۔

نیز ثمامہ بن اثاثہ کو مسجد نبوی میں اور بدر میں گرفتار شدہ افراد کو صحابہ کے گھروں میں قید کیا گیا۔

حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں بھی یہی طرز عمل جاری رہا، پھر حضرت عمرؓ نے جب باقاعدہ جیل خانہ کی ضرورت محسوس کی تو صفوان بن امیہ کا مکان لے کر اسے قید خانہ بنایا، یہ تاریخ اسلام کا پہلا جیل خانہ تھا، پھر دیگر بلاد میں بھی جیل خانہ بنائے چنانچہ مقروض انسان جو قرض کی ادائیگی میں عمداً غافل ہو کو بھی قید کیا جانے لگا اور یہ سلسلہ قاضی شریح نے شروع کیا (الفاروق از شبلی)۔

حضرت عمر فاروقؓ کے بعد حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ میں جیل خانہ بنوائے، چنانچہ ایک جیل خانہ کا نام نافع رکھا، اور پھر اس سے زیادہ مضبوط جیل خانہ دوسرا بنوایا جس کا نام مخیس رکھا (قاموس الفقہ)۔

اوپر درج شدہ احکام کے بعد اب فقہ اکیڈمی کی طرف سے قائم کئے گئے سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں۔

(۱) کسی ملزم کو جرم ثابت ہوئے بغیر قید رکھنا صریحاً ظلم ہے۔ اس لئے یہ ہرگز درست نہیں ہوسکتا۔ ہاں اگر اس کے مجرم ہونے کے قرائن موجود ہوں اور اس لئے اسے ظن غالب کی بنا پر محبوس کرنا پڑے تا کہ اثبات جرم کی صورت میں اس پر سزا کا نفاذ ہو تو اس صورت میں قید کرنا درست ہے، لیکن اس دوران کوئی،

جسمانی تشدد، سخت مار پیٹ، ذہنی ٹارچر اور جو مظالم رائج ہیں اس پر ان میں سے کوئی ظلم کرنا درست نہیں۔ بس معمولی مار پیٹ، ڈانٹ ڈپٹ، ڈرانا دھمکانا جیسا کہ علامہ کاسانی وغیرہ نے لکھا ہے درست ہے۔ اثبات جرم کے لئے یہ مدت کتنی ہوسکتی ہے اصلاً تو یہ گرفتاری کا حکم جاری کرنے والے حاکم (مفوض الی الامام) کی رائے وصوابدید پر منحصر ہے جیسا کہ اکثر فقہاء کی رائے ہے۔ اور ضرورت کا مقتضی بھی یہی ہے کہ یہ مدت حالات، جرم کی نوعیت اور مجرم کے احوال کی بنا پر مفوض الی القاضی ہو۔ تاہم حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کی رائے ایک ماہ کی مدت کو بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔ جبکہ ترجیح پہلی رائے کو ہی ہے۔

(۲) دوران قید محبوس شخص کے حقوق

(الف)...... اپنے مذہبی امور کو انجام دینے کی مکمل آزادی واختیار دینا لازم ہے۔ نماز، روزہ، تلاوت، طہارت ستر عورت وغیرہ تمام مذہبی احکام میں اسے پوری طرح آزادی دینا لازم ہے۔ البتہ جمعہ، جماعت، عیدین جنازہ میں شرکت کا حق نہ ہوگا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔ "ومن اظلم ممن منع مساجد الله أن يذكر فيها اسمه" جب مساجد میں جانے سے روکنے کو ظلم قرار دیا گیا ہے تو نماز سے روکنا اس سے بڑا ظلم ہے۔ اس لئے اس ظلم کی اجازت کیسے ہوسکتی ہے۔ ارشاد قرآنی ہے۔ "يسئلونك عن الشهر الحرام قتال فيه-قل قتال فيه كبير وصد عن سبيل الله و كفر به والمسجد الحرام وإخراج أهله منه أكبر عند الله والفتنة اكبر من القتل" (البقرہ) اس ارشاد میں واضح ہے کہ اللہ کے راستہ سے روکنا، اللہ کے ساتھ کفر کرنا مسجد حرام سے اہل ایمان کو نکال دینا اللہ کے یہاں شہر حرام میں قتال سے کہیں بڑا جرم ہے۔ اللہ کے راستے سے روکنا اس میں جہاں ایمان قبول کرنے سے رکاوٹ بننا مراد ہے وہاں اللہ کے قائم کردہ فرائض کی ادائیگی سے روکنا بھی مراد ہے۔ جیسا متعدد مفسرین نے اس کی صراحت کی ہے۔ حدیث مشہور ہے۔ ''لا طاعة لمخلوق في معصية الخلق'' (بخاری) یہ واضح ہے جو اس امر کی دلیل ہے۔

(ب)...... قیدی کو کام جسمانی ضروریات کھانا، پینا، بستر، علاج مناسب جگہ فراہم کرنا۔ اپنے اہل خانہ سے ملنے کے مواقع فراہم کرنا حتی کہ اپنی زوجہ سے تخلیہ فراہم کرنا بھی قیدی کا حق ہے۔ چنانچہ بدر کے قیدیوں کے لئے حسن سلوک کی جو تاکید زبان رسالت سے صادر ہوئی وہ ان تمام امور کو شامل ہے۔

(ج)...... عام سماجی حقوق اخبار، ریڈیو، فون، کتابیں، ورزش، تعلیم، ہنر سیکھنا ان تمام امور کی مشروط اجازت دے سکتے ہیں۔ یہ چونکہ بنیادی ضروریات حیات میں سے نہیں ہیں۔ اس لئے اگر اثبات جرم میں اور نفاذ سزا میں یہ امور مانع بنیں تو پھر ان کی اجازت نہ دینے کی روش بطور قانون کے اپنانے میں کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔ لیکن اگر یہ کسی الجھن کا ذریعہ نہ بنیں تو پھر ان تمام سماجی حقوق کا بھی قیدی کو حق دینا لازم ہے۔

(د)...... عام اخلاقی امور خصوصاً مردوں اور عورتوں کو الگ الگ رکھنا اسی طرح بالغوں اور نابالغوں کے لئے الگ قید خانہ مقرر کرنا انتہائی لازم امر ہے۔

احادیث میں اجنبی مرد وعورت کے تخلیہ کی صریح ممانعت موجود ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "إياكم والدخول على النساء" (ترمذی) اور فرمایا: ''نهانا رسول الله صلى الله عليه وسلم أن ندخل على النساء بغير أزواجهن'' (ترمذی) اگر یہ تخلیہ فراہم نہ کیا گیا تو یقیناً یہ مرد اور عورت دونوں قسم کے قیدیوں کے لئے سخت ذہنی پریشانی کا سبب ہوگا، یہ دونوں اپنے اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے اور ضروریات بشریہ کے پورا کرنے میں سخت انقباض وتکدر محسوس کریں گے۔ اور بلاشبہ یہ ذہنی ٹارچر کے قبیل سے ہے۔ اس لئے یہ جداگانہ انتظام لازم ہوگا۔ یہ اس وقت فرض کے درجہ میں ہوگا۔ جب یہ اختلاط، جنسی زیادتی یا ناجائز تعلقات کے قائم ہونے کا خدشہ ہو۔ ظاہر ہے اگر یہ انتظام نہ کیا گیا تو پھر جیل خانے قحبہ خانے بن جائیں گے۔ اس کے علاوہ ماحول کو فحش کلامی، گالی گلوج، شور شرابہ سے بے وقت جاگنے اور دوسروں کے آرام میں خلل انداز ہونے کا سبب بنے گا۔

(۳) محفوظ رکھنا لازم ہوگا۔

قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے سخت تعذیب، برہنہ کرنا، تشدد کرنا، الکٹرک شارٹ لگانا، ان پر کتے چھوڑنا، برف کی سلوں پر تڑپانا۔ اور اس طرح کے تمام حربے شریعت، اخلاق، عقل، انسانیت اور عام معاشرتی انداز کے سراسر خلاف تو ہیں ہی۔ مہذب قوانین میں بھی اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس طرح کے ظلم وتعدی سے مجرم جس جرم کا اعتراف کرے گا۔ وہ حقیقتاً اعتراف نہ ہوگا اسلامی قانون کا یہ معروف اصول ہے کہ: ''الحدود تندر أبالشبهات'' نیز کسی مجرم مثلاً زانی نے اگر بغیر کسی جبر واکراہ کے اقبال جرم کیا ہو اور پھر وہ اپنے اعتراف جرم کی خود ہی تکذیب کرے تو اس کا وہ اعتراف غیر معتبر ہوجاتا ہے۔ اس لئے طرح طرح کے جسمانی تشدد، یا ذہنی ونفسیاتی ٹارچر کرنے کا نہ تو حق ہی ہونا چاہئے اور نہ ہی اس طرح کے تشدد کا شکار بنا کر کیا جانے والا اعتراف اس کو مجرم ثابت کرنے

کی بنیاد بنانا درست ہے۔ چنانچہ علامہ سرخسی کے حوالہ سے اصل درج کیا گیا۔

(۴) قیدیوں کو زنجیروں سے باندھ کر رکھنا، ہتھکڑی پہنانا، اگر ان کی جسمانی اذیت کا سبب بن رہا ہو تو اس کی رعایت کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ بدر کے قیدیوں میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی سخت بندھی ہوئی رسیوں کو ڈھیلا کرانا، احادیث وسیرت کی کتابوں سے ثابت ہے۔ نیز ثمامہ بن اثال کا مسجد نبوی کے ستون سے باندھا جانا بھی ایک ثابت شدہ واقعہ ہے۔ ان دونوں واقعات سے یہ دونوں احوال واضح طور پر سامنے آتے ہیں کہ باندھا جانا درست نہیں جو اذیت کا سبب بنے۔

(۵) کسی مجرم کو اس کے خصوصی جرم کی بناپر قید تنہائی دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس لئے کہ اگر جیل کے نظام کو درست رکھنے اور قوانین حبس کو پوری طرح نافذ کرنے کے لئے اس کی ضرورت ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جیسا کہ اوپر درج کیا گیا۔

(۶) جیل میں قیدیوں سے جبراً کوئی کام لینا یقینی طور پر جبر وتعدی ہے۔ اور قرآن کریم کا صاف صریح حکم ہے۔ "ولا تعتدوا إن الله لا يحب المعتدين" اگر قیدی سے جبراً کام لیا گیا تو یقینی طور پر وہ اس کے لئے اجرت مثل کا مستحق ہے۔ اور یہ کام کرنا بھی اس کی رضامندی پر موقوف ہے۔

(۷) زیر سماعت قیدی، اور سزائے قید کا مستحق قرار پانے والے مجرم دونوں مذہبی، اخلاقی، سماجی، اور عام حقوق میں یقینی طور پر مساوی قسم کے سلوک کے مستحق ہیں۔ بس فرق اگر ہوگا تو صرف یہ کہ سزایافتہ شخص کے لئے جن قیود وشرائط کے ساتھ مثلاً تنہائی یا سزا وسہولیات کے اعتبار سے جو درجہ بندی کی گئی ہو جو کسی ظلم وتعدی کا سبب نہ بنے تو ان امور میں فرق وامتیاز قائم کرنے میں کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔

(۸) زیر سماعت قیدی کو ہرگز اتنے عرصہ تک فیصلے سے پہلے قید میں رکھنا درست نہ ہوگا جو اس پر عائد الزام کے ثابت ہونے پر پوری سزا کے بقدر ہو۔ اس کی ایک بدیہی وجہ یہ ہے کہ اگر اس پر جرم ثابت نہ ہوگا تو اتنے عرصہ تک اس کو قید رکھنا بجائے خود ظلم ہے۔ اور دوسرے قید دراصل سزا ہے۔ اور سزا اثبات جرم پر موقوف ہے جب ابھی اثباتِ جرم ہوا ہی نہیں تو اس قدر طویلِ حبس، یقیناً حبس بے جا ہے۔

یہ دراصل عدالتی نظام کے ان طویل طول پیچیدہ بکھیڑوں کا نتیجہ ہے۔ جس میں قیدی کو جرم کی سزا سے زیادہ عرصہ جیل میں گزارنا پڑتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ جرائم کے اثبات کے لئے مدت مقرر کرنے میں درجہ بندی کی جائے۔ اور ہر جرم کے لئے ایک مقررہ مدت میں اس کے اثبات کی حد مقرر کردی جائے۔ تاکہ قیدی عدالت کی طویل کارروائی کے نتیجے میں ظلم کا شکار ہونے سے بچ جائے۔

(۹) ملزم کو قید میں رکھ کر، بعد میں اگر وہ عدالت کی طرف سے جرم ثابت نہ ہونے کی بناپر بری ہو گیا۔ تو حنیفہ کے مختار مسلک کے مطابق اگر چہ مالی جرمانہ لینا درست نہیں لیکن دیگر ائمہ کے یہاں مالی تاوان لینے کی گنجائش ہے۔ اس لئے اس کے لئے اس ذہنی کوفت، جسمانی تکلیف اور عرصہ تک جیل میں رہنے کی بناپر اس کی صحت، معاش اور اہل خانہ سے دوری کی بناپر ہونے والے حرج در حرج کے لئے ضرور مالی جرمانہ کا مستحق قرار دینا لازم ہے۔

اس سلسلہ میں اگر چہ حنیفہ کے قول مختار کے مطابق مالی جرمانہ لینا درست نہیں ہے۔ لیکن قاضی ابو یوسف اور مالکیہ وحنابلہ کے قول کے مطابق اس رفع ظلم کے لئے اس عرصہ کا تاوان ضرور لازم ہونا چاہئے۔ اس کے لئے تفصیلی دلائل علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے فتاوی میں موجود ہیں نیز ابن قیم کی رائے بھی یہی ہے۔

(۱۰) قیدی کو اپنے مقدمات کے سلسلہ میں وکلاء سے ربط گواہوں سے تعاون، اور اپنی صفائی کے لئے ہر قسم کی مدد لینے کا مکمل اختیار ہونا چاہئے۔ تاکہ انصاف کے تقاضہ پورے ہو سکیں۔ اور وہ رفع الزام کر سکے۔

(۱۱) خواتین قیدیوں کو اگر وہ مطالبہ کریں تو اپنے شیر خوار بچے اپنے ساتھ رکھنے کا پورا حق ہوگا۔

اور یہ اس لئے کہ حق رضاعت وحق حضانت دونوں بچے کا حق بھی ہے اور ماں کا حق بھی۔ لیکن اس کے لئے مطالبہ کرنا شرط ہونا چاہئے

☆☆☆۔

قیدیوں کے حقوق

مفتی سید باقر ارشد قاسمی[1]

۱- بغیر ثبوت ملزم کو قید کرنے کا جواز وعدم جواز

اس سوال میں دو جزء ہیں: ایک یہ کہ کسی ملزم کو اس کے جرم کا ثبوت فراہم ہوئے بغیر قید کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اور دوسرا یہ کہ اگر قید کیا جائے تو کیا اس کے لئے کوئی مدت مقرر کی جاسکتی ہے؟

پہلے جزء کی تفصیل یہ ہے کہ بغیر ثبوت کے کسی کو قید کیا جانا جائز نہیں، البتہ ثبوت کی فراہمی تک اس کو نگرانی میں رکھا جاسکتا ہے تاکہ وہ فرار نہ ہو سکے، ثبوت کی فراہمی سے قبل سزا دینا جیسا کہ پولیس ریمانڈ میں دینے (تاکہ پولیس کے لئے موقع ہو کہ وہ جبراً اقبال جرم کرائے یا ثبوت فراہم کرے) یا پھر جیل میں قید کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، اس کے لئے حکام کو چاہئے کہ وہ الگ سے تفتیش خانہ بنائے جہاں پر جبر وتشدد، دہشت اور وحشت کا ماحول نہ ہو اور وہ جیل خانوں اور قید خانوں کی طرح بھی نہ ہوں، بلکہ اس جگہ پر ملزم سے پوچھ تاچھ کی جاسکے اور اس کو روک رکھا جائے تاکہ فرار نہ ہوسکے اور دوران تفتیش جرم کے سلسلہ میں اگر وہ مجرم ہے تو اقبال کروانے کے لئے معمولی طور پر سختی کی جاسکتی ہے۔

دوسرے جزء کے سلسلہ میں احقر کی رائے ہے کہ جلد از جلد ثبوت حاصل کر کے ملزم کا فیصلہ کر دیا جائے، مہینوں مہینوں تک جیل خانوں میں بند رکھنا اور سالہا سال تک مقدمہ چلانا یا جرم کی تحقیق کے لئے سالوں لگا دینا جائز نہیں، کوئی خاص مدت کی تخصیص نہیں کی جاسکتی، ثبوت فراہم ہونے تک اس کو روک رکھا جائے، البتہ اس دوران اس کو سزا یا بنیادی ضرورتوں سے محروم کر دینا یا ٹارچر کرنا جائز نہیں۔

۲- (الف) مذہبی امور سے متعلق قیدیوں کے مسائل

مذہبی امور کے تحت قیدیوں کے مسائل مقاصد شریعت کے من جملہ اصول میں سے ایک اصل ''حفاظت دین'' کے تحت آتے ہیں، لہذا یہ قیدیوں کے بنیادی حقوق میں شامل ہیں۔

عبادت کی آزادی اور مذہبی کتابوں کے مطالعہ کی اجازت

مقاصد شریعت میں حفاظت دین بھی ایک اصل ہے اور اس مقصد کے ضیاع کو کسی بھی حالت میں گوارا نہیں کیا جاسکتا، شرعی اعتبار سے دین کی آزادی انسان کا بنیادی حق ہے چاہے وہ قیدی ہی کیوں نہ ہو، دین کے معاملہ میں کسی پر زبردستی نہیں کی جاسکتی، قرآن میں ارشاد ہے: لا إكراه في الدين" (سورۃ البقرۃ) اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں کئی ایسے واقعات ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مذہبی رواداری پر دال ہیں، مذہب انسان کا نجی معاملہ ہے اس میں کسی کو دخل دینے کا نہ ہی اخلاقی حق ہے اور نہ ہی قانونی حق حاصل ہے، چنانچہ خطبات بنگلور میں حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب دامت برکاتہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مذہبی رواداری کا ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ یمن کا ایک بڑا عیسائی عالم اسقف ابی الحارث ساٹھ عیسائیوں کے وفد کے ساتھ خدمت اقدس میں حاضر ہوا، انہوں نے اپنے عقیدہ کے مطابق نماز ادا کرنی چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کے گوشہ میں انہیں عبادت کی اجازت مرحمت فرمائی اور انہوں نے اپنے مذہب کے مطابق نماز ادا کی (خطبات بنگلور/ ۸۳)۔

لہذا عبادت کے معاملہ میں قیدیوں پر کسی بھی قسم کی پابندی نہ صرف غیر شرعی ہے بلکہ غیر انسانی ہے، انسانی حقوق کی پامالی ہے، عبادت کی کھلی آزادی دوران قید قیدی کا حق ہے، اسی طرح مذہبی کتابوں کا مطالعہ بھی اس کا بنیادی حق ہے۔

---

[1] بنگلور، کرناٹک۔

دوسرے قیدیوں کے درمیان دعوت دین

یہ بھی حفاظت دین کے تحت آتا ہے کہ دعوت دین ایک فریضہ ہے اور حفاظت دین کی ایک کڑی۔

مذہبی تعلیمات کے مطابق غذا کی فراہمی

ویسے تو غذا کی فراہمی بنیادی حق ہے، مگر قیدی کی طبع، اس کی پسند یا ناپسند، مذہبی اصول وحدود کا خیال رکھنا اخلاقی طور پر ضروری ہے، قیدی کے ساتھ اس کی عزت نفس کو مجروح کیا جانا ظلم ہے اور مذہبی حدود واصول کو توڑنا اس کی عزت نفس پر حملہ ہے، لہذا یہ ضروری ہے کہ قیدی کی مذہبی تعلیمات کے مطابق غذا فراہم کی جائے۔

قیدی کے مذہب کی مقدس شخصیتوں اور کتابوں وغیرہ کی بے حرمتی

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم دی کہ کسی دوسرے کے مذہب کی اور مذہبی شخصیتوں کی توہین نہ کی جائے، کیوں کہ دوسرے مذاہب کا احترام کرنے کا حکم ہمیں شریعت میں ملتا ہے، قیدی کے مذہبی مقدس شخصیتوں اور کتابوں کی بے حرمتی جائز نہیں۔

ب- جسمانی ضروریات سے متعلق قیدیوں کے مسائل

جسمانی ضروریات کے تحت قیدیوں کے مسائل مقاصد شریعت کے من جملہ اصول میں سے ایک اصل ''حفاظت نفس'' کے تحت آتے ہیں، لہذا یہ قیدیوں کے بنیادی حقوق میں شامل ہیں۔

قیدیوں کے لئے ورزش وتفریح کی اجازت

کسی بھی انسان کا بنیادی حق مناسب غذا، صاف پانی، علاج اور حفظان صحت کی تدابیر ہیں، قیدی جو حکام کے رحم وکرم پر ہوتا ہے، اس کا بھی بنیادی حق یہ ہے کہ اس کو یہ اشیاء یا مواقع فراہم کئے جائیں، قیدی کو مناسب غذا بلکہ اگر کسی بیماری کا شکار ہے تو اس کو پرہیزی کھانا اور صاف پانی فراہم کیا جائے، جیسا کہ بدر کے قیدیوں کے سلسلہ میں روایتوں میں آتا ہے، ابوعزیز کی روایت ہے کہ جب وہ مجھے بدر سے قیدی بنا کر لائے تو مجھے انصار کے ایک خاندان میں جگہ ملی (بطور قید)، وہ دونوں وقت مجھے اپنے کھانوں میں سے روٹی دیتے اور خود کھجور پر اکتفاء کرتے (سیرت ابن کثیر ۲/۲۷۵)، قیدیوں کے ساتھ بہتر سلوک کا حکم ہے ہی، ساتھ ہی ان کے لئے اچھی غذا، صاف پانی، ہوادار کمرہ یہ سب مہیا کرنا جیل حکام کا فریضہ ہے۔

علاج:...... یہ انسان کی ضرورت بھی ہے اور انسانی ہمدردی کی علامت بھی، آج جگہ جگہ پر مختلف ادارے اور تنظیمیں بلاتفریق مذہب وقوم معذوروں اور بیماروں کی بلا معاوضہ خدمت کر رہے ہیں اور مفت علاج کی خدمات پیش کر رہے ہیں۔

ایسے ماحول میں قیدیوں کے لئے علاج کی سہولت از حد ضروری ہے، اس کے لئے قید خانہ ہی میں کسی ڈاکٹر یا کلینک کا انتظام ہو تا کہ کسی ہنگامی صورت میں علاج کیا جاسکے، اگر جیل خانہ کے ڈاکٹر سے قیدی کا علاج ممکن نہ ہو تو یہ لازم ہے کہ قیدی کو باہر لے جا کر اس کا علاج کیا جائے۔

قیدی کا یہ بھی بنیادی حق ہے کہ اس کا میڈیکل چیک اپ وقتاً فوقتاً کرایا جائے تا کہ اس کی صحت برقرار رہے، اس کے ساتھ ساتھ حفظان صحت کے لئے ورزش اور تفریح کا بھی انتظام ہو۔

بیوی سے تعلق کی اجازت

ایک بالغ انسان کی بنیادی ضرورت کسی غم خوار کی تسلی یا مورل سپورٹ (moral support) ہے۔ نفسیاتی طور پر قیدی اپنے آپ کو تنہا اور بے بس سمجھنے لگتا ہے اور اس سے اس میں نفسیاتی بیماری پیدا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے، نیز نیک سلوک، ہمدردی، محبت ومودت سے ایک ظالم شخص بھی صحیح راستے پر آسکتا ہے۔ اس لئے قیدی کا بنیادی حق یہ بھی ہے کہ اس کو اس کے رشتہ داروں سے ملنے دیا جائے خصوصاً بیوی سے ملاقات کی اجازت دی جائے تا کہ نفسیاتی وذہنی طور پر اپنے آپ کو اکیلا نہ سمجھے، کیوں کہ قید خانہ صرف عقوبت خانہ ہی نہیں بلکہ اصلاح خانے بھی ہیں، قیدیوں کو سزا ان کی

اصلاح کے لئے دی جاتی ہے نہ کہ انتقاما ان سے بدلہ لیا جاتا ہے، لہذا قید خانوں میں دین وایمان کی حفاظت، اخلاق وکردار کی تعمیر کا نظم بھی ہونا چاہئے اور ہر اس سبب سے گریز کرنا چاہئے جس سے کہ قیدیوں کے اخلاق وکردار تباہ ہوں یا ان کے دین وایمان میں کمی واقع ہو۔

اس لئے احقر کی رائے یہ ہے کہ اگر جیل میں میاں بیوی کے لئے تخلیہ کے لئے سہولت مہیا کی جاسکتی ہو تو اس بات کی قیدی کو اجازت دینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ کم از کم مہینے میں ایک دوبار بیوی سے ملاقات کرسکے، اس سے یہ ہوگا کہ قیدی کسی غلط راستہ پر نہ جائے گا جیسا کہ جیل خانوں میں یہ عام ہے کہ قیدی بری عادتوں کا شکار ہوجاتے ہیں، اس سے بچانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ قیدی کو بیوی سے تعلق کی اجازت دی جائے۔

تنگ وتاریک کوٹھری میں قید کرنے کا حکم

جیسا کہ اوپر ابھی احقر نے عرض کیا کہ قیدی کو قید اس لئے کیا جاتا ہے کہ وہاں اس کی تربیت ہو، اخلاقی وتہذیبی اعتبار سے اس کو سنوارا جائے اور جس جرم میں یا برائی میں وہ ملوث ہے اس کے بارے میں اس میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ وہ جرم ہے گناہ ہے، قید کا مطلب انتقام نہیں ہے۔

لہذا قیدی کو کسی ایسی کوٹھری میں رکھنا جہاں وہ ٹھیک سے بیٹھ بھی نہ سکتا ہو یا باہر کی دنیا سے بالکل کٹ کر رہ گیا ہو غلط ہے، ایسا کرنا اخلاقی طور پر جائز نہیں، جیل کے حکام کو چاہئے کہ قیدی کو پاک، قدرتی روشنی وہوادار، دیگر سہولیات سے پر کمرہ میں قیدی کو رکھیں تا کہ اس کی جسمانی وذہنی صحت بحال رہے، پاکی وصفائی کے لئے الگ سے مقام ہوتا کہ وہ وہاں اپنی حوائج ضروریہ سے فارغ ہو اور غسل وغیرہ کرسکے۔

ج-قیدیوں کے عام سماجی حقوق

قیدیوں کو اخبارات پڑھنے، ریڈیو سننے کی اجازت

قیدی کو اخبارات پڑھنے کی اجازت دی جائے، یا کم از کم اس بات کا انتظام ہو کہ وہ عام عالمی وملکی حالات اور خود اس شہر کے حالات سے واقفیت رکھے چونکہ وہ بھی سماج کا ایک حصہ ہے، لہذا اس کا حق ہے کہ وہ عام حالات سے واقف رہے۔

قیدیوں کو فون پر احباب واقارب سے گفتگو کرنے کی سہولت

جیسا کہ اوپر احقر نے لکھا کہ ایک بالغ انسان کی بنیادی ضرورت کسی غم خوار کی تسلی یا مورل سپورٹ (moral support) ہے، نفسیاتی طور پر قیدی اپنے آپ کو تنہا اور بے بس سمجھنے لگتا ہے، لہذا فون پر وقتاً فوقتاً احباب واقارب سے گفتگو کی اجازت اس کو نفسیاتی طور پر خوش حال کرے گی اور وہ اپنے آپ کی اصلاح کی جانب توجہ دے سکے گا، نیز احباب واقارب بھی گفتگو میں اس کو نیک تلقین کرسکیں گے، احباب واقارب کو ملنے سے روکنے سے قیدی کی جسمانی وذہنی صحت پر برا اثر پڑسکتا ہے، لہذا احباب واقارب سے ملاقات اور بات چیت کی اجازت ہونی چاہئے۔

قیدیوں کو آپس میں ایک دوسرے سے ملاقات کی اجازت

انسان کے سماجی حقوق میں سے ایک حق اپنے جیسے لوگوں سے ملاقات بھی ہے، قیدیوں کے لئے اس بات کی اجازت ہونی چاہئے کہ وہ دوسرے قیدیوں سے ملاقات کرسکیں۔

قیدیوں کو تعلیم وہنر سکھانے کا حکم

یہ بیحد ضروری ہے کہ قید کے ایام میں ان پڑھ قیدیوں کے لئے تعلیم کا اور بے ہنر قیدیوں کے لئے کوئی ہنر سیکھنے کا انتظام ہو، اس سے ان کی بہتر اصلاح ہوسکتی ہے اور مابعد قید وہ بہتر طور پر ایک شہری بن کر زندگی گزار سکیں گے۔

د-مرد وعورت اور بالغ ونابالغ کو الگ الگ قید خانوں میں رکھنا

قید خانوں میں مردوں اور عورتوں کو الگ الگ رکھا جائے، یہ ضروری بھی ہے اور اخلاقی اعتبار سے اہم بھی، مردوں اور عورتوں کے اختلاط سے

کئی طرح کے دوسرے جرائم خود قید خانوں میں پنپنے لگتے ہیں، اس لئے مکمل طور پر مردوں اور عورتوں کو الگ الگ رکھا جائے۔

اسی طرح بالغوں و نابالغوں کو بھی الگ الگ قید خانوں میں رکھا جائے کیوں کہ اس سے بھی کئی مفاسد کے کھلنے کا امکان ہوتا ہے۔

۳- قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے دھمکانے کی حد کیا ہے

قیدی سے سچی بات اگلوانے کے لئے اس کو ڈرایا دھمکایا جاسکتا ہے، اس کے لئے حد یہی ہے کہ ایسے مقامات پر مار لگائی جاسکتی ہے کہ جس سے کسی عضو کے تلف ہونے کا اندیشہ نہ ہو یا جان جانے یا ہمیشہ کے لئے معذور ہوجانے کا خوف نہ ہو اور اتنی مقدار میں مار لگائی جاسکتی ہے جتنی کہ وہ سہہ سکتا ہے، بہتر تو یہ ہے کہ اس کو سمجھا بجھا کر، ہمدردی و محبت سے سچی بات کہلوانے کی کوشش کی جائے، اگر مار پیٹ کے دوران قیدی ہمیشہ کے لئے معذور ہوجائے تو جیلر پر اس کا حرجانہ واجب ہوگا۔

سچی بات اگلوانے کے لئے قیدیوں کو بے لباس کرنا

کسی کو بے لباس کردینا سزا کے طور پر ہی سہی یا سچائی جاننے کے لئے ہی سہی جائز نہیں ہے، یہ اہانت کے زمرے میں آتا ہے، کسی کی اہانت کی شریعت اجازت نہیں دیتی اور اس سے انسان کے اندر شرمندگی سے بغاوت کے جذبات ابھرتے ہیں، اس کے علاوہ کسی کو بے ستر کرنا یا بے ستر دیکھنا حرام ہے۔

سچی بات اگلوانے کے لئے قیدیوں کو مار پیٹ کرنا

سچی بات اگلوانے کے لئے معمولی طور پر مار لگائی جاسکتی ہے، اس کے لئے حد یہی ہے کہ ایسے مقامات پر مار لگائی جاسکتی ہے کہ جس سے کسی عضو کے تلف ہونے کا اندیشہ نہ ہو یا جان جانے یا ہمیشہ کے لئے معذور ہوجانے کا خوف نہ ہو اور اتنی مقدار میں مار لگائی جاسکتی ہے جتنی کہ وہ سہہ سکتا ہے، اگر مار پیٹ کے دوران قیدی ہمیشہ کے لئے معذور ہوجائے تو جیلر پر اس کا حرجانہ واجب ہوگا۔

سچی بات اگلوانے کے لئے قیدیوں کو الیکٹرک شاک لگانا

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ کسی کو جلا کر مارا جائے، کیوں کہ جلانے کا حق صرف اللہ کی ذات کو ہے، لہذا سچی بات اگلوانے کے مقصد سے قیدیوں کو الیکٹرک شاک نہیں لگایا جاسکتا، الیکٹرک شاک بھی جلانے کے زمرہ میں آتا ہے، اس طرح کی سزا دینا کسی بھی طرح جائز نہیں، اگر جیل کے حکام نے ایسی سزا دی اور اس سے قیدی کو ہمیشہ کے لئے جسمانی نقصان ہوگیا تو اس کا ہرجانہ جیلر کو ادا کرنا ہوگا۔

سچی بات اگلوانے کے لئے قیدیوں پر کتے چھوڑنا

یہ بھی جائز نہیں کہ قیدیوں سے سچائی جاننے کے لئے کتے چھوڑے جائیں، یہ غیر انسانی حرکت ہے، انسانی معاشرہ و سماج اس طرح کی انسانی اہانت کی اجازت نہیں دیتا، ایسی سزا دینا ناجائز ہے۔

قیدیوں کو سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈال دینا

انسانی جان کی حفاظت ضروری ہے اور مقاصد شریعت میں سے ایک مقصد جان کی حفاظت ہے اس سلسلہ میں کوئی بھی ایسا فعل یا طریقہ جس سے انسانی جان جاسکتی ہے جائز نہیں ہے، چونکہ قیدی قید کی سزا پا رہا ہے، اس لئے اس کی جان کی حفاظت جیل کے حکام کے فرائض میں داخل ہے، اسلام جانوروں پر بھی نرمی و رحم دلی کا درس دیتا ہے، ایسی حالت میں کسی قیدی سے سچائی کو اگلوانے کے لئے سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈال دینا اس کی جان کی ہلاکت کی کوشش ہے اور بے رحمی کی انتہاء ہے، لہذا ایسا کرنا اسلام میں سخت حرام ہے، اگر ایسی سزا دیتے ہوئے کوئی قیدی مرجائے تو جیل کے حکام پر قصاص یا دیت واجب ہوگی۔

قیدیوں کو مسلسل جاگنے پر مجبور کرنا

قیدیوں کو مسلسل جاگنے پر مجبور کرنا یا اس کے لئے رہائش میں تیز روشنی یا تیز آواز کا انتظام رکھنا بھی سخت حرام ہے، انسانی حقوق میں انسان کے

آرام وسہولت کی فراہمی بھی داخل ہے، قیدیوں کو مسلسل جگے رہنے پر مجبور کرنا بھی غیر انسانی حرکت ہے جس کی کسی بھی طرح شریعت اجازت نہیں دیتی، نیز اس طرح کی سزا سے قیدی کی ذہنی حالت بگڑنے کا اندیشہ رہتا ہے یا اسے نفسیاتی مرض لاحق ہوسکتا ہے اور ایسی صورت حال کو پیدا ہونے دینا جیل حکام کے لئے جائز نہیں، کیوں کہ قیدی کی برقراری صحت کی ذمہ داری جیل کے حکام کے ذمہ ہوتی ہے۔

قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑے رکھنا یا ہتھکڑی یا بیڑی ڈالنا

قیدیوں کو اگر کہیں باہر لے جادیا جارہا ہو تو ایسی صورت میں اس کو ہتھکڑی یا بیڑی ڈالی جاسکتی ہے، لیکن اگر وہ قیدی اپنے قید کئے ہوئے کمرے میں موجود ہے تو ایسی صورت میں اسے جسمانی آزادی ہونی چاہئے، کمرے میں یا جائے قید میں اس کو ہتھکڑیوں یا بیڑیوں میں جکڑے رکھنے کی اجازت نہیں ہوگی، لیکن اگر مجرم خطرناک ہے کہ زنجیروں میں یا بیڑیوں میں نہ رکھیں تو بھاگ جانے کا خدشہ ہو یا قید کی جگہ کھلے مقام پر ہو جہاں سے فرار کا راستہ مل سکتا ہے تو ایسی صورت میں اسے پابہ زنجیر کیا جاسکتا ہے، چنانچہ صحیح البخاری کی ایک حدیث ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''عجب اللہ من قوم یدخلون الجنة فی السلاسل'' (بخاری، حدیث: ۲۹۴۳)۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قیدی کو زنجیریں پہنائی جاسکتی ہیں، اسلام میں اس کی اجازت موجود ہے۔

نیز امام مسلم نے ایک باب قائم کیا ہے: باب ربط الاسیر وحبسه وجواز المن علیه (کتاب الجهاد والسیر) اس باب کے ذیل میں حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت ذکر کی ہے، فرماتے ہیں:

''بعث رسول اللہ ﷺ خیلاً قبل نجد، فجائت برجل من بنی حنیفة یقال له ثمامة بن أثال سید أهل الیمامة فربطوه بساریة من سواری المسجد... الخ'' (صحیح مسلم، حدیث: ۴۵۴۳)۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قیدیوں کو جکڑا جاسکتا ہے۔

قیدیوں کو خصوصی جرم پر قید تنہائی

قیدی کو جرم کے مطابق سزا دینے کی اجازت شرعاً موجود ہے، لیکن اس سزا کے دوران اس کے بنیادی حقوق متاثر ہوں یہ شریعت کو گوارا نہیں، قیدی کی صحت کا خصوصی طور پر خیال رکھنے کی ہدایت ملتی ہے، لہٰذا احقر کے خیال میں قید تنہائی کی اجازت نہ ہونی چاہئے: کیوں کہ اس سے قیدی کی صحت متاثر ہوتی ہے اور یہ شریعت کو گوارہ نہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں سے نرمی کا معاملہ کرنے کا حکم دیا ہے؛ چنانچہ ابوعزیز سے روایت ہے، کہتے ہیں:

''کنت فی الأساری یوم بدر فسمعت رسول اللہ ﷺ یقول: استوصوا بالأساری خیراً...'' (الاصابہ تمیز الصحابہ، تحت ترجمہ ابو عزیز بن عمیر... ایضاً فی البیان والتعریف: رقم ۲۲۵ بحوالہ الطبرانی)

یعنی ابوعزیز کہتے ہیں کہ میں بدر کے قیدیوں میں شامل تھا، چنانچہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

قیدیوں سے جبراً مشقت لینا اور اس کی اجرت کا حکم

جبراً مشقت قیدی کی سزا پر اور اس کی صحت پر منحصر ہے، اگر عدالت نے قید بامشقت کی سزا سنائی ہے تو ایسی صورت میں قیدی کی مرضی کے خلاف اس سے مشقت لی جاسکتی ہے بشرطیکہ وہ صحت مند ہو اور مشقت کے قابل ہو، لیکن اگر عدالت نے مشقت لینے کا حکم نہیں دیا ہو تو ایسی صورت میں اس سے جبراً مشقت لینا جائز نہیں اور قیدی کی صحت اس قابل نہیں یا عمر کے اس مرحلہ میں ہے جس میں وہ مشقت کر نہیں سکتا تو ایسی حالت میں مشقت لینا اخلاقی طور سے غلط بات ہے، حکام کو اس کی اجازت نہیں کہ ایسے قیدی سے مشقت لیں۔

کام لینے پر اس کی اجرت دینی چاہئے، قیدی اس کی اجرت کا حقدار ہوگا۔

زیر سماعت مقدمہ والے قیدی اور سزاء قید والے قیدی میں فرق

سزائے قید والے قیدی کے لئے وہی سزا ہوگی جو عدالت کی جانب سے دی جاچکی ہوگی اور زیر سماعت مقدمہ کے قیدی کو سزا دینے کی گنجائش نہیں ہے، البتہ عدالت کے حکم سے تفتیش کے لئے معمولی طور پر سزا دی جاسکتی ہے، لیکن دونوں طرح کے قیدیوں میں فرق ہونا چاہئے، زیر سماعت مقدمہ والے قیدی کی سزا ہی قید ہے، اس کو روکے رکھنا ہے، جب اس کا جرم ثابت ہوجائے تو ایسی صورت میں عدالت کے حکم پر اس کو سزا دی جاسکتی ہے۔

زیر سماعت مقدمہ کے قیدیوں کے مسائل

مسئلہ ہے کہ زیر سماعت قیدیوں کو اتنے دنوں تک فیصلے سے پہلے قید میں رکھنا جوان کے اوپر عائد فرد جرم کی اصل سزا ہے، اس سلسلہ میں تفصیل یہ ہے کہ جرم ثابت ہوجانے پر اس کے لئے جو سزا دی جانے والی ہے، اس سے وہ بری ہوجائے گا کیوں کہ وہ سزا پاچکا ہے، بعد میں پھر سزا دینے کی گنجائش نہیں ہوگی، اگر جرم ثابت نہیں ہوا تو ایسی صورت میں عدالت یا حکام اسے دی جانے والی ناحق سزا کا ہرجانہ بھریں۔

اسی لئے بہتر ہے کہ زیر سماعت قیدی کے مقدمہ کا فیصلہ جلد از جلد کیا جائے اور یہ انتظام ہو کہ فیصلہ کی تاخیر سے قیدیوں کے حقوق متاثر نہ ہوں۔

ملزم کا جرم ثابت نہ ہوسکا، اس کو دی گئی قید کا حکم

اگر ملزم کو قید کر رکھا مگر بعد میں اس کا جرم ثابت نہ ہوسکا تو ایسی صورت میں اس کو دی گئی سزا یا دوران قید ہونے کی اذیت یا نقصان کی تلافی کے لئے اس شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ عدالت سے یا حکام سے مالی ہرجانہ طلب کرے۔

قیدی کو مقدمات کے لئے وکیل کی خدمات کا حصول اور صفائی کا حق

قیدی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مقدمہ کی پیروی کے لئے وکیل سے رابطہ کرے، قیدی کو وکیل سے رابطہ کے سلسلہ میں کسی بھی قسم کی رکاوٹ ناانصافی ہے، قیدی کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ اپنے مقدمہ کے سلسلہ میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے ہر جائز قدم اٹھا سکتا ہے، وکیل کی خدمات کا حصول بھی قیدی کا حق ہے۔

اسی طرح اپنی صفائی پیش کرنے کے سلسلہ میں بھی اس کو آزادی دینی چاہئے تاکہ وہ اپنی بے گناہی کو ثابت کرسکے، اس سلسلہ میں اس کو بھرپور موقع دیا جائے۔

خواتین قیدیوں کا اپنے شیر خوار بچوں کو ساتھ رکھنا

احقر کی رائے میں خواتین قیدیوں کو اس بات کی اجازت ہو کہ وہ اپنے شیر خوار بچوں کو ساتھ رکھ سکیں تاکہ اس بچہ کے لئے غذا کی فراہمی متاثر نہ ہو، لیکن اگر بچہ ماں کے بغیر یا ماں کے دودھ کے بغیر رہ سکتا ہے اور اس کی دیکھ بھال کرنے والے موجود ہیں تو ایسی صورت میں ٹھیک نہیں ہوگا کہ بچہ ماں کے ساتھ جیل کے ماحول میں رہے۔

☆☆☆

شریعت کی نظر میں قیدیوں کے حقوق

مولانا اقبال احمد قاسمی کانپوری

مذہب اسلام نے جس طرح خبیث جرائم پر سخت سے سخت سزائیں دیکر انسانوں کو جرائم سے پاک ماحول فراہم کرنے کی کامیاب سعی کی ہے (جیسا کہ اسکی شہادت وہ ممالک دیتے ہیں جہاں شرعی سزائیں نافذ ہیں جبکہ دیگر ممالک میں جرائم روز افزوں ہیں) اسی طرح ان سزاؤں کے مستحق افراد کے حقوق کا بھی بھر پور خیال کیا ہے۔ اسلام کی نگاہ میں کسی کو سزاء کے مستحق ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسکو بنیادی حقوق سے بھی محروم کر دیا جائے انسان تو افضل مخلوق ہے اس کا مقام تو سب سے بلند ہے علماء نے احادیث کی روشنی میں یہاں تک لکھا ہے کہ ایسے جانور جن کو مارنا مستحب ہے، جیسے کہ سانپ بچھو وغیرہ ان کے مارنے کے حکم کا یہ مطلب نہیں کہ اگر ان کا پیاسا ہونا معلوم ہو جائے تو ان کو پانی نہ پلایا جائے، اس لئے کہ ہم مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ جس کو کسی وجہ سے قتل کیا جائے اس میں بہتری کی رعایت کی جائے اسی وجہ سے جس کو قتل کرنا ضروری ہے اس کے بھی ہاتھ پاؤں وغیرہ کاٹنے کی ممانعت ہے (فتح-فضائل صدقات ص ۱/۷۶)۔

غرضیکہ اگر کسی شخص کو کسی جرم کے ثبوت میں یا محض الزام کی بنا پر قید کیا گیا ہے تو اسکی قید و بند کی زندگی کے دوران اس کے تمام تر انسانی حقوق کا خیال رکھنا باعث اجر و ثواب ہے، اور اس میں کسی قسم کی تفریق برتنا ناانصافی ہے۔ چنانچہ اللہ پاک نے نیک بندوں کی صفات میں مطلق قیدیوں کے خیال رکھنے کا بھی ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہے:

ویطعمون الطعام علی حبه مسکینا ویتیما واسیرًا (دھر ص، بیان القرآن)۔

وہ (اللہ کے نیک بندے) اللہ کی محبت میں مسکین، کرہ سوالنامہ کی ترتیب کے مطابق حسب ذیل ہے۔

۱-قید احتیاطی- بلا ثبوت جرم محض الزام کی بنا پر قید کرنا

کسی ملزم کو اسکے جرم کا ثبوت فراہم ہوئے بغیر قید کرنے کے سلسلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے چونکہ قید بھی ایک قسم کی سزاء ہے اور آدمی کی حیثیت اس سے مجروح ہوتی ہے اس لئے جب تک واقعی جرم ثابت نہ ہو کسی کو قید کرنا زیادتی ہوگی اس کے برخلاف فقہاء کی ایک جماعت بتقاضائے احوال تفتیش کے طور پر یا احتیاطًا قید کئے جانے کے جواز کی قائل ہے۔ علامہ وہبہ زحیلی فرماتے ہیں:

قال جماعة من الفقهاء لمشروعية الحبس بدليل ان النبي صلى الله عليه وسلم حبس رجلا في تهمة ثم خلى عنه. وهذا هو الحبس الاحتياطي۔ (الفقه الاسلامي وادلتهن: ۵۵۹۲/۷)۔

فقہاء کی ایک جماعت حبس و قید کے جواز کی قائل ہے، دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تہمت زدہ شخص کو قید میں رکھا پھر تفتیش کے بعد اس کو چھوڑ دیا یہی ''قید احتیاطی'' ہے (جو فقہاء کے نزدیک جائز ہے)۔

فما رواه الترمذي وغيره عن بهز بن حكيم عن أبيه عن جده أن النبي صلى الله عليه وسلم حبس رجلا في تهمة ثم خلى عنه وفي لفظ البيهقي: حبس رجلا في تهمة ساعة من النهار (ترمذی وابوداؤد بحوالہ القضاء ونظامہ ص ۵۵۱)۔

ترمذی میں ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تہمت کی بنا پر ایک شخص کو گرفتار کیا پھر اس کو بری کر دیا، بیہقی میں ہے کہ متہم شخص کو دن میں تھوڑے وقت کے لئے قید میں رکھا تھا۔ (کذا فی ابوداؤد وترمذی)۔

مذکورہ بالا تصریحات سے محض الزام وتہمت کی بنا پر برائے تحقیق وتفتیش کسی کو قید کرنے سے متعلق جواز کی ترجیح معلوم ہوتی ہے ساتھ ہی یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ یہ مدت مختصر ہونی چاہئے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدی کو جلد رہا کیا باقی قید احتیاطی کی مدت کیا ہونی چاہئے اس کی مستقل بحث کی ضرورت ہے۔

قید احتیاطی کی مدت

مذکورہ بالا عبارت اور حدیث شریف سے صرف یہ روشنی ملتی ہے کہ یہ قید احتیاطی بس مختصر وقفہ کے لئے ہی ہو لیکن یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ وہاں معاملہ نے سنگین رخ نہ اختیار کیا ہو اور چند گھنٹوں کی کارروائی سے اطمینان حاصل ہو گیا ہو اس لئے معاملہ کی نزاکت کے اعتبار سے مدت میں کمی و بیشی کی اجازت ہونی چاہئے جیسا کہ خود حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ مقروض اگر مالدار ہونے کے باوجود ٹال مٹول کر رہا ہے تو اس کی قید کو ادائیگی قرض تک بڑھا دیا جائے جبکہ تنگ دست مقروض کے لئے تو خود قرآن سفارش کرتا ہے ''وإن كان ذو عسرة فنظرة إلى ميسرة وأن تصدقوا خير لكم'' (البقرہ) چونکہ جرائم کی نوعیت مختلف ہوتی ہے بعض جرائم معمولی نوعیت کے ہوتے ہیں جبکہ بعض بہت اہم لہٰذا جرم کی شدت اور خفت کے اعتبار سے حبس وقید کی مدت میں کمی زیادتی ہوگی جیسے کہ تعزیر کے باب میں اسباب تعزیر کے اعتبار سے سزاء قید کی مدت میں کمی وبیشی ہوتی رہتی ہے۔

وتختلف مدة الحبس فى التعزير باختلاف اسبابه وموجباته ولذا فلا يمكن تقديره قال بن فرحون فى تبصرة الاحكام فحبس التعزير راجع إلى اجتهاد الحاكم يقدر ما يرى أنه ينزجر به۔ (القضاء ونظامه ص ۵۵۶)۔

تعزیری قید کی مدت اسباب تعزیر کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے اسی لئے اس کا کوئی متعین اندازہ ممکن نہیں۔ تبصرۃ الحکام میں ابن فرحون فرماتے ہیں کہ یہ حاکم کے اجتہاد ورائے پر موقوف ہے وہ مجرم کی تنبیہ کے لئے جس قدر قید مناسب سمجھے متعین کر سکتا ہے۔

اس موقعہ پر علامہ شامی نے کتاب السرقۃ میں قید احتیاطی کی اکثر مدت ایک ماہ ہونے کا قول بھی نقل کیا ہے۔

فيحبس حتى يكشف أمره قيل شهرًا (شامی ص ۶/۱۴۷)

کسی شخص کو اس کا معاملہ منکشف ہونے تک قید میں رکھا جا سکتا ہے بعض فقہاء اس کی مدت ایک ماہ بیان کرتے ہیں۔

بظاہر قید احتیاطی کی مدت کا فیصلہ مفوض الی رأی القاضی ہونا چاہئے کہ وہ جرم اور مجرم نیز الزام اور ملزم کے فرق اور واقعات کی نزاکت کے پیش نظر کوئی فیصلہ صادر کرے۔

۲- قیدیوں کے ضروری حقوق اور آزادی کے حدود

انسانوں کو جرائم سے روکنے اور مجرموں کو زجر وتوبیخ کے لئے ضرورتاً قید وبند کی اجازت ہر قانون اور شریعت میں دی گئی ہے، اگرچہ کسی انسان کو آزادی جیسی نعمت سے محروم کر کے قید میں رکھنا ہی مستقل سزاء ہے اس لئے بظاہر یہ حقوق انسانی کے خلاف ہے لیکن تنبیہ اور اصلاح کی ضرورت کے پیش نظر نصوص میں اس کی اجازت دی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إنما جزاء الذين يحاربون الله ورسوله ويسعون فى الأرض فسادًا أن يقتلوا أو يصلبوا أو تقطع ايديهم وارجلهم من خلاف أو ينفوا من الارض۔ (المائده ص ۳۳)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلانے میں لگے رہتے ہیں ان کی سزاء بس یہی ہے کہ وہ قتل کئے جائیں یا سولی دیئے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پیر مخالف جانب سے کاٹے جائیں یا وہ ملک سے نکال دیئے جائیں۔

مجرم کو قید خانہ میں بند کرنا یہی اس کا زمین سے نکالنا ہے امام اعظم ابوحنیفہ کی یہی رائے ہے۔ (معارف القرآن ۳/۱۲۲)

وموضع الاستدلال فى الآية قوله تعالىٰ ''أو ينفوا من الأرض فإن المراد بالنفى الحبس هذا على راء الاحناف (القضاء ونظامه ص ۵۵۱)۔

محل استدلال آیت میں "أو ینفوا من الارض" کا جملہ ہے کیونکہ مراد نفی الارض سے حبس اور قید ہے۔ یہی احناف کی رائے ہے۔

لیکن کسی کو قید میں ڈالے جانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ اب ہر نا روا سلوک کا مستحق ہوگیا اور دیگر حقوق انسانی کے قابل نہیں رہا بلکہ وہ عام انسانوں کی طرح اپنے مذہبی حقوق (عبادت، مطالعہ اور ان کی مذہبی کتب کا احترام وغیرہ) نیز جسمانی حقوق (خوراک، پوشاک، علاج اور صحت کا لحاظ) اسی طرح سماجی حقوق (عزیز و اقارب سے میل ملاقات، فون پر محتاط گفتگو، ذرائع ابلاغ کے استعمال) یا اخلاقی حقوق (مرد و عورت کے قید میں امتیاز برتنا اور علیحدہ نظم رکھنا، بالغ نابالغ کے لئے الگ الگ قید خانہ بنانا وغیرہ) کا برابر طور پر مستحق رہتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جرم خواہ کتنا ہی سنگین ہو اور اس کی سزاء عمر قید یا موت کیوں نہ ہو تاہم قیدیوں کے انسانی حقوق برقرار رہیں گے۔

علامہ زحیلی لکھتے ہیں:

الکرامة حق طبعی لکل انسان رعاها الاسلام فلا یجوز إهدار کرامة أحد أو اباحة دمه وشرفه، سواء کان لحسنا أو سیئا، مسلما او غیر مسلم، لان العقاب اصلاح وزجر لا تنکیل واهانة، ولایحل شرعًا السب والاستهزاء والشتم کما لایجوز التمثیل بأحد حال الحیاة أو بعد الممات، ولو من اعداء اثناء الحرب أو بعد انتهائها. ویحرم التجویع والاظماء والنهب والسلب۔ (الفقه الاسلامی ص ۶۲۰۸)۔

احترام انسانیت ہر انسان کا فطری حق ہے اسلام نے ہر موقع پر اسکی رعایت کی ہے لہٰذا کسی کی بے عزتی کرنا یا اسکے خون اور شرافت کو مباح سمجھنا جائز نہیں ہے خواہ کوئی نیکوکار ہو یا بدکار، مسلمان ہو یا غیر مسلم، کیونکہ سزا کا مقصد اصلاح اور تنبیہ ہے نہ کہ محض توہین، اور شرعاً برا بھلا کہنا اور استہزاء کرنا گالی دینا حلال نہیں ہے۔ جیسا کہ کسی کا مثلہ کرنا زندگی کی حالت میں یا مرنے کے بعد جائز نہیں ہے اگر چہ دوران جنگ دشمنوں سے سابقہ ہو یا جنگ کے بعد، اور بھوکا، پیاسا رکھنا بھی حرام ہے، اور کسی مجرم کے ساتھ لوٹ کھسوٹ کا معاملہ کرنا بھی ناجائز ہے۔

وان للسجین الحق علی الدولة فی الغذاء وادکساء والمأوی الملائم ومنع التعذیب الوحشی وغیر ذلك من أصول الحفاظ علی الکرامة الانسانیة۔ (ص ۷/۵۳۲۵)۔

حکومت پر قیدیوں کے سلسلہ میں ذمہ داری ہے (یعنی قیدیوں کا حق ہے) کہ ان کو غذاء، لباس، مناسب رہائش فراہم کرے اور وحشیانہ سزا وغیرہ سے پرہیز کرے اور حفظان صحت کے اصول پر انسانی حقوق کا خیال رکھے۔ (الفقہ الاسلامی)۔

مذکورہ مسئلہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے جیل خانہ کی زندگی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو قرآن کریم سے بھی رہنمائی ملتی ہے کہ جیل خانہ میں مذہبی آزادی بھی تھی صرف مذہبی امور کی انجام دہی کی آزادی نہیں بلکہ تبلیغ کی بھی آزادی تھی جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے دیگر قیدیوں کو تبلیغ کرتے ہوئے کہا "یصاحبی السجن أأرباب متفرقون خیر أم الله الواحد القهار" (یوسف) اسکے علاوہ غذا وغیرہ کی فراہمی وقت کے اہتمام کے ساتھ ہوتی تھی کما یدل قوله تعالیٰ ''قال لا یاتیکما طعام ترزقانه إلا نباتکما بتاویله قبل أن یاتیکما'' اسی کے ساتھ قیدیوں کو اپنے متعلقین سے ملنے کی اجازت تھی کہ وہ ان کے پاس آ جا سکیں جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس ایک شخص جیل میں آ کر گفتگو کرتا ہے ''یوسف ای الصدیق افتنا فی سبع بقرات'' ان قرآنی ارشادات سے کافی حد تک قیدیوں کے حقوق کا خلاصہ واضح ہو جاتا ہے جس کا حاصل یہی ہے کہ قیدیوں کی سزا سے قطع نظر وہ قید و بند کی حالت میں حقوق انسانی سے محروم نہیں کئے جانے چاہئیں۔

۳- سچ اگلوانے اور اقرار جرم پر مجبور کرنے والی سزائیں اور ان کا حکم

لہٰذا قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے ٹارچر کرنا انھیں الکٹرک شاک لگانا، ان کے ناخن اکھیڑ لینا، ان کو بے لباس کر دینا، کتے چھوڑ دینا، ٹھنڈک کا عذاب دینا پانی میں ڈبکی دینا، برف کی سلی پر لٹا دینا، مذہبی کتابوں کی بے حرمتی کرنا تیز روشنی یا تیز آواز لگا دینا وغیرہ صورتیں اختیار کرنا قطعًا ناجائز و حرام ہے۔ البتہ زبانی دھمکانا اور چند کوڑے وغیرہ لگا کر بات کی تحقیق کرنا بھی صرف انھیں ملزموں سے جائز ہوگا جن کا ریکارڈ پہلے سے مشتبہ یا خراب رہا ہو وصاف ستھرے لوگوں کو ملزم بنا کر ان کو اذیت میں مبتلا کر کے کسی معاملہ کے لئے اقبال جرم کرانا شرعاً ناجائز و حرام ہے اور ایسے اعتراف جرم کے کوئی معنی نہیں ہوں گے اور اس کو شرعاً مجرم نہیں مانا جائے گا۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: شامی ۶ / ۷ / ۱۴۷، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷ / ۵۳۱۷)۔

۴- قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑنا یا ہتھکڑی اور بیڑی ڈالنا

شرعاً مجرم جن سزاؤں کا مستحق ہے وہ اپنے وقت پر بھگتے گا اس سے قبل ہی اس کو قید کی حالت میں زنجیروں میں جکڑنا، انھیں بیڑی ڈالنا یا ہتھکڑی پہنانا جائز نہیں ہے البتہ اگر مجرم کے بارے میں یہ اندیشہ ہو کہ وہ گرفتاری سے راہ فرار اختیار کرسکتا ہے یا پیشی پر لے جاتے وقت چکمہ دے کر نکل سکتا ہے ایسی صورتوں میں زنجیروں میں جکڑنے یا بیڑی ڈالنے کی گنجائش ہے، لیکن قید خانوں میں جہاں بھاگنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا وہاں اس قسم کی بندشوں کی حاجت نہیں ہوتی لہٰذا قید خانہ میں جکڑ کر رکھنا انسانیت سوز حرکت ہوگی جو کہ اسلامی قانون کے رو سے بجائے خود ظلم کے مترادف ہے آج دنیاوی قید خانے اور جیل خانے اسی قسم کے مظالم سے بھرپور ہیں۔ علامہ حصکفی فرماتے ہیں:

ولا يغل إلا إذا خاف فراره فيقيد۔ (در مختار، شامی ص ۸/۵۸، کتاب القضاء)۔

اور طوق نہ پہنایا جائے، مگر جب کہ اس کے فرار ہونے کا خطرہ ہو تو جکڑا جاسکتا ہے۔

علامہ زحیلی لکھتے ہیں:

انہ لاغل ولاتجرید ولا تصفید ولا تمثیل فی الاسلام۔ (ص ۷/۵۳۲۵)۔

اسلام میں نہ طوق پہنانا ہے، نہ بےلباس کرنا، نہ بیڑی ڈالنا اور نہ ہی مثلہ بنانا ہے (ہاتھ پاؤں وغیرہ کاٹنا)

۵- کسی مجرم کو قید تنہائی کی سزا دینا

قید خانہ کی زندگی میں عام حالات میں قیدیوں سے ان کے رشتہ داروں اور پڑوسیوں وغیرہ کو ملنے کی اجازت ہوتی ہے اس کے علاوہ جیل خانہ خود آباد رہتا ہے وہاں قیدیوں کی بھیڑ ہوتی ہے جس میں ایک دوسروں سے ملاقات اور گفتگو کے مواقع ہوتے ہیں رہا مسئلہ کہ خاص جرم کی بنا پر کسی قیدی کو اس طرح مقید رکھنا کہ وہ سب سے الگ تھلگ بند کر کے رکھا جائے اور کوئی اس سے مل نہ سکے جسے ''قید تنہائی'' سے تعبیر کیا گیا ہے اسکی بھی اجازت فقہاء کی عبارتوں سے ملتی ہے نیز حدیث پاک میں جو غزوۂ تبوک کا واقعہ ملتا ہے اس میں مخلفین مخلصین کے ساتھ بھی تو قید تنہائی جیسا حکم تھا جیسا کہ تفصیل کتابوں میں ملتی ہے۔

ردالمحتار میں ہے: قيل يطين عليه الباب ويترك له ثقبه يلقى له الخبز والماء وقيل الرأى فيه للقاضي۔ (حوالۂ بالا)۔

بعض فقہاء کا قول ہے کہ دروازہ پر مٹی لیپ کر اس میں ایک سوراخ کھلا چھوڑ دیا جائے جس سے اسکو روٹی پانی دیا جاسکے اور ایک قول یہ ہے اس قاضی کی رائے پر عمل کیا جائے گا۔

قید تنہائی کے علاوہ دیگر قیدیوں کی بابت حکم میں بھی ملاقات وغیرہ کی اجازت محدود ہوتی ہے جیسا کہ در مختار کتاب القضاء میں ہے:

ولا يمكن أحد أن يدخل عليه للاستئناس إلا اقاربه وجيرانه لإحتياجه الشاورة ولايمكثون عنده طويلا۔ (در مختار مع الشامی ۸/۵۵)۔

مجرم کے پاس انسیت اور دل بہلانے کے لئے سوائے اقارب اور پڑوسیوں کے باقی کسی کو اجازت نہیں ہے اور ان سے ملاقات کی اجازت مشورہ وغیرہ کی ضرورت کی بنا پر ہے لہٰذا ان کے پاس دیر تک یہ لوگ بھی نہیں ٹھہر سکتے۔

خلاصہ کلام یہ کہ بعض خصوصی احوال میں کسی خاص مجرم کے لئے قید تنہائی کی سزاء تجویز کرنا قاضی کے لئے جائز ہے قاضی جس قدر اور جتنی مدت قید تنہائی کی ضرورت مجرم اور جرم کے اعتبار سے مناسب سمجھے وہ اس کا فیصلہ کرسکتا ہے۔

۶- قیدیوں سے جبریہ کام لینے اور اس کی اجرت کا مسئلہ

شامی میں ہے: ولا يتكسب فيه، وقد صرح في البحر وغيره بأن الأصح المنع لأن الحبس مشروع ليضجر. ومتى تمكن من الاكتساب لا يضجر فيكون السجن له بمنزلة الحانوت۔ (کتاب القضاء شامی ۸/۵۷)۔

قیدخانہ میں قیدی کمائی نہ کرے گا، بحر وغیرہ میں ہے کہ اصح قول یہ ہے کہ قیدی کو کمانے سے روکا جائے گا، کیونکہ قید تنبیہ کے لئے مشروع ہوا ہے اور جب وہ وہاں کمانے میں بلا اختیار ہوگا تو تنبیہ نہ رہے گی بلکہ قید خانہ اس کے لئے تو گویا دوکان بن جائے گا۔ (شامی)۔

قیدی کو از خود کمانے اور اجرت پر کام کرنے کی آزادی نہ ہوگی تاہم قیدیوں کو اسکی اجازت دی جاسکتی ہے خصوصا طویل المیعاد قیدی کے لئے مناسب ہے کہ اجرت پر اس سے کام لیا جائے تا کہ اس کا بھی بھلا ہو اور حکومت کا بھی البتہ جبریہ کام لینا یا بلا اجرت کام لینا یہ تعزیزاً وقتی قیدی مجرم کے لئے جو قید بامشقت کی زندگی کے زمرہ میں ماخوذ ہو اس کے لئے ایسی تعزیر قاضی وحاکم کی اجازت سے جائز ہے۔

۷- مجرم اور ملزم کا فرق

جن قیدیوں کا مقدمہ ابھی زیر ساعت ہے وہ ابھی مجرم نہیں قرار پائے ہیں صرف ملزم ہیں اور وہ بری بھی ہو سکتے ہیں ایسے قیدی اور ان کے علاوہ باضابطہ مجرم قرار دیئے گئے اور سزاء قید کا فیصلہ سنائے گئے قیدیوں کے درمیان زمین وآسمان کا فرق ہے۔ کیونکہ فقہ کا مشہور اصول ہے کہ جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے ملزم اور متہم شخص کو بری تصور کیا جائے گا لہٰذا ان کے ساتھ مجرموں جیسا سلوک جائز نہ ہوگا۔ وہبہ زحیلی فرماتے ہیں:

وإن الأصل في المتهم البراءة حتى تثبت إدانته۔ (الفقه الإسلامي ۶۴۵۳/۷)۔

متہم شخص کے بارے میں اصل تو یہی ہے کہ وہ بری ہے الا یہ کہ اس کا قصور ثابت ہو جائے۔

بہر حال وہ متہم شخص جو کسی بھی وقت بری ہو سکتا ہے اور وہ مجرم شخص جس کے لئے سزاء قید کا فیصلہ ہو چکا ہو دونوں کیسے ہم پلہ ہو سکتے ہیں لہٰذا زیر ساعت قیدی اور فرد جرم عائد شدہ قیدی کے مابین قید خانہ کے سلوک میں فرق قرین قیاس اور مقتضاء عدل وانصاف ہے۔

۸- اصل مجرم کی سزاء قید کے برابر زیر ساعت قیدی کو مقید کرنا

زیر ساعت قیدیوں کو جن کو محض الزام یا اتہام اور شبہ کی بنا پر قید میں لیا گیا ہو اگر ان کا ریکارڈ پہلے سے داغدار نہیں ہے تو ان کو قید میں رکھنا ہی شرعاً درست نہ ہوگا جو حضرات کسی جرم میں واقعی مشکوک ومشتبہ ہوں ان کو گرفتار کرنے اور قید کر دینے کی اجازت تو ملتی ہے لیکن زمانہ قید اتنا طویل ہرگز نہ ہونا چاہئے جو کہ اصل جرم کی سزاء کے مساوی ہو یہ طویل قید عقل ونقل کے سراسر خلاف ہوگی حکام کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ ملزم بنائے گئے شخص کے بارے میں بعجلت ممکنہ طے کرے کہ یہ قید میں رکھے جانے کے قابل کسی جرم میں ملوث ہے یا بری ہے۔ قیدیوں کی ساعت کو اتنا سست بنا دینا کہ وہ قید ملزم کے لئے مجرم کے کٹہرے میں کھڑے شخص کی مانند ہو جائے بجائے خود یہ ظلم کے مرادف ہے۔ الزام ثابت نہ ہو پانے کے باوجود محض الزام کی بنا پر جیل میں رکھ کر اس کی زندگی کا قیمتی حصہ برباد کر دینا انصاف نہیں بدترین ظلم ہے۔ آخر کفالت وضمانت کا قانون موجود ہے پھر اس کے باوجود سالہا سال قیدی رکھنا اور ضمانت پر بھی رہا نہ کرنا سرکاری ظلم نہیں تو اور کیا کہا جائے گا۔

رہا یہ مسئلہ کہ ایسے زیر ساعت قیدیوں کو کتنی مدت قید میں رکھ سکتے ہیں تو اس کی کوئی متعینہ حد شرعاً نہیں ہے البتہ بعض عبارات سے زائد سے زائد مدت ایک ماہ معلوم ہوتی ہے۔

فيحبس حتى يكشف أمره وقيل شهرًا (شامی ص ۱۴۷ کتاب السرقة)۔

ملزم کو اس کا معاملہ واضح نہ ہونے تک مقید رکھا جائے اور بعض نے ایک ماہ قید کی بات کہی ہے۔

۹- ملزم کے بری ثابت ہونے پر مدت قید کا حرجانہ

ملزم کو کسی شکایت یا شبہ کی بنا پر کچھ وقت کے لئے حراست میں لینا تو شرعاً جائز اور معمول کی کارروائی میں شامل ہے اگر ایسے ملزم کو عدالت نے بری کر دیا تو معمولی مدت کی قید میں رکھنے کا کوئی جرمانہ شرعاً عائد نہیں ہوتا حدیث میں ہے:

فما رواه الترمذي وغيره عن بهز بن حكيم عن أبيه عن جده أن النبي صلى الله عليه وسلم حبس رجلا في تهمة ثم خلى عنه وفي لفظ البيهقي حبس رجلا في تهمة ساعة من النهار۔ (القضاء و نظامه ص ۵۵۱)۔

ترمذی نے بہز بن حکیم کی روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو تہمت کی بنا پر قید کیا پھر اس کو چھوڑ دیا اور بیہقی کے الفاظ ہیں کہ دن میں تھوڑی دیر کے لئے اسکو تہمت کے تحت گرفتار کیا تھا۔

اور اگر کسی جرم کے الزام میں اتنے دنوں تک قید میں رکھا گیا جتنے دن قید کی ضرورت نہ تھی تو اب برأت کے بعد مال ہرجانہ اور ضمان کا استحقاق ہوگا یا نہیں بظاہر اس صورت میں احناف کے اصول ''المنافع لاتضمن'' کے پیش نظر ایسے شخص کے لئے بھی مالی ہرجانہ کا حق نہ ہونا چاہئے کیونکہ حراست کی وجہ سے اس کی جسمانی منفعت فوت ہوئی ہے اگر آزاد ہوتا تو کچھ منافع حاصل کرسکتا تھا لیکن اس حراست اور قید نے گویا اس کے منافع کو غصب کر کے ضائع کر دیا اور عندالاحناف منافع کا چونکہ ضمان نہیں لہٰذا یہاں پر بھی کسی قسم کا ہرجانہ وصول کرنے کا حق نہ ہونا چاہئے۔

لیکن اگر احناف کے اس اصول پر یہاں عمل کیا گیا تو تحقیق کے نام پر پکڑے گئے قیدیوں کو وقت پر چھٹکارہ بھی مشکل سے ملے گا اور نقصان کی تلافی بھی نہیں ہوسکے گی۔ اس لئے اس قسم کے ظلم کے سدباب کے لئے جس طرح بعض جگہوں میں منافع کو قابل ضمان مان لیا گیا ہے یہاں بھی تلفِ منفعت کی وجہ سے ضمان دلانا عین مصلحت اور تقاضائے انصاف ہوگا۔

امام نووی کتاب الجنایات میں لکھتے ہیں:

وإن جنى على حرجناية نقص بها جمال أو منفعة ولا ارش لها مقدر ذكرنا انه يجب فيهما حكومة۔ (كتاب المجموع للنووی ۲۰/۵۴۸)۔

اور اگر کسی آزاد کا کوئی ایسا نقصان کیا جس سے اس کے جمال میں کمی واقع ہوئی یا منفعت ختم یا کم ہوگئی اور اس کا کوئی متعین تاوان مقرر نہ ہو تو ہم اس سلسلہ میں ذکر کر چکے ہیں کہ (حاکم، یا دو عادل شخص کا) فیصلہ معیار ہوگا کہ وہ اس کا ہرجانہ طے کرے۔

اس عبارت سے جمال میں کمی اور منفعت کے ضیاع پر ہرجانہ کا ثبوت ملتا ہے اور مذکورہ مسئلہ میں بھی لمبی قید کے سبب صلاحیت بھی متاثر ہوتی ہے جو کہ جسم کا معنوی جمال ہے اور جسمانی و مالی منفعت بھی ضائع ہونا ظاہر ہے ذہنی اذیت بھی دماغی منعفت میں نقص پیدا کرتا ہے ان وجوہ سے ضمان لازم ہونے کا قول اختیار کرنا چاہئے جیسا کہ شوافع کا یہی مسلک ہے جو علامہ نووی کی کتاب سے ظاہر ہے۔ اگر چہ احناف کے یہاں اس سلسلہ کی صراحت نظر سے نہیں گزری تاہم عصر حاضر میں مذکورہ مسئلہ میں شوافع کا قول قابل عمل نظر آتا ہے۔ ورنہ مظالم کی راہ انصاف کی آڑ میں کھل جائے گی جیسا کہ آج کی حکومتوں کا رویہ ہے۔

۱۰- مقدمات کے لئے قیدیوں کو وکیل کرنے کا حق

وکالت کا ثبوت کتاب وسنت سے ہے، اور وکیل کسی بھی معاملہ میں اپنے مؤکل کا ترجمان ہوسکتا ہے، وکالت کی صورت عقلاً بھی مسلم ہے کیونکہ بسا اوقات انسان کو ایسے اعذار اور عوارض پیش آتے ہیں مثلاً بیماری، وطن سے دوری، کثرت مشاغل یا اپنے مافی ضمیر کو اچھی طرح ادا نہ کرسکنا وغیرہ کہ ان وجوہ سے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ آدمی اپنی طرف سے کسی کو اپنا وکیل اور نائب بنائے اور ظاہر ہے کہ نیابت کے فرائض انسان جب ہی انجام دے سکے گا جب مؤکل سے ملنے اور سارے حالات جاننے اور بتلانے کی مکمل آزادی ہو، اسی طرح کوئی بھی قیدی عدالت کے روبرو اپنی برائت کے دلائل جب ہی اچھی طرح پیش کرسکتا ہے جبکہ وہ قانون، اور اپنے مافی ضمیر کی ادائیگی پر پوری قدرت رکھتا ہو ورنہ جرم سے بری ہونے کے باوجود ممکن ہے کہ وہ مجرم ہی قرار پاجائے اور صاحب حق ہونے کے باوجود حق سے محروم رہ جائے جیسا کہ حدیث میں اس کا ذکر ہے:

عن ام سلمة رضی الله عنها أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال إنما أنا بشر مثلكم وإنكم تختصمون إلى ولعل بعضكم أن يكون ألحن بحجته من بعض فاقضي على نحو ما أسمع فمن قضيت له بحق أخيه شيئا فلا يأخذ فانما اقطع له قطعة من النار۔ (بخاری ومسلم بحواله القضاء ونظامہ ص ۶۴)۔

ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہاری طرح انسان ہوں اور بیشک تم لوگ میرے پاس مقدمات لاتے ہو اور بسا اوقات تم میں بعض لوگ اپنی بات چرب زبانی سے ثابت کر لے جاتے ہیں اور میں گفتگو کے مطابق فیصلہ بھی کر دیتا ہوں

لیکن کسی کے لئے اگر کسی بھائی کی کوئی چیز کا فیصلہ کردوں تو وہ اس کو ہرگز نہ لے کیونکہ یہ تو اس کے لئے جہنم کا ٹکڑا ہوگا جو میں دے رہا ہوں (بخاری و مسلم بحوالہ القضاء و نظامہ ص ۶۴)۔

خلاصہ کلام یہ کہ دیگر معاملات حقوق کی طرح جرم وسزا کے مقدمات میں بھی قیدی کو حق ہے کہ وکیل سے رابطہ کرے اور صفائی پیش کرنے کے لئے رائے ومشورہ لے، البتہ حدود وقصاص جیسے معاملات میں موکل کی حاضری وکیل کے ہمراہ لازم ہوگی کیونکہ حدود وقصاص میں کسی کی قائم مقامی شرعاً درست نہیں۔

۱۱- قیدی خواتین کو اپنے شیر خوار بچے کو ساتھ رکھنے کا حق

حدیث میں ہے: عن أبي أيوب قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول من فرق بين والدة وولدها فرق الله بينه وبين أحبته يوم القيمة۔

والعمل على هذا عند أصحاب النبي صلى الله علية وسلم وغيرهم، كرهوا التفريق بين السبي بين الوالدة وولدها وبين الولد و الوالد وبين الاخوة۔ (ترمذی شریف ص ۲/۲۸۵)۔

حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے ماں اور اس کے بچہ کے درمیان جدائیگی پیدا کی اللہ پاک اس کے اور اسکے دوستوں کے درمیان قیامت میں تفریق پیدا کردیں گے۔ صحابہ کا یہی عمل رہا ہے کہ وہ قیدی کے درمیان اس طرح تفریق کو مکروہ جانتے ہیں کہ ماں اور اس کے بچے کو یا بچے اور اس کے باپ کو یا بھائی بھائی کو جدا جدا کردیا جائے۔ (دیکھئے: کتاب المجموع ۱۰/ ۳۲۶، شامی ۶/ ۲۱)۔

قیدی ماں کو اپنے دودھ پیتے بچہ کو ساتھ رکھنے کے مسئلہ کا تعلق بچہ کی حضانت کے باب سے بھی ہے حق حضانت ماں کا بنیادی حق ہوتا ہے، اس لئے میاں وبیوی کی جدائی کے بعد بھی ماں کو حق تربیت باقی رہتا ہے، اور یوں بھی بچہ کے حقوق کی رعایت بہرحال ضروری ہے، رضاعت، حضانت اور پرورش یہ بچہ کے حقوق ہیں اور ظاہر ہے ان حقوق کی ادائیگی ماں سے بہتر دوسرا کوئی نہیں کرسکتا لہٰذا قیدی ماں کو بھی بچہ کی پرورش کا حق رہے گا، البتہ اگر بچہ کے اعزاء واقرباء (محارم) میں ایسے افراد موجود ہوں جو بچہ کو اچھی طرح تربیت کرسکیں تو پھر حسب موقع ماں کے بجائے دوسرے محارم سے تربیت کی خدمت لی جائے گی اور ماں کو قید میں بچہ کو رکھنے کا حق پھر نہ رہے گا۔

لیکن بحالت قید ماں کتنے دنوں تک اپنے بچہ کو ساتھ رکھ سکتی ہے اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ عام حالات میں اتنی طویل قید ہی شرعاً نامناسب ہے کہ جیل میں اتنی لمبی حضانت کا مسئلہ پیدا ہو بچہ کی رعایت سے قید کے بجائے دوسری سزاء تجویز کی جانی چاہئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حق حضانت کا اصول بظاہر یہاں پر بھی ملحوظ رکھا جانا چاہئے کہ بچہ سات سال تک اور بچی بالغ ہونے تک ماں کے پاس رہے لیکن جیل کی زندگی کوئی عزت کی زندگی نہیں ہوتی اس لئے جیسا کہ اجنبی مرد سے شادی متبادل نظم ہونے کی صورت میں صرف مدت رضاعت تک بچوں کو ماں کے پاس رہنے دیا جائے گا پھر بچوں کی تربیت دوسرے اعزاء کے حوالہ ہوگی۔

قیدیوں کے حقوق اور مسائل

مولانا محمد شاہجہاں ندوی [1]

اسلام یقیناً عدل وانصاف پر مبنی دین ہے، اس کی تمام تعلیمات اور اس کے تمام احکام وقوانین کی بنیاد عدل اور احسان پر ہے، اسلام نے جہاں دیگر معاملات میں عدل وانصاف کا حکم دیا وہیں قیدیوں کے ساتھ بھی عدل واحسان کا معاملہ رکھا ہے، قرآن کریم نے نیک لوگوں کی جن صفات کی بنیاد پر تعریف کی ہے، ان میں سے ایک صفت قیدی خواہ کافر ہو یا مسلمان، خواہ جنگی قیدی ہو، یا کسی جرم میں قید کیا گیا ہو، اس کو کھانا کھلانا اور اس کے ساتھ احسان کرنا بھی ہے، ارشاد ربانی ہے: "ویطعمون الطعام علی حبه مسكينًا ويتيمًا وأسيرًا" (الانسان: ۸) (اور وہ محض اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانے کھلاتے ہیں)، اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے قیدیوں کے ساتھ بھی احسان کرنا سکھایا ہے، ورنہ پرانے زمانہ میں یہ دستور تھا کہ قیدیوں کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈال کر روزانہ باہر نکالا جاتا تھا اور وہ سڑکوں پر یا محلوں میں بھیک مانگ کر پیٹ بھرتے تھے، یہ اسلام ہی کی برکت ہے کہ اس نے یہ طریقہ بند کیا اور قیدیوں کے ساتھ احسان کرنا سکھایا (الخراج لابی یوسف/ص ۱۴۹-۱۰۱، ضمن موسوعۃ الخراج، ط: دار المعرفۃ، بیروت، ۱۹۷۹ء)۔

خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے، چنانچہ جب ثمامہ بن اثال مسلمانوں کے ہاتھ قید ہوئے اور ان کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لایا گیا، تو آپ نے مسلمانوں سے فرمایا: "احسنوا أساره" (ان کو بہتر طریقہ سے قید میں رکھو)، فرمایا: "اجمعوا ما عندکم من طعام، فابعثوا به إليه" (تمہارے پاس جو کچھ بھی کھانا ہوا سے جمع کر کے ثمامہ کے پاس بھیج دو)، چنانچہ اس تعلیم کا اثر یہ ہوا کہ مسلمان ان کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اونٹنی کا دودھ بھی پیش کرتے تھے (آداب الحرب فی الاسلام للشیخ محمد الخضر الحسین/ص ۲۸-۲۹)۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معرکہ بدر کے قیدیوں کو اپنے صحابہ میں تقسیم کر کے ان کے ساتھ بہتر معاملہ کی ہدایت دیتے ہوئے فرمایا: "استوصوا بهم خيرًا" (ان کے ساتھ بھلائی کی ہدایت قبول کرو)، چنانچہ اس ہدایت کا یہ اثر ہوا کہ خود ان قیدیوں میں سے ایک مصعب بن عمیر کے بھائی ابوعزیز بن عمیر بن ہاشم کہتے ہیں کہ میں انصار کی ایک جماعت کے پاس تھا، وہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ کھاتے وقت خود کھجور پر اکتفا کرتے اور مجھے خصوصی طور سے روٹی کھلاتے، ان میں سے اگر کسی کو روٹی کا ایک ٹکڑا بھی دستیاب ہو جاتا تو وہ مجھے ترجیح دیتے، میں شرم کے مارے ان کو لوٹا دیتا، لیکن وہ دوبارہ مجھے لوٹا دیتے (السیرۃ النبویہ لابن کثیر ۲/۲۸۵)۔

فقہاء کرام نے بھی قیدی کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت دی ہے، چنانچہ قاضی ابو یوسف تحریر کرتے ہیں:

"والأسير من أسرى المشركين، لا بد أن يطعم ويحسن إليه، حتى يحكم فيه، فكيف برجل مسلم، قد أخطأ أو أذنب، يترك يموت جوعا" (کتاب الخراج/ ص ۱۴۹)۔

(مشرک قیدی کو بھی کھلانا اور اس کے ساتھ احسان کرنا لازم ہے، یہاں تک کہ اس کا فیصلہ ہو جائے، پھر مسلم قیدی جس نے غلطی یا گناہ کا ارتکاب کیا، اسے بھوکا مرتا کیسے چھوڑا جا سکتا ہے؟)۔

اسی طرح حضرت علیؓ نے قیدیوں کے سلسلہ میں فرمایا: "يحبس عنهم شره، وينفق عليه من بيت مالهم" (مرجع سابق، ص ۱۵۰) (مجرم کو قید کر کے لوگوں سے اس کے شر کو روک لیا جائے گا، اور سرکاری خزانہ سے مجرم قیدی پر خرچ کیا جائے گا)۔

اسلام نے نہ صرف قیدیوں کو کھانا دینے کا نظم کیا، بلکہ سردی اور گرمی کے مناسب لباس کا بھی نظم کیا اور سلاطین اسلام کا اس پر برابر عمل رہا (مرجع

[1] الجامعۃ الاسلامیۃ شانتاپورم، مالاپورم کیرالہ۔

سابق، ص ۱۴۹)۔

یہ ہیں اسلام کی وہ پاکیزہ تعلیمات جو مجرم قیدی کے ساتھ بھی احسان پر آمادہ کرتی ہیں اور ہر غیر انسانی سلوک سے باز رکھتی ہیں، لیکن جب سے طاقت کا توازن بگڑ گیا ہے، اہل اسلام انحطاط کے دور میں چلے گئے ہیں، اس وقت سے قیدیوں کے ساتھ وہ روح فرسا بدسلوکی کی جارہی ہے کہ اس پر انسانیت کی پیشانی شرمندگی سے تر ہے۔

اس مختصر جائزہ کے بعد اب سوالات کے جوابات درج ہیں:

۱-(الف) کسی ملزم کو اس کے جرم کا ثبوت فراہم ہوئے بغیر بطور احتیاط تحقیق کے لئے قید میں رکھا جاسکتا ہے، قرآن کریم میں ہے: "تحبسونهما من بعد الصلاة" (المائدۃ:۱۰۶) (پھر اگر کوئی شک پڑ جائے تو نماز کے بعد دونوں گواہوں کو (مسجد میں) روک لیا جائے)۔

ایک حدیث میں وارد ہے: ''إن النبی ﷺ حبس رجلا فی تهمة ثم خلی عنه'' (ترمذی، کتاب الدیات، باب ما جاء فی الحبس فی التہمۃ، حدیث نمبر: ۱۴۱۷، نسائی فی السارق، حدیث نمبر: ۴۸۷۲، اور ابوداؤد، کتاب الأقضیۃ، حدیث نمبر: ۳۶۳۰) (سرکار دو عالم ﷺ نے ایک شخص کو الزام میں قید کیا پھر اسے رہا کر دیا)۔ ''لمعات'' میں ہے: ''فیه أن حبس المدعی علیه مشروع قبل أن تقام البینة'' (تحفۃ الأحوذی ۴/۶۷۷، ط: داراحیاء التراث العربی، بیروت ۱۹۹۸) (اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مدعا علیہ کو ثبوت فراہم کئے جانے سے پہلے قید کرنا مشروع ہے)۔

لیکن اس قید کے لئے شرط ہے کہ کسی قوی قرینہ سے الزام کی تائید ہورہی ہو، یا ملزم پر شک کئے جانے کی واضح علامتیں ہوں، یا ملزم بدکرداری کے ساتھ معروف ہو (ردالمحتار ۶/۱۴۶، الأحکام السلطانیہ للماوردی، ص ۲۲۰)، تو اگر ملزم کے خلاف کوئی صحیح قرینہ نہ ہو، تو ایسے ملزم کو قید کرنا جائز نہیں ہے۔

لیکن ابو یوسف، قاضی شریح اور امام الحرمین، جرم کے کامل ثبوت کے بغیر قید میں رکھنے کو درست نہیں سمجھتے ہیں، امام الحرمین تحریر کرتے ہیں:

''الشرع لا یرخص فی معاقبة أصحاب التهم، قبل إلمامهم بالسیئات'' (غیاث الأمم، ص ۲۲۹)

(شریعت ملزمین کو جرم بتائے بغیر سزا دینے کو جائز نہیں ٹھہراتی ہے)۔

ب-اس سلسلہ میں فقہاء سے جو صراحت منقول ہے، وہ یہ ہے کہ قید احتیاطی کی کم سے کم مدت کی کوئی حد نہیں ہے، چنانچہ چند منٹ کی تحقیق کے بعد بھی اسے چھوڑا جاسکتا ہے، لیکن زیادہ سے زیادہ کتنی مدت تک قید میں رکھا جاسکتا ہے، اس کا تعلق امام مالک، احمد اور محققین حنابلہ وحنفیہ کے نزدیک حاکم کی صوابدید پر ہے (فتاوی ابن تیمیہ ۳۵/۳۹۷)، جب کہ مالکیہ نے صراحت کی ہے کہ مجہول الحال کو طویل مدت تک قید میں نہیں رکھا جاسکتا ہے اور حبس طویل ان کے نزدیک ایک سال سے زیادہ کی مدت ہے (مرجع سابق ۳۵/۳۹۷)، لیکن بعض فقہاء نے تحقیق حال کے لئے ملزم کو زیادہ سے زیادہ ایک دن قید میں رکھنے کی اجازت دی ہے، جبکہ بعض دیگر فقہاء کے نزدیک زیادہ سے زیادہ دو تین دن ملزم کو قید میں رکھا جاسکتا ہے جب کہ بعض کے نزدیک ایک ماہ تک قید میں رکھنے کی گنجائش ہے (تبصرۃ الحکام ۲/۱۴۷، المغنی لابن قدامہ ۹/۳۲۸، ط: عالم الکتب بیروت)۔

ابن عابدین تحریر کرتے ہیں:

''وإما أن یکون مجهول الحال، فیحبس، حتی یکشف أمره، قیل شهرا، وقیل باجتهاد ولی الأمر'' (ردالمحتار ۶/۱۴۷)

(ملزم اگر مجہول الحال ہو تو اسے قید میں رکھا جائے گا، یہاں تک کہ اس کا معاملہ واضح ہو جائے، کہا گیا ہے کہ ایک ماہ تک اور بعض نے کہا ہے کہ حاکم کی صوابدید پر چھوڑا جائے گا)۔

میری رائے ہے کہ فساد زمانہ کو دیکھتے ہوئے تحقیق حال کے لئے حراست کی مدت زیادہ سے زیادہ تین دن مقرر کی جائے۔

۲- الف-قیدیوں کے ساتھ معاملہ کی بنیاد چوں کہ حسن سلوک ہے، لہذا ان کو مذہبی امور کی مکمل آزادی ہے، چنانچہ ان کو عبادت کرنے، مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرنے اور دوسرے قیدیوں کے درمیان دعوت دین کا موقع فراہم کیا جائے گا، اسی طرح ان کی مذہبی تعلیمات کے مطابق ان

کے لئے غذا فراہم کی جائے گی، ایسے ہی وہ جس مذہب پر عقیدہ رکھتے ہیں، اس مذہب کی مقدس شخصیتوں اور کتابوں وغیرہ کی بے احترامی سے گریز لازم ہے، مذہبی امور کی انجام دہی کی مکمل آزادی کی بنیادی دلیل قرآن کریم کا یہ بیان ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے دعوت وتبلیغ کا کام قید خانہ میں بھی جاری رکھا، قرآن کریم حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت کے اس پہلو کو اس طرح پیش کرتا ہے:

"یا صاحبي السجن أأرباب متفرقون خير أم الله الواحد القهار. ما تعبدون من دونه إلا أسماء سميتموها أنتم وآبائكم. ما أنزل الله بها من سلطان. إن الحكم إلا لله. أمر ألا تعبدوا إلا إياه. ذلك الدين القيم. ولكن أكثر الناس لا يعلمون" (يوسف: ۴۰-۳۹)

(اے زنداں کے میرے دونوں ساتھیو! کیا الگ الگ بہت سے رب بہتر ہیں، یا اکیلا اللہ ہی جو سب پر غالب ہے، اس کو چھوڑ کر تم جن کی پوجا کر رہے ہو، وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں، جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ چھوڑے ہیں، اللہ نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری، اختیار واقتدار صرف اللہ ہی کا ہے، اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا کسی کی پوجا نہ کرو، یہی سیدھا طریق زندگی ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں)۔

امام ابو یوسف حکومت کی ذمہ داری قرار دیتے ہیں کہ قیدیوں کی دیکھ بھال اور رعایت کرے، ان کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرے اور ان پر بلکہ فقہاء کرام کی رائے ہے کہ قاضی عہدہ سنبھالنے کے بعد سب سے پہلا کام یہی کرے گا کہ قیدیوں کے معاملات پر غور کرے گا، ہدایہ میں ہے:

"وينظر في حال المحبوسين لأنه نصب ناظرا" (الهداية ۳/۱۰۲، ط: دار احياء التراث العربي، بيروت)

(قاضی قیدیوں کے احوال پر غور کرے گا، کیوں کہ وہ نگراں بنایا گیا ہے) بلکہ بعض فقہاء نے اسے واجب قرار دیا ہے۔

(دیکھئے حاشیۃ الدسوقی علی شرح الکبیر للدسوقی المالکی ۶/۱۶-۱۷)۔

ان فقہی جزئیات سے معلوم ہوا کہ قیدیوں کے ساتھ کسی طرح کی زیادتی درست نہیں، لہذا ان کو مذہبی امور کی مکمل آزادی فراہم کی جانی چاہئے۔

ب-۱- قید کا اصل مقصد قیدیوں کو تصرفات سے روکنا ہے (الطرق الحکمیۃ/ص ۱۰۲) اور ان کو تنگی میں ڈالنا ہے، تاکہ جرائم سے باز رہیں، لہذا اس بنیادی مقصد سے جو حقوق متصادم نہ ہوں وہ ان کو فراہم کئے جائیں گے، لہذا جسمانی ضروریات جیسے مناسب غذا، صاف پانی، علاج کی سہولت اور حفظان صحت کے لئے ورزش وتفریح کی ان کو اجازت دی جائے گی، ابو یوسف تحریر کرتے ہیں:

"ولم تزل الخلفاء يا أمير المؤمنين! ما يقوتهم في طعامهم وأدمهم، وكسوتهم الشتاء والصيف" (الخراج، ص ۱۴۹)

(امیر المومنین! خلفاء برابر قیدیوں کے لئے سردی اور گرمی کے مناسب حال غذا اور لباس کا نظم کرتے رہے ہیں)

"رد المحتار" میں ہے: "لمداواة مرضه لإمكان ذلك في السجن" (رد المحتار ۸/۵۷)

(یعنی قیدی قید خانہ سے باہر نہیں نکلے گا، کیوں کہ علاج جیل میں ممکن ہے) اور اگر علاج وہاں ممکن نہ ہو، تو باہر جا سکتا ہے، یہی شافعیہ اور مالکیہ کے کلام سے ظاہر ہے اور اسی کی طرف خصاف اور ابن ہمام کا میلان ہے (فتح القدیر ۵/۴۵، شرح ادب القاضی للخصاف ۲/۱۷۵)۔

لیکن حنفیہ کے نزدیک مفتی بہ یہ ہے کہ کفیل کی ضمانت کے ساتھ نکل سکتا ہے (الدر المختار ۸/۵۷)۔

لیکن یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ فقہاء نے اپنے زمانہ کے اعتبار سے بات کی ہے، میری رائے ہے کہ اس دور میں حکومت پر علاج کی سہولیات فراہم کرنا لازم ہے، کیوں کہ قید کا مقصد ہلاک کرنا نہیں ہے۔

۲- جہاں تک بیوی سے تعلق کا مسئلہ ہے، تو اس سلسلہ میں فقہاء کی رائیں مختلف ہیں:

ا- بیوی سے تعلق قائم کرنے کی مناسب جگہ قید خانہ میں ہو کہ دوسرے کی نظر نہ پڑے، تو قیدی کو بیوی سے تعلق قائم کرنے سے نہیں روکا جائے گا، یہ اکثر حنفیہ، بعض شافعیہ اور حنابلہ کا مذہب ہے، رد المحتار میں ہے:

"إذا احتاج للجماع، دخلت عليه زوجته أو أمته، إن كان فيه موضع سترة" (ردالمحتار نقلا عن النهر ۸/۵۶)
(اگر قیدی کو جماع کی ضرورت ہو تو اس کے پاس اس کی بیوی یا باندی جائے گی، اگر قیدخانہ میں محفوظ جگہ ہو)، اور مغنی میں ہے:

"وإن حبس الزوج فأحب القسم بين نسائه، بأن يسترعي كل واحدة في ليلتها، فعليهن طاعته إن كان ذلك مثلهن" (المغنی ۸/۱۴۸، ط: المكتبة التجارية مكة المكرمة)

(اگر شوہر قید ہو جائے، اور اس نے بیویوں کے درمیان عدل کرنا چاہا، اس طرح کے ہر ایک کو اس کی رات میں بلائے، تو ان پر اس کی اطاعت لازم ہے، اگر وہ جگہ ان جیسی عورتوں کی رہائش گاہ کے مثل ہو)۔

۲- بیوی سے تعلق قائم کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی، کیوں کہ قید کا مقصد قیدی کے دل میں وحشت پیدا کرنا ہے، تاکہ وہ جرائم سے باز آجائے، جب کہ لذت اندوزی اور عیش وعشرت کے ساتھ دل میں وحشت پیدا کرنا ممکن نہیں اور وطی کھانے کی طرح اصلی اور بنیادی ضروریات میں سے نہیں ہے، یہ مالکیہ، بعض شافعیہ اور حنفیہ کا مسلک ہے (تبصرۃ الحکام لابن فرحون المالکی ۲/۲۰۵، معید النعم للسبکی ص ۱۰۹، فتح القدیر ۵/۴۷۱، الفتاوی الہندیہ ۳/۴۱۸، الفتاوی البزازیہ ۵/۲۲۵)۔

۳- بیوی سے جماع قیدی کا مشروع حق ہے، لیکن قاضی کسی مصلحت کی بنا پر اس سے روک سکتا ہے، یہ بعض شافعیہ کا مسلک ہے (حاشیۃ الشبر املسی ۴/۳۲۴، ط: مصطفی البابی الحلبی)۔ میری رائے میں حکومت پر لازم ہے کہ قیدخانہ میں مناسب جگہ کی تعمیر کرائے، جہاں قیدیوں کو چار ماہ میں ایک بار مہذب اور پردہ پوش طریقہ سے اپنی جنسی خواہش پوری کرنے کا موقع دیا جائے۔

۳- ایسی تنگ جگہ میں قیدیوں کو رکھنا جہاں کھڑا ہونا، یا پاؤں پھیلا کر لیٹنا ممکن نہ ہو، جائز نہیں ہے، چنانچہ امام ابویوسفؒ نے دھوپ میں کھڑا کرنے کی سزا کو حرام قرار دیا ہے (الخراج/۱۲۵)۔

۴- ایسی تنگ وتاریک جگہ میں قیدی کو رکھنا کہ دیوار کے باہر کسی چیز کو دیکھنا ممکن نہ ہو، اسی طرح اگر وہ جگہ ایسی ہو کہ قیدی کا دم گھٹتا ہو، تو ناجائز ہے (الخراج/۱۱۸)۔

ج- عام حالات میں عام سماجی حقوق، جیسے اخبارات پڑھنے، ریڈیو سننے، فون پر احباب واقارب سے بقدر ضرورت مشورہ وگفتگو کرنے، دوسرے قیدیوں سے ملاقات، قیدخانہ میں تعلیم وتعلم اور ہنر سیکھنے کی اجازت دی جاسکتی ہے، "الدر المختار" میں ہے:

" ولا يمكن أحد أن يدخل عليه للاستئناس، إلا أقاربه وجيرانه، لاحتياجه للمشاورة، ولا يمكثون عنده طويلا، بحيث يحصل له الاستئناس بهم، بل بقدر ما يحصل به المقصود من المشاورة" (الدرالمختار مع ردالمحتار ۸/۵۵)

(کسی کو اس کے پاس انسیت کی خاطر آنے کی قدرت نہ دی جائے گی، مگر اس کے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو آنے دیا جائے گا، کیوں کہ اسے مشورہ کرنے کی ضرورت ہے، لیکن وہ زیادہ دیر اس کے پاس نہیں ٹھہریں گے، اس طرح کہ اسے ان سے انسیت حاصل ہو، بلکہ اتنی دیر ٹھہریں گے کہ مشورہ کا مقصد اس سے حاصل ہو جائے)۔

جہاں تک تعلیم وتعلم کا تعلق ہے، تو خود بعض صحابہ کرام نے بدر کے قیدیوں سے کتابت سیکھی تھی۔

لیکن اگر یہ چیزیں جرائم کی شدت کے لحاظ سے قید کے مقصد (یعنی مجرمین کو وحشت کا احساس ہو، اور وہ جرائم سے باز رہیں) کے خلاف ہو تو پھر عام سماجی حقوق سے ان کو محروم بھی رکھا جاسکتا ہے، مبسوط میں ہے:

"ولهذا قالوا: ينبغي أن يحبس في موضع خشن، لا يتبسط له في فراش ولا وطاء ولا أحد يدخل عليه ليستأنس ليضجر قلبه بذلك" (المبسوط ۲۰/۱۰۷، ط: داراحیاء التراث العربي بیروت ۲۰۰۲م)

(اسی وجہ سے فقہاء نے کہا ہے کہ مجرم کو کھردری جگہ میں رکھا جائے، اسے نرم گداز بستر نہ دیا جائے اور نہ اس کے پاس کوئی ایسا آدمی جائے جس سے وہ انسیت حاصل کرے، تاکہ اس کے دل میں اکتاہٹ پیدا ہو)۔

ردالمحتار میں ہے: ''وفي شرح أدب القضاء عن السرخسي أنه الصحيح من المذهب لأن الحبس مشروع ليضجر. ومتى تمكن من الاكتساب لايضجر، فيكون السجن له بمنزلة الحانوت'' (ردالمحتار ۸/۵۷)

(قید خانہ میں اسے کمائی کرنے کی اجازت نہ ہوگی، یہی صحیح مذہب ہے، اس لئے کہ قید اکتاہٹ پیدا ہونے کے لئے مشروع ہے اور جب اسے کمائی کی قدرت ہوگی، تو اکتاہٹ میں وہ مبتلا نہ ہوگا، پھر تو قید خانہ اس کے لئے دوکان کے درجہ میں ہو جائے گا)۔

ان فقہی جزئیات سے معلوم ہوا کہ مخصوص حالات میں عام سماجی حقوق سے قیدیوں کو محروم بھی کیا جاسکتا ہے۔

و- ۱-فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عورتوں کے لئے علیحدہ قید خانہ ہو، کیوں کہ مرد وعورت کا اختلاط باعث فتنہ ہے، الدر المختار میں ہے: ''ويجعل للنساء سجن على حدة نفيا للفتنة'' (الدرالمختار ۸/۵۸) (فتنہ سے بچنے کے لئے عورتوں کے لئے الگ قید خانہ بنایا جائے گا)۔

۲- بالغوں اور نابالغوں اور خنثی مشکل کے لئے الگ قید خانے بنائے جائیں گے (حاشیۃ الدسوقی ۳/۲۸۰، حاشیۃ الصعیدی علی کفایۃ الطالب ۲/۲۰۱)۔

واضح رہے کہ نابالغ کو بہ طور تادیب قید کیا جائے گا، مبسوط میں ہے:

''وبعضهم قال: الحبس للصبي بطريق التأديب، حتى لا يتجاسر على مثله، ولكن هذا إنما يكون فيما يباشر من أسباب التعدي قصدًا، أما ما وقع خطأ منه فلا'' (المبسوط ۲۰/۱۰۸)

(بعض کہتے ہیں کہ بچہ کو بہ طور تادیب قید کیا جائے گا، تاکہ اس جیسی حرکت پر اسے دوبارہ جسارت نہ ہو، لیکن یہ اسی صورت میں ہوگا جس میں بچہ زیادتی کے اسباب قصداً انجام دے، لیکن جو چیز اس سے بہ طور خطا ہو، تو اس میں بہ طور تادیب قید نہیں کیا جاسکتا ہے)، معاملات مالیہ کی طرح جرائم بھی نابالغ کو بہ طور تادیب قید کیا جاسکتا ہے اور اکثر نصوص فقہیہ سے پتہ چلتا ہے کہ نابالغ کو باپ یا ولی کے گھر میں قید کیا جائے، لیکن قید خانہ میں بھی قید کیا جاسکتا ہے، مگر یہ کہ اس کے بگڑنے کا خطرہ ہو تو لازم ہے کہ اسے باپ کے پاس قید کیا جائے (حاشیۃ الدسوقی ۲/۲۸۰، بدائع الصنائع ۷/۶۳، ط: دارالکتب العلمیۃ، بیروت)۔

۳- (الف) قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے ان کو اس طرح بے لباس کردینا کہ ستر کھل جائے، حرام ہے، ''الدر المختار'' میں ہے: ''ولا یجرد'' اور ''ردالمحتار'' میں ہے: ''أي من ثيابه في الحبس'' (الدر المختار ورد المحتار ۸/۵۸) (قیدی کو قید میں برہنہ نہیں کیا جائے گا)۔

ب-قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے معمولی درجہ میں مار پیٹ کی اجازت ہے، بنیادی دلیل وہ حدیث ہے جس میں منقول ہے کہ حیی بن اخطب کے چچا ''سعیہ'' نے حیی کے سونے اور زیورات کے ذخیرہ کو جس کی مالیت دس ہزار دینار تھی، غزوہ خیبر کے موقع سے چھپالیا اور آپ ﷺ کے دریافت کرنے پر جواب دیا ''أذهبته النفقات والحروب'' (اسے اخراجات اور جنگوں نے ختم کردیا ہے) اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''العهد قريب، والمال أكثر من ذلك'' (اسے بنی النضیر کی جلاوطنی کے موقع سے مدینہ منورہ سے خیبر لانے پر زیادہ زمانہ نہیں گزرا ہے اور مال اس سے زیادہ ہے کہ اخراجات میں ختم ہوجائے)۔

پھر آپ نے سعیہ کو حضرت زبیر کے حوالہ کیا اور انہوں نے اسے ہلکی ضرب لگائی اور اس نے سچی بات اگل دی اور مال کی جگہ بتادی (ابو داؤد، کتاب الامارۃ، باب ماجاء فی حکم أرض خیبر باسناد قوی، حدیث نمبر: ۳۰۰۶، جامع الأصول لابن الأثیر الجزری ۲/۶۴۳، ط: دارالسلاح، وعزاہ الی البخاری)۔

ماوردی تحریر کرتے ہیں: ''يجوز للأمير مع قوة التهمة أن يضرب المتهوم ضرب التعزير. لاضرب الحد. ليأخذه بالصدق عن حاله، فيما قرف به واتهم، فإن أقر، وهو مضروب، اعتبرت حاله فيما ضرب عليه، فإن ضرب ليقر، لم يكن لإقراره تحت الضرب حكم، وإن ضرب ليصدق عن حاله وأقر تحت الضرب، قطع ضربه، واستعيد إقراره، فإذا أعاده كان مأخوذا بالإقرار الثاني، دون الأول'' (الأحكام السلطانيه/۲۲۰)

(امیر کے لئے جائز ہے کہ الزام قوی ہونے کی صورت میں ملزم کو تعزیری ضرب لگائے، نہ کہ حد ضرب، تا کہ سچی صورت حال بیان کرنے کا اسے پابند بنا سکے، اس جرم کے سلسلہ میں جس کا اس نے ارتکاب کیا ہے اور جس سے اسے متہم قرار دیا گیا ہے، پھر اگر اس نے مار پیٹ کی حالت میں اقرار کیا، تو ضرب کے مقصد کے لحاظ سے اس کی حالت کا اعتبار ہوگا، تو اگر اقرار ہی کے لئے اسے مارا گیا، تو مار کی حالت کے اقرار کے لئے کوئی حکم نہ ہوگا اور اگر اپنی صحیح حالت بیان کرنے کے لئے اسے مارا گیا اور اس نے مار کی حالت میں اقرار کیا، تو مار بند کر دی جائے گی اور اس سے دوبارہ اقرار لیا جائے گا، اگر اس نے دوبارہ اقرار کر لیا تو دوسرے اقرار کی وجہ سے ماخوذ ہوگا اور پہلے اقرار کا کوئی اعتبار نہ ہوگا)۔ تعزیر پر قیاس کرتے ہوئے امام احمد کے ایک قول کے مطابق کہ تعزیر دس کوڑے سے زائد نہ ہو (المغنی ۱۰ / ۳۴۲) اس مار پیٹ کی بھی یہی حد مقرر کی جاسکتی ہے، اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''لا يجلد أحد فوق عشرة أسواط، إلا في حد من حدود الله'' (بخاری، کتاب الحدود، باب کم التعزیر والأدب، حدیث نمبر: ۶۸۴۸)

(اللہ تعالیٰ کی حد کے سوا کسی کو دس کوڑے سے زیادہ نہ مارا جائے)۔

یا حنفیہ کے مسلک کے مطابق ۳۹ کوڑے کے ساتھ اس کی تحدید کی جاسکتی ہے۔

ج- قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے انہیں الکٹرک شاک لگانا حرام ہے، امام ابو یوسفؒ نے دھوپ میں کھڑا کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے، تو الکٹرک شاک لگانا کیسے جائز ہوسکتا ہے؟ (الخراج / ص ۱۰۹، ضمن موسوعۃ الخراج)۔

د- قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے ان پر کتے چھوڑنا بھی حرام ہے، امام مالک سے پوچھا گیا کہ قیدی کو تیل اور گبریلے (بھونرے کی مانند پردار کالا کیڑا جو گوبر میں ہوتا ہے) کے ذریعہ سزا دی جاسکتی ہے تو آپ نے جواب دیا، حلال نہیں، سزا یا تو کوڑا ہے یا قید ہے (اسنی المطالب ۴ / ۹، تبصرۃ الحکام ۲ / ۱۴۷)۔

ھ- قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈال دینا بھی حرام ہے (نہایۃ المنتہی للکرمی ۳ / ۳۱۷، الفتاویٰ الہندیہ ۳ / ۴۱۴، التراتیب الاداریہ للکتانی ۱ / ۲۹۵، اسنی المطالب ۴ / ۴، و ۴۶، الانصاف ۹ / ۴۳۹، المغنی ۷ / ۶۴۳، شرح المحلی مع حاشیۃ القلیوبی ۴ / ۹۷، ۲۰۵، الخراج / ص ۱۰۹)۔

و- قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے انہیں مسلسل جگے رہنے پر مجبور کرنا اور اس کے لئے ان کی جائے رہائش میں تیز روشنی، یا تیز آواز کا انتظام رکھنا حرام ہے، فقہاء نے صراحت کی ہے کہ قیدی کو کھانے پینے اور قضائے حاجت سے روکنا ناجائز ہے، اسی طرح گرم وسرد جگہ یا دھوپ میں رکھنا، یا دھویں دار گھر میں بند کر کے روشن دان بند کر دینا حرام ہے، اسی طرح سردی میں سردی سے بچاؤ کے لباس چھین لینا یا نہ فراہم کرنا بھی حرام ہے (الأحکام السلطانیہ / ص ۲۳۹، التراتیب الاداریہ للکتانی ۱ / ۲۹۵)۔

۴- ۱- قید خانہ میں بیڑی ڈال کر یا ہتھکڑی پہنا کر رکھنا درست نہیں ہے، مگر یہ کہ فرار یا مجرم کے شر کا خطرہ ہو، الدر المختار میں ہے: "ولا يغل إلا إذا خاف فراره، فيقيد" (الدر المختار ۸ / ۵۸) (قیدی کی گردن میں بیڑی نہ ڈالی جائے گی، مگر جب کہ فرار کا خطرہ ہو، تو پیر میں بیڑی ڈالی جا سکتی ہے)۔

لیکن اس دور میں فرار کا خطرہ نہیں لہذا زنجیر میں جکڑ کر رکھنا درست نہ ہوگا۔

۲- قید کرتے وقت قیدی کو ہتھکڑی پہنائی جاسکتی ہے، بخاری شریف کی ایک حدیث میں ہے:

''عجب الله من قوم يدخلون الجنة في السلاسل'' (صحیح البخاری کتاب الجهاد، باب الأساری فی السلاسل، حدیث نمبر: ۳۰۱۰)

(اللہ تعالیٰ ایسی قوم سے خوش ہے، جن کے جنت میں داخل ہونے کا سبب زنجیر بن جائے)

ابن جوزی کہتے ہیں: ''معناه أنهم أسروا وقيدوا، فلما عرفوا صحة الإسلام، دخلوا طوعا، فدخلوا الجنة'' (فتح الباری ۶ / ۱۷۶) (مفہوم یہ ہے کہ ان لوگوں کو قید کر کے بیڑی ڈال دی گئی، پھر وہ اسلام کے صحیح ہونے سے آگاہ ہوئے اور خوشی سے اسلام میں داخل

ہو گئے، لہذا جنت میں داخل ہو گئے)۔

۵- کسی مجرم کو اس کے خصوصی جرم کے پس منظر میں قید تنہائی دی جاسکتی ہے:

"ویجوز للحاکم عزل السجین، وحبسه منفردا فی غرفة، یقفل علیه بابها، إن کان فی ذلك مصلحة" (فتاوی ابن تیمیه ۳۱۰/۱۵، المغنی ۱۲۴/۸، التراتیب الاداریه للکتانی ۲۹۵/۱، الانصاف لابن ہبیرہ ۳۹/۱)

(حاکم کے لئے جائز ہے کہ قیدی کو علیحدہ رکھے اور خاص کمرہ میں تنہا رکھ کر اس کا دروازہ بند کر دے اگر اس میں مصلحت ہو)۔

۶- قدیم عہد میں فقہاء نے جو بحث کی ہے وہ یہ ہے کہ قیدی کو کام کی قدرت دی جائے گی یا نہیں؟ اور ان کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) قیدی کو کام کی قدرت دی جائے گی، یہ شافعیہ، حنابلہ اور بعض حنفیہ کا مذہب ہے (المغنی ۴/ ۴۹۵، واسنی المطالب مع حاشیة الرملی ۲/ ۱۸۸-۱۸۹، و۱۹۴، الفتاوی الہندیہ ۳/ ۴۱۸)۔

(۲) کام کی قدرت نہ دی جائے گی، تاکہ قید کا مقصد فوت نہ ہو اور اس کا دل قید سے گھبرائے، پھر وہ جرم سے باز رہے، حنفیہ کے نزدیک یہی معتمد مذہب ہے (الفتاوی الہندیہ ۳/ ۴۱۸)۔

(۳) کام کی قدرت دی جائے یا نہ دی جائے، یہ حاکم کی صوابدید پر ہے، یہی مرتضی شیعی کا قول ہے (البحر الزخار ۵/ ۸۲)۔

لیکن اس دور میں جبراً کام سزا کے طور پر لیا جاتا ہے اور یہ سزا کا ایک حصہ ہے، لہذا جو لوگ تعزیر بالمال کو جائز سمجھتے ہیں ان کے یہاں یہ جائز ہونا چاہئے اور کام کی اجرت سرکاری خزانہ کی ملکیت سمجھی جائے گی۔

واضح رہے کہ ابوحنیفہ، محمد اور امام شافعی جدید مذہب کے لحاظ سے اور حنابلہ تعزیر بالمال کو نامشروع سمجھتے ہیں، جب کہ اگر مصلحت ہو تو ابو یوسف اور امام مالک کا مشہور مسلک یہ ہے کہ تعزیر کے طور پر مال لینا جائز ہے، جب کہ ابن تیمیہ اور ابن قیم تعزیر کے طور پر مال لینے اور ضائع کر دینے کو بھی جائز سمجھتے ہیں

(ردالمحتار ۶/ ۱۰۵-۱۰۶، الزیلعی ۳/ ۲۰۸، حاشیۃ الشبراملسی علی نہایۃ المحتاج ۷/ ۱۷۴، والحسبہ/ ۴۰، تبصرۃ الحکام ۲/ ۳۶۷-۳۶۸، الطرق الحکمیہ/ ۲۵۰، کشاف القناع ۴/ ۷۴-۷۵، الاحکام السلطانیہ لأبی یعلی/ ۲۹۵)۔

۷- جن قیدیوں کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے اور جن کے بارے میں سزائے قید کا فیصلہ ہو چکا ہے، ان دونوں میں سلوک کے اعتبار سے فرق کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ جس کا جرم ثابت ہو چکا ہے اور جس کے جرم کے ثبوت کا احتمال ہے، دونوں میں فرق ہے، لہذا سلوک میں بھی فرق ہو سکتا ہے۔ خود فقہاء نے صراحت کی ہے کہ ہر قیدی کے ساتھ اس کے جرم کے مناسب سلوک ہونا چاہئے، چنانچہ مالی معاملات جیسے قرض میں محبوس اور جرائم میں محبوس میں فرق کیا جائے گا اور مدیون کو چور کے ساتھ ایک جگہ نہیں رکھا جائے گا (ردالمحتار ۸/ ۵۸، الفتاوی الہندیہ ۳/ ۴۱۳)۔

۸- اسلامی شریعت زیر سماعت قیدیوں کے معاملات جلد نپٹانے کی تاکید کرتی ہے اور یہی عدل وانصاف کا تقاضہ ہے، لہذا قوی شواہد کے بغیر کسی کو قید میں رکھنا درست نہیں ہے، البتہ اگر قوی شواہد پائے جانے کی وجہ سے کسی کو قید میں رکھا گیا اور ضمانت پر اس کی رہائی معاشرہ کے لئے خطرناک ہو، تو ایسی صورت میں اسے قید میں رکھا جاسکتا ہے، البتہ فیصلہ میں تاخیر کو اسلامی شریعت پسند نہیں کرتی ہے، امام ابو یوسف تحریر فرماتے ہیں:

"فمر ولاتك جمیعا بالنظر فی أمر أهل المحبوس، فی كل أیام، فمن كان علیه أدب، أدب وأطلق ومن لم یكن له قضیة، خلی عنه" (الخراج، ص ۱۵۱) (آپ اپنے تمام حکام کو ہر روز قیدیوں کے معاملات میں غور کرنے کا حکم دیجئے، جو قابل سزا ہو، اسے سزا دے کر رہا کر دیا جائے اور جس کا معاملہ نہ بنتا ہو اسے چھوڑ دیا جائے)۔

عالمگیری میں ہے: "ویحبس الدعارون، الذین هم مخوفون علی المسلمین، وأهل الفساد، حتی تعرف منهم التوبة، والدعار من یقصد إتلاف أموال الناس، أو أنفسهم أو كلیهما، فإذا كان یخاف علی الناس منه فی النفس والمال.

حبس في السجن، حتى تظهر منه التوبة'' (الفتاوى الهنديه ۲/۲۱۴، ط: داراحياء التراث العربي، بيروت ۱۹۸۰)

(شرپسند عناصر کو جو مسلمانوں کو ہراساں کرنے والے ہوں، نیز اہل فساد کو قید میں رکھا جائے گا، جب تک وہ تائب نہ ہوجائیں، شرپسند وہ ہے جو لوگوں کے مال یا جان یا دونوں ضائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، اگر اس کی طرف سے لوگوں کے سلسلہ میں جان و مال کا خطرہ ہو تو اسے اصلاح حال اور تائب ہونے تک قید میں رکھا جائے گا)۔

اس سے معلوم ہوا کہ خاص صورتوں میں زیر ساعت قیدیوں کو ان کے اوپر عائد فرد جرم کی اصل سزا کی مدت تک قید میں رکھا جاسکتا ہے لیکن خواہ مخواہ بغیر معقول شواہد کے کسی کو قید میں رکھنا اسلامی شریعت جائز نہیں قرار دیتی ہے (الطرق الحکمیۃ ص ۱۰۱-۱۰۴)

جب کہ بعض فقہاء حنفیہ وشافعیہ وحنابلہ کے نزدیک ایسے فرد جرم میں جس کی اصل سزا قید ہے، بغیر کامل ثبوت کے ملزم کو قید میں رکھنے کو جائز نہیں قرار دیتے ہیں (ردالمحتار ۸/ ۶۵-۶۷، بدائع الصنائع ۷/ ۶۵، المغنی لابن قدامہ ۹/ ۳۲۸، تبصرۃ الحکام ۱/ ۲۰۷)۔

۹- فساد زمانہ کو دیکھتے ہوئے ملزم کو زمانہ قید میں ہونے والی ذہنی اذیت کی وجہ سے مالی ہرجانہ طلب کرنے کا حق ہے اور یہ مالی معاوضہ یا تو حکومت خود ادا کرے، یا جس محکمہ کی غلطی سے اسے قید کی اذیت جھیلنی پڑی، اس معاوضہ کو اس کے ذمہ ڈالا جائے۔

ذہنی اذیت یا حکومت یا اس کے عملہ کی طرف سے ناحق قید کئے جانے پر مالی معاوضہ طلب کرنے کے سلسلہ میں فقہی کتب میں کوئی جزئیہ نہیں ملا، البتہ مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک اگر کوئی شخص کسی آزاد کو قید کرلے اور اس کے منافع کو معطل کردے تو وہ شخص مدت قید کی اجرت مثل کا ضامن ہوگا، لیکن صحیح قول کے مطابق شافعیہ کے نزدیک ضامن نہیں ہے، ہاں البتہ اس سے جبری کام لے تو اجرت مثل کا ضامن ہوگا۔

(الدسوقی ۳/ ۴۵۴، وروضۃ الطالبین ۵/ ۱۳-۱۴، وکشاف القناع ۴/ ۱۱۱-۱۱۲)۔

۱۰- قیدی کو اپنے مقدمات کے سلسلہ میں وکیل سے رابطہ قائم کرنے، صلاح ومشورہ کرنے اور حقیقت حال سے باخبر کرنے کی مکمل آزادی ہے، وہ اپنی مصلحت کے پیش نظر ایک یا ایک سے زائد وکیل مقرر کرسکتا ہے۔

یہ قیدی کا بنیادی حق ہے، اس سے کسی بھی قیدی کو محروم نہیں کیا جاسکتا ہے، ردالمحتار کے حوالہ سے یہ جزئیہ گزر چکا ہے کہ قیدی کو اپنے عزیز واقارب سے صلاح ومشورہ کا حق ہے، یہی حکم وکیل سے صلاح اور مشورہ کا بھی ہے، لہذا حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وکیل سے ملنے، مشورہ کرنے اور حقیقت حال سے باخبر کرنے کے مواقع قیدی کو فراہم کرے اور قیدی اور وکیل کے درمیان کسی طرح کی رکاوٹ نہ کھڑی کرے۔

۱۱- اگر شیر خوار بچہ ماں کے علاوہ کسی کا دودھ نہ لے، یا اس کا باپ اس قابل نہ ہو کہ کسی عورت کو دودھ پلانے کے لئے اجرت پر رکھ سکے تو ایسی صورت میں خواتین قیدیوں کو شیر خوار بچوں کو جیل میں رکھنے کا حق ہوگا، کیوں کہ جب معتمد قول کے مطابق احناف کے نزدیک بیوی کو شوہر کے پاس جماع کے لئے جانے کی اجازت دی جائے گی، تو پھر خواتین قیدی کو بھی شیر خوار بچہ اپنے ساتھ جیل میں رکھنے کی اجازت دی جائے گی۔

☆☆☆

اسلام میں قیدی کے حقوق

مفتی ارشد فاروقی [1]

کہتے ہیں کہ قدیم جہالت جدید روپ دھار رہی ہے تو پھر آج کی ترقی یافتہ دنیا کی جیلوں کی صورت حال جاہلی دور کا نیا چہرہ پیش کر رہی ہے، گوانتانا موبے، کیوبا، چھتیس ہزاری کشمیر کے قید خانے ماضی وعہد قدیم کی یاد ہی تازہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ اضافے کر رہے ہیں۔

شریعت اسلامی کا عادلانہ نظام عالم میں امن وامان کی بقا، عام شہریوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے ایسے لوگوں کے لئے موزوں ومناسب سزائیں تجویز کرتا ہے جو نقص امن کا ذریعہ بنتے ہوں یا لوگوں کو نقصان پہنچانے کے درپے ہوں یا اخلاقی مجرم ہوں۔

اسلام نے سزؤاں کی دو تقسیم کی ہے، پہلی ''حدود'' کہلاتی ہیں:

۱- سزا کی حد متعین کردی ہے۔

الف- جیسے شادی شدہ وغیر شادی شدہ زانی وبدکار کی سزائیں "الزانية والزاني فاجلدوا كل واحد منهما مائة جلدة" (سورۂ نور: ۲)۔

ب- چوری کی سزا "السارق والسارقة فاقطعوا أيديهما" (سورۂ مائدہ: ۳۸)۔

ج- تہمت لگانے کی سزا "يرمون المحصنات" (سورۂ نور: ۴)۔

د- شراب نوشی کی سزا۔

۲- سزا کی حد متعین نہیں کی ہے، یہ سزائیں تعزیر کہلاتی ہیں۔

تعزیر ان جرائم کے مرتکبوں کی کی جاتی ہے جن کے بارے میں شریعت نے سزا کی کوئی مقدار وحد متعین نہیں کی ہے۔

''تعزیر'' بھی قرآن کریم میں ثابت ہے: "واهجروهن في المضاجع واضربوهن" (النساء ۳۴) بیوی کی تادیب کے لئے خوابگاہ کی علیحدگی یا تادیبی کارروائی تعزیر ہی کے قبیل سے ہے۔

''تعزیر'' کا ثبوت فعلی وقولی احادیث اور اجماع امت سے ثابت ہے، ہر اس بڑے جرم پر جاری ہوگی جس کی شریعت نے ''حد'' متعین نہ کی ہو۔

تعزیر کی مختلف صورتیں ہیں:

الف- حراست میں لینا۔ ب- زدوکوب کرنا۔ ج- ملامت کرنا۔ د- ڈرانا دھمکانا۔ ہ- مالی جرمانہ عائد کرنا (اس شق میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے) (سياسة وأدب العقاب في التشريع الاسلامي: مجلة الأزهر جلد ۲، ط ۱۹۶۲ جاد الحق)۔

بطور تعزیر حراست وقید میں ملزم ومجرم کو رکھنا باتفاق ائمہ وعلماء درست ہے۔ حدیث سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کو محبوس رکھا۔

فقہاء کرام نے ایسے جرائم کی فہرست جاری کی ہے جن میں قید کی سزا مقرر کی گئی ہے۔

(۱) قتل کا ملزم۔ (۲) چوری کا ملزم۔ (۳) مار پیٹ کرنے والا۔ (۴) شراب پینے کی نیت سے محفل سجانے والے۔ (۵) مخنث۔ (۶) نوحہ خواں (مرد وعورت)۔

---

[1] جامعہ امام انور دیوبند۔

(۷) بوس وکناراور چھیڑ خوانی کرنے والے۔(۸) تہمت لگانے والے۔(۹) مسلمان سودخور۔

ان مجرموں اور ملزموں کو بطور تعزیر زیر حراست قید خانے میں رکھا جائے گا، یہ بھی حقیقت ہے کہ ان مجرموں کو جیل میں کتنی مدت کے لئے رکھا جائے اس کی کوئی متعین مدت نہیں کی گئی بلکہ حاکم وقت یا قاضی وحسبٰس کی صوابدید پر موقوف ہے، وہ حالات کا تجربہ کرے محبوس کی سیرت وشخصیت سے اندازہ لگائے کہ کسے کتنی مدت اصلاح حال کے لئے کافی ہوسکتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ''قید وبند'' مکافات وسزا کی ایک قسم ہے جس پر فقہاء کا اجماع ہے اور احادیث وعمل صحابہ سے ثابت ہے۔

قید وبند بطور سزا کی تنفیذ میں بھی شریعت نرم روی، ایذارسانی سے گریز کی ہدایت دیتی ہے۔ جو رسول اللہ ﷺ کے فرمان عالی سے ثابت ہے:

''إن الله كتب الإحسان على شئي فإذا قتلتم فأحسنوا القتلة وإذا ذبحتم فأحسنوا الذبحة'' (رواہ مسلم)۔

اس حدیث سے چند امور میں رہنمائی ملتی ہے:

(۱) قیدیوں کو ذلیل ورسوانہ کیا جائے۔ (۲) ایذاء رسانی سے گریز کیا جائے۔

(۳) قیدی کے ساتھ غیر انسانی سلوک نہ برتا جائے "ولقد كرمنا بني آدم" (اسراء/ ۷۰)۔

فقہاء نے قیدیوں کے حقوق کے بارے میں کہا کہ قیدی کو مندرجہ حقوق حاصل ہوں گے:

(۱) بیمار قیدی کے علاج معالجہ کی ذمہ دار حکومت ہوگی۔ (۲) قیدی کے اخراجات کی ذمہ دار حکومت ہوگی۔

(۳) بیمار قیدی کی دیکھ ریکھ کے لئے کوئی میسر نہ ہو تو اسے اس کے گھرانے کے حوالہ کیا جائے۔ (۴) قیدی کام کاج کے لئے باہر نہیں جا سکتا۔

(۵) جماعت، جمعہ وعیدین کے لئے نہیں نکل سکتا۔ (۶) کسی کی نماز جنازہ پڑھنے کے لئے نہیں نکل سکتا۔

(۷) تیمارداری۔ (۸) جیل سے باہر جا کر ملنا جلنا۔ (۹) مہمان نوازی۔

قیدی کو ان امور کی اجازت دی جائے گی

(۱) عزیزوں سے ملنے کا حق حاصل ہوگا۔ (۲) خرید وفروخت۔ (۳) ہبہ کرسکتا ہے۔ (۴) صدقہ کرسکتا ہے۔

تعزیر کے باب میں حاکم بالکل مطلق العنان نہیں ہوتا بلکہ اصولی طور پر ان قوائد وضوابط کا پابند ہوتا ہے جن کی تدوین فقہاء شریعت نے کی ہے۔

(۱) سزاؤں کی تجویز ومقدار شریعت کی مقررہ مصالح کے خلاف نہ ہو۔

(۲) سزا کا مقصد فساد وبدامنی کا خاتمہ ہو، انسان کی آزادی وآبرو پامال کرنا نہ ہو۔

(۳) سزا جرم کے بقدر ہو۔

(۴) سزا کی تنفیذ مساویانہ ہو تمام عدالتوں میں اس کی پابندی کی جائے۔

۱-تہمت کی بنیاد پر قید کرنا اور اس کی مدت

شریعت نے جن انسانی بنیادی حقوق کے تحفظ کا حکم دیا ہے ان میں سے ایک عزت نفس اور آبرو ہے، اور جب تک کسی انسان کا مجرم ہونا ٹھوس دلائل اور مطلوبہ شہادت کے ذریعہ ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک حد یا تعزیر کا نفاذ نہیں کیا جا سکتا۔

قید کرنا تعزیر کی ایک قسم ہے اس لئے جب تک ملزم کے جرم کا ثبوت مہیا نہ ہو اس وقت تک ملزم کو قید کی سزا دینا اس کی عزت وآبرو پر حملہ کرنا ہوگا جس کی شریعت میں اجازت نہیں۔

اگر قید کی ضرورت متقاضی ہو تو مدت قید کی تعیین حاکم کی صوابدید پر مبنی ہوگی یا جن ممالک میں بعض جرائم کی تعزیر کی تعیین کو قانونی شکل حاصل ہے وہاں اس کے مطابق عمل کی گنجائش ہے۔

۲- قیدیوں کو کیا حقوق حاصل ہیں؟

(الف) مذہبی امور-عبادت کرنا: عبادت کرنے کا حق قیدی کو حاصل ہے، وہ تمام آیات واحادیث جن سے عبادات کا وجوب ہوتا ہے بے اس کا مخاطب قیدی بھی ہے، نماز، روزہ، زکوۃ کا پابند ہے، حج قیدی کے لئے قید کی وجہ سے مؤخر رہے گا۔ جمعہ وعیدین واجب نہیں۔ البتہ جن جیلوں میں جمعہ وعیدین کا اہتمام کیا جاتا ہے وہاں ان میں شامل ہونا ضروری ہے۔

مذہبی کتابیں-قرآن کی تلاوت کا قیدی اسی طرح پابند ہے جس طرح وہ آزاد رہنے کی حالت میں پابند تھا "فاقرؤوا ما تيسر من القرآن" (سورۂ مزمل: ۲۰)، "اتل ما أوحي إليك" (سورۂ عنکبوت: ۴۵) تلاوت قرآن کے ساتھ کتب تفسیر واحادیث ودیگر متعلقہ کتابیں پڑھنے کا حق اسے حاصل ہے۔

دعوت دین-امر بالمعروف ونہی عن المنکر کسی مقام وفرد کے ساتھ مختص نہیں ہے، قیدی دین حق کی اشاعت کا اسی طرح مکلف ہے جس طرح غیر قیدی، بلکہ داعی قیدی جیل میں رہنے والوں کی سیرت سازی میں بنیادی کردار ادا کرسکتا ہے: "أدع الى سبيل ربك" (سورۂ نحل: ۱۲۵) کا حکم قیدی کو دعوت دین کا مکلف بناتا ہے۔

غذا کی فراہمی-قیدی کے لئے مذہبی تعلیمات کے مطابق غذا فراہم کرنا ضروری ہے، قیدی کے عقیدے اور مذہبی شخصیات اور مقدس کتابوں کی بے حرمتی خود ایک مجرمانہ عمل ہے اس سے گریز کرنا قیدی کے حق کا تقاضا ہے۔

ب-جسمانی ضروریات-قیدی کے حقوق میں یہ شامل ہے کہ اسے مناسب موزوں غذا، پینے کا پانی، وقت ضرورت علاج اور ایسا ماحول مہیا کیا جائے جس میں وہ ہلاکت وامراض سے محفوظ رہ سکے۔

رہائش کے لئے تنگ وتاریک جگہ فراہم کرنا انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے، ایسی جگہ جس میں بہ سہولت قیدی رہ سکے فراہم کرنا جیلر کی ذمہ داری ہے۔

جنسی تعلق-قیدی مرد ہو یا عورت اگر قیدی کی مدت طویل ہے تو انہیں جنسی تعلق قائم کرنے کے لئے انتظامات قید خانہ میں کئے جانے چاہیں کہ جنسی خواہش کی تکمیل بھی انسانی صحت اور بقاء نسل انسانی کے لئے ضروری ہے، اس لئے اگر مرد مقید ہو تو اسے بیوی سے ملنے کا حق حاصل ہے اسی طرح عورت اسیر ہو تو اسے شوہر سے ملنے کا حق حاصل ہے اور خلوت صحیحہ کا موقع فراہم کیا جانا چاہئے۔

''قیدیوں کے خلوت کے حقوق-اسلام کی نظر میں'' کے عنوان سے یہ بحث اسلامی دنیا میں سال گذشتہ چھڑی اس سلسلے میں مصر کے مفتی ڈاکٹر علی جمعہ نے ایک فتوی دیا:

فتوی کی اصل عبارت یہ ہے:

''يجوز شرعًا اختلاء المسجون بزوجته وكذلك الزوجة المسجونة بزوجها لممارسة الحقوق الشرعية الخاصة بالزوجين، وذلك لأن العقوبة في الإسلام شخصية لا تتعدى الجاني إلى غيره'' (رسالة القاهرة ''مطالب باجازة الخلوة الشرعية في سجون مصر'' جريدة العالم الاسلامي، العدد: ۱۸۵۸، الاثنين ۲۸ رجب ۱۴۲۵، ۱۳ ستمبر ۲۰۰۴، عبدالعظيم الباسل)۔

(قیدی مرد بیوی سے اور قیدی بیوی مرد سے شرعی طور پر خلوت میں مل سکتے ہیں تاکہ ازدواجی حقوق کی ادائیگی ہوسکے کیوں کہ اسلام میں سزا کا تعلق صرف اسی فرد سے ہوتا ہے جو مجرم ہے، اس میں دوسرے کی حق تلفی نہیں کی جاتی)۔

اس طرح جب بیوی مقید ہو تو اس کی وجہ سے شوہر کو اور جب شوہر مقید ہو تو اس کی وجہ سے بیوی کو ازدواجی حق سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

سماجی حقوق-قیدی کو سماجی حقوق بھی حاصل ہونے چاہئیں اخبارات پڑھنے، دوسرے قیدیوں سے ملاقات کرنے اور ایسے ہی فون کے ذریعہ احباب واقارب سے بات کرنے کا حق حاصل ہونا چاہئے جو حکام کی نگرانی میں ہو۔ تعلیم وہنر سیکھنے کے مواقع بھی مہیا ہونا چاہئے۔

اخلاقی امور-قیدیوں کے بارے میں اخلاقی اصول وضوابط کی حد بندی اور پابندی ضروری ہے، مردوں عورتوں کے لئے مخلوط نظام رہائش نہیں ہونا چاہئے، ویسے بھی بچوں کی جیل علیحدہ ہوتی ہے۔ صنفی آوارگی سے محفوظ رکھنے کے لئے ان حقوق کی رعایت ضروری ہے۔

۳- اقبال جرم کے لئے ڈرانے دھمکانے کی حدیں

الف-اگر کسی قیدی کے بارے میں غلبۂ ظن ہو کہ وہ کوئی راز یا قیمتی فارمولہ جسم کے کسی حصے پر چھپائے ہوئے ہے تو جامہ تلاشی لی جاسکتی ہے اور اس مقصد کے لئے بے لباس کرنے کی اجازت ہوگی۔

اس حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے جس میں رازدارانہ خط لے جاتی ہوئی ایک خاتون گرفتار کی جاتی ہیں اور ان سے خط طلب کیا جاتا ہے وہ انکار کرتی ہے پھر جامہ تلاشی کی دھمکی بے لباس کرنے بات کہی جاتی ہے بالآخر بنتی برراز مکتوب دستیاب ہوجاتا ہے۔

ابورافع کہتے ہیں کہ سیدنا علیؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یعنی مجھے، زبیر اور مقداد کو روانہ فرمایا اور حکم دیا: ''خاخ'' جاؤ، وہاں ایک لونڈی ایک خط لئے ہوئے ہوگی، وہ خط اس سے حاصل کرلیا جائے، ہم تیزی کے ساتھ سفر کرتے ہوئے اس لونڈی تک جا پہنچے اور مکتوب طلب کرنے لگے، وہ انکار کرتی رہی پھر ہم نے اس سے کہا: '' لتخرجن الكتاب أو لنلقين الثياب '' یہ کہنا تھا کہ اس نے مکتوب ہمارے حوالے کردیا (صحیح مسلم ۲/ ۳۰۲)۔

امام نووی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ بہ وقت ضرورت جاسوس وسی آئی ڈی کی جامہ تلاشی لی جاسکتی ہے (شرح نووی مسلم ۲/ ۳۰۲)۔

ب- مار پیٹ-قید میں رکھنا خود تعزیر وسزا ہے اس کے بعد مار پیٹ کرنا عام حالات میں درست نہیں ہے، الا یہ کہ قیدی ایسا مجرم ہے جو جیل میں ہوتے ہوئے بھی سرکشی کا مظاہرہ کرتا ہے تو تادیبی کارروائی کے طور پر ایسی ضرب اور زدوکوب کی اجازت ہوگی جس میں ضرب کے متعلق آداب شرعی کا لحاظ رکھا جائے، جیسے چہرہ پر نہ مارے، ایسی ضرب نہ ہو جس سے کسی عضو کو نقصان پہنچ جائے، جسم پر تشلت پڑ جائے (ثابت بن انس، باب فی الاسیر ینال منہ ویضر)۔

ج- الکٹرک شاٹ لگانا-شریعت کی تعلیمات کے مطابق مجرم قیدی کو الکٹرک شاٹ لگانا درست نہیں ہے، کیوں کہ اس سے اسے سخت جسمانی نقصان پہنچ سکتا ہے، اس کے حواس معطل ہوسکتے ہیں۔ خون کے دوران کو شدید نقصان پہنچ سکتا ہے۔

د- کتے چھوڑنا-قیدیوں پر کتے چھوڑنا درندگی کی علامت ہے، انسانی وقار کی توہین ہے اور شدید نقصان پہونچانے کی کوشش ہے، حدیث میں دو درندوں جانوروں کو لڑانے کی ممانعت آئی ہے، اس پہلو سے بھی ایک انسان پر کتے چھوڑنا ممنوع ہوگا۔

ھ- قیدی کو برف پرلٹانا-ٹھنڈک کے موسم میں قیدی کو برف کی سل پر ڈالنا لٹانا اور پر مجبور کرنا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اس سے قیدی کے صحت کو نقصان پہنچنے کا شدید اندیشہ ہے، اور ''زمہریر'' سے مشابہت پائی جاتی ہے۔ جس طرح کسی مخلوق کو آگ سے جلانے کی ممانعت ہے اسی طرح جہنم کے عذاب میں ''زمہریر'' ہے، اس لئے برف کی سل پر لٹانے کی سزا سے گریز ضروری ہے۔

و- جگے رہنے پر مجبور کرنا-مختلف ذرائع سے قیدی کو جگے رہنے پر مجبور کرنا بھی درست نہیں ہے، مسلسل بے خوابی سے دماغی توازن بگڑ سکتا ہے، قدرت نے رات نیند کے لئے بنائی ہے: "وجعلنا نومكم سباتا" (سورۂ نبأ: ۹) جگے رہنے پر مجبور کرنا ان آیات کی خلاف ورزی کرنی ہوگی۔

۴- قیدیوں کو زنجیروں ہتھکڑیوں اور بیڑی میں جکڑا جاسکتا ہے؟

قیدی کو اس اندیشے سے کہ ہو فرار نہ وہ جائے حسب ضرورت باندھ کر رکھ سکتے ہیں لیکن بندش جارح، اذیت رساں نہ ہوا (سنن ابی داؤد ۲/ ۲۶۳)۔ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ نے جو حسن برتاؤ فرمایا ہے اس کی سرگزشت سیدنا ابوہریرہ کی زبانی سنئے۔ رسول اللہ ﷺ نے کچھ

سواروں کو نجد بھیجا وہ یمامہ کے سردار ثمامہ بن اثال کو پکڑ لے آئے اور مسجد کے ایک ستون میں باندھ دیا جب رسول اللہ ﷺ کا گزر ہوا تو فرمایا: ثمامہ تمہاری اپنے بارے میں کیا رائے ہے؟ انہوں نے جواب دیا: اے محمد! اگر آپ ہمیں قتل کریں گے تو ایک صاحب حیثیت کا خون کریں گے، اگر احسان فرمائیں گے تو احسان شناس پر مہربانی کریں گے، اگر آپ مال کے خواہاں ہیں تو فرمائش کی تکمیل کی جائے گی، رسول اللہ ﷺ انھیں چھوڑ کر چلے گئے، جب آپ دوسرے دن تشریف لائے تو وہی سوال وجواب دہرائے گئے۔ آپ ﷺ نے کچھ تعرض نہ کیا اس کے بعد جب آپ تیسرے دن تشریف لائے تو پھر وہی سرگذشت رہی، یہ صورت حال دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ ثمامہ کو آزاد کر دیا جائے، اب ثمامہ مسجد سے متصل کھجور کے درخت کے پاس گئے غسل کیا اور مسجد میں آکر کلمۂ شہادت کا نعرہ بلند کیا ''أشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن محمدا عبده ورسوله'' اور ثمامہ کہنے لگے اے محمد! بخدا روئے زمیں پر آپ سے زیادہ ناپسندیدہ کوئی شخصیت نہ تھی لیکن اب آپ انتہائی محبوب شخصیت بن کر دل ودماغ پر چھا گئے، آپ کے دین سے زیادہ برا میرے یہاں اور کوئی دین نہیں تھا، پر اب آپ کے دین سے بہتر کوئی نظام حیات متصور نہیں، پہلے آپ کے شہر کو ناپسند کرتا اب اس پر فدا ہوتا ہوں، آپ کے دستے نے مجھے گرفتار کر لیا جب کہ عمرے کے ارادے سے نکلا تھا اب آپ کا میرے بارے میں کیا فیصلہ ہے، آپ ﷺ انہیں مبارک باد دی اور عمرہ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ پھر جب ثمامہ مکہ آئے تو لوگوں نے بددین ہونے کی پھبتی کسی، اس موقع پر وہ کہہ اٹھے: میں رسول اللہ ﷺ پر ایمان لایا اور ان کا تابعدار رہا۔ اہل مکہ سن لو! یمامہ سے گندم کا ایک دانہ بھی رسول اللہ ﷺ کی اجازت کے بغیر تم تک نہ پہنچ پائے گا۔

اس مفصل روداد میں قیدی کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے، کس اخلاق کا مظاہرہ کیا جائے عزت نفس کا کس درجہ خیال رکھا جائے اس کا جلوہ نظر آتا ہے۔

☆ قیدی کو ستون میں باندھنا ثابت ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جائے گا کہ قیدی کو باندھ سکتے ہیں، ہتھکڑی پہنا سکتے ہیں، اور وقت ضرورت پاؤں میں بیڑی بھی ڈالی جا سکتی ہے۔

☆ تین دن قید میں رکھنا بھی اس سے ثابت ہوتا ہے۔

☆ قیدی سے پوچھ تاچھ کا خوب تر طریقہ بھی سکھایا گیا۔

☆ قیدی کے ساتھ حسن برتاؤ کا انداز بھی سامنے آیا۔

☆ بعض روایات میں ثمامہ کے بند ڈھیلے کرنے کی ہدایت آئی ہے کہ قیدی کو ہتھکڑی یا زنجیر یا بیڑی ڈالتے وقت خیال رہے کہ اس کے دست وپا۔

☆ اگر قیدی کے پاؤں میں بیڑی یا ہاتھ میں ہتھکڑی ڈالی جائے تو اس بات کا خیال رہے کہ وہ پنجگانہ نماز بہتر طریقہ پر ادا کر سکے۔

☆ قیدی کے ساتھ ایسا رویہ اپنایا جائے کہ وہ جرم پر نادم ہو، دوبارہ انجام دینے کا جذبہ کافور ہو جائے، صالح فرد بن کر صالح معاشرہ میں شامل ہو جائے جس طرح ثمامہ کا حال ہوا۔

۵- قید تنہائی کی بہ وقت ضرورت گنجائش ہے۔ البتہ اس سے ملنے جلنے کے وہ حقوق حاصل ہوں گے جو عام قیدیوں کا حال ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تعزیر کی تعیین کا حق ہر زمانے کے حکام کو دیا گیا ہے۔

۶- قیدیوں کو مصروف رکھنے خوش حال رکھنے کے لئے فرق مراتب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کام لیا جا سکتا ہے، احادیث کے ذخیرے میں ان روایات سے استدلال کیا جا سکتا ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کو زبان سکھانے کے عوض بعض کافروں کی رہائی قرار پائی، اس سے دو چیزیں ثابت ہوتی ہیں:

(۱) کام کرانے کی اجازت۔ (۲) کام کی مزدوری دینے کی ضرورت۔

۷- جن قیدیوں کا مقدمہ زیر سماعت ہے وہ ابھی صرف ملزم کی حیثیت رکھتے ہیں ان کے مسائل سزا یافتہ مجرموں کے مسائل سے علیحدہ ہیں جن کو مجرم قرار دیا گیا ہے، وہ جیل میں مجرم کی حیثیت سے گزارا کریں گے اور ان پر وہ سزائیں نافذ ہوں گی جو ان کے لئے طے ہوئی ہیں۔

ملزم کا قیام جیل میں حفاظتی بندوبست کے تحت ہے اس کے ساتھ مجرم کا معاملہ روا رکھنا درست نہ ہوگا۔ مجرم کے مقابلہ میں ملزم کو زیادہ حقوق اور سہولتیں حاصل ہونی چاہئے۔

۸- زیر سماعت قیدی کو فیصلے سے قبل سزا کی مدت کے برابر جیل میں رکھنا عدل وانصاف کے تقاضے کے خلاف ہے بلکہ صریح ظلم ہے۔ جب ملزم کے مقدمے عدالت میں پیش ہوں تو فیصلے میں تاخیر عدالت کی حیثیت عرفی کو مجروح کرتی ہے۔

اس لئے عدلیہ نظام کو چست اور سریع الحرکت ہونا چاہئے، نظام عدل کی خرابی بسیار کی نظیر اس قیدی کو بنائی جاسکتی ہے جو چالیس سال سے زائد جیل میں رہا اور اس مدت میں اس پر باقاعدہ مقدمہ بھی قائم نہ ہوسکا۔

۹- جس ملزم کو قید میں رکھا گیا اور عدالت نے اسے بری کردیا تو یہ ملزم حیثیت عرفی مجروح ہونے، ذہنی اذیت پہنچنے کا مالی جرمانہ طلب کرسکتا ہے، عدالتی نظام میں یہ شق موجود ہونی چاہئے تاکہ لوگوں کے حقوق محفوظ ہوں اور فساد کا خاتمہ ہو۔

۱۰- قیدی مقدمات کی پیروی کے لئے وکیل رکھ سکتا ہے۔

۱۱- خواتین قیدیوں سے شیر خوار بچوں کو علیحدہ نہیں کیا جائے گا، الا یہ کہ جیل کا ماحول بچوں کو موافق نہ آئے اور متبادل بہتر نظم موجود ہو، حدیث میں ہے کہ پرورش ونگہداشت کے مقصد کے لئے ماں پر حد زنا جاری کرنے میں تاخیر کی گئی۔ اس لئے جیل میں ماں کے ساتھ شیر خوار بچے کو رکھا جائے گا۔

اسلام میں قیدیوں کے حقوق

مولانا محمد اشرف عباس قاسمی

الحمدللّٰہ وحدہ، والصلاۃ والسلام علی من لانبی بعدہ۔ أما بعد!

اسلام، دنیا میں ایک ایسا نظام عدل قائم کرنا چاہتا ہے جس میں سب کو یکساں حقوق حاصل ہوں، اور کوئی بھی فرد رنگ، نسل، جنس اور مذہب کی بنیاد پر تفریق کا شکار ہو کر انصاف سے محروم نہ رہ جائے۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو ہر حال میں اس بات کا پابند بناتا ہے کہ وہ حد سے نہ گزریں، کمزور طبقات کے حقوق کا خیال رکھیں، حتی کہ عین حالت جنگ میں بھی بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کے قتل کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔ اسی طرح قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک اور انہیں عطا کردہ حقوق بھی کتاب وسنت اور فقہ اسلامی میں موجود ہیں، یہ الگ بات ہے کہ قیدیوں کی انواع الگ الگ ہیں۔ بعض بہت خطرناک قسم کے قیدی ہوتے ہیں، بعض جنگی قیدی ہوتے ہیں، بعض سیاسی قیدی ہوتے ہیں اور بعض چوری یا اسی طرح کے کسی اور واردات کی وجہ سے حوالات میں پہونچ جاتے ہیں، ہم ذیل میں کسی خاص قسم کی تخصیص کے بغیر قیدیوں کے عمومی حقوق سے متعلق اسلامی تعلیمات کا جائزہ لے رہے ہیں۔

قید کا ثبوت

نفس قید وحبس کا ثبوت کتاب اللہ سے بھی ہے اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے: "وخذوهم واحصروهم" (انہیں پکڑو اور باندھو)۔ محاربین کی سزا کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ پاک فرماتے ہیں: "أو ينفوا من الأرض" (المائدہ: ۳۳)۔

علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہاں نفی سے مراد قید کرنا ہے:

"قال القرطبي: وقال مالك والكوفيون: نفيهم سجنهم فينفى من سعة الدنيا إلى ضيقها فصار كأنه إذا سجن فقد نفي من الأرض" (القرطبي: الجامع لأحكام القرآن ۶/۱۵۲)۔ "قال الألوسي: المراد بالنفي عندنا هو الحبس والسجن. والعرب تستعمل النفي بذلك المعنى لأن الشخص به يفارق بيته وأهله (الألوسي: روح المعاني ۶/۱۲۶)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: "ان النبي ﷺ حبس رجلا في تهمة" (البیہقی ۶/۷۷)۔

یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے الزام کے سبب ایک شخص کو قید فرمادیا تھا۔

قید خانے کی تاریخ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں بھی قید خانے کا رواج رہا ہے۔ قرآن کریم میں حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں قید خانہ اور اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی دعوتی واصلاحی سرگرمیوں کا ذکر موجود ہے، البتہ شروع اسلام میں قید خانے کی عمارت نہیں ہوتی تھی، بلکہ ایسے لوگوں کو مسجد میں یا دہلیز پر ہی باندھ دیا جاتا تھا۔ سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے قید خانے کے لئے عمارت خریدی۔ ایک قول یہ ہے کہ خلفاء ثلاثہ کے دور میں قید خانہ تھا ہی نہیں۔ اسلام میں حضرت علیؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے قید خانہ کی تعمیر کی (ابن الهمام: فتح القدير ۷/۲۶۰ بيروت؛ وفي ذلك يقول علي رضي الله عنه: الاترانی کیسا مکیسا، بنیت بعد نافع مخیسا، بابا حصینا وأمینا کیسا)

قاضی ابو یوسفؒ فرماتے ہیں: وأول من فعله علي بن أبي طالب كرم الله وجهه بالعراق، ثم فعله معاوية بالشام ثم فعل ذلك الخلفاء من بعده (ابو یوسف القاضي: كتاب الخراج /۱۵۰)۔

۱-کیا کسی ملزم کو اس کے جرم کا ثبوت فراہم ہوئے بغیر قید کیا جاسکتا ہے؟

بغیر تحقیق و تفتیش کے کسی پر کوئی حکم لگا دینا یا اس کو قید و بند کی صعوبتوں میں ڈال دینا مزاج شریعت کے خلاف ہے، قرآن کریم ہمیشہ ثبوت اور احتیاط سے کام لینے کی تلقین کرتا ہے: "یا أیها الذین آمنوا إن جاء کم فاسق بنبأ فتبینوا أن تصیبوا قوما بجهالة فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین" (الحجرات/۴) (اے ایمان والو! اگر کوئی شریر آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کرلیا کرو، کبھی کسی قوم کو نادانی سے ضرر نہ پہنچادو، پھر اپنے کئے پر پچھتانا پڑے)۔

عمر بن عبد العزیزؒ فرماتے ہیں: ''ولا تبین فی قید إلا رجلا مطلوبا بدم'' (المرجع السابق ص ۱۵۰)۔

حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ نے ایک خفیہ خط کے ذریعہ کفار مکہ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادوں سے باخبر کرنا چاہا اور انہوں نے اس کے لئے ایک خاتون کی خدمت حاصل کی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہ ذریعہ وحی اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے حاطب سے اس کے متعلق اس وقت تک استفسار نہ کیا جب تک کہ وہ خط اس خاتون سے حاصل کر کے خدمت اقدس میں پیش نہ کر دیا گیا۔

البتہ بعض صورتوں میں گرفتاری کے بغیر جرم کی تہہ تک رسائی نہیں ہو پاتی، یا اس بات کا اندیشہ ہے کہ مجرم کو اگر بھنک لگ گئی تو وہ راہ فرار اختیار کرسکتا ہے تو ان حالات میں بہ طور احتیاط کے گرفتاری کی گنجائش ہے، بشرطیکہ وہاں ایسے پہلو موجود ہوں جو اس کے مجرم ہونے کی نشاندہی کرتے ہوں۔ بطور احتیاط کے جرم کے ثبوت کے بغیر اگر کسی مجرم کو قید کر دیا جاتا ہے تو اس صورت میں چوں کہ اب تک اس کے خلاف جرم ثابت نہیں ہوسکا ہے محض ایک ضرورت کی بنا پر اسے محبوس کرلیا گیا ہے لہذا "الضرورة تقدر بقدرها" کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے جتنی جلد ہوسکے رہا کیا جائے، یا جرم ثابت ہو جانے کی صورت میں آگے کی کارروائی کی جائے۔ چوں کہ جرائم کی نوعیت اور اشخاص کے احوال مختلف ہوتے ہیں اس لئے اسے قاضی کی رائے پر مفوض کیا جائے گا، اور اس سلسلے میں کسی خاص مدت کی تحدید نہیں کی جاسکتی۔ والصحیح أن التقدیر مفوض إلی رأی القاضی لاختلاف أحوال الأشخاص فیه'' (المرغینانی: الهدایة مع البنایة ۸/۲۷)۔

الف-مذہبی امور

جس طرح عام حالات میں اسلام مذہبی رواداری اور سیر چشمی کا مظاہرہ کرتا ہے، اسی طرح بے بس قیدیوں کو بھی یہ حقوق حاصل رہیں گے۔ ایک اعرابی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دبے پاؤں اس وقت آپہنچا جب آپ غزوہ ذات الرقاع سے لوٹ رہے تھے اور درخت پر تلوار لٹکا کر اس کے سایہ میں آرام فرمارہے تھے۔ اعرابی تلوار سونت کر پوچھا: من یمنعك منی؟ تم کو مجھ سے کون بچائے گا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ۔ اتنا سننا تھا کہ اعرابی پر لرزہ طاری ہوگیا، تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اب تک جو قتل کرنے کی تاک میں تھا اب بالکل بے بس قیدی کی طرح آپ کے رحم و کرم پر ہے۔ اسی حالت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسے قبول حق کی دعوت دیتے ہیں، لیکن وہ اپنے مذہب پر اصرار کرتا ہے۔ آپ اس سے کوئی تعرض نہیں کرتے ہیں اور وہ چلا جاتا ہے۔

(دیکھیے صحیح البخاری مع الفتح ۷/۴۲۶، رقم: ۴۱۳۶)۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ قیدی اپنے مذہبی امور میں آزاد ہیں۔ وہ اپنی مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرسکتے ہیں، ان کی مذہبی تعلیمات کے مطابق انہیں غذا فراہم کی جائے گی، اور ان کی مذہبی شخصیات اور کتابوں کی بے توقیری سے احتراز کیا جائے گا۔ کیوں کہ یہ احکام تو مسلمانوں کو عام حالات کے لئے بھی دیئے گئے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے: "ولا تسبوا الذین یدعون من دون الله فیسبوا الله عدوًا بغیر علم" (الأنعام: ۱۰۸) (اور دشنام مت دو ان کی جن کو یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں پھر وہ براہ جہل حد سے گزر کر اللہ تعالی کی شان میں گستاخی کرے)۔

کوئی بھی مسلم قیدی دوسرے قیدیوں تک دین کی دعوت پہنچا کر یوسف علیہ السلام کی سنت زندہ کرسکتا ہے، البتہ مذہب کے نام پر کسی بھی ایسے عمل کی اجازت نہیں دی جاسکتی جو دوسروں کی دل آزادی کا سبب بنے۔

ب- جسمانی ضروریات

قیدیوں کی جسمانی ضروریات مثلاً اکل وشرب کی فراہمی بھی مسلم ریاست کے فرائض میں شامل ہے۔

والأسير من أسرى المشركين لابد أن يطعم ويحسن إليه حتى يحكم فيه'' (ابو یوسف القاضی: کتاب الخراج/ص ۱۴۹)۔

غیر مسلم قیدی کا جب تک فیصلہ نہ ہو جائے اسے کھلایا پلایا جائے اور اچھی طرح رکھا جائے۔ امام ابو یوسفؒ اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ہارون رشید کو لکھتے ہیں: ''ان قیدیوں کے حسب حال کھانے اور سالن کا انتظام کیجئے اور ان کا ماہانہ وظیفہ متعین کر دیجئے، اور اصلاح وتقوی کے مالک ایک ایسے شخص کا انتخاب کر لیجئے جو تمام قیدیوں کا اندراج رکھے۔ یہ سارے نام اس کے پاس ہوں، وہ ہر مہینے یہ نام پکارے، ٹھنڈی میں قیدیوں کو قمیص اور کمبل دیا جائے اور گرمی میں قمیص اور تہہ بند، (المصدر السابق/ص ۱۵۰)۔

قرآن کریم میں ایسے لوگوں کی خاص فضیلت ذکر کی گئی ہے جو اپنا کھانا ضرورت اور چاہت کے باوجود قیدیوں کی نذر کر دیتے ہیں، ارشاد باری ہے:

''ويطعمون الطعام على حبه مسكينًا ويتيمًا وأسيرًا'' (الدھر: ۸) (اور وہ لوگ خدا کی محبت سے غریب، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں)۔

قاضی ابوبکر ابن العربیؒ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں:

''وفي إطعامه ثواب عظيم، وإن كان كافرًا فإن الله يرزقه فقد تعين بالعهد إطعامه، ولكن من الفضل في الصدقة، لا من الأصل في الزكاة، ويدخل فيه المسجون من المسلمين فإن الحق قد حبسه عن التصرف وأمره فيما وجب عليه فقد صار له على الفقير المطلق حق زائد بما هو عليه من المنع عن التمول في المعاش أو التصرف في الطلب'' (ابوبکر بن العربی: احکام القرآن ۴/۱۸۹۸)۔

قیدی کو کھلانے میں بڑا ثواب ہے اگر چہ وہ کافر ہو، کیوں کہ اللہ اس کو رزق دیتا ہے، اس کو کھلانا، پلانا، ذمہ داری بن چکی ہے، البتہ صدقے کے زائد مال سے اس کا نظم ہوگا، اصل زکوۃ سے نہیں۔ اسی میں مسلم قیدی بھی شامل ہیں، اس لئے کہ حق نے اسے تصرف سے روک دیا ہے اور واجبات کی ادائیگی میں محبوس کر رکھا ہے۔ اس اعتبار سے مطلق فقیر کے مقابلہ میں اسے ایک گونہ امتیاز حاصل ہے کیوں کہ اسے تو کسب معاش یا کسی بھی طلب وجستجو سے بزور روک دیا گیا ہے''۔

مصعب بن عمیر کے بھائی ابوعزیر بن عمیر کہتے ہیں: كنت في رهط من الأنصار حين أقبلوا بي من بدر فكانوا إذا قدموا غداء هم أو عشاء هم خصوني بالخير وأكلوا التمر لوصية رسول الله ﷺ إياهم بنا۔ ما تقع في يد رجل منهم كسرة خبز إلا نفخني بها فأستحيي، فأردها۔ فيردها علىّ لا يمسها (ابن ہشام: ۲/۲۸۸)۔

غذائی ضروریات میں صاف پانی اور علاج کا انتظام بھی شامل ہے۔

ورزش وتفریح

حفظان صحت کے لئے ورزش وتفریح قیدیوں کا کوئی حق واجب نہیں۔ قیدیوں کے جرائم کی نوعیت کے اعتبار سے اس کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ کبھی حبس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ مضطر ہو کر ادائیگی حق پر آمادہ ہو جائے، اور ظاہر ہے کہ اس طرح کی سہولیات اس مقصد میں آڑے آسکتی ہیں۔

بیوی سے تعلق

بیوی سے تعلق کے سلسلہ میں فقہاء کے یہاں دونوں آراء ملتی ہیں، علامہ عینیؒ فرماتے ہیں:

''ولو احتاج إلى الجماع تدخل زوجته أو جاريته فيطؤها حيث لا يطلع عليه أحد وقيل الوطأ ليس من أصول الحوائج فيجوز أن يمنع'' (العینی: البنایہ ۸/۳۱)

(اگر جماع کا تقاضہ ہو تو اس کی بیوی یا باندی اس کے پاس چلی جائے اور وہ اس سے اپنے جذبات کی تسکین کرلے۔ لیکن دوسرا قول یہ ہے کہ اس کو جماع کی اجازت نہیں دی جائے گی، اس لئے کہ جماع ضرورت اصلیہ میں سے نہیں ہے)۔

غزوہ تبوک سے لوٹنے کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین صحابہ کرام کے سماجی بائیکاٹ کا حکم دیا تھا۔ چالیس دنوں کے بعد اس میں یہ شق بھی داخل کردی گئی تھی کہ یہ تینوں حضرات اپنی بیویوں سے علاحدہ رہیں اور جماع وصحبت سے بالکل گریز کریں۔

قال كعب: حتى إذا رسول مضت أربعون من الخمسين إذا رسول الله صلى الله عليه وسلم يأتيني فقال: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم يأمرك أن تعتزل امرأتك قال: فقلت: أطلقها أم ماذا أفعل؟ قال: لا بل اعتزلها فلا تقربنها. قال: فأرسل إلى صاحبيّ مثل ذلك'' (اخرجه البخاري، رقم: ۲۷۵۷، مسلم رقم: ۲۷۶۹.۵۳)۔

اس لئے ہمارے خیال میں اس مسئلہ میں قدرے تفصیل کی جائے، اسلامی عدالتی نظام کسی بھی مستغیث کو جلد انصاف فراہم کرتا ہے اور مجرم پر جلد ہی سزا کا نفاذ عمل میں آجاتا ہے، اس نظام کے اعتبار سے مدت مدیدہ کے لئے قید وحبس کی ضرورت ہی نہیں پیش آتی ہے۔ البتہ کبھی ایسی صورت حال بھی پیش آتی ہے کہ طویل مدت تک کسی کو قید خانہ میں رہنا پڑتا ہے۔ تو اب غور کرلیا جائے، اگر طویل مدت کے لئے کوئی محبوس ہے تو اسے جماع کی اجازت دی جائے ورنہ نہیں واللہ اعلم۔

تنگ جگہوں میں قیدیوں کو رکھنا:

اس میں ایسی تنگ جگہ میں قیدیوں کو رکھنا جہاں کھڑا ہونا یا پاؤں پھیلا کر لیٹنا یا دیوار کے باہر کسی چیز کا دیکھنا ممکن نہ ہو۔ عام حالات میں درست نہیں، اس باب میں درحقیقت اعتدال سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ قیدی کو نہ تو بہت آرام دہ، کشادہ اور مکیف جگہ فراہم کی جائے اور نہ اسے ایسے تنگ وتاریک حجرہ میں رکھا جائے جہاں دم گھٹنے لگے: ''ينبغي أن يكون موضعًا خشنًا ولا يبسط له الفراش ولا وطاء ولا يدخل له أحد يستأنس به'' (ابن الهمام: فتح القدير ۷/ ۲۶۰)۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی کہتے ہیں کہ حبس شرعی کا بنیادی طور پر یہ مطلب ہی نہیں کہ اسے کسی تنگ وتاریک جگہ میں مقید کردیا جائے۔ حبس کا مطلب کسی شخص کو بے بس بنادینا اور اسے کسی بھی طرح کے تصرف سے روک دینا ہے۔ خواہ گھر میں ہو یا مسجد میں۔

''إن الحبس الشرعي في أصله ليس هو الحبس في مكان ضيق وإنما هو تعويق الشخص، ومنعه من التصرف سواء أكان في بيت أم مسجد، أم كان بتوكل شخص أو وكيله عليه وملازمته له'' (الفقه الاسلامي وادلته ۶/ ۵۰۹)۔

ج- عام سماجی حقوق

اخبارات اور ریڈیو کی اجازت: اگر قید کا مقصد محض نظر بند کرنا اور عام لوگوں سے دور رکھنا ہے تو ایسے قیدیوں کو اخبارات اور ریڈیو کی اجازت ہوگی، اور اگر قید کا مقصد کسی حق کی وصولی کے لئے اس پر دباؤ بنانا ہے تو اسے ایسی سہولیات فراہم نہ کی جائیں، حافظ ابن الھمامؒ نے قیدیوں کو بعض سہولیات فراہم نہ کرنے کا جواز یہ کہہ کر پیش کیا ہے: ''لأنه ليضجر قلبه فيسارع للقضاء'' (ابن الهمام: فتح القدير ۷/ ۲۶۰)۔

احباب واقارب سے ملاقات اور گفتگو: قیدی کو احباب واقارب کی ملاقات اور ان کے ساتھ بات چیت سے محروم نہیں کیا جاسکتا، احباب واقارب کو ملنے کی اجازت ہوگی، ممکن ہے کہ وہ ان کی فہمائش سے راہ راست پر آجائے، البتہ یہ ملاقات مختصر ہوا کرے گی۔

ولا يمنع من دخول أهله وجيرانه للسلام عليه لأنه قد يفضي إلى المقصود من الإيفاء بمشورتهم ورأيهم ويمنعون من طول المكث'' (ابن الهمام: فتح القدير ۷/ ۲۶۱)۔

اگر فتنہ اور انتشار کا خطرہ نہ ہو تو دوسرے قیدیوں سے ملاقات میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

قید کا مقصد یہ ہے کہ مجرم اپنی سابقہ مجرمانہ زندگی سے تائب ہوکر صحیح روش اختیار کرے، اس کے لئے فہمائش اور تذکیر کے ذرائع بھی استعمال کئے جائیں اور تعلیم وہنر سے بھی انہیں آراستہ کیا جائے، جس سے وہ صحیح معنوں میں انسان بن سکیں، ظاہر ہے کہ اسلام ایسے جذبہ کی بھرپور تشجیع کرے

گا۔

د- اخلاقی امور

اسلام اخلاقیات کا سب سے بڑا داعی اور نقیب ہے۔ اسلام کسی ایسے امر کی اجازت نہیں دیتا جس سے اخلاقیات پر کسی بھی حال میں ضرب پڑتی ہو۔ اس لئے اسلامی ریاست کا فرض بنتا ہے کہ وہ مرد وعورت اور بالغ ونابالغ کے لئے علاحدہ علاحدہ قید خانہ تعمیر کرے۔ تا کہ کسی بھی طرح کے مخرب اخلاق شر وفساد سے بچا جاسکے اور مرد وخواتین تکلف کے بغیر سہولت کے ساتھ رہ سکیں۔ بلکہ قاضی کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ مرد وزن کے مقدمات علاحدہ علاحدہ سنے۔ تا کہ اختلاط النساء مع الرجال کے فتنہ اور قباحت سے بچا جاسکے۔ تو ظاہر ہے کہ بھلا مرد وخواتین کو ایک ساتھ رکھنے کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے۔

وینبغی للقاضی أن یقدم النساء علی حدة والرجل علی حدة لأن الناس یزدحمون فی مجلسه وفی اختلاط النساء مع الرجال عند الزحمة من الفتنة والقبح مالا یخفی'' (السرخسی: المبسوط ۱۶/۸۰)۔

۳- قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے ایک حد تک سختی کی اجازت ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ اور ان کے ساتھیوں نے حاطب بن ابی بلتعہ کا خط لے جارہی خاتون پر سختی برتتے ہوئے دھمکی آمیز لہجہ اختیار کیا تھا:

''قال علی: حتی أتینا الروضة فإذا نحن بالضعینة قلنا لها: أخرجی الکتاب، قالت: مامعی کتاب۔ قلنا: لتخرجن الکتاب أو لنلقین الثیاب قال: فأخرجته من عقاصها'' (البخاری فی صحیحه رقم: ۴۲۷۴)۔

اسی غزوہ بدر سے عین قبل کفار مکہ کے جو دو غلام مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تھے، ان سے بھی پوچھ تاچھ میں سختی برتی گئی۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے: السیرۃ النبویۃ لابن ہشام ۲/۲۵۹)۔

امام ابو یوسفؒ ایک قیدی کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں: ''عوقب وأطیل حبسه'' (ابو یوسف: کتاب الخراج/۱۵۱)۔

البتہ ان چیزوں میں حد سے گزر جانے اور بہیمانہ رویہ روا رکھنے کی قطعاً اجازت نہیں دی جاسکتی۔ لہذا قیدیوں کو بے لباس کرنا، خوب مار پیٹ کرنا، الیکٹرک شاٹ لگانا، قیدیوں پر کتے چھوڑنا، قیدیوں کو سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈال دینا اور انہیں مسلسل جگائے رکھنا جائز نہیں ہے۔ قرآن کریم میں محاربین کے لئے جو سخت سزائیں متعین ہیں وہاں جرم کی نوعیت بالکل الگ ہے۔ عام قیدیوں پر اس کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔ امام ابو یوسفؒ خلیفہ ہارون رشید کو قیدیوں کے حال زار سے واقف کرانے کے بعد کہتے ہیں:

''فمر ولا تلث جمیعًا بالنظر فی أمر أهل الحبوس فی کل أیام فمن کان علیه أدب أدب وأطلق ومن لم یکن له قضیة خلی عنه۔ وتقدم إلیهم أن لا یسرفوا فی الأدب ولا یتجاوزوا بذلك إلی ما لا یحل ولا یسع۔ فإنه بلغنی أنهم یضربون الرجل۔ فی التهمة وفی الجنایة۔ الثلاث مائة والمأتین وأکثر وأقل۔ وهذا مما لا یحل ولا یسع، کما بلغنی أن ولا تلث یضربون... أن ابن آدم لم یعر من الذنوب فتفقد أمرهم ومر بالإجراء علیهم مثل مافسرت لك'' (ابو یوسف القاضی: کتاب الخراج/ص ۱۵۱)۔

(آپ اپنے ماتحت افسران کو مکلف کریں کہ وہ روزانہ قیدیوں کے احوال کا معائنہ کریں۔ جو مستحق ہو اسے سزا دے کر رہا کریں۔ اور جس کا کوئی مسئلہ ہی نہ ہو اسے چھوڑ دیں۔ آپ انھیں یہ بھی ہدایت دیجئے کہ وہ سزا اور تنبیہ میں اعتدال رکھیں۔ اور اس حد تک نہ جا پہنچیں جس کی شریعت میں اجازت اور گنجائش نہیں ہے۔ کیوں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے افسران ایک شخص کو کسی جرم پر تین تین سو اور دو دو سو کوڑے مارتے ہیں۔ شریعت میں اس کا کوئی جواز اور گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ افسران قیدیوں کو خوب پیٹتے ہیں۔ دیکھئے کوئی بھی انسان گناہوں سے پاک نہیں ہوتا، اس لئے آپ ان کے معاملے کا جائزہ لیجئے اور میری ذکر کردہ تفصیلات کے مطابق کارروائی کیجئے)۔

حدود وقصاص اور کفارہ کے علاوہ گناہ اور جرم کی جتنی صورتیں پیش آتی ہیں سب پر تعزیر ہوتی ہے۔ اور یہ تعزیر جرم کی نوعیت کے اعتبار سے خلیفہ

المسلمین یا قاضی یا حاکم تجویز کریگا۔ تعزیر کی ہی ایک صورت یہ ہے کہ اس کو قید خانہ میں ڈال دیا جائے گو یا قید خانہ میں ڈال دیا جانا مستقل ایک تعزیر ہے۔ اور اسلام نقطہ یہ چاہتا ہے کہ جرم کی نوعیت کے اعتبار سے مجرم سے نمٹا جائے (ابوزہرۃ: الجریمۃ والعقوبۃ فی الفقہ الاسلامی /ص ۴۴۵)

۴- قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑا جاسکتا ہے، انہیں ہتھکڑیاں پہنائی جاسکتی ہیں اور انہیں بیڑی ڈالی جاسکتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

"فإذا لقيتم الذين كفروا فضرب الرقاب حتى إذا أثخنتموهم فشدوا الوثاق" (محمد)

(سو تمہارا جب کفار سے مقابلہ ہو جاوے تو ان کی گردنیں مار دو، یہاں تک کہ جب تم ان کی خوب خونریزی کر چکو تو خوب مظبوط باندھ لو)

نیز یمامہ کے سردار ثمامہ بن اثال کو جب مسلمانوں نے گرفتار کیا تھا تو انہیں ایک ستون سے باندھ دیا تھا۔

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: بعث رسول الله ﷺ خيلا قبل نجد فجاءت برجل من بني حنيفة يقال له ابن اثال- سيد أهل اليمامة- فربطوه بسارية من سواري المسجد'' (اخرجه مسلم في صحيحه. رقم ۵۹،۱۷۶۴)۔

اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں رسول اکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: ''اللہ پاک اس قوم سے خوش ہوتے ہیں جسے بیڑیاں پہنا کر جنت میں داخل کیا جاتا ہے۔ اور ایک روایت میں ہے جسے زنجیروں کے ساتھ جنت کی طرف گھسیٹ کر لے جایا جائے گا'' یعنی کفر کی حالت میں مسلمانوں سے لڑتے ہیں، قیدی بنائے جاتے ہیں، ہتھکڑیاں بیڑیاں لگا دی جاتی ہیں۔ دار الاسلام لایا جاتا ہے، پھر دار الاسلام آ کر حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے ہیں اور اس طرح جنت میں داخل ہو جاتے ہیں:

''عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي ﷺ قال: عجب الله من قوم يدخلون الجنة في السلاسل. وفي رواية يقادون إلى الجنة بالسلاسل'' (رواه البخاري، مشكاة المصابيح، رقم: ۳۹۶۰)۔

اسی طرح صحابہ کرام نے بنو عامر بن صعصعہ ایک شخص کو گرفتار کر کے اسے جکڑ دیا تھا:

''أسر أصحاب النبي ﷺ رجلا من بني عامر بن صعصعة فمرّ به على النبي ﷺ وهو موثق'' (الجصاص الرازي: أحكام القرآن ۵/۲۷۰)۔

البتہ اس عمل میں بہت زیادہ تشدد سے کام نہ لیا جائے کہ جان ہی نکلنے لگے۔ جیسا کہ حضرت عباسؓ کے ساتھ ہوا تھا (دیکھئے: أسد الغابہ لابن الأثیر ۱۰۹/۳)۔

۵- مجرم کے لئے قید تنہائی:

کسی مجرم کو اس کے خصوصی جرم کے پس منظر میں قید تنہائی دی جاسکتی ہے۔ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ محبوس فی الدین عید، جمعہ، جماعت، حج اور کسی رشتہ دار کے جنازے میں شرکت کے لئے بھی نہیں نکل سکتا، اس طرح وہ الگ تھلگ پڑا رہے گا جس سے اسے اپنے جرم کا احساس ہوگا، اور اس کی تلافی کی بات سوچے گا۔

''والمحبوس في الدين لا يخرج لصوم رمضان ولا لعيد ولا جمعة ولا لصلاة جماعة ولا لحج فريضة ولا لحضور جنازة بعض أهله'' (ابن الهمام: فتح القدير ۲۶۰/۷)۔

۶- جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ حدود و قصاص اور کفارہ کے علاوہ گناہ اور جرم کی جتنی صورتیں پیش آتی ہیں، سب پر تعزیر ہوتی ہے۔ اور یہ تعزیر جرم کی نوعیت کے اعتبار سے خلیفۃ المسلمین یا قاضی یا حاکم تجویز کرے گا۔ اس اعتبار سے بطور تعزیر صحت مند قیدیوں سے جبراً کام لیا جاسکتا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ کام تعزیر کا ایک حصہ ہے، اس لئے قیدی اس پر کسی اجرت کے مستحق نہیں ہوں گے۔ البتہ حکومت کو چاہئے کہ اس پر کچھ اجرت مقرر کر دے جس سے قیدیوں کو کسی حد تک راحت حاصل ہو، قاضی ابو یوسفؒ نے ہارون رشید کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ہر قیدی کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیں، اور ہر مہینے ہر قیدی کو دس دراہم دیا کریں۔

''وصير ذلك دراهم تجرى عليهم في كل شهر يدفع ذلك إليهم ويكون للإجراء عشرة دراهم في الشهر لكل

واحد'' (ابو یوسف القاضی: کتاب الخراج / ص ۱۵۰)۔

۷- جن قیدیوں کے بارے میں سزائے قید کا فیصلہ ہو چکا ہے اور قاضی نے جرم کی نوعیت سامنے رکھتے ہوئے جس طرح کی سزا تجویز کردی ہے، اسی کے مطابق عمل درآمد کیا جائیگا۔ البتہ انہیں وہ تمام مذہبی، جسمانی اور اخلاقی حقوق حاصل رہیں گے جنہیں دلائل کی روشنی میں اوپر ثابت کیا جا چکا ہے، جہاں تک تعلق ہے ان قیدیوں کا جن کے مقدمات زیر سماعت ہیں، ان کے بارے میں جلد بازی درست نہیں ہوگی۔ انہیں صرف محبوس رکھا جائے اور معمول کے مطابق زندگی گزارنے دی جائے۔ مقدمات کی تفتیش کے دوران تھوڑی بہت سختی برتی جاسکتی ہے۔ باضابطہ کوئی سزا تجویز نہیں کی جاسکتی تا آں کہ قاضی کا فیصلہ آجائے۔

۸- اس کی اجازت نہیں۔ دنیاوی عدالتوں کے اصول وضوابط کچھ ایسے پیچیدہ ہوتے ہیں کہ ایک مسئلہ کے حل تک پہنچنے کے لئے سالہا سال لگ جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف شرعی عدالتیں تیزی سے اپنا کام نمٹاسکتی ہیں۔ اگر مقدمات کی تعداد زیادہ ہے تو اسلامی ریاست مزید عدالتیں قائم کرے تاکہ صحیح وقت پر ہر کس وناکس کو انصاف مل سکے۔ اس لئے زیر سماعت قیدیوں کو اتنے دنوں تک فیصلے سے پہلے قید میں نہ رکھا جائے جو ان کے اوپر عائد فرد جرم کی اصل سزا ہے۔

۹- فقہی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ قید میں ہونے والی ذہنی وجسمانی اذیت پر مالی ہرجانہ طلب نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ تعزیر میں مالی جرمانہ جائز نہیں۔ امام ابو یوسفؒ کا ایک قول جواز کا ہے۔ لیکن فتوی عدم جواز پر ہے۔

''لا بأخذ مال فی المذهب، قال فی الفتح: وعن أبي يوسف يجوز التعزير للسلطان بأخذ المال وعندهما وباقي الأئمة لا يجوز ومثله فی المعراج وظاهره أن ذلك رواية ضعيفة عن أبي يوسف قال فی الشرنبلالية: لا يفتى بهذا لما فيه من تسليط الظلمة على أخذ مال الناس فيأكلونه'' (ابن عابدین: ردالمحتار ۶/۱۰۶)۔

لیکن موجودہ صورت حال میں اس مسئلہ میں غور وفکر کی ضرورت ہے۔ ایک آدمی جسے جسمانی وذہنی اذیت سے دوچار ہونے کے علاوہ معاشی مار بھی پڑتی ہے۔ اس کے لئے اس میں کوئی گنجائش نکل سکتی ہے یا نہیں، اس دوران بلا وجہ جس طرح وہ محبوس اور تمام کاموں سے معطل رہا کم از کم حبس کے وقت کے اعتبار سے تو اس کو کچھ نہ کچھ گنجائش ملنی چاہئے واللہ اعلم۔

۱۰- قیدی اپنے مقدمات کے سلسلے میں وکیل سے رابطہ کرتا ہے۔ جس طرح دیگر عقود ومعاملات مثلاً نکاح وبیع میں اس کی اجازت ہے۔ موفق وغیرہ نے فی الجملہ وکالت کے جواز پر اجماع نقل کیا ہے۔ اور ضرورت بھی اس کی مقتضی ہے، کیوں کہ ہر شخص ہر کام بہ ذات خود انجام دینے کا اہل نہیں ہوتا۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے: الملخص الفقہی للشیخ فوزان ۲ / ۶۴، ہدایہ ۳/ ۱۳۶)

اسی طرح قیدی کو صفائی پیش کرنے کے مواقع دیئے جائیں گے۔ جلد بازی میں اس کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ حاطب بن ابی بلتعہؓ کا خط جب پکڑا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف فوری فیصلہ لینے کے بجائے ان کی بات سنی، اور انہوں نے اپنی صفائی پیش کی۔ ثمامہ بن اثال کی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری بات سنی تھی۔ واقعہ افک میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی صفائی پیش کرنے کو کہا گیا تھا۔

۱۱- شریعت میں حضانت کا سب سے مقدم حق ماں کو ہے۔ اب اگر ماں قید کرلی جاتی ہے تو محض قید کی وجہ سے اس کا یہ حق سلب نہیں ہوگا۔ اس لئے اسے (اگر قید خانے میں سہولت ہو) اپنے شیر خوار بچوں کو قید خانہ میں رکھنے کا حق حاصل ہوگا۔ واللہ اعلم۔

☆☆☆

قیدیوں کے حقوق اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

مولانا محمد ابوبکر قاسمی[1]

قیدیوں کے حقوق اسلامی تعلیمات کے تناظر میں

عربی زبان میں قیدی کو اسیر کہا جاتا ہے، جنگ کے دوران یا جنگ کے اختتام کے بعد وہاں کے باشندے یا فوجی جو گرفتار کئے جائیں عموماً اسی قسم کے لوگوں کو اسیر کہا جاتا ہے، تاہم اس کے علاوہ جاسوسی کے الزام میں یا کسی اور جرم کے سبب گرفتار کئے گئے شخص کو بھی اسیر کہا جائے گا، بلکہ حضرات مفسرین نے اسیر کے مفہوم میں مقروض شخص کو بھی داخل کیا ہے، اسی طرح علم سیکھنے اور سکھانے والے بھی اسیر کے مصداق ہیں (ملاحظہ ہو: تفسیر انوار القرآن ۱۲ / ۲۵۱)۔

قرآن کریم کی مشہور سورت سورۃ الدھر (جسے سورہ انسان بھی کہا جاتا ہے) میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کا یہ خصوصی وصف ذکر کیا ہے کہ وہ لوگ اپنا محبوب و پسندیدہ کھانا جہاں یتیم و مسکین کو کھلاتے ہیں وہیں قیدی و اسیر کو بھی اس سے حصہ دیتے ہیں، ساتھ ہی زبان حال سے کہتے ہیں کہ ہمارا یتیم و مسکین کو اور قیدیوں کو کھانا کھلانا صرف رضائے الٰہی کے جذبے سے ہے، ہم کو اس کھلانے کا نہ کوئی مالی عوض چاہئے اور نہ ہی ہم تعریف و شکریہ کے آرزو مند ہیں، ارشاد خداوندی ہے:

"ویطعمون الطعام علی حبه مسکینًا ویتیمًا وأسیرًا إنما نطعمکم لوجه الله لانرید منکم جزاءً ولا شکورًا" (سورۃ الدھر: ۸-۹)۔

(اور وہ لوگ اپنا محبوب و مرغوب کھانا غریب و یتیم اور قیدی کو کھلاتے ہیں (اور زبان یا دل سے کہتے ہیں کہ) ہم تم لوگوں کو محض خدائے تعالیٰ کی رضامندی کے لئے کھانا کھلاتے ہیں (اور اس کھلانے کا) تم سے نہ کوئی عملی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ ہی قولی بدلہ کہ تم شکریہ ادا کرو)۔

حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے معارف القرآن میں لکھا ہے:

قیدی سے مراد ظاہر ہے کہ وہ قیدی ہے جس کو اصول شرعیہ کے مطابق قید میں رکھا گیا ہے خواہ وہ کافر ہو یا مسلمان مجرم، مگر بہر حال اس کو کھانا کھلانا حکومت اسلامی کی ذمہ داری ہے، جو شخص اس کو کھانا کھلاتا ہے وہ گویا حکومت اور بیت المال کی اعانت کرتا ہے، اس لئے قیدی چاہے کافر بھی ہو اس کو کھانا کھلانا ثواب ہوگا خصوصاً ابتدائے اسلام میں تو قیدیوں کو کھانا کھلانا اور پانی پلانا اور ان کی حفاظت عام مسلمانوں میں تقسیم کر کے ان کے ذمہ کردی جاتی تھی، جیسے غزوہ بدر کے قیدیوں کے ساتھ معاملہ کیا گیا (معارف القرآن ۸ / ۶۳۴، پارہ: ۲۹)۔

حضرت مولانا عبد الماجد دریابادی نے مذکورہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے تفسیر ماجدی میں لکھا ہے کہ اس آیت سے یہ (مسئلہ) نکلا کے غیر مسلم اسیروں کی بھی امداد و اعانت موجب اجر آخرت ہے۔

''ففیه دلیل علی أن إطعام الأساری إن کان من أهل الشرك حسن یرجی ثوابه'' (معالم، روح)

اور قرآنی الفاظ "یطعمون الطعام" کی تفسیر کرتے ہوئے محققین علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ خلقت کے ساتھ حسن سلوک کی ساری ہی صورتیں آیت میں شامل ہیں جس کا ایک اہم جز کھانا کھلانا بھی ہے:

''وإطعام الطعام کنایة عن الإحسان إلی المحتاجین والمواساة معهم بأی وجه کان وإن لم یکن ذلك بالطعام بعینه (کبیر) أقول وهذا یدل علی أن المراد من قوله إنما نطعمکم لیس هو الإطعام فقط بل جمیع أنواع المواساة من الطعام والکسوة (کبیر) فکأنه ینفعونه بوجوه المنافع'' (روح) (تفسیر ماجدی، سورۃ الدھر، ص ۱۱۶۲، حاشیہ ۵)۔

---

[1] مدرسہ اسلامیہ شکرپور، بھرواره، دربھنگہ۔

سورہ الدہر کی مندرجہ بالا آیت کی تفاسیر کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قیدیوں کی تمام جائز ضرورتوں کو پورا کرنا اس کا بنیادی حق ہے۔

قیدیوں کے بارے میں مذکورہ تمہید کے بعد فقہ اکیڈمی کے مرسلہ سوالوں کا جواب لکھا جاتا ہے۔

۱- کسی ملزم کو اس کے جرم کا ثبوت فراہم ہوئے بغیر محض تہمت کی بنا پر بھی قید کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر جرم کا ثبوت نہ ہو تو فوراً چھوڑ دیا جائے۔

چنانچہ امام ترمذی علیہ الرحمہ نے ابواب الدیات کے تحت ایک باب قائم کیا ہے، ''باب ماجاء فی الحبس فی تھمة'' اس باب کے تحت امام ترمذیؒ نے حضرت بہزبن حکیم کی سند سے مرفوعاً یہ حدیث نقل کی ہے: ''إن النبی ﷺ حبس رجلا فی تھمة ثم خلی عنه'' (ترمذی ۱/۲۶۱)

(حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو بر بنائے تہمت گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا پھر (جرم نہ ثابت ہونے پر) اس کو چھوڑ دیا)، قطاع الطریق کو جیل میں ڈالنا خود قرآن کریم میں مذکور ہے: "أو ینفوا من الأرض" (سورۃ المائدہ: ۳۳) (یا ان کو زمین سے نکال دیا جائے) زمین سے نکالنے کا کیا مقصد ہے تو اس سلسلہ میں سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ ایسے مجرم کو قید خانہ میں بند کر دیا جائے، کیوں کہ اگر قید خانہ میں نہ ڈالا جائے اور یونہی دوسرے شہر میں آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ وہاں بھی لوگوں کو ستائے گا، حضرت امام ابوحنیفہؒ بھی اسی کے قائل ہیں، شامی میں کتاب القضاء کے تحت مجرم کو قید خانہ میں ڈالنے کے سلسلہ میں ایک علیحدہ فصل ہے جس کا مطالعہ اہل علم کے لئے مفید ہے۔ امام قدوریؒ نے اپنی مشہور کتاب مختصر کے کتاب الحجر میں قرض خواہوں کے مطالبہ پر مفلس مقروض کو قید کرنے کا ذکر کیا ہے، لیکن کتنے دنوں تک تحقیق حال کے لئے قید رکھا جائے تو اس سلسلہ میں انہوں نے دو تین ماہ کا ذکر کیا ہے، جس کی شرح میں صاحب جوہرہ نے چار سے چھ ماہ تک قید خانہ میں محبوس رکھنے کی بھی روایت نقل کی ہے، اور آخر میں یہ فیصلہ سنایا ہے کہ:

''وهذا لیس بتقدیر وإنما هو علی حال المحبوس فمن الناس من یضجره الحبس القلیل ومنهم من لا یضجره الکثیر فوقف ذلك علی رأی الحاکم فیه فإذا لم یتبین للحاکم... بأن قامت البینة أوسأل جیرانه العارفین فلم یوجد له شئ أخرجه'' (الجوهرة النیره ۱/۳۰۰)۔

((قیدیوں کو محبوس رکھنے کی مذکورہ مدتیں) شرعاً متعین نہیں ہیں بلکہ یہ قیدی کے احوال پر مبنی ہیں، بعض قیدیوں کو معمولی قید بھی پریشان بنا دیتا ہے اور بعض قیدیوں کو بہت مدتوں تک بھی قید کرنے سے کوئی پریشانی نہیں ہوتی اس لئے حاکم کی صوابدید پر محبوس رکھنے کی مدت کے معاملہ کو چھوڑ دیا جائے، اگر گواہوں اور احوال جاننے والے پڑوسیوں سے معلوم کرنے پر کوئی جرم ثابت نہ ہو تو پھر ایسے قیدی کو چھوڑ دیا جائے گا)۔

فتاوی عالمگیری میں امام طحاویؒ کے حوالہ سے ایک مہینہ تک محبوس رکھنے کا ذکر ہے، اور بہت سے مشائخ نے امام طحاوی علیہ الرحمہ کی روایت پر فتوی دیا ہے۔ (فتاوی عالمگیری ۳/۴۱۵)۔

۲- جیل خانہ میں قیدیوں کو جو حقوق شرعاً حاصل ہوں گے ان کی تفصیل دلائل کے ساتھ ذیل میں لکھی جاتی ہے:

الف- ہر قیدی کو مذہبی امور کی انجام دہی میں آزادی ہوگی، اور اسے اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنے، مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرنے، اسی طرح اپنے مذہب کی دعوت دینے کا حق حاصل ہوگا، اسی طرح جس مذہب پر وہ عقیدہ رکھتا ہے اس کے لئے غذا کے فراہم کرنے میں اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا۔

نیز ہر قیدی کو اپنے مذہب کی مقدس شخصیتوں اور کتابوں کے احترام کرنے کی اجازت حاصل ہوگی، کسی بھی قیدی کو اپنے مذہب کے خلاف امور کے انجام دینے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ قرآن کریم کی سورۃ البقرہ میں خداوند قدوس کا فرمان ہے: "لا إکراه فی الدین" (سورۃ البقرہ/۲۵۶) (کسی دین کے قبول کرنے میں کسی شخص پر زبردستی نہیں کی جاسکتی)، قرآن کریم کا مذکورہ جملہ اس وقت نازل ہوا جب بعض صحابہ نے اپنی اولاد یا اپنے متعلقین کو زبردستی اسلام میں داخل کرنا چاہا، تو اللہ رب العزت نے زبردستی کسی شخص کو مسلمان بنانے سے منع کیا۔

ب- قیدیوں کی جسمانی ضروریات، مناسب غذا، صاف شفاف پانی، ستر پوشی کے لئے نیز جاڑے گرمی سے حفاظت کے لئے کپڑا، اسی طرح دوا علاج نیز حفظان صحت کے لئے جسمانی ورزش وغیرہ کا نظم کرنا بھی ان لوگوں پر واجب ہوگا جن کی نگرانی میں قیدیوں کو رکھا گیا ہے، سورہ الدھر آیات/ ۸-۹ میں قیدیوں کو کھانا کھلانے اور اس کے ذیل میں مفسرین نے قیدیوں کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کا ذکر کیا ہے، روایات حدیث میں غلاموں کو کھانا کھلانے، کپڑا پہنانے اور حسب استطاعت کام لینے کے سلسلہ میں جو ہدایات وارد ہوئی ہیں ان کی تعمیل قیدیوں کے

سلسلہ میں بھی ہوگی (ملاحظہ ہو، بخاری شریف، کتاب العتق ۱/۳۴۶)۔

اسی طرح قیدیوں کے رہنے کے لئے رہائش کا نظم کرنا بھی لازم ہے جہاں وہ رہ سکے، سو سکے، لیٹ سکے، اگر کسی حکومت نے یا کسی شخص نے کسی قیدی کو ایسی تنگ جگہ رکھا جہاں قیدی کا کھڑا ہونا یا پاؤں پھیلا کر لیٹنا یا دیوار کے باہر کسی کو دیکھنا ممکن نہ ہو تو یہ شرعاً اور اخلاقاً جائز نہیں ہے، جو حکومت یا شخص کسی قیدی کے ساتھ یہ سلوک کرتا ہے اس کا یہ فعل سراسر مذموم اور حد انسانیت سے گرا ہوا ہے۔

ج- قیدیوں کو عام لوگوں کی طرح سماجی حقوق بھی حاصل ہوں گے، مثلاً اخبارات کا پڑھنا، ریڈیو کا سننا، فون پر احباب واقارب سے گفتگو کرنا، دوسرے قیدیوں سے ملاقات کرنا یا عام لوگوں کا قیدیوں سے ملاقات کرنا اور اسی طرح جیل خانہ میں پردہ کے ساتھ بیوی سے ہمبستر ہونے کا موقع فراہم کرنا، دوران قید قیدیوں سے بچوں کو تعلیم دلانا، یا قیدیوں کو تعلیم دینا، اسی طرح قیدیوں کا کام کاج کرنا، کوئی ہنر سیکھنا یا اجرت لے کر کوئی کام کرنا وغیرہ ان تمام امور کے انجام دینے کی قیدیوں کو اجازت ہوگی، چنانچہ غزوہ بدر کے قیدیوں سے بچوں کو تعلیم دلوانا خود حضور پاک ﷺ کے عمل سے ثابت ہے۔

بیوی سے ہمبستری کا ذکر، اسی طرح جیل میں کمانے کا ذکر فتاوی عالمگیری میں ہے:

''ولو احتاج إلى الجماع لا بأس بأن تدخل زوجته أو جاريته في السجن فيطؤها حيث لا يطلع عليه أحد. (إلى قوله) وقال القاضي فخر الدين الفتوى اليوم على أنه لا يمنع من الاكتساب ولا يمنع المسجون من دخول أهله وجيرانه عليه ولكن لا يمكنون من أن يمكثوا ثمة طويلا'' (فتاوی عالمگیری، کتاب القضاء، الباب السادس والعشرون في الحبس ۳/۴۱۸)۔

(اگر قید میں محبوس بیوی سے جماع کے لئے پریشان ہو تو کوئی حرج نہیں ہے کہ اس کی بیوی یا باندی کو جیل خانہ میں جانے کی اجازت دی جائے تاکہ وہ قیدی اپنی بیوی سے (پردہ کے ساتھ) جماع کرلے کہ کوئی شخص اس کو نہ دیکھے، اور قاضی فخر الدین کے بقول مفتی بہ قول یہ ہے کہ قیدی کو جیل خانہ میں کمانے کھانے سے منع نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح قیدی سے ملنے کے لئے اس کے قرابت داروں، پڑوسیوں کو اس کے پاس پہنچنے سے روکا نہیں جائے گا۔ البتہ ملنے والوں کو قیدی کے پاس زیادہ دیر تک ٹھہرنے کا موقع نہیں دیا جائے گا)۔

الغرض قیدی کو جیل خانہ میں رہتے ہوئے ہر طرح کی سہولت دی جائے گی، البتہ جیل سے باہر نکل کر جمعہ، جماعت، نماز عید و نماز بقرعید، یا فریضہ حج کی ادائیگی، اسی طرح نماز جنازہ پڑھنے کے لئے جیل خانہ سے نکلنے کی اجازت نہ ہوگی، چنانچہ درمختار میں ہے:

''ولا يخرج لجمعة ولا لجماعة ولا لحج فرض فغيره أولى ولا لحضور جنازة اه'' (ردالمحتار کتاب القضاء، فصل في الحبس/ص ۳۴۹)

فتاوی ہندیہ میں ہے: ولايخرج المحبوس في الدين من السجن لمجي شهر رمضان ولا للفطر ولا للأضحى ولا للجمعة ولا لصلوة مكتوبة ولا لحجة فريضة ولا لحضور جنازة بعض أهله وإن أعطى كفيلا بنفسه كذا في المحيط'' (فتاوی عالمگیری ۳/۴۱۸)۔

ہاں اگر قیدی شخص کے والدین یا قریبی رشتہ دار کی تجہیز و تکفین کرنے والا کوئی دوسرا شخص نہ ہو تو کسی کفیل شخص کی ضمانت پر مفتی بہ قول کے مطابق قیدی کو نکلنے کی اجازت ہوگی، چنانچہ فتاوی عالمگیری میں ہے:

''إذا مات للمحبوس والد أو ولد ولم يكن بحضرته أحد للغسل والتكفين يخرجه القاضي من السجن هو الصحيح (إلى قوله) والفتوى على أنه يخرج في قرابة الولاد بكفيل، كذا في الكبرى'' (فتاوی ہندیہ ۳/۴۱۸)۔

(جب قید میں محبوس شخص کے والد یا لڑکے کی وفات ہو جائے اور وہاں کوئی شخص میت کو نہلانے اور کفن پہنانے والا نہ ہو تو قاضی قیدی کو قید خانہ سے نکلنے کی اجازت دے گا، یہی قول صحیح ہے، اور فتوی اس بات پر ہے کہ قیدی شخص کو اپنے قریبی رشتہ دار کی نماز جنازہ میں شرکت کی غرض سے کفیل کے ساتھ نکلنے کی اجازت ہوگی)۔

د- حضرات فقہاء نے تحفظ کی غرض سے مختلف قسم کے قیدیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ انتظام کرنے کی ہدایات کا بھی مفصل ذکر کیا ہے، چنانچہ اگر قیدیوں

میں کوئی عورت ہو تو اس کو مردوں سے علیحدہ رکھنے کی کتب فقہ و فتاوی میں صراحت کی گئی ہے، ہندیہ میں ہے:

''وینبغي أن یکون للنساء محبس علی حدة تحرزا عن الفتنة وعن أبي حنیفة رحمه اللّٰه تعالی أن المرأة تحبس في محبس النساء ولکن یحفظها الرجل... إلخ'' (فتاوی عالمگیری ۳/ ۴۱۴)۔

(فتنہ سے بچاؤ کی خاطر مناسب یہ ہے کہ عورتوں کا علیحدہ جیل خانہ ہو، اور حضرت امام ابوحنیفہ سے مروی ہے کہ عورتوں کو عورتوں کے جیل میں ہی محبوس رکھا جائے گا، البتہ عورتوں کی حفاظت اور نگہداشت کوئی مرد کرے گا)۔

اسی طرح نابالغ بچوں کو بالغ قیدیوں سے علیحدہ رکھنا مناسب ہے، کیوں کہ بالغ قیدیوں کے بگاڑ سے متاثر ہو کر بچوں کے بگڑنے اور دوسری اخلاقی خرابیوں میں ملوث ہونے کا قوی امکان ہے۔

اسی طرح جو بڑے مجرم قسم کے قیدی ہیں جیسے کوئی بڑا ڈکیت یا چور ہو تو ایسے مجرم قیدیوں کو عام قیدیوں سے علیحدہ رکھنا ہی مناسب ہے۔

(ملاحظہ ہو: درمختار، کتاب القضاء ۴/ ۳۵۰) واللہ سبحانہ وتعالی اعلم۔

۳- قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے دھمکانے کی خاطر ایسی جگہ اسے قید رکھا جائے گا جو سخت ہو، اس کے لئے نرم بستر کا انتظام نہ کیا جائے، اسی طرح اس کی دل جوئی کی خاطر کسی کو ملنے سے روکا جا سکتا ہے، جیسا کہ فتاوی عالمگیری میں ہے:

''وینبغي أن یحبس في موضع خشن لا یبسط له فراش ولا وطاء ولا أحد یدخل علیه لیستأنس لیضجر قلبه''۔

(مناسب ہے کہ قیدی کو کھردری جگہ رکھا جائے، اس کے لئے نرم بستر نہ بچھایا جائے اور نہ ہی اس کی دلجوئی کے لئے کوئی شخص اس کے پاس جائے تاکہ اس کا دل تنگ ہو)۔

لیکن قیدیوں کو قید خانہ میں بے لباس کر دینا یا مار پیٹ کرنا یا انہیں الکٹرک شاٹ لگانا یا قیدیوں پر کتے چھوڑنا یا قیدیوں کو سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈال دینا یا انہیں مسلسل جگے رہنے پر مجبور کرنا یا اس کی جائے رہائش میں تیز روشنی یا تیز آواز کا انتظام کرنا تو یہ سب صورتیں ناجائز ہیں، اور قیدیوں کے ساتھ انتہائی ظالمانہ رویہ ہے، جس کی نہ عقلاً اجازت ہے اور نہ ہی شرعاً کوئی گنجائش ہے بلکہ قیدیوں کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آنے اور ان کے ساتھ مذکورہ قسم کی بداخلاقی وظلم کا مظاہرہ کرنے سے حضرات فقہاء نے منع کیا ہے۔

چنانچہ درمختار میں ہے: ''ولا یغل ولا یجرد'' (شامی ۴/ ۳۵۰) (قیدیوں کے گردن میں بیڑی نہ ڈالی جائے، اور نہ اسے ننگا کیا جائے)۔

فتاوی عالمگیری میں قدرے تفصیل ہے: ''لا ینبغي للقاضي أن یضرب محبوسا في دینه ولا في غیره ولا یصفد ولا یقید ولا یغل ولا یمد ولا یجرد ولا یقیمه في الشمس'' (فتاوی ہندیہ ۳/ ۴۱۴)۔

(قاضی کے لئے قیدی کو مارنا جائز نہیں ہے خواہ وہ قیدی دین کے سلسلہ میں گرفتار ہوا ہو یا اس کے علاوہ میں، اور نہ ہی قیدی کو ہتھکڑی لگائی جائے، اور نہ اس کے پاؤں میں بیڑی ڈالی جائے، اور نہ ہی گردن میں طوق ڈالا جائے، اور نہ قیدی کو کھینچا جائے اور نہ اس کے بدن کا کپڑا اتارا جائے اور نہ اس کو دھوپ میں کھڑا کیا جائے)۔

اسی طرح فتاوی عالمگیری میں قیدی کو برف پر کھڑا رکھنے سے بھی منع کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو: حوالہ سابق ۳/ ۴۱۶)۔

الغرض قیدیوں کو دھمکانے کے لئے مذکورہ سزائیں دینا شرعاً اور عقلاً درست نہیں ہے۔

۴- جن قیدیوں کے بھاگنے کا خطرہ ہو ان کے پاؤں میں بیڑی ڈال کر چوروں کے جیل میں ڈالا جا سکتا ہے بشرطیکہ کوئی دوسرا خطرہ نہ ہو۔

چنانچہ درمختار میں ہے: ''إذا خاف فراره فیقید أو یحول لسجن اللصوص'' (شامی ۴/ ۲۵۰)۔

فتاوی عالمگیری میں اس مسئلہ کو قدرے تفصیل سے لکھا گیا ہے (ملاحظہ ہو: فتاوی ہندیہ ۳/ ۴۱۴)۔

۵- سخت قسم کے مجرم کو اس کے جرم کے پس منظر میں قید تنہائی کی سزا دی جا سکتی ہے، چنانچہ حضرات فقہاء نے ذکر کیا ہے کہ متعنت وسرکش قسم کے قیدی کو جیل

خانہ کی کوٹھری میں بند کر کے اس کے دروازہ کو مٹی گارے سے بند کر دینے کی قاضی کو اجازت ہے، چنانچہ در مختار میں ہے:

''وهل يطين الباب، الرأي فيه المقاضي، بزازيه'' (شامی ۴/ ۳۵۰)

(اور کیا کال کوٹھری کے دروازہ کو مٹی کے گارے سے بند کر دیا جائے تو اس سلسلہ میں قاضی کو اختیار ہے اور اس کی رائے کا اعتبار کیا جائے گا)۔

۶- قیدی سے جبراً کام لینا تو جائز نہیں ہے ہاں قیدی کی رضامندی سے اس کو اجرت دے کر اس سے ایسا کام لیا جا سکتا ہے جو قیدی کے لائق ہو، اور اس کام کی ادائیگی میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

''ولا أمنعه عن طلب قدر قوت يومه لنفسه ولعياله'' (عالمگیری ۳/ ۴۱۶)۔

(کسی قیدی کو اپنے اخراجات اور بچوں کی ضروریات کی تکمیل کے لئے روزی کی طلب سے روکا نہیں جا سکتا) لہٰذا اگر کوئی قیدی جیل خانہ میں کام کرے گا تو شرعاً اسے اجرت ملے گی۔

۷- جیل خانہ میں ہر قسم کے قیدی کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے گا، خواہ وہ قیدی سزائے موت والا ہو یا ابھی اس کا معاملہ اور مقدمہ عدالت میں زیر سماعت ہی کیوں نہ ہو، قیدیوں کی ضروریات کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے کچھ صالح بندوں کا یہ خصوصی وصف ذکر کیا ہے کہ وہ لوگ صرف رضائے الٰہی کی خاطر اپنے مال سے یتیم و مسکین اور قیدیوں کی ضرورتوں (مثلاً کھانا پینا- پہننا وغیرہ) کو پورا کرتے ہیں (ملاحظہ ہو: سورۃ الدھر/ ۸-۹)۔

مذہب اسلام کی رو سے جب جانوروں کو کھلانا پلانا باعث ثواب ہے، تو پھر انسانوں کو کھلانا پلانا، ان کے ساتھ حسن سلوک کا برتاؤ کرنا اگرچہ وہ قیدی ہی کیوں نہ ہوں، کیوں کر موجب اجر نہ ہوگا۔

۸- کسی بھی قیدی کو اتنے دنوں تک فیصلے سے پہلے دوران سماعت قید میں رکھنا جتنے دنوں تک ثبوت جرم کے فیصلہ کے بعد بطور سزا کے قید میں رکھا جائے گا، عقلاً و نقلاً درست نہیں ہے، بلکہ زیر سماعت قیدی کو اس کے جرم کی تحقیق کر کے جلد از جلد جرم کے ثابت نہ ہونے کی صورت میں رہا کر دینا چاہئے، اور اگر جرم ثابت ہو جائے تو پھر اس کو واجبی سزا دینے پر اکتفاء کرنا چاہئے۔

بر بنائے تہمت پکڑے گئے قیدی اور سزا کے مستحق قیدی کو قید میں رکھے جانے کی مدتوں میں ضرور فرق ہونا چاہئے، خود حضرات صحابہ نے شبہ کی بنا پر کسی شخص کو گرفتار کر کے باندھ دیا، پھر جب شبہ کا ازالہ ہو گیا تو اسے چھوڑ دیا، چنانچہ امام ابوداؤد نے کتاب الجہاد باب فی الاسیر یوثق کے تحت ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک سریہ میں حضرت حارث بن برصاء لیثی کو لوگوں نے گرفتار کر لیا، انہوں نے عذر پیش کیا کہ ہم مسلمان ہونے کے ارادہ سے حضور پاک ﷺ کی خدمت میں جانے کی غرض سے نکلے ہیں، تو صحابہ نے ان سے کہا کہ اگر آپ مسلمان ہیں تو ہمارے ایک دن ایک رات آپ کو گرفتار رکھنے سے آپ کو کچھ نقصان نہیں پہونچے گا، اور اگر آپ اس کے برعکس ہوں گے، تو ہم آپ کو باندھ کے رکھیں گے، چنانچہ صحابہ نے ان کو باندھ کر رکھا۔

''فقلنا إن تكن مسلما لم يضرك رباطنا يومًا وليلة وإن لم تكن غير ذلك نستوثق منك فشددنا وثاقا''

(ابوداؤد ۲/ ۳۶۳-۷)۔

اس واقعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی کو بر بنائے شبہ گرفتار کیا جائے تو جس قدر جلد ممکن ہو شبہ کا ازالہ کر کے فوراً اسے چھوڑ دیا جائے، خواہ مخواہ کسی شخص کو شبہ کی بنیاد پر گرفتار کر کے طویل مدت تک گرفتار رکھنا کوئی شریفانہ فعل نہیں ہے، اور نہ ہی شرعاً یا عقلاً اس قسم کے فعل کی اجازت ہے۔ واللہ اعلم۔

۹- اگر کسی ملزم کو قید میں رکھا گیا اور بعد میں عدالت نے اس کو بری کر دیا تو ایسی صورت میں زمانہ قید میں رہتے ہوئے جو اسے ذہنی و مالی اذیت پہونچی ہے تو اس کا مالی ہرجانہ طلب کرنا احقر کے نزدیک درست ہے۔ کیوں کہ دور حاضر میں بلا قصور لوگوں کو خواہ مخواہ پھنسا کر جیل خانہ بھیجوانے کا عام رواج ہو گیا ہے۔ اور اگر کوئی بلا قصور شخص پکڑا گیا تو وہ شخص جیل سے چھوٹنے کے بعد اگر اپنے نقصان کا مالی معاوضہ وصول کرے تو شرعاً یہ درست ہے تاکہ بلا قصور شخص کو گرفتار کرانے کی وبا میں کمی آئے۔

حضرات فقہاء نے پانچ امور میں ضمان کو واجب کیا ہے (۱) اعیان (۲) منافع (۳) زوائد (۴) نواقص (۵) اوصاف۔

مندرجہ ذیل پانچوں امور کی تشریح کے لئے قاموس الفقہ جلد چہارم بحث ضمان ۳۱۸-۳۲۴ کا مطالعہ کیا جائے۔

فقہاء احناف نے اگرچہ منافع کے ضیاع کی صورت میں ضمان کو واجب نہیں کیا ہے، لیکن ہمارے زمانہ کے حالات اور سماج میں شر پسند عناصر کے غلبہ کو دیکھتے ہوئے اگر احناف کی رائے پر عمل کیا جائے تو شر پسند عناصر کو جہاں مزید جرم کے کرنے کا حوصلہ ملے گا وہیں تقاضائے انصاف بھی مجروح ہوگا، اس لئے فی زمانا جمہور کا نقطۂ نظر قرین ثواب معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

۱۰- قیدی کو اپنے مقدمات کے سلسلہ میں وکیل سے رابطہ اور صفائی پیش کرنے سے متعلق دور حاضر کے حالات میں بہت سے حقوق حاصل ہیں، جن کو دنیا کے قانونی دستاویزوں میں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے جن میں سے چند کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

۱- قیدخانے میں لائے جانے والے ہر فرد کی حراست سے متعلق درست حکم نامے کی جانچ کی جائے۔

۲- مقام حراست میں باضابطہ رجسٹر ہو جس میں تمام قیدیوں کی آمد کی تاریخ، وقت اور ان کے معاملات کی پوری تفصیل درج ہو، نیز وہاں عدالتی شخصیتوں اور قیدیوں کو حقوق دلانے والے اشخاص کی رسائی ممکن ہو۔

۳- قیدیوں کی شناخت کے لئے ان کے معاملات کا پورا اندراج ہو تاکہ یقین کے ساتھ بتایا جاسکے کہ ان کی حراست قانون کے دائرے میں ہوگئی ہے، نیز اندراجات کی نمبرنگ ہو تاکہ غیر متعلق ڈاٹا کا اس میں اندراج نہ ہوسکے۔

۴- جب کسی قیدی کا جرم ثابت نہ ہو تو ایسی صورت میں حراست کے لئے لکھا ہوا قانونی حکم نامہ ضروری ہے جس میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہو کہ وہ آدمی کس دن عدالت کے سامنے پیش ہوگا۔

۵- جتنا جلد ممکن ہو قیدیوں کو یہ سہولت دی جائے کہ وہ اپنے اہل خانہ اور قانونی نمائندوں کو اپنا اتہ پتہ بتاسکیں۔

۶- نیز پناہ گزیں قیدیوں سے بین الحکومتی اداروں کے بااختیار افراد کو یا قیدیوں کے متعلقین کو ملنے اور رابطہ رکھنے کا موقع فراہم کیا جائے۔

۷- قیدخانہ میں داخل کئے جانے کے بعد فوراً ماہر ڈاکٹروں سے قیدیوں کا چیک اپ کرایا جائے۔

۸- قیدخانہ میں داخل کئے گئے تمام قیدیوں کو قیدخانہ کے اصول وضوابط اور دستور العمل کا ایک نسخہ ضرور دیا جائے۔

۹- جو قیدی علاقائی زبان نہ جانتا ہو یا ان پڑھ اور معذور ہو ان کی آگاہی کا کوئی مناسب حل نکالا جائے۔

۱۰- قیدیوں کو دیئے گئے حقوق کا انہیں علم ہو تاکہ وہ اپنے حقوق کو حاصل کرسکیں یا ظلم وجبر کی صورت میں شکایت کرسکیں۔

۱۱- خواتین قیدی کے ساتھ جیل میں ان کے شیر خوار بچوں کو رکھنا

اگر کوئی خاتون (عورت) قید کی گئی اور اس کی گود میں کوئی شیر خوار بچہ ہے تو اپنے ساتھ جیل میں شیر خوار بچہ کو رکھنے کا بھی شرعاً اور عرفاً حق حاصل ہے، چنانچہ امام ابوداؤد نے کتاب الجہاد میں باب فی التفریق بین السبی کے نام سے ایک باب قائم کیا ہے جس میں یہ روایت درج کی ہے:

''عن علی رضی اللہ عنہ أنہ فرق جاریۃ وولدھا فنھاہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' (ابوداؤد، ج۲)

(حضرت علیؓ نے (قید کی گئی) ایک خاتون اور اس کے بچہ کو باہم جدا کردیا تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اس سے منع فرمایا)۔

حضرات فقہاء نے والدہ اور ولد کے علاوہ دیگر قرابت داروں کے درمیان تفریق کرنے اور اس کی مدت کے سلسلہ میں مفصل بحث کی ہے، مذکورہ باب کے تحت شروح ابوداؤد کا مطالعہ کیا جائے (ملاحظہ ہو: الدر المنضود ۴/ ۴۲۴)۔

☆☆☆

قیدیوں کے مسائل اور حقوق

مفتی تنظیم عالم قاسمی[1]

اسلام سراپا رحمت اور شفقت ہے، اس مذہب میں عدل واحسان کی بارہا تاکید کی گئی ہے اور یہی اس مذہب کی روح ہے، ظلم وزیادتی، ناحق مار پیٹ، ستانا اور کسی کو خواہ مخواہ پریشان کرنا اس مذہب میں جائز نہیں، اسلام کی نظر میں مرد وعورت امیر وغریب، محتاج اور غنی سب برابر ہیں، کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں، اس لئے کسی امیر کو غریب کے ساتھ ناروا سلوک کرنے کی اجازت نہیں دی گئی اور نہ ہی کسی صاحب طاقت کو بے کس اور کمزوروں پر اپنی طاقت استعمال کرنے حق دیا گیا ہے۔

انسان ہونے کے اعتبار سے قیدیوں کے ساتھ بھی حتی الامکان حسن سلوک رکھا جائے گا، قیدیوں سے کوئی ایسا برتاؤ نہ کیا جائے جو غیر انسانی ہے، کیونکہ جرائم تو بہر حال انسان سے ہی ہوتے ہیں، جانوروں سے نہیں ہوتے، اس لئے انسانیت کا احترام بہر حال لازم ہے، جس طرح غلام سے غلامیت کے باوجود آدمیت کے خواص باطل نہیں ہوتے، اسی طرح قیدیوں سے انسانیت باطل نہیں ہوگی۔

''وماكان من خواص الآدمية في الرقيق لا يبطل بل يبقى على أصل الحرية'' (فتح القدير: ۴۴/۳)

ایک انسان کو انسان ہونے کی حیثیت جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے انھیں بہر حال فراہم کیا جائے گا، جیسے پیٹ بھر کھانا، پیاس بجھانے کے لئے پانی فراہم کرنا، تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا مہیا کرنا وغیرہ۔ لہذا قیدیوں کو بھوکا، پیاسا رکھنا یا بے لباس کرنا جائز نہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی قریظہ کے قیدیوں کے بارے میں اپنے صحابہ کرام کو ہدایت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا:

''أحسنوا إسارهم وقيلوهم واسقوهم، وقال: لا تجمعوا عليهم حر هذا اليوم وحر السلاح'' (الموسوعة الفقهية: ۱۹۸/۴)

(انہیں خوش اسلوبی سے اور حسن سلوک سے قید کرو، انہیں آرام کا موقع دو، کھلاؤ، پلاؤ اور تلوار اور اس دن کی گرمی دونوں کو یکجا مت کرو)۔

جن دنوں میں بنو قریظہ کے قیدیوں کو قید کیا گیا تھا، وہ گرمی کے ایام تھے، تپش زیادہ تھی، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور خاص دن کی گرمی دھوپ اور قیلولہ کے لئے مواقع فراہم کرنے کی تاکید فرمائی، کیونکہ گرمی کے ایام میں قیدیوں کی گرمی کا خیال نہ رکھنا، انہیں دھوپ میں چھوڑ دینا بلکہ آرام کا موقع نہ دینا بھی غیر اسلامی حرکت ہے اور قیدیوں کے ساتھ غیر انسانی حرکت جائز نہیں۔ معلوم ہوا کہ قیدیوں کو الکٹرک شاٹ لگانا، قیدیوں پر کتے چھوڑنا، قیدیوں کو سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈال دینا، حد سے زیادہ مار پیٹ کرنا، مسلسل جگے رہنے پر مجبور کرنا یا ان کی جائے رہائش میں تیز روشنی یا تیز آواز کا انتظام کرنا شرعاً درست نہیں ہے۔

چوری، قتل وغارت گری، زنا کاری، شراب نوشی، ظلم وزیادتی اور اس طرح کے دیگر جرائم یقیناً اسلام کی نظر میں بھی انتہائی شنیع اور قابل مذمت ہیں، ان کے مرتکبین سخت سے سخت سزا کے مستحق ہیں لیکن شریعت نے اس کے بھی حدود متعین کئے ہیں اور ان میں اہم چیز انسانیت کا احترام ہے، ہر وہ سزا جس سے آدمیت کی توہین ہوتی ہو جائز نہیں ہے۔ اسیران بدر میں ایک شخص سہیل بن عمرو تھا جو نہایت فصیح اللسان تھا اور عام مجمعوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا، حضرت عمرؓ نے کہا: یا رسول اللہ! اس کے دو نیچے کے دانت اکھڑوا دیجئے کہ پھر اچھا نہ بول سکے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اگر اس کے عضو بگاڑوں تو گو نبی ہوں لیکن خدا اس کی جزا میں میرے اعضاء بھی بگاڑے گا (تاریخ طبری/ ۱۳۴۴)، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں توہین آمیز کلمات کہنا یقیناً بڑا جرم ہے،

---

[1] استاذ حدیث دار العلوم سبیل السلام، حیدرآباد۔

لیکن اس کے باوجود اس کے عوض میں دانت اکھاڑنے کی رائے قبول نہیں کی گئی، اس لئے کہ یہ مثلہ کے دائرے میں آتا ہے، اسی طرح دانت اکھاڑنے سے ایک عضو سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتا جو انسانی ضرورت ہے۔ اس سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ قیدیوں کو اس طرح بے تحاشہ نہیں مارا جائے گا اور نہ کوئی ایسی سزا دی جائے گی جس کے سبب ان کا کوئی عضو شل اور ضائع ہو جائے، ان کے کسی عضو کی منفعت ختم ہو جائے کیوں کہ یہ غیر انسانی اور رحم وکرم کے خلاف ہے۔

اسلام میں حقوق انسانی اور بنیادی آزادی کے تحفظ کا مکمل لحاظ رکھا گیا ہے، غیر انسانی یا ذلت آمیز سلوک کی قطعاً گنجائش نہیں، آج کل دنیا کے مختلف ممالک میں قیدیوں کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا جاتا ہے وہ نامناسب بلکہ ناجائز ہے جیسے قیدیوں کو ٹارچر کرنا، تفتیش وتحقیق کے نام پر الٹا لٹکا دینا، ایسی جگہ قید کرنا جہاں بیٹھنے، لیٹنے اور آرام کر... کی گنجائش نہ ہو، بے لباس کرنا وغیرہ، ابوغریب جیل میں جو سزائیں دی جاتی ہیں کون سا دل ہے جو ان سزاؤں کی کیفیت سن کر تڑپ نہ ہو اور ان سزاؤں کی تصویر دیکھ کر رونگٹے کھڑے نہ ہوتے ہوں، دیگر شعبہائے حیات کی طرح اس شعبے میں بھی اسلام نے عدل واحسان پر مبنی تعلیمات اور اصول پیش کئے ہیں، اس سلسلے میں جنگ بدر کے قیدیوں کے احوال پیش کئے جا سکتے ہیں، مشہور سیرت نگار علامہ شبلی نعمانیؒ اسیران بدر کے ساتھ صحابہ کرام کے سلوک کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"صحابہ نے ان کے ساتھ یہ برتاؤ کیا کہ ان کو کھانا کھلاتے تھے اور خود کھجور کھا کر رہ جاتے تھے، ان قیدیوں میں ابوعزیز بھی تھے جو حضرت معصب بن عمیر کے بھائی تھے، ان کا بیان ہے کہ مجھ کو جن انصاریوں نے اپنے گھر میں قید کر رکھا تھا، جب صبح یا شام کا کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوریں اٹھا لیتے، مجھ کو شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دیتا لیکن وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے اور مجھ ہی کو واپس دیتے، اور یہ اس بنا پر تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید کی تھی کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے" (سیرۃ النبی: ۱/۳۳۰)۔

ایسے لوگ جو جنت میں جائیں گے، ان کے اوصاف بیان کرتے ہوئے ایک وصف یہ بھی بیان کیا کہ وہ لوگ قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے، ارشاد باری ہے:

"ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینًا ویتیمًا وأسیرًا" (سورۃ الدھر: ۸) (اور کھلاتے ہیں کھانا اس کی محبت پر محتاج کو اور یتیم کو اور قیدی کو) "قیدی" سے مراد ظاہر ہے کہ وہ قیدی ہے جس کو اصول شرعیہ کے مطابق قید میں رکھا گیا ہو خواہ وہ کافر ہو یا مسلمان مجرم، چونکہ مجرم قیدیوں کو کھانا کھلانا حکومت کی ذمہ داری ہے، اگر کوئی شخص قیدیوں کو کھلاتا ہے تو گویا اسلامی بیت المال کی اعانت کرتا ہے بالخصوص ابتدائے اسلام میں جب کہ بیت المال کا کوئی منظم نظام نہیں تھا، اس لئے صحابہ کرام میں قیدیوں کو تقسیم کر کے ان کے کھانے پینے اور ضروریات زندگی کی تکمیل کی جاتی تھی۔

تاہم قرآن واحادیث سے قیدیوں کو زنجیروں سے جکڑنے، ہتھکڑیاں لگانے اور پاؤں میں بیڑیاں لگانے کی اجازت معلوم ہوتی ہے کہ مجرم کی شوکت ختم ہو جائے اور اس کی شر سے لوگ محفوظ رہیں، ارشاد باری ہے، "فإذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی أثخنتموھم فشدوا الوثاق" (سورہ محمد: ۴) (سو جب تمہارا مقابلہ کافروں سے ہو جائے تو ان کی گردنیں مار چلو یہاں تک کہ جب ان کی خوب خونریزی کر چکو تو خوب مضبوط باندھ لو)۔

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فوج کا ایک دستہ قبیلہ نجد کی طرف روانہ فرمایا، ان لوگوں نے یمامہ کے رئیس ثمامہ بن اثال کو گرفتار کر لیا، ان کو مدینہ لے کر آئے اور مسجد نبوی کے ایک ستون سے اچھی طرح باندھ دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کوئی نکیر نہیں فرمائی بلکہ جب ان کے پاس سے آپ کا گذر ہوتا تو سوال کرتے "ماذا عندک یا ثمامۃ"؟ (تمہارا میرے بارے میں کیا خیال ہے) - وہ جواب میں کہتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں میرا اچھا اور بہتر خیال ہے، اگر آپ قتل کریں تو ایک واجب القتل کو قتل کریں گے اور اگر آپ چھوڑ دیں تو ایک شکر گزار شخص کو چھوڑیں گے، اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مال ودولت مطلوب ہے تو فرمائیے مال حاضر کر دوں گا، ایمان قبول نہ کرنے کی بنیاد مصلحتاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تین دن تک اس طرح ستون میں بندھا ہوا رکھا اور یہی سوال وجواب ہوتا رہا، تیسرے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چھوڑ دینے کی ہدایت دی، وہ قید سے آزاد ہوئے، دل میں آپ کی محبت اور ایمان کی الفت گھر کر چکی تھی، غسل کے بعد ایمان قبول کر لیا (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۲۳۳۱)۔

اس زمانے میں باضابطہ کوئی قید خانہ نہیں تھا، قیدیوں کو اسی طرح باندھ کر بے بس کیا کرتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیدیوں کو باندھنا، ہتھکڑیاں پہنانا اور پاؤں میں بیڑیاں ڈالنا جائز ہے، "فی الحدیث دلالۃ علی جواز الاستیثاق من الأسیر الکافر بالرباط والغل والقید وما یدخل فی معناھا إن خیف انفلاتہ ولم یؤمن شرہ إن ترك مطلقا" (عون المعبود: ۷/۲۲۷)، اگر قیدیوں کو بھاگنے یا ان کے بے بس نہ ہونے کا اندیشہ ہو تو ان کو تصرفات سے روکنے کے لئے قید کرنے کے ساتھ آنکھوں پر پٹی باندھی جا سکتی ہے یا تنہا کسی مکان میں قید کیا جا سکتا ہے۔

علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں: ''فإن الحبس الشرعی لیس هو السجن فی مكان ضيق وإنما هو تعويق الشخص ومنعه من التصرف بنفسه'' (فتاوی ابن تیمیہ ۳۵/ ۳۹۸)۔

یعنی قید کا اصل مقصد قیدیوں کو اپنے تصرفات اور شرارت سے روکنا ہے اور اس کے لئے تمام قیدیوں کو ان کے ذاتی حالات کے تناظر میں دیکھا جائے گا، ہر قیدی کا مزاج، قوت طاقت اور منصوبے الگ الگ ہوتے ہیں، اگر کسی قیدی کے بارے میں اطمینان ہو کہ یہ نہیں بھاگے گا تو اسے ہتھکڑی یا بیڑی لگانے کی ضرورت نہیں، اور اگر کوئی قیدی طاقتور ہو، اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا ہو، فرار ہونے کا احتمال ہو تو اس کی آنکھوں پر پٹی بھی باندھی جاسکتی ہے وغیرہ وغیرہ، غرض یہ کہ اصل مقصد قیدیوں کو زیر کرنا اور ان کے شوکت کو ختم کرنا ہے اس کے لئے جیل میں ڈالنا ضروری نہیں، یہ مقصد جس طرح بھی حاصل ہو وہ قید شرعی میں داخل ہے (دیکھئے: الموسوعۃ الفقہیہ طبع کویت ۴/ ۱۹۶)۔

سرکش قیدیوں کو معمولی جسمانی اذیت بھی دی جاسکتی ہے، اس کے جواز پر عہد نبوی کے اس واقعے سے روشنی پڑتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر کے موقع پر قریش کے حالات معلوم کرنے کے لئے بعض صحابہ کو مامور کیا، ان حضرات نے ابوسفیان کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنے کی غرض سے ایک غلام کو گرفتار کرلیا اور اس کی پٹائی بھی کرتے رہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت نماز پڑھ رہے تھے، جب نماز سے فارغ ہوئے تو غلام کی پٹائی پر کسی ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ فرمایا کہ غلام صحیح کہتا ہے، اس کو ابوسفیان کا علم نہیں (ابوداؤد، حدیث: ۲۳۳۲) لیکن یاد رہے کہ کوئی بات اقرار کرانے یا کسی جانکاری کے حصول کے لئے صرف معمولی ضرب ہی لگائی جاسکتی ہے، غیر انسانی مار جیسے ضرب شدید، ٹارچر کرنا، کرنٹ لگانا وغیرہ کسی بھی صورت میں جائز نہیں، ایسے قیدیوں کو زیادہ سے زیادہ طویل عرصے تک کے لئے قید خانہ میں ڈالا جاسکتا ہے، یا مصلحت دیکھی جائے اور شر و فساد زیادہ ہو تو قتل کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ باغیوں کو قتل کی اجازت ہے۔

(دیکھئے: تبیین الحقائق ۲/ ۲۹۴ مکتبہ امدادیہ ملتان)۔

ابن قدامہ حنبلی ایک جگہ قیدیوں سے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وہ قیدی جو خود سپردگی سے گریز کرے اور قید کرنے والے احکامات کی بجاآوری سے انکار کرے یا مقابلہ آرائی کے لئے آمادہ ہو جائے تو اسے ساتھ چلنے پر مجبور کیا جائے گا، خواہ اس کے لئے طاقت کا استعمال کرنا پڑے، اور اگر اس طرح سختی کارگر ثابت نہ ہو تو اسے سزائے موت دی جاسکتی ہے کیوں کہ اس کا زندہ باقی رہنا اہل کفر کے لئے باعث تقویت اور مسلمانوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگا (المغنی لابن قدامہ: ۸/ ۳۷۷)۔

اس جزیئے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قیدی جب کنٹرول سے باہر ہو جائے تو اس کو زیر اور ناتواں کرنے کے لئے مصلحتاً کوئی ایسا کام کیا جاسکتا ہے جس سے قیدی کی قوت و شوکت ٹوٹ جائے بشرطیکہ وہ کام غیر انسانی نہ ہو، ان ساری باتوں اور بحثوں پر غور کیا جائے تو قیدیوں سے متعلق دو باتیں واضح ہوتی ہیں:

(۱) قید کرنے کا مقصد قیدیوں کو زیر کرنا اور ان کی طاقت کو کچلنا ہے، یہ مقصد جس طرح حاصل ہو اس کے ساتھ ویسا معاملہ کیا جاسکتا ہے۔

(۲) مجرموں کا جرم خواہ کتنا بھی سنگین ہو وہ انسان ہی رہتا ہے لہذا سزا دیتے ہوئے ان کی انسانیت کا خیال رکھا جائے اور کوئی غیر انسانی سزا نہ دی جائے۔

دراصل اسلام انسانی حقوق اور بنیادی آزادی کے تحفظ کا پابند کرتا ہے اور کوئی ایسے عمل کی اجازت نہیں دیتا جو حقوق انسانی اور بنیادی آزادی کو متاثر کرتا ہو جیسے انسان کے زندہ رہنے کے لئے مناسب غذا، صاف پانی کی ضرورت ہے، قیدیوں کو اس سے محروم نہیں رکھا جائے گا، اسی طرح علاج و معالجہ، حفظان صحت کے لئے ورزش و تفریح، بیوی سے جنسی تعلق وغیرہ ضروریات زندگی کی تکمیل کی انہیں مکمل اجازت ہوگی کہ یہ چیزیں انسانی حقوق میں داخل ہیں، مذہبی امور میں بھی ان سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا، جس مذہب کو وہ مانتا ہے اس کی یا اس مذہب کے پیشواؤں اور کتابوں کی توہین نہیں کی جائے گی، اور نہ دوسرے مذہب کے قبول کرنے پر انہیں مجبور کیا جائے گا، مذہبی کتابوں کے مطالعہ، مذہبی تعلیمات کے مطابق غذا فراہم کرنا، دوسرے قیدیوں کے درمیان دعوت دین یہ سب مذہبی امور ہیں جو انسان کی بنیادی حقوق اور بنیادی آزادی میں شامل ہیں، کسی جرم کے سبب ان کے یہ حقوق ختم نہیں ہوں گے، یہی وجہ ہے کہ عام حالات میں مشرک سے اور ذمی و مستامن سے ان کے عقائد و مذہب سے تعرض کرنے سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے جب کہ شرک بہت بڑا جرم ہے، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے انسانی اور بنیادی حقوق سے کوئی تعرض نہیں فرمایا۔

بنیادی حقوق میں اخبارات پڑھنے، ریڈیو سننے، فون پر احباب واقارب سے گفتگو کرنے، دوسرے قیدیوں سے ملاقات، تعلیم اور ہنر سیکھنا بھی داخل ہے، ان حقوق سے انہیں محروم نہیں کیا جائے گا، البتہ فون پر بات چیت میں اگر اندیشہ ہو کہ اس کے ذریعے وہ سازش کرسکتا ہے تو اسے روک دیا جائے گا، ورنہ عام

حالات میں اس کی اجازت ہوگی، جیسا کہ شریعت نے عورتوں کو اجازت دی ہے کہ وہ ہفتہ میں ایک بار اپنے والدین سے اور سال میں ایک مرتبہ اپنے دیگر محارم سے ملاقات کر سکتی ہیں اور شوہر کو روکنے کا حق حاصل نہ ہوگا کیوں کہ یہ ان کا بنیادی حق ہے۔

''فلا تخرج إلا لحق لها او عليها أو لزيارة أبويها كل جمعة مرة أو لمحارم كل سنة'' (درمختار: ۱/ ۲۰۲)

،قیدیوں کو قید خانہ سے فرار ہونے کے خوف سے نکلنے کی اجازت تو نہ ہوگی البتہ فون پر بات چیت یا سلاخوں سے رشتہ داروں سے ملاقات سے نہیں روکا جائے گا، اسی طرح حکومت کو چاہئے کہ اخلاقی امور کی طرف بطور خاص توجہ دے، مثلاً مردوں اور عورتوں کو الگ الگ قید خانے میں رکھیں تاکہ دونوں کے باہم اختلاط کے سبب مسائل پیدا نہ ہوں، اسی طرح بالغ اور نابالغ بچوں کے قید خانے بھی الگ کئے جائیں کہ جنسی استحصال وہراسانی کی شکایت کا موقع نہ ہو، یہ تمام امور، یعنی مذہبی امور، عام سماجی حقوق، جسمانی ضروریات وغیرہ انسانی حقوق میں شامل ہیں جن کی فراہمی کی شریعت نے نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ مختلف نوعیتوں سے ان کی تاکید کی گئی ہے، چونکہ انسان کو آزادی جیسی عظیم نعمت سے محروم رکھنا ہی ایک سخت سزا ہے، قید فی نفسہ بہت سے حقوق سے بے انتہاء محرومی کا نام ہے، اسی لئے شریعت نے مخصوص حالات ہی میں قید وبند کی سزا کی اجازت دی ہے، جب یہ سزا دے دی گئی تو قیدیوں کے لئے یہی سزا کافی ہے، اب مزید حقوق انسانی یا بنیادی آزادی سے محروم رکھنے کی نہ ضرورت ہے اور نہ ہی شرعاً جائز ہے۔

۱- اصل تو یہی ہے کہ ثبوت جرم کے بعد قید کیا جائے لیکن ثبوت فراہم ہوتے ہوتے اگر مجرم کو فرار ہونے کا خوف ہو تو بطور احتیاط پہلے بھی قید کیا جا سکتا ہے، اس کے لئے مدت کی تعیین کے سلسلے میں میرا رجحان ہے کہ حکومت اور محکمۂ جرائم کو اس کا اختیار دے دیا جائے اگرچہ بعض لوگوں نے ایک مہینہ کی مدت متعین کی ہے:

''واختلفوا في مقدار الحبس في التهمة هل هو مقدر أو مرجعه إلى اجتهاد الإمام على قولين ذكرهما القاضي أبو يعلى والقاضي الماوردي وغيرهم وقيل: هو مقدر بشهر'' (فتاوی لابن تیمیہ ۳۵/ ۳۹۹)۔

۲- قیدیوں کو مذہبی امور، اخلاقی امور، عام سماجی حقوق اور جسمانی تمام ضروریات کی تکمیل کا حق حاصل ہوگا کہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادی سے ان کو علیحدہ رکھنا درست نہیں ہے۔

۳- قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے غیر انسانی مار مارنا جائز نہیں اور نہ ہی بے لباس کرنا، الکٹرک شاٹ لگانا، کتے چھوڑنا جائز ہے۔ (تفصیل اوپر آچکی ہے)

۴- قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑنا، ہاتھ میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ڈالنا بضرورت جائز ہے۔

۵- کسی خصوصی جرم کے پیش نظر قید تنہائی دی جا سکتی ہے، یہ سزا غیر انسانی نہیں۔

۶- قیدیوں کی وسعت کے بقدر ان سے جبراً کام لیا جا سکتا ہے اور وہ اجرت کے مستحق نہیں ہوں گے، ضروریات زندگی قید خانہ سے ان کو حاصل ہونے کے سبب جیسا کہ بیوی کو نفقہ ملنے کے سبب وہ شوہر سے کام کی اجرت طلب نہیں کر سکتی۔

۷- جن قیدیوں کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے ان کے ساتھ سلوک بہتر کیا جانا چاہئے کہ ان کا جرم ابھی ثابت نہیں ہوا ہے، قید خانہ میں ڈالنا یہ خود ایک بڑی سزا ہے، دونوں میں فرق ہوگا۔

۸- زیر سماعت قیدیوں کو جتنا جلد ہو سکے چھوڑنے کی کوشش کرنی چاہئے، تا آنکہ جرم ثابت ہو جائے اور عدالت کا کوئی فیصلہ سامنے آجائے۔

۹- اگر ملزم کو بعد میں عدالت نے بری کر دیا تو زمانۂ قید میں ہونے والی ذہنی اذیت اور مالی ہرجانہ طلب کر سکتا ہے۔

۱۰- قیدی کو مکمل حق حاصل ہے کہ وکیل سے رابطہ کر کے اپنی صفائی پیش کرائے، شریعت نے شہادت کا سلسلہ اسی وجہ سے رکھا ہے۔

۱۱- خواتین کو اپنے ساتھ شیر خوار بچوں کو جیل میں رکھنے کا حق حاصل ہے، آپ ﷺ نے ایسے شخص پر لعنت کی ہے جو غلام اور اس کی ماں میں یا محرم میں تفریق کر دے، اس کی علت قطع رحمی ہے، ماں اور بیٹا کا مسئلہ اس سے زیادہ اشد ہے۔

قیدیوں کے حقوق

مولانا ابرار حسن ایوبی ندوی [1]

۱- قانون اسلامی اس سلسلہ میں تمام قدیم وجدید قوانین سے ممتاز ہے کہ وہ انسان کو من حیث الانسان جب تک اس کا جرم ثابت نہ ہو جائے بری اور بے گناہ سمجھتا ہے، انسان کی تکریم وتعظیم کے پیش نظر اس کا مشہور قاعدہ ہے: ''الأصل براءة الذمة'' (القواعد الفقهية/ ۲۱۸، للأستاذ على أحمد الندوى)، اس نے انسان کی جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کا پورا سامان کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس نے ملزمین (فقہ اسلامی کی اصلاح میں متہم) کی ان کے حالات کے لحاظ سے درجہ بندی کی ہے، تاکہ معصوم پر آنچ نہ آئے اور مجرم قانون کی گرفت سے بچ نہ سکے، الزام جس کو فقہاء کی اصلاح میں ''دعاوی'' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، کی دو قسمیں ہیں: (۱) دعوی تہمت (۲) دعوی غیر تہمت۔

(۱) دعوی تہمت: ......ملزم کی طرف ایسے اعمال کو منسوب کرنا جن کا کرنا اس کے لئے حرام ہو اور موجب سزا ہو جیسے قتل، ڈاکہ زنی، چوری وغیرہ یا اس کے علاوہ ایسا حرام کام کرنا جس کو چھپ کر انجام دیا جاتا ہو اور گواہی کا اس پر قائم کرنا دشوار ہو (دیکھئے: مجموعہ فتاوی ابن تیمیہ ۳۵/ ۳۹)۔

دعوی کی دوسری قسم دعوی غیر تہمت ہے، یہ دعوی مختلف قسم کے عقود بیع، قرض، رہن اور ضمان کے تعلق سے ہو سکتا ہے یا ایسے افعال کے تعلق سے ہو سکتا ہے جس کا کرنا حرام نہ ہو، مثلاً بیع یا قرض یا مہر کی وجہ سے کسی کے ذمہ میں دین کا ثابت ہونا وغیرہ۔

فتاوی ابن تیمیہ میں ہے: ''وغير التهمة أن يدعى دعوى عقد من بيع أو قرض أو رهن أوضمان أو دعوى لايكون فيها سبب فعل محرم مثل دين ثابت فى الذمة من ثمن بيع أوقرض أوصداق وما إلى ذلك'' (مجموع فتاوى ابن تيميه ۳۵/ ۳۹۰)۔

سوال نامہ کا ظاہر بتاتا ہے کہ سوالات کا تعلق قسم اول سے ہے قسم ثانی سے نہیں اور یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ ملزمین جن پر تہمت لگائی گئی ہے اور جرم ابھی ثابت نہیں ہوا ہے ان کو متہم اور اس قسم کے الزامات کو ''دعاوی متہم'' کہا جاتا ہے۔

ایسے اشخاص کے متعلق کوئی بات مطلق طور پر نہیں کہی جاسکتی، بلکہ دینداری اور بے دینی اور جرائم میں تلوث یا عدم تلوث کے لحاظ سے ان کی تین قسمیں کی جاسکتیں ہیں:

۱- ایسے لوگ جو تقوی وطہارت اور دینداری میں مشہور ومعروف ہوں اور جرائم سے ان کا دامن داغ دار نہ ہو۔

۲- ایسے لوگ جن کی نیکی یا بدی کی جہت واضح نہ ہو، یعنی مجہول الحال ہوں۔

۳- ایسے لوگ جو فسق وفجور میں مشہور ہوں اور ماقبل میں کوئی جرم ثابت بھی ہو چکا ہو (دیکھئے: مجموع فتاوی ابن تیمیہ ۳۵/ ۳۹۷-۳۹۹، ۳۴/ ۲۳۶)۔

مذکورہ بالا افراد کے سلسلہ میں قید یا عدم قید کے احکامات: قسم اول سے تعلق رکھنے والے افراد (معروف بالورع والتقوى) کو بالاتفاق نہ تو قید کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کوئی سزا دی جاسکتی ہے، بلکہ بعض فقہاء کے مطابق تو ان سے قسم بھی نہیں لی جاسکتی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر جس نے ان کی آبرو کو داغ دار کرنے اور تاذی کے لئے الزام لگایا ہے اسے سزا دی جائے گی۔

دوسری قسم (مجہول الحال) سے تعلق رکھنے والے افراد جن کی دین داری یا بے دینی، اسی طرح جرائم میں تلوث یا عدم تلوث واضح نہ ہو، قرائن کی بنیاد پر ایسے

---

[1] مرکز الامام ابی الحسن علی الحسنی الندوی للبحوث والدعوۃ والفکر الاسلامی، دار عرفات تکیہ کلاں رائے بریلی۔

لوگوں کو قید کیا جاسکتا ہے اور ان کی پوزیشن واضح ہونے کے بعد ہی ان کے ساتھ اگلا اقدام کیا جائے گا۔

تیسری قسم (معروف بالفسق والفجور) سے تعلق رکھنے والے افراد کو بالاتفاق جرم کے ثابت ہونے سے پہلے قید وگرفتار کرنے کی اجازت ہے، اس لئے کہ جب مجہول الحال لوگوں کو گرفتار کرنے کی اجازت ہے تو معروف بالفسق والفجور افراد کو قید کرنے کی بدرجہ اولی اجازت ہوگی (دیکھئے: مجموع فتاوی ابن تیمیہ ۳۵/۳۹۷-۴۰۰)۔

سنن ابوداؤد میں متہم کو (جو ظاہر ہے دوسری یا تیسری قسم کے افراد ہوں گے) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے قید کئے جانے کی صراحت موجود ہے۔

''عن بهز بن حكيم عن أبيه عن جده أن النبی ﷺ حبس في تهمة'' (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۳۶۳۰)۔

قید احتیاطی کی مدت

قید احتیاطی کی مدت کی تعیین کے سلسلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، کوئی حتمی قول اس سلسلہ میں منقول نہیں ہے، بعض احادیث میں ایک دن اور ایک رات قید احتیاطی میں رکھنے کی بات پائی جاتی ہے اور ثمامہ بن اثال حنفی کو تین دن تک قید میں رکھا گیا یہ واقعہ مشہور اور معروف ہے، لیکن احقر کے خیال میں وہاں تو خود ان کو اپنے جرم کا اعتراف تھا احتیاطی قید کی کوئی بات نہیں تھی، فقہاء کا اختلاف اس سلسلہ میں کسی نص صریح کے نہ ملنے کی وجہ سے ہے، بعض فقہاء نے اس کی مدت ایک ماہ، بعض نے چھ ماہ اور بعض نے سال بھر بتائی ہے، لیکن جمہور کی رائے اس سلسلہ میں یہ ہے کہ مدت کی تحدید کا انحصار قاضی یا حاکم وقت کی صوابدید پر ہے، بس شرط یہ ہے کہ اصول شریعت اور عدل کی رعایت کے ساتھ ساتھ ان کی ولایت شرعی کا جو مقتضی ہو اس کے لحاظ سے فیصلہ کریں۔

سنن ابی داؤد میں اس طرح کی روایتیں موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملزم کو ثبوت جرم سے پہلے قرائن کی بنیاد پر قید کیا گیا اور ایک دن اور ایک رات قیدی بنا کر رکھا گیا، لیکن اس مدت کو حتمی مدت نہیں کہا جاسکتا۔

مقام کدید کے رہنے والے لوگوں (بنوالملوح) پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کو حملہ کرنے کا حکم دیا، صحابہ نے راستہ میں ان کے ایک فرد حارث بن البرصاء اللیثی کو گرفتار کرلیا، وہ کہنے لگے کہ میں تو اسلام قبول کرنے کی نیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جارہا تھا، لیکن صحابہ نے انہیں چھوڑا نہیں بلکہ کہا کہ ہم بھی واپس ہونے والے ہیں، حقیقت حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے واضح ہوجائے گی، اگر تمہاری بات سچی ہوگی تو ایک دن اور ایک رات تمہارا قید میں رہنا کوئی نقصان دہ نہیں ہوگا اور اگر معاملہ اس کے برخلاف ہوگا تو تم آزاد نہیں ہوسکو گے، اس اسلامی فوج کے سربراہ حضرت جندب بن کعبؓ نے فرمایا تھا:

''إن تكن مسلمًا لم يضرك رباطنا يومًا وليلة وإن تكن غير ذلك نستوثق منك فشددناه وثاقًا'' (سنن ابی داؤد ۱/۲۶۷۸)

خلاصہ جوابات

۱- جو حضرات دینداری اور تقوی وطہارت میں مشہور ومعروف ہوں انہیں بالاتفاق قید نہیں کیا جاسکتا۔

۲- مجہول الحال اور معروف بالفسق والفجور اشخاص کو قرائن کی بنیاد پر ثبوت جرم سے پہلے قید کیا جاسکتا ہے۔

۳- قسم ثانی وثالث کے جو افراد قید کئے جائیں گے نصوص صریحہ سے ان کی قید کی زیادہ سے زیادہ مدت متعین نہیں ہے، بلکہ اسے حاکم وقت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے، اسی شرط کے ساتھ کہ اصول شریعت اور عدل کے تقاضوں کا خیال رکھیں۔

۲- مذہبی، جسمانی، سماجی اور اخلاقی امور کے تعلق سے قیدیوں کے حقوق

الف- حبس شرعی کا مفہوم کسی تنگ جگہ میں قید کرنا نہیں بلکہ ملزم کو اس کے ذاتی تصرفات سے روکنا ہے، اس لئے جو چیزیں ذاتی تصرفات کے قبیل سے ہوں ان سے تو روکا جاسکتا ہے، مثلاً کوئی تجارتی کاروبار وغیرہ، لیکن عبادت، مذہبی کتابوں کے مطالعہ اور قیدیوں کے درمیان دعوت دین سے نہیں روکا جاسکتا اور محبوس کے مذہبی تعلیمات کے مطابق اس کے لئے غذا فراہم کی جائے گی (دیکھئے: مجموع فتاوی ابن تیمیہ ۳۵/۳۹۸)۔

ضروریات خواہ خالص انسانی ہوں یا مذہبی وسماجی جہاں تک مفسدہ نہ پیدا ہوتا ہو نصوص شریعت سے ٹکراتا نہ ہو اور مصلحت حبس کے خلاف نہ ہو اجازت دی جائے گی۔ (دیکھئے: فتاوی ہندیہ ۳/۴۱۶، موسوعۃ الفقہ الاسلامی المعاصر: عبدالحلیم عویس ۳/۲۷۰)۔

محبوس جس مذہب کا متبع ہے اس کی نیز اس کی مقدس شخصیات کے اور مقدس کتابوں کی بے حرمتی جائز نہیں ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا صاف حکم ہے:

"ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوًا بغیر علم" (سورہ انعام:۱۰۸)۔

ب- جسمانی ضروریات

مناسب غذا، صاف پانی اور علاج وغیرہ جیسی چیزیں فراہم کی جائیں گی، اس لئے کہ ان ساری چیزوں سے زندگی کی بقا متعلق ہے اور زندگی کو باقی رکھنا واجب ہے۔"مالم یتم الواجب الا بہ فھو واجب" (القواعد الفقہیہ/۳۴۵؛ مولانا علی احمد ندوی)۔

صحابہؓ نے غزوہ بدر کے قیدیوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ہمارے لئے اسوہ اور نمونہ ہے (سیرۃ النبی ۱/۳۲۹)۔

لیکن دوسری طرف یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے گا کہ انہیں اپنے جرائم کا خیال آتا رہے، وہ بالکل مطمئن اور بے پرواہ نہ ہوجائیں، جیسا کہ فتاویٰ ہندیہ میں ہے: "وفی السغناقی قالوا: وینبغی أن یحبس فی موضع خشن لا یبسط لہ فراش ولا وطاء ولا أحد یدخل علیہ لیأنس لیضجر قبلہ" (الفتاوی الہندیہ ۳/۴۱۹)۔

ورزش وتفریح

اگر بقاء زندگی کے لئے ورزش وتفریح ناگزیر ہوجائے (جیسا کہ اطباء آج کل بعض بیماریوں کے علاج میں چہل قدمی لازمی بتاتے ہیں) تو ایسی صورت میں بقدر ضرورت ورزش وتفریح کی اجازت دی جاسکتی ہے، تفریح محض کی اجازت بہر حال نہیں دی جاسکتی۔

بیوی سے تعلق

اگر قید خانہ میں ایسی جگہ ہے کہ پورے تستر اور شرعی آداب کے ساتھ تعلقات زن وشو قائم کئے جاسکتے ہوں تو اس کی اجازت دی جاسکتی ہے، مجمع الانہر میں ہے:

"قال الزیلعی وغیرہ: إن احتاج إلی الجماع لا یمنع من دخول امرأتہ أو جاریتہ علیہ إن کان فی السجن موضع سترۃ لأن اقتضاء شھوۃ الفرج کاقتضاء شھوۃ البطن" (مجمع الانہر فی شرح ملتقی الابحر ۲/۲۲۸، نیز دیکھئے: فتاوی ہندیہ ۳/۴۱۸)

انتہائی تنگ وتاریک جگہ میں قیدیوں کے رکھنے کا مسئلہ

مذکورہ سزائیں مخصوص حالات میں اور محدود مدت تک کے لئے دینے کی اجازت تو دی جاسکتی ہے لیکن اس طرح سزا دینا کہ اعضاء تلف ہوجائیں، انسان کا دماغ اور اس کے قوائے حسیہ ناکارہ ہوجائیں بالکل جائز نہیں (دیکھئے: المغنی ۱۰/۳۴۸)۔

اخلاقی امور

اخلاق واعمال کی اصلاح کا اسلام نے ہر قدم پر خیال رکھا ہے اور اسی کے پیش نظر فقہ اسلامی میں اس بات کی وضاحت ملتی ہے کہ مردوں اور عورتوں کو الگ الگ قید خانہ میں رکھا جائے تاکہ فتنہ سے امن رہے، اندرونی دیکھ بھال کا کام خود عورتیں سنبھالیں، ہاں باہر سے حفاظت کی ذمہ داری اہل تقویٰ مردوں کی ہو۔

نیز یہ غایت درجہ احتیاط کی بات ہے کہ مخنثین کے لئے بھی علیحدہ قید خانہ کا نظم کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ نہ تو ان کو مردوں کے ساتھ رکھنے کی اجازت ہے اور نہ ہی عورتوں کے بیچ، بلکہ ان کو بالکل علاحدہ رکھنے کا حکم ہے۔

جہاں تک بالغوں اور نابالغوں کے الگ الگ قید خانوں کا تعلق ہے تو یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ فقہاء نابالغ بچوں کو اصلاً جیل وغیرہ میں قید کرنے کے قائل نہیں ہیں اور جو حضرات قائل ہیں بھی ان کا کہنا ہے کہ حبس کی سزا تادیباً ہوگی معاقبۃً نہیں اب اگر تادیباً ہی سہی بچوں کو جیل میں رکھا جاتا ہے تو اس بات کا خیال کیا جائے گا کہ فتنہ کا اندیشہ ہے یا نہیں؟ اگر فتنہ کا اندیشہ ہو تو بچوں کو بھی علیحدہ ہی رکھا جائے گا (دیکھئے: فتاوی ہندیہ ۳/۴۱۴، ردالمحتار ۸/۱۲۳)۔

لیکن اس سلسلہ میں اصل اختیار قاضی کو حاصل ہوگا امن من الفتنہ والے اصول کو سامنے رکھتے ہوئے۔ مجمع الانہر میں ہے:

"وتعیین مکان الحبس للقاضی" (مجمع الانہر ۲/۲۲۴)۔

عام سماجی حقوق

اعزہ واقرباء سے ملنے کے سلسلہ میں دوطرح کے اقوال پائے جاتے ہیں:

۱- اجازت ہے لیکن زیادہ نہیں ٹھہر سکتے۔

۲- کسی کو قیدی کے پاس جانے ہی نہیں دیا جائے گا تا کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو سکے۔

فتاوی ہندیہ میں ہے: ''ولا یمنع المسجون من دخول أهله وجیرانه ولکن لا یمکنون أن یمکثوا هناك طویلًا وفی السغناقی ولا أحد یدخل علیه لیأنس لیضجر قلبه'' (فتاوی ہندیہ ۲/۴۱۹)۔

اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ اگر کوئی مفسدہ پیدا ہونے کا اندیشہ نہیں ہے تو اعزہ واقرباء سے فون پر مختصر بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

قیدیوں کے آپس میں میل ملاپ سے اگر اس بات کا خدشہ ہو کہ شر کے لئے وہ گروہ بندی یا جتھابازی کریں گے یا اس طرح کے کاموں کے لئے پلاننگ کریں گے تو ملاقات سے روکا جائے گا، لیکن اگر معمولی قسم کی ملاقات ہو اور اس طرح کے مواقع نہ دیئے جائیں تو بہر حال ملاقات کی اجازت ہوگی۔

اخبارات پڑھنے اور ریڈیو سننے سے روکا جائے گا، اس لئے کہ یہ امور حوائج ضروریہ میں سے نہیں ہیں، تعلیم اور ہنر سیکھنے میں اگر جیل کے مصالح میں کوئی حرج نہ پڑ رہا ہو تو اس کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

۳- قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے دھمکانے اور سزا دینے کا مسئلہ

قیدیوں سے سچی بات قبول کروانے کے لئے مار پیٹ کی بھی اجازت ہے اور دھمکانے کی بھی، بے لباس کرنے کی نہیں، البتہ بے لباس کر دینے کی دھمکی دی جاسکتی ہے، لیکن الکٹرک شاک لگانا، قیدیوں پر کتے چھوڑنا، سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈالنا قطعاً جائز نہیں اور نہ ہی اس کو اس طرح جگے رہنے پر مجبور کرنا درست ہے کہ اس کا کوئی عضو تلف ہو جائے۔

جن حالات میں سزا دینے کی اجازت ہے وہاں پر اس بات کی بھی تاکید ہے کہ ایسا کوئی کام نہیں کیا جائے گا جو تکریم انسانی کے خلاف ہو۔

(دیکھئے: الرسول القائد، محمود شیت خطاب: ۱۲۶، موسوعۃ الفقہیہ الاسلامی المعاصر ۳/ ۳۴۴، فتاوی ہندیہ ۳/ ۴۱۶، مسند احمد، حدیث: ۲۳۴۱۸، المغنی ۱۰/ ۳۴۷، بخاری، حدیث: ۳۰۰۷، ابوداؤد، حدیث: ۲۶۷۳)۔

جہاں تک ایسی سزائیں دینے کا تعلق ہے کہ قیدی مسلسل جاگتا رہے سو نہ سکے تو اسے عارضی اور وقتی سزا کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں، اس لئے کہ غزوہ بدر کے قیدیوں کو جس طرح جکڑا گیا یہاں تک حضرت عباسؓ کی کراہ کی آواز آتی رہی، اسی طرح ابو یزید سہیل بن عمرو کا ہاتھ ان کی گردن میں ملا کر باندھ دیا گیا تو ظاہر ہے کہ یہ حضرات سو نہیں سکے ہوں گے، لیکن یہ سزا محدود وقت اور مخصوص حالات کے پیش نظر تھی (دیکھئے: ابوداؤد، حدیث: ۲۶۸۰)۔

لیکن یہ سزائیں اس حد تک دینا کہ اعضاء شل ہو جائیں اس کی اجازت قطعاً نہیں دی جاسکتی (تفصیل کے لئے دیکھئے: المغنی ۱۰/ ۳۴۸)۔

۴- قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑنا، ہتھکڑی پہنانا اور بیڑی ڈالنا

عام حالات میں نہ تو قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑا جائے گا نہ ہی ان کو ہتھکڑی پہنائی جائے گی اور نہ ہی بیڑی ڈالی جائے گی، ہاں اگر بھاگ نکلنے کا یا کوئی اور مفسدہ پیدا ہونے کا خطرہ ہو تو ایسا کرنا درست ہوگا۔

فتاوی ہندیہ میں ہے: ''لا ینبغی للقاضی أن یضرب محبوسا فی دین ولا غیره ولا یصفد ولا یقید ولا یغل ولا یمد ولا یجرد وإذا خاف علی المحبوس فی السجن أن یفر من حبسه حوله إلی محبس اللصوص'' (فتاوی ہندیہ ۳/۴۱۴، نیز دیکھئے: مجمع الانہر ۲/۲۲۴)۔

۵- مجرم کو قید تنہائی کی سزا دینا؟

کسی مجرم کو خصوصی جرم کے پس منظر میں قید تنہائی کی سزا دینے کا انحصار قاضی کی صوابدید پر ہے، اگر اس کی موجودگی دوسروں کے لئے فتنہ وفساد اور شر کا

ذریعہ ہوتو ایسی صورت میں اس کو معاشرہ سے الگ کردینا ہی بہتر ہے۔

امام ابن تیمیہ نے اس سلسلہ میں بڑی نفیس بحث کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی نے انسانوں کو ایک دوسرے کے تعاون کا محتاج بنایا ہے، دینی اور دنیاوی بہت سی ضرورتیں ایک دوسرے کے ذریعہ تکمیل کو پہنچتی ہیں، اب اگر کوئی شخص ایسا ہو کہ اس کا وجود بجائے نفع بخش ہونے کے نقصاندہ ثابت ہونے لگے اور خیر کے بجائے شر کا ذریعہ ہو تو اس کو علاحدہ کردینا ہی بہتر ہوگا (دیکھئے: مجموع فتاوی ابن تیمیہ ۱۵/ ۳۱۰)۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ کسی مجرم کو خصوصی جرم کے پس منظر میں قید تنہائی کی سزا دی جاسکتی ہے۔

۶- جیل میں قیدیوں سے جبراً کام لینا اور اس کی اجرت کا استحقاق؟

اگر حاکم وقت یا قاضی مناسب سمجھیں اور ضرورت ہو تو قیدیوں سے جبراً کام لیا جاسکتا ہے، لیکن اس میں قیدی کی حیثیت اور اس کے حالات کا لحاظ کرنا ضروری ہے، ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ طاقت سے زیادہ کا بوجھ اس پر ڈالا جائے یا یہ کہ ایسا کام اس سے کروایا جائے جو اس کی حیثیت سے فروتر ہو اور اگر کام لیا گیا تو بہر حال قیدی اجرت کے مستحق ہوں گے۔

بدر کے بعض قیدی جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے انہیں مسلمانوں کے بچوں کو تعلیم دینے کے لئے مکلف کیا گیا اور اس کے بدلہ میں ان کی گردنوں کو آزاد کردیا گیا، یہ واقعہ سیرت وحدیث کی تقریباً تمام ہی کتابوں میں مذکور ہے (دیکھئے: غزوۃ بدر الکبری: محمد احمد باشمیل/ ۲۳۶، مسند احمد، حدیث: ۲۲۱۶، الرسول القائد/ ۱۳۶)۔

۷- جن قیدیوں کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے اور جن کے بارے میں سزائے قید کا فیصلہ ہو چکا ہے، قید خانوں میں سلوک کے اعتبار سے کیا ان دونوں میں فرق کیا جاسکتا ہے؟

ان دونوں قسم کے افراد کے درمیان وہی فرق ہے جو کہ مجرم اور متہم کے درمیان ہے، لہذا جس کے بارے میں فیصلہ ہو چکا ہے اس کے ساتھ جرم کی نوعیت کے اعتبار سے سلوک ہوگا، اور جس کا مقدمہ ابھی چل رہا ہے اس کے ساتھ عام معمول کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔

احقر کے مطالعہ میں اس فرق کو واضح کرنے کے لئے کوئی دلیل تو نہیں مل سکی البتہ حضرت ماعز اسلمی اور غامدیہ کے واقعہ سے استدلال کرسکتے ہیں، اس طور پر کہ حضرت ماعز کے اقرار سے ان کا جرم ثابت ہو گیا تھا اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر حد جاری کرنے کا حکم صادر فرمایا، لیکن عورت کا جرم آپ کی مجلس میں ثابت نہیں ہوا تھا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''واغد یا انیس إلى امرأة هذا فإن اعترفت فارجمها'' یہاں پر اقامت حد کو اعتراف پر معلق کردیا، تو ایک میں صریح فیصلہ فرمانا اس لئے تھا کہ ان کا جرم ثابت تھا اور دوسرے میں صریح فیصلہ نہ فرمانا یوں تھا کہ اب تک ان کا جرم ثابت نہیں ہوا تھا۔

۸- زیر سماعت قیدیوں کو اصل سزا سے کتنے دنوں تک قید میں رکھا جاسکتا ہے؟

بلاوجہ اور قصداً کسی کو جرم کی اصل سزا کے بقدر قید میں رکھنا ظلم ہے اور صحیح نہیں ہے، البتہ کبھی ایسا ہوسکتا ہے کہ متہم مجہول الحال تھا جیسا کہ سوال نمبر ا کے جواب میں گذر چکا ہے، اس کو قید میں ڈال دیا گیا اور اس کے مقدمہ کا تصفیہ ہونے میں اس کے جرم کی سزا سے زیادہ زمانہ یا اس کے بقدر زمانہ لگ گیا تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔

موجودہ دور میں ایسی قید کو عدالتی ریمانڈ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور ایسا اس لئے ہوسکتا ہے کہ متہم کو قید کرنا ناگزیر ہو گیا ہو اور قاضی ابھی دوسرے مقدمات جو اس کے پاس پہلے سے چل رہے ہیں ان کے تصفیہ میں مشغول ہو تو بہر حال متہم کو انتظار کرنا ہوگا، اور ایسی صورت میں ممکن ہے کہ زیر سماعت قیدی کو اصل سزا کے بقدر یا اس سے زائد زمانہ تک قید میں رہنا پڑے۔

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: ''ثم الحاكم قد يكون مشغولًا عن تعجيل الفصل وقد يكون عنده حكومات سابقة فيبقى المطلوب محبوسًا معوقًا من حين يطلب إلى حين يفصل بينه وبين خصمه وهذا حبس بدون التهمة ففي التهمة أولى'' (مجموع فتاوى ابن تیمیہ ۳۵/۲۹۸)۔

۹- ملزم کا عدالت سے براءت کے بعد ہرجانہ کا مطالبہ کرنا:

قانون اسلامی اس مسئلہ کو احترام انسانیت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اس لئے کہ انسان کی کرامت وشرافت کوئی ایسی چیز نہیں کہ اہل قوت کو اختیار دے دیا جائے کہ کھلے ہوئے جانوروں کی طرح جہاں چاہیں چریں کھائیں اور جس کی چاہیں آبرو اور عزت وانسانیت سے کھلواڑ کریں۔

مادی ومعنوی جس قسم کا ضرر بھی محبوسین کو ناحق پہنچایا جائے شریعت نے اس کا عوض حاصل کرنے کا حکم دیا ہے۔

قرآن کریم میں ہے: ''فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیه بمثل ما اعتدی علیکم'' (بقرہ: ۱۹۴)۔

''وإن عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به'' (نحل: ۱۲۶)، ''وجزاء سيئة سيئة مثلها'' (شوری: ۴۰)۔

نیز حدیث میں ہے: ''لا ضرر ولا ضرار'' (ابن ماجہ/۲۳۴۰)۔

مذکورہ دلائل کی روشنی میں ایک اہم فقہی قاعدہ اس سلسلہ میں سامنے آتا ہے:

''وجوب تعويض المضرور عن ضرره على حساب من سبب هذا الضرر'' (موسوعة الفقه الاسلامی المعاصر ۳۴۸/۲)۔

۱۰- قیدی کو وکیل سے رابطہ کا حق

خصومات میں توکیل کی اجازت یا تو حسی موانع یا معنوی رکاوٹوں کی بنیاد پر حاصل ہوتی ہے، جس کو ہم عجز وعذر کے الفاظ سے تعبیر کرسکتے ہیں اور قیدی بھی ایک طرح معذور ہی ہوتا ہے اور خصومات میں توکیل کو اس لئے مشروع کیا گیا ہے کہ اگر موکل اپنا دفاع نہ کرسکے یا یہ کہ قاضی کی مجلس میں حاضر نہ ہوسکے تو اس کے حقوق کا ضیاع نہ ہونے پائے اور یہی بات قیدی میں بھی پائی جارہی ہے، لہذا قیدی کو وکیل سے رابطہ اور صفائی پیش کرنے کے پورے حقوق حاصل ہوں گے۔

(دیکھئے: بدائع الصنائع ۷/ ۴۳۲، المغنی ۵/ ۲۷۰)۔

عالم اسلام کے مشہور فقیہ ڈاکٹر وہبہ زحیلی فرماتے ہیں: ''أما الوكالة بالخصومة كالمحاماة اليوم، فتجوز في حقوق الناس لما روي عن علي رضي الله عنه ولأن الحاجة تدعو إلى التوكيل فيها، إذ قد لا يحسن المرء الدفاع عن حقوقه أو يكره أن يتولى الخصومة بنفسه'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴۰۷۷/۵)۔

ان دلائل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قیدی کو وکیل سے رابطہ اور صفائی پیش کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔

۱۱- قیدی خواتین کا شیر خوار بچوں کو اپنے ساتھ رکھنا

خواتین قیدیوں کو اپنے ساتھ شیر خوار بچوں کو جیل میں رکھنے کا حق حاصل ہے، اس لئے کہ دونوں کو جدا کرنے میں یا بچہ کو ساتھ نہ رکھنے دینے میں دونوں کو ضرر شدید پہنچے گا اور یہ ضرر بلا وجہ ہوگا جو درست نہیں ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب عورتیں قید کرکے لائی جاتی تھیں تو آپ ان کے بچوں کو ان سے جدا کرنے سے سخت طریقہ سے منع فرماتے تھے (دیکھئے: المغنی ۱۰/ ۴۶۸)۔

الدر المنضود میں مغنی المحتاج کے حوالہ سے نقل کیا ہے: ''ويحرم التفريق بين الأم والولد حتى يميز وفي قول حتى يبلغ''

(الدر المنضود شرح سنن ابی داؤد ۴/ ۲۲۵؛ مولانا عاقل سہارنپوری)۔

لہذا یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خواتین قیدیوں کو اپنے ساتھ جیل میں شیر خوار بچوں کو رکھنے کا حق حاصل ہے۔

قیدیوں کے حقوق

مولوی محمد مغفور باندوی [1]

اسلامی تعلیمات عدل وانصاف پر مبنی ہیں۔ اس میں تمام بنی نوع انسان کے لئے عدل وانصاف کا پیمانہ ایک ہی متعین کیا گیا ہے۔ ہر طبقہ کو اس کا حق ضرور دیا گیا ہے۔ کسی فرد سے اس کا انسانی حق چھینا نہیں گیا ہے۔ قیدیوں کے لئے بھی اسلامی شریعت نے عدل وانصاف پر مبنی بہترین احکام پیش کئے ہیں جو قیدیوں کے مزاج اور حالات سے ہم آہنگ ہیں اور دنیا کے لئے نمونہ اور مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ذیل میں قیدیوں کے حقوق سے متعلق سوال نامہ کے جوابات فقہ اسلامی کی روشنی میں پیش کئے جارہے ہیں۔

(۱) جمہور فقہاء کے نزدیک کسی شخص کو اس کا جرم کے ثبوت فراہم کئے بغیر محض تہمت اور شک کی بنیاد پر قید کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس سلسلے میں قوی قرینہ موجود ہو جو اس کے مجرم ہونے کی طرف اشارہ کررہا ہو۔ ان حضرات کی دلیل اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے کہ آپ نے قبیلہ غفار کے ایک شخص کو دو اونٹوں کی چوری کی تہمت کی وجہ سے قید میں ڈال دیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چھوڑ دیا۔ چھوڑنے کی وجہ غالباً یہی رہی ہوگی کہ اس پر جرم ثابت نہیں ہو پایا ہوگا۔

''حدثنا علی بن سعید الکندی... عن بهز بن حکیم عن أبیه عن جده أن النبی ﷺ حبس رجلًا فی تهمة ثم خلی عنه، وفی الباب عن أبی هریرة رضی الله عنه، حدیث بهز... حدیث حسن'' (رواه الترمذی فی کتاب الدیات، باب فی الحبس فی التهمه ۱/۲۶۱، نیز ابوداؤد فی کتاب الجهاد، باب فی الدین هل یحبس ۲/۵۱۱)۔

اور حضرت علیؓ کا ایک عمل بھی ان کی دلیل ہے کہ حضرت علیؓ نے بعض ایسے افراد کو قید کردیا جن پر کسی کا الزام نہ تھا۔ قید ہونے کے بعد ان لوگوں نے اس جرم کا اقرار کرلیا تھا۔'' وعن علی رضی الله عنه أنه حبس متهمین حتی أقروا'' (۲/۲۲۱)۔

علامہ شامی نے اس کا ذکر کیا ہے: ''وذهب جمهور الفقهاء إلی مشروعیة التهمة واعتبروا من السیاسة العادلة إذا تأیدت التهمة بقرینه قویة أو ظهرت أمارات الریبة علی المتهم أو عرف بالفجور'' (الموسوعة الفقهیه ۱۶/۲۱۳)۔

جب کہ فقہاء احناف نے تہمت کی وجہ سے قید کئے جانے کے سلسلے میں تھوڑی تفصیل کی ہے، اگر کسی شخص پر چوری، قتل یا کسی ایسے جرم کا الزام ہو جس کا تعلق حدود وقصاص سے ہے تو ایسے شخص کو محض تہمت کی بنیاد پر قید کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر کسی شخص پر تعزیرات کے قبیل کے جرائم (جیسے مالیات کے جرائم وغیرہ) کا الزام ہے تو اس کو محض تہمت کی بنیاد پر بغیر ثبوت فراہم کئے ہوئے قید نہیں کیا جاسکتا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: علامہ بابرتی کی عنایۃ ۵/۳۳۵، ۳۳۶)۔

اسی طرح صاحب فتح القدیر نے بھی اس کو ذکر کیا ہے (فتح القدیر ۵/۳۳۶)۔

اب تہمت کی بنا پر اگر کسی شخص کو قید کیا گیا تو اس قید کی مدت کیا ہوگی۔ اس سلسلے میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں۔ واضح ترین قول یہ ہے کہ قید کی مدت کی تعیین حاکم کی صواب دید پر موقوف ہوگی۔

''وأما قدر مدة الحبس فیختلف باختلاف أسبابه وموجباته وحبس التعزیر راجع إلی اجتهاد الحاکم بقدر ما یری أنه ینزجر به۔ وقال أبو عبدالله الزبیری من الشافعیة: یتقدر بشهر للاستبراء والکشف ولستة أشهر للتأدیب والتقویم'' (تبصرة الحکام ۲/۲۴۰، ۲۴۱)۔

---

[1] متعلم المعہد العالی للتدریب فی القضاء، پٹنہ۔

''وتقدير مدة الحبس راجع إلى الحاكم كذا في البحر الرائق'' (هنديه ۲/ ۱۶۸)۔

جب کہ صاحب معین الحکام علامہ طرابلسی نے بھی ملزم کی حالت کے اعتبار سے قید کی مدت کو حاکم کی صوابدید پر محمول کیا ہے۔

''إذا حبس شهرين أو ثلاثة يسأل عن حاله هذا إذا كان أمره مشكلًا''۔

آگے چل کر وہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ قاضی کی صوابدید پر منحصر ہے: ''والصحيح أنه مفوض إلى رأى القاضي'' (معين الحكام/ ۱۹۸)۔

۲- (الف)۔ مذہبی امور میں قیدیوں کو آزادانہ حقوق حاصل ہوں گے۔ وہ قید خانہ میں اپنے مذہب کے مطابق عبادت کر سکتے ہیں۔ قید خانے کے اندر اپنی مذہبی کتابوں کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے اندر اس مذہب کی دینی شخصیات اور دینی کتابوں کی بے حرمتی سے بھی اجتناب کیا جائے گا، اور تبلیغ کے سلسلے میں ان کو ایک دائرے کے اندر آزادی حاصل ہوگی۔

ب- قیدیوں کے لئے قید خانے میں مناسب غذا اور صاف پانی کا بھی انتظام کیا جائے گا۔ قیدی کے بیمار ہونے کی صورت میں اس کے علاج اور صحت کی حفاظت کا خیال رکھا جائے گا۔ البتہ بیوی سے جماع کے سلسلے میں فقہاء نے یہ بات لکھی ہے کہ اگر شوہر اس چیز کا مطالبہ کرے اور قید خانے میں ایسی جگہ میسر ہو جہاں ان کو پردہ مہیا کیا جاسکتا ہو اور ان کو کوئی نہ دیکھے تو اس کی بیوی کو قید خانے میں بھیج دیا جائے گا تاکہ وہ اپنی خواہش کی تکمیل کر سکے۔

''لو احتاج إلى الجماع فدخل عليه امرأته أوجاريته حتى جامعها لكن في موضع لا يطلع أحد فإن لم يجد مكانًا خاليًا لا يجامع'' (معين الحكام/۱۹۸)۔

''يمكن من وطأ جاريته لو فيه خلوة'' (ردالمحتار ۸/ ۵۶)۔

اسی طریقہ سے قیدیوں کو اتنی تنگ جگہ میں بھی نہیں رکھا جائے گا جہاں رہنے میں پیر پھیلانے میں دشواری ہو۔

''اعلم أن الحبس الشرعي ليس هو في مكان ضيق'' (معين الحكام/۱۹۶)۔

ج- البتہ ان کو ایسے حقوق حاصل نہ ہوں گے جن سے قیدی کا مقصد فوت ہو جائے، اس لئے کہ قید خانے کا مقصد یہ ہے کہ قیدی کے دل میں بے چینی ہو اور اس کو دلی تکلیف ہو۔

''ولا يبسط له فرش ولا غطاء ولا يدخل عليه أحد ليستأنس'' (معين الحكام/۱۹۶)۔

''وصفته أن يكون بموضع ليس به فراش ولا وطاء لينضجر'' (الدر المختار مع الرد ۸/۵۵)۔

''وينبغي أن يحبس في موضع خشن ولا يبسط له فراش ولا وطاء ولا أحد يدخل عليه ليستأنس لينضجر قلبه'' (ہندیہ ۲/ ۴۱۹)

قید کے مقصد کے پیش نظر انہیں غیر ضروری چیزوں کی اجازت نہیں ہوگی جو ان کے لئے دلی تسکین کا باعث ہو، لہذا اس کو ریڈیو سننے، اخبار پڑھنے یا دوسری چیزوں کی اجازت نہیں ہوگی۔

د- اخلاقی امور میں بھی ان چیزوں کا خاص خیال رکھا جائے گا کہ مردوں، عورتوں اور نابالغوں کے لئے علیحدہ علیحدہ قید خانے تعمیر کئے جائیں۔

''فرع في البحر عن المحيط ويجعل للنساء سجن على حدة نفيا للفتنة'' (الدر مع الرد ۸/ ۵۸)۔

۳- کسی قیدی سے سچی بات اگلوانے کے لئے ایسے طریقے کا استعمال جو اس قیدی کی شدید ذہنی یا جسمانی تکلیف کا باعث ہو درست نہیں۔ چاہے شدید ضرب ہو، الکٹرک شاٹ لگانا ہو، ان پر کتے چھوڑنا ہو یا تار چرو غیرہ کرنے کی کوئی بھی شکل ہو شریعت میں ان کی گنجائش نہیں ہے۔

''ولا ينبغي للقاضي أن يضرب محبوسًا في دين ولا غير ولا يصفد ولا يقيد ولا يغل ولا يمد ولا يجرد ولا يقيمه في الشمس'' (ہندیہ ۲/ ۴۱۴)۔

البتہ اگر مجرم کی طرف سے زیادتی پائی جارہی ہے اور وہ بار بار قید خانے سے فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے تو ایسی صورت میں اس کو ضرب میں چند کوڑے لگائے جاسکتے ہیں۔ لیکن محض جرم کا اقرار کرانے اور اس سے سچ اگلوانے کے لئے کسی طرح کی شدید ذہنی اور جسمانی تکلیف دینا جائز نہ ہوگا۔

''وإن كان هذا المحبوس لايزال يهرب من السجن يؤذيه القاضى بأسواط'' (ہندیہ ۴/ ۴۱۶)۔

''وليس للطالب أن يقيم فى الشمس أو على الثلج أو موضع ليضر كذا فى الخلاصة'' (ہندیہ۴۱۶/۴)۔

''ولا يضرب المحبوس إلا فى ثلاثة إذا الممتنع من كفارة الظهار والانفاق على قريبة والقسم بين النساء'' (الطحطاوی علی الدر ۴/ ۱۸۶)۔

۴- جب تک قیدی کے فرار ہونے کا اندیشہ نہ ہو اس وقت تک اس کو ہتھکڑی یا بیڑی وغیرہ نہیں پہنائی جائے گی۔ البتہ اگر قیدی کے فرار ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں اس کو ہتھکڑی وغیرہ پہنائی جاسکتی ہے۔

''ولا يغل إلا إذا خاف فراره فيقيد أو يحول لسجن اللصوص'' (ردالمحتار ۸/ ۵۸)۔

''ولا يصفد ولايقيد ولا يغل...واذا خاف القاضى على المحبوس فى السجن أن يفر من جسه حوله إلى حبس اللصوص'' (ہندیہ ۳/ ۴۱۴)۔

''ولا يغل إلا إذا خاف فراره فيقيد أو يحول إلى سجن اللصوص'' (حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ۴/ ۱۸۷)۔

۵- عہد نبوی اور عہد صدیقی میں باضابطہ کوئی قید خانہ نہیں تھا اور نہ کوئی ایسی جگہ تھی جو خاص طور سے قیدیوں کے لئے بنائی گئی ہو۔ عہد فاروقی میں باضابطہ طور پر قید خانے کی شکل وجود میں آئی اور ایک خاص جگہ کو قید خانہ کے لئے متعین کر دیا گیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تمام قیدی بحیثیت قیدی کے برابر ہیں۔ لیکن فقہاء نے اس بات کی گنجائش رکھی ہے کہ اگر کسی شخص کو کسی خاص جرم کی وجہ سے قید تنہائی دی جائے تو اس کی گنجائش ہے۔

''الظاهر من كلام الفقهاء أن الأصل فى الحبس كونه جماعيًا وقالوا: لايجوز عند أحد من المسلمين أن يجمع الجمع الكثير فى موضع ضيق عنهم...ويجوز للحاكم عن السجن وحبسه منفردًا فى غرفة يقفل عليه بابها إن كان فى ذلك مصلحة'' (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۳۱۹)۔ ... ''ويحبس فى موضع وحش'' (معین الحکام/ ۱۹۷)۔

۶- قید خانے میں قیدی کام کرنے کا مکلف نہیں ہے۔ اس لئے قیدیوں سے جبراً کام نہیں لیا جاسکتا۔ اگر وہ قید خانے میں اجرت پر کوئی کام کریں جس سے ان کو مالی نفع بھی حاصل ہو تو ایسی صورت میں ان کے لئے دوکان اور جیل برابر ہو جائے گی۔ لیکن اگر وہ اپنی مرضی سے قید خانے میں کوئی محنت کا کام کریں یا اس سے زبردستی کام لیا جائے تو ایسی صورت میں وہ اجرت کے مستحق ہوں گے اور ان کو مطالبہ کا حق حاصل ہوگا۔

''ولا يخوفو لايجرد ولا يقام بين يدى صاحب الحق اهانة ولا يؤاجر'' (معین الحکام/ ۱۹۷)۔

''ولا يجرد ولا يؤاجر وعن الثانى يؤجر لقضاء دينه'' (حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ۴/ ۱۸۶)۔

''وفى ظاهر الرواية عن أصحابنا لايؤاجر إلا رواية عن ابى يوسف ولكن إن اجر نفسه وأخذ الأجرة يترك له قوة يومه وعياله'' (ہندیہ ۳/ ۴۲۲)۔

۷- فقہاء کرام نے تین طرح کے قید خانوں کی صراحت فرمائی ہے، ایک وہ قید خانہ جو اہل فجور (اخلاقی برائیوں کے حامل افراد) کے لئے ہو۔ دوسرا جو چوری اور اسی طرح کے کام کرنے والوں کے لئے ہو۔ تیسرا جو جنایات وغیرہ (دوسروں پر ظلم اور قتل) کا ارتکاب کرنے والوں کے لئے، لہذا اتنی بات معلوم ہوگئی کہ قیدیوں کے ساتھ جو سلوک ہوگا ان کے جرائم کے اعتبار سے ہوگا۔ لہذا وہ شخص جس کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے، اس کے ساتھ عام قیدیوں والا سلوک نہیں کیا جائے گا۔

''صنف الفقهاء سجون الجرائم إلى ثلاثة أصناف أهل الفجور والمفاسد الخلقية وأهل التلصص والسرقات ونحوها وأهل الجنايات الاعتداء على الأبدان وجعل أبو يوسف القاضى هذا التقسيم عنوان أفضل افراده فى كتابه'' (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۳۱۹)۔

۸- کسی ملزم شخص کو مقدمہ کی سماعت تک تو قید کرنے کی اجازت ہے، اس سے زیادہ اس کو قید کرنے کی اجازت فقہاء نے نہیں دی ہے۔

''ونقل عن قاضي لامش أنه كان يحبسها في وقت قضائه لمصلحة رأى في ذلك وهو صيانتها عن الفجور'' (معين الحكام ۱۹۷)

لیکن زیر سماعت قیدیوں کو اتنے دنوں تک قید میں رکھنا جو اس جرم کی اصل سزا ہے بالکل جائز نہیں ہے، اور یہ حاکم کی جانب سے اس پر ظلم وزیادتی تصور کی جائے گی۔

۹- ملزم پر اگر جرم ثابت نہ ہوسکا اور اس کو حکومت نے بری کردیا تو نقصان کے تلافی حکومت پر ہوگی یا نہیں؟ شریعت میں تہمت کی بنیاد پر قید کرنے کی اجازت ہے، اسی طرح سے اس کو زیر سماعت مقدمہ میں کسی مصلحت کی بنا پر بھی قید کیا جاسکتا ہے، اور اس کو مدت قید میں تجارت وغیرہ کی اجازت نہیں ہے، لہذا وہ صرف قید ہونے کی وجہ سے اس مدت کا مالی ہرجانہ طلب نہیں کرسکتا۔

البتہ فقہاء نے قیدی کو کسی بھی طریقے کی ذہنی وجسمانی تکلیف پہنچانے کی گنجائش نہیں دی ہے۔

لہذا اگر اس کو مدت قید میں جسمانی یا ذہنی تکلیف دی گئی اور اس پر جرم ثابت نہ ہوسکا تو اس کو جسمانی تکلیف کا معاوضہ طلب کرنے کی اجازت ہوگی۔

''وذهب جمهور الفقهاء إلى مشروعية التهمة واعتبروا من السياسة العادلة إذا تأيدت التهمة بقرينة'' (ردالمحتار)

''الحبس هو تعويق الشخص ومنعه من التصرف بنفسه حيث شاء'' (تبصرة الحكام ۲/ ۲۳۲)۔

۱۰- شریعت کا اصول یہ ہے کہ جس کسی شخص پر کسی قسم کا الزام عائد ہو تو وہ خود ہی اس کی صفائی کرے، ہاں اس کو اس سلسلے میں ایسے شخص سے مشورہ وغیرہ کا حق حاصل ہوگا جو اس کے رشتہ دار یا اقرباء وغیرہ میں سے ہو۔ لیکن اگر ملزم کے بار بار آنے میں دشواری ہو اور وہ بار بار نہ آسکتا ہو یا خود اپنی صفائی پیش کرنے سے عاجز ہو تو ایسی صورت میں اس کو وکیل بنانا جائز ہوگا، اور وکیل کو تمام حقوق حاصل ہوں گے جو کہ اس شخص کو حاصل تھے۔

''إذا ادعى على محبوس حقًا يخرجه القاضي بسماع الدعوى عليه والإجابة عنها ثم يرد إلى الحبس ولا يؤكل عنه أحدًا في الخصومة عند غير المالكية فإن تعذر على المحبوس الخروج جاز له استحسانًا توكيل من يجيب عنه'' (الموسوعة الفقهيه ۱۶/ ۳۲۶)۔

''ولا يمكن أحد أن يدخل عليه للاستيناس إلا أقاربه وجيرانه وله المشورة'' (طحطاوی علی الدر المختار ۴/ ۱۸۶)۔

۱۱- وہ عورت جو مقید ہو اس کے بچے کو اس کے ساتھ رکھنے کے سلسلے میں اقوال فقہاء سے اس کی اجازت معلوم ہوتی ہے جیسا کہ ابوداؤد سجستانی نے اپنی کتاب سنن ابی داؤد میں ایک باب التفریق بین السبی کے عنوان سے قائم کیا ہے، اور بطور دلیل حضرت علیؓ کی ایک روایت ذکر کی ہے جس میں انہوں نے باندی اور غلام کے درمیان تفریق کردی تھی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو ان کے اس فعل سے منع فرمایا اور بیع کو ختم کرنے کا حکم دیا:

حدثنا عثمان ابن الجد شيبة... عن علي أنه فرق بين جارية وولدها فنهى النبي ﷺ عن ذلك ورد البيع (سنن ابوداود، ج۲)

محشی ابوداؤد فرماتے ہیں کہ فقہاء کی رائے اس سلسلہ میں یہ ہے کہ چھوٹے بچے کو اس کی ماں سے جدا نہیں کیا جائے گا۔ اور جدا کرنا جائز نہیں ہے۔ البتہ صغر کی حد بندی میں اختلاف ہے، اصحاب رائے فرماتے ہیں کہ اس کی حد احتلام ہے۔

''قلت لم يختلف أهل العلم في أن التفريق بين الولد الصغير وبين أمة غير جائز إلا أنهم اختلفوا في الحد بين الصغير الذي لا يجوز معه التفريق وبين الكبير الذي يجوز معه قال أصحاب الرأي الحد ذلك الاحتلام''

(موسوعة السنة، الكتب الستة وشرحها ۹/ ۱۴۴، باب التفریق بین السبی)۔

اسی طرح علامہ شامیؒ نے عورت کے ساتھ اس کے شوہر کو قید خانہ میں رکھنے کی گنجائش ذکر کی ہے، البتہ اس میں فتنہ کی قید لگائی ہے، اس سے بھی ماں کے ساتھ اس کے بچے کو قید خانہ میں رکھنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے (دیکھئے: ردالمحتار ۸/ ۵۶، مطبوعہ زکریا)۔

☆☆☆

چوتھا باب/مختصر مقالات

قیدیوں کے حقوق کا مسئلہ

قاضی عبدالجلیل قاسمی [1]

اسلام میں قید وبند کسی مخصوص جرم میں بطور سزا مقرر نہیں ہے۔ مثلاً فلاں جرم میں تین ماہ جیل میں رکھا جائے گا، فلاں جرم میں مثلاً ایک سال یا پانچ سال یا دس سال جیل میں رکھا جائیگا۔ جیسا کہ آج کل حکومتوں کا دستور ہے۔

جن لوگوں کو جیل میں رکھا جائے گا کتب فقہ میں ان کی تفصیلات موجود ہیں۔

مثلاً اگر کسی پر دین ہو اور وہ ادا کرنے کے لائق بھی ہو لیکن ادا نہ کر رہا ہو تو اس کو اس وقت تک جیل میں رکھا جائے گا جب تک کہ دین ادا نہ کردے۔ جیسے ہی دین ادا کرے گا اس کو رہا کر دیا جائے گا۔ اگر وہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے تو قاضی اپنی صوابدید کے مطابق اس کو جیل میں رکھے گا۔ جب محسوس کرلے گا کہ اگر اس کے پاس مال ہوتا تو ادا کر دیتا اور اس کے پاس مال نہیں ہے تو اس کو رہا کردے گا۔

اسی طرح اگر کسی شخص کی وجہ سے معاشرہ میں برائی کے پھیلنے کا اندیشہ ہو تو اس کو جیل میں بند کیا جائے گا، لیکن جب اطمینان ہو جائے گا تو پھر اس کو رہا کر دیا جائے گا۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے ظہار کرلے اور کفارہ ادا نہ کرے تو قاضی اس کو جیل میں بند کردے گا۔ لیکن جب کفارہ ادا کردے گا تو رہا کر دیا جائے گا۔

البتہ بعض مجرمین کے بارے میں بعض فقہاء کی رائے ہے کہ ان کو ہمیشہ کے لئے جیل میں رکھا جائے گا۔ مثلاً کوئی شخص لواطت کا عادی ہو یا بدعت کا داعی ہو یا بار بار جرم کا ارتکاب کرتا ہو یا دو بار چوری کی حد نافذ ہونے کے بعد بھی چوری کرے یا لوگوں کو کثرت سے ایذاء پہونچاتا ہو یا شراب نوشی کا عادی مجرم ہو۔

۱- متہم کی تین قسمیں ہیں:

اول:...... متہم اس قسم کی تہمت سے بری ہو مثلاً نیک صالح مشہور ہو تو ایسے شخص کو قید نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ الزام ثابت نہ ہونے پر مدعی کو سزا دی جائے گی۔ تاکہ بدمعاش لوگ شرفاء کو تنگ نہ کریں۔

’’أن يكون المدعى عليه بذلك بريا ليس من أهل تلك التهمة كما لو كان رجلا صالحا مشهورًا فهذا النوع لاتجوز عقوبته اتفاقًا...أما المتهم له فيعاقب صيانة لسلطة أهل الشر والعدوان على أعراض البراء الصلحاء‘‘ (معين الحكام/ ۱۷۸)۔...’’فإذا لم يكن من أهل تلك التهمة ولم تقم قرينة صالحة على اتهامه فلا يجوز حبسه ولا عقوبته اتفاقًا (الموسوعة الفقهية ۱۶/ ۲۹۳)۔

دوم:...... متہم جو مجہول الحال ہو تو اس کو قید کیا جائے گا یہاں تک کہ اس کے حال کی تحقیق ہو سکے۔

’’أن يكون المتهم مجهول الحال عند الحاكم والوالي لايعرفه ببر ولا فجور. فإذا ادعى عليه تهمة فهذا يحبس حتى ينكشف حاله، هذا حكمه عند عامة علماء الإسلام والمنصوص عند أكثر الأئمة أنه يحبسه القاضي والوالي‘‘ (معين الحكام: ۱۸۰ ۱۷۹)۔...’’وإن كان المتهم مجهول الحال لا يعرف ببر ولا فجور فهذا يحبس حتى

[1] قاضی شریعت امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ۔

ینکشف حاله عند جمهور الفقهاء'' (الموسوعه ۱۶/۲۹۳)۔

سوم:...... جو تہمت اس پر لگائی گئی ہے اس میں وہ شخص مشہور و بدنام ہو۔ تو اس کو بدرجہ اولی جیل میں بند کیا جائے۔

''وهو المتهم بالفجور كالسرقة وقطع الطريق والقتل والزنى وهذا القسم لابد أن يكشفوا'' (معین الحکام: ۱۸۱)

''وإن كان المتهم معروفا بالفجور والسرقة والقتل ونحو ذلك جاز حبسه بل هو أولى ممن قبله'' (الموسوعه ۱۶/ ۲۹۳)

متہم کی حالت کے اعتبار سے قید و بند کی مدت متعین کی جاسکتی ہے۔ مجہول الحال کے قید و بند کی مدت کم ہوگی، اور جو بدنام ہوگا اس کی بدنامی و شہرت کے اعتبار سے اس کی مدت متعین ہوگی۔

آج کل جو رواج ہو گیا ہے کہ الزام کے بعد اس پر مقدمہ قائم کئے بغیر سالہا سال تک اس کو قید و بند میں رکھا جاسکتا ہے، ایسا کرنا ہرگز جائز نہ ہوگا۔ اس لئے کہ انصاف میں تاخیر خود ہی ایک قسم کا ظلم ہے۔ ایسے لوگوں کے قید و بند کا مقصد ان پر عائد کردہ الزام کی تحقیق کرنا ہے۔ اس لئے اس کی مدت ایک دو ماہ سے زائد ہرگز نہ ہونی چاہئے:

''قال بعض الفقهاء: إن أكثر مدة يحبس فيها المتهم المجهول الحال يوم واحد، وحددها قوم بيومين وثلاثة وأجاز آخرون بلوغها شهرا۔ أما المتهم المعروف بالفجور والفساد فأكثر مدة حبسه بحبس ما يقتيضه ظهور حاله والكشف عنه'' (الموسوعه: ۱۶/۲۹۴،۲۹۵)۔

۲- الف: قیدی کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کا پورا حق ہوگا۔ اس کو یا اس کے اسلاف کو گالی گلوج کرنا یا ان کے احترام کے خلاف کوئی قول و فعل ممنوع ہوگا۔

''لا يجوز للإمام أوغيره التاديب باللعن والسب الفاحش وسب الآباء والأمهات ونحو ذلك'' (الموسوعة: ۱۶/ ۲۲۸)

''ينبغي تمكين المحبوس من الوضوء والصلوة ولا تجوز معاقبته بالمنع منهما'' (الموسوعه ۱۶/ ۳۲۷)۔

ب- جسمانی ضروریات میں مناسب غذا، صاف ستھرا پانی، علاج اور ورزش وغیرہ کی سہولت دی جائے گی۔ البتہ بیوی سے وطی کا موقع دینے کے بارے میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض نے اجازت دی ہے۔ بعض نے منع کیا ہے، بعض نے قاضی کی رائے پر موقوف رکھا ہے۔ میرے نزدیک مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قاضی کی صوابدید پر موقوف ہونا چاہئے۔

''القول الأول: لايمنع المحبوس من وطاء زوجته في الحبس إذا كان فيه موضع لايطلع عليه أحد وإلا منع... القول الثاني: يمنع المحبوس من وطاء زوجته؛ لأن من غايات الحبس إدخال الضيق والضجر على قلبه لردعه وزجره... القول الثالث: الاصل في وطاء المحبوس زوجته انه حق من حقوقه المشروعة ولا يمنع منه إلا إذا اقتضت ذلك المصلحة ورآه القاضي'' (المنوسوعه ۱۶/ ۳۲۲،۳۲۳)۔

البتہ اس کو ایسی تنگ جگہ میں نہیں رکھا جائے گا جہاں کھڑا ہونا، پاؤں پھیلا کر لیٹنا، دیوار کے باہر کسی چیز کا دیکھنا ممکن نہ ہو۔

''قال ابن القيم الجوزية الحنبلي: اعلم أن الحبس الشرعي ليس هو الحبس في مكان ضيق وإنما هو تعويق الشخص ومنعه من التصرف بنفسه حيث شاء سواء كان في بيت أو مسجد'' (معین الحکام: ۱۹۶)۔

ج- عام سماجی حقوق کے بارے میں قاضی اپنی صوابدید کے مطابق برتاؤ کرے گا، اگر مصلحت کے خلاف نہ ہو تو اجازت دے گا ورنہ منع کردے گا۔

د- مردوں اور عورتوں اور نابالغ بچوں کے الگ الگ قید خانے بنائے جائیں گے۔

''نص الفقهاء على أن يكون للنساء محبس على حدة إجماعًا ولا يكون معهن رجل لوجوب سترهن وتحرزا من الفتنة... إذا حبس الخنثى المشكل فلا يكون مع الرجال ولا النساء بل يحبس وحده أو عند محرم'' (الموسوعه ۱۶/ ۳۱۷)

جہاں تک بچوں کے جیل میں رکھنے کا مسئلہ ہے تو ان کو تعزیر کے طور پر جیل میں نہیں رکھا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ مکلف نہیں ہیں، البتہ تادیب کے طور پر

رکھا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں جیل میں رکھنا بہتر ہوگا جب کہ تادیب کے لئے جیل میں رکھنا اس کو آزاد چھوڑ دینے سے بہتر ہو اور اس میں اس کی اصلاح کی امید ہو، ان کو مردوں و عورتوں سے الگ رکھا جائے گا۔

۳- قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے معمولی مار پیٹ کی سزا دی جاسکتی ہے۔ متہم اگر مجہول ہو تو معمولی سزا دی جائے گی۔ اور اگر تہمت میں مشہور ہو تو اس کو کچھ زیادہ سزا دی جاسکتی ہے۔ لیکن سچی بات اگلوانے میں اور اقرار پر مجبور کرنے میں بہت فرق ہے۔ متہم کو اقرار کرنے پر مجبور کرنے کے لئے سزا دینا جائز نہ ہوگا۔

جیسا کہ ایک بار حضرات صحابہ نے ایک شخص کو پکڑا اور اس سے حضرت ابوسفیان کے بارے میں پوچھنا شروع کیا جب وہ جواب دیتا کہ چھوڑ دو میں بتا دوں گا۔ پھر جب چھوڑ دیتے تو کہتا کہ ابوسفیان کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں ہے۔ اسی طرح بار بار ہوتا رہا۔ نبی کریم ﷺ نماز پڑھ رہے تھے اور یہ سب سن رہے تھے، پھر نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ جب تک وہ سچ بولتا ہے تم لوگ اس کو مارتے رہو گے اور جب جھوٹ بول دے گا تو چھوڑ دو گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محض اقرار کرانے کے لئے سزا دینا اور مار پیٹ کرنا جائز نہ ہوگا۔

البتہ قیدیوں کو بے لباس کرنا، ان پر کتے چھوڑنا، انہیں الکٹرک شاٹ لگانا، ٹھنڈک میں برف کی سل پر ڈال دینا، دھوپ میں کھڑا کرنا، ان کی جائے رہائش میں تیز روشنی یا تیز آواز کا انتظام کرنا جائز نہ ہوگا۔ (دیکھئے: الموسوعہ الفقہیہ: ۱۶/ ۲۸-۳۲۷)۔

۴- اگر کسی قیدی کے فرار ہونے کا اندیشہ ہو تو اس کے حالات کے اعتبار سے ہتھکڑی پہنائی جاسکتی ہے، یا بیڑی ڈالی جاسکتی ہے۔ اگر فرار کا اندیشہ نہ ہو تو ایسا نہیں کیا جائے گا۔

"وفي كفالة الأصل: لايضرب المديون ولا يغل ولا يقيد إلا أن يخاف فراره" (معين الحكام/١٩٧)۔

۵- کسی مجرم کو اس کے خصوصی جرم کے پس منظر میں قید تنہائی دی جاسکتی ہے۔

"ويجوز للحاكم عزل السجين وحبسه منفردا في غرفة يقفل عليه بابها إن كان في ذلك مصلحة" (الموسوعہ ١٦/ ٣١٩)

۶- اگر قیدی سے کام لینا قاضی مناسب سمجھے تو کام لیا جاسکتا ہے۔ کام لیا جائے گا تو اس کو اجرت ملے گی۔

"بترك تمكين المحبوس من العمل في حبسه لتقدير الحاكم واجتهاده" (الموسوعہ ١٦/ ٣٢٢)۔

۷- جن قیدیوں کے بارے میں سزائے قید کا فیصلہ ہو چکا ہو۔ یہ سوال قابل غور ہے۔ اس لئے کہ شریعت میں جرم کی سزا قید میں رکھنا نہیں ہے۔ جن وجوہات کی وجہ سے کسی کو قید میں رکھا جاتا ہے ان وجوہات کے دور ہونے پر اس کو رہا کر دیا جائے گا۔ بہر حال حق کی عدم ادائیگی کی وجہ سے قید میں رکھا گیا ہو یا اس پر جو تہمت لگائی گئی اس کی تحقیق کے لئے اس کو قید میں رکھا گیا ہو۔ اوپر علامہ ابن القیم سے حبس شرعی کی تعریف معین الحکام کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔

۸- اسلام میں کسی جرم کی سزا متعینہ مدت تک جیل میں رکھنا نہیں ہے۔ اس لئے یہ سوال ہی بے کار ہے کہ اصل سزا کے بقدر فیصلہ سے قبل اس کو جیل میں رکھا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اوپر گزر چکا ہے کہ متہم اگر مجہول الحال ہو تو زیادہ سے زیادہ اس کو ایک ماہ جیل میں رکھا جاسکتا ہے۔ اگر فتنہ و فساد میں معروف و مشہور ہو تو اس کے قید و بند کی مدت تحقیق کے لئے کچھ زیادہ ہوسکتی ہے۔

۹- اوپر کی بحث سے واضح ہوا کہ صرف اسی متہم کو قید و بند میں رکھا جائے گا جو مجہول الحال یا فتنہ و فساد میں معروف ہو۔ اور حبس شرعی کی تعریف کی اوپر گزر چکی ہے۔ اس لئے اس کو قید و بند میں رکھنا ناحق نہیں ہے، اس لئے اس مدت کا ہرجانہ طلب کرنا صحیح نہ ہوگا۔ البتہ اگر جیل میں اس کو ناحق اذیت دی جائے تو اذیت دینے والوں کو سزا دیئے جانے کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ ثابت ہونے پر اذیت پہنچانے والوں کو سزا دی جائے گی۔

۱۰- قیدی کو اپنی طرف سے صفائی پیش کرنے کا پورا حق ہوگا۔ دوسرے لوگوں کی طرح اس کو بھی وکیل بنانے کا حق ہوگا۔

۱۱- شیر خوار بچہ کا ماں کے پاس رہنا صرف ماں کا حق نہیں ہے، بلکہ خود بچہ کا بھی حق ہے۔ لہذا اگر کسی وجہ سے ماں کو جیل میں رکھا جائے تو اس سے بچہ کا حق متاثر نہیں ہونے دیا جائے گا، اس لئے بچہ کو ماں کے ساتھ رکھا جائے گا۔

قیدیوں کے حقوق

مفتی سید صادق محی الدین[1]

اسلام دین عدل واعتدال ہے اس میں انتہاپسندی، جبروتشدد، ظلم وزیادتی، کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اس اعتدال کی بنیاد جس قانون اسلام پر قائم ہے اس قانون کا ایک اہم دفعہ احترام نفس ہے، اور اسلام کا بنیادی اور آفاقی پیغام انسانیت کا احترام ہے۔ ولقد کرمنا بنی آدم۔

نوع انسانی کو حرمت نفس کی تعلیم جس محسن اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی اس نے اپنی زندگی میں کتنی ہی جنگیں لڑیں، دشمنوں پر فتح حاصل کی اور انہیں اپنا اسیر بنایا، لیکن کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہ ملے گا کہ جس میں مخالف قوم اور دشمنوں کے ساتھ بدسلوکی، جبروتشدد یا ظلم وزیادتی کی ہو یا انہیں انتہا درجہ کی اذیتیں پہونچائی ہوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ میں فاتح کی حیثیت میں داخل ہوئے تو اپنا سر مبارک عاجزی سے جھکائے ہوئے "لا تثریب علیکم الیوم" کی صدا بلند کی، اور اہل مکہ کے ساتھ معافی ودرگزر کا سلوک فرمایا اور ان کے لئے نرمی ورحمت کے پہلو کو بچھادیا، اور صحابہ کرام ؓ کو یہ حکم دیا کہ ان قیدیوں کے ساتھ فیاضی کا برتاؤ کریں، اس حکم کی تعمیل میں صحابہ کرام ؓ نے ان قیدیوں کے ساتھ جو برتاؤ کیا اس کی نظیر نہیں ملتی، اگر چہ کہ اس وقت مسلمانوں کے حالات انتہائی تنگ دستی کے تھے، لیکن صحابہ کرام ؓ نے اپنے سے اچھا کھانا انہیں کھلایا اور اپنے سے عمدہ کپڑا ان کو پہنائے۔

حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم قیدیوں سے کبھی فدیہ لے کر اور اکثر بغیر فدیہ لئے ان کو آزاد فرمادیا کرتے تھے، نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ حنین کے موقع پر بنو عبدالمطلب کے قیدیوں کو بلاکسی معاوضے کے رہا فرمادیا، آپ کی پیروی میں انصار ومہاجرین نے بھی ایسا ہی عمل کیا، البتہ بنو سلیم اور بنو فزارہ کا یہ خیال تھا کہ حملہ آور دشمن جو خوش قسمتی سے زیر ہو گیا ہے آزاد کر کے ان پر لطف وکرم کیوں کیا جائے، اس لئے انہوں نے آزاد نہیں کیا تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں طلب فرمایا اور ہر قیدی کی قیمت طے کروائی تو ہر قیدی کی قیمت چھ اونٹ طے پائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قیمت خود ادا فرمادی، اس طرح سارے قیدیوں کو آزادی مل گئی، پھر ان قیدیوں کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے لباس مہیا فرما کر رخصت فرمایا۔ اللہ سبحانہ وتعالی کا ارشاد ہے: "ویطعمون الطعام علی حبه مسکینًا ویتیمًا وأسیرًا" (سورہ انسان: ۸)، اللہ سبحانہ وتعالی کی محبت میں وہ غریب، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔

قیدی دو طرح کے ہیں ایک وہ جو ظلما قید کر لئے گئے ہوں، دوسرے وہ جو ظلم کی سزا میں قید ہوئے ہوں۔ ظلما قید ہونے والے قیدیوں کی مدد اور ان پر احسان تو ایک فطری عمل ہے، لیکن ثبوت ظلم کی سزا میں قید ہونے والے قیدیوں کے ساتھ بھی اسلام احسان وسلوک کی تعلیم دیتا ہے، اس میں مسلم وغیر مسلم کی بھی کوئی قید نہیں، اسلام نے ان قیدیوں کو کھانا کھلانے کی ذمہ داری از روئے قانون اسلامی حکومت پر عائد کی ہے، اگر اسلامی ملک کے باشندے ان قیدیوں کو کھانا کھلا کر حسن سلوک کرتے ہیں تو گویا ان کا یہ کام اسلامی حکومت اور بیت المال کا معاون ہوتا ہے، دراصل ابتدائے اسلام میں قیدیوں کی بنیادی ضروریات کھانے پینے اور ان کی حفاظت عام مسلمانوں کی تفویض کو جاتی تھی۔

پھر ان میں بھی قیدی دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک وہ جو دو ملکوں کی لڑائی اور جنگ کی صورت میں گرفتار ہوتے ہیں، اسلام نے ایسے قیدیوں کے ساتھ احسان وسلوک کی ایک بے نظیر تاریخ بنائی ہے، قیدیوں کے ساتھ رأفت ورحمت کا برتاؤ کر کے اس دنیا کو جو ظلم کی خوگر ہے احترام انسانیت کا

---

[1] دارالافتاء جامعہ نظامیہ۔

عظیم درس دیا ہے۔

دوسرے وہ قیدی جو کسی جرم کے الزام میں کسی بھی ملک میں گرفتار ہوتے ہیں اور اسی ملک کے قید خانے میں محبوس ہوتے ہیں، ان میں بھی دو طرح کے قیدی ہوتے ہیں: ایک وہ جن پر الزام ہوتا ہے، لیکن جرم ثابت نہیں ہوتا، ان کے متعلق مقدمات زیر دوراں رہتے ہیں اس لئے وہ قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے رہتے ہیں، دوسرے وہ قیدی ہیں جن پر ثبوت وشہادت کے ساتھ جرم ثابت ہو چکا ہوتا ہے اور ملکی عدالت ان کے لئے سزا تجویز کرتی ہے، حسب فیصلہ وہ قید خانے میں اپنی سزا کی میعاد پوری کرنے کے لئے قید رہتے ہیں۔

اب رہے وہ قیدی جن پر صرف الزام ہو اور ان کا جرم ثابت نہ ہو سکا ہو اور وہ قیدی ثبوت جرم سے پہلے قید میں رہے ہوں، اگر چہ بعد میں ان پر جرم ثابت ہو گیا ہو، ان ہر دو طرح کے قیدیوں پر عدالت کے فیصلہ سے قبل غیر انسانی طرز پر دی جانے والی سزائیں خود قابل جرم ہیں، قیدیوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک روا رکھنے والے خود قابل سزا ہیں۔ اس تناظر میں درج ذیل سوالات کا جائزہ لیا جائے تو ان کے جوابات یہ ہوں گے۔

۱- جرم کے ثبوت کے بغیر اول تو قید کیا جانا ہی صحیح نہیں، اگر واضح اشارات کی بنا پر شکوک وشبہات کو تقویت پہونچ رہی ہو تو ان کو تحقیق کی خاطر قید کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ قید طویل نہ ہو، بلکہ مختصر عرصہ میں نتیجہ پر پہونچ کر کما حقہ ثبوت فراہم نہ ہو تو ان کو رہائی دے دی جائے، اگر جرم کے ثبوت کو تقویت مل رہی ہو کہ جس سے جرم ثابت ہونے کا یقین ہو تو اس کو قید رکھ کر عدالت میں جلد سے جلد فیصلہ کی کوشش کرتے ہوئے حسب فیصلہ اس کو سزا دی جانی چاہئے۔

۲- دستور و قانون کے مطابق دنیا کے سارے ممالک میں انسانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے اس لئے سوال نمبر ایک میں درج مذہبی، جسمانی، سماجی و اخلاقی امور بطور حقوق قیدیوں کو بھی ضرور دئے جائیں۔ البتہ وہ قیدی جن پر جرم ثابت ہو کر حسب جرم وہ سزا کاٹ رہے ہوں ان کے ساتھ حسب فیصلہ ان کی سہولتوں میں کمی بیشی کی جا سکتی ہے۔ بہر حال ہر صورت میں احترام انسانیت ملحوظ خاطر رہے۔

۳- سچ اگلوانے کے لئے قیدیوں کو دھمکانا پڑے تو ایسے قیدیوں کو جن پر الزام کمزور بنیادوں پر لگا ہو ان کو ہلکے پھلکے انداز میں دھمکایا جا سکتا ہے، اور جن پر الزام ثبوت جرم کے شواہد فراہم کرنے کے موقف میں ہو تو ان کو حقیقت حال جاننے کے لئے قابل برداشت حد تک دھمکایا جا سکتا ہے، لیکن الف، ب، ج، د، ھ، و میں درج سزائیں دینے کا کوئی جواز فراہم نہیں ہو سکتا، یہ ساری سزائیں بے انتہاء انسانیت سوز اور گھناؤنی ہیں، عدالت کے فیصلہ سے قبل اس طرح کی سزا دینے والے خود عبرت ناک سزاؤں کے مستحق ہیں کیوں کہ دنیا کی کوئی عدالت جو احترام انسانیت کے انسان قانون کی علم بردار ہے اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔

۴- قیدیوں کو حفاظت کی غرض سے ہتھکڑی پہنائی جا سکتی ہے، قیدی کی چالاکی اور اس کی تدبیر سے اس بات کا خطرہ ہو کہ وہ ہتھکڑی سے آزاد ہو کر فرار ہو جائے گا تو دوسرے درجہ میں حفاظت کی غرض سے پیر میں بیڑی ڈالی جا سکتی ہے، یہ بھی ثبوت جرم میں ممد و معاون ہونے کی حیثیت سے ان کو اختیار کیا جاتا ہے، اب رہا زنجیروں میں جکڑ دینا یہ ایک دردناک پہلو ہے جو انسانیت سوز ہے اس لئے اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

۵- قید تنہائی ایک کرب ناک سزا ہے جس کا ایک انسان متحمل نہیں ہو سکتا، عدالت کو چاہئے کہ جرم کی مناسبت سے سزا تجویز کرے، اور وہ جرائم جن کی سزائیں اسلام نے مقرر کی ہیں وہ اس قابل ہیں کہ دنیا کی ساری عدالتیں تعصب سے اونچے اٹھ کر ان کی حقیقتوں کو تسلیم کر کے جاری کرنے کا فیصلہ کر لیں تو انسانیت پر غیر ضروری ظلم وستم کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ اسلام کا قانون جرم کو ناپسند کرتا ہے، لیکن مجرم سے نفرت نہیں سکھاتا، مجرم کو ثبوت جرم پر اسلام اور دوسروں کو اس کی عبرت ہو۔

۶- عدالت کے فیصلہ سے قبل قیدیوں پر کوئی مشقت ڈالی جائے یا کسی طرح کی سزا دی جائے تو دنیا کا کوئی قانون اس کی اجازت نہیں دیتا، اس لئے وہ قیدی جن کے جرم کی مناسبت سے عدالت نے قید بامشقت طے کی ہو تو ان سے کوئی کام ان کی برداشت کے مطابق لیا جا سکتا ہے۔

۷- نمبر سات میں دریافت امر نمبر ایک کے ضمن میں بیان ہو چکا ہے، یقیناً ان دونوں کے درمیان میں فرق رہے گا، جو قیدی جرم کی سزا میں عدالت

کے فیصلہ کے بعد سزا کاٹ رہے ہوں ان کو بشرط انصاف وہی سزا ملنی چاہئے جس کو عدالت نے جرم کی مناسبت سے تجویز کیا ہے، وہ قیدی کہ جن کا جرم ابھی عدالت سے ثابت نہیں ہوا، ان کو کسی طرح کی سزا دینے کے قید خانے کے ذمہ دار شرعاً قانوناً مجاز نہیں۔

۸- زیر سماعت قیدیوں کو طویل عرصہ تک قید و بند میں رکھنا یہ خود انسانیت پر دردناک ظلم ہے، اس لئے مقدمات کی سماعت میں تیزی لانی چاہئے تاکہ کم سے کم مدت میں انسانوں کو انصاف مل سکے۔ اسلام فوری انصاف کی ہدایت کرتا ہے، اس پر عمل نہ کیا جائے تو اکثر ایسی صورت حال ظاہر ہوتی ہے جس کا نمبر آٹھ میں ذکر کیا گیا ہے۔

۹- نمبر نو میں جو بات ذکر کی گئی ہے کہ اگر قیدی بڑی مدت تک جیل کاٹنے کے بعد باعزت بری کر دیا گیا ہو تو وہ زمانہ قید میں ہونے والی ذہنی اذیت و جسمانی تکلیف وغیرہ کے ضمن میں دنیا کا قانون تو ہرجانا طلب کرنے کی اجازت دیتا ہے، لیکن اس سے اس کو دی گئی تکلیف کا قطعی ازالہ نہیں ہوسکتا، کیوں کہ صدمات ذہنی و روحانی کرب اور عمر عزیز کا ایک بڑا قیمتی حصہ جو جیل کی نذر ہو رہا ہے اس کی کوئی قیمت دنیا جہاں کی دولت بھی بطور بدل ثابت نہیں ہوسکتی، اسی لئے اسلام احترام انسانیت کے پیش نظر حدود و قصاص اور دیگر جرائم سے متعلق جو ہدایات ان کے لئے دیتا ہے اور جو قوانین انسانوں کے لئے پیش کرتا ہے اس کو دستور و قانون سے حیثیت سے تسلیم کیا جائے تو انصاف کے تقاضے پورے ہوسکتے ہیں۔

۱۰- ہر انسان کو اپنی صفائی پیش کرنے کا حق حاصل ہے، اگر کوئی قیدی اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کا اہل نہ ہو تو اس کو قانوناً یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مقدمات کے سلسلہ میں وکیل سے رابطہ رکھے اور اس کی خدمات حاصل کرے۔

۱۱- خواتین صنف نازک کہلاتی ہیں، اسلام نے حالت جنگ میں بھی عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے لئے خصوصی احکامات دئے ہیں، اگر وہ جرائم کی مرتکب ہوں، اور جرم کے ثبوت پر سزا کاٹ رہی ہوں اور ان کا بچہ دودھ پی رہا ہو تو شیر خوار بچے کو ماں کے ساتھ جیل میں رکھنے کا حق حاصل رہے گا۔ اسلام پر یہ الزام ہے کہ وہ سخت سزائیں دیتا ہے، حالانکہ اسلام نے جو سزائیں جرائم کی مناسبت سے طے کی ہیں اس میں مجرم پر بھی احسان کی صورت رکھی گئی ہے۔

قیدیوں کے حقوق - اسلام میں

مولانا محمد اسماعیل بھڈکودروی [1]

الجواب: ۱- کسی ملزم کو اس پر جرم کا شک وشبہ ہونے کی وجہ سے اس کی تحقیق وتفتیش کے لئے قید کیا جا سکتا ہے، اور اگر بطور احتیاط قید کیا جائے تو اس کے متعلق ضروری ہے کہ جلدی سے اس کی تحقیق کی جائے، اور جب کسی جرم کا ثبوت فراہم نہ ہو تو فوراً ہی اس کو باعزت رہا کر دیا جائے،

''وقد حبس رسول الله صلى الله عليه وسلم رجلًا في تهمة'' (المبسوط للسرخسی ۲۶/۳۶، فقه السنة ۳/ ۴۶۶)۔

''قال جماعة من الفقهاء بمشروعية الحبس بدليل أن النبي صلى الله عليه وسلم حبس رجلًا في تهمة ثم خلى عنه وهذا هو الحبس الاحتياطي'' (الفقه الاسلامی وادلته ۶/ ۱۹۸)۔

الجواب: ۲- الف-قیدیوں کو مذہبی امور انجام دینے سے روکنا جائز نہیں، البتہ ایسے مذہبی امور جن کی ادائیگی قید خانہ سے نکلے بغیر ممکن نہ ہو ایسے مذہبی امور سے روکنے کی اجازت ہوگی مثلاً جمعہ، جماعت میں حاضری، حج کی ادائیگی، جنازہ میں شرکت وغیرہ، البتہ اپنے اصول وفروع کے جنازہ میں کسی کو اپنا کفیل بنا کر شریک ہونے کی اجازت ہوگی۔ مذہبی کتابوں کے مطالعہ، دوسرے قیدیوں میں دعوت دین اور حلال پاکیزہ غذا فراہم کرنا قیدیوں کا حق ہے، یہ حق اس سے چھینا نہیں جا سکتا، اور چونکہ مذہب کی مقدس شخصیتوں اور کتابوں کا احترام تمام مذاہب میں مسلّم ہے لہٰذا ان کی بے احترامی سے گریز کرنا لازم ہوگا، "یاصاحبی السجن أأرباب متفرقون خیر أم الله الواحد القهار" (سورۂ یوسف/ ۳۹)۔

''ولا يخرج لجمعة ولا جماعة ولا لحج فرض ولا لحضور جنازة ولو كان بكفيل، زيلعي وفي الخلاصة يخرج بكفيل لجنازة أصوله وفروعه لا غيرهم وعليه الفتوى'' (الدر المختار علی ہامش الشامی نعمانیہ ۴/ ۳۱۴، البحر الرائق ۶/ ۲۸۳)۔

ب- جن قیدیوں کا جرم ثابت ہو چکا ہے جسمانی ضروریات کے لحاظ سے ان کی زیادہ رعایت نہیں کی جائے گی بلکہ ان کو معمولی قسم کا بستر، کھانا پانی دے دیا جائے، اور بیماری کی وجہ سے حتی المقدور قید خانہ ہی میں ان کا علاج کیا جائے، قید خانہ سے باہر علاج کے لئے جانے کی اجازت نہ ہوگی، الا یہ کہ قید خانہ میں علاج ومعالجہ ممکن نہ ہو تو قید خانہ سے باہر علاج معالجہ کے لئے جانے کی اجازت ہوگی، نیز بیوی کے ساتھ تعلق کی بھی اجازت ہوگی، البتہ حفظان صحت کے لئے ورزش وتفریح کی اجازت نہیں دی جائے گی لیکن ان کو اتنی تنگ جگہ میں رکھنا کہ ان کے لئے اٹھنا بیٹھنا دشوار ہو جائے درست نہیں۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے: شامی ۴/ ۳۱۳، فصل فی الحبس)

اور جن کا جرم ابھی ثابت نہیں ہوا یا ان کے متعلق اب تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا ان کو ہر قسم کی سہولت دی جائے گی، رہائشی اعتبار سے ان کو وسیع جگہ میں رکھا جائے گا، نان ونفقہ اور کسوہ دیا جائے گا، اور ان کی مار پیٹ جائز نہ ہوگی، غرض یہ کہ ان کے ساتھ ہر اعتبار سے احسان کا معاملہ کیا جائے گا۔

''وينبغي أن يكون الحبس واسعًا وأن ينفق على من في السجن من بيت المال وأن يعطى كل واحد كفايته من الطعام واللباس'' (فقه السنة ۳/ ۴۶۷)۔

''والأسير من أسرى المشركين لا بد أن يطعم ويحسن إليه حتى يحكم فيه فكيف برجل مسلم قد أخطأ أو أذنب

---

[1] دار العلوم کنتھاریہ، بھروچ، گجرات۔

یترك یموت جوعًا'' (کتاب الخراج للامام ابی یوسف/۱۴۹)۔

''وکسوتھم فی الشتاء قمیص وکساء وفی الصیف قمیص وإزار ویجری علی النساء مثل ذلك وکسوتھن فی الشتاء قمیص ومقنعة وکساء وفی الصیف قمیص وإزار ومقنعة'' (کتاب الخراج للامام ابی یوسف/۱۵۰)۔

ج- قیدیوں کو قید میں رہتے ہوئے بعض سماجی حقوق ادا کرنے کی بھی اجازت ہوگی جیسے تعلیم و تعلم، دوسرے قیدیوں سے ملاقات و حسن سلوک، نیز مختصر وقت کے لئے اپنے رشتہ داروں کی ملاقات سے نہ روکا جائے، اسی طرح فون پر مختصر بات چیت، خیر خیریت پوچھنے کی اجازت دی جائے گی جس پر ہمارے اسلاف کے جیل خانوں کے واقعات سے روشنی پڑتی ہے۔

''ولا یمکن أحد أن یدخل علیه للاستئناس إلا أقاربه وجیرانه لاحتیاجه للمشاورة ولا یمکثون عنده طویلًا'' (در) قوله ولا یمکثون عنده طویلًا ای بحیث یحصل له الاستئناس بھم بل بقدر ما یحصل به المقصود من المشاورة'' (شامی نعمانیه ۴/۲۱۳، فصل فی الحبس)۔

د- مردوں اور عورتوں کا الگ قید خانہ رکھا جائے گا، اسی طرح بالغ و نابالغ کا قید خانہ بھی فتنہ کے اندیشہ سے الگ رکھنا چاہئے۔

''وفی المحیط یجعل للنساء سجن علاحدة نفیا لوقوع الفتنة'' (البحر الرائق ۶/ ۲۸۳)۔

الجواب: ۳- قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے کسی حد تک دھمکانے کی اجازت ہے جیسا کہ حضرت علیؓ نے اس عورت کو جس کو حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ نے کفار مکہ کے نام ایک خط دیا تھا، اس عورت نے اصرار کے باوجود خط نہ نکالا تو حضرت علیؓ نے اس کو بے لباس کرنے کی دھمکی دی:

''عن علی رضی الله عنه قال بعثنی رسول الله صلی الله علیه وسلم وأبا مرثد والزبیر وکلنا فارس قال انطلقوا حتی تأتوا روضة خاخ فإن بھا امرأة من المشرکین معھا کتاب من حاطب إلی المشرکین فأدرکناھا تسیر علی بعیر لھا حیث قال رسول الله صلی الله علیه وسلم فقلنا: الکتاب؟ فقالت: ما معنا کتاب، فأنخناھا فالتمسنا فلم نر کتابًا فقلنا: ما کذب رسول الله ﷺ لتخرجن الکتاب أو لنجردنك الخ'' (بخاری شریف ۲/ ۵۶۷، مکتبہ دیوبند)۔

مگر اس مقصد کے لئے قیدیوں کو حقیقۃً بے لباس کر دینا، اسی طرح کسی جرم کے ثبوت سے پہلے ان کو مار پیٹ کرنا اور ان پر کتے چھوڑنا جائز نہیں ہے، نیز ان کو سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈال دینا، ان کے رہنے کی جگہ پر تیز روشنی و تیز آواز کا اذیت دینے کے غرض سے انتظام کرنا، اور ان کو مسلسل بیداری پر مجبور کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس کی وجہ سے ہلاک ہونے یا اعضاء کی اکثر یا کل منفعت فوت ہو جانے کا اندیشہ ہے، رہی بات الکٹرک شاٹ کی تو چونکہ یہ بھی آگ کی ایک قسم ہے، اور جس طرح آگ سے جل جانے والی چیز سکڑ جاتی ہے اسی طرح الکٹرک شاٹ سے ہوتا ہے، اور حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جاندار کو آگ سے عذاب دینے کی ممانعت فرماتے ہوئے کہا کہ اللہ کے علاوہ کسی بھی بندہ کو آگ کے ذریعہ عذاب دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

''عن أبی ھریرة رضی الله عنه أنه قال: بعثنا رسول الله صلی الله علیه وسلم فی بعث فقال: إن وجدتم فلانا وفلانا فأحرقوھما بالنار، ثم قال رسول الله صلی الله علیه وسلم حین أردنا الخروج: إنی أمرتکم أن تحرقوا فلانا وفلانا وأن النار لا یعذبھا إلا الله فإن وجدتموھما فاقتلوھما'' (بخاری شریف ۲/ ۴۲۳ کتاب الجھاد، باب لایعذب بعذاب الله، المحیط البرھانی: کتاب الکراھیة، الفصل الثالث والعشرون)۔

''وقد روی أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال فی بنی قریظة: لا تجمعوا علیھم حر ھذا الیوم وحر السلاح ولا تمثلوا بھم، لقوله علیه الصلاة والسلام فی وصایا الأمراء ولا تمثلوا'' (بدائع الصنائع ۷/ ۱۲۰، کتاب السیر، مطلب وأما مفاداة الاسیر فحکمه)۔

الجواب: ۴- قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑنا اور ہتھکڑیاں پہنانا، نیز بیڑیاں ڈالنا جائز ہے جیسا کہ حضرت ثمامہ بن اثالؓ کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے۔

''عن الليث قال حدثني سعيد ابن سعيد سمع أبا هريرة قال: بعث النبيﷺ خيلًا قبل نجد فجائت برجل من بني حنيفة يقال له ثمامة بن أثال فربطوه بسارية من سواري المسجد'' (بخاری شریف ۲/۶۲۰ مکتبہ دیوبند)۔

''عن جندب بن مكيث قال: بعث رسول اللهﷺ عبدالله بن غالب الليثي في سرية وكنت فيهم وأمرهم أن يشنوا الغارة على بني الملوح بالكديد فخرجنا إذا كنا بالكديد لقينا الحارث بن البرصاء الليثي فأخذناه فقال: إنما جئت أريد الإسلام وإنما خرجت إلى رسول اللهﷺ فقلنا: إن تكن مسلما لم يضرك رباطنا يوما وليلة وإن تكن غير ذلك نستوثق منك فشددنا وثاقا (اى ربطًا شديدًا)'' (ابو داؤد شریف ۲/۳۶۳، باب فی الاسیر یوثق)۔

الجواب:۵- نبی اکرم ﷺ کے زمانہ مبارکہ میں غزوہ تبوک کے موقع پر تین صحابۂ کرامؓ پیچھے رہ گئے جس کی وجہ سے تمام مسلمانوں نے ان سے پچاس دن تک مقاطعہ کیا، اس سے معلوم ہوا کہ کسی مجرم کو اس کے خصوصی جرم کی وجہ سے قید تنہائی دی جاسکتی ہے۔

الجواب:۷- جن قیدیوں کا جرم ثابت ہو چکا ہو اور سزا تجویز کی جاچکی ہو انہیں مجوزہ سزا دی جاسکتی ہے، مگر جن قیدیوں کا جرم ابھی ثابت نہیں ہوا محض شبہ کی وجہ سے ان کو حراست میں رکھا گیا ہے تو ان کے ساتھ نرمی کا معاملہ کیا جائے گا، ان کو کسی قسم کی سزا دینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، خلاصہ یہ ہے کہ دونوں قسم کے قیدیوں کے درمیان فرق کیا جائے گا۔

''ولا يحل إقامة حد على من لم يستوجبه كما لا يحل إبطاله عمن استوجبه بغير شبهة فيه'' (کتاب الخراج للامام ابی یوسف ۱۵۲)

الجواب:۸- جن قیدیوں کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے انہیں اپنے اوپر عائد فرد جرم کی اصل سزا سے زائد مدت تک بلکہ اس سے کم بھی رکھنا جائز نہیں، کیوں کہ ان کے بارے میں حکم یہ ہے کہ جلد از جلد ان کے متعلق فیصلہ کیا جائے اور جو سزا تجویز کی جائے دیدی جائے۔

''لا تدعن في سجونكم أحدًا من المسلمين في وثاق لا يستطيع أن يصلي قائمًا ولا تبيتن في قيد إلا رجلا مطلوبا بدم'' (کتاب الخراج للامام ابی یوسف/۱۵۰)۔

''ولا يحل حبس أحد بدون حق ومتى حبس بحق يجب المسارعة بالنظر في أمره فإن كان مذنبا أخذ بذنبه وإن كان بريئا أطلق سراحه'' (فقه السنه ۳/۲۶۶)۔

الجواب:۱۰- قیدی کو وکیل یا جج، اسی طرح کسی اور سے رابطہ قائم کرکے اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا حق حاصل ہے جیسا کہ حضرت یوسفؑ کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ہر مرتبہ عزیز مصر کے سامنے اپنی برائت ظاہر کرنے کی پوری کوشش فرمائی۔

الجواب:۱۱- اگر شیر خوار بچہ کا جیل سے باہر شیر خواری کا بآسانی انتظام ہو جاتا ہے اور دوسری کسی عورت کا دودھ قبول کر لیتا ہے نیز ماں سے علیحدہ رہنے میں اس کو کوئی خطرہ نہیں ہے تو خواہ مخواہ اس کی ماں کے ساتھ اس کو قید خانہ میں نہ بھیجا جائے، کیوں کہ ماحول کا اثر انسانی فطرت کو متاثر کرتا ہی ہے۔

☆☆☆

قیدیوں کے حقوق

مولانا ابوالبقاء ندوی[1]

۱- جرم کا ثبوت فراہم ہوئے بغیر بھی محض شک وشبہ اور تہمت کی بنا پر قید کرنا جائز ہے، بشرطیکہ شک کو تقویت بخشنے والا کوئی قرینہ پایا جائے۔ مدت قید کا تعین حاکم کی صوابدید پر موقوف ہے، البتہ اگر ملزم مشہور مجرم اور فسادی نہ ہو تو جتنی جلد ممکن ہو سکے اسے رہا کر دیا جائے، بعض فقہاء نے ایسے ملزم کی مدت قید زیادہ سے زیادہ تین دن اور بعض نے ایک مہینے مقرر فرمائی ہے۔

مندرجہ ذیل نصوص فقہیہ سے اس سوال کے حل میں مدد لی جاسکتی ہے۔

"ذهب جمهور الفقهاء إلى مشروعية حبس التهمة واعتبروه من السياسة العادلة إذا تأيدت التهمة بقرينة قوية أو ظهرت أمارات الريبة مع المتهم أو عرف بالفجور" (حاشیہ ابن عابدین ۴/۷۶)۔

أن النبي صلى الله عليه وسلم حبس رجلاً في تهمة" (اخرجہ ابوداؤد ۴/۴۷، ترمذی ۴/۲۸)۔

أن النبي صلى الله عليه وسلم حبس أحد رجلين من غفار اتهما بسرقة بعيرين وقال للآخر: اذهب فالتمس، فذهب وعاد بهما" (اخرجہ عبدالرزاق فی المصنف ۱۰/۲۱۶)۔

"لا حد لأقل مدة الحبس أما أكثره فيرجع فيه إلى اجتهاد الحاكم حتى ينكشف حال المتهم وقد نسب ابن تيمية هذا القول إلى مالك وأصحابه وأحمد ومحققي أصحابه وأصحاب أبي حنيفة، وقال بعض الفقهاء إن أكثر مدة يحبس فيها المتهم المجهول الحال يوم واحد وحددها قوم بيومين وثلاثة وأجاز آخرون بلوغها شهرا" (الموسوعة الفقہیہ ۱۶/۲۹۵)

۲- الف- قیدیوں کو شرعاً بھی اور ہر جمہوری ملک کے قانون کی رو سے بھی ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہے، لہذا اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنے، مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرنے، دوسرے قیدیوں کے درمیان اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے کا حق ان کو حاصل ہے۔ ان کو مذہبی تقاضوں کے مطابق غذا فراہم کی جائے، ان کی مذہبی شخصیات اور مذہبی کتابوں کی بے حرمتی سے گریز کیا جائے۔

درج ذیل فقہی عبارت سے اس پر روشنی پڑتی ہے:

"ينبغي تمكين المحبوس من الوضوء والصلاة" (الدر المختار مع حاشیہ ۵/۳۷۸)۔

ب- جسمانی ضروریات

قیدیوں کو وہ تمام امور مہیا کئے جائیں جو ان کی جان اور صحت وتندرستی کی بقا کے لئے لازم ہیں، ایسی کوئی شکل اختیار کرنا جس سے ان کی صحت وتندرستی پر مضر اثرات پڑ سکتے ہوں ان کے بنیادی انسانی حقوق کے خلاف ہے۔ لہذا انہیں مناسب غذا، علاج اور حفظان صحت کے لئے ورزش وتفریح کا موقع فراہم کیا جائے، ایسی تنگ جگہ میں رکھنا جہاں روشنی اور ہوا کا گذر نہ ہو قطعاً درست نہیں ہے۔

---

[1] جامعۃ الفلاح، بلریا گنج۔

البتہ بیوی سے تعلق کے سلسلہ میں فقہاء کرام کی مختلف رائیں پائی جاتی ہیں، راجح یہ ہے کہ اسے حاکم کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے، وہ قید خانے کی صورت حال، مجرم یا ملزم کے مقدمے کی نوعیت وغیرہ کا جائزہ لے کر مناسب فیصلہ صادر کریں (دیکھئے: ہدایہ، حاشیہ ابن عابدین، الموسوعۃ الفقہیہ)۔

ج-عام سماجی حقوق

قیدی حضرات بھی اصلاً سماج اور معاشرہ کا حصہ ہیں، انہیں اپنی تعزیری سزا پوری کرنے کے بعد سماج ہی میں واپس آنا ہے، اس لئے دنیوی حالات سے باخبر رہنے اور احباب واقارب سے ملاقات اور فون پر بات کرنے کا ان کو حق حاصل ہے۔ البتہ خصوصی مجرمین کی ٹیلیفونی گفتگو ریکارڈ کی جاسکتی ہے تاکہ وہ سماج اور معاشرہ کے لئے مفید بننے کے بجائے خطرہ نہ بن جائیں، قیدیوں کے لئے تعلیم اور ہنر سکھانے کا بھی نظم کیا جانا چاہئے تاکہ رہائی کے بعد وہ باعزت طریقے سے معاشرہ میں رہ سکیں۔

''للفقهاء ثلاثة أقوال فى تمكين المحبوس من العمل فى الحبس: الأول: لا يمنع. الثانى: يمنع. الثالث: يترك تمكين المحبوس من العمل فى الحبس لتقدير الحاكم واجتهاده'' (الموسوعة الفقهيه۲۲۲/۱۶)۔

د-اخلاقی حقوق

عدالتی حراست میں قیدیوں کو ڈالنے کا بنیادی مقصد ان کی اصلاح اور تادیب ہے، لہٰذا ایسی شکل اختیار کرنا جس سے ان کے اخلاق کے بگڑنے کا اندیشہ ہو جائز نہیں ہے، پس مردوں اور عورتوں کے قید خانے الگ الگ، اسی طرح نابالغ بچوں کے قید خانے الگ ہونے چاہئیں۔

درج ذیل فقہی نصوص اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی کرتی ہیں:

''نص الفقهاء على أن يكون النساء محبس على حدة إجماعًا ولا يكون معهن رجل لوجوب سترهن وتحرزا من الفتنة. تدل أكثر النصوص على أن يكون حبس الحدث فى بيت أبيه أو وليه على أنه يجوز حبسه فى السجن إلا إذا خشى عليه ما يفسده فيوجب حبسه عند أبيه لا فى السجن'' (الدر المختار ملخصا۲۵۳/۴)۔

۳- الف-قیدیوں کو بے لباس کرنا جائز نہیں ہے۔

''تحرم المعاقبة بالتجريد من الثياب لما فى ذلك من كشف العورة'' (حاشيه ابن عابدين۱۳/۴)۔

ب- قیدیوں کی اس طرح پٹائی کرنا کہ اس کی جان جانے یا کسی عضو کے تلف ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جائے درست نہیں ہے۔

''لا يجوز للحاكم التأديب بما فيه الإهانة والخطر كضرب الوجه وموضع المقاتل'' (الموسوعة الفقهيه)

ج- انہیں آگ یا اس کے مانند کسی اور چیز کی سزا دینا جائز نہیں ہے،

''يحرم التأديب بإحراق الجسم أو بعضه بقصد الإيلام والتوجيع'' (الموسوعة الفقهيه۲۲۷/۱۶)۔

د- ان پر کتا یا کوئی اور درندہ جانور چھوڑنا بھی جائز نہیں ہے۔

''وكذا إغراء الحيوان كالسبع والعقرب بالمحبوس ليؤذيه'' (الموسوعة الفقهيه۲۲۸/۱۶)۔

ہ- ان کو برف کی سلوں پر ڈالنا بھی درست نہیں ہے۔

''لا يجوز الحبس فى مكان بارد. فإن مات فالدية على الحابس'' (فتح القدير۴۷۱/۵)۔

و- ان کو مسلسل جگے رہنے پر مجبور کرنا بھی درست نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنے میں ان کی عقل کے زائل ہونے کا اندیشہ ہے۔

''وفى الجملة لا تجوز معاقبة المحبوس بقصد إتلاف كله أو بعضه'' (فتح القدير۴۷۱/۵)۔

۴- قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑنا درست نہیں ہے، البتہ اگر فرار ہونے کا اندیشہ ہو تو انہیں ہتھکڑی پہنائی جاسکتی ہے اور بیڑی ڈالی جاسکتی ہے۔

''ولا يغل السجين بوضع الغل في عنقه إلا إذا خيف فراره فيوضع القيد في رجله'' (الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید)۔

۵- کسی مجرم کو خصوصی جرم کے پس منظر میں قید تنہائی دی جاسکتی ہے۔ علامہ ابن عابدین نے اس کی تصریح فرمائی ہے:

''ويجوز للحاكم عزل السجين وحبسه منفردًا في غرفة يقفل عليه بابها إن كان في ذلك مصلحة'' (حاشیہ ابن عابدین ۴/۷۷)

۶- قیدیوں سے جبرًا کام لیا جانا چونکہ تعزیری سزا کا حصہ اور لازمہ نہیں ہے اس لئے ایسا کرنا ان کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہے، اگر ان سے جبرًا کام لیا جائے تو انہیں اس کی مناسب اجرت دی جائے۔

۷- جن قیدیوں کا مقدمہ زیر سماعت ہے وہ قانون اور شریعت کی نگاہ میں معصوم اور بے گناہ ہیں، اس لئے اولاً تو ان کا قید خانہ ہی الگ ہونا چاہئے لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو ان کے ساتھ سلوک میں نرمی اور آسانی برتی جانی چاہئے۔

''والمعمول به في القديم تمييز حبس الوالي الذي يضم أهل الريبة والفساد عن حبس القاضي الذي يضم المحكومين ويختلف سجن الوالي عن سجن القاضي'' (الموسوعة الفقهيه ۱۶/۳۱۸)۔

۸- اگر قیدی فجور وفساد میں معروف ومشہور ہو تو مقدمہ کی کارروائی مکمل ہونے تک اسے قید میں رکھا جاسکتا ہے اگر چہ یہ مدت اس کے اوپر عائد فرد جرم کی اصل سزا کے مساوی ہو جائے، البتہ اگر وہ متہم محض ہو تو ایک مہینے سے زیادہ قید میں رکھنا درست نہیں ہے۔

''أما المتهم المعروف بالفجور والفساد فأكثر مدة حبسه بحسب ما يقتضيه ظهور حاله والكشف عنه ولو حبس حتى الموت، وهذا هو الظاهر في مذاهب فقهاء الأمصار من الحنفية والمالكية والشافعية والحنابلة''(الموسوعة الفقهيه ۱۶/۲۹۵)

''وقال بعض الفقهاء إن أكثر مدة يحبس فيها المتهم المجهول الحال يوم واحد وأجاز آخرون بلوغها شهرًا'' (حاشیہ ابن عابدین ۴/۸۸)۔

۹- الزام اور تہمت کی بنیاد پر قید کرنا چونکہ ایک فعل مشروع ہے اس لئے عدالت سے پروانہ براءت ملنے کے بعد مالی ہرجانہ طلب کیا جانا درست نہیں ہے۔

''مثل ما وقع لابن أبي الحقيق حين أخفى كنزا يوم خيبر وادعى ذهابه بالنفقة، فحبسه النبي صلى الله عليه وسلم ورد عليه بقوله: العهد قريب والمال أكثر'' (الموسوعة الفقهيه)۔

۱۰- قیدی کو وکیل سے رابطہ قائم کرنے اور اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کے حوالہ سے صفائی پیش کرنے کا حق حاصل ہے۔

''حق الدفاع حق أصيل ينشأ منذ اللحظة التي يواجه فيها الشخص بالاتهام، والاتهام بطبيعته يقتضي الدفاع فهو ضرورة منطقية له'' (دراسات في الفقه الجنائي الاسلامي/۱۰۵)۔

۱۱- خواتین قیدیوں کو اپنے ساتھ شیرخوار بچوں کو جیل میں اس وقت تک رکھنے کا حق حاصل ہے جب تک وہ بچے دودھ نہ چھوڑ دیں۔

اس سلسلہ میں حضرت غامدیہؓ کے واقعہ سے استدلال کیا جاسکتا ہے کہ اعتراف زنا کے بعد فورًا ان کو رجم کی سزا نہیں دی گئی بلکہ انہیں حکم دیا گیا کہ پہلے وہ بچہ کو جنم دیں اور دو سال تک دودھ پلائیں، چنانچہ بچے نے دودھ چھوڑ کر جب روٹی کھانی شروع کر دی تب انہیں رجم کی سزا دی گئی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایسا نہ کرنے میں بچے کی حرمت جان اور تحفظ نفس کے حق کی خلاف ورزی لازم آتی ہے جس کی قطعًا اجازت نہیں دی جاسکتی۔

قیدیوں کے حقوق - شریعت میں

مولانا سلطان احمد اصلاحی[1]

۱- ہاں ملزم کو جرم کا ثبوت فراہم ہوئے بغیر بھی احتیاطی طور پر قید کیا جا سکتا ہے، اس قید کی مدت مقرر کی جا سکتی ہے، کوشش کی جائے کہ یہ مدت کم سے کم ہو اور ضرورت سے زیادہ اس کو قیدی بنا کر نہ رکھا جائے، بعض یا بسا اوقات حکومت اور انتظام کی مصلحتیں اس کی مقتضی ہوتی ہیں کہ ثبوت فراہم ہونے سے پہلے ملزم کی نقل وحرکت کو موقوف کر دیا جائے، ظاہر ہے اس کی اجازت بہ تقاضائے ضرورت ہی ہو سکتی ہے اور ضرورت کا اصول معلوم ہے کہ اس کو بقدر ضرورت سے زیادہ نہ ہونا چاہئے۔ "والضرورة تقدر بقدرها"۔

۲- اس سوال کے تحت شق اول (الف) مذہبی امور کے تحت مذکور تمام حقوق قیدی کو حاصل ہونے چاہئیں، یہ سب اس کے جائز اور مسلمہ حقوق ہیں جن سے اسے محروم کئے جانے کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں ہے، قید کے دوران دعوت دین کا ثبوت قرآن کی صراحت سے اسنودیوسفی سے فراہم ہوتا ہے۔

ب- کے تحت جسمانی ضروریات میں غذا، پانی، علاج اور ورزش وتفریح کی سہولت اسے مناسب طور پر حاصل ہونی چاہئے، قید کی مدت اگر چار ماہ سے زائد ہوتی ہے تو اسے بیوی سے تعلق قائم کرنے کا موقع بھی ملنا چاہئے، اس سے اندرون قید خانہ جنسی جرائم کو کم کرنے میں بھی مدد ملے گی۔ قیدیوں کو تکلیف دہ تنگ جگہ میں رکھنے کی گنجائش اقبال جرم کی مخصوص ضرورت سے ہی ہو سکتی ہے جس کے وقفہ کو کم سے کم رکھا جانا ضروری ہے۔ آخری محمدی شریعت میں جرم ثابت ہو جانے پر مجرم کو اس کی سزا جلد ملنی چاہئے اور اقبال جرم کے لئے قیدی کو اذیت بقدر ضرورت ہی دی جا سکتی ہے۔ معاصر سیکولر عدالتی نظام میں قید کی سزا کو غیر ضروری طور پر بلکہ نقصان دہ حد تک طویل کر دیا گیا ہے۔ آخری اسلامی شریعت کی ترجیح اس معاملہ میں اس سے مختلف ہے۔

ج- سماجی حقوق میں قیدی کو اخبار پڑھنے، ریڈیو سننے، اسی طرح دوسرے قیدیوں سے ملاقات اور اس کو تعلیم وہنر سیکھنے کی تو اجازت ہو سکتی ہے، البتہ فون سے احباب واقارب سے گفتگو کی اجازت مطلق نہیں دی جا سکتی، اس کی نگرانی ہونی چاہئے، جس سے مجرم فون کی سہولت کا ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے۔

د- اخلاقی امور کے تحت عورتوں کے قید خانے کو لازمی طور پر مردوں سے الگ ہونا چاہئے اور اس کے انتظام وانصرام کو خاتون پولیس عملہ کے سپرد ہونا چاہئے۔ مرد قیدیوں میں بالغوں اور نابالغوں کی بیرکوں کو ایک دوسرے سے الگ ہونا چاہئے اور اس کا کڑا انتظام ہونا چاہئے کہ بالغ قیدیوں کے ذریعہ نابالغ قیدیوں کا کسی طرح کا جسمانی اور جنسی استحصال نہ ہو۔

۳- مجرم/ملزم قیدیوں سے اقبال جرم کے لئے بقدر ضرورت ان کو صرف مارا ہی جا سکتا ہے، اس کے علاوہ جیسا کہ معاصر دنیا میں خاص طور پر امریکہ کی زیر سرپرستی عراق، افغانستان اور گوانتاناموبے کی قیدوں میں ہو رہا ہے، قیدیوں کو بے لباس کرنے، ان کو الکٹرک شاک لگانے اور ان کے اوپر کتے چھوڑنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، وطن عزیز کی قیدوں میں بھی اگر ایسا ہو رہا ہو تو اس پر فوری نظر ثانی ہونی چاہئے، سخت ٹھنڈک میں قیدیوں کو برف کی سلوں پر لٹانے کی بھی اجازت نہیں دی جا سکتی، جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس سے ملزم/مجرم کی جان جانے کا خطرہ ہو سکتا ہے۔

---

[1] علی گڑھ۔

۴- ضرورت کے تقاضہ سے قیدی کو ہتھکڑی پہنائی جاسکتی ہے، اسی طرح اس کو زنجیر اور بیڑی میں بھی جکڑا جاسکتا ہے، لیکن یہ تینوں چیزیں ایسی ہونی چاہئیں کہ ان سے ناگزیر تکلیف سے زائد تکلیف نہ ہو، مزید اس کے وقفہ کو بھی کم سے کم ہونا چاہئے اور ضرورت کے دائرہ سے اس کو آگے نہیں بڑھنا چاہئے۔

۵- ہاں مخصوص صورت میں مجرم کو قید تنہائی کی سزا دی جاسکتی ہے، البتہ اس صورت میں اس کو سوال نمبر ۲ کے تحت ملنے والی سہولتوں اور رعایتوں سے محروم نہ رکھا جائے۔

۶- جیل میں قیدی سے جبری کام لیا جاسکتا ہے، یہ قید با مشقت کا ایک حصہ ہے جس کی گنجائش ہے، اندریں صورت اس کو اجرت کا استحقاق تو نہ ہوگا، البتہ بہتر ہوگا کہ اس کو کام کے معاوضہ سے بالکل محروم نہ رکھا جائے۔

۷- تفصیلات بالا کا لحاظ رکھتے ہوئے ان دونوں طرح کے قیدیوں کے درمیان سلوک میں فرق کیا جاسکتا ہے۔

۸- ملزم کو جرم کی سزا سے زائد مدت کے لئے قید میں رکھا جاسکتا ہے، لیکن اس کو حد درجہ محدود اور مخصوص ہونا چاہئے، عارضی زیر التوا معاملات کا فیصلہ جلد سے جلد ہونا چاہئے اور مجرم کو لٹکا کر رکھنے کے سلسلہ کو کم سے کم ہونا چاہئے۔

۹- نہیں، بری کیا گیا ملزم قید میں ہوئی ذہنی اذیت اور مالی نقصان کا ہرجانہ طلب نہیں کرسکتا، معمول کی صورت میں معاشرہ میں امن وامان بنانے کے لئے اس طرح کی حراست ایک ضرورت ہے، جسے تسلیم نہ کرنے سے اس سے بڑے نقصان کا اندیشہ ہے، سو اس بڑے نقصان کے لئے اس چھوٹے نقصان کو گوارا کیا جائے گا، ہاں ملزم کے حالات کو دیکھتے ہوئے عدالت بربنائے احسان اس کو کچھ معاوضہ پیش کرے تو یقینا استحسان کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

۱۰- قیدی کو عدالت میں اپنا کیس رکھنے کے لئے وکیل رکھنے کا حق حاصل ہوگا۔

۱۱- ہاں ان کو یہ حق حاصل ہے اور جیل کی انتظامیہ کو اس کا انتہائی معقول اور اطمینان بخش انتظام کرنا چاہئے۔

☆☆☆

قیدی کے حقوق

مفتی انور علی اعظمی [1]

۱- جرائم شرعی ممنوعات ہیں۔ اللہ نے ان کے اوپر زجر و توبیخ کی ہے، حد کے ذریعہ بھی اور تعزیر کے ذریعہ بھی، جرائم کبھی صرف تہمت کے درجہ میں ہوتے ہیں اور کبھی ثبوت کی حد تک پہونچ جاتے ہیں۔ اگر جرائم تہمت کی حد تک ہوں تو ایسی صورت میں امیر کو یہ حق حاصل ہے کہ تہمت کی تحقیق کے لئے اور حقیقت حال کی تفتیش کے لئے اس متہم شخص کو قید کر دے۔ البتہ مدت حبس میں اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ کے اصحاب میں عبداللہ زبیری نے استبراء اور کشف کی غرض سے حبس کو ایک مہینہ کے ساتھ محدود کیا ہے، اور دوسرے علماء نے یہ کہا کہ اس مقصد کے لئے کوئی مدت متعین نہیں، امام اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق ایک ماہ سے زیادہ بھی قید میں رکھ سکتا ہے، اور یہی قول زیادہ بہتر ہے:

”والثالث أن للأمير أن يجعل حبس المتهوم للكشف والاستبراء واختلف فى مدة حبسه لذلك فذكر عبدالله الزبيرى من أصحاب الشافعى أن حبسه للاستبراء والكشف مقدر بشهر واحد لا يتجاوزه وقال غيره بل ليس مقدر وهو موقوف على رأى الإمام واجتهاده وهذا أشبه وليس للقضاة أن يجسوا أحدًا إلا بحق وجب“ (الاحكام السلطانيه للماوردی/۲۲۰)۔

۲- (الف) عالمی معیار آزادی مذہب کے حق کو تسلیم کرتا ہے۔ اس لئے تمام اہل مذاہب کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت ہونی چاہئے۔ ہمارے فقہاء نے بھی اس مسئلہ میں صراحت کی ہے کہ کسی قیدی کو وضو، نماز اور اس جیسے کاموں سے نہیں روکا جا سکتا۔ موسوعہ میں مالا یجوز تادیب المحبوس بہ کے تحت:

والمنع من الوضوء الصلاة ونحوها کی صراحت موجود ہے۔ (الموسوعة الفقهیه۲/۱۶ ،۲۲۶)۔

تو جیسے مسلمان قیدی کو اس کی عبادت سے نہیں روکا جا سکتا اسی طرح دوسرے اہل مذاہب کو بھی ان کے مذہب کے مطابق عبادت کرنے کی چھوٹ دی جائے گی۔

ب- ریاست کی ایک بہت ہی اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ تمام قیدیوں کو معقول غذا اور صاف پانی مہیا کرائے تا کہ وہ بھوک اور قلت خوراک سے پیدا ہونے والی بیماریوں کا شکار نہ ہوں۔

موسوعہ میں مالا یجوز تادیب المحبوس به کے تحت جن چیزوں کو شمار کرایا گیا ہے۔ اس میں التجويع والتعريض للبرد ونحوه کو بھی ذکر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن پاک نے صحابہ کرام کی تعریف کی ہے کہ قیدیوں کو کھانا کھلانا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مستحسن عمل ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ويطعمون الطعام على حبه مسكينًا ويتيمًا وأسيرًا" (سورہ دہر......) اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہے، آپ نے اپنے اصحاب سے گرم دن میں کہا: ”أحسنوا إسارهم واسقوهم وقال: لا تجمعوا عليهم حر هذا اليوم وحر السلاح (الموسوعة الفقهیه۱۹۸/۴)۔

قرآن وحدیث کی یہ تعلیمات ہمیں اس بات کی دعوت دیتی ہیں کہ ہم قیدیوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کریں۔ ان کے لئے کھانا اور پانی کا اچھا

[1] دار العلوم مئو۔

بندوبست کریں۔ اسی طرح سے ضرورت کے کپڑے ان کو مہیا کریں اور بحیثیت انسان ہونے کے ان کے ساتھ انسانی کرامت کا معاملہ کریں۔

ج- جہاں تک اخبارات پڑھنے، ریڈیو سننے، فون پر احباب واقارب سے گفتگو کرنے کا سوال ہے، اس کی گنجائش قیدیوں کے لئے ہونی چاہئے تاکہ ان قیدیوں کو معاشرہ میں باوقار زندگی گزارنے کا اہل بنایا جاسکے۔ عالمی قانونی دستاویزوں میں قیدیوں کو یہ حق دیا گیا ہے تاکہ قیدی کا باہری دنیا سے تعلق اور رابطہ باقی رہے بلا وجہ قیدیوں کو ان بنیادی حقوق سے محروم کرنا اچھا نہیں۔

اگر کوئی قیدی قید میں رہ کر تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے یا کوئی ہنر سیکھنا چاہتا ہے تو اس کی بھی گنجائش دینا بالکل مناسب ہے۔ تاکہ وہ قید سے خلاصی کے بعد معاشرہ میں آسانی سے ضم ہوسکے اور ایک اچھے انسان کا کردار پیش کرے۔ اگر قیدی بچوں کے زمرے میں آتا ہے تو اس کے لئے تعلیم کا موقع فراہم کرنا انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔

د- عالمی قانون کے تحت بچوں کو بڑوں سے الگ رکھنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں جو اصول وضوابط بطور خاص کمسن بچوں کے لئے بنائے گئے ہیں ان میں سے یہ بھی ہے کہ زیر حراست بچوں کو بالغ قیدیوں سے الگ رکھنا چاہئے۔ اور حتی الامکان فوری طور پر عدالتی کارروائی کے لئے پیش کیا جانا چاہئے۔ اسی طرح خواتین قیدیوں کو جسمانی وجنسی زیادتیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے انہیں الگ رکھنے کی ضرورت ہے، اور ان کے لئے خواتین ملازمین کا بندوبست کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

۳- قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے ان کو بے لباس کرنا۔ الیکٹرک شاٹ لگانا۔ ان کے اوپر کتے چھوڑنا۔ سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈالنا۔ انہیں مسلسل جگے رہنے پر مجبور کرنا یا ان کی جائے رہائش میں تیز روشنی یا تیز آواز کا انتظام کرنا یہ سب ناجائز ہے۔ اور انسانی حقوق کی پامالی ہے۔ فقہاء نے اس سلسلہ میں صراحت کی ہے:

''لا يجوز تأديب المحبوس به: التمثيل بالجسم، وضرب الوجه ونحوه، والتعذيب بالنار ونحوها، والتجويع والتعريض للبرد ونحوه، والتجريد من الملابس وأمور أخرى تحرم معاقبة بها (موسوعہ فقیہ:۱۶/ ۲۷، ۳۲۶)۔

اس سلسلہ میں حضرت علیؓ کا ایک قول بھی ہمارے لئے بہترین نمونہ ہے، انہوں نے جنگ جمل کے دن کہا:

''لايقتل أسير ولا يكشف ستر ولا يؤخذ مال وهو القدوة في هذا الباب (ہدایہ ۲/۵۸۹)۔

جہاں تک اس مقصد کے لئے قیدی کو مارنے کا تعلق ہے تو ایسی مار نہیں ماری جاسکتی جس سے اس کا مثلہ ہوجائے۔ اسی طرح چہرے پر مارنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ البتہ تعزیراً اتنی پٹائی کی جاسکتی ہے جو حد سے کم ہو اور وہ فقہاء کے یہاں ۳۹ کوڑے ہیں۔

۴- شرعاً قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑنے کی، ہتھکڑی پہنانے کی اجازت ہے، اسی طرح انہیں بیڑی بھی ڈالی جاسکتی ہے جیسا کہ قرآن پاک کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے: "حتی إذا أثخنتموهم فشدوا الوثاق فإما منًّا بعد وإما فداءً" (سورہ محمد: ۴)، لیکن زنجیروں میں جکڑنے یا بیڑی ڈالنے کا یہ عمل سارے قیدیوں کے ساتھ نہیں ہونا چاہئے، خطرناک قیدیوں کو قابو میں رکھنے کے لئے آخری تدبیر کے طور پر ان بندھنوں کا استعمال ہونا چاہئے، جیسے ہی اس انسان کا پرتشدد رویہ ختم ہوجائے ان بندھنوں کو ہٹا دینا چاہئے۔

۵- کیا کسی مجرم کو اس کے خصوصی جرم کے پس منظر میں قید تنہائی دی جاسکتی ہے؟ اگر جرم کسی خاص نوعیت کا ہو اور ارباب حل وعقد اسے قید تنہائی میں رکھنا بہتر سمجھتے ہوں تو اس میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں۔ البتہ اس قیدی کے مذہبی، سماجی اور جسمانی حقوق کا لحاظ کرنا ہوگا۔ جس طرح دوسرے قیدی ان حقوق کے حقدار ہیں یہ قیدی ان کا اس سے زیادہ مستحق ہے۔ تنہائی میں وقت گزارنے کے لئے کتابوں کا مطالعہ، اخبارات ورسائل کی فراہمی اور اس طرح کے دوسرے امور کی رعایت ہونی چاہئے۔

۶- کیا جیل میں قیدیوں سے جبراً کام لیا جاسکتا ہے۔ اگر کام لیا جائے تو کیا قیدی اس کام کی اجرت کے مستحق ہیں؟

اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ قیدی جن کا مقدمہ زیر سماعت ہے اور ابھی ان کا جرم ثابت نہیں ہوا ہے، ایسے قیدیوں کو کام پر مجبور نہیں کرنا چاہئے۔ اور اگر ان سے کام لیا جائے تو انہیں ان کے کام کا معاوضہ بھی ملنا چاہئے۔ اور وہ قیدی جن کے مقدمہ کا فیصلہ ہوچکا ہے اور جرم ثابت ہے

اگر ان سے کام لیا جائے تو کام لینے میں ان پر بہت زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے، اور انہیں بھی عمل کی اجرت ملنی چاہئے۔

طویل المیعاد قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کی ضابطہ بندی کی خاطر (عمر قید کے تعلق سے اقوام متحدہ کی سفارشات) ایک بنیادی عالمی دستاویز ہے۔ ان سفارشات کے موافق ریاست کی ذمہ داری ہے کہ مکالمہ، مذہبی وثقافتی امور کی بجا آوری، کھیل کود اور خالی اوقات کے دوسرے مشاغل کے مواقع ان تمام قیدیوں کو فراہم کرے جو عمر قید کی سزا پا چکے ہیں۔ اسی طرح طویل المیعاد قیدیوں کے متعلق یورپین کونسل کی رپورٹ سفارش کرتی ہے کہ نفع بخش کاموں کے مواقع دیئے جائیں۔

۷- جن قیدیوں کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے اور جن کے بارے میں سزائے قید کا فیصلہ ہو چکا ہے قید خانوں کے سلوک کے اعتبار سے ان دونوں میں فرق ہونا چاہئے، اس سلسلہ میں سب سے اہم اصول یہ ہے کہ زیر مقدمہ قیدیوں کو دوران سماعت بے قصور تصور کیا جائے۔ اس لئے کہ بہت سے قیدی معاملہ میں چھان بین کے بعد وہ معصوم قرار پاتے ہیں۔ لہذا زیر سماعت قیدیوں کو ایسی قیام گاہوں پر نہیں رکھا جانا چاہئے جہاں ایسے مجرموں کو رکھا جاتا ہے، جن کی سزا کا حکم صادر کیا جا چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ زیر سماعت قیدیوں کے لئے کام کرنا لازمی نہیں ہونا چاہئے، البتہ اپنی خوشی سے کام کرنا چاہیں تو انہیں موقع ملنا چاہئے۔

۸- کیا زیر سماعت قیدیوں کو اتنے دنوں تک فیصلے سے پہلے قید میں رکھا جا سکتا ہے جو ان کے اوپر اصل فرد جرم کی سزا ہے؟

اس سلسلہ میں ابوالحسن ماوردی تحریر فرماتے ہیں: ''والثالث أن للأمير أن يجعل حبس المتهوم للكشف والاستبراء واختلف فى مدة حبسه لذلك. فذكر عبد الله الزبيرى من أصحاب الشافعى أن حبسه للاستبراء والكشف مقدر بشهر واحد لا يتجاوزه وقال غيره: بل ليس بمقدر وهو موقوف على رأى الامام واجتهاده وهذا أشبه وليس للقضاة أن يحبسوا أحدًا إلا بحق وجب''۔

علامہ ماوردی کی اس عبارت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تحقیق وتفتیش کے لئے متہم شخص کو جیل میں رکھا جا سکتا ہے، لیکن یہ مدت عبداللہ زبیری کی تحقیق کے مطابق ایک مہینہ سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے۔ دوسرے فقہاء نے اگرچہ اس مدت کو امام کی رائے اور اس کے اجتہاد پر چھوڑ دیا ہے۔ لیکن اتنی بات تو خوب سمجھ میں آتی ہے کہ کشف واستبراء کے لئے قید کئے جانے کی مدت اتنی طویل نہیں ہونی چاہئے جو اس کے اوپر عائد فرد جرم کی اصل سزا سے بھی زائد ہو یا اس کے برابر ہو۔

۹- اگر ملزم کو قید میں رکھا گیا اور بعد کو عدالت نے اسے بری کر دیا تو زمانہ قید میں ہونے والی ذہنی اذیت اور مالی ہرجانہ کا مطالبہ کرنا درست ہے۔ اس لئے کہ آج کل بہت سارے بے قصور اور سیدھے سادے لوگوں کو بے بنیاد مقدمات میں پھنسایا جاتا ہے اور بعض مرتبہ مدعی، سوچی سمجھی سازش کے تحت کسی شریف آدمی کو نقصان پہنچانے کے لئے اس کا کاروبار برباد کرنے کے لئے ایسا کرتا ہے۔ بہت سے ذہین، باصلاحیت نوجوانوں کو جھوٹے مقدمات میں پھنسا کر ان کی تعلیمی ترقی کی بہترین عمر کو ضائع کر دیا جاتا ہے، عمر کا وہ مخصوص حصہ جو ایک نوجوان کے لئے اپنا مستقبل بنانے کا سب سے سنہرا موقع ہوتا ہے وہ اسے قید میں گزارنا پڑتا ہے، بعد میں عدالت اسے ضرور بری قرار دیتی ہے۔ لیکن عدالت اس کا قیمتی وقت اور ذہنی اذیت کا بدل نہیں دے سکتی، اس لئے ایسا شخص اگر ہرجانے کا دعوی کرتا ہے تو اپنے دعوی میں حق بجانب ہے۔ اس کی طرف سے ہتک عزت کا مقدمہ جائز اور درست ہے۔

۱۰- قیدی کو اپنے مقدمات کے سلسلہ میں وکیل سے رابطہ اور صفائی پیش کرنے کے کیا حقوق ہیں؟

اس سلسلہ میں فتاوی عالمگیری میں یہ عبارت مذکور ہے:

''وإن كان الموكل محبوسا فى سجن هذا القاضى الذى وقعت الخصومة عنده لا يقبل منها التوكيل وإن كان محبوسا فى سجن الوالى وهو لا يمكنه الخروج للخصومة يقبل منها التوكيل هكذا فى الظهيرية''۔

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر موکل قاضی کی عدالت میں حاضر نہ ہو سکتا ہو تو اس کو وکیل بنانے کا حق حاصل ہے۔ اور اگر وہ بہ نفس نفیس

قاضی کی عدالت میں حاضر ہوسکتا ہو تو اس کو حق توکیل نہیں ملے گا۔ لیکن آج کل کے عدالتی معاملات انتہائی دقت آمیز ہوتے ہیں، اور ہر شخص کے لئے قانونی باریکیوں کو سمجھنا آسان نہیں ہے اس لئے قیدیوں کو باصلاحیت قانونی نمائندوں کی خدمات کا حق ملنا چاہئے۔ پہلی بار جو لوگ قید خانہ آتے ہیں وہ اپنی حالت اور دوسری بہت سی چیزوں کے تعلق سے اکثر الجھن اور غیر یقینی صورت حال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جو لوگ وکیلوں کے اخراجات برداشت کر سکتے ہیں ان کو وکیلوں تک رسائی ملنی چاہئے اور جو ایسا نہیں کر سکتے ان کے لئے قانونی نمائندگی کا بندوبست کیا جانا چاہئے۔

ہمارے فقہاء کے یہاں اس کی اجازت موجود ہے، چنانچہ آگے عالمگیری میں یہ عبارت بھی مذکور ہے: ''إذا علم القاضی بأن المؤکل عاجز عن البیان فی الخصومة بنفسه یقبل منه التوکیل کذا فی فتاوی قاضی خان'' (عالمگیری ۲/۳۷۶)۔

۱۱- کیا خواتین قیدیوں کو اپنے ساتھ شیر خوار بچوں کو جیل میں رکھنے کا حق ہے؟ اس سلسلہ میں سنن ابی داؤد میں باب فی التفریق بین السبی کے تحت امام ابوداؤد نے یہ حدیث نقل کی ہے: ''عن علی أنه فرق بین جاریة وولدها فنهاه النبی ﷺ من ذلك ورد البیع'' (بذل المجھود ۴/۲۵)

(حضرت علیؓ روایت فرماتے ہیں کہ انہوں نے ایک باندی اور اس کے لڑکے کے درمیان بیع میں تفریق کر دی تھی تو حضور ﷺ نے اس تفریق کو منع کیا اور بیع کو لوٹانے کا حکم دیا)۔

اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ عورت اور اس کے بچے کے درمیان تفریق درست نہیں ہے، لہٰذا قیدی خواتین کے ساتھ ان کے شیر خوار بچوں کو رہنے کی اجازت دینی چاہئے یا ایسی خواتین کی سزا مؤخر کر دینی چاہئے۔

چنانچہ عالمی قوانین کی روشنی میں بہت سے ملکوں میں یہ اجازت ہے کہ مائیں قید خانہ میں اپنے چھوٹے بچوں کو ساتھ رکھیں، بعض جگہوں پر اٹھارہ مہینے تک ساتھ رکھنے کی گنجائش ہے، اور بعض ملکوں میں چار سال کی عمر تک بچہ اپنی ماں کے ساتھ رہ سکتا ہے۔

☆☆☆

مشروعیت حبس

مفتی محمد جعفر ملی رحمانی

معاشرہ میں بعض لوگ اپنے جرائم وبدکاری کی پاداش میں عقوبت کے مستحق ہوتے ہیں اور قید کرنا عقوبت کی صلاحیت رکھتا ہے، اس لیے جرائم پیشہ افراد کو قید کرنے کی مشروعیت کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور اجماع سے ثابت ہے اور عقل بھی اس کی متقاضی ہے۔

اور اس کے دلائل یہ ہیں:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أو ینفوا من الأرض (سورہ مائدہ: ۳۳)۔

قرطبی اس کے ذیل میں لکھتے ہیں: وقال مالك أيضًا والكوفيون: نفيهم سجنهم فينفى من سعة الدنيا إلى ضيقها فصار كأنه إذا سجن فقد نفى من الأرض إلا من موضع استقرار'' (الجامع لأحکام القرآن ۶/ ۱۵۲)۔

حدیث میں ہے: ''إن النبي صلى الله عليه وسلم حبس رجلا في تهمة ثم خلّى عنه'' (ترمذی/ص ۲۶۱)۔

قیدیوں کے حقوق کی بابت رہنما اصول

قرآن کریم اور احادیث نے قیدیوں کے حقوق سے تمام جزئیات کو تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا، مگر ایسی کلیات اور ضوابط کی وضاحت فرمادی جن کی روشنی میں فقہاء وعلماء امت ان کے حقوق کی تعیین کر سکتے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱- قیدیوں کے ساتھ حسن معاملہ

ارشاد خداوندی ہے: يأيها النبي قل لمن في أيديكم من الأسرى إن يعلم الله في قلوبكم خيرا يؤتكم خيرا مما أخذ منكم فيغفر لكم والله غفور رحيم'' (سورہ انفال: ۷۰)۔

(اے نبی! ان قیدیوں سے کہہ دیجئے جو آپ کے ہاتھ میں ہیں کہ اگر اللہ کو تمہارے قلب میں نیکی کا علم ہوگا تو جو کچھ تم سے (فدیہ میں) لیا گیا ہے اس سے بہتر تمہیں دے گا اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ بڑا مغفرت والا ہے بڑا رحمت والا ہے)

جب اللہ رب العزت ان قیدیوں کے عفو ومغفرت کا وعدہ فرمارہے ہیں، تو انسانوں پر لازم ہے کہ وہ قیدیوں کے ساتھ انتہائی درجہ کی رحمت وانسانیت کے ساتھ پیش آئے۔

۲- قیدیوں کو کھانا کھلانا، انہیں بھوکا نہ رکھنا، قیدیوں کا کھانا عام لوگوں کے کھانے سے جودت (quality) اور کمیت (countity) میں کم نہ ہو، بلکہ اس سے افضل ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ويطعمون الطعام على حبه مسكينًا ويتيمًا وأسيرًا (سورۂ انسان: ۸)۔

(اور کھانا کھلاتے رہتے ہیں مسکینوں اور یتیموں کو اور غریبوں کو اللہ کی محبت سے)۔

بقول محققین یہ آیت مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کی تمام صورتوں کو شامل ہے، جس کی ایک اہم فرد کھانا کھلانا ہے۔

(دیکھئے: التفسیر الکبیر للرازی ۱۰/ ۷۴۷، روح المعانی، تفسیر ماجدی)۔

المعجم الکبیر للطبرانی میں ہے: عن أبي عزيز بن عمير أخي مصعب بن عمير قال: كنت في الأسارى يوم بدر فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ''استوصوا بالأسارى خيرا'' وكنت في نفر من الأنصار وكانوا إذا قدموا غدائهم وعشائهم أكلوا التمر وأطعموني الخبز بوصية رسول الله صلى الله عليه وسلم إياهم (۲۲/۳۹۳، رقم: ۴۰۰)۔

(حضرت ابوعزیز سے مروی ہے فرماتے ہیں: کہ میں بدری قیدیوں میں شریک تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیدیوں کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرو''، اور میں انصار کی ایک جماعت میں تھا، جب وہ دوپہر اور شام میں کھانا کھاتے تو خود کھجوریں کھاتے اور مجھ کو روٹی کھلاتے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہمارے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنے کی تاکید فرمائی تھی)۔

۳- قیدیوں کے ساتھ اہانت واذلال کا معاملہ نہ ہو۔

۴- قیدیوں کو ایسے کپڑے مہیا کرنا جو موسم کے مناسب ہو۔

۵- قیدیوں کو زمان قید میں اپنے دین ومذہب کے شعائر پر عمل پیرا ہونے کی اجازت ہو۔

قیدیوں کے حقوق

۱- جس شخص کو ثبوت جرم کے فراہم ہوئے بغیر قید کیا جائے اسے متہم کہتے ہیں، اور متہم دو حال سے خالی نہیں ہوتا، یا تو وہ معروف الحال ہوگا یا مجہول الحال۔ پھر معروف الحال دو سے خالی نہیں، یا تو معروف بالبر والصلاح والتقوی ہوگا (جس کا صلاح وتقوی اور نیکی معلوم ہو) یا معروف بالفسق والفجور ہوگا (جس کا فسق وفجور معلوم ہو)۔

صورت اولی کا حکم: جس شخص کا صلاح وتقوی معلوم ہو ایسے شخص کو محض تہمت کی بنا پر گرفتار کرنا جائز نہیں (دیکھئے: کتاب الخراج لابی یوسف/ ۳۴۴، الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۲۹۴)۔ اور جس شخص کا فسق وفجور معلوم ہو اسے گرفتار کرنا جائز ہی نہیں بلکہ اولی ہے (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۲۹۳)۔

صورت ثانیہ کا حکم: جس شخص کا صلاح وتقوی اور فسق وفجور معلوم ومشہور نہ ہو اسے انکشاف حال تک قید میں رکھنا درست ہے (حوالہ سابق)۔

البتہ متہم شخص کو کتنی مدت قید میں رکھا جاسکتا ہے تو اس سلسلے میں اقل مدت کی تو کوئی حد نہیں، مگر اکثر مدت کے بارے میں فقہاء کرام کے مختلف اقوال ہیں: علامہ ابن تیمیہؒ امام مالکؒ، امام احمدؒ اور ان کے اصحاب اور احناف کی طرف منسوب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: متہم مجہول الحال کی اکثر مدت حبس حاکم کے اجتہاد پر مبنی ہے، یعنی متہم شخص کو اس وقت تک قید میں رکھا جائے گا جب تک کہ اس کے حالات ظاہر نہ ہو جائیں (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۲۹۴-۲۹۵)۔

اور بعض فقہاء کرام کے نزدیک اکثر مدت حبس ایک دن، بعض کے نزدیک دو یا تین دن ہیں، اور بعض حضرات نے ایک مہینے کی بھی اجازت دی ہے (حوالہ سابق)۔

رہا متہم معروف بالفجور والفساد تو اس کی اتنی مدت تک قید میں رکھا جاسکتا ہے کہ اس کی حالت ظاہر ہو جائے، اور تحقیق طلب امور مکمل ہو جائیں، خواہ قید کی حالت ہی میں اس کی موت واقع ہو، یہی مذہب فقہائے احناف، مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کا بھی ہے (حوالہ سابق)۔

جسمانی ضروریات

(ب) قیدی کے لئے مناسب غذا، صاف پانی، موسم کے مناسب، علاج معالجہ، بیوی سے ازدواجی تعلق جب کہ اسے اس کی حاجت ہو اور قید خانہ میں اس کے لئے مناسب جگہ کا انتظام ہو، اسی طرح حفظان صحت کے لئے ورزش وتفریح قیدی کے بنیادی حقوق میں داخل ہیں۔

(دیکھئے: التفسیر الکبیر للرازی ۱۰/ ۷۴۷، الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۳۲۰-۳۲۳، رد المحتار ۵/ ۲۵۸)۔

عام سماجی حقوق

(ج) اخبارات پڑھنا، ریڈیو سننا، فون پر احباب واقارب سے گفتگو کرنا، دوسرے قیدیوں سے ملاقات کرنا، تعلیم وہنر سیکھنے اور ان جیسے دیگر امور، قیدیوں کی اصلاح وفلاح اور معاشرہ میں شریفانہ زندگی گزارنے کا اہل بنانے کے وسیع مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے عالمی معیار نے یہ طے کر دیا ہے کہ پوری دنیا سے اس کے ربط کو ختم نہیں کرنا چاہئے، اس لئے قیدیوں کو یہ عام سماجی حقوق حاصل ہوں گے، اور انہیں ان حقوق کا حاصل ہونا، قیدیوں کے سلسلے میں نظریۂ شرع اسلامی کے خلاف بھی نہیں ہیں، کیوں کہ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''استوصوا بهم خيرا'' جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ قیدی ہر طرح کے خیر کے مستحق ہیں (دیکھئے: المعجم الكبير للطبراني ۲۲/۳۹۳، رقم: ۹۷۷، نهاية ۲/۲۱۱، بدائع الصنائع ۶/۱۸۱)۔

اخلاقی امور

د- مردوں اور عورتوں کے لئے، اسی طرح بالغوں اور نابالغوں کے لئے الگ الگ قید خانے ہونا نہ صرف قیدیوں کے حقوق میں داخل ہیں بلکہ ریاست پر اس کا انتظام لازم وضروری ہے، کیوں کہ ان سب کو ایک جگہ رکھنا مفاسد اور خرابیوں کا سبب ہے۔

(دیکھئے: المقاصد الشرعية للخادمی/۴۶، المحیط البرہانی ۱۰/۹۴، البحر الرائق ۶/۷۶۴، الموسوعة الفقهية ۱۶/۳۱۸)۔

۳- (الف/ب/ج/د/ھ/و) قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈال دینا، ان کو بے لباس کردینا، انہیں مسلسل جگے رہنے پر مجبور کرنا، الکٹرک شاٹ لگانا، ان پر کتے چھوڑنا، یہ سب افعال غیر انسانی، غیر اخلاقی اور ظلم وزیادتی پر مبنی ہونے کی وجہ سے غیر شرعی اور حرام ہیں۔

(دیکھئے: التفسیر المنیر ۷/۵۳۱، البحر المحیط ۵/۶۷۳، الموسوعة الفقهية ۱۶/۳۲۷، البحر الرائق ۶/۷۶۴، رد المحتار ۸/۵۴)۔

اگر قیدی اس طرح کی سزاؤں کے نتیجے میں اقبال جرم کریں تو شرعاً وہ معتبر نہیں ہوگا، اور نہ اسے بنیاد بنا کر سزاؤں کا فیصلہ کرنا صحیح ہوگا۔

(کتاب الخراج لأبی یوسف/ ۳۴۳، شرح السیر الکبیر ۵/۲۳۱، موسوعة القواعد الفقهية ۱/۷، ۴۲۷/۹، ۴۳۹)۔

۴- عام حالات میں قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑنا، ہتھکڑی پہنانا اور بیڑی ڈالنا جائز نہیں ہوگا (دیکھئے: البحر الرائق ۶/۷۶، المبسوط ۲۰/۹۸، مجمع الانہر ۳/۲۲۴، رد المحتار ۸/۵۴، الہندیہ ۳/۴۱۴)۔ لیکن جب اس کے فرار ہونے کا اندیشہ ہو تو شرعاً اس کی اجازت ہوگی (دیکھئے: التفسیرات الاحمدیہ/ص ۴۴۳، المصنف لعبد الرزاق ۵/۳۵۳، رقم: ۹۷۲۹)۔

۵- کسی مجرم کو اس کے خصوصی جرم کے پس منظر میں اس طرح قید کرنا کہ پوری دنیا سے اس کے ربط وتعلق کے مواقع ختم ہوں شرعاً جائز ہونا چاہئے

(دیکھئے: القرطبی ۶/۱۵۳، البحر الرائق ۶/۷۶۴، رد المحتار ۸/۵۴)۔

۶- جیل میں قیدیوں سے جبراً کام لینا شرعاً جائز نہیں ہے (دیکھئے: المبسوط ۲۰/۹۸، رد المحتار ۸/۵۴، النہر الفائق ۳/۶۱۲)، اور اگر لیا گیا تو وہ اس کام کی اجرت کے مستحق نہیں ہوں گے، کیوں کہ اگر انہیں مستحق اجرت قرار دیا جائے تو اس صورت میں جبراً عقد اجارہ کی صحت کا قائل ہونا لازم آتا ہے، جب کہ عقد اجارہ کی صحت کے لئے طرفین کی رضامندی شرط ہے، اور یہاں یہ شرط مفقود ہے (دیکھئے: الموسوعة الفقهية ۱۶/۲۵۸-۲۶۴)، تو جو کام قیدیوں سے جبراً لئے گئے اسے استہلاک منافع کہا جائے گا، اور استہلاک منافع مضمون بالقیمت نہیں ہوتے (دیکھئے: نور الانوار/۴۷، کشف الاسرار ۱/۸۶، موسوعة القواعد الفقهية ۹/۲۷۱)، اس لئے اس صورت میں قیدی اجرت کے مستحق نہیں ہوں گے۔

۷- جن قیدیوں کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے اور جن کے بارے میں سزائے قید کا فیصلہ ہو چکا ہے، قید خانوں میں باعتبار سلوک کے ان دونوں میں فرق کیا جانا جائز ہی نہیں بلکہ لازم ہے۔ کیوں کہ ثبوت جرم کے فراہم ہوئے بغیر اس کے ساتھ وہ سلوک روا رکھنا جو ان مجرموں کے ساتھ کیا جاتا ہے جن کی سزا حکم صادر ہو چکا، سراسر ظلم وزیادتی اور ناانصافی ہے جو شرعاً ناجائز وحرام ہے۔

وقال تعالیٰ: "إعدلوا هو أقرب للتقوى" (سورہ مائدہ: ۸)۔

مافی الحدیث: ''عن عبد الله بن عمر رضی الله عنهما عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: ''الظلم ظلمات یوم

القیامة" (صحیح البخاری/۲۳۰، رقم الحدیث: ۲۴۴۷، کتاب المظالم، سنن الترمذی ۲/۲۲)۔

"ما فی کتاب الخراج لابی یوسف: ولا یقام علیه حد إلا ببینة عادلة أو بإقرار من غیر تهدد من الوالی له أو وعید" (ص/۲۴۴ التحذیر من الأخذ بالتہمة)۔

۸- جزء نمبر ایک میں ہم نے متہم کی جو قسم کی ہے اس اعتبار سے صرف متہم معروف بالفسق والفجور اور متہم مجہول الحال ہی کو ظہور حال اور تحقیق طلب امور کی تکمیل تک قید خانہ میں رکھ سکتے ہیں، خواہ یہ زمانہ قید اس مدت سے زائد ہو، جو ان کے اوپر فرد جرم کی اصل سزا ہے (دیکھئے: سنن ترمذی ۱/۲۶۱، موسوعہ فقہیہ ۱۶/۲۹۲، ۲۹۳)۔

۹- اولاً ملزم کی دو قسمیں ہیں: معروف الحال اور مجہول الحال، پھر معروف الحال کی دو قسمیں ہیں: معروف بالصلاح والتقوی اور معروف بالفسق والفجور۔ اگر قیدی معروف بالصلاح والتقوی ہے تو اسے محض تہمت کی وجہ سے قید خانہ میں رکھ کر ذہنی اذیت دینا یہ اعتداء اور ظلم ہے، اور ظلم وزیادتی کی صورت میں ہرجانہ طلب کرنا اس وقت درست ہوتا ہے جب کہ اعتداء اور ظلم کا تعلق عین سے ہو، جب کہ ذہنی اذیت کا تعلق عین سے نہیں، اس لئے مالی ہرجانہ طلب کرنا صحیح نہیں ہونا چاہئے (دیکھئے: التفسیر المنیر ۱/۵۴۲، الموسوعة الفقہیہ ۱۶/۲۹۲، رد المحتار ۹/۲۴۷، درر الحکام ۱/۶۸۶، کشف الاسرار ۱/۸۶)۔

۱۰- زیر سماعت قیدیوں کو قانونی صلاح ومشورہ کا حق حاصل ہے، جو قیدی وکیلوں کے اخراجات برداشت کر سکتے ہیں انہیں اپنے وکیلوں تک رسائی ملنی چاہئے، اور جو ایسا نہیں کر سکتے ان کے لئے قانونی نمائندگی کا بندوبست ریاست پر لازم ہونا چاہیے، کیوں کہ جو قیدی ثبوت جرم فراہم ہوئے بغیر قید خانہ میں رکھے گئے ہیں وہ مظلوم ہیں (الموسوعة الفقہیہ ۱۶/۲۹۲)، اور دفع ظلم ہر ایک کا اپنا حق ہے (التفسیر المنیر ۳/۳۵۲)۔ اگر وہ قانونی چارہ جوئی کے ذریعہ اپنے اس حق کو حاصل کرنا چاہے تو انہیں اس کا حق حاصل ہوگا، اور جو اس حق کو حاصل کرنے سے عاجز ہیں انہیں ان کا حق دلانا ریاست کا فرض ہے (دیکھئے: بخاری ۲/۱۰۲۸، رقم: ۶۹۵۲، مسلم، رقم: ۲۵۸۴، ترمذی، رقم: ۲۲۵۵، رد المحتار ۸/۵۲)۔

۱۱- خواتین قیدیوں کو اپنے شیر خوار بچوں کو جیل میں رکھنے کا حق حاصل ہے، کیوں کہ ماں اور ولد کو جدا کرنے سے ولد کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہے۔

نیز شریعت نے ماں اور ولد کو جدا کرنے سے منع فرمایا ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"من فرق بین والدة وولدها فرق الله بینه وبین أحبته یوم القیامة" (ترمذی ۱/۲۴۱)۔

"نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم أن یفرق بین الأم وولدها فقیل: یا رسول الله إلی متی؟ قال: حتی یبلغ الغلام وتحیض الجاریة" (المستدرك للحاکم ۲/۵۵، دار قطنی ۳/۵۷، نصب الرایه للزیلعی ۴/۵۳)۔

لہذا حکومت کو زمانہ حبس میں شیر خوار بچے کو اپنی ماں سے جدا کرنے کا حق حاصل نہیں ہونا چاہئے (درر الحکام ۱/۵۷، النظریات الفقہیہ لمحمد الزحیلی/۲۳۸)۔

قیدیوں کے حقوق، مسائل اور حل

قاضی محمد ہارون مینگل [۱]

۱- ثبوت جرم کے بغیر کسی ملزم کو قید کرنا

دوران تفتیش متہم کی تعذیب کی گنجائش ہے، پھر یہ تعذیب ضرب اور مارنے کی صورت میں ہو یا حبس اور قید کی شکل میں ہو۔

علامہ ابن قیم جوزی رحمۃ اللہ علیہ ''الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ'' میں لکھتے ہیں:

''ویسوغ ضرب هذا النوع من المتهمين، كما أمر النبي ﷺ الزبير بتعذيب المتهم الذى غيب ماله حتى أقر به، فى قصة ابن الحقيق،... منهم أشهب بن عبد العزيز قاضى مصر فإنه قال: يمتحن بالحبس والضرب، ويضرب بالسوط مجردًا'' (ص ۱۱۴)۔

جہاں تک اس قسم کی قید کے لئے مدت مقرر کرنے کا سوال ہے سو یہ عدالت کی صوابدید پر موقوف ہے۔ یہ صوابدید انصاف پر مبنی ہو نہ کہ ظلم اور تعدی کی صورت میں ہو۔

''كذلك والى العرب ووالى الحكم يفعل كل منهما ما اقتضته ولايته الشرعية. مع رعاية العدل والتقيد بالشريعة'' (ص ۱۱۵)

۲- مذہبی امور، جسمانی ضروریات اور عام سماجی و اخلاقی امور سے متعلق قیدیوں کے حقوق:

الف- عبادت کرنا، مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرنا، دوسرے قیدیوں کے درمیان دعوت دین کرنا، یہ تمام چیزیں قیدیوں کے حقوق میں سے ہیں، انہیں یہ چیز مہیا کرنا اور انہیں ان امور کے لئے مواقع فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔

(میری اپنی رائے اس بارے میں ذرا مختلف ہے۔ میں قید کو سزا کے طور پر تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام میں سزا کے طور پر قید اور حبس کا ذکر نہیں ہے۔ (اس بارے میں میری ایک علیحدہ تحریر ہے)۔

قید میں دعوت دین قرآن کریم سے ثابت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے قید میں خواب دیکھنے والوں کو تفسیر بتانے سے قبل دین کی دعوت دی تھی۔ اسی طرح قیدیوں کو ان کی مذہبی تعلیمات کے مطابق غذا فراہم کرنا بھی ان کا حق ہے۔ ان کی مذہبی شخصیات اور کتابوں وغیرہ کی بے حرمتی ہرگز جائز نہیں ہے۔

ب- مناسب غذا سے لے کر تفریح تک یہ انسانی حقوق ہیں، یہ قیدیوں کو میسر ہونے چاہئیں، جہاں تک بیوی سے تعلق ہے تو یقینا موجودہ وقت میں اکثر و بیشتر ممالک میں اس کا انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ بڑی بڑی سیاسی شخصیات کے لئے یہ انتظام بھی ہوتا رہتا ہے، حقوق انسانی میں سے یہ چیز بھی ہے۔ سعودی عرب کی حکومت مہینہ یا ہفتہ میں ایک دو دن کے لئے شادی شدہ قیدیوں کی بیویوں کو ان کے ساتھ رہنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ چاہئے کہ ہر مسلمان حکومت اس قسم کا انتظام کرے کیوں کہ بیوی نے کوئی جرم نہیں کیا ہے کہ اسے شوہر سے نہ ملنے کی سزا دی جائے۔ پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل نے اس امر کی سفارش کی ہے۔ لہذا یہ سہولت بھی قیدی کو ملنی چاہئے۔ باقی رہی یہ بات کہ قیدیوں کو تنگ جگہ میں رکھا جاتا ہے تو اولاً جیسا کہ میں نے لکھا کہ شرعاً قید بطور سزا میرے نزدیک درست نہیں ہے پس تنگ جگہ میں رکھنا وغیرہ بطور اولی

[۱] پاکستان

درست نہیں ہیں۔

ج- یہ سہولتیں بھی اس ترقی یافتہ دور میں قیدیوں کو میسر ہونی چاہئیں، ہر وقت نہیں تو کم از کم کچھ اوقات کے لئے ضروری ہیں۔

د- ایسا ہونا ضروری ہے بلکہ یہ بھی ہونا چاہئے کہ عام جرائم کے مرتکب قیدیوں کو عادی اور سنگین جرائم کے مرتکب قیدیوں سے الگ رکھا جائے، تاکہ وہ ان کے برے اثرات سے محفوظ رہیں۔

۳- سچی بات اگلوانے کے لئے قیدیوں کو دھمکانے کی حد

قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کی گنجائش ہے اور یہ ثابت بھی ہے جیسا کہ سوال نمبر ا کے جواب میں بحوالہ کتب ذکر کیا گیا، اور یہ بھی آ گیا کہ تفتیش کے دوران اس طرح کرنا انصاف پر مبنی ہے جبکہ اور شرعی جواز کی شرائط سے تجاوز نہ کیا جاتا ہو۔ ذیلی شقوں کے جوابات مندرجہ ذیل ہیں:

الف- چونکہ شرعاً شرعی ستر کھولنے کی اجازت نہیں ہے، اس لئے جن حصوں کا چھپانا شرعاً لازمی ہے ان کو بے پردہ کرنے کی اجازت تفتیش کی خاطر درست نہیں۔

ب- قیدیوں کو مار پیٹ کرنا۔

ب- قیدیوں کو مار پیٹ کرنے کی اجازت ہے، البتہ اس میں تشریح ہے کہ "یضرب بالسوط مجردًا"۔

ج- اگر الیکٹرک شاٹ لگانے کی تکلیف "ضرب سوط" سے زیادہ نہ ہو تو گنجائش ہے، ورنہ اس کی اجازت شرعاً نہیں دی جا سکتی۔

د- قیدیوں پر کتے چھوڑنے کی قطعاً اجازت نہیں دی جا سکتی۔

ھ- قیدیوں کو سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈالنا چونکہ ناقابل برداشت سزا ہے اس کی اجازت صرف تفتیش کے دوران سچ کو اگلوانے کے لئے درست نہیں ہے۔

و- چونکہ جگے رہنے میں ناقابل برداشت ایذاء کی کوئی شکل بظاہر نظر نہیں آتی ہے، اس لئے اس کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ بشرطیکہ مزید کوئی ناقابل برداشت سزا اس میں شامل نہ ہو۔

۴- قیدیوں کو زنجیر، بیڑی یا ہتھکڑی لگانا

اگر قیدی کوئی عادی مجرم ہو اور خطرناک ہو، سنگین جرائم کا مرتکب ہو، بھاگنے اور فساد کرنے کا اندیشہ ہو، کوئی اور تدبیر کارگر نہ ہو تو اس کے ساتھ ایسا کرنا درست ہے، ورنہ زنجیروں میں جکڑنے اور بیڑی ڈالنے کی گنجائش نہیں اور نہ ہی ایسا کرنا انسانیت کو زیب دیتا ہے۔

۵- قیدی کو قید تنہائی میں رکھنا

اگر جرم کی نوعیت اور مجرم کی حالت کو مدنظر رکھ کر ایسا کرنا عدالت کے نزدیک مناسب ہو تو مجرم کو قید تنہائی میں رکھا جا سکتا ہے۔

۶- قیدیوں سے جبرًا کام لینا

شرعاً قیدیوں سے، جبرًا کام لینے کی گنجائش نہیں۔ اور اگر قیدی کو مشغول رکھنے کے لئے یا اس کی مالی معاونت کے لئے کام لیا جائے گا، تو قیدی اجرت کے مستحق بن جاتے ہیں، اس کی محنت کی اجرت کسی دوسرے شخص کے لئے جائز نہیں۔

۷- جن قیدیوں کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے اور جن کے بارے میں سزائے قید کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ بحیثیت انسان دونوں برابر ہیں۔ چونکہ میں قید کو بطور سزا اسلامی احکامات کے خلاف سمجھتا ہوں، اس لئے میرے نزدیک قید میں رکھنا صرف حقیقت حال معلوم کرنے کی حد تک یا کسی ابہام کو رفع کرنے کی خاطر یا کسی کے حق کو وصول کرنے کے لئے ہے، ایسی صورت میں دونوں قیدیوں میں کوئی فرق نہیں۔ البتہ اگر قید کو سزا تسلیم کر لیا جائے تو ان دونوں اقسام کی قید اور قیدیوں میں یقیناً فرق ہے، اور بڑا فرق ہے، جس قیدی کا مقدمہ ہنوز زیر سماعت ہے وہ قیدی مجرم نہیں،

بلکہ صرف ملزم ہے۔ الزام ابھی ثابت نہیں ہے۔ کسی کو جرم ثابت ہوئے بغیر سزا دینا ہرگز درست نہیں ہے۔ لہذا اس سے برے سلوک کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ بخلاف اس کے جس قیدی کو جرم ثابت ہونے پر سزا سنائی گئی ہے وہ مجرم ہے۔ اور مجرم کو جرم کرنے پر سزا دی جاسکتی ہے اور چونکہ قید کو اس کے حق میں سزا قرار دیا گیا ہے اس لئے وہ اس سزا کو بھگتنے کا مستحق ہے۔ اس کی نوعیت یقیناً اس پہلے والے قیدی سے مختلف ہوگی جس کا تعین عدالت نے کیا ہوگا۔

۸- زیر سماعت قیدیوں کو اتنے دنوں تک فیصلے سے پہلے ہرگز قید میں نہیں رکھا جاسکتا ہے جو ان کے اوپر عائد فرد جرم کی اصل سزا ہے، ورنہ عدالت میں مقدمہ چلانے کی ضرورت کیا ہے۔

۹- اگر ملزم کو قید میں رکھا گیا ہو اور بعد کو عدالت نے اسے بری قرار دیا تو وہ زمانہ قید میں ہونے والی ذہنی اذیت کا مالی ہرجانہ از روئے انصاف طلب کرسکتا ہے، مگر کس سے، اور کس قدر: کیوں کہ فوجداری مقدمات میں مدعی حکومت ہے اور قید میں رکھنے والی عدالت ہے، اور پھر اس اذیت اور ذہنی کوفت کے مالیت ہرجانہ کا تعین کس بنیاد پر کیا جاسکتا ہے، جب کہ شرعاً ذہنی کوفت اور اذیت کے تعین کی گنجائش نہیں ہے۔

۱۰- قیدیوں کو وکیل سے رابطہ کرنے اور صفائی پیش کرنے کے وہ تمام حقوق اور سہولت میسر ہونی چاہئے جو کسی بھی آزاد شخص کو حاصل ہے، اور قانوناً اس وقت بھی حاصل ہے، اگر کوئی حکومت یہ حقوق دینے کے لئے مواقع فراہم نہیں کرتی تو یہ اس کی سرزوری اور قوانین کو پامال کرنے کے مترادف ہے۔

۱۱- خواتین قیدیوں کو اپنے ساتھ شیر خوار بچوں کو رکھنے کا حق حاصل ہے۔

قیدیوں کے حقوق اور احکام

مفتی ظہیر احمد قاسمی[1]

۱- اگر ملزم کے بارے میں ظن غالب ہو کہ اس نے ارتکاب جرم کیا ہے تو ثبوت جرم کے بغیر بھی ملزم کو قید کیا جا سکتا ہے۔

''حیث ذکر عبد الرحمن إبراہیم فی کتابه القضاء ونظامه أن النبی صلی الله علیه وسلم حبس رجلا فی تہمة ثم خلی عنه وفی لفظ البیہقی حبس رجلا فی تہمة ساعة من النہار (القضاء ونظامه / ۵۵۱، بحواله الترمذی /۴۳۵، ابو داؤد ۲/ ۲۸۲)۔

''وفی الشامی: فإن غلب علی ظنه أنه سارق وأن المسروق عنده عاقبه (شامی ۶/۱۴۷) وکذا جاء فی الدر المختار: لأن الحبس للتہمة مشروع'' (۷/۵۷۷، الدر مع شامی، کتاب الکفاله، وکذا فی الفقه الاسلامی وادلته ۷/ ۵۲۹۵)۔

جہاں تک مدت حبس کا تعلق ہے تو اس میں ملزم کے احوال اور اس پر عائد الزامات کی نوعیت کو مدنظر رکھتے ہوئے قاضی طے کرے گا۔

بعض لوگوں نے اس کی مدت ایک ماہ مقرر کی ہے جیسا کہ شامی میں ہے:

فیحبس حتی یکشف مره وقیل شہرا'' (الشامی ۶/۱۴۷)۔

۲- اسلام میں انسان تو انسان حیوانات تک کے حقوق رکھے گئے ہیں۔ان کی رعایت نہ کرنے پر انسان کو عذاب کا مستحق گردانا جاتا ہے۔جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک عورت کو محض اس وجہ سے عذاب دیا گیا کہ اس نے بلی کو بھوکے پیاسے قید کیا یہاں تک کہ وہ مرگئی۔

''عن عبد الله بن عمر أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: عذبت امرأة فی ہرة حبستہا حتی ماتت جوعا فدخلت فیہا النار'' (القضاء ونظامه/۵۵۸)۔

لہٰذا اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ جب کوئی جانور کو بھوکا رکھنے میں جہنم کا مستحق ہو سکتا ہے تو پھر انسانوں کو بھوکا رکھنے میں کتنا سخت عذاب ہوگا۔
(دیکھئے: القضاء ونظامه/ ۵۵۸، وکذا فی الہدایہ ۲/ ۴۴۹)

ا- قیدیوں کو قید کے دوران مذہبی اجازت حاصل ہوگی۔

لا إکراہ فی الدین۔لکم دینکم ولی دین وغیرہ، یہ آیات اس پر دلالت کرتی ہیں جو عام ہیں۔

ب- جسمانی ضروریات کی فراہمی بھی شرعاً قیدیوں کا حق ہے۔اسی طریقہ سے ان کو رہنے کے لئے مناسب جگہ کی فراہمی بھی ضروری ہے (الفقه الاسلامی وادلته ۷/ ۵۳۲۵)۔لیکن بیوی سے ملنے کے سلسلہ میں اختلاف ہے گو کہ راجح اجازت کا ہونا ہے۔

وفی النہر إذا احتاج للجماع دخلت علیه زوجته أو أمته إن کان فیه موضع سترة... وقیل یمنع۔''

ج- عام سماجی حقوق بھی اس کو فراہم کئے جانے چاہئیں، ملزم اور مجرم کی قید میں فرق ملحوظ رکھا جانا چاہئے۔اور ساتھ ہی ملزم اور مجرم کے جرم کے احوال اور جرم کی نوعیت کا بھی لحاظ کیا جانا ضروری ہے۔

اگر مجرم خطرناک ہے یا ملزم کو اس طرح کی رعایت دینا نقصان پہونچا سکتا ہے تو ان میں کمی یا ان سے محروم کرنے کا حق قاضی کی صوابدید پر ہوگا۔

۳- ملزم کے احوال اور اس پر عائد الزامات کے لحاظ سے اس سے سچ اگلوانے کے طریقے قاضی اپنی صوابدید کے مطابق اختیار کر سکتا ہے۔جب کہ اس کے ارتکاب جرم کا ظن غالب ہو (شامی ۶/ ۱۴۷)۔

---

[1] مدرسہ اشاعت العلوم کانپور۔

الف- اگر ملزم کے بارے میں ارتکاب جرم کا یقین یا ظن غالب ہو تو ملزم کو بے لباس کر دینا تو جائز نہیں کیوں کہ ستر واجب ہے البتہ اس کی دھمکی دی جاسکتی ہے، جیسا کہ حاطب بن ابی بلتعہ کے خط کو نکلوانے کے لئے بعض صحابہ نے اس عورت کو بے لباس کر دینے کی دھمکی دی تھی جس عورت کو حاطب بن ابی بلتعہ نے خط دیا تھا۔ جس کا تذکرہ سورۂ ممتحنہ میں ہے، (انظر الفقہ الاسلامی ایضاً ۷ / ۴۵، ۵۳۱۷)۔

ب- اگر ظن غالب ہو تو اس کو مارا پیٹا بھی جاسکتا ہے:

''عن ابن العز الحنفی صح أنه علیه الصلوة والسلام أمر الزبیر بن العوام بتعذیب بعض المجاهدین حین کتم کنز حی بن أخطب ففعل فعدلهم علی المال، قال: وهو الذی یسع الناس وعلیه العمل'' (الدر المختار ۱مع شامی ۶/۱۴۶)۔

شامی میں ہے: قوله فیه جواز ذلك ای جواز ضرب المتهم۔ (شامی ۶/۱۴۹)

ج- اگر اس طرح تکلیف پہنچائی جائے کہ اس سے عضو معطل نہ ہو تو اس کی گنجائش خطرناک ملزم کے حق میں ہوسکتی ہے بشرطیکہ اس کے ارتکاب جرم کا ظن غالب ہو۔ چونکہ متہم کے ضرب کا ثبوت اوپر اول سے ہو چکا ہے اور ضرب کی علت دلالۃ النص کے طور پر ایلام ہے (اصول الشاشی/ ۲۶)۔

البتہ ایسی ایذاء اور ایلام نہ ہو جس سے اس کے جسم کا کوئی عضو تلف ہو جائے ''نهی النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم عن المثلة''۔

وحرم تعزیر بحلق اللحیة وقطع طرف وجرح'' (الفقه الاسلامی وادلته ۵۶۰۰/۷)۔

جب یہ تعزیز احرام ہے جو کہ جرم کے ثابت ہونے کے بعد دی جاتی ہے تو ملزم کے حق میں بدرجہ اولی اس طرح سزا دینا کہ، اس کا کوئی عضو معطل ہو جائے درست نہ ہوگا۔

د- اس کی اجازت نہیں ہوگی چونکہ اس میں اس کے زخمی ہو جانے کا قوی امکان ہے۔ اور یہ حرام ہے جیسا کہ شیخ وہبہ الزحیلی کی عبارت سے واضح ہے۔

''وحرم تعزیر بحلق اللحیة وقطع طرف وجرح'' (الفقه الاسلامی وادلته ۵۶۰۰/۷)۔

لیکن کتوں سے دھمکایا جاسکتا ہے اگر وہ خطرناک ملزم ہو، چونکہ دھمکانے میں ذہنی ایلام ہے جسمانی ایلام نہیں۔ اور ذہنی ایلام دیا جاسکتا ہے اگر ملزم کے بارے میں ظن غالب ہو کہ اس نے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

ہ- اگر عضو کے بیکار ہو جانے یا جان جانے کا خطرہ نہ ہو تو سزا بھی دی جاسکتی ہے بشرطیکہ اس کے ارتکاب جرم کا ظن غالب ہو، کیوں کہ اس میں ایلام جسمانی ہے جو کہ ضرب میں بھی پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر گذرا۔

و- علی وجہ الایلام یہ بھی درست ہوسکتا ہے بشرطیکہ ملزم کے ارتکاب جرم کا ظن غالب ہو۔ سابقہ دلائل کی روشنی میں۔

ایک اشکال کا جواب: سچی بات اگلوانے کے سلسلہ میں ضرب اور دھمکانے کی صورت میں اشکال ہوسکتا ہے کہ یہ تو زبردستی اقرار کرانے کے مترادف ہوگا اور اس صورت میں اس کا اقرار معتبر نہ ہونا چاہئے۔

درمختار میں ہے: ''لا یصح إقراره بطلاق وعتاق مکرها'' (کتاب الاقرار ۴/ ۴۴۸)۔

جواب: ...... ڈرانے دھمکانے اور ضرب وغیرہ کی صورت میں محض اقرار کی بنیاد پر ملزم کو سزا نہیں دی جائے گی جب تک کہ اس کے ساتھ مزید اور قرائن وشواہد موجود نہ ہوں، مثلاً اس نے اقرار جرم کرنے کے ساتھ ساتھ فلاں فلاں کا نام لیا اور انہوں نے اس کی تصدیق کی۔ اسی طرح اس کے اقرار کے مطابق کارروائی کرنے پر مطلوبہ شئی برآمد ہوئی تو اس سے ثابت ہوا کہ واقعی وہ مجرم ہے، نہ کہ محض اس کے اقرار کرنے ہی پر۔

۴- عمومی احوال میں ان کا استعمال ٹھیک نہیں لیکن اگر ملزم یا مجرم کے بھاگ جانے کا قوی اندیشہ ہو تو اس کو زنجیروں میں جکڑا بھی جاسکتا ہے۔ یہی حکم ہتھکڑی اور بیڑی کا ہے۔ درمختار میں ہے: ولا یغل إلا إذا خاف فراره فیقید (الدر المختار مع الشامی ۸/ ۵۸ کتاب القضاء)

''وذکر الشیخ وهبة الزحیلی: أنه لا غل وله تجرید ولا تصفید ولا تمثیل فی الإسلام وإن للسجین الحق علی الدولة فی الغذاء والکساء والماوی الملائم ومنع التعذیب الوحشی وغیر ذلك من أصول الحفظ علی الکرامة

الإنسانية'' (الفقه الاسلامی وأدلته ۷/ ۵۳۱۷)۔

۵- قید تنہائی شرعاً دی جاسکتی ہے: حیث ذکر العلامة الحصكفي في كتابه الدر المختار: وهل يطين الباب؟ الرأى عنه للقاضي۔ ثم ذكر العلامة ابن عابدين تحت قوله المذكور ''قيل يطين عليه الباب ويترك له ثقبة يلقى له الخبز والماء وقيل الرای فيه للقاضي'' (الشامی ۸/۵۸)۔

۶- قاضی کی رائے پر مفوض ہوگا اگر قاضی اس کو مناسب سزا تصور کرتا ہے تو ان سے جبریہ کام بھی لیا جاسکتا ہے۔ اور اس میں چاہے وہ بالکل اجرت نہ دے یا کم دے دونوں طرح درست ہوگا، ویسے بطور سزا کے اجرت مثل سے کم ہی دیا جانا چاہئے، شامی میں ہے:

ولا يكتسب فيه وقد صرح في البحر وغيره بأن الأصح المنع لأن الحبس مشروع ليضجر وفي تمكن من الاكتساب لايضجر فيكون السجن له بمنزلة الحانوت'' (الشامی ۸/ ۵۷ کتاب القضاء)۔

تاہم قاضی کے صوابدید پر موقوف ہوگا، وہ مجرم کے احوال اور جرم کو اور اس کی سزا کی مدت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مناسب فیصلہ کرسکتا ہے۔

۷- دونوں کے مابین فرق کیا جانا لازم ہے۔ ظاہر ہے ایک پر الزام ہے دوسرے پر جرم ثابت ہو چکا ہے تو دونوں کے مابین قید خانوں میں سلوک کے اعتبار سے فرق کیا جانا لازم ہے، جب کہ دونوں کا تعلق ایک ہی جرم سے ہو۔

''لأن الأصل في المتهم البراءة حتى تثبت إدانته'' (الفقه الاسلامی وادلته ۶۳۵۲/۷)۔

۸- آج کل کی عدالتوں میں ایسا ہو رہا ہے مگر ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ تفتیش اور سماعت کی مدت اصل سزا کی مدت سے بہت کم ہونی چاہئے۔ علامہ شامی نے ایک قول تفتیش کے لئے ایک ماہ نقل کیا ہے۔

وإما أن يكون مجهول الحال فيحبس حتى يكشف أمره قيل شهرًا وقيل باجتهاد ولي الأمر'' (۶/ ۱۴۷ کتاب السرقہ)

۹- عمومی احوال میں مالی جرمانہ طلب کرنا درست نہیں، کیوں کہ کسی بھی ذمہ دار سے اگر غلطی ہوجاتی ہے تو اس کا معاوضہ یا اس کو ضامن قرار نہیں دیا جاتا۔

(بدائع الصنائع ۷/ ۳۰۵ تبیین الحقائق ۳/ ۲۱۱ القضاء ونظامه ۵۵۱)۔

البتہ اگر یہ ثابت ہوجائے کہ اس کو بلا وجہ تعصب یا دشمنی نکالنے کے لئے گرفتار کیا گیا تھا یعنی تعدی پائی جائے تو اس صورت میں اس کا تاوان دلایا جانا چاہئے۔ گوکہ حنفیہ کے ہاں مالی جرمانہ اور منفعت کا ضمان عموماً واجب نہیں ہوتا، لیکن ایسے موقع پر جہاں تعدی پائی جائے وہاں پر منافع کو مال تصور کرتے ہوئے اس کا بدلہ دلایا جانا چاہئے۔ احناف کے یہاں بھی منافع مال کی طرح ہیں۔

علامہ کاسانی کہتے ہیں: لأن هذه المنافع أموال أو ألحقت بالأموال'' (بدائع الصنائع ۲/ ۲۲۸)۔

البحر الرائق میں ہے: لو تزوجها على منافع سائر الأعيان في سكنى داره۔ ... ونحو ذلك في منافع الأعيان مدة معلومة صحت التسمية لأن هذه المنافع أموال أو ألحقت بالأموال'' (البحر الرائق ۳/ ۱۵۶)۔

اسی طرح ہدایہ میں ہے:

ثم على قول محمد تجب قيمة الخدمة لأن المسمى مال إلا أنه عجز عن التسليم لمكان المناقضة'' (الهداية ۲/۲۸)

ان عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ عندالاحناف بھی منافع مال ہیں یا حکماً مال کے درجہ میں ہیں، لہذا ان کا تاوان بھی دلایا جاسکتا ہے۔

۱۰- لفظ وکیل ہی سے معنی واضح ہوجاتا ہے کہ وہ تمام کارروائی کرنے کا مجاز ہے جس کا موکل نے اس کو کرنے کا حکم دیا ہے۔ یا جو موکل کارروائی کرسکتا ہے وہ وکیل بھی کرسکتا ہے، لہٰذا جتنے حقوق موکل کے ہیں وہ تمام حقوق وکیل کے ہوں گے اس کے نائب ہونے کی حیثیت سے۔ آپ ﷺ نے بھی اپنا وکیل متعین فرمایا ہے

قال جابر بن عبدالله أردت الخروج إلى خيبر فأتيت النبي ﷺ وقلت: إني أردت الخروج إلى خيبر فقال ﷺ: إذا أتيت وكيلي فخذ منه خمسة عشر وسقًا فإن ابتغى منك آية فضع يدك على ترقوته'' (القضاء ونظامه/ ۳۶۲)

قیدیوں کے حقوق - شرعی تناظر میں

مولانا اشتیاق احمد اعظمی [1]

1- کیا کسی ملزم کو اس کے جرم کا ثبوت فراہم ہوئے بغیر قید کیا جاسکتا ہے اور اگر بطور احتیاط قید کیا جائے تو کیا اس کے لئے کوئی مدت مقرر کی جاسکتی ہے؟

جرائم کبھی صرف تہمت کی حد تک ہوا کرتے ہیں اور کبھی ثبوت کی حد تک پہنچ جاتے ہیں، اگر جرائم صرف تہمت کی حد تک ہوں، ثبوت فراہم ہوسکے تو امیر کو یہ حق حاصل ہے کہ تہمت کی تحقیق اور حقیقت حال کی تفتیش کے لئے متہم شخص کو حبس میں رکھ دے۔ البتہ اس صورت میں حبس کی مدت کیا ہو؟ اس میں اختلاف ہے، امام شافعی کے اصحاب میں عبداللہ زبیری کی رائے ہے کہ کشف حال اور استبراء کی غرض سے ایک ماہ تک متہم کو حبس میں رکھا جاسکتا ہے، جبکہ دیگر علماء نے اس صورت میں قید کی مدت متعین نہیں کی ہے، امام وقت اپنے اجتہاد سے ایک ماہ سے زیادہ بھی قید میں رکھ سکتا ہے اور یہی قول زیادہ بہتر ہے۔

علامہ ماوردی رقم طراز ہیں: والثالث أن للأمير أن يعجل حبس المتهوم للكشف والاستبراء واختلف في مدة حبسه لذلك فذكر عبد الله الزبيري من أصحاب الشافعي أن حبسه لاستبراء والكشف مقدر بشهر واحد لايتجاوز وقال غيره: بل ليس بقدر وهو موقوف على رائ الإمام واجتهاده وهذا أشبه وليس للقضاة أن يحبسوا أحدًا إلا بحق وجب (الأحكام السلطانية: ۲۲۰)۔

الغرض ملزم کو ثبوت جرم کے بغیر قید کیا جاسکتا ہے، اس سلسلہ میں قاضی ابویعلیٰ نے الاحکام السلطانیۃ میں ایک روایت نقل کی ہے جو یہ ہے:

عن بهز بن حكيم عن أبيه عن جده: أن النبي ﷺ حبس في تهمة (بحواله أبو داؤد وترمذی والنسائی)۔

قاضی ابویعلیٰ نے ایک دوسری روایت بھی ذکر کی ہے جس سے تہمت میں قید کرنے کی مدت کا ایک دن اور رات کا ہونا معلوم ہوتا ہے، وہ نقل کرتے ہیں:

عن أبي هريرة أن النبي صلى الله عليه وسلم حبس في تهمة يومًا وليلةً استظهارًا واحتياطًا (ص ۲۲۲ الأحكام السلطانية للقاضي أبي يعلى: ۲۲۲)۔

اس سے معلوم ہوا کہ متہم کی احتیاطاً اور استظہار حال کی لئے ایک دن ورات کی مدت تک قید میں رکھا جاسکتا ہے۔

بعض فقہاء نے مجہول الحال ملزم اور معروف بالفسق والفجور ملزم کے قید کے درمیان فرق کیا ہے، مجہول الحال ملزم کی مدت قید میں اختلاف ہے، کسی کے یہاں ایک دن ہے اور کسی کے یہاں دو اور تین دن، کچھ فقہاء نے ایک ماہ بھی کہا ہے، لیکن ملزم معروف بالفجور ہو تو جب تک اس کے معاملہ کی تحقیق وتفتیش نہ ہوجائے اسے حبس میں رکھا جاسکتا ہے، خواہ یہ مدت حبس موت تک کیوں نہ طویل ہوجائے۔

موسوعہ میں ہے:

---

[1] استاذ دارالعلوم مئوناتھ بھنجن، یوپی۔

وقال بعض الفقهاء: إن أكثر مدة يحبس فيها المتهم المجهول الحال يوم واحد وحددها قوم بيومين وثلاثة و أجاز آخرون بلوغها شهرًا. أما المتهم المعروف بالفجور والفساد فأكثر مدة حبسه ما تقتضيه ظهور حاله والكشف عنه ولو حبس حتى الموت وهذا هو الظاهر من مذاهب فقهاء الأمصار من الحنفية (موسوعة فقهية ص ۱۶/۲۹۵)۔

(الف) مذہبی امور سے متعلق قیدیوں کے حقوق

عالمی معیار آزادی، مذہبی حق کو تسلیم کرتا ہے، اس کی روشنی میں تمام مذاہب کے لوگوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت ملنی چاہئے، موسوعہ فقہیہ کے اندر مالا یجوز تأدیب المحبوس بہ کے زیر عنوان: "والمنع من الوضوء والصلاۃ" کو ذکر کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ مسلمان قیدی کو اس کی عبادت سے نہیں روکا جاسکتا تو اسی طرح دیگر اہل مذاہب کو بھی ان کے مذہب کے مطابق عبادت کرنے، مذہبی کتابوں کا مطالعہ وغیرہ اس کی مذہبی ہدایات کے مطابق اس کے لئے غذا فراہم کرنا اور جس مذہب پر وہ عقیدہ رکھتا ہے، اس مذہب کی مقدس شخصیتوں اور کتابوں وغیرہ کی بے احترامی سے گریز کرنا ضروری ہوگا۔

(ب) جسمانی ضروریات

ریاست کی ایک بہت ہی اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ تمام قیدیوں کو معقول غذا اور صاف پانی مہیا کرائے تاکہ وہ بھوک اور قلت خوراک سے پیدا ہونے والی بیماریوں کا شکار نہ ہوں، موسوعہ فقہیہ میں مالا یجوز تادیب المحبوس کے تحت "التجویع" کو بھی ذکر کیا گیا ہے، یعنی قیدی کو بھوکا رکھنا جائز نہیں ہے اور انسانی مروت کے خلاف کام ہے۔

دوسری جگہ موسوعہ میں قیدیوں کے حقوق سے متعلق ہمیں ان الفاظ میں تذکرہ ملتا ہے:

"مبادی الإسلام تدعو إلى الرفق بالأسرى وتوفير الطعام والشراب والكساء لهم واحترام آدميتهم لقوله تعالى: ويطعمون الطعام على حبه مسكينًا ويتيمًا وأسيرًا. وروي أن النبي صلى الله عليه وسلم قال لأصحابه في يوم صائف: أحسنوا إسارهم وقيلوهم واسقوهم قال: لاتجمعوا عليهم حر هذا اليوم وحر السلاح" (موسوعہ ۴/۱۹۸)

معلوم ہوا کہ اسلام ہمیں قیدیوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنے کی دعوت دیتا ہے، ان کے لئے کھانا پانی اور ضرورت کے لباس فراہم کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور ان کی آدمیت کے احترام کی بھی دعوت دیتا ہے، قرآن صحابۂ کرام کی تعریف کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ وہ خود کھانے کے خواہش مند ہونے کے باوجود، مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلانے والے ہیں، حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں سے حسن سلوک کرنے، ان کو قیلولہ کرنے کا موقعہ دینے اور پانی پینے دینے کے حق کو بیان کیا اور فرمایا کہ ان قیدیوں کے اوپر موسم کی شدت حرارت اور اسلحوں کی گرمی کو اکٹھا مت ہونے دو۔

(ج) عام سماجی حقوق

جہاں تک اخبارات پڑھنے، ریڈیو سننے، فون پر احباب واقارب سے گفتگو اور دوسرے قیدیوں سے ملاقات کا سوال ہے تو قیدیوں کو ان امور کی گنجائش ملنی چاہئے تاکہ یہ قیدی معاشرہ میں باوقار زندگی گزارنے کے اہل بن سکیں، عالمی قانونی دستاویزوں میں قیدیوں کو یہ حق دیا گیا ہے تاکہ قیدی کا باہری دنیا سے تعلق اور رابطہ باقی رہ سکے۔

اگر کوئی قیدی تعلیم حاصل کرنا چاہے یا کوئی ہنر سیکھنا چاہے تو اس کی بھی گنجائش دینی چاہئے تاکہ وہ قید سے نکلنے کے بعد معاشرہ میں آسانی سے ضم ہوسکے اور ایک اچھے انسان کا کردار نباہ سکے، اگر قیدی بچہ ہو تو اس کے لئے تعلیم کا موقع فراہم کرنا انتہائی اہم امر ہے۔

(د) اخلاقی امور

عالمی قانون کے تحت بچوں کو بڑوں سے الگ رکھنا چاہئے، اس سلسلہ میں جو اصول وضوابط بطور خاص کمسن بچوں کے لئے بنائے گئے ہیں، ان میں سے یہ بھی ہے کہ زیر حراست بچوں کو بالغ قیدیوں سے الگ رکھا جانا چاہئے اور حتی الامکان فوری طور پر عدالتی کارروائی کے لئے پیش

کیا جانا چاہئے، اسی طرح خواتین قیدیوں کو جسمانی وجنسی زیادتیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے انہیں الگ رکھنے کی ضرورت ہے اور ان کے لئے خواتین ملازمین کا بندوبست کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

۳- قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے ان کو بے لباس کرنا، مار پیٹ کرنا، الیکٹرک شاٹ لگانا، ان کے اوپر کتے چھوڑنا، سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈال دینا اور انہیں مسلسل جگے رہنے پر مجبور کرنا یا ان کی جائے رہائش میں تیز روشنی یا تیز آواز کا انتظام کرنا، یہ سب امور بالکل ناجائز ہیں اور حقوق انسانی کی پامالی ہے۔ موسوعہ فقہیہ میں مالا یجوز تأدیب المحبوس به کے تحت ان امور کو شمار کرایا ہے: التمثیل بالجسم ۲۔ ضرب الوجه ونحوه۔

۳- التعذیب بالنار ونحوها۔

۴- التجویع والتعریض للبرد ونحوه۔

۵- التجرید من الملابس أخری تحرم المعاقبة بها (۱۶/ ۲۷-۳۲۶)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ جمل کے دن فرمایا تھا:

لا یقتل أسیر ولا یکشف ستر ولا یوخذ مال وهو القدوة فی هذا الباب (ہدایۃ ۵۸۹/۲)۔

جہاں تک اس مقصد کے لئے قیدی کو مارنے پیٹنے کا تعلق ہے تو انہیں ایسی مار مارنا جس سے ان کا مثلہ ہو جائے، ممنوع ہوگی، جیسا کہ چہرہ پر مارنا صحیح نہیں، البتہ تعزیراً اتنی پٹائی ہو سکتی ہے جو حد سے کم ہو اور وہ طرفین کے نزدیک زیادہ سے زیادہ ۳۹ کوڑے ہیں اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ۷۵ کوڑے ہیں، چنانچہ شیخ عبدالقادر لکھتے ہیں: ویری أبو حنیفة ومحمد أن الحد الأعلی فی التعزیر تسعة وثلاثون سوطا بینما یری أبو یوسف أنه خمسة وسبعون سوطا (التشریع الجنائی الاسلامی: ۶۹۰/۲)۔

۴- قیدیوں کو از روئے شرع زنجیروں میں جکڑنا اور ہتھکڑیاں پہنانا جائز ہے، جیسا کہ انہیں بیڑیاں بھی ڈالی جا سکتی ہیں، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

حتی إذا أثخنتموهم فشدوا الوثاق فإما منا بعد وإما فداء (سورہ محمد/۴)

لیکن ظاہر ہے کہ زنجیروں میں جکڑنے یا بیڑی ڈالنے کا یہ عمل تمام قیدیوں کے ساتھ نہیں کیا جانا چاہئے، صرف خطرناک قیدیوں کو قابو میں کرنے کے لئے آخری تدبیر کے طور پر ان بندھنوں کا استعمال ہونا چاہئے۔ موسوعہ میں ہے: وللآسر أن یشد وثاقه إن خاف انفلاته أو لم یأمن شره کما یجوز عصب عینیه أثناء نقله لمنعه من الهرب (موسوعة فقهیة: ۱۹۶/۴)۔

۵- کیا کسی مجرم کو اس کے خصوصی جرم کے پس منظر میں قید تنہائی دی جا سکتی ہے؟

اگر مجرم کے جرم کی نوعیت بالکل انوکھی اور خاص قسم کی ہو اور ارباب حل وعقد اسے قید تنہائی کی سزا دینا طے کرتے ہوں تو شرعاً اس میں کوئی محظور نہیں، البتہ قید تنہائی کی صورت میں اس کے دیگر مذہبی، سماجی اور جسمانی حقوق کی پامالی کسی طرح درست نہ ہوگی، دوسرے قیدیوں کی طرح اسے بھی یہ سارے حقوق ملنے چاہئیں، بلکہ یہ ان حقوق کا دیگر قیدیوں سے زیادہ مستحق ہوگا، تنہائی میں مونس کے طور پر کتابوں، اخبارات وغیرہ کی فراہمی، نیز باہری دنیا سے جڑے رہنے کے لئے ریڈیو وغیرہ کی سہولیات بھی اسے فراہم کی جانی چاہئے۔

۶- کیا جیل میں قیدیوں سے جبراً کام لیا جا سکتا ہے؟ اگر کام لیا جائے تو کیا قیدی اس کام کی اجرت کے مستحق ہیں؟

ایسے قیدی جن کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے اور ابھی ان کا جرم ثابت نہیں، انہیں کام کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اور اگر ان سے کام لیا بھی جائے تو انہیں کام کا معاوضہ ملنا چاہئے اور جن قیدیوں کے مقدموں کا فیصلہ ہو چکا ہے اور جرم ثابت ہے، ان سے کام لینے کی صورت میں ان پر کام کا اتنا بوجھ نہ ڈالا جائے جو ان کی بساط سے باہر ہو اور انہیں بھی کام کی اجرت ملنی چاہئے۔

طویل المیعاد قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کی ضابطۂ بندی کی خاطر (عمر قید کے تعلق سے اقوام متحدہ کی سفارشات) ایک بنیادی عالمی دستاویز ہے، ان سفارشات کے موافق ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرتی تعامل اور اتصال و رابطہ کے مواقع، نیز اجرت کے ساتھ کام کرنے، مطالعہ، مذہبی وثقافتی امور کی بجا آوری، کھیل کود اور خالی اوقات کے دوسرے مشاغل کے مواقع، ان تمام قیدیوں کو فراہم کرے جو عمر قید کی سزا پا چکے ہیں، اسی طرح طویل المیعاد قیدیوں کے متعلق یورپین کونسل کی رپورٹ سفارش کرتی ہے کہ نفع بخش کاموں کے مواقع دیئے جائیں۔

۷۔ جن قیدیوں کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے اور جن کے بارے میں سزائے قید کا فیصلہ ہو چکا ہے، قید خانوں کے سلوک کے اعتبار سے ان دونوں میں فرق کیا جانا چاہئے، اس بارے میں سب سے اہم اصول یہ ہے کہ زیر مقدمہ قیدیوں کو دوران سماعت بے قصور تصور کیا جائے، کیونکہ بہت سے معاملہ میں چھان بین کے بعد وہ معصوم قرار پاتے ہیں، لہٰذا زیر سماعت قیدیوں کو ایسی قیام گاہوں پر نہیں رکھا جانا چاہئے، جہاں ان مجرموں کو رکھا جاتا ہے جن کی سزا کا فیصلہ ہو چکا ہے، دوسرے یہ کہ زیر سماعت قیدیوں کے لئے کام کرنا لازمی نہیں ہونا چاہئے، البتہ اپنی خوشی سے کام کرنا چاہیں تو انہیں اس کا موقع ملنا چاہئے۔

۸۔ کیا زیر سماعت قیدیوں کو اتنے دنوں تک فیصلے سے پہلے قید میں رکھا جا سکتا ہے جو ان کے اوپر اصل فرد جرم کی سزا ہے؟

اس سلسلہ میں علامہ ماوردی کی تحریر سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:

والثالث أن للأمير أن يعجل حبس المتهوم للكشف والاستبراء واختلف في مدة حبسه لذلك. فذكر عبدالله الزبيري من أصحاب الشافعي أن حبسه للاستبراء والكشف مقدر بشهر واحد لا يتجاوزه وقال غيره: بل ليس بقدر وهو موقوف على رأى الإمام واجتهاده وهذا أشبه وليس للقضاة أن يحبسوا أحدًا إلا بحق وجب (الأحكام السلطانية: ۲۲۰)۔

مذکورہ بالا عبارت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تحقیق وتفتیش کے لئے متہم شخص کو جیل میں رکھا جا سکتا ہے، عبداللہ زبیری کی تحقیق کے مطابق یہ مدت ایک مہینہ سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے، جبکہ دیگر فقہاء نے اس مدت کو امام کے اجتہاد اور رائے پر چھوڑ دیا ہے، لیکن اتنی بات تو سیاق وسباق سے مترشح ہو رہی ہے کہ کشف واستبراء کے لئے قید کئے جانے کی مدت اس قدر طویل نہیں ہونا چاہئے جو ان کے اوپر عائد اصل فرد جرم کی سزا سے بھی زائد ہو یا اس کے برابر ہو۔

۹۔ اگر ملزم کو قید میں رکھا گیا اور بعد کو عدالت نے اسے بری قرار دیا تو کیا وہ زمانۂ قید میں ہونے والی ذہنی اذیت اور مالی ہرجانہ طلب کر سکتا ہے؟

اس کا جواب اثبات میں ہے کہ وہ ہرجانہ طلب کر سکتا ہے، کیونکہ فی زمانہ بہت سارے بے قصور اور سیدھے سادے لوگوں کو بے بنیاد مقدمات میں پھنسایا جاتا ہے اور بعض مرتبہ مدعی، سوچی سمجھی سازش کے تحت کسی شریف آدمی کو نقصان پہنچانے کے لئے اس کا کاروبار برباد کرنے کے لئے ایسا کرتا ہے، بہت سے ذہین، باصلاحیت نوجوانوں کو جھوٹے مقدمات میں پھنسا کر ان کی تعلیمی ترقی کی بہترین عمریں ضائع کر دی جاتی ہیں، عمر کا وہ مخصوص حصہ جو ایک نوجوان کے لئے اپنا مستقبل سنوارنے کے واسطہ سنہرا موقع ہوا کرتا ہے، اسے وہ قید میں گزارنے پر مجبور ہوتا ہے، بعد میں عدالت اسے ضرور بری قرار دیتی ہے، لیکن عدالت اس کا قیمتی وقت اور ذہنی اذیت کا بدل نہیں دے سکتی، اس لئے ایسا شخص اگر ہرجانہ کا دعوی کرتا ہے تو وہ اپنے دعوی میں بالکل حق بجانب ہے۔

۱۰۔ قیدی کو اپنے مقدمات کے سلسلہ میں رابطہ اور صفائی پیش کرنے کے کیا حقوق حاصل ہیں؟ اس سلسلہ میں فتاوی عالمگیری میں یہ عبارت ملتی ہے:

وإن كان الموكل محبوسًا في سجن هذا القاضي الذي وقعت الخصومة عنده لا يقبل منها التوكيل وإن كان محبوسًا في سجن الوالي وهو لا يمكنه الخروج للخصومة يقبل منها التوكيل هكذا في الظهيرية.

اس سے معلوم ہوا کہ اگر موکل، قاضی کی عدالت میں حاضر نہ ہو سکتا ہو تو اس کو وکیل بنانے کا حق حاصل ہے اور اگر وہ بہ نفس نفیس قاضی کی عدالت میں حاضر ہو سکتا ہے تو اس کو حق توکیل نہیں ملے گا، لیکن آج کل کے عدالتی معاملات انتہائی دقت آمیز ہوتے ہیں اور ہر شخص کے لئے قانونی باریکیوں کو سمجھنا آسان نہیں ہے، اس لئے قیدیوں کو باصلاحیت قانونی نمائندوں کی خدمات کا حق ملنا چاہئے، پہلی بار جو لوگ قید خانہ جاتے ہیں وہ اپنی

حالت اور دوسری بہت سی چیزوں کے تعلق سے اکثر الجھن اور غیر یقینی صورتحال کا شکار ہو جاتے ہیں، اس لئے جو لوگ وکیلوں کے اخراجات برداشت کر سکتے ہیں، ان کو وکیلوں تک رسائی ملنا چاہئے اور جو ایسا نہیں کر سکتے، ان کے لئے قانونی نمائندگی کا بندوبست کیا جانا چاہئے۔

فقہاء احناف کے یہاں بھی اس کی اجازت موجود ہے، چنانچہ عالمگیری میں یہ تحریر موجود ہے: إذا علم القاضي بأن الموكل عاجز عن البيان في الخصومة بنفسه يقبل منه التوكيل كذا في فتاوىٰ قاضي خان (عالمگیری: ۳/۲۷۶)۔

۱۱- کیا خواتین قیدیوں کو اپنے ساتھ شیر خوار بچوں کو جیل میں رکھنے کا حق حاصل ہے؟

سنن ابی داؤد میں باب فی التفریق بین الصبی کے تحت امام ابوداؤد نے یہ حدیث نقل کی ہے:

عن علي أنه فرق بين جارية وولدها فنهاه النبي صلى الله عليه وسلم ورد البيع (بذل المجهود ۴/۲۵)

حضرت علیؓ روایت فرماتے ہیں کہ انہوں نے ایک باندی اور اس کے لڑکے کے درمیان بیع میں تفریق کر دی تھی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کی اس تفریق سے منع کیا اور بیع کو لوٹانے کا حکم دیا۔

اس روایت کی روشنی میں یہ معلوم ہوا کہ عورت اور اس کے بچہ کے درمیان تفریق درست نہیں، لہٰذا قیدی خواتین کے ساتھ ان کے شیر خوار بچوں کو بھی رہنے کی اجازت دی جانی چاہئے۔

چنانچہ عالمی قوانین کی روشنی میں بہت سے ملکوں میں ماؤں کو قید خانہ میں اپنے نوزائیدہ بچوں کو رکھنے کی اجازت ہے، کچھ قید خانوں کی انتظامیہ اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ ماں اپنے بچے کو نو یا اٹھارہ مہینہ کی عمر تک اپنے ساتھ رکھے، لیکن اگر بچہ کے لئے رہنے کی کوئی جگہ نہ ہو تو چار سال کی عمر تک اپنی ماں کے ساتھ رہ سکتا ہے۔

قیدیوں کے حقوق

مولانا افتخار احمد مفتاحی [1]

۱- جب کسی پر کسی طرح کا ظلم ثابت ہو جائے تبھی قید کرنا چاہئے، فقہاء کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مدعی کا حق ثابت ہو جائے تو قاضی مدعا علیہ کو حق کی ادائیگی کا حکم کرے گا، پس اگر ادائیگی حق سے انکار کرے گا تو قاضی اس کو قید کرے گا اس لئے کہ قید ظلم کا بدلہ ہے۔ (البحر الرائق ۶/۲۷۶)۔

اگر حاکم فتنوں کے سد باب اور تحقیق حال کے لئے اور ثبوت فراہم ہونے سے پہلے احتیاطاً قید کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، فقہاء کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر امام وقت، حاکم وقت کو معلوم ہو جائے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو فتنہ وفساد پھیلانے کے لئے حکمت عملی مرتب کر رہے ہیں تو ان کے فتنہ وفساد میں ملوث ہونے کی تحقیق کے لئے انہیں قید کر سکتا ہے۔

"إن علم الإمام أن البغاة (الخوارج) يشهرون السلاح ويتأهبون للقتال فينبغي له أن يأخذهم ويحبسهم حتى يقلعوا عن ذلك ويحدثوا توبة لأنه لو تركهم لسعوا في الأرض بالفساد" (بدائع الصنائع، کتاب السیر ۶/۱۲۷)۔

لیکن چونکہ تحقیق حال اور ثبوت کی فراہمی کے لئے احتیاطاً قید کر رہا ہے اس لئے حاکم کو چاہئے کہ جتنی جلد ممکن ہو تحقیق حال کر لے، اگر وہ بے قصور پایا جاتا ہے تو قید سے آزاد کر دے، مدت کا تعین حاکم کی صوابدید ہی پر رکھا جائے گا۔

۲- الف- فقہ کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قیدیوں کو تصرفات شرعیہ سے روکا نہیں جائے گا، اس لئے کہ قیدیوں کا حق ہے کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق عبادت کریں، مذہبی کتابوں کا مطالعہ کریں، دوسروں کو دین کی دعوت دیں اور قید کے حکام کو چاہئے کہ ان قیدیوں کے سامنے ان کی مذہبی مقدس شخصیتوں اور کتابوں وغیرہ کی بے احترامی سے احتراز کریں، "ولا يمنع من التصرفات الشرعية" (بدائع الصنائع ۶/۱۸۰)۔

ب- قیدیوں کو غذا، صاف پانی کی فراہمی ضروری ہے، شریعت کی نگاہ میں یہ مستحسن امر ہے جیسا کہ قرآن میں ان لوگوں کا تذکرہ بطور تعریف کے کیا گیا ہے جو اللہ کی محبت کے جوش میں اپنا کھانا باوجود خواہش اور احتیاج کے نہایت شوق اور خلوص سے مسکینوں، یتیموں اور "قیدیوں" کو کھلاتے ہیں (قیدی عام ہے مسلم ہو یا کافر) "ويطعمون الطعام على حبه مسكينًا ويتيمًا وأسيرًا" (سورہ دہر)۔

حدیث میں ہے کہ بدر کے قیدیوں کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جس مسلمان کے پاس کوئی قیدی ہو وہ اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے، چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں صحابہ قیدیوں کو اپنے سے بہتر کھانا کھلاتے تھے حالانکہ وہ قیدی مسلمان نہ تھے۔

قیدیوں کو ضرورت وحاجت کے تحت بیوی سے تعلق کی اجازت ملنی چاہئے۔

"ولا يمنع من الجماع إن احتاج إليه فتدخل امرأته أو جاريته عليه إن كان فيه موضع سترة (بحر الرائق ۶/۲۷۶)۔

حفظان صحت کے لئے علاج، ورزش کا بھی نظم ہونا چاہئے، ایسی تنگ جگہوں میں قیدیوں کو نہ رکھا جائے جہاں کھڑا ہونا، پاؤں پھیلا کر لیٹنا ممکن نہ ہو سکے۔

ج- عام سماجی حقوق، اخبارات پڑھنے، ریڈیو سننے، فون پر احباب واقارب سے گفتگو کرنے، دوسرے قیدیوں سے ملاقات، تعلیم اور ہنر سیکھنے وغیرہ

---

[1] استاذ جامعہ مفتاح العلوم مئو، یوپی۔

کی اجازت ہونی چاہئے۔

''ولا یمنع من دخول أقاربه علیه'' (بدائع الصنائع ۱۸۱/۶)۔

''ولا یمکن أحد أن یدخل علیه للاستئناس إلا أقاربه وجیرانه'' (البحر الرائق)۔

د- مردوں اورعورتوں کے لئے، بالغوں اور نابالغوں کے لئے الگ الگ قید خانے فتنہ کے سد باب کے پیش نظر بنائے جائیں۔

''ویجعل للنساء سجن علاحدة نفیًا لوقوع الفتنة'' (البحر الرائق؛ کتاب القضاء ۴۲۶/۶)۔

۳- الف- قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے تعزیزاً ایسی سزاؤں کے دینے کا اختیار قاضی کو ہوگا جو انسانیت سوز نہ ہوں جیسے قیدیوں کو بے لباس کرنا، تو شرعی نقطہ نظر سے (کشف العورۃ) کی اجازت نہ دی جائے گی، بقیہ بدن سے کپڑے بوقت ضرورت اتارے جاسکتے ہیں جیسا کہ حدود کے بارے میں کہا گیا

''وینزع عنه ثیابه معناه دون الإزار لأن التجرید أبلغ فی إیصال الألم إلیه وهذا الحد مبناه علی الشدة فی الضرب وفی نزع الإزار کشف العورة فلیتوقاه'' (بدایه)۔

ب- قیدیوں کو ایسی معمولی ضرب لگائی جاسکتی ہے جس کا اثر اندر تک نہ پہنچے۔

ج- معمولی الیکٹرک شاٹ لگائی جاسکتی ہے کیونکہ اس سے غالبًا جسم کی مشنریوں پر اثر نہیں پڑتا، لیکن اگر مہلک ہوں تو اس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

د- قیدیوں پر کتے چھوڑنے کی اجازت قطعاً نہیں دینی چاہئے کیونکہ یہ انسانیت سوز سزا ہے۔

۴- قیدیوں کی حفاظت بھی ایک اہم مسئلہ ہے، اس لئے قیدیوں کے فرار ہونے کے خدشہ کے باعث زنجیروں میں جکڑنا، ہتھکڑی پہنانا، یا بیڑی ڈالنا درست ہونا چاہئے، لیکن اگر فرار ہونے کا خدشہ نہیں ہے تو ان قیدیوں کو ان چیزوں سے آزاد رکھا جائے۔

۵- کسی مجرم کو اس کے خصوصی جرم کے پس منظر میں قید تنہائی دی جاسکتی ہے۔

۶- قیدیوں سے جیل میں جبرًا کام نہیں لیا جاسکتا ہے، ''ولا یکتسب فیه''۔ اگر اس سے کام لیا گیا تو قیدی کو اس کی اجرت دینی چاہئے اور کام کے اوقات حد سے متجاوز نہ ہوں اور کام بھی قیدی کی طاقت سے باہر نہ ہو۔

۷- جن قیدیوں کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے اور جن کے بارے میں سزائے قید کا فیصلہ ہو چکا ہے سلوک کے اعتبار سے دونوں میں فرق کیا جاسکتا ہے بلکہ کیا جانا چاہئے۔

۸- شریعت کا نقطہ نظر یہ ہے کہ قاضی کو حکم ہے کہ فیصلہ میں تاخیر نہ کریں جتنی جلد ممکن ہو سکے فیصلہ کریں، اگر بالقصد قاضی فیصلہ میں تاخیر کرتا ہے تو اسے معزول کیا جاسکتا ہے، اس لئے زیر سماعت قیدیوں کو اتنے دنوں تک فیصلے سے پہلے قید میں نہ رکھا جائے جو ان کے اوپر عائد فرد جرم کی اصل سزا ہے۔

۹- اصل تو یہی ہے کہ جیل میں قیدیوں سے کام نہ لیا جائے، لیکن اگر کسی ملزم کو قید میں تحقیق حال کے لئے رکھا گیا اور قیدی حکام نے ان سے کام لیا بعد میں عدالت نے اسے بری کر دیا تو قیدی مالی ہرجانہ وصول کرسکتا ہے۔

۱۰- صلاح ومشورہ کے لئے قیدی کو اپنے اعزہ واقارب، پڑوسی اور گھر کے لوگوں کے ساتھ ساتھ وکیلوں سے ملاقات کے حقوق حاصل ہوں گے، مزید حاکم وقت کے پاس بھی اپنی صفائی کے لئے جاسکتا ہے، وکیلوں پر کسی قسم کی بندش نہیں ہونی چاہئے۔

۱۱- چونکہ ماں کو حق حضانت حاصل ہے اور بچوں کی تربیت بھی اسی کے سپرد ہے اس لئے اگر شیر خوار بچہ ہو تو ماں کو یہ حق ہوگا کہ جب تک وہ بچہ خود خورد ونوش اور دیگر انسانی ضروریات پر قادر نہ ہو جائے وہ اپنے ساتھ قید میں رکھے۔

قیدی کے حقوق

مولانا محمد فاروق قاسمی[1]

قیدی کے حقوق سے متعلق سوالات کے جوابات حسب ذیل ہیں:

۱- حبس وقید کی دو قسمیں ہیں: حبس عقوبت، حبس استظہار واستکشاف، اور یہ دونوں طریقے حبس کے مشروع ہیں، چنانچہ حبس استظہار میں تہمت جرم اور شبہ کی وجہ سے حبس کیا جاتا ہے، تا کہ حالات کا استکشاف کیا جاسکے، پھر اگر جرم ثابت ہو جائے تو اسے حبس عقوبت کے طور پر مدت معینہ تک علی حالہ محبوس چھوڑ دیا جائے، یا کوئی جرم ثابت نہ ہو سکے تو اسے رہا کر دیا جائے، جیسا کہ ابوداؤد، ترمذی، اور نسائی نے بہز بن حکیم کی یہ روایت ذکر کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو تہمت کی وجہ سے مسجد میں محبوس کر دیا (ابوداؤد: ۳۶۳۰، الترمذی: ۱۴۱۷، نسائی)۔

عن بهز بن حكيم عن ابيه عن حده: أن النبي ﷺ حبس رجلا في تهمة ساعة من نهار ثم خلى عنه''۔

علامہ خطابی اس حدیث پاک کی شرح میں فرماتے ہیں:

''في هذا دليل على أن الحبس على ضربين، حبس عقوبة، وحبس استظهار، فالعقوبة لا تكون إلا في واجب وأما ماكان في تهمة فإنما يستنظر بذلك ليستكشف به مما وراءه'' (بذل المجہود ۴/۳۲۰، قدیم)۔

۲- اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ حبس کی دو قسمیں ہیں: حبس عقوبت اور حبس استظہار، تو ظاہری بات ہے کہ حبس استظہار میں جب تک جرم کا ثبوت ہو نہ جائے اس وقت تک اس محبوس کی حیثیت ایک مجرم اور مستحق عقوبت کی نہیں ہے، لہذا اس کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جاسکتا، بلکہ جملہ امور میں سہولیات کا خیال رکھا جائے گا۔

برخلاف حبس اگر عقوبت کے طور پر ہو تو اس کا مقصد قلبی ودماغی پریشانی میں مبتلا کرنا ہے تا کہ ظلم سے امتناع ممکن ہو خواہ ادائیگی حقوق کے ذریعہ ہو یا تائب ہونے کے ذریعہ ہو، تو اس صورت میں اس کے ساتھ قابل استیناس امور کی سہولت فراہم نہیں کی جاسکتی، جیسا کہ فتاوی ہندیہ میں ہے:

''وينبغي أن يحبس في موضع خشن لا يبسط له فراش ولا وطاء ولا أحد يدخل عليه ليستأنس ليضجر قلبه'' (ہندیہ ۲/ ۴۱۹)

لہذا کتابوں کا مطالعہ، اخبارات بینی، ریڈیو سننا، فون پر احباب واقارب سے بات چیت کرنا، دوسری جگہوں پر موجود قیدیوں سے ملنا، تعلیم وہنر سیکھنا، ورزش وتفریح کرنا وغیرہ اعمال کی اجازت نہیں ہوگی، کیوں کہ ان تمام امور میں استیناس موجود ہے، جو حبس عقوبت کی غرض کے منافی ہے۔

البتہ محرمات سے اجتناب چوں کہ ہر حال میں ضروری ہے اس لئے ان کے ارتکاب کی گنجائش نہیں ہوگی، چنانچہ قیدی جس مذہب پر عقیدہ رکھتا ہے اس مذہب کی شخصیتوں اور کتابوں کی بے احترامی جائز نہیں، اسی طرح مذہبی تعلیمات کے مطابق اس کے لئے غذا فراہم کرنا بھی ضروری ہوگا۔

بات رہی بیوی سے تعلق کی، تو تستر وخلوت مہیا ہونے کی صورت میں بیوی سے جماع کی گنجائش ہوگی، لیکن وہاں زیادہ دیر تک ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہوگی:

قال الشامي وفي النهر إذا احتاج للجماع دخلت عليه زوجته أو أمته إن كان فيه موضع سترة، وفيه دليل على أن زوجته لا تحبس معه، (إلى قوله) إذ في حبسها معه غاية الاستئناس له مع كون المقصود من ذلك الضجر الخ'' (شامی ۸/۵۲)

اسی طرح تنگ جگہوں میں قیدیوں کو رکھنا مفوض الی رائی القاضی ہے، اگر قاضی اس سزا کو جرم کے مناسب سمجھے تو یہ سزا دے سکتا ہے:

[1] جامعہ دارالاحسان، بارڈولی، سورت۔

''وفی الشامیة إذا کان متعنتا لا یؤدی المال، قبل یطین علیه الباب ویترك له ثقبة یلقی له الخبز والماء، وقیل الرأی فیه للقاضی... الخ'' (شامی ۸/۵۴)۔

۳- شریعت غراء نے قیدیوں کو حالت قید میں ہوتے ہوئے ڈرادھمکا کر کسی قسم کے اقرار کرنے یا کوئی سچی بات کہلوانے کی اجازت نہیں دی ہے، بلکہ نفس قید میں رہنا ہی باعث ضجر واضطراب ہے جو دھمکی کے لئے کافی ہے، اس دوران اس کے جرم کی تحقیق وتفتیش قاضی وحاکم کی ذمہ داری ہے، اگر جرم کا ثبوت ہوتا ہے تو وہ عقاب کے بعد رہا کا، ورنہ ابتدائی رہا کا حقدار ہے، جیسا کہ درمختار میں موجود ہے:

''وأما المحبوسون فی سجن الوالی فعلی الإمام النظر فی أحوالهم فمن لزمه أدب أدبه وإلا أطلقه. وفی الشامیة عن کتاب الخراج لابی یوسف فمن کان منهم من أهل الدعارة والتلصص والجنایات ولزمه أدب أدبه، ومن لم یکن له قضیة خلّی سبیله'' (الدرالمختار مع الشامی ۸/۴۳)۔

لہذا قیدیوں سے سچی بات لینے کے لئے بےلباس کرنا، زدوکوب کرنا، شاٹ لگانا، کتے چھوڑنا، برف کی سلوں پر رکھنا، سونے کے مانع اسباب کا انتظام کرنا، درست نہیں، بلکہ اکراہ ہے، جو جائز نہیں، وفی الدرالمختار اقرارالمکره باطل (ایضا ۸/۲۵۰)۔ اسی طرح کسی صاحب حق کے لئے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ مدیون کو اپنے حق کی وصولیابی کے لئے کوئی ظاہری اذیت رسانی کرے۔

کما فی الهندیة لیس للطالب أن یقیم فی الشمس أو علی الثلج أو فی موضع یضربه'' (ہندیہ: ۳/۴۱۶)۔

۴- قیدی اگر قید خانہ میں بھاگنے یا فرار اختیار کرنے کے ذریعہ تعنت نہیں کرتا اور نہ اس طرح کی حرکت کا جیلر کو اندیشہ ہو تو اس کو زنجیر میں جکڑنا، ہتھکڑی پہنانا، یا بیڑی ڈالنا درست نہیں، البتہ اگر قید خانہ سے فرار اختیار کرنے کا اندیشہ ہو تو اس کو مقید کیا جاسکتا ہے، اسی طرح اگر قیدی سفاک وخونریز ہونے کی وجہ سے گرفتار ہو تو بیڑی ڈالی جاسکتی ہے، جیسا کہ صاحب درمختار فرماتے ہیں:

''ولا یغل إلا إذا خاف فراره فیقید'' (۸/۵۴)۔ ''ولا یلبث أحدًا فی قید إلا رجلا مطلوبا بدم'' (۸/۴۳)۔

۵- ایسا قیدی جو عقوبۃً قید وبند کی زندگی گذار رہا ہو، اس کو اس کے جرم کے مطابق قید تنہائی دی جاسکتی ہے، اور یہ قاضی وحاکم کی رائے پر موقوف ہے، لیکن اگر وہ قیدی کسی صاحب حق کے حق کی وجہ سے قید کیا گیا ہو، تو ایسی صورت میں مکان حبس کی تعیین صاحب حق کو ہوگا، قاضی وحاکم کو نہیں ہوگا۔

''لأن القاضی: یعین مکان الحبس عند عدم إرادة صاحب الحق أما لو طلب صاحب الحق مکانا فالعبرة فی ذلك له'' (شامی ۸/۴۳)۔

۶- جیل خانہ میں کسی بھی قیدی سے جبراً کوئی کام نہیں لیا جاسکتا، اور اگر کام لیا جائے اور وہ قیدی عقوبۃً گرفتار ہوا ہو تو اس صورت میں وہ حقدار اجرت نہیں ہوگا، کیوں کہ مقصد حبس، ذہنی وقلبی پریشانیوں میں مبتلا کرنا ہے، اور مستحق اجرت ہونا مقصد حبس کے منافی ہے، کیوں کہ قیدی یہ سمجھے گا کہ وہ کسی کارخانہ یا دکان کا ملازم ہے: ''وفی الدر المختار ولا یوجر. وفی الشامیة لأن الحبس مشروع لیضجر. ومتی تمکن من الاکتساب لایضجر فیکون السجن بمنزلة الحانوت'' (شامی ۸/ ۵۴)، البتہ حضرت امام ابویوسف فرماتے ہیں کہ اگر قیدی کسی دین کی وجہ سے محبوس ہے تو اس سے مزدوری کرائی جائے گی تاکہ اس کے دین کی ادائیگی ہوسکے، کما فی الدر المختار وعن الثانی یؤجره لقضاء دینه'' (ایضا)

۷- جن قیدیوں کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے، حقیقت میں وہ ابھی عقوبت کے حقدار ہی نہیں ہیں، لہذا ان کے ساتھ سزا کے حقدار محبوسوں جیسا برتاؤ نہیں کیا جائے گا، بلکہ دونوں کے حقوق تکمیل ضرورت کے اعتبار سے الگ الگ ہوں گے۔

۸- زیر سماعت قیدیوں کو اس وقت تک قید کرنے کا حق ہے جب تک کہ انکشاف حال نہ ہوجائے، لہذا اگر حالات کے تتبع وتلاش میں اس کے اوپر ''عائد فرد جرم'' کی اصل سزا کی مدت بھی گزر جائے تو اس کی گنجائش ہوگی، کیوں کہ اختلاف قاضی وحاکم سے یہ مدت کبھی دراز بھی ہوسکتی

ہے، اس لئے کہ ایک قاضی کی تفتیش اور سبب حبس دوسرے قاضی کے لئے حجت نہیں، بلکہ ہر نئے قاضی پر واجب ہے کہ وہ خود حالت کی تفتیش کر کے فیصلہ کرے۔

کما فی الشامیة ثم یسأل عن حبسهم ولابد أن یثبت عنده سبب وجوب حبسهم، وثبوته عند الأول لیس محجة یعتمدها الثانی فی حبسهم لأن قوله لم یکن حجة کذا فی الفتح'' (شامی ۸/۴۳).

البتہ تحقیق حالت میں ذمہ دار کی جانب سے اگر کوتاہی ہو، اور خواہ مخواہ کا ٹال مٹول ہو تو خود ذمہ دار ظالم ہوں گے۔

۹- اگر کسی ملزم کو اس کے جرم محقق کی بنیاد پر یا کسی شبہ کی بنیاد پر استکشاف حال کے لئے قید میں رکھا گیا، پھر مدت عقوبت ختم ہوگئی یا اس سے قبل ہی عدالت نے بری کر دیا، تو ایسا قیدی زمانہ قید کے ہرجانہ کا حق دار نہیں ہوگا، کیوں کہ تحقیق جرم کے بعد اگر زمانہ قید کا ہرجانہ دیا جائے تو عقوبت ہی کیا ہوگی؟ یہ تو مزید اس کے جرم پر جری ہونے کا ذریعہ ہوا، جو مقصد حبس وقید کے بالکل منافی ہے۔

اسی طرح جس کو شبہ کی بنیاد پر قید کیا گیا، لیکن کسی جرم کے عدم ثبوت کی وجہ سے رہا کر دیا گیا، اور مزید اس کو قید میں باقی نہیں رکھا تو یہ بھی ہرجانہ کا حقدار نہیں ہوگا، کیوں کہ اس طرح کا حبس مشروع ہے، اور حبس مشروع میں ہرجانہ مقصد شرع کے خلاف ہے، ہاں اگر قیدی کا بری الذمہ ہونا ثابت ہو چکا، پھر بھی محبوس رکھا گیا تو اس کو ہرجانہ دینا ہوگا، تاکہ اس کے ظلم کی تلافی ہو سکے۔

۱۰- اگر قیدی کسی غیر واقعی معاملہ کی وجہ سے محبوس ہے تو اسے اپنے مقدمات کے سلسلے میں وکلاء سے رابطہ قائم کرنا، اور رہائی کے جملہ اسباب حاصل کرنے کی گنجائش ہے، بلکہ حاکم کے اس ظلم سے بچنے کے لئے اگر مادی صرفہ بھی اٹھانا پڑے تو کر لینا چاہئے، جیسا کہ علامہ شامی فرماتے ہیں:

''ودفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له لیس برشوة'' (شامی ۹/۵۲۱)۔

تاہم جو قیدی کسی جور وظلم یا معاصی کی بنیاد پر مقید ہو اور وہ ایسا ہو جس سے لوگوں کو اذیت پہنچتی ہو تو اس کے لئے وکلاء سے رابطہ قائم کرنے اور سزا سے خلاصی کی کوشش کرنے کی اجازت نہیں، اور نہ وکیل کے لئے جائز ہے کہ اس کی پیروی کرے، البتہ اگر وہ معاصی کا خوگر نہ ہو بلکہ ایک وقتی غلطی کی وجہ سے مقید ہو تو اس کی سفارش کرنے، کروانے کی اجازت ہی نہیں بلکہ مستحب ہے، جیسا کہ ملا علی قاری فرماتے ہیں:

''وقد أجمعوا علی تحریم الشفاعة فی الحد بعد بلوغه إلی الإمام لهذا الحدیث، وعلی أنه یحرم التشفیع فیه، فأما قبل البلوغ فقد أجاز فیها أکثر العلماء إذا لم یکن المشفوع فیه صاحب شر وأذی للناس، وأما المعاصی التی یجب فیها التعزیر فیجوز الشفاعة والتشفیع فیها سواء بلغت الإمام أم لا، لأنها أهون بل هی مستحبة إذا لم یکن المشفوع فیه صاحب أذی'' (مرقاۃ ۷/ ۱۸۰)۔

۱۱- خواتین قیدیوں میں سے جو سزائے مقید ہوں، انہیں شیر خوار بچہ کو جیل میں رکھنے کا حق حاصل نہیں، کیوں کہ یہ استیناس کا سبب ہے جو سزائے قید کے منافی ہے، البتہ جو تہمت وشبہ کی وجہ سے مقید ہوں انہیں شیر خوار بچوں کو، ساتھ رکھنے کی اجازت ہے:

''فی فتح القدیر ولا یبسط له الفراش ولا وطاء ولا یدخل له أحد لیستأنس به'' (فتح القدیر ۷/۲۶۰)۔

قیدیوں کے حقوق کا شرعی پہلو

مولانا نعیم اختر قاسمی[1]

قید و بند اور جیل خانہ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ انسانی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سزا کی ایک قسم کے اعتبار سے قید و بند کا تصور کسی نہ کسی صورت میں ہر زمانہ میں رہا ہے۔ حضرت یوسفؑ کے جیل خانہ میں جانے اور اس کے اندر قیدیوں کی ایک معتد بہ تعداد سے ملنے کی واضح شہادت موجود ہے۔

اسلام میں قیدیوں کے لئے جیل خانہ کی تعمیر سب سے پہلے حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں ہوئی (الفاروق ۲ / ۲۷ بحوالہ مقریزی)۔ اس سے پہلے قیدیوں کے لئے کوئی مخصوص جگہ نہ ہوتی تھی، اس کے بعد حضرت علیؓ نے بھی ایک جیل خانہ بنوایا تھا (شامی ۴ / ۳۱۳)۔ دراصل حبس اور قید تعزیر کی چند صورتوں میں سے ایک صورت ہے۔

''فإن الحبس من أنواع التعزير (شامی ۴ / ۲۶۱ کتاب الکفالۃ)۔

کسی آدمی کو قید کب کیا جاسکتا ہے؟

کتب فقہ میں کسی شخص کو قید کرنے کی دو صورتیں بیان کی گئی ہیں، پہلی صورت یہ ہے کہ کسی آدمی پر جرم کا الزام لگایا گیا ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس پر وہ الزام ثابت ہو گیا ہو۔ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱- قید بطور احتیاط

اگر کسی آدمی پر ایسے جرم کا الزام لگایا گیا ہو جس کا تعلق حدود و قصاص سے ہو یعنی جس کے ثابت ہونے پر اس سے قصاص لیا جائے یا اس پر حد جاری کی جائے تو ایک عادل یا دو مستور شخص کی گواہی پر آخری فیصلہ ہونے تک اسے قید میں رکھا جاسکتا ہے، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

''ولا يحبس فيهما حتى يشهد شاهدان مستوران أوشاهد عدل يعرفه القاضي'' (ہدایہ ۲/۱۱۵ کتاب الکفالۃ)
(حدود و قصاص میں جب تک دو مستور یا ایک ایسا عادل گواہی نہ دے جس کو قاضی جانتا ہو تب تک اسے قید نہیں کیا جائے گا)۔
گویا یہ دفعہ غیر ضمانتی ہے۔

البتہ حضرات صاحبین کے نزدیک اگر کسی آدمی پر موجب حد قذف یا موجب قصاص جرم کا الزام لگایا گیا ہو تو چوں کہ ایسا ملزم ان کے نزدیک اپنی طرف سے کسی کو وکیل بالنفس بنا سکتا ہے اس لئے ایسے ملزم کو آخری فیصلہ ہونے تک قید کرنا درست نہیں بلکہ ضمانت پر رہا کیا جاسکتا ہے۔

''وذكر في أدب القاضي أن على قولهما لا يحبس في الحدود والقصاص بشهدة الواحد لحصول الاستيثاق بالكفالة'' (حوالہ سابق)۔

(ادب القاضی میں ہے کہ صاحبین کے قول پر حدود (حد قذف) وقصاص میں ایک آدمی کی گواہی پر قید نہیں کیا جائے گا کیوں کہ مضبوطی تو کفالہ سے حاصل ہو ہی جاتی ہے)۔

---

[1] مدرسہ مصباح العلوم کوپاگنج، مئو۔

محض تہمت اور الزام کی بنا پر وقتی طور پر گرفتار کرنا حدیث سے بھی ثابت ہے۔ ترمذی کی روایت ہے:

''أن رسول الله صلى الله عليه وسلم حبس رجلًا في تهمة ثم خلى عنه'' (ترمذی ۱/ ۱۷۰)۔

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک الزام کے تحت ایک آدمی کو گرفتار کیا اور پھر اسے چھوڑ دیا)۔

حافظ ابن قیم جوزیہ لکھتے ہیں:

''ولو حلفنا كل واحد منهم وأطلقناه مع العلم باشتهاره بالفساد في الأرض وكثرة سرقاته وقلنا لا نأخذ إلا بشاہدی عدل كان مخالفًا للسياسة الشرعية'' (شامی ۳/ ۱۸۸، باب التعزیر)۔

(اگر ہر اس ملزم سے جس کا زمین میں فساد برپا کرنا اور کثرت سے چوری کرنا مشہور ہو ہم قسم لے کر چھوڑ دیا کریں اور اس بنا پر اسے گرفتار نہ کریں کہ دو عادل آدمی کی گواہی ہمیں حاصل نہیں ہے تو یہ شرعی حکومت کے منافی ہوگا)۔

اسی لئے فقہاء لکھتے ہیں:

''وللقاضي تعزير المتهم وإن لم يثبت عليه'' (در مختار علی الرد ۳/ ۱۸۷)۔

۲-قید بطور تعزیر

وہ جرم جس کا تعلق تعزیر سے ہو تو اس کے اندر حجت کاملہ یعنی دو گواہوں کی گواہی کے بعد ہی قید کیا جاسکتا ہے یعنی مکمل جرم ثابت ہونے کے بعد، اس سے پہلے نہیں۔

''بخلاف الحبس في باب الأموال لأنه أقصى عقوبة فلا يثبت إلا بحجة كاملة'' (ہدایہ ۳/ ۱۱۵)۔

(برخلاف اموال کے باب میں قید کرنے کے کیوں کہ حبس آخری سزا ہے لہذا حجت کاملہ کے بغیر ثابت نہیں ہوگا)۔

گویا یہ مطلقًا ضمانتی دفعہ ہے۔

قید کی مدت

قید کرنا اگر تعزیرًا ہو تو اصلًا اس کی کوئی مدت مقرر نہیں بلکہ وہ حاکم کی صوابدید پر منحصر ہے کہ جب حاکم مجرم کے اندر ندامت اور توبہ کے آثار دیکھے اسے رہا کردے، مندرجہ ذیل فقہی عبارتوں سے یہی ثابت ہو رہا ہے:

''وتقدير مدة الحبس راجعة إلى الحاكم كما لا يخفى'' (البحر الرائق ۵/ ۴۳)۔

''والصحيح أن التقدير مفوض إلى رأي القاضي لاختلاف أحوال الأشخاص فيه'' (عنایہ ۲/ ۱۲۷، فصل فی الحبس)۔

''ويخلد في الحبس إلى أن يظهر التوبة أي أماراتها'' (منحة الخالق على البحر ۵/ ۴۲)۔

البتہ ایک بڑے ملک کے اندر جس کے جیلوں میں سزا کاٹنے والے مجرموں کی ایک بڑی تعداد رہتی ہو وقتًا فوقتًا اس بات کا پتہ لگانا کہ کن کن مجرموں کے اندر توبہ کے آثار ظاہر ہوئے ہیں یہ انتہائی مشکل کام ہوگا، اس لئے آسانی کے واسطے الگ الگ قسم کے جرم کے لئے الگ الگ قسم کی سزاؤں کے ساتھ قید کی مدت بھی مقرر کی جاسکتی ہے۔ جرم اور مجرم کی کیفیت کے پیش نظر ریاستی قوانین میں بھی اس قسم کی لچک ہوتی ہے کہ فلاں جرم کی سزا میں مثلاً پانچ سال سے لے کر دس سال تک کی سزا ہوسکتی ہے۔ دونوں مدتوں کے درمیان کی مدت کی تعیین حاکم اور جج کی صوابدید پر منحصر ہوتی ہے۔

اور اگر محض جرم کے الزام میں اسے احتیاطًا قید کیا گیا ہو تو اس کی قید کے مدت بیان نہیں کی جاسکتی۔ جرم کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے اگر اسے ضمانت مل گئی تو اس کا مقدمہ آہستگی سے چلتا ہے۔

اور اگر ملزم کی طرف سے درخواست ضمانت کے باوجود اس کی ضمانت منظور نہ کی جاسکی تو اس کے مقدمہ کی کارروائی میں تیزی لائی جاتی ہے اور ایسا کرنا شرعاً اخلاقاً اور قانوناً ناگزیر ہوتا ہے، مبادا وہ ملزم بری ہو تو اسے حبس بے جا سے جلد از جلد رہائی مل جائے گی۔ اور اگر مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں نہ ہوا بلکہ اسے مجرم قرار دے دیا گیا تو دوران سماعت قید کی مدت اس جرم کی اصل مدت سزا سے قانوناً منہا کردی جاتی ہے، اور ایسا کرنا ہی انصاف کا تقاضہ ہے۔

رہ گئی وہ صورت جس میں زیر سماعت قیدی کی مدت حبس اس کے اوپر عائد فرد جرم کی اصل سزا سے زیادہ ہوجائے یہ صورت بہت نادر ہے، کیوں کہ ابھی یہ بات گزری کہ جس کی ضمانت کی درخواست نامنظور ہوجاتی ہے اس کے مقدمہ کی فائلوں کی گردش قانوناً تیز کردی جاتی ہے اور اس کے مقدمہ کا تصفیہ جلد از جلد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور اگر ایسا ملزم درخواست ضمانت ہی پیش نہیں کرتا تو گویا وہ خود جیل میں رہنا گوارہ کررہا ہے، ایسی صورت میں کسی کو اس کے قید کی مدت لمبی ہونے سے کیا غرض ہوسکتی ہے؟

زمانۂ قید میں ہونے والے مالی نقصان کا ہرجانہ طلب کرنا

جیسا کہ بعض لوگوں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ اگر کسی ملزم کی درخواست ضمانت نامنظور کردی جائے اور بعد کو وہ جرم سے بری قرار دیا جائے تو زمانہ قید کی ذہنی اذیت کا تو کوئی بدل نہیں ہوسکتا اس لئے کسی بدل کا مطالبہ درست نہیں، البتہ زمانہ قید میں ہونے والے مالی ہرجانہ کا مطالبہ کرسکتا ہے، تاہم اس کے لئے قانون کی پیچیدگیوں سے گزرنا پڑتا ہے اور یہ بہت مشکل اور دشوار گزار عمل ہے، اسی لئے ایسا دیکھنے اور سننے کو نہیں ملتا۔ رہی اس مسئلہ کی شرعی حیثیت تو اس تعلق سے کوئی جزئیہ نہیں ملا۔

قیدیوں کو حاصل ہونے والے مختلف قسم کے حقوق

صاحب درمختار نے ''حبس'' پر مستقل ایک فصل قائم کی ہے جس میں مکان قید اور اس کی کیفیت پر تھوڑی روشنی ڈالی ہے، فرماتے ہیں:

''صفته أن يكون بموضع ليس به فراش ولا وطاء ليفجر... ولا يمكن لأحد أن يدخل عليه للاستيناس إلا أقاربه وجيرانه لاحتياجه للمشاورة ولا يمكثون عنده طويلا'' (درمختار علی الرد ۴/ ۳۱۴)۔

(قید خانہ ایسی جگہ ہونا چاہئے جہاں نہ کوئی بستر ہو اور نہ کوئی دری تاکہ اسے کلفت ہو۔ اس کے رشتہ دار اور پڑوسیوں کے علاوہ کسی اور کو انس حاصل ہونے کے واسطے اس کے پاس جانے نہ دیا جائے گا۔ رشتہ داروں اور پڑوسیوں سے مشورہ کرنے کا چونکہ وہ محتاج ہوتا ہے اس لئے اجازت ہے مگر وہ بھی ضرورت سے زیادہ اس کے پاس نہیں ٹھہریں گے)۔

اس کے علاوہ اور بھی چند چیزوں کا بیان ہے مثلاً جیل خانہ میں تجارت وکمائی کا کوئی کام نہیں کرے گا۔ بیوی سے صحبت کرنے یا نہ کرنے کے تعلق سے دونوں طرح کی روایتیں ہیں (درمختار علی الرد ۴/ ۳۱۴)۔

علامہ شامیؒ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''والمحبوس يسمى منفيًا من الأرض لأنه لا ينتفع بطيبات الدنيا ولذاتها ولا يجتمع بأقاربه وأحبابه (ردالمحتار ۳/ ۲۱۲، باب قطع الطريق)۔

(قیدی کو ''منفی من الارض'' بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ دنیا کی آسائشوں اور لذتوں سے نفع نہیں اٹھاتا اور اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے ملاقات نہیں کرتا)۔

ان فقہی عبارتوں سے اصلاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ قید جو کہ سزا کی ایک قسم ہے اس کی کیفیت کچھ ایسی ہونی ضروری ہے جس میں قیدی کو کلفت کا سامنا کرنا پڑے، اگر وہ ساری سہولتیں اور آسائشیں دوران قید اسے بھی حاصل ہوجائیں جو ایک آزاد شخص کو حاصل ہوتی ہیں تو اسے پھر اس قید میں

رکھنے کا مقصد ہی فوت ہوجائے گا۔

یہ بات ایک حد تک صحیح ہے تاہم قید اور جیل خانہ کی کیفیت چونکہ منصوص نہیں ہے اس لئے اس میں عرف کا لحاظ کر کے کچھ دوسری مصلحتوں کی رعایت بھی ضروری ہے۔ کسی مجرم کو قید کرنے کا مقصد جس طرح اسے سزا دینا ہوتا ہے اسی طرح اس کا دوسرا بڑا مقصد اس مجرم کی اصلاح ہونے تک آزاد اور صالح معاشرہ کو اس کی تخریب کاریوں اور شرارتوں سے محفوظ رکھنا بھی ہوتا ہے۔

نیز موجودہ زمانہ میں زندگی کے اندر اس قدر تنوع پیدا ہوگیا ہے اور اس قدر چیزیں انسانی ضرورت میں شامل ہوگئی ہیں کہ قیدی کو عام حالات میں ہر قسم کی سہولتوں سے محروم کرنے کو آزاد معاشرہ بھی ایک قسم کی زیادتی تصور کرے گا اور خود قیدی کے اندر اصلاح کے بجائے باغیانہ خیالات جنم لے سکتے ہیں، اور پھر قید کا مقصد ''ظہور اثر توبہ'' فوت ہوسکتا ہے۔ اس لئے موجودہ زمانہ میں قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کا جو عالمی معیار مقرر کیا گیا ہے اسے اپنانے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہونی چاہئے اور قیدی کو ہر قسم کے مذہبی، اخلاقی اور سماجی حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔ نیز جسمانی ضروریات بھی پوری ہونے کا خیال ہونا چاہئے، اسی طرح اپنے مقدمات کے سلسلہ میں اپنی براءت کے اظہار کے لئے وکیل سے رابطہ پیدا کرنے کے سارے حقوق ملنے چاہئیں، شریعت کی طرف سے اس کی کوئی ممانعت نہیں ملتی۔

دونوں قسم کے قیدیوں میں فرق

جن قیدیوں کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے ان کی قید اصلاً بطور سزا کے نہیں ہوتی بلکہ احتیاط پیش نظر ہوتی ہے اور مقدمہ کا فیصلہ ہونے تک قانون کی نگاہ میں وہ معصوم اور بے گناہ ہوتے ہیں اور معصوم کو سزا نہیں ہوتی اس لئے جیل کے اندر ان کی قید کی کیفیت اور رہائش کا معیار کچھ اس قسم کا ہونا ضروری ہے کہ وہ اسے اپنے ناکردہ جرم کی سزا تصور نہ کریں، یہ اور بات ہے کہ عام طور پر اس معاملہ میں دونوں قسم کے قیدیوں کے درمیان امتیاز نہیں برتا جاتا۔

قیدیوں سے جبراً کام لینا

فقہی اعتبار سے تعزیر کا تعلق چونکہ حاکم کی صوابدید پر منحصر ہوتا ہے اور سزا کی نوعیت کا فیصلہ بھی اسی کو کرنا ہوتا ہے اس لئے اگر وہ سزاءً بعض قیدیوں کو کسی کام پر لگا دے تو اس کا یہ اقدام درست ہونا چاہئے مگر ایسی صورت میں وہ اجرت کے بھی مستحق ہوں گے۔ موجودہ وقت میں وہ اجرت اس کی خوراکی کے طور پر وصول شدہ سمجھی جاتی ہے، درمختار میں ہے:

''ولا یؤاجرہ وعن الثانی یؤجرہ لقضاء دینہ'' (در مختار علی الرد ۴/۳۱۵)۔

(اسے اجیر نہیں بنائے گا، امام ابو یوسفؒ سے منقول ہے کہ اس کے دین کی ادائیگی کے لئے اجیر بنائے گا)۔

زنجیر، بیڑی، ہتھکڑی وغیرہ کا استعمال

درمختار میں ہے: ''ولا یغل إلا إذا خاف فرارہ فیقید'' (درمختار علی الرد ۴/۳۱۵)۔

(اس کے گلے میں طوق نہیں ڈالے گا مگر جب اس کے فرار ہونے کا اندیشہ ہو تو بیڑی ڈال دے گا)۔

اس سے معلوم ہوا کہ بعض خاص حالات میں کچھ خطرناک قسم کے مجرموں پر اس کا استعمال درست ہے۔ صرف رسماً استعمال کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

قید تنہائی

شامی میں ہے: إذا کان متعنتا لا یؤدی المال قیل یطین علیہ الباب ویترک لہ ثقبۃ یلقی لہ الخبز والماء (رد المحتار ۴/۳۱۵)

(اگر مال کی ادائیگی کرنے میں وہ زیادتی کرنے والا ہو تو جیل کا دروازہ بالکلیہ مسدود کر کے صرف ایک سوراخ رہنے دیں گے جس کے ذریعہ

کھانا اور پانی اندر پہنچائیں گے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ بعض مجرم کو اس کے خصوصی جرم کے پس منظر میں قید تنہائی بھی دی جاسکتی ہے۔ نیز حضرت موسی علیہ السلام کے ذریعہ سامری کو دی جانے والی "لامساس" کی سزا سے بھی اس کا اشارہ ملتا ہے واللہ اعلم۔

سچی بات اگلوانے کی صورتیں

یہ مسئلہ انتہائی حساس نازک اور پیچیدہ ہے۔ کیوں کہ قانون راز اور سچی بات اگلوانے کے لئے کسی قیدی پر کسی بھی قسم کے جسمانی تشدد کی اجازت نہیں دیتا، لیکن قیدیوں کے حق میں بنا ہوا یہ قانون دنیا میں کہیں بھی معمول بہ نہیں بلکہ اس کے برعکس بعض خطرناک مجرموں کی زبان کھلوانے کے لئے وہ سارے حربے اور جسمانی تشدد کے وہ سارے طریقے آزمائے جاتے ہیں جن میں سے صرف چند کا ذکر سوالنامہ میں کیا گیا ہے۔

دراصل جرم کی نوعیت، مجرم کی سفاکیت اور مقدمہ کی نزاکت وسنگینی کو دیکھتے ہوئے ملزم پر اگر کسی بھی قسم کا تشدد نہ کیا جائے تو بڑے بڑے جرائم راز سربستہ ہی رہ جائیں اور مجرموں کے گروہ تک رسائی اور ان کے نیٹ ورک کا پتہ ہی نہ لگ سکے، اس لئے بعض خاص حالات کے تعلق سے اس مسئلہ کو ذمہ داروں کی صوابدید پر چھوڑ دینا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے، اگر چہ ایسی صورت میں ظلم و ناانصافی اور بے جا تشدد کا پورا اندیشہ موجود ہے تاہم اس کے علاوہ کوئی چارہ کار بھی نہیں۔ البتہ اس بات کا پابند بنانے کی ضرور کوشش ہونی چاہئے کہ ملزم کو اس قسم کے ٹارچر اور تشدد کا نشانہ نہ بنایا جائے جو انسانیت سوز تصور کیا جاتا ہو۔

☆☆☆

قیدیوں کے حقوق

مولانا محمد قمر عالم [1]

یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام کی تعلیمات اور اس کے تمام اوامر ونواہی عدل وانصاف پر مبنی ہیں، اس میں اپنوں، غیروں، دوستوں، دشمنوں کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا گیا ہے اور نہ ہی ذات و برادری کے اعتبار سے کسی ناروا امتیازی سلوک کو جائز رکھا گیا ہے، اس وقت ہمارے ملک میں خصوصًا اور پوری دنیا میں عمومًا قیدیوں خاص طور پر ایک خاص فرقے اور مذہب کے ماننے والے قیدیوں کے ساتھ جو ناروا اور روح فرسا سلوک کیا جاتا ہے اسے سن کر رونگٹے ہی کھڑے نہیں ہوتے بلکہ روح بھی کانپ جاتی ہے۔

ان حالات میں ہمارا فرض منصبی ہے کہ ہم دنیا والوں کے سامنے قیدیوں کے حقوق کے سلسلے میں اسلام کی منصفانہ تعلیمات پیش کریں، تاکہ دنیا والے قیدیوں پر ہونے والے مظالم سے گریز کریں۔

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی جانب سے قیدیوں کے حقوق کے سلسلے میں چند سوالات ہیں جن کے جوابات تحریر کئے جارہے ہیں۔

۱- کسی بھی ملزم کو اس کے جرم کا ثبوت فراہم کئے بغیر تفتیش کے لئے احتیاطًا قید کیا جاسکتا ہے اور جتنا جلد ہو سکے تفتیش کرکے کوئی صحیح فیصلہ کرلیا جائے یعنی اگر وہ بے قصور ہے تو بلا تاخیر فورًا چھوڑ دیا جائے اور اگر اس کا جرم ثابت ہوجائے تو حسب جرم وموافق قانون اس کی مناسب سزا مقرر کردی جائے۔ اس قید کے لئے مدت کی تعیین بہتر ہوگا ورنہ تو قیدی سالہا سال تک تفتیش کے نام پر جیل کی تاریک وہولناک کوٹھریوں میں سڑتا رہے گا۔

۲- (الف) مذہبی امور: سے متعلق قیدیوں کو قید خانہ میں آزادی ہونی چاہئے، کیوں کہ عالمی معیار آزادی مذہب کے حق کو تسلیم کرتا ہے، عالمی قانون کا کہنا ہے کہ تمام مذہبی نمائندوں کو قیدیوں کی مذہبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے قید خانہ میں آنے کی اجازت ملنی چاہئے، اسی طرح اپنے مذہب کے مطابق عمل کرنا، مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرنا، اپنے مسلک ومذہب کی تبلیغ کرنا، مذہب کے مطابق عبادات کرنا، اس کے مذہب کے مطابق غذا فراہم کرنا بھی حکومتوں اور قید خانہ کے ذمہ داروں کے لئے ضروری ہے۔ نیز جس مذہب سے وہ تعلق رکھتا ہے اس مذہب کی مقدس شخصیتوں اور کتابوں وغیرہ کی بے حرمتی سے احتراز ضروری ہے۔

ب- جسمانی ضرورت: مناسب غذا، صاف پانی، کھلی فضا، ورزش کا بہتر انتظام، صاف ستھرا بستر، سونے کی جگہ الگ، علاج ومعالجہ کا معقول نظم اور ڈاکٹروں تک بلا واسطہ رسائی تمام قیدیوں کے لئے ضروری ہے۔ بیوی سے تعلقات کی بھی اجازت ہونی چاہئے، چنانچہ لاطینی امریکہ کے بہت سے قید خانوں میں مرد قیدیوں کو سنیچر اتوار کے دن فیملی وزٹ کی اجازت ہوتی ہے، کچھ جگہوں پر خواتین قیدیوں کو بھی اس کی اجازت دی گئی ہے، اس طرح کی ملاقاتوں کے دوران کچھ حد تک خلوت وتنہائی کی فضا قائم کرنے کے لئے چادر وغیرہ پردے کے لئے لٹکا دئے جاتے ہیں۔ جناب سالار محمد خان ایڈوکیٹ صاحب نے اپنے ایک مقالہ میں اس کی وضاحت کی ہے۔ آگے لکھتے ہیں کہ راجستھان اور ہندوستان کی کچھ دوسری ریاستوں میں کھلے جیلوں پر کام شروع ہوگیا ہے جہاں طویل میعاد قیدی جو اپنی سزا کا ایک حصہ کاٹ چکے ہیں وریہ ثابت کرچکے ہیں کہ ان سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوسکتا وہ ان قید خانوں میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ انفرادی رہائش گاہوں میں رہ سکتے ہیں، ایسے قیدی آس پڑوس کے کھیتوں میں یا دیگر مفید کاموں میں مشروف رہتے ہیں۔

---

[1] مدرسہ حسینیہ رانچی۔

ج-عام سماجی حقوق: پوری دنیا سے قیدیوں کو ربط وتعلق کے مواقع کوختم نہیں چاہئے، لہذا ان کی رسائی اخبارات ورسائل اور ریڈیو وغیرہ تک ہونی چاہئے، اسی طرح فون پر خویش واقارب سے گفتگو اور دوسرے قیدیوں سے ملاقات کی بھی اجازت ہونی چاہئے، نیز تعلیم اور ہنر سکھانے کا معقول نظم قید خانہ میں ہونا چاہئے تاکہ قید خانہ کی زندگی سے چھٹکارا پانے کے بعد معاشرہ میں شریفانہ زندگی گزار سکے۔

د-مردوں اور عورتوں کے قید خانے بالکل الگ الگ ہونے چاہئیں، جنسی وجسمانی زیادتیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے خواتین قیدیوں کی نگرانی بھی خواتین ملازمین کے ذریعہ کرانا ضروری ہے، دوران قید استحصال وتشدد وامتیاز وتفریق کی تمام شکلوں سے تحفظ کو یقینی بنانا قید خانہ کے انتظامیہ پر لازم ہے۔ اسی طرح بالغوں اور نابالغوں کے لئے بھی الگ الگ قید خانے کا ہونا ضروری ہے اور حتی الامکان نابالغ قیدیوں کو فوری طور پر عدالتی کارروائی کے لئے پیش کیا جانا چاہئے، اسی طرح اپنے اہل خانہ سے ملنے اور ان سے مراسلت کے تمام ذرائع کے استعمال کی اجازت کمسن نابالغ اور چھوٹے قیدیوں کو ہونا چاہئے۔ تعلیم وتربیت اور نظم وضبط سے متعلق اصول وضوابط ایسے ہوں جن سے بچوں کے اندر صحیح اخلاق واطوار، عدل وانصاف، عزت نفس اور حقوق انسانی کے جذبے کو ترقی ملے اور ان سے ان کی عزت ووقار اور احترام میں کوئی فرق نہ آئے۔

۳-قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے انہیں بے لباس کرنا، مار پیٹ کرنا، الکٹرک شاٹ لگانا، ان پر کتے چھوڑنا، سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈال دینا اور انہیں مسلسل جگے رہنے پر مجبور کرنا اور اس کے لئے اس کی جائے رہائش میں تیز روشنی یا تیز آواز کا انتظام کرنا یہ سب از روئے شرع حرام اور ناجائز ہیں اور حقوق انسانی کی پامالی اور ان کے ساتھ مذاق کے مرادف ہے، کیونکہ ان کے ساتھ وحشیانہ برتاؤ صرف اس لئے نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے کوئی جرم کیا ہے، یا ان پر مجرم ہونے کا الزام لگایا گیا ہے، قیدیوں کے ساتھ براسلوک ہمیشہ ہی مذہب میں قانونا ممنوع رہا ہے لہذا تعذیب وتشدد اور بالقصد بےرحم غیر انسانی یا ذلت آمیز رویہ پر سختی سے پابندی لگنی چاہئے، اس ممانعت کا صرف یہی مطلب نہیں ہے کہ براہ راست جسمانی وذہنی ظلم وستم نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس میں ہر وہ چیز شامل ہے جس کا سرا کسی نہ کسی صورت میں قیدیوں کے حقوق سے ملتا ہے۔

۴- جسمانی بندھنوں جیسے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالنا، یا پاؤں میں بیڑی ڈالنا یا جسم کو لوہے کی زنجیروں میں جکڑ دینا یہ درست نہیں ہے مگر یہ کہ وہ قیدی نہایت ہی خونخوار قسم کا ہو یا ان بندھنوں کے استعمال کے بغیر وہ قیدی قابو میں نہیں آسکتا تو ایسی صورت میں ان کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ مگر جیسے ہی اس قیدی کی حالت نارمل ہوجائے ان بندھنوں کو ہٹا دینا چاہئے۔

۵- کسی بھی مجرم کو اس کے خصوصی جرم کی وجہ سے مسلسل الگ تھلگ رکھنا درست نہیں ہے، ہاں! اگر چند دنوں کے لئے ہو تو اس میں مضائقہ نہیں۔

۶- اگر جج نے اس سے جبراً کام لینے کا فیصلہ لکھا ہے تو روا ہے ورنہ نہیں، اور کام کی اجرت کا استحقاق وعدم استحقاق کا تعلق بھی جج کے فیصلہ پر منحصر ہے۔

۷- زیر سماعت قیدیوں کو ایسے مقام پر نہیں رکھنا چاہئے جہاں ایسے مجرموں کو رکھا گیا ہے جن کی سزائے قید کا فیصلہ ہو چکا ہے، خواتین قیدیوں کو اپنے ساتھ شیر خوار بچوں کو جیل میں رکھنے کا حق حاصل ہے۔

پانچواں باب / تحریری آراء

قیدیوں کے حقوق شرعی نقطہ نظر

مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی

اسلام میں کسی کی حرکت خود اختیاری پر پابندی کا نام حبس یا قید ہے، امام ابن قیم جوزیہؒ نے قید کی یہی تعریف کی ہے، نبی کریم ﷺ کی سیرت اور ہدایات سے قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم ملتی ہے۔

۱- کسی ملزم کو عام حالات میں جرم ثابت ہوئے بغیر قید نہیں کیا جاسکتا، اگر ملزم فاسق و فاجر ہو اور مختلف جرائم میں شہرت رکھتا ہو تو اس کو الزام کی بناء پر بھی قید رکھا جاسکتا ہے جب تک وہ آئندہ کے لئے توبہ نہ کرلے۔

۲- الف- قیدی کو مذہبی امور کی آزادی حاصل ہوگی یعنی وہ اپنے مذہب کے مطابق عبادت کر سکے گا، اس کی مذہبی تعلیم کے مطابق اس کو غذا دی جائے گی اور اس کے مذہب کی مقدس شخصیتوں اور کتابوں کے بے حرمتی نہیں کی جائے گی۔

ب- اس کی جسمانی ضروریات کا خیال رکھا جائے گا یعنی اس کو مناسب غذا، صاف پانی، رہنے کی کھلی جگہ جہاں وہ لیٹ بیٹھ سکے۔

ج- اس کو عام سماجی حقوق بھی حاصل ہوں گے۔

د- اخلاقی امور کا لحاظ رکھا جائے گا یعنی مردوں کو عورتوں سے الگ، اسی طرح بالغوں اور نابالغوں کے لئے الگ الگ جگہوں کا ہونا۔

۳- قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے ان کو اس طرح سزائیں دینا قطعی جائز نہیں ہے کہ ان کو بے لباس کر دیا جائے، مار پیٹ کی جائے، الکٹرک شاٹ لگائے جائیں، ان پر کتے چھوڑے جائیں، برف کی سلوں پر لٹایا جائے، انہیں مسلسل جاگنے پر مجبور کیا جائے وغیرہ۔

۴- امام زیلعیؒ نے اپنی کتاب شرح متن الکنز میں لکھا ہے:

قید کی حقیقت کیا ہے۔ یہ کہ قیدی ایسی جگہ ہوگا جہاں کوئی فرش یا بستر نہ ہوگا، کسی رشتہ دار کو اندر جانے کی اجازت نہ ہوگی، تاکہ وہ ان سے مل کر خوش نہ ہو سکے، اگر بیمار ہو جائے اور جیل کے اندر علاج ممکن ہو تو اندر ہی علاج کیا جائے گا اور ضرورت ہوگی تو علاج کے لئے جیل کے باہر لے جایا جائے گا (۴/ ۱۸۲)۔

اس سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ سزائے قید کی اصل غرض مجرم کی آزادی اور حریت پر قدغن لگانا ہے اور اس کے ساتھ اسے قدرے جسمانی اذیت دینا بھی مقصود ہے۔

لیکن اسلامی قانون میں تعزیر کا مقصد اصلاح ہے تاکہ مزید جرم سے بچایا جاسکے، لہذا اگر جرم خطرناک ہو تو ہتھکڑی بھی پہنائی جاسکتی ہے اور بیڑی بھی ڈالی جاسکتی ہے۔

۵- خصوصی جرم کے پس منظر میں قید تنہائی کی بھی گنجائش ہوگی تاکہ مجرم کو اپنے جرم کا احساس ہو۔

۶- جیل میں قیدیوں سے مشقت لی جاسکتی ہے مگر یہ مشقت مجرم کی شخصیت اور اس کے جرم کی نوعیت کے مطابق اور مناسب ہو، کیوں کہ یہ مشقت سزا کے طور پر ہے، اس لئے وہ اجرت کے مستحق نہیں ہوں گے۔

۷- جب کہ مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے تو فیصلہ ہونے تک ان کو مجرم نہیں سمجھا جائے گا اور جن کے بارے میں سزائے قید کا فیصلہ ہو چکا ہے، زیر سماعت قیدی اور ان کے درمیان سلوک میں فرق ہونا چاہئے۔

۸- زیر سماعت قیدی جن کا جرم ابھی ثابت نہیں ہوا اس کو جرم سے پہلے سزا دینا غیر انسانی ہے۔

۹- زیر سماعت قیدی کو اگر بری قرار دے دیا گیا تو قید کی مدت میں ہونے والی ذہنی اذیت اور مالی نقصان کا ہرجانا اس کو ملنا چاہئے۔

۱۰- قیدی کو اپنے مقدمات کے سلسلہ میں وکیل کی خدمات اور صفائی پیش کرنے کا پورا پورا حق ہے اور اگر وہ ان اخراجات کر برداشت نہ کرے تو حکومت پر لازم ہے کہ وہ بیت المال سے اس کے اخراجات ادا کرے۔

۱۱- خواتین قیدیوں کو اپنے ساتھ شیر خوار بچوں کے رکھنے کا حق ہے اور جب تک وہ قید میں ہوں ان کے اخراجات بیت المال کو ادا کرنے ہوں گے۔

☆☆☆

قیدیوں کے حقوق- شرعی پہلو

مفتی محبوب علی وجیہی [1]

۱- اسلام نے شریعت مطہرہ کے موافق عمل کرنے والے کی تعریف بیان کی ہے اور اسے آخرت میں ثواب کا مستحق قرار دیا ہے، دوسری طرف اس کی خلاف ورزی کرنے والے اور حدود شرعیہ سے تجاوز کرنے والے پر سزا مقرر فرمائی ہے اور ہر جرم کی سزا شریعت میں الگ الگ ہے اور بعض جگہوں پر شریعت میں تعزیری سزا بھی بیان کی گئی ہے لیکن چونکہ ہندوستان میں اسلامی حکومت نہیں ہے کہ جس میں شرعی اعتبار سے سزا دی جائے، بلکہ قانون ہند میں مجرم کے لئے جو سزا مقرر کی گئی ہے وہی دی جائے گی، لہذا شرعی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو ملزم کو بغیر اس کا جرم ثابت ہوئے قید کرنا درست نہیں ہے، مگر مجرم کے بھاگ جانے یا غائب ہو جانے کا خطرہ ہو تو اس کو قید کرنا جائز ہے، مگر جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے اس سے کام نہ لیا جائے۔

۲- قیدیوں کو مذہبی امور سے روکنا درست نہیں ہے اور نہ ان کے مذہب یا مقدس شخصیتوں اور کتابوں کی توہین کرنا چاہئے، اور حکومت پر لازم ہے کہ ان کے مذہب کے مطابق غذا فراہم کرے۔ اور علاج و معالجہ وحفظان صحت سے متعلق ضروری چیزوں کا خیال رکھے، اور حکومت پر یہ لازم ہے کہ مردوں کو عورتوں سے الگ اور بالغ لڑکوں کو نابالغ بچوں سے الگ قید خانے میں رکھے۔

۳- قیدیوں سے سچی بات حاصل کرنے کے لئے ان کو مار پیٹ کرنا صحیح ہے بشرطیکہ ہلاکت کا اندیشہ نہ ہو، باقی بے لباس کرنا یا الیکٹرک شاک لگانا اور ان پر کتے چھوڑنا صحیح نہیں ہے۔ بے لباس کرنا تو حیاء انسانی کے خلاف ہے، اور بجلی کے شاک لگانے یا کتے چھوڑنے میں قیدی کی جان کے ہلاکت میں پڑ جانے کا خطرہ ہے اس لئے یہ عمل ان کے ساتھ درست نہیں ہے، اسی طرح برف کی سل پر رکھنا اور جاگنے پر مجبور کرنا وغیرہ یہ بھی درست نہیں ہے۔

۴- صورت مذکورہ میں قیدی کو جس طرح بھی قید کرنے میں سہولت ہو اس طرح اسے قید کرنا جائز ہے خواہ وہ زنجیروں میں ہو یا ہتھکڑی میں یا بیڑی ڈال کر، اور جب اس کے بھاگنے کا خطرہ ختم ہو جائے تو پھر بیڑی وغیرہ نکال دینا چاہئے۔

۵- کسی مجرم کو اس کے خصوصی جرم کے پس منظر میں قید تنہائی دی جاسکتی ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۶- جیل میں ان قیدیوں سے جبراً کام لیا جاسکتا ہے جن کا جرم ثابت ہو چکا ہے اور عدالت نے بامشقت قید کی شرط لگا دی ہے۔ اس کام پر وہ اجرت کے مستحق بھی نہیں ہوں گے مگر ہر قیدی سے کام لینا درست نہیں ہے۔ اگر ایسے قیدی سے کام لیا گیا جس کا جرم ثابت نہ ہوا اور

[1] امام جامع مسجد رام پور۔

عدالت نے اسے بری کر دیا تو پھر وہ قیدی اجرت کا مستحق ہوگا۔

۷- جن قیدیوں کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے اور جن کی سزا کا فیصلہ ہو چکا ہے دونوں کے حق میں سلوک کے اعتبار سے حکومت کی طرف سے فرق ہونا چاہئے، دونوں کے حق میں یکساں سلوک کرنا صحیح نہیں ہے۔

۸- زیر سماعت قیدیوں کو فیصلے سے پہلے وہ سزا دینا جو ان پر عائد ہوتی ہے جائز نہیں ہے۔ صرف انہیں قیدی بنا کر رکھا جائے گا انہیں سزا دینا درست نہیں ہے، ممکن ہے شبہ کی بنا پر اسے قید کیا گیا ہو اور اس کا جرم ثابت نہ ہو سکے۔

۹- صورت مذکورہ میں وہ ہرجانہ طلب کرنے کا مستحق نہیں ہے، کیوں کہ اسے حکومت نے جو قیدی بنا کر رکھا وہ صرف اس وجہ سے رکھا کہ وہ کہیں حکومت کے قبضہ سے نکل نہ جائے اور بھاگ نہ جائے اس لئے وہ ہرجانہ طلب کرنے کا مستحق نہیں ہوگا۔

۱۰- حکومت کو چاہئے کہ قیدی کو وکیل سے اپنے بات کہنے اور صفائی پیش کرنے کی مہلت دے اور کسی طرح کا اس پر دباؤ نہ ڈالے کہ جس سے وہ ڈر کر وکیل سے رابطہ قائم نہ کرے اور صفائی پیش نہ کر سکے۔ اسی طرح قیدی کو اس کے رشتہ داروں وغیرہ سے ملنے کا حق حاصل ہونا چاہئے۔

۱۱- خواتین کو اپنے شیر خوار بچہ کو جیل میں رکھنے کا حق حاصل ہوگا کیوں کہ شیر خوار بچہ اپنی ماں کے دودھ کے بغیر کمزور بھی ہو سکتا ہے اور بعض وقت مر بھی سکتا ہے اور ایک جان کے ساتھ دوسری جان کو تکلیف دینا اور سزا دینا جائز نہیں ہے، اس لئے خواتین کو اپنے ساتھ شیر خوار بچے کے رکھنے کا حق حاصل ہوگا۔

قیدیوں کے حقوق - اسلامی نقطہ نظر

مولانا ابوسفیان مفتاحی[1]

۱- کسی شخص نے کسی کو ملزم بنایا تو اس کے ذمہ اس کے جرم کو ثابت کرنا ضروری ہے۔ ثبوت جرم کے بغیر قید نہیں کیا جاسکتا، اور احتیاط کے طور پر ایسے شخص کو قید کیا جاسکتا ہے جو اپنے جرم میں مشہور زمانہ ہے مثلاً فتنہ سازی اور فسادی ہے اور ڈاکہ زنی اور چوری وغیرہ، تو ایسے شخص کو بطور احتیاط قید کیا جاسکتا ہے، اور اس کی قید کے لئے مدت حاکم کی صوابدید پر ہوگی، واللہ اعلم۔

۲- الف- قیدیوں کو مذہبی امور کے حقوق حاصل رہیں گے مثلاً عبادت کرنا، مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرنا، دوسرے قیدیوں کے درمیان دین کی دعوت دینا، اس کے مذہب کے مطابق اس کے لئے غذا فراہم کرنا اور اس کے مذہب کی مقدس کتابوں اور شخصیتوں کی عزت واحترام کرنا یہ وہ حقوق ہے جو اسے حاصل رہیں گے، کیوں کہ عالمی معیار آزادی مذہب کے حق کو تسلیم کرتا ہے، اس لئے تمام اہل مذاہب کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت ہونی چاہئے۔ عالمی قانون کا اصرار ہے کہ تمام مذہبی نمائندوں کو قیدیوں کی مذہبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے قید خانہ ہی میں آنے کی اجازت ملنی چاہئے۔ عالمی معیار کے مطابق یہ مذہبی سہولتیں دنیا کے مشہور ومعروف مذاہب کے ماننے والے کے لئے ہی نہیں بلکہ تمام چھوٹے بڑے مذاہب کے ماننے والے کے لئے ہیں۔ قید خانہ میں کسی مخصوص مذہب کی طرف داری نہیں ہونی چاہئے۔ واللہ اعلم۔

ب- جسمانی ضروریات کے لئے مناسب غذا، صاف پانی، علاج اور حفظان صحت کے لئے ورزش کی اجازت ہونی چاہئے۔ ایسی تنگ جگہوں میں قیدیوں کو نہ رکھا جائے جہاں کھڑا ہونا یا پاؤں پھیلا کر لیٹنا ممکن نہ ہوسکے۔ اور بیوی سے تعلق کی اجازت نہ دی جائے۔ عالمی اصول وضوابط کے مطابق جیل بھیجے جانے والے افراد پر ایک ہی سزا نافذ کی جاتی ہے اور وہ ہے آزادی سے محرومی۔ قیدیوں کو قید خانہ کے ملازمین اور دوسرے قیدیوں کی طرف سے بھی جسمانی، جذباتی ایذا رسانی طبعی حالات یا بے توجہی کے سبب سخت بیماری یا موت سے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔

واللہ اعلم۔

ج- عام سماجی حقوق کے لئے اخبارات پڑھنے، ریڈیو سننے اور فون پر احباب واقارب سے گفتگو کرنے کا موقع جو قید خانہ میں نہیں ہیں۔ واللہ اعلم۔

د- اخلاقی امور میں ہے کہ مردوں اور عورتوں کو ایک ہی قید خانہ میں نہ رکھا جائے بلکہ الگ الگ قید خانہ میں رکھا جائے۔ نیز بالغوں اور نابالغوں کو بھی الگ الگ قید خانہ میں رکھا جائے۔ اور حراست میں لئے گئے بچوں کے ساتھ اس طرح پیش آنا چاہئے کہ ان کے احساس ووقار اور عزت کو فروغ ملے لازمی اسکولی عمر کے بچوں کو تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت دی جائے، اور جن اداروں میں بچوں کو رکھا گیا ہے وہاں ہتھیار نہ لایا جائے۔

واللہ اعلم۔

۳- قیدیوں سے سچی بات اگلوانے کے لئے حاکم اپنی صوابدید کے مطابق سزا تجویز کرسکتا ہے کہ قیدی جس سے ڈر کر سچی بات ظاہر کردے، لیکن جان لیوا سزا تجویز نہ کرے۔ واللہ اعلم۔

---

[1] جامع مفتاح العلوم مئو۔

۴- قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑنا جائز ہے، اور ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنانا بھی جائز ہے، اور پیروں میں بیڑی بھی ڈالنا جائز ہے، واللہ اعلم۔

۵- کسی مجرم کو اس کے خصوصی جرم کے پس منظر میں قید تنہائی دی جاسکتی ہے، واللہ اعلم۔

۶- جیل میں قیدیوں سے بغیر جبر واکراہ بامقصد کام لیا جانا جائز ہے، اور قیدی اس کام کی اجرت کا مستحق ہوگا، لیکن کام کے اوقات حد سے متجاوز نہ ہوں۔ واللہ اعلم

۷- جن قیدیوں کا مقدمہ ابھی زیر سماعت ہے اور جن کے بارے میں سزائے قید کا فیصلہ ہو چکا ہے، قید خانہ میں سلوک کے اعتبار سے دونوں میں فرق رکھا جائے گا، یعنی زیر سماعت قیدیوں کو ایسے قیامگاہوں پر نہیں رکھا جانا چاہئے جہاں ایسے مجرموں کو رکھا گیا ہے جن کی سزا کا حکم صادر کیا جا چکا ہے، ان کی حراست کی کیفیت سزا یافتہ قیدیوں کی حراست کی کیفیت سے کم تر ہونا چاہئے، قبل سماعت قیدیوں کے لئے انفرادی اصول وضوابط ہونے چاہئیں، ان کے لئے کام لازم نہ ہو البتہ اپنی خوشی سے کام کرنے کا موقع ملنا چاہئے۔ واللہ اعلم۔

۸- زیر سماعت قیدیوں کو اتنے دنوں تک فیصلہ سے پہلے قید میں رکھنا درست ہے جو ان کے اوپر عائد فرد جرم کی اصل سزا ہے۔ واللہ اعلم۔

۹- ملزم کو قید میں رکھا گیا اور بعد کو عدالت نے اسے بری کر دیا تو زمانہ قید میں ہونے والی ذہنی اذیت پر مالی ہرجانہ طلب کرسکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

۱۰- قیدی کو اپنے مقدمات کے سلسلہ میں اس کے گھر کے لوگ یا دوست واحباب کو وکیل سے رابطہ رکھنے اور اور صفائی پیش کرنے کے حقوق حاصل ہیں، چونکہ انہیں آزاد قانونی صلاح ومشورہ کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ جو وکیلوں کے اخراجات برداشت کر سکتے ہیں ان کو ان تک رسائی ملنی چاہئے، اور جو ایسا نہیں کر سکتے ان کے لئے قانونی نمائندگی کا بندوبست کیا جانا چاہئے۔ واللہ اعلم۔

۱۱- خواتین قیدیوں کو اپنے ساتھ شیر خوار بچوں کو جیل میں رکھنے کا حق حاصل ہوگا۔ خواتین کے تعلق سے نوزائیدہ اور شیر خوار بچوں کا مسئلہ کافی اہمیت کا حامل ہے، بہت سے ملکوں میں ماؤں کو قید خانہ میں اپنے نوزائیدہ بچوں کو رکھنے کی اجازت ہے، شیر خوار بچوں کو ان کی ماؤں سے جدا کرنے کی مناسب عمر کیا ہے یہ متعین کرنا بڑا مشکل ہے۔ کچھ قید خانہ کی انتظامیہ ماؤں کو اپنے بچوں کو نو یا اٹھارہ مہینوں کی عمر تک اپنے ساتھ رکھنے کی اجازت دیتی ہے۔ اگر بچے کے لئے رہنے کی کوئی اور جگہ نہ ہو تو چار سال کی عمر تک وہ اپنی ماں کے ساتھ رہ سکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

☆☆☆

قیدیوں کے حقوق اور شرعی احکام

مفتی جمیل احمد نذیری[1]

۱- کسی ملزم کو اس کے جرم کا ثبوت فراہم ہوئے بغیر بھی قید کیا جاسکتا ہے، اسے حبس بسبب التھمۃ کہتے ہیں، اس آیت سے اس کا جواز ملتا ہے:

''تحبسونھما من بعد الصلاۃ'' (مائدہ:۱۰۶) (دونوں کو نماز کے بعد روکو)۔

رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ غفار کے دو اشخاص میں سے ایک شخص کو دو اونٹوں کی چوری کی تہمت کی وجہ سے محبوس کیا تھا، اور چھوڑ دیا تھا (مصنف عبدالرزاق ۱۰/ ۲۱۷)، حضرت علیؓ سے بھی متہمین کو محبوس کرنے کا ثبوت ملتا ہے (تبصرۃ الحکام ۲/ ۱۴۰)۔

اس کی کوئی مدت مقرر نہیں، حاکم کی صوابدید پر منحصر ہے، مگر اس کے معاملہ کو بلا وجہ طول نہ دیا جائے، بس اتنے دن تک رکھا جائے، جتنے میں الزام کے متعلق صحیح صورت حال سامنے آجائے (شامی ۴/ ۸۸، الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۲۹۴)۔

۲- الف: مذہبی امور جن کا سوال میں تذکرہ ہے، قیدی کو ان کا حق ملنا چاہئے۔

ب- جسمانی ضروریات بھی اسے فراہم کی جانی چاہئیں، بیوی سے بھی مقاربت کا موقع ملنا چاہئے۔

(السجون بین الشریعۃ والقانون: ڈاکٹر حسن عبدالغنی ابوغدہ، مکتبہ الرشد الریاض/ ص ۴۸۷)۔

ایسی تنگ جگہ میں قیدیوں کو رکھنا جائز نہیں جہاں کھڑا ہونا یا پاؤں پھیلا کر لیٹنا یا دیوار کے باہر کسی چیز کا دیکھنا ممکن نہ ہو، یہ قیدیوں کے ساتھ انسانیت سوز ظلم ہے۔

ج- عام سماجی حقوق بھی اسے حاصل رہیں گے، البتہ اس میں حسب صوابدید حکام تعیین وغیرہ کا حق رہے گا، یہ حقوق بہت عمومی حیثیت سے نہیں دیئے جائیں گے جن سے قید کرنے کا مقصد فوت ہونے لگے۔

د- اخلاقی امور: مردوں اور عورتوں کے الگ الگ قید خانے، اسی طرح بالغ ونابالغ کے الگ الگ قید خانے ہونے چاہئیں (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۲۱۷)۔

۳- بالکل جائز نہیں ہیں۔

۴- جرائم کے اعتبار سے ان کی گنجائش رہے گی (السجون بین الشریعۃ والقانون/ ۵۵۱) اس میں اصل حاکم کی صوابدید ہے۔

۵- بعض قیدیوں کے ساتھ ایسا کرنے کی گنجائش ہے، مثلاً مرتد، مخنث، محبوس بالدین جو ادائیگی قرض سے انکار کرے اور سرکشی دکھائے۔

(کتاب مذکور/ ۵۵۶)۔

۶- اگر بطور سزا کے کام لیا گیا ہے تو اس کی کوئی اجرت واجب نہ ہوگی، لیکن اگر قیدیوں سے کہا گیا کہ خالی وقت میں فلاں کام کر دیا کرو، اتنی اجرت

[1] مہتمم جامعہ عربیہ احیاء العلوم (?) ... الاسلام، مبارک پور۔

ملے گی، تو وہ اجرت کے مستحق ہوں گے۔

۷- جی ہاں، فرق کیا جائے گا، زیر سماعت قیدیوں کے ساتھ مجرموں والا سلوک نہیں کیا جا سکتا۔

۸- صرف الزام کی بنیاد پر، اس سزا کی مدت کے بقدر، قید خانے میں نہیں رکھا جا سکتا، کیونکہ یہ تو ملزم کو پہلے ہی سے مجرم قرار دینا ہوا، جبکہ اس کا معاملہ ابھی زیر سماعت ہے۔

۹- اگر اس کے ساتھ مجرموں جیسا برتاؤ کیا گیا، جبکہ ابھی وہ صرف ملزم ہے، نیز اسے لمبی مدت تک رکھا گیا جبکہ اس الزام کی تحقیق وتفتیش اس سے کم مدت میں ممکن تھی، اور حکام نے بلا کسی معقول عذر کے معاملہ کو طول دیا ہے تو زمانہ قید میں ہونے والی ذہنی اذیت کا مالی ہرجانہ طلب کر سکتا ہے، لیکن اگر اس کے ساتھ مجرموں والا برتاؤ نہیں کیا گیا اور قید صرف اس لئے کیا گیا تا کہ بھاگ نہ جائے اور معاملہ کی تفتیش آسان ہو اور اتنی مدت میں قید میں رکھا گیا جتنی اس کے معاملہ کی تفتیش کے لئے عام اصول کے مطابق ضروری تھی تو زمانہ قید کی ذہنی اذیت کا مالی ہرجانہ طلب کرنے کا حق نہ ہوگا، کیونکہ متہم ہو جانے کی وجہ سے شریعت نے اسے قید کرنے کی اجازت دے دی ہے، اور قید خانہ میں ذہنی اذیت تو ہوگی ہی، شریعت کی اجازت کے بعد ذہنی اذیت کے لئے مالی ہرجانہ کے مطالبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۱۰- قیدی کو اپنے مقدمات کے سلسلہ میں وکیل سے رابطہ اور صفائی پیش کرنے کا پورا حق ہے، کیونکہ معاملہ زیر سماعت ہے، وہ ملزم ہے مجرم نہیں، اسے اس قسم کے مشوروں اور رابطوں کا پورا حق دیا جانا چاہئے (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۳۲۶)۔

۱۱- خواتین قیدیوں کو اپنے ساتھ شیر خوار بچوں کو جیل میں رکھنے کا حق ہے، تا کہ وہ مدت رضاعت تک شریعت کے حکم کے مطابق دودھ پلا سکیں، یہ حق نہ دینا ماں اور اس کے بچے کے درمیان جدائی کر دینا ہے جو کہ قطع رحم ہے جبکہ وہ بچہ اس عمر میں ماں کا بہت ہی محتاج ہے۔

احقر کے خیال میں اس کی اجازت شوہر کو اپنی بیوی سے مجامعت والے حق سے بڑھ کر ہونی چاہئے، کیونکہ وہاں شوہر و بیوی میں سے کسی کی جان کا خطرہ نہیں، اور یہاں شیر خوار بچے کی ہلاکت کا خطرہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆

قیدیوں کے حقوق

مفتی شیر علی[1]

اسلام میں قانون یہ ہے کہ اگر کسی نے کسی پر جرم کا دعوی کیا تو مدعا علیہ سے پوچھا جائے کہ آیا تو نے یہ جرم کیا ہے یا نہیں؟ اگر وہ اقرار کرے تو فوراً سزا دیکر معاملہ وہیں ختم کر دیا جائے، اگر اقرار نہ کرے تو شبہ کی وجہ سے قید کیا جاسکتا ہے، البتہ ایسی سزائیں دینا کہ اس کی آدمیت یا اس کی عقل ختم ہو جائے، مثلاً ان کو ننگا کرنا، الیکٹرک شاٹ دینا، مافوق الطاقت تکلیف دینا، یہ اسلام میں جائز نہیں ہے۔ اسی طرح قید بھی کرنا اور پٹائی بھی کرنا، ڈبل سزا کی بھی اسلام اجازت نہیں دیتا، البتہ مذہبی امور کی ادائیگی میں رکاوٹ بننا جیل خانہ والوں کے لئے مناسب نہیں ہے، نیز عبادت، تبلیغ، تعلیم و تعلم سے بھی نہیں روک سکتے، رشتہ داروں سے ملاقات کی بھی اجازت دینا چاہئے۔

۱- شبہ کی بنا پر قید کیا جاسکتا ہے، مدت حکومت کی رائے پر موقوف ہے، شبہ دور ہونے تک۔

۲- (الف) مذہبی امور کی ادائیگی میں رکاوٹ بننا جیل خانہ والوں کے لئے مناسب نہیں ہے، نیز عبادت و تبلیغ، تعلیم و تعلم سے بھی نہیں روک سکتے، رشتہ داروں سے ملاقات کی بھی اجازت دینا چاہئے۔

ب- ان کے آرام کا خیال کرنا چاہئے۔

ج- ''عام سماجی حقوق'' اس کی بھی اجازت ہونی چاہئے۔

۳- الف- قیدیوں کو بے لباس کرنا۔

ب- قیدیوں کو مار پیٹ کرنا۔

ج- انہیں الیکٹرک شاٹ لگانا۔

د- قیدیوں پر کتے چھوڑنا۔

ہ- قیدیوں کو سخت ٹھنڈک میں برف کی سلوں پر ڈال دینا۔

و- انہیں مسلسل جگے رہنے پر مجبور کرنا، اور اس کے لئے اس کی جائے رہائش میں تیز روشنی، یا تیز آواز کا انتظام رکھنا۔ یہ سب جائز نہیں ہے۔

---

[1] دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر (گجرات)۔

جواب بابت قیدیوں کے حقوق

مولانا محمد ذکاء اللہ شبلی [1]

۱- جرم کے ثبوت سے قبل قید کرنا درست نہیں، البتہ اگر الزام زیادہ سنگین ہو تو ایسے ملزم کو اس کے گھر یا محلہ میں نظر بند کیا جاسکتا ہے۔

۲- الف- قیدیوں کو عالمی وملکی قانون کے تحت مذہبی امور کی انجام دہی کی اجازت ہے۔

ب- جسمانی ضرورت کے مناسب چیزوں کے استعمال کا اختیار ہے۔

عمر قید کی سزا کاٹ رہے قیدیوں کو ہمارے یہاں کچھ دنوں کے لئے سال پر ان کے اہل خانہ سے ملاقات کا موقع دیا جاتا ہے۔

ج- عام سماجی حقوق واخلاقی امور کا پاس ولحاظ رکھنا ان کا حق ہے۔

۳- سچ اور صحیح بات معلوم کرنے کے لئے مناسب تدبیر جو انسانیت سے پرے نہ ہو اختیار کرنے کی اجازت ہوگی۔

۴- سخت قسم کے مجرم کے ساتھ یہ نوعیت اختیار کی جاسکتی ہے۔

۵- کسی خاص قسم کے مجرم کو تنہائی کی سزا دی جاسکتی ہے۔

۶- کسی بھی قیدی سے زبردستی کام نہیں لیا جاسکتا۔

۷- زیر سماعت مقدمات کے قیدی اور سزا کا فیصلہ ہو جانے والے قیدیوں میں رہائش وقیام وطعام وسلوک کے معاملہ میں فرق ضروری ہے۔

۸- فیصلہ سے پہلے اتنے دنوں قید میں رکھا جاسکتا ہے، لیکن فیصلہ کے وقت اس کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ ملزم اتنی سزا قبل فیصلہ کاٹ چکا ہے اس لئے آزاد کیا جاتا ہے۔

۹- اگر ایسے جرم میں جس میں قید کی سزا نہیں ہے، قید کر دیا گیا تو ایسے شخص کو قید خانہ میں ہونے والی اذیت اور اس مدت کا مالی ہرجانہ وصول کرنے کا حق ہوگا۔

۱۰- ہر قیدی کو قانوناً یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی طرف سے ترجمان و وکیل مقرر کرے۔ اور وکیل سے اسے اپنی پوری بات پرسکون ماحول میں کہہ سنانے کا بھی حق ہے۔

۱۱- خواتین قیدیوں سے ان کے شیرخوار بچوں کو جدا نہیں کیا جاسکتا۔

---

[1] اندور، مدھیہ پردیش۔

چھٹا باب / مناقشہ

قیدیوں کے حقوق

مفتی انور علی اعظمی

اس سلسلہ میں ایک بات تو مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ ابھی عرض مسئلہ کے سوال ۱۰ کے جواب میں ایک شق رکھی گئی ہے کہ قیدی کو وکیل سے رابطہ کرنے اور اپنی صفائی پیش کرنے کا حق ہے، اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ جو قیدی وکیل کے اخراجات نہ برداشت کرسکے، ان کے لیے قانونی نمائندگی کا بندوبست ریاست یا حکومت پر لازم ہونا چاہیے، عرض مسئلہ میں یہ شق رہ گئی ہے اس کا لحاظ رکھیں۔

دوسری یہ گزارش کرنی ہے کہ ہندوستان میں جہاں ہم رہ رہے ہیں، اس کی حد تک ہم یہ خوب محسوس کرتے ہیں کہ اس وقت جیل میں بہت سارے مسلمان ایسے ہیں جو بے گناہ قید کئے گئے ہیں اور مسلمانوں کے علاوہ بھی اور جو دوسرے بے گناہ قیدی ہیں، ان کے ساتھ جو اخلاقی برتاؤ ہم کرسکتے ہیں اس میں ایک یہ بھی ہے کہ تہوار وغیرہ کے موقع پر ان کے ساتھ خاطر و مدارات کا معاملہ کیا جائے اور ان کو کچھ تحفے، پھل، کھانے پینے کے سامان فراہم کئے جائیں، مسلمانوں کے ساتھ جو زیادتیاں اس وقت ہو رہی ہیں، عام طور پر ان کے مقدمات دیکھنے کے لیے اجتماعی طور پر کوئی کوشش ہونی چاہیے اور بہت سارے نوجوان مسلمان جو جیل میں سڑائے جا رہے ہیں اور جن کی بہترین جوانی کی عمر اور تعلیم حاصل کرنے کا زمانہ ضائع ہو رہا ہے، ان کی ملازمت برباد ہو رہی ہے، تو ایسے بے گناہ نوجوانوں کی زندگی کو بچانے کے لیے اور ان کو جیل سے نکلوانے کے لیے اجتماعی طور پر کوئی کوشش ہونی چاہیے، یہ انتہائی ضروری ہے، اس وقت خاص طور پر ہمارا علاقہ اعظم گڈھ نشانہ پر ہے اور کئی سو ایسے مسلمان لڑکے جیل میں ہیں، جنہوں نے کوئی قصور نہیں کیا تھا، بغیر کسی قصور کے اور بغیر کسی جرم کے انہیں جیل میں رکھا گیا ہے، معلوم نہیں کب تک وہ جیل میں پڑے رہیں گے۔

مولانا عبدالرحیم صاحب کشمیری

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم. امابعد

سب سے پہلے تو ہم کشمیر سے حاضری پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور آپ حضرات کے بھی مشکور ہیں اور اس مؤقر اجلاس میں موقع ملا، اس کے لیے بھی شکر گزار ہیں، یہاں جو سوالات آئے ہیں اور جو بار بار تذکرہ ہوا ہے، گوانتانا موبے وغیرہ کا، تو چوں کہ ہمارا تعلق کشمیر سے ہے تو پچھلے بیس سال کے عرصہ سے جو وہاں پر ہم حالات دیکھ رہے ہیں اور مختلف ٹی وی چینلوں اور وسائل اعلام کے ذریعہ سے دنیا تک وہ باتیں رہ رہی ہیں، لیکن کشمیر میں جو بالکل آپ کے قریب ہے، وہاں جو انسانی حقوق کی پامالیاں ہوئی ہیں، اس وقت دس ہزار سے گیارہ ہزار افراد بالکل ان کا نام ونشان کا پتہ نہیں ہے، ان کی مائیں، ان کی بہنیں اور ان کے اقرباء جو ہیں روزانہ مختلف سڑکوں پر اور مختلف جگہوں پر ان کی تصاویر لے کر احتجاج کرتے رہتے ہیں کہ ہمارے بچوں کا پتہ بتاؤ، حال ہی میں کشمیر میں دو تین مختلف جگہوں پر، مختلف قبریں ہزاروں کی تعداد میں دریافت ہوئی ہیں، ان قبروں میں کون دفن ہے اللہ ہی جانتا ہے، حکومت بھی آج تک جواب نہیں دے پائی ہے۔ تو پہلے تو میری گزارش یہ ہے کہ گوانتانا موبے وغیرہ اتنا دور جانے سے پہلے ذرا ہم اپنے آس پاس کی بھی خبر لے لیں کہ کہیں ہمارے آس پاس ہی اس سے زیادہ مظالم نہ ہو رہے ہوں اور اس کے متعلق جو کچھ ہم کرسکتے ہیں، کیونکہ اب تو اعظم گڈھ وغیرہ، بٹلہ ہاؤس کا معاملہ بھی سامنے آگیا ہے، تو یہاں کے مسلمانوں کو جو ہے اس بارے میں تھوڑا سا سنجیدہ ہو کر کوئی متفقہ لائحہ عمل مرتب کرنا ضروری ہے، تاکہ آئندہ یہ مظالم کا سلسلہ جاری نہ رہے اور اس میں ایک بات اور ہے، چونکہ میرا ذاتی اس سے واسطہ پڑا ہے، 13 دسمبر کو

پارلیمنٹ پرحملہ ہوا تھا اس کے جو اس وقت ماسٹر مائنڈ بتائے گئے تھے وہ میرے رشتہ میں بھائی ہیں، بڑے بھائی ہیں، سید عبدالرحمن گیلانی وہ میرے بڑے بھائی ہیں، ان کی جو اسٹوری ہے جس سے ہم خود گزر رہے ہیں، یہ کوئی سنی سنائی باتیں نہیں کی ہیں، اس کے پس منظر میں کچھ سوالات ابھر رہے ہیں پہلی بات تو انہوں نے یہ کہی کہ جس وقت ان کو گرفتار کیا گیا وہ جمعہ پڑھنے کے لیے جارہے تھے اور ان کو ٹی وی چینلوں پر ماسٹر مائنڈ ظاہر کیا گیا، پھر الحمدللہ سپریم کورٹ سے وہ باعزت بری بھی ہو گئے اور پھر ان پر حملہ بھی ہوا اور اس وقت گورنمنٹ آف انڈیا نے سی آئی ایس ایف کو ان کی حفاظت پر بھی مامور کر رکھا ہے، وہاں صورت حال یہ ہے کہ انہوں نے پہلی بات یہ کہی کہ جب ہم کو گرفتار کیا گیا تو ہم سے پانچ سادہ پیپرس پر دستخط کروائے گئے اور پانچ سادہ پیپرس پر دستخط کروانے کے بعد جو اس وقت پوٹا قانون نافذ تھا، اس کے تحت کسی بھی ڈی ایس پی کے یہاں اقبالی بیان جو ہے وہ قانونی حیثیت اختیار کرلیتا تھا اب انہوں نے جب دستخط سادہ کاغذ پر کروالیے، اس کے بعد اس میں جو کچھ چاہو درج کرلو، دستخط تو ملزم سے لے لیے، اب جو مسئلہ ہمارے پاس اٹھتا ہے کہ جب ظالموں کی طرف سے مظلوم پر اتنی انتہا کردی جاتی ہے کہ جو چاہو اس کے ساتھ الزام لگادو اور جس طرح سے چاہو اسے بدنام کرو، اخلاقی لحاظ سے، جسمانی لحاظ سے، اس پر جتنا ظلم کرو، کرو تو جو اس کا دفاع کرنے کا معاملہ ہے اور وکلاء کا معاملہ آپ کو معلوم ہے، جس طرح سے وہ ملزم کو پھنسانے کے لئے فرضی گواہ کھڑے کرلیتے ہیں، کیا شریعت اسلامیہ میں ہمارے لیے ایسی گنجائشیں ضرورت اور عموم بلویٰ کی وجہ سے اس معاملہ میں، کیا ہمارے وکلاء حضرات کے لئے اسی طرح سے جس انداز میں پولیس فرضی مقدمات قائم کردیتی ہے، اسی طرح سے ہمارے وکلاء فرضی گواہوں کو کھڑا کرسکتے ہیں اور اسی طرح سے وہ معاملات کرسکتے ہیں، وہ لوازمات پورے کرسکتے ہیں، جو اگرچہ شرعاً کذب کے دائرہ میں آجائے، شرعاً جو صریح جھوٹ میں بھی آجائے اور قول زور کے دائرہ میں آجائے، شہادۃ زور کے دائرہ میں آجائے لیکن مسئلہ ہے ایک آدمی کو بچانے کا اس کی جان کے تحفظ کا اور بہت سارے مسائل اس سے جڑے ہوئے ہیں، یہاں ہمارے سوالات میں اس کا کوئی تفصیلی ذکر نہیں ہے اور میں جہاں تک سمجھتا ہوں، جہاں تک ہماری بحثیں ہیں، تو ہماری بحثوں کا شاید ایک دائرہ تو یہ ہے کہ ہماری علمی تحقیق ہے اور دوسرے گراؤنڈ ریالٹی (Ground Reality) جو حقیقت زمین پر اس وقت موجود ہے۔

جو ہمارے یہاں پر تحقیقات ہو رہی ہیں، حکومت تو اس سے استفادہ کرنے سے رہی، ان کا تو اپنا معاملہ ہے وہ جس طرح سے قیدیوں کے ساتھ پیش آئے اور کوئی اسلامی حکومت بھی ایسی نہیں ہے اس وقت جو ہم سے مطالبہ کرے کہ بتاؤ کہ ہمیں قیدیوں سے کیسے پیش آنا ہے، کیسے ہمیں ان کی تربیت کرنی ہے یا ان کی تادیب کرنی ہے یا ہمیں زجر کرنا ہے، اس وقت یہ دیکھنا ہے کہ ہندوستان میں اور جو اقلیتوں پر مظالم ہو رہے ہیں، اس سے چھٹکارے کی صورت کیا ہے؟ بظاہر اس کی صورت یہ ہے، ہمارے ساتھ جو معاملہ ہوا، وہ تو اللہ نے ہمارے ساتھ غیب سے نصرت فرمائی، ہمارے بھائی صاحب کے کیس میں مسٹر رام جیٹھ ملانی جو کرمنل لاء میں بڑے مشہور ہیں، ہندوستان کے اندر جو سپریم کورٹ کے وکیل ہیں، وہ کھڑے ہوگئے، حالانکہ رام جیٹھ ملانی کا میں بتاؤں گا اطلاع کے لیے، انہوں نے خود مجھ سے کہا کہ میں ایک پیشی کا کم سے کم تین لاکھ روپے لیتا ہوں اور ایک مقدمہ کو نپٹانے کی تو بات ہی نہیں، تو ہمارے بس میں نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے کہا کہ آپ کا کیس میں انسانی بنیاد پر لڑ رہا ہوں اور الحمدللہ انہوں نے لڑا، اور سپریم کورٹ میں ہمارے بھائی صاحب بری ہوگئے۔ لیکن ہر ایک مسلمان اور ہر ایک غریب کے پاس اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ ایک پیشی کے تین لاکھ روپے پیش کرے، تو اس وقت ہمارے پاس مسئلہ دوسرا کھڑا ہو رہا ہے کہ کیا ایسی صورت میں سودی رقم یا ایسی رقومات جن کو ہم رفاہ عام پر خرچ کرتے ہیں اور باقی معاملات میں خرچ کرتے ہیں کیا ہمیں فتویٰ جاری کرنا چاہیے! سماجی طور پر کہ ایسا شخص جو ہے اس سودی رقم کا زیادہ مستحق ہے، بہ نسبت دوسری مدات کے، کیونکہ اس وقت اس کی جان خطرہ میں ہے، تو یہ چند اہم پوائنٹس ہیں جن میں ایک شہادت زور والا معاملہ ہے، فرضی گواہوں کو کھڑا کرنے کا معاملہ۔ ظالم کے مقابلہ میں اور اسی طرح سے اس کے مقدمے کے اخراجات جو ہیں وہ کیا سودی رقم سے پورے کئے جاسکتے ہیں، ان سارے معاملات کو ضرور یہاں پر بحث میں لانا ضروری ہے، تاکہ امت کے سامنے کوئی لائحہ عمل پیش ہوجائے۔

مفتی تنظیم عالم قاسمی، حیدرآباد

قیدیوں کے حقوق سے متعلق جو سوالنامہ دیا گیا تھا، اس میں بیشتر جزئیات کا تعلق اس بات سے ہے کہ قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے اوران کے ساتھ قید خانے میں کیسا معاملہ کرنا چاہیے، اس سلسلہ میں حضرات فقہاء نے جو اصولی بحث کی ہے میرے خیال سے اگر وہ اصولی بحث سامنے رکھا جائے تو کافی مسائل میں ہمارے لیے کافی تعاون مل سکتا ہے، تقریباً تمام حضرات فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جرم خواہ کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو، اس کی آدمیت باقی رہتی ہے، آدمیت ختم نہیں ہوتی، انسان وہ باقی رہتا ہے خواہ کیسا ہی وہ بڑا جرم کرنے والا کیوں نہ ہو۔ ''وماکان من خواص الأدمية في الرقيق لايبطل بل يبقى على أصل حرية۔'' وغیرہ وغیرہ لوگوں نے عبارتیں پیش کی ہیں۔اس سلسلہ میں ظاہری بات ہے کہ آدمی ایسا عمل جو انسانیت کے خلاف ہے جیسے الیکٹرک شارٹ لگانا یا ایسی مار مارنا جس سے انسانیت متاثر ہوتی ہو یا بے لباس کرنا، الیکٹرک شارٹ لگانا، قیدیوں پر کتے چھوڑنا وغیرہ وغیرہ۔

ظاہری بات ہے کہ یہ آدمیت کے خلاف ہے، یہ سزائیں ان کو نہیں دی جاسکتی ہیں، لیکن اس کے علاوہ وہ سزائیں جو آدمیت کے خلاف نہیں ہیں، جیسے مذہبی امور، جسمانی ضروریات، عام سماجی حقوق، اخلاقی امور یہ تمام چیزیں انسان کو حاصل ہوں گی اور یہ بالکل آدمیت کے مطابق ہے، ظاہری بات ہے بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ قید خانے میں اگر ان کو ریڈیو سننے، فون وغیرہ پر بات کرنے کی اجازت دی جائے تو استیناس حاصل ہوسکتا ہے، یعنی ایک طرح سے جو گھٹن محسوس کرنے کا حربہ ہے وہ حاصل نہیں ہوگا، اس پر قابل غور پہلو یہ ہے کہ جب قید خانے میں ایک آدمی کو داخل کردیا جائے تو خود بخود گھٹن کا جو پہلو ہے وہ حاصل ہوگا۔اس کے لیے الگ سے کہ ان کو ریڈیو سننے یا اس طرح اور دیگر چیزوں کے بارے میں الگ سے اس کی ضرورت نہیں پڑسکتی ہے۔

مولانا ظہیر احمد، کانپور

میرا دراصل سوال پروفیسر عبدالرحیم صاحب سے ہے، انہوں نے یہ بتایا تھا کہ تقریباً سات حقوق ایسے ہیں جو کسی بھی حالت میں مردہ نہیں ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں، لیکن انہوں نے جو ذکر کیا، چار تو انہوں نے ٹو دی پوائنٹ ذکر کئے تھے Freedom, Right of Life, Shavery of Tarchers اور Freedom of Religion لیکن اس کے بعد بقیہ جو ہے وہ شاید رہ گئے ہیں تو میں چاہتا ہوں کہ ان کی بھی پوری وضاحت کردیں۔

مولانا شوکت ثناء قاسمی

میرا بھی سوال دونوں ماہرین سے یہ ہے کہ اگر وہ حقوق جو ذکر کئے گئے قیدیوں کے اور جو قانون کی کتاب میں ہے اگر کوئی ملک اس پر عمل نہیں کرتا ہے یا جیلر اس پر عمل نہیں کرتا ہے تو کیا قیدی اس کا مطالبہ کرسکتے ہیں اور اگر وہ ملک یا جیلر اس کے اس مطالبے کی تکمیل نہیں کرتے تو وہ کیا کرسکتا ہے؟۔ اس کے لئے کیا وہ کوئی مقدمہ لڑسکتا ہے، یا کہاں جاسکتا ہے، اپنے مطالبات کی تکمیل کیسے کراسکتا ہے؟۔ اس کی بھی تھوڑی تشریح ہوجائے تو مناسب ہے۔

مفتی صباح الدین ملک قاسمی

چند باتیں اس سلسلہ میں عرض کرنی ہے، سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جو موضوع ہمیں دیا گیا ہے وہ تو تقریباً خالص نظری موضوع ہے، یعنی اس پہلو سے کہ اسلامی شریعت قیدیوں کے کیا حقوق اپنے پاس رکھتی ہے۔ظاہر ہے کہ اس سوال کا تعلق اسلامی مملکت سے ہے، اسلامی حکومت کہیں قائم ہو تو وہ اپنے قیدیوں کو یا حربی قیدیوں کو کیا حقوق دے گی؟ یہ خالص قرآن وسنت اور جو بھی ہمارے دلائل ادلہ شرعیہ ہے اس کے مطابق ہم کیا کریں گے یہ ایک پہلو ہے جس پر پورا سوالنامہ مرکوز ہے۔دوسری طرف عملی پہلو یہ ہے کہ جس کی طرف آپ چاہتے بھی ہیں، ہم بھی چاہتے ہیں، اس مسئلہ کا اور جس کی طرف ہمارے کشمیری بھائی نے اشارہ کیا ہے، تو اس کے لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ ظاہر ہے کہ جو کچھ بھی یہ ملک کررہا ہے ہمارے ساتھ،

مسلمانوں کے ساتھ یا عالمی سطح پر، عالمی طاقتیں ہمارے ساتھ کر رہی ہیں، تو ظاہر ہے کہ وہ جو کچھ کر رہی ہیں یا تو خلل ان کے یہاں ان کے قانون میں ہو، وہ قانون ہی غلط ہے جس کے تحت وہ ہمارے ساتھ غلط سلوک رہے ہیں یا دوسری بات یہ ہو کہ قانون تو صحیح ہے، عالمی بھی، ملکی بھی، لیکن عمل میں وہ غلط کر رہے ہیں۔ دونوں سطح پر ہم کو دیکھ کر اپنا ایک ضابطۂ عمل بنانا پڑے گا اور اگر ہم سمجھتے ہیں امپلیمنٹیشن میں وہاں قصور ہے، ملکی قانون میں ہم کو تبدیلی کرانے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن امپلیمنٹیشن میں قصور ہے تو پھر اس کا باضابطہ مطالعہ کر کے Line of Action یہاں کے دستور اور قانون کی روشنی میں طے کرنا پڑے گا اور جتنی تنظیمیں غیر مسلموں کی این.جی.اوز اس حق میں ہوں اور ہیں، ہمارے علم میں تو ان کو ساتھ لے کر کے پورا مومنٹ چلانا پڑے گا، انسانی بنیادوں پر یہاں کے قانون کے مطابق، یہ بات کہنے کے بعد ایک دوسری بات میں کہنا چاہتا ہوں، جو سوالات اٹھائے گئے ہیں، ظاہر ہے کہ اس عمل کا تعلق یعنی قیدیوں کے حقوق کا تعلق نظام حکومت سے ہے، نظام حکومت کی بنیادی ذمہ داری جو کسی بھی سول معاشرہ میں طے ہے، وہ یہ ہے کہ ہر فرد کے جو حقوق ہیں جو مانے ہوئے ہیں، ان حقوق کی حفاظت ہو، امن برقرار رہے، ظلم کسی پر نہ ہو، دست درازی کوئی نہ کرے، اسی بنیاد پر جرم کا مسئلہ آتا ہے۔ کرائم بھی دو طرح کے ہیں: یعنی ملکی قانون میں ایک سول ہے اور ایک کرمنل لاء کے تحت آتا ہے پینل کورٹ کے تحت، تو ان دونوں میں بھی بنیادی طور پر فرق ہوگا۔ جس کی طرف ابھی ہم تھوڑا سا اشارہ کریں گے، لیکن ہم یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ نظام حکومت جو بھی حکومت ہو اس کی ذمہ داری ہے امن قائم کرنا، ظلم سے روکنا اور اسی پہلو سے کسی بھی قیدی کو جس کے بارے میں دو شکلیں ہو سکتی ہیں یا تو اس پر شک ہو کہ وہ مجرم ہوگا، تو حوالات میں بند کیا گیا، یہاں تک کہ ثبوت، یعنی شواہد سے وہ ثابت ہو جائے، تو پھر اس کو اس کے جرم کی اصلی سزا دی جائے اور ہو سکتا ہے کہ اصلی سزا میں خود حبس کی سزا ہو تو یہ اس کی دو شقیں بنتی ہیں، لیکن دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے براءت کا۔ "الأصل براءة" ہر انسان کو یہ حق ہے کہ وہ بری ہے اور اس کا یہ حق ہر قیمت پر محفوظ ہونا چاہیے۔ حکومت اگر کسی کو شک کے دائرہ میں لا کر، کوئی جرم ہوتا ہے اور شک کے دائرہ میں لا کر کسی کے برأت اصلیہ کے حق سے محروم کرنا چاہتی ہے تو ظاہر ہے وہ اس کا حق ہے محروم نہیں کر سکتی ہے۔ اس کی دادرسی کرے یہ اس کا حق ہے، یعنی مظلوم کا اور ظالم کو ڈھونڈنا ظاہر ہے کہ ظلم ثابت نہیں تو شک آپ جس پر بھی کریں گے تو شک کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسرے کے حق کو مجروح کر دیں گے، یعنی کسی کو قیدی بنالیں گے اور ان کو فرض کر لیں گے تو دونوں کی رعایت کرنی پڑے گی، یہ قانونی نظریہ جو ہے عدل کا دونوں جانب سے ہے اور اس کا لحاظ کرنا ہوگا۔

تیسری بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قیدی یعنی ایک قید کی نوعیت زیر سماعت مدت کی ہے اور ایک قید کی نوعیت یہ ہے کہ ثابت شدہ مجرم کی ہے ان دونوں میں فرق ساتویں سوال میں آیا ہے، جبکہ یہ فرق ہر جگہ ملحوظ ہے، آپ نے جتنی گفتگو کی، اس سے پہلے سوالات اٹھائے گئے ہیں، ساری شقوں میں وہ فرق ملحوظ ہے، دونوں کی نوعیت پر بنیادی فرق ہے، مجھے حیرت ہے کہ بعض لوگوں نے دونوں کو دانستہ ایک کر دیا ہے، جس کو صرف شک کی بنیاد پر زیر حراست لیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ بھی اس کے ساتھ ایک طرح کا ظلم ہے، حقیقتاً اس پر کچھ ثابت نہیں ہے، لیکن اگر اس کو اس حق کے یعنی جو مظلوم ہے، اس کو حق دادرسی کی خاطر ایسا کرنا پڑ رہا ہے تو یہ بدرجۂ مجبوری ہے اس لئے اس میں وہ تمام حقوق اس کے ملحوظ رکھے جانے چاہئیں، جو کہ ایک عام انسان کو ایک آزاد شہری کو حاصل ہوتے ہیں، ہاں اگر حبس ثابت شدہ مجرم، یعنی فیصلہ ہو جانے کے بعد اگر حبس بطور سزا ہو تو اس کے حقوق مختلف ہوں گے، تمام تر مختلف ہوں گے اور ظاہر ہے کہ وہ حقوق اس کو حاصل نہیں ہوں گے، جو ایک عام آزاد غیر مجرم شہری کو حاصل ہوا کرتے ہیں۔

اور دوسری بات پھر آگے یہ کہ ہماری اس پوری گفتگو میں ضمانت والی بیل، بیل پر جو چھوٹتا ہے آدمی، ضمانت والی بات ابھی تک کہیں نہیں آئی ہے، ضمانت والی بات میرے علم میں جہاں تک ہے وہ ہمارے یہاں پر جو متخصصین ہیں، جواب دیں گے، اگر میری معلومات غلط ہیں۔ میرے علم میں یہ ہے کہ جیسا کہ خیال ہوتا ہے کہ بیل کا جو پہلو آتا ہے وہ ثابت شدہ مجرم کے لیے نہیں ہوتا۔ بلکہ زیر سماعت حوالات میں جب تک رہتا ہے چونکہ وہ احتیاطی قید اور گرفتاری ہے اس میں بیل پر ضمانت کی ایک شق رکھی گئی ہے، ثابت شدہ مجرم کو غالباً بیل پر ضمانت کا حق حاصل نہیں ہوتا ہے۔

ایک بات یہ ہے کہ جیسا کہ ہم سب واقف ہیں۔ "الحدود تندرأ بالشبہات یا العقوبات تندرأ بالشبہات" تو ظاہر ہے کہ شک اور شبہ جو ہے وہ تو درأ حدود کا باعث بنتا ہے، شک اور شبہ کسی کو مجرم بنانے کے لیے اور اس کے حقوق پر دست درازی بنانے کا کوئی سبب نہیں بن سکتا، شک کا فائدہ

مجرم کو مل جاتا ہے، شک کا فائدہ ایک بری انسان کو مجرم ثابت کرنے کے لیے نہیں مل سکتا، تو ہمارا اصول تو یہ کہتا ہے۔

دوسری بات قیدیوں سے سچی بات اگلوانے والی بات عارض مسئلہ نے اس کو صرف ایک شق میں محصور کر دیا ہے۔

ایک آخری بات وہ یہ ہے کہ ابو غریب اور گوانتاناموبے کے بارے میں، اس کے بارے میں بہت شور ہے حالانکہ اعتراض یہ ہے کہ جو بین الاقوامی قانون کی رو سے جو قیدیوں کو حقوق ملنے چاہئیں ان کی خلاف ورزی کی جارہی ہے، اس وجہ سے اس پر اعتراض آتا ہے، ورنہ اگر وہ ثابت ہو جائے، امریکن یعنی قانون عالمی کے سامنے اگر کوئی بھی افغانستان کا یا جس پر القاعدہ سے تعلق کا الزام ہے اگر وہ امریکن گورنمنٹ کے سامنے ثابت ہو جائے تو سب اس کے قانون کی رو سے جائز ہو جائے گا اور ہمارا اعتراض یہ ہے کہ بنیادی طور پر جن لوگوں کو وہاں رکھا گیا، چھ چھ سال اور اس سے بھی زیادہ حقیقتاً ان کو دفاع کا حق نہیں دیا گیا جو خود ان کے قانون میں موجود ہے، جو خود عالمی قانون اور جنیوا قانون میں موجود ہے تو اعتراض کا نقطہ وہ ہے نہ کہ اعتراض کا نقطہ دوسرا۔

تمت

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ
جدید فقہی مباحث

مشترکہ و جداگانہ
خاندانی نظام

(قرآن سنت کی روشنی میں)

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے بیسویں فقہی سمینار منعقدہ مورخہ ۵ تا ۷ / مارچ ۲۰۱۱ء کو
رامپور یوپی میں پیش کئے گئے علمی، فقہی اور تحقیقی مقالات ومناقشات کا مجموعہ

تحقیقاتِ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارالاشاعت
اُردو بازار ٥ ایم اے جناح روڈ ٥ کراچی پاکستان

پیش لفظ

کہا جاتا ہے کہ انسان سماجی حیوان ہے، یعنی وہ تنہا زندگی نہیں گذار سکتا، اسے ایک بہتر زندگی گذارنے کے لئے خاندان کی ضرورت ہے، وہ تین خاندانوں کے درمیان رہتا ہے، دادھیال، نانیہال اور سسرال، دادھیال اور نانیہال والدین کے ذریعہ وجود میں آتا ہے اور سسرال خود اس کے ذریعہ، انسان اس خوشی کو ادھوری اور ناتمام سمجھتا ہے، جس میں اس کا خاندان شریک نہ ہو، اسی طرح خاندان کی دلداری اور تسلی کے بغیر غم وحزن کا احساس بڑھ جاتا ہے اور رائی کے برابر مصیبت بھی پہاڑ نظر آتی ہے؛ اس لئے معتدل، خوشگوار اور پُرسکون زندگی کے لئے خاندان کا وجود ناگزیر ہے اور انسان ہمیشہ سے خاندانی نظام سے مربوط رہا ہے۔

خاندان چھوٹا بھی ہوتا ہے اور بڑا بھی، چھوٹا خاندان وہ ہے، جو شوہر وبیوی اور ان کے غیر شادی شدہ لڑکوں اور لڑکیوں پر مشتمل ہو، اس سے تو کوئی مفر ہی نہیں ہے؛ لیکن مسئلہ بڑے خاندان کا ہے، جس میں والدین، بھائی، بہن بھی شامل ہیں اور مل جل کر زندگی گذارتے ہیں، سوال یہ ہے کہ بڑے خاندان کو مشترک طور پر زندگی گذارنا چاہئے، یا اس کی ہر اکائی کو الگ الگ؟...... کچھ فوائد مشترکہ طور پر زندگی گذارنے میں ہیں؛ کیونکہ اس میں بوڑھے، معذور اور نابالغ لوگوں کے علاوہ مطلقہ اور بیوہ عورتوں کی پرورش آسان ہوجاتی ہے اور ان کی نگہداشت دشوار نہیں ہوتی؛ اس کے ساتھ ساتھ بعض دشواریاں بھی پیدا ہوتی ہیں، جیسے باہمی آویزشیں، رقابتیں، اندر ہی اندر سلگتی ہوئی نفرت کی آگ، شرعی اصول کے مطابق پردہ کی رعایت کرنے میں دشواری وغیرہ، جداگانہ خاندان میں یہ مفاسد پیدا نہیں ہوتے؛ لیکن جیسا کہ ذکر کیا گیا جسمانی اور مالی اعتبار سے مجبور افرادِ خاندان کی کفالت دشوار ہوجاتی ہے۔

شریعت میں دونوں طرح کے نظام کی نظیریں موجود ہیں، علماء وارباب افتاء کا کام ہے کہ وہ حالات کے لحاظ سے اسے منطبق کریں اور شریعت کے مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بھی فیصلہ کریں کہ کب کونسا نظام بہتر ہوگا؟ نیز اس نظام پر عمل کرنے کی وجہ سے جو مفاسد پیدا ہوں گے، ان کی تلافی کس طرح ہوگی؟...... موجودہ دور میں اس موضوع کی اہمیت بے حد بڑھ گئی ہے، دیہاتوں سے شہر کی طرف لوگوں کی آمد، بلندی کو چھوتے ہوئے زندگی کے معیارات، اس کے لئے زیادہ سے زیادہ افراد کا کسبِ معاش میں مشغول ہونا اور مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا بھی ملازمت کرنا، یہ وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے خاندان بٹتا جارہا ہے اور جداگانہ طریقہ پر زندگی گذارنے کا مزاج فروغ پارہا ہے، اس مزاج کی وجہ سے خودغرضی بھی پیدا ہورہی ہے، ان حالات میں اس عنوان کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے؛ چنانچہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے اس موضوع پر ایک مجلسِ مذاکرہ حیدرآباد میں بھی رکھی تھی، جس میں فکری پہلو پر زیادہ توجہ دی گئی تھی؛ لیکن اس موضوع کی اہمیت کا تقاضہ تھا کہ اس پر زیادہ وسعت کے ساتھ فقہی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے؛ لہٰذا جب رام پور میں اکیڈمی کا بیسواں فقہی سمینار طے پایا، تو اس عنوان کو بھی شامل رکھا گیا، اور شرکاءِ سمینار نے اس سلسلہ میں بڑی مفید تحریریں پیش کیں۔

چنانچہ اس موضوع پر آنے والے مقالات، سمینار میں ہونے والے مناقشات، موضوع سے متعلق پیش کئے جانے والے عرضِ مسئلہ اور تجاویز کا یہ مجموعہ قارئین کے لئے پیشِ خدمت ہے، جس کو عزیز گرامی مفتی احمد نادر قاسمی سلمہ اللہ تعالیٰ نے محنت اور خوش سلیقگی کے ساتھ مرتب کیا ہے، فجزاہ اللہ خیر الجزاء، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو قبول فرمائے۔ واللہ ہو المستعان۔

خالد سیف اللہ رحمانی (خادم اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا)

۱۴ر محرم الحرام ۱۴۳۳ھ/ ۱۰ر دسمبر ۲۰۱۱ء

پہلا باب تمہیدی امور

سوالنامہ

مشترکہ اور جداگانہ خاندانی نظام

کہا جاتا ہے کہ انسان سماجی حیوان ہے، یعنی انسان تنہا زندگی نہیں گزار سکتا، اسے بہت سے لوگوں کی رفاقت کی ضرورت ہوتی ہے، رفاقت کے مختصر دائرہ سے...... جو قریبی رشتہ داروں پر مشتمل ہو...... خاندان بنتا ہے، اور وسیع دائرہ سے جس میں رشتہ دار، ہمسائے، دوست واحباب اور ایک جگہ رہنے والے سارے لوگ شامل ہوں ''سماج'' وجود میں آتا ہے، اسلام میں بھی خاندان کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے خاندان (شعوب وقبائل) کو انسان پر اپنی نعمتوں میں شمار کیا ہے، غرض کہ انسان کی اپنی انفرادیت بھی ہے اور وہ ایک اجتماعی ڈھانچہ کا حصہ بھی ہے۔

زندگی گزارنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ایک مختصر خاندان کے تمام افراد- جیسے اس کے والدین، بیوی، بچے اور بھائی، بہن- ایک ساتھ رہیں، دوسری صورت یہ ہے کہ انسان صرف اپنے بال بچوں کے ساتھ رہے یا زیادہ سے زیادہ اپنے والدین کو اپنے ساتھ رکھے، معاشرت کے ان دونوں طریقوں میں بعض محاسن بھی ہیں اور بعض مفاسد بھی، مشترکہ خاندانی نظام میں خاندان کے کمزور لوگوں کی مدد ہوتی ہے، بیوہ، مطلقہ عورتوں اور یتیم لڑکوں اور لڑکیوں کی بہتر طور پر پرورش ہوجاتی ہے، بوڑھے ماں باپ کو سہارا حاصل ہوتا ہے، جبکہ اس سے بعض اوقات باہمی نزاع بھی اٹھ کھڑی ہوتی ہے، چچازاد اور پھوپھی زاد بھائی بہنوں کے درمیان پردہ کا اہتمام دشوار ہوجاتا ہے، دوسری طرف علاحدہ خاندانی نظام میں انسان کے اندر اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرکے اپنی ضرورتوں کو خود پوری کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، دیر تک تعلقات میں ہم آہنگی باقی رہتی ہے، مگر اس کا منفی پہلو یہ ہے کہ بوڑھے اور خدمت کے محتاج ماں باپ اور خاندان کے بزرگ حضرات تنہا پڑ جاتے ہیں، یتیم بچے اور مطلقہ عورتوں کا بعض دفعہ کوئی پرسان حال نہیں رہتا۔

دیہات سے شہر کی طرف نقل مکانی، الگ رہنے کا بڑھتا ہوا مزاج اور مکانات کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے اب مشترکہ خاندان کی بجائے جداگانہ خاندان کا رجحان بڑھتا جارہا ہے، اس رجحان کی وجہ سے مغربی ملکوں میں بوڑھے لوگوں کے لئے مستقل ہاسٹل تعمیر ہورہے ہیں؛ بلکہ اب ہندوستان کے بڑے شہروں میں بھی اس کی شروعات ہوچکی ہے، اس لئے یہ اس عہد کا ایک اہم اور ابھرتا ہوا سوال ہے، اور اس اہم سماجی مسئلہ پر شریعت کی ہدایات اور اس کے مقاصد کی روشنی میں غور کرنے کی ضرورت ہے، اسی پس منظر میں حسب ذیل سوالات پیش خدمت ہیں:

۱۔ اسلام کی نظر میں مشترکہ خاندانی نظام بہتر ہے یا جداگانہ زندگی بسر کرنے کا طریقہ؟

۲۔ اگر مشترکہ خاندان ہو اور افراد خاندان کی ضروریات کے لئے سب مل کر خرچ دیں، کسی کے بچے زیادہ ہوں اور کسی کے کم ہوں، تو کیا ان سب پر برابر اخراجات عائد کئے جائیں گے یا ان کے بچوں کی تعداد کے لحاظ سے؟

۳۔ اسی صورت میں اگر مختلف بھائیوں نے مل کر اپنے والد یا کسی بھائی کے پاس آمدنی جمع کی اور گھر کے اخراجات سے بچی ہوئی رقم سے کوئی چیز خریدی گئی تو اس میں سبھوں کا حصہ برابر ہوگا یا ہر ایک کی آمدنی کے لحاظ سے ہوگا؟

۴۔ اگر تین بھائی ہیں، دو بھائی اپنی پوری تنخواہ مثلاً دس دس ہزار روپے گھر میں دے دیتے ہیں اور ایک بھائی بیس ہزار روپیہ کماتا ہے، وہ بھی دس ہزار گھر میں دیتا ہے اور دس ہزار الگ بچا کر رکھتا ہے، تو وہ بچی ہوئی رقم صرف اس کی ملکیت ہوگی یا تمام بھائیوں کی؟

۵۔ اگر خاندان کے کچھ افراد کماتے ہیں اور کچھ گھر کے کام دیکھتے ہیں اور اس طرح گھر کا کام چلتا ہے تو کیا کمانے والے حضرات کی آمدنی میں کام کرنے والے حضرات بھی برابر کے حقدار ہوں گے؟

۶۔ والدین زندگی بھر بچوں کی خدمت بھی کرتے ہیں اور کفالت بھی، اور بڑھاپے میں انہیں خدمت اور کفالت کی ضرورت ہوتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ والدین کی خدمت وکفالت بیٹوں پر واجب ہے یا بیٹیوں پر بھی، اور اس سلسلہ میں بہو کی ذمہ داری کیا ہے؟ خاص کر جب بیٹیاں اپنے سسرال چلی جائیں اور ماں کو اپنی ضروریات کے لئے تعاون کی ضرورت ہو اور وہ تعاون ایسا ہو جس کو بیٹا خود انجام نہ دے سکتا ہو تو بہو پر اس خدمت کو بجالانا واجب ہوگا یا نہیں؟

۷۔ مشترک خاندان میں بہت سی دفعہ چچازاد بھائی بہن یا اس طرح کے دوسرے قریبی رشتہ داروں کا ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہوتا رہتا ہے اور ایک ہی گھر میں- خاص کر جب کہ وہ تنگ بھی ہو- رہنے کے باوجود ایک دوسرے سے مکمل پردہ نہیں ہو پاتا، ایسی صورتحال میں پردہ کے احکام کیا ہوں گے؟

☆☆☆

اکیڈمی کا فیصلہ

مشترکہ وجداگانہ خاندانی نظام:

مشترکہ اور جداگانہ خاندانی نظام سے متعلق مقالات، ان کی تلخیص اور عرض کو سامنے رکھ کر بحث ومباحثہ کے بعد درج ذیل تجاویز منظور کی گئیں:

۱۔ مشترکہ خاندانی نظام ہو یا جداگانہ، دونوں کا ثبوت عہد رسالت اور عہد صحابہ سے ملتا ہے؛ لہٰذا دونوں ہی نظام فی نفسہ جائز و درست ہیں۔ جہاں جس نظام میں شریعت کے حدود وقوانین کی رعایت و پاسداری اور والدین ودیگر زیر کفالت افراد اور معذورین کے حقوق کی حفاظت ہو سکے اور فتنہ و نزاع سے بچا جا سکے اس نظام پر عمل کرنا بہتر ہوگا، کسی ایک نظام کی تحدید نہیں کی جاسکتی ہے۔ البتہ یہ اجلاس تمام مسلمانوں سے یہ اپیل کرتا ہے کہ مورث کے انتقال کے بعد جتنی جلدی ممکن ہو ترکہ کی تقسیم کر کے تمام شرعی وارثین کو ان کا متعینہ حصہ دے دیں، تا کہ ایک دوسرے کے حقوق کا غلط استعمال نہ ہو اور یہ عمل باہمی نزاع اور نفرت وعداوت کا سبب نہ بن جائے۔ یہ اجلاس خاص طور سے عورتوں کے حقوق کی ادائیگی کی طرف مسلمانوں کی توجہ کو مبذول کرانا چاہتا ہے، کیونکہ اس میں بہت زیادہ کوتاہیاں پائی جاتی ہیں۔

۲۔ مشترکہ خاندانی نظام کی بنیاد ایثار وقربانی اور باہمی تعاون پر ہے، ورنہ یہ نظام قائم نہیں رہ سکتا ہے، نیز عدل وانصاف کو قائم رکھنا بھی ضروری ہے، لہٰذا اگر خاندان کے سبھی افراد صاحب استطاعت ہوں تو زیر کفالت افراد کی تعداد کے اعتبار سے اخراجات دیں گے، اور اگر کوئی مالی اعتبار سے کمزور ہو تو ہر شخص اپنی آمدنی کے تناسب سے اخراجات برداشت کرے گا، البتہ خاندان کے سبھی حضرات کو چاہئے کہ جائز ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ آمدنی حاصل کرنے کی کوشش کریں، تا کہ کمانے والوں پر بوجھ نہ پڑے۔

۳۔ جب آمد وخرچ دونوں مشترک ہوں تو اخراجات کے بعد بچی ہوئی رقم سے خریدی گئی چیز میں سبھی افراد برابر کے حقدار ہوں گے۔

۴۔ جب سبھی بھائیوں کا ذریعہ آمدنی الگ الگ ہو اور سبھوں نے برابر برابر رقم جمع کی اور ایک بھائی نے اپنی زائد آمدنی کو بچا کر اپنے پاس رکھا تو یہ بھائی اپنی زائد آمدنی کا خود مالک ہوگا، دوسرے بھائی اس کے حقدار نہیں ہوں گے۔

۵۔الف: اگر خاندان کے افراد کسی معاہدہ کے تحت کام کرتے ہوں تو جو بھی آمدنی ہوگی وہ خاندان کے سبھی افراد کے درمیان حسب معاہدہ تقسیم ہوگی، خواہ وہ گھر پر کام کرتے ہوں یا باہر۔

ب: اگر کاروبار ایک ہی ہو، کچھ لوگ گھر پر کام کرتے ہوں اور کچھ لوگ گھر کے باہر تو اس صورت میں کل آمدنی سبھی افراد کے درمیان برابر برابر تقسیم ہوگی۔

ج: اگر الگ الگ کاروبار ہو اور ان کے درمیان کسی طرح کا معاہدہ نہ ہو تو باہر کمانے والوں کی آمدنی میں گھر کا کام دیکھنے والے حقدار نہیں ہوں گے۔

۶۔ والدین کی خدمت وکفالت لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں پر بھی حسب استطاعت واجب ہے۔ اگر ماں کو ایسی خدمت کی ضرورت ہو جس کو کوئی عورت ہی انجام دے سکتی ہے اور بہو کے علاوہ کوئی دوسری قریبی عورت خدمت کرنے والی نہ ہو، نیز ماں مجبور ہو، خود سے وہ کام انجام دینے کے لائق نہ ہو تو ایسی صورت میں بہو پر ساس کی خدمت واجب ہوگی۔

۷۔ مشترک خاندان میں بھی شرعی پردہ کا اہتمام کیا جائے، کسی غیر محرم کے ساتھ تنہائی میں ملنے سے، اور ہنسی مذاق نیز غیر ضروری گفتگو سے اجتناب کرنا لازم ہے، البتہ احتیاط کے باوجود اگر سامنا ہو جائے اور ہر طرح کے فتنہ سے بچنے کی کوشش ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۸۔ سماج کے معمر اور سن رسیدہ افراد انسانی سماج کے لئے بیش قیمت سرمایہ ہیں، ان کی راحت رسانی اور خدمت انسانی سماج کی ذمہ داری ہے، خصوصاً اولاد اور افراد خاندان کی ذمہ داری ہے کہ بوڑھوں کی خدمت کریں، ان کی عزت وتکریم کریں، اور انہیں اپنے ساتھ محبت اور الفت کے ساتھ رکھیں اور ان کی خدمت کو اپنے لئے سعادت سمجھیں۔

☆☆☆

تلخیص مقالہ جات:

اسلام کا خاندانی نظام

مفتی احمد نادر القاسمی

اسلام کے خاندانی نظام میں یہ بات بنیادی طور پر پیش نظر رکھی گئی ہے کہ صلہ رحمی بھی برقرار رہے اور ایک دوسرے کے مادی اور اخلاقی حقوق بھی ادا ہوتے رہیں، اور کسی طرح بھی قائم شدہ رشتہ داریوں میں دراڑ اور شگاف نہ آئے، لہٰذا یہ بات اس پس منظر میں کہی جاسکتی ہے کہ اسلام ایسا نظام چاہتا ہے جس میں: ۱۔محرم اور غیر محرم کے درمیان شرعی حدود بھی قائم رہے اور اختلاط نہ ہو، ۲۔جس سے جس کے حقوق وابستہ ہیں وہ بھی بحسن وخوبی ادا ہوتے رہیں، ۳۔اہل قرابت، ماں باپ اور بھائی بہن کے درمیان کسی بھی طرح نااتفاقی نہ پیدا ہو۔

سماجی حقائق:...... یہ مشاہدہ ہے کہ مشترکہ خاندان میں سماجی مسائل اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب نامحرم رشتہ داروں کا اندرون خانہ کثرت سے آنا جانا، رہائش پذیر ہونا، اور پھر خواتین کا رفتہ رفتہ بے پردگی کے ماحول میں ڈھلتا چلا جانا، عام ہوجاتا ہے، اور آدمی رشتہ داری اور قرابت داری نبھانے کی حمیت میں شریعت کی قائم کردہ حدوں کو توڑتے چلے جانے کا عادہ ہوجاتا ہے، شریعت نے بنیادی طور پر ایسے تمام مقامات جہاں شخصی طور پر مرد وعورت کی عزت وشرافت کو ٹھیس پہنچ سکتی ہو، یا ناشائستہ ماحول پیدا ہوسکتا ہو، یا خاندانی یا اجتماعی زندگی میں ناروا تلخیاں در آسکتی ہوں، وہاں احتیاطی تدابیر اختیار کئے جانے پر زور دیا ہے، اور کتاب وسنت میں کافی مقدار میں نصوص اور ہدایات اس سلسلہ میں موجود ہیں۔

حقوق کی ادائیگی کا مسئلہ:...... مشترکہ اور علاحدہ خاندانی نظام کی بحث حقوق کی ادائیگی سے بھی جڑی ہوئی ہے، عام طور سے والدین جب بچوں کی شادی کی ذمہ داری سے فارغ ہوجاتے ہیں اور لڑکے اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہنے لگتے ہیں تو پھر والدین کے جانی ومالی حقوق میں دانستہ اور نادانستہ کمی آنے لگتی ہے، اور پھر جانبین سے شکایات کے سلسلے بھی شروع ہوجاتے ہیں۔

اہل قرابت، بھائی بہن اور والدین کے ساتھ انصاف:

عام طور سے یہ بھی ہوتا ہے کہ شادی کے بعد دیگر قرابت داروں، یتیم ومسکین خواہر وبرادران کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہونے لگتی ہے اور ایک طرف بیوی بچوں کے حقوق اور دوسری طرف اہل قرابت کے مالی مطالبے اور اس پر معاشی کمزوری کا دباؤ، اس صورتحال میں دن بدن مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں اور گھریلو ماحول پراگندہ ہونا شروع ہوجاتا ہے، اور یہ کبھی انسان کے علاحدہ رہنے کے سبب بھی ہوتا ہے، اور کبھی مشترک رہنے کی شکل میں بھی۔

معاشرہ کی ان گوں ناگوں پیچیدگیوں، حقائق پر مبنی والدین اور اہل قرابت کی حق تلفیوں اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سماجی ومعاشرتی عدم توازن کے سدباب اور عدل وانصاف پر مبنی اسلامی معاشرہ تشکیل دینے کی غرض سے اسلامک فقہ اکیڈمی نے اپنے بیسویں فقہی سمینار کا ایک اہم موضوع ''مشترکہ اور جداگانہ خاندانی نظام'' بھی رکھا ہے، تاکہ اسلام کے خاندانی ومعاشرتی نظام کی صحیح تصویر سامنے آسکے، اسلام کا تصور خاندان واضح ہوسکے اور مسلم معاشرہ میں توازن بھی بحال ہوسکے، اس موضوع سے متعلق اکیڈمی کے سوالنامے میں سات سوالات قائم کئے گئے ہیں، ان سوالات کے جو ۲۴ جوابات ومقالات تحریر لکھے جانے تک اکیڈمی کو موصول ہوئے، ان ۲۴ مقالہ نگار حضرات ومفتیان اور ماہرین قوانین اسلامی کی آراء، دلائل اور تجزیہ تلخیص کی شکل میں پیش کیا جارہا ہے۔

سوال نمبر ۱:۱۔اسلام کی نظر میں مشترکہ خاندانی نظام بہتر ہے، یا جداگانہ زندگی بسر کرنے کا طریقہ؟

اس سوال کے جواب میں اکثر، یعنی ۱۹ مقالہ نگار حضرات نے جداگانہ خاندان کے بہتر ہونے کی بات کہی ہے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مولانا محمد یاسر قاسمی، مفتی رضوان الحسن مظاہری، مولانا محمد آصف یاسین، مولانا بہاء الدین ندوی، مفتی عبدالقیوم پالنپوری، مفتی صادق محی الدین، مفتی عبداللطیف پالنپوری، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا محمد شاجہاں ندوی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا قاضی ذکاء اللہ شبلی، مولانا اختر امام عادل

قاسمی، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا محمد فخر عالم نعمانی، مفتی ارشد فاروقی قاسمی، مفتی سعید الرحمن پٹنہ، اور مفتی معز الدین قاسمی۔

مذکورہ حضرات نے بنیادی طور پر مشترکہ خاندان کی وجہ سے معاشرے میں رونما ہونے والی معاشرتی خرابیوں، محرم اور غیر محرم میں اختلاط، گھر کی ایک تا چند خواتین پر مشترکہ خاندان میں افراد کی زیادتی کی وجہ سے بے جا کام کا بوجھ، کتاب وسنت میں مشترکہ خاندان کے بارے میں کوئی صراحت موجود نہ ہونے، افراد خاندان کے درمیان ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے نفرت ونزاع اور ناچاقیوں جیسے حالات کے پیدا ہونے اور پھر اس کے نتیجہ میں خاندانوں کے انتشار کا شکار ہو جانے کو اس کی اساس قرار دیا ہے، اور اس موقف کی تائید وتوثیق میں مذکورہ وجوہات کے ساتھ ساتھ نقلی وعقلی دلائل بھی دیئے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

آیات:

۱۔ ''واعبدوا اللّٰہ ولا تشرکوا بہ شیئا وبالوالدین إحسانا وبذی القربی والیتامی والمساکین والجار ذی القربی والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبیل وما ملکت أیمانکم... إن اللّٰہ لا یحب من کان مختالا فخورا''۔ (سورۂ نساء:۳۶)

(اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک رکھو اور قرابت داروں کے ساتھ، اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ........ قطعاً اللہ تعالیٰ ایسوں کو دوست نہیں رکھتا جو خود بیں ہیں، فخار ہیں)۔ (ماخوذ از مقالہ مفتی معز الدین قاسمی)

مفتی معز الدین قاسمی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے: ''ہم صرف اس وجہ سے مشترکہ خاندان کو برداشت کریں یا اس کی ترغیب دیں کہ سب کے الگ الگ زندگی گذارنے میں والدین کا کیا ہوگا؟ یا کوئی معذور بھائی بہن ہو تو وہ کہاں رہے گا، یا بیوہ، مطلقہ عورتوں اور یتیم لڑکوں اور لڑکیوں کی پرورش کون کرے گا یہ کوئی قرین قیاس نہیں ہے''۔ (دیکھئے: مقالہ مفتی معز الدین قاسمی اورنگ آباد)

۲۔ مشترکہ خاندان کا تصور صرف سماجی دباؤ اور ناانصافیوں پر مبنی رواج کا نتیجہ ہے، جس کی حیثیت: ''ما وجدنا علیہ آبائنا'' (سورہ مائدہ:۱۰۴) سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ (مقالہ مذکور)

۳۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''یاأیہا الذین آمنوا لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتی تستأنسوا وتسلموا علی أہلہا''۔ (سورۂ نور:۲۷)

(اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے علاوہ دوسرے کے گھروں میں جب تک اجازت نہ لے لو اور اس گھر میں رہنے والوں کو سلام نہ کر لو مت داخل ہو)۔

۴۔ ''وإذا بلغ الأطفال منکم الحلم فلیستأذنوا کما استأذن الذین من قبلہم کذلک یبین اللّٰہ لکم آیاتہ. واللّٰہ علیم حکیم''۔ (سورۂ نور:۵۹)

(اور جب تمہارے بچے بلوغت کو پہنچ جائیں تو چاہئے کہ جس طرح ان سے بڑے اجازت لے کر داخل ہوا کرتے تھے اسی طرح وہ بھی اجازت لے کر داخل ہوں، اس طرح اللہ تعالیٰ واضح انداز میں احکام بیان کرتا ہے، اور وہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے)۔

۵۔ ''وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاہلیۃ الأولی''۔ (سورۂ احزاب:۳۳)

(تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور زمانہ جاہلیت کے دستور کی طرح مت پھرو)۔

۶۔ ''واذکرن ما یتلی فی بیوتکن من آیات اللّٰہ والحکمۃ''۔ (سورۂ احزاب:۳۴)

(اور تم ان آیات الٰہیہ اور اس کے علم کو یاد رکھو جس کا تمہارے گھروں میں چرچہ ہے)۔

اپنے گھروں میں قرار اور ذکر علاحدہ خاندان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۷۔ ''وأسکنوہن من حیث سکنتم من وجدکم''۔ (سورۂ طلاق:۶)

(اور ان مطلقات کو رہنے کا مکان دو اپنی حیثیت کے مطابق جہاں تم رہتے ہو)۔

۸۔ ''وعاشروہن بالمعروف، فإن کرہتموہن فعسی أن تکرہوا شیئاً ویجعل اللّٰہ فیہ خیراً کثیراً''۔ (سورۂ نساء:۱۹)

(اور بیبیوں کے ساتھ خوش اسلوبی سے گذر بسر کیا کرو، اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو عجب کیا کہ تم ایک شیٔ کو ناپسند کرو اور اللہ اس کے اندر کوئی بڑی بھلائی رکھ دے)۔

۹۔ "یأیها الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شهداء لله ولو علی أنفسکم أو الوالدین والأقربین. إن یکن غنیا أو فقیرا فالله أولی بهما. فلا تتبعوا الهوی أن تعدلوا. فإن تلؤا أو تعرضوا. فان الله کان بما تعملون خبیرا"۔ (سورۂ نساء:۱۳۵)

(اے ایمان والو انصاف پر خوب قائم رہنے والے، اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے رہو، چاہے وہ تمہارے یا تمہارے والدین اور عزیزوں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، وہ امیر ہو یا مفلس، اللہ بہر حال دونوں سے زیادہ حقدار ہے، تو خواہش نفس کی پیروی نہ کرنا کہ حق سے ہٹ جاؤ، اور اگر تم کجی کروگے، یا پہلو تہی اختیار کروگے تو جو تم کر رہے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے)۔

۱۰۔ "لیس علی الأعمی حرج ولا علی الأعرج حرج ولا علی المریض حرج ولا علی أنفسکم أن تأکلوا من بیوتکم أو بیوت آبائکم أو بیوت أمهاتکم أو بیوت إخوانکم أو بیوت أخواتکم أو بیوت أعمامکم أو بیوت عماتکم أو بیوت اخوالکم أو بیوت خالاتکم أو ماملکتم مفاتحه أو صدیقکم"(سورۂ نور:۶۱)۔ (دیکھئے: مقالہ مولانا ولی اللہ مجید قاسمی)

(نہ اندھے آدمی پر الزام ہے، نہ لنگڑے آدمی پر الزام ہے، اور نہ بیمار آدمی پر الزام ہے اور نہ خود تم پر اس بات میں کہ تم اپنے گھروں میں سے کھانا کھالو یا اپنے باپ کے گھروں سے، یا اپنی ماؤں کے گھروں سے، یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے، یا اپنی بیویوں کے گھروں سے، یا اپنے چچاؤوں کے گھروں سے، یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے، یا ان گھروں سے جن کی کنجیاں تمہارے اختیار میں ہوں، یا اپنے دوستوں کے گھروں سے)۔

۱۱۔ ''قل للمؤمنین یغضوا من أبصارهم ویحفظوا فروجهم ذلك أزکی لهم''(سورۂ نور:۳۰)۔(مقالہ مولانا اختر امام عادل)

(آپ ایمان والوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں، اور اپنی اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے حق میں زیادہ صفائی کی بات ہے)۔

۱۲۔ "وقل للمؤمنات یغضضن من أبصارهن ویحفظن فروجهن ولا یبدین زینتهن إلا ما ظهر منها ولیضربن بخمرهن علی جیوبهن ولا یبدین زینتهن إلا لبعولتهن أو آبائهن أو آباء بعولتهن أو أبنائهن أو ابناء بعولتهن أو اخوانهن أو بنی إخوانهن أو بنی اخواتهن أو نسائهن...الخ"(سورۂ نور:۳۱)۔ (مقالہ محمد یاسر قاسمی)

(اور آپ کہہ دیجئے ایمان والیوں سے کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا سنگار ظاہر نہ ہونے دیں، مگر ہاں جو اس میں سے کھلا ہی رہتا ہے، اور اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں اور اپنی زینت ظاہر نہ ہونے دیں، مگر ہاں اپنے شوہر پر اور اپنے شوہر کے باپ پر اور اپنے بیٹوں پر اور اپنے شوہر کے بیٹوں پر اور اپنے بھائیوں پر اور اپنے بھائیوں کے لڑکوں پر یا اپنی بہنوں کے لڑکوں پر اور اپنی ہم مذہب عورتوں پر)۔

احادیث:

۱۔ ''عن المسور بن مخرمة أن رسول الله ﷺ قال: فاطمة بضعة منی فمن أغضبها، فقد أغضبنی''(الصحیح البخاری مناقب فاطمه ۱۔۵۳۲)

(فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے، جس نے اس سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھا)، اسقدر محبت کے باوجود حضور ﷺ نے ان کو علاحدہ رکھا۔

۲۔ ''عن عامر بن ربیعة قال رسول الله ﷺ: لا یخلون رجل بامرأة قال: ثالثها الشیطان''(مشکوۃ باب النظر إلی)

(کوئی بھی شخص ہرگز کسی عورت کے ساتھ تنہائی میں نہ ہو، (پھر فرمایا ہے): تیسرا اس کے ساتھ شیطان ہوتا ہے)۔

۳۔ ''عن عائشة سئلت أی الناس کان أحب إلی رسول الله ﷺ قالت: فاطمة''(السنن للترمذی باب ماجاء فی فضل فاطمة ۲۔۲۲۶) (مذکورہ بالا آیات وروایات مفتی سعید الرحمن قاسمی کے مقالہ سے ماخوذ ہیں)۔

(حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا گیا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سب سے محبوب کون شخص تھا؟ تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا: فاطمہ)۔

۴۔ ''لا يجمع بين المرأة وعمتها ولا بين المرأة وخالتها'' (بخاری حدیث نمبر:۵۱۹، مسلم حدیث نمبر ۱۴۰۸) (دیکھئے: مقالہ مولانا محمد شاہجہاں ندوی)

(ارشاد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ کوئی شخص کسی عورت کو اس کی پھوپھی اور اس کی خالہ کے درمیان نکاح میں جمع نہ کرے)۔

عبارات فقہاء:

۱۔ ''وعلى الزوج أن يسكنها في دار مفردة ليس فيها أحد من أهله إلا أن تختار'' (ہدایہ باب النفقہ ۲۔ ۴۴۴)

۲۔ ''ولو أراد الزوج أن يسكنها مع ضرتها أو مع أحمائها كأم الزوج وأخته وبنته من غيرها وأقاربه، فأبت عليه أن يسكنها في منزل مفرد، لأنهن ربما يؤذينها ويضرون بها في المساكنة، وإبائها دليل الأذى والضرر، ولأنه يحتاج إلى أن يجامعها ويباشرها في أي وقت يتفق، ولا يمكنه ذلك إذا كان معها ثالث، حتى لو كان في الدار بيوت ففرغ لها بيتا وجعل لبيتها غلقا على حدة'' (بدائع الصنائع للکاسانی ۳۔ ۴۲۸)

(مقالہ مفتی ارشد فاروقی، محمد فخر عالم نعمانی، مفتی صادق محی الدین، مولانا اختر امام عادل)۔

۳۔ ''السكنى للزوجة على زوجها واجبة، وهذا الحكم متفق عليه بين الفقهاء. لأن الله تعالى جعل للمطلقة الرجعية السكنى على زوجها قال تعالى: ''واسكنوهن من حيث سكنتم من وجدكم''... ولأن الله تعالى أوجب المعاشرة بين الأزواج بالمعروف، قال تعالى: ''وعاشروهن بالمعروف'' من المعروف المامور به أن يسكنها في سكن تأمن فيه على نفسها ومالها... فلذلك كانت السكن حقا لها على زوجها وهو حق ثابت بإجماع أهل العلم'' (موسوعہ فقہیہ ۲۵۔ ۱۰۸، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷۔ ۸۰۳)

۴۔ ''فإن أراد الزوج أن يسكنها مع من أقربائه وطلبت المرأة منزلا على حدة. فلها ذلك. لأن حق السكنى للمرأة إنما كان لمعنيين: أحدهما أن تعاشر مع الزوج، والثاني أن تأمن على متاعها، فاذا كان معها ثالث تستحي من المعاشرة مع زوجها وتخاف على متاعها'' (المحیط البرہانی ۴۔ ۳۱۸، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷۔ ۸۰۳، الموسوعۃ الفقہیہ ۲۵۔ ۱۰۸) (دیکھئے: مقالہ محمد یاسر قاسمی)

۵۔ ''رابطة اجتماعية تتكون من زوج وزوجة وأطفالها وتشمل الجدود والأحفاد وبعض الأقارب على أن يكونوا مشتركين في معيشة واحدة''۔

اس ضمن میں مولانا اختر امام عادل صاحب نے بڑی عمدہ بحث کی ہے وہ لکھتے ہیں: ''منافع کے حصول سے زیادہ ضروری مفاسد کو دور کرنا ہے، "لاضرر ولا ضرور" بعض اہم مقاصد کے حصول کے لئے مشترکہ خاندانی نظام کے بجائے دفع مضرت کی خاطر جداگانہ خاندانی نظام زیادہ لائق ترجیح اور قابل قبول ہے''۔

دوسری رائے:...... دوسری رائے مفتی انور علی اعظمی، مفتی مقصود وجیہی اور مفتی محبوب علی وجیہی صاحب کی مشترک ہے کہ مشترکہ خاندانی نظام بہتر ہے، اس لئے کہ اس میں ماں باپ اور معذور و مجبور اور یتیم بھائی بہنوں کی صحیح دیکھ ریکھ ہو سکے گی، جبکہ مفتی انور علی اعظمی صاحب اس شق کا اضافہ کرتے ہیں کہ جب تک آپس میں پیار محبت اور حسن معاملگی باقی رہے، مشترک رہنا چاہئے اور جب نزاع پیدا ہو جائے تو الگ کر دیا جائے۔ (دیکھئے: مقالہ مفتی مقصود وجیہی، مفتی انور علی اعظمی)

تیسری رائے:...... تیسری رائے مفتی جمیل احمد نذیری اور مفتی ظہیر احمد کانپوری کی ہے کہ ''ایسا خاندانی نظام بہتر ہے جس میں سب کے حقوق بہتر طریقہ سے ادا ہوں اور باہم نزاع کی صورت پیدا نہ ہو، مفتی جمیل احمد نذیری صاحب کے الفاظ ہیں: ''اسلام کی نگاہ میں نہ مشترکہ خاندانی نظام بہتر ہے نہ جداگانہ زندگی بسر کرنے کا طریقہ، بلکہ جس میں سب کے حقوق بہتر طریقہ سے ادا ہوں وہی نظام بہتر ہے'' (دیکھئے: مقالہ مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی ظہیر احمد کانپوری)

دوسری اور تیسری رائے کے حاملین علماء نے علاحدہ سے کوئی دلیل نہیں پیش کی ہے، انہیں روایات ونصوص کو سامنے رکھا ہے جن میں صلہ رحمی اور حقوق میں اقرباء کے خیال کی بات کی گئی ہے، جیسے:

۱۔ ''وآت ذالقربى حقه والمسكين وابن السبيل ولا تبذر تبذيرا''۔ (سورۂ اسراء: ۲۶)
(اور تو قرابت دار کو بھی اس کا حق ادا کر اور محتاج اور مسافر کو ان کا حق دے اور مال کو فضولیات میں مت اڑا)۔

۲۔ ''لا تضار والدة بولدها ولا مولود له بولده، وعلى الوارث مثل ذلك'' (سورۂ بقرہ: ۲۳۳)
(نہ کسی ماں کو تکلیف پہنچائی جائے اس کے بچہ کے باعث اور نہ کسی باپ ہی کو تکلیف پہنچائی جائے اس کے بچہ کے باعث، اور اسی طرح کا انتظام اس کے وارث کے اوپر بھی ہے)۔

۳۔ ''وآتى المال على حبه ذوي القربى واليتامى والمساكين'' (سورۂ بقرہ: ۱۷۷)
(اور اس کی محبت میں مال صرف کرے قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں پر)۔

۴۔ ''فأما اليتيم فلا تقهر'' (سورۂ ضحیٰ: ۹)
(تو آپ بھی یتیم پر سختی نہ کیجئے)۔

سوال نمبر ۲: اگر مشترکہ خاندان ہو اور افراد خاندان کی ضرورت کے لئے سب مل کر خرچ دیں کسی کے بچے زیادہ اور کسی کے کم ہوں تو کیا ان سب پر برابر اخراجات عائد کئے جائیں گے، یا ان کے بچوں کی تعداد کے لحاظ سے۔

اس سوال کے جواب میں ۱۳ مقالہ نگار حضرات کی رائے یہ ہے کہ مشترکہ خاندان کی صورت میں جس کے جتنے بچے ہوں گے ان کے تناسب سے اخراجات لازم ہوں گے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مفتی مقصود وجیہی، مفتی محبوب علی وجیہی، مفتی معزالدین قاسمی، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا محمد شاجہاں ندوی، مفتی عبداللطیف پالنپوری، مفتی عبدالقیوم پالنپوری، مولانا محمد آصف یاسین، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مفتی ارشد فاروقی، مولانا ابرار خاں ندوی، مولانا عقیل الرحمن قاسمی۔

مذکورہ مقالہ نگار حضرات نے مندرجہ ذیل دلائل سے استدلال کیا ہے:

آیات:

۱۔ ''وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف''۔ (سورۂ بقرہ: ۲۳۳) (دیکھئے: مقالہ محمد یاسر قاسمی)
(اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے ان کی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے موافق)۔

۲۔ ''وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا'' (اسراء: ۲۳)۔
(اور تیرے پروردگار نے حکم دے رکھا ہے بجز اسی ایک رب کے اور کسی کی پرستش نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک رکھنا)۔

۳۔ ''ووصينا الإنسان بوالديه حسنا'' (سورۂ عنکبوت: ۸)
(اور ہم نے حکم دیا ہے، انسان کو اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کا)۔

حدیث:

۱۔ ''أنت ومالك لابيك'' (ابن ماجہ، ابوداؤد، مسند احمد)
(تو اور تیرا مال تیرے باپ ہی کا ہے)۔

عبارات فقہاء:

۱- ''ونفقة الصغار على الأب لا يشاركه أحد'' (فتح القدیر ۴-۴۱۰، بدائع الصنائع ۴-۳۲)

۲- ''وإذا لم يف كسبه بحاجتهم أو لم يكتسب لعدم تيسير الكسب أنفق عليهم القريب ورجع على الأب إذا أيسر'' (فتح القدیر ۴-۴۱۱)

۳- ''وفي جوامع الفقه إذا لم يكن للأب مال والجد والأم أو الخال أو العم موسر يجبر على نفقة الصغير ويرجع بها على الأب إذا أيسر'' (حوالہ سابق) (دیکھئے: مقالہ مولانا ابرار خاں ندوی)۔

۴- ''وتجب النفقة بأنواعها على الحر لطفله (يعم الأنثى والجمع) الفقير الحر'' (رد المحتار مع الدر ۲-۹۲۳)

۵- ''وأجمعوا على أن نفقة الوالدين الذين لا كسب لهما ولا مال، واجبة في مال الولد'' (المغنی ۷-۵۸۳)

۶- ''ويجبر الولد الموسر على نفقة أبيه وأمه إذا كانا محتاجين'' (تاتارخانیہ ۳-۲۸۰)

۷- ''النفقة واجبة على زوجها مسلمة كانت أو كافرة''۔ (ھدایہ ۲-۴۴۱)

دوسری رائے:

بعض مقالہ نگار کی رائے یہ ہے کہ مشترکہ خاندان کی شکل میں گھر کے ہر کمانے والے فرد پر اخراجات برابر عائد ہوں گے، اس لئے کہ یہ معاملہ احسان وتبرع کا ہے اور اس میں اخلاقاً سب کو شریک ہونا چاہئے، اس رائے کے حامل مندرجہ ذیل حضرات ہیں:

مولانا اختر امام عادل، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا محمد فخر عالم نعمانی، مفتی سعید الرحمن قاسمی (پٹنہ)، مفتی انور علی اعظمی، مولانا محمد یاسر قاسمی سرائے میر اور مفتی محمد صادق محی الدین۔

ان حضرات نے مندرجہ ذیل عبارات فقہاء کو بنیاد بنایا ہے:

عبارات فقہاء:

۱- ''لو كان للفقير ابنان أحدهما فائق في الغنى والآخر يملك نصابا فهي عليهما سوية (خانيه) وعزاه في الذخيرة إلى مبسوط محمد، ثم نقل عن الحلواني: قال مشائخنا: هذا لو تفاوتا في اليسار تفاوتا يسيرا، فلو فاحشا يجب التفاوت فيها''۔ (رد المحتار ۵-۳۵۵) (مقالہ افتخار احمد مفتاحی)

۲- ''ثم يفرض على الابن نفقة الأب إذا كان الأب محتاجا والابن موسرا سواء كان الأب قادرا على الكسب أو لم يكن'' (الفتاوی التاتارخانیہ ۳-۲۸۱) (مقالہ محمد یاسر قاسمی)

۳- ''وكذا لو اجتمع اخوة يعملون في تركة أبيهم ونمى المال، فهو بينهم سوية، ولو اختلفوا في العمل والرأي''۔ (شامی ۶-۲۹۲)

۴- ''إن الأشعريين إذا أرملوا في الغزو أو قل طعام عيالهم بالمدينة جمعوا ما كان عندهم في ثوب واحد، ثم اقتسموه بينهم في اناء واحد بالسوية فهم مني وأنا منهم'' (دیکھئے: مقالہ ولی اللہ مجید قاسمی)

(اشعری لوگوں کا جب حالت سفر میں توشہ ختم ہوجاتا ہے یا شہر میں رہتے ہوئے کچھ گھروں میں غلہ کم ہوجاتا ہے تو ان کے پاس جو کچھ ہوتا ہے، اسے ایک کپڑے میں جمع کرتے ہیں اور پھر باہم برابر تقسیم کرلیتے ہیں، وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں)۔

تیسری رائے:

تیسری رائے اس مسئلہ میں یہ ہے کہ جس فرد کی جیسی آمدنی ہو آمدنی کے تناسب سے نفقہ واجب ہوگا، اس رائے کے حاملین میں جناب مفتی جمیل احمد

نذیری اور مولانا افتخار احمد مفتاحی ہیں۔

دلیل: اس کی تائید میں مفتی جمیل احمد نذیری صاحب نے ''فتاوی خیریہ'' کی عبارت پیش کی ہے:

''سئل فی أخوین سعیهما واحد وعائلتهما واحدة حصلا بسعیهما أموالا من مواشٍ وغیرها. والآن یرید أحدهما مفارقة الآخر ومقاسمة الأموال مناصفة ویأبی الأخر ... والحالة هذه جمیع ما حصلاه بسعیهما وکسبهما مشترك بینهما تجب قسمته بینهما مناصفة أم لا. (أجاب) نعم ماحصلاه بکسبهما مشترك بینهما. لا یجوز أن یختص به أحدهما دون الآخر'' (الفتاوی الخیریہ ۱۔ ۱۱۲) (دیکھئے: مقالہ مفتی جمیل احمد نذیری)۔

چوتھی رائے:

چوتھی رائے اس مسئلہ میں یہ ہے کہ آپسی رضامندی سے طے کرلے، تاکہ نزاع نہ ہو، اس رائے کو جناب مفتی ظہیر احمد صاحب اور جناب مولانا رضوان الحسن مظاہری نے اختیار کیا ہے، ان کے پیش نظر اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے باہمی نزاع سے بچنا ہے۔

سوال نمبر ۳: اس صورت میں اگر مختلف بھائیوں نے مل کر اپنے والد یا کسی بھائی کے پاس آمدنی جمع کی اور گھر کے اخراجات سے بچی ہوئی رقم سے کوئی چیز خریدی گئی تو اس میں سبھوں کا حصہ برابر ہوگا، یا ہر ایک کی آمدنی اور گھر میں جمع کرنے کے لحاظ سے ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں ۱۵ مقالہ نگار حضرات کی رائے یہ ہے کہ آمدنی کا لحاظ نہیں کیا جائے گا، بلکہ دیا ہوا مال والد کی ملکیت تصور ہوگا، لہذا اس بچی ہوئی رقم سے خریدی ہوئی چیز میں سب برابر کے شریک وسہیم ہوں گے اور تمام کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کیا جائے گا، اس رائے کو مندرجہ ذیل حضرات نے اختیار کیا ہے۔

مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا محمد یاسر قاسمی، مولانا محمد آصف یاسین، مفتی عبدالقیوم پالنپوری، مفتی محمد صادق محی الدین، مفتی عبداللطیف پالنپوری، مفتی ظہیر احمد کانپوری، مفتی انور علی اعظمی، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مفتی معز الدین قاسمی، مولانا اختر امام عادل، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مولانا ابرار خاں ندوی، مولانا محمد فخر عالم نعمانی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا حفیظ الرحمن مدنی۔

مذکورہ حضرات علماء کرام نے اپنی اس رائے کو مندرجہ ذیل عبارات فقہاء سے مستحکم کرنے کی کوشش کی ہے:

۱۔ ''کذلك لواجتمع اخوة یعملون فی ترکة أبیهم ونمی المال فهو بینهم سویة. ولو اختلفوا فی العمل والرأی'' (الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید ۵۔ ۵۲)

۲۔ ''وما حصله أحدهما فله وما حصلاه معاً فلهما إن لم یعلم ما لكه'' (درمختار) ''قوله: وما حصلاه معا یعنی ثم خلطاه وباعاه... وإن لم یعرف مقدار ما کان لکل منهما صدق کل واحد منهما أی النصف. لأنهما استویا فی الاکتساب وکان المکتسب فی أیدیهما فظاهر أنه بینهما نصفان. ویؤخذ من هذا ما افتی به فی الخیریة فی زوج امرأه وابنها اجتمعا فی دارواحدة، وأخذ کل منهمایکتسب علیحدة ویجمعان کسبهما. ولا یعلم التفاوت ولا التساوی ولا التمیز. فأجاب بأنه بینهماسویة'' (شامی ۲۔ ۹۲۳، فصل فی الشرکۃ الفاسدہ)۔ (دیکھئے: مقالہ: محمد فخر عالم نعمانی، مولانا محمد یاسر قاسمی)

۳۔ ''وأما القبض فلأن الملك لوثبت بدونه للزم المتبرع شئ لم یلتزم وهو التسلیم'' ۔ (ابن مودود الموصلی الحنفی، الاختیار لتعلیل المختار ۳۔ ۵۴) (مقالہ مولانا محمد شاہجہاں ندوی)

دوسری رائے:

دوسری رائے یہ ہے کہ ہر ایک اپنی آمدنی کے لحاظ سے اس خریدی ہوئی جائداد میں شریک ہوگا، اس رائے کو اپنانے والے مندرجہ ذیل حضرات ہیں:

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مفتی مقصود وجیہی، مفتی محبوب علی وجیہی۔

تیسری رائے:

تیسری رائے یہ ہے کہ اگر آمدنی کا علم ہو اور منافع معلوم ہوں تو آمدنی کے لحاظ سے بھائیوں کی شرکت ہوگی، اور اگر معلوم نہ ہو تو برابر تقسیم کیا جائے گا۔

یہ رائے مفتی سعید الرحمن قاسمی اور مولانا افتخار احمد مفتاحی کی ہے۔

اس سوال کے جواب میں مفتی عبدالقیوم پالنپوری کہتے ہیں کہ اگر یہ رقوم جائداد خریدنے کے لئے دی گئی تھیں تو سب اپنی رقوم کے بقدر شریک ہوں گے، ورنہ وہ والد کا ترکہ ہوگا اور سب برابر کے شریک ہوں گے۔

مولانا رضوان الحسن مظاہری کہتے ہیں کہ اس کی مختلف شکلیں ہیں:

الف۔ اگر بھائیوں نے والد کو سرپرست بنا کر رقم کا مالک بنادیا تھا اور پھر والد نے اس سے جائداد خریدی تو پھر سب برابر ہوں گے۔

ب۔ اگر بطور امانت کے رقم جمع کرایا اور اخراجات کے بعد جو رقم بچ گئی اس سے جائداد خریدا تو ہر ایک کا اپنے حصہ اور اپنی آمدنی کے بقدر حصہ ہوگا۔

"کل واحد منهما فی نصیب صاحبه کالأجنبی" (ہدایہ) (دوسرے کا حصہ بغیر اجازت نہیں لے سکتا)۔

مفتی ارشد فاروقی صاحب نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ اگر جمع وصرف کی بنیاد حساب پر ہے تو اسی حساب سے حصہ ہوگا۔

سوال نمبر:۴۔ ایک بھائی بیس ہزار میں سے دس ہزار گھر کے خرچ میں دیتا ہے، اور دو بھائی اپنی پوری تنخواہ، یعنی دس ہزار گھر میں دیتے ہیں تو وہ جو دس ہزار بچا کر اپنے پاس رکھتا ہے وہ تنہا اس کی ملکیت ہوگی یا سارے بھائی اس میں شریک ہوں گے؟

اس سوال کے جواب میں تقریباً سارے ہی مقالہ نگار حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ برابر تمام بھائیوں کے گھر کے اخراجات میں رقم جمع کرنے کے بعد جو دس ہزار آمدنی الگ سے جس بھائی نے اپنی کمائی میں سے رکھی ہے وہ اس کی ذاتی ملکیت ہے، اس میں کسی دوسرے کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

اس موقف کی تائید کے لئے حضرات مقالہ نگار نے مندرجہ آیات واحادیث پیش کئے ہیں:

آیات:

۱۔ ''للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن''۔ (سورۂ نساء:۳۲)
(مردوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے، اور عورتوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے)۔

۲۔ ''وأن لیس للانسان إلا ما سعی، وأن سعیه سوف یری''۔ (سورۂ نجم:۳۹، ۴۰)
(اور انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی اور یہ کہ انسان کی سعی بہت جلد دیکھ لی جائے گی)۔

۳۔ ''یا یها الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل''۔ (سورۂ نساء:۲۹)
(اے ایمان والو آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر نہ کھاؤ)۔

احادیث:

۱۔ ''لا یحل مال امرأ مسلم إلا بطیب نفس منه'' (مشکوۃ ۵۔۲۵۵) (دیکھئے: مقالہ: مفتی عبداللطیف پالنپوری)
(کسی مسلمان کے لئے کسی دوسرے مسلمان کا مال اس کی رضامندی کے بغیر حلال نہیں ہے)۔

۲۔ ''کل أحد أحق بماله من والده وولده والناس أجمعین'' (دارقطنی حدیث ۴۵۶۸، سنن کبری للبیہقی حدیث نمبر:۱۶۱۷۰)
(ہر شخص اپنے مال کا اپنے والد، اپنے لڑکے اور تمام لوگوں سے سب سے زیادہ حقدار ہے)۔

عبارات فقہاء:

۱۔ ''إن زیدا یسکن مع أبیه عمرو فی بیت واحد ویعیش من طعام أبیه. وقد کسب مالا آخر. فلیس لإخوانه بعد وفاة أبیه ادخال ما کسبه زید فیها لشرکة'' (شرح المجلة الاحکام العدلیہ ۳/۳۴۵) (مقالہ مولانا محمد شاہجہاں ندوی)

۲۔ ''وقد اشترى الأرض من ماله وبنى عليها من ماله ولم يشاركه أحد فى أى عمل من أعمال العمارة، فتكون ملكا له خاصا له وليس من حق أخيه أن يشاركه فى أى قدر من الأرض والبناء'' (مجموعہ الفتاوی الشرعیہ ۴/۱۸۸)

(دیکھئے: مقالہ مولانا ابرار خاں ندوی)

البتہ اس مسئلہ میں مفتی جمیل احمد نذیری اور مفتی سعید الرحمن قاسمی کی رائے یہ ہے کہ اس صورت میں کسی بھائی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ الگ سے کوئی رقم اپنے لئے بچا کر رکھے، اسے ہر قیمت پر ساری رقم جمع کرنا ہوگی، ورنہ یہ بھی تینوں کے ساتھ دغا اور دھوکہ بازی ہوگی۔

اور مولانا حفیظ الرحمن مدنی کہتے ہیں کہ اگر اخراجات اور کھانا پینا سب ساتھ ہے تو ہر ایک کو اپنی پوری رقم جمع کرنا ضروری ہوگا (دیکھئے: مقالہ مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مفتی جمیل احمد نذیری اور مفتی سعید الرحمن قاسمی پٹنہ)۔

سوال نمبر: ۵۔ اگر خاندان کے کچھ افراد کماتے ہیں، اور کچھ گھر کے کام دیکھتے ہیں اور اس طرح گھر کا کام چلتا ہے تو کیا کمانے والے حضرات کی آمدنی میں گھر کا کام دیکھنے والے حضرات بھی برابر کے شریک ہوں گے؟

اس سوال کے جواب میں ۱۲ مقالہ نگار حضرات نے یہ کہا ہے کہ یہ کام چونکہ تقسیم کار پر مبنی ہے، اور کچھ لوگ گھر کا کام دیکھتے ہیں اور کچھ لوگ باہر کا، اس لئے گھر کام کرنے والے افراد برابر کے حصہ دار ہوں گے اس رائے کو مندرجہ ذیل حضرات نے اختیار کیا ہے۔

مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا اختر امام عادل، مفتی مقصود وجیہی، مفتی محبوب علی وجیہی، مفتی عبد الرحیم قاسمی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی ظہیر احمد کانپوری، مفتی محمد صادق محی الدین، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، اور مفتی سعید الرحمن قاسمی پٹنہ۔

ان حضرات نے فقہاء کی انہیں عبارتوں سے استدلال کیا ہے جو سوال نمبر ۳ کے ضمن میں نقل کی جاچکی ہیں، مثلاً:

۱۔ ''ولو اجتمع اخوة يعملون فى تركة أبيهم ونمى المال فهو بينهم سوية ولو اختلفوا فى العمل والرأى''۔ (شامی ۳/۳۴۹)

۲۔ ''فإذا كان الأب مزارعا والابن صانع الأحذية، فكسب الأب من المزارعة والابن من صنعة الحذاء، فكسب كل واحد منهما لنفسه، فليس للأب المداخلة فى كسب ابنه لكونه فى عياله'' (درر الحکام ۳/۴۴۵، دفعہ ۱۳۹۸)

(دیکھئے: مقالہ مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مفتی عبد الرحیم قاسمی)

دوسری رائے:

دوسری رائے یہ ہے کہ اس میں گھر کا کام کرنے والے لوگ شریک نہیں ہوں گے، اس رائے کے حامل مقالہ نگاران میں یہ حضرات شامل ہیں:

مولانا ابرار خاں ندوی، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مولانا قاضی ذکاء اللہ شبلی، مفتی عبد اللطیف پالنپوری، مولانا محمد آصف یاسین، مولانا رضوان الحسن مظاہری، مفتی ارشد فاروقی۔

جبکہ مولانا ولی اللہ مجید قاسمی کی رائے یہ ہے کہ اگر ایسا عرف رائج ہو تو شریک ہوگا ورنہ نہیں، اور مفتی ارشد فاروقی نے یہ تفصیل کی ہے کہ باہر رہنے والوں کی کمائی میں ان کا کوئی حصہ تو نہیں ہوگا، تاہم اخلاقاً ان کا حل نکالتے رہنا چاہئے۔

اور مولانا محمد فخر عالم نعمانی کا خیال یہ ہے کہ وہ رقم جو باہر کام کرنے والے حضرات گھر میں اخراجات کے لئے دیتے ہوں اس میں تو شریک ہوں گے، لیکن جو اپنے پاس رکھتے ہوں اس میں شریک نہیں ہوں گے۔

مولانا محمد یاسر قاسمی کی رائے یہ ہے کہ اگر پہلے سے ایسا کوئی معاہدہ ہو تو شرکت ہوگی، ورنہ نہیں۔

سوال نمبر: ۶ والدین کی خدمت صرف بیٹوں پر واجب ہے یا بیٹیوں پر بھی، اور بالخصوص بچیوں کے اپنے سسرال

چلے جانے کے بعد بہو کی کیا ذمہ داری ہے؟

اس سوال کے جواب میں تقریباً تمام ہی مقالہ نگار حضرات نے لڑکے اور لڑکیوں دونوں پر خدمت کو واجب قرار دیا ہے، البتہ کفالت کے سلسلہ میں مولانا رضوان الحسن مظاہری، مولانا محمد آسف یاسین نے یہ صراحت کی ہے کہ اگر بیٹیاں مالدار ہوں تو بیٹوں کے ساتھ ساتھ بیٹیوں پر بھی والدین کی کفالت واجب ہے، ورنہ صرف بیٹوں پر۔

کیا بہو پر گھر کے افراد کی خدمت لازم ہے؟

اس سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ بیٹیاں اگر اپنے سسرال چلی جائیں تو ساس اور سسر کی خدمت کے سلسلہ میں بہو کی کیا ذمہ داری ہے؟

اس بارے میں اکثر حضرات اس کے قائل ہیں کہ ساس، سسر کی خدمت کرنا بہو کی صرف اخلاقی ذمہ داری ہے، قانونی اور شرعی طور پر لازم نہیں ہے، لیکن مولانا عقیل الرحمن قاسمی کہتے ہیں کہ اگر ساس سسر خدمت کے محتاج ہوں تو دیانت کے تقاضے سے خدمت کرنا بہو پر واجب ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: مقالات مولانا اختر امام عادل، مفتی معزالدین قاسمی، افتخار احمد مفتاحی، مولانا ابرار خاں ندوی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی اور مولانا ولی اللہ مجید قاسمی)۔

اس سوال کی دونوں شقوں کے جواب کے ضمن میں متعلقہ نگار حضرات نے مندرجہ دلائل پیش کئے ہیں:

آیات:

۱۔ ''ووصينا الإنسان بوالديه حسنا'' (سورۂ عنکبوت: ۸)
(اور ہم نے انسان کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک اختیار کریں)۔

۲۔ ''أن اشكر لي ولوالديك إليّ المصير'' (سورۂ لقمان: ۱۴)
(کہ تو میری اور اپنے ماں باپ کی شکرگذاری کیا کر، میری ہی طرف واپسی ہے)۔

۳۔ ''وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا'' (اسراء: ۲۳)
(اور تیرے پروردگار نے یہ حکم دے رکھا ہے کہ بجز اسی ایک رب کے اور کسی کی پرستش نہ کرنا اور اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک رکھنا)۔

احادیث:

۱۔ ''عن جابر بن عبد الله يا رسول الله إن لي مالا وإن لي أبا وله مال وإن أبي يريد أن يأخذ مالي، فقال رسول الله ﷺ: أنت ومالك لأبيك'' (ابوداؤد ۲-۱۵۰، کتاب البیوع)
(حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول میرے پاس کچھ مال ہے، اور میرے والد ہیں ان کے پاس بھی کچھ مال ہے، اور وہ چاہتے ہیں کہ میرا مال لے لیں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے)۔

۲۔ ''لا يجزي ولد والده إلا أن يجده مملوكا فيشتريه، فيعتقه'' (مسلم حدیث نمبر: ۱۵۱۰)
(کوئی اولاد اپنے والد کے حق کا بدلہ نہیں دے سکتی، مگر یہ کہ اسے مملوک غلام پائے، پھر اسے خرید کر آزاد کردے)۔

عبارات فقہاء:

۱۔ ''يجب على الولد الموسر كبيرا كان أو صغيرا، ذكرا أو انثى نفقة والديه وأجداده وجداته الفقراء...ولا يشارك الولد الموسر أحد في نفقة أصول المحتاجين'' (مجموعہ قدری پاشا دفعہ ۴۰۸) (مقالہ مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۲۔ ''ويجبر الولد الموسر على نفقة الأبوين المعسرين''۔ (فتاویٰ ہندیہ ۱/ ۵۶۴)

۳۔ ''يجب على الابن نفقة خادم الأب إذا احتاج إليه''۔ (الاختیار ۴/ ۱۱)

۴۔ ''وإن استاجر الرجل ابنه ليخدمه فى بيته لم يجز، ولا أجر عليه، لأن خدمة الأب مستحقة على الابن دينا، وهو مطالب به عرفا، فلا يأخذ عليه أجرا، ويعد من العقوق أن يأخذ الولد الأجر على خدمة أبيه، والعقوق حرام، وكذلك إن استأجرته الأم، لأن خدمتها أوجب عليه، فإنها أحوج إلى ذلك واشفق عليه، وإن كان أحدهما استاجره ليرعيه غنما أو يعمل غير الخدمة جاز، فإن ذلك غير مستحق عليه ولاهو مطلوب فى العرف'' (مبسوط ۱۶-۱۵۷)

۵۔ ''وإن استاجر الابن أمه أوجدته أوجده للخدمة لا يجوز، ولو خدمت فلها المسمى، ويستوى ذلك أن يكون الابن حرا أو عبدا، مسلما أو كافرا؛ لأن خدمة الأب واجبة على الابن مع اختلاف الدين'' (المحيط البرهانى ۸-۴۰)

۶۔ ''وإن قالت: لا أطبخ ولا أخبز لا تجبر على الطبخ والخبز، وعلى الزوج أن يأتيها بطعام مهيّا أو يأتيها بمن يكفيها عمل الطبخ والخبز'' (الفتاوى الهنديه ۱-۵۴۸)

۷۔ ''ولا يجب عليها خدمته فى الخبز والطحن والطبخ والغسل وغيرها من الخدم، لأن المعقود عليها من جهتها هو الاستمتاع، فلا يلزمها ماسواه'' (المهذب للشيرازى ۱۵-۵۸۱، المغنى ۷-۲۱)

۸۔ ''ولكن الأولى لها فعل ماجرت العادة بقيامها به، لأن العادة ولا تصلح الحال إلا به، ولا تنتظم المعيشة بدونه'' (المغنى ۷-۲۱)

۹۔ ''وكذا إذا كان له ابن وبنت ولا يفضل الذكر على الأنثى فى النفقة لاستوائهما فى سبب الوجوب وهوالولاد... ولوكان له بنت وأخت فالنفقة على البنت، لأن الولادلها''۔ (بدائع ۳/۴۴۳)

۱۰۔ ''فإذا كان للأب ابن وبنت موسرين قسمت نفقة بينهما بالتسوية'' (النفقة على المذاهب الاربعة ۲-۵۸۱)

(مذکورہ بالا دلائل وعبارت کے لئے دیکھئے مقالہ: مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مفتی ارشد فاروقی، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مولانا محمد فخر عالم نعمانی، مفتی محمد صادق محی الدین)

۷۔ قریبی رشتہ داروں سے بالخصوص جب گھر تنگ ہو تو گھر کے غیر محرم عورتوں کے لئے پردہ کے کیا احکام ہوں گے؟

اس سوال کے جواب میں ۱۲ مقالہ نگار حضرات کی رائے یہ ہے کہ پردے کے احکام میں کوئی تبدیلی اور سہولت کی گنجائش نہیں ہے، محرم اور غیر محرم کے سلسلہ میں جو اصول حجاب ونقاب کے شریعت نے دیئے ہیں وہ اپنی جگہ مسلّم ہیں کوئی اس پر عمل کرے یا نہ کرے، گھر میں آنے والے غیر محرم عزیزوں سے ہمارے گھروں کی خواتین کو پردہ کرنا ضروری ہے، اس رائے کو جن حضرات نے اپنایا ہے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا رضوان الحسن مظاہری، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مفتی سعید الرحمن قاسمی، مولانا محمد یاسر قاسمی، مولانا محمد فخر عالم نعمانی، مولانا ابرار خاں ندوی، مولانا عقیل الرحمن قاسمی، مولانا قاضی ذکاء اللہ شبلی، مفتی محمد صادق محی الدین، مفتی عبداللطیف پالنپوری، مفتی عبدالقیوم پالنپوری)

اس مسئلہ کے لئے حضرات مقالہ نگار نے پردہ کے سلسلہ میں وارد آیات واحادیث کو بنیاد بنایا ہے، مثلاً:

آیات:

۱۔ ''ولا يبدين زينتهن إلا بعولتهن الخ''۔ (سورۂ نور: ۳۱)
(اور اپنا سنگار ظاہر نہ ہونے دیں، مگر ہاں ان میں سے جو کھلا ہی رہتا ہے)۔

۲۔ ''يايها النبى قل لأزواجك وبناتك ونساء المؤمنين يدنين عليهن من جلابيبهن''۔ (سورۂ احزاب: ۵۹)
(اے نبی ﷺ آپ کہہ دیجئے اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور عام ایمان والوں کی عورتوں سے کہ اپنی چادریں اپنے اوپر نیچی کرلیا کریں تھوڑی سی)۔

احادیث:

۱۔ ’’عن عقبة بن عامر أن رسول الله ﷺ قال: إياكم والدخول على النساء، فقال رجل من الأنصار: يا رسول الله أفرأيت الحمو! قال: الحمو الموت‘‘ (بخاری ۲/۷۸۷)

(حضرت عقبہ بن عامرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم عورتوں کے پاس (تنہائی میں) جانے سے بچو، تو انصار میں سے ایک شخص نے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم! دیور کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دیور تو موت ہی ہے)۔

۲۔ ’’لا يخلون رجل بامرأة إلا ذو محرم‘‘ (ترمذی ۱/۱۳۹، بخاری)

(ہرگز کوئی شخص عورت کے ساتھ تنہائی میں نہ ہو، سوائے اس کے کہ محرم ہو)۔

۳۔ ’’لأن الخوف من الأقارب أكثر، والفتنة منهم أوقع لتمكنهم من الوصول إليها والخلوة بها من غير نكير عليهم. وعادة الناس المساهلة فيه‘‘۔ (مرقاۃ شرح مشکوۃ ۳۔۲۰۹ باب النظر إلى المخطوبة)

۴۔ ’’لا يخلون رجل بامرأة قال: ثالثهما الشيطان‘‘۔ (مشكوة باب النظر إلى المخطوبة: ۲۶۸)

عبارات فقہاء:

۱۔ ’’اتفق أهل العلم باللغة على أن الأحماء أقارب زوج امرأة كأبيه، وأخيه، وابن أخيه وابن عمه ونحوهم‘‘ (فتح الباری ۲۔۲۸۹)

۲۔ ’’وتمنع المرأة الشابة من كشف الوجه بين الرجال، لا لأنه عورة، بل لخوف الفتنة كمسه، وإن أمن الشهوة‘‘ (درمختار)، ’’والمعنى تمنع من الكشف لخوف أن يرى الرجال وجهها فتقع الفتنة‘‘ (رد المحتار ۲۔۷۳، ۷۳، المبسوط ۱۰۔۱۵۲، فتح القدير ۱۔۱۸۱)

اس بارے میں اختر امام عادل صاحب کا خیال ہے کہ پردہ واجب ہے، احتیاط کے باوجود اگر سامنا ہو جائے اور کسی قسم کا فتنہ اور شہوت نہ ہو تو ’’دفعاً للحرج‘‘ کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (دیکھئے مقالہ: مولانا اختر امام عادل)

دوسری رائے:

اس مسئلہ میں دوسری رائے یہ ہے کہ چونکہ چہرہ ہتھیلی اور ٹخنہ سے نیچے کا پردہ نہیں ہے، اس لئے قریبی رشتہ داروں کے سامنے اگر عورتیں آتی ہیں تو اس میں سہولت دی جاسکتی ہے، چونکہ مشترکہ خاندان ہے اور عموم بلوی ہے، تاہم اختلاط اور تنہائی سے ہر حال میں مکمل اجتناب ہو اور فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔

یہ رائے مندرجہ ذیل حضرات کی ہے:

مفتی مقصود وجیہی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مفتی ظہیر احمد قاسمی، مولانا محمد آصف یاسین اور مفتی ارشد فاروقی۔

ان حضرات نے بھی حرج و تنگی اور نص میں وارد "إلا ما ظهر منها" (سورۂ نور: ۳۱) اور انہیں دلائل سے استدلال کیا ہے جن سے فریق اول نے کیا ہے۔

جبکہ اس مسئلہ میں مفتی معز الدین قاسمی اور مفتی عبد الرحیم قاسمی نے علاحدہ سے کوئی رائے قائم نہیں کی ہے، اور مولانا بہاء الدین ندوی نے اپنی مختصر تحریر بھیجی ہے، تاہم سوالات کے جوابات نہیں دیئے۔

☆☆☆

عرض مسئلہ:

مشترکہ اور جداگانہ خاندانی نظام

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی [1]

مشترکہ اور جداگانہ خاندانی نظام کے موضوع پر کل اکیس مقالے موصول ہوئے جس میں سے ایک مقالہ زیراکس صاف نہ ہونے کی وجہ سے عرض میں شامل نہیں ہے۔

مذکورہ موضوع کے پہلے سوال کے جواب میں اکثر مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ جداگانہ خاندانی نظام بہتر ہے اور ان کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ شرعی حدود کی جتنی رعایت جداگانہ خاندانی نظام میں ممکن ہے، اس قدر مشترکہ نظام میں نہیں ہے۔

۲۔ غیر محرموں سے پردہ کا عدم اہتمام۔

۳۔ موروثی جائداد اور ذرائع آمدنی کی تقسیم عمل میں نہیں آتی ہے۔

۴۔ حساب وغیرہ میں شفافیت نہیں آپاتی، جس کی وجہ سے دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے، اور نزاع کی نوبت آتی ہے، نیز کدورت اور کینہ پروری جنم لیتی ہے۔

۵۔ کمانے والوں کی تعداد کھانے والوں سے کم ہوتی ہے، اور بہت سے لوگوں میں دوسروں پر انحصار کا مزاج بن جاتا ہے۔

۶۔ مشترکہ خاندانی نظام جنسی تعلق کے لئے حارج ہے جس کی وجہ سے جنسی ناآسودگی پائی جاتی ہے، نیز بے تکلف اور خوشگوار ازدواجی زندگی گزارنا بھی اس نظام میں مشکل ہے، حالانکہ نگاہ کی حفاظت اور عصمت وعفت کے لئے ضروری ہے کہ مرد اپنی خواہش کے مطابق دن رات کے جس حصے میں چاہے اپنی ضرورت پوری کرلے۔

۷۔ مشترکہ نظام میں گھر کا سکون درہم برہم ہوجاتا ہے، حالانکہ گھر کو جائے سکون ہونا چاہئے۔

۸۔ مشترکہ نظام میں فضول خرچی اور لاپرواہی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، مالی معاملہ مشترک ہونے کی وجہ سے ہر شخص اسے مال مفت سمجھ کر دل بے رحم کا سلوک کرتا ہے۔

۹۔ علیحدہ گھر عورت کا حق ہے۔

بیشتر مقالہ نگاروں نے اس موقع پر وہ فقہی عبارتیں نقل کی ہیں جن میں علیحدہ کمرہ یا گھر عورت کا حق قرار دیا گیا ہے۔

۱۰۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کے لئے جداگانہ رہائش اور خورد ونوش کا انتظام فرمایا، حالانکہ ایک ساتھ خورد ونوش میں بچت اور کفایت کا امکان تھا، اسی طرح حضرت علی کو نکاح کے بعد آپ نے علیحدہ گھر میں منتقل کردیا، جو شادی سے پہلے آپ کے ساتھ رہائش پذیر تھے، آپ انہیں اپنے بیٹے کی طرح چاہتے تھے، نیز اپنی چہیتی بیٹی سے ان کا رشتہ کیا تھا۔

۱۱۔ جداگانہ زندگی بسر کرنے کے باوجود بوڑھے اور خدمت کے محتاج ماں باپ کے تنہا پڑنے کا اندیشہ غلط ہے، کیونکہ محتاج ماں باپ کا نفقہ اولاد پر فرض ہے، عام طور پر مقالہ نگاروں نے اس موقع پر نفقہ سے متعلق فقہی عبارتیں نقل کی ہیں۔

مفتی انور علی اور مولانا محمد مقصود صاحب کی رائے ہے کہ مشترکہ خاندانی نظام میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ بہتر ہے ان کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ یکجائی محنت اور مشترکہ جدوجہد خاندان کو معاشی استحکام عطا کرتی ہے۔

۲۔ مشترکہ نظام برصغیر میں ایک معروف چیز ہے، اسے بالکل غیر شرعی اور ناقابل قبول نہیں کہا جاسکتا۔

۳۔ حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے اجتماعی مفاد کے تحفظ کے لئے اور مستقبل کی تعمیر کے لئے انفرادی مفاد کو نظر انداز کردیا ہے، جیسا کہ صلح حدیبیہ سے معلوم ہوتا

---

[1] جامعۃ الفلاح بلریا گنج، اعظم گڑھ۔

ہے، اسی طرح سے اجتماعیت کا لحاظ رکھتے ہوئے حطیم کو کعبہ میں شامل نہیں کیا گیا، اور اجتماعی حالت کے پیش نظر قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ ذخیرہ بنا کر رکھنے سے منع کیا گیا، اور حالت میں تبدیلی ہوجانے کے بعد اس کی اجازت دی گئی، اسی کے پیش نظر منافقین کے قتل سے باز رہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی مفاد اہم ہے، مشترکہ خاندانی نظام میں اجتماعی مفاد کی حفاظت ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ بوڑھوں اور بے سہارا لوگوں کی کفالت ہوتی ہے، حضرت جابرؓ نے اپنی چھوٹی بہنوں کی کفالت کی وجہ سے شوہر دیدہ عورت سے نکاح کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس عمل کی تعریف فرمائی۔

مولانا ظہور احمد صاحب کی رائے یہ ہے کہ اگر کسی کو پریشانی نہ ہو تو مشترکہ نظام بہتر ہے اور اگر نزاع پیدا ہو چا ہے دو بیویوں کے درمیان یا ساس بہو کے درمیان تو ایسی صورت میں ہر ایک کو علیحدہ رکھا جائے، لیکن اگر والدین بوڑھے ہوں تو ان کو ساتھ رکھنا لازم ہے۔

''إن کان الوالد زمنا أولا یقدر علی عقل وللا بن عیال کان علی الابن أن یضم الأب إلی عیاله وینفق علی الکل'' (فتاوی قاضی خاں ۱-۲۰۶) ''ولا یخفی أن الأم بمنزلة الأب الزمن، لأن الأنوثة بمجردها عجز'' (رد المحتار ۲-۶۷۷، فتاوی دار العلوم ۸-۴۱۲، ۴۱۷)

مولانا محمد یاسر صاحب جو جداگانہ رہائش کو بہتر کہتے ہیں ان کی بھی رائے یہی ہے کہ والدین بوڑھے ہوں تو ان کو ساتھ رکھنا ضروری ہے۔

مولانا جمیل احمد نذیری کہتے ہیں کہ نہ مشترکہ نظام بہتر ہے اور نہ جداگانہ، بلکہ جس میں سب کے حقوق بہتر طریقے سے ادا ہوں وہی بہتر ہے، لیکن ہوتا یہ ہے کہ علیحدہ ہونے پر سارے حقوق ادا نہیں ہو پاتے، لیکن یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اولادیں جب صاحب اولاد ہوجاتی ہیں تو ساتھ رہنا بجائے مفید ہونے کے مضر ہوجاتا ہے اس موقع پر بٹوارہ ہی بہتر ہوتا ہے۔

دوسرے سوال کے جواب میں مولانا شاہ جہاں ندوی، مولانا عبد اللطیف پالنپوری، مفتی عبد الرحیم قاسمی، مولانا محمد آصف پالنپوری، مفتی سید صادق، مولانا حفیظ الرحمان مدنی، مولانا عبد القیوم پالنپوری، مولانا محمد مقصود، قاضی ذکاء اللہ، مفتی معز الدین کہتے ہیں کہ ہر شخص پر برابر نفقہ واجب نہیں ہوگا بلکہ بچوں کی تعداد کے اعتبار سے خرچ دینا ہوگا، مولانا حفیظ الرحمان مزید کہتے ہیں کہ اس مسئلہ کا تعلق ''باب الشرکۃ'' سے نہیں بلکہ ''باب النفقہ'' سے ہے، یعنی لڑکے باپ کے ساتھ شرکاء کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ان کے زیر کفالت رہتے ہیں، مولانا محمد ابرار خاں ندوی کی بھی یہی رائے ہے وہ کہتے ہیں کہ جس کے بچے زیادہ ہوں وہ زیادہ رقم دے، اور اگر وہ متحمل نہ ہو تو دوسرے لوگ دیں اور جب اس کی حالت بہتر ہوجائے تو اپنی رقم واپس لے لیں، اصول یہی ہے، البتہ اس میں عرف کا بھی اعتبار ہوگا کہ جہاں زائد رقم کو قرض سمجھا جاتا ہو وہاں واپسی کا حق ہوگا اور جہاں ایسا عرف نہ ہو وہاں واپسی کا حق نہ ہوگا۔

''إذا لم یکن للأب مال والجد والأم أو الخال أو العم موسر یجبر علی نفقة الصغیر ویرجع بها علی الأب إذا أیسر''۔ (فتح القدیر ۴-۴۱۹)

مولانا عقیل الرحمان قاسمی کہتے ہیں کہ کاروبار مشترک ہو تو ساری کمائی باپ کی ہوگی اور وہ گھر کے تمام افراد پر یکساں خرچ کا ذمہ دار ہوگا، کاروبار جدا ہو تو ہر شخص اپنے اہل وعیال اور معذور والدین کے نفقہ کا ذمہ دار ہوگا، مولانا محمد یاسر قاسمی کی بھی یہی رائے ہے، اور انہوں نے دلیل میں یہ عبارت نقل کی ہے:

''کذا لو اجتمع اخوة یعملون فی ترکة أبیهم ونمی المال فهو بینهم بالسویة، ولو اختلفوا فی العمل والرای'' (شامی ۶-۲۹۲)

مولانا یاسر صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ کاروبار مشترک ہو اور خورد ونوش علیحدہ ہو تو معاہدہ کے مطابق واجب ہوگا، مولانا اختر امام عادل، مفتی انور علی، اور مولانا افتخار احمد کہتے ہیں کہ مشترکہ نظام کی روح اور اس کے مقاصد کا تقاضا ہے کہ سب پر برابر اخراجات عائد کئے جائیں، بچوں کی تعداد کا لحاظ ضروری نہیں ہے، اس لئے کہ اس نظام کی بنیاد باہمی تعاون پر ہے، نیز یہ مسئلہ عرف پر مبنی ہے، مشترکہ نظام کا معروف دستور یہی ہے کہ خاندان کا ہر فرد اپنی حیثیت کے مطابق اس میں حصہ لیتا ہے، مولانا افتخار احمد مفتاحی نے بطور دلیل یہ عبارت نقل کی ہے:

''کما کان للفقیر ابنان أحدهما فائق فی الغنی والآخر یملك نصابا فهی علیهما بالسویة ''خانیة'' قال مشائخنا هذا لو تفاوتا فی الیسار تفاوتا یسیراً، فلو فاحشا یجب التفاوت فیها''۔ (رد المحتار ۵-۳۵۵)

مولانا ظہیر احمد کہتے ہیں کہ یہ آپسی رضامندی اور معاہدہ پر موقوف ہے، مولانا جمیل احمد نذیری کہتے ہیں کہ بچوں کی تعداد کے اعتبار سے اخراجات عائد نہ ہوں گے بلکہ جو جتنا کماتا ہو اسی کے اعتبار سے لا کر دے، اگر زیادہ کمانے والے کو اعتراض ہو تو باہم علیحدگی اختیار کرلیں۔ فتاوی خیریہ میں ہے:

''سئل فی اخوین سعیهما واحد وعائلتهما واحدة حصلا بسعیهما أموالاً من الموروثی وغیرها والآن یرید أحدهما مفارقة الاخوة ومقاسمة المال مناصفة ویأبی الآخر ... أجاب نعم ما حصلاه بکسبهما مشترك بینهما'' (الفتاوی الخیریة ۱-۱۱۲)

تیسرے سوال کے جواب میں بیشتر مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ہر ایسا مشترک معاملہ جہاں ملکیتیں مخلوط ہوں، اور امتیاز ممکن نہ ہو وہاں تمام شرکاء کا حق برابر مانا جائے گا، اور زیادہ تر لوگوں نے بطور حوالہ شامی کی یہ عبارت نقل کی ہے۔

''زوج امرأة وابنها اجتمعا فی داروا حدة وأخذ كل واحد منهما یکتسب علحدة ویجمعان کسبهما ولایعلم التفاوت ولا التساوی ولا التمییز، فأجاب بأنه بینهما علی السویة'' (رد المحتار ۳-۳۹۲)

مولانا جمیل احمد نذیری نے اس کے ساتھ فتاوی خیریہ کی یہ عبارت بھی نقل کی ہے:

''فإذا کان سعیهم واحد ولم یتمیز ماحصله کل واحد منهم بعمله یکون ماجمعوه مشترکا بینهم بالسویة، وان اختلفوا فی العمل والرأی کثرة وصوابا'' (فتاوی خیریہ ۱/۱۱۲)

مولانا اختر امام عادل صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ یہ ساری آمدنی گھر کے خرچ کے لئے امیر کنبہ کے پاس جمع کی گئی ہو، اور اگر گھر کے خرچ کے علاوہ الگ سے کوئی رقم والد یا بڑے بھائی کے پاس جمع کی گئی اور اس سے کوئی چیز خریدی گئی تو اس میں سب کا حصہ برابر نہ ہوگا، بلکہ جمع شدہ کے لحاظ سے ہر ایک کا حصہ متعین کیا جائے گا، بشرطیکہ جمع کا تناسب معلوم ہو، اس لئے کہ یہ رقم بطور امانت و وکالت جمع کی گئی ہے۔

مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا محمد مقصود، قاضی ذکاء اللہ مفتاحی، مولانا شاہ جہاں ندوی نے لکھا ہے کہ ہبہ اور قرض کی صراحت نہ ہو تو اولاد اپنی رقم کے اعتبار سے شریک ہوگی، اور مولانا ظہیر احمد لکھتے ہیں کہ کاروبار میں سب شریک ہوں مگر کھانے، پینے میں الگ الگ ہوں تو ہر شخص برابر اخراجات لینے کا حقدار ہوگا۔ (فتاوی دارالعلوم ۱۳/۲۸)

چوتھے سوال کے جواب میں بھی اکثر لوگوں کی رائے ہے کہ بچی ہوئی رقم صرف کمانے والے کی ملکیت ہوگی، دوسرے بھائیوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوگا، اس لئے کہ آمدنی کا یہ حصہ مشترکہ نظام کے دائرے سے خارج ہے۔ مولانا افتخار احمد مفتاحی نے للرجال نصیب مما اکتسبوا (سورہ نساء: ۳۲) سے استدلال کیا ہے، مولانا ابرار خاں ندوی نے کویت سے جاری اسی طرح کے ایک فتوے کو بنیاد بنایا ہے، مفتی ظہیر احمد صاحب نے فتاوی دارالعلوم دیوبند ۱۳/۴۷ کا حوالہ دیا ہے، مولانا شاہ جہاں ندوی صاحب نے یہ دلیل پیش کی ہے:

(الف): ''کل أحد أحق بماله من والده وولده والناس أجمعین'' (السنن الکبر للبیهقی۔ ۷۹۰۔ السنن للدار قطنی ۴۵۶۸۔ السنن السعید بن منصور ۲۲۹۳)، حدیث مرسل ہے۔

(ب): ''ان زیداً یسکن مع أبیه عمرواً فی بیت واحد ویعیش من طعام أبیه وقد کسب مالا آخر. فلیس لإخوانه بعد وفاة أبیه ادخال ما کسبه زید فی الشرکة''۔ (درر الحکام ۳-۳۳۵)

مفتی انور اور مفتی معزالدین صاحب لکھتے ہیں کہ اشتراک کے وقت معاملہ صاف ہونا چاہئے، اگر معاہدہ پوری آمدنی کے دینے کا ہے تو بغیر بتائے کچھ بچا کر رکھنا خیانت ہے، اور بچی ہوئی رقم میں سب حصہ دار ہیں، اور اگر ایسا کوئی معاہدہ نہیں ہے تو وہ بچی ہوئی رقم کا خود مالک ہوگا، مفتی معزالدین صاحب نے یہ عبارت نقل کی ہے:

''اختلف قول العلماء فی عمل المرأة مع زوجها إذا اجتمع بعملهما أموالاً کثیرة، فقیل للزوج: وتکون المرأة معینة له، إلا إذا کان لها کسب علی حدة فهو لها''۔ (الفقه الحنفی فی ثوبه الجدید۔ ۵۲)

مولانا جمیل احمد نذیری اور مولانا حفیظ الرحمان مدنی لکھتے ہیں کہ اگر کھانا پینا ایک ساتھ ہو اور سب مل کر اپنی بساط کے بقدر گھر چلا رہے ہوں تو بچا کر رکھنے کی گنجائش نہیں ہے، اور اگر الگ ہوں تو کمانے والے کی ملکیت ہوگی۔

''لو اجتمع اخوة يعملون في تركة أبيهم ونمى المال، فهو بينهم سوية ولو اختلفوا في العمل والرای'' (رد المحتار ۳۔ ۳۸۳)

مولانا حفیظ الرحمان مدنی نے یہ حدیث بھی نقل کی ہے:

''كل احد أحق بماله من والده وولده والناس أجمعين'' (سنن کبری ۷/ ۷۹۰)

پانچویں سوال کے جواب میں بعض لوگوں نے بغیر کسی تفصیل کے لکھا ہے کہ کھانے والے کی آمدنی میں گھر کا کام کرنے والے بھی برابر کے حقدار ہوں گے، اس لیے کہ گھر کا کام دیکھنے والے نے ایک ذمہ داری سنبھال کر دوسروں کو کمانے کے لئے فارغ کر دیا ہے، ان کے اسماء گرامی یہ ہیں: مفتی انور علی، حفیظ الرحمان مدنی، سید صادق، مفتی عبدالرحیم، ظہیر احمد، محمد مقصود، معزالدین، افتخار احمد، آخرالذکر نے شامی کی اس عبارت سے استدلال کیا ہے۔

''كذا لو اجتمع اخوة يعملون في تركة أبيهم....'' (رد المحتار ۶۔ ۵۰۲)

مولانا محمد یاسر صاحب لکھتے ہیں کہ کام دیکھنے والے اگر کام کرنے والوں کے حکم سے یا آپسی معاہدہ سے کام دیکھتے ہوں تو آپسی معاہدہ اور تناصر کی بنیاد پر ایک دوسرے کے برابر شریک ہوں گے ورنہ نہیں۔

مولانا اختر امام عادل، مولانا عبداللطیف پالنپوری کی رائے ہے کہ مشترکہ کاروبار ہونے کی صورت میں گھر دیکھنے والوں کا برابر حصہ ہوگا، اور مشترکہ نہ ہونے کی صورت میں جو رقم گھر کے خرچ کے لئے دی گئی ہے، اس میں سب برابر کے شریک ہوں گے، اور جو رقم کمانے والوں نے اپنے پاس رکھ لی ہے، اس میں دیگر حضرات کا حصہ دار ہونا بہت مشکل ہے، مولانا اختر امام عادل نے حوالے کے طور پر شامی کی مذکورہ عبارت نقل کی ہے۔

مولانا جمیل احمد نذیری لکھتے ہیں کہ سب ایک ساتھ کھاتے پیتے ہوں تو کمانے والے کی آمدنی سے بنائی ہوئی زمین و جائداد میں گھر کا کام کرنے والے برابر کے حقدار ہوں گے۔

''سئل في اخوة أربعة تلقوا عن أبيهم تركة فأخذوا في الاكتساب والعمل فيها جملة كل على قدر استطاعة. هل تكون جميع التركة وما حصلوا بالاكتساب بينهم سوية؟... أجاب نعم'' (الفتاوی الخیریة ۱۔ ۱۱۲) اور مولانا شاہ جہاں ندوی لکھتے ہیں کہ متروکہ یا مشترکہ مال سے کاروبار کرنے کی صورت میں سب برابر کے حقدار ہوں گے۔

''كذلك لو كان اخوة أربعة في عائلة واحدة وسعوا في تكثير وتنمية الأموال الموروثة عن أبيهم. فتقسم الأقسام بينهم بالسوية ولا ينظر إلى اختلاف عملهم'' (درر الحکام ۳۔ ۴۴۹)

مولانا ذکاء اللہ، مولانا محمد آصف، مولانا ابرار خاں ندوی، مولانا شاہ جہاں ندوی (کاروبار مشترک نہ ہونے کی صورت میں) لکھتے ہیں کہ کمانے والے افراد کی آمدنی میں گھر کا کام دیکھنے والوں کا کوئی حصہ نہیں ہے، مولانا محمد ابرار اور مولانا شاہ جہاں یہ بھی کہتے ہیں کہ بہتر ہوگا کہ جو افراد گھریلو کام میں مصروف رہتے ہیں ان کی اجرت طے کر دی جائے، مولانا شاہ جہاں ندوی نے یہ عبارت نقل کی:

''فإذا كان الأب مزارعا والابن صانع الأحذية فكسب الأب من المزارعة والابن من صنعة الحذاء، فكسب كل واحد منهما لنفسه. فليس للأب المداخلة في كسب ابنه لكونه في عياله'' (درر الحکام ۳۔ ۴۴۵)

مولانا عقیل الرحمان صاحب لکھتے ہیں کہ اگر کسی نے گھر کے دوسرے افراد کے تعاون سے اپنا ذریعہ معاش اختیار کیا ہو، تعاون خواہ مالی ہو یا اخلاقی تو اس آمدنی میں گھر کے تمام لوگ شریک ہوں گے، اور اگر کمانے والے نے اپنا ذریعہ معاش از خود اختیار کیا ہو تو وہ آمدنی مشترک نہ ہوگی۔

''كذا لو اجتمع اخوة يعملون في تركة أبيهم...'' (حوالہ سابق)

والدین کی خدمت و کفالت بیٹیوں پر واجب ہے یا بیٹوں پر بھی؟ اس سوال کے جواب میں تمام مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ والدین کی خدمت و کفالت بیٹوں کے ساتھ بیٹیوں پر بھی واجب ہے، اور دلیل کے طور پر نفقہ سے متعلق فقہی عبارتیں نقل کی گئی ہیں۔

اور مولانا اختر امام عادل نے یہ عبارت نقل کی ہے:

''ولو أبوها ... زمنا فاحتاجها فعليها تعاهده، ولو كان كافراً، وإن أبي الزوج (فتح. در مختار) إلى مريضا فرضيا طويلا، وهذا إذا لم يكن من يقوم عليه لأن ذلك من المصاحبة بالمعروف المامور بها ... لرجحان حق الوالد'' (رد المحتار ۵-۲۵۷، ط: دیوبند)

بہو پر ساس، سسر کی خدمت واجب ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں زیادہ تر لوگوں نے لکھا ہے کہ قضاءً بہو پر خدمت واجب نہیں ہے یہاں تک کہ قانونی طور پر جس شخص کی وہ بیوی ہے وہ بھی اپنی خدمت کے لئے اسے مجبور نہیں کرسکتا ہے۔ دلیل کے طور پر وہ فقہی عبارتیں نقل کی گئی ہیں جن میں عورت کے نفقہ کا حکم ہے، البتہ اخلاقی طور پر بہو کو ساس وغیرہ کی خدمت انجام دینی چاہئے، مولانا اختر امام عادل کہتے ہیں کہ یہ سارا معاملہ اخلاقی ہے، اسی بنیاد پر ''المعروف کالمشروط'' کے اصول پر ساس، سسر کی خدمت اور دیکھ بھال کا بار بہو پر ڈالا جاسکتا ہے، مولانا جمیل احمد نذیری لکھتے ہیں کہ صلہ رحمی سے متعلق احادیث کی روشنی میں اس کے لئے خدمت مستحب ہے، لیکن بہو کے علاوہ کوئی اور موجود نہ ہو اور والدین کی ہلاکت کا اندیشہ ہو تو خدمت واجب ہے، قاضی ذکاء اللہ مفتاحی اور مولانا محمد یاسر قاسمی لکھتے ہیں کہ بہو پر خدمت نہ قضاءً واجب ہے اور نہ دیانۃً، البتہ اگر شوہر بیوی کو حکم دے تو شوہر کی اطاعت واجب ہوگی، مولانا یاسر صاحب نے یہ عبارت نقل کی ہے۔

''وحقه عليها أن تطيعه في كل مباح يأمرها به ... ظاهره أنه عند الأمر به منه يكون واجبا عليها كأمر السلطان الرعية به'' (رد ۴-۲۸۸)

مولانا محمد مقصود صاحب اور راقم نے لکھا ہے کہ والدین کی خدمت بیٹیوں پر بھی واجب ہے اور بہو پر بھی، اس لئے کہ جس ماحول اور معاشرہ میں قرآن نازل ہے وہاں کا عرف رواج یہی تھا کہ عورتیں شوہر سے متعلق اس کے گھر کے کام کو انجام دیا کرتی تھیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ولهن مثل الذي عليهن بالمعروف" (البقرۃ:۲۲۸)، "وعاشروهن بالمعروف" اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت کے لئے شوہر کی اطاعت فرض ہے، یہ بڑی عجیب بات ہوگی کہ شوہر دن بھر رزق کی تلاش میں سرگرداں رہے اور شام کو پکا ہوا کھانا ساتھ میں ہوٹل سے لائے یا خود ہی آ کر پکائے اور عورت کو کھلائے، اور وہ دن بھر گھر میں بیکار بیٹھی رہے، جنسی فائدہ اٹھانے میں مرد وعورت برابر کے شریک ہیں، لہٰذا اس کی وجہ سے تمام تر ذمہ داری مرد پر ڈال دینا کسی بھی حیثیت سے درست نہیں ہے۔

ساتویں سوال کے جواب میں بھی تقریباً تمام ہی لوگوں نے لکھا ہے کہ غیر محرم رشتہ داروں سے پردہ واجب ہے اور اس میں چہرہ چھپانا بھی شامل ہے، اسی طرح سے بیشتر لوگوں کی رائے ہے کہ مشترکہ خاندانی نظام میں بھی اس کی رعایت ضروری ہے...... اس کے برخلاف مولانا اختر امام عادل، مفتی انور علی، مولانا محمد آصف، مولانا شاہ جہاں ندوی اور راقم کی رائے ہے کہ مشترکہ خاندانی نظام میں مجبوری کی وجہ سے جبکہ فتنہ کا اندیشہ ہو نہ ہو چہرہ کھولنے کی اجازت ہے، اور مولانا محمد مقصود صاحب لکھتے ہیں کہ شریعت مطہرہ نے چہرہ وغیرہ کو پردہ میں شامل نہیں کیا ہے۔

☆☆☆

دوسرا باب تفصیلی مقالات

مشترکہ خاندانی نظام اور اس کے مسائل

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی[1]

مسلمانوں کے مسائل مجموعی طور پر دو نوعیتوں کے ہیں، ایک تو ان کے دین سے تعلق رکھنے والے ہیں، ان میں ان کا پرسنل لا ہے، اور عبادات اور واجبات دینی پر عمل ہے، تو اس کے لئے دستور ہند میں اجازت ہے، اس اجازت کے حوالہ سے ہم کو حکومت سے جو حاصل کرنا ہو اس کا مطالبہ ہم حکومت سے کریں، اور دستور کا حوالہ دے کر جمہوری طریقہ سے اصرار کا مؤثر ذریعہ استعمال کریں، اس کے لئے افہام وتفہیم سے کام لینے کی جو مؤثر کوشش ہوسکتی ہے اختیار کریں، لیکن عبادات اور واجبات دینی کا بڑا تعلق خود اپنے عمل سے ہے۔ اپنے دین پر عمل کرنے والے کے لئے عموماً رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا، اپنے پرسنل لا پر عمل کرنے میں غیروں کی طرف سے عموماً رکاوٹ نہیں ہوتی، کچھ رکاوٹ ہو تو افہام وتفہیم اور دستور کے حوالہ سے عدالتی اور جمہوری ذرائع سے کام لیا جاسکتا ہے۔

اور جہاں تک ملکی معاملات اور سماجی مسائل کا تعلق ہے تو وہ بڑی حد تک تو خود اپنے ملی ذرائع سے حل کئے جاسکتے ہیں، مثلاً دار القضاء کا ذریعہ ہے اور اصل بات تو یہ ہے کہ شریعت اسلامی کی خود سے پاسداری کرنا ہے، لیکن اگر مسلمان شرعی احکام کے سلسلہ میں خود غیروں کی مدد کا خواہاں ہو تو ایسے میں کیا کیا جاسکتا ہے؟ یہ تو اسلامی شریعت کو ماننے سے گریز کی علامت ہے، جس کا علاج ملت اسلامیہ کے پاس کیا ہوسکتا ہے؟ اس کا مسئلہ خدا کے سامنے جواب دہی کا ہے، آخرت میں اس کو اس کا سامنا کرنا ہوگا، البتہ اس سلسلہ میں ملت کے دانشور اور ملی ادارے ایسی ایسی تدابیر اختیار کرسکتے ہیں جو ان مسائل میں مسلمانوں کے لئے حل نکالنے کا انتظام کرتے ہوں، اور ان کی رہنمائی کرتے ہوں اور دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ غیر حکومتی ادارے ملک وملت کے بہت سے مسائل کو حل کرلیتے ہیں، اور اس طریقہ سے بہت حد تک کام چل جاتا ہے۔

تمام مذاہب میں اسلام کا یہ نمایاں امتیاز اور اس کی بنیادی خصوصیت ہے کہ اس نے ایک مکمل نظام زندگی پیش کیا ہے، دین کا دائرہ صرف ان مظاہر وحالات تک محدود نہیں رکھا جن کو عام مروجہ اصطلاح میں مذہبی سمجھا جاتا ہے، اور اس کا ایک خانہ متعین کردیا جاتا ہے، بلکہ اس کا دائرہ بہت وسیع رکھا ہے، اس میں زندگی کے ہر شعبہ کو سمیٹتے ہوئے زندگی کے ایک ایک لمحے کے لئے اور ہر قسم کے مسائل کے لئے اسلامی تعلیمات موجود ہیں، اور اصول وضوابط متعین کئے گئے ہیں، کوئی مسلمان ان سے آزاد رہ کر پورا مسلمان نہیں رہ سکتا، اسی کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یوں بیان فرمایا ہے: "یا أیھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ" (سورہ بقرہ: ۲۰۸) (اے ایمان والو! دین میں پورے پورے داخل ہوجاؤ)۔ قابل غور بات یہ ہے کہ خطاب ان لوگوں سے کیا جارہا ہے جو صاحب ایمان ہیں، اس سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ یہاں اصل مسئلہ یہ ہے کہ جو لوگ ایمان والے کہلاتے ہیں، ان کو توجہ دلائی جارہی ہے کہ وہ پورے دین کو اختیار کریں اور دین کو چند رسوم وعبادات تک محدود نہ سمجھیں، یہ ایک بڑی اہم اور اصولی بات ہے کہ دین کو خانوں میں تقسیم نہ کیا جائے؛ بلکہ ہر مسلمان کو یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ وہ اپنے کسی بھی معاملے میں آزاد نہیں ہے، بلکہ دین وشریعت کا پابند ہے۔

اجتماعی زندگی کو اسلام میں خاص اہمیت حاصل ہے، اور عائلی زندگی اسی اجتماعی زندگی کا ایک ایسا پہلو ہے جس سے کم وبیش سب کو سابقہ پڑتا ہے، اسلام میں اس عائلی زندگی کے لئے بڑی تفصیلات موجود ہیں، قرآن وحدیث میں اس کو جگہ جگہ واضح کیا گیا ہے، اس میں شبہ نہیں ہے کہ

---

[1] صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، وناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

دوسرے مذاہب اور فلسفوں میں بھی عائلی زندگی کا نظام پیش کیا گیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ وہ خود ساختہ نظام ہے، جہاں انسان نے جگہ جگہ ٹھوکر کھائی ہے، موجودہ مذاہب کی ان کتابوں میں جو مقدس کہلاتی ہیں اور ان کو آسمانی کتابیں کہا جاتا ہے، عائلی زندگی کے بارے میں ہم کو موٹی موٹی باتیں بھی نہیں ملتیں۔ یہ وہ آسمانی کتابیں ہیں جن پر انسانی ہاتھوں نے بڑی بے دردی کے ساتھ عمل جراحی کیا ہے، انسانوں نے خود اپنے لئے جو نظام زندگی اختیار کیا ہے اس میں جگہ جگہ فطرت سے انحراف پایا جاتا ہے۔ یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس کی تعلیمات وہدایات من وعن باقی ہیں، اور قیامت تک باقی رہیں گی۔ یہ اس خدائے حکیم وخبیر کی طرف سے دی گئی ہدایات ہیں، جو انسان کا خالق اور فطرت انسانی سے پوری طرح باخبر ہے: "ألا یعلم من خلق وھو اللطیف الخبیر" (سورہ الملک: ۱۴) (کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے، جبکہ وہ بہت لطف کا معاملہ کرنے والا اور بہت باریک بیں ہے)۔

عائلی زندگی کے لئے دی گئی ہدایات میں جن باریکیوں کا لحاظ کیا گیا ہے، ان سے خود اس کی حقانیت ظاہر ہوتی ہے جس کا عملی نمونہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شب وروز ہیں، آپ جیسا انسان کامل نہ اس دنیا نے دیکھا ہے اور نہ دیکھ سکے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شادیاں بھی کیں، آپ کی اولادیں بھی ہوئیں، آپ کا گھر والوں کے ساتھ کیا برتاؤ تھا؟ اور اس سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہدایات دیں؟ حدیث وسیرت میں اس کا پورا دفتر موجود ہے، جس سے عقائد وعبادات کے ساتھ معاملات ومعاشرت کا توازن نظر آتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو گھر والوں کے لئے بہتر ہو، اور میں تم میں سب سے زیادہ اپنے گھر والوں کے لئے بہتر ہوں۔

گھر کے کام کاج میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس شریک ہوتے، اور مزاح بھی فرماتے، ہنسی خوشی کے موقع پر اس کا اظہار فرماتے اور گھل مل کر رہتے، البتہ کوئی خلاف دین بات سامنے آجاتی تو سخت ناراض ہوتے، اور سختی سے روک دیتے۔ حضرات حسن وحسین رضی اللہ عنہما سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑی محبت تھی، ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے وہ سامنے آگئے تو آپ منبر سے اتر پڑے اور گود میں اٹھایا، حضرت فاطمہؓ سے آپ کو بڑی محبت تھی، سفر سے واپس تشریف لے آتے تو پہلے ان کے گھر تشریف لے جاتے، لیکن ایک مرتبہ انہوں نے حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما کو کنگن پہنا دیئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت ناراض ہوئے۔ یہ ساری چیزیں نمونے کی ہیں کہ ایک انسان کس طرح زندگی گزارے اور گھر والوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرے؟ ایک صحابی کو خطاب کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ولیسعك بیتك" (تمہیں تمہارا گھر اچھا لگے)۔

نکاح کا طریقہ کیا ہے؟ کس طرح اس میں سادگی اختیار کی جائے، فضول خرچی سے بچا جائے، اس کے آداب کیا ہیں؟ احادیث میں اس کی تفصیلات موجود ہیں، ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ اے نوجوانو! تم میں جو بھی خرچ وغیرہ کا انتظام کرسکتا ہو اس کو شادی کر لینی چاہئے، اور اگر ممکن نہ ہو تو روزے رکھے، اس سے شہوت ٹوٹے گی۔ آج معاشرے کے بگاڑ کا بنیادی سبب یہی ہے کہ شادیوں میں تاخیر کی جاتی ہے، بے حیائیاں بڑھتی چلی جارہی ہیں، اور شادیوں میں تاخیر کی ایک بڑی وجہ اس میں بے جا اسراف ہے، جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "أعظم النکاح برکة أیسرھا مؤونة" (کہ سب سے زیادہ بابرکت نکاح وہ ہے جس میں کم سے کم خرچ ہو)۔

گھر میں اگر کبھی جھگڑے کی نوبت آجائے تو کیا حکمت عملی اختیار کی جائے؟ آج کی صورت حال یہ ہے کہ غصہ آیا اور طلاق دیدی، اور تعداد میں بھی حدود شریعت کا کوئی پاس نہیں، حالانکہ اس کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے خود صلح صفائی کی کوشش کرے، ممکن نہ ہو سکے تو ثالثی کرائے، اس سے بھی بات نہ بنے تو پہلے بستر الگ کرے، اس سے بھی مسئلہ حل نہ ہو، اور سوائے طلاق کے اور کوئی حل باقی نہ رہ جائے تو شرعی طلاق دے، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک طلاق ایک طہر میں دے، عدت گزر جانے دے، طلاق پڑ گئی، تین طلاقیں دینے کی عام طور پر کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ محض لاعلمی، جہالت اور غصہ میں بے قابو ہوجانے کا نتیجہ ہوتا ہے۔

بچوں کی تعلیم وتربیت کی فکر ہمارے عائلی نظام کا اہم ترین حصہ ہے، شروع سے اس کی فکر نہ کی جائے تو یہی بچے آگے چل کر ہاتھ سے نکل جاتے ہیں، اور ماں باپ کے لئے بعض مرتبہ مصیبت بن جاتے ہیں، اگر شروع سے ہی فکر رکھی جائے تو ان کی اچھی اٹھان ہوتی ہے، حدیث میں آیا ہے کہ بچے سات سال کے ہوجائیں تو نماز کے لئے کہو، اور عادت ڈلواؤ، دس سال کے ہوجائیں اور ضرورت پڑے تو مارو، لیکن مارنے اور تنبیہ کرنے میں بھی اعتدال کی تعلیم دی گئی ہے۔

ماں باپ کا کیا حق ہے؟اس کی تاکید خود قرآن مجید میں جا بجا ہے، اللہ کے حق کے بعد والدین کے حق کا ذکر ہے، یہاں تک کہا گیا کہ اگر وہ مشرک ہوں تو بھی حسن سلوک کئے جاؤ، بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو وہ تمہاری جنت ہیں یا جہنم، اگر تابعداری اور سلوک کرو گے تو جنت ہیں اور اگر بدسلوکی کی تو جہنم میں پہنچنے کا ذریعہ ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ عائلی زندگی کی تفصیلات یہاں تک موجود ہیں کہ خادم اور ملازمہ کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے؟ اس وقت اس کی بڑی ضرورت ہے کہ مسلمان اس کی طرف توجہ کریں، تاکہ گھروں کا نظام اسلامی بنایا جاسکے، اور اس کے نتیجے میں ہمارا معاشرہ درست ہو۔

حضرات! اللہ تعالیٰ نے ''سورۂ نساء'' کی پہلی آیت میں انسانوں کے ازدواجی نظام کی حکمت ومصلحت کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس کے تقاضے کو سمجھنے اور ذمہ داری کے ساتھ پورا کرنے کی ہدایت کی ہے، اور عائلی زندگی کے تعلق سے رب العالمین کے احکام کی پیروی میں مخلصانہ طرز عمل اختیار کرنے کی تاکید کی ہے، اور بتایا ہے کہ انسان کی تخلیق جو اس نے حضرت آدم علیہ السلام سے کی ہے، پھر ان سے ان کا جوڑا پیدا کر کے دونوں کے تعلق کو نسل انسانی کا سلسلہ قائم ہونے کا ذریعہ بنادیا، اور اس طرح مرد وعورت کا انسانی جوڑا بنتے رہنے سے انسانی نسل کی افزائش کا سلسلہ قائم فرمادیا، لیکن انسانوں کو پابند بنایا کہ مرد وعورت کے تعلق سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں ان کو پروردگار عالم جو کہ ہر چیز سے باخبر ہے، اس کے بتائے ہوئے طریقے سے حل کرنا چاہئے، اور یہ کہ یہ صرف ایک نصیحت نہیں، بلکہ واجب التعمیل حکم ہے، فرمایا: "یاأیھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالاً کثیراً ونساءً واتقوا اللہ الذی تساءلون بہ والأرحام إن اللہ کان علیکم رقیباً" (سورہ نساء:۱) (اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا، اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا، اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں، اور تم خدا تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے سوال کیا کرتے ہو اور قرابت سے بھی ڈرو، بالیقین اللہ تعالیٰ تم سب کی اطلاع رکھتے ہیں)۔

اگر مسلمان ان ہدایات کا خیال رکھیں، اور خاص طور پر پروردگار کی طرف سے دی گئی تاکید کو سامنے رکھتے ہوئے لحاظ اور پابندی کریں تو ازدواجی زندگی میں جو کشمکش، ظلم اور حق تلفی کے واقعات سامنے آتے ہیں، وہ پیش نہ آئیں، یہ پریشانیوں کا سلسلہ جو ہر جگہ نظر آتا ہے، کبھی اس کو عورت کے ساتھ مرد کی زیادتی کے رنگ میں دیکھا جاتا ہے، اور کبھی بیوی کی طرف سے شوہر کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کی شکل میں دیکھا جاتا ہے، اور پھر دونوں میں سے ہر ایک کو دوسرے سے شکایات ہوتی ہیں، جو معاشرتی زندگی کے امن وعافیت کو سخت نقصان پہنچاتی ہیں، یہ چیزیں تقریباً پیش نہ آئیں۔

پہلی بات یہ ہے جو آیت کی رو سے ہمارے سامنے واضح ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنے ہر عمل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر اور اس کی ناراضگی سے بچنے کا پورا لحاظ ہو، اور وہ ایسے سارے کاموں میں جن میں اللہ تعالیٰ کا حکم صاف طریقے سے موجود ہے، پھونک پھونک کر قدم رکھیں، تقویٰ کا یہی مطلب بتایا گیا ہے، اور عقد نکاح کے آغاز سے مقررہ احتیاط ولحاظ سے عمل کیا جائے گا، تو بہتر زندگی اور ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی کی راہ ہموار ہوجائے گی۔

اس کیفیت کے پیدا کرنے کے لئے اولین عمل یہ ہوگا کہ زوجین کے انتخاب کے مرحلہ سے ہی اسلامی تعلیمات پر عمل کیا جائے اور جب دونوں کو تاحیات رفاقت کی زندگی گزارنا ہے تو یہ ضروری ہے کہ دونوں کے مزاج اور تصورات میں ضروری حد تک ہم آہنگی ہو، جیسے کوئی شخص جب کسی کو دوست بناتا ہے تو ایسے کو بناتا ہے جس سے اس کی بڑی حد تک ہم آہنگی ہو، اس ہم آہنگی سے ایک دوسرے کے درمیان انس پیدا ہوتا ہے اور شریعت میں اس کی اچھی رہنمائی کی گئی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ نکاح چار وجوہ سے کیا جاتا ہے، عورت کے حسن وجمال کو دیکھ کر، اس کی خوشحالی کو دیکھ کر، حسب ونسب کو دیکھ کر اور دینداری کو دیکھ کر۔ دینداری کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور ناراضگی کا لحاظ رکھنے کی صفت۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ میں مختلف وجوہ میں سے دین والے پہلو کو ترجیح دینے کا مشورہ عطا فرمایا۔ ظاہر ہے کہ جب دین کا خیال ہوگا، اللہ کی رضامندی اور ناراضگی کا خیال ہوگا تو دونوں طرف سے حقوق کی ادائیگی کا خیال رکھا جائے گا اور اس سے آپس میں ہم آہنگی اور انس کی کیفیت وفضا پیدا ہوتی رہے گی، اور کسی مسئلہ میں شکایت یا کمی کا احساس ہوگا تو وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی طلب میں آپس کی بات چیت سے حل کرلیا جائے گا۔

ت یہ ہے کہ ہمارے مسلم معاشرہ میں نکاح کے سلسلہ میں اللہ تعالی کی رضا مندی اور ناراضگی کو سوچنے کا رواج ہی ختم ہوگیا ہے،
لذت اور زندگی کی مادی ضرورت کی حد تک محدود کر دیا گیا ہے، چنانچہ ذرا ذرا سی بات پر شکایت کا موقع نکلتا ہے اور وہ بڑھ کر
گر اس میں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شرعی حکم کی پابندی کی جائے تو مسائل کے سنگین بننے کا خطرہ ہی نہ رہے۔

ہے کہ بیوی یا شوہر کے انتخاب میں نیک صفت و دینی لحاظ کا خیال نہیں کیا جاتا، صرف مادی فائدہ کو دیکھا جاتا ہے، اور اس میں
ی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، لہذا اکثرت سے دونوں کے درمیان ہم آہنگی کی خصوصیات کے ہونے کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا، پھر
نے کے بعد اس کے خلاف باتیں بتدریج سامنے آتی ہیں، اور تعلقات خراب ہوکر حالات بہت بگڑ جاتے ہیں، ان کو من مانے
کوشش ہوتی ہے، لہذا معاملہ اور بگڑ جاتا ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ عقد نکاح میں اولاً شریعت کی پابندی کو پیش نظر رکھا جائے
ں پوری سوجھ بوجھ اور مناسب انتخاب سے کام لیا جائے، دونوں میں مناسبت اور ہم آہنگی کے حاصل ہونے کا پہلے سے صحیح
تخاب صحیح ہو، اور دونوں کی رفاقت کا انداز قابل اطمینان اور راحت پہنچانے والا اور عافیت وانس ومحبت لانے والا ثابت ہو،
پیدا ہونے کے وقت زوجین کو پہلی فکر یہ ہو کہ وہ شریعت کے احکام کو اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور ہدایت کو پوری طرح
یعنی اللہ تعالی کے ڈر اور دین سے تعلق کی صفت کو ترجیح دی جائے تو انشاء اللہ نکاح اور طلاق کے معاملات کے پریشانی کا
رہے گا۔

اح امت اسلامیہ کے برگزیدہ امت ہونے کے تعلق سے ایک بہت ضروری عمل ہے، جو امت کے دانشوروں کو اپنا فریضہ
عاشرہ ہی امت کے برگزیدہ امت ہونے کی علامت ہوتا ہے، اسی بات کا لحاظ کرتے ہوئے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
حصہ اس میں بھی لگایا ہے، چنانچہ اس کے لئے کمیٹی مقرر ہے، جو ملک میں مسلم معاشرہ کو اس کے معیاری مقام پر لانے کی
کرتی ہے، لیکن بورڈ اس کام کو صرف اپنے تک محدود نہیں سمجھتا، بلکہ امت کے مختلف ادارے اور جماعتیں اس کام میں جو
کام سمجھتا اور اس کی قدر کرتا ہے اور ان کو اس خصوصیت کا حقدار بھی سمجھتا ہے۔

، کہ ''مجمع الفقہ الاسلامی'' (انڈیا) جس کو فقیہ ملت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے بڑے جذبہ کے ساتھ قائم کیا تھا، اور
م مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب زیدت مکارمہ و مآثرہ اس کے کام کو آگے بڑھا رہے ہیں، اور نئے قابل غور مسائل
س وسمینار کا انعقاد کرتے ہیں، رام پور (اتر پردیش) میں ۵ - ۷ ر مارچ ۲۰۱۱ء کو ایک اہم سمینار کا انعقاد کر رہے ہیں، جس
ں وسائل اور اس کے شرعی احکام''، ''تفریح اور اس کے جائز حدود''، ''مختلف النوع ملازمتوں کے احکام'' اور ''مشترکہ
ئل'' ہیں۔ آخر الذکر موضوع کو میں نے اپنے مقالہ کے لئے منتخب کیا، اور اس سلسلہ میں کچھ معروضات پیش کیں۔

سے دعا ہے کہ وہ سمینار کو کامیاب فرمائے اور ان کوششوں کو قبول فرمائے کہ تغیر پذیر دنیا میں نئے نئے مسائل ایسے پیدا
و خوض اور مشاورتی میٹنگوں اور سمیناروں کی ضرورت بڑھتی جارہی ہے، یہ ایک مفید کام ہے، جس کی طرف ہمارے فضلاء

☆☆☆

مشترکہ اور جداگانہ خاندانی نظام

مفتی حافظ سید صادق محی الدین فہیم [1]

اللہ سبحانہ وتعالی نے دنیا کے نظام میں ہر چیز کے جوڑے بنائے ہیں، تاکہ ان کے وجود کو بقا ملے: "ومن کل شئی خلقنا زوجین لعلکم تذکرون" (سورہ الذاریات: ۴۹) ساری مخلوقات میں انسان اشرف المخلوقات ہیں، نسل انسانی کی بقا کیلئے یہ نظام فطری طور پر ان کے اندر بھی رکھا گیا ہے، اسی لئے نسل انسانی کی صنف میں مرد وعورت (مذکر ومونث) بنائے گئے ہیں۔ حق سبحانہ وتعالی کے اس تخلیقی نظام کی تکمیل مرد وعورت کے درمیان نکاح کے ذریعہ پوری ہوتی ہے۔ خاندانی نظام کی بنیاد مرد وعورت ہوتے ہیں، اس نظام میں مرد کی حیثیت قوام کی ہے، اسی وجہ سے مرد کو مالی ودیگر بنیادی ضروریات کی تکمیل کا ذمہ دار بنایا گیا ہے: "الرجال قوامون علی النساء" (نساء: ۳۴)، اس نظام میں عورت پر خاندان کے گھریلو انتظام وانصرام کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے اور اس کو مرد کیلئے تسکین وراحت کا ذریعہ بنایا گیا ہے: "ومن آیتہ أن خلقکم من أنفسکم أزواجا لتسکنوا إلیھا" (روم: ۲۱)، ازدواجی رشتہ کی بنیاد پر جب اولاد کی نعمت نصیب ہوتی ہے تو ماں باپ اپنی اولاد کے ساتھ مل کر خاندانی نظام کی تشکیل کرتے ہیں۔ ایک انسان جب اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے تو اس کی پیدائش کا ذریعہ وہ وسیلہ چونکہ ماں باپ ہوتے ہیں، اس لئے اس کا رشتہ فطری طور پر ماں باپ سے قائم ہوتا ہے، پھر ماں باپ کے سوا دیگر افراد جیسے بھائی، بہن اور اسی طرح قریب ودور کے کئی ایک افراد سے اس کے رشتہ قائم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے رشتے خونی رشتے کہلاتے ہیں، ان تمام سے مل کر ایک خاندان بنتا ہے، تمدن فطری طور پر انسان کو بخشا گیا ہے، اس لئے وہ اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ مل کر معاشرتی زندگی اختیار کرتا ہے، فطری طور پر وہ اپنے جیسے انسانوں سے جدا رہ کر پرسکون زندگی نہیں گزار سکتا، کیونکہ ہر انسان قدم قدم پر دوسرے انسانوں کی مدد اور ان کے تعاون کا محتاج رہتا ہے جتنی بنیادی ضروریات ہیں ان سب میں بھی ایک انسان کی احتیاج دوسرے سے مربوط رکھی گئی ہے، اس لئے انسانی تمدن خاندان اور معاشرت ہی کے ذریعہ تکمیل پاتا ہے، اور ان مقاصد کی تکمیل اور ان فوائد کی تحصیل کیلئے ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ ایک دادا کی ساری اولاد سب کے سب ایک ہی رہائش گاہ میں رہیں، جداگانہ خاندانی نظام پر عمل پیرا ہو کر بھی اسلام کے احکام وقواعد کی روشنی میں حسن معاشرت اختیار کر کے ان مقاصد وفوائد سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک دوسرے کے حقوق وفرائض کی ادائیگی اور انسانی سلوک اور آپسی رواداری وسیر چشمی کے ساتھ زندگی گزارنے کیلئے نظام خاندانی کی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے۔ انسان اور حیوان کے درمیان ایک بڑا فرق خاندان کا بھی ہے، حیوانوں کے درمیان کوئی خاندانی نظام نہیں ہوتا، ان کی نسلی بقاء فطری طور پر توالد وتناسل سے جاری ضرور رہتی ہے، لیکن ان کی نسل جب زندگی کے شعور کو پالیتی ہے تو وہ اپنے ماں باپ وغیرہ سے کسی طرح کا تعلق برقرار نہیں رکھتی، نہ ان کا کوئی خاندان یا قبیلہ بنتا ہے۔

حق سبحانہ وتعالی نے انسانی فطرت میں خاندانی نظام کی برقراری کا شعور بخشا ہے، اب سوال یہ ہے کہ ایک چھت تلے مل جل کر زندگی گزارنے کیلئے خاندان کا دائرہ کار کن افراد تک محدود ہو، خاندانی نظام مشترکہ ہو یا جداگانہ یہ ایک اہم سوال اور عصر حاضر کا سلگتا ہوا موضوع ہے اس پر بڑی دقیق وگہری نظر کے ساتھ غور وفکر کی ضرورت ہے، انسانی نفسیات کے اسلامی ماہرین نے بھی اس موضوع کو تشنہ نہیں چھوڑا، اس پس منظر میں کئی ایک اعتبارات اور مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا جائے تو اسلامی نقطۂ نظر سے جداگانہ نظام خاندان کی تائید معلوم ہوتی ہے، خاندان کا آغاز چونکہ نکاح کی بنیاد پر مرد وعورت سے ہوتا ہے، اور حق سبحانہ وتعالی نے مرد کو قوام بنایا ہے، اس لئے قوام ہونے کی نسبت سے شوہر اپنی بیوی کی تمام ضروریات کی تکمیل کا پابند ہو جاتا ہے۔ ان ضروریات میں بنیادی حیثیت کھانے پینے، پہنے اوڑھنے کے مناسب انتظام کے ساتھ مناسب رہائش کے انتظام کو حاصل ہے، یہ فریضہ شریعت نے مرد پر عائد کیا ہے۔ ایک بڑے مکان میں جس کے رہائشی گوشے علحدہ علحدہ ہوں کئی خاندان مل جل کر اس میں رہ سکتے ہیں جس میں ان کے پکوان وضروریات زندگی کی دیگر سہولتیں ان کے اس گوشہ میں شامل ہوں، چنانچہ ہمارے اسلاف سے اس طرح کی رہائش کا

[1] موسس، صدر نشیں دار القضاء والافتاء للہند، آندھرا پردیش۔

ثبوت ملتا ہے، جیسا کہ اس روایت سے ثابت ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ان میں سے کسی کے ہاں کوئی مہمان آجاتا تو وہ دوسرے کے ہاں پکی ہوئی ہانڈی اپنے مہمان کیلئے ان کی اجازت کے بغیر اٹھالاتے، اس درجہ ان کے اندر مودت ومحبت تھی کہ وہ اس پر ناراض ہونے کے بجائے دعا دیتے کہ اللہ سبحانہ وتعالی اس میں تمہارے لئے برکت دے، اسی طرح روٹی وغیرہ کی ضرورت ہوتی تو اسی طرح کا عمل کرتے:

”قال: حدثنا محمد بن زياد قال: أدركت السلف وأنهم ليكونون في المنزل الواحد بأهاليهم. فربما نزل على بعضهم الضيف وقدر أحدهم على النار فيأخذها صاحب الضيف لضيفه فيفقد القدر صاحبها، فيقول من أخذ القدر؟ فيقول صاحب الضيف: نحن أخذناها لضيفنا. فيقول صاحب القدر: بارك الله لكم فيها أو كلمة نحوها. قال بقية وقال محمد: والقبض إذا قبضوا مثل ذلك وليس بينهم الأجدر القصب قال بقية: وأدركت أنا ذلك محمد بن زياد وأصحابه“ (الأدب المفرد، باب دالة اهل الاسلام بعضهم على بعض، ص۱۰۹)

اسلام کے نظام معاشرت میں سکنیٰ، یعنی رہائش کی فراہمی بڑی اہمیت رکھتی ہے، بیوی کیلئے رہائش کا انتظام شریعت نے شوہر پر واجب کیا ہے اور یہ حکم فقہاء کے درمیان متفق علیہ ہے، کیونکہ حق سبحانہ وتعالی نے مطلقہ کی رہائش کو اس کے شوہر پر واجب کیا ہے۔ ارشاد ہے: "أسكنوهن من حيث سكنتم من وجدكم" (الطلاق:٦) تو پھر رشتہ نکاح کے استحکام کے ساتھ برقراری کی صورت میں یہ فریضہ بدرجہ اولی شوہر پر واجب ہوگا۔ حق سبحانہ وتعالی نے بیویوں کے ساتھ عرف ودستور کے موافق حسن معاشرت اختیار کرنے کی ہدایت دی ہے: "وعاشروهن بالمعروف" (النساء:۱۹)، عرف کے مطابق یہی بات قابل عمل ہے کہ بیوی کیلئے ایک ایسی رہائش کا انتظام ہو جس میں وہ اپنے جان ومال سے متعلق بالکل مامون اور بے خوف وخطر رہ سکے، کئی ایک اعتبارات سے بیوی انتظام رہائش سے مستغنی نہیں ہے۔ اجانب سے ستر وحجاب، متاع حیات سے استفادہ، سامان کی حفاظت وغیرہ جیسے امور اس سے متعلق ہیں (ملخص الموسوعۃ الفقہیہ ۱۰۸/۲۵)، "والسكنى في بيت خال عن أهله وأهلها" (کنز الدقائق)، (ایک ایسا مکان ہو جس میں شوہر اور بیوی کے افراد خاندان میں سے کوئی نہ ہو)۔ "وعلى الزوج أن يسكنها في دار مفردة ليس فيها أحد من أهله. إلا أن تختار ذلك: لأن السكنى من كفايتها، فيجب لها كالنفقة. وقد أوجبه الله تعالى مقرونا بالنفقة (مقرونا بالنفقة) في قوله تعالى: "اسكنوهن من حيث سكنتم من وجدكم" (الطلاق٦). فإن المراد: "وأنفقوا عليهن من وجدكم" كذلك قرأ ابن عباس والسكنى بالملك أو الإجارة أو العارية واجبة إجماعا. وفي قرائة ابن مسعود اسكنوهن.... وإذا وجب السكنى حقا لها، فليس له أن يشرك غيرها فيها؛ لأنها تتضرر به. فإنها لا تأمن على متاعها ويمنعها ذلك من المعاشرة ومن الاستمتاع" (فتح القدير، كتاب الطلاق، ج٤، ٢٠٥).

شوہر پر واجب ہے کہ بیوی کیلئے رہائش کا انتظام کرے ایک ایسے مکان کا جو بیوی کیلئے خاص ہو جس میں اس کے متعلقین میں سے کسی اور کی رہائش نہ ہو، الا یہ کہ بیوی خود اوروں کے ساتھ رہنا پسند کرے، کیونکہ رہائش کا انتظام نفقہ ہی کی طرح واجب ہے۔ رہائش کا انتظام مرد پر واجب ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کسی ذاتی مکان کا انتظام کیا جائے، اس ضرورت کی تکمیل کرایہ وغیرہ کے مکان سے بھی ہوسکتی ہے۔ "والسكنى بالملك أو الإجارة أو العارية واجبة إجماعا" (فتح القدير، كتاب الطلاق ٤/ ٢٠٥)...... "سواء كان ملكا أو إجارة أو عارية" (رد المحتار ۷۱۹/۲)، رہائش کے اس بنیادی حق میں شوہر اپنی بیوی کی اجازت ومرضی کے بغیر کسی اور کو شریک نہیں کرسکتا، ہاں البتہ بیوی خود اپنے اس حق میں دوسروں کو شریک رکھنے پر رضامند ہو تو یہ ایک الگ بات ہے۔ چنانچہ ”ہدایہ“ میں ہے: "وإذا وجب حقا ليس له أن يشرك غيرها فيه؛ لأنها تتضرر به. فإنها لا تأمن على متاعها ويمنعها عن المعاشرة مع زوجها ومن الاستمتاع إلا أن تختار ذلك؛ لأنها رضيت بانتقاص حقها" (فتح القدير، كتاب الطلاق ۳۵۷/۴)، (وكذا تجب لها السكنى في بيت خال عن أهله) سوى طفله الذي لا يفهم الجماع وأمته وأم ولده (وأهلها) ولو ولدها من غيره" (درمختار ۷۱۹/۲)، (قوله خال عن أهله الخ)، لأنها تتضرر بمشاركة غيرها فيه. لأنها لا تأمن على متاعها ويمنعها ذلك من المعاشرة مع زوجها ومن الاستمتاع إلا أن تختار ذلك. لأنها رضيت بانتقاص حقها" (ہدایہ ۴۲۱/۲)، رہائش جب بیوی کا واجبی حق ہے تو شوہر کو اختیار نہیں کہ اس کے حق میں کسی اور کو شریک کرے، کیونکہ اس میں اس کیلئے نقصان اور ضرر ہے، اس کو اپنے مال واسباب کے سلسلہ میں پوری طرح اطمینان نہیں رہے گا۔ اپنے شوہر کے ساتھ بے تکلف رہنے اور ازدواجی تعلقات قائم کرنے میں موانعات رہیں گی، مگر یہ کہ وہ اپنا حق کم کرتے ہوئے اس طرح اشتراک کے ساتھ رہنے کو پسند کرے۔

شریعت مطہرہ نے شوہر پر اپنی بیوی سے متعلقہ حقوق کی ادائیگی کے وجوب میں شوہر کے معاشی حالات کو مدنظر رکھا ہے،جس طرح وہ مطلقہ عورت جس کا مہر مقرر نہ ہوا ہو اس سے صحبت وخلوت صحیحہ کی نوبت بھی نہ آتی ہو تو قرآن پاک نے "ومتعوهن على الموسع قدره وعلى المقتر قدره متاعا بالمعروف حقا على المحسنين" (البقرة:۲۳۶) کے ذریعہ صاحب حیثیت کو اپنی حیثیت کے لحاظ سے اور تنگ دست کو اپنی وسعت وگنجائش کے اعتبار سے بطور حسن سلوک عرف ودستور کے مطابق متعہ دینے کی ترغیب دی ہے،اس پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہا جائے گا کہ اگر شوہر غریب ہو تو اپنی بساط کے مطابق اور امیر ہو تو اپنی استطاعت کے مطابق بیوی کی بنیادی ضروریات تکمیل کرنے کا شرعا پابند رہے گا۔فقہاء کرام نے لکھا ہے کسی مشترکہ خاندان میں شوہر اپنی بیوی کیلئے ایک ایسے حصہ رہائش کا انتظام کردے کہ وہ بالکلیہ اس کے قبضہ واختیار میں ہو،یہاں تک کہ اس کی کنجی اور قفل بھی اس کے قبضہ میں رہے تو یہ باعتبار رہائش اس کیلئے کافی متصور ہوگا،کیونکہ اس سے بھی رہائش کا مقصود حاصل ہوجاتا ہے۔ خاص احوال میں جب کہ شوہر کی مالی حیثیت کمزور ہو تو دیگر بنیادی ضروریات مشترکہ ہوسکتی ہیں، اس لئے یہاں پر ''ولہ غلق'' کی قید رکھی گئی ہے۔

اس طرح کی صورت حال میں شرعی نقطہ نظر یہی ہے کہ بیوی کو شوہر کے ساتھ تعاون عمل کرتے ہوئے زندگی گزارنا چاہئے۔ "(ولو أسكنها في بيت من الدار مفردة وله غلق كفاها؛ لأن المقصود قد حصل) اقتصر على الغلق أفاد أنه وإن كان الخلاء مشتركا بعد أن يكون له غلق يخصه، وليس لها أن تطالبه بمسكن آخر" (فتح القدير ۴/ ۳۵۷)

ایک مشترکہ مکان میں ایک حصہ رہائش ایسی ہو جس میں بیوی اپنے مال ومتاع کو بحفاظت تمام رکھ سکے اور خود بھی بے تکلف رہ سکے اور اس میں کسی کی مداخلت نہ ہو تو پھر عورت کو حق نہیں رہتا کہ وہ اس سے زیادہ کا دعوی کرے:

''امرأة أبت أن تسكن مع ضرتها أو مع أحمائها كأمه وغيرها. فإن كان في الدار بيوت وفرغ لها بيت وجعل لبيتها غلق علاحدة ليس لها أن تطلب من الزوج بيتا آخر. فإن لم يكن فيها إلا بيت واحد فلها ذلك'' (عالمگیری ج،باب النفقات فی السکنی) ''فإن كانت دارا فيها بيوت وأعطى لها بيتا يغلق ويفتح لم يكن لها أن تطلب بيتا آخر إذا لم يكن ثمة أحد من أحماء الزوج يؤذيها اهـ'' (رد المحتار ۲-۷۲۰)

اسی طرح اپنے مکان کے ایک حصے میں اپنی بیوی کو اور ایک حصے میں اپنی والدہ کو رکھے تو یہی حکم ہوگا،یعنی علاحدہ مکان کے مطالبہ کا اس کو حق نہیں رہے گا:"وإن أسكن الأم في بيت داره والمرأة في بيت آخر فليس لها غير ذلك" (ردالمحتار ۲/ ۷۲۰)

لیکن صاحب حیثیت شوہر کی طرف سے اس طرح کے انتظام میں صرف اس کی رہائش کیلئے اس کی ضرورت کے مطابق ایک کمرہ یا ایک حصہ مکان کا انتظام کردینے سے حق رہائش کا وجوب ادا نہیں ہوگا، بلکہ اس سے متعلقہ امور جیسے طہارت خانہ، باورچی خانہ وغیرہ کا انتظام بھی علاحدہ طور پر ضروری ہوگا،جس میں کسی اور کی شرکت نہ ہو۔ چنانچہ ''شامی'' میں ہے:علیحدہ گھر سے مراد کہ جس کی کنجی وقفل اور دوسری سہولتیں الگ ہوں، یہ حکم اس بات کا متقاضی ہے کہ طہارت خانہ، باورچی خانہ وغیرہ کی بھی اس میں سہولت ہو:

''وبيت منفرد من دار له غلق زاد في الاختيار والعيني: ومرافق ومفاده لزوم كنيف ومطبخ. وينبغي الإفتاء به بحر (كفاها) لحصول المقصود (هداية) وفي البحر عن الخانية: يشترط أن لا يكون في الدار أحد من أحماء الزوج يؤذيها. ونقل المصنف عن الملتقط كفايته مع الأحماء لا مع الضرائر. فلكل من زوجيته مطالبته ببيت من داره علحدة'' (در مختار ۲-۷۲۰)، ''مطلب في مسكن الزوجة (قوله ومفاده لزوم كنيف ومطبخ) أي بيت الخلاء وموضع الطبخ، بأن يكونا داخل البيت أو في الدار لا يشاركها فيهما أحد من أهل الدار'' (رد المحتار ۲-۷۲۰)

لیکن وہ خاتون جو صاحب حیثیت اور خاندانی بزرگی وشرافت کی حامل ہو تو وہ اس طرح کے انتظام کے باوجود انفرادی رہائش کے انتظام کا مطالبہ کرسکتی ہے۔ہم نے جو اس سے پہلے ذکر کیا ہے کہ ایک بڑے مکان میں رہائش کا گوشہ فراہم کردیا جانا کافی ہوگا، یہ اس عورت کے بارے میں تھا جو عرف ودستور کے مطابق درمیانی درجہ کی رہائش کا حق رکھتی ہے:

''وذكر الخصاف: أن لها أن تقول: لاأسكن مع والديك وأقربائك في الدار. فأفرد لي دارا قال صاحب الملتقط: هذه الرواية محمولة على الموسرة الشريفة وما ذكرنا قبله أن أفراد بيت في الدار كاف إنما هو في المرأة الوسط اعتبارا في السكنى بالمعروف اهـ'' (ردالمحتار ۲۔۷۲۰)

ظاہر ہے اس طرح کے اعلی انتظام کا ذی حیثیت شوہر کو پابند کیا جاسکتا ہے، البتہ وہ شوہر جو مال کے اعتبار سے کمزور ہو اس کو اس درجہ معیاری رہائش کی فراہمی کیلئے مجبور نہیں کیا جاسکتا، رہائشی کمرہ تو علحدہ ہو، لیکن دیگر ضروریات مشترکہ گوارا کی جاسکتی ہیں:

''قلت: وينبغي أن يكون هذا في غير الفقراء الذين يسكنون في الربوع والأحواش بحيث يكون لكل واحد بيت يخصه وبعض المرافق مشتركة كالخلاء والتنور وبئر الماء''۔ (رد المحتار ۲۔۷۲۰)

اس طرح ایک بڑے مکان کے اندر علحدہ علحدہ حجرات اس کی بنیادی ضروریات کے ساتھ ہوں یا اس کے بغیر ہر دو صورت میں اس بات کا لحاظ ضروری ہے کہ اس مکان میں شوہر کے رشتہ داروں میں سے کوئی ایسے افراد نہ ہوں جن سے اس کو آزار پہنچنے کا خطرہ ہو:

''فإن كانت دار فيها بيوت وأعطى لها بيتا يغلق ويفتح لم يكن لها أن تطلب بيتا آخر إذا لم يكن ثمة أحد من أحماء الزوج يؤذيها'' (رد المحتار ۲۔۷۲۰)

قرآنی اشارات سے بھی جداگانہ خاندانی نظام کی تائید ملتی ہے۔ "وقرن في بيوتكن" (احزاب: ۳۳) اپنے گھروں میں جمی رہیں۔ "يا أيها الذين آمنوا لا تدخلوا بيوت النبي إلا أن يؤذن لكم" (احزاب: ۵۳) (اے ایمان والو نبی کے گھروں میں اجازت کے بغیر مت داخل ہو)۔ "إن الذين ينادونك من وراء الحجرات أكثرهم لا يعقلون" (حجرات: ۴) (جو لوگ آپ کو حجرات کے پیچھے سے نداء دیتے ہیں ان میں سے اکثر صاحب سمجھ نہیں ہیں)۔

ان آیات پاک سے اس بات کا واضح اشارہ ملتا ہے کہ امہات المؤمنین رضی اللہ عنھن کی رہائش الگ الگ مکانات میں تھی۔ بخاری شریف کی روایات سے بھی اس کی تصدیق وتائید ہوتی ہے۔ (بخاری، ج ۱، کتاب الجہاد، باب ماجاء في بيوت ازواج النبي ﷺ وما نسب من البيوت إليهن)، اس باب کے ابتداء میں امام بخاری رحمہ اللہ نے صدر بالا دونوں آیت پاک کو اس بات میں تائید میں نقل کرنے کے بعد جملہ سات احادیث پاک نقل کی ہیں۔ پہلی حدیث ام المؤمنین سیدتنا عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب آنحضرت سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ بیمار ہوئے تو اپنی دوسری ازواج سے اس بات کی اجازت چاہی کہ وہ ان ایام میں میرے (ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے) گھر رہیں گے۔ "ليس على الأعمى حرج...ليس عليكم جناح أن تأكلوا جميعا أو أشتاتا...الخ" (نور: ۶۱)

(نابینا کیلئے کوئی حرج نہیں ہے پاؤں سے معذور کیلئے نہ بیمار کیلئے نہ خود تمہارے لئے کوئی حرج ہے کہ تم اپنے گھروں میں یا اپنے والدین کے گھروں میں اور اپنے نانیوں اور اپنے بھائیوں، بہنوں، چچاؤں، پھوپیوں، ماموں اور خالاؤں کے گھروں میں یا ان گھروں میں جن کی کنجیاں تمہارے قبضہ واختیار میں ہوں یا تمہارے دوستوں کے گھروں میں اس طرح تمہارے لئے کوئی حرج نہیں ہے کہ تم سب ایک ساتھ مل کر کھاؤ یا الگ الگ کھاؤ)۔

مذکورہ آیت شریفہ میں اولاد وماں باپ، بھائیوں بہنوں چچاؤں اور پھوپیوں ماموں اور خالاؤں وغیرہ وغیرہ کی الگ الگ رہائش گاہوں کا ثبوت ملتا ہے۔

حضرت نبی پاک نے اپنی چہیتی صاحبزادی بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح اپنے چچازاد بھائی سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ کردیا تو ان کیلئے علاحدہ رہائش کا نظم فرمایا۔ جب کہ آپ ہی کی آغوش رحمت میں ان کی پرورش ہوئی تھی، مشترکہ خاندانی نظام بہتر ہوتا تو حضور پاک ان دونوں کا اپنے ہی دولت کدہ میں رہنے کا انتظام فرماتے۔ (حیاۃ الصحابۃ ۲/ ۶۶۸)

حق سبحانہ وتعالی نے جس طرح انسانوں کی ظاہری شکل وشباہت میں فرق رکھا ہے، قدوقامت، رنگ وروپ بھی ہر ایک کو جدا جدا بخشا ہے کہ جس میں ہر فرد جداگانہ ومنفرد حیثیت کا حامل اور اللہ سبحانہ وتعالی کی تخلیقی شان کا مظہر ہے، اسی طرح فکر وخیال میں بھی حق سبحانہ وتعالی نے ہر ایک کو انفرادیت بخشی ہے، ہر ایک کا انداز فکر جدا اور ہر ایک کی سوچ وسمجھ کا زاویہ یکسر مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے طویل مدت تک رشتہ داروں کا ایک ساتھ رہنا اختلاف کی راہیں کھولتا ہے، بسا اوقات یہ اختلاف نفرت وعداوت اور دشمنی کی حدوں میں داخل ہوجاتا ہے وہ بھائی جو آپس میں کبھی شیر وشکر بن کر

رہے ہوں ان کے درمیان حد فاصل قائم ہوجاتی ہے۔نزاع واختلاف کی دیواریں کھڑی ہوجاتی ہیں، بعض کتب احادیث میں ہے۔"عن أبي ذر قال: قال رسول الله ﷺ: یا أباذر زر غبا تزدد حبا" (شعب الایمان للبیہقی، ج ۶ ص ۳۲۶، حدیث نمبر ۸۳۶۲، باب فی حسن الخلق فصل فی ترک الغضب/معجم کبیر للطبرانی/مستدرک علی الصحیحین)۔

بروایت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی یہ الفاظ مروی ہیں: "زر غبا تزدد حبا" اگرچہ کہ شارحین نے اس کے حدیث ہونے میں کلام کیا ہے۔ طبرانی نے اس کو حدیث تسلیم کیا ہے اور اس کی اسانید کو حسن کہا ہے۔اس کی شرح میں حافظ مناوی لکھتے ہیں: "(زر) أخاك یا أبا هریرة (غبا تزدد حبا) أي زر أخاك وقتا بعد وقت ولا تلازم زیارته كل یوم تزدد عنده حبا وبقدر الزیادة تهون علیه"۔ یعنی اپنے بھائی سے وقفہ وقفہ سے ملا کرو بلاناغہ ملاقات کو لازم مت کرلو اس طرح کے عمل سے تمہارے درمیان تعلق ومحبت بڑھے گا، جس قدر ملاقات میں کثرت ہوگی اتنی ہی بے وقعتی ہوگی، قدر وقیمت میں کمی آئے گی۔ (التیسیر بشرح الجامع الصغیر ۲/ ۴۳)

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مشترکہ خاندانی نظام میں بیواؤں کی مدد مطلقہ عورتوں، یتیم لڑکوں لڑکیوں کی پرورش کا انتظام ہوجاتا ہے، جبکہ اکثر نزاع بھی مشترکہ خاندانی نظام کی وجہ سے آپس میں پیدا ہوجاتا ہے، جداگانہ خاندانی نظام کو اختیار کرکے خاندان کو بہت حد تک باہمی نزاع واختلاف، دشمنی وعداوت سے اور آپسی رشتوں کو تقاطع، یعنی ٹوٹنے سے بچایا جاسکتا ہے، جہاں تک مطلقہ وبیوہ عورتوں یتیم لڑکوں لڑکیوں کی بہتر پرورش کے منصب سے عہدہ برآں ہونے کی بات ہے تو اسلام نے بطور خاص ان کے حقوق کی ادائیگی ان کے رشتہ داروں پر درجہ بدرجہ عائد کی ہے اس کی پاس داری ہر ایک بندہ مومن کا فریضہ ہے۔کوئی خاتون بیوہ ہوجائے یا مطلقہ ہوجائے یا کسی فرد کے انتقال کی وجہ اس کی کمسن اولاد ہو اور وہ سب مالدار ہوں تو ان کے اپنے مال سے ان کی تمام ضروریات کی تکمیل ہوگی۔

اسلامی نقطہ نظر سے بیوہ اور مطلقہ کا "وأنكحوا الأيامى منكم" (سورہ نور: ۳۲) کے حکم کی تعمیل میں دوسرا نکاح کرکے ان کے مسائل کے حل کی صورت نکالی جاسکتی ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالی کا وعدہ ہے کہ اگر وہ محتاج ہوں تو حق سبحانہ اپنے فضل وکرم سے ان کو غنی کردیگا، اللہ سبحانہ وتعالی بڑی کشائش ووسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے (نور: ۳۲)، نکاح کے اسباب کسی وجہ سے مہیا نہ ہوں اور وہ محتاج بھی ہوں اسی طرح کسی کی وفات کی وجہ سے اس کی یتیم اولاد ہو اور وہ بھی محتاج ہو تو اسلام نے ان کے اخراجات کی ذمہ داری ان بیوہ، مطلقہ، یتامیٰ کے ایسے رشتہ داروں (وارثین) پر درجہ بدرجہ بقدر میراث عائد کی ہے جو ان (بیوہ، مطلقہ، یتامیٰ) کی وفات کی صورت میں ان کے شرعی وارث بن کر حصہ پاتے ہیں۔بیوہ یا مطلقہ محتاج ہو اور ان کے نکاح کا بھی انتظام نہ ہو تو ان کے والد یا والدہ پھر بھائی، بہن اسی طرح یہ بھی نہ ہوں تو دیگر عصبات پر بقدر میراث ان کا نفقہ واجب ہوگا۔یتامیٰ اگر محتاج ہوں تو ان کی کفالت بھی ماں پر اگر وہ مالدار ہو تو واجب ہوگی، ورنہ ماں اور دادا پر ان کے اپنے تناسب وراثت کے مطابق والدہ تمام اخراجات کے ثلث کی اور دادا دو ثلث اخراجات کے ذمہ دار ہوں گے۔

اسلام نے یتامیٰ کے حقوق کی نگہداشت کرنے کی سخت تاکید کی ہے، اگر وہ مالدار ہوں تو ان کے مال کی کسی خیانت کے بغیر حفاظت کرنے اور ان پر حسب ضرورت خرچ کرنے پھر جب وہ بالغ ہوجائیں تو ان کا مال ان کے حوالے کرنے کی ہدایت کے ساتھ اس بات کی بھی ہدایت کی ہے کہ ان کے اچھے مال کو اپنے برے مال سے تبدیل نہ کریں اور اپنے مال کے ساتھ ان کے اموال کو بلاوجہ ملا کر کھانے یا کسی طرح کا تغلب وتصرف کرنے سے منع کیا ہے، اگر کوئی ایسا کرے تو اس کیلئے اللہ کے ہاں بڑا وبال یعنی سخت پکڑ اور بڑا عذاب ہے (مفہوم وخلاصہ سورہ نساء آیت ۳)، اسی سورہ کی آیت نمبر ۱۵ میں اس وعید کا ذکر ہے جو یتامیٰ کا مال کھانے والوں کیلئے اللہ سبحانہ وتعالی نے بیان فرمائی ہے کہ گویا وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں اور عنقریب آگ میں داخل ہوں گے۔حدیث پاک میں ایسی بیوہ کی فضیلت آئی ہے کہ جس کے رخسار اپنی اولاد کی پرورش، دیکھ بھال کی محنت ومشقت اور ترک زینت کی بنا سیاہ پڑ گئے ہوں اور فرمایا کہ وہ بیوہ اور میں قیامت کے دن انگشت شہادت کی طرح قریب ہوں گے (رواہ ابوداؤد، زجاجۃ المصابیح، باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق، ص ۴۲۳)، اسی طرح کا ارشاد آپ اپنے یتامیٰ کی کفالت کرنے والوں کیلئے بھی فرمایا ہے: "أنا وكافل اليتيم في الجنة هكذا، وقال بأصبعيه السبابة والوسطى" (بخاری ۲/ ۸۸۸، باب فضل من یعول یتیما)، اور آپ کا ارشاد ہے۔بیوہ اور مسکین کی خبرگیری کرنے والا گویا ایسا ہے کہ جو اللہ کی راہ میں چل نکلا ہو، اور یہ بھی فرمایا کہ رات بھر قیام کرنے والے اور ہمیشہ روزہ رکھنے والے کی طرح اللہ کے ہاں ان کیلئے اجر وثواب ہے: "الساعي على الأرملة والمسكين كالمجاهد في سبيل الله أو كالذي يصوم النهار ويقوم الليل"۔ (بخاری ۲/ ۸۸۸، باب الساعی علی الأرملۃ)

(۱) حسب صراحت سطور بالا اسلامی نقطۂ نظر سے مشترکہ خاندانی نظام کے بالمقابل جداگانہ نظام خاندان ہی بہتر قرار پاتا ہے، ہمارے معاشرہ میں عام طور پر مشترکہ خاندانی نظام ہی مروج رہے ہیں گوکہ اب اس میں بتدریج تبدیلی آرہی ہے اور جداگانہ زندگی بسر کرنے کا طریقہ عام ہورہا ہے۔

(۲) بالفرض کہیں مشترکہ خاندانی نظام ہی مروج ہو اور مشترکہ خاندان میں تمام افراد خرچ میں معاونت کرتے ہوں تو والدین کیلئے بہتر بات یہی ہوگی کہ اپنی اولاد میں سے ہر لڑکے کی ذمہ داری کی مناسبت سے خرچ مقرر کریں کسی لڑکے کے ہاں بچے زیادہ ہوں تو اسی مناسبت سے اور کسی کے ہاں اگر کم ہوں تو اسی مناسبت سے ان پر مصارف کا بوجھ ڈالیں، تمام اولاد متفق ہو تو سب پر برابر اخراجات عائد کئے جاسکتے ہیں، تاہم اس میں آگے چل کر بھائیوں کے درمیان نزاع پیدا ہوجانے کا امکان رہتا ہے۔ شریعت مطہرہ کی رو سے مفضی الی المنازعہ (وہ امور جو اختلاف ونزاع کی طرف لے جانے والے ہوں) سے اجتناب بہتر ہے۔

(۳) مختلف بھائیوں کی طرف سے گھریلو مصارف کی تکمیل کیلئے اپنے والد یا بھائی کے یہاں آمدنی جمع کی جائے اور اس جمع شدہ پونجی سے گھریلو اخراجات کی تکمیل کے بعد بچی ہوئی رقم سے کوئی چیز خریدی جائے تو اس جیسے مشترکہ نظام میں بخوشی شراکت پر رضامندی کی بناء پر تمام افراد برابر کے حصہ دار رہیں گے۔

(۴) اگر کسی گھر میں تین بھائی ہوں جن میں سے دو بھائی دس دس ہزار روپیہ کماتے ہوں اور پوری پونجی اخراجات کے عنوان سے والد کے حوالے کرتے ہوں اور ایک بھائی ان میں سے جن کی آمدنی بیس ہزار ہو اور دس ہزار گھر میں دیتے ہوں اور بقیہ دس ہزار جمع کرلیتے ہوں تو ایسی صورت میں وہ بچی ہوئی رقم اسی ایک بھائی کی متصور ہوگی۔

(۵) خاندان کے کچھ افراد کماتے ہوں اور کچھ افراد گھر کے کام کاج دیکھتے ہوں، اس طرح اس نظام پر چلنے کیلئے بخوشی کمانے والے افراد رضامند ہوں تو تقاضہ انصاف یہی معلوم ہوتا ہے کہ ساری آمدنی میں تمام اصحاب برابر کے حق دار رہیں گے، کیونکہ کمانے والے افراد جس طرح بیرونی محنت کے ذریعہ خاندانی نظام کے چلانے میں مالی معاونت کیلئے رضامند ہیں، اسی طرح وہ اس بات پر بھی رضامند ہوتے ہیں کہ ہم میں سے کچھ افراد کمانے کی جدوجہد میں مصروف رہنے کے بجائے گھریلو کام کاج کی ذمہ داری نبھائیں، تاہم ان جیسی صورتوں میں عام طور پر ابتدائی احوال میں اتفاق رائے کی صورت بظاہر معلوم ہوتی ہے، لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرتا ہے احوال بدلتے ہیں، فکر وخیال میں تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے، اور وہ اصحاب جو گھریلو ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے زندگی گزارتے ہیں آہستہ آہستہ بوجھ معلوم ہونے لگتے ہیں، ضروریات کی تکمیل کی حد تک تو خواہی نہ خواہی زندگی گزر جاتی ہے، دیگر بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے بھی ان کو دیگر بھائیوں کے آگے دست سوال دراز کرنے کی نوبت آتی رہتی ہے جو کمانے والے بھائیوں کی طرف سے خوش دلی کے ساتھ پوری نہیں ہوتی، جب وہ کماتے ہی نہیں تو وہ اپنے اچھے برے حالات کیلئے کچھ پس انداز کرنے کے موقف میں بھی نہیں رہتے، اس طرح ان کی زندگی دوسروں کے سہارے بے وقاری کے ساتھ گزرتی ہے، اسی وجہ سے بسا اوقات وہ اپنی قدر وقیمت بھی کھو بیٹھتے ہیں، شخصی طور پر کسب کی صلاحیتیں ان سے معدوم ہوجاتی ہیں اور وہ اس طرح سے معاشرے کے نکمہ افراد میں شمار کئے جاتے ہیں، اس لئے اسلامی نقطۂ نظر سے احسن صورت تو یہی ہے کہ تمام افراد محنت وجستجو کرکے کمائیں اور اپنا بوجھ خود اٹھانے کی اپنے اندر صلاحیت پیدا کریں کسی کے محتاج اور دست نگر رہ کر اپنی بے آبروئی کا سامان نہ کرلیں، اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات کیلئے خود کفیل بنیں۔ خاندانی نظام کو مشترکہ رکھنا اگر کہیں ناگزیر ہو تب بھی خاندان کا ہر ہر بالغ فرد محنت کرے اور روزی پیدا کرنے کے ذرائع اختیار کرے اور گھریلو اخراجات میں سب کے برابر حصہ ادا کرے۔ حسب ضرورت گھریلو دیگر ضروری امور اور کام کاج میں بھی بشاشت قلبی کے ساتھ سب کا ہاتھ بٹائے اور ضرورت داعی ہو تو گھریلو نظم وانتظام کیلئے حسب حیثیت خدمتگار رکھ لئے جائیں اور ان کے مصارف کی ذمہ داری تمام افراد مساوی طور پر قبول کریں۔

(۶) اسلام میں والدین کی بڑی عظمت ومرتبت ہے حق سبحانہ وتعالی نے اپنی عبادت کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کا ذکر فرمایا ہے اس اعتبار سے وہ بڑے قدر وقیمت کے حامل ہیں، سب جانتے ہیں اس کائنات میں ان کے وجود کا ظاہری وسیلہ ماں باپ ہیں، زندگی بھر چونکہ بچوں کی پرورش وکفالت کرتے ہیں اور جب وہ بوڑھے ہوجاتے ہیں تو وہ اپنی خدمت اور کفالت کے ضرورت مند ہوجاتے ہیں۔ والدین تنگدست اور

محتاج ہوں تو شریعت نے ان کا نفقہ اولاد پر واجب کیا ہے، اگر چہ کہ وہ کمانے پر قادر ہوں۔ ولد کا اطلاق بیٹے اور بیٹی دونوں پر ہوتا ہے جس طرح بیٹا والدین کے نفقہ کا ذمہ دار ہے اسی طرح بیٹی بھی برابر کی ذمہ دار ہے۔ "فإذا كان للأب ابن وبنت موسرين قسمت نفقة بينهما بالتسوية"۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ۴/ ۵۸۸)

صاحب ''بدائع الصنائع'' نے قرآن پاک کی وہ آیات جن میں والدین کی عظمت و مرتبت اور ان کے ساتھ حسن سلوک اور عمدہ برتاؤ اور ان کو معمولی سے معمولی ایذا پہنچانے کی ممانعت اور ان کی ہر طرح خدمت و دلجوئی اور ان کی شکرگزاری کی تلقین ملتی ہے، کو عمدہ پیرائے بیان میں ایک جگہ جوڑ کر اولاد کو اپنے والدین کی ہر طرح دل و جان سے خدمت کرنے اور اپنی طاقت و بساط سے بڑھ کر ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی اہمیت اور اس کے وجوب کو ثابت کیا ہے:

''وأما نفقة الوالدين فلقوله عزوجل: ''وقضى ربك أن لا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا'' أى أمر ربك وقضى أن لا تعبدوا إلا إياه، أمر سبحانه وتعالى ووصى بالوالدين إحسانا''. والإنفاق عليهما حال فقرهما من أحسن الإحسان وقوله عزوجل: ''ووصينا الإنسان بوالديه حسنا''. وقوله تعالى: ''إن اشكر لى ولوالديك'' والشكر للوالدين والمكافأة لهما. أمر سبحانه وتعالى الولد أن يكافئ لهما ويجازى بعض ما كان منهما إليه من التربية والبر والعطف عليه والوقاية من كل شر ومكروه. وذلك عند عجزهما عن القيام بأمر أنفسهما والحوائج لهما وادرار النفقة عليهما حال عجزهما وحاجتهما من باب شكر النعمة فكان واجبا. وقوله عزوجل: ''وصاحبهما فى الدنيا معروفا'' وهذا فى الوالدين الكافرين فالمسلمان أولى، والإنفاق عليهما عند الحاجة من اعرف المعروف. وقوله عزوجل: ''ولا تقل لهما أف ولا تنهرهما'' وإنه كناية عن كلام فيه ضرب إيذاء، ومعلوم أن معنى التأذى بترك الإنفاق عليهما عند عجزهما، وقدرة الوالد أكثر فكان النهى عن التأفيف نهيا عن ترك الإنفاق دلالة كما كان نهيا عن الشتم والضرب دلالة''۔ (بدائع الصنائع ۴/ ۳۶-۳۹ کتاب النفقہ)

فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر والد محتاج ہوں اور ان کی نابالغ اولاد بھی ہو اور وہ بھی محتاج ہو اور بڑا لڑکا ان کا مالدار ہو تو اس بالغ مالدار لڑکے پر اپنے والد اور ان کی نابالغ اولاد دونوں کا نفقہ واجب ہے۔ "الأب إذا كان فقيرا معسرا وله أولاد صغار محاويج وابن كبير موسر يجبر الابن على نفقة أبيه ونفقة أولاده الصغار، كذا فى محيط السرخسى" (عالمگیری، الفصل الخامس فی نفقۃ ذوی الارحام ۲/ ۵۶۵)، ماں باپ اور خاص طور پر ماں بیماری اور ضعیفی کی بنا خدمت و تعاون کی محتاج ہو تو شریعت نے ساس کی خدمت کو بہو پر واجب نہیں کیا، ہاں البتہ حسن اخلاق کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ بخوشی شوہر کے والدین کی خدمت کرے اور اس کو اپنے لئے سعادت سمجھے۔ حدیث پاک ہونے کے حوالے سے یہ بات سنی گئی ہے کہ ایک انسان کے تین باپ ہیں ایک وہ جس کے ہاں انسان پیدا ہوا ہو، دوسرے وہ جس نے اس کو تعلیم و تربیت سے سنوارا ہو، تیسرے وہ جس نے اپنی بیٹی نکاح میں دی ہو۔ گو کہ اس کے حدیث ہونے کی تصدیق نہیں ہوسکی، تاہم اگر کسی شارح کا قول ہو تب بھی اس سے یہ واضح ہے کہ ساس اور سسر بھی والدین کا درجہ رکھتے ہیں، جس طرح ایک مرد کیلئے بیوی کے والدین اس کے والدین کی طرح ہوتے ہیں اور اس کے ماں باپ ہی کی طرح قابل احترام اور بوقت ضرورت خدمت و سلوک کے مستحق ہوتے ہیں، اسی طرح ایک عورت کے حق میں اس کے شوہر کے والدین بھی وہی مرتبہ رکھتے ہیں، اس لئے بہو اپنے خسر اور خوشدامن کو اپنے والدین تسلیم کرلے تو ان کی خدمت و دلجوئی اس کیلئے کوئی بار نہیں ہوگی، اور نہ کوئی معاشرتی دشواری پیدا ہوگی۔ شوہر کے والدین کا بھی فرض ہوگا کہ وہ اپنی بہو کو بیٹی سمجھیں اور اپنے عملی برتاؤ سے اس کا اظہار کریں۔

کسی وجہ سے بہو اگر ایسی نازک گھڑی میں شوہر کے والدین کی خدمت سے بے رخی برتے تو شرعا اس پر جبر تو نہیں کیا جاسکتا، ایسی صورت میں اولاد پر یہ فرض عائد ہوگا کہ وہ خود ان کی خدمت کرے، والد کی کوئی خاص خدمت متعلق ہو کہ جس کو مرد ہی انجام دے سکتے ہیں تو بیٹے اس خدمت کو انجام دیں، والدہ کی کوئی ایسی خاص خدمت مطلوب ہو تو بیٹیاں اس فرض کو نبھائیں، صورت حال اگر ایسی ہو کہ بیٹیاں سسرال میں ہونے کی وجہ سے والدہ کی خدمت کرنے سے عاجز ہوں، اسی طرح بیٹے اپنے مشاغل و مصروفیات کی بنا پر والد کی ضروری خدمت انجام نہ دے سکتے ہوں تو ہر دو یعنی بیٹے، بیٹیوں

پر فرض ہے کہ وہ اپنے والدین کی خدمت کیلئے حسب حال نوکر (خادم خادمہ) کا انتظام کریں، سب مل کر اس کے مصارف برداشت کریں، اولاد میں اگر کوئی غریب ہو تو مالدار اور خوش حال اولاد کا فرض ہے کہ وہ خوشدلی کے ساتھ اس فرض کو پورا کرے۔ یہ وہ سنہری موقع ہوتا ہے کہ جو آگے بڑھ کر اس فرض کو پورا کر لے دین ودنیا کی سعادتیں اس کا مقدر بن جاتی ہیں، اس سعادت کے حصول سے وہی محروم رہ سکتے ہیں، محرومی جن کا مقدر ہو۔

(۷) شرعی نقاط نظر سے واضح ہے کہ خاندان میاں بیوی اور اس کی نابالغ اولاد پر مبنی ہو، ایک ایسی رہائش جو مشترکہ خاندانی نظام پر مشتمل ہو جس میں شوہر کے علاوہ شوہر کے بھائی وغیرہ رہتے ہوں تو اس طرح کی رہائش میں غیر محرم افراد سے پردہ کا اہتمام ممکن نہیں۔ اسلامی نقطہ نظر سے چونکہ شوہر کے بھائیاں غیر محارم کی تعریف میں آتے ہیں۔ حضرت نبی پاک ا نے مردوں کو اس بات کی ہدایت دی ہے کہ وہ غیر عورتوں کے پاس جانے سے اپنے آپ کو بچائیں۔ حضور پاک ا کے اس ارشاد پر ایک انصاری صحابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! شوہر کے بھائی وغیرہ کیلئے بھی کیا یہی حکم ہے تو آپ ا نے فرمایا کہ شوہر کے رشتہ دار تو ہلاکت ہیں، یعنی ان سے بچنا ضروری ہے۔ ''حمو'' سے مراد شوہر کے حقیقی بھائی اور دیگر رشتہ کے تمام بھائی ہیں۔ "إياكم والدخول على النساء وقال رجل من الأنصار: يا رسول الله ﷺ أرئيت الحمو، الحمو الموت" (بخاری ۲/۷۸۶، کتاب النکاح باب لا يخلون رجل بامرأة الا ذو محرم والدخول على المغيبة)، اس کے حاشیہ نمبر دس (۱۰) میں امام نووی رحمۃ اللہ نے اس کی شرح میں لکھا ہے کہ اس طرح کے افراد سے بہ نسبت دوسروں کے زیادہ خطرہ رہتا ہے، برائی کے امکانات اور فتنے کے مواقع بڑھ جاتے ہیں، کیونکہ خاتون تک پہنچنے اور تنہائی کا فائدہ اٹھانے کے مواقع پر ان کو قدرت رہتی ہے۔ مکروہ وناپسندیدہ شئی کو عرب موت سے تعبیر کرتے ہیں

''قوله الحمو الموت... وقال الطبري: المعنى إن خلوة الرجل بامرأة أخيه وابن أخيه ينزل منزلة الموت أي أحذروه كما تحذروا الموت. والعرب تصف المكروه بالموت. فتح. قال الكرماني: معناه أن الخوف منه أكثر لتمكنه من الخلوة معها من غير أن ينكر عليه. وهو تحذير عما عليه عادة الناس من المساهلة فيه- إن الخوف منه أكثر من غيره والشر يتوقع منه. والفتنة أكثر لتمكنه من الوصول إلى المرأة. والخلوة من غير أن ينكر عليه بخلاف الأجنبي'' (فتح الباری ۹۔۲۸۹)

معاشی یا معاشرتی مجبوری کی بنا پر ایک بڑے مکان میں مشترک خاندان، جیسے چچازاد بھائی، بہن یا دیگر قریبی رشتہ دار رہتے ہوں، بہتر صورت تو یہی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے رہائشی گوشے بنیادی سہولتوں کے ساتھ علحدہ علحدہ ہوں، ان کے درمیان ستر وحجاب کے تقاضوں کا پورا پورا اہتمام ہو، بالفرض یہ سارے رشتہ دار ایک ایسے مکان میں رہتے ہوں جس میں ان کے رہائشی گوشے تو علحدہ ہوں، لیکن سب کی بنیادی ضروریات مشترک ہوں، تو ایسی صورت حال میں بھی کوشش اس بات کی ہونی چاہئے کہ غیر محرم رشتہ داروں سے پردہ کیا جائے، پردہ ممکن نہ ہو تو کم از کم درجہ میں یہ احتیاط ضرور رکھی جائے کہ ان غیر محارم رشتہ داروں سے کسی صورت میں بھی تنہائی اختیار نہ کی جائے۔ حدیث پاک کی رو سے جہاں کوئی ایک اجنبی عورت ومرد تنہائی میں جمع ہوتے ہیں تو وہاں شیطان موجود ہوتا ہے۔ "لا يخلون رجل بامرأة إلا كان ثالثهما الشيطان" (رواہ الترمذی، کتاب الرضاع، باب ما جاء فی کراهیة الدخول علی المغیبات، ۱۲۰۳، کتاب الفتن، باب ما جاء فی لزوم الجماعة، ۲۳۱۱، مشکوٰۃ المصابیح، باب النظر الی المخطوبہ ۲/۲۶۹)

دوسری احتیاط ستر سے متعلق کی جائے کہ ایسے ماحول میں خواتین ستر پوش لباس اختیار کریں جو چست اور مہین نہ ہو، بلکہ ڈھیلا ڈھالا ہو کہ جس سے اعضاء جسم نمایاں نہ ہوتے ہوں، خاص طور پر "وليضربن بخمرهن على جيوبهن ولا يبدين زينتهن" (سورہ نور: ۳۱) (اپنے گریبانوں پر اوڑھنیاں ڈالے رہیں) پر خوب خوب عمل ہو۔ مرد وخواتین دونوں کو غض بصر کا جو حکم دیا گیا ہے اس کی خوب تعمیل ہو، اور خواتین خاص طور پر اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں، یعنی ایسا لباس اور زیور جو حسن وجمال میں نکھار پیدا کرنے والا ہے کھلے عام پہننے سے احتراز کریں اور ایسے مشترکہ مکان میں مرد حضرات خاص طور پر جب باہر سے داخل ہوں تو اجازت لیکر اور سلام کر کے داخل ہوں۔ چونکہ یہ احکام قرآن پاک میں ایمان والوں کو دئے گئے ہیں، کتب احادیث میں بھی یہ احکام مفصلاً بیان کئے گئے ہیں، چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ''کتاب الاستئذان'' کے مستقل عنوان کے تحت متعدد احادیث شریفہ ذکر کی ہیں، و نیز دیگر کتب صحاح وسنن، معاجم وجوامع میں روایات موجود ہیں۔

خاندان کے بزرگ مرد وخواتین ان پر کڑی نظر رکھیں، ان کے درمیان بے تکلف ہونے کا ماحول پیدا ہونے نہ دیں، کسی امر میں ان کے درمیان بات چیت ضروری ہو تو ایسے موقع پر خاندان کے بزرگوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور موجود ہوں، بلا ضرورت ان کے درمیان راہ ورسم پیدا ہونے کے مواقع پیدا ہونے نہ دیئے جائیں۔

☆☆☆

مشترکہ خاندانی نظام کے معاشرتی نقصانات

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی [1]

کتاب وسنت اور صحابہ کرام کی زندگی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ''جداگانہ خاندانی نظام'' بہتر اور پسندیدہ ہے، مختلف خاندانوں کا ایک نظام اور ایک گھر میں رہنا انسانی فطرت کے برخلاف اور نامناسب ہے، اس کی وجہ سے درج ذیل خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

ا۔ معاملات کی خرابی:

معاملات کی صفائی اور اسے ہر طرح کے لڑائی جھگڑے سے پاک رکھے، خصوصی طور سے مالیات میں شفافیت کی اہمیت محتاج بیان نہیں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

''یا أیها الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارة عن تراض منکم ولا تقتلوا أنفسکم إن اللّٰه کان بکم رحیما، ومن یفعل ذلك عدوانا وظلما فسوف نصلیه ناراً وکان ذلك علی اللّٰه یسیراً'' (النساء: ۲۹،۳۰)

(ایمان والو! ایک دوسرے کے مال کو باطل طریقے پر مت کھاؤ، سوائے اس کے کہ باہمی رضامندی اور خوش دلی سے تجارت کے ذریعہ دوسرے کا مال لیا گیا ہو، اور تم اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور جو کوئی سرکشی اور ظلم کی وجہ سے ایسا کرے گا تو اسے ہم جلد ہی جہنم میں داخل کردیں گے اور یہ اللہ کے لئے بہت آسان ہے)۔

اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

''لا یدخل الجنة جسد غذی بحرام'' (رواہ ابو یعلی والبزار والطبرانی وحسنہ المنذری اسانیدہ وقال الالبانی صحیح لغیرہ الترغیب ۲۔۷۱۴)

(جس کی غذا میں حرام شامل ہو وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا)۔

اپنی کمائی ہو یا وراثت کے ذریعہ حاصل شدہ دولت وجائداد ہو، یا خوش دلی سے تجارت یا تحفہ وغیرہ کے ذریعہ کوئی مال حاصل ہو تو وہ حلال اور جائز ہے، کسی انسان کی رضا اور خوشی کے بغیر اس سے کچھ حاصل کرلینا حرام، باطل اور خودکشی کے مترادف ہے، علامہ ابن کثیر مذکورہ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''ولا تقتلوا أنفسکم أی بارتکاب محارم اللّٰه وتعاطی معاصیه وأکل أموالکم بینکم بالباطل''۔ (تفسیر ابن کثیر ا۔۵۸۷، اسماعیل ابن کثیر الدمشقی (۷۷۴) ط دار عالم الکتب الریاض ۱۹۹۷)

(اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو کا مفہوم یہ ہے کہ حرام اور معصیت کا ارتکاب کرکے، اور ایک دوسرے کے مال کو باطل طریقے پر کھاکر اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو)۔

کسی دوسرے کے مال کو صرف اسی وقت لینا حلال ہے، جبکہ وہ خوش دلی سے دیدے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

---

[1] جامعۃ الفلاح بلریا گنج، اعظم گڑھ۔

''ألا لا یحل مال امرأ إلا بطیب نفسه''۔ (مشكاة المصابيح / كتاب البيوع، باب الغصب والعارية)
(سن لو کسی دوسرے کے مال کو اس کی رضامندی کے بغیر لینا حلال نہیں ہے)۔

مشترکہ خاندانی نظام میں مالیاتی پہلو سے بے ضابطگی ایک امر واقعہ ہے، ہر شخص کو ایک متعین رقم یا پوری کمائی جھونک دینے کا پابند بنانے میں خوش دلی کا حصہ کم اور معاشرتی جبر اور دباؤ کا دخل زیادہ ہوتا ہے۔

نیز ہر شخص کے لئے کھانے پینے میں ایک متعین نظام کی پابندی ایک مشکل اور دشوار معاملہ ہے، اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ چوری، چھپے اپنے من پسند کھانوں، پھلوں اور لباس وغیرہ کا انتظام کیا جاتا ہے، اس ماحول میں چوری، چکاری، جھوٹ، فریب اور دھوکہ دہی کی خصلت کو پروان چڑھنے کا موقع ملتا ہے، اور ایک طرح سے ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

۲۔ فضول خرچی اور لاپرواہی:

کہا جاتا ہے کہ مشترکہ خاندانی نظام کی وجہ سے سرمایہ کی بچت ہوتی ہے اور کفایت شعاری کو فروغ ملتا ہے، اس لئے کہ اگر دس لوگوں کے لئے الگ الگ کھانا پکایا جائے تو خرچہ زیادہ آئے گا اور اگر دس لوگوں کا کھانا ایک جگہ بنایا تو اس کے بالمقابل کم خرچہ ہوگا، لیکن یہ صرف تصویر کا ایک پہلو ہے، تصویر کا دوسرا رخ بہت بھیانک ہے کہ مالی معاملہ مشترک ہونے کی وجہ سے ہر شخص اسے مال مفت سمجھ کر کے دل بے رحم کا سلوک کرتا ہے، اور گھر کے ساز وسامان کو پرایا مال سمجھ کر نہایت ہی بے احتیاطی اور بے دردی کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے، اور کھانے پینے کی چیزوں میں فضول خرچی اور لاپرواہی عام بات ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کے کھانے پینے کا مشترکہ نظام نہیں رکھا، حالانکہ رہائش الگ ہونے کے باوجود اگر کھانے کا نظام مشترک کر دیا جاتا تو قدرے بچت ہو جاتی، لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مالی معاملات کو بھی ایک دوسرے سے بالکل الگ اور جداگانہ رکھا، یہاں تک کہ اگر ایک کے یہاں دوسرے کا کوئی سامان ضائع ہو جاتا تو اس کا تاوان ادا کرتے، چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ:

''عن أنس أن النبی ﷺ کان عند بعض نسائه فأرسلت إحدی أمهات المؤمنین مع خادم بقصعة فیها طعام. فضربت بیدها، فکسرت القصعة، فضمها وجعل فیها الطعام، وقال: کلوا وحبس الرسول والقصعة حتی فوغوا. فدفع القصعة الصحیحة وحبس المکسورة''۔ (صحیح بخاری: ۴۹۳، ابو عبد الله محمد بن اسماعیل البخاری ط دار السلام الریاض ۱۹۹۷ء)

۳۔ بے پردگی:

پردے کی مشروعیت کا بنیادی مقصد ہے عصمت وعفت کی حفاظت، اور جنسی تعلقات کی پردہ پوشی اسی مقصد کے حصول کے لئے بعض اوقات میں محرم مردوں کو بھی گھر کے اندر داخل ہوتے وقت اجازت لینے کا حکم دیا گیا ہے (النور/ ۵۸)۔ اور ایسے لوگوں کے دائرے کو محدود سے محدود تر کیا گیا ہے جن کے سامنے عورت کو بے حجاب آنے کی اجازت دی گئی ہے (النور/ ۳۱)۔ اور وہ ایسے لوگ ہیں جن سے عورت کے لئے رشتہ نکاح قائم کرنا ہمیشہ کے لئے حرام ہے یا انہیں جنسی تعلقات سے آگاہی یا کوئی مطلب نہیں ہے، شوہر کا بھائی، بھتیجا، بھانجا، اس فہرست میں شامل نہیں ہیں۔ اور مشترکہ خاندان میں ان لوگوں سے زینت کی جگہوں اور ستر کے حصول کو چھپانا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ اور یہ وہ رشتہ دار ہیں جن سے پردہ کے سلسلہ میں عام طور پر غفلت برتی جاتی ہے، حالانکہ غیر کی بہ نسبت ان اپنوں سے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''إیاکم والدخول علی النساء، فقال رجل من الأنصار: یا رسول الله! أفرأیت الحمو؟ قال الحمو الموت'' (صحیح بخاری۔ ۱۳۵، رقم الحدیث ۵۲۳۲، صحیح مسلم/ ۱۳۶۰ کتاب السلام، مع المنهاج للنووی ط بیت الافکار الدولیة)۔

علامہ نووی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

''إن الخوف منه أکثر من غیره، والشر یتوقع منه، والفتنة أکثر لتمکنه من الوصول إلی المرأة والخلوة من

غير أن ينكر عليه بخلاف الأجنبي''۔ (المنهاج في شرح صحيح مسلم بن حجاج / ۱۳۶۰، عربي زكريا يحيى بن شرف النووي ت ۶۷۶ھ، ط: بيت الافكار الدولية)

دوسروں کے بالمقابل شوہر کے رشتہ داروں سے اندیشہ زیادہ ہوتا ہے، اس سے برائی کے امکانات اور فتنہ میں پڑ جانے کا خوف زیادہ ہوتا ہے، اس لئے کہ اسے عورت تک رسائی اور اس کے ساتھ تنہائی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، اور اسے برا بھی نہیں سمجھا جاتا، اس کے برخلاف دوسرے لوگوں کے معاملہ میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ:

''لا تلجوا على المغيبات، فإن الشيطان يجرى من أحدكم مجرى الدم'' (السنن للترمذي مع التحفه ۱۔۱۱۸۸، بيت الافكار الدولية)

(جن عورتوں کے شوہر سفر میں ہوں ان کے یہاں مت جاؤ، کیونکہ شیطان تمہارے اندر خون کی طرح رواں ہوتا ہے)۔

مشترکہ خاندانی نظام میں بعض افراد تلاش رزق میں ایک عرصے کے لئے گھر سے باہر رہتے ہیں، اور کچھ لوگ گھر کا کام دیکھتے ہیں اور بھائیوں کی عورتوں کے ساتھ تنہائی کے پورے مواقع حاصل ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے برائی کے نہ صرف امکانات ہوتے ہیں، بلکہ واقعات کی دنیا میں آئے دن اس سے متعلق چیزیں دیکھنے اور سننے کو ملتی ہیں۔

۴۔ جنسی ناآسودگی:

مشترکہ خاندانی نظام میں انسان کی رازداری اور پرائیوی متاثر ہوتی ہے، کسی بات کو اپنی بیوی بچوں تک محدود رکھنا چاہئے تو نہیں رکھ سکتا ہے، اور بے تکلف اور خوشگوار ازدواجی زندگی گزارنا بھی دشوار ہے، متعدد روایتوں میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ گھریلو کاموں میں ازواج مطہرات کے ساتھ تعاون کیا کرتے تھے۔ (صحیح بخاری / ۱۱۶۳ رقم ۵۳۶۳ کتاب النفقات باب خدم الرجل فی) ایک ساتھ ایک ہی برتن سے غسل کرلیا کرتے (صحیح بخاری / ۵۶، کتاب الغسل)۔ ازواج مطہرات پانی پی دیتیں تو برتن میں اسی جگہ منہ لگا کر پیتے جہاں سے وہ پی چکی ہوتیں، اسی طرح سے وہ گوشت کھا کر آپ کے حوالے کرتیں تو آپ اسی جگہ سے کھاتے جہاں سے وہ کھا چکی ہوتیں۔ (صحیح مسلم مع المنہاج / ۲۹۵، رقم ۳۰۰ کتاب الحیض)

ظاہر ہے کہ ایک بڑے اور بھرے گھر میں اس طرح سے خوشگوار ازدواجی زندگی جو کہ مطلوب شریعت ہے گزارنا مشکل ہے:

اسی طرح سے نگاہ کی حفاظت اور عصمت وعفت کے لئے ضروری ہے کہ مرد اپنی خواہش کے مطابق دن ورات کے جس حصے میں چاہے اپنی ضرورت پوری کرلے، اسے اس کے لئے آسانی اور اس کے مواقع میسر ہونے چاہئیں، چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

''إذا دعا الرجل زوجته لحاجته فلتأته، وإن كانت على التنور'' (السنن للترمذي مع التحفه / ۱۱۸۲، وقال الترمذي حسن غريب وصححه الالباني)۔

جب کوئی اپنی عورت کو اپنی ضرورت کے لئے بلائے تو وہ فوراً آجائے اگرچہ روٹی جل ہی کیوں نہ جائے۔

اور علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

''لأنه يحتاج إلى جماعها ومعاشرتها في أي وقت يتفق ولا يمكن ذلك مع ثالث'' (رد المحتار ۵ / ۳۲۱، ط: مکتبہ زکریا دیوبند)

شوہر کو کسی بھی وقت عورت کے ساتھ رہنے اور ہم بستری کرنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے اور کسی تیسرے کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں ہے۔

مشترکہ خاندانی نظام میں اس پر عمل پیرا ہونا دشوار تر ہے، جس کی وجہ سے ناآسودگی پیدا ہوگی اور غلط راستے پر قدم پڑیں گے، اور شادی کا جو اہم ترین مقصد ہے وہ باقی نہیں رہے گا۔

مطلوبہ نظام زندگی:

یہ اور اس کے علاوہ بعض دوسرے وجوہات ہیں جن کی بنیاد پر اسلام میں مشترکہ خاندانی نظام کی حوصلہ شکنی اور جداگانہ خاندانی نظام کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے، قرآن کی ان آیات کی تلاوت سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام عام طور پر جداگانہ خاندانی نظام پر عمل پیرا تھے۔

''ليس على الأعمى حرج ولا على الأعرج حرج ولا على المريض حرج ولا على أنفسكم أن تأكلوا من بيوتكم أو بيوت آبائكم أو بيوت أمهاتكم أو بيوت إخوانكم أو بيوت أخواتكم أو بيوت أعمامكم أو بيوت عماتكم أو بيوت خالاتكم . . .'' (النور /۶۱)۔

احادیث اور صحابہ کرام کی سیرت سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شادیوں کے بعد الگ گھر بسالیتے تھے، حضرت عبدالرحمان بن ابی بکر کہتے ہیں کہ ایک موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے گھر دو آدمیوں کا کھانا ہو وہ اپنے ساتھ ایک مہمان لیتا جائے...... حضرت ابوبکر اپنے ساتھ تین آدمیوں کو لیکر آئے، عبدالرحمن کہتے ہیں کہ اس وقت میرے والدین، میں اور میری بیوی اور ایک خادم جو میرے اور میرے والد کے گھر مشترکہ طور پر کام کرتا تھا یہ کل پانچ لوگ تھے۔ (دیکھئے صحیح بخاری مع فتح الباری ۲ / ۲۶۱۴ کتاب المناقب، باب علامۃ النبوۃ، ط: بیت الافکار الدولیۃ)

غور کا مقام ہے کہ حضرت عبدالرحمن کی ابھی شادی ہوئی ہے، ساتھ میں بچے نہیں ہیں، اور اس کے باوجود ان کا گھر الگ ہے، اور اسی کے ساتھ ہی وہ اپنے والد کے گھر کے کاموں میں تعاون بھی کرتے ہیں۔

حضرت علیؓ آپ کے چچیرے بھائی تھے اور آپ کی کفالت میں رہے، اپنی چہیتی بیٹی سے ان کا رشتہ کیا، انہیں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھ نہیں رکھا، حالانکہ آپ کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی، اور حضرت علی کو اپنے بیٹے کی طرح عزیز رکھتے تھے۔

علیحدہ گھر عورت کا حق:

علیحدہ گھر عورت کا حق ہے، اگر وہ اس کا مطالبہ کرتی ہے تو اسے علیحدہ گھر دینا ضروری ہے، چاروں اماموں کا اس پر اتفاق ہے، چنانچہ صاحب ''ہدایہ'' لکھتے ہیں:

''وعلى الزوج أن يسكنها في دار مفردة ليس فيها أحد من أهله. إلا أن تختار ذلك . . . وإذا وجب حقا لها ليس له أن يشرك غيرها فيه. لأنها تتضرر به. فإنها لا تأمن على متاعها ويمنعها عن المعاشرة مع زوجها ومن الاستمتاع'' (الهدايه ۲-۴۴۱ علی بن ابی بکر الفرغانی ۵۹۳، ط: مکتبه اشرفیه دیوبند)۔

شوہر کی ذمہ داری ہے کہ عورت کو الگ گھر میں رکھے جس میں اس کے گھر کے لوگوں میں سے کوئی نہ ہو، مگر یہ کہ عورت ہی ان کو رکھنا چاہے...... اور یہ جب عورت کے حق کے طور پر واجب ہے تو شوہر کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اس میں دوسرے کو شریک کرے، اس لئے کہ اس کی وجہ سے عورت کو پریشانی ہوگی، اس کے سامان کی حفاظت نہ ہو سکے گی اور نہ ہی وہ اپنے شوہر کے ساتھ بے تکلف رہ سکتی ہے اور نہ اس سے لطف اندوز ہو سکتی ہے۔

اور علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

''ويجب لها سكن بدليل قوله تعالى: ''أسكنوهن من حيث سكنتم من وجدكم''. فإذا وجبت السكنى للمطلقة فللتي في صلب النكاح أولى. قال الله تعالى: ''وعاشروهن بالمعروف'' ومن المعروف أن يسكنها في سكن. ولأنها لا تستغني عن المسكن للاستتار عن العيون. وفي التصرف والاستمتاع وحفظ المتاع'' (المغنی ۱-۳۵۵ ط: دار عالم الکتب الریاض ۱۹۸۶ء)

(عورت کے لئے گھر ضروری ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اپنی وسعت کے مطابق جہاں تم رہتے ہو وہاں ان کو بھی رکھو، اور جب طلاق یافتہ عورت کے لئے گھر ضروری ہے تو جو عورت نکاح میں ہے اس کے لئے بدرجہ اولیٰ گھر واجب ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ عورتوں کے ساتھ ''معروف'' کے مطابق زندگی گزارو، اور معروف کا تقاضا ہے کہ عورت کو ایک گھر مہیا کرے، اور اس لئے بھی کہ لوگوں کی نگاہوں سے بچنے، اور شوہر

کے ساتھ رہنے اور سامان کی حفاظت کے لئے ایک عورت گھر سے بے نیاز نہیں ہوسکتی ہے)۔

گھر کا ایک علیحدہ کمرہ کافی ہے یا مستقل ایک گھر کی ضرورت ہے جہاں باورچی خانہ، غسل خانہ اور بیت الخلاء کا الگ سے نظم ہو، یہ مرد وعورت کے حالات اور عرف وعادت پر محمول ہے۔ (دیکھئے ردالمحتار ۳۲۲/۵)، گھر کی ضروریات مشترک ہونے کی صورت میں اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ شوہر کے رشتہ داروں میں سے کوئی عورت کے لئے باعث ایذا نہ ہو، چنانچہ قاضی خاں لکھتے ہیں:

''فإن كانت دار فيها بيوت، وأعطى لها بيتا يغلق ويفتح لم يكن لها أن تطلب بيتا آخر إذا لم يكن ثمة أحد من أحماء الزوج يؤذيها'' (حوالہ مذکورہ/۳۲۱)۔

حاصل یہ ہے کہ مشترکہ خاندانی نظام کی جگہ جداگانہ خاندانی نظام کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے، اور مالی معاملات بھی جداگانہ ہوں، البتہ الگ گھر کے بجائے اس انداز سے ایک گھر کی تعمیر کی جائے کہ اس میں ایک دو کمروں پر مشتمل مختلف یونٹس ہوں، ہر یونٹ ایک مستقل گھر کی حیثیت رکھتی ہو، اس طور پر کہ اس کے ساتھ گھر کی دیگر سہولیات بھی ہوں، بیوی، شوہر اور اس کی نابالغ اولاد کے لئے ایک یونٹ اور والدین، بالغ اولاد اور زیر کفالت دیگر رشتہ داروں کے لئے دوسری یونٹ، اس طرح سے والدین کی دیکھ ریکھ بھی ہوسکے گی اور دیگر رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی بھی ممکن ہوگی، اور آج کے دور میں یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے، علامہ حصکفی لکھتے ہیں: "وبيت منفرد من دار له غلق ومرافق مفاده لزوم كنيف ومطبخ" (الدر المختار مع الرد ۳۲۱/۵) بڑے گھر کا ایک کمرہ اس طور پر کہ اس کو بند کیا جاسکتا ہو اور اس میں دوسری سہولیات ہوں، اس کا تقاضا ہے کہ باورچی خانہ اور بیت الخلاء اس سے ملحق ہو۔

جواب ۲:

مالی معاملات ایک دوسرے سے بالکل الگ ہونے چاہئے، اور اگر مشترک بھی ہو تو ہر چیز معلوم اور متعین ہو کوئی چیز پوشیدہ اور سربستہ نہ ہو، اور زیر کفالت لوگوں کے خرچہ کے لئے فقہی کتابوں میں جو اصول بیان کئے گئے ہیں ان کی رعایت ہونی چاہئے، جس کے مطابق بیوی اور بچوں کا نفقہ باپ پر واجب ہے، اور اس میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہوگا (الہندیہ ۵۶۰/۱)۔ اور غیر مالدار والدین کا نفقہ اس کی اولاد پر ہے جس میں بیٹا اور بیٹی دونوں برابر برابر حصہ لیں گے (الموسوعۃ الفقہیہ ۷۶/۴۱) والدین کے علاوہ دیگر ذی رحم محرم رشتہ داروں کا نفقہ دینے میں وراثت کا لحاظ رکھا جائے گا، یعنی جس اعتبار سے انہیں اس زیر کفالت شخص کی میراث سے حصہ متعین ہے، اسی اعتبار سے نفقہ واجب ہوگا۔ (ویجب ذالک علی قدر المیراث الہندیۃ ۵۶۶/۱)

اگر اولاد میں سے ایک بہت مالدار ہو اور دوسرا نصاب زکاۃ کے بقدر مال کا مالک ہو تو ایسی صورت میں دونوں کو برابر برابر نفقہ دینا ہوگا، جیسا کہ قاضی خاں کی رائے ہے، لیکن شمس الائمہ کہتے ہیں کہ اس فرق کو اس وقت نظر انداز کیا جائے گا، جبکہ دونوں کے معیار میں ہلکا سا فرق ہو، اور اگر بہت زیادہ فرق ہو تو نفقہ دینے میں اس تفاوت کا لحاظ رکھا جائے گا (الہندیہ ۵۶۵/۱)۔ میرے خیال میں قاضی خاں کی رائے زیادہ مناسب ہے اور اس فرق کا لحاظ نہیں رکھنا چاہئے، اس لئے کہ فرق کا لحاظ رکھنا مشہور ضابطہ: "الغرم بالغنم" کے برخلاف ہے، نیز اس کے لئے معیار متعین کرنا بھی بہت دشوار ہے جس کی وجہ سے باہم کشمکش کا اندیشہ ہے۔

زیر کفالت افراد کی تعداد کو نظر انداز کر کے معاہدہ کے ذریعہ اگر ہر شخص پر اس کی وسعت کے مطابق یا برابر اخراجات عائد کردیئے جائیں تو یہ بھی درست ہے، بشرطیکہ ہر شخص خوشدلی سے اس معاہدہ میں شریک ہو، اشعری قبیلہ کی ایک نمایاں خوبی کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إن الأشعريين إذا أرملوا في الغزو أو قل طعام عيالهم بالمدينة جمعوا ما كان عندهم في ثوب واحد، ثم اقتسموه بينهم في إناء واحد بالسوية فهم مني وأنا منهم''۔

(اشعری لوگوں کا جب حالت سفر میں توشہ ختم ہوجاتا ہے یا شہر میں رہتے ہوئے کچھ گھروں میں غلہ کم ہوجاتا ہے تو ان کے پاس جو کچھ ہوتا ہے اسے ایک کپڑے میں جمع کرتے ہیں اور پھر باہم برابر تقسیم کرلیتے ہیں، وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں)۔

مشترکہ خاندانی نظام میں عام طور پر خوش دلی کا جذبہ مفقود ہوتا ہے، معاشرتی دباؤ اور شرما حضوری میں لوگ اس نظام سے بندھے رہتے ہیں، اس لئے اسے ختم ہی کر دینا چاہئے۔

جواب (۳):......رقم کے تناسب کا اعتبار کیا جائے گا اور اگر کوئی معاہدہ ہے تو اس کی پابندی ضروری ہے۔

جواب (۴):......عہد و پیمان کے مطابق اگر پوری آمدنی حوالے کرنا ہے تو چوری چھپے کچھ پس انداز کرنا جائز نہیں ہے، اور اگر پوری آمدنی دینے کا معاہدہ نہیں ہے تو معاہدہ کے مطابق دینے کے بعد بچی ہوئی رقم کمانے والے کی ملکیت ہوگی۔

جواب (۵):......اس سلسلہ میں بھی عہد و پیمان یا عرف و رواج کا اعتبار کیا جائے گا، اور اگر ایسی کوئی صورت نہ ہو تو اس کے حقدار صرف کمانے والے ہوں گے۔

جواب (۶):......چہرہ کا پردہ ایک اختلافی مسئلہ ہے، اس لئے بربناء ضرورت قریبی غیر محرم رشتہ داروں سے چہرہ کے پردہ کو مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ پردہ کے دیگر جو حدود ہیں اس کی رعایت ان قریبی رشتہ داروں کے سامنے بھی ضروری ہے۔

جواب (۶):......امور خانہ داری اور اس سے متعلق چیزیں عورت کی ذمہ داری میں شامل ہے یا نہیں، یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے، سلف وخلف میں سے ایک جماعت کی رائے ہے کہ گھر سے متعلق امور کی انجام دہی بیوی پر واجب ہے، چنانچہ ابوثور کہتے ہیں کہ عورت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر چیز میں اپنے شوہر کی خدمت کرے "علیہا أن تخدم زوجہا فی کل شیئ" (زاد المعاد ۱۸۷/۵)۔ اسی طرح سے امام مالک سے منقول ہے کہ اگر شوہر تنگ دست ہو تو امور خانہ کی انجام دہی بیوی پر واجب ہے، گرچہ اس کا تعلق امیر، کبیر اور شریف گھرانے سے ہو۔ (فتح الباری ۳۸۴۵/۳) حنفیہ میں سے ابن ہمام نے لکھا ہے کہ اخلاقی طور پر یہ چیزیں عورت پر واجب ہیں قانونی طور پر واجب نہیں ہیں: "إن ہذہ الأعمال واجبۃ علیہا دیانۃ ولا یجبرہا القاضی" (فتح القدیر ۲۰۱/۴)۔

امام شافعی، امام ابوحنیفہ، اور بعض دوسرے حضرات کی رائے ہے کہ یہ چیزیں عورت پر واجب نہیں ہیں، علامہ ابن قیم نے دونوں طرح کی آراء سے متعلق دلائل کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ:

جس ماحول اور معاشرہ میں قرآن نازل ہوا وہاں کا عرف و رواج یہی تھا کہ عورتیں گھر کا کام کیا کرتی تھیں، شوہر بیوی کی خدمت کرے، جھاڑو لگائے، آٹا گوندھے، روٹی پکائے، کپڑا دھلے، اور اس کے علاوہ دیگر گھریلو کام کرے، یہ چیزیں اس معاشرہ میں "منکر" کے زمرے میں آتی تھیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"ولہن مثل الذی علیہن بالمعروف" (البقرۃ:۲۲۸)

نیز ارشاد باری ہے:

"الرجال قوامون علی النساء" (سورہ نساء:۳۴)

اگر عورت کی جگہ مرد کام کرنے لگے تو عورت قوامہ ہوگی نہ کہ مرد، حالانکہ مذکورہ آیت میں مرد کو قوام بنایا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے عورت کا خرچہ، کپڑا، رہائش مرد پر واجب قرار دیا ہے، کس لئے یہ چیزیں مرد پر واجب ہیں، کیا صرف اس لئے کہ مرد اس سے اپنی ضرورت اور خواہش پوری کرتا ہے، لیکن اس چیز میں تو عورت بھی مرد کے ساتھ شریک ہے، دونوں ہر ایک سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور اپنی ضرورت

پوری کرتے ہیں، مرد پر یہ ذمہ داری اس لئے ڈالی گئی ہے کہ عورت پر گھر کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ حدیث میں عورت کو ''قیدی'' کہا گیا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''اتقوا اللہ فی النساء فإنھن عوان عندکم''۔

عورتوں کے سلسلہ میں اللہ سے ڈرو اس لئے کہ وہ تمہارے پاس قیدی کی طرح ہیں۔

اور حضرت اسماء بنت ابی بکر کے متعلق صحیح روایتوں میں ہے کہ وہ اپنے شوہر حضرت زبیر کے گھر کا تمام کام کیا کرتی تھیں، اور اس سے فارغ ہوکر ان کے گھوڑے کی دیکھ ریکھ کرتیں، پانی ڈھو کر لاتیں، اور گھر سے کافی فاصلہ پر جاکر گھوڑے اور اونٹ کے چارے کا نظم کرتیں۔

اسی طرح سے حضرت فاطمہ کے گھریلو کام اور پانی لانے کا واقعہ بہت مشہور ہے، یہاں تک کہ جب کام کا بوجھ بہت بڑھ گیا تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک غلام کی ضرورت لیکر آئیں، لیکن اس موقع پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے یہ نہیں کہا کہ یہ سب چیزیں تمہارے ذمہ ہیں، فاطمہ کو پریشان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح سے حضرت اسماء کے سر پر چارے اور گھاس کا ٹوکرا دیکھ کر آپ نے حضرت زبیر سے یہ نہیں کہا کہ ان کے ذمہ یہ کام نہیں ہے، یہ ان کے اوپر ظلم ہے، یہ تمہارا کام ہے، تم اسے انجام دو، یا اس کا کوئی انتظام کرو، اسی طرح سے دیگر صحابہ کرام کی بیویاں بھی ان کی خدمت اور گھریلو کام کرتی تھیں، لیکن آپ نے کبھی اسے ناپسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا، بلکہ اس عرف ورواج کو باقی رکھا، حالانکہ یہ بات معلوم ومشہور ہے کہ تمام عورتیں خوش دلی سے یہ کام نہیں کرتی تھیں، بلکہ ان میں بعض ایسی بھی یقینی طور پر ہوں گی جنہیں یہ ناپسند رہا ہوگا۔

جو لوگ اسے واجب نہیں کہتے ان کی دلیل یہ ہے کہ عقد نکاح کا تقاضا صرف یہ ہے کہ مرد عورت سے جنسی فائدہ اٹھائے، خدمت لینا یہ تقاضائے عقد کے برخلاف ہے، اور صحابیات کا امور خانہ داری کو انجام دینا ان کی طرف سے جنسی تعلق رضاکارانہ تعاون ہے، اس طرح کے واقعات کو وجوب کے لئے دلیل بنانا صحیح نہیں ہے۔ (دیکھئے زاد المعاد ۵/ ۱۸۷، ۱۸۸، ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر، ابن القیم الجوزیۃ، ط: موسسہ الرسالہ، بیروت ۱۹۸۵ء)

علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

علماء کے درمیان یہ اختلافی مسئلہ ہے کہ شوہر کی خدمت عورت پر ضروری ہے یا نہیں، جیسے گھر کی صفائی، ستھرائی شوہر کے لئے کھانے، پینے کا نظم، اس کے غلاموں کے کھانے کا انتظام، اور اس کے جانوروں کے لئے چارہ مہیا کرنا وغیرہ، بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ عورت پر واجب نہیں ہے، یہ ایک کمزور رائے ہے، جیسے کہ ان لوگوں کا قول ضعیف ہے جو کہتے ہیں کہ شوہر پر عورت کے ساتھ رہنا اور صحبت کرنا واجب نہیں ہے، اس لئے کہ یہ معروف معاشرت کے خلاف ہے اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ چیزیں عورت پر واجب ہیں اور یہی صحیح ہے، اس لئے کہ اللہ کی کتاب کے مطابق شوہر عورت کا ''سید'' ہے اور سنت رسول کے مطابق عورت اس کے پاس قیدی ہے، اور غلام اور قیدی پر اپنے مالک کی خدمت واجب ہے، اور اس لئے کہ یہی معروف ہے۔ (دیکھئے فتاوی ابن تیمیہ ۲/ ۲۳۴، ۲۳۵)

خلاصہ یہ ہے کہ شوہر کے والدین کی خدمت اصلاً شوہر پر واجب ہے، اسی طرح سے بیٹیوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے والدین کی خدمت کریں، اور بقول علامہ ابن حزم والدین کی خدمت کی ذمہ داری شوہر کے حق سے مقدم ہے (المحلی ۱۱/ ۳۵۹)۔ لیکن اگر شوہر گھر کے باہر کی ذمہ داریوں میں مصروف ہے، تو ایسی صورت میں انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ شوہر سے متعلق چیزوں کی نگہداشت عورت کرے، یہ بڑی عجیب بات ہوگی کہ شوہر دن بھر رزق کی تلاش میں سرگرداں رہے اور شام میں آکر اپنے والدین کے لئے کھانا پکائے، اور عورت گھر میں بیکار بیٹھی رہے، اللہ کی کتاب میں ہے کہ عورت کے ساتھ معروف کے مطابق معاشرت اختیار کرو، ''وعاشروھن بالمعروف'' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے کہ عورت پر شوہر کی اطاعت فرض ہے، اور عام طور پر معروف طریقہ یہی ہے کہ شوہر سے متعلق چیزوں کی دیکھ ریکھ عورت کرتی ہے، چنانچہ حضرت جابرؓ صرف اس مقصد سے ایک شوہر دیدہ عورت سے نکاح کرتے ہیں کہ وہ ان کی کم عمر بہنوں کی تربیت کرے گی۔ فتزوجت امرأۃ تقوم علیھن وتصلحھن. فقال ﷺ: بارک اللہ لک۔ (صحیح بخاری/ ۱۱۶۴)

☆☆☆

مشترکہ رہائشی خاندانی نظام میں احتیاط وتدبیر کا مسئلہ

مفتی انور علی اعظمی [1]

سوال (۱)...... اسلام کی نظر میں مشترکہ خاندانی نظام بہتر ہے یا جداگانہ زندگی بسر کرنے کا طریقہ؟

جواب:...... زندگی گزارنے کے دونوں طریقے اپنے اندر کچھ اچھائیاں رکھتے ہیں اور کچھ خرابیاں، مشترکہ نظام میں بیٹوں یا بھائیوں کی یکجائی محنت اور مشترکہ جدوجہد خاندان کو معاشی استحکام عطا کرتی ہے۔ ایک باپ کے چند بیٹے ہیں اور چند بیٹیاں بھی۔ ایک لڑکا باپ کا سہارا بننے کے قابل ہوا، باقی دوسرے چھوٹے ہیں، باپ نے اس کی شادی کردی، اب اگر وہ جداگانہ خاندانی نظام بنانے میں بہت عجلت کرتا ہے تو ماں باپ کو بہت تکلیف ہوتی ہے اور ایسا کرنا مروت کے خلاف بھی معلوم ہوتا ہے، ایسی صورت حال میں بڑا لڑکا ذرا صبر سے کام لے چھوٹے بھائی بہن اپنا بار برداشت کرنے کے قابل ہوجائیں یا ماں باپ اس پوزیشن میں ہوں کہ ان کی تعلیم اور شادی بیاہ کی ذمہ داریاں آسانی سے سنبھال سکیں تو پھر لڑکے کے لئے اپنا الگ بندوبست کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

علیحدہ خاندانی نظام کی وکالت کرنے والے حضرات یہ کہہ سکتے ہیں کہ لڑکا الگ رہ کر بھی ماں باپ بھائی بہن کی خدمت کرسکتا ہے، لیکن الگ رہ کر خدمت کرنے میں اور ساتھ رہ کر ذمہ داری سنبھالنے میں بین فرق ہے۔ الگ رہنے کی صورت میں عام طور پر بیویاں اہل خاندان کی مدد کرنے میں حارج بنتی ہیں اور ساتھ رہنے کی صورت میں بڑا لڑکا اپنے باپ کا دست راست ہوتا ہے اور باپ کے بوجھ کو بانٹنے میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔

مولانا سلطان احمد اصلاحی نے اپنی کتاب ''مشترکہ خاندانی نظام اور اسلام'' میں جداگانہ نظام زندگی کی وکالت میں بہت زور لگایا ہے اور مشترکہ نظام کے معائب ونقائص کی ایک طویل فہرست بیان کردی ہے۔ نفسیاتی، دینی، معاشرتی، مالیاتی، معاشی تمام پہلوؤں سے اسے ناپسندیدہ بتایا ہے، بلکہ مشترکہ خاندانی نظام کو جنسی عدم تسکین کا سبب بھی قرار دیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں: ''پھیلے ہوئے گھر اس کی تشنگی اظہر من الشمس ہے۔ جہاں مرد اپنی بیوی سے بچ بچا کر اور دب دبا کر جنسی تسکین کا سامان کرسکتا ہے، جبکہ جنس (Sex) کے سلسلہ میں اسلام کی حساسیت معلوم ہے کہ وہ رشتۂ ازدواج سے باہر جنسی تسکین کو انتہائی سنگین جرم قرار دیتا ہے اور اس کے مرتکب کو سخت ترین سزا کا مستوجب ٹھہراتا ہے''۔ ہوسکتا ہے کہ مولانا اصلاحی صاحب کو مشترکہ خاندان میں کچھ زیادہ تلخیوں سے سابقہ پڑا ہو جس کی وجہ سے تحریر میں کچھ شدت پیدا ہوگئی ہے، لیکن جنسی تشنگی کی شکایت سمجھ میں نہیں آئی یہ تو میاں بیوی کا تنہائی کا معاملہ ہے، اس میں بچنے بچانے اور دبنے دبانے کی کیا ضرورت ہے۔

مشترکہ خاندانی نظام برصغیر میں ایک معہود اور معروف چیز ہے، اسے بالکل غیر شرعی نامعقول اور ناقابل قبول نہیں کہا جاسکتا اور ایک غریب باپ کو اس امر کا مکلف نہیں بنایا جاسکتا کہ وہ ہر لڑکے کی شادی سے پہلے الگ مکان مہیا کرے اور شادی کرکے اسے الگ کردے، ابھی تو جہیز نے لڑکیوں کی شادی میں جو رکاوٹ پیدا کی ہے وہ کچھ کم نہیں، اگر مکان کا مسئلہ کھڑا کردیا گیا تو یہ رہی سہی کسر پوری کردے گا۔

اس لئے چند بھائی خوش اسلوبی کے ساتھ جب تک گزارہ کرسکتے ہوں مشترکہ خاندانی نظام میں کوئی حرج نہیں اور جب خاندان بڑا ہوجائے اور دوریاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو اپنے معاملات صفائی کے ساتھ حل کرکے الگ الگ ہوجائیں۔

اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ اگرچہ چند بھائیوں کا کاروبار مشترک ہے اور کھانا پینا الگ الگ ہے تو یہ اشتراک زیادہ دنوں تک باقی رہتا ہے۔ اس صورت میں کاروبار سے حاصل شدہ آمدنی سالانہ حساب کرکے ہر بھائی کے نام برابر برابر ڈال دی جائے اور اپنی اپنی ضرورت کے مطابق اس میں

---

[1] مفتی دار العلوم، مئو، یوپی۔

سے لیتے رہیں۔ یہ مشترکہ نظام زیادہ دنوں تک چل سکتا ہے۔

سوال نمبر (۲)......اگر مشترکہ خاندان ہو اور افراد خاندان کی ضروریات کے لئے سب مل کر خرچ دیں، کسی کے بچے زیادہ ہوں اور کسی کے کم ہوں، تو کیا ان سب پر برابر اخراجات عائد کئے جائیں گے یا ان کے بچوں کی تعداد کے لحاظ سے؟

جواب:......مسئلہ کی مختلف صورتیں ہیں ایک صورت تو یہ ہے کہ خاندان کے اشتراک کے ساتھ آمدنی کے ذرائع بھی مشترک ہوں اور سب کا کاروبار یکجا ہو، جیسے کہ عام طور پر باپ کی زندگی میں چند بیٹے ایک ساتھ رہتے ہیں اور ایک ساتھ کاروبار کرتے ہیں، باپ کے انتقال کے بعد بھی یہ صورت حال کچھ دنوں تک باقی رہتی ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ چند بھائیوں کے آمدنی کے ذرائع الگ الگ ہوں کوئی ملازمت کرتا ہو، کوئی کاروبار کرتا ہو، کوئی کھیتی کرتا ہو، پہلی صورت میں جب تک بھائیوں کے درمیان مشترک کاروبار باہمی رضامندی کے ساتھ چلتا ہے اس سے افراد خاندان کی ضروریات پوری ہوتی ہیں اور کم اولاد والا اپنے دل میں زیادہ بچوں والے بھائی کے لئے گنجائش رکھتا ہے اور جب تک یہ گنجائش باقی رہتی ہے اشتراک باقی رہتا ہے، اس صورت میں اگرچہ کاروبار میں سب برابر کے حقدار ہیں، لیکن کم وبیش خرچ پر کسی کو اعتراض نہیں ہوتا، اس لئے اسے تبرع اور احسان پر محمول کیا جائے گا، دوسری صورت میں، جبکہ آمدنی کے ذرائع الگ الگ ہوں اس کے باوجود بھی چند بھائی ایک ساتھ رہتے ہیں اور ان کے بچوں کی تعداد بھی کم وبیش ہے تو اخلاقی طور پر جس کے بچوں کا خرچ زیادہ ہے اسے زیادہ دینا چاہئے اور جس کا خرچ کم ہو اسے کم دینا چاہئے لیکن اس صورت میں بچوں کی تعداد کے حساب سے جوڑ کر ہر ایک سے خرچ وصول کرنا مشترکہ خاندانی روایات کے خلاف ہے۔ عام طور پر زیادہ آمدنی والا زیادہ دیتا ہے، کم آمدنی والا کم دیتا ہے، کھیتی کرنے والا افراد خانہ کے لئے غلہ مہیا کرتا ہے، کاروبار اور ملازمت کرنے والا بھائی اپنے پیسے سے گھر کی دوسری ضروریات پوری کرتا ہے اور یہ معاملہ بھی آپس کی بھائی چارگی ایک دوسرے کی ہمدردی کے انداز پر چلتا رہتا ہے، اس صورت میں بھی نہ تو بچوں کی تعداد کے لحاظ سے جوڑ کر پیسے لئے جاتے ہیں اور نہ سب کو مشترکہ خرچ میں برابر برابر کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے، خاندانی اشتراک کی یہ صورت آپسی رضامندی کے ساتھ چلتی رہتی ہے، اس لئے اس کو بھی زیادہ کمانے والے بھائی کا کم کمانے والے بھائی پر تبرع اور احسان ہی کہا جاسکتا ہے۔

سوال (۳)......ایسی صورت میں اگر مختلف بھائیوں نے مل کر اپنے والد یا کسی بھائی کے پاس آمدنی جمع کی ہو اور گھر کے اخراجات سے بچی ہوئی رقم سے کوئی چیز خریدی ہو تو اس میں سبھوں کا حصہ برابر ہوگا یا ہر ایک کی آمدنی کے لحاظ سے ہوگا۔

جواب:......اس صورت میں بچی ہوئی آمدنی سے جو چیز خریدی جائے گی اس میں سب کا حصہ برابر ہوگا اور آمدنی کی کمی زیادتی کا اعتبار نہیں ہوگا، چنانچہ شرکت فاسدہ کے بیان میں شامی میں مذکور ہے: "وكذا لو اجتمع إخوة يعملون في تركة أبيهم. ونمى المال فهو بينهم سوية. ولو اختلفوا في العمل والرأي" (ردالمحتار ۶؍ ۳۹۲، مطبع دارالکتاب دیوبند)۔

اسی طرح کی ایک صورت حال کا جواب قاضی مجاہد الاسلام مرحوم نے دیا ہے، ہمارے سماج میں عام طور پر یہ بات معروف ہے، چند بھائی اجمالی خاندان کی طرح رہتے ہیں، ان میں کوئی زیادہ کماتا ہے کوئی کم، کوئی کماتا ہی نہیں۔ کوئی پڑھنے لکھنے میں مشغول ہے، کوئی کھیتی باڑی دیکھتا ہے، کوئی نوکری کرتا ہے۔ مشترک جائداد ہے اس کی آمدنی بھی گھر پر صرف ہوتی ہے، کمانے والے کو نوکری یا تجارت سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے وہ بھی گھر پر خرچ ہوتی ہے، کچھ عرصہ تک تو گھر بغیر حساب کتاب بہت اچھی طرح چلتا ہے، لیکن پھر میں اور تو، میرے اور تیرے کا جھگڑا شروع ہوجاتا ہے، معاملات واضح نہیں رہتے کوئی شخص اپنی آمدنی سے حاصل جائداد کو اپنی ذاتی قرار دیتا ہے، دوسرے اسے مشترک قرار دے کر اس میں حصہ کے طالب ہوتے ہیں۔ ان حالات میں سخت بگاڑ پیدا ہوتا ہے، اس لئے آپ کے لئے مندرجہ بالا حالات میں مشورہ یہ ہے کہ آپ دیگر بھائیوں کو بٹھا کر پورے معاملات صاف کر لیجئے اور پھر اپنی ذاتی آمدنی سے جو کچھ خریدنا ہو خرید لئے، اب تک جو کچھ حاصل ہوا ہے اسے مشترک مانئے، کس پر کم خرچ ہوا کس پر زیادہ خرچ ہوا یہ ہرگز نہ جوڑیئے۔ (فتاوی قاضی: ۲۳۶)

سوال ۴ (الف):......اگر تین بھائی ہوں دو بھائی اپنی پوری تنخواہ مثلاً دس دس ہزار روپئے گھر میں دیتے ہیں اور ایک بھائی بیس ہزار کماتا ہے وہ بھی دس ہزار گھر میں دیتا ہے اور دس ہزار الگ بچا کر رکھتا ہے تو وہ بچی رقم صرف اس کی ملکیت ہوگی یا تمام بھائیوں کی۔

جواب:......آمدنی کم وبیش ہونے کی صورت میں اشتراک کے وقت معاملہ واضح اور صاف ہونا چاہئے، مذکورہ بالا مسئلہ کی دوصورت ہے ایک یہ کہ بھائیوں میں صراحتاً یہ طے ہوا کہ ہر ایک اپنی پوری کمائی مشترکہ نظام کے حوالے کرے گا، اس صورت میں بغیر بتائے بچا کر رکھنا خیانت ہے اور اس بچی ہوئی رقم میں سب حصہ دار ہیں، دوسری صورت یہ ہے کہ ساتھ رہنے والے تینوں بھائی آپس میں یہ طے کرلیں کہ ہم سب گھریلو خرچ کے لئے دس دس ہزار روپیہ دیں گے اور ہر ایک اس پر راضی ہے، دونوں بھائی یہ جانتے ہیں کہ تیسرے کی کمائی بیس ہزار روپیہ ہے، دس ہزار دینے کے بعد بقیہ دس ہزار وہ بچا کر رکھتا ہے اس صورت میں وہ بچی ہوئی رقم تنہا ایک بھائی کی ہوگی، کیونکہ اس تیسرے نے اپنی کمائی کا روپیہ دونوں بھائیوں کی مرضی سے بچایا ہے، ان کے درمیان ایسا کوئی معاہدہ نہیں تھا کہ ہر ایک اپنی پوری کمائی مشترکہ نظام کے حوالے کرے گا، بلکہ پہلے سے ایک دوسرے کی آمدنی کی مقدار جاننے کے باوجود یہ طے کیا گیا کہ ہر ایک دس دس ہزار روپیہ دے گا، مسئلہ کی ایک تیسری صورت بھی ہے کہ تین بھائی ایک ساتھ رہتے ہوں اور صراحتاً کچھ طے نہ ہو تو اس صورت میں ایک بھائی کی بچی ہوئی رقم مشترک مانی جائے گی اور اس میں سب حصہ دار ہوں گے۔

سوال (۴) ب:......اگر خاندان کے کچھ افراد کماتے ہیں اور کچھ گھر کے کام دیکھتے ہیں اور اس طرح گھر کا کام چلتا ہے تو کیا کمانے والے حضرات کی آمدنی میں کام کرنے والے حضرات بھی برابر کے حقدار ہوں گے۔

جواب:......چند بھائی اگر ایک ساتھ رہتے ہیں تو فطری طور پر سب ایک جیسے نہیں ہوسکتے اور سب ایک برابر کام نہیں کرسکتے، بڑے کاروبار کو سنبھالنے کے لئے چند بھائیوں کے درمیان تقسیم کار بھی ضروری ہے، مثلاً کوئی بھائی دکان پر بیٹھ کر لین دین کی ذمہ داری سنبھالتا ہے، کوئی مال کی سپلائی اور پیسے کی وصولی کے لئے بھاگ دوڑ کرتا ہے، کوئی فیکٹری میں مزدوروں کی نگرانی کرتا ہے، کوئی گھر کے کام کاج دیکھتا ہے۔ اس صورت میں کمائی سب کے درمیان مشترک ہوگی اور سب برابر کے حقدار ہوں گے، اس لئے کہ گھر کا کام دیکھنے والا ایک ذمہ داری سنبھال کر دوسروں کو کمانے کے لئے فارغ کرتا ہے اور اگر وہ ایسا نہ کرتا تو انہیں کمانے کے لئے یکسوئی حاصل نہیں ہوپاتی۔ اس لئے وہ کمانے والے بھائیوں کی آمدنی میں برابر شریک ہوگا۔

سوال نمبر (۵)......جب بیٹیاں اپنے سسرال چلی جائیں اور ماں کو اپنی ضروریات کے لئے تعاون کی ضرورت ہو اور وہ تعاون ایسا ہو جس کو بیٹا خود انجام نہ دے سکتا ہو، تو بہو پر اس خدمت کو بجالانا واجب ہوگا یا نہیں؟

جواب:......شیخ وہبہ زحیلی اپنی کتاب ''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' میں تحریر فرماتے ہیں:

تجب نفقة الوالدين وإن علوا عند الجمهور لقوله تعالى: ''وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا'' ومن الإحسان أن ينفق عليهما عند الحاجة، وقوله عزوجل: ''وصاحبهما في الدنيا معروفاً'' ومن المعروف الإنفاق عليهما لو كانا مخالفين في الدين، فإنها نزلت في الأبوين الكافرين. وليس من المعروف أن يعش إنسان في نعم الله تعالى ويترك أبويه يموتان جوعاً۔ (الرقم: ۸۳۰)

شیخ وہبہ زحیلی نے ''فتح القدیر' البدائع' الشرح الصغیر' المغنی'' متعدد کتابوں کے حوالے سے یہ بات لکھی ہے کہ والدین کا نفقہ اولاد پر واجب ہے، چاہے وہ ماں باپ ہوں یا دادا دادی، اور جمہور کا مسلک یہی ہے، والدین کی تشریح میں جمہور کے نزدیک آباء، اجداد، امہات، جدات یہ سب شامل ہیں، اس لئے کہ لفظ ''اب'' کا اطلاق جد پر بھی ہوتا ہے اور ام کا اطلاق جدہ پر بھی، البتہ امام مالک کے نزدیک جن اصول کا نفقہ اولاد پر واجب ہے وہ اصل باپ اور ماں ہیں۔ اجداد اور جدات اس میں شامل نہیں، لیکن صحیح جمہور کا قول ہے، چنانچہ تفصیل کے بعد اس کی وضاحت کیا ہے کہ: ''والصحیح ہو قول الجمہور''۔

اصول پر انفاق کے واجب ہونے کے لئے چند شرطیں ہیں:

۱۔ اصول، یعنی ماں باپ وغیرہما فقیر ہوں یا کمانے سے عاجز ہوں پھر اگر وہ کمانے پر قادر ہوں، لیکن کماتے نہیں جب بھی حنفیہ اور شافعیہ کے

نزدیک ان کا نفقہ اولاد پر واجب ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ احسان کا حکم دیا ہے اور لڑکے کے غنی ہونے کی صورت میں باپ کو کمانے پر مجبور کرنا احسان کے خلاف بھی ہے اور ان کی ایذاء رسانی بھی۔ البتہ مالکیہ اور حنابلہ کے یہاں اگر باپ کمانے پر قادر ہے تو اسے کمانے پر مجبور کیا جائے گا اور اس کے نفقہ کی ذمہ داری اولاد پر نہیں ڈالی جائے گی۔ (حوالہ سابق ۸۳۱)

۲۔ اصول کے نفقہ کے واجب ہونے کے لئے دوسری شرط ہے کہ اولاد مالدار ہو یا کمانے پر قادر ہو جمہور کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ اولاد کا مال یا اس کی کمائی اس کی اپنی ضروریات سے فاضل ہو اور جس کے پاس اپنی ضروریات سے فاضل مال نہ ہو اس پر کچھ واجب نہیں۔

۳۔ حنابلہ کی رائے میں نفقہ کے واجب ہونے کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ منفق منفق علیہ کا وارث ہو، اس لئے ان کے نزدیک اختلاف دین کی صورت میں نفقہ واجب نہیں ہوگا۔ لیکن حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ ایجاب نفقہ کے لئے اتحاد دین کی شرط نہیں لگاتے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وإن جاهداك على أن تشرك بي ما ليس لك به علم فلا تطعهما وصاحبهما في الدنيا معروفا'' (سورۂ لقمان: ۱۵).

یہ آیت مشرک ماں باپ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کا حکم دیا ہے، قدرت کے ہوتے ہوئے ان کو کھانے پینے سے محروم رکھنا معروف کے خلاف ہے۔ (حوالہ سابق ۸۳۲)

والدین کا نفقہ بیٹوں کے ساتھ بیٹیوں پر بھی واجب ہے:

اصول کا نفقہ ولد پر واجب ہے اور عربی زبان میں لفظ ولد کا اطلاق مذکر مونث دونوں پر ہوتا ہے۔ اس لئے حنفیہ کے نزدیک بیٹے اور بیٹیاں اپنے ماں باپ کے خرچے میں برابر کے ذمہ دار ہیں۔

''تجب نفقة الأصول على الولد لا يشاركه في نفقة أبويه أحد؛ لأنه أقرب الناس إليهما. فكان أولى باستحقاق نفقتهما عليه. وهي عند الحنفية على الذكور والإناث بالسوية؛ لأن المعنى يشتملهما'' (الفقه الاسلامي وادلته ۷۔ ۸۲۲۔ عالمگیری ۲۔۱۵۱)

''بڑھاپے میں ساس کی خدمت بہو کی اخلاقی ذمہ داری ہے''۔

جب تک لڑکیاں گھر پر رہتی ہیں ماں کی خدمت کی سب سے زیادہ ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے۔ خاص طور پر زندگی کے اخیر ایام میں جب وہ اپنی ضروریات کے لئے خود کفیل نہ ہوں پیشاب، پاخانہ کے لئے نہ جاسکتی ہوں تو وہ ایک نازک ترین مرحلہ ہوتا ہے، اس وقت بیٹیاں سب سے زیادہ ماں کی خدمت کے لئے مناسب ہیں۔ اگر بیٹیاں اپنے سسرال جاچکیں ہوں اور پوتیاں اس لائق ہوں تو وہ بھی بیٹیوں ہی کے حکم میں ہیں، لیکن اگر کہیں ایسی صورت حال ہو کہ گھر میں بیٹیاں ہوں نہ پوتیاں تو اخلاقی طور پر بہو اسکی ذمہ دار ہے، البتہ فقہاء کی باتوں سے اس مسئلہ کا ایک اور حل بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اگر بیٹیاں خوشحال ہیں اور باپ کو کوئی ایسی بیماری ہے کہ وہ اپنی ضروریات خود پوری نہیں کرسکتا اور اس کے لئے اسے خادم کی ضرورت ہے تو بیٹے کو باپ کے خادم کے خرچ پر بھی مجبور کیا جائے گا۔ اس سے یہ مفہوم حاصل ہو رہا ہے کہ بیٹے یا تو اپنی بیویوں کو ماں کی خدمت میں لگائیں اور اگر بہوویں اس کام کو انجام دینے سے گریز کرتی ہیں تو بیٹے ماں کے لئے کسی خادمہ کا بندوبست کریں (عالمگیری ۲/۱۵۱) پر مذکور ہے:

''إلا أن يكون بالأب علة لا يقدر على خدمة نفسه ويحتاج إلى خادم يقوم بشانه يخدمه. فحينئذ يجبر الابن على نفقة خادم الأب منكوحة أو أمة. كذا في المحيط''۔

سوال (۶): ...... مشترک خاندان میں چچازاد بھائی بہن یا اس طرح کے دوسرے قریبی رشتہ داروں کے درمیان پردہ کے کیا احکام ہوں گے؟

جواب: ...... مولانا یوسف لدھیانوی مرحوم نے اسی طرح کے ایک سوال کا یہ جواب دیا۔

اجنبی نامحرموں سے چاردیواری کا پردہ ہے اور جو نامحرم رشتہ دار ہوں عورت ان کے سامنے جانے پر مجبور ہو ان سے چادر کا پردہ لازم ہے، اس کی تفصیل حضرت تھانوی کی ''تعلیم الطالب'' سے نقل کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ'' جو رشتہ دار شرعاً محرم نہیں، مثلاً خالہ زاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد، بھائی یا

بہن یا دیور وغیرہ، جوان عورت کو ان کے روبرو آنا اور بے تکلف باتیں کرنا ہرگز نہ چاہئے، جو مکان کی تنگی یا ہر وقت کی آمد و رفت کی وجہ سے گہرا پردہ نہ ہو سکے، تو سر سے پاؤں تک تمام بدن کسی میلی چادر سے ڈھانک کر شرم ولحاظ سے بضرورت روبرو آ جائے اور کلائی، بازو اور سر کے بال اور پنڈلی ان سب کا ظاہر کرنا حرام ہے، اسی طرح ان لوگوں کے روبرو عطر لگا کر آنا عورت کو جائز نہیں اور نہ بجتا ہوا زیور پہنے۔ (تعلیم الطالب۔ آپ کے مسائل اور ان کا حل ۳۶/۸)

حضرت تھانویؒ کی بات بہت اونچی ہے، لیکن اس پر عمل دشوار ہے۔

ایک گھر میں رہتے ہوئے مکمل پردہ بہت مشکل ہے وہ بھی ایسی صورت میں جبکہ بچپن سے ایک ساتھ رہے ہوں کھلے ہوں اور آج بھی ایک چار دیواری میں گزارا ہو رہا ہو تو محض اس تصور سے کہ چچازاد بھائی گھر میں آ رہا ہے فوراً چادر اوڑھ لینا بہت ہی اونچے تقوی کے ساتھ ممکن ہو سکتا ہے، شریعت میں عموم بلویٰ کی بناء پر حکم میں کچھ سہولت دی جاتی ہے، یہاں بھی اسی طرح کی مجبوری ہے گھر کا کام کاج بھی کرنا ہے، چچازاد بھائیوں کا ہر وقت آنا جانا ہے اس لئے آمنا سامنا ہو سکتا ہے اجنبی لڑکے اور لڑکی کا جب آمنا سامنا ہوتا ہے اس وقت کیفیت دوسری ہوتی ہے اور ایک گھر کے لڑکے ولڑکی کا معاملہ اس سے کچھ مختلف ہوتا ہے۔

البتہ ضروری ہے کہ ایک کمرہ میں تنہاء نہ رہیں، جیسا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے (لا یخلون رجل بامرأة لیس منها بسبیل فإن ثالثهما الشیطان. رواہ الترمذی بحوالہ ہدایہ ۴۴۶/۴) کی ہدایت کی ہے، آپس میں بہت بے تکلفی نہ ہو، اور گھر کے بڑے لوگ جوان لڑکے لڑکیوں پر نظر بھی رکھیں، گھر کے ذمہ داروں کی نگرانی اور گھر کی تربیت برائیوں سے دور رکھنے میں بہت مؤثر رول ادا کر سکتی ہے، اس دور میں ہزاروں دوریوں کے باوجود موبائل ایک دوسرے سے قریب کر دیتا ہے۔

بہت دور رہنے والوں کے لئے بھی ملنا کچھ مشکل نہیں اور چہار دیواری میں رہنے والے بھی بچنا چاہیں تو بچ سکتے ہیں، حقیقت میں برائی کا احساس اور اللہ کا ڈر آدمی کو برائی سے بچاتا ہے۔

☆☆☆

مشترکہ خاندانی نظام- شرعی نقطۂ نظر سے

مولانا اختر امام عادل قاسمی[1]

اللہ پاک نے اس روئے زمین کو انسانوں سے آباد کیا، ان کے آپس میں رشتے ناطے قائم کئے، ایک دوسرے کے ساتھ ضرورتیں وابستہ کیں، باہم تعارف کے لئے خاندانوں اور معاشروں کا سلسلہ جاری کیا، اور حقوق وفرائض کا ایک کامل نظام عطا فرمایا، یہ سب چیزیں ظاہر کرتی ہیں کہ انسان باہم مربوط بھی ہے اور ان کے درمیان کچھ فاصلے بھی ہیں، انسان بہت سے سماجی اقدار وروایات کا پابند بھی ہے اور اپنی پرائیوٹ زندگی میں بہت حد تک آزاد بھی، یہ دونوں چیزیں توازن کے ساتھ ہوں تو گھر اور معاشرہ جنت نظیر بن جاتا ہے اور توازن بگڑ جائے تو وہی گھر اور سماج جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔

انسانی فطرت:

انسان فطری طور پر حریت پسند واقع ہوا ہے، وہ سخت اجتماعیت میں بھی انفرادیت کا خواہاں ہوتا ہے اور بے پناہ مشغولیت میں بھی تنہائی کا متمنی ہوتا ہے، اللہ پاک نے انسان کی عجیب خلقت بنائی ہے وہ سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اکیلا رہنا چاہتا ہے اور تنہائی میں بھی وہ اکیلا نہیں ہوتا، ہر شخص کی اپنی شناخت ہے، اپنا ذوق اور مزاج ہے، اپنے مسائل اور ضروریات ہیں اور کوئی شخص زندگی کے کسی بھی مرحلے پر اس کے لئے ہرگز رضامند نہیں ہے کہ اس کی شناخت گم ہوجائے اور اس کے ذوق ومزاج اور شخصی مسائل کو دوسروں کی خاطر نظرانداز کیا جائے، ہر اعتدال پسند انسان چاہتا ہے کہ وہ دوسروں کے کام آئے، مگر دوسروں کے لئے خود اس کی شخصیت فنا نہ ہوجائے، عام انسانی اقدار کا لحاظ واحترام ضروری ہے، مگر اس کی اپنی پرائیویسی بھی ختم نہ ہو، وہ دنیا کے ہر رنگ ونوع کو قبول کرنے کو آمادہ ہے، مگر اس کا اپنا امتیاز بھی برقرار رہنا چاہئے، انسان کے اسی مزاج اور طبقاتی اور خاندانی رنگارنگی کے اسی راز کو قرآن کریم نے مختصر اور بلیغ انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:

''وجعلناكم شعوباً وقبائل لتعارفوا'' (الحجرات: ۱۳)۔

(اور ہم نے تمہارے اندر مختلف جماعتیں اور خاندان بنائے، تاکہ تم باہم پہچانے جاؤ)۔

خاندان کی اہمیت:

خاندان اللہ کی بڑی نعمت ہے، اس میں انسان کے لئے سامان مؤدت بھی ہے اور اس کی پشت پر بہت بڑی قوت بھی، اس سے انسان کی شناخت بھی وابستہ ہے اور جاری اقدار وروایات کا تسلسل بھی، خاندانی پس منظر انسان کے لئے ڈھال کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے بغیر انسان کٹی پتنگ کے مانند ہے اور زندگی کے منجدھار میں گویا وہ ایک بے پتوار کی کشتی پہ سوار ہو، حضرت شعیبؑ کے قصہ میں یہی خاندانی قوت کافروں کے پاؤں کی زنجیر بن گئی تھی، ان کی زبان سے نکلا ہوا یہ جملہ ان کی اسی بے بسی کا غماز ہے:

''ولولا رهطك لرجمناك وما أنت علينا بعزيز قال أرهطي أعز عليكم من الله الآية'' (هود: ۹۱-۹۲)۔

(اگر تمہارے کنبہ کے لوگ نہ ہوتے تو ہم تم کو سنگسار کردیتے، ہمارے نزدیک تمہاری کوئی عزت نہیں ہے، حضرت شعیبؑ نے فرمایا کیا اللہ کے مقابلہ میں میرا کنبہ تمہارے نزدیک زیادہ باعزت ہے؟)۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں شعب ابی طالب کا واقعہ خاندانی وحدت کی بہترین مثال ہے، جس میں مذہب کی قید کے بغیر خاندان

[1] مہتمم جامعہ ربانی منوروا شریف، سمستی پور بہار۔

بنو ہاشم کے ہر فرد نے شرکت کی۔ (طبقات ابن سعد ۱/ ۱۳۹، سیرت ابن ہشام ۱/ ۱۲۲)

اسی طرح دار الندوہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے (معاذ اللہ) منصوبۂ قتل پر قریش کو دس بار سوچنا پڑا تھا کہ کہیں پورا بنی عبد مناف مقابلہ پر نہ آ جائے اور پھر یہ تجویز پاس ہوئی کہ تمام قبائل کے لوگ اس میں شریک ہوں اور ہر قبیلہ سے ایک شخص اس کام میں نمائندگی کرے (طبقات ابن سعد ۱/ ۱۵۲)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاطعہ کے پیچھے بھی جو اصل محرک کارفرما تھا وہ بنو ہاشم کی خاندانی قوت کو کمزور کرنا اور بالآخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کو بے اثر کرنا......

اس سے خاندان کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے، اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح انسان کی ذاتی زندگی کے لئے خاندان کی ضرورت ہے اسی طرح دینی مقاصد میں بھی اس کی بڑی اہمیت ہے۔

قربت میں اعتدال کی ضرورت:

مگر اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ باہم معاملات میں جس قدر صفائی اور قربت میں جتنا اعتدال ہوگا یہ رشتہ اتنا ہی زیادہ مستحکم اور دیر پا رہے گا، یعنی قربت اور قرابت میں بھی فاصلہ برقرار رہنا چاہئے، بہت زیادہ نزدیکی رشتوں کو کاٹتی ہے، حد سے زیادہ قربت دلوں میں دوریاں پیدا کر دیتی ہے، اور اندھا اعتماد جلد ٹوٹ جاتا ہے، اسی اعتدال کا سبق ہمیں ایک حدیث پاک میں ملتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''تعاملوا كالأجانب وتعاشروا كالإخوان'' (الحديث)۔

(آپس میں معاملات اجنبیوں کی طرح کرو اور رہن سہن بھائیوں کی طرح رکھو)۔

مشترکہ خاندانی نظام بہتر نہیں ہے:

اس تناظر میں میری حقیر رائے یہ ہے کہ عام لوگوں کے لئے مشترکہ خاندانی نظام کے بالمقابل جداگانہ خاندانی نظام بہتر ہے، مسئلہ جواز وعدم جواز کا نہیں ہے، بلکہ اس کا ہے کہ ایک عام انسان کے لئے کون سا طرز زندگی بہتر ہے، وہ-جس میں خاندان کے تمام افراد ایک ساتھ رہیں، ایک ساتھ کاروبار کریں اور ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھائیں، یا وہ نظام جس میں خاندان کے تمام لوگ اپنی رہائش، کھانے پینے اور کاروبار میں آزاد ہوں، لیکن اس کے باوجود وہ باہم مربوط بھی ہوں اور ہر رنج وغم میں ایک دوسرے کے شریک ہوں......؟ میری رائے میں عام حالات میں مشترکہ خاندانی نظام بہتر نہیں ہے، اس میں متعدد ایسی قباحتیں ہیں جن سے جداگانہ نظام محفوظ ہے، اسباب کی تفصیل درج ذیل ہے:

اسباب ووجوہات:

(۱) شرعی حدود کی جتنی رعایت جداگانہ نظام میں ممکن ہے، مشترکہ خاندانی نظام میں نہیں، کئی ایسے مراحل ہیں جن میں مشترکہ نظام شرعی حدود کو قائم رکھنے میں ناکام ثابت ہوتا ہے، مثلاً:

کاروبار، اس میں شراکت اگر پوری امانت ودیانت کے ساتھ ہو تو بڑی باعث برکت ہے، احادیث میں اس کی ترغیب آئی ہے، ابوداؤد کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''يد الله مع الشريكين مالم يتخاونا، فإذا تخاونا محقت تجارتهما، فرفعت البركة منها'' (رواه ابوداؤد؛ مشكوٰة)

(شرکاء کے ساتھ اللہ کی مدد ہوتی ہے جب تک کہ خیانت نہ کریں خیانت کریں گے تو ان کی تجارت ختم کردی جائے گی اور برکت اٹھالی جائے گی)۔

''عن أبي هريرة رضي الله عنه رفعه قال: إن الله عز وجل يقول: أنا ثالث الشريكين ما لم يخن أحدهما صاحبه فإذا خانه خرجت من بينهما'' (رواه ابوداؤد، مشكوٰة باب الشركة ۲۵۴)

(حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوع طور پر منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں دو شرکاء کے درمیان تیسرا ہوتا ہوں بشرطیکہ ان میں سے کوئی خیانت نہ کرے اگر کوئی خیانت کرتا ہے تو میں بیچ سے نکل جاتا ہوں)۔

اس کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ شراکت کے کاروبار میں انفرادی قوت کے ساتھ دماغی قوت بھی دو چند ہو جاتی ہے، جس سے کاروبار کی ترقی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں،......مگر شرکت کے ساتھ امانت و دیانت کو قائم رکھنا آسان بات نہیں ہے، ایک تو خود تجارت ہی پوری دیانت داری اور سچائی کے ساتھ بہت مشکل ہے اس میں بھی شراکت کی تجارت، بہت کم ایسی مثالیں ہیں جن میں پوری دیانت اور امانت کے ساتھ شراکت کا کاروبار بحسن وخوبی تادیر جاری رہا ہو، بالخصوص اس دور میں جب کہ مسلمانوں کے اکثر طبقات میں دیانت وامانت کا بحران پایا جاتا ہے...... یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ شراکت کے کسی معاملے میں خواہ وہ قریب ترین رشتہ داروں ہی کے درمیان ہو ہر فریق تمام شرعی حدود کا لحاظ رکھ سکے گا، اور کسی طرف سے کوئی خیانت پیش نہیں آئے گی، کسی کی کوئی حق تلفی نہیں ہوگی، کسی کو کسی سے کوئی آزار نہیں پہنچے گا، اس لئے حق تلفی، ایذارسانی اور خیانت کے ان مضبوط اندیشوں سے بچنے کا محفوظ راستہ یہی ہے کہ انسان جہاں تک ممکن ہو کوئی بھی کاروبار انفرادی سطح پر کرے یا کم سے کم لوگ اس میں شریک ہوں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

''المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده'' (رواہ الترمذی والنسائی؛ مشکوٰۃ: ۱۵)
(مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں)۔

علاوہ ازیں شرکت کی تمام تر فضیلت وبرکت، دیانت کی بنیاد پر ہے اگر دیانت وامانت ہی مفقود یا مشتبہ ہو جائے تو کس بنیاد پر فضیلت ہوگی؟ اور اگر دیانت وامانت موجود ہو تو تنہا تجارت بھی فضیلت سے خالی نہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''التاجر الصدوق الأمين مع النبيين والصديقين والشهداء'' (رواہ الترمذی والدارمی؛ مشکوٰۃ باب المساہلۃ فی المعاملۃ: ۲۴۲)
(سچا اور ایمان دار تاجر انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا)۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ مشترک طور پر رہنے میں بالعموم غیر محرموں سے مکمل شرعی پردہ کا اہتمام نہیں ہو پاتا، بلکہ بسا اوقات اس کا تصور بھی ختم ہو جاتا ہے جو ایک بڑی شرعی قباحت ہے، جس کو مشترکہ طرز رہائش سے ختم کرنا بہت مشکل ہے، انفرادی طرز رہائش میں جس میں زیادہ سے زیادہ والدین شامل ہوں اس قباحت سے آدمی محفوظ رہ جاتا ہے، اور انسان چاہے تو پوری طرح شرعی پردہ کا اہتمام کر سکتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گھریلو نظام:

(۳) جداگانہ خاندانی نظام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی سے زیادہ قریب ہے، اس لئے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیک وقت نو (۹) بیویاں تھیں، (مشکوٰۃ ۲۴۷) اور ان سب کی رہائش اور خورد ونوش کا انتظام جداگانہ تھا، تمام کے حجرے الگ تھے، جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سے زیادہ پاک دل اور صاف باطن دنیا میں کون ہو سکتا ہے؟ اور ان سے بڑھ کر دوسروں کے حقوق کی نگہداشت کا خیال کس کو ہو سکتا ہے؟ اگر ان کا مشترکہ نظام بنتا تو بھی ہر طرح کی قباحت سے ان کا بچنا دوسروں کے مقابلہ میں بہت آسان تھا، کہ یہ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کا گھرانہ تھا، یہاں کے افراد دنیا کے سب سے چنے ہوئے لوگ تھے، یہ دنیا کے انسانوں کے لئے سب سے بہترین نمونہ تھے اور جن کو دیکھ کر تقویٰ وطہارت کے سانچے متعین کئے جاتے تھے...... خود قرآن کریم نے ان کے امتیاز وانفرادیت کی ضمانت دی ہے:

''يا نساء النبي لستن كأحد من النساء إن اتقيتن، الآية'' (احزاب: ۳۲)
(اے نبی کی عورتو! تم دنیا کی عام عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم تقویٰ اختیار کرو......)۔

لیکن ان سب کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشترکہ نظام اختیار نہیں فرمایا اور تمام ازواج کے لئے قیام وطعام کا جداگانہ نظام قائم فرمایا۔

روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کو ازواج مطہرات کے پاس تشریف لے جاتے اور پوچھتے کہ آج گھر میں کچھ ہے؟، اگر ہر گھر سے جواب ملتا نہیں، تو آپ فرماتے کہ اچھا میں نے روزہ رکھ لیا۔ (مسند احمد بن حنبل ۲/ ۴۹)

اگر کھانے کا نظام مشترکہ ہوتا تو تمام ازواج کے پاس تشریف لے جانے کی زحمت نہ فرماتے۔

بعد میں جب فتوحات کا آغاز ہوا تو آپ کی اجازت سے بنونضیر کے نخلستان سے جو آمدنی حاصل ہوتی تھی اس میں ہر ایک کا برابر برابر حصہ مقرر کر دیا گیا، جو ان کے سال بھر کے مصارف کے لئے کافی ہوتا تھا (بخاری کتاب النفقات باب حبس الرجل قوت سنة علی اہلہ ۲/۸۰۶)، پھر خیبر فتح ہوا تو ازواج کے لئے فی کس ۸۰ وسق کھجور اور ۲۰ وسق جو سالانہ مقرر ہو گیا، وسق ۶۰ صاع کا ہوتا ہے (بخاری کتاب الحرث والمزارعة باب المزارعة بالشطر حدیث نمبر ۲۲۷۰ ج ۱/ ۳۱۳)۔

ازواج مطہرات کی خوش رنجیاں:

اس احتیاط کے باوجود تمام ازواج مطہرات میں پوری ذہنی ہم آہنگی نہیں تھی ان میں دو گروپ تھے۔ (مشکوٰۃ باب مناقب ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم ص ۵۷۳) کبھی ان میں خوش رنجیاں بھی ہو جاتی تھیں، مثلاً:

شہد کے مسئلے پر ازواج کے درمیان جو خوش رنجی ہوئی وہ تفسیر وحدیث وسیر کی کتابوں میں معروف ہے۔ (نسائی باب الغیرۃ ۲/۱۷۴ وغیرہ)، جس کے نتیجے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے شہد سے بالکلیہ اجتناب فرما لیا تھا، لیکن حکم الٰہی آ جانے کے بعد آپ نے اپنا فیصلہ تبدیل کر لیا، قرآن میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔

''یاأیها النبي لم تحرم ما أحل الله لك تبتغي مرضات أزواجك والله غفور رحیم، قد فرض الله لكم تحلة أیمانكم والله مولكم وهو العلیم الحكیم'' (التحریم: ۱،۲)

(اے نبی! آپ بیویوں کی دلجوئی کے لئے اللہ کی حلال کردہ چیز سے کیوں پرہیز کرتے ہیں؟ اللہ بخشنے والے مہربان ہیں، اللہ پاک نے آپ کی قسم توڑنے کو ضروری قرار دیا ہے، اللہ آپ سب کا مالک ہے اور وہی علم وحکمت والا ہے)۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لائے تو ام المؤمنین حضرت صفیہؓ رو رہی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رونے کی وجہ دریافت کی، انہوں نے عرض کیا، مجھ کو حفصہؓ نے کہا ہے کہ ''تم یہودی کی بیٹی ہو''، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم نبی کی بیٹی ہو، تمہارے چچا پیغمبر، تمہارے شوہر پیغمبر، حفصہؓ تم پر کس بات میں فخر کر سکتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کو تنبیہ فرمائی، حفصہ! اللہ سے ڈرو۔ (ترمذی کتاب المناقب ۲/۲۷۸)

ایک دفعہ حضرت صفیہؓ کے بارے میں حضرت عائشہؓ کی طرف سے بھی اسی طرح کی تنقید پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ جواب دہرایا تھا۔ (سیرۃ النبی علامہ شبلی نعمانی ۲/۲۴۳)

ایک بار حضرت عائشہؓ نے حضرت صفیہؓ کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اشارتاً ایسی بات کہی جس سے ان کے چھوٹے قد ہونے پر تعریض جھلکتی تھی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کو تنبیہ کی اور فرمایا، عائشہ! تم نے اتنی سخت بات کہی ہے کہ اگر وہ سمندر میں ڈال دی جائے تو پورے سمندر کو متغیر کر دے (مشکوٰۃ باب حفظ اللسان والغیبۃ ص: ۴۱۴ بروایت ابوداؤد وترمذی)

ایک موقعہ پر حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راتوں کو حضرت عائشہؓ کے اونٹ پر چلتے تھے اور ان سے باتیں کرتے تھے، ایک دن حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ آج رات تم میرے اونٹ پر اور میں تمہارے اونٹ پر سوار ہوں، تاکہ مختلف مناظر دیکھنے میں آئیں، حضرت عائشہؓ راضی ہو گئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ کے اونٹ کے پاس آئے جس پر حضرت حفصہؓ سوار تھیں جب منزل پر پہنچے اور حضرت عائشہؓ نے آپ کو نہیں پایا تو اپنے پاؤں کو اذخر گھاس کے درمیان لٹکا کر کہنے لگیں، خداوندا! کسی بچھو یا سانپ کو متعین کر جو مجھے ڈس جائے۔ (سیرۃ النبی علامہ شبلی نعمانی ۲/۲۴۳)۔

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں تھے اور ازواج مطہراتؓ بھی ساتھ تھیں، اتفاقاً حضرت صفیہؓ کا اونٹ بیمار ہو گیا، حضرت زینبؓ کے پاس ضرورت سے زیادہ اونٹ تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ ایک اونٹ صفیہؓ کو دے دو، انہوں نے کہا، کیا میں اس یہودیہ کو اپنا اونٹ دے دوں؟ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اس قدر ناراض ہوئے کہ دو مہینے سے زیادہ ان کے پاس نہ گئے۔ (مشکوٰۃ باب ما نہی من التہاجر ص ۴۲۹ بروایت

(ابوداؤد)

حضرت صفیہؓ کھانا نہایت عمدہ پکاتی تھیں، ایک دن انہوں نے کچھ پکا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا، آپ اس وقت حضرت عائشہؓ کے گھر میں تشریف رکھتے تھے، حضرت عائشہؓ نے خادم کے ہاتھ سے پیالہ چھین کر زمین پر دے مارا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالہ کے ٹکڑے چن چن کر یکجا کئے اور ان کو جوڑا، پھر صاحب خانہ سے اس کے بدلے میں دوسرا پیالہ منگوا کر ان کو واپس کیا۔ (بخاری، کتاب المظالم باب اذا کسر قصعۃ او شیئا لغیرہ ۱/۳۳۷، ۲/۷۸۶ باب الغیرۃ کتاب النکاح، نسائی باب الغیرۃ ۲/۷۰)

بعض روایتوں میں حضرت صفیہؓ کے بجائے حضرت ام سلمہؓ کا نام ہے اور بعض میں حضرت زینب بنت جحشؓ کا نام لیا گیا ہے۔ (فتح الباری کتاب النکاح ۹/ ۴۰۴)

نکاح کے بعد حضرت علیؓ کی رہائش:

(۴) جداگانہ خاندانی نظام کے مسئلہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی کے اس واقعہ سے بھی روشنی ملتی ہے جو حضرت علیؓ کے بارے میں تاریخ میں موجود ہے:

مؤرخین کا بیان ہے کہ حضرت فاطمہؓ سے نکاح سے قبل حضرت علیؓ کی سکونت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھی، حضرت فاطمہؓ سے نکاح کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حضرت حارثہ بن النعمانؓ کے خالی مکان میں منتقل فرمادیا اور پھر اس کے بعد ہمیشہ ان کا اپنا گھریلو نظام الگ ہی رہا۔ (سیرۃ النبی ۱/ ۲۱۱۔ ۲۱۲ علامہ شبلی نعمانی)

اگر مشترکہ نظام زیادہ پسندیدہ اور قابل ترجیح ہوتا تو حضرت علیؓ کو علحدہ مکان میں منتقل کرنے کے بجائے اپنے ساتھ ہی ان کی رہائش کا انتظام کیا جاتا، جبکہ صاحبزادی حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ دونوں قبل سے آپ کی کفالت میں تھے، اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ خود اپنی اولاد میں بھی شادی کے بعد پرائیویسی اور انفرادیت کا لحاظ رکھا جانا چاہئے۔

فقہاء کا تجویز کردہ نظام سکونت:

(۵) فقہاء نے افراد خانہ کے لئے رہائش کا جو نقشہ مرتب کیا اس میں بطور خاص اس پرائیویسی کا لحاظ رکھا ہے، مثلاً شریعت اسلامیہ نے شوہر پر یہ حق عائد کیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو رہائش فراہم کرے، قرآن کریم میں ہے:

''وأسكنوهن من حيث سكنتم من وجدكم ولا تضاروهن لتضيقوا عليهن'' (الطلاق :٦)

(عورتوں کو رہائش فراہم کرو جو تمہاری حیثیت کے مطابق ہو اور ان کو تکلیف نہ پہنچاؤ کہ وہ تنگ آجائیں)۔

اس ذیل میں فقہاء نے یہ تصریح کی ہے کہ رہائش کا یہ مطلب نہیں ہے کہ محض عورت کے سر پر ایک چھت فراہم کردی جائے، بلکہ جداگانہ اور مخصوص مکان کی فراہمی عورت کا شرعی حق ہے جس میں وہ نجی زندگی گذار سکے اور جو شوہر کے اہل خانہ اور رشتہ داروں کی آمدورفت سے محفوظ ہو۔

علامہ کاسانیؒ رقمطراز ہیں:

''ولو أراد الزوج أن يسكنها مع ضرتها أو مع أحمائها كأم الزوج وأخته وبنته من غيرها وأقاربه فأبت ذلك، عليه أن يسكنها فى منزل مفرد، لأنهن ربما يؤذينها ويضرون بها فى المساكنة. وإبائها دليل الأذى والضرر. ولأنه يحتاج إلى أن يجامعها ويعاشرها فى أى وقت يتفق، ولايمكنه ذلك إذا كان معها ثالث. حتى لو كان فى الدار بيوت ففرغ لها بيتاً وجعل لبيتها غلقاً على حدة قالوا: إنها ليس لها أن تطالبه ببيت آخر'' (بدائع الصنائع كتاب النفقة ٣-٤٢٨، ٤٢٩)

(اگر شوہر اپنی بیوی کو اس کی سوکن، دیوروں، شوہر کی ماں، بہن، لڑکی یا دیگر رشتہ داروں کے ساتھ رکھنا چاہے اور عورت اس کے لئے آمادہ نہ ہو

توشوہر پر لازم ہے کہ اس کو جداگانہ مکان میں رہائش دے، اس لئے کہ ایک ساتھ رہنے پر ایک دوسرے کو تکلیف ہوسکتی ہے، چنانچہ عورت کا انکار اس کی علامت ہے، نیز عورت کو اپنے شوہر کے ساتھ کسی بھی وقت تنہائی کی ضرورت ہے اور تیسرے کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں، البتہ ایک بڑے گھر میں کئی کمرے ہوں اور شوہر ان میں سے ایک کمرہ اپنی بیوی کے لئے خاص کردے اور اس کے لئے تالا چابی الگ کردے تو فقہاء نے کہا ہے کہ پھر اسے مزید کسی کمرہ یا مکان کے مطالبہ کا حق نہیں رہ جائے گا)۔

بعض فقہاء نے یہ وضاحت کی ہے کہ اوسط سے اوپر درجہ کے گھرانوں میں کمرہ کے ساتھ مطبخ، بیت الخلاء اور پانی کا انتظام بھی جداگانہ ہونا چاہئے، درمختار میں ہے

''ومراده لزوم كنيف ومطبخ. وينبغي الإفتاء به (درمختار) أي بيت الخلاء وموضع الطبخ بأن يكونا داخل البيت أو في الدار لا يشاركها فيهما أحد من أهل الدار. قلت: وينبغي أن يكون هذا في غير الفقراء الذين يسكنون في الربوع والأحواش بحيث يكون لكل واحد بيت يخصه، وبعض المرافق مشتركة كالخلاء والتنور وبئر الماء ...وذكر الخصاف أن لها أن تقول: لا أسكن مع والديك وأقربائك في الدار، فأفرد لي داراً، قال صاحب الملتقط: هذه الرواية محمولة على المؤسرة الشريفة، وماذكرنا قبله ان إفراد بيت في الدار كاف، إنما هو في المرأة الوسط اعتباراً في السكنى بالمعروف اه... ومفهومه أن من كانت من ذوات الأعسار يكفيها بيت، ولو مع أحمائها وضرتها كأكثر الأعراب وأهل القرىٰ وفقراء المدن الذين يسكنون في الأحواش والربوع... فقد مر أن الطعام والكسوة يختلفان باختلاف الزمان والمكان'' (ردالمحتار کتاب الطلاق ۵-۲۵۵-۲۵۶)

یہ مضمون فقہ کی تقریباً تمام ہی کتابوں میں آیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی قانون رہائش کے معاملہ میں ہر شخص کی نجی زندگی اور اس کے تقاضوں کا پورا لحاظ رکھتا ہے اور اس کو مشترکہ طور پر رہنے کے لئے مجبور نہیں کرتا...... یہ مسئلہ فقہاء نے بیوی کے حق سکونت کے ذیل میں بیان کیا ہے، لیکن دیکھئے تو بیوی خاندان کی سب سے بڑی اکائی ہوتی ہے اور میاں بیوی سے ملکر ایک مختصر خاندان وجود میں آتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ اس میں توسیع ہوتی رہتی ہے، بچے پیدا ہوتے ہیں، بوڑھے ماں باپ شامل ہوجاتے ہیں وغیرہ،...... لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا مسئلہ دراصل آغاز کے وقت پیدا ہوتا ہے کہ بچوں کی شادی کے بعد ان کو ساتھ رکھا جائے یا ان کو جداگانہ رہائش دی جائے، حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے مذکورہ بالا واقعہ اور فقہاء کی ان تصریحات سے متبادر ہوتا ہے کہ بہتر طریقہ یہی ہے کہ شادی کے بعد ہی اولاد کو الگ کردیا جائے اور ان کی جداگانہ رہائش اور نجی زندگی میں مداخلت کے بغیر ان سے خدمت اور دیگر حقوق کے لئے نظام بنایا جائے۔

عہد اسلامی کے بعض علاقوں کی رہائش:

(۶) علامہ شامیؒ نے ''کتاب الطلاق'' میں اپنے عہد اور اپنے علاقہ کے طرز رہائش کے بارے میں ضمناً جو اشارہ کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دور میں مسلم خاندانوں میں جداگانہ رہائش عام تھی، البتہ بیت الخلاء اور پانی وغیرہ میں گاہے اشتراک بھی ہوتا تھا اور یہ اس دور میں اعلیٰ اور اوسط دونوں طرح کے گھرانوں میں عیب کی بات نہیں مانی جاتی تھی، شامی کے الفاظ ہیں:

''وأهل بلادنا الشامية لا يسكنون في بيت من دار مشتملة على أجانب. وهذا في أوساطهم فضلاً عن أشرافهم. إلا أن تكون داراً مورثة بين إخوة مثلاً. فيسكن كل منهم من جهة منها مع الإشتراك في مرافقها. فإذا تضررت زوجة أحدهم من أحمائها أو ضرتها وأراد زوجها إسكانها في بيت منفرد من دار لجماعة أجانب، وفي البيت مطبخ وخلاء يعدون ذلك من أعظم العار عليهم. فينبغي الإفتاء بلزوم دار من بابها'' (ردالمحتار کتاب الطلاق مطلب في مسكن الزوجة ۵-۲۵۵ مطبوعہ دیوبند)۔

(ہمارے علاقہ میں شام کے لوگ کسی ایسے مکان میں رہائش کو پسند نہیں کرتے جس کے احاطے میں دوسرے اجنبی لوگ بھی رہ رہے ہوں یہ

اوسط گھرانوں کا حال ہے اشراف کا تو کہنا ہی کیا، الا یہ کہ کوئی ایسا مکان ہو جو بھائیوں میں وراثت کی بنیاد پر مشترک ہو اور ہر بھائی کی فیملی الگ الگ حصے میں پانی اور بیت الخلا وغیرہ کے اشتراک کے ساتھ رہائش پذیر ہو، ایسی صورت میں اگر کسی بھائی کی بیوی اپنے دیور یا سوکن سے تکلیف محسوس کرے اور اس کی وجہ سے اس کا شوہر کسی ایسے فلیٹ یا گھر میں اپنی بیوی کو منتقل کرنا چاہے جس میں مطبخ اور بیت الخلاء وغیرہ تو موجود ہوں مگر اس کے احاطے میں اجنبی خاندان بھی رہائش پذیر ہوں تو ہمارے علاقے میں یہ بڑے عیب کی بات سمجھی جاتی ہے)۔

مشترکہ نظام کے مقاصد:

(۷) مشترکہ رہائش کا مقصد باہم جذبۂ تعاون کو فروغ، خاندانی رشتوں کا احترام، بزرگوں کے زیر سایہ چھوٹوں کی تربیت، ایک دوسرے کے تجربات سے استفادہ، کچھ دن محنت پھر آرام کی فطری خواہش اور ہر شخص کی اس میں حصہ داری کا لحاظ اور تنہائی و بے کسی کے کرب سے ہر ایک کی حفاظت، جس کی نوبت ایک نہ ایک دن بڑھاپے میں ہر شخص کو آتی ہے وغیرہ......

لیکن آج کے دور میں جہاں اکثر اخلاقی قدریں زوال پذیر ہو رہی ہیں، ان میں باہم اشتراک کے ساتھ ان بلند مقاصد کا حصول مشکل ہو گیا ہے، عموماً ایک ساتھ رہنے کے نتیجے میں باہم اختلاف بڑھتا ہے، رشتوں کا توازن بگڑتا ہے، ماحول میں کشیدگی پیدا ہوتی ہے، نزدیکیاں دوریوں میں بدلتی ہیں، باہم مخلصانہ جذبات کمزور پڑنے لگتے ہیں، تعاون کے بجائے ضرر کا جذبہ ابھرنے لگتا ہے، حقوق و فرائض کا احساس تشنۂ تکمیل رہ جاتا ہے، حق تلفیاں عام ہو جاتی ہیں، بزرگوں کا احترام بے کیفی اور بدمزگی میں بدل جاتا ہے، رسم و روایات کے جبر سے بغاوت وجود میں آتی ہے، سب ملکر آگے بڑھنے کے بجائے ایک دوسرے کو پچھاڑنے اور نیچا دکھانے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور اس ضمن میں اکثر جانی و مالی زیادتیاں بھی ہوتی ہیں وغیرہ......

جداگانہ نظام کے ذریعہ مقاصد کا حصول:

اس لئے شریعت کے عام اصول کے مطابق کہ ''منافع کے حصول سے زیادہ ضروری مفاسد کو دور کرنا ہے''، ''لاضرر ولاضرار'' بعض اہم مقاصد کے حصول کے لئے مشترکہ خاندانی نظام کے بجائے دفع مضرت کی خاطر جداگانہ خاندانی نظام زیادہ لائق ترجیح اور قابل قبول ہے...... بلکہ اگر صحیح وقت پر اور شرعی اصولوں کی روشنی میں اولاد یا بھائیوں کو علحدہ رہائش مہیا کرا دیا جائے، اور ان کی ابتدائی تربیت دینی بنیادوں پر ہوئی ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ الگ الگ رہ کر بھی افراد خاندان ان بلند مقاصد کے ممکنہ حصول کے لئے متحد نہ ہوں جو مشترکہ نظام کی روح ہیں اور ان مفاسد کو دور کرنے کے لئے کوئی لائحہ عمل مرتب نہ ہو سکے جو جداگانہ نظام کا لازمہ سمجھا جاتا ہے، جب ایک دوسرے سے مسائل وابستہ نہ ہونگے، تو باہم تنازعہ نہیں ہوگا، محبت فروغ پائے گی، خون کا رشتہ رنگ لائے گا، ایک دوسرے کی مصیبت میں لوگ کام آئیں گے، ہر شخص دوسرے کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے گا......

رہا بوڑھے ماں باپ اور خاندان کے بے آسرا لوگوں کا معاملہ، تو ان کے لئے باہم اشتراک سے کوئی نظام مرتب کیا جاسکتا ہے، تمام افراد خاندان کے درمیان حسب مرتبہ اس کے لئے کوئی ترتیب بنائی جائے، آخر ہر صاحب ایمان ماں باپ، خاندان کے بزرگوں اور غریب رشتہ داروں کی خدمت کی اہمیت جانتا ہے، اگر محبت کے ماحول میں باہم مشورہ سے کسی نظام کا تعین ہو تو عام حالات میں افراد خاندان کا تعاون حاصل ہونا مشکل نہیں۔

مشترکہ نظام کی بڑی خرابیاں:

(۸) مشترکہ نظام میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ بالعموم موروثی جائیدادوں اور ذرائع آمدنی کی تقسیم عمل میں نہیں آتی اور نہ اس کی ضرورت سمجھی جاتی ہے اور بسا اوقات پشتہا پشت تک اسی طرح گذر جاتا ہے، عموماً اس کی نوبت اس وقت آتی ہے جب شدید اختلاف کے بعد انتہائی کشیدہ ماحول میں ورثہ علحدگی پر مجبور ہوتے ہیں، پھر بہت سے پرانے قضیے سامنے آتے ہیں، حق تلفیوں اور زیادتیوں کے معاملات اجاگر ہوتے ہیں، اور نزاع اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ اس کو حل کرنا آسان نہیں ہوتا، یہ بالعموم تمام ہی لوگوں کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے......اس کی جگہ پر اگر لوگ جداگانہ طرز رہائش کی عادت بنالیں اور والدین بھی شادی کے بعد جلد ہی اپنی اولاد کو علحدہ کر دیں تو وراثت کی فوری تقسیم کی ضرورت محسوس کی جائے گی اور

بغیر کسی بڑے نزاع کے شفاف تقسیم عمل میں آئے گی، رزق بھی حلال اور تعلقات بھی الزامات اور کشیدگیوں سے بالاتر رہیں گے، شریعت اسلامیہ مشترک معاملات اور اجتماعی زندگی میں ایسے نظام العمل کی حوصلہ افزائی کرتی ہے جس میں انسان مواقع تہمت اور موضع اشتباہ سے حتی الامکان محفوظ ہو، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''إتقوا مواضع التهمة'' (الحدیث) (مقام تہمت سے بچو)۔

''الإثم ما حاك في صدرك وكرهت أن يطلع عليه الناس'' (رواہ مسلم (مشکوۃ باب الرفق والحیاء:۴۳۱)
(گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے اور اس سے لوگوں کا باخبر ہونا پسند نہ ہو)۔

(۹) مشترکہ نظام میں ایک بہت بڑی اقتصادی قباحت یہ ہے کہ آدمی عموماً انفرادیت، خود اعتمادی، شخصی آزادی اور خود کفیل ذریعۂ آمدنی سے محروم ہوجاتا ہے، بہت سے لوگوں کو دوسرے پر انحصار کا مزاج بن جاتا ہے اس کی بنا پر وہ اپنے بارے میں خود کچھ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، اس کی مضرت کا احساس اکثر لوگوں کو اس وقت ہوتا ہے جب وہ شدید اختلاف کے بعد الگ ہوتے ہیں اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہیں، اس وقت دنیا میں وہ خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں، اردگرد جو لوگ ہوتے ہیں ان سے عداوت کی بنا پر وہ مشورہ تک نہیں لے سکتے، لاچار غیروں کا سہارا لینا پڑتا ہے، ایسے وقت مخلص اور غیر مخلص کی شناخت مشکل ہوتی ہے، اور مجبوری بھی ہوتی ہے، اس سلسلے کے تجربات آئے دن سامنے آتے رہتے ہیں۔

دوسری اقتصادی خرابی یہ ہے کہ مشترکہ نظام میں کمانے والوں کی تعداد کھانے والوں سے بہت کم ہوتی ہے جس کا منفی اثر خاندان کے علاوہ ملک کی معیشت پر بھی پڑتا ہے اور اس طرح آمد و خرچ کا توازن بگڑ جاتا ہے، جبکہ جداگانہ نظام میں خاندان کی ہر چھوٹی بڑی اکائی کام کرنے پر مجبور ہوتی ہے اور ہر ذمہ دار شخص بہتر سے بہتر ذریعۂ آمدنی اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے جس سے وہ خود بھی ترقی کرتا ہے اور ملک کی معیشت بھی مضبوط ہوتی ہے۔

(۱۰) مشترکہ نظام میں ایک بہت بڑا مسئلہ حسابات کی شفافیت اور ہر شخص تک اس کی محنت اور سرمایہ کے مطابق منافع کے پہونچنے کا ہے، ایک گھر میں متعدد افراد خاندان ایک ساتھ گذر بسر کرتے ہیں ان میں کسی کی آمدنی زیادہ ہوتی ہے کسی کی کم، کسی کے اخراجات اس کی آمدنی سے زیادہ ہوتے ہیں تو کسی کے کم، والدین اگر حیات ہوں تو کوئی بیٹا گھر کے خرچ یا کاروبار کے لئے زیادہ پیسے دیتا ہے کوئی کم، ظاہر ہے کہ ہر شخص یکساں آمدنی اور خرچ کا تو مالک نہیں ہوسکتا، ہر شخص کی اپنی صلاحیتیں اور مواقع ہوتے ہیں، لیکن مشترکہ نظام میں باہمی جذبۂ تعاون کو بنیاد بنا کر اس تفاوت کو نظر انداز کیا جاتا ہے، بالخصوص باپ کی موجودگی میں یہ مسئلہ ہرگز زیر بحث نہیں آتا، لیکن جب سخت حالات میں سب کی جدائی عمل میں آتی ہے تو مشترکہ جائیداد کی تقسیم برابر برابر حسب حصۂ شرعی کی جاتی ہے، فقہاء بھی یہی فرماتے ہیں کہ چونکہ ملکیتیں ممتاز نہیں ہیں، اس لئے سارے لوگ باپ یا رئیس خاندان کے معاون تصور کئے جائیں گے اور موجودا ثاثہ پر سب کا حق برابر ہوگا اور تقسیم حسب حصص شرعی انجام پائے گی۔ (ردالمحتار کتاب الشرکۃ ۳؍ ۳۸۳)

مگر اس کے بعد کتنی پیشانیاں شکن آلود ہوتی ہیں، بغض و نفرت، کینہ و حسد اور تہمت والزام تراشی کا نہ تھمنے والا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، زیادہ کمائی دینے والے کو اپنے خسارہ کا احساس، اور کم دینے والے کو مزید سے مزید لینے کی فکر...... اس وقت سارا جذبۂ تعاون ہوا ہوجاتا ہے اور ایک ہی گھر کے افراد باہم اس طرح برسرپیکار نظر آتے ہیں جیسے صدیوں کی دشمنی چلی آرہی ہو، ''الامان والحفیظ''، کیا فائدہ ایسے مشترکہ نظام اور وقتی جذبۂ تعاون کا، جس کا انجام اتنا بھیانک ہو؟ ...... بہت کم ہیں ایسے گھرانے جو اس شدید انجام سے بچ جاتے ہوں اکثر لوگ اس اذیت ناک بھٹی سے گذرتے ہیں...... اور شرعی مسائل کی بنیاد عام حالات پہ ہوتی ہے، نہ کہ مخصوص اور استثنائی حالات پر ...... تلك عشرة كاملة۔

یہ وجوہات ہیں جن کی بنا پر میری حقیر رائے میں جداگانہ خاندانی نظام زیادہ بہتر اور شرعی قباحتوں سے بڑی حد تک پاک ہے، خصوصاً آج کے دور میں جبکہ جذبۂ تدین، احساس ذمہ داری اور دینی واخلاقی قدروں کا فقدان ہوتا جارہا ہے، امیدیں ٹوٹ رہی ہیں اور رشتوں پر مفادات کا غلبہ ہورہا ہے، ایسے حالات میں جداگانہ خاندانی نظام قبول کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے، اس وقت خاندان کے بااثر لوگوں کی ذمہ داری ہوگی کہ بوڑھے والدین اور خاندان کے کمزور اور بزرگ حضرات کے لئے ایک نظام العمل مرتب کریں جس میں خاندان کی ہر اکائی کی مالی حیثیت اور قرابت و تعلق کو

ملحوظ رکھا جائے، اور خاندان کے جملہ افراد اپنی اولین ترجیحات میں اس کو شامل کریں۔

مشترکہ نظام میں گھر کے اخراجات کی تقسیم:

اگر مشترکہ خاندان ہو اور افراد خاندان کی ضروریات کے لئے سب مل کر خرچ دیں، کسی کے بچے زیادہ ہوں اور کسی کے کم، تو کیا ان سب پر برابر اخراجات عائد کئے جائیں گے یا ان کے بچوں کی تعداد کے لحاظ سے؟

ضابطہ کی بات تو بظاہر یہ لگتی ہے کہ جس کا خرچ زیادہ ہو اس پر زیادہ اخراجات عائد کئے جائیں، لیکن مشترکہ نظام کی روح اور اس کے مقاصد کا تقاضا یہ ہے کہ سب پر برابر اخراجات عائد ہوں،، بچوں کی تعداد کا لحاظ ضروری نہیں ہے، اس لئے کہ اس نظام کی بنیاد تعاون باہمی پر ہے، تاکہ کوئی کمزور فرد کم آمدنی کی بنا پر زندگی کی دوڑ میں پیچھے نہ رہ جائے اور مالی دشواریاں اس کی ترقی کی راہ میں حائل نہ ہوں، مشترکہ نظام میں کوئی اپنی مالی قوت سے فائدہ پہونچاتا ہے تو کسی کی افرادی قوت کام آتی ہے، کوئی صحت سے کمزور ہوتا ہے تو کسی کی جسمانی صلاحیت اس کی مددگار ہوتی ہے، اگر باہمی تعاون وتناصر کا جذبہ مفقود ہو جائے تو سرے سے یہ نظام ہی ختم ہو جائے گا اور کوئی ضرورت نہیں رہ جائے گی مشترکہ نظام کے اس ڈھیر سارے بکھیرے کی، اگر ذمہ داریوں کے باب میں انفرادی اخراجات کا تناسب ہی ملحوظ ہو تو جداگانہ نظام ہی میں کیا قباحت تھی جو اس رسمی نام نہاد مشترکہ نظام کے جھمیلے میں آدمی پڑے......۔

دراصل یہ مسئلہ عرف پر مبنی ہے مشترکہ نظام کا معروف دستور یہی ہے کہ خاندان کا ہر فرد اپنی حیثیت کے مطابق اس میں حصہ لیتا ہے اسی طرح رائج حقوق وفرائض میں بھی اس کی شراکت برابر کی ہوتی ہے، اس نظام میں آمد وخرچ اور افادہ واستفادہ کا تناسب نہیں دیکھا جاتا، بلکہ ہر شخص اس نظام کا حصہ ہوتا ہے اور ہر ایک اپنی طاقت بھر حصہ داری نباہتا ہے، پس ہر ایک کو اس نظام سے اپنی ضرورت کے مطابق فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے......۔

اس مسئلہ میں درج ذیل فقہی عبارات سے روشنی حاصل کی جاسکتی ہے جو شرکت کے کاروبار کے ذیل میں کتب فقہ میں موجود ہیں، جن کی متعدد صورتوں میں محنت وعمل میں بین فرق ہونے کے باوجود تمام شرکاء کو منافع میں برابر کا حصہ ملتا ہے:

''وکذا لو اجتمع إخوة یعملون فی ترکة أبیھم ونمی المال فھو بینھم سویة، ولو اختلفوا فی العمل والرأی'' (ردالمحتار ۳۔۳۸۳)

(اگر کئی بھائی ملکر باپ کے ترکہ سے کاروبار کریں تو منافع میں سب برابر کے شریک ہونگے خواہ محنت وتجربہ کے لحاظ سے ان میں فرق ہو)۔

الأب وابنه یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لھما شیء کالکسب، فکلہ للأب إن کان الابن فی عیاله لکونه معیناً، ألا تری لو غرس شجرة تکون للأب'' (ردالمحتار فصل فی الشرکة الفاسدة ۳۔۳۸۳ وکذا فی الفتاوی الھندیة ۲۔۳۲۹)

(باپ اور بیٹے ملکر کوئی کام کرتے ہوں اور دونوں میں سے کسی کا سرمایہ اس میں لگا ہوا نہ ہو مثلاً کوئی محنت یا ہنر والا کام کرتے ہوں اگر بیٹا باپ کے زیر سرپرستی رہائش رکھتا ہو تو ساری کمائی باپ کی متصور ہوگی اور بیٹا اس کا محض مددگار قرار دیا جائے گا)۔

''وفی الخانیة زوج بنیه الخمسة فی دارہ وکلھم فی عیاله واختلفوا فی المتاع فھو للاب وللبنین الثیاب التی علیھم لاغیر'' (شامی فصل فی الشرکة الفاسدة ۳۔۳۸۳)

(فتاویٰ خانیہ میں لکھا ہے کہ کسی کے پانچ شادی شدہ بیٹے اس کے زیر پرورش گھر میں رہتے ہوں اور ان میں سامانوں کے بارے میں اختلاف پیدا ہو تو سارا سامان باپ کا مانا جائے گا اور بیٹوں کو صرف اپنے بدن کے کپڑوں کا مالک قرار دیا جائے گا)۔

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشترک نظام میں (اگر قیام وطعام سب مشترک ہو) والد یا امیر کنبہ اصل ہوتا ہے اور باقی تمام افراد اس کے معاون تصور کئے جاتے ہیں اور اصل کے واسطے سے موجود اثاثہ پر سب کا حق مساوی پہنچتا ہے، مذکورہ بالا فقہی عبارت میں بیٹے کی ساری آمدنی کا مالک بھی باپ کو قرار دیا گیا ہے، اس کا مطلب ہے کہ اس میں ان بھائیوں کا بھی حصہ ہوگا جنہوں نے باپ کے ساتھ اس مال کے کمانے میں محنت

نہیں کی تھی......اسی طرح اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مشترک نظام کا اصل مقصد تعاون باہم ہوتا ہے۔

گھر میں جمع شدہ آمدنی سے کسی چیز کی خرید:

(۳) اگر مختلف بھائیوں نے مل کر اپنے والد یا کسی بھائی کے پاس آمدنی جمع کی اور گھر کے اخراجات سے بچی ہوئی رقم سے کوئی چیز خریدی گئی تو اس میں سبھوں کا حصہ برابر ہوگا یا ہر ایک کی آمدنی کے لحاظ سے ہوگا؟

یہ مسئلہ بھی پچھلے اصول ہی سے جڑا ہوا ہے، فقہاء نے وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ ہر ایسا مشترک معاملہ جہاں ملکیتیں مخلوط ہوں، متمائز نہ ہوں جن میں فی صد کا تعین مشکل ہو وہاں تمام شرکاء کا حق برابر مانا جائے گا، علامہ شامیؒ نے مستقل عنوان ہی قائم کیا ہے "مطلب اجتمعا فی دار واحدة واکتسبا ولا یعلم التفاوت، فھو بینھما بالسویة" اس نوع کی متعدد نظیریں کتب فقہ میں موجود ہیں، شامی میں ہے:

"وماحصله أحدهما فله وماحصلاه معاً فلهما نصفين إن لم يعلم مالكه (درمختار) قوله وما حصلاه معاً، يعني ثم خلطاه وباعاه ...وإن لم يعرف مقدار ماكان لكل منهما صدق كل واحد منهما إلى النصف؛ لأنهما استويا في الاكتساب وكان المكتسب في أيديهما، فالظاهر أنه بينهما نصفان ... ويؤخذ من هذا ما أفتى به في الخيرية في زوج إمرأة وابنها إجتمعا في دار واحدة وأخذ كل منهما يكتسب على حدة ويجمعان كسبهما ولا يعلم التفاوت ولا التساوي ولا التمييز، فأجاب بأنه بينهما سوية" (شامی ۳-۳۹۲)

(مال ایک نے حاصل کیا تو اسی ایک کو ملے گا، اور دو نے ملکر حاصل کیا تو دونوں کو آدھا آدھا ملے گا، دونوں نے ساتھ حاصل کیا یعنی دونوں نے مال کو ملا کر بیچا......دونوں کی الگ الگ مقدار معلوم نہ ہو تو نصف تک ہر ایک کی بات مانی جائے گی، اس لئے کہ کمانے میں دونوں شریک ہیں اور گویا کمایا ہوا مال دونوں کے قبضے میں ہیں، پس ظاہر ہے کہ وہ دونوں کے درمیان آدھی آدھی تقسیم ہوگی، فتاویٰ خیریہ میں ایک جزئیہ اسی بنیاد پر یہ ذکر کیا گیا ہے کہ عورت کا شوہر اور اس کا بیٹا دونوں ایک گھر میں رہتے ہیں اور علحدہ علحدہ کماتے ہوں اگر دونوں اپنی کمائی کو ملا دیں اور پتہ نہ چل سکے کہ کس کا کتنا حصہ ہے؟ تو دونوں میں برابر تقسیم ہوگا)۔

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ زیر بحث مسئلے میں والد یا امیر کنبہ کے پاس جمع شدہ رقم میں سب کا حق برابر ہوگا اور اس میں آمدنی کا فرق ملحوظ نہیں ہوگا، اس لئے اس جمع شدہ سرمایہ کے کسی بھی حصہ سے جو چیز بھی خریدی جائے گی اس میں سب کا حصہ برابر ہوگا، خواہ آمدنی سب نے برابر جمع کی ہو یا کم وبیش، البتہ ضروری ہے کہ یہ ساری آمدنی گھر کے خرچ کے لئے امیر کنبہ کے پاس جمع کی گئی ہو، اور اسی جمع شدہ آمدنی کی بچی ہوئی رقم سے کوئی چیز خریدی گئی ہو، لیکن اگر چند بھائیوں نے والد یا بڑے بھائی کے پاس گھر کے خرچ کے علاوہ الگ سے کوئی رقم بالاقساط یا یکمشت جمع کی اور اس رقم سے کوئی چیز خریدی گئی تو اس میں سب کا حصہ برابر نہیں ہوگا، بلکہ جمع شدہ آمدنی کے لحاظ سے سب کے حصہ کا تعین کیا جائے گا، بشرطیکہ جمع کا تناسب معلوم ہو۔

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ پہلی شکل میں جب کہ گھر کے اخراجات کے لئے سب نے آمدنی جمع کی اس کی بنیاد باہمی محبت، جذبۂ تعاون اور گھر کی عزت وآبرو کے تحفظ پر ہے، اس لئے اس میں آمدنی کے تناسب کا نہیں، بلکہ محض اس جذبہ میں شراکت کا اعتبار کیا جائے گا اور اس میں سب برابر کے شریک ہیں، اس لئے جمع شدہ رقم پر سب کا حق برابر ہوگا، ...... برخلاف دوسری صورت کے کہ اس میں صرف بطور امانت یا وکالت رقم جمع کی گئی ہے، اور امیر کنبہ بھی اس کو ان کی مرضی کے بغیر خرچ نہیں کرسکتا، اس لئے اس میں صرف انہی لوگوں کا حصہ ہوگا جنہوں نے وہ رقم جمع کی ہوگی اور اسی قدر جس تناسب سے رقم جمع کی گئی ہوگی۔ "عالمگیری" میں ہے:

"إلا إذا كان لها كسب على حدة فهو لها، كذا في القنية" (فتاوی عالمگیری ۲-۳۲۹ کتاب الشركة)

(البتہ اگر اس کی کمائی علحدہ ہو تو وہ کمائی اسی کی ہوگی)۔

زیادہ کمانے والے بھائی کی زائد آمدنی میں دوسرے بھائیوں کا حصہ:

(۴) اگر تین بھائی ہیں، دو بھائی اپنی پوری تنخواہ مثلاً دس دس ہزار روپے گھر میں دے دیتے ہیں اور ایک بھائی بیس ہزار روپے کماتا ہے وہ بھی دس ہزار گھر میں دیتا ہے اور دس ہزار الگ بچا کر رکھتا ہے تو وہ بچی ہوئی رقم صرف اس کی ملکیت ہوگی اس میں دیگر بھائیوں کا کوئی حصہ نہ ہوگا، اس لئے کہ آمدنی کا یہ حصہ مشترکہ نظام کے دائرے سے خارج ہے، یہ اس کی ذاتی ملک ہے جو اس نے اپنے لئے پس انداز کی ہے، مشترکہ نظام کے دائرے میں صرف وہ رقم داخل ہوگی جو اس غرض سے اس میں شامل کی جائے گی، بقیہ رقم کو الگ کر لینا اس بات کی علامت ہے کہ وہ اس رقم کو اس نظام کا حصہ بنانا نہیں چاہتا، اور کسی کی مرضی کے بغیر اس کے مال پر تصرف جائز نہیں، اس لئے بچا ہوا مال اس کی ذاتی ملکیت ہی میں رہے گا اور اس پر کسی بھائی یا بہن کا کوئی حق نہیں ہوگا۔

کمانے والے افراد کی کمائی میں گھر کا کام دیکھنے والوں کا حصہ:

(۵) اگر خاندان کے کچھ افراد کماتے ہیں اور کچھ گھر کے کام دیکھتے ہیں اور اس طرح گھر کا کام چلتا ہے تو کیا کمانے والے حضرات کی آمدنی میں کام کرنے والے حضرات بھی برابر کے حقدار ہوں گے؟

مسئلے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں:

(الف) کوئی مشترکہ موروثی یا غیر موروثی کاروبار ہو جس میں کچھ لوگ کاروبار میں لگے ہوں اور کچھ گھر کے معاملات دیکھتے ہوں، ایسی صورت میں کاروبار میں لگے افراد کی آمدنی میں گھر میں کام کرنے والے حضرات بھی برابر کے حصہ دار ہوں گے، اس لئے کہ گھر اور کاروبار دونوں کے شرکاء ایک ہیں اور صرف تقسیم کار کے اصول پر کام کو بانٹ دیا گیا ہے۔

(ب) لیکن اگر کوئی ایسا مشترکہ کاروبار نہ ہو، بلکہ تمام لوگ اپنے اپنے طور پر کام کرتے ہوں اور اسی میں سے کچھ رقم گھر کے خرچ کے لئے دیتے ہوں اور کچھ حسب سہولت پس انداز کر لیتے ہوں اور کچھ لوگ وہ ہوں جو گھر کے معاملات میں مشغول ہوں اور کوئی آمدنی والا کام نہ کرتے ہوں، ایسی صورت میں وہ رقم جو گھر کے خرچ کے لئے کمانے والوں نے دے دی ہے اس میں ظاہر ہے کہ سارے افراد کا برابر حصہ ہوگا، لیکن جو رقم ان لوگوں نے گھر میں نہیں دی، بلکہ اپنے پاس رکھ لی، اس میں دیگر حضرات کا حصہ دار ہونا بہت مشکل ہے، اس لئے کہ جو مال انسان کی ذاتی ملکیت سے خارج نہیں ہوا اس پر دوسرے کا حق کیوں کر ثابت ہوسکتا ہے؟...... زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ گھر کے کام میں لگے ہوئے لوگوں کو آمدنی لانے سے مستثنیٰ کر دیا جائے اور ان کی محنت کو دوسروں کی کمائی کا بدل قرار دیا جائے، یعنی وہ بغیر کمائے ہوئے بھی گھر میں جمع ہونے والی آمدنی میں برابر کے حقدار ہوں گے، لیکن کمائی کا وہ حصہ جو کمانے والوں کی جیب سے نکل کر گھر میں نہیں آیا وہ ظاہر ہے کہ ان کی نجی ملک ہے اس پر دوسروں کو حق دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

والدین کی خدمت وکفالت کی ذمہ داری:

(۶) والدین ساری زندگی بچوں کی خدمت کرتے ہیں اور کفالت بھی اور بڑھاپے میں انہیں خدمت وکفالت کی ضرورت ہوتی ہے، ایسے وقت شریعت اسلامیہ والدین کی خدمت وکفالت کی ذمہ داری اولاد پر عائد کرتی ہے، قرآن کریم میں ہے،

"وقضیٰ ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحساناً" (الاسراء: ۲۳)۔

(اور تیرے پروردگار کا یہ فیصلہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو)۔

"ووصينا الإنسان بوالديه إحساناً" (عنکبوت: ۸)۔

(اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کی)۔

"وصاحبهما في الدنيا معروفاً" (لقمان: ۱۵)۔

(اور والدین کے ساتھ دنیا میں اچھا سلوک کرو)۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص اپنے والد کے ساتھ حاضر ہوا اور عرض کیا:

''یا رسول اللہ إن لی مالاً وإن لی أباً ولہ مال وإن أبی یرید أن یأخذ مالی، فقال رسول اللہ ﷺ: أنت ومالک لأبیک'' (ابوداؤد، کتاب البیوع باب فی المؤجل یأکل من مال ولدہ، ۳۵۳۰. ابن ماجہ کتاب التجارات باب ما للرجل من مال ولدہ ۲۲۹۲، مسند احمد ۲/۲۱۴)۔

(یارسول اللہ! میرے پاس مال ہے اور میرے والد کے پاس بھی مال ہے، پھر بھی میرے والد میرا مال لینا چاہتے ہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم اور تمہارا مال تمہارے باپ کا ہے)۔

بعض روایات میں اولاد کو انسان کی کمائی قرار دیا گیا ہے:

''إن أطیب ما یأکل الرجل من کسبہ وإن ولدہ من کسبہ، فکلوا من کسب أولادکم إذا احتججتم إلیہ بالمعروف'' (ابوداؤد ۲-۸۰۱ط حمص، ابن ماجہ ۲-۷۶۹ط الحلبی)

(سب سے پاکیزہ رزق وہ ہے جو انسان اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھائے، اور اولاد بھی انسان کی کمائی ہے، پس ضرورت کے وقت اپنی اولاد کی کمائی کھاؤ معروف طریقہ پر)۔

والدین کے لئے اولاد کی ذمہ داریاں:

فقہاء نے پوری تفصیل کے ساتھ والدین کے لئے اولاد کی ذمہ داریوں کو واضح کیا ہے:

اگر والدین ضرورت مند ہوں اور ان کے پاس مال نہ ہو تو اولاد پر ان کی کفالت واجب ہے، والدین کمانے پر قادر ہوں یا نہ ہوں اگر وہ نہیں کمارہے ہیں تو ان کو کمانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، بلکہ ان کو خرچ مہیا کرنا اولاد کی ذمہ داری ہے بشرطیکہ اولاد صاحب استطاعت ہو یا کمانے پر قادر ہو اور کمائی میں اس کے اپنے اور بیوی بچوں کے اخراجات کے علاوہ گنجائش ہو۔ (تبیین الحقائق ۳/ ۶۴، شامی ۲/ ۶۷۸)

اگر ماں کے مرنے کے بعد باپ نے دوسری شادی کرلی ہو اور باپ کی خدمت کے لئے سوتیلی ماں کا باپ کے پاس رہنا ضروری ہو اور اس کے خرچ کا کوئی انتظام نہ ہو تو صاحب استطاعت اولاد پر باپ کے ساتھ سوتیلی ماں کا خرچ بھی واجب ہوگا، البتہ اگر باپ سوتیلی ماں کے بغیر بھی خود اپنے سارے امور انجام دے سکتا ہو تو اس صورت میں اولاد پر سوتیلی ماں کا خرچہ واجب نہیں ہوگا، دے تو باعث فضیلت ہے، ورنہ مجبور نہیں کیا جائے گا۔

اگر باپ کو خدمت گار کی ضرورت ہو تو خدمت گار کی فراہمی بھی اولاد کے ذمہ ہے، بشرطیکہ ان کے پاس اتنی گنجائش ہو۔

اگر ماں باپ کے پاس نابالغ یا معذور اولاد ہو جن کے اخراجات کا بوجھ بھی انہی کے سر ہو تو ماں باپ کے ساتھ ان کی چھوٹی اولاد کے اخراجات بھی حسب گنجائش کمانے والی اولاد پر واجب ہوگی۔ (بدائع الصنائع کتاب النفقۃ سبب وجوب ھذہ النفقۃ ۳/ ۴۴۳، فتاویٰ ہندیہ نفقۃ ذوی الارحام ۱/ ۵۶۵ ط دیوبند)

فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر باپ کو نکاح کی ضرورت ہو اور بیٹے کے پاس اتنی استطاعت ہو تو باپ کی شادی کرانا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ (فتاویٰ ہندیہ نفقۃ ذوی الارحام ۱/ ۵۶۵ ط دیوبند)

البتہ اگر اولاد میں کوئی اس قدر صاحب استطاعت نہ ہو کہ ان کے کھانے پینے اور خدمت کا مستقل انتظام کر سکے، جبکہ والدین بالکل محتاج اور معذور ہوں، اور ان کے انتظام کی کوئی دوسری شکل موجود نہ ہو تو ایسی صورت میں حکم یہ ہے کہ موجود اولاد اپنے شامل ان کی رہائش اور کھانے پینے کا نظم کرے، اس لئے کہ مشترکہ کھانے میں ایک دو آدمی کے کھانے کی گنجائش بآسانی نکل سکتی ہے، اور الگ رہنے میں جبکہ بنیادی اخراجات کا بھی نظم ممکن نہ ہو، والدین کی صحت اور زندگی کے لئے بڑے خطرات ہیں۔ (فتاویٰ ہندیہ نفقۃ ذوی الارحام ۱/ ۵۶۵ ط دیوبند، بدائع الصنائع کتاب النفقۃ شرائط وجوب النفقۃ ۳/ ۴۴۹)

اگراولاد باوجود استطاعت وسہولت کے والدین کے اخراجات سے انکار یا ٹال مٹول کرے تو والدین کوحق ہوگا کہ وہ ان کو بتائے بغیر اپنے خرچ کے بقدر مال لے لے، اگر وہاں قاضی ہوتو قاضی کے پاس اپنا معاملہ لے جائے۔ (فتاویٰ ہندیہ نفقۃ ذوی الارحام ۱/ ۵۶۷ طدیوبند)

یہی حکم جمہور فقہاء کے نزدیک اولاد کی اولاد کے لئے بھی ہے، یعنی اگر اپنی اولاد مرچکی ہو یا خود بہت محتاج اور معذور ہو تو احکام کی یہ تفصیلات اولاد کی اولاد پر بھی عائد ہونگی اور یہ سلسلہ نیچے تک چلتا رہے گا۔ (العنایۃ علی الہدایہ ۴/ ۴۱۰، مغنی المحتاج ۳/ ۴۴۶)

اسی طرح فقہاء نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ والدین کی خدمت وکفالت کی ذمہ داری اولاد ذکور واناث دونوں پر برابر عائد ہوتی ہے، اگر اولاد میں کوئی زیادہ خوشحال ہے اور کوئی کم تب بھی واجبات کی ادائیگی میں فرق نہیں کیا جائے گا، شمس الائمہ سرخسیؒ نے بعض مشائخ کا قول نقل کیا ہے کہ اولاد میں تھوڑے بہت فرق کا اعتبار نہیں ہے، لیکن بہت زیادہ فرق ہو تو فرق کا لحاظ رکھا جائے گا۔ (فتاویٰ ہندیہ نفقۃ ذوی الارحام ۱/ ۵۶۴، ۵۶۵ طدیوبند)

شامی میں ہے کہ اگر والدین چلنے پھرنے سے معذور ہوجائیں اور ان کی خدمت اور دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ ہو اور ایک بیٹی ہے جو شادی شدہ ہے اور اپنی سسرال میں رہتی ہے تو اس شادی شدہ بیٹی کی ذمہ داری ہے کہ وہ باپ کے گھر آکر ان کی خدمت اور دیکھ بھال کا فریضہ ادا کرے، اگر شوہر اس کے لئے راضی نہ ہو تب بھی والدین کو اس بے بسی کی حالت میں تنہا نہ چھوڑے، ایسے موقعہ پر ماں باپ کا حق مقدم ہے، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ شوہر اس کا نفقہ بند کردے گا، مگر نفقہ کی لالچ میں والدین کی خدمت نہ چھوڑے:

''ولو أبوها ...زمنا مثلاً فاحتاجها، فعليها تعاهده ولو كافراً، وإن أبي الزوج ''فتح'' (درمختار) أي مريضاً مرضاً طويلاً ...وهذا إذا لم يكن من يقوم عليه ... لأن ذلك من المصاحبة بالمعروف المأمور بها ...لرجحان حق الوالد وهل لها النفقة الظاهر لا، وإن كانت خرجت من بيته بحق كما لو خرجت لفرض الحج'' (ردالمحتار كتاب الطلاق مطلب في الكلام على المؤنسة ۲۵۷، ۲۵۸/۵ ط ديوبند)۔

رہ گیا مسئلہ بہو کا، تو قانونی طور پر وہ شوہر کے والدین کے لئے جوابدہ نہیں ہے، قانونی طور سے جس شخص کی وہ بیوی ہے وہ بھی اپنی خدمت کے لئے اسے مجبور نہیں کرسکتا، فقہاء نے اس ذیل میں ایک دلچسپ جزئیہ لکھا ہے:

ولو جاء الزوج بطعام يحتاج إلى الطبخ والخبز فأبت المرأة الطبخ والخبز، يعني بأن تطبخ وتخبز لما روى أن رسول الله ﷺ قسم الأعمال بين علي ؓ وفاطمة فجعل أعمال الخارج على علي ؓ وأعمال الداخل على فاطمة ؓ ولكنها لا تجبر على ذلك إن أبت ويؤمر الزوج أن يأتي لها بطعام مهيأ'' (بدائع الصنائع كتاب النفقة بيان مقدار الواجب في النفقة ۴۳۰/۳، شامي كتاب الطلاق ۵/۲۲۱)۔

(اگر شوہر ایسا کھانا لیکر آئے جس کو پکانے یا روٹی بنانے کی ضرورت ہو اور عورت پکانے سے انکار کردے جیسا کہ روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گھر کے کام کو حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے درمیان تقسیم کردیا تھا، حضرت علیؓ کے ذمہ باہر کا کام اور حضرت فاطمہؓ کے ذمہ اندر کا کام مقرر فرمایا تھا، لیکن اگر عورت انکار کردے تو اس کو مجبور نہیں کیا جائیگا اور شوہر سے کہا جائے گا کہ وہ بیوی کے لئے تیار شدہ کھانا لیکر آئے)۔

ظاہر ہے کہ پھر شوہر کے والدین کی خدمت کے لئے اس کو مجبور کیسے کیا جاسکتا ہے؟ یہ سارا معاملہ اخلاقی ہے، جیسے حضور ﷺ نے حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے درمیان اخلاقی بنیادوں پر کاموں کی تقسیم فرمادی تھی، اسی بنیاد پر المعروف کالمشروط کے اصول پر ساس سسر کی خدمت ودیکھ بھال کا بار بہو پر ڈالا جاسکتا ہے، اور اس سے کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح تمہارا شوہر تمہارے ماں باپ کا خیال رکھتا ہے، تم کو بھی اس کے ماں باپ کا خیال رکھنا چاہئے، بہت سے کام جو قانون کے بل پر نہیں ہوسکتے، اخلاقی قوت کے ذریعہ ہوجاتے ہیں خصوصاً گھریلو اخلاقیات جو عرف میں رائج ہوں، ان کی نزاکت کا لحاظ تو ہر ایک کو رکھنا چاہئے، آخر ایک نہ ایک دن ہر ایک کو اس مرحلے سے گذرنا ہے، علامہ حصکفیؒ نے میاں بیوی کے مسائل کے ذیل میں کثرت مہر کو جہیز سے جوڑتے ہوئے لکھا ہے:

''وعليه فلو زفت به إليه لا يحرم عليه الإنتفاع به، وفي عرفنا يلتزمون كثرة المهر لكثرة الجهاز وقلته لقلته: ولاشك أن المعروف كالمشروط، فينبغي العمل بما مر كذا في النهر''۔ (درمختار علی ردالمحتار

کتاب الطلاق مطلب فی الابراء عن النفقة ۵/۲۲۸)

(عورت جو سامان جہیز لیکر آتی ہے اس سے شوہر کا استفادہ کرنا جائز ہے، اس لئے کہ ہمارے عرف میں جن عورتوں کا مہر زیادہ ہوتا ہے وہ زیادہ سامان جہیز لیکر آتی ہیں اور کوئی شبہ نہیں کہ معروف، مشروط کی طرح ہوتا ہے، اس لئے اس پر عمل ہونا چاہئے)۔

قریبی رشتہ داروں سے پردہ کا مسئلہ:

(۷) مشترک خاندان میں ایک بڑا مسئلہ قریبی رشتہ داروں سے باہم پردہ کا ہے، خاص طور سے جب خاندان کافی بڑا ہو اور سب یا اکثر ایک ہی احاطے میں رہتے ہوں تو بہت احتیاط کے باوجود ایک دوسرے سے مکمل پردہ نہیں ہو پاتا۔

پردہ کے بارے میں شریعت کا مزاج اور مذاق یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل چیز فتنہ اور موقعۂ تہمت سے اجتناب ہے، جہاں فتنہ جتنا زیادہ سخت ہوگا، کراہت اتنی ہی شدید ہوگی، حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''إياكم والدخول على النساء فقال رجل من الأنصار: يارسول الله! أفرأيت الحمو قال: الحمو الموت'' الحديث متفق عليه۔ (مشكوٰة باب النظر الى المخطوبة ص ۲۶۸)

(عورتوں کے پاس جانے سے بچو، ایک انصاری صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ! دیور کے بارے میں کیا رائے ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا دیور تو موت ہے)۔

''وعن عامر بن ربيعة ﷺ قال رسول الله ﷺ: لايخلون رجل بإمرأة قال: ثالثها الشيطان''(مشكوٰة باب النظر الى المخطوبة ص ۲۶۸)۔

حضرت عامر بن ربیعہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص کسی عورت سے تنہائی میں نہ ملے، فرمایا کہ تیسرا شیطان ہوتا ہے۔

گھروں میں ستر عورت کا مسئلہ نہیں ہے حجاب کا مسئلہ ہے جس کا تذکرہ احادیث میں کیا گیا ہے یا قرآن پاک میں آیا ہے کہ جب باہر نکلو تو اپنے اوپر جلباب ڈال لیا کرو (ويدنين عليهن من جلابيبهن) (سورہ نور:۵۹)، یہ اس لئے نہیں کہ چہرہ عورت ہے، بلکہ اس لئے کہ اسی سے فتنہ کا آغاز ہوتا ہے، دیور وغیرہ سے لوگ مذاق اور بے تکلفی کا رشتہ تصور کرتے ہیں، اس لئے وہاں تنہائی اور بے پردگی اور بھی زیادہ خطرناک ہے..... فقہاء حنفیہ کا نقطۂ نظر اس سلسلے میں بہت نرم، لچکدار، معتدل اور موجودہ حالات میں زیادہ قابل عمل ہے:

''وتمنع المرأة الشابة من كشف الوجه بين الرجال لا لانه عورة بل لخوف الفتنة كمسه وإن أمن الشهوة (درمختار)والمعنى تمنع من الكشف لخوف أن يرى الرجال وجهها فتقع الفتنة وهذا فى الشابة.أما العجوزالتى لا تشتهى. فلابأس بمصافحتها ومس يدها إن أمن ولا يجوز النظر إليه بشهوة أى إلا لحاجة والتقييد بالشهوة يفيد جوازها بدونها. لكن سيأتى فى الحظر تقييده بالضرورة.وظاهره الكراهة بلاحاجة داعيةقال فى التتارخانية:وفى شرح الكرخى:النظر إلى وجه الأجنبية الحرة ليس بحرام، ولكنه يكره لغير حاجة' (ردالمحتار كتاب الصلاة مطلب فى ستر العورة ۲/۴۲،۴۳)وكذا فى المبسوط للسرخسى ۱۰/۱۵۲،وفتح القدير ۱/۱۸۱)

(جوان عورت کو مردوں کے درمیان چہرہ کھولنے سے اس لئے نہیں روکا جاتا کہ وہ ستر عورت کے دائرے میں داخل ہے، بلکہ اس لئے کہ فتنہ کا اندیشہ ہے، جس طرح کہ عورت کو چھونا درست نہیں محض فتنہ سے بچنے کے لئے اگرچہ کہ شہوت سے محفوظ ہو،...... مطلب یہ ہے کہ عورت اگر مردوں کے درمیان چہرہ کھولے گی اور لوگ اس کا چہرہ دیکھیں گے تو فتنہ پیدا ہوسکتا ہے...... یہ حکم جوان عورت کے لئے ہے، بوڑھی غیر مشتہاۃ عورت سے مصافحہ کرنے اور اس کا ہاتھ چھونے میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ شہوت سے محفوظ ہو......، اسی طرح جوان عورت کے چہرہ کو بلاضرورت دیکھنا جائز نہیں، شہوت کی قید کا مقصد یہ ہے کہ شہوت نہ ہو تو دیکھ سکتے ہیں، مگر ضرورت کی قید برقرار ہے، یعنی واقعی ضرورت کے بغیر چہرہ دیکھنا مکروہ

ہے، تاتارخانیہ میں شرح الکرخی کے حوالے سے ہے کہ اجنبی عورت کا چہرہ دیکھنا حرام نہیں ہے، البتہ بلاضرورت مکروہ ہے)۔

علامہ شامی نے مختلف فقہی کتابوں کے حوالے سے جو بات منقح کی ہے وہ یہ کہ جوان عورت کا چہرہ کسی اجنبی کے لئے بلاضرورت دیکھنا مکروہ ہے، اگر حاجت ہو اور انسان شہوت سے محفوظ ہو تو بقدر حاجت غیر محرم عورت کا چہرہ دیکھنا درست ہوگا۔

مشترک نظام میں جبکہ خاندان کی متعدد اکائیاں ایک احاطے میں قیام پذیر ہوتی ہیں ایک دوسرے کا آمنا سامنا ہونے سے بچنا بہت مشکل ہے، یہ ایک مجبوری ہے جس میں ابتلائے عام ہے، یہ ویسی ہی مجبوری ہے جس کو فقہاء نے حاجت داعیہ کہا ہے، اسلئے اگر شہوت سے امن ہو تو بلا ارادہ غیر محرم عورت کے چہرہ پر نظر پڑ جانے میں مضائقہ نہیں، البتہ ارادہ کے ساتھ نہ دیکھے، تنہائی میں اکٹھا ہونے سے ہر ممکن پرہیز کرے، باہر یا اپنے کمرے سے گھر کے احاطے میں داخل ہو، تو آواز دیکر یا کھانس کر داخل ہو تا کہ غیر محرم عورتیں محتاط ہو جائیں اور بلاضرورت کسی پر نظر نہ پڑے، عورتیں بھی جب اپنے کمروں سے نکلیں تو پورے پردہ کے ساتھ نکلیں جس میں صرف ضرورت کے بقدر ہی آنکھ وغیرہ کھلی ہو، ہنسی مذاق اور بے تکلفی سے پوری احتیاط برتیں، دل ونگاہ کو پاک رکھیں اور جان بوجھ کر کسی ایسی جگہ نہ رہیں جہاں تنہائی میں کوئی اس سے ملنے کی کوشش کرے، اس احتیاط کے ساتھ رہا جائے تو مشترک نظام مشکل ہونے کے باوجود ناجائز نہیں رہے گا۔

عصر حاضر کے بزرگوں میں حضرت الاستاذ مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے اپنے فتاویٰ میں گھریلو پردہ کے بارے میں تقریباً انہی خیالات کا اظہار کیا ہے (دیکھئے فتاویٰ محمودیہ ۸ / ۲۷۴، ۲۷۵)۔ واللہ اعلم بالصواب۔

خلاصۂ جوابات:

(۱) آج کے دور میں مختلف مصالح کے تحت مشترکہ خاندانی نظام کے مقابلے میں جداگانہ خاندانی نظام زیادہ بہتر ہے اور اس میں شرعی حدود، دوسروں کے حقوق، اور شرعی منکرات ومحظورات سے تحفظ زیادہ ممکن ہے۔

(۲) اگر مشترکہ خاندان ہو اور افراد خاندان کی ضروریات کے لئے سب مل کر خرچ دیں تو سب پر برابر اخراجات عائد کئے جائیں گے، خواہ کسی کے بچے کم ہوں یا زیادہ۔

(۳) اس صورت میں اگر مختلف بھائیوں نے ملکر اپنے والد یا کسی بھائی کے پاس آمدنی جمع کی اور گھر کے اخراجات سے بچی ہوئی رقم سے کوئی چیز خریدی گئی تو اس میں سبھوں کا حصہ برابر ہوگا، آمدنی کا لحاظ نہیں ہوگا۔

(۴) اگر تین بھائی ہیں دو بھائی اپنی پوری تنخواہ مثلاً دس دس ہزار روپے گھر میں دیتے ہیں اور ایک بھائی بیس ہزار روپے کماتا ہے، وہ بھی دس ہزار گھر میں دیتا ہے اور دس ہزار الگ بچا کر رکھتا ہے تو وہ بچی ہوئی رقم صرف اس کی ملکیت ہوگی اس پر بھائیوں کا کوئی حق نہیں ہوگا۔

(۵) اگر خاندان کے کچھ افراد کماتے ہیں اور کچھ گھر کے کام دیکھتے ہیں اور اس طرح گھر کا کام چلتا ہے تو کمانے والے حضرات کی آمدنی میں گھر میں کام کرنے والوں کا کوئی حق نہیں ہوگا، الا یہ کہ کمانے والے حضرات گھر ہی کے مشترک کاروبار میں کام کرتے ہوں تو ایسی صورت میں کمانے والوں کی کمائی میں گھر میں کام دیکھنے والوں کا برابر حصہ ہوگا۔

(۶) والدین کی خدمت وکفالت کی مکمل ذمہ داری اولاد کے سر ہے، خواہ وہ اولاد ذکور ہوں یا اناث، بہو کے اوپر، ''المعروف کالمشروط'' کے اصول پر محض اخلاقی طور پر یہ ذمہ داری آتی ہے، اگر کسی وجہ سے وہ انکار کردے تو اس کو قانوناً مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

(۷) خاندان کے غیر محرم لوگوں سے بھی عام اصول کے مطابق پردہ واجب ہے، بلکہ باہم بے تکلفی اور ساتھ رہنے کی بنا پر خطرات اور بھی زیادہ ہیں، البتہ ایک ساتھ رہنے پر اس میں تھوڑی مشکلات بھی ہیں اور زیادہ تر بے احتیاطی بھی ہوتی ہے، اس لئے جہاں تک ممکن ہو پردہ کا اہتمام ضروری ہے، لیکن تمام احتیاط کے باوجود آمنا سامنا ہوجائے، اور دل میں کوئی شہوت یا بدخیالی پیش نہ آئے تو دفعاً للحرج مضائقہ نہیں۔

☆☆☆

خاندانی نظام-بعض احکام ومسائل

مولانا محمد مصطفی عبدالقدوس ندوی[1]

خاندانی نظام کاڈھانچہ:

قرآن مجید نے خاندانی نظام کو بڑی اہمیت دی ہے، اس کے وجود کو اللہ تعالی کے احسانات میں سے شمار کیا ہے، واضح رہے کہ انسانی خاندان کی بنیاد تین حصوں میں دائر ہے: دادیہال، نانیہال اور سسرال۔ دادیہال اور نانیہال ماں باپ کی طرف سے ہوتے ہیں جن کو نسبی رشتہ کہا جاتا ہے، اور سسرال شوہر و بیوی کی طرف سے ہوتا ہے، جسے قرآنی اصطلاح میں ''صہر'' کہا جاتا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"وهو الذي خلق من الماء بشراً فجعله نسباً وصهرا وكان ربك قديراً" (الفرقان:۵۴) (اور وہ وہی ہے جس نے انسان کو پانی سے پیدا کیا، پھر اس کو خاندان والا اور سسرال والا بنادیا، اور آپ کا پروردگار بڑا قدرت والا ہے)۔

"والله جعل لكم من أنفسكم أزواجاً وجعل لكم من أزواجكم بنين وحفدة ورزقكم من الطيبات..." (النحل:۷۲) (اور اللہ نے تم ہی میں سے تمہارے لئے بیویاں بنائیں اور تمہارے لئے تمہاری بیویوں سے بیٹے اور پوتے پیدا کئے اور تمہیں لذیذ چیزیں کھانے کو دیں)۔

"ومن آياته أن خلق لكم من أنفسكم أزواجاً لتسكنوا إليها وجعل بينكم مودة ورحمة إن في ذلك لآيات لقوم يتفكرون" (الروم:۲۱) (اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تم ہی میں سے تمہارے واسطے جوڑے بنادیئے کہ ان کے پاس چین سے رہو اور تمہارے بیچ میں پیار اور مہربانی رکھا، البتہ اس میں بہت پتے کی باتیں ہیں جو دھیان کرتے ہیں)۔

"وأولوا الأرحام بعضهم أولى ببعض في كتاب الله" (الاحزاب:۶) (اور قرابت والے ایک دوسرے سے لگاؤ رکھتے ہیں اللہ کے حکم میں......)

مشترکہ اور جداگانہ خاندانی نظام کے فوائد ونقصانات:

زندگی گذارنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ایک مختصر خاندان کے تمام افراد۔ جیسے اس کے والدین، بیوی، بچے اور بھائی بہن، بعض اوقات بھائی کے بچے، بلکہ بہن کے بچے بھی- ساتھ رہتے ہیں، اس طریقہ کو مشترکہ خاندان کہا جاتا ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ انسان صرف اپنے بال بچوں کے ساتھ رہے، یا زیادہ سے زیادہ اپنے والدین کو اپنے ساتھ رکھے، اس صورت کو جداگانہ خاندانی نظام کہا جاتا ہے۔

ان دونوں طریقوں میں بعض محاسن بھی ہیں اور بعض مفاسد بھی، مشترکہ خاندانی نظام میں خاندان کے کمزور لوگوں کی مدد ہوتی ہے، بیوہ، مطلقہ عورتوں اور یتیم لڑکوں اور لڑکیوں کی بہتر طور پر پرورش ہوجاتی ہے، بوڑھے ماں باپ کو سہارا حاصل ہوتا ہے، جبکہ اس سے بعض اوقات باہمی نزاع بھی اٹھ کھڑی ہوتی ہے، چچازاد اور پھوپھی زاد بھائی بہنوں کے درمیان پردہ کا اہتمام دشوار ہوجاتا ہے، دوسری طرف علاحدہ خاندانی نظام میں انسان کے اندر اپنی ذمہ داریوں کو محسوس اپنی ضرورتوں کو خود پوری کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، جبکہ مشترکہ خاندانی نظام میں ایسا نہیں ہوتا ہے، کچھ لوگ محنت کرتے ہیں بقیہ لوگ بیٹھ کر عیش کرتے ہیں، اور غیر ذمہ داری کا رجحان فروغ پاتا ہے، علاحدہ خاندانی نظام کا جہاں مذکورہ فائدے ہیں، وہیں اس کا منفی پہلو یہ ہے کہ بوڑھے اور خدمت کے محتاج ماں باپ اور خاندان کے بزرگ حضرات تنہا پڑجاتے ہیں، یتیم بچے اور مطلقہ عورتوں کا بعض دفعہ کوئی پرسان حال نہیں رہتا، استاذ گرامی حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم جداگانہ خاندانی نظام کے نقصانات گناتے ہوئے رقمطراز ہیں:

---

[1] استاذ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

''نوجوان لڑکوں اور خاص کر لڑکیوں میں خاندان سے بے تعلق ہوکر ایسی زندگی گذارنے کا مزاج پیدا ہو رہا ہے کہ جس میں انہوں نے اپنے بزوں کی خدمت کرنی پڑے، اور نہ ان کا حکم ماننا پڑے، ماں باپ جن کے قدموں کے نیچے جنت رکھی گئی اور جن کو جنت کا دروازہ کہا گیا، وہ اولاد کے لئے بوجھ بنتے جا رہے ہیں، خاندان کے بزرگوں کے تجربات پر مبنی مشوروں کو دخل در معقولات تصور کیا جا رہا ہے، رشتۂ نکاح میں وفاداری کے بندھن کمزور ہوتے جا رہے ہیں، اولاد سے فرار کا جذبہ پروان چڑھ رہا ہے، خاندان کے مجبور لوگوں کی کفالت اور ان کی خدمت کی ذمہ داری لوگ اپنے آپ پر محسوس نہیں کرتے، غرض کہ ہمارا خاندانی نظام بھی شکست وریخت کے خطرہ سے دوچار ہے'' (کلیدی خطبہ بموقع خاندانی نظام اور خواتین کے حقوق ر ۱۱)۔

دیہات اور گاؤں سے شہر کی طرف نقل مکانی، الگ رہنے کا بڑھتا ہوا مزاج اور مکانات کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے اب مشترکہ خاندان کے بجائے جداگانہ خاندان کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے، اس رجحان کی وجہ سے مغربی ملکوں میں بوڑھے لوگوں کے لئے مستقل ہاسٹل تعمیر ہو رہے ہیں؛ بلکہ اب ہندوستان کے بڑے شہروں میں بھی اس کی شروعات ہو چکی ہے؛ اسی پس منظر میں حسب ذیل سوالات پھران کے جوابات پیش خدمت ہیں:

مشترکہ خاندانی نظام بہتر یا جداگانہ؟

۱۔ اسلام کی نظر میں مشترکہ خاندانی نظام بہتر ہے یا جداگانہ زندگی بسر کرنے کا طریقہ؟

اسلامی نقطہ نظر سے مشترکہ خاندانی نظام اور جداگانہ زندگی بسر کرنے کا نظام دونوں شرعی حدود کی رعایت کے ساتھ جائز ہیں؛ اس لئے کہ شریعت میں دونوں کی نظیریں ملتی ہیں، مشترکہ خاندانی نظام کی نظیر اسلام کا قانون میراث اور قانون نفقہ ہے کہ جو اس بات کو واضح کرتا ہے کہ خاندانی نظام میں (اتنا پھیلا بھی نہ ہونا چاہئے کہ انسان کے لئے اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہو جائے، اور انسان گھر میں رہتے ہوئے اپنے آپ کو بازار میں محسوس کرے، اور ایک دوسرے سے اکتاہٹ کا سبب بن جائے۔

جہاں تک جداگانہ یعنی صرف اپنے بال بچوں یا زیادہ سے زیادہ اپنے والدین کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی بات ہے تو اس کی نظیر، بلکہ اسوۂ حسنہ موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ زندگی بسر کی ہیں، نیز ہر زوجہ مطہرہ کا گھر سیپریٹ الگ تھا، اور ہر ایک کے یہاں رات گذارنے کی باری بھی متعین تھی، اسی وجہ سے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کی شادی حضرت علیؓ سے کردی تو ان دونوں کو علاحدہ گھر میں بسایا۔

اب رہا افضلیت و بہتر کی بات تو مختلف قرائن وشواہد اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہوتا ہے کہ جداگانہ زندگی بسر کرنے کا طریقہ بہتر ہے، کیونکہ ہر انسان کے اندر خلوت پسندی اور دوسروں کی مداخلت سے تحفظ کا جو جذبہ رکھا گیا ہے، وہ مجروح ہونے سے محفوظ رہتا ہے، اللہ تعالی کے اس ارشاد سے بھی اس طرف اشارہ ملتا ہے: "اسکنوھن من حیث سکنتم من وجدکم" (طلاق:۶) (یعنی جہاں تم رہو وہاں ان کو اپنے مقدور کے مطابق رہنے کے واسطے گھر دو)، اسی وجہ سے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر عورت شوہر سے علاحدہ (سیپریٹ) گھر کا مطالبہ کرے تو شوہر پر لازم ہے کہ ماں باپ، بھائی بہن یہاں تک کہ اگر اس کے پاس دوسری بیوی سے اولاد ہو تو اس سے بھی الگ ہو کر سیپریٹ گھر مہیا کرے، اور الگ بسائے، تاکہ وہ ان لوگوں کی اذیت سے محفوظ رہ سکے، اور شوہر سے حق نفس کے حصول اور استمتاع میں یہ لوگ مخل نہ ہو سکیں، ملک العلماء علامہ کاسانی کا بیان ہے:

''ولو أراد أن يسكنها مع ضرتها أو مع أحمائها كأمه وأخته وبنته من غيرها أو أقاربه فأبت ذلك، عليه أن يسكنها في منزل مفرد، لأنهن ربما يؤذينها ويضررن بها في المساكنة، وإباؤها دليل الأذى والضرر، ولأنه يحتاج إلى أن يجامعها ويعاشرها في أي وقت يتفق، ولا يمكنه ذلك إذا كان معهما ثالث'' (بدائع الصنائع ۴-۴۲۸ ط نعیمیہ دیوبند)

یہی مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کا مذہب ہے، چنانچہ علامہ دردیر، علامہ دسوقی مالکی اور علامہ علیش مالکی کا بیان ہے:

''ولها الامتناع من أن تسكن مع أقاربه كأبويه في دار واحدة لما فيه من الضرر عليهم باطلاعهم على حالها، ولو بعد رضاها بسكناهم معهم ولم يثبت الضرر لها بمشاجرة ونحوها'' (حاشية الدسوقي، الشرح

الکبیر وھامش علیش ۳-۴۸۵)

امام نووی کہتے ہیں: "ومن المعروف أن يسكنها بمسكن، و لأنها تحتاج إليه للاستتار عن العيون عند الاستمتاع" (المجموع ۲۰ر۱۱۰، تحقیق: محمد نجیب مطیعی، ط: دار احیاء التراث العربی، بیروت)، علامہ ابن قدامہ رقمطراز ہیں: "ومن المعروف أن يسكنها في مسكن، ولأنها لا تستغني عن المسكن للاستتار عن العيون وفي التصرف، والاستمتاع. وحفظ المتاع" (المغنی ۱۱ر۳۵۵، ط: دار عالم الکتب، ریاض)

اور اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "فإمساك بمعروف" (بقرہ:۲۲۹) (یا تو بھلے طریقے پر روک رکھنا ہے) "وعاشروهن بالمعروف" (نساء:۱۹) (اور ان لوگوں کے ساتھ اچھی طرح گذر بسر کرو) کا تقاضا یہ ہے کہ شریک حیات کے لئے مستقل علاحدہ رہائش کا نظم ہونا چاہئے۔

بچوں کی تعداد کے لحاظ سے اخراجات ہوں گے:

۲۔ اگر مشترکہ خاندان ہو اور افراد خاندان کی ضروریات کے لئے سب مل کر خرچ دیں، کسی کے بچے زیادہ ہوں اور کسی کے کم ہوں، تو کیا ان سب پر برابر اخراجات عائد کئے جائیں گے یا ان کے بچوں کی تعداد کے لحاظ سے؟

اسلامی قانون یہ ہے کہ بچوں کے اخراجات ان کے باپوں پر واجب ہوتے ہیں، جس طرح بیوی کا نفقہ شوہر پر اور ماں باپ کا خرچ اولاد پر ہوتا ہے، دوسرے افراد خاندان پر نہیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"والوالدات يرضعن أولادهن حولين كاملين لمن أراد أن يتم الرضاعة وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف" (بقرہ:۲۳۳) (مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں، یہ حکم اس کے لئے ہے جو دودھ کی مدت پوری کرنا چاہے، اور (اس صورت میں) دودھ پیتے بچے کے باپ پر ان عورتوں کا معروف طریقہ کے مطابق کھانا اور کپڑا واجب ہے۔''

ظاہر ہے کہ دودھ پلانے والی مطلقہ ماؤں کا نفقہ باپ پر محض بچے کی وجہ سے لازم ہو رہا ہے (بدائع الصنائع ۳ر۴۴۰)، جیسا کہ اللہ تعالی نے دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

"فإن أرضعن لكم فآتوهن أجورهن" (طلاق:۶) (پھر اگر وہ دودھ پلائیں تمہاری خاطر، تو ان کا بدلہ دو)۔

اسی طرح اس آیت کریمہ میں بچہ کو دودھ پلانے کی اجرت باپ پر لازم قرار دی گئی، ایسا اس لئے کہ بچہ کا نفقہ باپ پر واجب ہے (حوالہ سابق، المجموع ۲۰ر۱۳۵، المغنی ۱۱ر۳۷۳)، نیز اللہ تعالی نے فقر و احتیاج کے خوف سے اولاد کو قتل کرنے سے منع فرمایا: "ولا تقتلوا أولادكم خشية إملاق" (سورہ اسراء:۳۱)

اگر اولاد کا نفقہ باپوں پر واجب نہ ہوتا تو انہیں فقر و فاقہ کا خوف نہ ہوتا، اس سے معلوم ہوا کہ بچوں کے جملہ اخراجات باپ پر دینے واجب ہیں۔ (ملاحظہ ہو: سابق حوالہ جات)، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابیؓ سے فرمایا: "تصدق به على ولدك" (ابوداؤد: کتاب الزکوۃ باب فی صلۃ الرحم، حدیث نمبر:۱۶۹۱، نسائی: باب تفسیر الصدقۃ عن ظہر غنی، حدیث نمبر:۲۵۳۶) (اس دوسرے دینار کو اپنے بچوں پر صدقہ کردو)، نیز حضرت ہندہؓ سے فرمایا: "خذي ما يكفيك وولدك بالمعروف" (بخاری: بیوع باب من أجری أمر الأمصار علی ما یتعارفون بینهم، الخ، باب نمبر:۹۵. نفقات، باب إذا لم ینفق فللمرأۃ أن تأخذ بغیر علمه ما یکفیها وولدها بالمعروف، حدیث نمبر:۵۳۶۴، مسلم: کتاب الاقضیہ، باب قضیہ ہند، حدیث نمبر:۴۴۷۷، نسائی، کتاب القضاۃ، باب قضاء الحاکم علی الغائب إذا عرفه، حدیث نمبر:۵۴۲۲، ابن ماجہ، التجارات، باب ما للمرأۃ من مال زوجها، حدیث نمبر:۲۲۹۳)

(یعنی تم اپنے شوہر کے مال میں سے ان کے علم میں لائے بغیر معروف طریقہ پر اتنا مال لے سکتی ہو جو تمہاری اور تمہارے بچے کی ضروریات کے لئے کافی ہو جائے)۔

نیز بچوں کے اخراجات باپ پر واجب ہونے پر امت کا اجماع بھی ہے، جیسا کہ امام ابن المنذرؒ کا بیان ہے کہ اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انسان پر اس کے محتاج بچے جن کے پاس مال نہیں ہے، کا نفقہ واجب ہے۔ (المغنی لابن قدامہ ۱۱ر۳۷۳، تحقیق: ڈاکٹر عبداللہ بن عبدالمحسن ترکی، ڈاکٹر عبدالفتاح

محمد حلو، ط: ۳ر دار عالم الکتب، سعودیہ، ۱۴۱۷ھ)

اسی طرح بیوی کا نفقہ بھی شوہر پر واجب ہے، اس کی دلیل قرآنی آیات، احادیث نبوی اور اجماع امت ہے (بدائع الصنائع ۳ر ۴۱۷، ۴۱۸)، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وعلى المولود له رزقهن و كسوتهن بالمعروف" (بقرہ: ۲۳۳) (اور (اس مدت میں) دودھ پیتے بچے کے باپ پر ان عورتوں کا معروف طریقہ کے مطابق کھانا اور کپڑا واجب ہے)۔

"أسكنوهن من حيث سكنتم من وجدكم ولا تضاروهن لتضيقوا عليهن وإن كن أولات حمل فأنفقوا عليهن حتى يضعن حملهن" (طلاق: ۶) (جہاں تم رہو اپنے مقدور کے مطابق ان کو گھر دو رہنے کے واسطے اور ان کو ایذا دینا نہ چاہو، تاکہ ان پر تنگی برتو، اور اگر پیٹ میں بچہ رکھتی ہوں تو ان پر خرچ کرو، یہاں تک کہ وہ پیٹ کا بچہ جن دیں)۔

"لينفق ذو سعة من سعته، ومن قدر عليه رزقه فلينفق مما آتاه الله، لا يكلف الله نفساً إلا ما آتاها، سيجعل الله بعد عسر يسرا" (طلاق: ۷) (چاہئے کہ خرچ کرے وسعت والا وسعت کے موافق، اور جس کو نپی تلی ملتی ہے اس کی روزی تو خرچ کرے جیسا کہ دیا ہے اس کو اللہ نے، اللہ کسی کو مکلف نہیں بناتا، مگر اسی قدر جتنا کہ اس کو دیا، اب اللہ سختی کے پیچھے آسانی کر دے گا)۔

اس سلسلہ میں بہتری احادیث وارد ہوئی ہیں، ان میں ایک پیش ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "خذي ما يكفيك" (بخاری؛ بیوع، باب نمبر: ۹۵، نفقات، حدیث نمبر: ۵۳۶۴، مسلم؛ کتاب الاقضیہ، حدیث نمبر: ۴۴۷۷، نسائی، کتاب القضاۃ، حدیث نمبر: ۵۴۲۲، ابن ماجہ، کتاب التجارات، حدیث نمبر: ۲۲۹۳)، یعنی اپنے شوہر حضرت ابوسفیانؓ کے مال میں سے ان کے علم میں لائے بغیر معروف طریقہ کے مطابق اتنا مال لو کہ اس سے تمہاری ضرورت پوری ہو جائے۔

پس دریافت کردہ صورت میں افراد خاندان کی ضروریات کے لئے سب مل کر خرچ دے رہے ہوں تو سب پر برابر اخراجات عائد کئے جائیں گے، جبکہ سب کے بچے برابر ہوں اور ہر ایک کے پاس ایک ایک، یا دو دو، یا تین تین یا چار چار بیویاں ہوں، اور اگر ایسا ہو کہ کسی کے بچے زیادہ ہوں اور کسی کے کم ہوں، اسی طرح اگر کسی کے پاس ایک بیوی ہو اور کسی کے پاس دو یا اس سے زیادہ ہوں تو ان سب پر اخراجات ان کے بچوں اور بیویوں کی تعداد کے لحاظ سے عائد کئے جائیں گے۔

البتہ اگر کوئی احسان وایثار کرنا چاہتا ہے کہ اس کے بچے کم ہونے کے باوجود برابر یا بڑھ کر ہی اخراجات دینا چاہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، یہ اس کی طرف سے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی اور بے لوث ان کی خدمت ہوگی، اور یہ ان کے لئے کھونا بھی پانا ہی ہوگا، اس لئے کہ اس کا اجر اللہ کے پاس دوگنا ہے کہ ایک صلہ رحمی کا دوسرے صدقہ کا۔

مشترکہ خریدی ہوئی چیز میں سبھوں کا حصہ کس اعتبار سے ہوگا؟

۳۔ اس صورت میں اگر مختلف بھائیوں نے مل کر اپنے والد یا کسی بھائی کے پاس آمدنی جمع کی اور گھر کے اخراجات سے بچی ہوئی رقم سے کوئی چیز خریدی گئی تو اس میں سبھوں کا حصہ برابر ہوگا یا ہر ایک کی آمدنی کے لحاظ سے ہوگا؟

اصولی اعتبار سے ہر شخص اپنی کمائی کا خود مالک ہوتا ہے، اس میں کسی کا کوئی حق نہیں ہوتا، وہ اپنے مال کو جس طرح چاہے استعمال کرسکتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"للرجال نصيب مما اكتسبوا وللنساء نصيب مما اكتسبن" (نساء: ۳۲) (مردوں کے لئے ان کی کمائی کا حصہ ہے اور عورتوں کے لئے ان کی کمائی کا حصہ ہے)۔

لہٰذا اگر مختلف بھائیوں نے مل کر اپنے والد یا کسی بھائی کے پاس گھر کے اخراجات کے واسطے روپے جمع کئے، لیکن ان بھائیوں نے والد یا جس بھائی کے پاس جمع کئے تھے، ان کو مالک نہیں بنایا تھا، بلکہ اپنی طرف سے ان کو وکیل بنایا تھا، ایسی صورت میں گھر کے اخراجات سے بچی ہوئی رقم سے

کوئی چیز خریدی گئی تو اس میں سبھوں کا حصہ برابر نہیں ہوگا؛ بلکہ ہر ایک اپنی جمع شدہ آمدنی کے تناسب سے مالک ہوگا؛ کیونکہ وکیل کا تصرف دراصل موکل کا تصرف متصور ہوتا ہے (الوکیل متصرف بطریق النیابة عن المؤکل، وتصرف النائب تصرف المنوب عنہ، بدائع الصنائع ۵ ر ۳۷، ط: نعیمیہ دیوبند)

اسی طرح اگر مختلف بھائیوں نے مل کر اپنے والد یا کسی بھائی کے پاس آمدنی جمع کی، ساتھ ہی سبھوں نے یہ کہا کہ گھر کے اخراجات سے جو رقم بچ جائے گی وہ آپ کے پاس امانت کے طور پر رہے گی، اس رقم سے کوئی چیز خریدی گئی تو اس میں سبھوں کا حصہ برابر نہیں ہوگا؛ بلکہ ہر ایک کی آمدنی کے لحاظ سے ہوگا۔

اور اگر سبھوں نے رقم جمع کرتے وقت "تہادوا تحابوا" (حدیث) یعنی ایک دوسرے کو ہدیہ کرو اور اس سے آپس میں محبت والفت بڑھے گی، پر عمل کیا، یعنی مختلف بھائیوں نے جو بھی رقم جمع کی ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی رقم ایک دوسرے کو ہبہ کردے، اس طرح جمع شدہ رقم تمام بھائیوں کے درمیان مشترک ہوجائے گی، ایسی صورت میں اس رقم سے کوئی چیز خریدی گئی تو اس میں سبھوں کا حصہ برابر ہوگا۔

اور اگر سب بھائیوں نے اپنے والد یا کسی بھائی کے پاس آمدنی جمع کرتے وقت انہیں مالک بنادیا تھا کہ وہ جس طرح چاہیں خرچ کریں، تو ایسی صورت میں ہبہ ہوگا، اور ہبہ کا حکم یہ ہے کہ جسے کوئی بھی چیز ہبہ کی جاتی ہے تو اس پر اس کی ملکیت قائم ہوجاتی ہے ("اصل حکم الهبة: هو ثبوت الملك للموهوب له في الموهوب من غير عوض" (بدائع ۵ ر ۲۶)) ، لہذا اس صورت میں گھر کے اخراجات سے بچی ہوئی رقم سے کوئی چیز خریدی گئی تو اس میں سبھوں کا حصہ برابر ہوگا؛ کیونکہ والد صاحب یا بھائی کا خریدنا سبھوں کے لئے مشترک ہوگا، اور ان کی طرف سے سبھوں کے حق میں ہبہ متصور ہوگا۔

اسی طرح جس بھائی نے گھر کے اخراجات کے لئے زیادہ رقم دیتے وقت دوسرے بھائیوں کی مدد اور صلہ رحمی کی نیت کی تھی، تو اس صورت میں گھر کے اخراجات سے بچی ہوئی رقم کے ذریعہ خریدی ہوئی چیز میں تمام بھائیوں کا حصہ برابر ہوگا۔

ہر انسان کی کمائی اس کی اپنی ملکیت ہے:

۴۔ اگر تین بھائی ہیں، دو بھائی اپنی پوری تنخواہ مثلاً دس ہزار روپے گھر میں دے دیتے ہیں اور ایک بھائی بیس ہزار روپیہ کماتا ہے، وہ بھی دس ہزار گھر میں دیدیتا ہے اور دس ہزار بچا کر الگ رکھتا ہے، تو وہ بچی ہوئی رقم صرف اس کی ملکیت ہوگی یا تمام بھائیوں کی؟

جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ ہر شخص اپنی کمائی کا مالک ہوتا ہے، اس میں تصرف کرنے کا حق اسے پورا پورا حاصل ہوتا ہے، کسی دوسرے کو اس میں کوئی حق نہیں ہوتا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

''مردوں کے لئے ان کی کمائی کا حصہ ہے اور عورتوں کے لئے ان کی کمائی کا حصہ ہے، پس جس بھائی کی آمدنی بیس ہزار روپے ہے، دس ہزار گھر میں دیتا ہے اور دس ہزار الگ بچا کر رکھتا ہے تو وہ بچی ہوئی رقم صرف اسی کی ملکیت ہوگی۔

علامہ ابن نجیم مصری نے اپنی شاہکار تصنیف ''الاشباہ والنظائر'' میں نوع ثانی کے پانچویں قاعدہ: "تصرف الإمام على الرعية بالمصلحة" کی تفریعات کے ذیل میں لکھا ہے کہ دیوان میں ایک شخص کا نام درج تھا، اسے وہاں سے عطیہ ملتا تھا، اتفاق سے اس کا انتقال ہوگیا، اس کے دو بیٹوں کے درمیان صلح ہوئی کہ ایک کا نام دیوان میں دیا جائے، جس کا نام دیوان میں ہوگا وہ اپنے عطیہ میں سے دوسرے بھائی (جس کا نام دیوان میں نہیں ہے) کو متعین رقم دے گا، یہ صلح باطل ہے، پورا عطیہ اسی کو ملے گا جس کا نام دیوان میں درج ہوا ہے (مجلۃ الاحکام العدلیہ ۲ ر ۸۷، موسوعۃ القواعد والضوابط الفقہیہ الحاکمۃ للمعاملات المالیۃ فی فقہ الاسلام از ڈاکٹر علی احمد ندوی، ط: دار عالم المعرفۃ ۱۹۹۹ء، ص ر ۹۸، القواعد الفقہیۃ بین الأصالۃ والتوجیہ از ڈاکٹر محمد بکر اسماعیل ط: دار المنار ر ۲۰۸)، اس فقہی جزئیہ سے صرف اس حد تک استیناس کرنا ہے کہ جس کا جو حق ہے اور جس کی جو ملکیت ہے اس میں سے دوسرے کو دینا یا اس میں دوسرے کو شریک کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، لہذا مذکورہ بالا صورت میں بچی ہوئی رقم صرف اسی بھائی کی ملکیت ہوگی جس کی آمدنی بیس ہزار روپے ہے، دس ہزار گھر میں اخراجات کے واسطے دیتا ہے اور دس ہزار الگ بچا کر رکھتا ہے، اس میں دیگر بھائیوں کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

باہر کمانے والے کی آمدنی میں گھر کے کام دیکھنے والے کی شرکت:

۵۔ اگر خاندان کے کچھ افراد کماتے ہیں اور کچھ گھر کے کام دیکھتے ہیں اور اس طرح گھر کا کام چلتا ہے تو کیا کمانے والے حضرات کی آمدنی میں کام کرنے والے حضرات بھی برابر کے حقدار ہوں گے؟

واضح رہے کہ خاندانی نظام کی بنیاد مذہب اسلام میں عدل واحسان پر ہے، عدل یہ ہے کہ جو آپ کے کام آتا ہے اور جتنا کام آتا ہے، آپ بھی اس کے کام آئیں اور اسی قدر آئیں، جسے اسلامی قانون کی اصطلاح میں "الغرم بالغنم" اور الخراج بالضمان" (المنثور للزرکشی ۲/۱۱۹، الاشباہ والنظائر للسیوطی ر ۲۵۴، الاشباہ والنظائر لابن نجیم المصری ا/۱۴۸، ط: نزار مصطفی الباز)، کہا جاتا ہے، اسی لئے شریعت اسلامیہ نے خاندانی فقہ کا نظام حصۂ میراث کے تناسب پر رکھا ہے (ہدایہ ۲/۴۴۹، بدائع ۳/۴۴۲)

اعزہ واقارب کا نفقہ ان رشتہ داروں پر واجب ہوتا ہے جو امکانی طور پر اس کے وارث ہونے کے اہل ہیں، اور اتنی ہی مقدار میں واجب ہوگا جتنا اس کا حق میراث ہوتا ہے، احسان یہ ہے کہ جو آپ کے کام نہ آئے آپ اس کے کام آئیں، بالفاظ دیگر اپنے حق سے دستبردار ہونا اور دوسرے کو ان کے حق سے زیادہ دینا، یعنی ایثار و بے غرضی کا معاملہ ہونا چاہئے، رشتہ داروں کی خدمت یہ سمجھ کر کرنی چاہئے کہ ان کے لئے کھونا بھی پانا ہے، اس لئے مذہب اسلام میں خاندانی نظام کی بنیاد عدل واحسان پر ہے، البتہ اس کا استحکام احسان پر عمل کرنے سے ہوگا۔

چنانچہ اسلام کے عدل واحسان کا تقاضا یہ ہے کہ کمانے والے حضرات کی آمدنی میں گھر کے کام کرنے والے حضرات بھی برابر کے حقدار ہوں گے۔

نیز اگر باہم بھائیوں کے درمیان معاہدہ ہوا کہ بعض گھر کے کام دیکھیں گے اور بعض باہر کام کریں گے اور کمائیں گے، اور کمانے والے کی آمدنی میں کام کرنے والے بھی برابر کے حقدار ہوں گے، اس معاہدہ پر عمل آوری ضروری ہوگا، کیونکہ اسلام نے معاہدہ کو پورا کرنے کو واجب قرار دیا ہے (موسوعہ فقہیہ ا۳/۳۴)، اس لئے کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"یأیہا الذین آمنوا أوفوا بالعقود" (المائدہ:۱) (اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو! عہد پورے کیا کرو)۔

"وأوفوا بعهد الله إذا عاهدتم" (النحل:۹۱) (اور پورا کرو اللہ کے عہد کو جب تم عہد کر چکے ہو)۔

"وأوفوا بالعهد إن العهد كان مسئولاً" (الاسراء:۳۴) (اور عہد کی پابندی رکھو بے شک عہد سے متعلق سوال ہوگا)۔

"یأیہا الذین آمنوا لم تقولون ما لا تفعلون کبر مقتاً عند الله أن تقولوا ما لا تفعلون" (الصف:۲، ۳) (اے ایمان والو! تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں، اللہ کے نزدیک یہ بات بہت ناراضی کی ہے کہ تم ایسی بات کہو جو تم کرو نہیں)۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اس کے لئے دین نہیں جو عہد و پیمان کا پاس لحاظ نہ رکھے۔ (مسند احمد ۳/۱۳۵)، نیز ارشاد فرمایا: "المسلمون عند شروطهم" (بخاری؛ الاجارۃ باب أجر السمسرۃ؛ باب نمبر:۱۴)، البتہ باہم معاہدہ کا تعلق ناجائز اور خلاف شرع بات سے نہ ہو تب اس کی تکمیل واجب ہوگی، کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہیں، مگر ایسی شرط جو کہ حلال کو حرام یا حرام کو حلال کردے۔ (ترمذی؛ کتاب الاحکام باب ما ذکر عن رسول اللہ ﷺ فی الصلح بین الناس، حدیث نمبر: ۱۳۵۲، امام ترمذی کا بیان ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے (حوالہ سابق))

والدین کی خدمت و کفالت کی ذمہ داری:

۶۔ والدین زندگی بھر بچوں کی خدمت بھی کرتے ہیں اور کفالت بھی، اور بڑھاپے میں انہیں خدمت اور کفالت کی ضرورت ہوتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ والدین کی خدمت و کفالت بیٹوں پر واجب ہے یا بیٹیوں پر بھی، اور اس سلسلہ میں بہو کی ذمہ داری کیا ہے؟ خاص کر جب بیٹیاں اپنے سسرال چلی جائیں اور ماں کو اپنی ضروریات کے لئے تعاون کی ضرورت ہو اور وہ تعاون ایسا ہو جس کو بیٹا خود انجام نہ دے سکتا ہو تو بہو پر اس خدمت کو بجالانا واجب ہوگا یا نہیں؟

اولاد خواہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں سب پر ماں باپ کے حقوق میں سے پہلا حق ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا، اور سب سے بہتر حسن سلوک ان کی خدمت وکفالت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"واعبدوا الله ولا تشركوا به شيئاً وبالوالدين إحساناً" (نساء: ۳۶) (اور اللہ کی عبادت کرو، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ بہتر سلوک کرو)۔

"وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحساناً إما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما وقل لهما قولاً كريماً. واخفض لهما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحمهما كما ربياني صغيراً" (بنی اسرائیل: ۲۳-۲۴)۔

(اور تیرے پروردگار حکم دے رکھا ہے کہ بجز اس (ایک رب) کے اور کسی کی پرستش نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک رکھنا، اگر وہ تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں ان دونوں میں سے ایک یا وہ دونوں، تو ان سے (کبھی) ہوں بھی نہ کہنا اور ان کو جھڑکنا اور ان سے ادب کے ساتھ بات چیت کرنا، اور ان کے سامنے محبت سے انکسار کے ساتھ جھکے رہنا اور کہتے رہنا کہ اے میرے پروردگار ان پر مہربانی فرما جیسا کہ انہوں نے مجھے بچپن میں پالا، پرورش کیا)۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مختلف حدیثوں میں ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ (دیکھئے: بخاری، کتاب النفقات باب إذا لم ينفق الرجل فللمرأة أن تأخذ بغير علمه الخ، حدیث نمبر: ۵۳۶۴، نسائی، کتاب الزکوۃ، باب أيتهما اليد العليا، حدیث نمبر: ۲۵۳۳، ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء في بر الوالدين حدیث نمبر: ۱۸۹۷)۔

تمام فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر والدین محتاج، ضرورت مند ہوں، ان کی کوئی کمائی نہ ہو اور نہ ان کے پاس مال ہو تو ان کی اولاد پر ان کی کفالت واجب ہے۔ (قال ابن المنذر: أجمع أهل العلم على أن نفقة الوالدين الفقيرين الذين لا كسب لهما، ولا مال، واجبة في مال الولد (المغنی ۱۱/ ۳۷۳)

جزئیات میں تھوڑا اختلاف ہے، اور وہ یہ ہے کہ احناف کے نزدیک ایسے باپ کی بھی کفالت اولاد پر واجب ہے جو کہ تندرست وتوانا ہوں، کسب معاش پر قادر ہوں، لیکن تنگدست ہوں (بدائع ۴/ ۳۴، مبسوط ۵/ ۲۲۸)، حاصل کلام یہ ہے کہ احناف کے یہاں مفتی بہ قول کے مطابق محض ماں باپ کا محتاج وضرورت مند ہونا وجوب کفالت کے لئے کافی ہے، فالمعتبر في ايجاب نفقة الوالدين مجرد الفقر (فتح، ردالمحتار ۵/ ۲۵۵)۔

جبکہ مالکیہ کے یہاں مکمل کفالت اس وقت واجب ہوتی ہے، جبکہ باپ کمانے پر قادر نہ ہو۔ (فيجب عليه تمام الكفاية حيث عجز عن الكسب، وإلا لم تجب على الولد" (حاشیہ دسوقی وشرح کبیر ۳/ ۵۰۱)۔

اور شوافع ماں باپ کی کفالت اولاد پر وجوب کے مطلق قائل ہیں ان کے یہاں محتاج وضرورت مند ہونا بھی شرط نہیں ہے (فتجب على الولد نفقة الأب والأم" (المجموع شرح المهذب للنووي ۲۰/ ۱۳۳)۔

واضح رہے کہ جس طرح والدین کی خدمت وکفالت بیٹوں پر واجب ہے اسی طرح بیٹیوں پر بھی واجب ہے، صاحب ہدایہ کا بیان ہے:

"وهي على الذكور والإناث بالسوية في ظاهر الرواية، وهو الصحيح" (ہدایہ ۲/ ۴۴۹)

(ماں باپ کا نفقہ بیٹے اور بیٹیوں پر برابر واجب ہے، یہی ظاہر روایت اور صحیح قول ہے)۔

یہی مالکیہ کا مذہب ہے (فتجب على الولد نفقة الأب والأم) (المجموع ۲۰/ ۱۳۳)۔ شوافع اور حنابلہ کے یہاں صراحت نہیں ملی ہے، البتہ امام نووی نے "الولد" کا لفظ استعمال کیا ہے، اور عربی زبان میں الولد کا اطلاق اولاد پر ہوتا ہے، جس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہوتی ہیں، اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ شوافع کے مذہب کے مطابق بھی والدین کی خدمت وکفالت بیٹے اور بیٹیوں دونوں پر واجب ہوگی۔

جہاں تک ساس اور سسر کی خدمت کی بات ہے تو یہ بہو پر اس وقت دیانۃً واجب ہوگی جب کوئی اور خدمت کرنے والا میسر نہ ہو، اور واقعی وہ خدمت کے محتاج ہوں، کیونکہ اس کے شوہر پر ماں باپ کی خدمت واجب ہے، اور اس کا شوہر اس کے اور اس کے بچوں کی ضروریات کی تکمیل میں

مشغول ہے، اس لئے وہ اپنے والدین کی خدمت کرنے سے قاصر ہے، حالانکہ جب والدین خدمت کے محتاج ہوں تو اولاد پر ان کی خدمت واجب ہے، خواہ وہ خود خدمت کرے یا کسی اور کے ذریعہ خدمت کرائے گو اجرت دے کر ہو، جیسا کہ علامہ کاسانی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''ولا تجب على الابن نفقة منكوحة أبيه، لأنها أجنبية عنه، إلا أن يكون الأب محتاجاً إلى من يخدمه، فحينئذ يجب عليه نفقة امرأته؛ لأنه يؤمر بخدمة الأب بنفسه أو بالأجير'' (بدائع ۴/۳۶۔۴۴۳)

بیٹا پر سوتیلی ماں کا نفقہ واجب نہیں ہے، اس لئے کہ وہ اس کے حق میں اجنبی عورت ہے، ہاں جبکہ باپ خدمت کا محتاج ہو، اور وہ ان کی خدمت میں مشغول ہو تو اس وقت اس سوتیلی ماں کا نفقہ اس پر واجب ہے؛ کیونکہ بیٹا کو باپ کی خدمت کرنے کا حکم ہے، چاہے وہ بذات خود خدمت کرے یا کسی کو خادم رکھ کر خدمت کرے''۔

فقیہ وقت حضرت الاستاذ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم ایک استفتاء کے جواب میں رقمطراز ہیں:

''شوہر کے والدین کی خدمت عورت پر اس وقت دیانۃً واجب ہوگی جب کوئی اور خدمت کرنے والا میسر نہ ہو، اگر کوئی دوسرا خدمت کرنے والا میسر ہو، تب بھی عورت کو چاہئے کہ اپنے ساس سسر کی خدمت سے دامن نہ کھینچے، کہ یہ اس کا اپنے شوہر کے ساتھ تعاون ہے، کیونکہ اصل میں والدین کی خدمت اس کے شوہر پر واجب ہے، اور شوہر اپنی بیوی اور اس کے بچوں کی ضروریات کے لئے مشغول ہے، تو اخلاق و دیانت کا تقاضا ہے کہ وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں شوہر کی مدد کرے'' (کتاب الفتاوی ۴/۴۰۹۔۴۱۰)

مشترک خاندان میں پردہ کا پاس ولحاظ:

۷۔ مشترک خاندان میں بہت سی دفعہ چچازاد بھائی بہن یا اس طرح کے دوسرے قریبی رشتہ داروں کا ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہوتا رہتا ہے اور ایک ہی گھر میں۔ خاص کر جب کہ وہ تنگ بھی ہو۔ رہنے کے باوجود ایک دوسرے سے مکمل پردہ نہیں ہو پاتا، ایسی صورت حال میں پردہ کے احکام کیا ہوں گے؟

شریعت اسلامی کی رو سے چچازاد بھائی بہن، ماموں زاد بھائی بہن، پھوپھی زاد بھائی بہن اور خالہ زاد بھائی بہن، باہم آپس میں غیر محرم رشتہ دار ہیں، اسی طرح سسرال میں سسر کو چھوڑ کر شوہر کے چھوٹے بڑے بھائی، چچائیں اور دیگر رشتہ دار عورت کے حق میں سب غیر محرم ہیں، گویا کہ شرعی حکم کے اعتبار سے یہ سب رشتہ دار ایک عورت کے حق میں اجنبی لوگ ہیں؛ ایک اجنبی آزاد عورت کا پردہ یہ ہے کہ اس کا پورا جسم عورت ہے، یعنی قابل ستر حصہ ہے، سوائے چہرہ، دونوں ہتھیلیاں کلائی تک اور دونوں قدم، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"ولا يبدين زينتهن إلا ما ظهر منها" (نور:۳۱) (اور اپنا سنگار ظاہر ہونے نہ دیں مگر ہاں جو اس میں سے کھلا ہی رہتا ہے)۔

میں "ما ظهر منها" کی تفسیر میں علماء کا اختلاف ہے، تاہم اکثر علماء کی رائے کے مطابق چہرہ اور دونوں ہتھیلی مراد ہیں۔ (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۶/۲۲۷۔۲۲۸، احکام القرآن للجصاص ۳/۳۱۶، روح المعانی ۱۸/۱۴۱، التفسیر الکبیر للرازی ۱۲/۲۰۵۔۲۰۶، ہندیہ ۵/۳۲۹، المجموع شرح المہذب للنووی ۳/۱۲۷۔۱۲۹، شرح منح الجلیل ۱/۱۳۳، بلوغ الامانی ۳/۹۰)۔

جہاں تک قدم کی بات ہے تو اس سلسلہ میں بھی فقہاء کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن راجح قول کے مطابق ستر عورت میں داخل نہیں ہے۔ (ہدایہ ۱/۹۳، فتح القدیر ۲/۲۵۹، المجموع شرح المہذب ۲/۶۶۹، حاشیہ ہدایہ ۱/۹۳)

کیونکہ حضرت علیؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے "ما ظهر منها" کی تفسیر چہرہ، دونوں ہتھیلی اور دونوں قدم سے کی ہیں (روح المعانی ۱۸/۱۴۰۔۱۴۱)۔ نیز قرآن نے: "ولا يضربن بأرجلهن ليعلم ما يخفين من زينتهن" (نور:۳۱) کہا ہے، جس کے معنی: اور عورتیں اپنے پیر زور سے نہ رکھیں کہ ان کا مخفی زیور معلوم ہوجائے، محل زیور قدم نہیں ہے، بلکہ پنڈلی ہے، اس لئے کہ زیور کعبین (ٹخنے کے اوپر ہوتے ہیں) (کبیری شرح منیۃ المصلین از ابراہیم حلبی ۱/۲۱۱)۔

ذراع (بازو، کہنی سے پنچ کی انگلی تک کا حصہ) کے ستر عورت میں شامل ہونے کے بارے میں بھی اختلاف ہے، تاہم حضرت عائشہؓ سے ایک مرفوع حدیث مروی ہے، جس میں نصف ذراع تک ستر عورت میں نہ ہونے کی صراحت ہے (وہ حدیث یہ ہے: "لا یحل لامرأة تؤمن باللہ والیوم الآخر إذا عرکت أن تظہر إلا وجہہا ویدیہا إلی ہاہنا وقبض علی نصف الذراع" (معجم طبرانی، الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۶/۱۲/۲۲۹))۔

''درمختار'' میں ہے: "ذراعیہا عورۃ علی المرجوح" (الدر المختار علی ہامش الرد ۲/۲۹۹، ط: پاکستان، نیز دیکھئے: الاشباہ لابن نجیم ر ۳۸۴)۔

امام ابوحنیفہؒ، اور امام ابو یوسفؒ دونوں ہی سے ذراعین کے ستر عورت میں داخل نہ ہونے کی ایک روایت منقول ہے، البتہ یہ غیر ظاہر روایت قول ہے۔ (کبیری ر ۲۱۱-۲۱۲، البحر الرائق ۱/۲۷۰)

''ہدایہ'' میں ہے: "قد یبدو منہا عادۃ" (ہدایہ ۴/۴۵۸)۔ کبھی عادۃً عورت کے یہ حصے کھل جاتے ہیں۔ فقہاء کے اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ پورے ذراع تو نہیں؛ بلکہ نصف ذراع ستر عورت میں شامل نہیں ہے، جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث میں اس طرف اشارہ موجود ہے، اور قرآن کریم میں ''ما ظہر منہا'' سے جو استثناء ہے، اس میں نصف ذراع بھی داخل ہے (فتح القدیر ۲/۲۶۰)، کیونکہ سوار، یعنی کنگن جو ہاتھ میں پہنی جاتی ہے وہ پورے بازو کہنی تک محیط نہیں ہوتی ہے، بلکہ زیادہ سے زیادہ نصف ذراع تک ہوتی ہے، اور خانگی کام جیسے روٹی پکانا اور کپڑے صاف کرنا وغیرہ میں نصف ذراع تک عام طور پر کھل جاتے ہیں۔ (ہندیہ ۵/۳۳۹، شرح المختصر علی ہامش الأصل للسرخسی ۳/۵۸)

گویا اس میں عورتوں کے لئے عموم بلوی ہے، اور عموم بلوی کی وجہ سے شرعی حکم میں تخفیف ہوتی ہے (ما عمت البلیۃ خفت قضیتہ، الاشباہ والنظائر لابن نجیم ۱/۸۵)۔ نیز فقہ اسلامی کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ جب کسی شرعی حکم پر عمل آوری میں بڑی تنگی وحرج ہو تو اس وقت آسانی ہوتی ہے، "المشقۃ تجلب التیسیر" (حوالہ سابق ۱/۷۷)، "الحرج مدفوع شرعاً" (فتاوی غیاثیہ ر ۵۳، عینی ۱/۲/۴۰۵، رد المحتار ۳/۳۴۵، کتاب الصوم)، اور "الأمر إذا ضاق اتسع"۔ (الاشباہ والنظائر لابن نجیم المصری ۱/۸۵)

پس دریافت کردہ صورت میں حکم شرع یہ ہوگا کہ اولاً اگر شرعی حدود کی رعایت نہ ہو سکے اور پردہ کے نظام پر عمل دشوار ہو، تو جداگانہ خاندانی نظام پر عمل کی کوشش ہونی چاہئے، لیکن بروقت ایسا ممکن نہ ہو تو شرعی نقطہ سے حسب ذیل امور کا پاس ولحاظ رکھنا ضروری ہے تاکہ ماحول پاکیزہ رہے اور شریعت اسلامی کی ناموس پامال ہونے سے محفوظ رہے اور گھر کا معاشرہ صاف ستھرا دوسروں کے لئے نمونہ عمل بن سکے:

۱۔ چچازاد بھائی اور دیگر قریبی رشتہ دار جو محرم نہیں ہیں ان سے تنہائی نہیں ہونی چاہئے، کیونکہ ان میں سے کسی سے تنہائی حرام ہے، "الخلوۃ بالأجنبیۃ حرام" (درمختار مع الرد ۹/۵۲۶) (اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لا یخلون رجل بامرأۃ إلا کان ثالثہما الشیطان" (ترمذی: فتن باب لزوم الجماعۃ ۲/۴۱)، امام ترمذی کا بیان ہے: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے، مستدرک حاکم؛ کتاب العلم ۱/۱۱۴) (کوئی اجنبی مرد کسی عورت سے تنہائی میں ہرگز نہیں ہوتا، مگر ان دونوں کے بیچ میں تیسرا شیطان ہوتا ہے)۔

۲۔ بلا ضرورت گفتگو کرنے سے گریز کرے، اور از راہ ضرورت گفتگو کرنی پڑے تو حتی الامکان کوشش ہونی چاہئے کہ تنہائی میں سے گفتگو کی نوبت نہ آئے، حدیث شریف میں آتا ہے: "لا تحدثن من الرجال إلا محرما" (رواہ ابن سعد) (کوئی عورت کسی مرد سے ہرگز گفتگو نہ کرے، مگر جبکہ وہ محرم ہو)، نیز اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "وإذا سألتموہن متاعاً فاسألوہن من وراء حجاب" (احزاب: ۵۳)۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اجنبی مرد وعورت کے درمیان اختلاط وگفتگو جائز نہیں ہے، اور کسی وجہ سے بات کرنے کی نوبت آئے تو درمیان میں پردہ ہونا چاہئے، تاکہ فتنہ سر نہ اٹھائے۔

۳۔ مشترکہ خاندان جتنا بڑا ہوا اتنا ہی خواتین کے لئے پردہ کے اہتمام میں دشواری ہوتی ہے، ایسی صورت میں خواتین کے لئے گنجائش ہے کہ عام حالات میں چہرہ، دونوں ہاتھ نصف بازو اور دونوں قدم کھلے رکھ سکتی ہیں؛ کیونکہ یہ حصے شرعی پردہ میں داخل نہیں ہیں؛ لیکن جن غیر محرم رشتہ دار سے فتنہ کا اندیشہ ہو تو ان سے چہرہ کا پردہ کرنا ضروری ہوگا، تاکہ فتنہ کو راہ نہ مل سکے۔

☆☆☆

اسلام کا خاندانی نظام

مولانا ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی[1]

خاندانی نظام ایک فطری نظام ہے جس کا چشمہ انسانی وجود بلکہ کائنات کی ہر چیز کے وجود سے پھوٹا ہے، ارشاد الٰہی ہے: "ومن كل شيئ خلقنا زوجين لعلكم تذكرون" (الذاریات: ۴۹۔۵۱) (اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں، شاید کہ تم اس سے سبق لو)۔

خاندان ہی وہ فطری گہوارہ ہے جہاں بچے کی جسمانی، عقلی اور روحانی پرورش ہوتی ہے، اور جس کے سایہ میں وہ محبت وشفقت، ہمدردی، جانثاری اور باہمی تعاون کے احساسات کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے، اور اس پر اس کی وہ چھاپ پڑتی ہے جو زندگی بھر اس کے ساتھ رہتی ہے۔

چنانچہ مستحکم اور مربوط خاندان ہی نظام انسانی، اور انسان کی فطرت، وجود، ساخت اور زندگی میں اس کے کردار سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

قرآن کریم نے اپنی مختلف سورتوں میں خاندانی نظام کو بڑی اہمیت دی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں خاندان ہی اسلامی معاشرہ کی اساس اور بنیاد ہے، اور اس کے بغیر اس معاشرہ کا وجود نہیں ہوسکتا ہے۔

اسلام سے پہلے خاندان کی حمایت ہر حال میں لازم تھی، ایک جاہلی شاعر کہتا ہے:

وهل أنا إلا من غزية إن غوت غويت وإن ترشد غزية أرشد

(میرا تعلق تو بس خاندان (غزیہ) سے ہے، اگر وہ گمراہ ہو تو میں بھی گمراہ ہو جاؤں، اور اگر وہ راہ یاب رہے تو میں بھی راہ یاب رہوں)۔

اور اپنے قبیلہ کی مصلحت کو مقدم رکھنا ہر صورت میں ضروری تھا، خواہ ایسا دوسرے کا حق مار کر ہی کیوں نہ ہو، چنانچہ ایک جاہلی شاعر کہتا ہے:

ونشرب إن وردنا الماء صفواً ويشرب غيرنا كدراً وطينا

(اور ہم جب چشمہ پر پہنچتے ہیں، تو صاف وشفاف پانی پیتے ہیں، جبکہ ہمارے علاوہ دوسرے لوگ گدلا اور مٹی آلود پانی پیتے ہیں)۔

اسلام چونکہ دین فطرت اور عقل ہے، اور حقیقت پسندی اس کا شعار ہے، چنانچہ اس نے خون ونسل کے رشتہ کی بالکلیہ نفی نہیں کی، بلکہ اس خاندانی جذبات کو شائستہ بنایا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

"يا أيها الذين آمنوا كونوا قوامين بالقسط شهداء لله، ولو على أنفسكم أو الوالدين والأقربين إن يكن غنيا أو فقيرا فالله أولى بهما فلا تتبعوا الهوا أن تعدلوا وإن تلووا أو تعرضوا فإن الله كان بما تعملون خبيراً" (النساء: ۱۳۵) (اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علمبردار، اللہ کے واسطے گواہ بنو، اگر چہ تمہارے والدین اور رشتہ دار پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو، فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے، لہذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں انصاف سے باز نہ رہو، اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے اعراض کیا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے)۔

اور دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے: "لا تجد قوما يؤمنون بالله واليوم الآخر يوادّون من حادّ الله ورسوله ولو كانوا آبائهم أو أبنائهم أو إخوانهم أو عشيرتهم" (المجادلہ: ۲۲) (تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں، وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوں، جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے، خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے اہل خاندان)۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب ونسب پر مبنی افتخار کی مذمت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: "إن الله عزوجل قد أذهب عنكم عبية الجاهلية وفخرها بالآباء، مؤمن تقي وفاجر شقي، أنتم بنو آدم، وآدم من تراب، ليدعن رجال فخرهم بأقوام، إنما هم فحم من فحم جهنم، أو ليكونن أهون

---

[1] استاذ حدیث وفقہ شانتاپورم مالاپورم، کیرالہ

علی اللہ من الجعلان التی تدفع بأنفها النتن" (ابوداؤد حدیث نمبر: ۵۱۱۶، اور ترمذی حدیث نمبر: ۳۹۵۶، اور احمد حدیث نمبر: ۸۷۴۳، اور اس کی تخریج کرنے والوں کا کہنا ہے کہ اس کی اسناد حسن ہے)۔

(اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کے تکبر اور باپ دادا پر فخر کو ختم کردیا ہے (ختم کرنے کا حکم دیا ہے)، اب انسان صرف دو طرح کے ہیں (۱) پرہیزگار مؤمن، اور (۲) بدبخت فاجر (کافر یا نافرمان)، تم سب آدم کی اولاد ہو، اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہے، کچھ اشخاص ایسے لوگوں پر اپنے فخر کو چھوڑ دیں گے جو جہنم کے ایندھن سے ہیں، یا اللہ کے نزدیک گبریلے سے بھی بدتر ہو جائیں گے، جو اپنی ناک سے گندگی دور کرتا ہے)۔

دوسری طرف اسلام نے رشتہ دار کے ساتھ بھلائی کرنے کو ایمان اور عقیدہ کے ساتھ مربوط کردیا ہے، ارشاد الٰہی ہے: "ولکن البر من آمن باللہ والیوم الآخر والملائکة والکتاب والنبیین وآتی المال علی حبه ذوی القربی ..." (البقرة: ۱۷۷) (بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور روز آخرت اور فرشتوں کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مدد کے لئے ہاتھ پھیلانے والوں اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے)۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تعلموا من أنسابکم ما تصلون به أرحامکم، فإن صلة الرحم محبة فی أهله، مثراة فی ماله، منسأة فی أثرهم" (ترمذی حدیث نمبر: ۱۹۷۹، اور حاکم حدیث نمبر: ۷۲۸۴، اور احمد حدیث نمبر: ۸۸۶۸، راوی حدیث حضرت ابوہریرہؓ ہیں اور یہ حدیث صحیح ہے)۔

(اپنے نسب سے اس قدر سیکھو جس سے تم اپنے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرسکو، کیونکہ صلہ رحمی رشتہ داروں کے اندر محبت کا سبب ہے اور کثرت مال کا ذریعہ ہے اور عمر میں نیز ارشاد فرمایا: "الصدقة علی المسکین صدقة، وهی علی ذی الرحم اثنتان صدقة وصلة" (ترمذی حدیث نمبر: ۶۵۸، اور نسائی؛ حدیث نمبر: ۲۵۸۲، ابن ماجہ؛ حدیث نمبر: ۱۶۹۹، حاکم؛ حدیث نمبر: ۱۴۷۶، اور احمد حدیث نمبر: ۱۶۲۳۲، راوی حدیث سلمان بن عامر ہیں اور یہ حدیث صحیح ہے)۔

(مسکین پر صدقہ ایک صدقہ ہے، اور وہ رشتہ دار پر ڈبل صدقہ ہے یعنی صدقہ اور صلہ رحمی ہے)۔

خاندانی نظام کی بنیادیں:

اسلام میں خاندانی نظام کی بنیاد درج ذیل اصولوں پر ہے:

۱۔ وحدت اصل انسانی:

ایک جان سے چونکہ نسل انسانی کا وجود ہے، لہٰذا مل کر رہنا فطرت انسانی کا تقاضا ہے، اور خاندان کے سارے افراد بھی ایک ہی اصل سے ہیں، اور مرد و عورت کی تخلیق بھی ایک ہی جنس سے ہے، ارشاد الٰہی ہے: "یا أیها الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدة" (النساء: ۱) لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا)۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے: "وهو الذی أنشأکم من نفس واحدة......" (الانعام: ۹۸) (اور وہی ہے جس نے ایک جان سے تم کو پیدا کیا، پھر ہر ایک کے لئے ایک جائے قرار ہے اور ایک مدفن ہے)۔

۲۔ محبت وشفقت:

دوسری اصل جس پر نظام خاندان کی بنیاد ہے وہ شفقت ومحبت ہے جسے وجود میں لانا نظام خاندان کی اہم اساس ہے، ارشاد الٰہی ہے: "ومن آیاته أن خلق لکم من أنفسکم أزواجا وجعل بینکم مودة ورحمة" (الروم: ۲۱) (اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں، تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو، اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کردی)۔

اور ارشاد ہے: "واخفض لهما جناح الذل من الرحمة" (الاسراء: ۲۴) (اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو)۔

۳۔ عدل ومساوات:

تیسری اصل جس پر اسلامی خاندانی نظام کی بنیاد ہے وہ عدل وانصاف اور مساوات وبرابری کو وجود میں لانا ہے، ارشاد الٰہی ہے: "ولهن مثل الذی

علیہن بالمعروف" (البقرہ:۲۲۸) (اور عورتوں کے لئے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں، جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں)۔

اور ارشاد ہے: "ومن عمل صالحاً من ذكر أو أنثى وهو مؤمن فلنحيينه حياة طيبة ......" (النحل:۹۷) (جو شخص بھی نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے)۔

۴۔ سماجی تعاون:

خاندان چونکہ باہم مربوط ایک مجموعہ ہے، لہذا اسے اپنے تمام افراد کے باہمی تعاون پر قائم ہونا چاہئے، ارشاد الٰہی ہے: "وآت ذا القربى حقه" (الاسراء:۲۶) (اور رشتہ دار کو اس کا حق دو)۔

اور نفقہ، میراث اور وصیت کے احکام بھی اسی حیثیت سے مشروع ہوئے ہیں۔

عہد نبوت میں رائج خاندانی نظام:

عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں مشترکہ اور جداگانہ دونوں طرح کے خاندانی نظام رائج تھے، مشترکہ نظام کے رائج ہونے کی دلیل عبداللہ بن عمرؓ کا یہ قول ہے:

"كانت لي امرأة كنت أحبها وكان أبي يكرهها، فقال لي: طلقها، فأبيت، فأتى رسول الله ﷺ فذكر ذلك له، فقال: طلقها، فطلقتها" (مسند طیالسی حدیث نمبر:۱۹۳۱، السنن الکبری للبیہقی حدیث نمبر:۱۵۲۹۱، المعجم الکبیر للطبرانی حدیث نمبر:۱۳۰۷۲، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے) (میری ایک بیوی تھی جس سے میں محبت کرتا تھا، اور میرے والد کو اس سے نفرت تھی، سو انہوں نے مجھ سے کہا کہ اسے طلاق دے دو، تو میں نے انکار کیا، چنانچہ وہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، اور اس کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تذکرہ کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے طلاق دیدو تو میں نے اسے طلاق دے دیا)۔

ظاہری بات ہے کہ حضرت عمرؓ کی ناپسندیدگی دینی بنیاد پر تھی، جس کا مشاہدہ آپ نے مشترکہ زندگی بسر کرنے کی بنیاد پر فرمایا۔

اور اس سے بھی واضح دلیل حضرت جابر بن عبداللہؓ کا یہ بیان ہے:

"هلك أبي وترك سبع أو تسع بنات، فتزوجت امرأة ثيبا، فقال لي رسول الله ﷺ: تزوجت يا جابر؟ فقلت: نعم، فقال: بكراً أم ثيباً؟ قلت: بل ثيبا، قال: فهلا جارية تلاعبها وتلاعبك، وتضاحكها وتضاحكك؟ قال جابر: فقلت: إن عبد الله هلك وترك بنات، وإني كرهت أن أجيئهن بمثلهن، فتزوجت امرأة تقوم عليهن وتصلحهن، فقال ﷺ: بارك الله لك أو خيراً" (صحیح البخاری، حدیث نمبر:۶۳۸۷، صحیح مسلم، حدیث نمبر:۷۱۵، مسند ابی یعلی حدیث نمبر:۱۹۹۰) (میرے والد کی شہادت ہوگئی، اور انہوں نے سات یا نو بچیاں چھوڑیں، تو میں نے شوہر دیدہ سے شادی کرلی، تب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: اے جابر! تو نے شادی کرلی؟ سو میں نے کہا جی حضور! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دوشیزہ یا شوہر دیدہ سے، تو میں نے کہا: بلکہ شوہر دیدہ سے، سو آپ نے فرمایا تو تم نے دوشیزہ سے کیوں نہیں کی کہ تم اس سے کھیلتے اور وہ تم سے کھیلتی، اور تم اس کے ساتھ ہنستے اور وہ تمہارے ساتھ ہنستی؟ جابر نے کہا: تب میں نے کہا کہ عبداللہ کا انتقال ہوگیا اور انہوں نے بیٹیاں چھوڑیں اور میں نے ناپسند کیا کہ ان کے پاس انہی جیسی دوشیزہ لے کر آؤں تو میں نے ایسی عورت سے شادی کی جو ان کی دیکھ بھال کرے اور ان کے معاملات درست رکھے، تب سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تجھے برکت سے مالا مال کرے، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بھلی بات فرمائی)۔

یہ حدیث بالکل واضح ہے کہ جابرؓ مشترکہ خاندان میں زندگی بسر کر رہے تھے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف ان کے عمل کو درست قرار دیا، بلکہ اس کی وجہ سے ان کو دعا دی۔

اور جداگانہ خاندان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم، نیز حضرت علی اور بہت سے صحابہ کرام جداگانہ زندگی بسر کرنے کا طریقہ اختیار کئے ہوئے تھے، ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے ابو ہریرہؓ سے دریافت کیا: "إني كنت صائماً فدخلت بيت أبي، فأكلت وأنا ناس، قال: الله أطعمك فتم صومك" (ابوبکر احمد بن مروان دینوری مالکی (۳۳۳ھ) "المجالسۃ وجواہر العلم ۲/ ۱۹۳، حدیث نمبر:۳۱۹، ط: دار ابن حزم بیروت ۱۴۱۹ھ)۔

(میں روزہ سے تھا پھر میں اپنے باپ کے گھر میں داخل ہوا، اور کھالیا، جبکہ مجھے بھول لاحق ہوگئی، تو حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا: اللہ نے تجھے کھلایا ہے، سو تم اپنا روزہ مکمل کرو)۔

حضرت ابوہریرہؓ نے اس بات پر نکیر نہیں کی کہ تم اپنے باپ سے الگ ہوکر جداگانہ طریقہ سے زندگی کیوں بسر کررہے ہو۔

• اس تمہید کے بعد سوالات کے جوابات حسب ذیل ہیں:

۱۔ اسلام کی نظر میں جداگانہ خاندانی نظام بہتر ہے، یعنی وہ خاندان جو شوہر، بیوی اور اولاد پر مشتمل ہو، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

(۱) شریعت اسلامی محبت والفت کی داعی ہے، اور نزاع، دشمنی اور باہمی نفرت کے تمام اسباب سے منع کرتی ہے، قطع رحمی سے اس نے عورت اور اس کی پھوپھی اور عورت اور اس کی خالہ کے درمیان نکاح میں جمع کرنے کو حرام قرار دیا ہے، اور اس حرمت پر تمام علماء اسلام کا اتفاق ہے، نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "لا يجمع بين المرأة وعمتها، ولا بين المرأة وخالتها" (صحیح بخاری حدیث نمبر: ۵۱۰۹) اور صحیح مسلم حدیث نمبر: ۸،۱۴)۔

(عورت اور اس کی پھوپھی اور عورت اس کی خالہ کے درمیان (عقد نکاح) میں جمع نہ کیا جائے)۔

اور یہ مخفی نہیں کہ ساس بہو اور نند اور بھاوج کے درمیان وقتاً فوقتاً نزاع کھڑی ہوتی رہتی ہے، جس کی بنیاد پر مرد حیرت میں پڑ جاتا ہے، اور اسے سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ حق کس کے ساتھ ہے؟ اس طرح گھریلو جھمیلے کی وجہ سے اس کا سکون چھن جاتا ہے، حالانکہ ازدواجی زندگی کا ایک مقصد باہمی سکون بھی ہے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: "ومن آياته أن خلق لكم من أنفسكم أزواجاً لتسكنوا إليها" (الروم: ۲۱) (اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں، تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو)۔

(۲) گھر کو جائے سکون ہونا چاہئے، ارشاد الٰہی ہے: "والله جعل لكم من بيوتكم سكنا" (النحل: ۸۰) (اور اللہ نے تمہارے لئے تمہارے گھروں کو جائے سکون بنایا)۔

جبکہ مشترکہ خاندان میں عام طور سے گھر کا سکون درہم برہم ہوجاتا ہے۔

(۳) ارشاد الٰہی ہے: "اسكنوهن من حيث سكنتم من وجدكم" (الطلاق: ۶) (ان کو اسی جگہ رکھو جہاں تم رہتے ہو اپنی وسعت کے موافق)، یہ آیت اگرچہ مطلقہ عورتوں کو زمانہ عدت میں اس جگہ رکھنے سے متعلق ہے جہاں شوہر رہتا ہو، خواہ جیسا کچھ بھی مکان میسر ہو، تو زمانہ بقائے نکاح کے درمیان جہاں شوہر رہتا ہو وہاں بیوی کو ساتھ رکھنے کا حق بدرجۂ اولی ہوگا۔

(۴) "ہدایہ" میں ہے: "وعلى الزوج أن يسكنها في دار مفردة ليس فيها أحد من أهله، إلا أن تختار ذلك؛ لأن السكنى من كفايتها، فتجب لها كالنفقة، وقد أوجبه الله تعالى مقروناً بالنفقة، وإذا أوجب حقالها، ليس له أن يشرك غيرها فيه؛ لأنها تتضرر به، فإنها لا تأمن على متاعها، ويمنعها ذلك عن المعاشرة مع زوجها، ومن الاستمتاع إلا أن تختار؛ لأنها رضيت بانتقاص حقها" (ابوالحسن علی بن ابی بکر رشدانی مرغینانی، الہدایہ شرح بدایۃ المبتدی ۲/۲۸۸-۲۸۹، ط: داراحیاء التراث العربی بیروت)۔

(اور شوہر پر واجب ہے کہ بیوی کو علاحدہ گھر میں ٹھہرائے، جہاں اس کے گھر والوں میں سے کوئی نہ ہو، مگر یہ کہ عورت ساتھ رہنے کو خود ہی اختیار کرے، اس لئے کہ رہائش اس کی ضرورت سے ہے، تو وہ اس کے لئے نفقہ کی طرح واجب ہوگی، اور اللہ تعالیٰ نے رہائش گاہ کو نفقہ کے ساتھ واجب کیا ہے، اور جب اللہ تعالیٰ نے رہائش گاہ بیوی کے حق کے طور پر لازم کیا ہے، تو شوہر کو حق نہیں کہ اس کے علاوہ دوسرے کو اس میں شریک کرے اس لئے کہ اس شرکت سے اسے ضرر لاحق ہوگا، کیونکہ اسے اپنے سامان کے سلسلہ میں اطمینان نہ ہوگا، اور یہ شرکت اسے اپنے شوہر کے ساتھ معاشرت اور لطف اندوز ہونے سے باز رکھے گی، مگر یہ کہ عورت خود شرکت کو اختیار کرے، کیونکہ وہ اپنے حق کو کم کرنے پر خود ہی راضی ہوگئی)۔

اور "البحر الرائق" میں ہے: "ويشترط أن لا يكون في الدار أحد من أحماء الزوج يؤذيها كما في الخانية، قالوا: للزوج أن يسكنها حيث أحبّ، ولكن بين جيران صالحين" (زین الدین بن ابراہیم المعروف بابن نجیم المصری (۹۷۰ھ)، البحر الرائق شرح کنز الدقائق ۱۱/۳۰۹، ط: المکتبۃ الشاملہ) (اور شرط یہ ہے کہ گھر میں شوہر کے رشتہ داروں میں سے کوئی نہ ہو جو اسے اذیت دے، جیسا کہ "خانیہ" میں ہے، فقہاء کا کہنا ہے کہ شوہر بیوی کو جہاں چاہے رکھے، لیکن نیک پڑوسیوں کے درمیان رکھے)۔

اور "ردالمحتار" میں ہے: "فضمير فيه" راجع للبيت، لا الدار، وهو الظاهر، لكن ينبغي أن يكون الحكم كذلك فيما إذا كان في الدار من

الأحماء من یؤذیہا، وإن لم یدل علیہ کلام البزازی" (ابن عابدین محمد امین بن عمر (۱۲۵۲ھ)، ردالمحتار مطلب فی مسکن الزوجہ ۱۳/ ۱۶۲، ط: المکتبۃ الشاملۃ) (چنانچہ 'فیہ' کی ضمیر کوٹھری کی طرف لوٹ رہی ہے، نہ کہ حویلی کی طرف، اور یہی ظاہر ہے (یعنی اگر حویلی کے اندر ایک کوٹھری جو لوازمات جیسے مستقل بیت الخلاء اور باورچی خانہ کے ساتھ ہو، اور جس میں تالا بھی لگتا ہو، اگر بیوی کے حوالہ کی تو یہ کافی ہے) لیکن مناسب یہ ہے کہ یہ حکم اس صورت میں بھی ہو، جبکہ حویلی میں شوہر کے رشتہ داروں میں سے کوئی اسے اذیت دے (یعنی تو پھر علاحدہ مکان کا عورت مطالبہ کرسکتی ہے)، اگرچہ بزازی کا کلام اس پر دلالت نہیں کرتا ہے)۔

اور آگے تحریر کرتے ہیں: "أن ذلک یختلف باختلاف الناس، ففی الشریفۃ ذات الیسار لابد من إفرادہا فی دار، ومتوسط الحال یکفیہا بیت واحد من دار، ومفہومہ أن من کانت من ذوات الإعسار یکفیہا بیت ولو مع أحمائہا وضرتہا، کأکثر الأعراب وأہل القری وفقراء المدن الذی یسکنون فی الأحواش والربوع، وہذا التفصیل ہو الموافق لما مرّ من أن المسکن یعتبر بقدر حالہما" (ردالمحتار باب النفقۃ، مطلب فی مسکن الزوجہ ۵/ ۳۲۲، ط: دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۵ھ) (رہائش گاہ میں لوگوں کے اختلاف سے فرق ہوتا ہے، چنانچہ معزز مالدار خاتون کو (مستقل) مکان میں علاحدہ رکھنا ضروری ہے، اور درمیانی حالت والی عورت کو حویلی کا ایک کمرہ کافی ہے، اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ تنگدست عورت کے لئے ایک کوٹھری اپنے دیور اور سوکن کے ساتھ کافی ہے، جیسے زیادہ تر بدو، گاؤں کے لوگ اور شہر کے فقراء کا حال ہے، جو پھوس کے مکان اور چھوٹے گھروں میں رہتے ہیں، اور یہ تفصیل اس بیان کے موافق ہے جو گزرا کہ رہائش گاہ میں دونوں کی حالتوں کا اعتبار ہے)۔

فقہاء احناف کی ان فقہی نقول سے واضح ہے کہ عورت کو مستقل مکان یا مستقل کمرہ دینا اسے ضرر سے بچانے کے لئے ہے، اور اس وقت اسے ضرر سے بچانے کا طریقہ یہی ہے کہ اس کے ساتھ جداگانہ زندگی بسر کرنے کا طریقہ اختیار کیا جائے، اسی وجہ سے علامہ شامی نے اس بحث کے اخیر میں تحریر کیا ہے کہ مفتی کے لئے ضروری ہے کہ احوال زمانہ کی رعایت کے ساتھ فتویٰ دے۔

اور حنابلہ کا مسلک بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا حق ہے کہ وہ شوہر کے ساتھ مستقل رہائش گاہ میں رہے، جہاں شوہر کے گھر والوں میں سے کوئی نہ ہو، تاکہ عورت سے ضرر دور ہو، اور میاں بیوی کو عمدہ طریقہ سے ایک دوسرے سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملے، ابن قدامہ حنبلی تحریر کرتے ہیں: "ولیس للرجل أن یجمع بین امرأتیہ فی مسکن واحد بغیر رضاہما صغیراً کان أو کبیراً، لأن علیہما ضرراً لما بینہما من العداوۃ والغیرۃ، واجتماعہما یثیر المخاصمۃ، وتسمع کل واحدۃ منہما حسہ إذا أتی الأخری، أو تری ذلک، فإن رضیا بذلک جاز؛ لأن الحق لہما، فلہما المسامحۃ بترکہ"

(ابومحمد عبداللہ بن احمد بن قدامہ مقدسی (۶۲۰ھ)، المغنی ۷/ ۲۶، ط: ادارۃ المنار بمصر ۱۳۶۷ھ) (اور مرد کو یہ حق نہیں ہے کہ اپنی دو بیویوں کے درمیان ان کی رضامندی کے بغیر ایک کوٹھری میں جمع کرے، خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، اس لئے کہ ایسی صورت میں دونوں کے حق میں ضرر ہے، کیونکہ دونوں کے درمیان عداوت اور غیرت ہوتی ہے، اور دونوں کا اجتماع نزاع کو ابھارے گا، اور دونوں میں سے ہر ایک مرد کی آہٹ سنے گی، جبکہ وہ دوسری کے پاس آئے گا، یا وہ اسے دیکھے گی، سو اگر وہ دونوں اس پر راضی ہوں تو جائز ہے، اس لئے کہ حق ان دونوں کا ہے، تو ان کو اسے چھوڑنے کے سلسلہ میں نرمی برتنے کا اختیار ہوگا)۔

اور مالکیہ کے نزدیک بھی عورت شوہر کے رشتہ دار کے ساتھ ایک گھر میں رہنے سے انکار کرسکتی ہے، دردیر مالکی تحریر کرتے ہیں:

"ولہا الامتناع من أن تسکن مع أقاربہ کأبویہ فی دار واحدۃ لما فیہ التضرر علیہا باطلاعہم علی حالہا "إلا الوضیعۃ" فلیس لہا الامتناع من السکنی معہم، وکذا الشریفۃ إن اشترطوا علیہا سکناہا معہم، ومحل ذلک فیہما مالم یطلعوا علی عوراتہا "کولد صغیر لأحدہما فللآخر أن یمتنع من السکنی معہ "إن کان لہ حاضن" غیرہما یحضنہ، وإلا فلیس للآخر الامتناع من ذلک سواء علم بہ حال البناء أم لا، "إلا أن یبنی أحدہما "وہو" أی الولد "معہ" عالم بہ الآخر، وأراد عزلہ بعد ذلک، فلیس لہ الامتناع" (ابوالبرکات سیدی احمد بن محمد العدوی الشہیر بالدردیر (۱۲۰۱ھ)، الشرح الکبیر ۳/ ۴۸۵، ط: دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۷ھ-۱۹۹۶ء)۔

(بیوی کو حق ہے کہ شوہر کے رشتہ داروں جیسے اس کے والدین کے ساتھ ایک گھر میں رہنے سے انکار کردے، کیونکہ اس میں اس کا نقصان ہے، اس کے حال سے ان کے باخبر ہونے کے سبب، اور اس معاملہ سے واقف ہونے کی وجہ سے جسے وہ ان سے چھپانا چاہتی ہے، مگر جبکہ پست مرتبہ ہو تو اسے ان کے ساتھ رہنے سے انکار کا حق نہیں ہے، اور ایسے ہی عورت کو انکار کا حق نہیں اگر شوہر کے گھر والوں نے اپنے ساتھ اس کے رہنے کی شرط لگائی ہو، اور ان دونوں عورتوں میں اس کا محل اس صورت میں ہے، جبکہ دونوں کے قابل ستر معاملات سے شوہر کے گھر والے واقف نہ ہوں، ایسے ہی اگر میاں بیوی میں سے کسی کا چھوٹا بچہ ہو تو دوسرا

اس کے ساتھ رہنے سے انکار کرسکتا ہے، اگران دونوں کے علاوہ بچہ کی پرورش کرنے والا ہو، ورنہ دوسرے کوانکار کرنے کا حق نہیں، خواہ زفاف کی حالت میں اس کا علم ہو یا نہ ہو، مگر یہ کہ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے ساتھ رہے، اور بچہ بھی اس کے ساتھ ہو، اور دوسرے کو اس کا علم ہو اور اس کے بعد اسے الگ کرنا چاہے تو اسے ایسا کرنے کا حق نہیں ہے)۔

اور دسوقی مالکی تحریر کرتے ہیں: "ولو بعد رضاها بسكناها معهم ولولم يثبت الضرر لها بمشاجرة ونحوها" (محمد بن احمد بن عرفہ (۱۲۳۰ھ) حاشیۃ الدسوقی ۴۸۵/۳، ط: دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۷ھ) (عورت شوہر کے رشتہ دار کے ساتھ رہنے سے باز رہ سکتی ہے، اگرچہ ایسا ان کے ساتھ رہنے پر رضامندی کے بعد ہو، خواہ جھگڑے وغیرہ کے ذریعہ اس کے حق میں ضرر ثابت نہ ہوا ہو)۔

اور شافعیہ کے نزدیک بھی شوہر کا اپنے والدین رشتہ دار اور بیوی کے درمیان ایک رہائش گاہ میں جمع کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ بیوی کا حق ایسی رہائش گاہ ہے جس میں اپنی جان ومال کے سلسلہ میں اسے اطمینان حاصل ہو۔ (الامام النووی بشان العارفین ر ۳۴)

(۵) جداگانہ زندگی بسر کرنے کے باوجود بوڑھے اور خدمت کے محتاج ماں باپ کے تنہا پڑنے کا خدشہ غلط ہے، کیونکہ محتاج ماں باپ کا نفقہ اولاد پر فرض ہے، بلکہ اس کے لئے کمائی کرنا پڑے، تو کمانا فرض ہے، "ہندیہ" میں ہے: "وكذا إن كان له أبوان معسران يفترض عليه الكسب بقدر كفايتهما كذا في الخلاصة" (الہندیہ ۳۴۹/۵، ط: دارالفکر بیروت) (اور ایسے ہی اگر اس کے پاس محتاج والدین ہوں تو اس پر ان کی ضرورت کے بقدر کمانا فرض ہے، ایسے ہی خلاصہ میں ہے)۔

اور "ہدایہ" میں ہے: "وعلى الرجل أن ينفق على أبويه وأجداده وجداته إذا كانوا فقراء وإن خالفوه في دينه". (الہدایہ ۲۹۲/۲)

(اور آدمی پر واجب ہے کہ اپنے والدین اور اپنے دادا اور دادیوں کا نفقہ فراہم کرے، جبکہ وہ محتاج ہوں، اگرچہ وہ اس کے دین میں اس کے مخالف ہوں)۔

ایسے ہی مبسوط سرخسی میں ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے: (شمس الائمہ ابی بکر محمد السرخسی (۴۹۰ھ)، المبسوط ۲۲۲/۵، ط: مطبعۃ السعادۃ بمصر سنۃ ۱۳۲۴ھ)۔

یہی مذہب حنابلہ کا ہے اور فقر کے ساتھ کمائی سے عاجزی حنفیہ کی طرح شرط نہیں ہے۔ (المغنی ۵۸۶/۷۔۵۸۷)

اور مالکیہ کے نزدیک والدین کا نفقہ اولاد پر واجب ہے اور معتمد قول کے مطابق کمائی پر قدرت نہ ہونا وجوب کی شرط ہے۔ (دردیر مالکی الشرح الکبیر ۵۲۲/۱)۔

اور شافعیہ کے نزدیک بھی والدین، خواہ اوپر درجہ کے ہوں، ان کا نفقہ اولاد پر خواہ نیچے درجہ کے ہوں ان پر واجب ہے، اور اصح قول کے مطابق کمائی پر قدرت نہ ہونے کی شرط نہیں ہے۔ (مغنی المحتاج ۴۴۶/۳۔۴۴۸)

اور جمہور یعنی حنفیہ، شافعیہ، حنابلہ، ظاہریہ اور جعفریہ وغیرہم کے نزدیک صلبی اولاد پر یہ نفقہ واجب ہے، اور ان کے نہ ہونے کی صورت میں ان کی اولاد پر، خواہ نیچے درجہ کے ہوں۔ (فتح القدیر ۳۴۷/۳، مغنی المحتاج ۴۴۶/۳، کشاف القناع ۴۱۳/۳، المحلی ۱۰۰/۱۰، زین الدین الجبعی العاملی (۹۶۵ھ) الروضۃ البہیۃ شرح اللمعۃ الدمشقیہ ۱۴۳/۲۔۱۴۴، ط: جامعۃ النجف الدینیہ)

اسی طرح احناف کے نزدیک محتاج بھائی بہن کا نفقہ بھی واجب ہے، بلکہ ہر ذورحم محرم کا نفقہ واجب ہے، جبکہ وہ محتاج اور کمائی سے عاجز ہو اور یہ وجوب میراث کی اہلیت رکھنے والے اس کے ذورحم محرم رشتہ دار پر ہے، اور ذورحم محرم وہ رشتہ دار ہیں جن کے درمیان قرابت کی بنا پر ابدی طور سے نکاح کی حرمت ہو، سرخسی تحریر کرتے ہیں: "يجبر الرجل على نفقة كل ذي رحم محرم منه، وكذلك المرأة الموسرة تجبر على ما يجبر عليه الرجل من نفقة الأقارب لأن هذا الاستحقاق بطريق الصلة، فيستوي فيه الرجال والنساء" (المبسوط ۲۲۳/۵۔۲۲۴) (آدمی کو اپنے ہر محرم رشتہ دار کے نفقہ پر مجبور کیا جائے گا، اور ایسے ہی مالدار عورت کو ان رشتہ داروں کے نفقہ پر مجبور کیا جائے گا، جن کے نفقہ پر مرد کو مجبور کیا جاتا ہے، اس لئے کہ یہ استحقاق صلہ رحمی کے طور پر ہے، تو اس میں مرد اور عورت برابر ہوں گے)۔

جبکہ حنابلہ کے نزدیک اصول وفروع کے علاوہ صرف ان رشتہ داروں کا نفقہ واجب ہے جن کا وہ "فرض" یا "عصبہ ہونے" کی بنیاد پر وارث ہو رہا ہو، اور یہ ضابطہ فروع اور اصول کے بارے میں نہیں ہے، چنانچہ نانا کا نفقہ واجب ہے اگرچہ "فرض" یا "عصبہ ہونے" کی بنیاد یہاں نہیں ہے، کیونکہ ان کی قرابت قوی ہے۔ (المغنی ۵۸۶/۷)

اگر چہ مالکیہ اور شافعیہ کے نزدیک اصول وفروع کے علاوہ دیگر رشتہ دار کا نفقہ واجب نہیں ہے، لیکن اس کی جگہ "صلہ رحمی" ہے۔ (ابن جزی المالکی، "قوانین الاحکام الشرعیہ/ ۲۴۶، شمس الدین محمد بن احمد الرملی الشافعی (۱۰۰۴ھ) نہایۃ المحتاج ۷/ ۲۰۷-۲۰۸، ط: الحلبی ۱۳۵۷ھ)

ذیل میں "صلہ رحمی" کے سلسلہ میں مذاہب فقہیہ کی کچھ تفصیل ہے:

والدین اور دیگر رشتہ دار کے ساتھ حسن سلوک واجب ہے، یہی حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کا مسلک ہے، اور شافعیہ میں سے امام نووی نے اسی کو درست قرار دیا ہے، جبکہ شافعیہ نے والدین اور دوسرے رشتہ دار کے درمیان فرق کیا ہے، اور جمہور کی طرح والدین کے ساتھ حسن سلوک کو واجب قرار دیا ہے، جبکہ دیگر رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک ان کے نزدیک سنت ہے۔ خیال رہے کہ صلہ رحمی محرم اور غیر محرم سارے رشتہ دار کے لئے مطلوب ہے، یہی حنفیہ کا ایک قول ہے اور یہی قول مالکیہ کے نزدیک مشہور ہے، اور اسی کی امام احمد نے صراحت کی ہے، اور شافعیہ کے مطلق کلام سے یہی سمجھا جاتا ہے، جبکہ حنفیہ کا ایک دوسرا قول یہ ہے کہ صلہ رحمی محرم کے ساتھ خاص ہے، اور یہی مالکیہ کا غیر مشہور قول ہے، اور حنابلہ میں سے ابوالخطاب کا بھی یہی قول ہے، لیکن راجح جمہور کا مسلک ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مطلق رشتہ دار کا ذکر فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد الٰہی ہے: "واتقوا الله الذي تسائلون به والأرحام" (النساء:۱) (اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو، اور رشتہ داروں کا خیال رکھو)۔

البتہ ماں باپ پر مقدم ہے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے فرمایا جس نے پوچھا کہ لوگوں میں میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "أمك ثم أمك ثم أمك ثم أبوك" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۵۹۷۱، صحیح مسلم: ۲۵۴۸) (تمہاری ماں سب سے زیادہ حسن سلوک کی حقدار ہے، پھر تمہاری ماں، پھر تمہاری ماں، پھر تمہارا باپ)۔

اسی طرح محرم رشتہ دار دوسرے رشتہ داروں پر مقدم ہوں گے۔ (شرح النووی علی صحیح مسلم ۱۶/ ۱۱۶-۱۱۷، ط: موسسۃ المختار، القاہرہ: الطبعۃ الاولی ۲۰۰۱ء، رد المحتار ۱۲/ ۶۴۳، ط: دار الکتب العلمیہ بیروت، محمد بن مفلح الحنبلی الآداب الشرعیہ ۲/ ۶۲، ط: المکتبۃ الشاملۃ، واحمد بن غنیم بن سالم النفر اوی المالکی (۱۱۲۶ھ) الفواکہ الدوانی علی رسالۃ ابن ابی زید القیروانی ۲/ ۳۸۵، سلیمان بن محمد البجیرمی الشافعی (۱۲۲۱ھ) حاشیۃ البجیرمی علی المنہاج ۳/ ۲۲۹، البحر الرائق ۸/ ۲۸۵-۲۸۶، ط: الہند، رد المحتار ۱۰/ ۳۸۹)۔

(۶) مشترکہ خاندانی نظام کی ایک سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ گھر کا ذمہ دار شخص عام طور سے کمانے والے افراد پر تکیہ کر کے گھر کی ترقی سے بے فکر ہو کر بے کاری کے شکار ہو جاتے ہیں، حالانکہ اگر صحت وعافیت کی دولت سے انسان مالا مال ہے تو اسے اپنے اور اپنے بال بچوں کی ضرورت کے بقدر کمانا فرض ہے، "فرض وهو الكسب بقدر الكفاية لنفسه وعياله وقضاء ديونه ونفقة من يجب عليه نفقته" (الہندیہ ۵/ ۳۴۸)

(اور کمانا فرض ہے اپنے اور اپنے بال بچوں کی ضرورت، اپنے قرض کی ادائیگی اور اس کے نفقہ کے بقدر جس کا نفقہ اس پر واجب ہو)۔

(۷) مشترکہ خاندانی نظام میں عام طور سے شادی کے بعد کمانے والے لڑکوں کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اور بلاوجہ اسے متہم کیا جاتا ہے، جبکہ واضح ہے کہ ایک لڑکا شادی سے پہلے اگر والد یا گھر کے ذمہ دار کو دس ہزار روپے دیتا تھا، تو اب شادی کے بعد وہ پانچ ہزار سے زیادہ نہیں دے سکتا ہے، کیونکہ اس کے سامنے بیوی بال بچوں کے کچھ دوسرے تقاضے بھی ہیں۔

(۸) بڑا لڑکا عام طور سے مشترکہ خاندانی نظام میں والد کے تعاون میں اپنی پوری زندگی کھپا دیتا ہے، اور چھوٹے بھائی اور بہنوں کی تعلیم اور شادی بیاہ کا نظم کر کے گھر کی جائداد بھی بچا لیتا ہے، لیکن نہ ہی والد کی طرف سے اسے اس کی خدمات کا صلہ ملتا ہے، اور نہ ہی چھوٹے بھائی بعد میں اس کی محنتوں کا اعتراف کرتے ہیں، بلکہ عام طور سے شادی بیاہ کر کے الگ ہو جاتے ہیں، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے زمین خرید لیتے ہیں، اور ان کا اپنی طرف سے کوئی تعاون نہیں کرتے ہیں، بڑے بھائی کو آخر یہ سزا بڑے پن کی وجہ سے ملی؟ یا کیا بڑا ہونا جرم ہے؟

اس لئے شریعت کی روح، عدل وانصاف اور مقاصد شریعت سے زیادہ ہم آہنگ جداگانہ خاندانی نظام ہی ہے، ابن قیم تحریر کرتے ہیں: "وحيثما ظهرت دلائل العدل، وسفر وجهه، فثم شرع الله وأمره" (مجلۃ البحوث الاسلامیہ مکۃ المکرمہ ۳۲/ ۳۲۵) (اور جہاں عدل کے آثار ظاہر ہوں اور اپنا چہرہ بے نقاب کر دے، وہیں اللہ کی شریعت اور اس کا حکم ہے)۔

واضح رہے کہ ماں باپ تنہا ہوں یا ان کو خدمت کی ضرورت ہو تو ان کو الگ کمرہ میں ساتھ رکھنا چاہئے، اس لئے مغربی ملکوں کی طرح مستقل ہاسٹل تعمیر

کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یقیناً بوڑھے ماں باپ کو اپنے پاس رکھنے کے لئے ہو بہو تیار ہوتی ہے، مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ والدین ایک بیٹے کا مال اپنے دوسرے بال بچوں پر خرچ کرتے ہیں، اور ان کی طرف داری کرتے ہیں۔

۲۔ اگر مشترکہ خاندان ہو اور افراد خاندان کی ضروریات کے لئے سب مل کر خرچ دیں، لیکن کسی کے بچے زیادہ ہوں، اور کسی کے کم ہوں، تو عدل وانصاف کا تقاضا ہے کہ بچوں کی تعداد کے لحاظ سے سب پر اخراجات عائد کئے جائیں، جیسا کہ بشیر بن سعد نے اپنے بیٹے نعمان بن بشیر کو ایک عطیہ دیا، اور ان کی بیوی عمرہ بنت رواحہ نے کہا کہ میں اس وقت تک راضی نہیں ہوسکتی جب تک تم اس پر سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ نہ بنالو، چنانچہ جب وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "أفعلت هذا بولدك كلهم؟" (کیا تو نے ایسا اپنی تمام اولاد کے ساتھ کیا ہے؟) تو انہوں نے کہا: نہیں، تو اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اتقوا الله واعدلوا في أولادكم" (اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان انصاف سے کام لو)، چنانچہ میرے باپ نے وہ عطیہ لوٹا لیا، اور مسلم کی ایک دوسری روایت میں ہے: "أيسرك أن يكونوا لك في البر سواء" (کیا تجھے اس بات سے خوشی ہوگی کہ وہ سب تمہارے ساتھ حسن سلوک کرنے میں برابر ہوں، تو میں نے عرض کیا، کیوں نہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تب میں گواہ نہیں بن سکتا، اور "ابوداؤد" کی ایک دوسری روایت میں ہے: "لا تشهدني على جور. إن لبنيك عليك من الحق أن تعدل بينهم" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۲۵۸۶، صحیح مسلم حدیث نمبر: ۱۶۲۳، احمد حدیث نمبر: ۱۸۳۵۸، ابوداؤد حدیث نمبر: ۳۵۴۳) (مجھے ظلم پر گواہ نہ بناؤ، یقیناً تمہارے بیٹوں کا تم پر حق ہے کہ تم ان کے درمیان انصاف سے کام لو)۔

حافظ ابن حجر تحریر کرتے ہیں: "وقد تمسك به من أوجب التسوية في عطية الأولاد... وذهب الجمهور إلى أن التسوية مستحبة. فإن فضل بعضاً صح و كره. واستحبت المبادرة إلى التسوية أو الرجوع. فحملوا الأمر على الندب. والنهي على التنزيه" (احمد بن علی ابوالفضل العسقلانی الشافعی فتح الباری باب الہبۃ للولد ۵/ ۲۱۴، ط: دار المعرفۃ، بیروت ۱۳۷۹ھ) (اس حدیث سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جنہوں نے اولاد کے عطیہ میں برابری کو واجب قرار دیا ہے (جیسے بخاری، طاؤس، ثوری، احمد، اسحاق، اور بعض مالکیہ، پھر ان لوگوں سے مشہور یہ ہے کہ ایسا عطیہ باطل ہے، اور امام احمد سے ایک روایت یہ ہے کہ صحیح ہے، اور رجوع واجب ہے، اور امام احمد سے ایک دوسری روایت یہ ہے کہ ایک دوسرے کو ترجیح دینے کا سبب ہو تو جائز ہے، جیسے لڑکے کے اپاہج پن یا تدین وغیرہ کی وجہ سے، اور امام ابویوسف کا قول ہے کہ برابری واجب ہے اگر ترجیح دینے سے ضرر پہنچانے کا قصد کرے)۔

اور جمہور اس طرف گئے ہیں کہ برابری مستحب ہے تو اگر بعض کو ترجیح دے تو صحیح اور مکروہ ہے، اور برابری یا رجوع کی طرف اقدام کرنے کو مستحب قرار دیا گیا ہے، چنانچہ انہوں نے امر کو استحباب پر اور نہی کو تنزیہ پر محمول کیا ہے)۔

اور ابن قیم تحریر کرتے ہیں:

> "وقوله: لا أشهد على جور، والأمر برده، وفي لفظ "سو بينهم" وفي لفظ: هذا جور. أشهد على هذا غيري" ليس إذنا، بل هو تهديد لتسميته إياه جوراً، وهذه كلها ألفاظ صريحة في التحريم والبطلان من عشرة أوجه تؤخذ من الحديث، ومنها قوله: "أشهد على هذا غيري"، فإن هذا ليس بإذن قطعاً. فإن رسول الله ﷺ لا يأذن في الجور فيما لا يصلح وفي الباطل، فإنه قال: إني لا أشهد إلا على حق. فدل على أن الذي فعله أبو النعمان لم يكن حقاً، فهو باطل قطعاً. فقوله إذن: أشهد على هذا غيري حجة على التحريم كقوله تعالى: "اعملوا ما شئتم" (حم السجدة:۴۰) وقوله ﷺ: إذا لم تستح فاصنع ما شئت، أي الشهادة ليست من شأني ولا تنبغي لي، وإنما هي من شأن من يشهد على الجور والباطل وما لا يصلح، وهذا غاية في الوضوح" (ابن قيم الجوزيه، تهذيب سنن ابي داؤد وايضاح مشكلاته" ۲-۲۰۶-۲۰۷، ط: المكتبة الشامله)۔

(اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ میں "ظلم کی گواہی نہیں دیتا ہوں"، اور عطیہ کو واپس کرنے کا حکم، اور ایک (دوسری) تعبیر میں "ان کے درمیان برابری کرو"، اور ایک (دوسری) عبارت میں "یہ ظلم ہے اس پر میرے علاوہ دوسرے کو گواہ بناؤ"، یہ اجازت نہیں، بلکہ یہ دھمکی ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ظلم کا نام دیا ہے، اور یہ سب حرمت اور باطل ہونے کے سلسلہ میں صریح الفاظ ہیں، دس پہلوؤں سے جو حدیث سے اخذ کئے جاسکتے ہیں، اور ان میں سے ایک پہلو آپ کا یہ فرمان ہے کہ اس پر میرے علاوہ کو گواہ بناؤ"، کیونکہ یہ قطعی طور سے اجازت نہیں ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ظلم، نامناسب معاملہ اور باطل کی اجازت نہیں دے سکتے ہیں،

کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں حق ہی کی گواہی دیتا ہوں، تو اس سے پتہ چلا کہ نعمان کے والد نے جو کیا تھا وہ حق نہیں تھا، پس وہ قطعی طور سے باطل تھا، سو آپ کا یہ فرمانا کہ "اس پر میرے علاوہ کو گواہ بناؤ" حرمت کے سلسلہ میں حجت ہے، جیسے ارشاد الٰہی: "کرتے رہو جو کچھ تم چاہو" اور سرکار کا یہ ارشاد کہ اگر تم شرم نہ کرو تو جو چاہو کرو یعنی اس طرح کی گواہی میری شان نہیں ہے اور میرے لئے مناسب بھی نہیں ہے اور اس طرح کی گواہی اس شخص کی شان ہے جو ظلم، باطل اور نامناسب بات کی گواہی دیتا ہو، اور یہ بالکل واضح ہے)۔

ہاں البتہ مشترکہ خاندان کے افراد ایک دوسرے کی آمدنی کا خیال کرتے ہوئے اگر کمی بیشی پر راضی ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اور یہ زیادہ دینے والے کی طرف سے تبرع ہوگا، جس طرح والد ضرر پہنچانے کے قصد کے بغیر حقیقی سبب کی بنیاد پر عطیہ میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دے سکتا ہے، ہندیہ میں ہے:

"وروی عن أبي حنیفة رحمه الله تعالی أنه لا بأس به إذا كان التفضيل لزيادة فضل له في الدين، وإن كانا سواء يكره، وروى المعلى عن أبي يوسف رحمه الله تعالى أنه لا بأس به إذا لم يقصد به الإضرار، وإن قصد به الإضرار سوّى بينهم يعطي الابنة مثل ما يعطي للابن، وعليه الفتوى، هكذا في فتاوى قاضيخان، وهو المختار، كذا في الظهيرية" (الهندیہ ۴؍۳۹۱)

(اور امام ابوحنیفہؒ سے مروی ہے کہ عطیہ میں ایک دوسرے کو ترجیح دینے میں کوئی حرج نہیں، جبکہ دینی خوبی میں زیادتی کی وجہ سے ہو، اور اگر دونوں برابر ہوں، تو مکروہ ہے، اور معلّٰی نے ابو یوسفؒ سے روایت کیا ہے کہ ایک دوسرے کو ترجیح دینے میں کوئی حرج نہیں، جبکہ اس سے ضرر پہنچانے کا قصد نہ کیا ہو (بلاوجہ ترجیح نہ ہو) اور اگر اس سے ضرر پہنچانے کا قصد ہو تو اولاد کے درمیان برابری کرے بیٹی کو وہی مقدار دے جو بیٹے کو دے، اور اسی پر فتویٰ ہے، اسی طرح فتاویٰ قاضی خاں میں ہے، اور یہی مختار ہے، ایسا ہی ظہیریہ میں ہے)۔

اگرچہ احناف کے نزدیک مفتی بہ قول یہ ہے کہ اپنے محتاج والدین اور اسی طرح دیگر محتاج اصول کا نفقہ اولاد پر برابری کے ساتھ واجب ہے، جیسا کہ "الدر المختار" میں ہے: "بالسوية بين الابن والبنت، وقيل كالإرث، وبه قال الشافعي" (الدر المختار ۵؍۳۵۵) (بیٹی اور بیٹے پر برابری کے ساتھ نفقہ واجب ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ بقدر میراث واجب ہے اور یہی امام شافعی کا قول ہے) اور رد المحتار میں ہے: "هو ظاهر الرواية، وهو الصحيح كما في الهداية، وبه يفتى كما في الخلاصة، وهو الحق كما في الفتح، وكذا لو كان للفقير ابنان، أحدهما فائق في الغنى، والآخر يملك نصاباً، فهي عليهما سوية" (رد المحتار ۵؍۳۵۵) (یہی ظاہر الروایہ ہے کہ بیٹے اور بیٹی پر برابری کے ساتھ نفقہ واجب ہے، اور اسی کو ہدایہ میں صحیح قرار دیا ہے، اور خلاصہ میں ہے کہ اسی پر فتویٰ ہے اور فتح القدیر میں ہے کہ یہی حق ہے، ایسے ہی محتاج باپ کے دو بیٹے ہوں، ایک مالداری میں بڑھا ہوا ہو اور دوسرا صرف نصاب کا مالک ہو، تو نفقہ دونوں پر برابری کے ساتھ واجب ہے)۔

لیکن حلوانی نے کہا ہے: "قال مشائخنا هذا إذا تفاوتا في اليسار تفاوتاً يسيراً، أما إذا تفاوتا تفاوتاً فاحشا، فيجب أن يتفاوتا في قدر النفقة" (البحر الرائق ۴؍۳۵۰) (ہمارے مشائخ نے کہا ہے کہ یہ اس صورت میں ہے جبکہ دونوں کے درمیان مالداری میں معمولی فرق رہا، جبکہ دونوں کے درمیان زبردست فرق ہو تو واجب ہے کہ دونوں کے درمیان نفقہ کی مقدار میں فرق ہو)، اور اسروشنی حنفی تحریر کرتے ہیں: "وإذا كان لرجل ابنان أحدهما موسر مكثر، والآخر متوسط الحال، فالنفقة عليهما على المكثر أكثر وعلى المتوسط أقل" (محمد بن محمود الاسروشنی (۶۳۲ھ) جامع احکام الصغار الطبعۃ الاولی سنہ ۱۹۸۲ء بغداد) (اور اگر آدمی کے پاس دو بیٹے ہوں ان میں سے ایک مالدار اور زیادہ مال دار ہو اور دوسرا درمیانی حالت والا ہو، تو ان دونوں پر نفقہ واجب ہے، زیادہ مال والے پر زیادہ ہے اور درمیانی حالت والے پر کم ہے)۔

اس جزئیہ سے استیناس کرتے ہوئے باپ کے لئے گنجائش ہے کہ اولاد کی قلت وکثرت پر نظر کئے بغیر آمدنی کے لحاظ سے ہر ایک پر رقم مقرر کرے، بشرطیکہ زیادہ آمدنی والا اس کے لئے خوشدلی سے راضی ہو۔

۳۔ اس مسئلہ کی کئی صورتیں ہیں:

(۱) مشترکہ خاندان میں اگر مختلف بھائیوں نے مل کر اپنے والد کے پاس آمدنی جمع کی اور باپ کو اس مال کا مالک بنادیا، پھر گھر کے اخراجات سے بچی ہوئی رقم سے کوئی چیز خریدی گئی تو وہ شئی باپ کی ملکیت ہے، اور اس کے مرنے کے بعد سبھوں کا حصہ برابر ہوگا، الاختیار میں ہے: "وأما القبض فلأن الملك لو ثبت

بدونہ للزم المتبرع شئ لم یلتزمہ وھو التسلیم" (ابن مودود الموصلی الحنفی الاختیار لتعلیل المختار ۳/ ۵۴، ط: دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۲۶ھ) (اور ہبہ میں قبضہ کی شرط، تو وہ اس لئے ہے کہ ملکیت اگر اس کے بغیر ثابت ہوجائے، تو تبرع کرنے والے کو ایسی چیز لازم ہوجائے گی، جس کا اس نے التزام نہیں کیا ہے، اور وہ حوالہ کرنا ہے)۔

اور عرف میں بھی ایسا ہی ہے کہ بیٹے باپ کو رقم کا مالک بنادیتے ہیں۔

(۲) مشترکہ خاندان میں اگر مختلف بھائیوں نے مل کر اپنے والد کے پاس بطور امانت رقم جمع کی، اور باپ کو اس کا مالک نہیں بنایا، اور کمی بیشی کو نظر انداز نہیں کیا، پھر گھر کے اخراجات سے بچی ہوئی رقم سے کوئی چیز خریدی گئی تو اس میں ہر ایک کا حصہ اس کی آمدنی کی رقم کے لحاظ سے ہوگا، "فشرکۃ الأملاک: العین یرثہا رجلان أو یشتریانہا، فلا یجوز لأحدھما أن یتصرف فی نصیب الآخر إلا بإذنہ، وکل واحد منہما فی نصیب صاحبہ کالأجنبی" (ہدایہ ۳/ ۵) (چنانچہ شرکت املاک کوئی ایسی چیز ہے جس کے دو شخص وارث ہوں یا اسے دونوں خریدیں، تو اس میں سے ہر ایک کے لئے دوسرے کے حصہ میں تصرف کرنا جائز نہیں، مگر اس کی اجازت سے اور دونوں میں سے ہر ایک اپنے ساتھ کے حصہ میں اجنبی کی طرح ہے)۔

(۳) اگر مشترکہ خاندان میں مختلف بھائیوں نے مل کر اپنے کسی بھائی کے پاس بطور امانت آمدنی جمع کی، اور کمی بیشی کو نظر انداز نہیں کیا، اور پھر گھر کے اخراجات سے بچی ہوئی رقم سے کوئی چیز خریدی گئی، تو اس میں ہر ایک کا حصہ اس کی آمدنی کے لحاظ سے ہوگا۔

''والاختیاریۃ أن یشتریا عینا أو یتہبا، أو یوصی لہما فیقبلان، أو یستولیا علی مال، أو یخلطا مالہما، وفی جمیع ذلک کل واحد منہما أجنبی فی نصیب الآخر، لا یتصرف فیہ، إلا بإذنہ لعدم إذنہ لہ فیہ'' (الاختیار ۳- ۱۲)

(اور شرکت املاک اختیاری یہ ہے کہ دو شخص کوئی چیز خریدیں یا ہبہ قبول کریں، یا دونوں کے لئے وصیت کی جائے اور دونوں قبول کرلیں، یا دونوں کسی مال کو قبضہ کرلیں، یا اپنے مال کو ملالیں، اور ان تمام صورتوں میں دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے حصہ میں اجنبی ہے، اس میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف نہ کریں، کیونکہ اسے تصرف کی اجازت نہیں ہے)۔

بہتر ہے کہ یہ ساری صورتیں شروع ہی میں طے کرلی جائیں تاکہ مشترکہ خاندان کو صحیح ڈھنگ سے چلایا جاسکے، اور بعد میں کوئی نزاع نہ پیدا ہو۔

۴۔ اگر تین بھائی ہیں، دو بھائی پوری تنخواہ مثلاً دس ہزار روپے گھر میں دے دیتے ہیں، اور ایک بھائی بیس ہزار روپے کماتا ہے وہ بھی دس ہزار گھر میں دیتا ہے اور دس ہزار الگ بچا کر رکھتا ہے تو وہ بچی ہوئی رقم صرف اس کی ملکیت ہوگی، اور دوسرے بھائیوں کی ملکیت نہ ہوگی:

"إن زیدا یسکن مع أبیہ عمرو فی بیت واحد، ویعیش من طعام أبیہ. وقد کسب مالاً آخر. فلیس لإخوانہ بعد وفاۃ أبیہ إدخال ما کسبہ زید فی الشرکۃ" (علی حیدر درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ۳/ ۴۴۵ دفعہ نمبر: ۱۳۹۸) (زید اپنے باپ عمرو کے ساتھ ایک گھر میں رہتا ہے، اور اپنے باپ کے کھانے سے زندگی بسر کرتا ہے، اور اس نے دوسرا مال کمایا ہے، تو اس کے باپ کی وفات کے بعد اس کے بھائیوں کو حق نہیں کہ زید نے جو مال کمایا ہے، اسے مشترک مال میں داخل کریں)۔

اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "کل أحد أحق بمالہ من والدہ وولدہ والناس أجمعین" (سنن دار قطنی حدیث نمبر: ۴۵۶۸، سنن کبری للبیہقی حدیث نمبر: ۱۶۱۷۰، سنن سعید بن منصور حدیث نمبر: ۲۲۹۳، اور یہ مرسل حدیث ہے، حبان بن ابی جبلہ قرشی تابعین میں سے ہیں اور ثقہ ہیں)۔

(ہر ایک اپنے مال کا اپنے والد، اولاد اور تمام لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ حقدار ہے)۔

۵۔ الف: اگر گھر کے کچھ افراد کماتے ہیں، اور کچھ گھر کے کام دیکھتے ہیں، اور اس طرح گھر کا کام چلتا ہے، تو کمانے والے حضرات کی آمدنی خود ان کی ہوگی، البتہ ضروری ہے کہ گھر کا کام دیکھنے والے بھائی کی تنخواہ مقرر کردی جائے: "فإذا کان الأب مزارعاً، والابن صانع أحذیۃ، فکسب الأب من المزارعۃ والابن من صنعۃ الحذاء، فکسب کل منہما لنفسہ، ولیس للأب المداخلۃ فی کسب ابنہ لکونہ فی عیالہ" (درر الحکام ۳/ ۴۴۵، دفعہ ۱۳۹۸) (سو اگر باپ کاشتکار ہو، اور بیٹا جوتے بنانے والا ہو، پھر باپ نے کاشتکاری سے کمائی کی اور بیٹا جوتے بنانے والا ہو، پھر باپ نے کاشتکاری سے کمائی کی اور بیٹے نے جوتے بنانے سے، سو دونوں میں سے ہر ایک کی کمائی خود اس کی ہوگی، اور باپ کو اپنے بیٹے کی کمائی میں دخل دینے کا حق نہ ہوگا، اس جہت سے کہ اس کا کھانا

بیٹا اور رہنا ایک ساتھ ہے)، آگے تحریر ہے: "ولدہ- لیس احترازیاً فالحکم فی الزوجة والإخوة علی الوجه المذکور أیضاً" (المرجع السابق ۳/۴۴۵)
("اس کا بیٹا" یہ قید احترازی نہیں ہے، چنانچہ بیوی اور بھائیوں کا حکم بھی ذکر کردہ صورت کے مطابق ہے)۔

ب۔ اگر سب مل کر باپ کے متروکہ مال یا مشترک مال سے شروع کردہ کاروبار کو بڑھانے میں لگے ہوں، اور کچھ افراد گھر کے کام دیکھتے ہوں تو اس صورت میں آمدنی میں سارے بھائی برابر کے حقدار ہوں گے۔ "کذلك لو کان إخوة أربعة فی عائلة واحدة وسعوا فی تکثیر وتنمیة الأموال الموروثة عن أبیهم فتقسم الأقسام بینهم بالسویة، ولا ینظر إلی اختلاف عملهم أو اختلاف رأیهم" (درر الحکام ۳/۴۴۵)

(ایسے ہی اگر چار بھائی مشترک خاندان میں ہوں اور انہوں نے باپ سے وراثت میں ملے ہوئے مال کو بڑھانے کی کوشش کی تو برابری کے ساتھ ان کے درمیان حصے تقسیم کئے جائیں گے، اور ان کے عمل یا ان کی رائے کے اختلاف کو پیش نظر نہیں رکھا جائے گا)۔

د۔ اگر ایک بھائی کا ذاتی کاروبار ہو، اور دوسرے بھائی جن کا کھانا پینا رہنا ایک ساتھ ہو اسی کاروبار میں اس کے ساتھ کام کریں، تو یہ سب تعاون کرنے والے ہوں گے، اور آمدنی اس کی ہوگی جس کا کاروبار ہے: "کذلك لو کان فی عیال أحد ولده وإخوان وعملوا فی صنعة واکتسبوا أموالاً فکافة الکسب لذلك الشخص، ویکون هؤلاء معینین له" (سابق مرجع ۳/۴۴۵)

(ایسے ہی اگر کسی کی کفالت میں اس کے بچے اور بھائی ہوں اور وہ ایک صنعت میں کام کریں اور مال کمائیں تو ساری آمدنی اس شخص کی ہوگی، اور یہ لوگ اس کی مدد کرنے والے ہوں گے)۔

۶۔ والدین کی کفالت وخدمت بیٹے اور بیٹیوں سب پر ہے، "یجب علی الولد الموسر کبیراً کان أو صغیراً ذکراً أو أنثی نفقة والدیه وأجداده وجداته الفقراء.... ولا یشارك الولد الموسر أحد فی نفقة أصوله المحتاجین" (مجموعہ قدری باشا دفعہ ۴۰۸)

(مالدار اولاد پر خواہ بالغ ہو یا نابالغ، مرد ہو یا عورت اپنے محتاج والدین، دادا نانا، اور دادی ونانی کا نفقہ واجب ہے، اور اپنی محتاج اصول کے نفقہ کے سلسلہ میں کوئی مالدار اولاد کا شریک نہ ہوگا)، اور ہندیہ میں ہے: "ویجبر الولد الموسر علی نفقة الأبوین المعسرین" (عالمگیری ۱/۵۶۴) (اور مالدار اولاد کو محتاج والدین کے نفقہ پر مجبور کیا جائے گا)۔

اور یہ بات مخفی نہیں کہ "ولد" کا لفظ مذکر اور مونث اور بالغ ونابالغ اولاد سب کو شامل ہے۔

خیال رہے کہ شافعیہ، حنابلہ اور مالکیہ کے نزدیک بھی یہ وجوب بیٹے اور بیٹیوں دونوں پر ہے، فرق صرف یہ ہے کہ مالکیہ کے نزدیک یہ وجوب صرف اپنے صلبی بیٹے اور بیٹیوں پر ہے، پوتے اور پوتیوں پر نہیں۔ (مغنی المحتاج ۳/۴۴۶، المغنی ۷/۵۸۴، کشاف القناع ۳/۳۱۴، شیخ منصور بن یونس البہوتی الحنبلی شرح منتہی الارادات ۳/۲۵۷، مطبوع علی ہامش کشاف القناع المطبعۃ الشرقیہ ۱۳۱۹ھ، والدردیر المالکی الشرح الکبیر ۲/۵۲۲)

اسی طرح خدمت بھی بیٹے اور بیٹیوں دونوں پر ہے، ارشاد الٰہی ہے: "ووصینا الإنسان بوالدیه" (لقمان: ۱۴) (اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہنچانے کی خود تاکید کی ہے)۔

اور یہ واضح ہے کہ انسان میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں، اور حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "لا یجزی ولد والده إلا أن یجده مملوکاً فیشتریه فیعتقه" (صحیح مسلم: حدیث نمبر: ۱۵۱۰، ابوداؤد حدیث نمبر: ۵۱۳۷، الادب المفرد للبخاری حدیث نمبر: ۱۰)

(کوئی اولاد اپنے والد کے حق کا بدلہ نہیں دے سکتی، مگر یہ کہ اسے مملوک غلام پائے پھر اسے خرید کر آزاد کردے)۔

اور فقہاء نے بھی عام طور سے والدین کے حقوق کی رعایت کی تاکید کی ہے، عبداللہ بن محمود بن مودود موصلی حنفی تحریر کرتے ہیں: "ویجب علی الابن نفقة خادم الأب إذا احتاج إلیه، لأن خدمة الأب مستحقة علی الابن فکذا نفقة من یخدمه" (الاختیار ۴/۱۱) (اور بیٹے پر باپ کے خادم کا نفقہ واجب ہے، جبکہ اسے اس کی ضرورت ہو، کیونکہ باپ کی خدمت بیٹے پر لازم ہے، تو ایسے ہی اس کا نفقہ بھی لازم ہوگا جو اس کی خدمت کرے)۔

اور شمس الائمہ سرخسی تحریر کرتے ہیں:

"وإن استأجر الرجل ابنه لیخدمه فی بیته لم یجز، ولا أجر علیه؛ لأن خدمة الأب مستحقة علی الابن

دينا، وهو مطالب به عرفاً، فلا يأخذ عليه أجراً، ويعدّ من العقوق، أن يأخذ الولد الأجر على خدمة أبيه، والعقوق حرام، وكذلك إن استأجرته الأم؛ لأن خدمتها أوجب عليه، فإنها أحوج إلى ذلك وأشفق عليه، وإن كان أحدهما استأجره ليرعيه غنما، أو يعمل غير الخدمة جاز، فإن ذلك غير مستحق عليه ولا هو مطلوب في العرف'' ۔(المبسوط ۱۲-۱۰۷، ط: دار الفكر بيروت ۱۴۲۱ھ)

(اور اگر کسی شخص نے اپنے بیٹے کو مزدوری پر لیا تا کہ وہ اس کے گھر میں اس کی خدمت کرے تو یہ جائز نہیں، اور اس کے ذمہ اجرت نہیں، اس لئے کہ باپ کی خدمت بیٹے پر دینی اعتبار سے لازم ہے، اور اس سے عرف میں اس کا مطالبہ ہے، تو وہ اس پر اجرت نہیں لے گا، اور نافرمانی سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اولاد اپنے باپ کی خدمت پر اجرت لے، اور نافرمانی حرام ہے، اور ایسے ہی اگر اسے ماں مزدوری پر رکھے کیونکہ ماں کی خدمت اس پر زیادہ واجب ہے، اس لئے کہ اسے اس کی زیادہ ضرورت ہے، اور وہ اس کے حق میں زیادہ مہربان ہے، اور اگر دونوں میں سے کوئی اسے اجرت پر رکھے تا کہ اس سے بکری چروائے، یا وہ خدمت کے علاوہ کام کرے، تو یہ جائز ہے، کیونکہ یہ اولاد پر لازم نہیں، اور نہ ہی عرف میں یہ مطلوب ہے)۔

اور محمود بن احمد برہان الدین مازہ حنفی تحریر کرتے ہیں:

''وإن استأجر الابن أمه أو جدته أو جده للخدمة لا يجوز، ولو خدمت فلها المسمى، ويستوي ذلك أن يكون الابن حراً أو عبداً، مسلماً أو كافراً؟ لأن خدمة الأب واجبة على الابن مع اختلاف الدين، ويجوز الاستئجار للخدمة فيما بين الإخوة، وسائر القرابات، ومن مشايخنا من قال: إذا استأجر عمه للخدمة والعم أكبر، أو استأجر أخاه الأكبر للخدمة لا يجوز'' (برهان الدين مازه المحيط البرهاني ۸-۴۰، ط: دار احياء التراث العربي بيروت)۔

(اور اگر بیٹے نے اپنی ماں یا دادا یا دادی کو خدمت کے لئے اجرت پر لیا تو یہ جائز نہیں ہے، اور اگر اس نے خدمت کی تو اسے متعین کردہ اجرت ملے گی، اور اس حکم میں بیٹا خواہ آزاد ہو یا غلام، مسلم ہو یا کافر سب برابر ہیں، کیونکہ باپ کی خدمت دین ومذہب کے اختلاف کے ساتھ بیٹے پر واجب ہے، اور بھائیوں اور دیگر رشتہ داروں کے درمیان خدمت کے لئے اجرت پر لینا جائز ہے، اور ہمارے مشائخ میں سے بعض نے کہا ہے کہ اگر اپنے چچا کو خدمت کے لئے اجرت پر رکھے تو یہ جائز نہیں)۔

اور احمد بن غنیم نفراوی مالکی تحریر کرتے ہیں: "نعم يظهر أنه يلزمه اتخاذ خادم لهما إن احتاجا إليه" (الفواکہ الدوانی ۲/ ۱۰۸۷) (ہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مالدار اولاد پر لازم ہے کہ والدین کے لئے خادم فراہم کرے، اگر انہیں اس کی ضرورت ہو)۔

لہذا ماں باپ کی خدمت بیٹے اور بیٹیوں کو آخری حد تک کرنی چاہئے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر نے ایک شخص کو اپنی ماں کو اپنی پشت پر لے طواف کرتے ہوئے دیکھا، تو اس شخص نے پوچھا، اے ابن عمر! آپ کی کیا رائے ہے، میں نے ان کے حق کا بدلہ دے دیا، تو حضرت ابن عمرؓ نے ایک ہی سانس میں دو مرتبہ نہیں نہیں فرمایا'' ۔(مسند بزار حدیث نمبر: ۴۳۸۰، الادب المفرد حدیث نمبر: ۱۱)

ب- بہو پر ساس سسر کی خدمت واجب نہیں ہے، اگر ماں کو اپنی ضروریات کے لئے تعاون کی ضرورت ہو، اور وہ تعاون ایسا ہو جس کو بیٹا خود انجام نہ دے سکتا ہو، تو بہو پر اس خدمت کو بجالانا واجب نہیں ہے، اگر وہ دیانۃً واخلاقاً تعاون دے تو بہتر ہے، "وإن قالت: لا أطبخ ولا أخبز، لا تجبر على الطبخ والخبز، وعلى الزوج أن يأتيها بطعام مهيأ، أو يأتيها بمن يكفيها عمل الطبخ والخبز" (الہندیہ ۱/ ۵۴۸)۔

(اور اگر بیوی نے کہا میں کھانا اور روٹی نہیں پکاؤں گی تو کھانا اور روٹی پکانے پر اسے مجبور کیا جائے گا، اور شوہر کی ذمہ داری ہوگی کہ اسے تیار کھانا فراہم کرے، یا اس کے پاس خادمہ لائے جو کھانا اور روٹی پکانے کے کام سے اسے نجات دے)۔

لیکن فقیہ ابو اللیث کا کہنا ہے کہ "أن هذا إذا كان بها علة لا تقدر على الطبخ والخبز، أو كانت من بنات الأشراف، فأما إذا كانت تقدر على ذلك، وهي ممن تخدم نفسها تجبر على ذلك" (البدائع ۴/ ۲۴) (یہ اس صورت میں ہے جب کہ اسے کوئی ایسا مرض ہو کہ کھانا اور روٹی پکانے پر قادر نہ ہو، یا شریف زادیوں میں سے ہو، سوا اگر اسے اس پر قدرت ہو، اور وہ ہو بھی ایسی عورت جو اپنا کام خود کرتی ہو تو اسے اس پر مجبور کیا جائے گا)، اور ہندیہ میں ہے:

"قالوا: إن هذه الأعمال واجبة عليها ديانة، وإن كان لا يجبرها عليها القاضي" (الہندیہ ۱/۵۴۸) (فقہاء احناف نے کہا ہے کہ گھر کے کام کاج اور شوہر کی خدمت عورت پر دیانۃً واجب ہے، اگرچہ قاضی اسے اس پر مجبور نہیں کرے گا)۔

اور دیانتاً وجوب کا اثر یہ ہوگا کہ "لو استأجرها الزوج للطبخ والخبز لم يجز، ولا يجوز لها أخذ الأجرة على ذلك" (مرجع سابق ۱/۵۴۸) (اگر شوہر بیوی کو کھانا اور روٹی پکانے کے لئے اجرت پر رکھے تو یہ جائز نہیں، اور اس کے لئے اس پر اجرت لینا جائز نہیں ہے)۔

اور امام کاسانی نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے: "لأنها لو أخذت الأجرة لأخذتها على عمل واجب عليها في الفتوى، فكان أخذها في معنى الرشوة، فلا يحل لها الأخذ" (البدائع ۴/۲۴)

(اس لئے کہ اگر وہ اجرت لے تو دیانتاً اپنے اوپر واجب عمل پر اجرت لے گی، تو اس کا لینا رشوت کے معنی میں ہوا، تو اس کے لئے لینا حلال نہیں)۔

خیال رہے کہ مالکیہ کے نزدیک اگر عورت معزز ہو جو خدمت نہ کرتی ہو، یا شوہر بلند مرتبہ ہو کہ بیوی کی خدمت اس کے لئے معیوب ہو، اور شوہر مالی گنجائش رکھنے والا ہو، تو اس پر واجب ہے کہ بیوی کے لئے خادم فراہم کرے، اور اگر عورت اس حیثیت کی نہ ہو، یا ہو اور شوہر فقیر ہو، تو اندرونی خدمت جیسے آٹا گوندھنا، جھاڑو لگانا، بستر بچھانا اور صرف شوہر کے لئے نہ کہ اس کے مہمانوں کے لئے، اور عرف کے مطابق پانی لانا اور شوہر کے کپڑے دھونا، بیوی پر واجب ہے، خواہ وہ مالدار اور معزز ہی کیوں نہ ہو۔ (دردیر مالکی الشرح الکبیر ۲/ ۵۱۰-۵۱۱)

شافعیہ کے نزدیک بھی شوہر کی خدمت بیوی پر واجب نہیں، ابو اسحاق شیرازی شافعی تحریر کرتے ہیں: "ولا يجب عليها خدمته في الخبز والطحن والطبخ والغسل وغيرها من الخدم، لأن المعقود عليها من جهتها هو الاستمتاع، فلا يلزمها ما سواه" (ابو اسحاق ابراہیم بن علی الشیرازی (۴۷۶ھ) المہذب ۱۵/ ۵۸۱، ط: مطبعۃ العاصمۃ فی القاہرہ) (بیوی پر شوہر کی خدمت روٹی پکانے، آٹا پیسنے، کھانا پکانے، اور کپڑا دھونے اور دوسری حاجتیں پوری کرنے میں واجب نہیں، کیونکہ عورت کی طرف سے جس چیز پر عقد ہوا ہے وہ لطف اندوز ہونا ہے، تو اس کے علاوہ اس پر لازم نہ ہوگا)۔

البتہ عورت کی خدمت امر مشروع ہے، اور اسی کے ساتھ عرف جاری ہے، لہٰذا مرد عورت کی خدمت کا قصد کرسکتا ہے، البتہ اس پر خدمت واجب نہیں ہے۔ (تکملۃ المجموع ۱۵/ ۵۸۲-۵۸۳)

حنابلہ کے نزدیک بھی شوہر کی خدمت واجب نہیں ہے، ابن قدامہ تحریر کرتے ہیں: "وليس على المرأة خدمة زوجها من العجن والخبز والطبخ وأشباهه، نص عليه أحمد... لأن المعقود عليه من جهتها الاستمتاع، فلا يلزمها غيره كسقي دوابه وحصاد زرعه" (المغنی ۷/ ۲۱) (اور عورت پر شوہر کی خدمت یعنی آٹا گوندھنا روٹی پکانا اور کھانا پکانا اور اس کی مانند کام (جیسے گھر میں جھاڑو لگانا اور کنویں سے پانی بھرنا) واجب نہیں، اس کی امام احمد نے صراحت کی ہے، اس لئے کہ عورت کی طرف سے جس چیز پر عقد ہوا ہے وہ اس سے لطف اندوز ہونا ہے، تو اس کے علاوہ کام اس پر لازم نہ ہوگا، جیسے اس کے جانور کو پانی پلانا اور اس کی کھیتی کاٹنا)۔

البتہ عرف کے مطابق کام کرنا بہتر ہے: "ولكن الأولى لها فعل ما جرت العادة بقيامها به، لأن العادة ولا تصلح الحال إلا به، ولا تنتظم المعيشة بدونه" (المغنی ۷/ ۲۱) (لیکن اس کام کو انجام دینا بہتر ہے جس کے انجام دینے کے ساتھ عرف جاری ہو، اس لئے کہ ایسا عرف ہے اور عرف پر عمل کے بغیر حالت ٹھیک نہیں ہوسکتی ہے، اور اس کے بغیر معیشت درست نہیں ہوسکتی ہے)۔

جبکہ ابوبکر بن شیبہ، ابو اسحاق جوزجانی اور ابن تیمیہ اس طرف گئے ہیں کہ دستور کے مطابق اس جیسی عورت اس جیسے مرد کی جو خدمت کرسکتی ہے وہ اس پر واجب ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کے ذمہ گھر کی خدمت اور حضرت علی بن ابی طالبؓ کے ذمہ گھر کے باہر کے کام کا فیصلہ کیا، اور حضرت علی کو خادم فراہم کرنے کے یا خود سے کام کرنے کی ذمہ داری نہیں سونپی، نیز لوگوں میں رائج عرف بھی یہی ہے، لیکن یہ قول کمزور ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ کو اپنے پسندیدہ اخلاق کے شایان شان کام کرنے کا عرف کے مطابق حکم دیا، لیکن ایسا بطور وجوب نہیں تھا، نیز عرف میں ایک دوسرے کا تعاون رائج ہونا اس کے قانونی وجوب کا متقاضی نہیں ہے۔ (المغنی ۷/ ۲۱، الشیخ علاء الدین ابو الحسن علی بن محمد البعلی الدمشقی الاختیارات الفقہیہ من فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ/ ۵۴۵-۵۴۶، ط: دار المعرفۃ، بیروت) (جب جمہور فقہاء کے نزدیک بیوی پر شوہر کی خدمت اور اس کے گھریلو کام کی انجام دہی واجب نہیں ہے، تو شوہر کے والدین کی خدمت کیوں کر واجب ہوگی، البتہ وہ اگر عرف کے مطابق تعاون دے تو یہ اس کی بلند اخلاقی ہوگی۔

د۔ اگر ماں کو اپنی ضروریات کے لئے تعاون کی ضرورت ہو، اور وہ تعاون ایسا ہو جس کو بیٹا خود انجام دے سکتا ہو، اور بہو اس خدمت کو بجالانے پر راضی نہ ہو تو بیٹے کو چاہئے کہ وہ ان کے لئے خادم یا خادمہ فراہم کرے، "البحر" میں ہے:

"وأشار بقوله: "ولأبويه" إلى أن جميع ما وجب للمرأة، يجب للأب والأم على الولد من طعام وشراب و كسوة وسكنى حتى الخادم. قال في الخانية: وكما يجب على الابن الموسر نفقة والده الفقير تجب عليه نفقة خادم الأب. امرأة كانت الخادم أو جارية. إذا كان الأب محتاجاً إلى من يخدمه" (البحر الرائق ۴؍۳۵۰) (اور مصنف نے اپنے قول "اور والدین کے لئے" سے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تمام وہ چیزیں جو عورت کے لئے واجب ہیں وہ سب اولاد پر والدین کے لئے واجب ہیں جیسے کھانا پینا، لباس اور رہائش یہاں تک کہ خادم بھی، "خانیہ" میں کہا ہے کہ جس طرح مالدار بیٹے پر محتاج والد کا نفقہ واجب ہے اسی طرح اس پر باپ کے خادم کا نفقہ بھی واجب ہے، خادم (آزاد) عورت ہو یا باندی جبکہ باپ کو ایسے آدمی کی ضرورت ہو جو اس کی خدمت کرے)۔

اور علامہ شامی تحریر کرتے ہیں: "نعم صرحوا بأن الأب إذا كان مريضاً أو به زمانة يحتاج إلى الخدمة فعلى ابنه خادمه و كذلك الابن" (رد المحتار بہامش الدر المختار ۳؍۶۱۲) (ہاں فقہاء احناف نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ باپ اگر مریض ہو یا اسے اپاہج پن ہو، جس کی بنا پر وہ خدمت کا محتاج ہو، تو اس کے بیٹے پر اس کے لئے خادم فراہم کرنا لازم ہے، اور یہی حال بیٹے کا ہے (یعنی محتاج بیٹے کے لئے خادم فراہم کرنا لازم ہے)۔

اور دردیر مالکی تحریر کرتے ہیں: "ويجب عليه نفقة خادمها" (الشرح الکبیر ۲؍۵۲۳) (اور مالدار اولاد پر والدین کے خادم کا نفقہ واجب ہے)۔

اور شیخ محمد شربینی خطیب شافعی تحریر کرتے ہیں: "ويجب له مؤونة خادم إن احتاجه" (مغنی المحتاج ۳؍۴۴۹) (اور رشتہ دار جس کو نفقہ دیا جائے اس کے خادم کا نفقہ بھی واجب ہے، اگر اسے اس کی ضرورت ہو)۔

اور حنابلہ کے نزدیک بھی جن کا نفقہ واجب ہے ان کے لئے خادم بھی لازم ہے، اگر اس کی ضرورت ہو، بہوتی حنبلی تحریر کرتے ہیں: "ويلزم من وجب عليه نفقته خادم للجميع أي جميع من تلزمه نفقتهم لحاجة إليه، لأنه من تمام الكفاية" (شرح منتہی الارادات ۳؍۲۵۹) (جس پر جن رشتہ دار کا نفقہ واجب ہو، ان سب کے لئے خادم بھی لازم ہے، اس کی ضرورت کی وجہ سے اس لئے کہ اسی سے ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے)۔

اور اگر بیٹے کی مالی حیثیت ایسی نہ ہو کہ خادم فراہم کر سکے، تو اپنے پاس رکھ کر خدمت اور دیکھ بھال لازم ہے، "البحر" میں ہے: "ولا يجبر الابن على نفقة أبويه المعسرين إذا كان معسراً، إلا إذا كان بهما زمانة، أو بهما فقر فقط، فإنهما يدخلان مع الابن ويأكلان معه ولا يفرض لهما نفقة علاحدة" (البحر الرائق ۴؍۳۴۹) (اور بیٹے کو اپنے تنگدست باپ کے نفقہ پر مجبور نہیں کیا جائے گا، جبکہ وہ محتاج ہو، مگر جب کہ دونوں کو اپاہج پن ہو، یا صرف افلاس ہو تو وہ دونوں بیٹے کے ساتھ داخل ہوں گے اور اس کے ساتھ کھائیں گے، اور دونوں کے لئے علاحدہ نفقہ مقرر نہیں کیا جائے گا)۔

اور خانیہ میں ہے: "ولا يجب على الابن الفقير نفقة والده الفقير حكماً، إذا كان الوالد يقدر على العمل، وإن كان الوالد لا يقدر على عمل، أو كان زمناً، وللابن عيال كان على الابن أن يضم الأب إلى عياله، وينفق على الكل" (مرجع سابق ۴؍۳۴۹) (اور محتاج بیٹے پر قانونی اعتبار سے اپنے محتاج والد کا نفقہ واجب نہیں ہے، جبکہ والد کام کی قدرت رکھتا ہو، اور اگر کام کی قدرت نہ رکھتا ہو یا اپاہج ہو اور بیٹے کا کنبہ ہو تو بیٹے پر لازم ہے کہ باپ کو اپنے کنبہ میں شامل کر لے اور سب پر خرچ کرے)۔

۷۔ چچازاد بھائی بہن، ماموں زاد بھائی بہن، خالہ زاد بھائی بہن اور پھوپھی زاد بھائی بہن، اسی طرح دیور، سالی اور بہنوئی وغیرہ یہ سب اجنبی مرد اور عورت کے حکم میں ہیں، کیونکہ عورت کے لئے اجنبی وہ ہے جو اس سے فی الحال یا مستقبل میں عارضی رکاوٹ زائل ہونے کے بعد نکاح کر سکتا ہو، دونوں کے درمیان ابدی طور سے نکاح کی حرمت نہ ہو، چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "إياكم والدخول على النساء، فقال رجل من الأنصار: يا رسول الله! أرأيت الحمو؟ فقال ﷺ: الحمو الموت" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۵۲۳۲، صحیح مسلم: حدیث نمبر: ۲۱۷۲، ترمذی حدیث نمبر: ۱۱۷۱ اور مسند احمد حدیث نمبر: ۱۷۳۴۷) (یعنی عورتوں کے پاس (تنہائی میں) جانے سے پرہیز کرو، انصار میں سے ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول! دیور کے بارے میں کیا رائے ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دیور موت ہے (یعنی ان سے اور زیادہ بچنا اور پردہ کا اہتمام ہونا چاہئے)۔

اور اجنبی مرد و عورت کے سلسلہ میں ضابطہ یہ ہے کہ بدن کا جو حصہ ستر میں داخل ہے اس کا دوسرے سے چھپانا لازم ہے، اور جو ستر میں داخل نہیں اس کا ظاہر

کرنا اور نہ چھپانا جائز ہے، مگر یہ کہ کسی عارض کی وجہ سے اس کا چھپانا لازم ہوجائے، چنانچہ جمہور فقہاء کے نزدیک عورت کا سارا بدن ستر ہے سوائے چہرہ اور ہتھیلی کے، جبکہ بعض فقہاء کے نزدیک عورت کا سارا بدن سر سے پیر کی انگلی تک ستر ہے، چنانچہ ان کے نزدیک چہرہ اور ہتھیلی ستر میں داخل ہیں، جن کا چھپانا اجنبی کے سامنے بدن کے دوسرے حصہ کی طرح لازم ہے، دونوں فریق کا استدلال آیت کریمہ: "ولا یبدین زینتہن إلا ما ظہر منہا..." (النور: ۳۱) (اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود ظاہر ہوجائے) سے ہے۔

ابن کثیر تحریر کرتے ہیں:

''أی لا یظہرن شیئاً من الزینة للأجانب إلا ما لا یمکن إخفاؤہ، قال ابن مسعود ﷺ کالرداء والثیاب وقال بقول ابن مسعود: الحسن وابن سیرین والنخعی وغیرہم، وقال الاعمش عن سعید بن جبیر عن ابن عباس فی معنی: ''إلا ما ظہر منہا'' قال: یعنی وجہہا وکفیہا والخاتم...... ویحتمل أن ابن عباس ومن تابعہ اراد تفسیر ما ظہر منہا بالوجہ والکفین، وھذا ھو المشہور عند الجمہور'' (اسماعیل بن عمر بن کثیر (۷۷۴ھ) تفسیر القرآن العظیم ۳-۱۶۳۵، -۱۶۳۶، ط: موسسة الریان، بیروت الطبعة الثالثہ ۱۴۲۸ھ-۲۰۰۷ء)۔

(یعنی وہ اپنی آرائش وزیبائش میں سے کچھ اجنبیوں کے لئے ظاہر نہ کریں، مگر جس کا چھپانا ممکن نہ ہو، ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ خود سے ظاہر ہونے والی آرائش جیسے چادر اور کپڑے (ان کا ہوا سے اڑ جانا یا عورت کے جسم پر رہنے والا نقاب جو اس کے بدن پر ہونے کی وجہ سے باعث کشش ہے)، اور حسن، ابن سیرین اور نخعی وغیرہ نے بھی وہی بات کہی ہے جو ابن مسعودؓ سے مروی ہے، اور اعمش نے سعید بن جبیر سے اور انہوں نے ابن عباس سے "مگر جو کچھ اس آرائش وزیبائش میں سے ظاہر ہوجائے" کے معنی کے سلسلہ میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ قرآن عورت کے چہرہ، دونوں ہتھیلی اور انگوٹھی مراد لے رہا ہے۔۔۔۔اور احتمال ہے کہ ابن عباس اور جنہوں نے ان کی اتباع کی "جو کچھ اس آرائش وزیبائش میں سے ظاہر ہو" کی تفسیر چہرہ اور ہتھیلی سے کرنا چاہا ہو، اور یہی جمہور کے نزدیک مشہور ہے)۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: (السید محمود الآلوسی البغدادی (۱۲۷۰ھ) روح المعانی ۱۸/ ۱۴۰، ط: ادارة الطباعة المنیریہ بمصر، امام ابوبکر احمد بن علی رازی جصاص (۳۷۰ھ)، احکام القرآن ۳/ ۳۱۵، ط: الآستانہ سنہ ۱۳۳۵ھ)۔

نیز جصاص رازی ان لوگوں کی تردید کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں، جو ظاہری زینت سے مراد کپڑے وغیرہ کو قرار دیتے ہیں:

"إن ھذا القول لا معنی لہ، لأنہ معلوم أنہ ذکر الزینة، والمراد العضو الذی علیہ الزینة، ألا تری أن سائر ما تتزین بہ المرأة من الحلی والقلب والخلخال والقلادة، یجوز أن تظہرہا للرجال، إذا لم تکن ھی لابستہا، فعلمنا أن المراد موضع الزینة کما جاء فی نسق التلاوة بعد ھذا: "ولا یبدین زینتہن إلا لبعولتہن" (النور: ۳۱)، والمراد موضع الزینة، فتأویلہا علی الثیاب لا معنی لہ إذا کان ما یری الثیاب علیہا دون شیئ من بدنہا کما یراہا إذا لم تکن لابستہا" (مرجع سابق ۳/ ۳۱۶) (اس قول کا کوئی مطلب نہیں ہے، اس لئے کہ معلوم ہے کہ قرآن کریم نے زینت کا ذکر کیا ہے، اور مراد وہ عضو ہے جس پر زینت ہو، کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ تمام آرائش کی چیزیں جیسے زیورات، کنگن، پازیب اور ہار جن سے عورتیں آرائش وزیبائش کرتی ہیں، ان کو مردوں کے سامنے ظاہر کرسکتی ہیں، جبکہ وہ ان کو پہنے ہوئے نہ ہوں، تو ہمیں معلوم ہوگیا کہ مراد زینت کی جگہ ہے، جیسا کہ تلاوت کی ترتیب میں اس کے بعد وارد ہے، "اور وہ اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں مگر اپنے شوہروں کے سامنے" اور مراد زینت کی جگہ ہے، تو کپڑے سے اس کی تاویل کا کوئی مطلب نہیں ہے، جبکہ صرف اس کے کپڑا کو دیکھ رہا ہو، نہ کہ اس کے بدن کا کوئی حصہ، جس طرح کپڑے کو دیکھ سکتا ہے جبکہ عورت اسے پہنے نہ ہو)۔

لیکن امام جصاصؒ کی یہ تردید بہت کمزور ہے، کیونکہ جو کپڑا بدن سے الگ ہو اور جو عورت کے جسم پر ہو، دونوں میں آسمان وزمین کا فرق ہے، عورت کے جسم پر رہنے والا نقاب پر کشش ہوجاتا ہے، جبکہ وہی اس کے بدن سے الگ ہوکر اپنی کشش کھودیتا ہے، لہذا میرے نزدیک راجح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی تفسیر ہے، کیونکہ (۱) یہاں حجاب کا ذکر ہے، نہ کہ ستر کا، (۲) نیز ظاہر ہونے کا تذکرہ ہے، نہ ظاہر کرنے کا، (۳) اس حکم کے بعد اللہ تعالی نے شوہر، باپ، شوہروں کے باپ، اپنے بیٹے، شوہروں کے بیٹے، بھائی، بھائیوں کے بیٹے، بہنوں کے بیٹے، اپنے میل جول کی عورتوں، اپنے مملوک، بے شہوت مرد اور بے شہوت بچوں کے سامنے جس بناؤ سنگھار کے ظاہر کرنے کی اجازت دی ہے، اس سے چہرہ اور اس کی زیب وزینت ہی مراد ہے، تو اس حلقے سے باہر لوگوں کے لئے چہرہ اور اس کی زینت کے اظہار کی آزادی کیسے ہوسکتی ہے؟ جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ان کی بہن حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ رسول

اللہ ﷺ کے سامنے آئیں اور وہ باریک کپڑے پہنے ہوئے تھیں، تو آپ ﷺ نے فوراً رخ پھیر لیا اور فرمایا: "یا أسماء! إن المرأة إذا بلغت المحيض لم يصلح لها أن يرى منها إلا هذا وهذا، وأشار إلى وجهه و كفيه" (سنن ابی داؤد حدیث نمبر: ۴۱۰۶، سنن کبریٰ للبیہقی حدیث نمبر: ۳۳۴۳، اور حسن لغیرہ درجہ کی حدیث ہے) (اے اسماء! جب عورت بالغ ہوجائے تو درست نہیں ہے کہ چہرہ اور ہتھیلی کے سوا اس کے بدن کا کوئی حصہ نظر آئے) تو یہ ضرورت پر محمول ہے یا جبکہ غیر محرم رشتہ داروں کے سامنے کسی وجہ سے آنا پڑے تو اس پر محمول ہے۔

بہر حال جمہور کے نزدیک چہرہ اور ہتھیلی کا کھولنا مباح ہے، بشرطیکہ (۱) عام اور معمولی زینت کے ساتھ ہو، اور حد درجہ کی غیر معمولی آرائش سے اجتناب کیا گیا ہو اور (۲) یہ کھولنا فتنہ اور شہوت انگیزی کا سبب نہ ہو، ورنہ حرام کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے ان کا کھولنا درست نہ ہوگا۔

اسی طرح عام زینت کی حالت میں بھی اگر فتنہ کا اندیشہ ہو، خواہ اخلاقی گراوٹ کی وجہ سے یا دیگر اسباب کی بنا پر تو چہرہ کھولنا درست نہ ہوگا ''الدر المختار'' میں ہے: "وتمنع المرأة الشابة من كشف الوجه بين رجال، لا لأنه عورة، بل لخوف الفتنة" (الدر المختار ۱/۴۰۶) (اور جوان عورت کو مردوں کے درمیان چہرہ کھولنے سے روکا جائے گا، اس وجہ سے نہیں کہ وہ ستر ہے بلکہ فتنہ کے اندیشہ کی وجہ سے)۔

علامہ شامی تحریر کرتے ہیں: "أي الفجور بها". والمعنى: تمنع من الكشف لخوف أن يرى الرجال وجهها فتقع الفتنة؛ لأنه مع الكشف قد يقع النظر إليها بشهوة" (رد المحتار ۱/۴۰۶) (فتنہ کے اندیشہ سے مراد اس کے ساتھ برائی کا اندیشہ ہے، اور مفہوم یہ ہے کہ جوان عورت کو چہرہ کھولنے سے روکا جائے گا، اس خوف سے کہ مرد اس کے چہرہ کو دیکھیں تو فتنہ رونما ہو، کیونکہ چہرہ کھولنے کی صورت میں اس کی طرف شہوت کے ساتھ نظر پڑ سکتی ہے)۔

مالکیہ کے مشہور مسلک کے مطابق اگر معاشرہ کے فساد کی وجہ سے فتنہ کا اندیشہ ہو تو بھی چہرہ کھولنا درست نہیں ہے، جبکہ "فصل زروق بين الجميلة فيجب، وغير الجميلة فيستحب لها الستر". (دردیر مالکی الشرح الکبیر ۱/۱۰۵) (زروق مالکی نے تفریق کی ہے حسین عورت کے درمیان، چنانچہ اس پر اپنے چہرہ اور ہاتھ کا چھپانا واجب ہے، اور بدصورت عورت کے درمیان تو اس کے لئے چھپانا مستحب ہے)۔

اور معاشرہ کے فساد کا علم اخلاق اور دینداری وغیرہ میں گراوٹ سے ہوسکتا ہے۔

اور اگر عورت کی طرف سے فتنہ کا اندیشہ ہو تو پھر اس پر چہرہ اور ہاتھ کا چھپانا واجب ہے، "واعلم أنه إن خشي من المرأة الفتنة يجب عليها ستر الوجه والكفين". (ابوعبداللہ محمد بن محمد بن عبدالرحمن المعروف بالحطاب (۹۵۴ھ) مواہب الجلیل شرح مختصر خلیل ۱/۴۹۹، ط: مطبعۃ السعادۃ بمصر، الطبعۃ الاولی ۱۳۲۸ھ)

اسی طرح جمہور، یعنی اوزاعی، شافعیہ، حنابلہ وغیرہم کے نزدیک عورت کے لئے دونوں پیر کو اجنبیوں کے سامنے ظاہر کرنا جائز نہیں ہے، ہاں حاجت کی بنا پر کھول سکتی ہے، جیسے زمین میں کام کرنے والی دیہاتی عورت جو ننگے پیر چل رہی ہو، یا جس کے پاس پیر میں پہننے کے لئے جوتے چپل نہ ہوں۔ (المبسوط ۱۰/ ۱۵۳، الام ۱/ ۸۹، المغنی ۱/ ۶۰۱۔۶۰۲)

جبکہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک دونوں پیر ستر میں داخل نہیں، یہ حسن کی امام ابوحنیفہ سے ایک روایت ہے، جبکہ ظاہر الروایہ میں ستر میں داخل ہیں، لیکن فتویٰ امام صاحب کے قول پر ہے، "أن القدمين ليستا عورة على القول المعتمد في المذهب" (الدر المختار ۱/ ۴۰۵) (مذہب حنفی میں معتمد قول کے مطابق دونوں پیر ستر نہیں)۔

جبکہ مالکیہ کے نزدیک ایک قول یہ ہے کہ قدمین ستر ہیں، جبکہ راجح قول یہ ہے کہ قدمین ستر نہیں، کیونکہ چلنے کے وقت ظاہر ہوتے ہیں، اور ان کے چھپانے میں مشقت ہے۔ (مواہب الجلیل ۱/ ۴۹۹، ابوعبداللہ محمد بن یوسف الشہیر بالمواق المالکی (۸۹۷ھ) التاج والاکلیل لشرح مختصر خلیل بہامش مواہب الجلیل ۱/ ۴۹۹، ط: مطبعۃ السعادۃ بمصر ۱۳۲۸ھ)

بہر حال اگر مشترک خاندان اختیار کیا گیا جس میں قریبی رشتہ داروں کا ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہوتا رہتا ہے، تو ایسی صورت میں عورت حاجت کی بنا پر چہرہ کھول سکتی ہے، جبکہ فتنہ کا اندیشہ نہ ہو ورنہ مکمل پردہ لازم ہے۔

اور آیت حجاب: "يا أيها النبي قل لأزواجك وبناتك ونساء المؤمنين يدنين عليهن من جلابيبهن ذلك أدنى أن يعرفن فلا يؤذين" (الاحزاب: ۵۹) (اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو ہدایت کردیجئے کہ وہ اپنے اوپر اپنی بڑی چادروں کے گھونگھٹ لٹکا لیا کریں، یہ

اس بات کے قرین ہے کہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں)۔

گھر سے باہر منہ کھولے نہ پھرنے یا فتنہ کی حالت پر محمول ہے، آلوسی تحریر کرتے ہیں: "وأخرج عبد الرزاق وجماعة عن أم سلمة قالت: لما نزلت هذا الآية: "يدنين عليهن من جلابيبهن" خرج نساء الأنصار، كأن على رؤوسهن الغربان من السكينة وعليهن أكسية سود يلبسنها" (روح المعانی ۱۱؍۲۶۴، ط: دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۱۵ھ) (عبد الرزاق اور ایک جماعت نے روایت کی ہے کہ حضرت ام سلمہ نے فرمایا جب یہ آیت: اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں، نازل ہوئی تو انصار کی عورتیں اس حالت میں نکلیں کہ گویا ان کے سروں پر سکینت کی وجہ سے کوے بیٹھے ہوں اور ان کے اوپر سیاہ چادریں تھیں جنہیں وہ اوڑھ رہی تھیں)۔

"وعن ابن عباس: أمر الله نساء المؤمنين إذا خرجن من بيوتهن في حاجة أن يغطين وجوههن من فوق رؤوسهن بالجلابيب، ويبدين عيناً واحدة" (تفسیر ابن کثیر ۳؍۱۸۸۹) (حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی عورتوں کو حکم دیا ہے کہ جب وہ کسی حاجت کے سلسلہ میں اپنے گھروں سے باہر نکلیں تو اپنے سروں کے اوپر سے اپنے چہرہ ڈھانپ لیں اور ایک آنکھ ظاہر کریں)۔

اور آلوسی تحریر کرتے ہیں: "يرخين عليهن، يقال: إذا زل الثوب عن وجه المرأة أدني ثوبك على وجهك" (روح المعانی ۱۱؍۲۶۴) (اپنی چادر اوڑھ کر اوپر سے گھونگھٹ ڈال لیا کریں، کہا جاتا ہے کہ جبکہ کپڑا عورت کے چہرہ سے ہٹ جائے تو اپنا کپڑا اپنے چہرہ پر ڈال لے)۔

خلاصہ بحث:

۱۔ آدمی کا اصل خاندان وہ ہے جو اس کی بیوی اور بال بچوں پر مشتمل ہو، بھائی بہنوں پر مشتمل خاندان اس کے باپ کا خاندان ہے، نہ کہ اس کا۔

۲۔ اسلام کی نگاہ میں جداگانہ زندگی بسر کرنے کا طریقہ زیادہ بہتر ہے۔

۳۔ جداگانہ خاندانی نظام کے باوجود خدمت کے محتاج ماں باپ اور خاندان کے بزرگ حضرات اور یتیم بچوں کے تنہا پڑنے کا خدشہ غلط ہے، اس لئے کہ حسب مراتب خاندان کے مالدار افراد پر ان کا نفقہ واجب ہے۔

۴۔ مشترکہ خاندان کے افراد پر ان کے بچوں کی تعداد کے لحاظ سے اخراجات عائد کرنا عدل سے قریب ہے، مگر یہ کہ وہ آپس میں تسامح سے کام لیں تو ایسا کرنے کا ان کو حق ہے۔

۵۔ اگر گھر کے اخراجات کی رقم کا والد کو ہبہ کر کے مالک بنا دیا گیا، تو اخراجات سے بچی ہوئی رقم سے خرید کردہ سامان والد کا ہے، اور ان کے مرنے کے بعد سبھوں کا حصہ برابر ہوگا۔

۶۔ بھائی اپنی آمدنی کا خود مالک ہے۔

۷۔ ہر ایک بھائی اپنی آمدنی کا خود مالک ہے، گھر کے کام دیکھنے والے بھائی کی تنخواہ مقرر کر دینی چاہئے، البتہ باپ کی متروکہ جائداد کو ہی سب مل کر بڑھا رہے ہوں، تو اس صورت میں آمدنی سب کے درمیان یکساں تقسیم ہوگی۔

۸۔ والدین کی کفالت اور خدمت بیٹا اور بیٹی دونوں پر واجب ہے۔

۹۔ بہو پر شوہر کے والدین کی خدمت واجب نہیں۔

۱۰۔ گھریلو کام میں بہو کا ساس کا ہاتھ بٹانا واجب نہیں ہے، لیکن عرف وعادت کے مطابق اگر وہ تعاون کرے تو زیادہ بہتر ہے۔

۱۱۔ بوڑھے اور محتاج ماں باپ کی خدمت کے لئے اولاد پر خادم فراہم کرنا ضروری ہے، اور اگر استطاعت نہ ہو تو اپنے پاس رکھ کر ان کی خدمت اور دیکھ بھال لازم ہے۔

۱۲۔ مشترک خاندان کے قریبی رشتہ داروں کے سامنے بقدر حاجت عورت چہرہ کھول کر رہ سکتی ہے، بشرطیکہ فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، جو گھر کے حالات، معاشرہ کی روش دینداری اور اخلاقی گراوٹ کی عام حالت سے معلوم ہو سکتی ہے۔

☆☆☆

مشترکہ اور جداگانہ خاندانی نظام شریعت کی روشنی میں

مولانا محمد ارشد فاروقی [1]

تمہید:

مشترکہ اور جداگانہ خاندانی نظام کو اگر اقدار اسلامی اور سیکولرائزیشن کے تناظر میں دیکھا جائے تو ایک کشمکش کی تصویر سامنے آتی ہے۔

اسلام خلق خدا کو اللہ کا ایک کنبہ (الخلق عیال اللہ) انسانوں کو یکساں حقوق دینے والا، پڑوسی مسلم ہو کہ غیر مسلم اسے بھوکا چھوڑ دینے پر تنبیہ کرنے والا، دنیا کے مسلمانوں کو ایک ''امۃ'' کا نام دینے والا، بنیان مرصوص سے تشبیہ دینے والا، ماں باپ، قرابت والوں، یتیموں، فقیروں، قریب ہمسایہ، اجنبی ہمسایہ، پاس بیٹھنے والے اور مسافر کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دینے والا ہے۔

ان اسلامی اقدار کے اعتبار سے پوری دنیا ایک بڑے مشترک گھرانے کا نام ہے ایک مشترکہ خاندان ہے ایک جسم ہے کہ ایک عضو میں تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم کراہ اٹھتا ہے۔

دوسری طرف سیکولرائزیشن براہ شہری آبادکاری یا تعمیراتی نظام ہے اس نظریہ کے تحت گاؤں اجاڑے اور شہر آباد کئے جا رہے اور رہنے کے لئے پیوست کالونیاں تعمیر ہو رہی ہیں اور ان میں LIG اور MIG کوارٹرز تعمیر کئے جا رہے ہیں، اب ٹاوروں کی تعمیر بھی عام ہوتی جا رہی ہے اور عالمی دور کا یہ بھی حصہ بن چکا ہے کہ کس ملک میں کتنا بلند ٹاور ہے ''یتطاولون فی البنیان'' کا مظاہرہ ہے۔

پیچیدہ سازش:

غور کیا جائے تو سیکولرائزیشن کے منصوبے کے تحت یہ ایک بڑی پیچیدہ سازش ہے، اس عمل کے ذریعہ عالمی اجتماعیت کو توڑ کر انسان کو فرد کی سطح تک لاکر تنہا کر دیا جاتا ہے، چنانچہ سیکولرائزیشن اس کا متقاضی ہے کہ انسان خلافت، قومی حکومت، علاقائی اتحاد، حتی کہ گھرانہ پھر خاندان کو تباہ کر دے، ہو سکے تو زوجین مزید نیچے آکر پھر مرد اور عورت کی سطح تک تنہا ہو جائیں۔

چنانچہ سیکولرائزیشن کا تعمیراتی عمل ایسی رہائشی صورت حال پیدا کرتا ہے جس سے خاندان ٹوٹ جائیں۔ گھرانے کے بندھن اور معاشرتی بندھن کمزور پڑ جائیں، حتی کہ زوجین اور چھوٹے بچے ہی یکجا رہ جائیں، اگر ہو سکے تو وہ بھی ٹوٹ جائیں، تاکہ صرف ایک فرد پر گھر متصور ہو۔ چنانچہ موجودہ عہد میں ان تمام امور کا لحاظ رکھا جاتا ہے، اسکائی اسکریپر اور میگا سیٹی پلاننگ اس کی آخری شکلیں ہیں (عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال)۔

فرد و خاندان کے متعلق اسلام کی ہدایات کے تقاضوں سے سیکولرائزیشن کا عمل نہ یہ کہ صرف ہم آہنگ نہیں ہے، بلکہ متصادم ہے۔

جوابات:

اس تمہیدی تحریر میں فرد و خاندان اور ایک دوسرے کے حقوق اور اسلامی اقدار پر مبنی خاندان کی تشکیل کی صورت حال اور سیکولرائزیشن کے عمل کے نتیجے میں جو کشمکش پائی جاتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام فرد و خاندان کے لئے کونسا طریقہ رہائش پسند کرتا ہے۔

۱۔ اسلام کی نظر میں مشترکہ خاندانی نظام بہتر ہے یا جداگانہ زندگی بسر کرنے کا طریقہ؟

اس سوال کا جواب دوٹوک انداز میں نہیں دیا جا سکتا، بلکہ افراد علاقے وسائل و حالات کے اعتبار سے حکم لگے گا۔ اور یہ بات قدر مشترک رہے

---

[1] معہد امام انور شاہ، دیوبند، سہارنپور۔

گی کہ اسلام نے جوان معاملات میں اشخاص کے حقوق بیان کئے ہیں ان کا احترام باقی رہے۔

بطور مثال اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی رہائشی صورت حال کا جائزہ سامنے رکھا جائے تو ستر فیصد سے زیادہ لوگ جداگانہ خاندانی نظام پر قدرت ہی نہیں رکھتے، تو اب ان کے لئے اور ان کی بیگمات کے سکن یا سکنی ایسا کہ وہ متقل کر سکیں کا نظم کیسے ہو، جبکہ ممبئی کے ایک چہار در چہار (دس بائی دس) کمرے میں والدین، بہو بیٹا، بیٹی داماد تین خاندان ننھے بچوں کے ساتھ آباد عام طور پر دیکھے جاتے ہیں دو منزلہ بیڈ گراؤنڈ فلور کے ساتھ ان کے لئے عمر بتانے کے لئے کافی ہے، بلکہ ہندوستان کے جن مدارس میں حسن انتظام کا مظاہرہ کیا گیا ہے اور اساتذہ کے لئے بائشی مکانات تعمیر کرائے گئے یا مہیا کئے گئے وہ روسی فیکٹریوں سے ملحق کالونیوں سے زیادہ مختلف نہیں، ان ذمہ داروں کی بات الگ ہے جن کے لئے فتوحات کا دروازہ کھل چکا ہے یا کھول لیا گیا ہے۔

ہندوستان میں زمیندارانہ نظام رائج رہا ہے اور اس کے اثرات ہنوز پائے جاتے ہیں، ان میں مشترکہ خاندانی نظام کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ جداگانہ نظام کو معیوب تصور کیا جاتا ہے۔

اس لئے اسلام میں اصل مطلوب ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی ہے، چاہے وہ مشترکہ خاندانی نظام میں پوری ہوتی ہو یا جداگانہ نظام میں، فی نفسہ جداگانہ نظام یا مشترکہ نظام نہ محمود ہے اور نہ مذموم، بلکہ اس کی قباحت لغیرہ ہے اور اس کا حسن بھی لغیرہ فقہاء کی اصطلاح کے مطابق کہلائے گا۔

ایک بڑی حویلی ہو، مشترکہ خاندانی نظام ہو، لیکن والدین کے حقوق عقوق و نافرمانی میں تبدیل ہو جائیں تو یہ مذموم ہوگا۔

والدین ایک فلیٹ میں بیٹا بہو دوسرے فلیٹ میں رہائش پذیر ہوں اور والدین کے حقوق ادا کر رہے ہوں تو یہ انفرادی وجداگانہ نظام قابل ستائش ہوگا، لیکن اگر والدین کمزور و ناتواں ہیں تو پھر ان کے ساتھ رہنا ضروری ہوگا اور والدین کو ضعف و بڑھاپے کے عالم میں بوڑھوں کے گھر کے حوالہ کر دینا ناجائز ہوگا۔

اس لئے خلاصہ یہ کہ مشترکہ خاندانی نظام کو اپنایا جائے یا جداگانہ خاندانی نظام کو اختیار کیا جائے اس میں فی نفسہ کوئی حرج اس وقت نہیں ہے جب حقوق ضائع نہ ہوتے ہوں، شرعی حد بندیاں نہ ٹوٹتی ہوں۔

قرآن کریم نے بیوی کی رہائش کی ذمہ داری شوہر پر ڈالی ہے: "واسکنوهن من حیث سکنتم من وجدکم" (سورہ الطلاق: ٦)، اس آیت کے ذیل میں علامہ کاسانی لکھتے ہیں: "ولو أراد الزوج أن یسکنها مع ضرتها أو مع أحمائها، کأم الزوج وأخته وبنته من غیرها وأقاربه فأبت ذلك، علیه أن یسکنها في منزل مفرد؛ لأنهن ربما یؤذینها ویضرون بها في المساکنة، وإباؤها دلیل الأذی والضرر، ولأنه یحتاج إلی أن یجامعها ویعاشرها في أي وقت یتفق، ولا یمکنه ذلك إذا کان معهما ثالث، حتی لو کان في الدار بیوت ففرغ لها بیتا وجعل لبیتها غلقا علی حدة، قالوا: إنها لیس لها أن تطالبه ببیت آخر" (بدائع الصنائع للکاسانی ۳/ ۴۲۸)۔

(اگر شوہر بیوی کی رہائش کا نظم سوکن یا اس کی سسرالی رشتہ داروں، ساس نند سوتیلی بیٹی وغیرہ کے ساتھ کرنا چاہے اور بیوی اسے قبول نہ کرے تو شوہر کے لئے ضروری ہے کہ وہ علیحدہ مکان کا انتظام کرے، کیونکہ اسے ان سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، دوسرے شوہر کا جب موڈ ہو وہ سامان تسکین مہیا کر سکتا ہے اور خوشگوار آزادانہ بے محابا ٹل جل سکتا ہے، جبکہ تیسرے کی موجودگی کانٹا بن کر چبھے گی)۔

ہاں اگر مکان میں کئی کمرے ہوں اور ایک کمرہ تالے کنجی کے ساتھ بیوی کی تحویل میں دے دے تو فقہاء کی رائے ہے کہ اب مستقل مکان کا مطالبہ اس کے لئے جائز نہیں۔

علامہ کاسانی کی یہ تحریر جہاں بیوی کے لئے حق رہائش کے وجوب پر دلالت کرتی ہے وہیں مشترکہ وانفرادی نظام خاندان کے جواز کی طرف بھی رہنمائی کرتی ہے اور یہ بھی وضاحت کرتی ہے کہ شوہر کی مالی حیثیت و وسعت کا بھی خیال رکھا جائے گا۔ اور یہ بھی بتاتی ہے کہ بیوی شوہر کے رشتہ داروں کے ساتھ رہنا چاہے تو یہ درست ہے، لیکن اگر وہ ان کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہ ہو تو مستقل رہائش کا نظم کرنا شوہر کی ذمہ داری ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلامی معاشرت کی روح کو باقی رکھتے ہوئے اور سیکولرائزیشن کے نقصانات سے بچتے ہوئے جداگانہ اور مشترکہ خاندانی دونوں نظام مباح ہے۔

۲۔ اخراجات کی برابری کا مسئلہ:

عام طور پر مشترکہ خاندان کے افراد کسی ایک فرد کو ذمہ دار بنا کر اس کے حوالے اخراجات کر دیتے ہیں اور اس کے ہاتھ میں رقم حسب وسعت بھیجتے رہتے ہیں اور یہ طریقہ بقائے باہم وقرابت رائج ہے، اس میں تسامح اور توسع ہر فرد کے مدنظر ہے اور تبرع واحسان کی بنیاد پر خاندان کی گاڑی منزل کی طرف رواں رہتی ہے، شرعی اصول بہ نظر استحسان اس طرز کو دیکھتے ہیں۔

لیکن اگر بات تبرع واحسان اور تسامح وتوسع کی نہ ہو، بلکہ افراد خاندان خالص تاجرانہ یا حسابانہ ذہنیت رکھتے ہوں تو ان کے لئے شریعت کا حساب بھی بالکل صاف ہے کہ وہ تمام افراد کے اخراجات کو تقسیم کریں اور فی کس کے حساب سے ہر شخص مصارف دے جس کے افراد زیادہ ہوں گے یا اولاد زیادہ ہوں گی وہ اسی حساب سے خرچ دے گا۔

۳۔ اسی صورت میں اگر مختلف بھائیوں نے مل کر اپنے والد یا کسی بھائی کے پاس آمدنی جمع کی اور گھر کے اخراجات سے بچی ہوئی رقم سے کوئی چیز خریدی گئی تو اس میں سب کا حصہ برابر ہوگا یا ہر ایک کی آمدنی کے لحاظ سے ہوگا؟

اگر یہ مشترکہ خاندان ایک فرد کے پاس رقم جمع کرتا ہے اور جمع وصرف تبرع وتسامح پر مبنی ہے تو خریدی ہوئی چیز کے سب برابر کے حصہ دار ہوں گے۔

اور اگر جمع وصرف کی بنیاد حساب پر ہے تو اسی حساب سے اس خریدی ہوئی چیز میں ہر کا حصہ ہوگا۔

۴۔ اگر تین بھائی ہیں، دو بھائی اپنی پوری تنخواہ، مثلاً دس ہزار روپے گھر میں دے دیتے ہیں اور تیسرا بھائی بیس ہزار روپے کماتا ہے وہ بھی دس ہزار روپے گھر میں دیتا ہے اور دس ہزار الگ بچا کر رکھتا ہے تو وہ بچی ہوئی رقم صرف اس کی ملکیت ہوگی یا تمام بھائیوں کی؟

"وأن ليس للإنسان إلا ما سعى" (سورہ نجم: ۳۹)، "ولكل امرئ منهم ما اكتسب" (سورہ نور: ۱۱) اور اس جیسی نصوص کا تقاضا ہے کہ بیس ہزار روپے کمانے والے بھائی نے جو رقم جمع کی ہے وہ اس کی ملکیت ہے اس میں دیگر دونوں بھائیوں کا حصہ بقرہ میں لگے گا۔

۵۔ بچی ہوئی رقم سے خرید کردہ اشیاء کی ملکیت کا مسئلہ:

اس کی کئی صورتیں ہیں:

۱۔ ایک صورت یہ ہے کہ باپ کی موجودگی میں اس کے لڑکے اس کے ساتھ کاروبار کرتے ہیں اور باپ ہی کے ساتھ ان کا کھانا پینا اور رہنا سہنا ہے تو اس صورت میں تمام آمدنی باپ کی ملکیت شمار ہوگی۔

''ردالمحتار'' میں ہے: "الأب وابنه يكتسبان في صنعة ولم يكن لهما شيئ فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله لكونه معينا له، ألا ترى لو غرس شجرة تكون للأب" (کتاب الشرکہ ۴/۳۲۵)۔

(باپ بیٹے کمائی کر رہے ہوں اور ان کا علیحدہ سے کچھ نہیں ہے) تو پوری کمائی باپ کی ملکیت ہے بشرطیکہ بیٹا باپ کی کفالت میں ہو اور اسے باپ کا معاون تسلیم کیا جائے گا۔ جیسے اگر بیٹا پودا لگائے (باپ کی زمین میں) تو درخت کا مالک باپ ہوگا)۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دو بھائی یہ طے کر لیتے ہیں ایک سال ایک باہر جا کر سامان تجارت فروخت کرے گا دوسرا گھر پر رہے گا، دوسرے سال دوسرا باہر جائے پہلا گھر رہے اور منافع طے ہو جائیں وہ بھی نصف ثلث کے طور پر چاہے باہر رہنے والا اپنے لئے منافع زیادہ طے کرے جائز ہے اور یہ شرکت کی درست صورت ہے: "واشتراط الربح متفاوتا عندنا صحيح" (درمختار ۳/۵۲۰)

۳۔ تیسری صورت جس کے بارے میں سوال کیا گیا ہے وہ ہے۔

اس صورت کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم یہ کہ گھر پر رہ کر کام کرنے والے جو کام باہر رہنے والوں کا کرتے ہیں اس کا باضابطہ معاوضہ طے کرلیں۔ اس صورت میں ان کو ان کے عمل کی اجرت مل جاتی ہے، اس لئے باہر رہنے والوں کی آمدنی میں ان کا سوائے اجرت کے کوئی حصہ نہ ہوگا۔

دوسری قسم یہ ہے کہ کسی معاہدے کے بغیر کچھ لوگ گھر کے کام کاج دیکھتے ہیں اور کچھ لوگ باہر رہ کر کماتے ہیں اور سب بال بچے ایک ساتھ رہتے ہیں۔

اس صورت میں گھر رہنے والے لوگوں کے اخراجات باہر رہنے والوں کی آمدنی سے پورے ہوتے ہیں اور باہر رہنے والوں کی ضروریات کی تکمیل گھر رہنے والوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔

گویا یہ ایک طے کئے بغیر عملی معاہدہ ہے جس کی بنیاد تعلقات وصلہ رحمی پر ہے، اس طرح گزر بسر درست ہے، البتہ گھر رہنے والوں کا باہر رہنے والوں کی آمدنی میں الگ سے کوئی حصہ نہیں ہوگا، کیونکہ وہ ان کی محنت کی کمائی ہے وہ اس کے مالک ہیں۔

لیکن باہر رہنے والوں کے لئے مناسب ہوگا کہ وہ گھر رہنے والوں کے معاشی مسائل کا حل نکالتے رہیں۔

۶۔ ساس اور سسر کے تئیں بہو کی ذمہ داری:

انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ والدین کی خدمت کو سعادت سمجھے، خالق فطرت کا حکم عالی مرتبت ہے: "وبالوالدين إحسانا" (سورہ اسراء: ۲۳) (اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو)۔ فرمان رسالت ہے: "رضى الرب فى رضى الوالد وسخط الرب فى سخط الوالد" (الحدیث)۔

ظاہر ہے قرآن کا خطاب بیٹوں اور بیٹیوں دونوں کو شامل ہے جس طرح بیٹوں پر والدین کی کفالت وخدمت واجب ہے اسی طرح بیٹیوں پر بھی واجب ہے۔

علامہ کاسانی لکھتے ہیں: "ولو كان له ابنان فنفقته عليهما على السواء، وكذا إذا كان له ابن وبنت ولا يفضل الذكر على الأنثى فى الفقة لاستوائهما فى سبب الوجوب وهو الولاد. ولو كان له بنت وأخت فالنفقة على البنت. لأن الولاد لها" (بدائع الصنائع ۳؍۴۴۳)

(اگر کسی شخص کے دو بیٹے ہوں تو ان دونوں کے ذمہ یکساں طور پر اس کا (باپ) نفقہ واجب ہے۔ اسی طرح جب ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہو (بیٹے بیٹی دونوں پر نفقہ یکساں طور پر واجب ہے) اور نفقہ کے باب میں مرد کا حصہ عورت کے مقابلہ میں دوگنا نہ ہوگا چونکہ نفقہ کے وجوب کا جو سبب اولاد ہونا ہے وہ دونوں میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے)۔

اور اگر اس کی بیٹی بھی ہو اور بہن بھی تو نفقہ بیٹی کے ذمہ ہوگا کہ سبب وجوب اسی میں پایا جاتا ہے۔ ''ہدایہ'' میں ہے: "فكان أولى باستحقاق نفقتهما عليه، وهى على الذكور والإناث بالسوية فى ظاهر الرواية. وهو الصحيح" (۲؍۴۵۱)۔

بیٹے اور بیٹی دونوں کی ذمہ داری ہے کہ والدین کی خدمت اور حسب ضرورت کفالت کریں اور یہ ان کی خوش نصیبی کا ذریعہ اللہ کی خوشنودی کے حصول کا باعث ہے۔

سوال میں اس بابت ''بہو'' کی ذمہ داری کے متعلق استفسار کیا گیا ہے اس سلسلہ کی اصولی بات یہ ہے کہ بیوی کے لئے شوہر کی فرماں برداری ضروری ہے اور زندگی کی خوشی کا راز اسی میں مضمر ہے، اس لئے جب ضرورت کے مواقع پر شوہر بیوی سے اپنے والدین میں سے کسی کی خدمت کے لئے کہے تو اس کی تعمیل بہو کی ذمہ داری ہوگی، جسے وجوب سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ فقہاء کی یہ عبارت کہ شوہر کی اطاعت بیوی پر ان امور ہی میں واجب ہے جن کا التزام اس کے لئے ضروری ہے۔ قانون کی ایک شق کی وضاحت کرتی ہے۔

جب بوڑھی ساس بیمار ضرورت مند خدمت وتعاون کی مستحق ہو تو بہو کی دینی ذمہ داری ہے کہ وہ خدمت کرے، مدد کرے۔ "من لم يوقر كبيرنا فليس منا" (الحدیث)، "ما كان العبد فى عون أخيه كان الله فى عونه. من نفس كربة من كرب الدنيا الخ" (الحدیث) کے پیش نظر بہو کا یہ انسانی واجبی حق ہے۔

یقیناً زوجین کے حقوق کے باب میں فقہاء نے قانونی گفتگو دفعہ وار کی ہے اور خالص قانونی مسئلہ کا لب ولہجہ کبھی خشک و بے لچک بھی ہوجاتا ہے،لیکن شریعت کا پورا نظام اور اخلاقی اقدار کا ڈھانچہ خوشگوار لچک دار طرز حیات عطا کرتا ہے۔

لطیفہ:

مولانا تھانویؒ نے جب کسی وعظ میں فرمایا: ''کہ عورتوں کے ذمہ بچوں کو دودھ پلانا نہیں ہے، تو مردوں کو دقت کا سامنا کرنا پڑا، تب دوسرے وعظ میں فرمایا کہ عورتوں کے علاج کی ذمہ داری شوہر پر نہیں ہے، تب ماحول میں اعتدال پیدا ہوا۔

۷۔غیر محرم سے پردے کے احکام:

اسلام نے مردوعورت کے مابین نقطۂ اعتدال قائم رکھنے کے لئے پردے وستر کا حکم دیا ہے اور انسدادی تدابیر کے طور پر لباس اور ستر کے احکام، استیذان، تخلیہ ولمس کی ممانعت، محرموں اور غیر محرموں کے درمیان فرق، غض بصر، اظہار زینت کی ممانعت اور اس کے حدود، چہرہ کا حکم حاجات کے لئے گھر سے نکلنے کی اجازت کے احکام بیان کیا ہے۔

خاص طور پر ''اظہار زینت'' کا جو مفہوم "إلا ما ظهر منها" (سورہ نور: ۳۱) سے مترشح ہوتا ہے اس کی تعیین میں مفسرین کے دو قول واضح طور پر سامنے آتے ہیں، ایک یہ کہ عورت کے پردے میں چہرہ بھی شامل ہے، دوسرا یہ کہ چہرہ کا پردے میں شمار نہیں۔

یہ ضرور ہے کہ مفسرین وفقہاء کے ارشادات کے تتبع سے چہرے کی شمولیت کا قول راجح قابل عمل وتقلید ہے، لیکن مجتہد فیہ مسئلہ کی اصولی حیثیت پر بھی نگاہ رہنی چاہئے کہ اختلاف رائے وسعت وگنجائش کی کلید لے کر رحمت کے دروازے کھولتا ہے۔

آج وہ مسلم ممالک جہاں کی خواتین پردے کی پابند ہیں ان میں انڈونیشا اور ملیشیا وغیرہ میں پردہ نام ہے اسکارف کا کہ سر ڈھکا رہتا ہے چہرہ اور گٹوں سمیت ہاتھ کھلے رہتے ہیں اس روش کو اگر غیر اسلامی قرار دیں تو مسلم خواتین کی بڑی جماعت کو جو اسلام کی تعلیمات کی پابند ہیں بے پردگی کے گناہ کا مرتکب مانیں جو شریعت کے مزاج سے میل نہیں کھاتا، اس لئے مفسرین وفقہاء کے دوسرے قول پر کاربند سمجھنا چاہئے۔

تخلیہ سے گریز

اس روشنی میں مشترک خاندان کی صورت حال کو دیکھا جائے:

۱۔ مشترک خاندان میں رہنے والے اس بات کا ضرور لحاظ رکھیں کہ جو رشتہ کی بہن یا بھائی ہوں جن کے رشتے ایک دوسرے سے ہوسکتے ہیں وہ شریعت کی رو سے اجنبی اور اجنبیہ ہیں، اس لئے مکان کی تنگی اور اشتراک کے باوجود تنہائی میں جمع نہ ہوں اور خلوت گزینی سے گریز کریں۔

''عن عمر ﷺ عن النبی ﷺ قال: لا يخلون رجل بامرأة إلا كان ثالثهما الشيطان'' (الترمذی)

"لا يخلون رجل بامرأة الا ذو محرم" (صحیح البخاری)، "لا تلجوا على المغيبات، فإن الشيطان يجرى من أحدكم مجرى الدم". (سنن ترمذی باب کراہیۃ الدخول علی المغیبات)

(شوہروں کی غیر موجودگی میں عورتوں کے پاس نہ جاؤ، کیونکہ شیطان تم میں سے کسی کے اندر خون کی طرح گردش کر رہا ہے کوئی مرد کسی عورت (اجنبی) سے تخلیہ نہ کرے کہ وہاں تیسرا شیطان ضرور موجود ہوتا ہے)۔

عن عقبة بن عامر أن رسول الله ﷺ قال: ''إياكم والدخول على النساء، فقال رجل من الأنصار: يا رسول الله أفرأيت الحمو؟ قال: الحمو الموت'' (بخاری ۲-۷۸۷)

(عقبہ ابن عامر سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا خبردار عورتوں کے پاس تنہائی میں نہ جاؤ۔ انصار میں سے کسی نے عرض کیا اے اللہ کے رسول دیور اور جیٹھ کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ فرمایا وہ تو موت ہے)۔

۲۔ لمس سے گریز: "قال النبی ﷺ من مس كف امرأة ليس منها بسبيل وضع على كفه جمرة يوم القيمة. (تکملہ فتح القدیر)۔

(حضور ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص کسی ایسی عورت کا ہاتھ چھوئے گا جس کے ساتھ اس کا جائز تعلق نہ ہو اس کی ہتھیلی پر قیامت کے روز انگارہ رکھا جائے گا)

۳۔ ہنسی مذاق بے تکلفی سے پوری احتیاط رکھیں۔

۴۔ اسکارف کا استعمال ضرور کریں۔

سروبال چھپائیں پھر چہرہ کھلا رہے تو اس صورت حال میں مفسرین کے اس قول پر کہ چہرہ پردے میں داخل نہیں ہے، عمل کی گنجائش ہے، اس لئے کہ ان مشترک خاندانوں کے لئے چہرہ سمیت پردہ کرنا دشوارترین ہے اور سخت حرج ہے، خاص طور پر جب کئی خاندان ایک کمرے یا تنگ ترین مکان میں گزر بسر کر رہے ہوں۔ جس کی مثالیں ممبئی جیسے گنجان آبادی والے شہروں میں ملتی ہیں۔

اور ہمارے ملک کی مسلم آبادی کا بہت بڑا حصہ مشترک خاندانی نظام پر مشتمل ہے، اس لئے اگر ایک گھر میں رہنے والی عورتوں، لڑکیوں کو ہر خالہ زاد، ماموزاد جیسوں سے ہر وقت چہرہ چھپانے، نقاب میں رہنے کا حکم حرج سے خالی نہیں اور نہ کرنے کی صورت میں ان کو گنہگار قرار دینا اور دائمی جرم کرتے رہنے کی بات کرنا قرین قیاس شرعی نہیں۔

اس لئے اس باب میں فیصلہ لیتے وقت ان تمام پہلوؤں پر نگاہ ڈالنا ضروری ہے "وهو اللطيف الخبير"۔

قرآن نے شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی کا محتاط باحیا موسی علیہ السلام کے پاس اپنے والد کا پیغام لے کر آنا یوں نقل کیا ہے:

"فجائته إحداهما تمشي على استحياء" (القصص: ۲۵) (پھر آئی اس کے پاس ان دونوں میں سے ایک چلتی تھی شرم سے)۔

یہ ہے شریف اور پاکباز عورتوں کا قاعدہ۔ پردے کے بنیادی مقاصد میں عفت و پاکدامنی کی مثالی صفت کا حاصل کرنا ہے۔

☆☆☆

خاندانی نظام سے متعلق عصری مسائل اور ان کا شرعی حل

مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی [1]

اسلام دین فطرت ہے جس نے زندگی کے تمام شعبے میں ہماری رہنمائی کی ہے، مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کس طرح گزارے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں واضح ہدایات موجود ہیں جب ہم انسان کے اجتماعی نظام میں مشترکہ اور جداگانہ خاندانی نظام پر غور کرتے ہیں تو قرآن واحادیث کے مطالعہ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ معاشرتی زندگی کی شائستگی اور انضباط کے لئے ضروری ہے کہ خاندان کی یونٹ مختصر ہو اور ہر شادی شدہ کا مکان، گھریلو انتظامات اور مالی معاملات جدا جدا ہوں، جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ رب العزت کا فرمان ہے:

''یأیها الذین اٰمنوا لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتی تستأنسوا وتسلموا علی أهلها'' (النور:۲۷)

(اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے علاوہ دوسرے گھروں میں مت داخل ہو جب تک کہ اجازت حاصل نہ کرلو اور ان کے رہنے والوں کو سلام نہ کرلو)۔

''وإذا بلغ الأطفال منکم الحلم فلیستأذنوا کما استأذن الذین من قبلهم کذلك یبین اللہ لکم اٰیته واللہ علیم حکیم''۔ (النور:۵۹)

(اور جب تمہارے بچے بلوغیت کو پہنچ جائیں تو چاہئے کہ جس طرح ان سے بڑے اجازت لے کر داخل ہوا کرتے تھے اسی طرح وہ بھی اجازت لے کر داخل ہوں اس طرح اللہ تعالیٰ کھول کر احکام بیان کرتا ہے وہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے)۔

مذکورہ بالا آیات سے جہاں ایک طرف دوسرے کے گھروں میں بلا اجازت داخلہ کی ممانعت ہے وہیں دوسری طرف بالغ اولاد کے علیحدہ گھر ہونے کا بھی اشارہ ملتا ہے۔

اسلام نے نہ صرف یہ کہ ہر شادی شدہ کے لئے الگ مکان کی بات کی ہے، بلکہ اگر کسی شخص کی چند بیویاں ہوں تو ہر ایک کے لئے علیحدہ مکان ہو، جیسا کہ خود حضور اقدس ﷺ کی تمام ازواج کے لئے الگ الگ مکانوں کا ذکر ملتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلیة الأولی''۔ (الاحزاب:۳۳)

(تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور قدیم زمانہ جاہلیت کے دستور کے مطابق مت پھرو)۔

اسی طرح دوسری آیت میں اللہ رب العزت نے ازواج مطہرات کی عبادت اور ذکر واذکار کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

''واذکرن ما یتلی فی بیوتکن من آیات اللہ والحکمة''۔ (الاحزاب:۳۴)

اور تم ان آیات الٰہیہ کو اور اس علم کو یاد رکھو جس کا تمہارے گھروں میں چرچا ہے۔

مذکورہ بالا آیات میں "بیوتکن" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو جمع ہے جس سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ ازواج مطہرات کے لئے الگ الگ مکان تھا۔ جس کی تائید احادیث سے بھی ہوتی ہے "بخاری شریف" کی حدیثوں میں اس کی صراحت موجود ہے۔ "بخاری شریف کتاب الجهاد باب ماجاء فی بیوت ازواج ﷺ" کا مطالعہ کیا جائے اس کی پوری تفصیل وہاں موجود ہے (الصحیح للبخاری ۱/۴۳۷)۔ نیز کتب فقہ میں یہ جزئیہ صراحۃ مذکور ہے کہ بیوی اپنی رہائش کے لئے الگ مکان کا مطالبہ کرسکتی ہے۔ "ہدایہ" میں ہے۔

---

[1] نائب مفتی امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ۔

"وعلى الزوج أن يسكنها في دار مفردة ليس فيها أحد من أهله إلا أن تختار" (هدايه باب النفقة ۲-۱۴۳)۔

اسی طرح حضرت محمد ﷺ کا یہ عمل کہ جب اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا عقد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کردیا تو ان دونوں کے لئے ایک الگ مکان دیدیا۔ حالانکہ حضور ﷺ حضرت فاطمہؓ سے غیر معمولی تعلق تھا ان کے بارے میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"عن المسور بن مخرمة أن رسول الله ﷺ قال: فاطمة بضعة مني فمن أغضبها فقد أغضبني" (الصحيح البخاری مناقب فاطمة ۱-۵۳۲)

(مسور بن مخرمہؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے جس نے اس کو ناراض کیا اس نے مجھ کو ناراض کیا)۔

دوسری جگہ آپ نے دنیا کے تمام لوگوں میں انہیں اپنے سے سب سے زیادہ محبوب وعزیز قرار دیا۔

"عن عائشة سئلت أي الناس كان أحب إلى رسول الله ﷺ قالت: فاطمة" (السنن للترمذی باب ماجاء فی فضل فاطمة ۲۲۶/۲)۔ دوسری جانب جب ہم غور کرتے ہیں تو آپ ﷺ کے داماد حضرت علیؓ جو آپ کی پرورش ونگرانی میں تھے آپ کے چچازاد بھائی بھی تھے ان کے والد ابو طالب کا آپ پر بے پایاں احسان بھی تھا اور خود حضرت علی سے غیر معمولی تعلق تھ۔ روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا علی مجھ سے ہیں اور میں علی سے ہوں۔

"قال النبي ﷺ لعلي: أنت مني وأنا منك" (الصحيح للبخاري مناقب علي بن أبي طالب ۱-۵۲۵)

لیکن حضرت فاطمہؓ وحضرت علیؓ سے ان چند در چند قربت وتعلق کے باوجود شادی کے بعد ان دونوں کا مکان الگ کردیا۔

مذکورہ بالا آیات وروایات سے یہ بات واضح ہوکر سامنے آتی ہے کہ اسلام میں مشترکہ خاندانی نظام بہتر نہیں ہے۔ ایک مختصری یونٹ جس میں میاں بیوی غیر شادی شدہ اولاد اور حاجت وضرورت مند ماں باپ شامل ہوں، پر مشترکہ خاندانی نظام کے ساتھ زندگی بسر کرنا بہتر ہے۔ نیز پردہ کا بھی یہی تقاضا ہے، اس لئے کہ مشترکہ خاندانی نظام میں پردہ شرعی کی مکمل رعایت ناممکن نہیں تو مشکل ترین ضرور ہے۔ عورتوں کا پردہ کے مطلوبہ طرز معاشرت کا اہم ترین جزء ہے، قرآن نے اس کے احکام بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں "سورۂ نور" میں گھر کے پردہ کے احکام کی تفصیل کرتے ہوئے یہ بات کہی ہے کہ آدمی دوسرے کے گھر میں سلام واجازت کے بغیر داخل نہ ہو، اگر کوئی نہ ہو یا اجازت نہ ملے تو واپس آجائے "يا أيها الذين آمنوا لا تدخلوا بيوتاً غير بيوتكم حتى تستأنسوا وتسلموا على أهلها ذلكم خير لكم لعلكم تذكرون، فإن لم تجدوا فيها أحداً فلا تدخلوها حتى يؤذن لكم وإن قيل لكم ارجعوا فارجعوا هو أزكى لكم والله بما تعملون عليم"۔ (النور: ۲۷-۲۸)

سوال ۲ کا جواب:

اس سلسلہ میں کوئی صریح جزئیہ تو نہیں، ملا البتہ حالات وعرف کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر مشترک خاندانی نظام ہو اور افراد خاندان کی ضروریات کے لئے سب مل کر خرچ کریں تو ایسی صورت میں تمام افراد پر اخراجات برابر عائد ہونے چاہئیں، بچوں کی تعداد کے تناسب سے اخراجات لازم نہیں ہونی چاہئے، اس لئے کہ عرف اور سماج میں جب مشترک خاندان کے تحت آدمی زندگی بسر کرتا ہے تو ہر ایک کے ذہن ودماغ میں یہ بات ملحوظ رہتی ہے کہ اخراجات سب مل کر برابر ادا کریں گے کمی بیشی کا شائبہ بھی کسی کے دل میں پیدا نہیں ہوتا ہے، گویا عملاً اخراجات برابر ادا کرنے کی شرط ہوتی ہے اور اصول فقہ کے مسلمہ ضابطہ "المعروف كالمشروط" کے تحت یہ معاملہ ہے، لہٰذا ایسی صورت میں اگر کسی کی اولاد کم ہے اور وہ زیادہ خرچ دیتا ہے تو جتنا زائد وہ دے رہا ہے وہ اس کی جانب سے تبرع واحسان سمجھا جائے گا۔

سوال ۳ کا جواب:

سوال میں جو صورت ذکر کی گئی ہے اس کی دو حالتیں ہیں (۱) لڑکے کارجین کے معاون ہیں (۲) معاون نہیں ہیں۔ دونوں کے احکام الگ الگ ہیں۔

پہلی صورت یعنی اگر خاندان مشترک ہو اور لڑکے سب مل کر کماتے ہیں کھانا پینا رہنا سہنا سب ایک ساتھ ہو لڑکے والد کی ماتحتی میں ہو اور کفالت میں ہوں تو لڑکوں کو والد کا معاون سمجھا جائے گا اور تمام آمدنی والد کی سمجھی جائے گی، علامہ شامی نے لکھا ہے:

''فی القنیة: الأب والابن یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما شیئ فالکسب کله للأب، إن کان الابن فی عیاله لکونه معینا'' (رد المحتار ۳-۳۴۹)

مذکورہ جواب کی تائید اکابر کے فتاوی سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ ''فتاوی رحیمیہ'' میں اس طرح کے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''لیکن اگر زید والدین کے ساتھ رہتا تھا اور رہنا سہنا کھانا پینا ان کے ساتھ تھا اور ان کے ماتحت رہ کر کمائی ہوئی رقم سے زمین خریدی ہے تو وہ جگہ والد کی شمار ہوگی۔ (فتاوی رحیمیہ ۱۵۹/۶)

دوسری صورت یہ ہے کہ خاندان مشترک ہے کھانا پینا رہنا سہنا مشترک ہے، لڑکے والد کی ماتحتی اور کفالت میں نہیں ہیں اور آمدنی کی تقسیم کے سلسلہ میں کوئی تناسب مقرر نہیں ہے تو ایسی صورت میں مشترکہ اخراجات کے بعد جو آمدنی بچے گی وہ تمام لوگوں کے درمیان برابر تقسیم ہوگی۔ علامہ شامی نے شرکت فاسدہ کی بحث کے تحت یہ جزئیہ صراحۃ لکھا ہے کہ باپ اور بیٹے دونوں ایک گھر میں رہتے ہوں اور دونوں کا ذریعہ معاش الگ ہو اور دونوں اپنی آمدنی ایک جگہ اس طرح جمع کرتے ہوں کہ اس میں تمیز و تفاوت مشکل ہو تو ایسی صورت میں آمدنی میں دونوں برابر کے شریک ہوں گے۔

''فی الخیریة: فی زوج امرأة وابنها اجتمعا فی دار واحدة وأخذه کل منهما یکتسب علی حدة ویجمعان کسبهما، ولا یعلم التفاوت ولا التساوی ولا التمییز، فأجاب بأنه بینهما سویة''۔ (رد المحتار ۳-۳۴۹)

علامہ شامی نے اس بات کی بھی صراحت کی ہے کہ اگرچہ کام اور رائے میں ان لوگوں کے درمیان تفاوت ہو، لیکن آمدنی برابر تقسیم ہوگی اور خیریہ کے حوالہ سے اسی پر فتوی نقل کیا ہے، عبارت ملاحظہ ہو:

''فی فتاوی الحانوتی: فإذا کان سعیهم واحداً ولم یتمیز ماحصله کل واحد منهم بعمله یکون ماجمعوه مشترکا بینهم بالسویة، وإن اختلفوا فی العمل والرأی کثرة وصوابا کما أفتی به فی الخیریة'' (رد المحتار ۳-۳۴۸)

لہٰذا اگر تمام بھائیوں نے اپنی آمدنی ایک بھائی کے پاس جمع کی تو اس صورت میں بھی تمام بھائی اس میں برابر کے شریک ہوں گے۔

سوال ۵ کا جواب:

اس کا جواب بھی راقم الحروف کے نزدیک یہی ہے کہ جب خاندان کے کچھ افراد کماتے ہیں اور کچھ گھریلو کاموں کی دیکھ بھال کرتے ہیں تو اس صورت میں بھی تمام بھائی آمدنی میں برابر کے شریک ہوں گے، اس کی دلیل جواب ۳ کے تحت ذکر کردی گئی ہے۔

سوال ۴ کا جواب:

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک بھائی نے جو اپنی کمائی کا کچھ حصہ بچالیا تو یہ بچی ہوئی رقم اسی بھائی کی ملکیت شمار ہوگی، اس میں دوسرے بھائیوں کا حصہ نہیں ہوگا، البتہ یہ طریقہ وعدہ خلافی ہوگا اور امانت ودیانت کے خلاف ہونے کی وجہ سے گنہگار ہوگا۔ اس لئے کہ مشترکہ خاندان میں قولاً نہ سہی تو عملاً یہ عہد و پیمان ہوتا ہے کہ ہم سب مل جل کر رہیں گے، اجتماعی اخراجات ہوں گے اور جو بھی آمدنی ہم لوگوں کی ہوگی وہ ایک جگہ جمع ہوگی۔

مذکورہ جواب کی تائید حضرت مولانا مفتی محمود الحسن علیہ الرحمہ کے فتاوی سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ اس طرح کے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

اس میں بھائیوں کا حق نہیں۔

علیحدہ ہونا اس کو جائز ہے، لیکن ماں باپ اور بھائیوں کے ساتھ رہ کر کھانا، پہننا اور اپنی کمائی علیحدہ جمع کرنا بہت بڑی بے مروتی اور انتہائی احسان فراموشی ہے جس کا نتیجہ بہت خراب ہے''۔ (فتاوی محمودیہ ۱۴/ ۱۹۴)

سوال ٦ کا جواب:

والدین اگر معذور و مجبور ہوں تو ان کا نفقہ ظاہر روایت کے مطابق بیٹا اور بیٹی دونوں پر برابر واجب ہے بشرطیکہ دونوں موسر ہوں۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ دونوں پر بقدر میراث نفقہ واجب ہوگا، یعنی نفقہ کا دو حصہ لڑکا ادا کرے گا اور ایک حصہ لڑکی۔ صاحب ''ہدایہ'' نے پہلے قول کو صحیح قرار دیا ہے۔ ''ہدایہ'' میں ہے:

''وهي على الذكور والإناث بالسوية في ظاهر الرواية، وهو الصحيح''۔ (هدایه ۲۔۴۴۶)

علامہ شامی نے خلاصہ کے حوالہ سے اس قول کو مفتی بہ لکھا ہے۔ عبارت ملاحظہ ہو:

''ثم النفقة لأصوله ... الفقراء ... بالسوية بين الابن والبنت وقيل: كالإرث'' (الدر المختار ۵۔۳۵۵)

''(قوله بالسوية بين الابن والبنت) هو الظاهر، وهو الصحيح هدايه، وبه يفتي خلاصه، وهو الحق فتح'' (رد المحتار ۵۔۳۵۵)

لہٰذا صحیح اور مفتی بہ قول کے بموجب لڑکا اور لڑکی دونوں پر محتاج وضرورتمند والدین کا نفقہ برابر برابر واجب ہے۔ جہاں تک والدین کی خدمت کا تعلق ہے تو یہ بیٹوں پر واجب ہے۔ لیکن اگر والدین خدمت کے محتاج ہوں کوئی دوسرا ان کی خدمت کرنے والا نہ ہو تو ایسی صورت میں فقہاء کرام نے یہ صراحت کی ہے کہ شادی شدہ لڑکی پر ایسے والدین کی خدمت واجب ہے وہ ہفتہ میں ایک مرتبہ جا کر ان کی خدمت کرے گی شوہر اس کو منع نہیں کرسکتا ہے، اگر وہ منع کرے تو بھی جاسکتی ہے۔

''ولا يمنعها من الخروج إلى الوالدين في كل جمعة إن لم يقدرا على إتيانها على ما اختاره في الاختيار، ولو أبوها زمنا مثلاً فاحتاجها، فعليها تعاهده، ولو كافراً وإن أبى الزوج'' (الدر المختار ۵۔۳۲۳۔۳۲۴)

''(قوله فعليها تعاهده) أي بقدر احتياجه إليها، وهذا إذا لم يكن له من يقوم عليه''۔ (رد المحتار ۵۔۳۲۴)

بہو پر خوش دامن کی خدمت واجب ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں کتب فقہ میں یہ مسئلہ مصرح ہے کہ بہو پر خوش دامن کی خدمت واجب نہیں ہے۔ البتہ جبکہ خوش دامن بالکل مجبور ہو اور کوئی اس کی خدمت کرنے والی نہ ہو تو ایسی صورت میں اس کا اخلاقی فریضہ یہ ہے کہ وہ اس کی خدمت کرے، یہ اس کے لئے بڑی سعادت اور ثواب کا کام ہوگا۔ مسلمانوں پر بحیثیت مسلمان صرف انہیں کاموں کا کرنا واجب نہیں ہوتا ہے جو اس کے ذمہ شریعت نے واجب قرار دیئے ہیں، بلکہ بہت ساری ایسی مجبوریاں ہیں جہاں مسلمان اس خدمت کے واجب نہ ہونے کے باوجود انسانیت کے تقاضہ اور اخلاقی ذمہ داری سمجھتے ہوئے اسے اپنے اوپر واجب سمجھتا ہے۔

حضرت مولانا عبدالرحیم صاحبؒ اس طرح کے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''شوہر کی والدہ اور اس کے بھائی بہن کے لئے کھانے کا انتظام کرنا عورت پر شرعاً لازم وضروری نہیں ہے، البتہ اگر عورت اپنی ساس کی ضعیفی اور کمزوری کی وجہ سے ان کی خدمت کرے اور ان کے لئے کھانا پکائے تو یہ اس کے لئے سعادت مندی ہوگی اور یہ خدمت انشاء اللہ اس کے لئے باعث اجر وثواب ہوگی''۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۸/۴۵۷)

سوال ۷ کا جواب:

پردہ کے جو احکام کتاب وسنت میں تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں وہ یہاں بھی لاگو ہوں گے اور ان حالات میں بھی پردۂ شرعی کی مکمل رعایت لازم وضروری ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے سوال ا کے جواب کے تحت یہ لکھا ہے چونکہ مشترکہ خاندانی نظام کی صورت میں پردۂ شرعی کی مکمل رعایت مشکل ہے، اس لئے یہ نظام اسلام کا مطلوب ومقصود نہیں ہے۔

☆☆☆

کلفت ومشقت سے آزاد خاندانی نظام

محمد ابرار خان ندوی[1]

اسلام میں خاندان کا تصور:

اسلام میں خاندان شوہر، بیوی، اولاد کے مجموعہ کا نام ہے، مرد کو اس خاندان کا نگراں مقرر کیا گیا ہے، اور پھر سب پر ایک دوسرے کے بے شمار حقوق وفرائض عائد کئے گئے ہیں، مرد پر کسب معاش کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے، عورت پر تدبیر منزل کی، اولاد پر والدین کی اطاعت وفرمانبرداری، خدمت وکفالت، اور نگہداشت کی، اولاد کی صحیح تعلیم وتربیت کو والدین پر فرض قرار دیا ہے، وہیں اولاد کو والدین کے ساتھ حسن سلوک (سورۃ العنکبوت ۲۰/۸) اور ان کے لئے دعاء رحمت مانگنے کا حکم اور تاکید کی گئی ہے (سورہ بنی اسرائیل ۱۵/۲۵) اور والدین کی نافرمانی حتی کہ ان کو "اف" تک کہنے سے منع کیا گیا ہے (سورۃ بنی اسرائیل ۱۵/۲۳)۔

اسلام اس مختصر خاندانی نظام کا تصور پیش کرتا ہے، اور اسی کا حامی وداعی ہے، بالفاظ دیگر جداگانہ نظام معاشرت بہتر وپسندیدہ ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام جس میں تمام بھائی، ان کے بیوی بچے، چچا ان کی اولاد وغیرہ سب ایک ساتھ رہیں، قیام وطعام مشترک ہو، گھر کے اخراجات اجتماعی طور پر انجام دیئے جائیں کچھ لوگ محنت ومشقت سے کمائیں اور تمام افراد خاندان کے اخراجات پورے کریں، کچھ لوگ گھر کے کام کاج دیکھیں اور کوئی ناکارہ بن کر بٹھارہے کہ کیا ضرورت ہے، گھر کی ضروریات تو پوری ہو ہی رہی ہیں۔ اسلامی تعلیمات کے مزاج ومذاق کے لحاظ سے یہ نظام معاشرت پسندیدہ نہیں ہے۔ اسلام اس کی پرزور دعوت دیتا ہے کہ ہر شخص محنت ومشقت کرے، کسب معاش کے لئے جدوجہد کرے، تلاش رزق کی کوشش کرے (سورۃ الجمعۃ ۲۸/۱۰) اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے اخراجات خود برداشت کرے، کسی کا دست نگر ومحتاج نہ بنے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لأن يحتطب أحدكم حزمةً على ظهره خير له من أن يسأل أحداً فيعطيه أو يمنعه" (مسند احمد ۱-۱۶۷)

تم میں سے جو لکڑی کا ایک بوجھ اپنی پیٹھ پر لاد کر لائے، یہ اس کے لئے اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی سے سوال کرے، تو وہ اس کو دے یا منع کرے۔

دوسری حدیث میں ہے:

"ما أكل أحد طعاماً قط خيراً من أن يأكل من عمل يده"۔ (كنز العمال ۴-۸، رقم الحديث ۹۲۲۲)

کسی شخص نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر کھانا کبھی نہیں کھایا۔

مدینہ منورہ میں انصار ومہاجرین کے مابین مواخات کا قیام اس جانب کھلا ہوا اشارہ ہے کہ ہر شخص اپنا ذریعہ معاش اختیار کرے، اپنی اور اپنے ماتحت افراد کی ضروریات کو پورا کرنے کی مکمل سعی وجدوجہد کرے، اور اپنے معاش کا نظم انفرادی طور پر انجام دے، مشترکہ نظام معاشرت کے مقابلہ "انفرادی نظام معاشرت" کے مستحسن وبہتر ہونے کی یہ واضح دلیل اور بین اشارہ ہے۔

مشترکہ خاندان۔ مصالح ومفاسد:

مشترکہ خاندانی نظام کے کچھ فائدے بھی ہیں جن سے انکار نہیں کیا جاسکتا، مثلاً خاندان کے معذور و بے سہارا، یتیم وبوڑھے افراد، بیوہ مطلقہ عورتیں، بیمار وپریشان حال لوگ جن کا کوئی ذریعۂ معاش نہیں، ایک ساتھ رہنے میں ان کی تعلیم وتربیت کفالت ونگہداشت بہتر طریقہ پر ہوجاتی ہے۔

---

[1] جامعۃ الہدایہ، جے پور۔

مگران فوائد کے مقابلہ مفاسد زیادہ ہیں، مثلاً ایک ساتھ مالی معاملات ہونے کی بناء پر بدگمانیاں پیدا ہوں گی، آپسی تعلقات متاثر ہوں گے، صلہ رحمی کے بجائے قطع رحمی کا خطرہ ہوگا، پردہ کے احکام پامال ہوں گے، ان کے علاوہ اور بہت سے شرعی مفاسد ہیں، الغرض مشترکہ خاندانی نظام میں مصالح کم مفاسد زیادہ ہیں "إثمهما أكبر من نفعهما" (سورۃ البقرہ ۲۱۹) ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے زائد و بڑا ہے۔

مشترکہ خاندانی نظام اور باہمی منازعت:

مشترکہ خاندانی نظام میں باہم حقوق تلفی ہوتی ہے، آپس میں نزاع اور بیوی بچوں کے سلسلہ میں ایک دوسرے سے بدگمانی، دلوں میں کدورت اور بُعد پیدا ہوتا ہے، اور جو چیز نزاع کا باعث ہو اس سے اجتناب لازم ہے (۲) الغرض مشترکہ خاندان کے مصالح کے مقابلہ مفاسد و مضرتوں کو دیکھتے ہوئے اسے بہتر وقابل عمل قرار نہیں دیا جاسکتا، اس کا خاتمہ ہی بہتر ہے۔

''درء المفاسد أولى من جلب المصالح، فإذا تعارضت مفسدة ومصلحة قدم المفسدة غالباً'' (الأشباه والنظائر لابن نجيم المصري ٣٢٢، مكتبه فقيه الأمت)

مفاسد کا دور کرنا، حصول مصالح سے بہتر ہے، جب (کسی مسئلہ میں) مفسدہ و مصلحت میں تعارض پیدا ہو جائے تو اکثر ازالہ مفسدہ کو ترجیح دی جاتی ہے۔

جداگانہ نظام معاشرت اور اصحاب حاجت کے حقوق:

اگر افراد خاندان واہل قرابت میں ایک دوسرے کے حقوق وفرائض کے اداء کرنے کا احساس وجذبہ پیدا ہو جائے، صلہ رحمی وتعاون وامداد کا اسلامی تصور قلب وذہن میں موجزن ہو، اہل حاجت ومعذورین کے سلسلہ میں شریعت کی تعلیمات کی بجا آوری ہو، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ معاشرت کا جداگانہ نظام قائم ہونے کے باوجود معذور وبے سہارا، یتیم وبیوہ، ضعیف وبوڑھے، بیمار اور مالی بدحالی میں مبتلا افراد پریشان ہوں، اور ان کا کوئی پرسان حال وخیر خواہی کرنے والا نہ ہو، اسلام میں تو رشتہ دار، مسکین ومسافر سب کے ساتھ ہمدردی وتعاون کا حکم دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

''وآت ذا القربى حقه والمسكين وابن السبيل'' (سورة بنی اسرائيل:٢٦)

اہل قرابت ورشتہ داروں کی امداد وتعاون پر تو دوہرے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔

''الصدقة على المسكين صدقة، وعلى ذى القرابة ثنتان: صدقة وصلة'' (ابن ماجہ: ابواب الزکوۃ حدیث نمبر:۱۸۴۹)۔

مسکین پر صدقہ کا صرف ایک ثواب ہے (صدقہ کا) اور رشتہ دار پر صدقہ (کی دوہری فضیلتیں ہیں) ایک صدقہ کا، اور دوسرے صلہ رحمی کا، (کا دوہرا اجر ہے)

مشترکہ خاندانی نظام میں اخراجات کی تقسیم:

اگر مشترکہ خاندانی نظام قائم ہے، اور کسی کے بچے زیادہ ہیں اور کسی کے کم تو بہتر ومناسب یہی ہے کہ جس کے بچے زائد ہیں وہ زیادہ روپیہ دے، اس لئے کہ اس کے بیوی بچوں کے اخراجات کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے۔

علامہ ابن ہمام تحریر فرماتے ہیں:

''ونفقة الأولاد الصغار على الأب لايشاركه أحد'' (تفصیل کے لئے دیکھئے، فتح القدیر ۴؍۴۱۰، دار الفکر، بیروت، لبنان، نیز دیکھئے بدائع الصنائع ۴؍۳۲) چھوٹے بچوں کا نفقہ والد کے ذمہ واجب ہے، اس میں کوئی اس کا شریک نہیں ہوگا۔

ہاں: والد کی مالی حیثیت اچھی نہیں ہے اور وہ اپنے بچوں کے اخراجات برداشت کرنے کا متحمل نہیں ہے، تو قریبی رشتہ دار مثلاً اس کے بھائی، چچا، وغیرہ اس کے اخراجات برداشت کریں گے، اور بعد میں جب اس کی اقتصادی حالت بہتر ہوگی تو اپنی رقم واپس لے لیں گے۔

''وإذا لم يف كسبه بحاجتهم أو لم يكتسب لعدم تيسير الكسب أنفق عليهم القريب ورجع على الأب إذا أيسر'' (تفصیل کے لئے دیکھئے: فتح القدیر ۴؍۴۱۰، دار الفکر بیروت، لبنان)۔

جب اس کی (یعنی والد کی) کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے ناکافی ہو، یا کوئی ذریعہ معاش نہ ہونے کی وجہ سے وہ کچھ نہ کماتا ہو تو ان پر اولاد پر) قریبی رشتہ دار خرچ کرے گا، اور جب ان کے والد خوشحال ہوں گے تو وہ ان سے واپس لے گا۔

عرف کا اعتبار ہوگا (اخراجات میں):

مشترکہ خاندانی نظام میں اصولی طور پر تو بچوں کی تعداد کے اعتبار سے اخراجات ہونا چاہئے، لیکن اس سلسلہ میں وہاں کے عرف کو بھی دیکھا جائے گا، اگر وہاں کا عرف یہ ہے کہ بچوں کی تعداد کے لحاظ سے نہیں، بلکہ ہر ایک حسب ضرورت خرچ کرتا رہتا ہے، اور جو بھائی زائد خرچ کرتا ہے، وہاں کے عرف میں اسے قرض تصور نہیں کیا جاتا، اور نہ ہی اس کی نیت واپس لینے کی ہوتی ہے تو یہ زائد رقم بھائی کی جانب سے تبرع ہوگی، اور اس کی واپسی لازم نہ ہوگی اور اگر کسی علاقہ میں زائد خرچ کی جانے والی رقم قرض سمجھی جاتی ہے، یا وہاں کا عرف تو قرض کا نہیں ہے، مگر اس بھائی نے اس شرط کے ساتھ خرچ کیا ہے کہ بعد میں اس کی زائد رقم اس کو لوٹانا ہوگی، تو ایسی صورت میں یہ زائد رقم واجب الاعادہ ہوگی۔

علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

وفی جوامع الفقه: ''إذا لم يكن للأب مال، والجد والأم أو الخال أو العم موسر، يجبر على نفقة الصغير، ويرجع بها على الأب إذا أيسر'' (تفصیل کے لئے دیکھئے: فتح القدیر ۴/ ۴۱۰، دار الفکر بیروت، لبنان، نیز دیکھئے بدائع الصنائع ۴/ ۳۲)۔

''جوامع الفقہ'' میں ہے، کہ جب باپ کے پاس کچھ بھی مال نہ ہو، اور دادا، ماں، ماموں یا چچا خوشحال ہوں، تو ان کو چھوٹے بچوں کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے مجبور کیا جائے گا، بعد میں جب ان کے والد، صاحب حیثیت ہوں گے تو وہ ان سے اپنا پیسہ واپس لے لے گا۔

مشترکہ رقم سے خریدی ہوئی چیز سب کی ملکیت ہے:

بھائیوں نے اپنی آمدنی والد یا بڑے بھائی کے پاس جمع کی، تاکہ اس سے گھر کے اخراجات پورے کئے جائیں، گھر کی ضروریات پوری ہونے کے بعد باقی ماندہ رقم سے کوئی جائداد، منقولہ یا غیر منقولہ یا کوئی سامان خرید لیا جائے، تو وہ تمام بھائیوں کی ملکیت ہوگی، یعنی سب بھائی اس میں برابر کے شریک ہوں گے، کسی کا حصہ کم یا زائد نہیں ہوگا، خواہ کسی بھائی نے زائد رقم دی ہو، اس لئے کہ انہوں نے والد یا بڑے بھائی کو جو رقم دی ہے وہ اپنے اختیار ومرضی سے بطور تبرع دی ہے، نہ کہ بطور قرض۔

تنخواہ میں دوسرے بھائی کا حق نہیں ہے:

تین بھائی ہیں، دو بھائی اپنی پوری تنخواہ مثلاً دس دس ہزار روپے گھر میں دیدیتے ہیں، اور ایک بھائی بیس ہزار روپے کماتا ہے، وہ بھی دس ہزار روپے گھر میں دیتا ہے، اور دس ہزار روپے الگ بچا کر اپنے پاس رکھتا ہے، تو وہ بچی ہوئی رقم اس کی ذاتی ملکیت ہے، اپنی محنت سے اس نے کمایا ہے، دوسرے بھائیوں کا اس میں کچھ بھی حصہ نہیں۔

وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیہ (کویت) کے تحت قائم ''قطاع الافتاء والبحوث الاسلامیہ'' میں ایک شخص نے استفتاء بھیجا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کی پندرہ سال سے کم عمر تھی، جب اس کے والد کا انتقال ہوگیا، تقریباً پندرہ سال کی عمر میں اس نے کویت جا کر کمایا اور پھر اپنی ذاتی کمائی سے ایک زمین خرید کر اس میں عمارت تعمیر کرائی جس کے تمام کاغذات وشواہد اس کے پاس ہیں، اس کے والد نے ورثہ میں ایک زمین وغیرہ چھوڑی تھی، اس نے بھائیوں سے جب میراث میں اپنا حصہ مانگا، تو بھائیوں نے کہا کہ تمہاری اس عمارت میں ہمارا بھی حصہ ہے، پہلے تم اس میں حصہ دو اس شخص نے پوری تفصیل ''قطاع الافتاء والبحوث الاسلامیہ'' میں بھیجی، استفتاء کا جواب مع ترجمہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

إجابة اللجنة:

''بأنه مادام المستفتي قد اشترى الأرض من ماله، وبنى عليها من ماله ولم يشاركه أحد فى أى عمل من أعمال العمارة، فتكون ملكاً خاصاً له، وليس من حق أخيه أن يشاركه فى أى قدر من الأرض ولا بناء'' (مجموعۃ الفتاوی الشرعیۃ ۴/ ۱۸۸)

مستفتی نے اپنے پیسے سے زمین خرید کر اپنے پیسہ سے اس پر عمارت تعمیر کرائی ہے، اور عمارت کے کسی بھی کام میں کسی نے حصہ نہیں لیا ہے، تو وہ اس کی خاص ملکیت ہے، اور اس کے بھائی کو حق نہیں ہے کہ زمین اور عمارت میں کچھ بھی حصہ دار بنے۔

کمانے والے افراد کی آمدنی میں گھر کا کام دیکھنے والوں کا حصہ نہیں ہے:

خاندان کے کچھ افراد کماتے ہیں اور کچھ گھر کا کام کاج دیکھتے ہیں، گھر کی نگرانی، ضروریات کا سامان لانا، مریض و بیمار افراد کی دواء وعلاج کا نظم کرنا اور وہ دیگر گھریلو ضروریات وچیزوں کا فوری انتظام کرتے ہیں، ان کا خود کا کوئی پیشہ، تجارت یا ملازمت وغیرہ کچھ نہیں ہے، سارا وقت اہل خاندان کی دیکھ ریکھ اور ان کے مطالبات کی تکمیل میں صرف ہوتا ہے، اس کے برعکس کچھ افراد خاندان تجارت وملازمت کے پیشہ سے منسلک ہیں، وہ اپنی آمدنی کا کچھ حصہ اہل خاندان کی ضروریات میں بھی خرچ کرتے ہیں، لیکن کچھ ان کی ذاتی ملکیت ہوتی ہے، تو ان کی یہ آمدنی ان کی ذاتی محنت سے حاصل شدہ مال ہے، اس میں ان افراد کا کچھ بھی حق نہیں جو گھر کا کام دیکھتے ہیں، اور اگر یہ کمانے والے افراد گھریلو ضروریات کے لئے بھی کچھ نہ دیں (علاوہ اپنے ماتحتوں کے نفقات کے) تب بھی ان کی یہ آمدنی ان کی ذاتی ملکیت ہوگی، کسی دوسرے کا اس میں کچھ بھی حصہ نہ ہوگا۔ البتہ بہتر ہوگا، کہ جو افراد صرف گھریلو کاموں میں مصروف رہتے ہیں ان کی اجرت طے کردی جائے، تاکہ ان کا نقصان نہ ہو، اور بعد میں کسی قسم کا نزاع نہ پیدا ہو، اور اگر کمانے والے افراد کا خود کا کوئی کاروبار نہیں ہے، بلکہ والد محترم کی دوکان ہے، جس میں یہ تجارت کرتے ہیں، تو ایسی صورت میں دوکان سے حاصل ہونے والی آمدنی سب بھائیوں کی مشترکہ ملکیت ہوگی، البتہ ضروری ہوگا کہ دوکان میں کام کرنے والے بھائیوں کی حیثیت متعین کردی جائے، کہ ان کی حیثیت ملازم کی ہے یا شریک کی، تاکہ بعد میں نزاع پیدا نہ ہو۔

والدین کی کفالت لڑکا ولڑکی دونوں پر ہے:

حقوق اللہ کے بعد حقوق العباد میں سب سے پہلے والدین کا حق ہے، والدین کے ساتھ حسن سلوک اچھا برتاؤ، (سورۃ الاحقاف ۲۶/۱۵)۔ ان کی اطاعت وتابعداری اور خدمت ونگہداشت کا حکم دیا گیا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

''وقضى ربك أن لا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحساناً'' (سورہ بنی اسرائیل ۱۵/۲۳)۔

(اور تمہارے رب نے فیصلہ کردیا ہے کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو)۔

والدین بوڑھے ہوں، معذور و بیمار ہوں تو ان کی خدمت ونگہداشت، علاج ومعالجہ کے اخراجات ودیگر ضروریات وحاجات کی ذمہ داری اولاد پر ہے، اور یہ ذمہ داری لڑکے ولڑکی دونوں پر واجب وضروری ہے۔

معروف فقیہ علامہ داماد آفندی رقمطراز ہیں:

''تجب على الموسر نفقة أبويه... الفقراء... بالسوية بين الإبن والبنت'' (مجمع الانہر ۱/۴۹۹)۔

بعض فقہاء کرام نے امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کی جانب منسوب یہ قول نقل کیا ہے کہ میراث میں استحقاق کے حساب سے لڑکا دو تہائی اور لڑکی ایک تہائی (والدین کے) اخراجات اداء کریں گے۔

علامہ ابن ہمام تحریر فرماتے ہیں:

''لا يشارك الولد في نفقة أبويه ... أحد ... في ظاهر الرواية، لأنه أقرب الناس إليهما ... فمن كانت أقرب فهو أولى بالإستحقاق له وعليه، وهي على الذكور والإناث بالسوية في ظاهر الرواية، وروى الحسن عن أبي حنيفة أن النفقة بين الذكر والأنثى أثلاثاً، للذكر مثل حظ الأنثيين على قياس الميراث'' (فتح القدير ۴/۴۱۸، دار الفکر، بیروت لبنان)۔

ظاہر الروایہ کے مطابق والدین کے نفقہ میں لڑکے کا کوئی دوسرا رشتہ دار شریک نہ ہوگا، کیونکہ تمام لوگوں میں وہ ان سب کے نزدیک قریب ہے..... تو جو سب سے زیادہ قریب ہے تو میراث میں اس کا استحقاق زیادہ ہے اور والدین کے اخراجات کی بابت) کا حق بھی اس پر زیادہ اور ظاہر الروایہ کے مطابق لڑکے ولڑکی

دونوں پر برابر برابر ہے، حسن بن زیادہ نے امام ابوحنیفہ سے نقل کیا ہے کہ میراث، میں مرد و لڑکیوں کے برابر لڑکے کا حصہ ہے اس پر قیاس کرتے ہوئے نفقہ میں بھی لڑکے پر دو تہائی اور لڑکی پر ایک تہائی ہوگا۔

البتہ مفتی بہ قول اور ظاہر الروایہ یہی ہے کہ لڑکے و لڑکی دونوں پر برابر برابر نفقہ واجب ہوگا۔

''ولا يفضل الذكر على الأنثى في النفقة لإستوائهما في سبب الوجوب، وهو الولاد'' (بدائع الصنائع ۴ر۳۲)۔

نفقہ کے سلسلہ میں لڑکے کو لڑکی پر برتری نہ ہوگی، یعنی لڑکی کے مقابلہ لڑکے پر زیادہ نہ ہوگا، کیونکہ سبب وجوب میں دونوں برابر ہیں۔

ساس کی خدمت اور بہو کی ذمہ داری

والدین کی خدمت لڑکے و لڑکی دونوں کی ذمہ داری ہے، لیکن لڑکی شادی کے بعد سسرال چلی جاتی ہے، اور میکے اور سسرال میں فاصلہ اور دوری ہے تو اس کے لئے والدین کی خدمت دشوار ہوتی ہے، لڑکے کے لئے اس طرح کی پریشانی نہیں ہوتی ہے، لیکن بعض خدمتیں ایسی ہوتی ہیں جسے صرف عورت ہی انجام دے سکتی ہے، تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لڑکا اس سے کس طرح عہدہ برآ ہو، اور کیا وہ اس خدمت کے لئے اپنی بیوی کو مامور کرسکتا ہے؟ یعنی بہو کی ذمہ داری اس سلسلہ میں کیا ہے؟۔ فقہاء کرام نے صراحت کی ہے کہ اگر باپ کو دوسری شادی کی ضرورت ہو تو بیٹے پر باپ کی منکوحہ کے اخراجات پورے کرنے کی ذمہ داری ہوگی، اس لئے کہ بیٹے کی ذمہ داری ہے کہ والد کی خدمت خود کرے یا کسی کو اجرت دے کر کرائے۔

علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں:

''ولا تجب على الإبن نفقة منكوحة أبيه؛ لأنها أجنبية عنه، إلا أن يكون الأب محتاجاً إلى من يخدمه، فحينئذ يجب عليه نفقة امرأته، لأنه يؤمر بخدمة الأب بنفسه أو بالأجير'' (بدائع الصنائع ۴-۳۲، دار الكتب العلمية، بيروت)۔

والد کی منکوحہ کے اخراجات بیٹے پر واجب نہیں ہیں، اس لئے کہ وہ اس کے لئے اجنبیہ ہے، البتہ والد کو خادم کی ضرورت ہو تو ایسی صورت میں بیٹے پر والد کی منکوحہ کے اخراجات لازم ہوں گے، اس لئے کہ اس کو حکم دیا گیا ہے..... والد کی خدمت کرنے کا وہ خود اس خدمت کو انجام دے یا اجیر کے ذریعہ انجام دے۔

نیز علامہ داماد آفندی نقل فرماتے ہیں:

''وفي الجوهرة: إن احتاج الأب إلى زوجة والإبن موسر وجب عليه أن يزوجه أو يشتري له جارية ويلزمه نفقتهما وكسوتهما'' (مجمع الأنهر ۱-۵۰۱، دار إحياء التراث العربي)

جوہرۃ میں ہے کہ اگر والد کو (خدمت کے لئے) بیوی کی ضرورت ہو اور بیٹا خوشحال ہے تو اس پر ضروری ہے کہ وہ والد کی شادی کرائے یا اس کے لئے باندی خریدے، اور ان دونوں کے اخراجات اور لباس وغیرہ اس کے ذمہ لازم ہوں گے۔

مذکورہ بالا جزئیات پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو اخلاقی طور پر ماں کی خدمت پر آمادہ کرے، اور بہو کی بھی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ ساس کی خدمت کرے۔

بعض امور ایسے ہیں جو عورت (بیوی) پر دیانۃً واجب ہیں، قضاءً واجب نہیں ہیں، جیسے عورت کھانا پکانا جانتی ہے اور کھانا پکانے میں اسے کوئی جسمانی پریشانی یا کسی قسم کی مجبوری نہیں ہے تو دیانۃً اس پر لازم ہے کہ شوہر کے لئے کھانا پکائے، قضاء واجب نہیں ہے، اور نہ ہی اس پر کھانا پکانے کے لئے جبر کیا جائے گا، عورت منع کردے تو شوہر دوسرا نظم کرے گا۔ اس سلسلہ میں علامہ فقیہ ابواللیث نے عمدہ بحث کی ہے۔

علامہ ابن ہمام مصری نقل فرماتے ہیں:

''قال الفقيه: هذا إذا كان بها علة، لا تقدر على الطبخ والخبز أو كانت ممن لا تباشر ذلك بنفسها، فإن كانت ممن تخدم بنفسها وتقدر على ذلك لا يجب عليه أن يأتيها بمن يفعله، وفي بعض المواضع تجبر على ذلك: قال السرخسي: لا تجبر، ولكن إذا لم تطبخ لم يعطيها الإدام وهو الصحيح، وقالوا: إن هذه

الأعمال واجبة عليها ديانة، ولا يجبرها القاضي'' (فتح القدير ۴/۳۸۸، دار الفکر، بيروت)۔

(فقیہ ابواللیث کہتے ہیں کہ (شوہر پر کھانا پکانے کے لئے دوسرے کا نظم کرنا) یہ اس صورت میں ہے جب کہ عورت کو کوئی ایسی مجبوری لاحق ہو کہ وہ کھانا اور روٹی نہ پکاسکتی ہو یا وہ ان خواتین میں سے ہو جو خود اس کام کو نہ انجام دیتی ہوں، اگر وہ ایسی خواتین سے تعلق رکھتی ہے جو اس خدمت کو خود بجالاتی ہیں اور وہ اس پر قادر بھی ہے تو شوہر پر اس کام کو کرنے کے لئے کسی دوسرے کا انتظام کرنا واجب نہیں ہے۔ اور بعض صورتوں میں تو اس پر اس کے لئے جبر کیا جائے گا، امام سرخسی کہتے ہیں اس پر جبر تو نہیں کیا جائے گا، البتہ اگر وہ کھانا نہ پکائے تو اسے سالن نہیں دیا جائے گا، اور یہی صحیح ہے، اور فقہاء کی رائے ہے کہ یہ اعمال اس پر دیانۃً واجب ہیں، قاضی اس کو مجبور نہیں کرے گا)۔

الغرض ساس کی خدمت کرنا بہو کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔

مشترکہ خاندان میں پردہ کے احکام:

مشترکہ خاندانی نظام شرعی مفاسد کی وجہ سے مستحسن وپسندیدہ نہیں ہے، پردہ جس کی اسلام میں نہایت تاکید آئی ہے، اس کی خلاف ورزی ہوتی ہے، قرآن کریم میں جابجا اس کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد خداوندی ہے:

''يأيها النبي قل لأزواجك وبناتك ونساء المؤمنين يدنين عليهن من جلابيبهن، ذلك أدنى أن يعرفن فلا يؤذين، وكان الله غفوراً رحيماً'' (سورۃ الأحزاب: ۵۹)

(اے نبی، اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلوں لٹکالیا کریں، یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے، تا کہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں، اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے)۔

لیکن کیا کیا جائے کہ آج زیادہ تر نظام معاشرت اجتماعی ہے، چچازاد بھائیوں کا بے تکلف گھر میں آنے جانے کی وجہ سے بے پردگی ہوتی ہے۔ دوسری طرف عورتوں کا گھر کے اندر مکمل پردہ کے ساتھ رہنا اور پردہ میں ہی خانگی امور انجام دینا مشقت وپریشانی کا باعث ہے، اسی تنگی وحرج دقت وپریشانی کے سبب شریعت نے محرم رشتہ داروں کے لئے عورت کے سر، گردن، چہرہ، کان، بازو، پنڈلی وغیرہ پر پڑنے والی نگاہ کو ناجائز وممنوع قرار نہیں دیا ہے۔

علامہ داماد آفندی نقل فرماتے ہیں:

''فحل النظر للمحارم إلى تلك الأعضاء؛ لأن المرأة تكون في بيتها في ثياب مهنتها عادةً ولا تكون مستترةً، ويدخل عليهن بعض المحارم من غير استيذان، فلو حرم النظر إلى هذه المواضع يودى إلى الحرج، وكذا الرغبة نقل للحرمة المؤبدة فقلما تشتهي'' (مجمع الانہر ۲-۵۹۲)

لیکن غیر محرم کے لئے ان اعضاء کو دیکھنے کی اجازت نہیں ہے، لڑکیاں گھر سے الگ جداگانہ زندگی تو گزار نہیں سکتی ہیں، اور نہ ہی "المشقة تجلب التيسير" اور "إذا ضاق الأمر اتسع" جیسے قواعد کا سہارا لے کر عورتوں کو کھلی چھوٹ دی جاسکتی ہے کہ وہ جیسے چاہیں گھر کے اندر رہیں، اور غیر محرم مردوں کو بھی اس کی قطعاً اجازت نہیں کہ بلا اجازت گھر میں جب چاہیں داخل ہوتے رہیں، تو ایسی صورت حال میں دونوں کو چاہئے کہ غایت درجہ احتیاط کریں اس کے بعد اگر کچھ بے حجابی ہوجاتی ہے تو اللہ کی ذات سے امید قوی ہے کہ مواخذہ وگرفت نہ ہوگی، نیز درج ذیل امور کو ملحوظ رکھا جائے۔

۱۔ مرد خصوصاً غیر محرم بلا اجازت واطلاع اندر داخل نہ ہوں، داخل ہونے سے پہلے کنڈی کھٹکھٹالیں، یا بیل بجائیں، تا کہ عورتیں پردہ کا اہتمام کرلیں۔

۲۔ عورتوں جہاں تک ممکن ہو پردہ کا اہتمام کریں، اس کے بعد پھر بھی بے حجابی ہوجاتی ہے تو انشاء اللہ قابل مواخذہ نہ ہوگا۔

۳۔ کوشش کی جائے کہ جداگانہ نظام معاشرت قائم ہو، اور تمام لوگ اصحاب ضرورت، معذورین، بیوہ ویتیم، بے سہارا، اور ضعیف وسن رسیدہ افراد رشتہ دار وغیرہ رشتہ دار لوگوں کے اسلام نے جو حقوق بیان کئے ہیں، ان کو ادا کریں۔

خلاصہ کلام: پردہ کا حکم منصوص ہے، اس میں رعایت نہیں دی جاسکتی ہے، اور نہ ہی پردہ کے حکم میں تبدیلی ممکن ہے، ورنہ بہت سے مفاسد جنم لیں گے، اور معاشرہ میں انارکی وبے راہ روی کو راہ ملے گی۔

☆☆☆

چند اہم معاشرتی مسائل کا شرعی حل

مولانا عقیل الرحمن قاسمی [1]

۱۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے جس طرح عبادات، اخلاق، معاملات اور عقاید کے میدان میں انسانوں کی صحیح اور مکمل رہنمائی کی ہے ٹھیک اسی طرح معاشرت کا بھی عمدہ اور بہترین طریقہ پیش کیا ہے، جس کے مطابق زندگی گزارنے سے قلب کو اطمینان اور روح کو سکون حاصل ہوتا ہے۔

معاشرتی نظام دو طرح کے ہیں (۱) مشترکہ خاندانی نظام (۲) جداگانہ اور انفرادی زندگی گزارنے کا طریقہ۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دونوں اختیار دیا ہے۔ البتہ دیکھنا یہ ہے کہ بہتر اور عمدہ کون سا نظام زندگی ہے۔ چنانچہ ایک ساتھ زندگی بسر کرنے سے اپنے عزیز واقارب کے ہر سکھ دکھ میں شریک رہنا آسان ہوتا ہے، ہر ایک کے حقوق کی ادائیگی بسہولت ہوجاتی ہے، بڑوں کی تعظیم اور چھوٹوں پر شفقت کے مواقع زیادہ میسر ہوتے ہیں، آپسی اخوت، محبت اور الفت میں اضافہ ہوتا ہے اور ایک ساتھ زندگی گزارنے سے جو مشکلات اور پریشانیاں پیش آتی ہیں ان پر صبر کرکے عنداللہ خیر مسلم کہلانے کا حق حاصل ہوتا ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "عن ابن عمر رضی اللہ عنہ المسلم إذا كان يخالط الناس ويصبر على أذاهم خير من المسلم الذي لا يخالط الناس ولا يصبر على أذاهم" (ترمذی باب صفۃ القیامۃ حدیث ۲۵۰۷) (جو مسلمان لوگوں کے ساتھ اختلاط رکھتا ہے اور ان کی جانب سے پہنچنے والی تکلیف پر صبر کرتا ہے وہ اس مسلمان سے بہتر ہے جس کا نہ تو لوگوں سے اختلاط رہتا ہے اور نہ ہی ان کی طرف سے پہنچنے والی تکلیف پر صبر کرتا ہے)۔

مزید یہ کہ شریعت کا مزاج بھی یہی ہے کہ وہ ہر کام میں انفرادیت کے مقابلہ میں اجتماعیت کو ترجیح دیتی ہے، چنانچہ تنہا نماز ادا کرنے سے جو ثواب ملتا ہے جماعت کے ساتھ وہی نماز پڑھنے سے ۲۷ گنا زیادہ ثواب ملتا ہے "عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ قال صلاة الجماعة أفضل من صلاة الفذ بسبع وعشرين درجة" (مسلم ۱/ ۲۳۴ مکتبہ بلال دیوبند)

(تنہا نماز پڑھنے کے مقابلہ میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا ۲۷ گنا زیادہ فضیلت رکھتا ہے)۔ ہفتہ کی عید، یعنی نماز جمعہ اور سالانہ عیدین، یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے لئے بڑی مسجد یا عیدگاہ کا افضل ہونا بھی اجتماعیت کے محبوب ہونے کی علامت ہے، اسی طرح فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے دنیا کے تمام مسلمانوں کا ایک تاریخ اور ایک جگہ جمع ہونا بھی عنداللہ اجتماعیت کے پسندیدہ ہونے کی واضح دلیل ہے۔

مگر ان تمام خوبیوں اور اچھائیوں کے باوجود اس طریقہ معاشرت سے کچھ ایسی دشواریاں اور پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں کہ بظاہر جن کا کوئی حل نہیں اور جن سے بچنے کی کوئی سبیل نہیں۔ مثلاً جب سارے افراد خانہ ایک ساتھ زندگی گزارتے ہیں اور کثرت سے اختلاط ہوتا ہے تو مزاج کے ہم آہنگ نہ ہونے کی وجہ سے آپس میں اختلافات ہونے لگتے ہیں۔ گھریلو جھگڑوں کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، محبت نفرت میں اور نزدیکی دوری میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ ماں، باپ اور بھائی، بہن پر مشتمل مختصر کنبہ بہت ممکن ہے کہ اس نحوست سے محفوظ رہ جائے لیکن جب بھائیوں کی شادی ہوجاتی ہے اور مختلف جگہوں سے مختلف الخیال والمزاج عورتوں کا گھر میں ورود ہوتا ہے تو عموماً اس لاعلاج مرض سے بچنا مشکل ہوجاتا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپسی اختلافات کی بڑی مذمت فرمائی ہے۔ فرمان نبوی ہے: "ألا أخبركم بأفضل من درجة الصيام والصلاة والصدقة؛ قالوا: بلى يا رسول الله! قال: إصلاح ذات البين وفساد ذات البين الحالقة" (ابوداؤد ۶۷۳ مکتبہ بلال دیوبند کتاب الادب باب فی اصلاح ذات البین) (صلح ومصالحت کے ساتھ زندگی بسر کرنا روزہ نماز اور صدقہ سے زیادہ بہتر ہے۔ اس کے مقابلہ میں آپسی جھگڑے اور نفرتیں مونڈنے والے ہیں)۔

علاوہ ازیں عموماً آج کل مکانات چھوٹے اور تنگ ہوا کرتے ہیں، مشترک خاندان میں عموماً چچازاد بھائی بہن اور دیور بھابھی یا اس طرح کے دوسرے قریبی رشتہ داروں کا ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہوتا ہے، جس کی بنا پر خصوصاً عورتوں کے لیے پردہ کا اہتمام کرنا نہایت ہی مشکل ہوجاتا ہے۔ اپنے مشکلات کو

---

[1] جامعہ اسلامیہ جالیہ، ہلوجائی، نوگاؤں، آسام۔

دور کرنے کے لیے عورت اگر علیحدہ مکان کا مطالبہ کرے تو شوہر پر اس کا انتظام کرنا واجب ہے "فإن کان للرجل والدة أو أخت أو ولد من غیرها فی منزلها، فقالت: صیرنی فی منزل علی حدة کان لها ذلك" (فتاوی قاضی خاں علی ہامش العالمگیریۃ کتاب النکاح باب النفقۃ ۱/۴۲۸، مکتبہ رشیدیہ وکذا فی الہدایہ ۲/۴۴۱)

مزید برآں مشترکہ خاندانی نظام کو کسی نہ کسی مرحلہ میں پہنچ کر انفرادیت کا شکار ہونا ہے، ورنہ تو سارے انسان ایک ہی مشترک خاندان کے افراد ہوں گے جس کا نظام سنبھالنا کسی فرد بشر کے بس کی بات نہیں۔

اسی طرح جب خاندان مشترک ہوتا ہے تو عموماً ہر ایک کی ملکیت کو ممتاز نہیں کیا جاتا ہے، جس کی بنا پر والدین یا کسی ایک کی وفات کے بعد تقسیم میراث میں وارثوں کے درمیان ختم نہ ہونے والا اختلاف اور جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ آپس میں بات چیت بند اور ایک دوسرے کی صورت دیکھنا گوارہ نہیں، جو کہ شرعاً حرام ہے، ارشاد نبوی ہے: "لا یحل للرجل أن یهجر أخاه فوق ثلث لیال یلتقیان فیعرض هذا ویعرض هذا" (متفق علیہ بحوالہ مشکاۃ ۲/۴۲۷)

خلاصہ یہ کہ عموماً مشترکہ نظام زندگی دشواریوں اور پریشانیوں کا باعث ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ خواہ مخواہ کسی کو تنگی اور دشواری میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا ہے: "یرید الله بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" (سورہ بقرہ: ۱۸۵)۔

اس تفصیل کو پیش کرنے کے بعد بندہ کی رائے یہ ہے کہ موجودہ ماحول میں جداگانہ زندگی بسر کرنا ہی بہتر ہے، البتہ ہر شخص پر ضروری ہے کہ الگ رہ کر بھی سبھی حق داروں کے جملہ حقوق کو صحیح طور پر ادا کرے، ورنہ عند اللہ جواب دینا ہوگا۔

۲۔ خاندان کے مشترک ہونے کے مفہوم کم از کم دو ہیں۔ (الف) باپ بیٹے سب ایک ساتھ مل کر زندگی بسر کرتے ہوں، کھانا پینا بھی ایک ہی ساتھ ہوتا ہو اور کاروبار میں بھی سب مشترک ہوں، اس صورت میں ساری کمائی باپ کی شمار ہوگی اور وہ گھر کے تمام افراد پر یکساں خرچ کرنے کے ذمہ دار ہوں گے "الأب وابنه یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما شئ فالکسب کله للأب إن کان الابن فی عیاله لکونه معینا له"۔ (شامی ۳/۴۸۳ فصل فی الشرکۃ الفاسدۃ مکتبہ زکریا دیوبند، دار الکتاب ۶/۳۹۲ وکذا فی العالمگیریۃ ۲/۳۲۹ کتاب الشرکۃ دار الکتاب دیوبند)

(ب) بود وباش اور رہائش، نیز کھانا پینا تو ایک ساتھ ہو، لیکن کاروبار سب کا جدا ہو اور گھر کا خرچ سب مل کر برداشت کرتے ہوں۔ اس صورت میں ہر کوئی صرف اپنے اہل وعیال اور معذور والدین کے نفقہ کا ذمہ دار ہوگا "وعلی المولود له رزقهن وکسوتهن بالمعروف" (سورہ بقرہ: ۲۳۳) رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا: "ولهن علیکم رزقهن وکسوتهن بالمعروف" (تمہارے اوپر بیویوں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق لازم ہے) (مسلم باب حجۃ الوداع) اسی مسئلہ کو صاحب ہدایہ یوں بیان فرماتے ہیں: "النفقة واجبة للزوجة علی زوجها مسلمة کانت أو کافرة" بیوی چاہے مسلمان ہو یا کافر شوہر پر اس کا نفقہ لازم ہے۔ (ہدایہ ۲/۴۴۱ مکتبہ بلال دیوبند) ایسے ہی اولاد کے نفقہ کے متعلق صاحب ہدایہ رقم طراز ہیں: "ونفقة الأولاد الصغار علی الأب لا یشارکه فیها أحد کما لا یشارکه فی نفقة الزوجة"۔ (ہدایہ ۲/۴۴۷، مکتبہ بلال دیوبند)

لہٰذا صرف اپنے اہل وعیال کی تعداد کے حساب سے ہر شخص پر اخراجات عائد ہوں گے۔ اس کے علاوہ مشترکہ نظام زندگی کا استحکام بھی اسی میں ہے کہ معاشرت برادرانہ ہو لیکن معاملات اجنبی جیسا ہو: "تعاشروا کالاخوان تعاملوا کالاجانب" اور اگر ہر شخص پر برابر اخراجات عائد کئے جائیں تو جس کی فیملی مختصر ہے وہ اپنے اوپر خرچ کا بار محسوس کرے گا اور پھر بہت جلد بنیان مرصوص جیسا خاندان تاش کے پتوں کی مانند بکھر جائے گا۔

۳۔ اگر مشترکہ نظام زندگی کی صورت میں سب بھائیوں نے مل کر اپنے والد یا کسی بھائی کے پاس آمدنی جمع کی ہوں اور پھر اس سے کوئی چیز خریدی گئی تو اس میں سب کا حصہ برابر ہوگا۔ جیسا کہ ابن عابدین فرماتے ہیں: "یوخذ من هذا ما أفتی به فی الخیریة فی زوج امرأة وابنها اجتمعا فی دار واحدة وأخذ کل منهما یکسبان علی حدة ویجمعان کسبهما، ولا یعلم التفاوت ولا التساوی والتمییز، فأجاب بأنه بینهما سویة ... وکذا لو اجتمع اخوة یعملون فی ترکة أبیهم ونمی المال فهو بینهم سویة، ولو اختلفوا فی العمل والرأی"۔ (رد المحتار ۳/۳۶۰)

۴۔ اسلام کا اصول یہ ہے کہ "للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن" (النساء: ۳۲) (مردوں کی کمائی ان کا حق ہے اور عورتیں اپنی کمائی کی حق دار ہیں)، لہٰذا تین بھائی مثلاً ایک ساتھ رہتے ہوں اور سب کی آمدنی کے ذرائع مختلف ہوں، مقدار آمدنی میں خواہ تفاوت ہو یا نہ ہو ہر کوئی اپنی مکمل آمدنی کا مالک ہوگا۔

اب اگر سب بھائیوں نے مل کر اتفاق کیا ہو کہ ہم سب اپنی کمائی کا مکمل حصہ خانگی ودیگر ضروریات کے لیے ایک جگہ جمع کریں گے تو سب پر اپنی تنخواہ یا انکم کا پورا حصہ جمع کرنا لازم ہوگا۔ اور اگر رقم کی کوئی خاص مقدار جمع کرنے پر معاہدہ نہ ہوا ہو تو صرف اپنے اہل وعیال کی تعداد کے صرفہ کے مطابق آمدنی جمع کرنا لازم ہوگا، مزید جو بچ جائے اس پر خالص اسی کی ملکیت ہوگی، دوسرے کا اس میں کوئی حق نہیں ہوگا۔

اگر کسی نے گھر کے دوسرے افراد کے تعاون سے اپنا ذریعہ معاش اختیار کیا ہو۔ تعاون خواہ مالی ہو یا اخلاقی صراحۃ ہو یا دلالۃ۔ پھر اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کی تقسیم عمل میں نہ آئی ہو، تو اس کی کمائی گھر کے سارے افراد کے درمیان مشترک سمجھی جائے گی، تنہا اس کی ملکیت نہیں ہوگی۔ اور تمام افراد خانہ گھر کی معاشی وکاروباری ترقی میں ایک دوسرے کے معاون شمار ہوں گے۔ اور اگر کمانے والے نے اپنا ذریعہ معاش از خود اختیار کیا ہو، گھر کے کسی فرد کی جانب سے کسی طرح کا کوئی مالی یا اخلاقی تعاون نہ ملا ہو اور آمدنی کے متعلق بھائیوں کے مابین کوئی معاہدہ نہ ہوا ہو تو پھر مکمل آمدنی اسی کی ہوگی۔ گھر کے تمام افراد کا کھانا پینا ایک ساتھ ہونے کے باوجود وہ مشترک نہ سمجھی جائے گی۔ البتہ کمانے والے حضرات کو چاہئے کہ گھر کے کام کاج دیکھنے والے افراد کو بطور تبرع واحسان اپنی کمائی کا ایک مخصوص حصہ دے دیا کرے "إن الله يحب المحسنين" (سورہ بقرہ: ۱۹۵)، اس مسئلہ کو صاحب ''درر الحکام'' نے ۴۴۵/۳ پر اس طرح بیان کیا ہے: "فإذا كان الأب مزارعا والابن صانع أحذية، فكسب الأب من الزراعة والابن من صناعة الحذاء فكسب كل واحد منهما لنفسه وليس للأب المداخلة في كسب ابنه لكونه في عياله" (باپ کاشت کار ہو اور لڑکا جوتا بنانے کا کام کرتا ہو تو ہر ایک کی کمائی پر خالص اس کا حق ہوگا، محض اس وجہ سے کہ بیٹا باپ کے زیر پرورش ہے باپ کو بیٹے کی کمائی میں مداخلت کا حق نہیں ہوگا)، بے شمار اور ان گنت احسانات کے باوجود باپ کا جب یہ حال ہے تو ایک بھائی کو دوسرے بھائی کی کمائی میں کیسے شریک سمجھا جاسکتا ہے۔

۶۔ والدین کی خدمت واطاعت والدین ہونے کی حیثیت سے کسی زمانہ اور کسی عمر کے ساتھ مقید نہیں ہر حال اور ہر عمر میں ان کے ساتھ اچھا سلوک واجب ہے، خاص طور پر والدین کے بڑھاپے کا زمانہ، جبکہ وہ اولاد کی خدمت کے محتاج ہو جائیں، ان کی زندگی اولاد کے رحم وکرم پر رہ جائے اس وقت اگر اولاد کی طرف سے ذرا سی بھی بے رخی محسوس ہو تو وہ ان کے دل کا زخم بن جاتی ہے۔ ان ہی امور کی جانب قرآن کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے: "وقضى ربك أن لا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحساناً إما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما وقل لهما قولا كريما واخفض لهما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحمهما كما ربياني صغيرا"۔ (سورہ اسراء: ۲۳-۲۴)

(اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کرو، اگر تیرے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اف نہ کہو اور نہ ہی جھڑکو اور ان سے نرم بات کرو، اور ان کے سامنے عاجزی کے کندھے نیاز مندی کے ساتھ جھکا دو اور دعا کرو اے رب ان پر اسی طرح رحم فرما جس طرح انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی)۔

جہاں تک مسئلہ ہے والدین کی کفالت اور نفقہ کا تو معلوم ہونا چاہئے کہ فقہاء کے یہاں وجوب نفقہ کے تین اسباب ہیں (الف) زوجیت (ب) قرابت (ج) ملک۔ یعنی رشتہ زوجیت کی وجہ سے بیوی کا نفقہ شوہر پر، ملکیت کی بنا پر غلام کا نفقہ آقا پر اور قرابت ورشتہ داری کی بنیاد پر اولاد کا نفقہ والدین پر اور والدین کا نفقہ اولاد پر واجب ہے۔ والدین کا نفقہ اولاد پر کب لازم ہوتا ہے، صاحب ''ہدایہ'' فرماتے ہیں: "وعلى الرجل أن ينفق على أبويه وأجداده وجداته إذا كانوا فقراء، وإن خالفوه في دينه" (ہدایہ ۴۸۸/۲، مکتبہ بلال دیوبند) (جب والدین اور دادا دادی محتاج ہوں تو دین کے اختلاف کے باوجود ان کا نفقہ انسان پر واجب ہوتا ہے)۔ اسی طرح یہ عبارت بھی ملاحظہ ہو: "ويجبر الولد على نفقة الأبوين المعسرين مسلمين كانا أو ذميين قدرا على الكسب أو لم يقدرا" (عالمگیری ۱/۵۶۴ دار الکتاب دیوبند)

لہٰذا والدین اگر محتاج ہوں یا کسب سے معذور ہوں تو اولاد پر ان کا نفقہ واجب ہے اگر نرینہ اولاد نہ ہوں تو وہ اسے برداشت کریں اور اگر صرف لڑکیاں ہوں یا لڑکے تو ہوں، لیکن نکمے ہوں تو اس صورت میں اپنی وسعت کے بقدر لڑکیاں والدین کی جملہ نگہداشت کریں گی۔

اب ایک پہلو رہ جاتا ہے کہ اس سلسلہ میں بہو کی کیا ذمہ داری ہے تو واضح ہو کہ شریعت میں احکام کے دو درجے ہیں اخلاقی واحسانی اور فقہی وقانونی، یعنی کچھ چیزیں دیانۃً انسان پر واجب ہیں ان کی تعمیل ضروری ہے اور تعمیل نہ کرنا موجب گناہ ہے۔ لیکن قانوناً اس پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، جیسے ایک طرفہ وعدہ کو پورا کرنا۔ اور بہت سے احکام وہ ہیں جن کی تعمیل قانوناً واجب ہے، اگر وہ اس پر عمل نہ کرے تو گنہ گار بھی ہوگا اور قانوناً بھی اس کام پر مجبور کیا جائے گا۔

شوہر کے والدین کی خدمت عورت پر اس وقت دیانۃً واجب ہوگی جب کوئی اور خدمت کرنے والا...... میسر نہ ہو، اور اگر کوئی دوسرا خدمت کرنے والا ہو تب بھی عورت کو چاہئے کہ اپنے ساس سسر کی خدمت سے دامن نہ کھینچے کہ یہ اس کا اپنے شوہر کے ساتھ تعاون ہے کیونکہ اصل میں والدین کی خدمت اس کے شوہر پر واجب ہے اور شوہر اپنی بیوی بچوں کی ضروریات کے لیے مشغول ہے تو اخلاق و دیانت کا تقاضہ ہے کہ وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں اپنے شوہر کی مدد کرے "تعاونوا علی البر والتقوی"۔ (سورہ مائدہ: ۲)

۷۔ حجاب اور پردہ کے احکام قطعی ہیں شریعت نے اس کے مسائل کو بڑی تفصیل سے بیان کر دیا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں پردہ نسواں سے متعلق سات آیتیں نازل ہوئی ہیں چار سورہ احزاب میں اور تین سورہ نور میں۔ اسی طرح ستر سے زیادہ احادیث رسول میں قولاً و عملاً پردہ کے احکام بتلائے گئے ہیں۔ لہٰذا بغیر کسی شرعی عذر کے غیر محرم سے پردہ نہ کرنے یا اس میں تساہل برتنے کی ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی۔ جہاں تک مکانات کے تنگ یا چھوٹے ہونے کی بات ہے تو شریعت نے کسی کو اس بات کا پابند نہیں بنایا ہے کہ پورا خاندان ایک ساتھ ایک گھر میں اقامت پذیر رہے۔ بلکہ ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے اگر حجاب میں رکاوٹ پیش آرہی ہو تو شوہر پر ضروری ہے کہ وہ اپنی بیوی کے لیے ایسی جگہ رہائش کا انتظام کرے جہاں وہ مکمل پردہ کا اہتمام کر سکے۔ ایسے ہی بیوی اگر اس طرح کی دشواریوں سے نجات پانے کے لیے الگ مکان کا مطالبہ کرے تو شریعت نے اسے یہ حق دیا ہے: "فإن کان للرجل والدۃ أو أخت أو ولد من غیرھا فی منزلھا. فقالت: صیرنی فی منزل علی حدۃ کان لھا ذلک"، اگر شوہر کی ماں، بہن اور دوسری بیوی کی اولاد اور موجود بیوی ایک مکان میں ہو اور بیوی کہے کہ الگ مکان کا میرے لئے انتظام کرو تو یہ اس کا حق ہے۔ (فتاوی قاضی خاں علی ہامش العالمگیریۃ ۱/ ۴۲۸، مکتبہ رشیدیہ)

اس مسئلہ میں قریب اور دور کے رشتہ دار میں ہرگز فرق نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ احادیث رسول کی روشنی میں تو قریبی رشتہ داروں سے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے "عن عقبۃ بن عامر أن رسول اللہ ﷺ قال: إیاکم والدخول علی النساء. فقال رجل من الأنصار: یا رسول اللہ أفرأیت الحمو قال: الحمو الموت" (عقبہ بن عامر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورتوں کے پاس جانے سے پرہیز کرو۔ ایک انصاری مرد نے کہا کہ یا رسول اللہ آپ دیور کے بارے میں فرمائیں آپ نے جواب دیا دیور تو موت ہے) (بخاری ۲/ ۷۸۷، "باب لا یخلون رجل بامرأۃ إلا ذو محرم"۔ ترمذی ۱/ ۱۳۹، مکتبہ رشیدیہ، دہلی)

لفظ "الحمو" کی تحقیق کے متعلق صاحب "فتح الباری" فرماتے ہیں: "اتفق أھل العلم باللغۃ علی أن الأحماء أقارب زوج امرأۃ کأبیہ وأخیہ وابن أخیہ وابن عمہ ونحوھم" (فتح الباری ۲/ ۲۸۹، مکتبہ یوسفی، دیوبند)۔ علماء لغت اس پر متفق ہیں کہ حمو کا اطلاق شوہر کے قریبی رشتہ دار مثلاً اس کے والد، بھائی، بھتیجا اور چچازاد بھائی وغیرہ پر ہوتا ہے۔

صاحب مرقات نے "حمو" کو موت قرار دینے کی وجہ یوں تحریر کی ہے: "لأن الخوف من الأقارب أکثر والفتنۃ منھم أوقع لتمکنھم من الوصول إلیھا والخلوۃ بھا من غیر نکیر علیھم وعادۃ الناس المساھلۃ فیہ" (قریبی رشتہ داروں سے خوف اور فتنہ کے وقوع کا امکان زیادہ رہتا ہے، اس لئے کہ وہ بآسانی عورت کے پاس پہنچ سکتے ہیں۔ تنہائی کے مواقع بھی زیادہ ہوتے ہیں اس پر نکیر بھی نہیں کیا جاتا، بلکہ عموماً لوگ اس حوالہ سے تساہل پسندی کے شکار ہیں) (مرقات شرح مشکاۃ ۳/ ۴۰۹، باب النظر إلی المخطوبۃ)۔

ان تفصیلات کی روشنی میں بندہ کی رائے اس مسئلہ میں یہ ہے کہ قریبی رشتہ دار جب کہ غیر محرم ہو، مثلاً دیور، جیٹھ، نندوئی، بہنوئی، خالہ زاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد اور چچازاد سب سے پردہ لازم ہے۔ اگر مکان تنگ ہو اگر مکان تنگ ہو تو اتنا کافی ہے کہ چہرہ نہ کھولا جائے۔ گھونگھٹ کر لیا جائے۔ بے تکلفی، ہنسی اور مذاق سے مکمل پرہیز کیا جائے اور ایک جگہ تنہائی نہ ہونے پائے۔

واضح ہو کہ فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم دار العلوم دیوبند کی بھی یہی رائے تھی۔ (فتاوی محمودیہ ۲۸/ ۱۰۶، زکریا بک ڈپو دیوبند)

☆☆☆

مشترکہ خاندانی نظام میں رہائشی اصول وآداب

مولانا محمد یاسر قاسمی[1]

خاندانی نظام:

دنیا میں خاندانی زندگی گذارنے کے دوطریقے رائج ہیں، ایک طریقہ یہ ہے کہ ایک مختصر خاندان کے تمام افراد، جیسے اس کے والدین، بیوی، بچے اور بھائی، بہن ایک ساتھ رہیں، جب کہ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انسان صرف اپنے بال بچوں کے ساتھ رہے، پہلے طریقہ سے مراد مشترکہ خاندانی نظام ہے، جبکہ دوسرے طریقہ سے مراد جداگانہ خاندانی نظام ہے۔

زیر نظر مقالہ میں شریعت اسلامیہ کی ہدایات اور فقہ اسلامی کی تصریحات کی روشنی میں یہ تحقیق کی گئی ہے کہ شریعت کی نظر میں مشترکہ خاندانی نظام بہتر ہے یا جداگانہ نظام۔

حقوق زوجین کے اقسام:

کسی بھی نظام کی بقاء اور دوام کے لئے کچھ اصول وضوابط کا سہارا لیا جاتا ہے، شریعت اسلامیہ نے بھی عقد زواج کو استوار بنانے اور مستحکم کرنے کے لئے زوجین کو کچھ حقوق دے رکھا ہے، ان حقوق کی تین قسمیں ہیں: (۱) دونوں کے مابین مشترکہ حقوق، (۲) حقوق زوجہ، (۳) حقوق زوج۔

بیوی کا رہائشی حق:

حقوق زوجہ میں ایک اہم حق حق سکنی بھی ہے، یعنی بیوی کا رہائشی حق، چنانچہ اللہ تعالی نے بیوی کے لئے رہائش کے انتظام کو واجب قرار دیا ہے، ارشاد ہے: "اسکنوھن من حیث سکنتم من وجدکم" (الطلاق:۶) (تم ان عورتوں کو اپنی وسعت کے مطابق رہنے کا مکان دو جہاں تم رہتے ہو)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: "عاشروھن بالمعروف" (النساء:۱۹) (عورتوں کے ساتھ خوبی کے ساتھ گذران کرو)۔

احادیث طیبہ میں بھی عورتوں کے ساتھ خیرخواہی اور ان کے حقوق کی ادائیگی پر زور دیا گیا ہے، چنانچہ حکیم بن معاویہ قشیری اپنے والد حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر بیوی کا کیا حق واجب ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم کھاؤ تو اس کو کھلاؤ جب تم لباس زیب تن کرو تو اس کو بھی پہناؤ، اس کے چہرہ پر مت مارو، اس کو برا بھلا نہ کہو، اور اسے علیحدہ نہ کرو، مگر گھر ہی میں'' (ابوداؤد:۲۹۱)، یہ حدیث بیوی کے روٹی، کپڑے اور مکان کا انتظام کرنے کے بارے میں صریح ہے۔

بیوی کے سکنی کے بارے میں فقہاء کی تصریحات:

''موسوعہ'' میں ہے: بیوی کی رہائش کا انتظام شوہر کے ذمہ واجب ہے، یہ حکم فقہاء کے مابین متفق علیہ ہے، اس لئے کہ اللہ تعالی نے مطلقہ رجعیہ کے لئے اس کے شوہر پر اس کی رہائش کو واجب قرار دیا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ''تم ان عورتوں کو اپنی وسعت کے مطابق رہنے کا مکان دو جہاں تم رہتے ہو'' (الطلاق:۶) تو اصل نکاح میں سکنی بدرجۂ اولی واجب ہوگا، نیز اس لئے کہ اللہ تعالی نے معروف طریقہ پر بیوی کے ساتھ معاشرت کو واجب کیا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: تم ان کے ساتھ معروف طریقہ پر گذران کرو (نساء:۱۹)۔

معروف طریقہ جس کا حکم شوہر کو دیا گیا ہے اس میں یہ بھی داخل ہے کہ بیوی کو ایسے مکان میں رہائش دے جہاں وہ اپنے شوہر کے ساتھ تمتع کرسکے

---

[1] مدرسہ بیت العلوم سرائے میر، اعظم گڈھ یوپی۔

اور ساز وسامان کی حفاظت کے لئے بھی وہ سکنی سے بے نیاز نہیں ہے، اس لئے باجماع علماء بیوی کی رہائش کا انتظام کرنا شوہر کے ذمہ واجب ہے۔

''السکنی للزوجة علی زوجها واجبة، وهذا الحکم متفق علیه بین الفقهاء، لأن الله تعالی جعل للمطلقة الرجعیة السکنی علی زوجها، قال تعالی: ''اسکنوهن من حیث سکنتم من وجدکم'' فوجوب السکنی التی هی فی صلب النکاح أولی، ولأن الله تعالی أوجب المعاشرة بین الأزواج بالمعروف، قال تعالی: ''وعاشروهن بالمعروف''، من المعروف المأمور به أن یسکنها فی سکن تأمن فیه علی نفسها ومالها، کما أن الزوجة لا تستغنی عن المسکن للاستتار عن العیون، والاستمتاع وحفظ المتاع، فلذلك کانت السکنی حقا لها علی زوجها، وهو حق ثابت بإجماع أهل العلم''۔ (الموسوعة الفقهیه۲۵-۱۰۸، المحیط البرهانی ۴-۲۱۸، الفقه الاسلامی وادلته۷-۸۰۳)

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالی نے معروف طریقہ پر بیوی کے ساتھ معاشرت کو واجب قرار دیا ہے، معروف طریقہ سے کیا مراد ہے؟

اس کا جواب امام ابوبکر جصاص رازیؒ دیتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:

معروف سے مراد یہ ہے کہ شوہر بیوی کو پورا حق دیدے، جیسے مہر، نفقہ اور باری، نیز سخت کلامی، بیوی سے اعراض اور دوسری کی طرف مکمل جھکاؤ کے ذریعہ اس کو اذیت نہ دے اور بلا کسی جرم کے اس کے سامنے ترش روئی اختیار نہ کرے، غرض یہ کہ ایسی تمام باتوں سے گریز کرے جو بیوی کو بلاوجہ اذیت دیں۔

''ومن المعروف أن یوفیها حقها من المهر والنفقة والقسم وترك أذاها بالکلام الغلیظ والإعراض عنها، والمیل إلی غیرها وترك العبوس والقطوب فی وجهها بغیر ذنب، وما جری مجری ذلك''(احکام القرآن للجصاص ۲-۱۳۸)

عورتوں کی فطرت میں اللہ تعالی نے ماتحتی قبول کرنے اور تابع بن کر زندگی بسر کرنے کی صلاحیت ودیعت کی ہے، مگر بایں ہمہ ان کی طبیعت میں ٹیڑھا پن بھی ہے، روٹھ جائیں تو منانا مشکل ہے، اس لئے بہت سنبھل کر بیوی کے ساتھ معاشرت اختیار کرنے کا احادیث میں بھی حکم آتا ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عورتوں کے بارے میں خیرخواہی کی نصیحت قبول کرو (یعنی ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو) اس لئے کہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں اور پسلی میں بھی سب سے ٹیڑھا اوپر کا حصہ ہوتا ہے، اگر تم اسے سیدھا کرنا چاہوگے تو توڑ دوگے، اور اسی حالت پر چھوڑ دوگے تو ہمیشہ ٹیڑھی رہے گی، لہذا عورتوں کے بارے میں بھلائی کی نصیحت قبول کرو۔

''عن أبی هریرة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: واستوصوا بالنساء خیراً، فإنهن خلقن من ضلع، وإن أعوج شیئ فی الضلع أعلاه، فإن ذهبت تقیمه کسرته، وإن ترکته لم یزل أعوج فاستوصوا بالنساء خیراً''۔ (رواه البخاری ۲-۱۲۰۲ ط ممبئی)

بیوی کی اسی فطرت کو سامنے رکھ کر شریعت اسلامیہ نے نفقہ کی ادائیگی کے سلسلہ میں بڑا اہتمام کیا ہے اور اس کے سکنی اور رہائش گاہ کے اوصاف کو بھی بیان کیا ہے، کسی بھی صالح خاندان کو وجود دینے کے لئے ان ہدایات کو روبہ عمل لانا ضروری ہے۔

بیوی کے حق سکنی کے اوصاف:

۱۔ رہائشی مکان کا مملوکہ ہونا ضروری نہیں، بلکہ عاریت یا کرایہ کا مکان بھی کافی ہے، چنانچہ علامہ شامی ارقام فرماتے ہیں:

''سواء کان ملکاً له أو إجارة أو عاریة'' (رد المحتار علی الدر ۵-۲۲۰ ط زکریا، الفقه الاسلامی وادلته۷-۸۰۳)

۲۔ معیار کے اعتبار سے مکان شوہر اور بیوی دونوں کے لائق ہو:

رد المحتار میں ہے: "بقدر حالهما أی فی الیسار والإعسار فلیس مسکن الأغنیاء کمسکن الفقراء کما فی البحر" (رد المحتار علی

الدر ۵ر۳۲۰)

البتہ رہائش کے انتظام میں عرف وعادت اور فریقین کے حالات کی بھی رعایت کی جائے گی، اور بیوی کے معیار کو بھی ملحوظ رکھا جائے گا، اس کے بارے میں علامہ شامی کا کلام ملاحظہ فرمائیں:

''بیویاں تین معیار کی ہوتی ہیں: (۱) مال دار شریف خاتون، (۲) متوسط الحال، (۳) تنگ دست، بیویوں کے اس معیار کے اعتبار سے ان کے مسکن کے اوصاف بھی مختلف ہو سکتے ہیں، لہذا اگر شریف مال دار خاتون سے اس کا نکاح ہوا ہے تو اس کے لئے ایک مستقل گھر کا انتظام کرنا لازم ہوگا اور اقارب واعزہ میں سے کسی کو بیوی کی مرضی کے بغیر اس مکان میں رکھنے کی شوہر کو اجازت نہیں ہوگی، اور اگر اس کی بیوی متوسط طبقہ سے تعلق رکھتی ہے، نہ زیادہ مال دار ہے، نہ زیادہ غریب، تو اس کے لئے گھر کا ایک کمرہ ہی کافی ہوگا، جس میں شوہر کے اقارب واعزہ یا دوسری بیوی کو رکھنے کی گنجائش نہیں ہوگی، البتہ گھر کے اور کمروں میں وہ قیام کرنا چاہیں تو بیوی کو اعتراض کا حق حاصل نہیں ہوگا، اگر عورت غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہو تو اس کے لئے ایک کمرہ کافی ہوگا، اگر اس کے ساتھ اس مکان میں شوہر کے رشتہ دار یا اس کی سوکن رہتی ہو، جیسا کہ اکثر اعراب اور دیہاتی، نیز شہروں میں رہنے والے غریب جو جھگیوں اور جھونپڑیوں میں رہتے ہیں، اور یہ تفصیل اس اصول کے موافق ہے کہ رہائش میں زوجین کے حالات کا اعتبار کیا جائے گا، اس لئے کہ ارشاد باری تعالی ہے: "اسکنوهن من حيث سكنتم من وجدكم" (الطلاق:۶) (تم عورتوں کو اپنی استطاعت کے مطابق سکونت دو جہاں تم رہتے ہو)، علامہ شامی فرماتے ہیں کہ آج کے ہمارے زمانہ میں اس تفصیل پر اعتماد کرنا چاہئے، اس لئے کہ طعام اور کسوہ زمان ومکان کے فرق سے بدلتے رہتے ہیں۔(رد المحتار علی الدر ۵ر۳۲۲)

خلاصہ یہ کہ رہائش کے معیار کے سلسلہ میں عرف وعادت کی رعایت کی جائے گی اور فریقین کے حالات اور ان کے معیار کو بھی نگاہ میں رکھنا ہوگا۔

۳۔ اگر زوجین کا معیار زندگی جدا ہے کہ ایک مال دار ہے، جبکہ دوسرا تنگ دس تو شوہر پر متوسط سکنی لازم ہوگا۔

رد المحتار میں ہے: "لکن إذا کان أحدهما غنياً والآخر فقيراً فقد مر أنه يجب لها فی الطعام الكسوة الوسط"۔ (رد المحتار علی الدر ۵ر۳۲۰)

۴۔ شوہر کی ذمہ داری ہے کہ بیوی کے لئے ایسے مکان کا انتظام کرے جس میں اس کی مرضی کے بغیر کسی کو رکھنے کا شوہر کو اختیار نہ ہو۔

ہدایہ میں ہے: "وعلى الزوج أن يسكنها فی دار مفردة ليس فيها أحد من أهله، إلا أن تختار ذلك" (ہدایہ ۲ر۴۴۱، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷ر۸۰۳، الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید ۲ر۱۲۵)

بیوی کے لئے مستقل مکان کا انتظام کیوں واجب ہے:

بیوی کے لئے مستقل مکان کا انتظام اس لئے ضروری ہے کہ زوجہ کے حق سکنی کا دوہی مقصد ہوا کرتا ہے:

(۱) اپنے شوہر کے ساتھ معاشرت اختیار کر سکے۔

(۲) اپنے سامان کی حفاظت سے مطمئن ہو، لہذا اس کے ساتھ کسی اور کی موجودگی میں شوہر کے ساتھ معاشرت کرنے اور لطف اندوز ہونے میں حیاء دامن گیر ہوگی۔

(۳) اور مقصد زوجیت، یعنی بیوی سے سکون حاصل کرنا بھی فوت ہو جائے گا، جیسا کہ سامان کی حفاظت کے بارے میں وہ ہمیشہ تشویش میں مبتلا ہوگی۔

چنانچہ ''محیط برہانی'' میں ہے:

''فإن أراد الزوج أن يسكنها مع أحد من أقربائه وطلبت المرأة منزلاً على حدة، فلها ذلك، لأن حق السكنى للمرأة إنما كان لمعنيين: أحدهما أن تعاشر مع الزوج، والثانى أن تأمن على متاعها، فإذا كان معها ثالث تستحى من المعاشرة مع زوجها وتخاف على متاعها'' (المحيط البرهانی ۴-۲۱۸، الفقه الاسلامی وادلته ۷-۸۰، الموسوعة الفقهيه ۲۵-۱۰۸)

(۴) بیوی کی رہائش کے لئے دین دار محلہ یا آبادی کا انتخاب کیا جائے جہاں عزت وآبرو محفوظ ہو اور ظلم وزیادتی سے تحفظ مل سکے، اگر عورت اپنے

شوہر کی ایذا رسانیوں کی قاضی سے شکایت کرے اور کسی محفوظ مکان کا مطالبہ کرے جہاں کے رہنے والے صلاح وتقوی میں معروف ہوں اور ان کے ذریعہ شوہر کو اس کے ظالمانہ برتاؤ سے روکنا یا نظر رکھنا ممکن ہو تو قاضی کو ایسا حکم دینا چاہئے، محیط برہانی میں ہے کہ:

''اگر شوہر نے بیوی کو کسی ایسے مکان میں سکونت دیا جہاں کوئی اور نہیں رہتا، اور اس نے قاضی سے شکایت کیا کہ شوہر مجھے مارتا ہے اور تکلیف دیتا ہے، اس لئے اس کو حکم دیجئے کہ مجھے اچھے لوگوں کے درمیان رکھے تو اگر قاضی کو بیوی کی صداقت کا علم ہوجائے تو اسے چاہئے کہ شوہر کو زجر وتنبیہ کرے اور ظلم سے اس کو روکے، اس لئے کہ قاضی کو یہ علم ہوگیا کہ شوہر نے ناجائز فعل کا ارتکاب کیا ہے اور اگر قاضی کو بیوی کی صداقت کا علم نہیں ہوا تو اگر اس مکان کے پڑوسی اچھے لوگ ہیں تو وہیں رہنے کا حکم دے، اس لئے کہ اگر اس کو وہاں سے منتقل ہونے کا حکم دے گا تو وہ اسی جیسے پڑوسیوں کے درمیان منتقل کردے گا، جس کا کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوسکتا، لہذا منتقل کرنے کا حکم دینے کے بجائے اس کو چاہئے کہ پڑوسیوں سے شوہر کے برتاؤ کے بارے میں تحقیق کرے اگر وہ لوگ عورت کی شکایت کی تصدیق کریں تو قاضی شوہر کو عورت پر زیادتی کرنے سے منع کرے اور اگر پڑوسی شکایت کی تصدیق کرنے کے بجائے یہ کہیں کہ شوہر اس کو اذیت نہیں دیتا تو قاضی اس کو وہیں رہنے دے، اور اگر پڑوسی قابل اعتماد نہ ہوں یا شوہر کی جانب داری کریں تو قاضی شوہر کو حکم دے کہ وہ اپنی زوجہ کو اچھے پڑوسیوں کے درمیان رکھے''۔ (المحیط البرہانی ۴/ ۳۱۸، رد المحتار علی الدر ۵/ ۳۲۲)

(۵) رہائش کے لئے ایسے مکان کا انتظام کیا جائے جہاں بالکل تنہائی نہ ہو، اگر شوہر نے اس کو ایسے مکان میں سکونت دیا جہاں بالکل تنہائی ہے اور یہ اندیشہ ہے کہ یہ تنہائی عورت کے لئے نفسیاتی مرض کا سبب بن سکتی ہے تو ایک ایسی عورت کا انتظام کرنا ضروری ہوگا جو اس کی مونس بن سکے اور اس کی وحشت دور کرسکے۔ (رد المحتار علی الدر ۵/ ۳۲۳)

(۶) بیوی کے مخصوص مکان کی حاجات اور ضرورت اور اس کے منزلی حقوق کے بارے میں شریعت اسلامیہ نے اچھا خاصا مواد فراہم کیا ہے، ہم سطور ذیل میں اس کے خلاصہ پر اکتفا کرتے ہیں:

زوجہ کا گھر ایسا ہو جس میں ضروریات زندگی، آٹا پینے کا آلہ، توا، جگ، گلاس، چولہا، ہانڈی، چمچہ، چٹائی، فرش، لحاف، گدہ، کپڑا صاف کرنے کا برتن، صابن، شمپو، تیل، پاپوش اور روشنی کے آلات ٹیپ وغیرہ سب فراہم ہوں، زمانہ کے عرف وعادت کے مطابق اس میں تغیر اور تبدل کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ گھر کی لازمی ضروریات، یعنی باورچی خانہ، غسل خانہ، اور بیت الخلاء اور کپڑا پھیلانے کی جگہ کا معقول انتظام بھی تمام فقہاء کے نزدیک شوہر کے ذمہ واجب ہے۔

چنانچہ ''درمختار'' میں ہے:

''ویجب علیه آلة طحن وخبز وآنیة شراب وطبخ ککوز وجرة وقدر ومغرفة، وکذا سائر أدوات البیت کحصر ولبد وطنفسة، وما تنظف به وتزیل الوسخ کمشط وأشنان وما یمنع الصابون ومداس رجلها وتمامه فی الجوهرة والبحر'' (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۷- ۸۰۵، رد المحتار علی الدر ۵- ۲۹۱)

لیکن بیوی کے گھر کے مذکورۃ الصدر اوصاف اس وقت واجب ہیں جب شوہر مال دار یا متوسط معیار زندگی گذارنے والا ہو، البتہ اگر تنگ دست ہو جو متعدد کمروں پر مشتمل مکان کے کسی ایک کمرہ میں رہتا ہے تو گھر کی لازمی ضروریات، غسل خانہ، بیت الخلاء وغیرہ کا مشترک ہونا بھی کافی ہوجائے گا، بشرطیکہ اس کے پڑوسی نیک ہوں۔

چنانچہ ''درمختار'' میں ہے:

''زاد فی الاختیار والعینی ومرافق ومراده لزوم کنیف ومطبخ وینبغی الإفتاء به بحر''۔

علامہ شامی "ولزوم کنیف ومطبخ" کے تحت رقم فرماتے ہیں: "أی بیت الخلاء وموضع الطبخ بأن یکونا داخل البیت أو فی الدار لا یشارکها فیهما أحد من أهل الدار، قلت: وینبغی أن یکون هذا فی غیر الفقراء الذین یسکنون فی الربوع والأحواش بحیث یکون لکل واحد بیت یخصه وبعض المرافق مشترکة کالخلاء والتنور وبئر الماء"۔ (رد المحتار علی الدر ۵/ ۳۲۱، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/ ۸۰۵)

ایک طرف بیوی کے گھر کے یہ اوصاف ہیں تو دوسری طرف ہمارے معاشرہ میں ایک ہی ساتھ زندگی گذارنے کا طریقہ ہے کہ ایک بڑے گھر کے مختلف کمروں میں بیوی اور شوہر کے اقارب رشتہ دار، یعنی اس کے بھائی، بہن والدین وغیرہ رہتے ہیں جس میں گھر کی ضروریات، یعنی بیت الخلاء، غسل خانہ، باورچی خانہ، آنگن وغیرہ مشترک ہوتا ہے، اس طرح کے طریقۂ زندگی میں ایک طرف تو والدین، بھائی، بہن کی حاجات وضروریات کا بہترین تکفل ہوجاتا ہے، مگر اجنبی گھر سے آئی زوجہ کے حقوق بالکل پامال ہوکر رہ جاتے ہیں، اور وہ اس مشترکہ خاندان میں ایک لونڈی کی طرح زندگی گذارنے پر مجبور ہوجاتی ہے، ایسی صورت میں اس کے شرعی پردہ کا نظام بھی باقی نہیں رہ پاتا، اس لئے سطور ذیل میں اس کا جائزہ لیا گیا ہے کہ کیا شوہر کے اقارب کے ساتھ بیوی کو ٹھہرانا مسکن شرعی بننے کی صلاحیت رکھتا ہے؟

بیوی کے رہائشی مکان میں شوہر کے والدین، بھائی، بہن، سوکن اور دوسری بیوی کے بچوں کا قیام:

بیوی کو بنیادی طور پر ایک مستقل کمرہ کا مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے، جس کو وہ جب چاہے مقفل کرسکے اور تخلیہ کرسکے، لہذا اگر شوہر نے بیوی کو ایسے بڑے مکان کا ایک علاحدہ کمرہ دے دیا جہاں شوہر کے والدین اور دوسرے رشتہ دار، بھائی، بہن یا دوسری بیوی مکان کے دوسرے کمروں میں رہتے ہوں تو عام حالات میں بیوی کو علاحدہ مکان کا مطالبہ کرنے کا حق حاصل نہیں ہوگا، خصوصاً مرافق بیت، غسل خانہ، بیت الخلاء، اور باورچی خانہ وغیرہ علاحدہ علاحدہ ہوں، اور اگر مشترک بھی ہوں تو علاحدہ مکان کا مطالبہ نہیں کرسکتی، البتہ اگر شوہر کے رشتہ داروں یا اس کی سوکن سے اس کو اذیت پہنچتی ہو تو علاحدہ مکان کا مطالبہ کرنے میں بیوی حق بجانب ہوگی، اور بیوی شریف مال دار خاتون ہو تو اس کے لئے علاحدہ مکان اور علاحدہ مرافق کے مطالبہ کا حق حاصل ہوگا، اور متوسط الحال ہو تو مشترکہ مکان کا ایک کمرہ اور علاحدہ مرافق بیت کافی ہوں گے، واضح رہے کہ بیوی کے کمرہ میں والدین، بھائی، بہن وغیرہ کا قیام اس کے لئے باعث ضرر ہوگا، نیز بیوی کے کمرہ میں صنفی تعلق کا شعور رکھنے والے لڑکے کی سکونت کی گنجائش نہیں ہوگی (ردالمحتار علی الدر ۵/۳۲۰)، سطور بالا کی روشنی سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ بیوی کے کمرہ میں اگر کوئی تیسرا رہتا ہے تو یہ مسکن شرعی نہیں ہے۔

مشترکہ مکان میں پردہ کے احکام وحدود:

خاندانی نظام معاشرت کو پاکیزہ بنانے اور صنفی تعلقات کو ہوا دینے والے عوامل اور محرکات کا سد باب کرنے کے لئے اللہ تعالی نے قرآن کریم میں انسدادی تدابیر کو بیان کیا، تاکہ پورا خاندان اخلاق فاضلہ کے ساتھ متصف ہو اور گھر میں برائیوں کے اسباب بالکل ناپید ہوجائیں، چنانچہ اللہ تعالی نے اس سلسلہ میں مردوں اور عورتوں کو مستقلاً مخاطب کیا، ارشاد باری تعالی ہے:

"قل للمؤمنين يغضوا من أبصارهم ويحفظوا فروجهم ذلك أزكى لهم إن الله خبير بما يصنعون" (النور: ۳۰) (اے نبی ﷺ) مومن مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نظریں بچاکر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لئے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے، یقینا جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر ہے)۔

"وقل للمؤمنات يغضضن من أبصارهن ويحفظن فروجهن ولا يبدين زينتهن إلا ما ظهر منها وليضربن بخمرهن على جيوبهن" (النور: ۳۱)۔ ((اے نبی ﷺ) مومن عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نظریں بچاکر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود ظاہر ہوجائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں)۔

مذکور بالا دونوں آیتوں میں اللہ تعالی نے مردوں اور عورتوں کو غض بصر کا حکم دیا ہے، تاکہ فتنہ کا سد باب ہوجائے، اس لئے کہ نظر زنا کا پہلا زینہ ہے اور قاصد ہے، اسی لئے نظر کو ابلیس کے تیروں میں سے ایک زہریلے تیر سے تعبیر کیا گیا ہے، اسی نظر سے مرد عورتوں کے حسن وجمال سے لذت اندوز ہوتا ہے، اور عورتیں بھی مردوں کو اپنا منظور نظر بناتی ہیں، چنانچہ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی پر اس کے زنا کا حصہ لکھ دیا گیا ہے، یقینی طور پر اس کو کرکے رہے گا، چنانچہ دونوں آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے، زبان کا زنا بولنا ہے، دونوں کانوں کا زنا سننا ہے، دونوں ہاتھوں کا زنا پکڑنا ہے، دونوں پیروں کا زنا چلنا ہے، اور نفس آرزو اور خواہش کرتا ہے اور شرمگاہ یا تو اس کی تصدیق کرتی ہے یا تکذیب۔ (بخاری ومسلم)

البتہ ہر نظر ممنوع نہیں ہے، بلکہ جہاں حسن محسوس ہو اور انسان پہلی نظر کے بعد دوبارہ اس کو دیکھنے لگے تو یہ ممنوع ہے، چنانچہ اللہ کے

رسول ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: اے علی تمہارے واسطے جنت میں ایک خزانہ ہے، تم کو اس کا پورا حصہ ملے گا، اس لئے ایک مرتبہ دیکھنے کے بعد دوبارہ مت دیکھو، اس لئے کہ پہلی نظر تیرے لئے مباح ہے دوسری کی گنجائش نہیں ہے۔

"عن جرير قال: سألت رسول الله عن نظر الفجأة فقال: اصرف بصرك" (ابوداؤد) (حضرت جریرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ اچانک نظر پڑ جائے تو کیا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نظر پھیر لو)۔

یہ تو عمومی احوال کا حکم ہے، مگر بعض احوال میں اجنبیہ کو نظر بھر کر دیکھنے کی گنجائش ہے، مثلاً:

۱۔ کسی عورت کو پیغام دیتے وقت دیکھنا، یہ جائز ہی نہیں، بلکہ مسنون ہے، اللہ کے نبی ﷺ نے اس کا حکم بھی صحابہ کو دیا ہے اور عملاً بھی اس کو ظاہر کیا ہے۔

''عن المغيرة بن شعبة أنه خطب امرأة فقال النبي ﷺ: انظر إليها، فإنه أحرى أن يؤدم بينكما'' (رواه الترمذی والنسائي وغيرهما، رد المحتار على الدر ۹-۵۳۲)۔

مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک عورت کو نکاح کا پیغام دیا تو آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اس کو دیکھ لو کیونکہ یہ تم دونوں کے مابین محبت اور اتفاق پیدا کرنے کے لئے مناسب تر ہوگا۔

''عن سهل بن سعد أن امرأة جاءت إلى رسول الله ﷺ فقالت: يا رسول الله! جئت لأهب لك نفسي، فنظر إليها رسول الله ﷺ، فصعد النظر إليها'' - (رواه البخاري)

(حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ ایک عورت آنحضرت ﷺ کے پاس حاضر ہوئی اور بولی کہ اپنے آپ کو حضور کے نکاح میں دینے کے لئے آئی ہوں اس پر رسول اللہ ﷺ نے نظر اٹھائی اور اس کو دیکھا)۔

''عن أبي هريرة ﷺ قال: كنت عند النبي ﷺ فأتاه رجل فأخبره أنه تزوج امرأة من الأنصار، فقال له رسول الله ﷺ: أنظرت إليها، قال: لا، قال: فاذهب فانظر إليها، فإن في أعين الأنصار شيئاً'' (مسلم)۔

(حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں حضرت نبی اکرم ﷺ کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نے انصار میں سے ایک عورت کے ساتھ نکاح کا ارادہ کیا ہے، حضور ﷺ نے پوچھا کیا تم نے اس کو دیکھا ہے؟ اس نے عرض کیا نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا جا کر اس کو دیکھ لو، کیونکہ انصار کی آنکھوں میں عموماً کچھ عیب ہوتا ہے)۔

۲۔ امانت دار ڈاکٹر کے لئے بغرض علاج عورت کو دیکھنا جائز ہے۔

۳۔ ختنہ کرنے والے کے لئے مختون کے فرج کو دیکھنا جائز ہے۔

۴۔ زنا کرنے والوں کے فرج کو تحمل شہادت کے لئے دیکھنا جائز ہے۔

۵۔ دایہ کو ولادت کے وقت فرج کو دیکھنا جائز ہے۔

۶۔ اگر کوئی عورت پانی میں ڈوب رہی ہو یا آگ میں گھر گئی ہو، تو اس کو دیکھنا ہی نہیں، بلکہ اس کی جان بچانے کے لئے پکڑ کر اٹھا لینا بھی جائز ہے۔(رد المحتار علی الدر ۹/ ۵۳۲، احکام القرآن للجصاص ۳/ ۴۰۸)

اگر عورت کا پورا بدن مرض میں مبتلا ہے، حتی کہ شرمگاہ بھی، تو اگر کوئی معالج عورت مل جائے تو اسی سے علاج کرائے، ورنہ امانت دار ڈاکٹر اس کا علاج کرے اور اس کے جسم کے تمام اعضاء کو چھپا دے، صرف بیماری کی جگہ کو کھلا رکھے ورحتی المقدور زخم کے مقام کے علاوہ سے نگاہ نیچی رکھے (رد المحتار علی الدر ۹/ ۵۳۳)۔

ستر کے حدود:

اسلامی معاشرت کی باطنی اصلاح کے لئے اللہ تعالی نے نگاہوں کو نیچی رکھنے اوران کو غلط جگہوں سے بچائے رکھنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی ساتھ بدن کے ان حصوں کے چھپانے کا بھی حکم دیا جو لوگوں کو دعوت نظارہ دیتے رہتے ہیں کہ نگاہیں بہک نہ جائیں۔

اصطلاح شرع میں جسم کے ان حصوں کو ستر کہا جاتا ہے جن کا ڈھانکنا فرض ہے، ستر کی چار قسمیں ہیں:

(۱) مرد کا ستر مرد کے ساتھ:

مردوں کے لئے ناف اور گھٹنہ کے درمیان کا حصہ ستر قرار دیا گیا ہے، لہذا ان کے لئے دوسرے کے اس حصہ کو دیکھنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ دوسروں کے سامنے اس کو کھولنا ممنوع ہے، واضح رہے کہ گھٹنہ اور ران بھی ستر میں داخل ہے۔ (ردالمحتار علی الدر ۹/ ۵۲٦، المحیط البرہانی ۸/ ۲۴)

(۲) عورت کا ستر عورت کے لئے:

ایک مرد کا دوسرے مرد کے ساتھ جو ستر بیان کیا گیا یہی ایک عورت کا دوسری عورت کے لئے بھی ستر ہے، اس لئے کہ عورت کو دوسری عورت کے دیکھنے سے شہوت نہیں ہوتی، جیسا کہ مردوں کا معاملہ ہے، البتہ اگر فتنہ کا اندیشہ ہوتو دیکھنا جائز نہیں ہے، مثلاً ذمیہ مسلمان عورت کے حق میں اجنبی مرد کی طرح ہے، لہذا عورت کے لئے ذمیہ عورت کے ساتھ بے پردہ ہونا جائز نہیں ہے، نیز نیک خاتون بھی فاجرہ فاسقہ عورتوں کے سامنے بے حجاب ہونے سے گریز کریں۔ (ردالمحتار علی الدر ۹/ ۵۳۴، المحیط البرہانی ۸/ ۲۵)۔

''عن عمر بن الخطاب ﷺ أنه كتب إلى أبي عبيدة بن الجراح ﷺ: أما بعد فإنه بلغني أن نساءً من نساء المسلمين يدخلن الحمامات مع نساء أهل الشرك، فإنه من قبلك. فلا يحل لامرأة تؤمن بالله واليوم الآخر أن ينظر إلى عورته إلا أهل ملتها'' (سعید بن منصور، ابن المنذر، بیہقی)

(حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ کو فرمان بھیجا، حمد وصلاۃ کے بعد! مجھے خبر پہنچی ہے کہ مسلمان عورتیں مشرکوں کی عورتوں کے ساتھ حمام میں جاتی ہیں، آپ اپنی طرف سے ان کو منع کردو، اس لئے کہ جو عورت اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہے جائز نہیں ہے کہ غیر مذہب کا کوئی بھی فرد اس کے ستر کو دیکھے) (التفسیر المنیر ۹/ ۵۵۴)

(۳) مرد کا ستر اجنبیہ کے لئے:

الف۔ اگر مرد عورت کے حق میں اجنبی ہے تو اس کا ستر وہی ہے جو ایک مرد کا دوسرے مرد سے ہے، لہذا عورت مرد کے پورے بدن کو ضرورۃً دیکھ سکتی ہے، بجز ناف سے گھٹنہ کے درمیان کے حصہ کو، تاہم اگر ضرورت نہ ہو اور فتنہ کا اندیشہ ہو تو نوجوان مرد یا نوجوان عورت کے لئے ایک دوسرے کو نہ، چنانچہ حدیث میں حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ وہ اور حضرت میمونہؓ آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھی تھیں اتنے میں ابن ام مکتومؓ آئے جو نابینا تھے، حضور ﷺ نے فرمایا: ان سے پردہ کرو، حضرت ام سلمہؓ نے عرض کیا کیا یہ نابینا نہیں ہیں؟ نہ وہ ہم کو دیکھیں گے اور نہ ہی ہم کو پہچانیں گے تو رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا کہ تم دونوں بھی نابینا ہو؟ کیا تم انہیں نہیں دیکھتی ہو؟۔ (ابوداؤد، ترمذی، بدائع)

جبکہ صحیحین کی روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ کو آپ ﷺ نے حبشیوں کا کھیل دیکھنے کا موقع فراہم کیا تھا، جب حضرت عائشہؓ آپ ﷺ کی اوٹ سے ان کا کھیل دیکھ رہی تھیں۔ (بخاری ومسلم)

لہذا پہلی روایت ندب پر محمول ہوگی، جبکہ دوسری روایت سے جواز مستفاد ہوتا ہے، البتہ نگاہیں نیچی رکھنا مرد وعورت سب کے لئے بہتر ہے۔ (التفسیر المنیر ۹/ ۵۵۱)

مرد کا ستر بیوی کے لئے:

ب۔ اگر مرد عورت کا شوہر ہے تو سر سے پیر تک ہر ہر جز کو دیکھنا دونوں کے لئے جائز ہے، لیکن بہتر ہے کہ شرمگاہ کو نہ دیکھیں، حضرت عائشہؓ کا بیان

ہے کہ نہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ستر کبھی دیکھا اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی مجھ سے دیکھا، باوجودیکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک لمبے عرصہ تک رہی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی کے پاس جائے تو جہاں تک ہو سکے ستر ڈھانکے، اور دونوں بالکل گدھوں کی طرح ننگے نہ ہو جائیں۔ (ردالمحتار علی الدر ۹/ ۵۲۷، محیط برہانی ۸/ ۲۶)

(۴) محارم کا ستر مردوں کے لئے:

محارم سے مراد وہ عورتیں ہیں کہ نسبی یا سببی حرمت کی بنیاد پر ان سے نکاح کرنا مرد کے لئے کبھی حلال نہ ہو، جیسے ماں، بیٹی، پھوپھی، خالہ، بہن، بھتیجی، بھانجی وغیرہ، ذورحم محرم، یعنی قریبی رشتہ داروں کے لئے ان کی ظاہری اور باطنی زینت کی جگہوں، یعنی سر، کان، چہرہ، گردن، سینہ، بازو، کلائی، ہتھیلی، پنڈلی، اور پیر کو دیکھنا جائز ہے، اور ان عورتوں کے لئے بھی ان کے سامنے ظاہری اور باطنی مواضع زینت کو ظاہر کرنا مباح ہے۔

چنانچہ ارشاد باری ہے:

''ولا يبدين زينتهن إلا لبعولتهن أو آبائهن أو آباء بعولتهن أو أبنائهن أو أبناء بعولتهن أو إخوانهن أو بني إخوانهن أو بني أخواتهن''۔ (النور: ۳۱)

(اور عورتیں اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں، مگر ان لوگوں کے سامنے، شوہر، باپ، خسر، بیٹے، سوتیلے بیٹے، بھائی، بھتیجے، بھانجے)۔

اس آیت کریمہ میں زینت سے مراد نفس زینت نہیں ہے، اس لئے کہ نفس زینت تو بازاروں میں فروخت ہوتی ہے جس کو دیکھنا ہر ایک کے لئے مباح ہے، بلکہ اس سے مراد مواضع زینت ہیں۔

چنانچہ سر، تاج کا محل ہے، چہرہ، سرمہ کا محل ہے، گردن اور سینہ، ہار کا محل ہے، کان، بالی کا محل ہے، بازو، بازوبند کا محل ہے، کلائی، کنگن کا محل ہے، ہتھیلی، انگوٹھی اور مہندی کا محل ہے، پنڈلی، پایل کا محل ہے، اور پیر، مہندی اور انگوٹھی کا محل ہے، اور بال، چوٹی کا محل ہے۔ (محیط برہانی ۸/ ۲۷، ردالمحتار علی الدر ۹/ ۵۲۸، بدائع الصنائع ۴/ ۲۹۱)

الغرض محارم کے لئے ان کی رشتہ دار عورتوں کے یہ حصے ستر میں داخل نہیں ہیں، جس طرح عورتوں کو زینت کی ان جگہوں کو ظاہر کرنے کا اختیار ہے مردوں کو دیکھنا بھی مباح ہے، مگر شرط یہ ہے کہ دونوں شہوت سے مامون ہوں، اباحت کی وجہ ان کا کثرت سے میل جول ہے، عموماً ایک دوسرے کے پاس ان کی آمد و رفت ہوتی رہتی ہے، بالخصوص مشترکہ خاندانی نظام میں اس سے بچنا بہت مشکل ہے، اس لئے شریعت اسلامیہ نے اس نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے زینت کے ان مقامات کو ذورحم محرم کے سامنے کھولنے کی اجازت دے دی، تاکہ لوگ حرج اور تنگی میں مبتلا نہ ہوں، نیز محارم ایک دوسرے کو بنظر شفقت دیکھتے ہیں جس میں شہوت کا شائبہ بھی نہیں ہوتا، لہذا اگر شہوت کے ساتھ دیکھنے تک نوبت پہنچ جائے تو دیکھنا مباح نہیں ہوگا۔ (بدائع الصنائع ۴/ ۲۹۲، محیط برہانی ۸/ ۲۷)

اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے امام ابوبکر جصاص رازی نقل کرتے ہیں کہ منذر ثوری نے روایت کیا ہے کہ محمد بن الحنفیہ اپنی ماں کے بال میں کنگھی کرتے تھے، ابوالبختری نے نقل کیا ہے کہ حسنؓ اور حسینؓ اپنی بہن ام کلثومؓ کے پاس اس حال میں جاتے کہ وہ کنگھی کر رہی ہوتیں، ابن زبیرؓ سے بھی ان کی محرم عورتوں کے بارے میں یہی منقول ہے، ابراہیم سے منقول ہے کہ اگر کوئی اپنی ماں، بہن، خالہ اور پھوپھی کے بالوں کو دیکھتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، جب کہ انہوں نے پنڈلیوں کے دیکھنے کو مکروہ قرار دیا، امام ابوبکرؒ نے فرمایا کہ آیت کے بموجب بال اور پنڈلیوں کے مابین فرق کی کوئی دلیل نہیں ہے، ہشام نے حضرت حسن سے اس عورت کے بارے میں ان کا قول نقل کیا ہے جو اپنا دوپٹہ اپنے بھائی کے سامنے اتار دیتی ہے، فرمایا: بخدا اس کے لئے مباح نہیں ہے، حضرت سفیان نے لیث سے انہوں نے طاوس سے روایت کیا ہے کہ وہ بیٹی اور بہن کے بال دیکھنے کو مکروہ قرار دیتے تھے، حضرت جریرؒ نے مغیرہؒ سے اور انہوں نے شعبی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا بیٹی یا بہن کے بال کو سیدھی نظر سے دیکھنا مکروہ ہے۔

امام ابوبکر فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اس حالت پر محمول ہے جب آدمی شہوت کا اندیشہ رکھتا ہو، اس لئے کہ اگر شہوت سے مامون ہونے کی

حالت پر اس کو محمول کیا جائے گا تو اس کا آیت اور سنت کے خلاف ہونا لازم آئے گا، اور عورت کے حق میں ذو رحم محرم اور اجنبی سب برابر ہو جائیں گے۔ (احکام القرآن للجصاص ۳/۴۱۰)

زینت کی ان جگہوں کے علاوہ بقیہ بدن کے کسی بھی حصہ کو دیکھنا محرم کے لئے بھی جائز نہیں ہے، خواہ پیٹ پیٹھ، گھٹنہ ہی ہو۔ (در مع الرد ۹/۵۲۸)

ماتحتوں اور شہوت نہ رکھنے والوں کے سامنے اظہار زینت کا حکم:

اس سلسلہ میں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: "أو التابعين غير أولي الإربة من الرجال" (النور: ۳۱) (یعنی عورتیں ان خدمت گاروں کے سامنے زینت کا اظہار کرسکتی ہیں جو عورتوں سے کچھ حاجت نہیں رکھتے)۔

آیت کریمہ کے اس جز کی تفسیر میں امام ابوبکر جصاصؒ رقم طراز ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ قتادہ اور مجاہد سے منقول ہے کہ ان حضرات نے فرمایا اس سے مراد تابع لوگ ہیں، جو تمہارا بچا کھچا کھانا حاصل کرنے کے لئے تمہارے پیچھے لگے رہتے ہوں، جن کو عورتوں سے کوئی مطلب نہیں ہوتا، حضرت عکرمہؒ کا بیان ہے کہ اس سے مراد عنین ہے، مجاہد، طاؤس، عطاء اور حسن کا خیال ہے کہ اس سے مراد ناقص العقل ہے، بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد وہ احمق ہے جس کو عورتوں سے کوئی حاجت نہیں ہوتی، زہری نے حضرت عروہ سے اور وہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے بیان کیا کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے پاس ایک مخنث آیا جایا کرتا تھا، جس کے متعلق لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اس کو عورتوں کی کچھ حاجت نہیں، حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے اور یہ بیٹھا کسی عورت کے اوصاف بیان کر رہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کو وارننگ دیا میں نہیں مناسب سمجھتا کہ یہ یہاں کے احوال سے واقف ہو، آئندہ یہ تمہارے پاس ہرگز نہ آئے، لہذا لوگ اس سے پردہ کرنے لگے، حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ میرے پاس تشریف لائے جب میرے پاس ایک مخنث بیٹھا ہوا تھا تو وہ میرے بھائی عبد اللہ کو مخاطب کر کے کہنے لگا، اگر اللہ تعالی نے ہم کو طائف کی فتح سے ہمکنار کیا تو میں ماویہ بنت غیلان کو تمہیں دکھاؤں گا، جس کا حال یہ ہے کہ جب سامنے سے آتی ہے تو اس کے پیٹ میں چار بل نظر آتی ہے اور جب پیچھے پلٹتی ہے تو آٹھ بل تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نہیں مناسب سمجھتا کہ یہ یہاں کے احوال سے واقف ہو آئندہ یہ تمہارے پاس نہ آئے۔

امام ابوبکر جصاص رازی اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس مخنث کے بارے میں یہ گمان تھا کہ عورتوں سے اس کو کچھ مطلب نہیں تو ازواج مطہرات کے پاس اس کے جانے کی اجازت دے دیا تھا، اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پتہ چلا کہ یہ عورتوں کے احوال اور ان کے اوصاف سے خوب واقف ہے تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ یقین ہو چلا کہ اس کو تو عورتوں سے مطلب ہے تو آپ نے اس سے پردہ کرنے کا حکم دیا۔ (احکام القرآن للجصاص ۳/۴۱۱)

آیت اور حدیث سے یہ پتہ چلا کہ ایسے مرد بھی عورتوں کے پاس جاسکتے ہیں جن کو صنفی معاملات سے کچھ لینا دینا نہیں ہے، اور اگر ان کے متعلق کبھی یہ اندیشہ ہو جائے کہ یہ تو عورتوں کے سراپا سے دلچسپی رکھتے ہیں تو عورتیں ان کے سامنے اپنی زینت کو ظاہر نہیں کرسکتیں، بلکہ ان کے ساتھ بھی اجنبی مردوں کا ہی معاملہ کریں گی اور اپنی زینت کی جگہوں کو ظاہر کرنے سے گریز کریں گی۔

چنانچہ "درمختار" میں ہے:

"والخصي والمجبوب والمخنث في النظر إلى الأجنبية كالفحل، وقيل: لا بأس بمجبوب جف مائه لكن في الكبرى أن من جوزه فمن قلة التجربة والديانة" (رد المحتار علی الدر ۹/۵۳۶)

جس کے خصیتین نکال دیئے گئے ہوں، یا وہ مقطوع الذکر ہو، یا مخنث اور اجنبیہ دیکھنے کے مسئلہ میں ان کا حکم بھی مرد کی طرح ہے، بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس مقطوع الذکر کے بارے میں کوئی حرج نہیں ہے جس کی منی خشک ہوگئی ہو، لیکن "کبری" میں ہے کہ جس نے بھی اس کے لئے جائز قرار دیا ہے وہ ناتجربہ کاری اور فقدان دیانت پر مبنی ہے۔

دور حاضر کے نوکروں، خانساماؤں اور پرائیوٹ ملازموں، ہجڑوں اور بوڑھوں کے سلسلہ میں احتیاط ہی مناسب ہے، ان کا گھروں میں آنا خطرات سے خالی نہیں ہے، جیسا کہ روزمرہ کے واقعات اس پر شاہد عدل ہیں، اس لئے کہ اگر وہ خود کچھ نہ کرسکے تو دلالت اور ایجنٹی کے ذریعہ سے دور حاضر کی عورتوں کو نقصان پہنچانا کسی پر بھی مخفی نہیں ہے، اس لئے ان کا حکم بھی اجنبی مردوں کا ہی حکم ہے اور ان سے نگاہیں بچا رکھنا اور مقام زینت کو چھپانا واجب ہوگا۔

علامہ شامی ''عنایہ'' سے نقل کرتے ہیں کہ اصح یہ ہے کہ باری تعالیٰ کا قول: "أو التابعين" (النور: ۳۱) از قبیل متشابہات ہے اور اس کا فرمان: "قل للمؤمنين يغضوا من أبصارهم" (النور: ۳۰) محکم ہے، اس لئے ہم اسی محکم پر عمل کریں گے۔ (عنایہ، رد المحتار علی الدر ۵۳۶/۹)

دیور، چچازاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد وغیرہ سے پردہ:

دیور، جیٹھ، چچازاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد، خالہ زاد، بہنوئی، نندوئی سب غیر محرم ہیں، لہذا عورت کے لئے لازم ہے کہ ان کے سامنے آنے سے گریز کرے، ان سے خلوت سے گریز کرے، اگر کچھ اعزہ مشترکہ مکان میں رہتے ہوں تو ایک دوسرے سے پردہ لازم ہے، چہرہ بھی کھولنے سے گریز کریں، اگر کوئی اندر آئے تو اجازت لے کر آئے، پھر عورتیں ان سے مکمل پردہ کریں۔

''بدائع'' میں ہے: "وأما النوع السابع وهو ذوات الرحم بلا محرم فحكمهن حكم الأجنبيات الحرائر" (بدائع ۲۹۷/۴) یعنی نامحرم رشتہ داروں کا حکم آزاد اجنبی عورتوں کا حکم ہے۔

حدیث میں دیور کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے، چنانچہ عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خبردار عورتوں کے پاس تنہائی میں نہ جاؤ انصار میں سے ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ دیور اور جیٹھ کے متعلق کیا ارشاد ہے، فرمایا وہ تو موت ہے۔ (بخاری ۷۸۷/۲، مسلم، ترمذی)

''لمعات'' میں ہے:

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں دیوروں سے ایسے ہی بچیں جیسے وہ موت سے بچتی ہیں، اس لئے کہ رشتہ داروں سے اندیشہ زیادہ ہوتا ہے اور فتنہ ان سے ہی زیادہ رونما ہوتا ہے، اس لئے کہ عورتوں کے پاس بلا روک ٹوک ان کی آمد ورفت رہتی ہے اور خلوت کی نوبت آتی رہتی ہے (لمعات علی ہامش المشکاۃ)، البتہ عورت ایسے بچوں کے سامنے اظہار زینت کرسکتی ہیں جو ابھی صنفی احساسات سے نابلد ہیں، قرآن میں ہے: "أو الطفل الذين لم يظهروا على عورات النساء". (النور: ۳۱)

محارم سے اجازت لے کر گھر میں آنا:

جس طرح اجنبیوں کے لئے شریعت اسلامیہ نے استیذان کا حکم دیا ہے کہ گھر میں آنے سے پہلے تین مرتبہ اجازت لیں، اگر اجازت مل جائے تو اندر آئیں، ورنہ دروازہ پر بیٹھے نہ رہیں، بلکہ وہاں سے چلے جائیں، ٹھیک اسی طرح ذورحم محرم رشتہ داروں کے لئے بھی گھر میں آنے سے پہلے اجازت مانگنے کا حکم ہے، تاکہ عورتوں کو اس حال میں نہ دیکھیں جس حال میں وہ ان کو دیکھنا پسند نہ کرتے ہوں، چنانچہ مسلم بن یزید سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے حضرت حذیفہؓ سے دریافت کیا کہ کیا مجھے اپنی بہن سے اجازت لینا ہوگا، انہوں نے جواب دیا کہ اگر تم اس سے اجازت لئے بغیر اندر داخل ہوگے تو تم اس کو اس حال میں دیکھو گے جو تمہیں بری لگے۔

حضرت عطاء سے منقول ہے کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے دریافت کیا کہ میں اپنی بہن سے اجازت لے کر اندر جاؤں؟ آپ نے جواب دیا، ہاں، حضرت عطاء بولے کہ میں اور وہ ایک کمرہ میں رہتے ہیں اور اس کا نفقہ بھی میرے ذمہ ہے، حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ تم کو اس سے اجازت لینا ہی ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ایک شخص نے پوچھا کیا میں اپنی ماں سے اجازت لوں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہاں اجازت لینا ہوگا۔

حضرت عطا بن یسار سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں اپنی ماں سے اجازت لے کر گھر میں جاؤں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ ہاں کیا تم اسے ننگی دیکھنا پسند کروگے؟

محارم سے استیذان کی دلیل ارشاد باری ہے:

"إذا بلغ الأطفال منکم الحلم فلیستأذنوا کما استأذن الذین من قبلهم" (النور:۵۹) (جب تمہارے لڑکے سن بلوغ کو پہنچ جائیں تو چاہئے کہ وہ اس طرح اجازت لے کر گھر میں آئیں جس طرح ان کے بڑے ان سے پہلے اجازت لے کر آتے تھے)، چنانچہ اطفال کے سلسلہ میں اجنبی اور محارم کے مابین حکم کے حوالہ سے کوئی تفریق نہیں کی گئی، بس فرق اتنا ہے کہ محارم کے باب میں کسی قدر تخفیف دی گئی، اس لئے کہ مواضع زینت کا دیکھنا ان کے لئے جائز ہے، جبکہ اجنبیوں کے لئے جائز نہیں ہے۔ (احکام القرآن للجصاص ۳؍۴۰۵، بدائع الصنائع ۴؍۳۰۰)

مشترکہ خاندانی نظام میں ستر پوشی اور استیذان کے ان احکام کو ملحوظ رکھنا از حد ضروری ہے، تاکہ گھر کا ماحول اسلامی آداب سے آراستہ ہو، ہر ایک کے حقوق کا پورا خیال کیا جائے، اگر ''مشترکہ عائلی نظام'' میں ان آداب اور تحفظات کا خیال نہ رکھا جاتا ہو تو ایسی زندگی گذارنے کے مقابلہ جداگانہ نظام ہی ہمارے لئے موزوں اور بہتر ہوگا، اس طرح کے نظام زندگی میں آپسی رسہ کشی، مخاصمات اور منازعات سے عافیت، سب وشتم اور ظلم وجور کے امکانات کم پائے جاتے ہیں۔

آج والدین کی رضا کے لئے انسان خالق کائنات کی ناراضگی کو برداشت کرلیتا ہے، اور اسلامی طرز معاشرت کو یکسر نظر انداز کردیتا ہے، جبکہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق" (پیدا کرنے والے مالک کو ناراض کر کے کبھی مخلوق کی اطاعت نہ کرو، لہذا حقوق اسلامی اور آداب معاشرت اسلامیہ کو پامال کرنے والے مشترکہ عائلی نظام سے اگر کوئی کنارہ کش ہوکر، جداگانہ خاندانی نظام میں اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کرنا چاہتا ہے تو والدین کو چاہئے کہ اس کا تعاون کریں، نہ کہ اس کی زندگی میں مشکلات پیدا کریں۔

والدین اور قرابت کے نفقہ کا وجوب:

بایں ہمہ والدین اور اہل قرابت کے حقوق کی نگہداشت اور ان کی ادائیگی بھی ہر انسان کے ذمہ لازم ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مشترکہ خاندانی نظام کا فرد ہے یا جداگانہ خاندانی نظام سے تعلق رکھتا ہے، آج والدین اور اہل قرابت کے تئیں ہمدردی کا جذبہ معدوم ہوتا جارہا ہے، جس کی وجہ سے ان کے حقوق کی ادائیگی سے معاشرہ میں بیزاری پائی جاتی ہے، بالخصوص والدین جن کے ساتھ حسن سلوک پر قرآن وحدیث میں بہت زور دیا گیا ہے، ان کے کھانے، پینے، کپڑے، اور رہائش کے انتظام کو اولاد پر لازم قرار دیا گیا ہے، مگر ساری آسائشوں کے باوجود آج اولاد والدین کو (اولڈ ہاؤسیز) میں مرنے کے لئے بے یارومددگار چھوڑ دیتے ہیں، جو اپنے کو دنیا میں رہتے ہوئے بھی خارج از دنیا تصور کرتے ہیں، یقیناً احسان فراموشی اور حقوق سے چشم پوشی کی اس سے بڑی کوئی مثال نہیں مل سکتی، اسی لئے شریعت اسلامیہ نے اس باب پر خصوصی توجہ دی ہے، چنانچہ قرابت کی بنیاد پر جن لوگوں کا نفقہ کسی فرد پر عائد ہوتا ہے ان میں والدین کا نفقہ بھی ہے، اولاد کے ذمہ اس کے وجوب پر تمام اہل علم کا اجماع ہے، چنانچہ ابن المنذر رقم طراز ہیں: "وأجمعوا علی أن نفقة الوالدین الذین لا کسب لهما، ولا مال، واجبة فی مال الولد"۔ (المغنی لابن قدامہ ۷؍۵۸۳)

ایسے والدین جن کے پاس کوئی ذریعۂ آمدنی نہ ہو تو ان کا نفقہ اولاد کے مال میں واجب ہے:

علامہ کاسانی اس حق کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں، والدین کے نفقہ کے وجوب کی دلیل ارشاد باری ہے:

"وقضی ربك ألا تعبدوا إلا إیاه وبالوالدین إحسانا" (سورہ اسراء:۲۳) (تیرے رب نے حکم دیا کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو) والدین جب محتاج ہوں تو ان کو نفقہ دینا ان کے ساتھ سب سے بڑا احسن سلوک ہے، دوسری جگہ ارشاد ہے: "ووصینا الإنسان بوالدیه إحسانا" (سورہ عنکبوت:۸) (ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا)، اللہ تعالی نے ایک جگہ فرمایا: "أن اشکر لی ولوالدیك" (سورہ لقمان:۱۴) (میری اور اپنے والدین کی شکر گذاری کر) والدین کی شکر گذاری یہی ہے کہ ان کے احسانات کا انسان اچھا بدلہ دے، جس طرح انہوں نے اس کی پرورش کیا، شفقت کا برتاؤ کیا، اور اس کی ہر تکلیف سے حفاظت کیا، ان دونوں کے محتاج ہونے کی حالت میں بطور شکرانہ نعمت کے اس کی بھی ذمہ داری ہے کہ ان کے ساتھ یہی برتاؤ کرے، اللہ تعالی نے کافر والدین کے بارے میں وصیت فرمایا: "وصاحبهما فی الدنیا معروفا" (سورہ لقمان:۱۵) (دنیا میں ان دونوں کے ساتھ خوبی کے ساتھ بسر کر) جب کافر والدین کے بارے میں یہ حکم ہے تو مسلمان والدین تو بدرجہ اولی مستحق ہوں گے، اور بوقت احتیاج ان کا نفقہ دینا ان کے ساتھ سب سے بڑی نیکی ہے۔

نیز فرمان باری تعالیٰ: "ولا تقل لهما أف ولا تنهرهما" (سورہ اسراء: ۲۳) (ان دونوں سے اف بھی مت کہو اور نہ ان کو جھڑکو) ایسی گفتگو سے کنایہ ہے جس میں ایذاء رسانی کی جھلک محسوس ہو، اور یہ بات معلوم ہے کہ والدین کے لاچار ہونے کے وقت ان کے نفقہ کا انتظام نہ کرنا زیادہ باعث اذیت ہے، جبکہ اولاد نفقہ دینے پر قدرت بھی رکھتے ہوں، لہذا جس طرح اف کہنے کی ممانعت، گالی گلوج اور مار پیٹ کی ممانعت کو دلالۃ مستلزم ہے، ٹھیک اسی طرح والدین کے نفقہ کے انتظام نہ کرنے کی ممانعت کو بھی مستلزم ہوگی۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص اپنے والد کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، اے اللہ کے رسول ﷺ میرے پاس مال ہے اور میرا یک والد ہیں ان کے پاس بھی مال ہے وہ چاہتے ہیں کہ میرا مال لے لیں، تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "أنت ومالك لأبيك" (مسند احمد، سنن ابی داؤد، ابن ماجہ) (تو اور تیرا مال سب تیرے والد کا ہے)۔

آنحضرت ﷺ نے اس حدیث میں بیٹے کے مال کو لام تملیک کے ساتھ والد کی طرف اضافت کی ہے، بظاہر اس کا مقتضی یہ ہے کہ والد حقیقتاً بیٹے کے مال کا مالک ہو، تاہم اگر حقیقت ملک ثابت نہ ہو تو بوقت ضرورت کم از کم مالک بنائے جانے کا حق تو ضرور ثابت ہونا چاہئے۔

حضرت نبی اکرم ﷺ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کا سب سے پاکیزہ کھانا وہ ہے جسے کما کر کھائے اور اس کا لڑکا بھی اس کی کمائی کا حصہ ہے، لہذا اگر تمہیں ضرورت پڑے تو لڑکوں کی کمائی سے معروف طریقہ پر کھاؤ۔

حدیث سے پتہ چلا کہ سب سے پاکیزہ کھانا انسان کی کمائی کا کھانا ہے، اور جب لڑکے کی کمائی اس کی کمائی ہے تو اسے اپنے اوپر لڑکے کے مال سے خرچ کرنے کا اختیار ہوگا، اس لئے کہ انسان ان کمائی سے اپنے اوپر خرچ کرتا ہے۔ (بدائع الصنائع ۳/۴۴۰)

والدین اور اہل قرابت کا نفقہ اولاد پر کب واجب ہوتا ہے؟

والدین اور اہل قرابت اگر تنگ دست ہوں جن کے اندر اپنی ضروریات کی تکمیل کی صلاحیت نہیں ہے اور اولاد کے پاس اتنا مال ہے جو ان کی اپنی ضرورت سے زائد ہے، تو ان کی ذمہ داری ہے کہ ان کی کفالت کریں اور ان کے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور رہنے سہنے کا انتظام کریں، اس سے فرق نہیں پڑتا کہ والدین کمانے کی صلاحیت رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں، "فتاوی تاتارخانیہ" میں ہے:

"ويجبر الولد الموسر على نفقة أبيه وأمه إذا كانا محتاجين، هكذا ذكر الإمام خواهر زاده وشمس الأئمة السرخسي" (الفتاوى التاتارخانيه ۳-۲۸۰)

"ثم يفرض على الابن نفقة الأب إذا كان الأب محتاجاً والابن موسراً سواء كان الأب قادراً على الكسب أو لم يكن" (الفتاوى التاتارخانيه ۳-۲۸۱، رد المحتار على الدر ۵-۳۵۵)

والدین کے نفقہ میں اولاد ہی مقدم ہیں، ان کے ساتھ کوئی اور شریک نہیں ہوگا، اگر اولاد مذکر اور مؤنث دونوں مال دار ہوں تو والدین کا نفقہ سب پر برابر برابر واجب ہوگا، نیز اگر ایک لڑکے کی آمدنی زیادہ ہو، جبکہ دوسرے کی آمدنی اس سے کم ہو تو اگر دونوں کی آمدنی میں معمولی فرق ہے تو دونوں پر یکساں طریقہ پر نفقہ واجب ہوگا، اور اگر دونوں کی آمدنی کے تناسب میں زیادہ فرق ہے، تو زیادہ آمدنی والے پر زیادہ اور کم آمدنی والے پر کم ہی واجب ہوگا۔ (رد المحتار علی الدر ۵/۳۵۵، الفتاوی التاتارخانیہ ۳/۲۸۱)

اگر لڑکا مال دار ہے اور صاحب عیال والد محتاج ہیں جن کے چھوٹے بچے ہیں، اور اس لڑکے کی سوتیلی ماں بھی والد کے ساتھ رہتی ہیں تو والد سوتیلی ماں کی خدمت کے محتاج ہیں تو بیٹے کو والد اور ان کے عیال کے نفقہ پر مجبور کیا جائے گا، "تارتارخانیہ" میں ہے:

"وفي الغياثية: محتاج له أولاد صغار محاويج وله ابن كبير موسراً أجبر على نفقة أبيه وعلى نفقتهم أيضاً، لأن الأب كالميت لفقره ولو مات فنفقتهم عليه كذا هنا" (۳-۲۸۰)

"ردالمحتار" میں ہے: "نعم لو كان الأب محتاجاً إليها قدمر أن نفقة زوجته حينئذ على ابنه. وهذا يشمل ما لو كانت موسرة. (رد المحتار علی الدر ۵/۳۵۵)

اگر بیٹا زیادہ مالدار نہیں، بلکہ اس کے اندر والدین میں سے ایک کا نفقہ دینے کی صرف صلاحیت ہے، جبکہ والدین میں سے ہر ایک نفقہ دیئے جانے کے لائق ہیں تو شریعت اسلامیہ بیٹے پر صرف ماں کے نفقہ کے واجب کرنے پر اکتفا کرتی ہے، اس لئے کہ انوثت سراپا لاچاری اور بے بسی ہے، جس کی وجہ سے ماں کے لئے کسب معاش دشوار ہے، اور اس کی تائید حدیث سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! میری حسن معاشرت کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا تیری ماں، انہوں نے پوچھا پھر کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر تیری ماں، انہوں نے پوچھا پھر کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر تیری ماں، انہوں نے پوچھا پھر کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (چوتھی مرتبہ) جواب دیا پھر تیرے والد۔ (احکام القرآن للجصاص ۳/۲۵۶، رد المحتار علی الدر ۵/۳۴۲)

کیا تنگ دست پر کسی کا نفقہ واجب ہے؟

کسی شخص پر دوسرے کے نفقہ کے وجوب کے لئے اس کا مالدار ہونا شرط ہے، لہٰذا محتاج لڑکے پر محتاج والدین کا نفقہ واجب نہیں ہوگا، اس پر تو صرف اپنی اولاد اور بیوی کا نفقہ واجب ہوتا ہے، ہاں اگر والدین اپاہج ہوں، چلنے پھرنے سے معذور ہوں ان کے اندر کسب معاش کی صلاحیت نہیں ہے، تو بیٹے کو چاہئے کہ ان کو بھی اپنے عیال میں شامل کرلے، اور جو کھاتا ہے ان کو بھی کھلائے، جو پہنتا ہے ان کو بھی پہنائے، اس لئے کہ چار آدمی کا کھانا پانچ آدمی سہولت سے کھا سکتے ہیں۔ (رد المحتار علی الدر ۵/۳۵۲)

قرآن وحدیث اور نصوص فقہیہ کی روشنی میں یہ طے ہوجاتا ہے کہ اولاد کو چاہئے کہ والدین کا پورا لحاظ کریں، اپنے حسن سلوک اور حسن معاشرت کے ذریعہ ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچائیں، ان کی کڑوی کسیلی سن کر، چیں بجبیں نہ ہوں، اپنی حق تلفی کی فکر کے بجائے فرض شناسی میں لگ جائیں، لاچاری اور بے بسی کی حالت میں ان کے بڑھاپے کی لاٹھی بنیں، نہ یہ کہ اولڈ ہاؤسیز میں ان کو ڈال کر تجہیز وتکفین کا انتظار کریں، یہی اسلام کا مطلوب ہے اور یہی دنیا کا دستور ہے۔

خلاصۂ جوابات:

۱۔ غض بصر، پردہ، اور استیذان جیسی انسدادی تدابیر اور دور حاضر میں احکام شرعیہ سے اجتناب، پہلوتہی، غیر محارم کے ساتھ بے محابہ اختلاط اور بے تکلفی کو دیکھتے ہوئے جداگانہ خاندانی نظام میں زندگی بسر کرنا بہتر ہے، تاہم اگر والدین زیادہ ضعیف ہوں اور انہیں ہروقت خدمت کی ضرورت ہو یا یتیم لڑکوں اور لڑکیوں کی کفالت اور پرورش کا مسئلہ درپیش ہو تو ان کو بھی مکان کے کسی علاحدہ کمرہ میں رکھنا چاہئے، اور ان کی پرورش اور تربیت کے جملہ امکانی اخراجات کا تکفل کیا جائے۔

۲۔ مشترکہ خاندانی نظام کی کفالت کی دو قسمیں ہیں:

الف۔ والد بقید حیات ہوں اور وہی خاندان کے نگران اعلی اور مالک ہوں اور تمام لڑکوں کی کمائی انہیں کے زیر ملک آتی ہو تو چونکہ والد ہی اصل مالک ہیں، اس لئے وہ حسب منشا تمام اولاد اور ان کے بیوی بچوں پر خرچ کے سلسلہ میں متبرع ہیں، لہٰذا صورت مذکورہ بالا میں والد پر کمی بیشی کا کوئی الزام عائد نہیں ہوگا۔

”وفی الخانية: زوج بنيه الخمسة فی داره وكلهم فی عياله واختلفوا فی المتاع فهو للأب وللبنين الثياب التی عليهم لا غير“ (ردالمحتار على الدر ٦-٥٠٢)

ب۔ والد بقید حیات نہ ہوں، ان کے وصال کے بعد سارے لڑکے والد کے ترکہ میں مشترکہ طریقہ پر کسب کرتے ہوں اور کسی کی کمائی ممتاز اور علاحدہ نہ ہو، بلکہ ہر ایک کی ملکیت مشترک ہو تو یہ شرکت شرکت ملک ہے جس میں عمل اور رائے کا اختلاف معتبر نہیں ہوتا، لہٰذا سارے بھائی اس میں برابر کے شریک ہوں گے، چونکہ عملی طور پر بھی ان کی رہائش ایک ساتھ ہے، لہٰذا اخراجات بھی ایک ساتھ ہوں گے، اور ان میں کوئی تمیز نہ ہوگا، خواہ کسی کا کنبہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو، ہر ایک کی ضروریات کی برآری میں ہر ایک متبرع سمجھا جائے گا، چنانچہ ”رد المحتار“ میں ہے:

”وكذا لو اجتمع إخوة يعملون فی تركة أبيهم ونمى المال فهو بينهم سوية، ولو اختلفوا فی العمل

والرأی، انتھی'' (رد المحتار علی الدر ۶-۵۰۲)

ج۔ اگر مشترکہ خاندانی نظام میں والد بقید حیات نہ ہوں اور سارے بھائی ایک ساتھ کماتے ہوں اور خورد ونوش اور رہائش کا انتظام علاحدہ ہو تو ان کے درمیان نفقہ معاہدہ کے تابع ہوگا۔

۳۔ اگر چند بھائیوں نے مل کر کمایا اور اپنی آمدنی والد یا کسی بھائی کے پاس اس طرح رکھ دیا کہ ہر ایک کی ملکیت مشترک ہوگئی ان کے درمیان باہم کوئی تمایز نہ رہا تو اگر گھر کے اخراجات سے بچی ہوئی رقم سے کوئی چیز خریدی گئی تو سبھی بھائی اس میں برابر کے حق دار ہوں گے، ''درمختار'' میں ہے:

"وما حصله أحدهما فله، وما حصلاه معاً فلهما نصفين، إن لم يعلم ما لكه" الخ''، اس کے تحت علامہ ابن عابدینؒ رقمطراز ہیں:

''يؤخذ من هذا ما أفتى به في الخيرية في زوج امرأة وابنها اجتمعا في دار واحدة، وأخذ كل منهما يكتسب علاحدة ويجمعان كسبهما ولا يعلم التفاوت ولا التساوي ولا التمييز، فأجاب بأنه بينهما سوية'' (رد المحتار علی الدر ۶-۵۰۲)

۴۔ اگر تین بھائی ہیں، دو بھائی اپنی پوری تنخواہ مثلاً دس دس ہزار روپے گھر میں دے دیتے ہیں اور ایک بھائی بیس ہزار روپیہ کماتا ہے وہ بھی دس ہزار گھر میں دیتا ہے اور دس ہزار الگ بچا کر رکھتا ہے تو وہ بچی ہوئی رقم کا تنہا مالک ہوگا، کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں ہوگا، کیونکہ اس نے بقیہ رقم کو بھائیوں کے رقم کے ساتھ ملایا نہیں ہے، لہذا اس پر شرکۃ ملک کی تعریف صادق نہیں آتی۔

۵۔ اگر خاندان کے کچھ افراد کماتے ہوں اور کچھ گھر کے کام دیکھتے ہوں تو کمانے والے اپنی کمائی کے مالک ہیں، اور گھر کے کام دیکھنے والے اگر ان کے حکم سے یا آپسی معاہدے سے گھر کا کام دیکھتے ہوں تو آپسی تعاہد اور تناصر کی بنا پر ایک دوسرے کے برابر کے شریک ہوں گے، ورنہ اس کی کمائی میں کوئی شرکت نہیں ہوگی، غرض یہ کہ مسئلہ مذکورہ کا دارومدار باہمی معاہدہ پر ہے۔

۶۔ والدین کی خدمت وکفالت جس طرح بیٹوں پر واجب ہے اسی طرح بیٹیوں پر بھی واجب ہے، دونوں یکساں طور پر ان کی خدمت وکفالت کے ذمہ دار ہیں۔ (ردالمحتار علی الدر ۵/۳۵۵، الفتاوی التاتارخانیہ ۳/۲۸۱)

بہو پر شوہر کے والدین کی خدمت نہ تو قضاءً واجب ہے نہ دیانۃً، البتہ اگر والدین خدمت کے محتاج اور خدمت بھی ایسی ہو جس کو شوہر سرانجام نہ دے سکتا ہو، اگر وہ بیوی کو خدمت کا حکم دے تو بیوی کے لئے شوہر کی اطاعت واجب ہوگی، ''درمختار'' میں ہے:

''وحقه عليها أن تطيعه في كل مباح يأمرها به'' اس کے تحت ابن عابدین فرماتے ہیں: ''ظاهره أنه عند الأمر به منه يكون واجباً عليها كأمر السلطان الرعية به''۔ (رد المحتار علی الدر ۴-۳۸۸)

۷۔ باقی بدن تو چھپا ہی رہتا ہے، چہرہ بھی کھولنے سے گریز کریں اور نامحرم کے ساتھ خلوت کا موقع کبھی نہ دیں، نہ ہی ہنسی مذاق کی کبھی نوبت آئے، یہ حکم اس وقت ہے، جبکہ مکان میں تنگی کی وجہ سے اتنی گنجائش نہ ہو کہ نامحرم کی آمد کے وقت مکان کے اندرونی حصہ میں چلی جائیں یا درمیان میں پردہ لٹکا دیں، اگر گنجائش ہو تو چہرہ چھپا کر بھی سامنے آنے سے اجتناب کریں، یہ تو عورتوں کے حق میں ہے۔

مردوں کے حق میں یہ ہے کہ جب مکان میں جائیں اطلاع کر کے نگاہ نیچی رکھ کر جائیں اور ہنسی مذاق اور خلوت سے کلی اجتناب کریں۔

☆☆☆

اسلام کا پسندیدہ خاندانی نظام

مفتی رضوان الحسن مظاہری[1]

(۱) اسلام کی نظر میں مشترکہ خاندانی نظام بہتر ہے یا جداگانہ زندگی بسر کرنے کا طریقہ؟

جواب:

''حدثنا هشام ابن عماد وداؤد بن رشيد ومحمد بن صباح قالوا: حدثنا وليد بن مسلم حدثنا وحشي بن جرب من أبيه عن جده قالوا: يا رسول الله! إنا نأكل ولا نشبع قال فلعلكم تأكلوا متفرقين قالوا: نعم۔ قال: فاجتمعوا على طعامكم وذكروا اسم الله عليه يبارك لكم فيه، وعن عبد الله بن عمر قال: سمعت ابي عمر بن الخطاب يقول: قال رسول الله ﷺ: كلوا جميعاً ولا تفرقوا، فإن البركة مع الجماعة'' (باب الاجتماع على الطعام، سنن ابن ماجه ۲۴۵)

حدیث شریف کی روشنی میں بعض اہل علم نے اس سے یہ استدلال پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ منکرات پر کنٹرول اور حجاب کی پوری پابندی اگر ہو سکے مثلاً: مشترکہ خاندانی نظام میں قریبی رشتے دار جو حقیقت میں محرم نہیں، بلکہ غیر محرم ہیں جن سے ربط وضبط کا واسطہ ہوتا ہے، جیسے چچازاد بھائی ہیں یا پھوپھوزاد بھائی ہیں وغیرہ وغیرہ تو حدیث میں جس اجتماعیت کے ساتھ کھانے میں برکت کی بات آئی ہے، اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے گھر کا ہر فرد ایک ساتھ کھائے تو اجتماعیت بھی قائم رہتی ہے اور برکت بھی ہوتی ہے۔ مگر یہ سب کچھ اس وقت ہے جب فتنہ کا خوف نہ ہو اور ہر فرد اپنے آپ کو اس سے مطمئن اور مامون پائے لیکن اس سے کون دانا انکار کی جرأت کر سکتا ہے کہ بہت سے احکام ہیں کہ ان کی اساس سماجی اقدار پر ہوتی ہے، اسی کو حضرت عائشہ جیسی بالغ نظر فقیہ نے واضح طور پر فرمایا کہ گو حضور اکرم ﷺ نے عورتوں کو مسجد میں نماز کی ادائیگی کی اجازت دی ہے، لیکن اگر آپ ﷺ آج کی عورتوں کے حالات دیکھتے ہوئے تو ضرور اس سے منع فرمادیا ہوتا۔ "لو أدرك رسول الله ﷺ ما أحدثت النساء لمنعهن" (درمختار علی الرد ۳/۳۶۱) اور خاص طور پر ہمارے زمانے کے سماج کے بارے یہ سمجھنا کہ مردوں کی نظر عورتوں کے چہرہ پر غیر شرعی جذبات سے عاری ہو کر پڑے گی، محض ایک خوش خیالی اور خام فکری کہلائے گی۔ اس لئے فی زمانہ فقہ کی اصطلاح میں ''سد ذریعہ'' کے طور پر وہی رائے قابل عمل ہے جو مالکیہ اور حنابلہ نے دی ہے۔ اسی لئے خود حنفیہ کے یہاں بھی متاخرین نے اجنبی مردوں سے چاہے وہ قریبی رشتہ دار کیوں نہ ہوں یا مشترکہ خاندانی نظام کے مرد کیوں نہ ہوں، چہرہ کو چھپانے کا حکم سختی کے ساتھ دیا ہے۔ علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

''فإن خاف الشهوة أوشك امتنع نظره إلى وجهها، فحل النظر مقيد بعدم الشهوة وإلا فحرام. وهذا في زمانهم، وأما في زماننا فمنع من الشابة''۔ (درمختار علی الدر ۳-۲۶۱)

اگر شہوت کا خوف یا شک ہو تو عورت کے چہرے کو دیکھنا ممنوع ہے، یہ حکم تو ان کے زمانے میں تھا، ہمارے زمانہ میں نوجوان کو مطلق منع کرتے ہیں۔

پردے کا دوسرا درجہ خاص طور پر ان غیر محرم رشتے داروں سے متعلق ہے جو کثرت سے گھروں میں آمد ورفت کرتے ہیں۔ اس لئے ان سے چہرے کے پردے میں ایک گونہ دقت ہے، اس لئے شہوت وبدکاری کا خوف نہ ہو تو ایسے رشتہ داروں کے سامنے چہرہ اور ہتھیلیاں کھولنے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ اس کی دلیل وہ روایات ہیں جن سے آپ ﷺ کا حضرت اسماء کو دیکھنا یا فتح مکہ کے موقع پر حضرت ام ہانی کو دیکھنا معلوم ہوتا ہے۔ تلاش وتتبع کی جائے تو اس طرح کی اور نظیریں بھی بہ آسانی مل سکتی ہیں۔ چنانچہ ''بزازیہ'' کی ایک عبارت سے بھی اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اجنبی اور ذی

[1] مدرسہ کرن، احمد نگر مہاراشٹر۔

رحم رشتہ داروں کے حکم میں فرق ہے، بشرط کہ شہوت کا اندیشہ بالکل نہ ہو۔اور اگر شہوت کا اندیشہ ہے تو پھر دونوں کے لئے یکساں حکم ہے۔

''والحکم بالفرق بین الأجنبی وذی الرحم إذا کان النظر لا عن شهوة. فأما بالشهوة. فلا یحل لأحد النظر''
(بزازیہ علی الهندیہ۶۔۳۷۷کتاب الاحسان، قاموس الفقہ)۔

فقہاء کرام کی تشریحات سے یہ بات اگرچہ ثابت ہے کہ مشترکہ خاندانی نظام من کے لئے شریعت وسعت اور گنجائش ضرور ہے، مگر فی زمانا مفاسد زیادہ ہیں، مقاصد سے بہتر یہی ہے کہ خاندانی نظام کو اس طرح سے چلایا جائے کہ والدین کے حقوق بھی ادا ہوں اور کا بھی دیکھ بھال ہو۔مثلاً ان کی امداد کا خیال بھرپور ہواور شریعت کا کوئی حکم بھی پامال نہ ہو،اس لئے راقم کا خیال ہے کہ جداگانہ نظام خاندانی مشترکہ نظام سے بہتر ہے۔

۲۔ اگر مشترکہ خاندان ہواور افراد خاندان کی ضروریات کے لئے سب مل کر خرچ دیں کسی کے بچے زیادہ ہوں اور کسی کے کم ہوں تو کیا ان سب پر برابر اخراجات عائد کئے جائیں گے، یا ان کے بچوں کی تعداد کے لحاظ سے؟

جواب:۲۔ اس طرح اگر مشترکہ نظام کے تحت کئی افراد ہوں، مثلاً تین بھائی ہوں اور ہر ایک اپنی اپنی تجارت، یا اور کوئی ملازمت وغیرہ کرتے ہوں، تو خانگی ضروریات میں سب مل کر خرچ کرنے میں یا تو فیصد طے کر لیں یا آپس میں جو بھی نوعیت ہو طے کر لیں۔اس صورت میں بہتر ہے کہ آپس میں کوئی معاہدہ کر لیں تا کہ بعد میں نزاع کی صورت پیدا نہ ہو۔

الف۔یا تو آپس مین ایک متعین مقدار ہر ایک کے ذمہ لازم کر دے جس کو ہر ایک ادا کرتا رہے اور اس میں افراد اور بچوں کی تعداد کا کوئی تذکرہ نہ ہو، جیسے بعض خاندانوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔

ب۔ یا پھر ہر ایک ضروریات کے لئے افراد اور بچوں کی حیثیت سے خرچ کے مقدار طے کریں یہ صورت نزاع کو ختم کرنے کے اعتبار سے بہتر ہے۔ اس لئے ہر شخص کے خرچ دے کر جو مال اس کے پاس ہے وہ اس کا مالک ہے، اس میں کسی کی شرکت نہیں ہے۔اور گھریلو ضروریات میں بھی ہر ایک اس اعتبار سے اخراجات برداشت کرے کہ دوسرے پر ظلم نہ ہو، ہر ایک کی کمائی اس کے خرچ اس کے بچوں اور اولاد کے اعتبار سے ہو، اس لئے کہ یہ خاندانی نظام اگر بعد میں بھی کسی بھی وجہ سے جدا ہونے پر مجبور ہوں، جیسے والدہ کا انتقال ہو جائے اور اب ہر ایک وارث اپنا اپنا جداگانہ نظام چاہتا ہے تو ہر ایک کی بچی ہوئی رقم اس کی ہوگی اس میں دوسرے بھائیوں کا دعوی درست نہیں ہے۔

''إن زیداً یسکن مع أبیه عمرو فی بیت واحد ویعیش، فلیس لإخوانه بعد وفاة أبیه إدخال ما کسبه زید فی الشرکة''۔(شرح مجلة الاحکام ۳۔۳۳۵ دفعہ نمبر:۱۳۹۸)

۳۔ اسی صورت میں اگر مختلف بھائیوں نے مل کر اپنے والد یا کسی بھائی کے پاس آمدنی جمع کی اور گھر کے اخراجات سے بچے ہوئے رقم سے کوئی چیز خریدی گئی تو اس میں سبھوں کا حصہ برابر ہوگا یا ہر ایک کی آمدنی کے لحاظ سے ہوگا۔

جواب:اس نوعیت کی مختلف شکلیں ہیں:

۱۔ مشترکہ نظام میں اگر چند بھائیوں نے مل کر اپنے سرپرست، مثلاً والد محترم کے پاس اپنی اپنی آمدنی جمع کی، اور اپنے سرپرست، یعنی باپ کو اس آمدنی کا مختار کل بنا کر اس کا مالک بنا دیا۔پھر والد نے گھر کے اخراجات سے بچے ہوئے مال سے کوئی چیز خرید لی تو اب خریدی ہوئی اشیاء باپ کی ملکیت ہے۔اور والد کے مرنے کے بعد ہر ایک بھائی کو برابر کا حصہ ملے گا۔(ابن مودود، الاختیار لتعلیل المختار ۲ر۵۴)

اور ''برہانیہ'' میں قبضہ کی شرط تو باپ اس پر قابض ہے اور عرفاً بھی ایسا ہی ہے بیٹا اپنے باپ کو رقم کا مالک بنا دیتے ہیں۔

۲۔ دوسری شکل جو واضح ہے یہ ہے کہ اگر بھائیوں نے مل کر آمدنی تو اپنے والد کے پاس جمع کرایا۔لیکن بطور امانت کے اور باپ کو اس مال کا مالک یا مختار نہیں بنایا اب والد نے گھر کے اخراجات سے بچی ہوئی رقم سے کوئی شیٔ خرید لی تو اس میں ہر ایک کا اس کی رقم اور آمدنی کے لحاظ سے ہوگا۔

''فشرکة الأملاك للعین یرثها رجلان أو یشتریانها. فلا یجوز لأحدهما أن ینصرف فی نصیب الآخر. إلا بإذنه وکل واحد منهما فی نصیب صاحبه کالأجنبی'' (ہدایہ)

چنانچہ شرکت املاک کوئی ایسی چیز ہے جس کے دو شخص وارث ہوں یا اسے دونوں نے مل کر خریدا ہو تو ان میں سے ہر ایک کے لئے دوسرے کے حصہ میں تصرف کرنا جائز نہیں، مگر اس کی اجازت سے اور دونوں میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے حصہ میں اجنبی کی طرح ہوں گے۔

۴۔ اگر تین بھائی ہیں دو بھائی اپنی پوری تنخواہ مثلاً دس ہزار روپے گھر میں دے دیتے ہیں اور ایک بھائی بیس ہزار روپیہ کماتا ہے وہ بھی دس ہزار روپیہ گھر میں دیتا ہے اور دس ہزار الگ بچا کر رکھتا ہے تو وہ بچی ہوئی رقم صرف اس کی ملکیت ہوگی یا تمام بھائیوں کی۔

جواب: اگر تین بھائی ہیں دو بھائی پوری پوری تنخواہ دس دس ہزار روپیہ گھر خرچ کے لئے دیتے ہیں اور تیسرا بھائی بیس ہزار میں سے دس ہزار گھر خرچ کے لئے دے کر بقیہ دس ہزار الگ بچا کر رکھتا ہے تو بچی ہوئی رقم (دس ہزار) اس کی ہی ملکیت شمار ہوگی۔ دوسرے دونوں بھائیوں کو اس میں کوئی حصہ وغیرہ نہ ملے گا۔

"إن زيداً يسكن مع أبيه عمرو في بيت واحد ويعيش من طعام أبيه وقد كسب مالاً آخر. فليس لإخوانه بعد وفاة أبيه إدخال ما كسبه زيد في الشركة" (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ۳/۴۴۵)، زید اپنے باپ عمرو کے ساتھ ایک گھر میں رہتا ہے اور اپنے باپ کے کھانے سے زندگی بسر کرتا ہے اور اس نے اپنی محنت سے دوسرا مال کمایا ہے تو اس کے باپ کی وفات کے بعد اس کے بھائیوں کو حق نہیں کہ زید نے جو مال کمایا ہے اس کو مال مشترک میں شامل کریں۔

''قال رسول اللهﷺ كل أحد أحق بماله من والده وولده والناس أجمعين'' (سنن دارقطني حديث: ۴۵۶۸، سنن كبرى للبيهقي حديث نمبر: ۱۶۱۷، سنن سعيد بن منصور: ۲۲۹۳)۔

فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ہر ایک اپنے مال کا اپنے والد اولاد اور تمام لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ حقدار ہے۔

۵۔ اگر خاندان کے کچھ افراد کماتے ہیں اور کچھ گھر کے کام دیکھتے ہیں اور اس طرح گھر کا کام چلتا ہے تو کیا کمانے والے حضرات کی آمدنی میں کام کرنے والے حضرات بھی برابر کے حقدار ہوں گے۔

جواب: سوال کے نقاط کو دیکھنے سے اس صورت کی بھی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں:

الف۔ خاندان کے کچھ افراد گھر کے کام دیکھتے ہیں، اور کچھ افراد کمانے میں مشغول ہیں اس طرح سے دونوں کے تعاون سے گھر کا کام چلتا ہے تو بہتر اور مناسب یہ ہوگا کہ گھر کے کچھ وہ افراد جو گھر کے کام میں مشغول ہیں ان کی تنخواہ طے ہو جائے اور کمانے والے حضرات کی آمدنی خود ان کی ہو جائے۔ "فإذا كان الأب مزارعاً والابن صانع أحذية، فكسب الأب من المزارعة والابن من صنعة الحذاء. فكسب كل واحد منهما لنفسه وليس للأب المداخلة في كسب ابنه لكونه في عياله". (درر الحکام ۳/۴۴۵)

(پھر اگر باپ کاشتکار ہو اور بیٹا جوتے بنانے والا ہو پھر باپ نے کاشتکاری سے کمایا اور بیٹے نے جوتے بنانے سے کمایا اور دونوں میں سے ہر ایک نے اپنے لئے کمائی کی تو کمائی خود اس کی ہوگی اور باپ کو اپنے بیٹے کی کمائی میں دخل دینے کا حق نہ ہوگا، اس لئے کہ کمانے والے جو ایک ساتھ رہتے ہیں اس کی آمدنی خود اس کی ملکیت ہے حتی کہ باپ کو بھی اس میں دخل کی گنجائش نہیں)۔

اس لئے گھر کام کرنے والے افراد کی تنخواہ پہلے ہی طے کرلیں تا کہ بعد میں کسی طرح کا کوئی آپسی تنازع نہ ہو۔

ب۔ دوسری شکل اگر سب مل کر باپ کے متروکہ مال یا مشترک مال سے شروع کردہ کاروبار کو بڑھانے میں لگے ہوں اور کچھ افراد گھر کے کام میں مشغول ہوں تو اس شکل میں آمدنی میں ہر ایک بھائی برابر کے شریک وحقدار ہوں گے۔

''كذلك لو كان إخوة أربعة في عائلة واحدة وسعوا في تكثير وتنمية الأموال الموروثة عن أبيهم فتنقسم الأقسام بينهم بالسوية، ولا ينظر إلى اختلاف عملهم واختلاف رأيهم'' (درر الحکام ۳-۴۴۵)

(اگر چار بھائی مشترک خاندان میں ہوں اور انہوں نے باپ سے وراثت میں ملے ہوئے مال کو بڑھانے کی کوشش کی تو برابری کے ساتھ ان کے درمیان حصے تقسیم کئے جائیں گے، اور ان کے عمل اور ان سبھوں کی رائے کے اختلاف کو پیش نظر نہیں رکھا جائے گا)۔

ج۔ تیسری شکل اگر ایک بھائی کا ذاتی کاروبار ہو اور دوسرے بھائی جن کا رہنا سہنا کھانا پینا ایک ساتھ ہو، لیکن کاروبار میں اس بھائی کے ساتھ کام کریں بطور تعاون تو یہ کام کرنے والے تعاون کرنے والے ہوں گے۔ اور پوری آمدنی اس بھائی کی ہوگی جس کا کاروبار ہے۔

''كذلك لو كان في عيال أحد ولد له وإخوان وعملوا في معيشة واكتسبوا أموالاً، فكافة الكسب لذلك الشخص ويكون هؤلاء معين له''۔ (درر الحکام ۳۔۴۴۵)

(ایسے میں اگر کسی کی کفالت میں اس کے بچے اور بھائی ہوں اور وہ ایک صنعت میں کام کریں اور مال کمائیں تو ساری آمدنی اس شخص کی ہوگی اور یہ لوگ اس کی مدد کرنے والے ہوں گے)۔

۶۔ والدین زندگی بھر بچوں کی خدمت بھی کرتے ہیں اور کفالت بھی، اور بڑھاپے میں انہیں خدمت اور کفالت کی ضرورت ہوتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ والدین کی خدمت وکفالت بیٹوں پر واجب ہے یا بیٹیوں پر بھی، اور اس سلسلہ میں بہو کی ذمہ داری کیا ہے، خاص کر جب بیٹیاں سسرال چلی جائیں اور ماں کو اپنی ضروریات کے لئے تعاون کی ضرورت ہو، اور وہ تعاون ایسا ہو جس کو بیٹا خود انجام نہ دے سکتا ہو تو بہو پر اس خدمت کو بجالانا واجب ہوگا یا نہیں؟

جواب: باپ کا نفقہ اس رشتہ کی بنا پر اس کا نفقہ اپنی اولاد کے ذمہ واجب ہے، بشرط کہ وہ کمانے سے معذور نہ ہو، لیکن عملاً بے روزگار اور تنگ دست ہو اور اپنی کفالت خود کرنے سے قاصر ہو، نیز اولاد کو یہ حق بھی نہ ہوگا کہ وہ باپ کو کمانے اور خود مکتفی ہونے کا مطالبہ کرے، اگر ایک شخص کے چند بچے ہوں اور سبھی معاشی اعتبار سے خوش حال ہوں تو نفقہ سبھوں پر مساوی تقسیم ہوگا اور اگر اس کی اولاد میں لڑکے بھی ہوں اور لڑکیاں بھی جو بذات خود مال رکھتی ہوں تو نفقہ ذکور (لڑکے) اور اناث (لڑکیاں) دونوں پر برابر تقسیم ہوگا، اور کمی بیشی نہ ہوگی (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۱/۵۸۸)۔ واضح ہو کہ یہ حکم اس وقت ہے جب لڑکیاں خود مالک جائداد ہوں شوہر کی مملوکہ جائداد کی وہ مالکہ نہیں سمجھی جائے گی۔ (قاموس الفقہ ۱/۴۵۵)

لہٰذا والدین کی کفالت وخدمت بیٹے پر خاص طور پر اور بیٹوں پر اگر مال دار ہوں۔

''يجب على الولد الموسر كبيراً كان أو صغيراً ذكراً أو أنثى نفقة والديه وأجداده وجداته الفقراء ولا يشارك الولد الموسر أحد في نفقة أصوله المحتاجين''۔ (مجموعہ قدوری پاشادوم ۲۰۲)

(صاحب مال اولاد پر، خواہ وہ بالغ ہو یا نابالغ اسی طرح وہ صاحب مال مذکر ہوں یا مؤنث ان کے محتاج والدین اور اصول (دادا، نانا اور دادی ونانی) کا نفقہ واجب ہے۔ اور ان کے محتاج اصول کے نفقہ کے سلسلے میں کوئی مالدار اولاد اس کا شریک نہ ہوگا)۔

اور ''فتاوی ہندیہ'' میں ہے:

''ويجبر الولد الموسر على نفقة الأبوين المعسرين'' (عالمگیری ۱۔۵۶۴)

اور مالدار اولاد کو محتاج والدین کے نفقہ پر مجبور کیا جائے گا، چاہے وہ مذکر ہوں یا مؤنث، اس لئے کہ لفظ اولاد دونوں کو مشترک ہے، مذکر کو بھی اور مونث کو بھی۔

۷۔ مشترکہ خاندان میں بہت سی دفعہ چچازاد بھائی بہن یا اس طرح کے دوسرے قریبی رشتہ داروں کا ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہوتا ہے، ایک ہی گھر میں خاص کر جب کہ وہ تنگ بھی ہو، رہنے کے باوجود ایک دوسرے سے مکمل پردہ نہیں ہو پاتا، اس صورت میں پردہ کا کیا احکام ہوں گے؟

جواب: مشترکہ خاندانی نظام کی کچھ وہ خرابیاں جو راقم نے تحریر کیا ہے اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مشترکہ خاندانی نظام میں پردہ سے متعلق لوگ بہت غفلت میں مبتلا ہیں۔ اس سلسلہ میں لوگ مطمئن ہیں کہ دین کے احکامات سماج کے اقدار پر ہوں۔ چاہے وہ خلاف شرع ہی کیوں نہ ہوں، حجاب معاشرے کی برائیوں کو روکنے میں اور بے حیائی کو ختم کرنے کے لئے نسخہ عظیم ہے، تھوڑی سی نفع کی امید میں راس المال کو ضائع نہ کیا جائے۔ مشترکہ خاندانی نظام کے بہانے اس حکم الہی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے، اسی کو حضرت عائشہؓ جیسی بالغ نظر فقیہہ نے واضح طور پر

فرمایا کہ گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو مسجد میں نماز ادا کرنے کی اجازت دی ہے۔ لیکن اگر آپ آج کی عورتوں کے حالات دیکھتے تو ضرور اس سے منع فرمادیتے۔ "لو أدرك رسول الله ﷺ ما أحدثت النساء لمنعهن" (درمختار علی الرد ۲۶۱/۳)

ہمارے زمانہ کے سماج کے بارے میں یہ سمجھنا کہ مردوں کی نظر عورتوں کے چہرے پر غیر شرعی جذبات سے عاری ہو کر آمنا سامنا ہوگا، محض ایک خوش خیالی اور خام فکری ہے، بہر حال غیر محرم رشتہ دار سے پردہ سے متعلق جبکہ ایک مشترکہ خاندانی نظام سے وابستہ ہوں قدرے نرمی ضرور ہے۔ چونکہ کثرت سے آمدورفت ہوا کرتی ہے، اس لئے ان سے چہرے کے پردہ میں ایک گونہ دقت ہے، اس لئے بدنگاہی وشہوت کا اندیشہ نہ ہو تو ایسے رشتہ داروں کے سامنے چہرہ اور ہتھیلیاں کھولنے کا جواز معلوم ہوتا ہے، اس کی دلیل وہ روایات ہیں جن سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت اسماءؓ کو دیکھنا یا فتح مکہ کے موقع پر حضرت ام ہانیؓ کو دیکھنا معلوم ہوتا ہے۔ اگر تلاش وتتبع کی جائے تو اس طرح کی اور نظیریں بہ آسانی مل سکتی ہیں۔

"بزازیہ" کی ایک عبارت سے بھی اس طرح اشارہ ہوتا ہے کہ اجنبی اور ذی رحم کے حکم میں یہ فرق ہے، بشرطیکہ شہوت کا بالکلیہ اندیشہ اور خوف نہ ہو۔ اور اگر اندیشہ شہوت موجود ہوں تو دونوں صورتوں میں حکم یکساں ہیں:

"والحكم ما الفرق بين الأجنبي وذى الرحم إذا كان النظر لا عن شهوة، فأمّا بالشهوة، فلا يحل لأحد النظر"۔ (بزازیہ علی الهنديه ۳۴۴/۶)

پردہ میں اجنبی اور ذی رحم کے درمیان فرق یہ شرط ہے کہ ذی رحم میں شہوت نہ ہو اور اگر شہوت ہے تو پھر پردہ کے معاملہ میں دونوں اجنبی اور ذی رحم برابر ہے، لہٰذا مشترکہ خاندانی نظام میں اپنی سہولت کی گنجائش ہے، جیسا کہ فقہاء کرام کی تشریحات سے معلوم ہوا، چہرہ اور ہتھیلیاں کھلا رکھے نہ کے دوسرے عضو۔ (قاموس الفقہ)

☆☆☆

مشترکہ اور جداگانہ نظام......بہتر کون؟

مولانا محمد فخر عالم نعمانی[1]

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خانگی زندگی:

جداگانہ خاندانی نظام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خانگی زندگی سے مشابہت رکھتا ہے، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیک وقت نو بیویاں تھیں (مشکوۃ شریف ۴۴۷) اور تمام ازواج کا قیام وطعام جداگانہ تھا، سب کے حجرے الگ الگ تھے، جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات سے زیادہ پاک دل اوران سے بڑھ کردوسروں کے حقوق کی رعایت کرنے والا دنیا میں کون ہوسکتا ہے؟ جیسا کہ قرآن شاہد ہے (سورہ احزاب ص ۳۲)، اگران کا مشترکہ نظام بنتا تو ہرقسم کی شرعی قباحت سے انکا بچنا دوسروں کے مقابلے میں بہت آسان تھا، لیکن اس کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشترکہ نظام اختیار نہیں فرمایا اور تمام ازواج مطہرات کے لئے قیام وطعام کا جداگانہ نظام قائم فرمایا۔

صحابۂ کرامؓ کی زندگی:

جداگانہ نظام کی تائید حضرت علیؓ کی رہائش سے بھی ہوتی ہے، تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے کہ حضرت علیؓ (حضرت فاطمہؓ کے ساتھ نکاح سے پہلے) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے اور انہی کی کفالت میں تھے، لیکن حضرت فاطمہؓ سے نکاح کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو حضرت حارثہ بن نعمان کے خالی مکان میں منتقل فرمادیا، اس کے بعد ہمیشہ انکا اپنا گھریلو نظام الگ رہا (سیرت النبیؐ ۱/۲۱۱ ص ۱/۲۱۲)۔ جداگانہ نظام اگر پسندیدہ (بہتر) نہ ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کیا ضرورت تھی حضرت علیؓ کو اپنے پاس سے ہٹا کر حضرت حارثہ بن نعمان کے خالی مکان میں رکھنے کی؟ ان دونوں واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشترکہ خاندان کے بالمقابل جداگانہ خاندانی نظام بہتر ہے، لہٰذا ہر والدین کو اپنے لڑکے کی شادی کے بعد الگ رہائش کردینا چاہئے، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؓ کے ساتھ کیا، کیونکہ حضرت علیؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہی کفالت میں تھے۔

جداگانہ نظام فقہاء کی نظر میں:

اللہ تعالیٰ نے شوہروں پر بیوی کے لئے فراہم رہائش کو واجب فرمایا ہے، قرآن میں ہے: واسکنوھن من حیث سکنتم من وجدکم ولا تضاروھن لتضیقوا علیھن (سورہ طلاق:۶)

(عورتوں کو رہنے کی جگہ دو جو تمہاری حیثیت کے مطابق ہو اوران کو تکلیف نہ پہنچاؤ کہ وہ تنگ آجائیں)۔

فقہاء کرام نے اس آیت کے ذیل میں رہائش کی تصریح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جداگانہ اور مخصوص مکان کی فراہمی عورت کا شرعی حق ہے جس میں وہ شخصی زندگی گزار سکے اور جو شوہر کے گھر والے اور رشتہ داروں کی آمدورفت سے محفوظ ہو۔ صاحب ''بدائع الصنائع'' فرماتے ہیں: "ولو أراد الزوج أن یسکنھا مع ضرتھا أو مع أحمائھا کأم الزوج وأختہ وبنتہ من غیرھا وأقاربہ، فأبت ذلك علیہ أن یسکنھا فی منزل مفرد، لأنہ ربما یؤذینھا ویضرون بھا فی المساکنۃ، وإباءھا دلیل الأذی والضرر"۔ (بدائع الصنائع ۳/۴۲۸۔۴۲۹ کتاب النفقۃ)

(اگر شوہر اپنی بیوی کو اس کے سوکن، دیوروں، شوہر کی ماں، بہن، لڑکی یا دیگر رشتہ داروں کے ساتھ رکھنا چاہے اور عورت اس کے لئے راضی نہ ہو تو شوہر پر لازم ہے کہ اس کو جداگانہ وعلیحدہ مکان میں رہائش دے، اس لئے کہ ایک ساتھ رہنے میں تکلیف ہوسکتی ہے اور عورت کا انکار اس کی علامت ہے)۔

---

[1] جامعہ ربانی منورا شریف، سمستی پور۔

بعض فقہاء کرام نے یہ واضح کیا ہے کہ متوسط گھرانوں میں کمرہ کے ساتھ مطبخ، بیت الخلاء اور پانی کا انتظام بھی جداگانہ ہونا چاہئے۔ شامی میں ہے:

ومراده لزوم كنيف ومطبخ وينبغي الإفتاء به (درمختار) أي بيت الخلاء وموضع الطبخ بأن يكونا داخل البيت أو في الدار لايشاركها فيهما أحد من أهل الدار، قلت: وينبغي أن يكون هذا في غير الفقراء الذين يسكنون في الربوع والأحواش بحيث يكون لكل واحد بيت يخصه، وبعض المرافق مشتركة كالخلاء وتنور وبئر الماء۔ (شامی ۵۔۲۵۵ کتاب الطلاق)

فقہاء کرام کی ان عبارات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت نے رہن سہن کے معاملے میں ہر فرد کی شخصی (پرائیویسی) زندگی اور اس کے تقاضوں کا پورا خیال رکھا ہے اور کسی فرد کو مشترکہ طور پر زندگی گزارنے کے لئے مجبور نہیں کیا ہے، پس شریعت کے عام اصول کے مطابق (دفع مضرت جلب منفعت سے زیادہ ضروری ہے) بعض اہم مقاصد کے حصول کے لئے مشترکہ خاندانی نظام کے بجائے دفع مضرت کے لئے جداگانہ خاندانی نظام زیادہ لائق ترجیح اور قابل قبول ہوگا۔

گھر کے اخراجات کی تقسیم میں بچوں کی تعداد کا لحاظ:

(۲) اگر مشترکہ خاندان ہو اور افراد خاندان کی ضروریات کے لئے سب مل کر خرچ کریں کسی کے بچے زیادہ ہوں اور کسی کے بچے کم تو کیا ان سب پر برابر اخراجات عائد کئے جائیں گے یا ان کے بچوں کی تعداد کے لحاظ سے؟

عقل اور قیاس کی رو سے لگتا ہے کہ جس کے بچے زیادہ ہوں اس پر زیادہ اخراجات عائد کئے جائیں اور جس کے بچے کم ہوں ان پر کم اخراجات عائد کئے جائیں، لیکن کوئی دانشمند آدمی یہ نہیں کہتا ہے کہ مشترکہ نظام میں جس کی خوراک اور قد وقامت زیادہ ہو اس پر زیادہ اخراجات عائد ہوں اور جس کی خوراک اور قد وقامت پست اور کم ہوں تو اس پر کم اخراجات عائد ہوں، اس لئے کہ ہر آدمی کی خوراک وصحت ایک جیسی نہیں ہے کوئی موٹا، لمبا ہے تو کوئی چھوٹا، ناٹا ہے۔ موٹا، لمبا ہے تو اس کے کپڑے وغیرہ میں خرچ زیادہ لگیں گے دبلا وچھوٹا ہے تو اس کے کپڑے وغیرہ میں خرچ کم لگیں گے۔ ظاہر بات ہے کہ مشترکہ نظام میں ان سب تفاوت کا اعتبار نہیں، کیونکہ مشترکہ نظام میں باہمی تعاون کے جذبہ کی بنیاد پر اس طرح کے تفاوت کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور یہی مشترکہ نظام کی روح ہے، مشترکہ نظام کے مقصد کا تقاضا ہے کہ سب پر برابر اخراجات عائد کئے جائیں۔ بچوں کی تعداد کا لحاظ نہ کیا جائے، تاکہ مشترکہ نظام کی روح اور اس کے مقاصد باقی رہیں، ورنہ ایک خطرناک صورت ظاہر ہوگی جس سے مشترکہ نظام کا شیرازہ پارہ پارہ ہوجائے گا۔ مشترکہ نظام کا مشہور طریقہ ہے کہ خاندان کا ہر فرد اپنی طاقت ووسعت کے مطابق کام کرے اور اپنی حیثیت کے بقدر حصہ داری نبھائے۔ مشترکہ نظام میں آمدنی بخرچ کا تناسب نہیں دیکھا جاتا ہے، بلکہ ہر فرد کو اس نظام کا رکن (ممبر) سمجھا جاتا ہے، مشترکہ نظام میں والد یا امیر کنبہ کا اصل ہوتا ہے اور باقی لوگ اس کے مددگار سمجھے جاتے ہیں اور اصل کے واسطے سے موجودہ چیزوں پر سب کا حق برابر مانا جاتا ہے۔ اس مسئلہ کی تائید فقہاء کرام کی اس عبارت سے ہوتی ہے۔

''وكذا لو اجتمع أخوة يعملون في تركة أبيهم ونمى المال فهو بينهم سوية، ولو اختلفوا في العمل والرأي۔ (شامی ۶۔۳۹۲ فصل فی الشرکۃ الفاسدۃ)

اگر کئی بھائی مل کر باپ کے ترکہ سے کاروبار کریں تو منافع (فائدہ) میں سب برابر کے شریک ہوں گے۔ اگرچہ کام وتجربات کے لحاظ سے ان میں فرق ہو۔ یہ عبارت اس بات پر دلالت کررہی ہے کہ شرکاء کے درمیان محنت وعمل میں واضح فرق کے باوجود تمام شرکاء منافع میں برابر کے حقدار ہوں گے۔

''الأب وابنه يكتسبان في صدقة واحدة، ولم يكن لهما شئ كالكسب فكله للأب إن كان الابن في عياله لكونه معينا، ألا ترى لو غرس شجرة تكون للأب'' (شامی ۶۔۳۹۲، فصل فی الشرکۃ الفاسدۃ)

باپ بیٹے دونوں ایک ساتھ مل کر کوئی کام کرتے ہوں اور دونوں میں سے کسی کا مال لگا ہوا نہ ہو۔

مثلاً مزدوری (کاریگری) کرتے ہوں، پس اگر بیٹا باپ کے ساتھ رہا ہو تو ساری کمائی باپ کی ہوگی اور بیٹا صرف اس کا مددگار مانا جائے گا۔

عبارت بالا میں بیٹے کی آمدنی کا مالک باپ کو قرار دینا ثابت کرتا ہے کہ اس آمدنی میں ان بھائیوں کا بھی حق ہوگا جو باپ کے ساتھ اس مال کے کمانے میں شریک نہیں ہیں۔

بچی ہوئی رقم سے خریدی گئی چیز کا حکم:

۳۔ اگر مختلف بھائیوں نے مل کر اپنے والد یا کسی بھائی کے پاس آمدنی جمع کی اور گھر کے اخراجات سے بچی ہوئی رقم سے کوئی چیز خریدی گئی تو اس میں سبھوں کا حصہ برابر ہوگا۔ یا ہر ایک کی آمدنی کے لحاظ سے ہوگا؟

تمام بھائیوں کا حق برابر ہوگا۔ علامہ شامی نے اپنی کتاب شامی میں ایک عنوان لگایا ہے:

"اجتمعا فی دار واحدة واکتسبا ولا یعلم التفاوت فهو بینهما بالسویة" کہ گھر کے مختلف لوگ کام کر کے والد یا امیر کنبہ کے پاس جمع کرتے ہوں اور تفاوت معلوم نہ ہو تو سب لوگوں کا حق برابر ہوگا، آمدنی کے فرق کا لحاظ نہیں ہوگا، کیونکہ فقہاء عظام نے لکھا ہے کہ ہر ایسا مشترک معاملہ جہاں کئی شرکاء کی ملکیتیں مل جائیں اور امتیاز نہ رہے وہاں تمام شرکاء کا حق برابر مانا جائے گا۔ شامی میں ہے:

"وما حصله أحدهما فله وما حصلاه معاً فلهما إن لم یعلم مالکه (در مختار) قوله: وما حصلاه معاً یعنی ثم خلطاه وباعاه ... وإن لم یعرف مقدار ماکان لکل منهما صدق کل واحد منهما أی النصف؛ لأنهما استویا فی الاکتساب وکان المکتسب فی أیدیهما فظاهر أنه بینهما نصفان ...ویؤخذ من هذا ما أفتی به فی الخیریة فی زوج امرأة وابنها اجتمعا فی دار واحدة، وأخذ کل منهما یکتسب علیحدة، یجمعان کسبهما، ولا یعلم التفاوت ولاالتساوی ولاالتمیز، فأجاب بأنه بینهمابینهماسویة" (شامی ۶-۳۹۲ فصل فی الشرکة الفاسدة)

(مال ایک نے حاصل کیا تو اسی ایک کو ملے گا اور دونوں نے مل کر حاصل کیا تو دونوں کو آدھا آدھا ملے گا دونوں نے ساتھ حاصل کیا، پھر دونوں نے مال کو ملا کر بیچا...... اگر دونوں کی الگ الگ مقدار معلوم نہ ہو تو نصف تک ہر ایک کی بات مانی جائے گی، اس لئے کہ کمانے میں دونوں شریک ہیں اور گویا کہ کمایا ہوا مال دونوں کے قبضے میں ہے، پس ظاہر ہے کہ دونوں کے درمیان آدھی آدھی تقسیم ہوگی...... اسی بنیاد پر فتاوی خیریہ میں ایک جزئیہ یہ بیان کیا گیا کہ عورت کا شوہر اور اس کا بیٹا دونوں ایک گھر میں رہتے ہوں اور علیحدہ علیحدہ کماتے ہوں اگر دونوں اپنی کمائی کو ملا دیں اور پتہ نہ چل سکے کہ کس کا کتنا حصہ ہے تو دونوں کا حق برابر ہوگا)۔

اس عبارت سے یہ مسئلہ واضح ہو گیا کہ والد یا امیر کنبہ کے پاس جمع شدہ رقم میں سب کا برابر حق ہوگا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تفاوت معلوم نہ ہو اور امتیاز نہ رہا ہو اور اگر تفاوت معلوم ہو اور امتیاز اور تعیین ممکن ہو، جمع کا تناسب معلوم ہو تو جس تناسب سے رقم جمع کی گئی اسی تناسب سے ہر ایک کا حصہ ہوگا۔ جیسا کہ عالمگیری میں مذکور ہے: "إلا إذا کان لها کسب علیحدة فهو لها، کذا فی القنیة (فتاوی عالمگیر ۲/۳۲۹ کتاب الشرکة)۔ مگر جبکہ اس کی کمائی الگ ہو تو وہ کمائی اسی کی ہوگی۔

زیادہ کمانے والے بھائی کی زائد آمدنی میں دوسرے بھائیوں کا حق:

(۴) اگر تین بھائی ہیں دو بھائی اپنی پوری تنخواہ مثلاً دس ہزار روپے گھر میں دے دیتے ہیں اور ایک بھائی بیس ہزار روپے کماتا ہے وہ بھی دس ہزار روپے گھر میں دیتا ہے اور دس ہزار روپے الگ بچا کر رکھتا ہے تو وہ بچایا ہوا روپیہ صرف اسی کا ہوگا اس میں دوسرے بھائیوں کا کچھ بھی حق نہ ہوگا۔ اس لئے کہ یہ روپیہ شرکت کے دائرے سے خارج ہے، یہ اس کی ذاتی ملک ہے، جس کو اس نے اپنے لئے جمع کیا ہے۔ شرکت تمام بھائیوں کی صرف اسی مال میں ہوگی جو اس غرض سے اس میں شامل کیا جائے گا اور اس روپیہ میں جس کو اس نے الگ کر رکھا ہے اس میں کسی بھائی وغیرہ کا کچھ حق وحصہ نہ ہوگا۔

کمانے والے حضرات کی آمدنی میں گھر کا کام کرنے والوں کا حصہ:

(۵) اگر خاندان کے کچھ افراد کماتے ہیں اور کچھ گھر کا کام دیکھتے ہیں اور اس طرح گھر کا کام چلتا ہے تو کیا کمانے والے حضرات کی آمدنی میں کام کرنے والے حضرات بھی برابر کے حقدار ہوں گے؟

مسئلے کی دو شکل بن سکتی ہے:

(الف) مشترک کاروبار ہو کچھ لوگ کاروبار میں لگے ہوں اور کچھ افراد گھر کے معاملات دیکھتے ہوں تو کاروبار میں لگے افراد کی آمدنی میں گھر کے کام کرنے والے حضرات بھی برابر کے حصہ دار ہوں گے، کیونکہ گھر اور کاروبار دونوں کے شرکاء ایک ہیں فقط کام کو تقسیم کر دیا گیا ہے۔

(ب) کاروبار مشترک نہ ہو، بلکہ کچھ لوگ اپنے اپنے طور پر کام کرتے ہوں اور کمائی میں سے کچھ رقم گھر کے خرچ کے لئے دیتے ہوں اور کچھ اپنے پاس جمع کر لیتے ہوں اور کچھ لوگ گھر کے کام میں مشغول ہوں، کوئی آمدنی والا کام نہ کرتے ہوں تو کمانے والے کی اس رقم میں جو گھر کے خرچ کے لئے دی ہے سارے افراد برابر کے حصہ دار ہوں گے، لیکن وہ رقم جو کمانے والے نے اپنے پاس محفوظ رکھی ہے اس میں دوسرے حضرات حقدار نہ ہوں گے، کیونکہ جو مال انسان کی ذاتی ملکیت سے نہیں نکلا اس پر دوسرے کا حق کیسے ثابت ہو سکتا ہے؟

والدین کی خدمت اور ان کی ذمہ داریاں:

(۶) والدین ساری زندگی بچوں کی خدمت کرتے ہیں اور کفالت بھی اور بڑھاپے میں انہیں خدمت و کفالت کی ضرورت ہوتی ہے؟ شریعت مطہرہ ایسے وقت میں والدین کی خود کفالت کی ذمہ داری اولاد پر عائد کرتی ہے، حق تعالیٰ نے والدین کے ادب واحترام اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کو اپنے شکر کے ساتھ ملا کر واجب فرمایا ہے، جیسا کہ ''سورہ لقمان'' میں اپنے شکر کے ساتھ والدین کے شکر کو لازم فرمایا ہے: "أن اشكر لي ولوالديك" (سورہ لقمان: ۱۴) (یعنی میرا شکر ادا کرو اور اپنے والدین کا بھی) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ جل شانہ کی عبادت کے بعد والدین کی اطاعت سب سے اہم ہے اور اللہ تعالیٰ کے شکر کی طرح والدین کا شکر گزار رہنا واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وبالوالدين إحساناً إما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما" (بنی اسرائیل: ۲۳)

والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو اگر پہنچ جائیں تیرے پاس، یعنی تیری کفالت میں ان دونوں میں کا ایک یا دونوں حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص اپنے والد کے ساتھ حاضر ہوا اور عرض کیا، "یا رسول اللہ إن لي مالا وان لي أبا وله مال وان أبي يريد أن يأخذ مالي فقال رسول الله ﷺ: أنت ومالك لأبيك". (ابوداؤد شریف ۲؍۱۵۰ کتاب البیوع باب الرجل یاکل من مال ولدہ، ابن ماجہ ۱۶۵ ابواب التجارات)

یا رسول اللہ میرے پاس مال ہے اور میرے والد کے پاس بھی مال ہے پھر بھی میرے والد میرا مال لینا چاہتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم اور تمہارا مال تمہارے باپ کا ہے۔

اگر نابالغ یا معذور اولاد ماں باپ کی کفالت میں ہو تو ماں باپ کے ساتھ ان کی چھوٹی اولاد کا نفقہ بھی حسب گنجائش کمانے والی اولاد پر واجب ہوگا۔ (بدائع الصنائع ۳؍۴۴۳ کتاب النفقۃ، فتاوی عالمگیری ۱؍۵۶۱ نفقۃ ذوی الارحام)

بیٹی کی ذمہ داری: والدین کی خدمت و کفالت کی ذمہ داری صرف بیٹوں پر ہی نہیں ہے بلکہ والدین کی خدمت و کفالت کی ذمہ داری بیٹوں اور بیٹیوں دونوں پر برابر ہے۔ (شامی ۵؍۲۸۱، باب نفقۃ الاصول فتاوی عالمگیری ۱؍۵۶۴ نفقۃ ذوی الارحام)

اگر والدین چلنے پھرنے سے مجبور ہوں اور ان کی دیکھ ریکھ کرنے والا کوئی نہ ہو صرف ایک شادی شدہ بیٹی ہو جو اپنے سسرال میں رہتی ہو تو اس بیٹی کی ذمہ داری ہے کہ وہ باپ کے گھر آ کر ماں باپ کی دیکھ ریکھ کرے، خواہ اس کا شوہر راضی ہو یا نہ ہو۔ (شامی ۵؍۲۵۷ کتاب الطلاق)

بہو کی ذمہ داری:

شریعت اسلامیہ نے بہو پر شوہر کے والدین کے لئے کوئی ذمہ داری قانوناً نہیں سونپی ہے، بلکہ وہ جس شخص کی بیوی ہے اس کی خدمت بھی اس کے اوپر واجب نہیں ہے، اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر شوہر بغیر پکا ہوا کھانا لائے اور عورت پکانے سے انکار کردے تو عورت کو مجبور نہیں کیا جائے گا، بلکہ شوہر کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ بیوی کے لئے پکا ہوا کھانا لائے۔

''امتنعت المرأة) عن الطحن والخبز ... فعليه أن يأتيها الطعام مهيأً'' (شامی ۵۔۲۲۱ کتاب الطلاق بدائع الصنائع ۳۔۴۳۰ کتاب الفقه)

اس عبارت سے پتا چلتا ہے کہ عورت کو شوہر کے کام کے لئے مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے تو شوہر کے والدین کی خدمت اور دیکھ ریکھ کے لیے کیسے مجبور کیا جاسکتا ہے؟ ہاں اخلاقی طور پر اور ''المعروف کالمشروط'' کی بنیاد پر شوہر کے والدین کی خدمت و دیکھ ریکھ کی ذمہ داری عائد کی جاسکتی ہے۔

غیر محرم رشتہ داروں سے پردہ:

(۷) مشترکہ خاندانی نظام میں ایک بڑا مسئلہ غیر محرم رشتہ داروں سے پردہ کا ہے۔ دراصل اسلام نے جن چیزوں کو جرائم اور انسانیت کے لئے مضر قرار دیکر قابل سزا جرم کہا ہے ان کے مقدمات پر بھی پابندی عائد کی اور ان کو ممنوع قرار دیا اس معاملے میں مقصود اصلی زنا اور بدکاری سے بچانا تھا تو "يغضوا من أبصارهم" (سورہ نور: ۳۰) کہہ کر نظر نیچے رکھنے کے قانون سے شروع کیا۔ "فسئلوهن من وراء حجاب" (سورہ احزاب: ۵۳) کہہ کر عورتوں مردوں کے بے محابا اختلاط کو روکا۔ "وقرن في بيوتكن" (سورہ احزاب: ۳۳) فرما کر عورتوں کو گھروں کی چہار دیواری میں محدود رکھنے کی ہدایت کی اور "يدنين عليهن من جلابيبهن" (سورہ احزاب: ۵۹) کہہ کر ضرورت کے وقت برقع یا لمبی چادر سے پورا بدن چھپا کر اور سڑک کے کنارے چلنے کی ہدایت دی۔

عورتوں کا پردہ شرعاً سد ذرائع کے اصول پر مبنی ہے۔ قرآن کریم میں ہے: "وإذا سألتموهن متاعاً فسئلوهن من وراء حجاب ذلكم أطهر لقلوبكم وقلوبهن"۔ (سورہ احزاب: ۵۳)

جب مانگنے جاؤ بیویوں سے کوئی چیز کام کی تو مانگو پردے کے باہر سے اس میں خوب ستھرائی ہے، تمہارے دل کو اور ان کے دل کو، یعنی عورتوں سے اگر دوسرے مردوں کو کوئی استعمال چیز برتن، کپڑا وغیرہ لینا ضروری ہو تو سامنے آکر نہ لیں، بلکہ پردہ کے پیچھے سے مانگیں یہ پردے کا حکم مردوں اور عورتوں دونوں کے دلوں کو نفسانی وساوس سے پاک رکھنے کے لئے دیا گیا ہے۔

اس آیت میں قابل غور بات یہ ہے کہ پردے کا حکم جن عورتوں اور مردوں کو دیئے گئے ہیں۔ ان میں عورتیں تو ازواج مطہرات ہیں جن کے دلوں کو پاک وصاف رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے جس پر: "ليذهب عنكم الرجس أهل البيت" (سورہ احزاب: ۳۳) دال ہے۔

(تاکہ دور کردے تم سے گندی باتیں اے نبی کے گھر والو)۔

حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے: عن عقبة بن عامر رضي الله تعالى عنه أن رسول الله ﷺ قال: إياكم والدخول على النساء فقال: رجل من الأنصار أفرأيت الحمو؟ قال الحمو الموت. (رواه البخاري والمسلم والترمذي) والحم هو اخو الزوج ومن أولى به كالاخ والعم وابن العم ونحوهم، وهو المراد ههنا كذا فسره الليث بن سعد وغيره'' (كذا في الترغيب للمنذر ۳/۶۶)

(حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ عورتوں کے پاس جانے سے بچو۔ ایک انصاری صحابیؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ دیور کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دیور تو موت ہے)۔

عام طور پر دیور وغیرہ سے لوگ مذاق اور بے تکلفی کا رشتہ تصور کرتے ہیں، اس لئے وہاں تنہائی اور بے پردگی اور بھی زیادہ خطرناک ہے۔

اس حدیث سے تمام قریبی غیر محرم رشتہ داروں کا بھی حکم معلوم ہو گیا، جیسا کہ حدیث کی تفسیر سے واضح ہے، کیونکہ قریبی رشتہ داروں سے بھی بے تکلفی میں خطرات اور فتنہ میں پڑنے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔ اس لئے حتی الامکان قریبی غیر محرم رشتہ داروں سے بھی پردہ میں احتیاط کرے۔ تنہائی

میں اکٹھا ہونے سے پرہیز کرے، ہنسی مزاق اور بے تکلفی سے دور رہے اور دل ونگاہ کو پاک وصاف رکھے۔

اس کے بعد بھی اگر مشترک نظام اور کئی خاندان کے ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے جہاں ایک دوسرے کا آمنا سامنا ہونے سے بچنا بہت مشکل ہو سامنا ہو جائے اور نظر پڑ جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

سوالات کے مختصر جوابات:

۱۔ دور حاضر میں مختلف مصلحتوں کے مدنظر مشترکہ خاندانی نظام کے مقابلے میں جداگانہ خاندانی نظام بہتر ہے اور اس میں شرعی حدود کی زیادہ پاسداری ہے دوسروں کے حقوق کی زیادہ رعایت اور منہی عنہ سے تحفظ زیادہ ممکن ہے۔

۲۔ اگر مشترکہ خاندان ہو اور افراد خاندان کی ضروریات کے لئے سب مل کر خرچ دیں تو سب پر برابر اخراجات عائد کئے جائیں گے، خواہ کسی کے بچے کم ہوں یا زیادہ۔

۳۔ صورت مذکورہ میں اگر مختلف بھائیوں سے مل کر اپنے والد یا کسی بھائی کے پاس آمدنی جمع کی اور گھر کے اخراجات سے بچی ہوئی رقم سے کوئی چیز خریدی گئی تو اس میں سبھی بھائی کا حصہ برابر ہوگا آمدنی کا لحاظ نہیں ہوگا۔

۴۔ اگر تین بھائی ہیں دو بھائی اپنی پوری تنخواہ مثلاً دس ہزار روپے گھر میں دیتے ہیں اور ایک بھائی بیس ہزار روپے کماتا ہے وہ بھی دس ہزار گھر میں دیتا ہے اور دس ہزار الگ بچا کر رکھتا ہے تو وہ بچی ہوئی رقم صرف اس کی ملکیت ہوگی اس پر بھائیوں کا کوئی حق نہیں ہوگا۔

۵۔ اگر خاندان کے کچھ افراد کماتے ہیں اور کچھ گھر کے کام دیکھتے ہیں اور اس طرح گھر کا کام چلتا ہے تو کمانے والے حضرات کی آمدنی میں گھر کے کام کرنے والوں کا کوئی حق نہیں ہوگا۔

۶۔ والدین کی خدمت وکفالت کی مکمل ذمہ داری اولاد پر ہے، خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی، بہو پر قانوناً کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

۷۔ عام غیر محرموں کی طرح خاندان کے غیر محرموں سے بھی پردہ واجب ہے، بلکہ باہم بے تکلفی کی وجہ سے خطرات زیادہ ہیں، اس لئے حتی الامکان پردہ کا اہتمام ضروری ہے۔

☆☆☆

اسلام کا عائلی اور خاندانی نظام

مولانا افتخار احمد مفتاحی [1]

مذاہب اسلام ساری دنیا کے لئے پیام رحمت بن کر آیا ہے اور وہ ایسا مثالی وفلاحی نظام حیات قائم کرنا چاہتا ہے کہ ہر فرد ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک اور اس کا مخلص اور خیر خواہ ہو اور بوقت ضرورت اس کے کام آئے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الخلق کلھم عیال اللہ فأحبھم إلی اللہ أنفعھم بعیالہ (طبرانی)

ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، پس ان میں سے اللہ کو وہ زیادہ محبوب ہے جو اس کے کنبہ کو زیادہ نفع پہنچاتا ہے۔

''ترمذی شریف'' اور ''ابوداؤد شریف'' میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی موجود ہے کہ "الراحمون یرحمھم الرحمن ارحموا من فی الأرض یرحمکم من فی السماء" (رحم کرنے والوں پر رحم کرتا ہے زمین والوں پر رحم کرو تم پر آسمان والا رحم کرے گا)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین رحمت پوری کائنات کے لئے رحمت ومحبت کا پیغام ہے اور یہ فقط انسانوں ہی کے ساتھ نہیں بلکہ شجر وحجر اور حیوانات کے لئے بھی رحمت ہے، چنانچہ ارشاد گرامی ہے: "فی کل کبد رطب صدقۃ" (ہر جاندار کے ساتھ سلوک کرنا صدقہ ہے) اس طرح آپ نے ہرے بھرے درختوں کو بھی بلا ضرورت کاٹنے سے منع کیا ہے۔

اسلام کا عائلی وخاندانی نظام بھی چھوٹے پیمانے پر اس کے عام نظام زندگی کی ایک جھلک ہے، کیونکہ خاندانی نظام کی بنیاد بھی خدا ترسی وانسان دوستی پر ہے اور خونی رشتے اور نسلی ونسبی تعلق کو مقدس ولائق احترام قرار دینے کے ساتھ اس کا حد درجہ خیال رکھنے کی تاکید کرتا ہے، صلہ رحمی پر زور دیتا ہے اور قطع رحمی سے منع کرتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "من أراد منکم أن یسألہ فی أثرہ ویبارك لہ فی رزقہ فلیصل رحمہ" (تم میں سے جو چاہتا ہے کہ اس کی عمر میں اضافہ ہو اور اس کے رزق میں برکت ہو تو اسے صلہ رحمی کرنی چاہئے)۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں تو کتاب وسنت کی اتنی واضح تعلیمات موجود ہیں کہ شاید دنیا کے کسی صحیفہ اخلاق وتعلیمات میں نہ ہوں، والدین کے طرز عمل اور ان کی کسی بات پر ان کو جواب دینا تو درکنار انہیں زبان سے ''اف'' تک کہنے سے منع کیا گیا ہے: "لا تقل لھما أف ولا تنھرھما" (سورہ اسراء: ۲۳) ان کے ساتھ تن کر اور اکڑ کر نہیں، بلکہ نہایت درجہ عاجزی اور خاکساری کے ساتھ پیش آنے کا حکم ہے۔

حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ نے اپنی مشترکہ والدہ کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلہ رحمی کا حکم دیا اور اس کی تاکید کی، ایک صاحب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میرے حسن سلوک کا زیادہ حقدار کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہاری ماں اسی طرح تین بار آپ نے ان کے جواب میں ماں کی خدمت کا حکم دیا اور چوتھی بار کے سوال پر باپ کے ساتھ بھی یہی حکم ہوا اس سے آگے بڑھ کر حدیث شریف میں والد کے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک کو بہتر کار خیر بتایا گیا۔

''مسلم شریف'' میں ارشاد ہے کہ بہترین نیکی کسی آدمی کا اپنے باپ کے مرنے کے بعد ان کے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک ہے، چچا کو باپ کے برابر بتایا گیا بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کی خاص تاکید کی گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "من عال جاریتین حتی تبلغا جاء یوم القیامۃ (وکنت) أنا وھو ضم أصابعہ وعندہ دخلت أنا وھو الجنۃ کھاتین وأشار إصبعیہ"۔ (مسلم)

(جس نے دو لڑکیوں کی پرورش ان کے بالغ ہونے تک کی تو قیامت کے دن وہ میں اس طرح ایک ساتھ ہوں گے (اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] مفتاح العلوم، مئو۔

نے انگلیاں ملاکر دکھائیں، اور ترمذی کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اور وہ جنت میں اس طرح داخل ہوں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو انگلیوں کی طرف اشارہ کیا)۔

اسلام نے اپنے ماتحتوں کی معاشی کفالت اور خبر گیری کا حکم دیا ہے اور کسی فرد کو لاوارث، محروم اور بے یار ومددگار نہیں چھوڑا اور عورتوں، بچوں، یتیموں اور تمام کمزور افراد کی اجتماعی وہمہ جہت خبر گیری اور ان کی دینی ودنیوی خیر وصلاح کی ذمہ داری مردوں کے سپرد کر کے ان کا بوجھ ہلکا کر دیا گیا، الغرض اسلام نے مردوں پر کسب معاش اور گھر کے باہر کی ذمہ داریاں اور عورتوں پر خاص طور پر گھریلو ذمہ داریاں ڈال کر ایک ایسا خاندانی نظام بنانا چاہا جس میں بزرگوں، والدین اور خاندان کے باشعور افراد کی بالادستی حاصل ہو اور وہ شفقت ومحبت کے ساتھ تمام خاندانی افراد کی سرپرستی کریں اور چھوٹے اپنے بڑوں کی تعظیم کریں اور یہ چیزیں مشترکہ خاندانی نظام میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے، اس لئے اس نظام کی خوبیوں سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس بات پر بھی غور کرنا ہے کہ اس کے مضرات کیا ہیں اور اس کے برخلاف جداگانہ خاندانی نظام میں اچھائیاں اور خرابیاں کیا ہیں؟

مشترکہ خاندانی نظام میں عورت بہت سے اسلامی تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر رہتی ہے، جبکہ اسے نفسیاتی طور پر بھی بہت سی الجھنیں پیش آتی ہیں، مثلاً قرآن نے: "نسائكم حرث لكم فأتوا حرثكم أنى شئتم" کہہ کر عورت کو مرد کی کھیتی قرار دیا اور جنسی تسکین حاصل کرنے کا سبب فراہم کیا اور مرد وعورت کو بے تکلفی سے رہنے اور لطف اندوز ہونے کا ذریں موقع عطا کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "إذا الرجل دعا زوجته لحاجته فلتأته وإن كانت على التنور" - (ترمذی شریف ۱/۲۱۹ ابواب الرضا باب ماجاء فی حق الزوج علی المرأۃ)

(شوہر جب بیوی کو خاص ضرورت کے لئے بلائے تو وہ اس کے پاس بلا تاخیر آئے چاہے اس کا توا ہی کیوں نہ جل رہا ہو)۔

نیز ''صحیح مسلم شریف'' میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ کسی عورت پر پڑی جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذہنی یکسوئی میں فرق محسوس ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی وقت اپنی بیوی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور باوجود کہ وہ اپنے لئے ابھی بالکل تازہ تازہ کھال سجھانے کے ضروری کام میں لگی ہوئی تھی، انہیں بلا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اپنی ضرورت پوری کی اور ظاہر ہے کہ مرد وعورت کو جنسی تسکین کی یہ سہولت مشترکہ خاندانی نظام میں بمشکل ہی حاضر ہوسکتا ہے۔

اسی پس منظر میں فقہاء نے واضح کیا کہ شادی کے بعد شوہر پر بیوی کی جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان میں ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ بیوی کے لئے الگ مکان فراہم کرے، صاحب ''ہدایہ'' رقمطراز ہیں: "وعلى الزوج أن يسكنها في دار مفردة ليس فيها أحد من أهله إلا أن تختار ذلك، لأن السكنى من كفايتها، فيجب لها كالنفقة" - (ہدایہ ۲/۴۲۱)

(اور شوہر پر واجب ہے کہ بیوی کے لئے الگ گھر میں رہائش فراہم کرے جس میں اس کے متعلقین میں سے کوئی دوسرا نہ ہو، سوائے اس کے کہ عورت خود اس کو پسند کرے، اس لئے کہ رہائش (سکنی) اس کا بنیادی حق ہوتا ہے)۔

اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام بیویوں کے مکان الگ الگ ہونے کی صراحت موجود ہے، اسی وجہ سے دیہاتی لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لئے آتے اور انہیں پتہ نہیں ہوتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات میں سے کس کے کمرے میں ہیں تو بلند آواز سے پکارتے تو قرآن نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے تنبیہ کیا کہ "إن الذين ينادونك من وراء الحجرات أكثرهم لا يعقلون" (حجرات: ۴) (بے شک جو لوگ آپ کو پکارتے ہیں کمروں کے پیچھے سے ان میں سے اکثر سمجھتے نہیں ہیں)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مکان کو بھی اپنے سے بالکل الگ قرار دیا۔ مشترکہ خاندانی نظام میں کتنی بہو، بیٹیاں تنازع کے سبب طلاق سے دوچار ہو کر بے کسی کی زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہیں اور جبکہ بہ نفس نفیس طلاق کو "ابغض الحلال" قرار دیا گیا ہے۔

اور مشترکہ نظام میں پردے کی بھی رعایت کما حقہ نہیں ہو پاتی، جبکہ پردہ اور غیروں سے عدم اختلاط اسلام کے مطلوبہ طرز معاشرت کا اہم ترین جزء ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کو فرمایا کہ غیر عورتوں کے پاس جانے سے پرہیز کرو اس پر قبیلہ انصار کے ایک شخص نے سوال کیا شوہر کے بھائی کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اس کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "الحمو الموت" (بخاری مسلم) یعنی شوہر کے رشتہ داروں سے موت کی طرح بچنا چاہئے۔

مشترکہ نظام میں دیور، جیٹھ اور نندوئی وغیرہ سے پردے کی جو مشکلات پیش آتی ہیں وہ تو اپنی جگہ مسلم ہیں علاوہ ازیں عورت اپنے شوہر کے لئے زیب وزینت اور بے تکلف گفتگو نہیں کرسکتی جو اس کے شوہر کا بنیادی حق ہے۔

الغرض مشترکہ اور جداگانہ خاندانی نظام کے مفاسد اور محاسن کا تقابلی جائزہ لینے کے بعد یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام کی خوبیوں کا تو انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس کے مفاسد کے پیش نظر فی زمانا جداگانہ خاندانی نظام ہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس میں گھریلو جھگڑوں سے بھی حفاظت رہتی ہے اور آپس میں تعلق قائم رہتا ہے، پردہ کی بھی رعایت ہوتی ہے اور زوجین کو بے تکلف گفت وشنید اور جنسی تسکین کا موقع ملتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ والدین اور خاندان کے کمزور افراد جن کی کفالت شرعی طور پر ان کے ذمہ واجب ہوتی ہے ان کے پورے حقوق کی رعایت کی جائے اور ان کی خبر گیری کو جزء لاینفک سمجھا جائے۔

چونکہ نفقہ تبرع اور عطیہ ہے جو قرابت کی وجہ سے واجب ہوتا ہے، اس لئے سب پر برابر اخراجات عائد کیا جانا چاہئے، یا سب آپس میں اخراجات کی مقدار پر صلح کرلیں، علاوہ ازیں بڑھتی ہوئی مہنگائی اور آمدنی میں تفاوت کثیر کی وجہ سے اگر حسب آمدنی خرچ عائد کیا جائے تو مناسب معلوم ہوتا ہے "كما كان للفقير ابنان أحدهما فائق في الغنى والآخر يملك نصابا فهي عليهما سوية (خانيه) وعزاه في الذخيرة إلى مبسوط محمد ثم نقل عن الحلواني قال مشائخنا: هذا لو تفاوتا في اليسار تفاوتاً يسيرا، فلو فاحشا يجب التفاوت فيها"۔ (بحر، رد المحتار ۵/۳۵۵)

۳۔ عرض ہے کہ اگر آمدنی میں تفاوت ہے اور اس تفاوت کا صحیح علم ہے تو بچی ہوئی رقم میں حصہ آمدنی کے تناسب سے ہونا چاہئے اور اگر تفاوت کا علم نہ ہو تو برابر برابر حصہ ہونا مناسب معلوم ہوتا ہے، "كما أفتى به في الخيرية في زوج امرأة وابنها اجتمعا في دار واحدة وأخذ كل منهما يكتسب على حدة ويجمعان كسبهما، ولا يعلم التفاوت ولا التساوي ولا التمييز. فأجاب بأنه سوية"۔ (رد المحتار ۶/۵۰۲ في الشركة الفاسدة)

۴۔ چونکہ نفقہ تبرع ہوتا ہے جو برابر برابر واجب ہوتا ہے اس لئے اگر تینوں بھائیوں نے دس دس ہزار روپئے تو جس بھائی کی زائد آمدنی سے دس ہزار روپیہ بچتا رہا جس کا علم سب کو ہے تو بچی ہوئی رقم اسی کی ملکیت ہونی چاہئے دیگر بھائیوں کا اس میں حصہ نہیں ہونا چاہئے اللہ رب العزت کا ارشاد گرامی ہے: "للرجال نصيب مما اكتسبوا"۔ (النساء: ۳۲)

۵۔ اگر خاندان کے کچھ افراد کماتے ہیں اور کچھ گھر کے کام دیکھتے ہیں اور اس طرح گھر کا کام چلتا ہے تو کمانے والے حضرات کی آمدنی میں کام کرنے والے حضرات بھی برابر کے حق دار ہوں گے، کیونکہ سارے بھائی کسی نہ کسی طرح گھر کی معاشی وکاروباری ترقی میں ایک دوسرے کے معاون سمجھے جائیں گے، "كذا لو اجتمع إخوة يعملون في تركة أبيهم ونمى المال فهو بينهم سوية ولو اختلفوا في العمل والرأي"۔

۶۔(الف): والدین کی خدمت وکفالت بیٹوں اور بیٹیوں دونوں پر واجب ہوگی اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے "اتفق الأئمة الأربعة على أنه يجب على الولد ابنا أو بنتا أن ينفق على أبيه وأمه المعاشرين"۔

صاحب "ہدایہ" نے لکھا: "وهي على الذكور والإناث بالسوية في ظاهر الرواية هو الصحيح لأن المعنى يشملهما"۔

(ہدایہ اولین باب النفقۃ)

اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا قول: "وقضى ربك أن لا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا" (سورہ اسراء: ۲۳) اور: "ووصينا الإنسان بوالديه حسنا" (سورہ عنکبوت: ۸) یعنی والدین کیساتھ احسان کا حکم ہے اور احسان یہ ہے کہ ضرورت کے وقت ان کو نفقہ دیا، تا کہ ان کی حاجت وضرورت پوری ہو سکے اور اللہ رب العزت نے کہا "ولا تقل لهما أف ولا تنهرهما" (سورہ اسراء: ۲۳)، اس آیت میں "اف" کہنے سے بھی منع کیا گیا کہ انہیں تکلیف نہ ہو اور ظاہر ہے کہ "اف" کہنے پر جتنی تکلیف ہوگی اس سے زیادہ ضرورت کے وقت نفقہ نہ دینے پر ہوگی۔

۶۔(ب): بہو پر خدمت کو بجالانا واجب ہے یا نہیں؟

اسلام میں انسانوں کی خدمت اور کمزور اور معذوروں کے ساتھ حسن سلوک کی جیسی کچھ تاکید کی گئی ہے شاید ہی وہ کسی مذہب میں ہو اور اس حسن

سلوک میں مرد وعورت میں کوئی امتیاز نہیں ہے، مسلمان مرد کی طرح مسلمان عورت بھی ان تعلیمات وہدایات کی مخاطب ہے، شوہر کی ماں، باپ اگر بوڑھے اور خدمت کے محتاج ہوں یا اسکے دوسرے قریبی اعزہ میں ایسے لوگ ہوں جو خدمت واعانت کے مستحق ہوں تو کسی شریف اور مسلمان عورت سے جس کا دل خوف خدا سے معمور ہو اسکی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ بھلائی اور نیکی کے اس کام میں تعاون نہیں کرے گی، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ''عورت مرد اور اس کے گھر کی نگراں ہے، اس کے بارے میں سوال کیا جائے گا'' (بخاری)۔

گھر میں مرد ہی نہیں، بلکہ اس کے زیر کفالت افراد بھی شامل ہیں جن میں والدین سرفہرست ہیں اور والدین میں سے بھی والدہ کا سب سے پہلا حق ہے۔

قرآن میں ارشاد ہے: "وآت ذا القربی حقه والمسکین وابن السبیل ولا تبذر تبذیراً" (بنی اسرائیل: ۲۶) اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرو۔ ساس خاوند کی طرف سے بہو کے اولین قرابت داروں میں سے ہے، مذکورہ تعلیمات کے مدنظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر ماں کو اپنی ضروریات کے لئے تعاون کی ضرورت ہو اور وہ تعاون ایسا ہو جس کو بیٹا انجام نہ دے سکتا ہو تو بہو پر بدرجہ مجبوری اس خدمت کو بجالانا واجب ہونا چاہئے۔

(۷) ایسے گھروں میں جہاں چچازاد بھائی، بہن یا اس طرح کے دوسرے قریبی رشتہ داروں کا ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہوتا ہو تو ایسی صورت میں عورت کو ڈھیلے ڈھالے اور ساتر لباس میں رہنا چاہئے جس سے عورت کے باز ونظر آئیں نہ چھاتی اور گدی وغیرہ، اسی طرح عورت کے لئے دیوروں اور جیٹھوں سے پردہ کرنا بھی ضروری ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''الحمو الموت'' کہہ کر سخت تنبیہ کی ہے اور یہ پردہ اس طرح آسانی سے ممکن ہے کہ ایک تو مذکورہ انداز میں ڈھیلا ڈھالا لباس کرتہ بڑی آستین کا پہنے پاجامہ غرارہ دار نہ پہنے اور کلائی اور ٹخنے نہ کھلنے دے، تاکہ اس کی زینت کا اظہار اور فتنے والی جگہیں آشکارا نہ ہوں، علاوہ ازیں بے باکانہ انداز میں گفتگو نہ کرے، بلکہ حسب ضرورت مختصر بات کرے اور ان کے ساتھ تنہائی بالکل اختیار نہ کرے۔

☆☆☆

مشترکہ وجداگانہ خاندانی نظام۔ دلائل کی روشنی میں

مولانا محمد سعید اللہ قاسمی [1]

۱۔ جب ہم انسان کے اجتماعی نظام میں مشترکہ اور جداگانہ خاندانی نظام پر نگاہ ڈالتے ہیں تو قرآن وحدیث کے مطالعہ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ معاشرتی زندگی کی شائستگی اور آپسی تعلقات کی بہتری کے لئے ضروری ہے کہ خاندانی نظام مختصر ہو اور ہر شادی شدہ کی رہائش الگ اور دیگر گھریلو معاملات کھانا پکانا، لین دین، سب جدا جدا ہوں، اس سلسلہ میں باری تعالی کا ارشاد ہے:

"یأیها الذین آمنوا لا تدخلوا بیوتاً غیر بیوتکم حتی تستأنسوا وتسلموا علی أهلها" (سورہ النور: ۲۷) (اے ایمان والے تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں مت داخل ہو جب تک اجازت حاصل نہ کرلو اور ان کے رہنے والوں کو سلام نہ کرلو۔

اسی طرح قرآن حکیم میں بالغ اولاد کے سلسلہ میں حکم خداوندی ہے:

"وإذا بلغ الأطفال منکم الحلم فلیستأذنوا کما استأذن الذین من قبلهم کذلك یبین الله لکم آیاته والله علیم حکیم" (سورہ النور: ۵۹) (اور جب تمہارے بچے بلوغت کو پہنچ جائیں تو چاہئے کہ جس طرح ان سے بڑے اجازت لے کر داخل ہوا کرتے تھے اسی طرح وہ بھی اجازت لے کر داخل ہوں، اسی طرح اللہ تعالی کھول کھول کر احکام بیان کرتا ہے، وہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے)۔

مذکورہ آیات سے جہاں ایک جانب دوسرے کے گھروں میں بغیر اجازت داخلہ کی ممانعت معلوم ہوتی ہے وہیں دوسری جانب بالغ اولاد کے علاحدہ گھر ہونے کا بھی اشارہ ملتا ہے، اسلام نے صرف یہ کہ ہر شادی شدہ کے لئے الگ مکان کی بات کی ہے، بلکہ اگر کسی شخص کی کئی بیویاں ہوں تو ہر ایک کے لئے الگ الگ مکان ہو، جیسا کہ خود حضور اقدس ﷺ کی تمام ازواج مطہرات کے واسطے الگ الگ مکانات کا ذکر ملتا ہے۔

اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے: "وقرن في بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلیة الأولی" (سورہ احزاب: ۳۳) (تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور قدیم زمانہ جاہلیت کے دستور کے مطابق مت پھرو)۔

اسی طرح دوسری آیت میں اللہ رب العزت نے ازواج مطہرات کی عبادت اور ذکر واذکار کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: "واذکرن ما یتلی في بیوتکن من آیات الله والحکمة" (سورہ احزاب: ۳۴) (اور تم ان آیات الہیہ کو اور اس علم کو یاد رکھو جس کا تمہارے گھروں میں چرچا ہے)۔

اوپر کی آیتوں میں (بیوتکن) کا استعمال کیا گیا ہے جو جمع ہے جس سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ ازواج مطہرات کے واسطے الگ الگ گھر تھا۔

نیز اسی سلسلہ میں "بخاری شریف کتاب الجهاد باب ما جاء في بیوت أزواج ﷺ" کا مطالعہ کیا جائے اس کی پوری تفصیل وہاں موجود ہے۔ (بخاری شریف ۱/ ۴۳۷)

فقہ کی کتابوں میں بھی یہ جزیہ صراحۃً مذکور ہے کہ بیوی اپنی رہائش کے لئے علاحدہ مکان کا مطالبہ کرسکتی ہے، "ہدایہ" میں تحریر ہے:

"وعلی الزوج أن یسکن في دار مفردة لیس فیها أحد من أهله إلا أن تختار"۔ (حوالہ هدایه باب النفقه ۲/ ۴۴۲)

اسی طرح حضرت محمد ﷺ کا یہ عمل کہ جب اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کا حضرت علیؓ سے نکاح کردیا تو ان دونوں کے لئے الگ مکان دیدیا۔

---

[1] دار القضاء امارت شرعیہ، آسنسول۔

حضرت فاطمہؓ سے غیر معمولی تعلق تھا ان کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"عن المسور بن مخرمة أن رسول الله ﷺ قال: فاطمة بضعة مني، فمن أغضبها فقد أغضبني" (الصحیح للبخاری مناقب فاطمہ ۱/۵۳۲)

(مسور بن مخرمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے، جس نے اس کو ناراض کیا اس نے مجھ کو ناراض کیا)۔

دوسری طرف جب ہم غور کرتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت علیؓ جہاں داماد تھے، وہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی بھی تھے، آپ ہی کی پرورش ونگرانی میں بھی تھے، حضرت علیؓ کے والد حضرت ابوطالب کے آپ پر بے انتہا احسانات تھے اور حضرت علیؓ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت زیادہ محبت بھی کرتے تھے، ایک موقع سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ علی مجھ سے ہے اور میں علی سے ہوں، "قال النبی ﷺ لعلی: أنت مني وأنا منك". (الصحیح للبخاری، مناقب علیؓ)

حضرت علیؓ وفاطمہؓ سے اتنی قربت وتعلق کے باوجود شادی ونکاح کے بعد ان دونوں کو الگ کردیا اور الگ مکان کا نظم کیا۔

مذکورہ آیات واحادیث کی روشنی میں یہ بات واضح طور پر سامنے آئی کہ اسلام میں مشترکہ خاندانی نظام بہتر نہیں ہے، ہاں ایک چھوٹا سا خاندان جس میں میاں بیوی غیر شادی شدہ اولاد ضعیف العمر اور حاجت وضرورت مند ماں باپ شامل ہوں تو اس طرح مشترکہ خاندانی نظام کے ساتھ زندگی بسر کرنا بہتر ہے اور پردہ کے لئے یہی صحیح ہے، اس مشترکہ خاندان میں مکمل پردہ شرعی کی رعایت ناممکن تو نہیں، لیکن مشکل ترین ضرور ہے، عورت کا پردہ کرنا اسلام کا مطلوب اور معاشرت کا اہم ترین جز ہے، قرآن حکیم میں پردہ کے سلسلہ میں تفصیلی حکم ہے۔

۲۔ اس سلسلہ میں کوئی جزیہ تو نہیں ملا، البتہ عام رہن سہن کے انداز سے بات سمجھ میں آئی ہے کہ مشترکہ خاندان میں جو اخراجات ہوتے ہیں اسے سب بھائی مل کر اپنے اپنے بچوں کی تعداد کے اعتبار سے اخراجات دیں، چونکہ یہ بات مسلم ہے کہ افراد کی زیادتی سے اخراجات میں زیادتی ہوتی ہے، اس لئے جس کے بچے زیادہ ہیں وہ زیادہ خرچ دیں، تاکہ آپس میں بدگمانی پیدا نہ ہو کہ ہمارے بچے کم ہیں، تو ہم بھی اتنا ہی کیوں دیں جتنا دوسرا بھائی جس کے بچے زیادہ ہیں دیتے ہیں، یہ نزاع کا سبب بھی بن سکتا ہے، دوسرے کا مال ناحق اور ظلماً کھانے کے زمرے میں آسکتا ہے، ہاں البتہ خوش دلی کے ساتھ سب ہی بھائی آپس میں یہ طے کرلیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

اس وقت مشترکہ خاندانی نظام میں یہ ہی رائج ہے اور "المعروف کالمشروط" کے تحت آتا ہے، نیز باہمی رضامندی کے ساتھ برابر اخراجات دینا طے ہوجانے کے بعد جس کے بچے کم ہوں ظاہر سی بات ہے کہ اس کی رقم زیادہ ہوجائے گی، تو وہ اس کی طرف سے تبرع اور احسان ہوگا۔

۲۔ سوال میں جو صورت ذکر کی گئی ہے اس کی دو حالتیں ہیں:

۱۔ لڑکے گارجین کے معاون ہیں۔ ۲۔ معاون نہیں ہیں۔

دونوں کے احکام الگ الگ ہیں پہلی صورت، یعنی اگر خاندان مشترک ہو اور لڑکے سب مل کر کماتے ہیں کھانا پینا رہنا سہنا سب ایک ساتھ ہو تو لڑکے والد کی ماتحتی میں اور کفالت میں ہوں تو لڑکوں کو والد کا معاون سمجھا جائے گا اور تمام آمدنی والد کی سمجھی جائے گی۔ علامہ شامیؒ نے لکھا ہے:

"فی القنیة: الأب والابن یکتسبان فی صنعة واحدة، ولم یکن لهما شیئ فالکسب کله للأب، إن کان الابن فی عیاله لکونه معینا" (رد المحتار ـ ۳۴۹)

مذکورہ جواب کی تائید اکابر کے فتاوی سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ "فتاوی رحیمیہ" میں اس طرح کے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

لیکن اگر زید والدین کے ساتھ رہتا تھا اور رہنا سہنا کھانا پینا، ان کے ساتھ تھا اور ان کے ماتحت رہ کر کمائی ہوئی رقم سے زمین خریدی ہے تو وہ جگہ والد کی شمار ہوگی۔ (فتاوی رحیمیہ ۳ـ۱۵۹)

دوسری صورت یہ ہے کہ خاندان مشترک ہے، کھانا پینا رہنا سہنا مشترک ہے لڑکے والد کی ماتحتی اور کفالت میں نہیں ہیں اور آمدنی کی تقسیم کے سلسلہ میں کوئی تناسب مقرر نہیں ہے تو ایسی صورت میں مشترک اخراجات کے بعد جو آمدنی بچے وہ تمام لوگوں کے درمیان برابر برابر تقسیم ہوگی۔

علامہ شامی نے شرکت سدہ کی بحث کے تحت یہ جزئیہ صراحۃ لکھا ہے کہ باپ اور بیٹے دونوں ایک گھر میں رہتے ہوں اور دونوں کا ذریعہ معاش الگ ہو اور دونوں اپنی آمدنی ایک جگہ اس طرح جمع کرتے ہوں کہ اس میں تمیز وتفاوت مشکل ہو تو ایسی صورت میں آمدنی میں دونوں برابر کے شریک ہوں گے۔

’’فی المنیریة: فی زوج امرأة وابنها اجتمعا فی دار واحدة، وأخذ کل منها یکتسب علاحدة ویجمعان کسبهما، ولا یعلم التفاوت ولا التساوی ولا التمیز، فأجاب بأنه بینهما سویة‘‘۔(رد المحتار ۳-۳۴۹)

علامہ شامی نے اس بات کی بھی صراحت کی ہے کہ اگرچہ کام اور رائے میں ان لوگوں کے درمیان تفاوت ہو، لیکن آمدنی برابر برابر تقسیم ہوگی اور خیریہ کے حوالہ سے اسی پر فتوی نقل کیا ہے، عبارت پر نگاہ ڈالی جائے۔

’’فی فتاوی الحانوتی: فإذا کان سعیهم واحداً ولم یتمیز ما حصله کل واحد منهم بعمله یکون ما جمعوه مشترکاً بینهم بالسویة، وإن اختلفوا فی العمل والرأی کثرة وصواباً، کما أفتی به فی الخیریة‘‘ (رد المحتار ۳-۳۲)

لہذا اگر تمام بھائیوں نے اپنی آمدنی ایک بھائی کے پاس جمع کی تو اس صورت میں بھی تمام بھائی اس میں برابر کے شریک ہوں گے۔

۵۔ اس کا جواب بھی بندہ کے نزدیک یہی ہے کہ جب خاندان کے کچھ افراد کماتے ہیں اور کچھ گھریلو کام کی دیکھ بھال کرتے ہیں تو اس صورت میں بھی تمام بھائی آمدنی میں برابر کے شریک ہوں گے۔

ایک بھائی نے جو اپنی کمائی کا کچھ حصہ بچالیا تو بچی ہوئی رقم اسی بھائی کی ملکیت ہے، دوسرے بھائیوں کا اس بچی ہوئی رقم میں کوئی حصہ نہیں ہوگا، اگر اس نے پس انداز کی ہوئی رقم کے سلسلے میں پہلے وضاحت نہیں کیا کہ میری آمدنی جتنی بھی ہو میں حسب معاہدہ سب کے برابر اخراجات دوں گا بقیہ رقم کے سلسلہ میں خود مختار رہوں تو یہ دیانت کے خلاف ہے، کیونکہ عملاً یہ بات ہوتی ہے کہ ہم سب مل کر گھر چلائیں گے جو بھی آمدنی ہوگی ایک جگہ جمع ہو کر اجتماعی طور پر خرچ ہوگی، اس سلسلے میں حضرت مولانا مفتی محمود الحسنؒ کے فتاوی سے بھی رہنمائی ہوتی ہے، حضرت مفتی صاحبؒ اس طرح کے ایک سوال کے جواب میں تحریر میں فرماتے ہیں کہ اس رقم میں دوسرے بھائیوں کا حصہ نہیں، الگ رہنا اس کے لئے جائز ہے، لیکن ماں باپ اور بھائیوں کے ساتھ رہ کر کھانا پینا پہننا اوڑھنا اور اپنی کمائی الگ کر کے جمع کرنا بہت بڑی بے مروتی اور انتہائی احسان فراموشی ہے جس کا نتیجہ بہت خراب ہے۔
(فتاوی محمودیہ ۱۴/ ۱۹۴)

۶۔ والدین اگر معذور ومجبور ہوں تو ان کا نفقہ ظاہر روایت کے مطابق بیٹا اور بیٹی دونوں پر برابر برابر واجب ہے، بشرطیکہ دونوں دوسر ہوں، اور دوسرا قول ہے کہ دونوں پر بقدر میراث نفقہ واجب ہوگا، یعنی نفقہ کا دو حصہ لڑکا ادا کرے گا اور ایک حصہ لڑکی، صاحب ’’ہدایہ‘‘ نے پہلے قول کو صحیح قرار دیا ہے۔

عبارت ہدایہ: ’’وهی علی الذکور والإناث بالسویة فی ظاهر الروایة وهو الصحیح‘‘۔(ہدایہ ۲/ ۴۴۶)

علامہ شامی نے خلاصہ کے حوالہ سے اس قول کو مفتی بہ لکھا ہے۔

عبارت ملاحظہ ہو: ’’ثم النفقة لأصوله الفقراء بالسویة بین الابن والبنت، وقیل: کالإرث‘‘۔(الدر المختار ۵/ ۳۵۵)

(قوله بالسویة بین الابن والبنت) هو الظاهر، وهو الصحیح۔(رد المحتار ۵/ ۳۵۵)

لہذا صحیح اور مفتی بہ قول کے بموجب لڑکا اور لڑکی دونوں پر محتاج وضرورتمند والدین کا نفقہ برابر برابر واجب ہے، جہاں تک والدین کی خدمت کا تعلق ہے تو یہ بیٹوں پر واجب ہے، لیکن اگر والدین خدمت کے محتاج ہوں اور کوئی دوسرا ان کی خدمت کرنے والا نہ ہو تو ایسی صورت میں فقہاء کرام نے یہ صراحت کی ہے کہ شادی شدہ لڑکی پر ایسے والدین کی خدمت واجب ہے، وہ ہفتہ میں ایک مرتبہ جا کر ان کی خدمت کرے گی، شوہر اس کو منع نہیں کر سکتا ہے اگر وہ منع کرے تو جا سکتی ہے۔

’’ولا یمنعها من الخروج إلی الوالدین فی کل جمعة إن لم یقدرا علی إتیانها علی ما اختاره فی الاختیار ولوالدها

زمنا مثله فاختاره بها فعليها تعاهدوا ولو كافراً وإن أبى الزوج'' (الدر المختار ۵-۳۲۴)

''(قوله فعليها تعاهده) أي بقدر احتياجه إليها، وهذا إن لم يكن له من يقوم عليه'' (رد المحتار ۵-۳۲۴)

۷۔ بہو پر خوش دامن کی خدمت واجب ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں کتب فقہ میں مسئلہ مصرح ہے کہ بہو پر خوش دامن کی خدمت واجب نہیں ہے، البتہ جب خوش دامن بالکل مجبور ہو اور کوئی اس کی خدمت کرنے والی نہ ہو تو ایسی صورت میں اس کا اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ اس کی خدمت کرے، یہ اس کے لئے بڑی سعادت اور ثواب کا کام ہوگا، مسلمانوں پر بحیثیت مسلمان صرف انہیں کاموں کا کرنا واجب نہیں ہوتا جو اس کے ذمہ شریعت نے واجب قرار دیا ہے، بلکہ بہت ساری ایسی مجبوریاں ہیں جہاں مسلمان اس خدمت کے واجب نہ ہونے کے باوجود انسانیت کے تقاضہ اور اخلاقی ذمہ داری سمجھتے ہوئے اسے اپنے اوپر واجب سمجھتا ہے۔

حضرت مولانا عبدالرحیم صاحبؒ اس طرح کے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''شوہر کی والدہ اور اس کے بھائی بہن کے لئے کھانے کا انتظام کرنا عورت پر شرعاً لازم وضروری نہیں ہے، البتہ اگر عورت اپنی ساس کی ضعیفی اور کمزوری کی وجہ سے ان کی خدمت کرے اور ان کے لئے کھانا پکائے تو یہ اس کے لئے سعادت مندی ہوگی اور یہ خدمت انشاء اللہ اس کے لئے باعث اجر وثواب ہوگی''۔ (فتاوی رحیمیہ ۸/۴۵۷)

۸۔ پردہ کے جو احکام کتاب وسنت میں تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں وہ یہاں بھی نافذ ہوں گے، اور ان حالات میں بھی پردہ شرعی کی مکمل رعایت لازم وضروری ہوگی، یہی وجہ ہے کہ میں نے سوال (۱) کے جواب کے تحت یہ لکھا ہے کہ چونکہ مشترکہ خاندانی نظام کی صورت میں پردہ شرعی کی مکمل رعایت مشکل ہے، اس لئے یہ نظام اسلام کا مطلوب ومقصود نہیں ہے۔

☆☆☆

تیسرا باب مختصر جوابات

شریعت کی نظر میں مشترکہ و جداگانہ خاندانی نظام

مفتی محبوب علی وجیہی[1]

۱- اسلام کی نظر میں مشترکہ خاندانی نظام بہتر ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتماعی مفاد کے تحفظ اور اس کے مستقبل کی تعمیر کے لئے انفرادی مفاد کو نظر انداز کیا ہے، جیسا کہ صلح حدیبیہ کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے، اسی طرح آپ نے اجتماعیت کا لحاظ رکھتے ہوئے حطیم کو خانہ کعبہ میں شامل نہیں کیا، ایسے ہی اجتماعی حالات کے پیش نظر قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ ذخیرہ بنا کر رکھنے سے منع کیا تھا، تاکہ غرباء تک زائد سے زائد گوشت پہنچے اور وہ محروم نہ رہیں، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی گئی اور مختلف قسم کی ضرورتیں بیان ہوئیں تو آپ نے ذخیرہ کر کے رکھنے کی اجازت دیدی، اجنبی عورتوں کی طرف دیکھنے سے منع کیا گیا ہے، تاکہ وساوس شیطانی وفساد کا دفعیہ ہو اور اللہ رب العزت کی حرمتیں محفوظ رہیں، لیکن جس سے شادی کا ارادہ ہو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھنے کی اجازت دی ہے، تاکہ بعد میں ندامت نہ ہو اور ازدواجی زندگی خوش گوار رہ سکے۔

حضور علیہ السلام نے منافقین کے قتل کرنے سے منع کر دیا تھا، تاکہ لوگوں کی نفرت اور یہ کہنے کا سبب نہ بنے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں، حالانکہ وہ طرح طرح کے فتنہ وفساد پھیلاتے رہتے تھے، لیکن "مصلحة الإسلام أعظم من مصلحة القتل" کے تحت منافقین کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا، پھر جب یہ اندیشہ جاتا رہا اور اسلام کے غلبہ سے تالیف قلب وغیرہ کی مصلحت پہلی جیسی نہیں رہی تو یہ حکم بھی منسوخ ہو گیا، لہذا ان واقعات کی روشنی میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ذاتی اور انفرادی مفادات کو نظر انداز کر کے اجتماعی مفاد کو پیش نظر رکھا ہے، کیونکہ انفرادی اور شخصی مفاد کے مقابلہ اجتماعی مفاد اہم ہے، پس مشترکہ خاندانی نظام سے بوڑھے ماں باپ چھوٹے بہن بھائی اور یتیم و بیواؤں وغیرہ کو سہارا از آند مل سکتا ہے اور ایسے بے سہارا لوگوں کی کفالت جو اس کے زیر نگرانی ہوں واجب ہے، حضرت جابرؓ نے اپنی چھوٹی بہنوں کی کفالت کی وجہ سے بیوہ عورت سے نکاح کیا اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ تم نے باکرہ سے نکاح کیوں نہیں کیا تو آپ نے یہی جواب دیا کہ میری چھوٹی بہنیں ہیں جن کی کفالت میرے ذمہ ہے، یہ بیوہ عورت ان کی اچھی طرح تربیت کر سکتی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جواب سے خوش ہوئے۔

رہا یہ مسئلہ کہ مشترکہ خاندانی نظام سے باہمی نزاع پیدا ہو جاتا ہے اور پردے کا اہتمام دشوار ہو جاتا ہے تو اس معاملہ میں انسان کو اپنی حکمت عملی اور سیاست دینی سے کام لینا چاہئے اور گھر کے ماحول پر سخت نظر رکھنا چاہئے، نہ کہ گھر کے خراب ماحول سے متاثر ہو کر بوڑھے والدین اور چھوٹے بہن بھائیوں کو بے سہارا چھوڑ دینا چاہئے، اور جہاں تک اس چیز کا سوال ہے کہ دیہات سے شہر کی طرف نقل مکانی اور بوڑھے لوگوں کے لئے ہاسٹل وغیرہ کا تعمیر ہونا تو اس میں بھی ہماری رائے یہی ہے کہ بوڑھے والدین کی جو خدمت نیک اولاد کر سکتی ہے اور والدین وغیرہ کو گھر پر سکون مل سکتا ہے وہ ہاسٹل وغیرہ میں نہیں مل سکتا، اس لئے اولاد اور کفیل کو بے سہارا لوگوں کو اسے ساتھ رکھنا چاہئے اور مکمل طور پر ان کی دیکھ ریکھ کرنا چاہئے، ہاں اگر گھر کے تمام لوگوں کو ایک ساتھ رکھنے میں قوی جھگڑے کا امکان ہو تو پھر اسے چاہئے کہ ایک کالونی یا ایک محلہ میں رہے اور قریب رہ کر ماں باپ اور دیگر لوگوں

---

[1] جامع العلوم فرقانیہ، رامپور، یوپی۔

کی اپنے ذمہ میں پرورش کرے اور ان کی نگرانی کرے، لیکن بالکل علاحدہ چھوڑ کر ماں باپ وغیرہ کو دور رہنا درست نہیں ہے، کیونکہ اس میں ان کی صحیح دیکھ بھال نہیں ہوسکتی۔

۲۔ اگر مشترکہ خاندان ہو اور کسی کے بچے زیادہ ہوں اور کسی کے کم ہوں تو جس کے بچے زیادہ ہوں اسے زیادہ خرچ دینا چاہئے اور جس کے بچے کم ہوں اور زیادہ خرچ کرے تو اسے خدا کے یہاں اس کے خرچ کا اجر ملے گا، الغرم بالغنم۔

۳۔ مذکورہ صورت میں اگر سب بھائیوں نے ایک بھائی یا باپ کو بچی ہوئی رقم کا مالک بنادیا اور کل اختیار دیدیا جب تو سب برابر کے شریک ہوں گے، اور اگر بھائی یا باپ کو بچی ہوئی رقم کا اختیار نہیں دیا اور مالک نہیں بنایا تو ہر ایک اپنی آمدنی کے لحاظ سے حصہ دار ہوگا۔

۴۔ اس صورت میں وہ رقم صرف اسی بھائی کی ہوگی جس نے وہ رقم کمائی ہے، دوسرے بھائیوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

۵۔ اس صورت میں گھر کا کام دیکھنے والے بھائی کمانے والے بھائیوں کی آمدنی میں برابر کے شریک ہوں گے، کیونکہ گھر اور باہر کا کام آپس میں تقسیم کرلیا ہے، اس لئے باہر کے افراد گھر کے کام میں اور گھر کا کام کرنے والے باہر کی آمدنی میں برابر شریک ہوں گے۔

۶۔ ماں باپ کی خدمت بیٹیوں پر بھی واجب ہے اور بہو پر بھی واجب ہے کہ وہ ساس کی خدمت کرے، کیونکہ ساس بھی ماں کے قائم مقام ہوتی ہے، اس لئے بہو کو چاہئے کہ وہ اپنے شوہر کی ماں کی خدمت کرے۔

۷۔ شریعت مطہرہ نے چہرے وغیرہ کو پردے میں شامل نہیں کیا ہے، اس لئے چچازاد بھائی بہن ایک دوسرے کے آمنے سامنے آسکتے ہیں، البتہ ایک دوسرے کی عزت واحترام اور لحاظ رکھتے ہوئے آمنا سامنا کریں اور جہاں تک ہوسکے اختلاط اور تنہائی سے بچیں، کیونکہ زیادہ اختلاط اور تنہائی سے فتنہ کا خوف ہوتا ہے اور اسی فتنہ کے خوف کی وجہ سے جوان عورت کو دیکھنے سے منع کیا گیا ہے، لیکن مشترکہ خاندان میں قریبی رشتہ داروں اور چچازاد بھائی بہن کا ایک دوسرے سے پردہ کرنا بہت دشوار ہے، اس لئے احتیاط سے رہیں اور حتی الامکان تنہائی سے بچیں، رد المحتار شرح درمختار ۵/۳۲۵ پر ہے: ''وينظر من الأجنبية إلى وجهها وكفيها فقط''۔

☆☆☆

مشترکہ اور جداگانہ خاندانی نظام کے مسائل

مفتی جمیل احمد نذیری[1]

۱۔ اسلام کی نگاہ میں نہ مشترکہ خاندانی نظام بہتر ہے، نہ جداگانہ زندگی بسر کرنے کا طریقہ، بلکہ جس میں سب کے حقوق بہتر طریقے سے ادا ہوں، وہی نظام بہتر ہے۔ اگر بیٹا، ماں باپ سے الگ ہو کر ماں باپ کے حقوق ادا نہیں کر پا رہا ہے، مثلاً ان کا اکرام واحترام، ان سے الفت وانسیت، ان کی فرمانبرداری نہیں کر پا رہا ہے، ان کا کام نہیں کرتا، یا ان کے کام نہیں آتا، ان کو آرام نہیں پہنچاتا، ان کی ضروریات پوری نہیں کرتا، ان کی زیارت وملاقات نہیں کر پاتا، ان کا نان ونفقہ اور سکنی وغیرہ جو اس کے ذمہ ہے، نہیں دیتا (زندگی میں ماں باپ کے حقوق یہی ہیں)۔

اسی طرح اپنے بھائی بہنوں، جن کا نان ونفقہ اسی کے ذمہ شرعاً عائد ہے، نہیں ادا کرتا، صلہ رحمی سے بھی لا پرواہ ہے، تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے والدین اور اپنے بھائی بہنوں کو ساتھ رکھ کر ان کے نان ونفقہ وسکنی کی ادائیگی کرے اور صلہ رحمی کے تقاضوں کو پورا کرے۔ البتہ کمائی اور کمائی سے پیدا زمین وجائداد کے بارے میں آپس میں سارے معاملات طے ہو جانے چاہئیں، تاکہ کسی قسم کا نزاع نہ ہو۔ اور اگر علیحدہ رہ کر بھی یہ سارے حقوق بالکل صحیح طریقہ سے، شریعت کے مطابق، ادا کر لیتا ہے، تو شریعت اس علیحدہ رہنے سے مانع نہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ علیحدہ ہو جانے پر سارے حقوق کما حقہ ادا نہیں ہو پاتے۔

دیکھا یہ گیا ہے کہ جب بیٹے اور بیٹیوں کی شادیاں ہو جاتی ہیں، خاص طور پر جب اولاد بھی صاحب اولاد ہو جاتی ہے تو ساتھ رہنا سہنا، ساتھ کھانا پینا، بجائے مفید ہونے کے مضر ہو جاتا ہے۔ اور حقوق کی ادائیگی کے بجائے حقوق تلفی شروع ہو جاتی ہے، اس موقع پر بٹوارہ ہی بہتر ہوتا ہے۔

باپ کو خود چاہئے کہ اختلاف ونزاع پیدا ہونے سے پہلے بٹوارہ کر دے اور اپنے نفقہ وسکنی اور اس سے متعلق جن کا نفقہ وسکنی وغیرہ ہو، بٹوارہ کے وقت میں اس کا انتظام کر دے۔

یہ بات بہت زیادہ انتشار کا باعث بنتی ہے کہ پوتا پوتی، نواسے، نواسیاں، بھتیجے، بھتیجیاں شادی کے لائق ہو جاتے ہیں، بلکہ بعض کی شادیاں بھی ہو جاتی ہیں، مگر ساتھ رہنے، ساتھ کھانے پینے پر اصرار کیا جاتا ہے اور بٹوارہ کو برا سمجھ کر اندر اندر ہی جھگڑے کو بڑھایا جاتا ہے۔

ایسے موقع پر چاہئے کہ کاروبار اور کمائی میں شرکت رکھی جائے، سب کا حصہ صاف صاف متعین کر دیا جائے اور کھانا پینا، رہنا سہنا الگ الگ کر دیا جائے۔ کاروبار اور کمائی میں تو غیروں کے ساتھ شرکت ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے یہ تو اپنوں کا معاملہ ہے۔ مل جل کر کمائیں، مگر الگ الگ رہیں، الگ کھانا پینا رہے، کمائی اور کاروبار میں کس کو کیا ملنا ہے اور کس کو کیا کرنا ہے، سب واضح کر دیا جائے۔

۲۔ مشترکہ خاندان کی صورت میں کسی کے بچے زیادہ ہوں یا کم، بچوں کی تعداد کے اعتبار سے اخراجات عائد نہ ہوں گے۔ بلکہ جو جتنا کماتا ہو، اسی کے اعتبار سے لا کر دے۔ ظاہر ہے کہ کوئی کم کماتا ہوگا، کوئی زیادہ، کمانے اور کاروبار کرنے میں کوئی زیادہ ہوشیار ہوگا، کوئی کم، لیکن ملکیت کے اعتبار سے سب برابر مانے جائیں گے، لہٰذا سب کے اخراجات برابر طریقہ سے پورے ہونے چاہئیں۔ اگر اس پر کم بچے والے، مگر زیادہ کمائی والے کو، اعتراض ہو تو باہم علیحدگی اختیار کر لیں۔ لیکن اگر ساتھ رہیں، یعنی ''عائلہ واحدہ'' ہو، کھانا پینا رہنا سہنا ایک ساتھ ہو اور ''سعی واحد'' ہو، یعنی سب مل جل کر گھر کو چلانے میں کوشاں ہوں تو اس صورت میں سب برابر کے حقدار ہوں گے۔ اور سب کے اخراجات بیوی بچوں سمیت۔ برابر انداز میں پورے کئے جائیں گے اور سب کو اپنی اپنی کمائی لا کر دینی ہو، خواہ کم کمائے یا زیادہ۔

---

[1] مہتمم جامعہ عربیہ عین الاسلام، نوادہ، مبارکپور۔

''فتاوی خیریہ'' میں ہے:

''(سئل) فی أخوین سعیهما واحد وعائلتهما واحدة حصلا بسعیهما أموالا من مواش وغیرها، والآن یرید أحدهما مفارقة الآخر ومقاسمة المال مناصفة ویأبی الآخر فهل ... والحالة هذه جمیع ماحصلاه بسعیهما وکسبهما مشترك بینهما تجب قسمته بینهما مناصفة أم لا (أجاب) نعم ماحصلاه بکسبهما مشترك بینهما لایجوز أن یختص به أحدهما دون الآخر'' (الفتاوی الخیریه ا۔۱۱۲)

ایسے دو بھائیوں کے بارے میں سوال کیا گیا جن کی ''سعی واحد'' ہے اور عائلہ واحدہ (کھانا پینا، رہنا سہنا ایک ساتھ) ہے۔ ان دونوں نے اپنی سعی وکوشش سے بہت سے اموال مویشی وغیرہ حاصل کئے۔ اب ایک بھائی الگ ہونا چاہتا ہے اور مال کو آدھا آدھا تقسیم کرنے کا مطالبہ کرتا ہے، دوسرا انکار کرتا ہے تو کیا اس حالت میں جو ان دونوں نے اپنی سعی اور کمائی سے حاصل کیا ہے، وہ دونوں کے درمیان مشترک ہوگا اور تقسیم آدھا آدھا کر کے واجب ہوگی؟ جواب دیا کہ ہاں! جو ان دونوں نے اپنی کمائی سے حاصل کیا ہے وہ ان دونوں کے درمیان مشترک ہوگا، صرف ایک کے ساتھ خاص کرنا جائز نہیں۔

۳۔ اس صورت میں سب کا برابر کا حصہ ہوگا، آمدنی کا کوئی لحاظ نہ ہوگا۔ ''ردالمحتار'' میں ہے:

یقع کثیرا فی الفلاحین ونحوهم أن أحدهم یموت تتقوم أولاده علی ترکته بلا قسمة ویعملون فیها من حرث وزراعة وبیع وشراء واستدانة ونحو ذلك، وتارة یکون کبیرهم هو الذی یتولی سهماتهم ویعملون عنده بأمره، وکل ذلك علی وجه الإطلاق والتفویض لکن بلا تصریح بلفظ المفاوضة ولابیان جمیع مقتضیاتها مع کون الترکة أغلبها أو کلها عروض لا تصح فیها شرکة العقد، ولا شك أن هذا لیس شرکة مفاوضة خلافاً لما أفتی به فی زماننا من لاخبرة له، بل هی شرکة ملك کما حررته فی تنقیح الحامدیة ثم رأیت التصریح به بعینه فی فتاوی الحانوتی، فإذا کان سعیهم واحداً ولم یتمیز ماحصله کل واحد منهم بعمله یکون ماجمعوه مشترکاً بینهم بالسویة، وإن اختلفوا فی العمل و الرائ کثرة وصواباً کما افتی به فی الخیریة'' (رد المحتار ۳۔۲۷۰ و ۳۸۳، الفتاوی الخیریة ا۔۱۱۲)

کسانوں وغیرہ میں یہ صورت حال بہت پیش آتی ہے کہ ان میں کا کوئی مرتا ہے تو اس کی اولاد، بلا تقسیم، ترکہ میں عمل دخل شروع کر دیتے ہیں، کھیت جوتنا، بونا، خرید وفروخت، قرض وغیرہ لینا سارے کام ہونے لگتے ہیں اور کبھی ان میں کا بڑا، ان کے اہم معاملات کا ذمہ دار ہو جاتا ہے اور وہ اسی کے ساتھ رہ کر اس کے حکم سے کام کرتے رہتے ہیں۔ اور ساری باتیں علی الاطلاق اور بطور تفویض ہوتی ہیں۔ لیکن لفظ ''مفاوضہ'' اور اس کے مقتضیات کی صراحت نہیں ہوتی۔ جبکہ زیادہ تر، ترکہ یا کل کا کل سامان ہوتا ہے جس میں شرکت عقد صحیح نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ''شرکت مفاوضہ نہیں ہے۔ لیکن ہمارے زمانے کے وہ لوگ جنہیں فتویٰ دینے میں آگاہی اور مہارت نہیں ہے، انھوں نے اس کے ''شرکت مفاوضہ'' ہونے کا فتوی دیدیا ہے، حالانکہ یہ شرکت ملک ہے، جیسا کہ میں نے ''تنقیح فتاوی حامدیہ'' میں اسے تحریر کیا ہے، پھر میں نے اس کی بعینہ صراحت فتاویٰ حانوتی میں دیکھی۔ بس جب ان کی سعی واحد ہو (سب مل کر گھر چلا رہے ہوں) اور ہر ایک کے اپنے عمل سے جو حاصل کیا ہے وہ متمیز نہ ہو تو ان لوگوں نے جو کچھ جمع کیا ہے وہ ان کے درمیان برابری کے ساتھ مشترک ہوگا، اگرچہ کام میں اور رائے میں کثرت ودرستگی کے اعتبار سے مختلف ہوں، ''فتاویٰ خیریہ'' میں بھی یہی فتویٰ دیا ہے۔

۴۔ اگر والد کے زمانے سے ایک ساتھ رہتے سہتے آئے ہوں اور والد کے بعد بھی ایک ساتھ رہ رہے ہوں تو اپنے ضروری اخراجات رکھ کر بقیہ کمائی گھر میں دینی ہوگی۔ بچا کر رکھنے کی گنجائش نہیں اور اگر والد کے زمانہ سے ہی علیحدہ ہوں، لیکن والد کے بعد اس طرح ایک ساتھ ہو گئے ہوں کہ کھانا پینا بھی ایک ساتھ ہو تو بھی بچانے کی گنجائش نہیں۔

خلاصہ یہ کہ اگر ''عائلہ واحدہ'' ہو، یعنی ایک ساتھ رہنا سہنا، کھانا پینا ہو، اور سعی واحد ہو، یعنی سب مل کر اپنی بساط کے مطابق گھر کو چلا رہے ہوں

تو بچا کر رکھنے کی گنجائش نہ ہوگی۔

''ردالمحتار'' میں ہے: "لو اجتمع اخوۃ یعملون فی ترکۃ أبیھم، ونمی المال فھو بینھم سویۃ ولو اختلفوا فی العمل والرأی" (۳؍۳۸۳) (اگر کئی بھائی اجتماعی طور پر اپنے باپ کے ترکہ میں کام کرتے ہوں اور مال بڑھا ہو تو اس میں سب برابر کے شریک ہوں گے، اگر چہ رائے اور عمل میں مختلف ہوں)۔

''فتاوی خیریہ'' (۱؍۱۱۲) کی جو عبارت سوال ۲ کے جواب میں لکھی گئی ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

۵۔ کمانے والے کی آمدنی ہی نہیں، بلکہ اس آمدنی سے بنائی ہوئی زمین وجائداد وغیرہ میں کام کرنے والے حضرات برابر کے حقدار ہوں گے (اسے سوال نمبر ۴ کے جواب کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے)۔

''فتاوی خیریہ'' میں ہے: ''وسئل فی إخوۃ أربعۃ تلقوا عن أبیھم ترکۃ، فأخذوا فی الاکتساب والعمل فیھا جملۃ، کل علی قدر استطاعۃ ہل تکون جمیع الشرکۃ وما حصلوا بالاکتساب بینھم سویۃ وإن اختلفوا فی العمل والرأی کثرۃ وصواباً؛ (وأجاب:) نعم یکون الجمیع بینھم أرباعاً لکل ربع، وإن اختلفوا فی الرأی والقوۃ إذ کل واحد منھم یعمل لنفسہ ولإخوتہ علی وجہ الشرکۃ''۔(الفتاوی الخیریہ ۱؍۱۱۲)

(سوال کیا گیا کہ چار بھائی ہیں، انہوں نے اپنے باپ سے ترکہ پایا، پھر وہ سب کے سب اسی ترکہ میں کمانے اور کام کرنے میں اپنی اپنی استطاعت کے مطابق لگ گئے، کیا تمام ترکہ اور جو انہوں نے کما کر حاصل کیا ہے، ان سب میں برابر برابر تقسیم ہوگا، اگر چہ عمل اور رائے میں کثرت اور درستگی کے اعتبار سے مختلف ہوں، جواب دیا کہ ہاں! سب ان کے درمیان چار حصوں میں تقسیم ہوگا، ہر ایک کو ایک چوتھائی ملے گا، اگر چہ رائے اور قوت میں مختلف ہوں، کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنے لئے اور اپنے بھائی کے لئے شرکت کے طور پر کام کر رہا ہے)۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر عائلہ واحدہ ہو، سب ایک ساتھ رہتے سہتے، کھاتے پیتے ہوں، سب کی سعی ایک ہو، یعنی سب مل کر مشترکہ طور پر گھر کو چلانے اور ترقی دینے میں جٹے ہوئے ہوں تو ان کی محنت وکوشش سے جو اموال وجائداد بنیں گے، سب میں سب برابر کے شریک ہوں گے۔ کیونکہ ہر کام کرنے والا، خواہ وہ کمانے میں لگا ہو یا گھر دیکھنے میں لگا ہو، وہ نہ صرف دوسرے کے لئے کام کر رہا ہے کہ صرف اپنے لئے، بلکہ اس کی ساری دوڑ دھوپ اپنے لئے بھی ہے اور اپنے بھائیوں کے لئے بھی دوڑ دھوپ شرکت کے طور پر ہے، ''فتاوی خیریہ'' کی مذکورہ عبارت کا یہ جملہ قابل غور ہے "إذ کل واحد منھم یعمل لنفسہ ولإخوتہ علی وجہ الشرکۃ"۔

۶۔ بیٹیاں جب ماں باپ کے پاس آئیں تو ان کی خدمت کریں، یہ ان پر والدین کے حقوق میں سے ہے، اس میں بیٹا بیٹی سب برابر ہیں۔ ماں باپ کی کفالت تو بیٹوں ہی کے ذمہ ہے، اصلاً یہ چیز بیٹیوں پر ہی واجب ہے، ان کی بیویوں، یعنی بہوؤں پر واجب نہیں۔ بہوؤں پر، استحباباً ان کی خدمت وغیرہ ہے، ان احادیث کی وجہ سے جو صلہ رحمی، بڑوں کی تعظیم یا ضعیف لوگوں کی مدد وغیرہ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، اگر بہو کے علاوہ کوئی موجود نہ ہو تو والدین کو ہلاکت وضیاع وتکلیف شدید سے بچانے کے لئے بہو پر یہ خدمت ومدد واجب ہوگی۔

۷۔ پردہ کے احکام وہی رہیں گے جو ہیں، خواہ ان پر عمل کرنے میں لوگ کوتاہی کریں۔

☆☆☆

خاندانی نظام میں حقوق وفرائض کی ادائیگی کا مسئلہ

مفتی عبدالرحیم قاسمی [1]

۱۔ والدین کی خدمت اور ان کے حقوق کی ادائیگی فرض ہے اور بھائی بہن کے ساتھ حسن سلوک بھی ضروری ہے، بسا اوقات بیوی کا مزاج مختلف ہونے کی وجہ سے شوہر کے خاندان کے ساتھ اس کا رہنا دشوار ہوتا ہے، ایسے حالات میں بیوی کو الگ رکھنا ضروری ہے، البتہ علاحدہ رہنے کے باوجود لڑکا اپنے والدین کی خدمت کرتا رہے۔ ''امداد الاحکام'' میں ہے: ''اگر ساتھ رہنے میں والدین کے حقوق تعظیم وغیرہ ضائع ہونے کا اندیشہ ہو یا نزاعات واختلافات کی وجہ سے قطع رحم رشتہ ٹوٹنے کا خوف ڈر ہو تو الگ ہو جانا ضروری ہے''۔ (امداد الاحکام ۴/ ۴۵۵)

''فتاوی دار العلوم'' میں ہے: زید اپنی زوجہ کو لے کر علاحدہ رہے اور والدین کی خدمت اور فرمانبرداری کرتا رہے اور جو کچھ ان کا حق ہے ادا کرے، تاکہ دارین میں فلاح پائے۔ (فتاوی دار العلوم ۸/ ۴۱۲)

اسلام کے احکام کی بنیاد عدل وانصاف پر رکھی گئی ہے، لہذا ماں باپ بھائی بہنوں کی وجہ سے بیوی کے ساتھ حسن سلوک میں کوتاہی اور اس کی حق تلفی جائز نہیں، ''امداد الفتاوی'' میں ہے: ''چونکہ شرعاً عورت کو حق حاصل ہے کہ شوہر کے ماں باپ سے علاحدہ رہے، اگر وہ اپنے جائز حق کا مطالبہ کرے گی تو شوہر پر اس کے حق کا ادا کرنا واجب ہوگا اور واجب کا ترک چھوڑنا معصیت گناہ ہے''۔ (امداد الفتاوی ۲/ ۵۲۵)

''کتاب الفتاوی'' میں ہے: ''اگر مزاج مختلف ہونے کی وجہ سے بیوی اور گھر کے لوگوں کا ساتھ رہنا دشوار ہو تو بیوی کے لئے الگ مکان حاصل کرنا چاہئے، شریعت میں بیوی کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ شوہر کے گھر والوں سے علاحدہ رہنے کے لئے مکان کا مطالبہ کرے اور شوہر پر بشرط قدرت اس کو پورا کرنا واجب ہوگا''۔ (کتاب الفتاوی ۵/ ۱۴۴)

''درمختار'' میں ہے:

"یشترط أن لا یکون فی الدار أحد من أحماء الزوج یؤذیھا" (درمختار علی ہامش ردمختار ۲/ ۶۶۳) (شرط ہے کہ شوہر کے رشتہ داروں میں سے گھر میں کوئی نہ رہے جو بیوی کو ایذاء رسانی کرتا ہو اور تکلیف دیتا ہو)۔

''فتاوی محمودیہ'' میں ہے کہ مرد کے ذمہ واجب ہے کہ عورت کو ایک مکان علاحدہ رہنے کے لئے دے اس مکان میں شوہر کے ماں باپ بھائی بہن وغیرہ نہ رہتے ہوں، بلکہ وہ پورا بیوی کے قبضہ اور تصرف میں ہو اور مکان سے مراد ایک کمرہ یا کوٹھا ہے جس کو عربی میں بیت کہتے ہیں، لہذا اگر صحن وغیرہ مشترکہ ہو جس کو شوہر کے دوسرے عزیز بھی استعمال کرتے ہوں اور بیوی بھی تو اس کو مطالبہ کا حق نہیں کہ میرا صحن بھی مستقل ہونا چاہئے، اس میں بھی کسی کی شرکت نہ ہو۔ یہ اس وقت ہے، جبکہ شوہر اور بیوی دونوں زیادہ مالدار نہ ہوں، بلکہ غریب یا متوسط درجہ کے ہوں اگر مالدار ہوں اور شوہر میں اس قدر استطاعت ہو کہ کوئی مستقل گھر علاحدہ بیوی کو دے سکتا ہو، خواہ خرید کر خواہ کرایہ پر خواہ عاریت پر جس کا صحن وغیرہ بھی علاحدہ ہو جس کو عربی میں دار کہتے ہیں تو عورت کو اس کے مطالبہ کا حق حاصل ہے۔ (فتاوی محمودیہ ۱۸/ ۴۵۸)

''احسن الفتاوی'' میں ہے: ''اگر بیوی مالدار ہو تو اسے الگ مکان دینا واجب ہے متوسط درمیانی درجہ کی ہو تو اسی مکان میں سے ایک مستقل کمرہ کے علاوہ باورچی خانہ، غسل خانہ، اور بیت الخلاء بھی مستقل ہونا ضروری ہے، مسکین ہو تو صرف ایک کمرہ کافی ہے، باورچی خانہ، غسل خانہ، اور بیت الخلاء مشترک ہوں تو مضائقہ نہیں''۔ (احسن الفتاوی ۵/ ۴۷۶)

---

[1] امیر مرکز دعوت وارشاد وافتاء، ناظم جامعہ خیر العلوم نورمحل روڈ، بھوپال، ایم پی۔

''ردالمحتار'' میں ہے:

''إن المسكين يعتبر بقدر حالهما ولقوله تعالى: اسكنوهن من حيث سكنتم من وجدكم، و ينبغي اعتماده فى زماننا هذا، فقد مر أن الطعام والكسوة يختلفان باختلاف الزمان والمكان وأهل بلادنا الشامية لا يسكنون فى بيت من دار مشتملة على أجانب، وهذا فى أوساطهم فضلاً عن أشرافهم إلى قوله: فينبغي الإفتاء بلزوم دار من بابها نعم، ينبغي أن لا يلزمه إسكانها فى دار واسعة كدار أبيها أو كداره التي هو ساكن فيها؛ لأن كثيراً من الأوساط والأشراف يسكنون الدار الصغيرة، وهذا موافق لما قدمناه عن الملتقط من قوله: أعتباراً فى السكنى بالمعروف إذ لا شك أن المعروف يختلف باختلاف الزمان والمكان، فعلى المفتي أن ينظر إلى حال أهل زمانه وبلده إذ بدون ذلك لا تحصل المعاشرة بالمعروف، وقد قال تعالى: ولا تضاروهن لتضيقوا عليهن'' (شامی ۲-۶۶۴)

(گھر کے بارے میں ان دونوں کی حالت کا اعتبار کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے جہاں تم رہو وہاں ان کو رکھو اپنی استطاعت اور قدرت و وسعت کے مطابق مناسب ہے کہ ہمارے زمانے میں اسی پر اعتماد کیا جائے، خوراک پوشاک کے متعلق پہلے گذر چکا ہے کہ زمانہ اور جگہ کے بدلنے کی وجہ سے احکام بدلتے رہتے ہیں، ملک شام میں ایک ہی گھر میں اجنبیوں غیر محرموں کے ساتھ نہیں رہتے، یہ درمیانی درجہ کے لوگوں کا حال ہے، چہ جائیکہ بلند معیار زندگی رکھنے والے، لہٰذا مستقل دروازہ کا گھر دینے کا فتوی دینا مناسب ہے، ہاں کشادہ گھر دینے کی ضرورت نہیں، جیسے مائکہ کا گھر ہو یا شوہر کا گھر ہو، کیونکہ درمیانی درجہ کے اور اونچے درجہ کے بہت لوگ چھوٹے گھر میں رہتے ہیں، یہ مسئلہ اس کے موافق ہے جو ہم نے ملتقط کے حوالہ سے پہلے بیان کیا ہے گھر کے متعلق جو معروف ہو اس پر عمل کیا جائے بے شک زمانہ اور جگہ کے بدلنے سے معروف کا معیار بدلتا رہتا ہے، اس لئے مفتی پر لازم ہے کہ اپنے زمانہ اور شوہر کے حالات پر نظر رکھے، کیونکہ اس کے بغیر بھلائی کے ساتھ زندگی بسر نہیں ہو سکتی، اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ عورتوں پر تنگی کر کے ان کو نقصان نہ پہنچاؤ)۔

۲۔ مشترکہ خاندان کے افراد میں سے جس کے بچے زیادہ ہوں اس پر اپنے بچوں کی تعداد کے لحاظ سے خرچ دینا لازم ہے۔

''فتاوی عالمگیری'' میں ہے: "نفقة الأولاد الصغار على الأب لا يشاركه فيها أحد" (فتاوی عالمگیری ۱/ ۵۶۰) (چھوٹے بچوں کا خرچ باپ پر لازم ہے کوئی دوسرا مصارف میں شریک نہیں ہے)۔

''درمختار'' میں ہے: "تجب النفقة بأنواعها على الحر لطفله الفقير يعم الأنثى والجمع إن لم يبلغ حد الكسب" (درمختار علی ہامش رد المحتار ۲/ ۶۷۰) (آزاد آدمی پر اپنے چھوٹے بچوں کا خرچ واجب ہے، اگر وہ کمانے کے قابل نہ ہوں)۔

''امداد الاحکام'' میں ہے: زیادہ اولاد والی کی طرف جو زیادہ رقم جائے گی وہ بیوی کے نفقہ میں زیادتی نہیں، بلکہ یہ زیادتی اولاد کی ہی وجہ سے ہے اس پر دوسری بیوی اگر کوئی اعتراض کرے تو لغو ہے۔ (امداد الاحکام ۴/ ۴۵۹)

۳۔ مشترکہ رہنے والے بھائیوں نے مل کر جو رقم جمع کی ہے اس میں سے بچی ہوئی رقم کے ذریعہ کوئی چیز خریدی گئی اگر یہ معلوم ہے کہ کس نے کتنی رقم جمع کی تھی تو جتنی جس کی رقم ہوئی اس کی رقم کی مناسبت سے خریدی ہوئی چیز میں سے اس کی ملکیت ہوگی اور اگر یہ معلوم نہیں ہے کہ جمع کی ہوئی رقم کس کی کم تھی کس کی زیادہ تھی یا سب کی برابر تھی تو خریدی ہوئی چیز کی ملکیت میں سب کو برابر کا حصہ دار مانا جائے گا۔ ''احسن الفتاوی'' میں ہے: اگر مشترکہ کاروبار میں تفاوت معلوم ہو اور معین زیادتی اقرار یا بینہ سے ثابت ہو تو اس صورت میں اس کا اعتبار ہوگا۔ (احسن الفتاوی ۶/ ۳۹۴)

علامہ شامی نے لکھا ہے: "وإن لم يعرف مقدار ما كان لكل منهما صدق كل واحد منهما إلى النصف" (شامی ۳/ ۳۴۹) (اگر شریکوں میں سے ہر ایک کے مال کی مقدار معلوم نہ ہو تو آدھے حصہ تک ہر ایک کی تصدیق کی جائے گی)۔

"زوج امرأة وابنها اجتمعا فى دار واحدة وأخذ كل منهما يكتسب علاحدة ويجمعان كسبهما. ولا يعلم التفاوت ولا التساوى ولا التميز، فأجاب بأنه بينهما سوية" (شامی ۳/ ۳۴۹) (عورت کا شوہر اور اس کا لڑکا ایک ہی مکان میں رہتے ہیں اور ہر ایک علاحدہ کاروبار کرتا ہے

کمائی کی آمدنی کو ایک جگہ جمع رکھتے ہیں اور کس کی آمدنی کتنی ہے فرق اور برابری کی تمیز نہیں تو جواب یہ ہے کہ جمع شدہ رقم ان کے درمیان برابر تقسیم ہوگی)۔

"لو اجتمع إخوة يعملون في تركة أبيهم، ونمى المال فهو بينهم سوية، ولو اختلفوا في العمل والرأي" (شامی ٣/٣٤٩) (والد کے چھوڑے ہوئے کاروبار میں بھائی جمع ہوکر کام کررہے ہیں اور مال بڑھ گیا تو وہ بھی ان کے درمیان برابر تقسیم ہوگا اگرچہ کام کرنے اور رائے میں بھائی مختلف ہوں)۔

"فإن كان سعيهم واحد أولم يتميز ما حصله كل واحد بعمله يكون ما جمعوه مشتركاً بينهم بالسوية، وإن اختلفوا في العمل والرأي كثرة وصواباً" (شامی ٣/٣٤٨) (جب ان کی کوشش مشترک طور پر ایک ہو اور ایک نے جو آمدنی حاصل کی ہے اس کی تمیز نہ ہو تو ان کی جمع کی ہوئی جس قدر آمدنی ہے اس میں برابر حصوں کے حقدار ہوں گے، اگرچہ کام کرنے اور رائے کے زیادہ درست ہونے میں مختلف ہوں)۔

اگر سب بھائی کماتے ہیں اور سب شریک رہے اور کمی بیشی کا حال معلوم نہیں تو جو کچھ گھر میں موجود ہے بوقت علاحدگی سب برابر برابر تقسیم کریں گے۔ (فتاویٰ دارالعلوم ١٣/٩٠)

٤۔ جو بھائی بیس ہزار روپے کماتا ہے دس ہزار روپے دونوں بھائیوں کے برابر گھر میں دیتا ہے اور دس ہزار روپے الگ بچا کر رکھتا ہے تو وہ بچی ہوئی رقم اس کی ملکیت ہوگی، ''فتاویٰ دارالعلوم'' میں ہے: بکر نے جو زیور اور سامان خانہ داری اپنی آمدنی ملازمت سے حاصل کیا وہ اسی کا ہے اس کے بھائی زید یا عمر کا اس میں کوئی حق نہیں۔ (فتاویٰ دارالعلوم ١٣/٧٢)

حدیث میں ہے: "كل أحد أحق بماله من والده وولده والناس أجمعين". (رواہ البیہقی؛ سنن کبریٰ ٧/٧٩٠)

والد اولاد اور تمام لوگوں کے مقابلہ میں ہر شخص اپنے مال کا خود زیادہ حقدار ہے یہ حدیث صحیح ہے، ''جامع صغیر'' میں اس پر صحت کی علامت لکھی ہے اور ''سراج منیر شرح جامع صغیر'' میں اس کو صحیح کہا ہے، ''اصابہ'' اور ''اسد الغابہ'' سے معلوم ہوتا ہے کہ حبان جمحی ابن جبلہ تابعی ہیں، صحابی نہیں، اس صورت میں حدیث مرسل ہوگی، بہرحال قابل استدلال ہے۔ (فتاویٰ دارالعلوم ١٣/٦٦)

ایک بھائی نے کسب کیا اور مال حاصل کیا اور دوسرے بھائی کا اس میں کسب شامل نہیں ہوا تو پھر وہ مال حاصل شدہ اور مکسوبہ سب اسی کا ہے جس نے اپنے کسب سے حاصل کیا۔ (فتاویٰ دارالعلوم ١٣/٧١)

علاحدہ تجارت کے نفع نقصان کا کوئی بھائی شریک وذمہ دار نہ ہوگا۔ (فتاویٰ دارالعلوم ١٣/٧٣)

دونوں بیٹوں نے جدا جدا کمایا اور اپنے اپنے مال مکسوبہ سے علاحدہ علاحدہ جائیداد خریدی اور مکانات وغیرہ بنوائے تو ہر ایک اپنے اپنے مکسوبہ اور جائیداد خرید کردہ کا مالک ہوگا، باقی ورثہ کا اس میں کچھ حق وحصہ نہیں۔

"في رد المحتار: زوج امرأة وابنها اجتمعا في دار واحدة، وأخذ كل منهما يكتسب علاحدة ويجمعان كسبهما" (شامی ٣/٣٤٩)۔

(عورت کا شوہر اور اس کا بیٹا دونوں ایک گھر میں رہتے ہیں اور ہر ایک علاحدہ کماتا ہے اور دونوں ایک جگہ اپنی آمدنی کو جمع کرتے ہیں)۔

اس عبارت میں "قيد ويجمعان كسبهما" سے معلوم ہوا کہ اگر وہ دونوں باہم اپنے مکسوبہ مال کو جمع نہ کریں تو ہر ایک اپنے اپنے مکسوبہ مال وجائداد کا مالک ہے۔ (فتاویٰ دارالعلوم ١٣/٧٣)

مذکورہ عبارتوں سے ظاہر ہے کہ بیس ہزار روپے کمانے والے بھائی نے جو دس ہزار روپے گھر میں دیئے صرف وہی مشترک ہیں اور جو دس ہزار روپے الگ بچا کر رکھتا ہے اس رقم کا تنہا یہی مالک ہے۔

٥۔ گھر کے افراد نے مشورہ کرکے اگر کاروبار کی ذمہ داری کچھ حضرات کے سپرد کی ہے اور گھر کے کام دیکھنے کی ذمہ داری کچھ حضرات کے سپرد کی ہے اور وہ سب اپنی ذمہ داریوں کو انجام دیتے ہیں تو طے شدہ نظام کے مطابق آمدنی میں وہ سب برابر کے حصہ دار ہوں گے، کیونکہ گھر کی ذمہ داری سنبھالنے والوں نے ان کو امور خانہ داری سے بے فکر کردیا تبھی وہ پوری توجہ کے ساتھ کاروبار کو ترقی دے رہے ہیں۔

شامی میں ہے:

"لو اجتمع إخوة يعملون في تركة أبيهم ونمى المال فهو بينهم سوية، ولو اختلفوا في العمل والرأي"۔ (شامی ۳۴۹/۴)۔ (اپنے والد کے چھوڑے ہوئے ترکہ میں سب بھائی مل کر کام کررہے ہوں اور مال بڑھ گیا تو وہ ان کے درمیان برابر تقسیم ہوگا، اگرچہ کام کرنے اور رائے میں وہ مختلف ہوں)۔

البتہ جو بھائی سستی کاہلی کی وجہ سے بیکاری کے عادی ہوں، گھر پر پڑے رہیں اور کام کرنے والے بھائیوں سے آمدنی وصول کریں وہ کاروبار کی آمدنی میں حقدار نہیں، ''فتاوی دار العلوم'' میں ہے: ''اگر باپ کے ترکہ میں کئی بھائی تجارت اور کاروبار کریں اور اس کو بڑھادیں تو وہ سب بھائی اس میں برابر کے حصہ دار ہیں، اگرچہ ان کا عمل اور کوشش مختلف ہو، لیکن جو بھائی بالکل اس کاروبار سے علاحدہ رہا اور اس نے کسی قسم کی بھی اعانت بھائیوں کے کام میں نہ کی اور کسی قسم کا عمل نہ کیا تو روایت بالا کے مفہوم سے معلوم ہوا کہ وہ اس نما میں شریک نہ ہوگا''۔ (فتاوی دار العلوم ۷۵/۱۳)

ظاہر ہے کہ جب وہ بیکار بھائی نما میں شریک نہیں ہے تو آمدنی میں بھی حصہ دار نہیں ہوگا۔

☆☆☆

اسلام کا پسندیدہ خاندانی نظام

مفتی ظہیر احمد کانپوری[1]

اسلام میں ایسا خاندانی نظام پسندیدہ اور مستحسن ہے جس میں تمام شرکاء خاندان اور افراد خانہ کے حقوق کی ادائیگی مکمل طور پر ہو سکے اور ان کے مابین کسی قسم کا نزاع اور جھگڑا نہ رہے۔

لہٰذا اتنا بڑا مشترکہ خاندان کہ جن کے اجتماعی طور پر کسی گھر میں رہنے سے کسی کو کوئی تکلیف اور پریشانی نہ ہو اور ہر ایک کے مکمل حقوق کی ادائیگی شرعی طور پر ہو سکے بہتر ہے۔

لیکن اگر ساتھ رہنے کی وجہ سے نزاع اور جھگڑا پیدا ہوتا ہے تو پھر ساتھ رہنے کی بجائے علیحدہ طور پر رہ کر ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی کی جائے، اب خواہ یہ نزاع دو بیویوں کے درمیان ہو۔

تو ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ رکھ کر ان کے اخراجات پورے کئے جائیں اور ہر ایک کے حقوق پورے طور پر ادا کئے جائیں۔

یا ساس بہو اور سسر بہو کے درمیان نزاع رہنے کی صورت میں بیوی کو علیحدہ رکھا جائے اور اپنے والدین کے حقوق کی ادائیگی بھی کی جائے۔ (فتاوی دار العلوم ۸ / ۴۱۲، ۴۱۷، ۱۱/ ۱۳۶)

لیکن والدین اگر بوڑھے ہیں تو پھر ان کو اپنے ساتھ رکھنا لازم ہوگا، "فتاوی قاضی خاں" میں ہے:

"إن كان الوالد زمنا أو لا يقدر على عمل وللابن عيال كان على الابن أن يضم الأب إلى عياله وينفق على الكل"۔ (۱-۲۰۶، قاضی خاں مصطفائی)

(والد اگر انتہائی بوڑھے ہوں اور کام کرنے پر قادر نہ ہوں اور بیٹا صاحب عیال ہو تو بیٹے پر لازم ہے کہ والد کو اپنی عیال کے ساتھ رکھے اور مشترکہ طور پر خرچ کرے)۔

شامی میں ہے:

"ولا يخفى أن الأم بمنزلة الأب الزمن، لأن الأنوثة بمجردها عجز"۔

اور یہ بات مخفی نہیں ہے کہ ماں انتہائی بوڑھے، کھونسٹ باپ کے درجہ میں ہے (حکم میں ہے)۔ (رد المحتار ۲/ ۶۷۷، مکتبہ نعمانیہ)

(کیونکہ محض مؤنث ہونا عمل پر قادر نہ ہونے کی علامت ہے)

اسی طرح یہ نزاع دیگر قریبی رشتہ داروں کے مابین ساتھ رہنے کی وجہ سے پیدا ہو تو پھر ان کا علیحدہ رہ کر ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی کرنا چاہئے، جیسے بھائیوں کے درمیان نزاع ہو یا چچا بھتیجوں کے درمیان نزاع ہو۔

۱۔ یہ آپسی رضامندی اور معاہدہ پر موقوف ہے جس طرح بھی آپس میں طے ہو جائے۔

۲۔ خواہ مشترکہ طور پر ساتھ کھانے پینے رہنے کے بچوں کے لحاظ سے اخراجات متعین کر لئے جائیں۔

۳۔ مشترک طور پر کھانے پینے اور رہنے سہنے کے علاوہ ہر شریک برابر برابر اوپری خرچ لے۔ خواہ کسی کے بچے زیادہ ہوں یا کم۔

---

[1] جامع العلوم پٹکاپور، کانپور۔

۴۔ کاروبار میں تو سب شریک ہوں، مگر کھانے پینے، اور رہنے سہنے میں اخراجات میں علیحدہ ہو تو پھر ہر شریک کاروبار میں برابر کا شریک ہوگا۔ اور برابر اخراجات لینے کا حقدار رہے گا۔ (فتاوی دار العلوم دیوبند ۱۳/ ۴۸، ۱۳/ ۸۱و۸۶)

۵۔ ایسی صورت میں سبھی کا حصہ برابر ہوگا۔ (حوالہ سابق فتاوی دار العلوم دیوبند ۱۳/ ۴۸، و۱۳/ ۸۱و۸۶)

۶۔ بچی ہوئی رقم صرف اس کی ملکیت ہوگی۔ اس میں دیگر بھائیوں کا حصہ نہ ہوگا۔ (فتاوی دار العلوم دیوبند ۱۳/ ۷۴۔ ۷۳)

۷۔ سب برابر کے حقدار ہوں گے۔ (فتاوی دار العلوم دیوبند ۱۳/ ۴۶۔ ۴۵)

۸۔ (الف) بیٹے اور بیٹیوں دونوں پر برابر طور پر واجب ہے۔

چنانچہ ''قاضی خاں'' میں ہے: "ولو كان له ابن وابنة كانت نفقته عليهما على السواء، وقال بعضهم: يكون نفقته عليهما أثلاثا على قدر الميراث، والفتوى على الأول"۔ (قاضی خان ۱/ ۲۰۶ وکذا فی الدر مع الشامی ۲/ ۶۷۸)

(اور اگر اس کے لڑکا اور لڑکی ہو تو نفقہ دونوں پر برابر طریقہ پر واجب ہوگا اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ نفقہ اثلاثا واجب ہوگا میراث کے بقدر (یعنی لڑکے پر دو تہائی اور لڑکی پر ایک تہائی) اور فتوی پہلے قول پر ہے)۔

(ب)۔ بہو پر اس خدمت کا بجالانا واجب نہیں، تاہم کسی کے نہ ہونے پر اخلاقی طور پر اس خدمت کو انجام دینا چاہئے۔

ورنہ مالدار بیٹوں پر اپنے والدین کی خدمت کے لئے خادم/ خادمہ کا نظم کرنا واجب ہے، چنانچہ ''فتاوی قاضی خاں'' میں ہے:

''وكما يجب على الابن الموسر نفقة والده الفقير يجب عليه نفقة خادم الأب امرأة كانت الخادم أو جارية إذا كان الأب محتاجاً إلى من يخدمه''۔ (قاضی خان ۱۔۲۰۶)

یعنی مالدار بیٹے پر جس طرح اپنے والد کا نفقہ واجب ہے اسی طرح والد کے خادم کا نفقہ بھی واجب ہے، چاہے وہ خادم عورت ہو یا لڑکی، جبکہ والد کو خدمت کی ضرورت ہو۔

اس عبارت سے صریح طور پر والد کے خادم کے نفقہ کا وجوب ثابت ہوتا ہے جبکہ ماں کے خادم/ خادمہ کا ثبوت صریح طور پر شامی کی درج ذیل عبارت سے ہوتا ہے:

''ولا يخفى أن الأم بمنزلة الأب الزمن، لأن الأنوثة بمجردها عجز۔ (۲۔۶۷۷)

(کہ یہ بات ظاہر ہے کہ ماں بوڑھے باپ کے حکم میں ہے، کیونکہ مؤنث ہونا بذات خود عاجز ہونے کی دلیل ہے)۔

۹۔ یہ اس صورت میں ہوگا، جبکہ چچا بھی ساتھ رہتے ہوں اور خاندان کافی بڑا ہو زیادہ بڑے خاندان کے ساتھ رہنے میں پردہ کے علاوہ دیگر مسائل پیدا ہونے کا قوی امکان ہے۔ اس لئے بہت زیادہ بڑے پیمانہ پر مشترکہ خاندان بھی اسلام میں پسندیدہ نہیں۔ تاہم اس صورت میں حتی الامکان پردہ کا اہتمام کیا جائے، یعنی کم از کم چہرہ ہتھیلی اور ٹخنہ کے علاوہ سارا جسم ڈھکا ہونا ضروری ہے۔ جیسا کہ سورہ النور کی آیت: "وقل للمؤمنات الخ" (سورہ نور: ۳۱) میں وارد ہے۔

☆☆☆

مشترکہ اور جداگانہ خاندانی نظام کے فوائد اور نقصانات

مولانا عبداللطیف پالنپوری[۱]

جواب ۱: مشترکہ خاندانی نظام میں یقیناً کچھ فوائد اور محاسن ہیں، جیسا کہ سوالنامہ میں مذکور ہے، مثلاً خاندان کے کمزور افراد کی مدد، بیوہ ومطلقہ عورتوں اور یتیم لڑکوں اور لڑکیوں کی بہتر پرورش ہونا، بوڑھے ماں باپ کی خدمت وغیرہ، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں بہت کچھ مفاسد بھی ہیں جو شریعت کی نظر میں مکروہ وناپسندیدہ، بلکہ حرام درجے تک پہنچے ہوئے ہیں، اور ان مفاسد سے مشترکہ خاندانی نظام کو پاک کرنے کا حل اس دور فساد میں صرف مشکل ہی نہیں، بلکہ بہت مشکل ہے۔

جبکہ دوسری طرف جداگانہ خاندانی نظام ان مفاسد سے پاک ہے، رہا مسئلہ بوڑھے ماں باپ کی خدمت اور مطلقہ بیوہ عورتوں کی کفالت اور یتیم بچوں اور بچیوں کی پرورش کا، تو اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ جداگانہ خاندانی نظام ان چیزوں سے مانع نہیں ہے، بلکہ غور کیا جائے تو اس کا اصل سبب ماں باپ کے حقوق سے ناواقفیت اور بیواؤں اور یتیموں کی کفالت پر ملنے والے اجر وثواب سے غفلت ہے، ورنہ آج کے اس دور میں بھی بہت سارے نمونے موجود ہیں کہ جداگانہ خاندانی نظام کے باوجود ماں باپ کی خدمت کا پورا پورا حق ادا ہورہا ہے، بیواؤں کی کفالت اور یتیموں کی پروش کا بہترین انتظام ہورہا ہے، لہٰذا مذکورہ بالا تفصیل کے پیش نظر ہماری رائے یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں جداگانہ خاندانی نظام بہتر ہے۔ آگے مشترکہ خاندانی نظام کے مفاسد میں سے چند بطور نمونہ پیش خدمت ہیں:

۱۔ مشترکہ خاندانی نظام میں ہر ایک کی ملکیت ومالیت کا الگ حساب نہیں رہتا، جبکہ شریعت کے کئی احکام مثلاً زکوۃ، قربانی، صدقہ فطر کا وجوب ہر ایک کی ملکیت کے الگ حساب پر موقوف ہے، نیز وراثت کا حکم جاری کرنا بھی ہر ایک کی ملکیت کے الگ حساب پر موقوف ہے۔

۲۔ ایک بھائی کی اولاد زیادہ ہے، ایک کی کم تو ایک کا خرچ زیادہ ہے دوسرے کا کم، اور کام وآمدنی دونوں کی برابر، تو اس صورت میں ایک کا نقصان وحق تلفی ہے۔

۳۔ اگر والدین کی حیات میں کسی ایک بھائی کا انتقال ہوگیا تو اس کی اولاد اور بہوترکہ سے محروم ہوجائیں گے، مرنے والا چونکہ باپ کا معاون تھا، اس لئے اس کا کوئی ترکہ ہی نہ تھا جو اس کے بیوی بچوں کو دیا جائے، اور جب والد کا انتقال ہوگا تو پوتے اور مرحوم کی بیوہ محروم ہوں گے، اگر یہ مرحوم شروع سے الگ رہتا تو اس کا ترکہ اس کے بیوی بچوں کو ملتا۔

۴۔ اگر کئی بھائی ہیں، ایک بھائی کھیتی کرتا ہے اور پیداوار گھر میں کھانے پینے میں خرچ ہوتی ہے اور دوسرے بھائی گھر سے باہر ملازمت پر ہیں جو وقتاً فوقتاً خرچ بھیجتے رہتے ہیں اور وہ گھر میں صرف ہوتا رہتا ہے، اور گھر آئے ہوئے گھر کی ضرورت کی کوئی چیز خرید کرلاتے ہیں، اب جب علیحدگی ہوئی تو وہ چیزیں جو بھائی خرید کرلائے تھے انہوں نے اس چیز پر قبضہ کرلیا کہ یہ ہم نے ذاتی آمدنی سے خریدی ہے، اگر یہ شرکت کی چیز سمجھی جائے گی تو ہمارے ذمہ اتنا قرض بھی ہے وہ بھی شرکت کا ہوگا، اب اس مسئلہ کا حل کرنا مشکل ہوتا ہے۔

۵۔ چار بھائی ہیں، ایک تجارت کرتا ہے، ایک ملازمت کرتا ہے، ایک کھیتی کرتا ہے، ایک کم عمر اپنی بساط کے مطابق گھر کا کام کرتا ہے، اب ہر ایک بھائی خفیہ طور پر اپنے پاس کچھ رقم جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے، جس میں دوسرے کا نقصان اور حق تلفی ہے۔

---

[۱] جامعہ نذیریہ کاکوسی گجرات۔

۶۔ مشترکہ خاندانی نظام میں گھر کے سب افراد کے لئے یکساں کھانے کا انتظام ہوتا ہے، جبکہ بھائیوں کی آمدنیاں مختلف ہیں، بعض بے روزگار ہیں، لیکن سب کو برابر رکھنے کی وجہ سے اس بھائی کی عورت کی حق تلفی ہوتی ہے جس کی آمدنی زیادہ ہے، کیونکہ عورت کا نان نفقہ مرد کی حیثیت کے مطابق واجب ہوتا ہے۔

۷۔ ہرایک بھائی کی بیوی کے لئے الگ کمرہ نہ ہونے کی وجہ سے دیور، جیٹھ، چچازاد، پھوپھی زاد سے پردہ مشکل ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی مفاسد ہیں۔

جواب ۲: شریعت کا حکم یہ ہے کہ ہر آدمی اپنے بیوی بچوں کے خرچ کا مکلف ہے، ایک بھائی کی اولاد کے اخراجات دوسرے کے ذمے ڈالنا شرعاً جائز نہیں ہے، لہٰذا مشترکہ خاندانی نظام میں ہرایک بھائی پر اس کے بچوں کی تعداد کے لحاظ سے اخراجات عائد کئے جائیں گے۔

''ونفقة الأولاد الصغار على الأب لا يشاركه فيها أحد كما لا يشاركه في نفقة الزوجة لقوله تعالى: وعلى المولود له رزقهن، والمولود له هو الأب''۔ (ہدایہ ثانی باب النفقۃ ۲۔۴۲۲)

جواب ۳: اس صورت میں جبکہ سب بھائیوں نے علیحدہ علیحدہ کسب کیا ہے، اور مشترکہ اخراجات کے لئے والد یا بڑے بھائی کے پاس رقم جمع کروائی ہے، والد کو یہ رقم ہبہ نہیں کی ہے، اور مشترکہ اخراجات سے بچی ہوئی رقم کے ذریعے کوئی چیز خریدی گئی ہے، اور کس نے کتنی آمدنی جمع کروائی ہے یہ معلوم نہیں ہے، تو عدم امتیاز مقدار کے وقت سب بھائی خریدی ہوئی چیز کے برابر سرابر مالک شمار کئے جائیں گے۔ شامی میں ہے: (تنبیہ) "يؤخذ من هذا ما أفتى به في الخيرية في زوج امرءة وابنها اجتمعا في دار واحدة، وأخذ كل منهما يكتسب عليحدة ويجمعان كسبهما، ولا يعلم التفاوت ولا التساوي ولا التمييز، فأجاب بأنه بينهما سوية" (شامی ۳/ ۳۴۹، بیروت، امداد الفتاوی ۳/ ۵۱۵)

جواب ۴: اس صورت میں بیس ہزار کمانے والے بھائی نے دس ہزار جو الگ بچا کر رکھے ہیں تو وہ بچی ہوئی رقم صرف اسی کی ملکیت ہوگی، دوسرے دو بھائیوں کی اس میں شرکت نہ ہوگی، الا یہ کہ بیس ہزار کمانے والے بھائی کی اولاد دوسرے دو بھائیوں کے مقابلہ میں زیادہ ہو تو بچا کر رکھی ہوئی رقم میں سے اپنی اولاد کا زائد خرچہ دینا ہوگا۔ حدیث شریف میں آتا ہے: "ألا لا يحل مال امرأ مسلم إلا بطيب نفس منه" (مشکوۃ شریف ۲۵۵)

جواب ۵: سوال کی اس صورت میں کئی احتمال ہیں (۱) باپ حیات ہے اور اس کا اپنا کاروبار ہے، لیکن معذوری کی وجہ سے کاروبار نہیں کرسکتا، اب اس کی کچھ اولاد کاروبار میں کمائی کرتی ہے اور کچھ اولاد گھر کا کام دیکھتی ہے، اور کھانا پینا سب کا مشترک ہے، اس صورت میں پوری کمائی باپ کی شمار ہوگی، اور بیٹوں کی حیثیت معین کی ہوگی، اور باپ کے انتقال کے بعد شرعی قانون کے مطابق وراثت جاری ہوگی۔ "الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة، ولم يكن لهما شيئ فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله لكونه معينا له" (شامی ۳/ ۳۴۱، بیروت، احسن الفتاوی ۶/ ۳۹۳)

۲۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ باپ کے انتقال کے بعد میراث تقسیم نہیں ہوئی اور مشترک خاندانی نظام چلتا رہا، اور کچھ افراد باپ کے ترکہ میں کمائی کرتے ہیں اور کچھ افراد گھر کا کام دیکھتے ہیں، تو اس صورت میں ترکہ میں جو بڑھوتری ہوگی اس میں تمام بھائی برابر کے شریک ہوں گے۔

''وكذلك لو اجتمع إخوة يعملون في تركة أبيهم ونمى المال، فهو بينهم سوية، ولو اختلفوا في العمل والرأي اھ''۔ (شامی ۳۔۳۴۹، بیروت)

۳۔ تیسرا احتمال یہ ہے کہ کچھ افراد جو کمائی کرتے ہیں وہ والد صاحب کے کاروبار یا والد صاحب کے ترکہ میں کمائی نہیں کرتے ہیں، بلکہ وہ اپنی علیحدہ کمائی کرتے ہیں اور کچھ افراد گھر کا کام دیکھتے ہیں، اور انہوں نے گھر کا کام اپنے ذمہ لیا، اس لئے کمائی کرنے والوں کو کمائی کے لئے فراغت اور تعاون ملا، اس صورت کا حکم یہ ہے کہ کمانے والے حضرات کی آمدنی میں گھر کا کام دیکھنے والے افراد کا کوئی حق نہ ہوگا اور یہ آمدنی صرف کمانے والوں کی ہوگی، البتہ گھر کا کام دیکھنے والے بھائی اپنی ذمہ داری اور کام کی وجہ سے اجرت مثل کے حقدار ہوں گے۔

''وماحصله أحدهما بإعانة صاحبه، فله ولصاحبه أجر مثله'' (در مختار) (قوله بإعانة صاحبه) سواء كانت الإعانة بعمل كما إذا أعانه فى الجمع والقلع أو الربط أو الحمل أو غيره أو بآلة كما لو دفع له بغلا أو راوية ليستقى عليها أو شبكة ليصيد بها''۔(شامی ۳۔۳۵۰، بیروت)، (مستفاد از فتاوی محمودیہ ۱۳۔۱۹۳۔۱۹۲، مکتبہ صدیق ڈابھیل)

جواب ۶: ماں باپ کی خدمت اور کفالت بیٹوں اور بیٹیوں پر برابر طریقہ پر واجب ہے، جبکہ وہ صدقۂ فطر کے نصاب کے مالک ہوں، اور اولاد میں سے اگر کوئی صدقۂ فطر کے نصاب کا مالک نہیں ہے تو اس پر ماں باپ کا نفقہ واجب نہ ہوگا، بہو کے ذمے شوہر کے ماں باپ کی خدمت اور کفالت واجب نہیں ہے، البتہ بہو کا یہ اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ شوہر کے ماں باپ کو اپنے ماں باپ سمجھ کر ان کی خدمت میں تعاون کرے۔

''ولايشارك الولد فى نفقة أبويه أحد ... وهى على الذكور والإناث بالسوية فى ظاهر الرواية وهو الصحيح''۔(ہدایہ ثانی ۲۔۴۲۶، باب النفقۃ)

''وتجب على موسر ولو صغيرا يسار الفطرة على الارجح (در مختار) (قوله يسار الفطرة على الأرجح) أى بأن يملك مايحرم به أخذ الزكوٰة وهو نصاب، ولو غير نام، فاضل عن حوائجه الأصلية، وهذا قول أبى يوسف، وفى الهداية: وعليه الفتوى، وصححه فى الذخيرة، ومشى عليه فى متن الملتقى، وفى البحر: أنه الأرجح''۔(شامی ۲۔۶۷۶، بیروت)

''ففى ولدين لمسلم فقير، ولو أحدهم نصرانيا أو أنثى تجب نفقته عليهما سوية، ذخيرة، للتساوى فى القرب والجزئية، وإن اختلفا فى الإرث''۔(شامی ۲۔۶۷۸، بیروت)

جواب ۷: جس مکان میں پورا خاندان ساتھ رہتا ہو اور مکان تنگ ہونے کی وجہ سے مکمل طور پر پردہ نہیں ہو پاتا تو وہاں پردہ قائم رکھنے کی صورت یہ ہے کہ چہرہ کے علاوہ باقی بدن تو چھپا رہتا ہی ہے، چہرہ بھی سامنے نہ کریں، اور نامحرم کے ساتھ خلوت کا موقع کبھی نہ آنے دیں، ہنسی مذاق سے پوری احتیاط رکھیں، یہ اس وقت ہے، جبکہ مکان میں تنگی کی وجہ سے اتنی گنجائش نہ ہو کہ نامحرم کی آمد کے وقت مکان کے اندرونی حصہ میں چلی جائیں، یا پردہ درمیان میں لٹکا دیں، اگر گنجائش ہو تو چہرہ چھپا کر بھی سامنے آنے سے اجتناب کریں یہ تو عورتوں کے حق میں ہے۔

مردوں کے حق میں یہ ہے کہ جب مکان میں جائیں اطلاع کر کے جائیں، اور نگاہ نیچی رکھیں، اور ہنسی مذاق، نیز خلوت سے پوری احتیاط کریں۔(فتاوی محمودی ۸/ ۴۷۔ ۴۷۳، مکتبہ محمودیہ دن ق)

☆☆☆

مشترکہ یا جداگانہ نظام زندگی کے متعلق سوالات کے جوابات

مفتی عبدالقیوم پالنپوری[1]

(۱) اسلام میں مشترکہ نظام زندگی کے مقابلہ میں ایسا جداگانہ نظام زندگی بہتر ہے جس میں مرد بیوی اور نابالغ اولاد کے حقوق پورے طور پر ادا کرے اور والدین وغیرہ جن رشتہ داروں کا نفقہ یا خدمت واجب ہے ان کے حقوق کی ادائیگی ہو، کسی پر ناحق زیادتی نہ ہو اور شرعی پردہ کی رعایت ہو۔

(۲) شرعاً مرد پر اپنی نابالغ اولاد اور بالغ محتاج لڑکیوں اور اپاہج ومعذور بالغ لڑکوں اور بیوی کا خرچ ونفقہ واجب ہے، اور اگر والدین بھی واقعی نفقہ کے محتاج ہیں کہ ان کے پاس کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے تو انکا خرچ بھی غنی (صاحب نصاب) اولاد پر واجب ہے، پس مشترکہ خاندان میں ہر ایک پر اپنی اپنی اولاد کا خرچ واجب ہوگا، سب بھائیوں پر برابر خرچ واجب نہ ہوگا، ''درمختار'' میں ہے: وتجب النفقة بأنواعها على الحر لطفله (يعم الأنثى والجمع) الفقير الحر. (ردالمحتار مع الدر ۲/ ۹۲۳)

(۳) اگر اولاد نے اپنی آمدنی کی رقوم اپنے والد کو دی اور دینے کا مقصد والد کو ہبہ کرنا نہیں ہے اور قرض کے طور پر دینے کی صراحت بھی نہیں ہے، بلکہ مقصد ہے کہ ہمارے لئے جائداد خریدیں یا تجارت کریں یا موجود کاروبار کو بڑھائیں تو اس صورت میں ان رقوم سے جو جائداد خریدی جائے گی یا تجارت کی جائے گی تو اس میں اولاد اپنی اپنی رقوم کے بقدر شریک ہوں گی۔

اور اگر اولاد نے رقوم والد کو دی اور والد صاحب یہی سمجھتے ہیں کہ اس کا میں مالک ہوں اور اولاد کو واپس طلب کرنے کا حق نہیں ہے اور نہ والد کے تصور میں یہ ہے کہ اولاد نے بطور قرض یا اولاد نے اپنے لئے تجارت یا جائداد خریدنے کے لئے دی ہے اور نہ اولاد کے تصور وخیال میں یہ بات ہے، جیسا کہ (مشترکہ خاندانی نظام میں عموماً اسی طرح کا عرف ہے) تو اس صورت میں یہ اولاد کی دی ہوئی رقوم والد کی ملک قرار دی جائے گی اور ان میں سے گھر کے خرچ کے بعد باقی ماندہ رقوم سے جو جائداد واملاک خریدی والد نے یا تجارت کی یا موجودہ کاروبار میں اس سے اضافہ کیا تو اس کے مالک صرف والد ہی ہوں گے اور ان کی وفات کے بعد ان کے ترکہ میں شامل ہو کر تمام ورثاء وراثت کے حصول کے بقدر حقدار ہوں گے۔

۴- مذکورہ صورت میں جس بھائی نے اپنی تنخواہ...... ۲۰ ہزار میں سے ہر ماہ دس ہزار اپنے پاس جمع کی ہے، یہ جمع شدہ رقم کا مالک یہی بھائی ہے، اس میں شرعاً والد صاحب یا دوسرے بھائیوں کا کوئی حق نہیں ہوگا۔

(۴) اگر والد صاحب حیات ہیں اور چند لڑکے ان کے گاؤں کے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں یا کھیتی وغیرہ کا کام دیکھتے ہیں اور دوسری اولاد دوسری جگہ کماتی ہے اور ملازمت کرتی ہے تو یہ دوسری جگہ ملازمت کرنے والی اولاد نے جو رقوم کما کر والد صاحب کو دیدی تو والد صاحب اس کے مالک ہوں گے اور جو روپئے انہوں نے اپنی کمائی میں سے اپنے پاس جمع رکھی اس میں والد یا دوسرے بھائی حقدار نہ ہوں گے۔

(۵) والدین کو بڑھاپے میں خدمت وکفالت کی ضرورت ہوتی ہے تو والدین کی خدمت تو تمام اولاد لڑکے، لڑکیوں پر واجب ہے (الا یہ کہ اس میں سے کوئی معذور یا اپاہج ہو یا لڑکی سسرال میں دوسرے گاؤں ہونے کی وجہ سے نہ آسکتی ہو) اور بہوؤں پر اپنے شوہروں کے والدین کی خدمت شرعاً واجب نہیں ہے، اگر خدمت کریں گی تو ان کا احسان ہوگا اور ثواب کی مستحق ہوں گی، اگر بہوئیں خدمت کے لئے تیار نہ ہوں تو خود اولاد خدمت کرے اور ایسی خدمت جس میں عورتوں ہی کی ضرورت ہو تو دوسری عورتوں سے اجرت دے کر کام کروائیں۔

والدین واقعی نفقہ کے محتاج ہوں تو صدقۂ فطر کا نصاب رکھنے والی اولاد لڑکے اور لڑکیوں پر نفقہ واجب ہے، اور صدقۂ فطر کا نصاب رکھنے والی

---

[1] جامعہ نذیریہ کاکوسی، شمالی گجرات۔

لڑکی پر بھی لڑکے کے بقدر نفقہ واجب ہوگا، البتہ اگر اولاد میں مالداری وغنا میں غیر معمولی تفاوت ہے تو مالداری وغنا میں فائق اولاد پر دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ نفقہ واجب ہوگا۔

حضرت مفتی محمود صاحب ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ ”جب کہ وہ خود (والد) صاحب حیثیت ہے اور اپنا خرچ خود برداشت کرسکتا ہے تو پھر زید (لڑکے) کے ذمہ دس روپیہ دینا واجب نہیں ہے، بلکہ زید اپنی استطاعت کے مطابق خدمت کرتا رہے اور اس میں کوتاہی نہ کرے“۔ (فتاویٰ محمودیہ ۱۳/۴۶۴)

’’وفی الدر المختار: تجب علی موسر یسار الفطرة النفقة لاصوله الفقراء ولو قادرین علی الکسب ... بالسویة بین الابن والبنت، وقیل: کالإرث وبه قال الشافعی۔ وفی رد المحتار: (قوله السویة بین الابن والبنت) وهو ظاهر الروایة وهو الصحیح، هدایة، وبه یفتی خلاصة، وهو الحق، فتح۔ وکذا لو کان للفقیر ابنان أحدهما فائق فی الغنی والآخر یملك نصابا فهی علیهما سویة، خانیة، وعزاه فی الذخیرة إلی م۔سوط محمد، ثم نقل عن الحلوانی: قال مشائخنا: هذا لو تفاوتا فی الیسار تفاوتا یسیراً، فلو فاحشا یجب التفاوت فیها‘‘۔ (رد المحتار ۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴)

”درمختار“ میں ہے کہ ”صدقہ فطر کا نصاب رکھنے والے مالدار پر اپنے محتاج اصول، (باپ، دادا، ماں، دادی وغیرہ) کا نفقہ وخرچ واجب ہے، اگر چہ وہ اصول کمانے پر قادر ہوں..... لڑکے اور لڑکی کے درمیان برابری کے ساتھ اور کہا گیا ہے کہ وراثت کے مانند اور اسی کے مطابق امام شافعیؒ نے کہا ہے۔ علامہ شامیؒ نے فرمایا ہے کہ لڑکے اور لڑکی کے درمیان برابری کا قول وہ ظاہر الروایت ہے اور وہی صحیح ہے۔ ہدایہ، اور اسی پر فتوی ہے، خلاصہ اور وہی حق ہے، فتح اور اسی طرح اگر ایک محتاج باپ کے دو لڑکے ہوں، ایک زیادہ مالدار ہو اور دوسر انصاب کے بقدر کا مالک ہو تو نفقہ دونوں پر برابر ہوگا، خانیہ، اور اس مسئلہ کو ذخیرہ میں امام محمدؒ کی مبسوط کی طرف منسوب کیا ہے، پھر امام حلوانیؒ سے نقل کیا ہے کہ ”حلوانیؒ نے فرمایا کہ ہمارے مشائخ نے فرمایا ہے کہ یہ مسئلہ اس وقت ہے جب دونوں میں مالداری میں معمولی تفاوت وفرق ہو، پس اگر دونوں میں غیر معمولی مالداری میں تفاوت وفرق ہو تو نفقہ کی مقدار میں تفاوت واجب ہوگا۔ (بحر الرائق))

(٦) شریعت مطہرہ میں غیر محارم سے پردہ فرض ہے، عورت کے لئے بہنوئی، دیور، جیٹھ، شوہر کے بہنوئی چچازاد بھائی وغیرہ غیر محرم ہیں، ان سب سے پردہ ہے، بالکل ان کے سامنے نہ آئے، اگر ایک ہی مکان میں رہتے ہوں اور مکان کی تنگی ہو تو مجبوراً اتنا پردہ کافی ہے کہ باریک کپڑے عورتیں نہ پہنیں اور چہرہ، ہاتھ نہ کھولے، بلکہ گھونگٹ کرے اور تنہائی میں ایک جگہ ان کے ساتھ نہ ہو اور بے تکلفی اور ہنسی مذاق نہ کرے۔ ”تمنع المرأة من کشف الوجه بین الرجال لخوف الفتنة“۔ (تنویر الابصار مع الرد ۱/۴۰۶)

حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہی تحریر فرماتے ہیں۔

بہنوئی، پھوپھا، چچازاد بھائی وغیرہ سے پردہ ہے، بالکل ان کے سامنے نہ آئے، اگر ایک ہی مکان میں رہتے ہوں اور مکان کی تنگی ہو تو مجبوراً اتنا پردہ بھی کافی ہے کہ چہرہ، ہاتھ نہ کھولے، بلکہ گھونگٹ کرلے اور تنہائی میں ایک جگہ ان کے ساتھ نہ ہو اور بے تکلفی، ہنسی مذاق نہ کرے (فتاویٰ محمودیہ ۱۹/۱۷۵) اور حضرت مفتی محمود صاحب ایک دوسرے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

الجواب حامداً ومصلیاً: باقی بدن چھپا رہتا ہی ہے، چہرہ بھی سامنے نہ کریں اور نامحرم کے ساتھ خلوت کا موقع کبھی آنے نہ دیں، ہنسی مذاق سے پوری احتیاط رکھیں، یہ اس وقت ہے، جبکہ مکان میں تنگی کی وجہ سے اتنی گنجائش نہ ہو کہ نامحرم کی آمد کے وقت مکان کے اندرونی حصہ میں چلی جائیں یا پردہ درمیان میں لٹکادیں، اگر گنجائش ہو تو چہرہ چھپا کر بھی سامنے آنے سے اجتناب کریں۔ یہ تو عورتوں کے حق میں ہے۔ مردوں کے حق میں ہے کہ جب مکان میں جائیں اطلاع کر کے جائیں اور نگاہیں نیچی رکھیں اور ہنسی مذاق، نیز خلوت سے پوری احتیاط کریں۔ (فتاویٰ محمودیہ ۱۹/۱۷۶)

قال الحصکفی: الخلوة بالأجنبیة حرام۔ (درمختار ٦۔۳٦۸) عن عقبة بن عامر رضی الله تعالیٰ عنه أن رسول الله ﷺ قال: إیاکم والدخول علی النساء فقال رجل من الأنصار: یا رسول الله! أفرأیت الحمو؟ قال: الحمو الموت (بخاری شریف ۲۔۸۷) قال النووی: اتفق أهل العلم باللغة علی أن الأحماء أقارب زوج المرأة کأبیه، وعمه وأخیه وابن أخیه وابن عمه ونحوهم۔ (فتح الباری ۹۔۳۸۹ نقلاً عن محمودیه ۱۹۔۱۷٦) ☆☆☆

خاندانی نظام میں حسن معاشرت

مولانا محمد عثمان بستوی [1]

اسلام ایک کامل ومکمل دین ہے جس میں انسانی ضرورت کا پورا سامان موجود ہے اور انسانی زندگی کے تمام ابواب اور شعبوں میں مکمل رہنمائی کرتا ہے، چنانچہ حسن معاشرت کے لئے اسلام نے حقوق کی ادائیگی، معاملات کی صفائی، ایثار، خیر خواہی اور غم گساری جیسے احکامات کا انسان کو پابند کیا ہے۔

حسن معاشرت کے دو اہم اصول ہیں:۔ بیویوں کے بارے میں ہے: "عاشروهن بالمعروف" (النساء:۱۹) (بیویوں کے ساتھ عمدہ طریقہ پر زندگی گزار)۔ اور والدین کے بارے میں ہے: "وصاحبهما فى الدنيا معروفا" (سورۂ لقمان:۱۵)، "كونوا عباد الله إخوانا" (بخاری ۲/ ۸۹۶ مسلم ۲/ ۳۱۵)

حسن معاشرت کی جو تعلیم قرآن وحدیث میں دی گئی ہے وہ دو اصولوں پر مبنی ہے:

۱۔ یہ ہے کہ شریعت نے جس انسان کا جو حق بتایا ہے اس حق کو پورا پورا ادا کیا جائے، والدین کے حقوق، بیوی وشوہر کے حقوق اولاد کے حقوق، اسی طرح أعزہ واقارب، پاس پڑوس کے حقوق، سب کو ادا کیا جائے۔

۲۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ اپنا حق معاف کرے اور اس سلسلہ میں حسن اخلاق سے پیش آجائے۔

عام طور سے دنیا میں جو فساد اور جھگڑا ہوتا ہے دو ان اصولوں کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہوتا ہے، کیونکہ لوگ اپنا حق وصول کرنے پر تو زور لگاتے ہیں، مگر دوسروں کا حق دینے پر آمادہ نہیں ہوتے، اسی وجہ سے معاشرہ فتنہ وفساد، تباہی اور بربادی کا شکار ہوتا ہے۔

بیوی سے متعلق نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات:

(۱)۔ قال رسول الله ﷺ: "استوصوا بالنساء خيراً، فإنما هن عندكم عوان ليس تملكون منهن شيئاً غير ذلك، إلا أن يأتين بفاحشة مبينة، فإن فعلن فاهجروهن فى المضاجع، واضربوهن ضرباً غير مبرح فان أطعنكم فلا تبغوا عليهن سبيلا، إن لكم على نسائكم حقاً، ولنسائكم عليكم حقا، فأما حقكم على نسائكم فلا يوطئن فرشكم من تكرهون ولا يأذن فى بيوتكم لمن تكرهون، ألا وحقهن عليكم أن تحسنوا إليهن فى كسوتهن وطعامهن"۔ (رواہ ابن والترمذی، نیل الاوطار ۶۔۲۱۰)

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں تم کو عورتوں کے بارے میں بھلائی کی نصیحت کرتا ہوں تم میری اس نصیحت کو قبول کرو وہ تمہارے پاس قیدیوں کی طرح ہیں تم اس کے علاوہ ان کی کسی چیز کے مالک نہیں ہو، لیکن اگر وہ کسی بے حیائی کا ارتکاب کریں تو ان کے بستروں کو جدا کردو اور ان کی ایسی پٹائی کرو کہ ٹوٹ پھوٹ نہ ہو پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو تم کو ان پر کوئی اختیار نہیں ہے الخ۔

(۲)۔ وقال عليه السلام أيضاً: "خيركم خيركم لأهله وأنا خيركم لأهلي"۔ (ترمذی، نیل الاوطار ۶۔۲۰۶)

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے بہترین وہ لوگ ہیں جو اپنی خواتین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے ہیں اور میں تم میں اپنی خواتین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے والا ہوں۔

---

[1] ریاض العلوم گورینی، جونپور، یوپی۔

(٣) أكمل المؤمنين إيماناً أحسنهم خلقاً وخياركم خياركم لنسائهم۔ (رواہ احمد والترمذی، بحوالہ الفقہ الاسلامی وادلتہ ۔۔۳۲)

والدین اور بیوی کے حقوق کی ادائیگی سے متعلق حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ ایک مختصر جامع رسالہ نظر سے گزرا جو اس باب میں بہت ہی اہم ہے، استفادہ کے لئے اس کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

بہرحال مذکورہ نصوص کی روشنی میں مندرجہ ذیل تفصیلات عرض کی جاتی ہیں:

جواب ١: اسلام میں اصل مطلوب حسن معاشرت ہے، جیسا کہ "عاشروهن بالمعروف" اور "وصاحبهما في الدنيا معروفا" (سورہ لقمان: ١٥) اور "وكونوا عباد الله إخوانا" جیسی بہت سی نصوص سے معلوم ہوتا ہے، البتہ حسن معاشرت یہ موقوف ہے حقوق کی ادائیگی اور معاملات کی صفائی پر اور یہ دونوں موقوف علیہ عام طور پر مشترکہ خاندانی نظام میں نہیں پائے جاتے ہیں، اس لئے اسلام کا مطلوب اصلی حسن معاشرت یہ فوت ہوجاتا ہے اور نوبت اختلاف، حسد، بغض، کینہ وغیرہ جیسے امراض خبیثہ تک پہنچ جاتی ہے۔ اس لئے حضرات اکابر نے انفرادی نظام زندگی کو بہتر کہا ہے (دیکھئے معمولات نبوی/ اصلاح نفس العاشر، اصلاحی خطبات)۔ اس سے معلوم ہوا کہ انفرادی نظام زندگی یہ حسن لغیرہ ہے حسن لعینہ نہیں۔ لہٰذا جس وقت حسن معاشرت انفرادی نظام زندگی پر موقوف ہوجائے تو اس کا اختیار کرنا لازم وضروری ہے، اور جس وقت اجتماعی نظام زندگی پر حسن معاشرت موقوف ہوجائے تو اس وقت اجتماعی نظام زندگی کو اپنانا لابدی ہوگا: "إن كان والده زمناً لا يقدر على العمل للابن عيال. فعليه أن يضمه إلى عياله وينفق على الكل". (شامی ٥/ ٣٥٢)

حاصل یہ کہ اسلام نے انسان کو انفرادی واجتماعی دونوں طرح زندگی گزارنے کا اختیار دیا ہے، لیکن حسن معاشرت کا پابند بنایا ہے، خواہ وہ اجتماعی نظام زندگی سے حاصل ہو یا انفرادی نظام زندگی سے۔

حسن معاشرت کا مطلب: یہ ہے کہ الفت ومحبت قائم رہے خیر وخوبی کے ساتھ زندگی گزارے، کسی قسم کی تکلیف نہ دے، قدرت کے وقت حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرے۔ خرچ کرنے پر ناگواری کا اظہار نہ کرے۔ احسان نہ جتلائے ہشاش بشاش ہو کہ زندگی گزارے، تفصیل الفقہ الاسلامی وادلتہ (ص/ ٣٢٨) میں ملاحظہ ہو: "المراد من العشرة. ما يكون بين الزوجين من الألفة والاجتماع. ويلزم كل واحد من الزوجين معاشرة الآخر بالمعروف من الصحبة الجميلة. وكف الأذى وألا يمطله حقه مع قدرته. ولا يظهر الكراهة فيما يبذله له بل يعامله ببشر وطلاقة ولا يتبع عمله منة ولا أذى. لأن هذا من المعروف لقوله تعالى عاشروهن بالمعروف الخ". (الفقہ الاسلامی ٧/ ٣٢٨)

وكذلك امر الله تعالى بحسن الصحبة مع الوالدين "وصاحبهما في الدنيا معروفا" ومعنى المعروف قد مر أنفاً عن الفقه الاسلامي.

جواب ٢: جب ایک ساتھ چند لوگوں کا کھانا پینا ہو اور کمی زیادتی کا علم نہ ہو تو تمام اخراجات کھانے والے تمام افراد پر مساوی لازم ہوتے ہیں، لہٰذا مشترکہ خاندانی نظام میں اگر اپنی صوابدید کے مطابق آپسی مصالحت سے کوئی طریقہ ونظام اخراجات کے سلسلہ میں طے کرلیں تو بہت بہتر، ورنہ شرعاً تمام اخراجات ایک ساتھ کھانے والے تمام افراد پر بطریق مساوات تقسیم ہوجائیں گے۔ جس کے عیال زیادہ ہوں گے اس کے اوپر اخراجات ان کے عیال کے لحاظ سے لازم ہوں گے۔ اور جس کے عیال کم ہوں اس کے اور ان کے عیال کے لحاظ سے اخراجات عائد ہوں گے۔ كما في قصة على المشهورة. بأن جلس رجلان يتغديان مع أحدهما خمسة ارغفة ومع الآخر ثلاثة ارغفة ... وأكل معهما ثالثا. أعطى لهما ثمانية دراهم خذ هذا عوضكما مما اكلت ... فقال علي رضي الله عنه أليس الثمانية الارغفة اربعة وعشر ثلثا أكلتموها. وأنتم ثلاثة أنفس ولا يعلم الأكثر منكم أكلا والأقل فتحملون في أكلكم على السواء. الخ (نخبۃ العرب ٣٢، ٣٣)

محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان فرماتے ہیں: معاہدہ جیسے کوئی تحریری ہوتا ہے، اس کی خلاف ورزی حرام ہوتی ہے۔ اسی طرح معاہدہ عملی بھی ایک قسم کا معاہدہ ہی ہوتا ہے، اس کی بھی پابندی لازم اور خلاف ورزی عہد شکنی کے مرادف ہے۔ (تفصیل معارف القرآن ٢٤/ ٦٢٣)

جواب ٦: حکم سے قبل چند ضابطے لکھے جاتے ہیں:

الف: والدین کی خدمت وکفالت جس طرح لڑکوں کے ذمہ واجب ہے، اسی طرح لڑکیوں کے ذمہ بھی واجب ہے۔ في الدر: ولا يمنعها من الخروج إلى

الوالدين في كل جمعة ... ولو أبوها زمناً فاحتاجها فعليها تعاهده ولو كان كافرا وأبي الزوج (قوله فعليها تعاهده) أي بقدر احتياجها إليها، وهذا إذا لم يكن له من يقوم عليه كما قيده في الخانية ... لأن ذلك المصاحبة المعروف المامور بها الخ (شامی ۵/ ۳۲۴) "وتجب نفقة الأصول على الولد لا يشاركه في نفقة أبويه أحد، لأنه أقرب الناس إليهما، فكان أولى باستحقاق نفقتهما وهي عند الحنفية على الذكور والإناث بالسوية، لأن المعنى يشتملهما"۔ (الفقہ الاسلامی ۷/ ۸۳۲)

ب: بیوی پر شوہر کی اطاعت لازم ہے، اور شوہر اولی الامر میں داخل ہے، لہٰذا جس جائز کام کا حکم شوہر دے گا دیانتاً بیوی کے ذمہ اس کی پابندی لازم ہوگی۔

"في الدر: وحقه عليها أن تطيعه في كل مباح يأمرها به (قوله في كل مباح) ظاهره أنه عند الأمر منه يكون واجبا عليه كأمر السلطان الرعية به"۔ (شامی ۴-۲۸۸ زکریا)

لہٰذا بیٹا اگر والدہ کی کوئی ایسی خدمت ہو جس کو انجام دینے کے لائق نہ ہو اور بیٹی کسی سخت مشقت وتکلیف میں آ کر یا والدہ کو اپنے پاس رکھ کر خدمت کر سکتی ہو تو بیٹی کے ذمہ خدمت واجب ہوگی، لیکن اگر کسی کے بیٹی ہی نہ ہو یا بیٹی ہو، لیکن اس کے خدمت کرنے کی صورت میں اس کو سخت تکالیف ومشقت کا سامنا کرنے پڑے۔ یا ایسا نقصان ہو کہ جس کی تلافی نہ ہو تو اس صورت میں شوہر اپنی بیوی کے ذریعہ وہ خدمت کروالے۔ بیوی کے ذمہ شوہر کی اطاعت واجب ہوگی۔

۳۔ اگر وہ رقم والد صاحب یا بھائی کی ملکیت میں دیدی گئی ہو تو اس سے والد صاحب اپنے لئے کوئی زمین وغیرہ خریدیں تو وہ والد کی ملکیت ہوگی اور اس پر والد کی ملکیت کے تمام احکام جاری ہوں گے، لیکن اگر وہ رقم کسی کی ملکیت میں نہ دی جائے، بلکہ وکالتاً خرچ کے لئے دی جائے اور اس سے کچھ رقم بچ جائے پھر بچی رقم سے خریدنے والدین کی نیت سے خریدے تو اس صورت میں رقم کے جمع کرنے میں جو تناسب تھا اسی تناسب سے خریدی ہوئی شئی میں شرکت ہوگی، "إذا اختلط دينار أحد بدينارين لآخر من جنسه بصورة الدينار الباقي بينهما مشتركا أثلاثاً لصاحب الدينارين وثلاثة لصاحب الدينار" (شرح المجموع ۱۰/ ۱۱ طبع حیدر آباد)

"دفع لابنه مالا يتصرف فيه ففعل وكثر ذلك ومات الأب، إن أعطاه هبة فالكل له وإلا فميراث، تمامه في الجوهرة" (درمختار ۸-۵۲۰ زکریا دیوبند)

۴۔ ہر شخص اپنی کمائی کا خود مالک ہوتا ہے، لہٰذا جتنی رقم اپنی کمائی سے بچا کر رکھ لیا ہے تو اس کا مالک وہی ہے، بشرطیکہ کمانے والے نے کسی مشترک کاروبار سے نہ کمایا ہو، "ما اشتراه أحدهم لنفسه يكون له ويضمن حصة شركائه إذا دفعه من المال المشترك"۔ (شامی ۶/ ۴۷۸)

جواب ۷: چہرہ کا پردہ فتنہ کے اندیشہ کی وجہ سے ہے، لہٰذا جب فتنہ کا خوف نہ ہو اور ایک ساتھ رہنے وسہنے کی وجہ سے چہرہ کے پردہ میں دشواری ہو تو چہرہ کا پردہ تو واجب نہیں، لیکن بے محابہ وآزادانہ میل جول اور ایسے طور طریقہ جس سے فتنہ کا اندیشہ ہو ہرگز جائز نہ ہوں گے "الضرورة تقدر بقدر الضرورة" کا ضابطہ پیش نظر رکھا جائے گا"۔ (فقہی مقالات ۶۶ تا ۶۹ از مبسوط)

يباح النظر إلى موضع الزينة الظاهرة منهن دون الباطنة لقوله تعالى: "لا يبدين زينتهن إلا ما ظهر منها"، وقال علي وابن عباس رضي الله عنهما ما ظهر منها- الكحل- والخاتم، وقالت عائشة رضي الله عنها: إحدى عينها، ولكنا نأخذ بقول علي رضي الله عنه وابن عباس رضي الله عنهما فقد جائت الأخبار في الرخصة بالنظر إلى وجها وكفها من ذلك ماروى أن امرأة عرضت نفسها على رسول الله صلى الله عليه وسلم فنظر إلى وجها فلم ير فيها رغبة الخ- (مبسوط ۱۵۲، فقہی مقالات ۴-۶۶-۶۹)

☆☆☆

مشترکہ اور جداگانہ خاندانی نظام کا شرعی موقف

مولانا حفیظ الرحمن مدنی خیرآبادی[1]

''مجمع الفقہ الاسلامی ہند'' کی جانب سے ۵۔۷ مارچ ۲۰۱۱ء میں منعقد ہونے والے بیسویں فقہی سمینار کے لئے مرتب سوالناموں میں سے ایک اہم سوالنامہ بعنوان ''مشترکہ اور جداگانہ خاندانی نظام'' ہے۔ اس میں کل سات سوالات ہیں:

۱۔ اسلام کی نظر میں مشترکہ خاندانی نظام بہتر ہے یا جداگانہ زندگی بسر کرنے کا طریقہ؟

الجواب بتوفیق اللہ: مشترکہ اور جداگانہ خاندانی نظام دونوں میں بعض محاسن بھی ہیں اور بعض مفاسد بھی'' ان میں غور کرنے سے دو پہلو سامنے آتے ہیں (۱) ایک پردہ کا اہتمام اور غیر محرم کے سامنے بے پردگی سے احتراز۔

(۲) دوسرا خاندان کے کمزوروں کی مدد، مطلقہ اور یتیموں کی کفالت و پرورش، نیز والدین کے لئے سہارا بننا اور دونوں کے دلائل قرآن وحدیث میں صراحۃً موجود ہیں:

پردہ کے دلائل کے لئے ''سورۂ نور'' اور ''احزاب'' کی آیات کافی ہیں:

۱۔ قل للمؤمنین یغضوا من أبصارھم ویحفظوا فروجھم الخ۔(سورۃ النور:۳۰)

۲۔ وقل للمؤمنات یغضضن من أبصارھم ویحفظن فروجھن ولا یبدین زینتھن إلا ما ظھر منھا الخ۔(سورۃ النور:۳۱)

۳۔ یأیھا الذین آمنوا لا تدخلوا بیوتاً غیر بیوتکم حتی تستأنسوا وتسلموا علی أھلھا۔(سورۃ النور:)

۴۔ یأیھا الذین آمنوا لیستأذنکم الذین ملکت أیمانکم والذین لم یبلغوا الحلم منکم ثلاث مرات (سورۃ النور:۵۸)

۵۔ یأیھا الذین لا تدخلوا بیوت النبی إلا أن یؤذن لکم إلی طعام غیر ناظرین إناہ الخ۔(سورۃ الأحزاب:۵۱)

۶۔ یأیھا النبی قل لأزواجك وبناتك ونساء المؤمنین یدنین علیھن من جلابیبھن ذلك أدنی أن یعرفن (الاحزاب:۵۲)

دوسرے پہلو کے دلائل:

۱۔ وقضی ربك أن لا تعبدوا إلا إیاہ وبالوالدین إحسانا الخ۔(سورۃ الإسراء:۲۳)

۲۔ واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا وبالوالدین إحسانا، وبذی القربی والیتامی والمساکین۔(سورۃ النساء:۳۶)

۳۔ والذین یصلون ما أمر اللہ بہ أن یوصل ویخشون ربھم ویخافون سوء الحساب ... أولئك لھم عقبی الدار۔(سورہ الرعد:۲۱۔۲۲)

۴۔ والذین ینقضون عھد اللہ من بعد میثاقہ ویقطعون ما أمر اللہ بہ أن یوصل ویفسدون فی الأرض أولئك لھم اللعنۃ ولھم سوء الدار۔(سورۃ الرعد:۲۵)

۵۔ واتقوا اللہ الذی تسائلون بہ والأرحام إن اللہ کان علیکم رقیبا۔(سورۃ النساء:۱)

۶۔ عن أبي ھریرۃ ؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: أنفق یا ابن آدم أنفق علیکم۔(متفق علیہ)

۷۔ قال النبی ﷺ: الرحم معلقۃ بالعرش تقول من وصلنی وصلہ اللہ ومن قطعنی قطعہ اللہ۔

---

[1] مدرسہ عربیہ منبع العلوم، خیرآباد ضلع مئو، یوپی۔

۸۔ قال النبی ﷺ أنا وكافل اليتيم كهاتين (الحديث) وأشار بإصبعيه۔

محاکمہ: دونوں پہلو کے دلائل کی روشنی میں دیکھنا یہ ہے کہ تطبیق وموافقت کی کوئی صورت ہے یا نہیں۔ جیسا کہ فقہاء احناف کا اصول وضابطہ یہی ہے۔

اسی طرح اگر دونوں صورتوں میں کچھ نہ کچھ خرابیاں ہوں تو ''أہون الشرین'' پر عمل کیا جاتا ہے، اب اگر دوسرے پہلو کا لحاظ کرتے ہوئے مشترکہ نظام کو ترجیح دی جائے تو پہلی صورت، یعنی پردہ کے احکام پر عمل مشکل نظر آتا ہے، کیونکہ مشترکہ خاندانی نظام میں پردہ کا اہتمام بہت ہی مشکل ہے، کیونکہ بے پردگی کی وجہ سے بہت سے فتنوں کا اندیشہ ہے، اور فتنے ہوتے بھی رہتے ہیں۔

حکم: لہٰذا مناسد ومحاسن پر نظر کرتے ہوئے جداگانہ زندگی بسر کرنے کا طریقہ بہتر ہے۔

تاکہ چچازاد، پھوپھی زاد بھائی بہن اسی طرح دیور اور جیٹھوں کے درمیان پردہ کا اہتمام باقی رہے، اور انسان کے اندر اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرکے اپنی ضرورتوں کو خود پوری کرنے کا جذبہ پیدا ہو، البتہ بوڑھے والدین کے لئے الگ کمرہ متعین کردیا جائے، اور ان کی ضرورتیں پوری کی جائیں۔ باقی افراد خاندان، مثلاً مطلقہ عورتوں، یتیموں اور ناداروں کو علیحدہ رکھ کر مالی تعاون، خبر گیری اور نصیحتوں کے ذریعہ مطمئن کیا جائے۔

۲۔ اگر مشترکہ خاندان ہو اور افراد خاندان کے لئے سب مل کر خرچ دیں۔ اور کسی کے بچے زیادہ ہوں، کسی کے کم ہوں تو کیا ان سب کے لئے برابر اخراجات عائد کئے جائیں گے، یا ان کے بچوں کی تعداد کے لحاظ سے؟

الجواب وباللہ التوفیق: مذکورہ نظام معاشرت ایک باپ کی اولاد کی طرح ہے، کہ اولاد جب تک چھوٹی رہتی ہے تو باپ تنہا کما کر سب کا خرچ پورا کرتا ہے، اور جب لڑکے بڑے ہوجاتے ہیں تو کمانے میں بھی شریک رہتے ہیں، لیکن خرچ کرنے کا ذمہ دار تنہا باپ ہوتا ہے، پھر اس معاشرت کا تعلق ''باب الشرکۃ'' سے نہیں ہے۔ بلکہ ''باب النفقۃ'' سے ہے، یعنی لڑکے باپ کے ساتھ شرکاء کی حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ اس کے زیر کفالت رہتے ہیں، لہٰذا باپ افراد کی ضروریات کا کفیل ہے، لہٰذا ایسی صورت میں بچوں کی تعداد کے لحاظ سے خرچ دینا ضروری ہوگا۔

عن ابن عباس ؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: سووا بين أولادكم في العطية، فلو كنت مفضلاً أحداً فضلت النساء (رواہ سعید بن منصور فی سننہ والطبرانی فی المعجم الکبیر) دادودہش میں اپنی سب اولاد کے ساتھ مساوات اور برابری کا معاملہ کرو، اگر میں اس معاملہ میں کسی کو ترجیح دیتا تو عورتوں، یعنی لڑکیوں کو ترجیح دیتا، یعنی اگر مساوات اور برابری ضروری نہ ہوتی تو میں حکم دیتا کہ لڑکیوں کو لڑکوں سے زیادہ دیا جائے۔

۳۔ اگر تین بھائی ہیں، دو بھائی اپنی پوری تنخواہ، یعنی دس دس ہزار روپے گھر میں دے دیتے ہیں، اور ایک بھائی بیس ہزار روپیہ کماتا ہے، وہ بھی دس ہزار گھر میں دیتا ہے، اور دس ہزار الگ بچا کر رکھتا ہے، تو وہ بچی ہوئی رقم صرف اس کی ملکیت ہوگی یا تمام بھائیوں کی۔

الجواب: وباللہ التوفیق والسداد۔ اگر تینوں بھائی والد کے ساتھ رہتے ہوں تب تو والد ذمہ دار ہیں اور تینوں لڑکے افراد عائلہ ہیں اور کسب معاش میں باپ کے ساتھ معاون کی حیثیت سے ہیں، لہٰذا جو بھائی دس ہزار بچا کر رکھتا ہے اس کی بچی ہوئی رقم بھی سب کی ملکیت ہوگی۔ اور اگر تینوں بھائی ایک ساتھ مل کر رہ رہے ہیں، اور کھانا پینا وغیرہ اخراجات الگ الگ ہیں تو یہ معاشرت بطور شرکت کے ہوگی، جس میں ہر ایک نے دس ہزار رقم کے ساتھ شرکت کی ہے، لہٰذا بچی ہوئی رقم صرف ایک ہی بھائی کی ملکیت ہوگی، البتہ اگر اخراجات کھانا پینا وغیرہ ایک ساتھ ہوں تو ہر ایک کو اپنی پوری کمائی اس میں شامل کرنا ضروری ہوگا، اور بہرحال بچی ہوئی رقم بھی سب کی ملکیت ہوگی۔

دلیل: ''ولو اجتمع إخوة يعملون في تركة أبيهم ونمى المال فهو بينهم سوية. ولو اختلفوا في العمل والرأي'' (شامی ۳-۵۲۰)

۴۔ مشترک خاندان ہی کی صورت میں اگر مختلف بھائیوں نے مل کر اپنے والد یا کسی بھائی کے پاس آمدنی جمع کی اور گھر کے اخراجات سے بچی ہوئی رقم سے کوئی چیز خریدی گئی تو اس میں سبھوں کا حصہ برابر ہوگا، یا ہر ایک کی آمدنی کے لحاظ سے ہوگا؟

الجواب بتوفیق اللہ وعونہ: مذکورہ رقم سے خریدی ہوئی چیز میں سب کا حصہ برابر ہوگا آمدنی کے لحاظ سے نہیں ہوگا اور یہ رقم مشترک ہے، اس میں تمام بھائی برابر کے حصہ دار ہیں۔ "قال في التنوير وشرحه: وما حصله أحدهما فله وما حصلاه معاً فلهما نصفين إن لم يعلم ما لكل. وما حصله أحدهما بإعانة صاحبه فله. ولصاحبه أجر مثله بالغاً ما بلغ الخ. وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله: يؤخذ من هذا ما أفتى به في الخيرية في زوج امرأة وابنها اجتمعا في دار واحدة. وأخذ كل منهما يكسب على حدة ويجمعان كسبهما ولا يعلم التفاوت

ولا التساوي والتمييز. فأجاب بأنه بينهما سوية. وكذا لو اجتمع إخوة في تركة أبيهم. ونمى المال فهو بينهم سوية ولو اختلفوا في العمل والرأي". (احسن الفتاوی ۶/ ۹۴۳ بحوالہ ردالمحتار ۳/ ۳۶۰)

۵۔ اگر خاندانوں کے کچھ افراد کماتے ہوں اور کچھ گھر کے کام دیکھتے ہوں اور اس طرح گھر کا کام چلتا ہو تو کیا کمانے والے حضرات کی آمدنی میں کام کرنے والے حضرات بھی برابر کے حقدار ہوں گے؟

الجواب وباللہ التوفیق والسداد: خاندان کے کچھ افراد کا کمانا اور کچھ کا گھر کے کام وانتظام دیکھنا، تنظیم امور اور تدبیر منزل کی قبیل سے ہے، جس میں کوئی کام کسی کے سپرد ہوتا ہے اور کوئی کام کسی کے، اور جس نفس وجس وقت ہر ایک کی طرف سے پایا جاتا ہے جو گھر کی مصلحت میں صرف ہوتا ہے، لہٰذا آمدنی میں گھر کے کام دیکھنے والے افراد بھی برابر کے حقدار ہوں گے کیونکہ کمانے والا گھر کے کام دیکھنے والے ہی کی وجہ سے کمانے کے لئے فارغ ہوسکا ہے، اسی طرح گھر کا منتظم انتظام بیت وعائلہ میں مشغول ہونے کی وجہ سے کمانے کی طرف سے فرصت میں ہے اور کما نہیں پارہا ہے، اور کاسبین بھی اگر یہ منتظمین کام نہ دیکھتے تو کمانے کی فرصت نہ پاتے، لہٰذا ہر ایک کی مصلحت دوسرے سے وابستہ ہے، لہٰذا آمدنی بھی سب میں مشترک ہوگی۔

۶۔ والدین زندگی بھر بچوں کی خدمت وکفالت کرنے کے بعد بڑھاپے میں خدمت کے محتاج ہوجاتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ والدین کی خدمت وکفالت صرف بیٹوں پر واجب ہے یا بیٹیوں پر بھی اور اس سلسلہ میں بہو کی ذمہ داری کیا ہے؟

خاص کر جب بیٹیاں اپنے سسرال چلی جائیں اور ماں کو اپنی ضروریات کے لئے تعاون کی ضرورت ہو اور وہ تعاون ایسا ہو جس کو بیٹا، خود انجام نہ دے سکتا ہو، تو بہو پر اس خدمت کو بجالانا واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب بتوفیق اللہ عزوجل: والدین کی خدمت بیٹوں اور بیٹیوں سب پر واجب ہے اور بہو پر واجب نہیں ہے، لیکن اپنے شوہر کی اجازت سے بقدر جواز والد صاحب کی خدمت کرسکتی ہے، اور جو جواز میں اس کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔

اور بیٹی جب سسرال چلی جائے تو شوہر کی موافقت کے ساتھ خدمت کرسکتی ہے۔ البتہ مالی تعاون حتی الامکان ضروری ہے، اور ماں کی خدمت جو بیٹا خود انجام نہ دے سکے اس کو انجام دینا بہو پر واجب نہیں ہے، اور خدمت چونکہ بیٹے پر ضروری ہے، لہٰذا اگر خود نہ کرسکتا ہو تو کسی خادمہ وملازمہ کو رکھ کر خدمت کا نظم ضروری ہے۔

اور خدمت بیٹوں اور بیٹیوں پر واجب ہے، سورۂ عنکبوت، لقمان، نساء، اسراء وغیرہ کی آیتیں اس پر دلالت کرتی ہیں۔

۷۔ مشترک خاندان میں بہت سی دفعہ چچازاد بھائی بہن، یا اس طرح کے دوسرے قریبی رشتہ داروں کا ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہوتا رہتا ہے۔ اور ایک ہی گھر میں خاص کر جبکہ وہ بھی تنگ ہو رہنے کے باوجود ایک دوسرے سے مکمل پردہ نہیں ہو پاتا، ایسی صورت میں پردے کے احکامات کیا ہوں گے؟

الجواب بتوفیق اللہ عزوجل وعونہ وکرمہ: چچازاد، ماموں زاد بھائی وغیرہ نامحرم ہیں، اسی طرح دیور اور جیٹھ کا شمار بھی غیر محرموں میں ہے اور ہر غیر محرم سے پردہ کا حکم ہے۔ اور دیور سے خاص طور پر آپ ﷺ نے پردہ کی تاکید فرمائی ہے۔

ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم لوگ ان عورتوں پر داخل ہونے سے بچو جن کے شوہر موجود نہ ہوں، ایک صاحب نے سوال کیا کہ دیور کے بارے میں آپ ﷺ کی کیا رائے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ دیور تو موت ہے (مشکوٰۃ ۲/ ۲۰۶) اور پردے کے متعلق ارشاد باری ہے: "يأيها النبي قل لأزواجك وبناتك ونساء المؤمنين يدنين عليهن من جلابيبهن" (سورہ احزاب: ۵۹) (اے نبی ﷺ اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنے چادر کے پلو کو لٹکالیا کریں)۔

حضرت ابن عباسؓ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان عورتوں کو حکم دیا ہے کہ وہ کسی ضرورت سے باہر نکلیں تو سر کے اوپر سے اپنے چادروں کے دامن کو لٹکا کر اپنے چہروں کو ڈھک لیا کریں۔

"یأیہا الذین آمنوا لیستأذنکم الذین ملکت أیمانکم الخ" (النور: ۵۸) (اے مومنو! تین اوقات میں تمہارے غلاموں اور نابالغ بچوں کو بھی تمہارے پاس آنے کی اجازت طلب کرنی چاہئے)۔

"ولیضربن بخمرھن علی جیوبہن ولا یبدین زینتہن إلا بعولتہن أو آبائہن أو آباء بعولتہن الخ" (سورۃ النور) کے اندر بھی اپنی زیب وزینت کے حصے صرف محرم اقارب ہی کے لئے ظاہر کرنے کی اجازت ہے، ان سب دلائل سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ غیر محرم سے بہر حال پردہ ضروری ہے، لیکن ایک ساتھ رہنے میں پورے طور پر پردہ مشکل ہو پھر بھی سر، چہرہ، سینہ اور گردن کا ستر بہر حال لازم ہے۔ اور جب محرم رشتہ داروں کے سامنے سر، بال، گردن، کان، بازو، ہاتھ، پاؤں پنڈلی اور گردن سے متصل حصہ کھولنے کی گنجائش اسی وقت ہے، جبکہ فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، تو پھر غیر محرم کے سامنے کھولنے کی اجازت کیسے ہوسکتی ہے؟ اور مشترک معاشرت میں اور بھی زیادہ فتنہ کا اندیشہ ہے، لہٰذا احتیاط ضروری ہے۔

☆☆☆

مشترکہ خاندان کے شرعی آداب

مفتی محمد معز الدین قاسمی [1]

اللہ رب العزت نے انسان کو گوناگوں صلاحیتوں کا مالک بنایا اور وہ زندگی گذارنے میں اپنی ایک انفرادیت بھی رکھتا ہے اور اجتماعی ڈھانچے کا ایک جزء بن کر بھی زندگی گزارتا ہے۔

سوال نامہ میں زندگی گذارنے کے دونوں طریقوں کے کچھ فوائد ذکر کئے گئے ہیں اور چند ان مفاسد کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جو عام طور پر پیش آتے رہتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام کی جامعیت ہے کہ اس نے انسانی زندگی کے تمام پہلو کی باضابطہ رہنمائی کی ہے اور ہر صاحب حق کا حق صاف طور پر بیان کردیا ہے، چاہے وہ وقتی طور پر سفر کے دوران کسی کے ساتھ چند گھنٹوں کا ہو یا زندگی بھر اس کے ساتھ رہنے کا معاملہ ہو، چنانچہ صاف طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

"واعبدوا الله ولا تشركوا به شيئاً وبالوالدين إحسانا وبذي القربى واليتامى والمساكين والجار ذي القربى والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبيل وما ملكت أيمانكم إن الله لا يحب من كان مختالاً فخوراً" (سورہ نساء:۳۶)

اور ظاہر ہے کہ جب اتنی صراحت کے ساتھ تمام حقوق ذکر کئے گئے ہیں اور یہی نہیں، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح بے نقاب ہوجاتی ہے کہ آپ نے ہر صاحب حق کا حق نہ صرف بتلادیا، بلکہ اپنی عملی زندگی سے ان کو ثابت کردیا، والدین کے حقوق ہوں یا میاں بیوی کے مابین تعلقات ہوں یا بھائی بھائی کے آپس میں زندگی گذارنے کے مسائل ہوں۔ نفقہ (اخراجات) سے ان کا تعلق ہو، یا ادب واحترام سے وہ متعلق ہو۔ معاشرت سے متعلق ہو یا معاش سے سب کی وضاحت فرمادی گئی ہے۔

اب جب یہ ساری وضاحتیں قرآن وحدیث میں موجود ہیں، تو ہم صرف اس وجہ سے مشترکہ خاندان کو برداشت کریں، یا اس کی ترغیب دیں کہ سب کے الگ الگ زندگی گذارنے میں والدین کا کیا ہوگا، یا کوئی معذور بھائی یا بہن ہو تو وہ کہاں رہے گا، یا بیوہ ومطلقہ عورتوں اور یتیم لڑکوں اور لڑکیوں کی پرورش کون کرے گا، یہ کوئی قرین قیاس نہیں۔

چونکہ مشترکہ خاندان میں حقوق کا پامال ہونا، حدود شرعیہ کا خیال نہ رکھنا، اور بعض صورتوں میں کچھ افراد پر ہی مالی بوجھ کا لادنا اور دوسرے بعض افراد کا بے فکری اور آزادانہ زندگی کا گذارنا، نیز آمدنی کا محدود ہونا اور آئے دن خرچ کا بڑھتے رہنا، جس کے نتیجہ میں آپس میں بھائیوں میں رنجشوں کا پیدا ہونا، اپنے بیوی بچوں کی بے جا اخراجات کی تکمیل کے لئے مشترکہ آمدنی میں سے چوری چھپے مال کا حاصل کرنا، آپس میں بیوی بچوں میں ذرا ذرا سی بات پر فساد، جھگڑے، مشترکہ کھانے اور پکانے کا چند مطیع وفرمانبردار بیویوں پر بے جا قسم کا بوجھ ان کے حقوق کی پامالی وغیرہ وغیرہ نہ معلوم کتنے مفاسد اس میں پائے جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں قرآن وحدیث کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو کہیں یہ بات نہیں ملتی کہ تم سب ایک ساتھ رہ کر زندگی گذاردو، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا کہ مشترکہ خاندان "ما وجدنا عليه آباءنا" (سورہ لقمان:۲۱) کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، کہ ہمارے بڑوں کو ہم نے اسی طرح دیکھا ہے) اور خاندان کے بڑے ایسا کرتے چلے آئے ہیں، اور اگر ہم علاحدہ رہ کر زندگی گزاریں گے تو خاندان کے بڑے یہ کہیں گے کہ شادی ہوتے ہی لڑکا خاندان سے الگ ہوگیا، وہ اپنی بیوی کے کہنے میں آگیا اور اس نے والدین کو چھوڑ دیا وغیرہ وغیرہ۔

---

[1] جامعہ اسلامیہ دار العلوم اورنگ آباد۔

حالانکہ وہ والدین کے حقوق جو بھی لازم ہوتے ہیں ان کو پورے کرتا ہے، ان کے آرام کا پورا خیال رکھتا ہے، ان کی فرمائش کو پورا کرتا ہے، دوسرے الفاظ میں مشترکہ خاندان ایک بت ہے، جس کی پرستش ہم لوگ صدیوں سے کرتے چلے آرہے ہیں، یہ بات بھی صحیح ہے کہ بعض مرتبہ ایسے واقعات بھی دیکھنے کو ملیں گے کہ تمام لڑکے والدین سے الگ ہوگئے اپنی اپنی بیوی بچوں کے ساتھ اور والدین بے سہارا رہ گئے، یا معذور بھائی بہن کا کوئی پرسان حال نہیں، یا یتیم لڑکوں اور لڑکیوں کی کفالت کی ذمہ داری سنبھالنے والا کوئی نہیں۔

لیکن ان مسائل کا حل یہ ہے کہ ہم معاشرے میں دینی بیداری پیدا کریں، قرآن وحدیث کی تعلیمات کو عام کریں اور سب کو بتلائیں کہ بے کسوں اور بے بسوں کو سہارا دینے کی کیا فضیلت ہے، ان سے متعلقہ افراد پر ذمہ داری ڈالیں کہ وہ ان کے شرعی حقوق ادا کریں، ان کو عار دلائیں ان پر سماجی وخاندانی دباؤ (پریشر) بنائیں، اور اس کے باوجود نہ ماننے کی صورت میں ان کا سماجی بائیکاٹ کریں، اس سے ضرور معاشرہ کی اصلاح ہوگی، اور ہر صاحب حق کو حق پہنچے گا۔

اب رہی دوسری بات کہ مشترکہ خاندان ہو اور افراد خاندان کی ضروریات کے لئے سب مل کر خرچ دیں، کسی کے بچے زیادہ ہوں اور کسی کے کم ہوں تو کیا ان سب پر برابر اخراجات عائد کئے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ جب افراد خاندان کا لحاظ کیا جارہا ہے تو جس شخص کے افراد خاندان زیادہ ہوں گے اس کو ان کے اعتبار سے خرچ دینا ہوگا، الا یہ کہ ذمہ دار خاندان کسی معقول وجہ (جیسے اس کی آمدنی کم ہو یا وہ شخص کسی اور طریقہ سے افراد خاندان کی مدد کرتا ہو وغیرہ وغیرہ) سے سب کے برابر اس سے خرچ لیں، اور یہ ان سب نے مل کر طے کرلیا ہو، چونکہ حدیث شریف میں ہے:

"عن شريح قال: بلغنا أن النبي ﷺ قال: المؤمنون عند شروطهم ما لم يعص الله" (كتاب البيوع والأقضية، المصنف لابن ابی شیبه ۱۱-۲۲۷)

(حضرت شریح فرماتے ہیں کہ یہ بات ہم تک پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مومن اپنی شرطوں کے پابند ہوتے ہیں، جب تک کہ اللہ کی نافرمانی نہ ہونے لگے، لہذا اس صورت میں آپس میں انہوں نے جو طے کیا ہوگا اس کے مطابق وہ خرچ دینے کے پابند ہوں گے)۔

۳۔ لیکن واضح رہے کہ یہ سب اس وقت ہے، جبکہ مشترکہ خاندان کے افراد اپنے والد کے ترکہ میں اپنے اپنے اعتبار سے مختلف کاروبار اختیار کئے ہوئے نہ ہوں، یعنی ان کا اصل سرمایہ راس المال والد کا ترکہ نہ ہو، ورنہ تو تمام بھائیوں کی کمائی چاہے انہوں نے مختلف پیشے اختیار کر رکھے ہوں، آپس میں برابر سرابر تقسیم ہوگی، ملاحظہ ہو:

"وكذلك لو اجتمع إخوة يعملون في تركة أبيهم ونمى المال فهو بينهم سوية. ولو اختلفوا في العمل والرأي" ۔(باب الربح في الشركة الفاسدة، الفقه الحنفي في ثوبه الجديد ۵-۵۲)

نیز یہ بھی ضروری ہے کہ مشترکہ خاندان سے باپ بیٹے مراد نہ ہوں، اس طور پر کہ باپ بیٹے مل کر کوئی کاروبار کریں، اور پہلے سے کوئی سرمایہ نہ ہو، ظاہر ہے کہ اس صورت میں بیٹا باپ کا معین ومددگار ہوگا اور کمائی سب باپ کی ہوگی، ملاحظہ ہو: "ثم هذا في غير الابن مع أبيه فلو كان الأب وابنه يكسبان في صنعة واحدة. ولم يكن لهما شيئ فالكسب كله للأب. إن كان الابن في عياله لكونه معيناله"۔ (الربح في الشركة الفاسدة ۵/۵۲)

اس طرح مشترکہ خاندان سے باپ بیٹوں کے ساتھ ایک ساتھ عمل کی وہ صورت بھی خارج ہوگی (نکل جائے گی) جس میں بیٹے باپ کی سرپرستی او رپرورش میں رہتے ہوئے (چاہے مختلف پیشے اختیار کئے ہوئے ہوں) مال کمائیں۔

چنانچہ اس صورت میں بھی تمام کمائی باپ ہی کی ہوگی اور لڑکوں کی اپنی استعمال کی جو چیزیں ہیں (جیسے بدن کے کپڑے وغیرہ) وہ ان کی اپنی ہوں گی، "ولو زوج وبنيه الخمسة في داره وكلهم في عياله، واختلفوا في المتاع، فهو للأب وللبنين الثياب التي عليهم لا غير"۔

(فصل في الشركة الفاسدة، شامی ۳/۳۵۰)

اب رہی یہ صورت کہ مختلف بھائیوں نے مل کر اپنے والد یا کسی بھائی کے پاس آمدنی جمع کی اور گھر کے اخراجات سے بچی ہوئی رقم سے کوئی چیز خریدی گئی تو اس میں سب کا حصہ برابر ہوگا، یا ہر ایک کی آمدنی کے لحاظ سے ہوگا۔

اور ذکر کی گئی صورت میں چونکہ ہر ایک کی آمدنی کی تعیین نہیں ہے کہ ہر ایک نے کتنی آمدنی جمع کی، لہذا اس صورت میں سب کو برابر سرابر حصہ ملے گا، اس کی

وضاحت علامہ شامی نے بھی اپنی مشہور و معروف کتاب شامی میں کی ہے۔

اور علامہ محمود طحان نے (الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید ۵/۵۱ میں) اس کو ذکر کیا ہے۔

ملاحظہ ہو: ویؤخذ من هذا الحكم فى زوج امرأة وابنها اجتمعا فى دار واحدة وأخذ كل منهما يكتسب علاحدة ويجمعان كسبهما. ولا يعلم التفاوت ولا التساوى ولا التمييز. فأجاب أنه بينهما سوية. (الدر فی الشرکۃ الفاسدۃ)

تین بھائی ہیں اور دو بھائی اپنی پوری تنخواہ مثلاً دس دس ہزار روپیہ گھر میں دیدیتے ہیں اور ایک بھائی تیس ہزار کماتا ہے اور وہ بھی دس ہزار گھر میں دیتا ہے اور دس ہزار الگ بچا کر رکھتا ہے تو وہ بچی ہوئی رقم صرف اس کی ملکیت ہوگی یا تمام بھائیوں کی۔

مذکورہ صورت میں اگر بھائیوں میں یہ معاہدہ نہ ہوا ہو کہ ہم اپنی اپنی پوری کمائی ایک جگہ جمع کریں گے تب تو اس صورت میں بچی ہوئی رقم اس کی اپنی ذاتی ہوگی اس میں دیگر بھائیوں کا کوئی حصہ نہیں ہوگا، چونکہ ان میں سے ہر ایک الگ الگ پیشہ اختیار کئے ہوئے ہیں، اس صورت میں نہ پیشہ میں اشتراک ہے اور نہ راس المال میں اشتراک ہے۔ چنانچہ فقہاء کرام نے اسی قسم کا مسئلہ ذکر کیا ہے، ملاحظہ ہو:

واختلف قول العلماء فى عمل المرأة مع زوجها إذا اجتمع بعملهما أموالاً كثيرة. فقيل للزوج: وتكون المرأة معينة له. إلا إذا كان لها كسب علاحدة. فهو لها الخ. (الدر فی الشرکۃ الفاسدۃ، الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید ۵/۵۲)

مذکورہ صورت میں اگر میاں بیوی دونوں کا پیشہ ایک ہو تو اس صورت میں عورت کو شوہر کی مددگار تسلیم کرتے ہوئے تمام کمائی شوہر کی ہوگی، کو ذکر کیا گیا ہے۔ البتہ جب بیوی کا پیشہ الگ ہو تو اس صورت میں مال بیوی کا ہوگا، یہی صورت یہاں پر ہے کہ جب تمام بھائی الگ الگ پیشہ اختیار کئے ہوئے ہیں، اب ایک ساتھ اخراجات کو یکساں جمع کرتے ہیں، لہذا اس سے زائد جس کا ہوگا وہ اس کا مالک ہوگا، اس مال میں دوسرے بھائیوں کے اشتراک کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

۵۔ اگر خاندان کے کچھ افراد کماتے ہیں اور کچھ گھر کے کام دیکھتے ہیں اور اس طرح گھر کا کام چلتا ہے تو کیا کمانے والے حضرات کی آمدنی میں کام کرنے والے حضرات بھی برابر کے حصہ دار ہوں گے۔

مذکورہ صورت میں عرف عام میں سب کو برابر کے حقدار سمجھا جاتا ہے اور آمدنی میں سب برابر کے شریک ہوتے ہیں، چونکہ انہوں نے گھر کے کام کاج کو دیکھا تب ہی تو کمانے والے حضرات نے پیسہ کمایا ہے، لہذا اس صورت میں کمائی سب کے درمیان برابر تقسیم ہوگی۔

۶۔ آخری مسئلہ ذرا غور طلب ہے والدین کے حقوق اولاد پر ہیں اور اولاد کے حقوق والدین پر ہیں، لیکن آپ بہو پر لازم کریں کہ وہ اپنے خسر کی خدمت کرے یہ شرعاً درست نہیں ہے، چونکہ خسر بہو کے لئے اگرچہ محرم ہے، لیکن بہو پر لازم ہے کہ وہ اپنے خسر سے حتی الامکان پردہ کرے، بے پردہ زینت کے ساتھ سج دھج کر بال کھلے اپنے خسر کے سامنے ہر جگہ تنہائی میں ہرگز نہ جائے، جبکہ بہو جوان بھی ہو۔

مشترکہ خاندان کی جہاں بہت سی قباحتیں ہیں ان میں یہ بھی ایک بڑی قباحت ہے کہ مشترکہ خاندان میں پردہ کا بالکل لحاظ نہیں کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے آئے دن بے ہودگی کے ایسے ایسے واقعات سننے کو ملتے ہیں کہ جن کا ہم تصور نہیں کر سکتے، بیٹا باپ کی خدمت کرے گا، لیکن بہو خسر کی ہر قسم کی خدمت نہیں کرے گی، سب کی موجودگی میں کھانا دیدے، ضرورت کی چیزیں طلب کرنے پر لاکر دیدے، مجبور و معذور ہیں تو ان کا بستر ڈالدے وغیرہ وغیرہ، لیکن وہ بھی حجاب کے ساتھ، چونکہ شریعت مطہرہ نے محرم سے بھی پردے کا حکم دیا ہے، جبکہ بے پردگی میں فتنہ میں پڑنے کا اندیشہ ہو۔ (شامی ۲/۱۴۵)

اب رہی ساس صاحبہ کی خدمت کی بات تو ظاہر ہے کہ جب ساس صاحبہ بوڑھی ہو، خود سے اپنی ضروریات کی تکمیل نہیں کر سکتی تو اس کی خدمت کرنا اور اس کی ہر طرح مدد کرنا، ایک بہو ہونے کے اعتبار سے نہیں ہے، بلکہ انسانیت کے ناطے بہو پر لازم ہے کہ وہ ہر قسم کا تعاون پیش کرے۔ چنانچہ یہ سب چیزیں فقہ حنفی میں از قسم دیانات لازم ہوتی ہیں، قضاءً اس کو آپ لازم کرنا چاہیں تو اس کی گنجائش نہیں ہے۔

☆☆☆

اسلام کی نظر میں خاندانی نظام

مولانا محمد ذکاء اللہ شبلی[1]

۱۔ اسلامی نقطۂ نظر میں مشترکہ خاندان کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی، اور محسوس یہ کیا گیا کہ اس میں نہ خیر ہے اور نہ برکت وعافیت۔

وہ فیملی زیادہ خوشحال، ترقی یافتہ اور شرعی اعتبار سے بھی بہت سی بداحتیاطیوں سے محفوظ رہتی ہے، جو جداگانہ طور پر رہائش پذیر ہیں، حضرات صحابہ کرامؓ کی معاشرتی زندگی اس کی بین دلیل ہے۔

اور خود رسالت مآب رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام ازواج مطہرات کے رہنے اور کھانے پینے کا الگ انتظام فرمایا۔

اس لئے میرے نزدیک جدا جدا فیملی کا نظام ہی بہتر اور درست ہے۔

۲۔ مشترکہ خاندان جس میں کئی بھائی ایک ساتھ رہتے ہوں اور سب کی تمام ضروریات اجتماعی طور پر پوری کی جاتی ہوں اس میں اخراجات ہر صاحب اولاد بھائی پر اس کی اولادوں کی تعداد اور علاج ومعالجہ کے لحاظ سے صرفہ شرعاً عائد ہوگا۔

۳۔ شترکہ خاندان جس میں سب بھائیوں کی جانب سے بھیجی ہوئی رقم سے جو رقم بچ جائے اور اس سے کوئی چیز خریدی جائے تو اس میں سبھوں کا حصہ برابر ہوگا۔

۴۔ مشترکہ ضروریات میں مقرر کردہ رقم جمع کرنے کے بعد جو رقم کسی بھائی نے الگ سے جمع کی ہو تو وہ رقم اسی کی ہوگی مشترکہ شمار نہیں کی جائے گی۔

۵۔ گھر سے باہر رہ کر ملازمت یا تجارت کرنے والے بھائی کی جمع شدہ رقم یا حاصل کردہ جائیداد وزیورات میں گھر پر رہنے والے بھائی حصہ دار نہیں ہوں گے۔

۶۔ والدین کی شرعاً کفالت اور خدمت بیٹوں پر لازم ہے، لیکن شوہر کی خواہش پر بیوی خدمت کی پابند ہوگی، عام حالات میں شوہر اخلاقاً اور خاص ونازک موقع پر حکماً بھی شوہر بیوی سے ماں باپ کی خدمت لے سکتا ہے۔

البتہ بیٹیاں اگر گھر پر ہوں تو بحیثیت اولاد کے خدمت کی ذمہ داری بیٹوں سے بیٹیوں پر لازم ہوگی۔

۷۔ حجاب بہر حال لازم ہوگا، اس لئے کہ حج جیسے سفر میں غیر محرموں کے ازدحام میں بھی بحالت احرام خواتین کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ غیر محرم کے سامنے آنے پر کسی بھی چیز سے آڑ کر لیں، اس لئے مشترکہ طور پر رہنے والے خاندان میں باوجود بار بار غیر محرم کے آمنے سامنے ہونے پر پردہ میرے نزدیک لازم وضروری ہوگا۔

☆☆☆

[1] دار القضاء اندور، مسجد چھوٹی، گوال ٹولی، اندور، ایم پی۔

شریعت کا مطلوبہ خاندانی نظام

مفتی محمد الیاس قاسمی[1]

۱۔ عام حالات میں اسلام کی نظر میں جداگانہ زندگی بسر کرنے کا طریقہ بہتر ہے، لیکن کچھ مخصوص حالات کی بنیاد پر مشترکہ خاندانی نظام بھی بہتر ہوسکتا ہے، جداگانہ طرز زندگی کے متعلق قرآن کی تصریحات اور اس کے واضح اشارات موجود ہیں، قرآن مجید جہاں کوئی حکم بیان کرتا ہے مکان تذکرہ ہر شخص کے لئے الگ الگ کرتا ہے:

''یأیها الذین آمنوا لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم''۔(النور: ۲۷)

(اے لوگو جو ایمان لاتے ہو اپنے گھروں کے علاوہ دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو)۔

کسی شخص کی بیویاں ایک سے زائد ہوں تو ہر ایک کا مکان بھی الگ الگ ہونا چاہئے ازواج مطہرات کو پردہ کی تلقین کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وقرن فی بیوتکن" (الاحزاب: ۳۳) (اپنے اپنے گھروں میں ٹک کر رہو)۔

آگے مزید ارشاد فرمایا: "واذکرن ما یتلی فی بیوتکن من اٰیت اللہ والحکمۃ" (الاحزاب: ۳۴) (اور یاد کرو اللہ کی آیتوں اور حکمت کی بات کو جو تمہارے گھروں میں سنائی جارہی ہے)۔

''سورۂ الحجرات'' کی ایک آیت میں بھی ازواج مطہرات کے الگ الگ مکانوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

"إن الذین ینادونك من وراء الحجرات أکثرهم لا یعقلون" (الحجرات: ۴) (بے شک جو لوگ آپ کو حجرات (کمروں یا مکانوں) کے پیچھے سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر ناسمجھ ہیں)۔

زید بن عبداللہ ہذلی کا بیان ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مسجد نبوی ﷺ میں توسیع کی غرض سے جب ان مکانوں کو زمین بوس کرایا تو میں نے انہیں دیکھا تھا، یہ مکان اینٹوں کے تھے اور ان میں کمرے کھجور کے تنوں سے تیار کئے گئے تھے جن پر مٹی سے پتائی کی گئی تھی، فرماتے ہیں کہ میں نے شمار کیا تو یہ کل نو مکان تھے جن سے ملحق کمرے ان کے علاوہ تھے۔ (ابن سعد، طبقات الکبری ۱۰ر ۴۴۰ بیروت)

حضرت فاطمہؓ و علیؓ سے آپ ﷺ کو انتہائی خصوصی تعلق تھا، حتی کہ آپ ﷺ نے حضرت فاطمہ کو اپنے جگر کا ٹکڑا قرار دیا ہے، اس کے باوجود شادی کے بعد آپ ﷺ نے ان کے مکان کو اپنے سے بالکل الگ قرار دیا ہے۔

شادی کے بعد الگ مکان بیوی کا بنیادی حق ہے جس میں اس کی مرضی کے بغیر شوہر دوسرے کو شریک نہیں کرسکتا۔

''وعلی الزوج أن یسکنها فی دار مفردة لیس فیها أحد من أهله، إلا أن تختار ذلك؛ لأن السکنی من کفایتها، فتجب لها کالنفقة وقد أوجبه الله تعالیٰ مقرونا بالنفقة، وإذا وجب حقا لها لیس له أن یشرك غیرها فیه؛ لأنها تتضرر به، فإنها لا تأمن علی متاعها ویمنعها ذلك من معاشرة مع زوجها ومن الاستمتاع، إلا أن تختار ذلك؛ لأنها رضیت بانتقاص حقها''۔(هدایه علی فتح القدیر ۴۔۳۵۷)

---

[1] مدرسہ بیت العلوم پونہ، مہاراشٹر۔

پردے کے مختلف احکامات بھی جداگانہ طرز زندگی پر دلالت کرتے ہیں، چنانچہ ارشاد باری ہے:

"ذلك أطهر لقلوبكم وقلوبهن" (الاحزاب: ۵۳)

(اور جب تم ان سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے اوٹ سے مانگو یہ زیادہ پاکی کا باعث ہے تمہارے دلوں کے لئے اور ان کے دلوں کے لئے بھی)۔

قرآن مجید نے عورت پر نامحرم رشتہ داروں سے پردہ فرض قرار دیا ہے، جبکہ مشترکہ خاندانی نظام میں شوہر کے بھائی بھتیجے اس کے چچا اور ان لڑکوں وغیرہ سے پردہ کرنا ایک عورت کے لئے سخت دشوار ہوتا ہے، ان تمام رشتے داروں سے پردہ جداگانہ طرز حیات ہی میں ممکن ہے۔

اسلام نے سماج کے کمزوروں اور معذوروں کا خاص لحاظ رکھا ہے جو خاندان کے لوگوں کی طرح دوسرے رشتے داروں کے گھروں سے کھانے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔

''ليس على الأعمى حرج ولا على الأعرج حرج ولا على المريض حرج ولا على أنفسكم أن تأكلوا من بيوتكم ... أو صديقكم''۔(سورة النور: ٦١)

(اندھے کے لئے کوئی حرج نہیں ہے اور نہ لنگڑے کے لئے حرج ہے اور نہ مریض کے لئے حرج ہے اور نہ تمہارے اوپر کوئی حرج ہے کہ تم کھاؤ ایک دوسرے کے گھروں سے اور نہ اپنے باپوں کے گھروں سے اور اپنی ماؤں کے گھر سے اور اپنے بھائیوں کے گھروں اور اپنے خالوؤں کے اور ماموؤں کے گھروں سے اور اپنی خالاؤں اور پھوپھیوں کے گھروں سے اور جو تمہارے ہاتھ کی ملک ہیں ان کے گھروں سے یا اپنے دوستوں کے گھروں سے)۔

اس آیت کریمہ میں ہر جگہ گھروں (بیوت) کی نسبت متعلقہ افراد کی طرف الگ الگ کی گئی ہے، گویا اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ تمام رشتے داروں میں سے ہر ایک کا مکان دوسرے سے الگ ہونا چاہئے۔

اسلام نے زنا کو انتہائی سنگین جرم قرار دیا ہے اور زانی کے لئے سخت سزا تجویز کی ہے، لیکن اس نے بیوی سے کسی بھی وقت جنسی تسکین کو جائز قرار دیا ہے، بعض احتیاطوں کا لحاظ رکھتے ہوئے شوہر بیوی سے جب اور جس طرح چاہئے استفادہ کرسکتا ہے، لیکن مشترکہ خاندانی نظام میں ایک شخص اپنے ان تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتا۔

بعض احادیث سے مخصوص حالات میں مشترکہ خاندانی نظام کے بہتر ہونے کا بھی اشارہ ملتا ہے، چنانچہ حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے کہ جب انہوں نے ایک ثیبہ عورت سے نکاح کیا تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا سبب دریافت فرمایا تو انہوں نے جواب دیا کہ میرے والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے اور میری چھوٹی چھوٹی بہنیں ہیں اس لئے مجھے ایک ایسی عورت کی تلاش ہے جو ان کی دیکھ بھال کرسکے اگر میں نوعمر لڑکی سے نکاح کرتا تو وہ ان کی صحیح دیکھ بھال نہ کرسکتی، اس لئے میں نے ثیبہ عورت سے نکاح کیا۔

"عن جابر بن عبد الله قال: تزوجت امرأة فأتيت النبي ﷺ فقال: أتزوجت يا جابر! فقلت: نعم. قال: بكرا أو ثيبا. فقلت: لا بل ثيبا. فقال: هلا جارية تلاعبها وتلاعبك. فقلت: يا رسول الله ﷺ إن عبد الله مات وترك سبع بنات أو تسعا فجئت بمن يقوم عليهن فدعالي" (الجامع الترمذي ۱۔ ۲۰۸، الابواب النکاح)۔ ظاہری بات ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بہنیں آپ کے ہی گھر میں رہتی رہی ہوں گی، ورنہ ان کی دیکھ بھال کرنے کے کیا معنی ہوتے۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں دو بھائی تھے ایک بھائی ہنرمند ہونے کی وجہ سے روزی کماتا تھا اور دوسرا بھائی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا ہنرمند بھائی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے دوسرے بھائی کی شکایت کی کہ وہ کوئی دھندہ نہیں کرتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: شاید اس کی وجہ سے تمہیں رزق ملتا ہو۔

''کان إخوان علی عهد رسول الله ﷺ فكان أحدهما يأتی النبی ﷺ فقال: لعلك ترزق به''۔ (الجامع الصحیح للترمذی ابواب الزهد)

یہ دونوں بھائی مشترکہ گھر میں رہتے رہے ہوں گے، ورنہ اگر دونوں کا رہن سہن کا انفرادی ہوتا تو دوسرے بھائی کو شکایت کا کوئی موقع نہیں ملتا۔

۲۔ اس صورت میں بچوں کی تعداد کا لحاظ کئے بغیر سب پر برابر اخراجات عائد کئے جائیں گے۔

۳۔ اخراجات سے بچی رقم سے اگر والد نے کوئی چیز خریدی ہو تو وہ والد کی ملکیت ہوگی اور ان کے انتقال کے بعد تمام وارثین میں تقسیم ہوگی اور تمام بھائیوں کو برابر ملے گی۔

''الأب وابنه يكتسبان فی صنعة واحدة ولم يكن لهما بشئ فالكسب كله للأب. إن كان الابن فی عياله لكونه معينا له، ألا ترى لو غرس شجرة تكون للاب''۔ (شامی ۶-۵۰۲)

۴۔ صورت مسئولہ میں جس بھائی نے دس ہزار روپئے الگ بچا کر رکھا ہے تو یہ صرف اس کی ملکیت ہوگی، کیونکہ شرعاً وہی اس کا مالک ہے۔

۵۔ اگر کمانے والے افراد اور کام کرنے والے افراد میں کوئی معاہدہ ہو تو معاہدہ کے مطابق عمل کرتے ہوئے آمدنی میں کام کرنے والے حضرات کا بھی حصہ ہوگا۔

''لا يستحق الربح إلا بإحدى ثلاث بمال أو عمل أو تقبل (الدر المختار) قوله (أو عمل) كالمضارب فی المضاربة''۔ (شامی ۵-۵۰۱)

اگر ان میں کوئی معاہدہ نہ ہو تو کام کرنے والے افراد اجرت مثل کے حقدار ہوں گے۔

''وماحصله أحدهما بإعانة صاحبه. فله ولصاحبه أجر مثله. بالغا ما بلغ عند محمد. وعند أبی يوسف لايجاوز به نصف ثمن ذلك''۔ (الرد المختار)

''والربح فی الشركة الفاسدة بقدر المال ولاعبرة بشرط الفضل. فلو كل المال لأحدهما فللآخر أجر مثله (الرد المختار) قوله (والربح) حاصله أن الشركة الفاسدة إما بدون مال أو به من الجانبين أو من أحدهما. فحكم الأولى أن الربح فيها للعامل كما علمت''۔

البتہ اگر یہ تمام بھائی اپنے باپ کے ماتحت ہوں تو ساری آمدنی باپ کی شمار ہوگی اور باپ کے انتقال کے بعد تمام بھائیوں نے برابر تقسیم کی جائے گی۔

''الأب وابنه يكتسبان فی صنعة واحدة ولم يكن لهما بشئ فالكسب كله للأب. إن كان الابن عياله لكونه معينا له، ألا ترى لو غرس شجرة تكون للأب۔ (شامی ۶-۵۰۲)

۶۔ والدین کی خدمت وکفالت جس طرح بیٹوں پر واجب ہے اسی طرح بیٹیوں پر بھی واجب ہے، چنانچہ اگر بیٹی مالدار ہو اور والدین تنگدست ہوں تو والدین کا نفقہ بیٹی پر بھی واجب قرار دیا ہے۔

''ولا يشارك الولد فی نفقة أبويه أحد لأن لهما تأويلا فی مال الولد بالنص ... وهی على الذكور والإناث بالتسوية فی ظاهر الرواية. وهو الصحيح. لأن المعنى يشملهما''۔ (ہدایہ علی فتح القدیر ۴-۴۸-۳۴۷)

اسلام نے بیٹی پر غیر مسلم والدہ کی بھی خدمت واعانت کا حکم دیا ہے، چنانچہ حضرت اسماء بنت ابی بکر سے روایت ہے وہ کہتی ہیں کہ میری ماں اپنے باپ کے ساتھ میرے پاس آئی درآنحالیکہ وہ مشرکہ تھی، جب کہ قریش مکہ نے نبی ﷺ سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر رکھا تھا تو میں نے نبی ﷺ سے یہ مسئلہ دریافت کیا کہ حضور ﷺ میری ماں آئی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ میں اس کی مالی اعانت کروں، آپ ﷺ نے فرمایا ہاں تو اپنی

ماں کے ساتھ صلہ رحمی کر۔

"عن أسماء بنت أبي بكر قالت: قدمت علي امي وهي مشركة في عهد قريش ومرت بها إذ عاهدوا النبي ﷺ مع أبيها فاستقيت النبي ﷺ فقالت: إن أمي قدمت وهي راغبة قال: نعم صلي أمك" (صحیح بخاری کتاب الادب، مسلم کتاب الزکوۃ)۔ بہو پر بھی ساس وخسر کی خدمت اخلاقی طور سے واجب ہے جس تعاون کو بیٹا انجام نہ دے سکتا ہو اس خدمت کو بجالانا بہو پر اخلاقاً واجب ہوگا۔

۷۔ مشترک خاندان میں جہاں چہرے کا پردہ سخت دشوار ہو غیر محرم رشتہ داروں کے سامنے چہرہ، گٹوں تک دونوں ہاتھ اور قدمین کھولے جاسکتے ہیں، البتہ بلاضرورت بات چیت سے اجتناب کیا جائے، نیز ان رشتہ داروں سے تنہائی بھی اختیار نہ کی جائے، چنانچہ اسماء بنت ابی بکرؓ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سالی) ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں وہ نہایت باریک کپڑے پہنی ہوئی تھیں آپ نے ان سے منہ پھیر لیا اور فرمایا اے اسماء! عورت جب بالغ ہوجائے تو اس کے جسم کا کوئی حصہ نظر نہیں آنا چاہئے بجز اس کے، اور اس کے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ہتھیلیوں اور چہرے کی طرف اشارہ کیا۔

عن أسماء بنت أبي بكر دخلت على رسول الله ﷺ وعليها ثياب رقاق، فأعرض عنها رسول الله ﷺ وقال: يا أسماء! إن المرأة إذا بلغت المحيض لم يصلح لها ان يرى منها، إلا هذا، وأشار إلى وجهه وكفيه۔ (سنن ابی داؤد کتاب اللباس)

إن رسول الله ﷺ قال: إياكم والدخول على النساء، فقال رجل من الأنصار: يا رسول الله ﷺ! أفرأيت الحمو؟ قال: الحمو الموت"۔ (صحیح مسلم کتاب السلام بخاری کتاب النکاح)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم عورتوں کے یہاں جانے سے پرہیز کرو ایک انصاری نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیور کا جانا کیسا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دیور تو موت ہے، فقہاء کرام نے بھی مخصوص حالت میں غیر محرم عورتوں کی طرف دیکھنا جائز قرار دیا ہے۔

"أما النظر إلى الأجنبيات فنقول: يجوز النظر إلى موضع الزينة الظاهرة منهن، وذلك الوجه والكف في ظاهر الرواية، كذا في الذخيرة، وإن غلب على ظنه أنه يشتهي فهو حرام، كذا في الينابيع، النظر إلى وجه الأجنبية إذا لم يكن عن شهوة ليس حرام لكنه مكروه، كذا في السراجية، وروى عن حسن عن أبي حنيفة يجوز النظر إلى قدميها أيضا"۔ (عالمگیری ۵۔۳۲۹)

☆☆☆

اسلام کی نظر میں مشترکہ اور جداگانہ خاندانی نظام

مولانا ظہیر احمد ندوی[1]

سوال ۱: اسلام کی نظر میں مشترکہ خاندانی نظام بہتر ہے، یا جداگانہ زندگی بسر کرنے کا طریقہ؟

جواب: اسلام کی نظر میں مشترکہ خاندانی نظام بہتر نہیں ہے، اس لئے کہ مشترکہ خاندانی نظام میں بہت سی خرابیاں اور بگاڑ ہیں۔ اس دور میں اپنے لڑکے کی شادی کرواکر بہو کو گھر لاتے ہیں، تو ماں، باپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری خدمت کے لئے ہے، اور یہ چاہتے ہیں کہ ہماری ہر طرح کی خدمت کرے، اگر وہ خدمت نہ کرے تو اس پر جھگڑے ہوتے ہیں، اگر بہو اپنی نند کا کچھ کام نہیں کرتی تو اس پر جھگڑے ہونا شروع ہو جاتے ہیں، اور ایک طرح کا فساد برپا ہو جاتا ہے، اسی طرح اس میں عورتوں کا غیر محرم سے اختلاط ہوتا ہے، جو بہت بڑے فساد کی جڑ ہے، اور بھابھی کا دیور سے اختلاط ہوتا ہے۔

اس کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا: "الحمو الموت" (دیور موت ہے)۔ تو اس سے خطرناک بات اور کیا ہو سکتی ہے، اس لئے ایسے دور میں مشترکہ خاندانی نظام بہتر نہیں ہے، بلکہ جداگانہ زندگی بسر کرنا بہتر ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ماں، باپ اور رشتہ داروں سے الگ ہو جائے، بلکہ گھر اور چولہا سب کا الگ ہو، لیکن میل جول اور تال میل ہوتا رہے، اور ایک دوسرے کی ضرورت میں کام آئے، کیونکہ ایک کا دوسرے پر کچھ نہ کچھ حق ہوتا ہی ہے، جیسے ماں، باپ کا اولاد پر اور اولاد کا ماں باپ پر اور بھائی کا بہن پر اور بہن کا بھائی پر۔

اور مشترکہ خاندان سے ایک دم الگ ہونے میں حرج لازم آئے گا۔ لیکن جداگانہ رہنے میں بہت سی مصیبتوں اور آفتوں سے محفوظ رہتا ہے۔

سوال ۲: اگر مشترکہ خاندان ہو اور افراد خاندان کی ضروریات کے لئے سب مل کر خرچ دیں، کسی کے بچے زیادہ ہوں اور کسی کے کم ہوں، تو کیا ان سب پر برابر اخراجات عائد کئے جائیں گے، یا ان کے بچوں کی تعداد کے لحاظ سے؟

جواب: اگر مشترکہ خاندان ہو، اور افراد خاندان کی ضروریات کے لئے سب مل کر خرچ دیں، کسی کے بچے زیادہ ہوں اور کسی کے کم ہوں، تو ان سب پر برابر اخراجات عائد کئے جائیں گے۔ بچوں کی تعداد کی لحاظ سے عائد نہیں کئے جائیں گے۔

سوال ۳: اسی صورت میں اگر مختلف بھائیوں نے مل کر اپنی والد یا کسی بھائی کے پاس آمدنی جمع کی، اور گھر کے اخراجات سے بچی ہوئی رقم سے کوئی چیز خریدی گئی تو اس میں سبھوں کا حصہ برابر ہوگا یا ہر ایک کا آمدنی کے لحاظ سے ہوگا؟

جواب: ایسی صورت میں اگر مختلف بھائیوں نے اپنے والد یا کسی بھائی کے پاس آمدنی جمع کی اور گھر کے اخراجات سے بچے ہوئے رقم سے کوئی چیز خریدی گئی، تو اس میں سبھی کا حصہ ہوگا اور برابر ہوگا، ہر ایک کی آمدنی کا اعتبار نہیں ہوگا، اخلاقانہ طریقہ سے یہی ہے۔ اس میں آمدنی کا لحاظ نہیں کیا جائے گا، اگر آمدنی کا لحاظ کیا جائے گا تو اس صورت میں جب اس چیز کو تقسیم کیا جائے گا تو مشترکہ چیزوں میں بے انصافی ہوگی، اور وہ بھائی جس کی آمدنی زیادہ ہے وہ یہی چاہے گا کہ میری آمدنی کے اعتبار سے دیا جائے تو ایسی صورت میں بھائیوں میں بے انصافی اور قطع رحمی پیدا ہوگی، جیسے وراثت میں تمام بھائیوں کا حصہ برابر ہوتا ہے، اور جو چیزیں مشترکہ مال سے خریدی گئی تو اس میں ان کا حصہ برابر ہوگا۔

---

[1] استاذ فقہ الاسلامی جامعہ المعارف رامپور، یوپی۔

سوال ۴: بچی ہوئی رقم میں تمام بھائیوں کی شرکت۔

جواب: تین بھائی ہیں، دو بھائی گھر میں دس ہزار روپیہ دیتے ہوں، اور ایک بھائی بیس ہزار روپیہ کماتا ہو، اور وہ بھی گھر میں دس ہزار روپیہ دیتا ہو، اور دس ہزار روپیہ بچا کر رکھتا ہو، تو وہ جمع کی ہوئی رقم اس کی ملکیت ہوگی، اس بقیہ قیمت میں دوسرے بھائی کا حصہ نہ ہوگا۔

سوال ۵: اگر خاندان کے کچھ افراد کماتے ہیں، اور کچھ گھر کا کام دیکھتے ہوں تو کیا کمانے والے حضرات کی آمدنی میں کام کرنے والے حضرات بھی برابر کے حقدار ہوں گے؟

جواب: اگر خاندان کے کچھ افراد کماتے ہیں اور کچھ گھر کا کام دیکھتے ہیں، اور اس طرح گھر کا کام چلتا ہو تو کمانے والے حضرات کی آمدنی میں گھر کے کام کرنے والے حضرات بھی برابر کے حقدار ہوں گے، اس لئے کہ گھر کی وہ ذمہ داری جوان پر عائد ہوتی ہے، اور باہر کی ذمہ داری جوان پر عائد ہوتی ہے، اسکو وہ پورا کرتے ہیں، اس لئے گھر کے کام کرنے والے برابر کے حقدار ہوں گے۔

سوال ۶: بہو پر ساس کی خدمت بجالانا واجب ہوگا یا نہیں؟

جواب: والدین زندگی بھر بچوں کی خدمت کرتے ہیں، اور کفالت بھی، اور بڑھاپے میں انہیں خدمت اور کفالت کی ضرورت پڑتی ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ والدین کی خدمت اور کفالت بیٹوں پر واجب ہے، یا بیٹیوں پر اور اس سلسلہ میں بہو کی ذمہ داری کیا ہے۔

تو اس سلسلہ میں والدین کی خدمت اور کفالت بیٹوں پر واجب ہے۔

بقولہ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کیونکہ لڑکیاں جب تک گھر میں رہتی ہیں، تو ان پر بھی خدمت آئے گی، لیکن وہ اپنی شادی کر کے سسرال چلی جاتی ہیں، تو بیٹوں پر خدمت واجب ہے۔ ایک بات اور سمجھ لینا چاہئے کہ جس میں بڑی کوتاہی ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ جب عورت کے ذمہ شوہر اور اس کی اولاد کا کھانا پکانا واجب نہیں تو شوہر کے جو ماں باپ اور بھائی، بہن ہیں ان کی خدمت کرنا بطریقہ اولیٰ واجب نہیں ہوگا، اگر والدین کو خدمت کی ضرورت ہے، اور کفالت کی تو اس کا ذمہ دار لڑکا ہے، البتہ اس کے لڑکے کی بیوی کی سعادت مندی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے والدین کی خدمت کرے اور خوش دلی سے تو یہ سعادت مندی ہوگی، اور باعث اجر سمجھ کر انجام دے، اور لڑکے کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی بیوی کو اپنے والدین کی خدمت پر مجبور کرے، اور یہ خدمت انجام دے رہی ہو تو اس کا حسن سلوک اور حسن اخلاق ہے، اور اس کی یہ خدمت اس کے ذمہ فرض نہیں ہے، لہٰذا ان کو چاہئے کہ وہ اپنی بہو کی قدر کرے، اور اس کا بدلہ دینے کی کوشش کرے۔ (اصلاحی خطبات: بحوالہ المحمود الفتاوی)

سوال ۷: مشترکہ خاندان میں پردہ کے کیا احکام ہوں گے؟

جواب: مشترکہ خاندان میں بہت سی دفعہ چچازاد بھائی، بہن یا اس طرح کے دوسرے قریبی رشتہ داروں کا ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہوتا رہتا ہے، اور ایک ہی گھر میں خاص کر کے جب وہ تنگ ہو، رہنے کے باوجود ایک دوسرے سے مکمل پردہ نہیں ہو پاتا، تو ایسی صورتحال میں پردہ کا حکم ضروری ہے۔

کیونکہ ایک دوسرے کے حق میں غیر محرم ہیں، اور غیر محرم سے پردہ ضروری ہے۔ کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''الحمو الموت'' اس میں یہ سب داخل ہے۔

☆☆☆

خلاصہ جوابات

مشترکہ اور جداگانہ خاندانی نظام

مولانا محمد آصف یسین [1]

الجواب ۱: اسلام کی نظر میں مشترکہ نظامی خاندان ان کے مقابل میں جداگانہ زندگی گزارنا بچند وجوہ احسن وافضل ہے۔

۱۔ مشترکہ خاندانی نظام میں ایک دوسرے کے ساتھ چوبیس گھنٹے اختلاط کے نتیجے میں اور بشری وطبعی تقاضے کے باعث ایک دوسرے سے تکلیفیں پہنچنے پر آہستہ آہستہ کدورت بڑھتے بڑھتے نفرت کی حد تک یہ بات پہنچ جاتی ہے، آپس میں مشترک رہنے پر کتنی ہی احتیاط کے باوجود لابدی ہے، اس سے احتراز اور کلیتاً اجتناب کرامت سے کم نہیں۔ اقوال سے، افعال سے کسی نہ کسی طرح تکلیف پہنچ ہی جاتی ہے یا کسی ہمارے فعل پر دوسرا شخص شیطان کے وسوسے کی وجہ سے بدگمانی میں ملوث ہوجاتا ہے نتیجۃً یہ چھوٹی چھوٹی تکلیفیں آپس میں عداوت اور تنفر تک پہنچا دیتی ہیں، پھر تو یہ حال ہوتا ہے کہ روزانہ بیوی کا اپنے شوہر کے سامنے اپنی ساس کے بارے میں شکایتیں پے در پے کرنے سے بچے کے دل میں بھی والدہ کی محبت کم ہوجاتی ہے، کیونکہ دنیا کا یہ نظام ہے کہ ہر ساس یہ سمجھتی ہے کہ میری ہر بات میری بہو کی طرفداری میں ہے اور بہو یہ سمجھتی ہے کہ میری ساس کی ہر بات میری عداوت میں ہے، بھلا جب دونوں کے ذہنوں میں ایسا متقابل پہلو ہے تو بھلا بہو کا نباہ ساس کے ساتھ ہونا بڑا ہی پیچیدہ ہے، اسی لئے ساس بہو کا جھگڑا گلی گلی اور گھر گھر نظر آتا ہے، اب روزانہ بیوی اپنے شوہر کے سامنے اس کی والدہ کی شکایتیں فرما کر لڑکے کے دل میں سے اس والدہ کی محبت کو کم کروارہی ہے جن کا حق اللہ تعالیٰ نے جا بجا قرآن مجید میں اپنے بعد رکھا ہے، اس لئے خاندان میں حسن سلوک اور محبت کا ماحول برقرار رکھنے کے لئے جداگانہ خاندان ہی بہتر ہے۔

الجواب ۲۔ مشترکہ خاندان ہو اور بچوں کی تعداد میں کمی بیشی ہو تو ان سب پر اخراجات بچوں کی تعداد کے اعتبار سے عائد کرنا بایں وجہ بہتر ہے، تاکہ اولاد کے درمیان نزاع نہ ہو، کیونکہ ظاہری بات ہے کہ جب ایک بچے کی اولاد کم ہے پھر بھی اس کے پاس سے دوسرے بھائی کے برابر اخراجات عائد کئے جائیں گے تو لامحالہ عورت کے واسطے سے ہی سہی والدین کی کدورت اس بچے کے دل میں پیدا ہوجائے گی، نیز بھائی اور بھابھی کی کدورت بھی دل میں آئیگی جو کدورت دو بھائیوں اور والدین کے درمیان جھگڑا پیدا کردے گی، جیسا کہ آج کل کا مشاہدہ ہے۔

الجواب ۳۔ مختلف بھائیوں نے مل کر گھر کے اخراجات کے لئے والد کے پاس یا بڑے بھائی کے پاس آمدنی جمع کی اور کسی چیز کی پہلے صراحت نہیں ہوئی ہے تو والد اس رقم کے مالک ہوجائیں گے، لہٰذا جب والد صاحب اس رقم کے مالک ہوگئے تو اخراجات سے بچی ہوئی رقم سے جو چیز خریدی جائے گی اس میں سب بھائی برابر شریک ہوں گے، لیکن عمومی طور پر یہ ہوتا ہے کہ بڑا بھائی بہت سالوں سے نوکری کرتا ہے، لہٰذا وہ چھوٹے بھائی کے مقابل میں زیادہ رقم والد کو اخراجات کے لئے دے چکا ہوتا ہے، پھر جب والد دونوں بھائیوں کو برابر حصہ دیتے ہیں، جیسا کہ آج کل ہوتا ہے تو وہ دلی طور پر راضی نہیں ہوتے رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ دو بھائیوں میں دشمنی ہوجاتی ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر باپ اور بچے کے درمیان کدورت پیدا ہوجاتی ہے، لہٰذا باپ کو چاہئے کہ وہ خود صراحۃً زیادہ آمدنی دینے والے بھائی کو زیادہ حصہ دے، لیکن اگر پھر بھی

---

[1] مدرسہ جامعہ قاسمیہ، رتن پوری، گجرات۔

والد نے صراحۃً نہیں دیا اور لڑکوں نے بھی اس کی کوئی صراحت نہیں کی ہے تو اب تمام لڑکے گھر کے اخراجات سے بچی ہوئی رقم سے خریدی ہوئی چیز میں برابر کے شریک ہوں گے "إذا وہب ہبۃ لذی رحم محرم منہا لم یرجع فیہا من وہب لاصولہ وفروع"۔ (ہدایہ)

الجواب ۴۔ جو صورت مذکورہ میں جو بھائی بیس ہزار کما کر دس ہزار گھر میں دیتا ہے اور دس ہزار اپنے پاس رکھتا ہے تو اس دس ہزار میں جو اپنے پاس رکھے ہیں صرف اسی کی ملکیت ہونی چاہئے، کیونکہ آدمی اجرت کا مستحق محنت کی وجہ سے ہوتا ہے، لہٰذا اس دس ہزار میں محنت صرف اسی بھائی کی لگی ہے، نیز والد بھی اپنے اولاد کے اتنے مال کا مالک ہوتا ہے اور والد کا حق ہوتا ہے جتنا خرچے میں ضرورت ہو، اسی لئے تو فقہاء نے بیان فرمایا ہے کہ اگر والدین تنگ دست نہیں ہیں، تو لڑکوں پر ان کو خرچ دینا ضروری نہیں ہے، معلوم ہوا کہ پوری آمدنی اور تنخواہ پر والد کا حق نہیں ہے، نیز لڑکے نے جو دس ہزار روپئے والد کو نہیں دیئے ہیں اس دس ہزار کی قیمت کو زکوٰۃ قربانی وغیرہ کے نصاب میں باپ کی ملکیت میں شمار نہیں کیا جاتا، بلکہ بچہ کی ملکیت شمار کرکے اس دس ہزار پر زکوٰۃ وقربانی وغیرہ واجب ہوتی ہے اگر یہ دس ہزار روپئے باپ کی ملکیت شمار ہو کر تمام بھائیوں کا حق ہوتا تو نصاب میں صرف اس بچے کی ملکیت میں کیوں شمار ہوتا؟ معلوم ہوا کہ دس ہزار میں تمام بھائی شریک نہ ہوں گے۔ اور عام اجنبیوں کے حجاب میں فرق ہوگا اگر عام لوگوں جیسا پردہ ان سے بھی ضروری ہوگا تو بڑی مشکل پیش آئیگی عورت اس پر عمل نہیں کر سکے گی، پس ایسے لوگوں کے سامنے عورت کھلے چہرے آسکتی ہے ضروری بات کر سکتی ہے، البتہ ان کے ساتھ تنہائی میں رہنا ان سے بے تکلف باتیں کرنا، ان کے ساتھ سفر کرنا، ان کے پاس بے اجازت گھر میں آنا جانا جائز نہیں، یہی معاملہ مرد کا سالیوں کے ساتھ ہوگا، اجنبیت کے احساس کے ساتھ ضروری گفتگو کر سکتی ہے، بے تکلفی اور تنہائی جائز نہیں۔

پس حضرت کی اس بیان کردہ تفسیر سے معلوم ہوا کہ قریبی رشتہ دار کے سامنے کھلے چہرہ آسکتی ہے ضروری بات بھی کر سکتی ہے، البتہ ان کے ساتھ بے تکلف باتیں کرنا ان کے ساتھ سفر کرنا ان کے پاس بے اجازت گھر میں آنا جانا جائز نہیں۔

خلاصہ:

۱۔ مشترکہ نظام خاندان کے مقابل میں جداگانہ زندگی گزارنا افضل ہے۔

۲۔ بچوں کی تعداد کے اعتبار سے اخراجات عائد کرنا بہتر ہے۔

۳۔ اگر پہلے سے تفاوت کی کوئی صراحت نہیں ہوئی ہے، تو اخراجات سے بچی ہوئی رقم سے خریدی ہوئی چیز میں تمام بھائی برابر کے شریک ہوں گے۔

۴۔ صورت مذکورہ میں دس ہزار میں اسی لڑکے کی ملکیت ہوگی جس نے بیس ہزار کما کر دس ہزار بچا کر رکھے ہیں۔

۵۔ کمانے والے کی آمدنی میں کام دیکھنے والے برابر کے حقدار نہ ہوں گے۔

۶۔ والدین کی خدمت بیٹوں اور بیٹیوں دونوں پر واجب ہے، اور خرچہ اگر بیٹیاں مالدار ہیں تو ان پر بھی واجب ہوگا، ورنہ صرف بچوں پر۔ بہوؤں پر ساس کی خدمت کرنا واجب نہیں۔

۷۔ پردہ کے احکام میں تھوڑی سی خفت ہوگی کہ کھلا چہرہ ان کے سامنے آسکتی ہے ضرورت کی باتیں بھی کر سکتی ہیں، البتہ بے تکلف باتیں نہیں کر سکتی، تنہائی میں نہیں رہ سکتی اور سفر بھی ساتھ میں نہیں کر سکتی۔

☆☆☆

خاندانی نظام اسلامی قوانین کی روشنی میں

ڈاکٹر بہاء الدین محمد ندوی[1]

خاندانی زندگی کے لئے اسلام نے جو احکام وقوانین مقرر کئے ہیں ان قوانین کو بروئے کار لانے کے لئے جداگانہ زندگی بہتر ہے مشترکہ زندگی سے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''یأیها الذین آمنوا لیستأذنکم الذین ملکت أیمانکم والذین لم یبلغوا الحلم منکم ثلاث مرات من قبل صلاة الفجر وحین تضعون ثیابکم من الظهیرة ومن بعد صلاة العشاء الخ''۔(سورہ نور:۵۸)

اس آیت میں جو احکام مذکور ہیں ان کو عمل میں لانے کے لئے جداگانہ زندگی ہی بہتر ہے۔

والدین کا علاج اور خدمت اولادوں کی ذمہ داری ہے، چاہے وہ مرد ہوں یا عورت۔ بہو پر وہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

''یلزمه نفقة الوالد وإن علا من ذکر أو أنثی والولد وإن سفل من ذکر أو أنثی''۔(شرح المنهاج للمحلی ۴۔۸۴)

اجنبی مرد اور عورت کا آمنا سامنا ہونا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے۔ فقہاء لکھتے ہیں:

''ویحرم نظر فحل بالغ إلی عورة حرة کبیرة أجنبیة مطلقا قطعا. والمراد بالکبیرة غیر الصغیرة التی لاتشتهی. وکذا وجهها وکفها عند خوف فتنة. وکذا عند الآمن علی الصحیح''۔(شرح المنهاج للمحلی ۳۔۲۰۸)

☆☆☆

[1] نائب صدر دارالہدیٰ اسلامک یونیورسٹی ملاپورم، کیرلا۔

چوتھا باب مناقشہ

مشترکہ خاندانی نظام

مولانا احمد نادر قاسمی:

ابھی مشترکہ اور جداگانہ خاندان سے متعلق عرض مسئلہ ہمارے سامنے رکھا گیا، میں اس میں دو باتیں مجھے کہنی ہے، ایک تو والدین کے سلسلہ میں اور ایک سوال ۷ کے سلسلہ میں جو پردہ کے احکام سے متعلق ہے رکھنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے یہ عرض ہے کہ جداگانہ خاندان میں بھی تو معذور بھائی بہن اور والدین خود اس کا حصہ ہوتے ہیں، اس لیے اس کو الگ سے نہیں غور کیا جانا چاہئے۔

دوسرا مسئلہ جو سوال ۷ میں پردہ سے متعلق ہے، اور اس میں مشترک خاندان ہونے کی صورت میں غیر محارم سے چہرے کا پردہ نہ کرنے کی بات کہی جارہی ہے، میرا کہنا یہ ہے کہ اگر ان سے پردہ نہ کیا جائے تو شریعت میں آخر کونسا پردہ مطلوب ہے؟ مشاہدہ یہ ہے کہ مشترکہ خاندان میں پردہ نہ کرنے کی صورت میں جو سماجی اور اخلاقی طور پر ہمارے سماج میں جو برائیاں سامنے آرہی ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں ہیں، اس لئے پردہ کے سلسلہ میں وہ تمام آداب اور احکام جو غیر محرم کے سلسلہ میں آئے ہیں مشترکہ اور جداگانہ ہر خاندان میں ان کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ زیادہ بہتر بات ہوگی۔

مفتی انور علی (مئو)

ایک بات تو یہ عرض کرنی ہے کہ مشترکہ خاندانی نظام میں جو جنسی عدم تسکین کی بات کہی جارہی ہے مولانا سلطان احمد اصلاحی صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے اور شاید اس سے اور لوگوں نے بھی نقل کیا ہو تو جنسی عدم تسکین کی وہ بات سمجھ میں نہیں آتی، اور دوسری گزارش یہ ہے کہ مشترکہ خاندانی نظام میں کیا ایک غریب باپ کو اس بات کا مکلف بنایا جاسکتا ہے کہ وہ لڑکے کو پڑھائے لکھائے اور پھر اس کے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں تعلیم اور دوسری ضرورتوں کے محتاج ہوں ایک لڑکے کو پڑھانے لکھانے کے بعد الگ سے مکان بنا کر کے اس کو الگ کردے اور بقیہ سارا بوجھ اسی کے سر باقی رہے، یہ لڑکا آزاد ہوجائے اور بقیہ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اس کی تمام پریشانیاں اکیلے جھیلے۔

جہاں تک پردہ کی بات کہی جارہی ہے سوال ۷ میں تو جو ہمارے یہاں کا معاشرہ ہے یا اور بھی جو پہلے سے چلا آرہا ہے اپنے نانیہال میں، خالہ کے یہاں اور دوسرے قریبی رشتہ داروں کے یہاں سب کا آنا جانا رہتا ہے، خالہ زاد بہنیں، ماموں زاد بہنیں، پھوپھی زاد بہنیں بچپن سے آمنے سامنے آتی رہتی ہیں وہاں جاکر کے جب بہت زیادہ اہتمام نہیں ہوتا تو جب ایک گھر میں چچازاد بھائی بہن رہتے ہوں تو وہاں مکمل پردہ کا اہتمام کیسے کیا جاسکتا ہے؟

نام واضح نہیں ہوسکا:

یہ بات تو تقریباً مسلم ہے کہ مشترکہ خاندانی نظام اور جداگانہ خاندانی نظام دونوں میں کچھ خوبیاں بھی ہیں اور خرابیاں بھی۔ تو اس سلسلہ میں میرے ذہن میں ایک بات آتی ہے کہ اس کا تعلق جگہ، حالات اور عرف وعادت کے مطابق ہو، مان لیا جو شہر کے رہنے والے ہیں وہاں کے حالات کچھ اور ہیں، دیہات کے رہنے والے ہیں وہاں کے حالات کچھ اور ہیں، اس لیے اس کو مبتلی بہ کی رائے پر چھوڑ دیا جائے، یعنی جہاں مشترکہ خاندانی نظام میں حدود اللہ کی رعایت مکمل طور پر ہورہی ہو تو وہاں وہی نظام بہتر ہے اور جہاں جداگانہ خاندانی نظام میں حدود اللہ کی رعایت ہورہی ہو وہاں وہی نظام بہتر ہے، بہرصورت ہر حالت میں حدود اللہ کی رعایت ضروری اور وہ خاندانی مشترکہ نظام کی صورت میں ہو یا جداگانہ خاندانی نظام کی صورت میں ہو۔ جزاکم اللہ۔

مولانا اقبال احمد قاسمی (کانپور):

مشترکہ اور جداگانہ خاندانی نظام اس میں کون بہتر ہے اور کون کم بہتر ہے، حقیقت یہ ہے کہ دونوں کی گنجائش ہے، "ليس عليكم جناح أن تأكلوا جميعاً أو أشتاتاً" (سورہ نور:٦١)، قرآن کریم میں ہے۔ البتہ دونوں میں موازنہ کرنے سے جیسا کہ عرض مسئلہ میں موازنہ کیا گیا اور اس میں یہ بات آئی کہ جداگانہ خاندانی نظام زیادہ شریعت سے ہم آہنگ ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام کو آخرکار لڑ بھڑ کر تقسیم ہونا ہی پڑتا ہے۔ اس لیے اگر کسی مصلحت کے ساتھ رہا بھی جائے تو کم از کم چولھا ضرور الگ ہونا چاہئے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول آگ جو ہے چولھے سے ہی بھڑکتی ہے بہو میں اور عورتوں میں جو لڑائیاں ہوتی ہیں عام طور پر وہ چولھا ساتھ ہونے ہی کی وجہ سے ہوتی ہے، البتہ اس میں مسئلہ کھڑا ہوتا ہے بوڑھے والدین کا تو ہمیں ضرورت ہوگی اس بات کی کہ جداگانہ خاندانی نظام اور مشترکہ خاندانی نظام کی تحدید کردی جائے اور اس میں بوڑھے والدین دونوں نظاموں کا جزء بن سکیں تو انشاء اللہ اس میں ایسے معذوروں کے لیے بھی اس میں ایسے غور کرلیا جائے کہ جداگانہ خاندانی نظام کی تعریف ومصداق کیا ہے؟ اور اس میں اس کی گنجائش رکھی جائے تو جداگانہ خاندانی نظام ہی قابل عمل ہوگا۔ جزاکم اللہ۔

مولانا مفتی محمد جعفر صاحب (جامعہ اشاعت العلوم اکل کوا):

ابھی عرض مسئلہ میں ایک رائے یہ بھی آئی کہ بہو پر شوہر کے بوڑھے والدین کی خدمت قضاءً تو واجب نہیں ہے لیکن اگر شوہر حکم دے تو واجب ہوگی۔ اس سلسلہ میں ایک بات یہ عرض کرنی ہے کہ بہو پر شوہر کے بوڑھے والدین کی خدمت کو بحکم زوج اگر لازم کیا جاتا ہے تو تجویز مرتب کرتے وقت اس کی حدود بھی متعین کی جانی چاہئے کہ کس طرح کی خدمت لازم ہوگی۔ آیا کھانا پکا کر کھلانا، ان کے کپڑے دھونا، ان کے کمروں کی صفائی، یا پھر ساس کے سر میں تیل ڈالنا اس کی جسمانی خدمت وغیرہ بھی، امید کہ اس بات کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ جزاکم اللہ۔

مولانا اعجاز الحسن قاسمی (بانڈی پورہ کشمیر):

ابھی عرض مسئلہ میں یہ فرمایا گیا کہ بہو کے اوپر اپنے شوہر کی خدمت نہ قانوناً لازم ہے نہ دیانتاً لازم ہے۔ بہو پر اپنے شوہر کے ماں باپ کی خدمت، یعنی ساس اور سسر کی خدمت قانوناً لازم نہیں ہے اور دیانتاً بھی لازم نہیں ہے، تو کیا اس سے ہم یہ سمجھیں کہ اسلام بھی "اولڈ ایج ہوم" بنانے کو جائز سمجھتا ہے۔ ہماری گزارش یہ ہے کہ جب مشترکہ خاندان کے عنوان کے تحت بحث کی جائے تو اس میں دیور وغیرہ کے مسئلہ کو تو چھیڑا جائے لیکن ساس اور سسر کو والدین کے درجہ میں رکھ کر ان پر خدمت لازم ہونا چاہئے۔ یعنی ان کو بحث سے الگ نہ کیا جائے، ان کو مشترکہ خاندان کا جزء سمجھا جائے۔ جزاکم اللہ۔

مفتی ظہیر احمد صاحب (کانپور):

میرا سوال سوال ۲ سے متعلق ہے کہ کونسا خاندانی نظام بہتر ہے، جداگانہ یا مشترکہ؟ اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا ہے اس میں اصل جو چیز ہے حقوق کی ادائیگی، اس کو اصل بنیادی طور پر ہم کو دیکھنا چاہئے۔ کیونکہ اگر ہم مشترکہ خاندان کو ترجیح دیتے ہیں تو اس میں بیوی کے حقوق وغیرہ متاثر ہوتے ہیں۔ اور اگر ہم جداگانہ نظام کو بہتر قرار دیتے ہیں تو اس میں والدین کے اور اس کے علاوہ بھائیوں کے حقوق متاثر ہوتے ہیں۔ تو شریعت نے اصل حقوق کو بنیاد بنایا ہے تو جیسے حالات ہوں اس اعتبار سے ہر ایک کے حقوق کی ادائیگی پر نظر ہونی چاہئے ہماری، اور اس میں جداگانہ یا مشترکہ نظام کی طرف جو اصل ہمارا فوکس ہے وہ نہیں ہونی چاہئے۔

دوسرا سوال ۷ کے بارے میں عرض کرنا ہے، خاص طور سے جو چہرہ وغیرہ کے بارے میں بات آئی ہے تو اصل بنیاد وہاں پر جو چہرہ کا پردہ ہے وہ فتنہ کی وجہ سے ہے اور اختلاط اور تنہائی اگر یہ چیزیں نہ ہوں، ان کی اگر ہم مشروط طور پر اجازت دیدیں تو ہم اس سے بچ سکتے ہیں، اس پریشانی سے کہ اس میں کافی حرج لازم آئے گا اور لوگ اس پر عمل بھی نہیں کرسکتے۔ ایسا مسئلہ ہم بتلائیں یا ایسی تجویز ہم پیش کریں کہ معاشرہ میں اس پر عمل ہی نہ ہوسکے تو بہت ہی زیادہ پریشانی کا باعث ہوگا اور ہم لوگ فقہ اکیڈمی میں ان ہی مسائل کو حل کرنے کے لیے بیٹھے ہیں کہ اس میں جو مشکلات ہیں لوگ اس پر عمل پیرا ہوسکیں، شریعت کے قریب آسکیں تو چہرہ کے کھولنے کے ساتھ ساتھ جب ایک انسان مشترکہ طور پر وہاں رہ رہا ہے تو ہم یہ کہیں وہاں

اختلاط نہ ہو، تنہائی نہ ہو اور وہاں فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، اس شرط کے ساتھ میں سمجھتا ہوں کہ جائز ہونا چاہئے۔ جزاکم اللہ۔

مولانا محمد عمر عابدین قاسمی:

یہ بات کہ خاندانی نظام، مشترکہ ہو یا جداگانہ اس سلسلہ میں ہمیں دراصل خود عہد نبوی کا جو نظام تھا اس سے روشنی حاصل کرنا چاہئے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیں دونوں نمونے اس میں حاصل ہوتے ہیں۔ جیسے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا جب نکاح ہوا تو انہوں نے اپنی فیملی کے ساتھ مستقل جداگانہ نظام زندگی گزارا۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عمر جب تک ان کا نکاح نہیں ہوا اس وقت تک وہ عمر کے اس مرحلہ میں جب پہنچے جوانی کے تو عام طور سے وہ مسجد نبوی میں وقت گزارا کرتے تھے تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جداگانہ خاندانی نظام کے تحت تھے۔ لیکن حضرت جابر والی روایت جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: "هلا تزوجت بكرا" تو انھوں نے جواب دیا کہ میری کئی بہنیں ہیں جن کی پرورش میرے ذمہ ہے، اس سے روشنی ملتی ہے کہ مشترکہ خاندانی نظام بھی عہد رسالت میں پایا جاتا تھا، تو یہ دراصل ہر خاندان کی اپنی انفرادی ضرورت اور حالات پر مبنی ہے، اس کے تقاضے کو سامنے رکھ کر اس کا فیصلہ کرنا چاہئے کہ کس کے حق میں مشترکہ خاندانی نظام بہتر ہوگا اور کس کے حق میں جداگانہ۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی ایک اصول ہر ایک کے لیے مفید ہو۔ جزاکم اللہ۔

مفتی محمد مقصود صاحب (استاذ جامعہ فرقانیہ)

مجھے دو باتیں عرض کرنی ہیں، ایک یہ کہ شریعت مطہرہ نے جو اصول متقرر فرمائے ہیں، ہمارے فقہاء کرام نے جو بھی اصول مقرر کیے ہیں عارضی اسباب کی بناء پر ان اصول کی پامالی نہیں کرنا چاہئے، جیسا کہ ابھی ایک صاحب نے فرمایا کہ ایک گھر کے اندر چچازاد بہن بھائی سگے بہن بھائی رہتے ہیں اور پردہ کا اہتمام نہیں ہو پاتا تو یہ ایک عارضی سبب ہے، لیکن شریعت نے جو اصول مقرر کیے ہیں وہ اصول مسلم ہیں، اس طرح اگر ان میں نرمی پیدا کی جائے گی تو پھر رفتہ رفتہ ان کی پامالی ہونے لگے گی، اس لیے اکیڈمی کو اس سلسلہ میں بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہیے۔ دوسری بات، عرض یہ کرنا ہے کہ فقہاء کرام نے یہ فرمایا کہ حنفیہ کے یہاں یہ مسئلہ ہے کہ حج میں بوڑھی عورت ہو یا جوان عورت بغیر محرم کے نہیں جاسکتی۔ حج اس پر واجب نہیں ہے، حالانکہ وہ چاہتی ہے کہ حج میں کروں، ایسے مسائل آتے ہیں ہمارے آپ کے پاس اس کے بھائی چچازاد بھائی، خالہ زاد بھائی جو ایک زمانے سے اس کا تعلق رہا، گھر میں رہتی ہے پلی ہے بڑھی ہے وہ حج کرنے کے لیے جانا چاہتی ہے، مگر ہمارے فقہاء فرماتے ہیں کہ وہ حج کو نہیں جاسکتی، جب کہ فقہاء کرام نے دوسری طرف یہ بھی فرمایا کہ بوڑھی عورت سے مصافحہ کرنا جائز ہے علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح فرمایا ہے تو ایک طرف تو فقہاء فرما رہے ہیں کہ بوڑھی عورت کے مصافحہ جائز ہے اور ایک طرف ہے کہ حج کو نہیں جاسکتی تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے جو اصول ہیں ان اصول کے تحت جو ہے ہمیں اور آپ کو فیصلہ کرنا ہوگا۔ بس یہ چند باتیں تھیں جو میں نے آپ کے سامنے عرض کردی۔

مفتی شاہد علی قاسمی (المعہد العالی حیدرآباد):

جداگانہ خاندانی نظام میں مولانا نادر قاسمی صاحب نے والدین کو بھی شامل کیا ہے میں وضاحت چاہتا ہوں کہ جداگانہ اور مشترکہ خاندان میں کون کون سے افراد شامل ہوتے ہیں، احقر کی رائے یہ ہے کہ والدین کی شمولیت خاندان کو مشترکہ نہیں بنائے گی، بلکہ والدین دس دن ایک بیٹے کے ساتھ اور دس دن دوسرے بیٹے کے ساتھ رہیں تو یہ جداگانہ خاندان کے مغایر نہیں ہے۔

مولانا شوکت ثناء قاسمی (حیدرآباد):

مجھے ایک بات کی وضاحت چاہئے وہ یہ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے دور میں خاندانی نظام عام طور سے مشترک تھا یا جداگانہ، بعض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مشترکہ خاندانی نظام رائج تھا، جیسا کہ حضرت فاطمہ بنت قیس کا واقعہ کہ جب ان کے شوہر نے ان کو طلاق دے دی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں تو آپ نے انہیں ان کے سسرالی گھر میں عدت گزارنے کا حکم نہیں دیا، عام طور سے محدثین نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ ان کی زبان تیز تھی اور شوہر طلاق دے کر باہر چلے گئے تھے، سارا غصہ اپنے نند اور اپنے ساس پر نکال سکتی تھی، اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو گھر جانے کی اجازت نہیں دی۔ دوسرا واقعہ حضرت قتادہؓ کہ جن کی بہو نے ان کے لئے باضابطہ طور سے وضو کا پانی رکھا تھا اور یہ واقعہ موجود ہے۔ تیسرا

واقعہ جوابھی آچکا ہے کہ حضرت جابرؓ کا واقعہ ہے جو مشترکہ خاندان میں اپنی بہنوں کی پرورش کیا کرتے تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کو جو الگ کیا تھا اس کی کیا بنیاد تھی؟ یہ کیا بنیاد تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک جداگانہ خاندان بہتر تھا، یا اس بنیاد پر کہ گھر میں ایسی گنجائش نہیں تھی جیسے کہ آپ کے گھر، یعنی بہت چھوٹے تھے تو یہ بنیاد کیا تھی؟ کیا گنجائش نہیں تھی اس بنیاد پر الگ کیا گیا، یا جداگانہ نظام آپ کے نزدیک بہتر تھا۔

تیسری بات یہ ہے کہ مشترکہ خاندان میں جو پردہ کا مسئلہ ہے تو ''بزازیہ'' میں یہ عبارت موجود ہے کہ غیر محرم قریبی رشتہ دار کہ کن کی آمد ورفت گھر میں زیادہ ہوتی ہے، فقہاء نے اجازت دی ہے کہ ایسی صورت میں، یعنی ان کے سامنے چہرہ کھولنے کی اجازت ہے، یعنی پورا جسم تو چھپارہے اور چہرہ کھولتی ہے اور ہتھیلی اور پیروں کو ظاہر کرتی ہے تو اس کی اجازت ہے۔ اور خود نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کا سامنے آنا اور خود حضرت اسماء رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی خدمت میں آئی تھیں اور وہ حدیث مشہور ہے کہ آپ نے ان کو کہا تھا کہ جب لڑکی بالغ ہوجائے تو یہ حصہ ظاہر کرسکتی ہے، اس کے علاوہ ظاہر نہیں کرسکتی ہے، حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ حضرت حسن یا حسین کو لیتے وقت حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ہتھیلی انھوں نے دیکھا تھا تو گویا کہ جن کی آمد ورفت زیادہ ہوتی ہے تو پردہ میں ان کے لیے تخفیف ہے، اگر مشترکہ خاندان میں اس طرح کے رہنے اور پردہ کے وسائل ہوں اور چہرہ کھولنے کی اجازت اور ہتھیلی کھولنے کی اجازت ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے۔

مولانا عتیق احمد بستوی:

اللہ کا فضل ہے کہ مختلف پہلوؤں سے اس موضوع پر آپ غور کررہے ہیں، دو تین باتیں میرے ذہن میں آرہی تھیں میں نے سوچا کہ اس کو عرض کردوں آپ کے سامنے، شاید کچھ اور سوچنے کی راہیں کھلیں۔ ایک بات تو یہ ہے کہ جداگانہ خاندانی نظام یا مشترکہ خاندانی نظام، اس کا ہم جائزہ لیں عہد نبوی میں کیا رواج تھا، پھر اس میں کیا کچھ فرق ہے جو مدینے کا انصار کا سماجی نظام تھا کچھ الگ تھا، مہاجرین کا الگ تھا یا دونوں یکساں تھے، ہمارے کچھ احباب نے اس مسئلہ کو اٹھایا ہے، اچھا نقطہ ہے، اچھا پوائنٹ ہے کہ اس بارے میں کوئی فیصلہ کرنے میں بڑی معاون ہوگی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں، عہد صحابہ میں کیا رواج تھا۔ لیکن ایک بات یہ بھی میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بھائی یہ اسلام پوری دنیا کے لیے ہے، کوئی نظام اگر عرب میں رائج تھا، دوسرے ملک میں کوئی اور نظام چل رہا ہے تو بعض چیزیں سماجی ہوتی ہیں، معاشرتی ہوتی ہیں، ہمیں یہ فرق کرنا پڑے گا کہ کونسی چیز کا کتنا حصہ شریعت ہے، قانون ہے جو پوری دنیا میں رائج ہونا ہے اور کونسی چیز ہے جو ایک ملک کا رواج تھا، عرف تھا، سماج کا، عربوں کا۔

ہندوستان کا معاشرہ، یہاں کا ماحول عربوں سے مختلف ہے۔ امریکہ آپ چلے جائیں، برطانیہ آپ چلے جائیں، بنیادی چیز یہ ہے کہ گویا علیحدہ خاندانی نظام شریعت میں مطلوب ہے اور اسی سے گویا وہ مقاصد پورے ہوسکتے ہیں جو مقاصد شریعت کے ہیں اور جو شریعت کے اصول وضوابط ہیں۔ تب تو ظاہر بات ہے اسی کی ہمیں تبلیغ کرنا چاہیے، اسی کے لیے ہمیں زور لگانا چاہیے۔ ہمارے گھروں میں جو دوسرا ماحول ہے اس کو بدلنا چاہیے۔ لیکن اگر وہ سماجی چیز تھی، عربوں میں یہ رواج تھا، عربوں مین رہائش اس طرح کی تھی، مدینہ منورہ والوں میں یہ تھی، مکہ مکرمہ والوں میں یہ تھی اور ہمارے یہاں کوئی دوسرا طرز ہے، مشترکہ خاندانی نظام میں بھی اگر ہم ان چیزوں کو پورا کرسکتے ہیں، ان احکام وضوابط کو جو شریعت نے متعین کیے ہیں تو ظاہر بات ہے کہ ہم پھر کسی ایک نظام کو اختیار کرکے اس پر اصرار نہیں کرسکتے، اس لحاظ سے مجھے غور کرنا ہے۔

دوسرا ایک پوائنٹ اور بھی مجھے عرض کرنا ہے۔ علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے ''فیض الباری'' میں یہ بات لکھی ہے ان کی بات بار بار نقل ہوئی ہے کہ ہمارے یہاں اکثر مروج کتابیں جو فقہ کی ہیں، یہ کتابیں قضاۃ کے لیے لکھی گئی تھیں۔ قاضیوں کے لیے جو عدالتی نظام چلا رہے تھے ان کے واسطے فقہاء نے یہ کتابیں لکھیں۔ تو اکثر مسائل جو ان میں آئے ہیں وہ قضا کے مسائل ہیں، جب کہ قضاء کے مسائل کا مسئلہ کب آتا ہے جب دارالقضاء میں مسئلہ پہنچ جاتا ہے، نزاع ہوجاتا ہے اور نزاع ہونے کے بعد بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ علیحدگی نہ ہو، دونوں ساتھ رہ سکیں۔ تو جو دیانت کے مسائل ہیں وہ کم ذکر کیے گیے ہیں، جب میاں بیوی کے حقوق کا مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے اور فقہاء کی عبارتیں ہم پڑھتے ہیں بسا اوقات کہ دوا علاج کرانا شوہر کی ذمہ داری نہیں ہے یہ کام عورت کی ذمہ داری نہیں ہے، یہ کام مرد کی ذمہ داری نہیں ہے، یہ سب مسائل اکثر وبیشتر قضاء کے انداز کے ہوا

کرتے ہیں، ظاہر بات ہے کہ جو فیصلہ ہم یہاں کریں گے وہ محض قاضیوں کے لیے نہیں کہ دار القضاء میں کن چیزوں کو لیں اور کس کو فیصلہ کریں۔ بلکہ ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ جس طریقے سے گویا ہمارا خاندانی نظام مستحکم ہو سکے اور اس میں اسلام کے گویا جو اصول اور بنیادیں ہیں اس پر عمل ہو سکے، اس کی ہمیں ہدایت دینی ہے، اس طرف رہنمائی کرنی ہے۔ تو اس لحاظ سے جو جزئیات ومسائل ہیں ہمارے فقہاء کے وہ اپنی جگہ پر، اس سے ہم استفادہ کرتے ہیں اور کریں گے۔ لیکن جو احکام دیانت ہیں ان کا بھی ہمیں خیال رکھنا ہے اور موجودہ حالات میں جہاں فیملی کا تصور سمٹتا چلا جارہا ہے اب فیملی کا تصور آگے بڑھ گیا، اب تو تنہا آدمی فیملی ہے، مرد کے ساتھ عورت نہیں ہے۔ عورت کے ساتھ مرد نہیں۔ یہ تو فتنہ ہے جو آرہا ہے اس ملک میں، آچکا ہے اس پر ہم کو بندش باندھنی پڑے گی اور مسلمانوں کو بتانا پڑے گا کہ اسلام نے ہمیں کیا تصورات دیئے ہیں۔ بہرحال یہ چند بنیادی باتیں تھیں میں نے سوچا کہ آپ کے سامنے عرض کردوں، تا کہ آپ اس پر اظہار خیال فرمائیں اور اس کا خیال رکھ کر گفتگو کریں۔

مولانا سعید الرحمن فاروقی (ممبئی):

حدیث شریف میں: "إنکم لتنصرون وترزقون بضعفائکم" کمزوروں اور بے سہاروں کی مدد کرنے سے تمہاری مدد اور تمہارے رزق میں اضافہ کیا جاتا ہے، اسی طرح "من أحب أن یسأله في إثره ویبارك له في رزقه فلیصل رحمه" رحمی رشتوں کے احترام اور اس کے جوڑ سے اللہ کی طرف سے برکت اترتی ہے۔ دونوں جداگانہ یا مشترکہ نظام میں جس بات کو زیادہ اہمیت دینی چاہیے وہ ہے رفع نزاع، جھگڑے نہ ہوں تو دونوں بہتر ہے، مشکل یہ ہوگئی ہے معاشرہ کی کہ آپس میں رہ کر بہت زیادہ جھگڑتے ہیں اور اپنی طاقت، قوت، اعتماد اور اپنی عزت کھوجاتے ہیں اور الگ ہو کر بھی سکون سے نہیں رہتے، اس لیے دراصل حدود اس طرح متعین کردیئے جائیں کہ مشترکہ نظام میں ان حدود پر رہیں "تعاشروا کالإخوان تعاملوا کالأجانب" تو سکون رہے گا اور جداگانہ ہے تب بھی اپنی رعایت اور اپنی حدود پر قائم رہیں تو اتحاد واتفاق اور نزاع نہیں ہوگا، میں سمجھتا ہوں یہ بہت اہم بات ہے اگر پیش نظر رہے تو۔ جزاکم اللہ۔

مفتی محمد ارشد فاروقی:

فقہ اکیڈمی نے جو چھوٹے چھوٹے سوالات اٹھائے ہیں اس میں معاشرہ کے ساجی تمام مسائل کو گھیرنے کی کوشش کی ہے، اگر غور کیا جائے تو یہ جو نظام معاشرت ہے درحقیقت اس میں مشرق اور مغرب کا معرکہ ہے، مشرقی نظام کیسا ہے اور مغربی نظام کیسا ہے؟ مغربی نظام نے اس وقت ان تمام تصورات کو جو انسانی ہمدردی کے بنیاد پر ہوتے ہیں تقریباً اس کا خاتمہ کرنے کے لیے کوشاں ہے کہ جو اسلام "الخلق عیال الله" کا تصور دیتا ہے "إنما المؤمنون إخوة" کہہ کر پوری امت کو ایک قرار دیتا ہے اور پھر وہ اسی طرح رفتہ رفتہ خاندان کے مسائل بیان کرتا ہے تو اس معاشرہ کو بکھیرنا، خاندان کو توڑنا، خاندان کے نظام کو ختم کرنا، حتی کہ جیسا کہ ابھی محترم مولانا عتیق صاحب فرمارہے ہیں کہ اب ایک، یک وتنہا گزارنا اسی کو خاندان کہنا، اسی کو گھر کہنا اسی کو فرد کہنا، یہاں تک نظام پہنچ چکا ہے تو یہ ایک کشمکش ہے اس کشمکش کا مقابلہ ہمیں ان اعلیٰ اخلاقی، مثالی اسلامی تعلیمات سے کرنی ہے اور وہ فیصلے لینے ہیں جو براہ راست والدین کے اولاد سے تعلق کو قرآن نے کیا بتایا، بھائیوں کے تعلقات کو کیا بنایا، بہنوں کے تعلقات کو کیا بتایا، پورا نظام موجود ہے تو اس لیے اس طور پر کہ اسٹوڈیو روم یا فلیٹ یا پھر کالونی کی یہ شکل اس سے ہمیں یقیناً نکلنے کی کوشش کرنی چاہئے، بلکہ مسلم کالونیاں ایسی بنانی چاہیے کہ جس میں وسعت ہو، گنجائش ہو۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے معاشرہ پر بڑے شہروں پر ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو جیسا کہ میں نے مثال بھی دی ہے اپنے مقالہ میں کہ ممبئی میں ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دس بائی دس کا ایک کمرہ اس میں تین خاندان آباد ہے تخت کے نیچے تخت پر اور تخت کے اوپر۔ تو اب وہاں وہ سارے نظام کو ہم کیسے فٹ کریں پھر ایک دیہات کے نظام میں۔ ان تمام صورتوں کو سامنے رکھ کر اسلام جو ہے ہر جگہ رہنمائی کرتا ہے یہ ہمارا یقین ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت ہم ہندوستانی معاشرہ کو، ہندوستانی سماج کو وہ کیا پیغام دیں کہ ممبئی میں بھی وہ فٹ ہو، دلی میں بھی فٹ ہو، چھوٹے چھوٹے گاؤں میں بھی فٹ ہو۔ اس پر ہمیں غور کرنا ہے۔

دوسری بات خاص طور سے جو پردہ سے متعلق اٹھائی جارہی ہے یہ تو شروع سے یہ بات طے چلی آرہی ہے کہ مفسرین کرام کی دو رائے ہے کہ حجاب اور ستر میں فرق کیا ہے، بعض حضرات نے حجاب میں وجہ کو بھی مانا ہے اور بعض نے وجہ کو نہیں مانا ہے۔ ہمارے یہاں جمہور کا مسئلہ یہی ہے کہ وجہ حجاب میں شامل ہے، لیکن عند الضرورة۔ اب ایسے وقت میں جب کہ چچازاد، خالہ زاد، ماموں زاد بہنیں جو ہیں ایک ہی گھر میں رہ رہی ہیں تو اب ہر

وقت یہ تصور کرنا کہ ہمارا وہ پردہ کا نظام بیان کیا ہوا کہ ہر وقت چہرہ ڈھانپے ہوئے، چادر ڈالے ہوئے، چہرہ کو چھپائے ہوئے ایک بال بھی ظاہر نہ ہو کیسے ممکن ہے۔ اس واسطے جب دو قول موجود ہے تو ایسی صورت میں وہ دوسرا قول ہمارے لیے قابل عمل ہے اور قابل سہولت ہے اور خاص طور سے وہ شرطیں تنہائی، خلط ملط اور یہ سب چیزیں تو اس سے گریز لازمی ہے، تو اس پس منظر میں ہم تمام معاملات کو مشرق ومغرب کا جو کشمکش ہے اس میں ہم حل کرنے کی کوشش کریں۔ امید ہے کہ ہم انشاء اللہ کوئی ایسا فیصلہ دے سکیں گے جو ہندوستانی سماج ہی نہیں، بلکہ پوری دنیا کے لیے ایک رہنما کی حیثیت رکھے گا انشاء اللہ۔ جزاکم اللہ۔

مولانا اختر امام عادل قاسمی:

بہت سی باتیں میرے ذہن میں بھی تھیں، مگر بہت سے ہمارے بزرگوں کی زبان سے وہ ادا ہوگئی ہیں، ایک دو بات میں عرض کرنا چاہوں گا کہ یہ جو سماج بنتا، کوئی سوسائٹی یا معاشرہ بنتا ہے، خاندان بنتا ہے تو خاندان کے مختلف افراد کے لیے اسلام میں ہدایات موجود ہیں، ہدایات کو نظر انداز کرنے کی بنیاد پر یہ ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایک ہے استثنائی حالات، ایک ہے نارمل حالات، عام حالات عہد نبوی میں یا عہد صحابہ میں عام طور سے نظام رہائش کیا تھا، کسی کے پاس کوئی مسئلہ درپیش ہوا، اس کی وجہ سے کیا اجازت دی گئی۔ ہمیں نارمل حالات میں گنجائش تو ہر حالت میں موجود ہے، استثنائی حالات، مخصوص حالات کے لیے گنجائش رہتی ہے ہر قانون میں ایک شق ہوتی ہے موجود، لیکن عام قانون کے نقطۂ نظر سے کونسا نظام بہتر ہے، خود سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو اپنا گھریلو نظام تھا بیویوں کے درمیان، چاہتے تو ایک چولہا ہوتا، سارے لوگ شریک ہوتے، لیکن اور ان سے زیادہ پاکیزہ عورتیں بھی دنیا میں نہیں ہوسکتی تھیں جن کے دل صاف تھے، لیکن پھر بھی ہر ایک کا نظام الگ الگ، حضرت علیؓ کا قصہ جو مولانا عمر عابدین صاحب نے نقل کیا بڑا قیمتی ہے کہ شادی ہوتے ہی الگ مکان دیا گیا، حالانکہ بغل میں ایک روم بنایا جاسکتا تھا، کفالت میں پہلے سے دونوں تھے، حضرت علیؓ کی بھی کفالت حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے، حضرت فاطمہؓ کی بھی کفالت حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے، پہلے سے فرمارہے تھے۔ بغل میں سائڈ سے ایک کمرہ بنا دیا جاتا، سارا نظام پہلے سے چلتا رہتا ہے، لیکن نارمل حالات میں آپ نے ہمیشہ یہی کوشش کی، باقی جن کے لیے ماں موجود ہے باپ موجود ہے تو آپ نے ہمیشہ یہ ہدایت کی کہ ماں کی خدمت کرو، باپ کی خدمت کرو۔ حضرت اویس قرنی صرف ماں کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے محروم رہے، تو یہ سب واقعات استثنائی ہیں، کسی کے پاس مجبوری ہے تو یقیناً وہ ایسا کرے گا، ماں باپ تو مشترکہ خاندانی نظام کا حصہ نہیں بنتے۔ ماں باپ تو بہر حال ہمارا حصہ ہیں وہ جو لیبرل نظام حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب نے فرمایا کہ صرف میاں بیوی اور نابالغ بچے تو وہ مغرب کا ایک نظام ہے، ماں باپ تو ہمارے یہاں شامل ہیں، ماں باپ کی خدمت تو ہمارے یہاں شامل ہے، اس لیے وہ تو ہمارا حصہ ہیں۔ مشترکہ نظام کا مقصد جو بھائیوں کے درمیان رہائش ہوتی ہے چچاؤں تک متعدی ہوتی ہے، پھر چچاؤں تک بات چلتی ہے، جائداد مشترک ہوتی ہے اس میں جو خرابیاں ہیں وہ بہتر ہے کہ نہیں، یہ عہد نبوی سے میچ نہیں کرتا، علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ اپنے علاقہ کا حوالہ دیا ہے کہ "إلا أن تكون دار مورثة بين إخوة فيسكن كل منهم من جهة منها مع الاشتراك مع مرافقه"۔ ان کے زمانے میں ایسا نظام تھا کہ بعض اگر اپنے بھائیوں کے درمیان مکان پہلے سے یا کوئی جائداد مشترک ہے، اگر مرافق میں اشتراک ہے تو اس طرح کا رواج ان کے یہاں تھا اور اس کو وہ بہتر سمجھتے تھے، اس رہائش کے مقابلہ میں جہاں پر خاندانی جداگانہ نظام ہو بیت الخلاء وغیرہ بھی سب کا الگ ہو، لیکن اجنبیوں کے درمیان رہے، اس سے بہتر اس کو اس زمانے میں سمجھا جاتا تھا۔ یہ اس دور کا طرز رہائش تھا۔ اس لیے میرا خیال یہ ہے کہ اس بات کو بھی سامنے رکھا جائے کہ دفع مضرت مقدم ہے جلب منفعت سے جو چیزیں اخلاقی نصائح، اخلاقی باتیں کہی جاتی ہیں ماں باپ کو چھوڑ کر، ماں باپ کی خدمت تو ہمارا فریضہ ہے، اگر ان کو کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے تو یہ بچوں کی ذمہ داری ہے، لیکن بھائیوں کی مدد، معذوروں کی مدد، مطلقہ عورتوں کی مدد جو اخلاقی چیزیں ہیں اور جو منافع کے ذیل میں آتی ہیں، اس میں دفع مضرت کو سامنے رکھا جائے، اگر دفع مضرت جس میں زیادہ بہتر ہے اس کو اختیار کرنا چاہئے۔ تو یہ باتیں تھی جو رہ گئی تھیں۔ انہیں میں نے عرض کردیا ہے۔

☆☆☆